کتب ۔

مخزن لاہور

جلد ۱
نمبر ۲
فروری ۱۹۴۹ء

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

صفحہ اول،	مدیر،
احیائے اسلام میں حالی کا حصہ، ۳	حامد علی خاں،
سکون کا لمحہ، ۸	پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی،
آرٹ میں تاثریت کی تحریک، ۱۰	امین الرحمٰن،
دل یہ کبھی تو ---، ۱۶	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم،
دیومالا کا نفسیاتی پس منظر، ۱۷	شبیر محمد اختر،
تجلیات، ۲۱	خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی
بودلیئر، ۲۲	محمد حسن عسکری،
دل نہیں جلے رہے، ۲۸	عبدالمجید بھٹی،
چاند کی سیر، ۲۹	علی ناصر زیدی،
آمد بہار، ۳۳	سید نذیر حسین ناشاد،
بیمہ ایجنٹ، ۳۴	ڈاکٹر عاشق حسین،
شہکار، ۴۵	جلیل حسن جلیل،
غزل، ۴۶	یوسف ظفر،
مسٹر منز اور اُن کے پھپھیرے بھائی،	حامد علی خاں
مرزا غالب کے نام خط، ۵۵	حالی،
منشورات، ۵۶	حامد علی خاں
مخزن المخازن، ۵۹	
ایڈیٹر کے نام، ۶۱	قارئین

سالانہ
سات روپے
ششماہی
چار روپے
فی پرچہ
دس آنے

سلسلہ مطبوعات نوائے وقت

THE "MAKHZAN" LAHORE.

عبدالحمید نظامی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے امرت الیکٹرک پریس ۱۲ ہال روڈ چھپوا کر دفتر رسالہ مخزن " مال روڈ لاہور سے شائع کیا

صفحہ اوّل

جنوری کا "مخزن" مطبع ہی میں تھا کہ ہمیں اپنے محترم مدیر المعزازی مدظلہ کی تشویشناک ناسازیٔ طبع کی اطلاع ملی اور اگرچہ شیخ صاحب قبلہ کی طبیعت بہت جلد سنبھل گئی لیکن پھر بھی احباب کو بہت دنوں تک پریشانی رہی۔ کیونکہ علالت کے اثرات پوری طرح رفع نہیں ہوئے تھے۔ الحمد للہ کہ اب شیخ صاحب کی صحت اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ پریشانی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔

"مخزن" کے عہدِ نو کا دوسرا پرچہ آپ کے پیش نظر ہے ہمیں مسرت ہے کہ پاکستان و ہند کے معاصرین اور بہی خواہانِ اُردو نے ہماری اُمید سے بڑھ کر "مخزن" کی قدر افزائی کی اور عام قارئین نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

بعض احباب نے شکایت کی ہے کہ انہیں "مخزن" کے لئے کچھ لکھنے کی دعوت نہیں دی گئی یا انہیں فراموش کر دیا گیا ہے۔ اس مخلصانہ شکوے کی ہمیں پوری قدر ہے۔ لیکن ہم یہ غلط فہمی رفع کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم انہیں بھول گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلاب کے بعد اپنے اکثر احباب کے نئے پتوں کی ہمیں اطلاع نہیں ہوئی اس عذر کے باوجود ہم "مجرم" ضرور ہیں لیکن قابلِ معافی۔ اس سلسلے میں جن احباب نے ہمیں خط لکھ کر یاد فرمایا ہے ہم ان کے ممنون ہیں۔ اور باقی حضرات سے بھی متوقع ہیں کہ وہ ہمیں اپنے موجودہ پتوں سے مطلع فرمائیں گے۔

مضمون لکھنے کے لئے حسبِ سابق ہماری طرف سے صلائے عام ہے مشہور ادباء اور کہنہ مشق اساتذہ ہی کے لئے نہیں نئے ادباء و شعراء کے لئے بھی "مخزن" کے صفحات حاضر ہیں ہماری روش اب بھی "مخزن" کی قدیم روایات کے عین مطابق ہے۔

علمی مضامین کے علاوہ اچھے تفریحی مقالوں، افسانوں اور ڈراموں کے لئے بھی "مخزن" کے کچھ صفحات وقف رہیں گے اس باب میں ہمیں نوجوان ادباء سے تعاون کی زیادہ توقع ہے۔ کچھ مدت سے ہمارے نئے لکھنے والوں نے دوسری زبانوں کی ادبیات کو اُردو میں منتقل کرنے کے فرض سے بہت غفلت اختیار کر لی ہے ہماری رائے میں کسی زندہ زبان کو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کے اچھے نمونوں سے بے نیاز نہیں ہونا چاہیئے۔ مخزن مشرقی اور مغربی زبانوں کے عمدہ تراجم کی ضرور قدر کرے گا۔

گذشتہ پرچے میں سید احمد خان کے چند نادر خطوط اور مولینا حالی کی ایک غیر مطبوعہ نظم شائع ہوئی تھی ہم غیر مطبوعہ علمی و ادبی نوادر کی اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اہلِ ذوق احباب اس سلسلے میں ہماری مدد کریں گے۔

"تبرکاتِ مخزن" کے زیرِ عنوان ہم نے "مخزن" کے قدیم پرچوں سے نثر و نظم کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے لیکن ہمارے پاس "مخزن" کی پرانی جلدیں نہیں۔ اگر پرانی جلدیں ہوتیں تو سب سے پہلے ہم پہلی جلد سے مضامین کا انتخاب کرتے۔ اگر کوئی صاحب ہمیں "مخزن" کی پہلی جلد عاریتہً عنایت فرما سکیں تو ہم بیحد ممنون ہونگے۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی صاحبِ ذوق اس جلد سے منتخب نثر و نظم کی نقلیں ہمیں عنایت فرما دیں۔ امید ہے کہ "مخزن" کے ہزار ہا قارئین میں سے کوئی صاحب بہت بزرگ ہماری اس درخواست پر ضرور لبیک کہیں گے۔

مدیر

مخزن

احیائے اسلام میں حالی کا حصہ

گزشتہ دسمبر کے آخر میں "یومِ حالی" کی تقریب پر یہ تقریر لاہور سے نشر ہوئی تھی اس کی اشاعت کے لئے "مخزن" ریڈیو پاکستان کا ممنون ہے۔

حالی سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں پیدا ہوئے مغلوں کی حکومت اگرچہ قیصریت ہی کی ایک شکل تھی اور اِس لحاظ سے ہم اُسے اسلامی حکومت نہیں کہہ سکتے لیکن اِس کے باوجود اُس سے مسلمانانِ ہند کے کم از کم متمدن اور تعلیم یافتہ طبقوں کے عزّ و افتخار کی بہت سی روایات وابستہ تھیں۔ یوں بھی چونکہ مغل ہندوستان کو اپنا مستقل وطن بنا چکے تھے اور اُنکے [illegible] عہدِ سلطنت میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کو بہت ترقی حاصل ہوئی تھی، اِس لئے اُن کے زوال کو بہت سے غیر مسلموں نے بھی ملکی حکومت کے زوال کا مرادف قرار دیا۔ اِن حالات میں یہ اور بھی زیادہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان مغل سلطنت کے زوال کو اپنی شوکت و حشمت کا زوال سمجھتے۔

انگریز حملہ آور تاجر کے بھیس میں اِس طرح چپ چاپ گھس آیا تھا کہ ابتدا میں مسلمانوں کو شاید اپنی خانماں بربادی کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ اِس کے بعد جب یہ تلخ حقیقت برہنہ ہو کر سامنے آئی تو وہ کچھ مبہوت سے رہ گئے اور ایک عرصے تک یہی کیفیت رہی۔ بالآخر کچھ لوگ سنبھلے اور ۱۸۵۷ء میں اُنہوں نے دراز دستِ اجنبی سے چھٹکارا پانے کے لئے ایک آخری غیر منظم اور نتیجۃً ناکام کوشش کی۔ اِس رقصِ بسمل کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا اور اکثر ہندوستانیوں نے، بالخصوص مسلمانوں نے اِسے اپنی جنگِ آزادی تصور کیا مگر اِس ناکامی کے بعد

مسلمانوں کے حوصلے اُور زیادہ پست ہوگئے۔ انگریزوں کا مقابلہ پہلے بھی مسلمانوں ہی سے تھا لیکن اس ہنگامے کے بعد تو اُنھوں نے بڑی وضاحت سے مسلمانوں کو اپنا دشمن نمبرا قرار دیا اور اُن کو پیس کر رکھ دینے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ ایک عرصے تک مسلمانوں کے اعلیٰ خاندانوں بڑی بڑی شخصیتوں اور اُن کے تعلیمی و تمدنی اداروں کو نیست و نابود کرنا انگریز حاکموں کا شغل خاص بنا رہا۔

مغل دربار کے عہد میں بھی مسلمانانِ ہند علی العموم قومی اور جماعتی تصورات سے بیگانہ رہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اُن کی جماعتی بے حسی کی وہی کیفیت رہی اِس پر انگریز حاکم نے ایسے افراد کو بھی جن میں انفرادی غیرت اُور خودداری کا کچھ کس بل نظر آیا اپنے استبداد کی تیغ کے گھاٹ اتار دیا لیکن شرعدو ہی سے خیر کی ایک صورت پیدا ہوئی یعنی ۱۸۵۷ کے ہنگامہ کے بعد انگریزوں کی خون آشامی نے جب مسلمانوں کو اپنی توجہ خاص کا مرکز بنایا تو ہندوستانی مسلمانوں کی اِس مخصوص مظلومی کے باعث پہلی دفعہ ایک مسلمان شاعر کو اُن کے الگ تھلگ قومی وجود کا احساس ہوا۔ اور اُسی درباری دَور انفرادیت کا سب سے بڑا اور اہلیت پسند غزل گو شاعر غالب اِس قسم کے قومی احساس اور سیاسی شعور میں ڈوبے ہوئے اشعار کہنے پر مجبور ہو گیا:-

"بسکہ فعّالِ ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستان کا
"گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
"چوک جسکو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
"شہرِ دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا"

اِس کے بعد غالب نے مسلمانوں کے مجبور و محبوس اضطراب کی تصویر یوں کھینچی ہے

"گاہ جل کر کیا کئے شکوہ — سوزشِ داغہائے پنہاں کا
"گاہ رو کر کہا کئے باہم — ماجرا دیدہائے گریاں کا"

یہ اشعار ہر چند ہمارے ہاں ایک نئے جذبۂ قومی شعور کے نقیب ہیں، مگر اُس وقت حالات ایسے تھے کہ یہ پہلی آواز بالکل دبی دبی رہی، اور گھر کے حجرے سے باہر نہ پہنچ سکی، اِس لئے غالب کا یہ قومی احساس اپنے اثر کے لحاظ سے بڑی حد تک انفرادی ہی رہا لیکن ۱۸۳۷ء میں یعنی انگریزوں کے غدر سے بیس برس پہلے پانی پت میں خواجہ ایزد بخش کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا ——— الطاف حسین، جو بعد میں حالی کے تخلص سے مشہورِ عام و خاص ہوا اُور جس نے بالآخر اپنے قومی ترانوں سے مسلمان قوم کی شیرازہ بندی اور بالفاظِ دیگر احیائے اسلام کے کام میں ایک بنیادی حصہ لیا۔

حالی کے پہلو میں بہت ذکی الحس اور درد بھرا دل تھا۔ آخری مغل شہنشاہ، شہزادوں اور ذی عزت مسلمان خاندانوں کی ذلت اور بربادی غالب کی طرح اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور اُن کی مظلومی و بے چارگی پر اُن کا ہمدرد دل ایک گوشۂ عزلت میں مہینوں روتا رہا تھا، بظاہر اِس سے زیادہ، ایک بے برگ و نوا غزل گو شاعر اُور کر بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن حالی کی بلکہ خود ہندوستانی مسلمانوں کی خوش قسمتی سے اُن کے اِس انتہائی زوال کے دَور میں اُن کا پہلا بڑا رہنما پیدا ہو چکا تھا۔ بلند نظر اور بلند ہمت سید احمد خاں جو خوابیدہ و افسردہ مسلمانوں کے سیاسی، تمدنی، علمی اُور اخلاقی زوال سے نہ صرف بے حد رنجیدہ تھے بلکہ اِن تمام امراض کا علاج بھی اُن کے پیشِ نظر تھا، ہمارے شعر و ادب کے بیمار جسم و روح کے لئے بھی مسیحا ثابت ہوئے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد اُنھوں نے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے مرحلے میں جہاں دوسرے لوگوں سے مناسب کام لیا وہاں اُن کی جوہر شناس نظر حالی کے ہنر سے بھی غافل نہ رہی اور سید صاحب نے اِس حساس مسلمان شاعر سے ایک ایسا کام لیا جس کی تلاش میں اُس کی روح خود بے قرار تھی مگر چاروں کھونٹ پھیلے ہوئے اندھیرے میں اُسے کچھ سوجھ نہ پڑتا تھا۔

ہمارے اکثر شعرا جو زوالِ سلطنت کے تلخ حقائق کا مقابلہ نہ کر

سکتے تھے، اُنھوں نے برسوں پہلے زندگی سے راہِ فرار اختیار کر کے راہبانہ تصوف اور گھٹیا عشق و عاشقی کی غزل کے دامن میں پناہ لے لی تھی۔ حالی کی عمر اس وقت چالیس سال سے اُوپر ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ہم عصروں کی اس روش سے کچھ بیزار نظر آتے تھے لیکن اُنہیں اِس چکر سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہ آتی تھی۔ خود کہتے ہیں :۔

"بیس برس کی بیکار اور نکمّی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے اور طاقتِ رفتار جواب دے چکی تھی لیکن پاؤں میں چکر تھا اِس لئے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ چند روز اسی تردّد میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے بڑھتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اِس میدان کا مردِ ہے، ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ اس کی ایک نگاہ اِدھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ماندے خستہ و کوفتہ قدم اُسی دشوار گزار رستے پر پڑ لیئے۔ نہ یہ خبر ہے کہ کہاں جاتے ہیں، نہ یہ معلوم کہ کیوں جاتے ہیں۔ نہ طلب صادق ہے، نہ قدم راسخ ہے۔ نہ عزم ہے، نہ استقلال ہے، نہ صدق ہے، نہ اخلاص ہے مگر ایک ہاتھ ہے کہ کھینچے لیئے جاتا ہے۔"

یہ سید احمد خاں کا ہاتھ تھا جن کی ہمہ گیر رہنمایانہ قابلیت نے حالی کی شاعری کو بھی اُس رستے پر ڈال دیا جو اسے حیاتِ جاوید کی منزل میں لے گیا۔ ۱۸۷۹ء اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک یادگار سال ہے کیونکہ اس سال حالی کا مشہور مسدس (مدوجزرِ اسلام) شائع ہوا۔ یہ نظم سید صاحب کی تحریک سے لکھی گئی تھی اور یہ اُردو شاعری ہی میں نہیں پوری ہندوستانی شاعری میں اِس شان کی پہلی قومی نظم تھی۔ حالی کی اِس پُرخلوص آواز نے درماندہ و خستہ مسلمانوں کو ایک بار جھنجوڑ کر جگا دیا :

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم!
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم!

اُنھوں نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر اُن کے سامنے یُوں پیش کی کہ

وہ دینِ حجازی کا بیباک بیڑا   نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کو   نہ عمّاں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا
کئے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

اور پھر اُنہیں یُوں غیرت دلائی کہ

اگر کان دھر کر سُنیں اہلِ عبرت   تو سیلون سے تا بہ کشمیر و تبّت
زمیں، سبزہ، بن، پھول، پھل، ریت، پتھر   یہ فریاد سب کر رہے ہیں بحسرت
کہ کل فخر تھا جن سے اہلِ جہاں کو
لگا اُن سے عیب آج ہندوستاں کو

حالی کی یہ عبرت آموز اور پُرخلوص نظم شعری تکلف اور لسانی دقت کی آلائش سے بالکل پاک تھی۔ اِس میں پہلی بار ایک از خود گزشتہ قوم کے عوام کو عوام کی زبان میں قدیم قومی عظمت و شوکت کی یاد ہی نہیں دلائی گئی تھی، اور مسلمانوں کے قدیم شان و شکوہ سے اُن کی اُس وقت کی ذلت و پستی کا مقابلہ ہی نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس قعرِ ذلت سے نکلنے کی راہیں بھی اُنہیں سمجھائی گئی تھیں۔ سید احمد خاں کے جوہر شناس وجدان نے مسدس کے دُور رس اثرات کا اندازہ ایک نظر میں کر لیا چنانچہ مسدس کے پہلے نسخے کی رسید بھیجتے ہوئے ہی اُنہوں نے حالی کو لکھا :

...... جب خدا مجھ سے پوچھے گا تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں، اور کچھ نہیں۔

سید صاحب نے مسدس کی تعریف میں کچھ مبالغے سے کام نہ لیا

تھا۔ برگشتہ حال مسلمانوں کے لئے یہ نظم واقعی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی اور اس کو بجا طور پر وہ قبولِ عام حاصل ہوا کہ اُس کی مثال آج کے دن تک شاید مشکل سے مل سکے۔

اِس مسدس میں مسلمانوں کو کیا کچھ نظر آگیا، مولانا سلیمان ندوی کے الفاظ میں:

"عرب کی حالت، رحمتِ عالم کا ظہور، قرآن کی تاثیر، اسلام کا شیوع، فتوحات کی وسعت، علوم و فنون کی ترقی، علماء و حکماء کا کمال، تعمیرِ بلاد، سیر و سیاحت اور بغداد و اُندلس کے قابلِ فخر آثار اِس خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ اِس میں نظم کئے گئے تھے کہ مسلمانوں کو فقیری میں بادشاہی کا مزہ آگیا، اور اُن کے جھکے ہوئے سر فخر سے اُونچے ہونے لگے۔"

مسدسِ حالی نے مسلمان عوام کو بلاواسطہ جس قدر متاثر کیا ہوگا، اس کا اندازہ اب بھی کہ اسے لکھے ہوئے پون صدی کے قریب ہونے کو آئی ہے ہر وہ اجہل مسلمان اسے پڑھ کر خود کر سکتا ہے، لیکن قوم پر اِس کے بالواسطہ اثرات اتنے وسیع ہوئے کہ اُن کا احاطہ مشکل ہے۔ کیونکہ اِس ایک نظم نے ہمارے پورے شعر و ادب کو متاثر کر کے نہ صرف ایک عظیم ادبی انقلاب برپا کر دیا بلکہ قوم کے لئے ایک اجتماعی نقطۂ نظر کی تعیین بھی کر دی۔ سید احمد خان نے بجا طور پر اِس نظم کو ایک عہد آفریں تصنیف قرار دیا تھا۔ اسی نظم سے ہمارے ہاں ملی و وطنی نظموں کی بنیاد پڑی۔ اسی نظم سے عام مسلمانوں میں سیاسی بیداری کا آغاز ہوا اور اسی نظم سے ملت میں مجلسی، تمدنی، علمی، اقتصادی اور دینی و اخلاقی ترقی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ غرض حالیؔ نے مسلمانوں کے مردہ دلوں میں ایک نئی زندگی کے ولولے کی پرورش کر کے اُن کی سوتی قسمت کو جگا دیا۔

ہندوستان کے مسلمان من حیث القوم جاہل، بے ہنر، مفلس اور تباہ حال ہو چکے تھے۔ لیکن اُس وقت اُن کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اُن کے دل میں اپنی پستی کا احساس بھی باقی نہ رہا تھا۔ اسی لئے حالیؔ کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ تیرہ سو سال پہلے کی اسلامی تاریخ کے واقعات کو دُہرا کر مسلمانوں کے دلوں کو گرمایا جائے۔ انہیں اُمید تھی کہ جب مسلمان ماضی کے مرقع میں اپنی پُرشکوہ تصویر دیکھیں گے اور اُس کا مقابلہ اپنے اُس وقت کے کرم خوردہ حال سے کریں گے تو اُن کی غفلت کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔

اِس وقت گنجائش نہیں کہ میں مسدس سے زیادہ اقتباسات پیش کر کے یہ بتا سکوں کہ حالیؔ نے کس کس حیلے سے اپنی خفتہ و بے حس قوم کو بیدار کرنے کی تحریک کی اور اُسے علم و ہنر اور دانش و حکمت کے حصول کا شوق دلایا۔ اِس لئے فقط ایک آدھ مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:

کسی نے یہ اِک مردِ دانا سے پوچھا — کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا عقل! جس سے ملے دین و دُنیا — کہا گر نہ ہو اِس سے انسان کو بہرہ
کہا پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے
کہا گر نہ ہو یہ بھی اُس کو میسر — کہا مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر
کہا در ہو یہ بھی اگر بند اُس پہ — کہا اُس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر
وہ ننگِ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

یہ بلیغ تمثیل پیش کرنے کے بعد اُنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو یوں مخاطب کیا:

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو — مبادا کہ وہ ننگِ عالم تمہیں ہو

گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو   تو جلدی سے اُٹھو اور اپنی خبر لو
وگرنہ یہ قول آئیگا راست تم پر
کہ ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر

مسدس کے علاوہ حالی نے اور قومی نظمیں بھی کہیں۔ شکوۂ ہند، مرثیۂ دہلی اور متعدد دوسرے قطعات و رباعیات اِس سلسلے میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

خواجہ حالی کی ایک اور اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے قوم کو مسلمان عورتوں کی کس مپرسی پر متوجہ کیا۔ وہ اِس نکتے کو خوب سمجھتے تھے کہ قوم کی اصلاح کا کوئی منصوبہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ملت کے نصفِ ثانی یعنی عورت کے حال کی اصلاح بھی نہ ہو۔ حالی نے "چُپ کی داد" اور "مناجاتِ بیوہ" لکھ کر مردوں کو عورتوں کی مظلومی اور بے چارگی کا احساس دلایا، اور بڑا کام کیا۔ یہاں یہ بھولنے کی بات نہیں کہ اُس وقت تک ہماری شاعری کے کتنے ایسے موضوعات بالکل اجنبی تھے اور اگر حالی کے معاصرین یا زمانہ مابعد کے شاعروں نے شعر سے اصلاحِ قوم یا احیائے ملت کا کام لیا تو اس میدان میں اُن کا راہبر حالی ہی کا کلام تھا۔

نسبتہً چھوٹے شاعروں کا تو ذکر کیا، خود شاعرِ اعظم اقبال ؒ نے بھی ہند میں احیائے اسلام کیلئے جو عظیم الشان کام کیا اور جسکے تصدق میں قوم حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح ؒ کے ارشادات کو سمجھنے کے قابل بن سکی، وہ بھی شعر و ادب میں دراصل حالی ہی کے شروع کئے ہوئے کام کی تکمیل تھی۔ خود علامہ اقبال کو حالی کی اِس عظمت کا اعتراف تھا اور انہیں کے اِس قطعہ پر میری آج کی گفتگو ختم ہوتی ہے:

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دیدہ بیفسرد   بید دگر اُو را نفس از اشکِ سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود   تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

اچھے شعر کی تعریف

(حالی)

......"ابنِ رشیق کا قول ہے:

فَاِذَا قِیْلَ اَطْمَعَ النَّاسَ طُرًّا   وَاِذَا رِیْمَ اَعْجَزَ الْمُعْجِزِیْنَا

(یعنی جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں، مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جائیں) حق یہ ہے کہ ابنِ رشیق نے جس لطافت اور خوبی سے عمدہ شعر کی تعریف کی ہے اُس سے بہتر تصور میں نہیں آسکتی، گویا جس رُتبے اور پایہ کے شعر کی اُس نے تعریف کی ہے، اُسی رُتبے اور پایہ کا شعر اس کی تعریف میں انشا کیا ہے...... دنیا میں جتنے شاعر اُستاد مانے گئے ہیں یا جن کو اُستاد ماننا چاہیے اُن میں ایک بھی ایسا نہ نکلے گا جس کا تمام کلام اوّل سے آخر تک حُسن و لطافت کے اعلیٰ درجے پر واقع ہوا ہو۔ ...... شاعری کی معراجِ کمال یہ ہے کہ اُس کا عام کلام ہموار اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اُس میں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آئے جس سے شاعر کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ہو جائے۔ البتہ اتنی بات ضروری ہے کہ اس کے عام اشعار بھی خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں جیسا کہ اس کا خاص کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہے۔

حضرتِ کیفی دہلوی

سکون کا ایک لمحہ!

سورج کی پرواز وہی ہے　　چاند کا بھی انداز وہی ہے
چرخ پہ یہ چاند اور سیارے　　نظر آتے ہیں کیا تھکے ہارے؟
اپنی اپنی ڈگر سب جائیں　　بھڑیں نہ آپس میں ٹکرائیں
جو شے ہے وہ ہے حرکت میں　　تار ملے ہیں جوڑ اور گت میں
کاہکشاں مہ و مہر ستارے　　نور کے چشمے اور فوارے
دیکھ رہے ہیں انساں کب سے　　اصل کو اُن کی پر نہیں سمجھے
دُنیا اب بھی وہی ہے جیسی　　روزِ ازل کی اُنشا نے دیکھی

اپنی زمیں بھی ہولے ہولے　　چلی چلتی ہے اپنے رستے

نور سے تاریکی سے گزر کر اتنے پہاڑ اتنے بحر و بر
باغ مہکتے سونے جنگل بہتے دریا گہری دلدل
یہ سب لے کے رواں ہے وہ بھی چال وہی جو اوّل دن تھی
زور سے اٹھنا وہ لہروں کا آندھیوں کا وہ شور مچانا
جم کے کبھی پانی کا برسنا بھاپ کا دم لینے کو ترسنا
فضا کی وہ ہیجانی حالت یہ سب طاقت کی ہے بدولت
ہے اس سے ہی زمیں کی ہستی زیست مرادف ہے حرکت کی
زیرِ زمیں چرخ اور جل تھل میں ہے خلقت ساری ہل چل میں
لیکن اے خالق عالم کے جانتا ہے جو دل میں ہے میرے
ایک ہی ہے بس اس کی تمنا یعنی ایک سکوں کا لمحہ!
تاکہ وہ سمجھے شان کو تیری اور پہنچے پہچان کو تیری

کیفی

امین الرحمٰن

آرٹ میں "تأثریت" کی تحریک

اُردو زبان میں آرٹ کے جدید اور مُتنوّع موضوعات پر بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اِس لحاظ سے مضمونِ ذیل ایک نئی اور قابلِ تقلید کوشش ہے۔ امین الرحمٰن صاحب نے بہ ظاہر ایک خشک اور دقیق علمی موضوع کو اِس خوبی سے پیش کیا ہے کہ وہ دلچسپ و دلاویز بن گیا ہے۔ آیندہ اشاعتوں میں اِس سلسلے کے دو اَور مضامین شائع ہونگے جو "مخزن" کی درخواست پر خاص طور سے لکھے جا رہے ہیں۔

جدید ادب اور آرٹ کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے "تأثریت" کی اصطلاح کا موزوں یا غیر موزوں استعمال ہمارے نقادوں کی تحریروں میں اکثر دکھائی دیتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ اصطلاح بعض ایسے معانی کی حامل بن گئی ہے، جو ادبیات اور آرٹ دونوں کے مسائل پر تنقید کرنے کے لئے استعمال تو ہوتے ہیں لیکن، ان کا مفہوم حسبِ موقع بدل جاتا ہے۔ اسی لئے اِس اصطلاح کے غلط استعمال سے نقاد کا مطلب بڑی حد تک خبط ہو جاتا ہے۔ مثلاً مصوری میں "تأثریت" کی اصطلاح کا جو مفہوم معین ہے، موسیقی میں اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ اسی طرح شاعری اور ناول میں "تأثریت" کی اصطلاح جداگانہ مطلب کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

جدید ادب اور آرٹ کی بیسیوں دیگر اصطلاحوں کے مانند اس اصطلاح کے وضع کرنے کا سہرا بھی مغرب کے نقادوں کے سر پر ہے! ادب اور آرٹ کے مختلف شعبوں میں اس اصطلاح کے جو جداگانہ مفہوم پائے جاتے ہیں وہ بھی مغربی فنِ تنقید کے منت پذیر ہیں، دراصل یہ اصطلاح پہلے پہل فرانس کے ایک اخبار نویس نے وضع کی تھی۔ اُنیسویں صدی کے اواخر میں فرانسیسی مصوروں کا ایک طبقہ فنِ مصوری کی اُن تمام روایتی پابندیوں، اصولوں اور قوانین سے اکتا چکا تھا، جو اُن کے خیال کے مطابق حد سے زیادہ "کلاسیکی" اور "اکادیمیائی" تھے بلکہ یہ لوگ تو مصوری کے "رومانی" سکول کے بھی مخالف تھے حالانکہ وہ خود "کلاسیکی" سکول کی عائد کی ہوئی شدید پابندیوں اور کڑے قوانین کے خلاف بغاوت کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ فرانس کے اِن مصوروں کے ترقی پسند طبقے کے اندر اِن تمام پابندیوں سے انحراف کرنے کے باغیانہ خیالات پرورش پانے لگے یہاں تک کہ فرانسیسی مصور کلود مونے[1] نے اپنی تصویر "تأثرات" میں جس کا موضوع غروبِ آفتاب تھا، اِن تمام روایتی اور رسمی پابندیوں سے علانیہ بغاوت کر کے فنِ مصوری میں ایک نئے اسلوب کی بنا رکھی۔ ظاہر ہے کہ اس تصویر نے پرانے سکول کے مصوروں اور مصوری کے کٹر نقادوں کے حلقے میں ایک شورش بپا کر دی ہوگی۔ چنانچہ اخباروں میں اِس تصویر اور اِس کے بنانے والے کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا: اور اِسی ضمن میں ایک فرانسیسی اخبار نویس نے اِس تصویر پر طنز یہ تنقید کرتے ہوئے "تأثریت" کی اصطلاح وضع کی۔ اُس وقت اُسے کیا معلوم تھا کہ آیندہ چل کر یہی طنزیہ اصطلاح آرٹ اور ادب کی تنقید میں ایک بہت اہم مفہوم کی حامل ہو جائے گی۔

مونے کی اِس تصویر کی نمائش ۱۸۶۳ء میں ایک مخصوص کمرے

[1] CLAUDE MONET

کے اندر کی گئی۔ اِس نمائش میں اور بھی بہت سے ایسے مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں دکھائی گئی تھیں جنہیں اپنی ٹیکنیک کی جدت یا مصوری کے رائج الوقت سکول سے انحراف کرنے کی وجہ سے آرٹ کے کٹر نقادوں کی تعریضی تنقیدوں کا ہدف بننا پڑا تھا اور جن کے آرٹ کے لئے فرانس کی سرکاری اکادمی کے اندر کوئی جگہ نہ تھی، چنانچہ اِس خاص کمرے کا نام جہاں اِن تصویروں کی نمائش کی گئی تھی فرانسیسی زبان میں "سالونڈے ریفیوزے"[لہ] یعنی "رد کئے ہوؤں کا کمرہ" رکھا گیا تھا۔ اِس نمائش کو فرانس کے سرکاری سالون"کے رویّے کے خلاف بغاوت سمجھا گیا اور یہ بات تھی بھی صحیح۔

"تأثریت" کی اصطلاح بعد میں آرٹ کے اُن کڑے قوانین اور اصولوں کے خلاف ردِ عمل کے طور پر استعمال ہونے لگی جو اُنیسویں صدی میں فرانسیسی آرٹ کو جکڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ کلاسیکی اور رومانوی میلانات کے خلاف ایک اچھی خاصی تحریک چل نکلی اور مصوری میں "تأثریت" کے نام سے ایک نئے سکول کی داغ بیل پڑ گئی جس کی ٹیکنیک مصوری کے رائج الوقت اسالیب سے بڑی حد تک مختلف تھی مگر اِس انحراف کے پیچھے صرف قدیم روش سے بغاوت ہی کا جذبہ نہ تھا بلکہ اِس کے پس پردہ چند ایسے اصول کارفرما تھے جنہیں سائنس اور عقلِ سلیم کی تائید حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مصوری کے اِس نئے سکول کو بہت جلد فروغ حاصل ہو گیا۔ اِس سکول کے بانیوں میں معروف اور غیر معروف سبھی قسم کے مصور شامل تھے۔ مشہور مصوروں میں ایڈ ارمانے، کلود مونے، آگستے رینوآ، کیمیئے پسارو اور ایدگار دے گا وغیرہ شامل تھے۔

"تأثریت" کی ابتدا کو نہ تو ایک باضابطہ تحریک اور نہ ایک باقاعدہ سکول کہا جا سکتا ہے۔ اور نہ اِسے انگلستان کے مصوروں کی اُس جماعت کے مشابہ کہا جا سکتا ہے جس کی بنیاد روزیٹی اور میلے وغیرہ نے کچھ نظریے اور اصول وضع کر کے اور ایک باقاعدہ پروگرام کے مطابق ۱۸۶۳ء کے قریب ڈالی تھی۔ "تأثریت" پسندوں نے پہلے پہل نہ تو اپنے وضع کئے ہوئے مصوری کے جدید اصولوں کا کوئی مجموعہ ہی مرتب کیا اور نہ نظریے ہی پیش کئے اور نہ اُن کے سامنے کوئی باقاعدہ مرتب کیا ہُوا پروگرام ہی موجود تھا۔ اِس تحریک کے بانیوں کو آپ مصوروں کا ایک ایسا گروہ سمجھ لیجئے جس کے افراد بعض مخصوص قسم کے حالات کی وجہ سے جو اُنیسویں صدی کے فرانس میں آرٹ اور لٹریچر کے معاملے میں پائے جاتے تھے اپنے فن اور اس کے طریقِ کار کے مشترک مفاد کی خاطر ایک مرکز پر جمع ہو گئے تھے۔

لیکن آخر وہ وجہِ اشتراک کیا تھی جس کی بنا پر اِس قسم کے مصور جیسے مانے اور مونے تھے یا رینوآ اور پسارو ہیں، اور جن کے اپنے اسالیب ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف ہیں ایک مرکز پر جمع ہو گئے؟

اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ مصوری کے کلاسیکی اسکول کے باغی تھے۔ اور اُس کے خلاف اُنھوں نے ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آخر ان کا اپنا فنّی طریقِ کار کیا تھا؟ اور اُن کے مختلف اسالیب میں وہ کون سے مشترک عناصر تھے جن کی وجہ سے یہ تمام مصور ایک مرکز پر جمع ہو گئے؟ اِس بات کا جواب دینے کے لئے ہمیں "تأثریت" کے فنّی پہلو اور اُس کی ٹیکنیک کا تجزیہ کرنا پڑیگا، تاکہ ہمیں ایسے عمومی میلانات اور مشترک عناصر کا سراغ مل سکے جو اِن سب مصوروں کے اسالیب میں کم و بیش موجود ہیں۔

مصوری ایک بصری فن ہے یعنی اِس فن کا تعلق ہماری حسِ بصارت سے ہے۔ ہم خارجی اشیا کے تمام مظاہر آنکھ کے ذریعے سے یا بالفاظِ دیگر حسِ بصارت کی وجہ سے دیکھتے ہیں۔ حسِ بصارت اپنے عمل کے سرانجام دینے کے لئے روشنی کی محتاج ہے۔ روشنی کے ظہور کی تشریح خواہ ہم طبیعیات کے کسی بھی نظریے کے مطابق کیوں نہ کریں، حسِ بصارت اور آنکھ کے فعل کا آپس میں جو تعلق ہے، اُس پر کوئی خاص اثر نہیں پڑیگا۔

[لہ] SALON - de - REFUSES

فنِ مصوری سے حسِ بصارت کا بظاہر اتنا ہی تعلق معلوم ہوتا ہے کہ مصور جن اشیاء یا مظاہرِ قدرت کی تصویریں بناتا ہے، وہ اس کے مشاہدے میں آچکی ہوتی ہیں اور وہ اکثر اوقات تصویر کشی کرتے وقت اپنے بصری حافظے کی مدد لیتا ہے۔ حافظے کے اِس فعل کو جو خارجی اشیاء یا مظاہرِ قدرت کی تصویروں کو اس طرح محفوظ رکھتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر انہیں چشمِ تصور کے سامنے لانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی نفسیات میں بصری حافظہ کہتے ہیں۔

حسِ بصارت کے لحاظ سے ہر خارجی شے یا ظہور کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو اس شے کا قائم بالذات وجود جسے ہم ایک مستقل حقیقت کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً سفیدے کے درخت کا ایک ایسا قائم بالذات وجود ہوتا ہے جو پیپل یا شیشم کے درخت سے مختلف ہے۔ سفیدے کے درخت کے اِس قائم بالذّات وجود کو ہم ایک مستقل حقیقت کہہ سکتے ہیں، یعنی ایک ایسی حقیقت جو ہر جگہ ہر وقت ایک سی رہے گی۔ جب آپ کے سامنے رات کے وقت کوئی سفیدے کے درخت کا نام لیگا تو فوراً اِس درخت کا ایک خاص تصور آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائیگا۔ یہ تصور وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہے۔ خواہ رات ہو یا دن صبح کا وقت ہو یا شام کا سماں ہو، سفیدے کے درخت کا تصور آپ کے لئے یکساں ہی رہے گا۔ لیکن ہر خارجی شے کا حسِ بصارت اور روشنی کے لحاظ سے ایک اَور پہلو بھی ہوتا ہے جو اوّل الذکر پہلو سے مختلف ہوتا ہے۔ اشیاء کی خارجی ہیئت کا یہ پہلو زمان اَور مکان کی اضافیت کے لحاظ سے انہیں وقتی یا ہنگامی ہیئت مستعار دیتا ہے، کسی شے کی ہیئت جن طبیعیاتی امور پر منحصر ہوتی ہے، اُن میں "تأثریت" کے نقطۂ نگاہ سے فاصلے اَور روشنی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً اشیاء کی خارجی ہیئت معین کرنے کے لئے اُن کی سطح کے بیرونی خطوط کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ فاصلے کی کمی و بیشی سے اِن بیرونی خطوط کی ظاہری ہیئت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بعض دفعہ فاصلے کے زیادہ ہونے سے کسی شے کے بیرونی خطوط صاف، واضح یا تیکھے نظر نہیں آتے بلکہ مدھم، دُھندلے اور مبہم سے نظر آتے ہیں یا اسی شے پر دن کے مختلف اوقات میں سورج کی کرنیں اس طرح پڑتی ہیں کہ سایہ اور روشنی کے امتزاج سے اس شے کی ظاہری ہیئت میں ہر لمحہ ایک خاص قسم کا فرق پڑ جاتا ہے۔ جسے ہم اُس شے پر سایہ اور روشنی کا اثر کہہ سکتے ہیں یعنی اس شے کی جو ظاہری ہیئت، سایہ اور روشنی کے لحاظ سے صبح کے وقت ہوگی، وہ شام کے وقت نہیں ہوگی۔ اَور اِسی طرح تاریک یا چاندنی رات میں یہی شے ایک جُدا گانہ ہیئت اختیار کرلے گی۔ اور اگر اسی شے کا مشاہدہ کرتے وقت فاصلے میں بھی کمی و بیشی کر دی جائے تو اس کی ظاہری ہیئت جو آنکھ کو نظر آئے گی اَور بھی مختلف ہوگی۔

تأثریت پسند مصور جب کسی شے کی تصویر بناتا ہے تو وہ اِس شے کو اُس کی مستقل ہیئت میں ظاہر نہیں کرتا، یعنی جس طرح وہ شے فی الواقع اپنا ایک خاص جداگانہ وجود رکھتی ہے۔ بخلاف اِس کے وہ اُسے یوں دکھاتا ہے جیسے وہ اُس خاص وقت میں اپنی خارجی ہیئت کے نقوش خود اُس کے پردۂ بصارت پر پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ تصویر کشی کے وقت ایسا مصور اُس شے کی خارجی ہیئت کے صرف ان بصری تأثرات ہی کو رنگ اَور خطوط، روشنی اور سائے کے ذریعے سے ظاہر کریگا۔

خارجی اشیاء کی مستقل ہیئت پر روشنی جو اثر ڈالتی ہے اور ہر لمحہ انہیں جو "ہنگامی ہیئت" مستعار دیتی ہے اُس کے تأثرات کو دکھانے کے لئے مونے نے تصویروں کا وہ مشہور سلسلہ بنایا جس کا عنوان "گھاس کے گٹھے" ہے۔ تصویروں کے اِس سلسلے میں مونے نے یہ دکھایا ہے کہ کھیت میں پڑے ہوئے، گھاس کے گٹھوں کی

ہیئت دن کے مختلف اوقات میں روشنی کی کمی و بیشی سے کیا ہوتی رہتی ہے۔

اِس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ "تأثریت" کی ٹیکنیک میں روشنی کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ روشنی کی ماہیت کو بیان کرنے کے لئے ماہرین طبیعیات نے کچھ نظریات پیش کئے ہیں جن میں سے ایک نظریہ روشنی کو "متموّج حرکت" تسلیم کرتا ہے۔ اِس متموّج حرکت ہی کے متعلق جو روشنی کی صورت میں دنیا کی خارجی اشیاء کی ہیئت پر بہت اہم اثرات ڈالتی ہے۔ "تأثریت" پسندوں نے کچھ اُصول بھی وضع کئے تھے پچھلی صدی میں جرمن سائنس دان ہیلم ہولٹس اور فرانسیسی ماہر طبیعیات شیورو نے آواز اور روشنی کی ماہیت معلوم کرنے کے بارے میں جو ریسرچ کی تھی اتفاق سے اس کے بعض نتائج تأثریت پسندوں کے خیالات اور اصولوں سے ہم آہنگ ہو گئے اور تأثریت پسندوں کی ٹیکنیک جسے "تقسیمیت" یا "تموّجیت" کہتے ہیں روشنی کے امواجی نظریے سے بہت متأثر ہوئی۔

"تقسیمیت" یا "تموّجیت" کے مفہوم کو سمجھنے کیلئے آپ کو رنگوں کی طبیعیاتی ماہیت سے واقف ہونا چاہیئے۔ اُنیسویں صدی میں جو فی الحقیقت ایک سائنٹفک صدی تھی، ہر شے کو خالص سائنٹفک نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ مصوری اور رنگوں میں جو تعلق ہے اُس پر بھی طبیعیاتی نقطۂ نظر سے غور ہونے لگا۔ فرانسیسی سائنس دان شیورو نے رنگوں کی ماہیت پر جو عالمانہ کتاب لکھی تھی اُس سے مصوروں کو رنگوں کی اصل ماہیت کے متعلق بہت کچھ معلوم ہُوا۔ صدیوں سے مصور اپنے فن کی جمالیات میں اِس قدر محو رہتے چلے آئے تھے کہ رنگوں کی ماہیت پر کچھ سوچنا انہیں بالکل بیکار سی بات معلوم ہوتی ہوگی۔ انیسویں صدی میں انہیں پہلی بار یہ معلوم ہُوا کہ رنگوں کا معاملہ کوئی معمولی معاملہ نہیں یہ ایک نہایت پیچیدہ معاملہ ہے۔ رنگوں کے اِس طبیعیاتی مطالعہ نے مصوری کی ٹیکنیک پر بہت اثر ڈالا۔ یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ صدیوں سے مصوری میں تین بنیادی رنگ استعمال ہوتے چلے آئے ہیں۔ سرخ، نیلا اور زرد۔ لیکن اب پہلی دفعہ سائنس کی بدولت مصوروں کو یہ معلوم ہُوا کہ مصوری میں جو رنگ و روغن استعمال ہوتے ہیں ان میں تو ان تین رنگوں کی حیثیت بنیادی ہو سکتی ہے۔ لیکن روشنی کی ماہیت میں جو دراصل سات رنگوں سے مرکب ہے۔ اِن کی حیثیت بنیادی نہیں۔

رنگوں کی ماہیت کے متعلق یہ انکشافات تأثریت پسندوں کے بہت مفید مطلب ثابت ہوئے اور اُنھوں نے ان کی بناء پر مصوری کی ٹیکنیک میں ایک نئے طریق کار کا اضافہ کیا۔ "تقسیمیت" اِسی نئے طریق کار کا ایک نام ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ مصوری میں پہلے جو رنگ مرکب صورت میں استعمال کئے جاتے تھے، اب اُن کا استعمال اُن کے بنیادی رنگوں میں تجزیہ کے بعد ہونے لگا۔

تأثریت کی ٹیکنیک میں خالص رنگوں اور اشیاء کے رنگوں کو جس لحاظ سے اہمیت دی جاتی ہے۔ اُسے کس حد تک سائنٹیفک کہا جا سکتا ہے۔ آنکھ کے پردے پر رنگوں کے تأثرات مختلف وقتوں میں اور مختلف فاصلوں سے بالکل جداگانہ نوعیت اختیار کر جاتے ہیں۔ سبز پتے ایک خاص فاصلے سے بعض اوقات نیلگوں دکھائی دیتے ہیں۔ سائے سیاہ، بھورے یا مٹیالے نظر نہیں آتے بلکہ اپنے اردگرد کی اشیاء کے رنگوں سے بہت متأثر ہوتے ہیں۔ "تأثریت" کی ٹیکنیک میں پس پردہ جو اصول کارفرما ہیں وہ یہ ہیں کہ کسی رنگ کا اپنا کوئی جداگانہ یا قائم بالذات وجود نہیں ہے، بلکہ وہ صرف کسی شے کی ہیئت پر روشنی کے خاص اثر کی کیفیت ہے یہاں تک کہ "تأثریت" کی ٹیکنیک میں سایوں کو روشنی کی عدم موجودگی یا نفی نہیں کہا جاتا، بلکہ انہیں روشنی ہی کی ایک ایسی تبدیل شدہ ہیئت سمجھا جاتا ہے جس میں روشنی کا بہت کم دخل ہو۔

تأثریت پسند مصوروں نے مصوری میں رنگوں کے استعمال کے متعلق بہت سے نئے اُصول وضع کئے، اور تجربے بھی کئے۔ خاص طور پر

مختلف رنگوں کی آمیزش کے متعلق اُن کے تجربوں سے بہت سے دلچسپ نتائج نکلے۔ "تأثریت پسند" مصور رنگوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے بجائے اُن کے جداگانہ اثرات کے زیادہ قائل ہیں۔ مثلاً اگر نیلے اور زرد رنگ کو ملا دیا جائے تو سبز رنگ بن جاتا ہے۔ اسی طرح سبز رنگ کا تأثر پیدا کرنے کے لئے تصویر میں زرد اور نیلے رنگ کے چھینٹے پاس پاس ڈال دینے سے وہ تأثر پیدا ہو جاتا ہے، جس سے آنکھ کو دُور سے اِن چھینٹوں کا اثر سبز رنگ ہی کا سا دکھائی دیگا۔ اسی طریق کار کا نام "تقسیمیت" ہے۔ اسی طرح بھُورے چمکیلے رنگ کا تأثر پیدا کرنے کے لئے تأثریت پسند مصور سبز، سرخ اور زرد رنگوں کے ہلکے ہلکے چھینٹے پاس پاس ڈال دیتے ہیں، اِس سے کینوس پر رنگوں کا ایک کپکپاتا ہوا تموّج پیدا ہو جاتا ہے جس کی چمک دمک خالص بھُورے رنگ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔

عام طور پر مصور کاغذ یا کینوس پر برش سے رنگ کرتے ہیں، اور رنگ بھرنے کے اِس فعل میں وہ رنگ و روغن کو لیپ کی صورت میں استعمال کرتے ہیں لیکن چونکہ تأثریت پسند مصور رنگوں کو عام طور پر لیپ کی صورت میں کینوس پر نہیں پھیلاتے بلکہ اُنہیں نقطوں یا چھوٹے چھوٹے چھینٹوں کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں اس لئے اِس ٹیکنیک کا ایک اور نام "تنقیط" پڑ گیا۔ تأثریت پسندوں کی ٹیکنیک کو کئی اور نام بھی دیئے گئے ہیں۔ اُن میں سے ہر نام اِس ٹیکنیک کی کسی نہ کسی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً اِسے "تنویریت" کا نام بھی دیا گیا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اِس ٹیکنیک میں رنگوں کو اِس طور سے استعمال کیا جاتا ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ چمک دمک پیدا ہو سکے تاکہ اُنہیں روشنی کے رنگ سے زیادہ سے زیادہ مطابق بنا کر اصل چمک دمک برقرار رکھی جا سکے اور روشنی کا قدرتی تموّج پیدا کیا جا سکے۔

مَیں نے اب تک "تأثریت" کی ٹیکنیک کو صرف روشنی اور رنگوں کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ روشنی اور رنگوں کے علاوہ تأثریت کی ٹیکنیک کی اساس ایک اور اہم اُصول پر بھی ہے۔ اگر آپ نے کبھی مصوری کے ماقبل رفائیلی سکول کے کسی مصور مثلاً روزیٹی، ہیرٹ ہنٹ وغیرہ کی تصویریں دیکھی ہیں تو آپ کو وہ تصویریں ڈرائنگ اور ترکیب کی تفاصیل سے بھر پُور نظر آئیں گی۔ چہرے کے خال و خد کی تفاصیل، لباس کی شکنوں اور چُنٹوں کی تفاصیل، پھول پتوں کی تفاصیل، تعمیری آرائش کی تفاصیل، مختصر یہ کہ اِن تصویروں میں آپ کو تصویر کے ہر جُزو کی تفاصیل ملیں گی۔ اِسے دُوسرے لفظوں میں یُوں کہا جا سکتا ہے کہ ماقبل رفائیلی سکول کے مصور اپنی تصویریں بناتے وقت تصویر کے ہر جُزو پر پُوری پُوری توجہ مرکوز رکھتے تھے، یعنی اگر کسی تصویر کا ان بنیادی اجزا میں تجزیہ کیا جائے جن سے وہ مرکب ہے تو یہ پتہ چلے گا کہ مصور نے تصویر بناتے وقت تصویر کے ہر جُزو کو ایک علیحدہ نقطۂ ماسکہ سے دیکھا ہے جبھی تصویر کا ہر جُزو تفاصیل کے معاملے میں اِس قدر بھر پُور ہے۔ لیکن اگر آپ اِس مسئلے کو آنکھ کی فزیالوجی یا بصارت کے نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت جب آپ کسی ایک چیز یا چند چیزوں یا کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو اُس ایک لمحے میں آپ کی توجہ اُس شے کے کسی ایک خاص حصے ہی پر مرکوز ہوتی ہے اور اُس شے کے باقی حصے آپ کی توجہ کے اعتبار سے "کم مرکوز" ہوتے ہیں۔ اُس وقت اُس شے کے باقی حصوں کے متعلق آپ کے ذہن میں دُھندلا سا تصور تو ضرور ہوتا ہے مگر کوئی واضح تصور نہیں ہوتا۔ اور آپ محض نفسیاتی طور سے ایک "جُزو" سے "کُل" کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے اور نفسیات کے طالب علم اِس حقیقت کو نفسیات کے نصاب میں "توجہ" کے باب میں مطالعہ کرتے ہیں۔ اِس نفسیاتی حقیقت نے مصوری میں ایک نئے اُصول کے قائم کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ تأثریت کی ٹیکنیک روشنی کے علاوہ جس اصول پر رکھی

گئی ہے وہ یہی ہے۔ اور تأثریت کی ٹیکنیک کا تجزیہ کرتے ہوئے اِس بات کو ہم یوں بیان کرتے ہیں کہ تأثریت پسند مصور اپنی تصویر میں صرف ایک ہی نقطۂ ماسکہ رکھتے ہیں اور اسی ماسکہ کے حوالے سے تصویر کے باقی اجزا کی تفاصیل کو ظاہر کرتے ہیں، خواہ وہ زیادہ ہوں یا کم، دُھندلی ہوں یا واضح۔

یہی وجہ ہے کہ تأثریت پسندوں کے یہاں تصویر کی ترکیب، ڈرائنگ اور ڈیزائن میں بظاہر کوئی ہم آہنگی نظر نہیں آتی۔

تأثریت پسندی میں اشیا کی ظاہری سطوح کی ہیئت ظاہر کرنے میں ڈیزائن کی چنداں پروا نہیں کی جاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تأثریت پسند مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں ڈیزائن کے لحاظ سے بظاہر مہمل نظر ہوتی ہیں اور یہ بات مصوری کے اُن کٹر نقادوں کو بہت ہی کھٹکتی ہے جو ڈیزائن کو تصویر کا ایک جزو لاینفک سمجھتے ہیں تأثریت پسندی کے بارے میں خواہ کٹر نقادوں کے خیالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں اِس میں کسی کو انکار کی گنجائش نہیں کہ تأثریت کی تحریک نے بہت جلد اپنی ہمعصر مصوری کو اپنے سیدھے سادھے اصولوں اور ٹیکنیک کی سائنٹیفک خوبیوں کے لحاظ سے بہت کچھ متأثر کر لیا تھا کیونکہ دنیا کے بعض بہترین مصوروں نے جنہیں قدرت نے مصوری کا ذوقِ سلیم اور بصیرت ودیعت کی ہے اپنے فن کا کمال تأثریت کی ٹیکنیک ہی کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے۔ مونے نے تو خیر اِس جمالیاتی تحریک کی رہنمائی کی ہی تھی لیکن مانے، رینوا، پسارو اور دیگا بھی اِس نئی تحریک کی جڑیں مضبوط کرنے میں اس سے پیچھے نہیں رہے۔

عام طور پر مونے تأثریت کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے لیکن اِس سلسلے میں کسی حد تک مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ مشہور مصور واتو، کارواں اور ٹرنر کے طریقِ کار کو ہم بڑی آسانی سے تأثریت کی ابتدائی ٹیکنیک کہہ سکتے ہیں اور اسے تقسیمیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور مونے اِن مصوروں کے طریقِ کار سے اُسی طرح متأثر ہوا تھا جس طرح اُس سے ایک نسل پہلے دیلاکروے کانسٹبل کی ٹیکنیک سے متأثر ہو چکا تھا۔ اِس کی تائید کئی باتوں سے ہوتی ہے خاص کر اِس بات سے کہ مونے کو کئی بار آرٹ کے مطالعے کے سلسلے میں انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تھا اور وہاں وہ کافی عرصے کے لئے ٹھہرا کرتا تھا۔ ظاہر ہے اِن حالات میں اُسے ٹرنر کے فن اور اُس کے طریقِ کار سے متأثر ہونے کے براہِ راست بہت سے مواقع پیش آئے ہونگے اگرچہ اِس میں کوئی شک نہیں کہ مونے نے اپنی فطری اُپج سے بہت زیادہ کام لیا ہے۔

بظاہر تأثریت چند مصوروں کے گروہ کے ایک خاص طریقِ کار کا نام ہے لیکن فی الواقع مصوری کے شعبے میں یہ تحریک اُس بڑی تحریک کا ایک جزو تھی جو انیسویں صدی میں فرانس کے تمام آرٹ اور ادب کو روحِ عصر کے تقاضے کی بنا پر آہستہ آہستہ متأثر کر رہی تھی اور جب ہم مونے یا مانے، رینوا یا دیگا کا نام اِس سلسلے میں لیتے ہیں تو ساتھ ہی ہمیں زولا اور فلوبیئر کے نام بھی یاد آ جاتے ہیں جو اسی تحریک کے زیرِ اثر ادب کی دنیا میں تأثریت کی بنیاد ڈال رہے تھے!

اصطلاحیں جو اِس مضمون میں استعمال ہوئیں:-

تأثریت	IMPRESSIONISM		
تأثرات	IMPRESSIONS		
ہنگامی ہیئت	TRANSITORY FORM		
متموج حرکت	UNDULATORY MOTION		
تقسیمیت	DIVISIONISM	تموجیت	VIBRISM
روشنی کا امواجی نظریہ	UNDULATRY THEORY OF LIGHT		
تنقیط	POINTILLISM	تنویریت	LUMINISM
ترکیب	COMPOSITION	ماسکہ	FOCUS

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

دِل یہ کبھی تو ——

اشک بہا کے کیوں کہوں جو ہے سو بے ثبات ہے
ذوقِ تغیرات میں تازگیٔ حیات ہے

جامۂ زندگی کا رنگ تازہ بتازہ نو بنو
حسنِ رُخِ حیات ہے عظمتِ کائنات ہے

لمحہ بہ لمحہ شانِ نو ملتی ہے سب کو جانِ نو
نے یہ فنا کی دستبرد نے یہ اجل کی گھات ہے

شمس و قمر ہیں جامہ زیب اخترِ چرخ دلفریب
حسن کی کارگاہ ہے جلوہ گہِ صفات ہے

نقطۂ تیز سیر سے بن گئے دائرے یہاں
لاکھ طرح ہوئی بیاں اصل میں ایک بات ہے

دل میں نظر فروز ہیں کثرتِ غم کی ظلمتیں
اتنی ہے تابشِ نجوم جتنی اندھیری رات ہے

شغل مرا صنم گری اور کبھی حرم گری
دل یہ کبھی تو کعبہ ہے اور کبھی سومنات ہے

شیر محمد اختر

دیومالا کا نفسیاتی پس منظر

دنیا کے قدیم ادب کا معتد بہ حصہ دیومالا (صنمیات) کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ آجکل اِس ادبی خزانے کو کریدنے کے لئے بہت محنت اور جانفشانی سے کام لیا گیا ہے۔ یورپ کے بہت سے محققین اِس سلسلے میں مفید کام کر چکے ہیں۔ اور انہوں نے تمام دنیا کے صنمیات کو اکٹھا کر کے مزید تحقیقات کرنے والوں کے لئے آسانیاں بہم پہنچا دی ہیں

بعض لوگ جنہوں نے دیومالا کا مطالعہ شاید علمی تحقیق کے نقطۂ نظر سے نہیں کیا وہ اس ادبی خزانے کو خرافات کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ انجمن ترقی اُردو کی انگریزی اُردو ڈکشنری میں MYTHOLOGY کا اردو ترجمہ جہاں علم الاساطیر، علم الاصنام، "دیومالا" لکھا ہے وہیں "خرافات" بھی موجود ہے۔ لیکن مائی تھالوجی کو خرافات سمجھنا ادب کے ایک بھرپور خزانے کو ضائع کرنا ہے۔

دیومالا کو تنگ نظری سے دیکھنے والے عموماً اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جس زمانے میں دیومالا کہی یا لکھی جاتی رہی ہے، وہ انسان کے بچپن کا زمانہ تھا۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ اپنے تخیل سے زیادہ کام لیتا ہے۔ نت نئی کہانیاں ایجاد کرتا ہے۔ اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے گرد و نواح کی بے جان چیزیں اس کے لئے جان دار ہو جاتی ہیں۔ درخت بولتے ہیں۔ کرسی میز باتیں کرتی ہیں۔ گڈے گڑیا زبان رکھتے ہیں۔ پالتو جانور خصوصاً کتا بلی انسانوں کی طرح دل کی بات کہتے ہیں۔ لیکن کیا بچے کے اِس تخیل کو خرافات کہا جائے گا؟ یہ تو بچے کی ذہنی نشو و نما کی ایک منزل ہے

آج اِس زمانے میں بھی بچہ جب چاند دیکھتا ہے۔ تو "چندا ماموں" پکار اُٹھتا ہے۔ اُسے چاند میں ایک بڑھیا چرخہ کاتتی دکھائی دیتی ہے۔ عیسائی بچوں کے دل میں "کرسمس بابا" کا تصور ہے۔ "اقلیم خواب" ایک الگ دنیا سمجھی جاتی ہے۔ یہ اور ایسی بے شمار باتیں جو کہانیوں اور بچوں کی لوریوں میں پائی جاتی ہیں۔ ویسی ہی ہیں جیسی انسانی ذہن نے اپنے بچپن میں ہزاروں برس پہلے سوچیں اور جو اب تک دنیا کے ادبیات کا جزو ہیں۔

تاریخ کے اُس دَور میں جب دیومالا معرض وجود میں آتی رہی، ذہنِ انسانی نے ایک خاص ڈھنگ سے سوچا اور اس وقت کے سماجی رسوم و قیود کے مطابق اپنا اظہار کیا چنانچہ یہ قصے اس وقت کے سوچ بچار اور محسوسات کی آوازیں ہیں۔ ادب زندگی کا پرتو اور ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ صنمیات میں اگر محیر العقول باتیں پائی جاتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں عقل و استدلال کے مقابلے میں تخیل زیادہ کام کرتا تھا۔

مہذب انسان کا دعویٰ ہے کہ وہ علم و فضل میں بہت ترقی کر چکا ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ابھی بہت سے اسرارِ فطرت مثلاً پیدائش، موت، کائنات کی حقیقت وغیرہ سمجھے نہیں جا سکے۔ فلسفہ اور سائنس دونوں اِس میں ناکام رہے ہیں۔ پُرانے زمانے کے انسان کو بھی انہیں حقائق کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اُس نے بھی اُن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس زمانے کا ذہن ترقی یافتہ نہ تھا۔ اِس لئے جب وہ حقائق کی تہ تک نہ پہنچ سکا تو اُس نے فوراً تخیل کی مدد سے اُنہیں مافوق الفطرت تاویلوں کا رنگ دے دیا۔

علم الاساطیر کے ذریعے سے جب اِس سارے ادبی ذخیرے کا بغور مطالعہ کیا جاتا ہے تو بہت سی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ اِس ادب میں ایک طرف تو انسان کے اندیشوں، اُمیدوں اَور جبّیات کی گہرائیوں کا اظہار ہے اور دوسری طرف انہیں سماجی نظام اَور عادات سے مطابقت دینے کی کوشش نظر آتی ہے یہ دونوں پہلو باہم اِس قدر مخلوط ہیں کہ اِن کی یکجائی سے انسانی ذہن کے ارتقا کا مطالعہ بہ آسانی ہو سکتا ہے اَور یہ حقیقت کھلتی ہے کہ انسان کس ابتدائی منزل سے ترقی کرتا ہوا موجودہ ضابطہ پرستی تک پہنچا ہے۔

چونکہ کائنات میں ایک بے رُخ کُل کا سائل پایا جاتا ہے اِس لئے انسان غیر مطمئن رہتا ہے۔ اِس بے اطمینانی کا علاج بھی اُس نے خود ہی تجویز کر لیا ہے یعنی وہ اِس میکانکی "دنیا" میں اپنی ایک ایسی الگ دنیا کی تشکیل کر لیتا ہے جہاں اُسے من مانی مسرتیں میسر آتی ہیں اَور وہ حقیقت کی تلخی سے نکل جاتا ہے۔ یہ دنیا چونکہ اِس کی اپنی تخلیق ہوتی ہے اِس لئے اِس میں "انسانی پہلو" زیادہ ہوتا ہے۔ اِسی حقیقت کو ایک مفکر نے یوں بیان کیا ہے کہ "صنمیات میں انسان نے کائنات کو انسانی اصطلاحات میں ڈھال لیا ہے"۔

دیومالا ایسا افسانوی ادب ہے جو مافوق الفطرت دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اَور جس میں مذہب کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں بھی موت کے بعد ایک آنے والی زندگی کا عقیدہ موجود تھا۔ یہ زندگی مافوق الفطرت ہے اِس لئے جب افسانہ مذہبی رنگ میں رنگا گیا تو تخیل کے رہوار نے محدود سے نکل کر لامحدود کا رُخ کیا اَور اپنی جولانیٔ طبع کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اِس سرزمین میں کائنات کی پیدائش کے تصورات اَور فوق الفطرت نظریات آسانی سے پنپتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیومالا میں حیوان بھی انسان کی سی زندگی بسر کرتے رہے ہیں اَور بعد میں یہی جانور کنبوں کے آباؤ اجداد کے قائم مقام بنکر توتم[1] قرار پا گئے۔

یونانی صنمیات دنیا بھر کی صنمیات سے زیادہ بھرپور ہیں۔ اِن میں قدرت کی مختلف طاقتوں نیز کائنات کی تخلیق کا ذکر ہے۔ ہر طاقت جو انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے ایک دیوتا یا دیوی قرار دی گئی ہے جس کا کردار اُس طاقت کی خصوصیات ہی کے مطابق ہوتا ہے۔ سورج "اپالو" دیوتا ہے۔ روشنی صحت بخش ہوتی ہے اور شگفتگی کا موجب۔ اِس لئے صنمیات میں اپالو جہاں آگ کے رتھ پر سوار نظر آتا ہے وہیں اس کی دوسری صفات یعنی شفا بخشی اور محبت بھی نظر انداز نہیں کی گئی۔ ارتامیس دیوی چاند ہے۔ اس کی پُرسکون روشنی نے اسے "جنگلی جانوروں" اور کنواریوں "پاکیزگی" کا محافظ بنا دیا ہے۔ اسی طرح اِس دیومالا میں دیوتاؤں کا ایک مندر پن تھی ان ہے جس میں سولہ دیوی دیوتا رہتے تھے جو موسموں کے تغیر، دن رات اور دوسرے قدرتی مظاہر کی نمایندگی کرتے تھے۔

مختلف قوموں کے اِس ادبی ذخیرے کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ثقافتوں میں تکمیلِ آرزو کی صورتیں مختلف رہی ہیں اور یہ وہ ہمہ گیر طور پر خواہش اور ارادے کی خیالی تکمیل کا پرتو ہوتی ہے۔ اَور یہ تکمیل انسانوں کے ذریعے سے نہیں بلکہ دیوتاؤں کے ذریعے سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ کائنات کی تخلیق کی داستانیں، دیوتاؤں اَور سُورماؤں کی کہانیاں سب اِسی تکمیل کی صورتیں ہیں۔ ان کا ایک حصہ دیوتاؤں کو حسین، بہادر اَور دانا ظاہر کرتا ہے اَور یہ وہ خصوصیات ہیں جنہیں ہم خود پسند کرتے اَور اپناتے ہیں۔ مگر دوسرا حصہ وہ ہے جہاں اخلاق کا پہرہ دار کڑی نگرانی رکھتا ہے اَور جسے خرافات کہا جاتا ہے۔

دیوتا کے بعد اِس افسانوی ادب میں سورما کا کردار نظر آتا ہے جسے قومی طور پر سرفراز کیا جاتا ہے۔ یہ بھی محیر العقول کارنامے سرانجام دیتا ہے۔ ہمت، جرأت، شرافت اَور ایسی تمام مردانہ خصوصیات اِس میں موجود ہوتی ہیں۔ دنیا کی اعلیٰ شاعری میں یہ سورما دیوتاؤں کا سا مقام پاتے ہیں۔

سائنس نے ادب پر گہرا اثر کیا ہے اور بہت سی پرانی باتیں نئی شکل میں جا کر نیا روپ حاصل کر چکی ہیں۔ یہ سارا ادب ذہن کی پیداوار ہے اس لئے نفسیات نے، جو ایک سائنس ہے، اس کا تجزیاتی مطالعہ شروع کر دیا ہے اور اس ذریعے سے ہم اس پرانے زمانے کے ذہن کو بخوبی سمجھنے کے قابل ہو رہے ہیں اور ہمیں اس زمانے اور اپنے زمانے کے ذہن میں ایک تعلق نظر آتا ہے۔ نئی نفسیات کے علم بردار جن میں فرائڈ کا مکتب تحلیلِ نفسی، پیش پیش ہے، ابھی لوگ زیادہ کام نہیں کر سکے لیکن انہوں نے ایک راہ ضرور نکالی ہے جس پر گامزن ہو کر تحقیقات جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اس دبستان نے جو تحقیقات کی ہے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

یونانی صنمیات کا ایک قصہ یوں ہے کہ "نرگس" دریا کے دیوتا سی فی سسس اور جل پری لی رائے اوپ کا بیٹا تھا۔ ٹی ری سسس نے جل پری کو بتایا کہ اس کا بیٹا ایک عرصہ دراز تک زندہ رہ سکے گا بشرطیکہ وہ اپنا چہرہ نہ دیکھے۔ اس حسین لڑکے پر جل پری گونج[ـه] فدا ہو گئی لیکن نرگس نے اس سے اور اپنے دوسرے عاشق امونیاس سے بے رخی برتی۔ ان کی محبت کو ٹھکرایا اور دیوتاؤں کا غضب مول لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن اس نے ایک چشمے میں اپنا عکس دیکھا اور اس پر اس قدر فریفتہ ہو گیا کہ عکس کو پکڑنے کی کوشش میں ڈوب مرا۔ جہاں وہ ڈوبا تھا وہیں ایک پھول نمودار ہوا جس کا نام اس لڑکے کے نام پر نرگس رکھا گیا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض ملکوں میں اپنا عکس دیکھنا اب تک منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یونان میں بھی ابھی یہ توہم باقی ہے۔

تحلیلِ نفسی کی تحقیقات بتاتی ہے کہ بچے کی جنسی زندگی میں ایک ایسا دور بھی آتا ہے جب وہ اپنے ہی جسم سے محبت کر کے تسکین پاتا ہے۔ یہ محبت اُسے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ جوان ہو کر جب کسی کو اپنے ماحول سے وہ محبت میسر نہ آئے جو اس کی تسکین کا موجب ہو تو وہ بچپن کے اُسی دور میں واپس چلا جاتا ہے جہاں اُسے اپنے وجود سے محبت میں تسکین ملا کرتی تھی۔ اس حالت کا نام "نرگسیت" رکھا گیا ہے۔ یہ ایک ذہنی الجھن ہوتی ہے۔ جو لوگ اس الجھن میں مبتلا ہوتے ہیں وہ بہت ذکی الحس ہو جاتے ہیں، اور اپنی ساری توجہ کو اپنی ذات پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ بناؤ سنگار کرتے رہتے ہیں۔ آئینہ ان کا جزوِ زندگی بن جاتا ہے۔ شاعروں میں یہ الجھن زیادہ پائی جاتی ہے۔ یوں یہ قصہ جو انسانی ذہن کی پیداوار ہے تحلیلِ نفسی کے متعلق میں ایک نئے معنی کا حامل بن گیا ہے۔

یونان کے مشہور شاعر ہومر نے (جس کا زمانہ ۱۲-- ق م اور ۸۵۰ ق م کے درمیان کہا جاتا ہے) ایڈی پس بادشاہ کا ایک قصہ لکھا ہے۔ اس پر یونان کے مشہور ڈرامہ نویس سفاکلیز (پیدائش ۴۹۵ ق م) نے ایک ڈراما "شاہ ایڈی پس" کے نام سے رقم کیا ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ کچھ یوں ہے:-

" قدیم یونان کی ریاست تھی بز[ـه] کے ایک بادشاہ لیوس کو استخارے کے جواب میں یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوگا۔ یہ معلوم کر کے اُسے سخت الجھن ہوئی اور جب اُس کی بیوی جوکاسٹا کے بیٹا پیدا ہوا تو اُس نے اپنے مقدر سے بچنے کے لئے بچے کے دونوں پاؤں برمے سے ملا کر باندھا اور اُس ہونے والے قاتل کو کوہ سِتھیرون پر ڈلوا دیا۔ اتفاقاً ایک چرواہا اُدھر سے گزرا۔ اُس نے بچے کو یوں پڑا دیکھ کر اُٹھا لیا اور اسے کورنتھ کے قصرِ شاہی میں پہنچا دیا۔ بچے کے پاؤں چونکہ سوجے ہوئے تھے اس نسبت سے اس کا نام ایڈی پس[ـه] رکھا گیا۔ بچہ شاہی محلات میں پلتا رہا لیکن جب وہ جوان ہوا تو ایک دن کسی کورنتھی نے اسکی نجابت اور حسب نسب کے متعلق کچھ شکوک ظاہر کئے جن سے برانگیختہ اور دل گرفتہ ہو کر وہ دارالاستخارہ میں پہنچا تاکہ اس بارے میں دیوتاؤں سے استصواب کرے۔ استخارے کے جواب میں اُسے اطلاع ملی کہ وہ اپنے باپ کو قتل کر کے اپنی ماں سے بیاہ کریگا۔ وہ شاہ کورنتھ پولی بس کو اپنا باپ اور ملکہ کو اپنی ماں سمجھتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ باپ کے خون میں ہاتھ رنگے اور ماں کا خاوند بنے، چنانچہ اُس نے کورنتھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور تھی بز کو چل نکلا راستے میں

OEUIPUS ـه THEBES ـه ECHO ـه

اُسے ایک رتھ ملا۔ رتھبان نے گستاخی سے ایڈی پس سے راستہ چھوڑنے کو کہا۔ اِس پر اُسے غصہ آگیا اَور اُس نے رتھبان اَور رتھ کے سوار دونوں کو مار ڈالا۔ اِس کے بعد وہ شہر تھی بز کے قریب آیا جہاں ایک عجیب الخلقت مخلوق رہتی تھی۔ اُس کا سر عورت کا اَور دھڑ شیر ببر کا اَور وہ دلیر تھے۔ وہ ایک چٹان پر بیٹھی ہر راہ گیر سے ایک سوال کرتی۔ جو جواب نہ دے سکتا اُسے کھا جاتی۔ ایڈی پس نے اس کے معمے کو حل کر کے اُسے قتل کر دیا۔

تھی بز والوں کو جب یہ معلوم ہُوا کہ اُن کا بادشاہ کسی نامعلوم شخص کے ہاتھوں مارا گیا تو اُنھوں نے طے کیا کہ جو شخص اُنہیں اس دیونی سے نجات دلائے گا وہ اُسے اپنا بادشاہ بنا لیں گے۔ یوں ایڈی پس کو تاج شاہی اَور بیوہ ملکہ دونوں میسر آئے۔ زندگی نہایت امن اور سکون سے بسر ہو رہی تھی کہ ریاست تھی بز میں طاعون پھوٹ پڑا اور کم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ایڈی پس نے دارالاستخارہ سے رجوع کیا اور اُسے جواب ملا کہ جب تک مقتول بادشاہ لیوس کا قاتل ملک بدر نہ ہوگا لوگوں کو طاعون سے نجات نہ ہوگی۔

یہ ڈراما جب نقطہ عروج کو پہنچتا ہے تو سارا راز افشا ہو جاتا ہے۔ یہ جرم ایڈی پس سے جانے بُوجھے بغیر سرزد ہو گیا مگر وہ اپنے آپ کو سزا دینے کی خاطر اپنی آنکھیں پھوڑ کر ملک بدر ہو گیا اور دیوتاؤں کی پیشگوئی پوری ہوئی۔

جب اِس قصے کا تجزیاتی طور پر مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "یہ قسمت کا المیہ ہے جس میں دو گونہ کشمکش نظر آتی ہے۔ ایک طرف دیوتاؤں کی مرضی و منشا ہے اور دوسری طرف انسان کی تگ و دو جو اُس سے بچنا چاہتا ہے۔" ڈرامہ نویس نے بتایا ہے کہ انسان تقدیر کے سامنے بے بس اَور بے مقدور ہے۔ یہ المیہ پڑھ کر ہم پر دو طرح کا اثر ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ہم قسمت کے فیصلے کی تائید کرتے ہیں اَور دوسری طرف ایڈی پس کی حالت پر رحم کھاتے ہیں کیونکہ وہ بے بس تھا۔

روزمرہ زندگی کو جب بغور دیکھا گیا ہے تو ہمیں یہ ڈراما کھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ بچپن میں ہماری توجہ سب سے پہلے ماں کی طرف ہوتی ہے اور نافرمانی اور نفرت کا اظہار باپ کی جانب۔ ہمارے خواب بھی اِسی ڈرامے کے مناظر ہوتے ہیں۔ فرائڈ نے اِس ڈرامے کی توضیح یوں کی ہے کہ "شاہ ایڈی پس کا سارا قصہ جس نے باپ کو قتل کر کے ماں سے شادی کی محض ہمارے بچپن کی آرزو کی تکمیل ہے اَور بس۔" اسکی تائید خود ڈراما نگار کے الفاظ سے ہوتی ہے۔ یہ قصہ صدیوں سے چلا آتا ہے اَور اِس میں کوئی کلام نہیں کہ اسکی بنیاد خوابوں پر رکھی گئی ہے۔"

ماہرین نفسیات کو اپنی تحقیقات میں ایسے بیشمار خواب ملے ہیں جن میں باپ کو قتل کرنے اَور ماں سے شادی کرنے کی آرزو پائی گئی۔ ڈرامے کے دوران میں سفاکلیز نے ایک خواب کا ذکر بھی کیا ہے جو ایڈی پس نے دیکھا تھا کہ "وہ اپنی ماں کے بستر پر سو رہا ہے۔" یہ خواب سُنکر جوکاسٹا اُسکی بیوی —— ماں، اُس سے کہتی ہے کہ یہ کوئی بات نہیں، خوابوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ یہی خواب اِس ٹریجڈی کی کلید ہے۔

ماں کو اپنانے کی خواہش اور باپ کو قتل کرنے کا دبا ہُوا ارادہ آج بھی موجود ہے۔ مہاتما گاندھی کے قاتل نے اسکی تائید اپنے تحریری بیان میں کی ہے۔ کہ بھارت ماتا کا ایک بیٹا ہوتے ہوئے میں نے اپنا فرض جانا ہے کہ قوم کے نام نہاد باپو کا خاتمہ کر دوں جس نے ہماری بھارت ماتا کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں اہم حصہ لیا ہے۔

تحلیل نفسی ایڈی پس کے قصے کی تاویل یہ کرتی ہے کہ بچے پر سماجی ماحول کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنی ماں کو اپنا نہیں سکتا تو وہ باپ سے خائف ہو کر پرے ہٹ جاتا ہے۔ یہیں سے باپ کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہے اور اسی نفرت کا ردِ عمل جرم کا احساس اور اپنے تئیں سزا دینا ہے۔ ہم نے صرف چند قصوں کا جائزہ لیا ہے لیکن اس قسم کی تحقیقات کی مدد سے ہم دیومالا کے پورے افسانوی ادب کو ذہنی اعمال کی روشنی میں نئی قدر و قیمت دے سکتے ہیں ٭

حضرتِ اثرؔ صہبائی

تجلّیات

صبحِ خنداں ترا پیغام لئے آتی ہے
ہاتھ میں نور کا اِک جام لئے آتی ہے
چاندنی رات، کئی دلکش و رنگیں نغمے
اپنے دامن میں سرِ شام لئے آتی ہے
شبِ مدہوش کی تاریکیٔ پُرکیف و خموش
نکہتِ زلفِ دلآرام لئے آتی ہے
شاخِ گلپوش گلستاں میں برنگِ ساقی
جام میں بادۂ گلفام لئے آتی ہے
ہوشیار اے دلِ دیوانۂ منزلگہِ دوست
عقل ہر گام پہ اِک دام لئے آتی ہے
بُت شکنِ عشق انہیں توڑتا رہتا ہے اثرؔ
ہوس اصنام ہی اصنام لئے آتی ہے

محمد حسن عسکری

بودلیئر

(سرمایہ دارانہ سماج کا یرمیاہ)

عسکری صاحب یورپین شاعروں کے متعلق "مخزن" کیلئے مختصر مضامین لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے کی ابتدا گزشتہ مہینے مشہور امریکی نژاد انگریز شاعر ایلیٹ سے ہوئی تھی۔ عسکری صاحب کے یہ دلچسپ اور نظر افروز مضامین آئندہ کچھ مدت تک شائع ہوتے رہیں گے۔ (مدیر)

دوسری جنگِ عظیم کے بعد اسے یورپ کے سب سے بڑے روحانی پیشوا کیرکے گارڈ نے ایک بات بڑی خوفناک کہہ دی ہے۔ وہ یہ کہ بڑے تخلیقی کام کے لئے تنہائی ضروری ہے، مگر تنہائی کوئی ایسی چیز نہیں جسے آدمی ہنسی خوشی قبول کرلے، اس لئے قدرت جس آدمی کو تخلیقی کام کے لئے چھانٹتی ہے اُس کے لئے تنہا رہنے کا بندوبست پہلے کردیتی ہے۔ قدرت کے بھی کھیل نرالے ہیں، تنہائی کا بندوبست بھی ایک طرح نہیں کرتی۔ کسی کو مفلس بنا دیتی ہے، کسی کو بے انتہا امیر، کسی کو بیمار ڈالتی ہے، کسی کے اندر کوئی نفسیاتی پیچیدگی پیدا کرتی ہے۔ بغرض ہر طرح تنکے چنوا دیتی ہے۔ مگر انہیں تنکوں سے فن کار کا آشیاں بنتا ہے، اور آخر میں یہی لعنت رحمت ہوجاتی ہے۔

بودلیئر پر بھی یہی رحمت نازل ہوئی۔ ایک تو اعصابی مزاج، طبیعت ہیجان پرور، سودا ورثے میں ملا، پھر اوپر سے واسطہ پڑا سوتیلے باپ سے، جو ہزار نیک دل سہی، مگر اُس کے لئے "شوہر" اور "آپ کے شوہر" سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مزاج میں خلوت پسندی تو تھی ہی، ناساز گار ماحول نے کڑوے کریلے کو نیم چڑھا دیا۔ دنیا کی ہر چیز سے بیزاری بڑھی، تمام دھندے سے طبیعت ہٹی، بزدلی نے کاہل اور سست بنا دیا۔ رہی ایک حسرتِ تعمیر، تو اُس نے اُلٹے اور دل پر کچوکے لگائے۔ دل و دماغ پر قابو نہیں رہا۔ البتہ اپنی شاعرانہ شخصیت پر غرور تھا جو آخر ہے آیندہ اُس نے مسیحائی کی ورنہ ڈھیر ہونے میں کیا کسر تھی۔ اس فن کارانہ شخصیت نے واقعی کیمیا بنا کے دکھائی، راکھ میں سے سونا نکالا۔ ورنہ ظاہری حالت تو یہ تھی کہ کوٹ ہے تو جوتا نہیں، ٹوپی کی فکر ہوگئی تو قمیص گلے کے ٹھکانے لگی۔ اب کئی کئی دن اِسی انتظار میں بستر پہ پڑے ہیں کہ ماں سے قرض مل جائے، تو کپڑے خریدیں، گھر سے باہر نکلنے کے قابل ہوں۔ مکان کا کرایہ بہت چڑھ گیا تو سامان بیچ کے جان چھڑائی۔ آگے چلے، کوئی سستا سا گھر دیکھا، ہر وقت قرض خواہوں کا دھڑکا، کمرے میں بند بیٹھے ہیں اور کانپ رہے ہیں، پتا کھڑکا اور بندہ بھڑکا، نہانے کے لئے گرم پانی کہاں سے میسر ہو، جوئیں پڑ گئی ہیں۔ روٹی کا بھی ٹوٹا ہے، بعض وقت اللہ کا نام رہتا ہے، بس ایک یہ آس ہے کہ ایسی ہی جان پہ بنی تو ماں کی مامتا دست گیری کریگی۔ غم غلط کرنے کو افیم کھانی شروع کر دی ہے، اُس نے اور بھی شل کرکے رکھ دیا ہے۔ محبوبہ ملی ہے تو ان گنوں کی کہ ہر وقت فرمائشیں، فرمائشیں، شعر شاعری جائے چولہے بھاڑ میں، مگر ایک دفعہ اپنا سب کچھ نثار کرکے انہیں کچہری عدالت میں کھینچے کھینچے پھرنے سے بچا چکی ہے، اِس لئے چھوڑتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ پھر ہزار جاہل، بد مزاج، بد ذوق سہی، شاعری کا آخری سہارا ہے۔ اُسی کے بال سونگھ کے تو دنیا جہان کی سیر ہوجاتی ہے۔ اُس سے الگ ہوں تو جینا اور بھی جی کا جنجال ہوجائے۔ محبوبہ کیا ہے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بنی ہوئی ہے۔ دن رات اِس کھینچا تانی میں گزریں تو نظم

کون سکے مضمون کیسے لکھا جائے۔ کتاب کے پیسے مل آتے ہیں، مگر نظمیں پُوری نہیں ہوتیں، قرض خواہوں کو اس وعدے پر ٹالا ہے کہ مضمونوں کے پیسے آنے والے ہیں، مگر اگلے وقت کی روٹی کی فکر ہے کہ پہلے پیٹ میں کچھ پڑے تو مضمون سوجھے، یا پھر کوئلے ختم ہو گئے ہیں، سردی کے مارے لکھا ہی نہیں جاتا، اور سب سے زیادہ تو قرض خواہوں کے تقاضے ہیں جنہوں نے روح خشک کر رکھی ہے۔ طبیعت پر زور ڈالتے ہیں، مگر قوتِ ارادی مضمحل ہو چکی ہے۔ جب اپنی تھکن، بیزاری، بے بسی، شکست خوردگی پر خون کھولاتے کئی ہفتے گزر جاتے ہیں، تو یکایک یہی جھنجلاہٹ اور گھٹن نظم کی شکل میں ڈھلنے لگتی ہے، اور نظم بھی ایسی جس میں انسان کی ابدی اور ازلی محرومیاں اور لاچاریاں گونج رہی ہوں۔

بودلیئر کی نظموں پر اُس کی ذاتی زندگی کا اتنا اثر ہے کہ جن لوگوں کے لئے نفسیات کا علم ابھی تک گلابو ستابو کا تماشا بنا ہوا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ نفسیاتی پیچیدگیاں ہی ان نظموں کی جان ہیں، اور اُس کی شاعری جنسی بے راہ روی، گندگی سے رغبت، اخلاق سے بغاوت، مریضانہ جذبات اور شدید ترین خواہشات کا اظہار ہے۔ مگر یہ چیزیں تو پہلی نظر میں دکھائی دے جاتی ہیں، ان کے لئے نفسیات سے مدد مانگنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے انہیں چیزوں کی بنا پر شروع شروع میں بعض لوگوں کو اُس کی شاعری پسند آئی تھی، اور بعض لوگوں نے مخالفت کی تھی۔ آسکر وائلڈ اور اُس کے ساتھیوں نے بودلیئر کو اسی نظر سے پڑھا تھا، اور تقلید بھی شروع کر دی تھی۔ جب لوگ اُس کے کلام سے جسمانی لذت حاصل کرتے کرتے تھک گئے، تو پھر بودلیئر کی ایک نئی تفسیر ہوئی۔ اب کے اُسے عیسوی تصورات کا پرستار بتایا گیا۔ یہ بات کچھ غلط بھی نہیں ہے، مگر بعد لوگوں نے مبالغہ کرتے کرتے اُسے عارف اور صوفی بنا دیا۔ اس کے بعد بودلیئر کی نفسیاتی تحلیل شروع ہوئی۔ جب یہ سب فروعی باتیں ختم ہو گئیں تو اب کوئی بیس پچیس سال سے لوگوں نے اُس پر خالص ایک فن کار کی حیثیت سے غور کیا ہے۔ جو لوگ اُسکی شاعری کو محض لذتیت سمجھتے ہیں وہ اُسے چھوٹا بنا دیتے ہیں۔ اور نفسیات والے تو یہ چھوٹی سی حقیقت بھی نہیں سمجھ سکتے کہ زندگی کے کاروبار میں اُس کی قوتِ ارادی کتنی ہی کمزور سہی، لیکن ایسی نظمیں لکھنے کے لئے کیسے آہنی قسم کے فنی ارادے کی ضرورت ہے۔ اُس کی قوتِ ارادی ہر معاملے میں کمزور نہیں تھی، البتہ اُس طرح اُن چیزوں پر صرف نہیں ہوتی تھی جن پر کسی کارخانے کے مالک کی قوتِ ارادی صرف ہوتی ہے۔ پھر ایک پوری تہذیب کی روح کو الفاظ کی گرفت میں لانا ایسا منہ کا نوالا نہیں ہے، بغیر مصیبتیں اُٹھائے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ کسی تہذیب کے بنیادی عوامل سیدھے سادے لفظوں میں بیان بھی نہیں ہو سکتے، وہ تو صرف تمثیلاً استعارات کے پردے میں دکھائے جا سکتے ہیں۔ بودلیئر کی ذاتی الجھنیں دراصل پوری بورژوا سماج کی الجھنیں ہیں۔ اُس کی بیماری پُورے یورپ کی روحانی بیماری ہے۔ بودلیئر کے ذاتی تجربات نے اُسے وہ کچھ سمجھا دیا تھا جو یورپ کے حاکموں نے دو زبردست لڑائیوں کے بعد بھی نہیں سمجھا۔ مگر یہ بودلیئر کی فن کار شخصیت کا معجزہ ہے۔

بودلیئر کے بنیادی موضوعات یا احساسات دو ہیں۔ ایک تو انسان کی فریب خوردگی، دوسرے زندگی سے بیقراری، تھکن اور کوفت۔ جہاں تک پہلے موضوع کا تعلق ہے اِس سے فرانسیسی ادیبوں اور شاعروں کو ہر زمانے میں دلچسپی رہی ہے۔ بڑے بڑے فرانسیسی ادیبوں کو شروع سے لے کے آخر تک یہی کاوش رہی ہے کہ انسانی "انا" کے راز دریافت کئے جائیں کہ آخر وہ ہے کیا چیز، جو باتیں وہ محسوس کرتا ہے اُن کی اصل کیا ہے، وہ اصل ہیں بھی یا نہیں۔ فرانسیسی ادب جتنا بھی آگے بڑھتا ہے اِس تحقیق و تفتیش میں اتنی ہی شدت آتی جاتی ہے۔ اور بودلیئر کے یہاں تو انتہا ہو گئی ہے۔ اُس کا تو انسان کے متعلق بنیادی مفروضہ ہی یہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنی نظموں کے دیباچے میں پڑھنے والوں کو یوں مخاطب کیا ہے:

"میرے ریاکار قاری، میرے ہم شکل، میرے بھائی!"

انسان کی ریاکاری کو اس شدت سے محسوس کرنے کی بھی ایک خاص وجہ تھی۔ اُنیسویں صدی سے پہلے کچھ نہ کچھ اقدار ضرور ایسی ہوتی تھیں جن پر لوگوں کو راسخ اعتقاد ہوتا تھا، اور اُن کے بارے میں شک وشبہہ کی گنجائش نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اُنیسویں صدی میں کچھ تو سائنس کے زیرِ اثر، کچھ سرمایہ دارانہ اقدار کے عروج کی وجہ سے تمام اقدار پر سے اعتقاد اُٹھنے لگا تھا۔ اقدار کی تخریب کس حد تک پہنچ گئی تھی، اس کا اندازہ بودلیئر کی اِس نظم سے لگائیے جس میں شاعر کی محبوبہ اُس سے چند سوال پوچھتی ہے۔

"پُر اسرار آدمی، ذرا یہ تو بتا کہ تُو سب سے زیادہ کس سے محبت کرتا ہے؟ اپنے باپ سے، ماں سے، بہن سے یا بھائی سے؟'

'میرے نہ تو کوئی باپ ہے نہ ماں، نہ بھائی بہن'

'اپنے دوستوں سے؟'

'یہ تو تم نے ایسا لفظ استعمال کیا جس کا مَیں آج تک مطلب ہی نہیں سمجھا'

'اپنے ملک سے؟'

'مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ہے کس عرض البلد میں'

'خوبصورتی سے؟'

'وہ لافانی دیوی! اُس سے محبت کرنے کو جی تو چاہتا ہے'

'دولت سے؟'

'مجھے اِس سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی تمہیں خدا سے'

'پھر تمہیں کس سے محبت ہے، ارے عجیب اجنبی؟'

'مجھے بادلوں سے محبت ہے .... اُن بادلوں سے جو گذرتے چلے جاتے ہیں .... وہ دیکھو ...... اُن حیرت انگیز بادلوں سے۔"

اِس نظم کا عنوان ہے "اجنبی"۔ واقعی سرمایہ دارانہ سماج کا انسان دوسرے انسانوں سے بالکل اجنبی بن کے رہ گیا ہے۔ اُس کی ساری اقدار ختم ہو چکی ہیں، سارے انسانی تعلقات منقطع ہو گئے ہیں، وہ کسی چیز سے محبت نہیں کر سکتا، اگر کسی چیز کی طرف توجہ ہوتی ہے تو لمحاتی احساسات کی طرف ——— جن کی علامت گزرتے ہوئے بادل ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو انسان اس حالت کو پہنچ جائے وہ اپنے اُوپر بھی یقین نہیں کر سکتا۔ اُسے خود اپنے احساسات جھوٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ خود اپنی نظروں میں ریاکار بن جاتا ہے، دوسروں کا تو کہنا ہی کیا۔ پھر اُس کے لئے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ یا تو خودکشی کرے ورنہ پھر جان بوجھ کے اپنے آپ کو فریب دیتا ہے تاکہ زندگی کی بےلطفی اور بےرنگی اُس کا دم نہ گھونٹ دے۔

چنانچہ اب یہ تلاش شروع ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو کس طرح فریب دیا جائے۔ بودلیئر نے تقریباً وہی بات کہی ہے جو غالب نے کہی تھی:-

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اِک گُونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیئے

اُس کا بھی نسخہ یہی ہے کہ ہر وقت مخمور رہو، چاہے نشہ شراب کا ہو، یا شاعری کا، یا نیک اعمال کا۔ بودلیئر کی شدتِ جذبات اور "بدی" کا شوق دراصل اِسی جستجو کے ضمن میں آتا ہے۔ اسے سب سے زیادہ ڈر بےلطفی اور بےرنگی سے لگتا ہے، اور وہ انسان کا سب سے بڑا دشمن بیزاری اور کوفت کو سمجھتا ہے۔ اپنے دیباچے میں اُس نے بےلطفی کی تعریف اِس طرح کی ہے:-

"لیکن گیدڑوں، بھیڑیوں، چیتوں،
بندروں، بچھوؤں، گِدھوں، سانپوں،

بھونکتے، غراتے، دھاڑتے عفریتوں کے درمیان،
ہماری بدکاریوں کے شرمناک چڑیا گھر میں
ایک عفریت سب سے گھناؤنا، بدہیئت اور شریر ہے!
یوں تو نہ وہ اچھلتا کودتا ہے نہ چنگھاڑتا ہے،
مگر اُس کا بس چلے تو ساری زمین کو کھنڈر بنا کے رکھ دے،
اور ایک جمائی میں دنیا کو نگل جائے۔
اِس عفریت کا نام بے لطفی ہے! ——— آنسو اپنے آپ
سے اپنے آپ اُس کی آنکھوں میں چھلک آتے ہیں۔
وہ بیٹھا حقہ پی رہا ہے اور لوگوں کو سُولی پر چڑھانے کے
خواب دیکھ رہا ہے۔
اے قاری! تو بھی تو اس نازک مزاج عفریت سے واقف ہے،
ریاکار قاری ——— میرے ہم شکل ——— میرے بھائی!"

بودلیئر کے ہاں جتنی بھی ہیجان پسندی ہے اُس کا ماتم اس ایک مصرع میں آگیا ہے: "وہ بیٹھا حقہ پی رہا ہے، اور لوگوں کو سُولی پر چڑھانے کے خواب دیکھ رہا ہے"۔ بودلیئر کی گناہ پرستی محض اُس بے رنگی کے ردِ عمل کے طور پر ہے، مگر اُسے خوب معلوم ہے کہ یہ صرف دھوکا ہی دھوکا ہے، بدی کے پھولوں سے زندگی کی خزاں بہار میں نہیں تبدیل ہو سکتی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بودلیئر نے اخلاقی پابندیوں کے خلاف بغاوت کی ہے، اور جذبات کو ہر قید سے آزاد کرانا چاہا۔ یہ بھی اُس کی شاعری کا ایک پہلو ہو سکتا ہے۔ مگر اُس نے اس سے آگے بھی کچھ بتایا ہے۔ اُس نے ثابت کر دکھایا ہے کہ جذبات صرف اسی وقت تک مزہ دیتے ہیں جب تک کہ اُن کی پُرسے نظامِ زندگی میں ایک مخصوص جگہ ہو، اُن کی قدر و قیمت معلوم ہو، اُن کی حد میں مقرر رہوں۔ اگر زندگی کا کوئی نظامِ اقدار نہ ہو تو جذبات بھی مہلک بن جاتے ہیں، اُن میں کوئی لطف نہیں رہتا۔ بودلیئر نے بورژوا سماج کے چہرے پر سے نقاب اُٹھا کے دکھا دیا ہے کہ آزاد خیالی اور لامذہبیت نے اُس کی کیا گت بنا دی ہے۔ ہر جذبے پر سے پابندیاں اُٹھ گئی ہیں، چنانچہ ہر جذبہ ایک سطح پر آگیا ہے اور کسی کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انسان کی زندگی ایک ریگستان بن کے رہ گئی ہے جس میں سراب تو بہت سے ہیں مگر پانی نہیں ملتا۔ بودلیئر نے سرمایہ دارانہ تہذیب کے انسان کی تصویر اس شکل میں پیش کی ہے۔ اُس کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ نظامِ اقدار کو رد کر کے انسان اطمینان کے ساتھ نہیں جی سکتا۔ بودلیئر کی شاعری اخلاق سے فرار نہیں ہے، بلکہ اخلاقیات کی طرف بازگشت ہے۔ بودلیئر کی بنیادی سخت گیری کو چھوڑ کر اُس کی نظمیں پڑھیے تو نوجوانی کی بے راہ روی اور اشتعال پسندی سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتا، یا فنی تکمیل۔ اخلاقی احساس کے بغیر بودلیئر اتنا بڑا شاعر بن ہی نہیں سکتا تھا کہ اُس کی کتاب کو بیسویں صدی کے انسان کی انجیل کہا جا سکے۔ زر اندوزی کے علاوہ تمام دوسری روحانی اقدار کے مٹ جانے سے یورپ کو جو نقصان پہنچا ہے اُس کا بودلیئر کو اتنا شدید احساس تھا کہ اُس نے کہا ہے بورژوا سماج خدا سے صرف اس لئے منکر ہے کہ وہ جہنم کے تصور سے ڈرتی ہے، وہ نہیں چاہتی کہ اُس سے مواخذہ ہو۔ چونکہ بورژوا سماج خدا پر ایمان بھی نہیں رکھتی اور مذہب کو اپنے تجارتی مقاصد کے لئے استعمال بھی کرتی ہے، اس لئے بودلیئر نے وقتاً فوقتاً مذہب سے بھی بیزاری کا اظہار کیا ہے، حالانکہ اُس کی شاعری مذہب کے ضروری ہونے کی گواہی ہے۔ ویسے بھی بودلیئر اُس چیز سے بڑا جلتا تھا جسے آزاد خیالی کی تحریک کہتے ہیں۔ والتیر کے نام سے اُسے چڑ تھی، اور ورڈز ورتھ کو تو وہ بورژوا سماج کی حماقتوں اور خود فریبیوں کا مثالی نمونہ سمجھتا تھا۔

اس کے علاوہ بودلیئر کے یہاں ہمیں عیسوی رحم کے وہ خالص اور معصوم نمونے ملتے ہیں جو صرف دیوں، ورلین اور راں بو جیسے فرانسیسی شاعروں کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ سماجی اور معاشی مظالم پر جس زہرناک

اندازسے بودلیئر نے احتجاج کیا ہے ویسا تو کسی ٹھیٹ ترقی پسند شاعر نے بھی نہ کیا ہوگا۔ مثلاً اُس کی ایک منثور نظم ہے جس کا نام ہے "عجیب و غریب سرزمین": ایک دن شاعر کسی مرغزار میں ایک ٹیلے پر بیٹھا فطرت کے حُسن سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ تن بدن کا ہوش نہیں رہا ہے، تصوّر عرشِ معلّی کی سیر کر رہا ہے۔ اسی حالت میں تیسرا پہر ہو جاتا ہے اور بھوک تنگ کرنے لگتی ہے شاعر جیب سے ڈبل روٹی نکال کے کھانا شروع کرتا ہے۔ اتنے میں نظر جو اُٹھتی ہے تو ایک بچہ دکھائی دیتا ہے، کپڑے پھٹے ہوئے، بدحال، میلا کچیلا، فاقوں کے مارے سوکھا ہوا۔ وہ ٹکٹکی باندھے شاعر کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا ہے، اور ایک دم سے چیخ اُٹھتا ہے "کیک!" شاعر اُسے پاس بُلا کے روٹی کا ایک ٹکڑا اُسے دیتا ہے۔ یکایک اُسی کی طرح کا ایک اَور بچہ جھپٹا مارتا ہے اور روٹی چھین لے جاتا ہے اب دونوں میں کشتم کشتا شروع ہو جاتی ہے۔ روٹی ریزہ ریزہ ہو کے مٹی میں مل جاتی ہے، دونوں کے کپڑے تار تار ہو جاتے ہیں، جگہ جگہ سے خون نکل آتا ہے۔ اور آخر وہ تھک کے گر پڑتے ہیں۔ شاعر دل میں سوچتا ہے کہ اچھا، ایک ایسی بھی سرزمین ہے جہاں معمولی ڈبل روٹی کو کیک کہا جاتا ہے، اور اس کے ایک ٹکڑے کی خاطر دو انسان ایک دوسرے کو قتل بھی کر سکتے ہیں!..... اسی طرح ایک نظم ہے شام کا جھٹپٹا" پہلے تو شاعر شام کی چہل پہل اور سرگرمیاں بیان کرتا ہے، پھر سوچتا ہے کہ کون کون اس وقت کیا کرے گا، پھر طوائفوں، چوروں، اسپتال کے بیماروں کی طرف آتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ" ایسے تو دو ایک ہی ہوں گے جو آگ کے سامنے اپنی پیاری کے پاس بیٹھ کے کھانا کھانے جا رہے ہوں گے، زیادہ تر تو ایسے ہی ہیں جنہیں عمر بھر یہی پتا نہیں چلا کہ گھر بار ہوتا کیا ہے، اور نہ کبھی ڈھنگ سے جی سکے ہیں!"

تو ایسا شاعر جسے اپنے زمانے کی زندگی بے نقاب نظر آگئی ہو، جس نے دیکھ لیا ہو کہ سماجی بے انصافی اور اخلاقیات سے کنارہ کشی نے بورژوا "تہذیب" کی جان نکال لی ہے، اور اسے یہ بھی معلوم ہو کہ میں بھی اسی سماج کا ایک حصہ ہوں اور اس کے اثرات سے نہیں نکل سکتا تو اُس کی زندگی ایک مسلسل زہر نہ بن جائے تو اور کیا ہو۔ چنانچہ بودلیئر ہر قسم کے آدرشوں سے گھبرانے لگا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ سیاسی اور معاشی اصلاح کے نعرے بھی فریب ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو اُس نے کہا ہے "میں سیاست سے کیسے الگ رہ سکتا ہوں، جس طرح ہمارے جسم میں آتشک کا زہر پھر ابھرتا ہے اسی طرح جمہوریت کے بھی جراثیم ہوتے ہیں۔" اور دوسری طرف یہ کہا ہے کہ "الزام دینا، مخالفت کرنا بلکہ انصاف کا مطالبہ کرنا۔ کیا یہ سب بدمذاقی کی باتیں نہیں ہیں؟" شاعر کی حیثیت سے جس کا کام تھا کہ زیادہ سے زیادہ انسانی رشتے قائم کرے، مگر اس ماحول میں اُسے تمام انسانی رشتوں میں کھوٹ نظر آتا تھا۔ بودلیئر کے اس پہلو کی نمائندگی وہ نظم کر دیتی ہے جس کا نام ہے "اندوہگیں نغمہ"۔ شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے :۔

"تو بڑی عقلمند ہے تو مجھے اِس سے کیا؟
حسین بن! اور اندوہگیں بن! آنسو
چہرے کے حُسن کو دوبالا کر دیتے ہیں
جیسے دریا منظر کے حُسن کو،
طوفان سے پھول پھر تازہ ہو جاتے ہیں۔
میں تجھے سب سے زیادہ اُس وقت پیار کرتا ہوں جب
تیرے خوف زدہ چہرے سے مسرت غائب ہو جاتی ہے،
جب تیرا دل خوف و دہشت میں غرق ہو جاتا ہے،
جب تیرے حال پر ماضی کا
ہولناک بادل چھا جاتا ہے۔
میں تجھے اُس وقت پیار کرتا ہوں جب تیری بڑی بڑی آنکھوں
سے خون کی طرح گرم آنسو ٹپکتے ہیں،

جب حالانکہ میں تجھے ہاتھ سے تھپکیاں دے دے کر تسلی دیتا
ہوں، مگر
تیرا کرب اتنا شدید ہوتا ہے کہ مرتے ہوئے آدمی کی چیخ کی طرح
میرا دل چھید دیتا ہے۔
تیرے سینے سے جو آہیں نکلتی ہیں

. . . .

میں انہیں سانس کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لیتا ہوں۔
میرا خیال ہے کہ تیری آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتے ہیں
وہ تیرے دل میں روشنی رکھتے ہیں۔
میں جانتا ہوں کہ تیرا دل جس میں
پرانی محبتوں کے کھنڈر ہی کھنڈر ہیں،
بھٹی کی طرح بھڑکتا رہتا ہے۔
اور تو اپنے سینے میں
ازلی مردودوں کا ساغر و چھپائے ہوئے ہے۔
لیکن، میری پیاری، جب تک تیرے خواب
جہنم کا عکس نہیں بن جائیں گے،
جب تک ایسا نہ ہوگا کہ ڈراؤنے خواب تجھے چین نہ لینے دیں
تو زہر اور کٹار کی باتیں سوچا کرے،
بارود اور تلوار پر فریفتہ ہو جائے،
کسی کے لئے کمرے کے دروازے کھولے تو سہم کے،
تجھے ہر طرف بدنصیبی اور رنج و غم نظر آئے،
گھنٹہ بجے تو تو لرز اٹھے،
جب تک تجھے یہ پتا نہیں چلے گا کہ بیزاری اور لعنت
سے پیچھا چھڑانا کتنا مشکل ہے اور ان سے کیسی گھٹن ہوتی ہے،
اے میری غلام ملکہ، جو بڑی تند ڈر کے
مجھ سے محبت کرتی ہے،
اس وقت تک تو رات کی گندی اور دہشت ناک فضا میں
گھٹی گھٹی چیخوں کے ساتھ مجھ سے یہ نہیں کہہ سکتی۔
"اے میرے بادشاہ، میں تیرے مقابلے کی ہوں"

ظاہر ہے کہ اس عورت کا "بادشاہ" اپنے منحوس زمانے کا حساس ترین انسان ہے۔ اگر اس کے خواب جہنم کا نمونہ ہیں تو یہ بورژوا سماج پر سب سے بڑی طنز ہے کہ ظاہری ترقیوں کے باوجود اس نے انسانیت کی روح کا یہ حال کر دیا ہے۔ یہ بات صرف ایک بڑا شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ بات صرف فن کے ذریعے کہی جا سکتی ہے۔ بودلیئر نے بورژوا سماج کے لئے یہ کام کیا، جو اپنے اندر ایک پیغمبرانہ شان رکھتا ہے۔ بودلیئر بورژوا سماج کا یرمیاہ ہے۔ اسی لئے وہ بورژوا سماج کے آخری دور کا سب سے بڑا شاعر ہے، اور اسی لئے اس کی کتاب بیسویں صدی کے انسان کی انجیل کہلانے کی مستحق ہے۔ بودلیئر کی باقی حیثیتیں فروعی اور ثانوی ہیں +

بودلیئر، رومانی مسلک کا فرانسیسی شاعر اور نثر نگار ۹ اپریل ۱۸۲۱ء کو پیدا ہوا۔ ۱۸۲۷ء میں اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس کی ماں نے ایک فوجی افسر سے شادی کر لی۔ ۱۸۳۹ء میں ڈگری لینے کے بعد اس نے ادب کو مشغلۂ زندگی بنایا لیکن ۱۸۴۱ء میں اس کی اخلاقی بے راہروی سے تنگ آ کر اس کے نگرانوں کو اسے ہندوستان بھیج دینا پڑا۔ چند مہینوں بعد جب بودلیئر واپس وطن پہنچا تو قانوناً بالغ ہو چکا تھا۔ اب وہ اور کھل کھیلا۔ اور اس کے نگرانوں کو عدالت سے ڈگری لے کر اس کی آبائی میراث کیلئے ٹرسٹ مقرر کرنا پڑا۔ بودلیئر کا پہلا مجموعۂ نظم ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا لیکن معاشرہ کے خلاف اس کے باغیانہ خیالات نے عوام کی توجہ کو اس کی شاعری کی اعلیٰ فنی خوبیوں سے زیادہ جذب کیا، چنانچہ پہلی ہی تصنیف پر حکومت کو مصنف اور ناشر دونوں پر مقدمہ چلانا پڑا۔ تاریخ وفات ۱۸۶۷ء + ح

عبدالمجید بھٹی

دِل نہیں بہلے رے

(گیت)

سُندر آشاؤں میں ڈھل کر
اُلفت کی راہوں پہ نکل کر
اِک دُوجے کا ہاتھ پکڑ کے ہم کیوں ٹہلے رے
دل نہیں بہلے رے

مَیں آئی تھی رانی بن کر
ارمانوں کی جوانی بن کر
تم پھرتے تھے دائیں بائیں اہلے گہلے رے
دل نہیں بہلے رے

بھُول گئے تم گھر کی راہیں
جل گیا جی، اگنی ہیں آہیں
پل پل تڑپے، پھڑکے، ڈولے، دھڑکے دہلے رے
دل نہیں بہلے رے

آنکھوں میں اُمڈی تقدیریں
آنسو، دُبدھا کی تفسیریں!
تم بن جان جلائیں اب یہ محل دو محلے رے
دل نہیں بہلے رے

بجھ گئیں اُلفت کی پھلجھڑیاں
لاؤں کہاں سے اب وہ گھڑیاں
جن میں ڈُوب کے اُبھرے تھے ہم پہلے پہلے رے
دل نہیں بہلے رے

پروفیسر علی ناصر زیدی
(صدر شعبۂ طبیعیات گورڈن کالج)

چاند کی سیر

آپ نے چاند تک پہنچنے کے لئے متعدد کوششوں کا حال پڑھا ہوگا لیکن قوت کے لامحدود سرچشمے کے بغیر انسان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ آجکل جوہری قوت کی تحقیقات کا جو سلسلہ جاری ہے اُس سے اُمید ہے کہ ایک دن ایسا آئیگا کہ یہ عجیب و غریب قوت رسل و رسائل اور آمد و رفت کے لئے بھی استعمال کی جاسکے گی۔ اگر یہ ممکن ہوگیا تو یہ بھی ضرور ممکن ہوگا کہ انسان مع اپنی مشینوں کے اِس سیارے سے اُٹھکر ایک دوسرے سیارہ تک پہنچ جائے۔

راکٹ یا ہوائی کے نام سے آپ اچھی طرح واقف ہونگے۔ انکو فضائے محیط میں اُڑانے کی متعدد کوششیں کی جاچکی ہیں لیکن قوت کی کمی کی وجہ سے چاند تک پہنچ جانے میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ آج سائنس دانوں کی آنکھیں جوہری قوت کی طرف لگی ہوئی ہیں اور وہ یہ امید کر رہے ہیں کہ شاید اسی کے سہارے فضائے بسیط کو کسی حد تک طے کیا جاسکے۔

ایک سیارے سے دوسرے سیارے تک اُڑنے کے لئے یورانیم کی ضرورت پڑے گی۔ کیونکہ یہی دھات جوہری قوت کی اساس ہے۔ امریکہ کے چند ممتاز سائنسدان اِس بات پر زور دے رہے ہیں کہ اِس نادر الوجود دھات کو کسی صورت بچانا چاہئے۔ جوہری قوت ہی انسان کو پہلی مرتبہ یہ موقع دے گی کہ وہ اِس خاکدان کی زنجیروں کو توڑ کر کسی دوسری دنیا کی سیر کے لئے نکلے۔ ماہرینِ فلکیات کا خیال ہے کہ انسان سب سے پہلے چاند کا سفر اختیار کریگا۔ اندازہ ہے کہ اِس سفر پر جتنا یورانیم خرچ ہوگا اُس سے کہیں زیادہ چاند میں مل جائے گا کیونکہ ہمارا یہ منظورِ نظر اِس قیمتی دھات سے مالا مال سمجھا جاتا ہے مگر کوئی شخص اِس کی مقدار کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا اور نہ فی الحال اِس کا اندازہ کرنا ممکن ہی ہے۔

ماہرینِ طبیعیات ایک آلے کی مدد سے جس کو "طیف پیما" کہتے ہیں کسی بھی شے کے اجزا کا حال معلوم کرسکتے ہیں۔ اِس آلہ میں ایک منشور محفوظ ہوتا ہے۔ اِس کے ذریعے سے زیرِ تجربہ اشیا کا عکسِ شعاعی ایک فوٹوگرافک پلیٹ پر حاصل کیا جاتا ہے۔ بعدہٗ اُس کی ناپ تول کی جاتی ہے اور اجزا کی کیفیت معلوم ہوجاتی ہے۔ جہاں کیمیائی طریقے ناکام ہوتے ہیں سائنسدان اِسی آلے کی مدد لیتے ہیں۔ چنانچہ چاند کا عکسِ شعاعی بھی حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ چنداں سُود مند ثابت نہیں ہوا کیونکہ چاند اپنی روشنی آفتاب سے حاصل کرتا ہے اور وہی روشنی منعکس ہوکر ہمارے آلہ تک پہنچ جاتی ہے، کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ہے اور ہم یہ معلوم کرنے سے معذور رہ جاتے ہیں کہ چاند میں یورانیم کی کس قدر تعداد شامل ہے لیکن امید ضرور قائم ہے اور یہ امید اِس نظریے کی بنا پر ہے کہ چاند گردشِ ارضی کی وجہ سے کسی زمانے میں کرۂ ارض کے پرت سے جدا ہوگیا اور دُور جا پڑا۔ زمین کے پرت میں یورانیم موجود ہے اِس لئے چاند میں بھی یہ قیمتی جز و موجود ہونا چاہئے۔ چاند کی آفرینش کے متعلق یہ نظریہ سر جارج ایچ۔ ڈارون کا قائم کردہ ہے جو مسئلہ ارتقا کے مشہور بانی پروفیسر ڈارون کے بیٹے تھے۔

اُن کا خیال ہے کہ چند ارب سال گزرے، زمین کا ایک ٹکڑا اس سے جدا ہوکر فضا میں معلق ہوگیا اور چاند کہلایا۔ اس کی اصلی جگہ وہ تھی جہاں اب بحر الکاہل موجیں مار رہا ہے۔ اِس نظریہ کے مطابق اُس زمانے کی کہیں زیادہ تیز گردشِ ارضی اور وہ تلاطم جو شمسی مد و جزر کی وجہ سے پیدا ہوتا رہتا تھا، چاند کی پیدائش کے لئے ذمہ دار ہوئے۔ یہ نظریہ ابھی تک پایۂ ثبوت

کو تو نہیں پہنچا تاہم کافی بحث و مباحثے کے بعد بھی چاند کی آفرینش کے متعلق یہ تشریح قابلِ قبول سمجھی جاتی ہے۔

اب آپ اپنے حلقۂ تصور کو ذرا وسیع کیجئے۔ اگر ہم چاند پر پہنچ گئے، تو وہاں کیا دیکھیں گے۔ ہیئت دانوں نے بہت سی قیاس آرائیاں کی ہیں اور جدید ترین اطلاعات کے مطابق یوں سمجھئے کہ آپ کا سفر ایک ایسے جہاز میں شروع ہوگا جو چاروں طرف سے اچھی طرح بند ہوگا۔ اس کے اندرونی درجۂ حرارت پر بیرونی فضا کا کوئی اثر نہ پڑیگا۔ جیسے جیسے ہم اُوپر جاتے ہیں فضا لطیف سے لطیف تر ہوتی چلی جاتی ہے اور بہت زیادہ اونچائی پر تو ہوا کا دباؤ برائے نام ہی رہ جاتا ہے۔ اِس لئے بیرونی دباؤ کا بھی کچھ مصنوعی انتظام کرنا ہوگا ورنہ آپ کی پسلیاں پچک کر چکنا چُور ہو جائیں گی۔ آپ کو ایک خاص قسم کا لباس پہننا ہوگا جس میں اِن تمام مراعات کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ رات کو آپ کو سردی بہت زیادہ محسوس ہوگی اِس لئے آپ کے لباس کو برقی طور سے گرم کرنے کا انتظام بھی رہے گا۔

اپنے گہوارۂ خاکی کو الوداع کہہ دینے کے بعد آپ کے ہوا باز کو یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ آپ کا طیارہ کسی شہابِ ثاقب سے نہ ٹکرا جائے۔ ٹوٹتے ہوئے یہ ستارے جو آپ کو زمین پر سے اس قدر چھوٹے نظر آتے ہیں، اپنے حجم میں نہایت وسیع ہوتے ہیں اور اگر کسی ایک سے بھی آپ کا تصادم ہوگیا تو بس خیر نہیں، لیکن اِس کا امکان بہت کم ہے۔ شاید زمین پر ریل گاڑیوں کے حادثے سے بھی کم۔

دورانِ سفر میں دھوپ بھی آپ کو گرمی پہنچاتی رہے گی اور جوہری قوت کے بل بوتے پر آپ چند ہی روز میں چاند پر پہنچ جائینگے۔ شاید اس سے بھی کم وقت صرف ہو اور آپ دنوں کی بجائے چند گھنٹوں ہی میں وہاں پہنچ جائیں۔ زمین پر سے آپ کو آسمان نیلا نظر آتا ہے لیکن فضائے ارضی سے نکل جانے کے بعد یہ رنگ سیاہی میں تبدیل ہو جائے گا۔ اِس کی وجہ آگے بیان کی جائے گی۔ چاند کے نزدیک پہنچنے پر آپ کا ہوا باز بریک کے ذریعہ آپ کے طیارہ کی رفتار کم کر دیگا اور آپ آہستہ سے چاند کی ایک وادی میں اُتر جائینگے۔ اُترتے ہی آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ ایک ایسی سرزمین پر آگئے ہیں جہاں ارضی اختلافات عام ہیں۔ عظیم الشان پہاڑ ہونگے جن کی بلندی پچیس ہزار فیٹ تک ہوگی۔ پہاڑوں پر بڑے بڑے دہانے عام ہوں گے۔ شاید آتش فشانی کی وجہ سے یا شہاب ہائے ثاقب کے تصادم کی بنا پر بالکل اسی طرح جیسے کیچڑ میں پتھر ڈال دینے پر گہرے نشان پڑ جاتے ہیں۔

آپ کو چاند پر بڑے بڑے میدان بھی نظر آئیں گے جن کو قدیم ہیئت دان سمندر سمجھتے رہے ہیں لیکن یہ آپ کو بالکل خشک ملیں گے جیسا کہ آجکل کے ہیئت دانوں کا خیال ہے۔ آپ کو چاند پر پانی کا نام و نشان تک نہیں ملے گا۔ وہ ایک مُردہ دُنیا ہے، خوفناک مگر دلچسپ۔

آپ کو چاند پر دن رات دو دو ہفتے کے ملیں گے۔ اگر آپ وہاں دن کے وقت پہنچے تو بھی آپ کو آسمان سیاہ نظر آئیگا۔ آفتاب بھی نظر آئے گا اور ستارے بھی، بلکہ وہ زمین کی بہ نسبت چاند پر سے کہیں زیادہ تعداد میں نظر آئیں گے، کیونکہ وہاں اُن کی چمک دمک کو چھپانے کے لئے فضا موجود نہیں ہے۔ وہاں سے آپ کو ستارے ٹمٹماتے ہوئے بھی نہیں معلوم ہوں گے کیونکہ آپ کے اور اُن کے درمیان مختلف کثافت کی ہوائیں موجود نہ ہونگی اور اِس طرح عملِ انعطاف یا تکسیر مفقود ہوگا۔ وہاں آپ کو ستاروں کی روشنی تیز تر ملے گی اور وہ برقی بلب سے آنیوالی روشنی کی طرح مستقل ہوگی۔

اگر آپ چاند پر رات کے وقت پہنچے تو آپ تاریکی سے بچنے کے لئے اُس حصہ سے گریز کریں گے جو ہماری آپ کی زمین کے سامنے رہتا ہے

بلکہ اُس حصہ پر چکر لگائیں گے جو دوسری طرف واقع ہے۔ اُس وقت ترقی یافتہ دُوربینوں کی مدد سے زمین پر سے آپ کے طیارہ کا مشاہدہ کیا جا رہا ہوگا، اور جیسے ہی آپ چاند کے دوسری طرف پہنچیں گے، آپ زمین پر رہنے والوں کی نظر سے اوجھل ہو جائیں گے اور آپ ایسی سرزمین پر پہنچ جائیں گے جس کو انسان نے کبھی نہیں دیکھا۔

آفتاب کی شدید گرمی سے بچانے کے لئے آپ کو چاند پر سُرکن ہواؤں کا غلاف نہیں ملے گا اور وہاں دوپہر کے وقت درجۂ حرارت ۲۱۴ ڈگری تک پہنچ جانا عین ممکن ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اغلب ہے کہ نصف شب کو تھرمامیٹر کا پارہ صفر سے ۲۴۳ ڈگری نیچے گر جائے۔

آپ شاید زمین کی طرح وہاں بھی اپنا سایہ دیکھنے کے خواہشمند ہوں لیکن آپ کو اپنے جسم کا سایہ وہاں نظر نہیں آئے گا۔ روشنی کی شعاعیں تو سیدھی لائن میں سفر کرتی ہیں اور جب وہ کسی جسم سے ٹکراتی ہیں تو اُن میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور آپ کو سایہ نظر آتا ہے لیکن جب فضا ہی موجود نہیں ہے تو روشنی کا انتشار یا نفوذ ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو وہاں سے آسمان سیاہ نظر آئے گا جیسا کہ فضا کی موجودگی میں زمین پر سے نیلا نظر آتا ہے۔

جب آپ سہ پہر کی روشنی میں چاند کے پہاڑوں پر نظر ڈالینگے تو آپ کو اُن کی چوٹیاں چمکتی دمکتی نظر آئیں گی لیکن وادیاں قطعی تاریک۔ آپ کو صرف وہ چیزیں نظر آئیں گی جن پر روشنی براہِ راست پڑ رہی ہوگی۔ دھندلا پن یا سایہ، یہ سب کچھ غائب ہوگا۔ تقریباً ایسا منظر پیشِ نظر ہوگا جیسا کسی تصویر کا نیگیٹو۔ چاند پر جتنا عرصہ دن رہیگا، صاف شفاف دھوپ نظر آئے گی۔ نہ بارش ہوگی، نہ دھند ہوگی نہ غبار، نہ کہر ہوگی نہ برف باری اور نہ ژالہ باری ہی کی نوبت آئے گی۔ موسم کے متعلق پیشینگوئی کا سوال کچھ بھی مشکل نہ ہوگا، آپ ہر وقت یہ پیشینگوئی کر سکیں گے۔

آپ یہ دیکھ کر اور بھی متعجب ہوں گے کہ آواز نہیں سُنائی دے رہی ہے۔ اور نہ کسی شے کی بُو ناک میں آتی ہے۔ اگر آپ اپنے ہم سفروں سے گفتگو کرنا چاہیں گے تو آپ کو خاص آلے استعمال کرنا ہوں گے جو بہرے آدمی اپنے ساتھ رکھتے ہیں تاکہ وہ آواز کے ارتعاش کو کان کی ہڈیوں تک پہنچا دیں۔

چاند پر آپ کو غروبِ آفتاب کے وہ دلکش مناظر بھی نظر نہیں آئیں گے جو زمین پر نظر آتے ہیں کیونکہ یہ نظر فریب رنگ فضا ہی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ جب فضا نہیں تو رنگ بھی نہیں نیلام یا جھٹپٹے کی بھی امید نہ رکھیئے۔ رات یکبارگی آ پڑے گی اور دو ہفتے کی ہوگی۔

ایک چیز آپ کو اور زیادہ متحیر کریگی۔ اگر آپ کسی انتظام کے ماتحت اپنے دباؤ کے کمرے سے باہر نکل کر گھومیں تو آپ اپنے تئیں پھر سے جوان محسوس کریں گے۔ آپ کو حرکت کرنے میں کوئی خاص زحمت نہیں کرنی پڑیگی۔ وہاں آپ زمین کی بہ نسبت چھ گنا زیادہ اُونچا کود سکیں گے کیونکہ وہاں ثقلِ ارضی کرۂ ارض کی کشش کے مقابلہ میں چھٹا حصہ ہے۔ کھیل کود میں آپ کو بڑی آسانی ہوگی گیند پر ٹھوکر لگائیے۔ وہ تین ہزار فیٹ پر جا کر رُکے گی اور وہاں کے کھیلوں کے ریکارڈ کا زمین کے ریکارڈ سے تو مقابلہ کیجئے!

آیئے اب آپ سب سے زیادہ دلچسپ نظارہ دکھائیں۔ آپ کا گہوارۂ خاکی، آپ کی اپنی زمین، قمری آسمان میں معلق ہوگی۔ اگر آپ چاند کے اُس حصہ پر مقیم ہونگے جو زمین کے روبرو ہوگا تو کرۂ ارض آسمان میں چاند سا نظر آئے گا اور دھوپ میں چمک رہا ہوگا۔ آپ زمین پر سے چاند کو گھٹتا بڑھتا دیکھتے ہیں۔ ہلال اور بدر کا یہ چکر آپ زمین پر بھی عائد کرنا چاہیں گے کیونکہ یہ بھی اُسی سلسلہ سے منسلک ہے جس سے چاند ہے جبکہ آپ اس کو زمین پر سے دیکھتے ہیں۔ وہاں سے آپ کو زمین زیادہ بڑی اور زیادہ چمکیلی نظر آئے گی۔ اگر آپ رات کے وقت

پُوری زمین کو دیکھیں گے تو وہ آپ کو چاند کے اُس سائز سے ۱۴۰۴ گنا زیادہ بڑی نظر آئے گی جو آپ زمین پر سے دیکھا کرتے تھے اور چونکہ زمین کی قوتِ انعکاس چاند کی قوتِ انعکاس کا تقریباً چھ گنا ہے۔ اِس لئے زمین سے منعکس ہونے کے بعد جو روشنی چاند پر پڑتی ہوئی نظر آئے گی وہ اپنی پُوری آب و تاب کے وقت اُس چاندنی سے تقریباً اسّی گنا زیادہ روشن ہوگی جس سے آپ زمین پر محظوظ ہُوا کرتے تھے۔

چاند پر تو فضا غائب ہوگی لیکن کرۂ ارض پر موجود ہوگی۔ اِس لئے آپ کو مختلف براعظموں کی حدود دھندلی دھندلی نظر آئیں گی۔ شاید افریقہ کی حدود زیادہ نمایاں طور پر نظر آئیں اور شاید اُسی وقت افریقہ کی راس امید کی رصدگاہ بھی آپ کو دیکھ رہی ہو۔ آپ کو وطن یاد آنے لگا اور آپ اُس نئی دنیا سے اپنے پرانے کرہ پر واپس آجائیں گے۔

شاید کوئی شخص بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ ہمارا یہ خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوسکے گا۔ البتہ ہمارے اِس سفر پر پیشروؤں نے کچھ روشنی ڈالی ہے۔ ایک صاحب، جان ولکنس سترھویں صدی میں لکھ رہے ہیں کہ انسان شاید بڑی بڑی چڑیوں کی کمر پر سوار ہوکر چاند تک پہنچ جائیگا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی مشین ہی اِس کام کو انجام دیدے۔

فرانسس گوڈوین، سترھویں صدی کے ایک اَور لکھنے والے، چاند کے سفر کے لئے جنگلی راج ہنس کو نہایت موزوں سمجھتے تھے، اور اپنے تجربات کی بنا پر اُن حضرت نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ٹھیک پچیس راج ہنس انسان کا وزن اُٹھانے کیلئے کافی ہونگے۔ حضرتِ آدم اِن پچیس ہنسوں پر سوار ہوکر گیارہ روز میں چاند پر پہنچ جائیں گے۔

حقیقت تو یہی ہے کہ چاند کے اصلی حالات اُسی وقت معلوم ہو سکیں گے جب انسان کامیابی کیساتھ وہاں زندہ وسلامت پہنچ جائیگا۔ دُنیا کی سب سے بڑی دُوربین جو کیلیفورنیا میں ماؤنٹ پالومر کی رصدگاہ پر نصب ہے ایک نئے ہی انداز سے مرتب ہورہی ہے جس کا قطر دو سو انچ ہے یہ پرکز نا اپنی قوتِ تکبیر کی بنا پر چاند کو زمین سے چوبیس میل کی حدود میں لے آئے گا اور آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چاند ہم سے اِس قدر قریب ہوکر اپنے جگر کے داغ پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔

چاند سے رُوحِ ارض کا خطاب

نورِ ازل کا پرتو ہے اک اِک جھلک تیری حُسنِ جاوید سے قسمت ہے مشترک تیری
تیری چشمِ جہاں بیں ہے ہر جلوے کی محرم ظلمت کے شر سے سو روشن ہے مردمک تیری

گردوں کے تارے گو نہیں ہوں اک ذرۂ خاک کا لیکن آنسو ہوں تیری ہی چشمِ نمناک کا
اے ہائے قسمت میری، یوں ہاتھ تھا خاک میں اے ہائے قسمت میری یوں ہونا تھا خاک کا

آغوشِ خود سے وہ تیرا میرا جُدا ہونا گزری ہوئی حکایت ہے بھُولا ہُوا قصہ
داغِ جُدائی سو اب تک روشن ہو دل تیرا سوزِ غم سے ہے آج تک تاباں مرا سینہ

جلوہ گر اک ملکوں پر تو، اِک پر میں اُفتادہ حائل بیچوں بیچ اِن دونوں کے ہجر کا دریا
اپنے وحشی تخیل کے ٹوٹے جہازوں میں یاسِ بحرِ بے پایاں کو میں گو بار رہا تیرا

میرا دستِ کوتہ تیرا دامن نہ چھو سکا نا امیدِ ناکامی نے نادم کر کے لوٹایا
یوں ہی تجھے بچپن میں بھی تھاما ہے لینے کو میں ہارا شب بھر رویا میں ہار رہا پھیلا

اور یوں بچپن ہی میں تُو نے سمجھا دیا مجھ کو اِس آرزو خانے میں جو تعیُّن تمنّا ہو
حسرت اسکی، حرماں اسکا، ناکامیاں اسکی بے جا ہی جو قسمت سے ہو کوئی گلہ اُس کو

اُٹھتی ہیں فرطِ شوق سے موجیں سمندر میں بڑھتی ہیں آگے پانی کی فوجیں سمندر میں
تیرے پا بوس کی حسرت پوری نہیں ہوتی ناچار گر پڑتی ہیں پھر موجیں سمندر میں

کب یہ دُنیا اُجڑے گی، کب ہوگا پارہ پارہ یہ آسماں بادل کا گھر تاروں کا گہوارہ
کب تک آخر مٹیں گے یہ جھگڑے من و تُو کے کب تک حسن و اُلفت دونوں اِک ہو کے رہا
کیسی دسترس سے باہر ہی ہر پیکرِ خوبی کیا اس خود نگی ہی میں ہو دلبری اِس کی

موتی سمندر کی تہ میں تارا ہے اَبر پہ
سبزہ سراسر بیگانہ موجِ صبا وحشی!

حامد علی خاں

سید نذیر حسین ناشاد

آمدِ بہار

ہمارے دورِ قدیم کے شعرأ میں سید نذیر حسین صاحب ناشاد کا نام بہت ممتاز تھا ہمیں مسرت ہے کہ انھوں نے اب بھی "مخزن" کو یاد رکھا ہے مدیر

لے فصلِ گل آئی تری سُن لی ہے خدا نے
ڈھونڈ اے دلِ شوریدہ مچلنے کے بہانے

بادل تری رحمت کے لگے گھر کے جو آنے
مُرغانِ چمن اور لگے شور مچانے

معشوق نہ ہو پاس تو گلزار بھی ہیں ہیچ
معشوق ہو جب پاس تو جنگل ہیں سہانے

تیرا ہی نہ جی چاہے تو تقدیر یہ ہماری
یوں ملنے نہ ملنے کے تو ہیں سب بہانے

دنیا ہی میں ہو جاتا ہے دیدارِ الٰہی
اپنا تو یہ مت ہے کوئی مانے کہ نہ مانے

میرے دلِ ناشاد پہ بھی ایک نظر ہو
معمور رہیں مولا تری رحمت کے خزانے

ناشاد مرے جاتے ہو تم یاد میں جن کی
انسان نہ وہ آئیں، نہ آئیں وہ زمانے

ڈاکٹر عاشق حسین

بیمہ ایجنٹ

یہ ڈراما جو ڈاکٹر عاشق حسین کی زیرِ ترتیب نئی کتاب "زندگی کے کھیل" کا ایک حصّہ ہے۔ بہ اجازتِ خاص مخزن میں شائع کیا جا رہا ہے ڈاکٹر صاحب نے ملک کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ بہت غائر نظروں سے کیا ہے۔ اس کے ساتھ اُنہیں زبان اور بیان پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اسی لئے اہلِ ذوق بڑی بے تابی سے اُن کے رشحاتِ قلم کی اشاعت کے منتظر رہتے ہیں! ح

افراد:-

ڈاکٹر یزدانی	اسکول ماسٹر
حیدر	بیمہ ایجنٹ اور ڈاکٹر یزدانی کا دوست
زینب	ڈاکٹر کی بیوی
منظور، اصغر	ڈاکٹر یزدانی کے شاگرد

ڈاکٹر یزدانی کے مطب کا کمرہ جس کا طول نو فٹ اور عرض چھ فٹ ہے۔ مشرقی دروازہ سامنے گلی میں اور مغربی دروازہ ملحقہ مکان میں کھلتا ہے۔ کمرے کے درمیان ایک میز اور دو کرسیاں پڑی ہیں۔ ایک پر ڈاکٹر یزدانی بیٹھے ہیں، دُوسری کرسی خالی ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک الماری میں دوا کی شیشیاں رکھی ہیں چھت اور دیواروں میں جالا لگا ہوا ہے۔ کونے میں ٹاٹ کے فرش پر دس گیارہ برس کی عمر کے دو لڑکے بیٹھے بآوازِ بلند کتاب پڑھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر یزدانی۔ ابے منظور، آہستہ پڑھ۔ شور مت کر۔

منظور۔ ماسٹر جی، آپ ہی نے تو کہا تھا کہ اونچی آواز میں پڑھنے سے کتاب جلد یاد ہوتی ہے۔

ڈاکٹر یزدانی۔ ارے کمبخت اسکول میں کہا تھا۔ یہاں تو نہیں کہا،

منظور۔ کل انگریزی کے ماسٹر صاحب کو سبق نہ سنایا تو وہ ماریں گے

ڈاکٹر یزدانی۔ کیوں ماریں گے وہ۔ جلد سبق یاد کر لے۔

اصغر۔ ماسٹر جی، گھر پر اونچی آواز سے کتاب نہیں پڑھنی چاہیئے؟

ڈاکٹر یزدانی۔ کیوں نہیں۔ پڑھ لیا کرو۔

اصغر۔ آپ نے ابھی منظور سے کہا ہے۔ کہ اونچی آواز سے

مت پڑھو۔

ڈاکٹر یزدانی۔ ارے کمبخت یہ میرا گھر ہے۔ تیرا گھر تو نہیں۔ اسکول میں تو میں نے اس واسطے کہا تھا۔ کہ ہیڈ ماسٹر صاحب بار بار تیسے کمرے کے پاس سے گذرتے ہیں۔ تم بلند آواز سے پڑھو گے تو وہ آپ ہی سمجھ جائیں گے کہ کلاس کام کر رہی ہے۔ انہیں خدا جانے کچھ وہم سا ہو گیا ہے کہ میں اچھی طرح کام نہیں کرتا۔

اصغر۔ جی ہاں ماسٹر جی۔ کل میں پانی پینے کے کمرے میں گیا تھا تو مہر دین چپراسی آپ کا نام لے کر کہنے لگا۔ کہ ہیڈ ماسٹر صاحب آپ سے خوش نہیں ہیں۔

ڈاکٹر یزدانی۔ ارے پھر تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کیوں خوش نہیں ہیں

اصغر۔ جی ہاں۔ میں نے پوچھا تھا۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ کیا جواب دیا اس نے؟

اصغر:۔ کہنے لگا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اور ڈرائینگ ماسٹر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اور آپ کا نام لیکر کہہ رہے تھے۔ کہ آپ جماعت میں سارا دن بیٹھے ڈاکٹری کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ لڑکوں کو کچھ نہیں پڑھاتے۔

ڈاکٹر یزدانی۔ میں اب سمجھا۔ یہ سب ڈرائینگ ماسٹر کی شرارت ہے وہ ہمیشہ میرے خلاف ہیڈ ماسٹر کے کان بھرتا رہتا ہے۔ میرا بس چلا تو اس کو ایسا مزا چکھاؤں گا۔ کہ ساری عمر یاد رکھے۔

منظور:۔ ماسٹر جی ڈرائینگ ماسٹر کیوں آپ کے خلاف ہے؟ اتوار کو ہمارا اور بی سیکشن کا فٹ بال کا میچ تھا تو وہ گراؤنڈ میں سائنس ماسٹر سے آپ کا نام لیکر کہہ رہا تھا کہ آپ لڑکوں کی ٹیوشن رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ سائنس ماسٹر نے کیا جواب دیا تھا؟

منظور:۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس رپورٹ کرنی چاہیئے۔

ڈاکٹر یزدانی۔ دیکھا۔ یہ ایک باقاعدہ سازش ہے۔ سبھی اس میں شریک ہیں۔ سائنس ماسٹر بھی میرے خلاف ہے۔ کوئی فکر نہیں۔ میں ہر ایک سے بدلہ لونگا۔

منظور:۔ ماسٹر جی فارسی کے مولوی صاحب بھی آپ کے خلاف ہیں کیا؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ کیوں انہوں نے بھی کوئی شگوفہ چھوڑا ہے؟

منظور:۔ وہ آپ کا نام لیکر کہہ رہے تھے کہ آپ کو ڈاکٹری کا ایک لفظ نہیں آتا

ڈاکٹر یزدانی:۔ اس ابابیل کے بچے کو کیا معلوم کہ ڈاکٹری کس جانور کا نام ہے .... بات یہ ہے کہ اسکول کے سب ٹیچر مجھ سے جلتے ہیں۔

اصغر:۔ ماسٹر جی۔ کیوں جلتے ہیں وہ آپ سے؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ ابے بیوقوف تو سمجھتا نہیں؟ وہ بچارے صرف اسکول ماسٹر۔

منظور:۔ اور آپ؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ میں؟ میں خدا کے فضل سے اسکول ماسٹر بھی ہوں۔ ڈاکٹر بھی ہوں۔ سوداگر بھی ہوں۔

منظور:۔ ماسٹر جی آپ کس چیز کے سوداگر ہیں؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ تو بھی گدھا ہے دیکھتا نہیں۔ باہر بورڈ لگا ہوا ہے۔

منظور:۔ وہ تو آپ کی ڈاکٹری کا بورڈ ہے۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ ابے گلی کے موڑ پر بھی تو بورڈ ہے۔

اصغر:۔ ہاں ہاں۔ ماسٹر جی وہ بورڈ جس پر لکھا ہوا ہے کہ یہاں بھیڑ۔ بکری۔ لومڑی۔ شیر چیتے۔ ہرن۔ ریچھ

خرگوش کی کھالیں بنائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ شاباش۔ تو بہت سمجھدار لڑکا ہے۔

منظور:۔ (افسردہ آواز میں) ماسٹر جی۔ میں سمجھدار لڑکا نہیں ہوں؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ تو بھی سمجھدار ہے۔ لیکن ذرا آنکھیں کھول کے چلا کر۔

اصغر:۔ ماسٹر جی، ہماری کتاب میں قوتِ مشاہدہ پر ایک سبق ہے۔ میں نے جب سے وہ سبق پڑھا ہے۔ ہر چیز کو غور سے دیکھتا ہوں۔

ڈاکٹر یزدانی۔ شاباش۔ سمجھدار لڑکے اسی طرح کیا کرتے ہیں۔

اصغر:۔ ماسٹر جی، آپ شیر اور چیتے کی کھالیں کس طرح بنا لیتے ہیں؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ میں نہیں بناتا میرے ملازم بناتے ہیں۔ اس گلی کے آخر میں ایک مکان ہے۔ وہاں کھالیں بنائی جاتی ہیں۔

اصغر:۔ ماسٹر جی، آپ ہاتھی کی کھال بنا سکتے ہیں؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ ہر جانور کی کھال بن سکتی ہے۔

منظور:۔ ماسٹر جی۔ اگر ہر جانور کی کھال بن سکتی ہے۔ تو ویسا جانور نہیں بن سکتا کیا؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ ابے نالائق۔ کھال بنانے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم زندہ جانور بنا لیتے ہیں۔ کھال بنانا اس کو کہتے ہیں کہ مردہ جانوروں کی کھالوں کو صاف کیا جاتا ہے۔ اور رنگا جاتا ہے

اصغر:۔ ماسٹر جی، پھر یہ کھالیں کس کام آتی ہیں؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ فرش پر بچھائی جاتی ہے، بعض لوگ دیواروں میں بھی لٹکاتے ہیں۔ سوٹ کیس، بوٹ اور چمڑے کا سامان بنتا ہے۔

اصغر:۔ ماسٹر جی پھر تو آپ کے پاس بڑی دولت ہوگی۔ آپ ماسٹر بھی ہیں، ڈاکٹر بھی ہیں اور کھال کے سوداگر بھی ہیں۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ ابھی تو میں دولت مند نہیں بنا۔ آہستہ آہستہ بن جاؤں گا۔ یہی وجہ ہے کہ باقی ٹیچر مجھ سے جلتے ہیں۔

اصغر:۔ ماسٹر جی۔ جب آپ کے پاس بڑی دولت آجائے گی پھر آپ کیا کریں گے؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ پھر؟ پھر میں ٹھنڈی سڑک پر کوٹھی لونگا موٹر رکھوں گا۔ میرے پاس بہت سے نوکر ہوں گے اور .... دیکھو اصغر۔ منظور۔ کسی سے ذکر نہ کرنا۔

اصغر منظور۔ (یک دفت) ہم کسی سے نہیں کہیں گے۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ (قدرے آہستہ آواز سے۔ پھر ہیڈ ماسٹر اور باقی ٹیچر میرے مکان پر آئیں گے تو میں اُن سے بات بھی نہیں کرونگا

اصغر:۔ ماسٹر جی! ہم سے تو آپ بات کریں گے نا؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ تم تو میرے شاگرد ہو۔ تم سے میں بہت اچھا سلوک کروں گا۔ (ایک دم جیسے بھولی ہوئی بات یاد آجائے) دیکھو اصغر، تم پچھلے مہینے کی تنخواہ اب تک نہیں لائے یہ مہینہ بھی ختم ہو رہا ہے۔ کل اکتوبر کی تنخواہ ضرور لے آنا۔

اصغر:۔ ماسٹر جی! ابا کہتے تھے کہ اس مہینے ہمارا بہت خرچ ہوا ہے پہلی تاریخ کو آپ کو دو مہینے کی اکٹھی تنخواہ دس روپے دے دیں گے۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ اپنے ابا سے کہنا کہ پانچ روپے مہینہ بہت تھوڑا ہے۔ اب میں تم کو ایک گھنٹے کی بجائے دو گھنٹے پڑھاتا ہوں تنخواہ زیادہ ہونی چاہیئے۔

اصغر:۔ ماسٹر جی! ابا کہتے تھے کہ تو وظیفہ لے گا تو تیرے ماسٹر صاحب کو خوش کر دینگے۔

ڈاکٹر یزدانی: محنت سے پڑھا کرو۔ منظور تو بھی اپنے ابا سے کہنا کہ پانچ روپے مہینہ تھوڑا ہے۔

منظور:۔ اچھا ماسٹر جی! ابا کہتے تھے کہ اتوار کو دفتر سے چھٹی ہوگی تو تیرا امتحان لونگا۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ سخت محنت کرو۔

اصغر اور منظور پڑھنے لگتے ہیں۔ اصغر کی آواز بلند ہے۔ وہ کہتا ہے "لاہور بہت پرانا شہر ہے اور اپنی تاریخی عمارتوں کی وجہ سے مشہور ہے اس کا تاج محل، لال قلعہ اور قطب صاحب کی لاٹ ہے"۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ (چونک کر) رے نالائق کیا پڑھ رہا ہے؟ تاج محل تو آگرے میں ہے۔ تجھے اتنا بھی معلوم نہیں۔ لال قلعہ اور قطب صاحب کی لاٹ دہلی کی مشہور عمارتیں ہیں تجھے کس نے بتایا ہے کہ یہ عمارتیں لاہور میں ہیں؟

اصغر:۔ ماسٹر جی! جغرافیہ کے ماسٹر صاحب نے بتایا تھا۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ غلط ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کہہ سکتے۔ تاج محل شاہجہاں بادشاہ کی ملکہ کا مقبرہ ہے اور دنیا میں سب سے خوبصورت عمارت ہے۔ یہ وہی شاہجہاں ہے جس کی لڑکی ایک دفعہ سخت بیمار ہو گئی تھی تو ایک انگریز ڈاکٹر نے علاج کیا تھا اور وہ تندرست ہو گئی تھی۔ اس وقت سے انگریز ہندوستان میں آنا شروع ہوئے۔

اصغر:۔ ماسٹر جی! وہ انگریز بڑا لائق ڈاکٹر ہوگا۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ اور کیا۔ لائق ڈاکٹر ہی تھا جو بادشاہ نے اپنی لڑکی کے علاج کے واسطے بلایا تھا۔

منظور:۔ ماسٹر جی! آپ بھی تو ڈاکٹر ہیں۔ شاید آپ کو بھی کوئی بادشاہ اپنی لڑکی کے علاج کے لئے بلا لے۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ میں ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہوں۔

منظور:۔ ماسٹر جی! ہومیوپیتھک کس کو کہتے ہیں؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ ہومیوپیتھک ڈاکٹر آپریشن نہیں کرتے صرف کھانے کی دوا دیتے ہیں۔ اسی سے فائدہ ہو جاتا ہے۔

اصغر:۔ ماسٹر جی! میرا ایک دوست نذیر ہے وہ کہتا ہے کہ اسکی بہن کا بڑے ہسپتال میں آپریشن ہوا تھا۔ وہ تو مر گئی تھی۔

ڈاکٹر یزدانی:۔ ہاں۔ آپریشن میں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور بہت سے مریض مر بھی جاتے ہیں۔ ہومیوپیتھک دوا کھانے سے آپریشن کی ضرورت نہیں رہتی۔

اصغر:۔ ماسٹر جی! ہومیوپیتھک دوا بہت کڑوی ہوتی ہوگی؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ بالکل نہیں۔ ہومیوپیتھک دوائیں شکر کی طرح میٹھی ہوتی ہیں۔

اصغر:۔ ماسٹر جی! پھر تو بڑا مزہ رہتا ہوگا۔ گرمی کی چھٹیوں میں مجھے بخار ہو گیا تھا۔ تو ابا مجھ کو سخت کڑوی دوا پلاتے تھے میں ان سے کہوں گا۔ ہومیوپیتھک دوا لایا کریں ماسٹر جی بخار کی دوا بھی میٹھی ہوتی ہے کیا؟

ڈاکٹر یزدانی۔ ہاں۔ بخار کی دوا بھی میٹھی ہوتی ہے تم اپنے ابا سے کہنا کہ گھر میں اگر کوئی بیمار ہو جائے تو مجھ کو بلا لیا کریں منظور تو بھی اپنے ابا سے کہنا۔

اصغر منظور۔ (بیک وقت) اچھا ماسٹر جی!

ڈاکٹر بیزدانی:۔ ہومیوپیتھک علاج سے بہت جلد آرام ہوجاتا ہے اپنے ابا سے کہہ دینا کہ میں اُن سے فیس نہیں لونگا صرف دوا کی قیمت لے لیا کروں گا۔

منظور:۔ ماسٹر جی، کمیٹی کے ہسپتال سے دوا مفت ملتی ہے

ڈاکٹر بیزدانی:۔ ارے کمیٹی کا ہسپتال کیا چیز ہے۔ وہاں تو بوتلوں میں پانی رکھا رہتا ہے۔ میری دوائیں بہت قیمتی ہیں۔ اپنے ابا سے کہنا کہ میں اُن سے قیمت میں بھی رعایت کردونگا

منظور:۔ اچھا ماسٹر جی۔

اصغر:۔ ماسٹر جی۔ آپ کو ڈاکٹری سے بھی بہت آمدنی ہوتی ہوگی؟

ڈاکٹر بیزدانی:۔ ابھی تو زیادہ آمدنی شروع نہیں ہوئی۔ جب میں اپنا دواخانہ ٹھنڈی سڑک پر لے جاؤں گا۔ پھر بہت آمدنی ہوگی۔

اصغر:۔ پھر تو آپ کوٹھی اور موٹر لے لیں گے؟

منظور:۔ ماسٹر جی۔ موٹر میں ہمیں بھی آپ بٹھایا کریںگے؟

ڈاکٹر بیزدانی:۔ ہاں۔ ہاں۔ میں اپنے شاگردوں کو کبھی نہیں بھولوں گا۔

منظور:۔ میں ہر روز دعا مانگا کرونگا کہ خدا آپ کو جلد دولت دے۔

اصغر:۔ ماسٹر جی، میں بھی بڑا ہو کر ہومیوپیتھک ڈاکٹر بنوں گا ہومیوپیتھک ڈاکٹری کا اسکول کہاں ہے؟

ڈاکٹر بیزدانی:۔ ہومیوپیتھک ڈاکٹری کا سب سے بڑا کالج کلکتہ میں ہے۔

اصغر:۔ ماسٹر جی، آپ نے کلکتہ دیکھا ہے کیا؟

ڈاکٹر بیزدانی:۔ نہیں میں کلکتہ نہیں گیا۔ میں نے یہیں امتحان پاس کر لیا تھا۔

اصغر:۔ میں انٹرنس پاس کرکے ابا سے کہوں گا کہ مجھ کو کلکتہ بھیج دیں۔ میں وہاں ہومیوپیتھک ڈاکٹری پڑھوں گا۔ پھر میں بھی بڑا امیر ہو جاؤں گا۔

منظور:۔ ماسٹر جی، انٹرنس پاس کرنے سے پہلے آدمی ڈاکٹر نہیں بن سکتا؟

ڈاکٹر بیزدانی:۔ نہیں۔

منظور:۔ اچھا۔ میں بھی انٹرنس پاس کرکے ابا سے کہوں گا کہ مجھ کو کلکتہ بھیج دیں۔

اصغر:۔ ماسٹر جی کلکتہ بڑا شہر ہے یا لاہور؟

ڈاکٹر بیزدانی:۔ کلکتہ لاہور سے بہت بڑا ہے۔ لاہور تو کلکتہ سے آدھا بھی نہیں۔

اصغر:۔ ماسٹر جی، ڈرائینگ ماسٹر کا لڑکا کہتا تھا کہ لاہور ہندوستان میں سب سے بڑا شہر ہے۔

ڈاکٹر بیزدانی اس جانور کو کیا معلوم۔ جیسا باپ ویسا بیٹا۔ دونوں جاہل ہیں۔

اصغر:۔ اب میں اس کو بتاؤں گا۔ کہ انٹرنس کرکے میں ہومیوپیتھک ڈاکٹری پڑھنے کلکتہ جاؤں گا۔ ماسٹر جی وہ سنے گا تو بہت جلے گا۔

ڈاکٹر بیزدانی:۔ دیکھو اصغر تم بھی سنو منظور۔ اگر تم سے کوئی میرا نام لے کر پوچھے کہ تم ماسٹر صاحب کے گھر میں پڑھتے ہو تو کہنا نہیں۔

اصغر:۔ کیوں ماسٹر جی۔ ہم تو آپ کے گھر آکر پڑھتے ہیں۔

ڈاکٹر بیزدانی:۔ اسی لئے پڑھتے تو ہو لیکن کسی دوسرے ماسٹر کو نہ بتانا۔

سارا اسکول مجھ سے حسد کرتا ہے۔ یہ بات ہیڈ ماسٹر صاحب کے کانوں تک جا پہنچے گی۔ پرائیویٹ ٹیوشن منع ہے۔

اصغر اور منظور۔ (بیک وقت) اچھا ماسٹر جی۔ ہم نہیں بتائینگے

(گلی میں تیز تیز قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے حیدر داخل ہوتا ہے)

حیدر۔ ڈاکٹر صاحب تسلیمات۔

ڈاکٹر یزدانی۔ (کرسی سے اٹھتے ہوتے) آیئے آیئے شیخ صاحب آپ کا مزاج تو اچھا ہے۔ بہت دنوں کے بعد آپ کی زیارت ہوئی ہے تشریف رکھیئے نا۔

حیدر۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) جی ہاں۔ آجکل مصروفیت کچھ زیادہ ہے پچھلی مرتبہ آپ سے ملاقات بیڈن روڈ پر ہوئی تھی۔

ڈاکٹر یزدانی۔ ابھی اس واقعہ کو بھی تین مہینے گذر چکے ہیں اسکے بعد تو آپ نظر ہی نہیں آئے (اصغر اور منظور کی طرف متوجہ ہو کر) لڑکو تم جاؤ۔ جو کچھ میں نے آج پڑھایا ہے، اچھی طرح یاد کرنا سمجھے۔ جاؤ۔ اب چھٹی ہے۔

اصغر اور منظور۔ (بیک وقت) ماسٹر جی سلام

ڈاکٹر یزدانی۔ سلام

(اصغر اور منظور جاتے ہیں۔)

حیدر۔ ڈاکٹر صاحب آپ گھر میں بھی لڑکوں کو پڑھاتے ہیں کیا؟

ڈاکٹر یزدانی۔ نہیں تو، ہمارے اسکول میں پرائیویٹ ٹیوشن کی ممانعت ہے۔ یہ بیچارے دو یتیم لڑکے ہیں نہایت نادار اور مسکین۔ کبھی کبھی مجھے فرصت ہوتی ہے تو گھڑی دو گھڑی کے لئے کچھ پوچھنے آجاتے ہیں۔

حیدر۔ کہیئے آجکل کیسے گذر رہی ہے؟

ڈاکٹر یزدانی۔ شکر ہے۔ زندگی کا جو لمحہ گزر جائے غنیمت ہے۔

حیدر۔ ڈاکٹر صاحب! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ مجبوری کا نام شکر ہے۔

ڈاکٹر یزدانی۔ بھائی پھر کیا کیا جائے۔ حالات ہی ایسے ہیں کہ صبر و شکر کے سوا چارہ نہیں۔

حیدر۔ حالات کو سنوارنا اور بگاڑنا ایک حد تک اپنے اختیار میں ہوتا ہے

ڈاکٹر یزدانی آپکا ارشاد درست سہی لیکن میری طرف دیکھئے کہ صبح سے شام تک محنت کرتا ہوں۔ پھر بھی کچھ نہیں بنتا۔ کون شخص بھی خوشحال زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ تنہا محنت سے حالات درست نہیں ہو سکتے۔ محنت کے علاوہ اتفاقات بھی ہوتے ہیں ہم تو اب تک اس انتظار میں رہے کہ ہمیں بھی آگے بڑھنے کا موقع ملے لیکن شومئی قسمت سے موقع ہی نہیں ملا۔

حیدر۔ ڈاکٹر صاحب! معاف کیجیئے گا۔ یہی تو آپ کی غلطی ہے موقع کا انتظار نہیں کیا جاتا۔ موقعے تو خود پیدا کئے جاتے ہیں۔ نیپولین کا واقعہ آپ نے نہیں سنا؟

ڈاکٹر یزدانی۔ کون سا واقعہ۔

حیدر۔ نیپولین نے جب غنیم کے مقابلے میں لودی کا پل عبور کرنا چاہا تو دشمن کی طرف سے بے پناہ گولیوں کی بارش ہو رہی تھی، نیپولین کے جرنیلوں نے کہا کہ ابھی پل عبور کرنے کا موقع نہیں ہے۔ تو نیپولین نے ہنس کر جواب دیا۔ کہ میں موقع کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ بلکہ موقع خود پیدا کر لیا کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے پل کو عبور کر گیا۔

ڈاکٹر یزدانی۔ کہاں نیپولین اور کہاں ہم۔ کہاں راجہ بھوج

اور کہاں گنگو تیلی۔ شیخ صاحب! آپ ذرا دیکھئے کہ میں نے آپ کے قول کے مطابق موقعے وضع کرنے میں کتنی کوشش کی ہے اسکول ماسٹری اختیار کی، ہومیوپیتھک پریکٹس شروع کی، کھالوں کا کاروبار جاری کیا۔ لیکن جو حالت آج سے تین برس پہلے تھی وہی اب ہے۔

حیدر۔ آپ نے سنا ہوگا کہ کثرتِ تعبیر سے خواب پریشان ہو جاتا ہے۔ یہی حالت عملی زندگی کی ہے۔ ایک ہی وقت میں اگر بہت سے کام شروع کر دئیے جائیں تو کوئی کام بھی پورا نہیں ہوتا۔ توجہ بٹ جانے کے باعث یکسوئی نہیں رہتی۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ہم ایک کام بھی پوری محنت اور دلجمعی سے نہیں کر سکتے۔ اگر آپ نے اسکول ماسٹری اختیار کی تھی تو آپ کو چاہیئے تھا کہ یکسر اسی کام کے ہو رہتے! اسکے علاوہ اگر کچھ اور کرنے کو جی چاہتا تھا۔ تو ایسا کام کرتے جس کا تعلق براہِ راست درس و تدریس کے ساتھ ہوتا مثلاً تصنیف و تالیف کا کام۔ لیکن تعجب ہے کہ آپ نے بیک وقت ایسی کشتیوں میں پاؤں رکھ دئے، جو مختلف سمتوں کو جا رہی ہیں۔ آپ ہی سوچئے کہ کہاں اسکول ماسٹری اور کہاں کھال کا کاروبار۔

(ہلکا سا قہقہہ)

ڈاکٹر یزدانی۔ شیخ صاحب! میری حالت پر غور کیجئے کہ آج چھ سال سے اسکول میں ملازم ہوں۔ ۱۰ روپے تنخواہ چھیالیس سے نہیں بڑھی۔ پہلے سالانہ ترقی دو روپے تھی۔ اب ایک روپیہ ہو گئی ہے۔ پرائیویٹ ٹیوشن منع ہے۔ سرکاری ملازمت ہو تو کم از کم یہ اطمینان رہتا ہے۔ کہ نوکری مستقل ہے۔ لیکن انجمن کا اسکول ہے اور ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ شاید آج ہی جواب مل جائے۔ ہیڈ ماسٹر اور سیکنڈ ماسٹر کے علاوہ انجمن کے بیسیوں ممبروں کی خوشامد کرنا پڑتی ہے پھر بھی شکوہ و شکایت کا دفتر کھلا رہتا ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ اگر اس نوکری پر قناعت کر کے بیٹھ رہوں تو کیا انجام ہوگا۔ لاہور شہر میں زندگی گزارنا بھی پُل صراط پر چلنے کے برابر ہے۔

حیدر۔ جو کچھ آپ نے فرمایا۔ درست ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ان حالات میں ہومیوپیتھک پریکٹس اور کھالوں کے کاروبار کا جھنجھٹ مول لینے سے آپ کا کیا مقصد تھا؟

ڈاکٹر یزدانی:۔ تین سال ہوئے ایک دوست کے سامنے یہی رونا رویا تھا تو اس نے مشورہ دیا تھا کہ ہومیوپیتھی کے کام میں بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ اسکول کی نوکری کے ساتھ ساتھ یہ پیشہ بھی اختیار کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ اُن کی ہدایت کے مطابق میں نے چھ مہینے گھر میں ہومیوپیتھی کا مطالعہ کیا۔ اور کچھ روپے خرچ کر کے ایم۔ بی کی سند بھی حاصل کی۔ خیال تھا کہ آہستہ آہستہ کام چل نکلے گا لیکن قسمت ایسی خراب نکلی کہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اب روزانہ کبھی چار آنے آتے ہیں کبھی چھ آنے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

حیدر۔ ہومیوپیتھی کی پریکٹس میں تو لوگ کافی کما رہے ہیں۔ آپ کی ناکامی کی کیا وجہ ہے؟

ڈاکٹر یزدانی۔ میری ناکامی کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس محلہ میں بہت غریب لوگ رہتے ہیں وہ دوا کی قیمت برداشت نہیں کر سکتے۔ کمیٹی کے ہسپتال سے انہیں دوا مفت مل جاتی ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ میں چھ سال سے اسی محلہ میں رہتا ہوں محلے کے تمام لوگ ابتدا سے مجھے

اسکول ماسٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اب میں اُن کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر بن گیا ہوں۔ وہ حیران ہیں کہ نہ یہ کسی میڈیکل کالج میں داخل ہوا اور نہ اس کا آبائی پیشہ ڈاکٹری ہے۔ یہ کہاں کا ڈاکٹر ہے۔ اِس لئے انہیں میرے علاج پر اعتماد نہیں۔ میں خواہ مسیحائے زماں اور جالینوس دوراں کیوں نہ بن جاؤں۔ سوال یہ ہے کہ لوگوں کو میری قابلیت پر اعتماد ہے یا نہیں۔ اگر انہیں اعتماد نہیں ہے تو پھر میری حذاقت کے تمام دعوے بیکار ہیں۔

حیدر۔ فرض کیجئے کہ آپ اپنا مطب یہاں سے تبدیل کر لیتے ہیں۔ کیا اُس صورت میں کامیابی کی توقع ہے؟

ڈاکٹر یزدانی۔ میں کچھ عرصے سے اِس تجویز پر بھی غور کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اِس پیشے میں ترقی کی گنجائش تو یقیناً ہے لیکن دقت صرف اس لئے پیدا ہو رہی ہے کہ میرے پاس روپیہ نہیں۔ اگر میں اپنی سکونت اِسی مکان میں رکھوں اور مطب کسی اچھی جگہ لے جاؤں تو ظاہر ہے کہ اچھی جگہ کا کرایہ بھی زیادہ ہوگا۔ اِس کے علاوہ دواؤں کا اسٹاک بھی زیادہ رکھنا پڑے گا۔ اس پر ایک معقول رقم خرچ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اب غور فرمائیے کہ محض اِن ابتدائی انتظامات کے لئے کس قدر سرمایہ درکار ہے اور یہاں اپنی شانِ قلندری کی یہ کیفیت ہے کہ آج کی روٹی آج مل جاتی ہے اور کل کی روٹی کی فکر کل کرنا پڑتی ہے۔

حیدر۔ بیڈن روڈ اور نسبت روڈ ہومیوپیتھک ڈسپنسری کے لئے نہایت اچھے مقام ہیں۔

ڈاکٹر یزدانی۔ لیکن یہ تو سوچئے کہ بیڈن روڈ اور نسبت روڈ پر معمولی سی دکان کا کرایہ بھی بیس روپے سے کم نہ ہوگا کہیں سے چار پانسو روپیہ قرض مل جائے تو میں اچھے پیمانے پر کام شروع کر سکتا ہوں۔

حیدر۔ قرض تو آجکل مل نہیں سکتا۔ اپنی ہمت سے روپیہ پیدا کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر یزدانی۔ اگر مجھے پریکٹس سے چالیس روپے ماہوار آمدنی شروع ہو جائے تو میں فوراً اسکول کی ملازمت چھوڑ دوں گا نوکری تو لعنت ہے۔

حیدر۔ کھالوں کے کاروبار میں آپ کو کچھ فائدہ ہوا یا نہیں؟

ڈاکٹر یزدانی۔ یہ قصہ بھی سُن لیجئے۔ سال بھر ہوا اِس گلی میں دو بھائی آ کر رہے تھے۔ یہ چمڑا رنگنے کا کام کرتے تھے۔ فرصت میں میرے پاس بھی گاہے گاہے آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ باتوں باتوں میں اُن سے اِس بزنس کے متعلق بھی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ وہ تھے غریب لیکن محنتی بہت تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ اگر میں اُن کے کام میں شریک ہو جاؤں تو وہ منافع کا نصف حصہ مجھ کو دیا کریں گے۔ اُنہیں اُس وقت ساٹھ روپے کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے یہ رقم اُن کو دے دی۔ اور باقاعدہ شرکت کا کاغذ لکھا گیا۔ چھ مہینے سے یہ شرکت جاری ہے اور اب تک مجھ کو صرف پانچ روپے منافع کے ملے ہیں۔

حیدر۔ لیکن گلی کے موڑ پر بورڈ تو آپ نے ایسا شاندار لگا رکھا ہے کہ گویا دنیا بھر کے جانوروں کی کھالیں یہیں اُتاری جاتی ہیں۔ بورڈ پڑھ کر تو میں ڈر گیا تھا کہ کہیں میری کھال بھی نہ اُتار لی جائے۔

ڈاکٹر یزدانی۔ (ہنس کر) آخر اشتہار میں مبالغہ بھی تو ہونا چاہئے نا۔

حیدر۔ میری رائے اگر آپ قبول کریں تو میں عرض کروں گا کہ

خدارا ایک کام اختیار کیجئے۔ خواہ اسکول کی نوکری ہو یا ہومیوپیتھی کی پریکٹس یا کھالوں کا بزنس، اپنی طبیعت کے مطابق ایک پیشہ انتخاب کر لیجئے اور پھر سر توڑ محنت کیجئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی نہ ہو۔

ڈاکٹر یزدانی۔ میرا میلان تو ہومیوپیتھی کی طرف ہے۔

حیدر۔ بس پھر اللہ کا نام لیجئے اور سب کام چھوڑ کر اسی طرف متوجہ ہو جائیے۔

ڈاکٹر یزدانی۔ لیکن روپے کا انتظام کیونکر ہوگا۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے یہاں سے مطب اُٹھا کر کسی اچھی جگہ لے جانے کے لئے کافی روپیہ درکار ہے۔

حیدر۔ آپ کو پانسو روپیہ کافی ہوگا؟

ڈاکٹر یزدانی۔ اگر پانسو مل جائیں تو اور کیا چاہئے؟

حیدر۔ آپ کو شاید معلوم نہیں۔ دو مہینے ہوئے میں انسپکٹر ہو گیا ہوں۔

ڈاکٹر یزدانی۔ خوب، خوب۔ بھئی مبارک ہو۔ واللہ آپ قسمت کے دھنی ہیں۔ تعجب ہے آپ نے اب تک یہ بات چھپا کیوں رکھی۔ شاید اس خوف سے کہ دوستوں کو پتا چل گیا تو وہ دعوت کا تقاضا کریں گے۔

حیدر۔ آپ ایک چھوڑ، دو دعوتیں لیجئے۔ میں حاضر ہوں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے انسپکٹری حاصل کرنے کے لئے میں نے مسلسل تین برس کتنی محنت کی ہے۔ انشورنس ایجنٹ کا کام آسان نہیں ہے۔ ایک ایک آدمی کے پیچھے کئی کئی مہینے خراب کرنا پڑتے ہیں۔ پھر بھی بعض اوقات ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر انسان شروع ہی میں گھبرا جائے تو اس بیل کا منڈھے چڑھنا ممکن نہیں۔

ڈاکٹر یزدانی۔ واقعی آپ کی محنت کی داد دینا چاہئے۔ آپ نے گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی کی پروا نہیں کی۔ ہمیشہ کام کو مقدم سمجھا۔ جس جانفشانی سے آپ اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اب تو آپ کو معقول تنخواہ ملتی ہوگی؟

حیدر۔ دو سو روپیہ مقرر ہوئی ہے۔ انشاءاللہ سال بھر کے بعد ڈھائی سو کے گریڈ میں آجاؤں گا۔

ڈاکٹر یزدانی۔ خوب۔ خدا مبارک کرے۔ آپ کی ترقی ہمیشہ آپ کے دوستوں کے لئے خوشی اور عزت کا باعث ہوتی ہے۔ ہم پر بھی نظر عنایت رکھیئے گا۔

حیدر۔ ڈاکٹر صاحب! ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے۔ اگر آپ اُس پر عمل کریں تو پانسو روپیہ بہت معمولی شرح سُود پر قرض مل سکتا ہے۔

ڈاکٹر یزدانی۔ فرمائیے۔ کیا تجویز ہے وہ؟

حیدر۔ اگر آپ ہماری کمپنی میں پانچہزار روپے میں زندگی کا بیمہ کرا لیں تو میں کوشش کر کے کمپنی سے آپ کو قرضہ دلوا دوں گا۔ یُوں تو کمپنی بے حد مشکلوں سے کسی کو قرض دینے پر آمادہ ہوتی ہے لیکن آپ کے معاملہ میں میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر یزدانی۔ یہ بتائیے کہ اگر میں پانچہزار میں بیمہ کراؤں تو مجھے کتنا پریمیم ادا کرنا پڑے گا؟

حیدر۔ میں حساب کر کے بتاتا ہوں (وقفہ) اگر بیس سال کے واسطے پانچ ہزار میں بیمہ کرائیں تو آپ کو ایک سو اسی روپے سالانہ ادا کرنا ہوں گے۔

ڈاکٹر یزدانی۔ (آواز میں گھبراہٹ اور بے ساختہ تعجب) ایک

..سُو .. اسّی .. روپے !! توبہ . اِتنی بڑی رقم میرے پاس موجود ہو تو مجھے قرض لینے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟

حیدر ۔ اگر آپ سالانہ پریمیم نہیں ادا کرسکتے تو تو تے رُپیے ششماہی ہی ادا کر دیجئے ۔ آپ ذرا اِس رعایت پر بھی تو غور کیجئے کہ آپ کو پہلا ہی پریمیم ادا کرنے کے بعد پانسو روپیہ لوا دُونگا ۔ آپ آج نوتّے روپے کی قسط ادا کیجئے اور میں ایک ہفتے میں آپ کو پانسو کی رقم لئے دیتا ہوں ۔

ڈاکٹر یزدانی ۔ سہ ماہی قسط ادا کرنے پر قرض نہیں مل سکتا کیا ؟

حیدر ۔ جی نہیں ۔ پہلا پریمیم آپ کو چھ مہینے کے لئے ادا کرنا پڑیگا . بعد میں آپ سہ ماہی قسط مقرر کرسکتے ہیں ۔

ڈاکٹر یزدانی ۔ شیخ صاحب ! یہ تجویز تو واقعی بہت اچھی ہے ۔ لیکن مجھے اجازت دیجئے کہ میں ذرا گھر میں مشورہ کر لُوں ۔

حیدر ۔ ضرور ۔ ہوم گورنمنٹ کا مشورہ تو بہرصورت مقدم ہے .

(ہلکی سی ہنسی)

(ڈاکٹر یزدانی دروازہ کھول کر زنانخانے میں داخل ہوتے ہیں ۔ کواڑ کھلنے اور بند ہونے کی آواز ۔ ڈاکٹر یزدانی کے قدموں کی چاپ)

زینب ۔ (طنز سے) کیا چھٹی کے دن آپ نے گھر میں داخل ہونے کی قسم کھا رکھی ہے ؟

ڈاکٹر یزدانی ۔ تمہاری تو عادت سی ہوگئی ہے کہ ہر بات میں میخ نکالتی ہو ۔ میری مجبوریوں کو بھی دیکھا کرو ۔

زینب ۔ (تیز آواز میں) بھاڑ میں جائیں آپ کی مجبوریاں ۔ آپ ہر وقت میری ہی عادتوں کو بُرا کہتے ہیں ۔ کوئی اچھی عادتوں والی گھر میں لے آؤ ۔

ڈاکٹر یزدانی ۔ (بہت نرمی سے) خدا کے واسطے آہستہ بولو ۔ میں تمہیں ایک نہایت خوشی کی بات سُنانے آیا ہوں ۔ دیکھو تو ۔ اب اِنشاءاللہ ہمارے گھر میں روپے کی ریل پیل ہو جائے گی .

(مصنوعی طور پر کھانستے ہوئے) بات یہ ہے کہ میرے ایک دوست ہیں شیخ حیدر علی ۔ وہ ایک بہت بڑی بیمہ کمپنی کے انسپکٹر ہیں ۔ شہر میں اُن کی بڑی عزت اور بڑا رسوخ ہے ۔ وہ میری مدد کرنا چاہتے ہیں (مصنوعی کھانسی) بات یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ میرا ڈاکٹری کا کام ترقی کر جائے ۔ تم بھی ذرا سوچونا ۔ اگر ڈاکٹری کا کام بڑھ جائے تو سَو ڈیڑھ سَو روپیہ مہینہ آمدنی ہوسکتی ہے ۔

زینب ۔ پانچ سال ہوگئے ہیں میری شادی کو ۔ میں تو پہلے دن سے یہی سُن رہی ہوں کہ بس آج ڈیڑھ سَو کی آمدنی ہوئی جاتی ہے ۔ خدا جانے وہ کونسا آج ہوگا جب شیخ چلی کے خواب پُورے ہونگے ۔ شکر نہیں کرتے کہ اسکول سے چھیالیس رُپیے مہینہ مل جاتے ہیں اور دال روٹی چل رہی ہے ورنہ آپ کے لچھن تو ایسے تھے کہ آج گھر میں بھُونی بھانگ نہ ہوتی ۔

ڈاکٹر یزدانی ۔ میں کون سے سیر تماشے پر روپیہ خراب کرتا ہوں ۔ معمولی دال روٹی کھاتا ہوں اور موٹا جھوٹا پہنتا ہوں ۔

زینب ۔ اپنا موٹا جھوٹا گِنتے ہو ۔ میں نے جو ریشم اور کمخاب پہن رکھا ہے وہ اُتر والو ۔ اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر میں نے سَو روپیہ جمع کیا تو وہ آپ نے ڈاکٹری کی کتابوں اور دواؤں پر لُٹا دیا ۔ پھر ہزار مصیبتوں سے میں نے ساٹھ رُپیے جمع کئے تو وہ آپ نے اُس نامراد کھال رنگنے والے کو دے دیئے ۔

ڈاکٹر یزدانی ۔ خدا کی قسم ۔ میرا دل ہی جانتا ہے کہ مَیں تمہاری اِس قربانی کا کِتنا شکرگزار ہوں ۔ کوئی اَور عورت ہوتی تو

یہ ایثار کبھی نہ کرتی لیکن مجھے اُمید ہے کہ اِس مرتبہ تم ضرور میری مدد کرو گی۔

زینب۔ (ذرا نرم ہو کر) شکر گزاری کی کونسی بات ہے۔ سارا گھر آپ ہی کا ہے۔ مجھے تو وہ وقت دیکھنا چاہئیے ہیں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔

ڈاکٹر یزدانی۔ (مصنوعی طریقے سے کھانستے ہوئے) بات یہ ہے کہ حیدر صاحب کہتے ہیں کہ اگر میں اپنی زندگی کا بیمہ کرا لوں۔ تو مجھے کمپنی سے فوراً پانسو روپیہ قرض مل سکتا ہوں۔

زینب۔ (تیز ہو کر) اب قرض اُٹھانے پر آگئے ہو۔ شرم تو نہیں آتی۔ یہ جو گھر میں چند چیزیں نظر آتی ہیں اِن کو سُود میں دے دینا اور پھر گلے میں جھولی ڈال کر در بدر مانگتے پھرنا۔ میرا اور بچوں کا خدا حافظ۔

ڈاکٹر یزدانی۔ تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔

زینب۔ آپ صاف صاف کہئے کہ آپ کا مطلب کیا ہے؟

ڈاکٹر یزدانی۔ سیدھی سی بات ہے۔ تم تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ اگر میں اپنی زندگی کا بیمہ کرا لوں تو اِس وقت مجھے نوّے روپے کی قسط ادا کرنا ہو گی اور ایک ہفتے میں مجھے کمپنی پانسو روپیہ قرض دے دیگی۔ اِس پانسو روپے سے مَیں اپنا مطلب بیڈن روڈ پر لے جاؤں گا اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ پہلے مہینے سوسوا سو کی آمدنی ہو جائے گی۔

زینب۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اِس وقت نوّے روپے آئیں کہاں سے؟

ڈاکٹر یزدانی۔ (مصنوعی کھانسی کے ساتھ) بات یہ ہے کہ بُرا نہ مانو تو میں کہوں کہ (مصنوعی کھانسی) اگر تم مجھے اجازت دو تو میں تمہارا کچھ زیور گروی رکھ دوں۔

زینب۔ (چیختے ہوئے) ہائے اللہ —— اب اِن باتوں پر اُتر آئے ہو۔ نکھٹوؤں اور جواریوں کی طرح گھر کا زیور بیچتے پھرتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ گھر میں جھاڑو پھیر دو۔ بچوں کو یتیم خانے داخل کرا دو اور مجھے میکے بھیجدو۔ پھر جو جی میں آئے کر لینا۔

ڈاکٹر یزدانی۔ آہستہ بولو چیختی کیوں ہو؟

زینب۔ (بلند آواز میں) میں کیوں آہستہ بولوں۔ مَیں چیخوں گی۔ تم میرا گھر بار لُٹا رہے ہو اور مَیں چُپ بیٹھی رہوں۔ (ایک دم مطلب کے دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے) کون ہے تمہارا مُنڈی کاٹا دوست جو تمہیں یہ مشورہ دینے آیا ہوں۔ میں جا کر خود اُس سے پُوچھتی ہوں۔

(ڈاکٹر یزدانی زینب کو دونوں شانوں سے پکڑ کر پیچھے کو دھکیلتے ہیں)

ڈاکٹر یزدانی۔ خدا کے لئے صبر کرو۔ کیوں طوفان اُٹھا رہی ہو؟

(زینب ڈاکٹر یزدانی کو دھکا دے کر مطلب کے دروازے کی طرف بڑھتی ہے)

زینب۔ (چیختے ہوئے) میں اِس دوستی کے پردے میں دشمنی کرنے والے سے پوچھوں گی وہ خود جا کر اپنی بیوی کا زیور کیوں نہیں بیچتا۔ اُس کے گھر میں بیوی بچے نہیں ہیں کیا؟ خدا غارت کرے ایسے دوستوں کو، جو لوگوں کے گھروں میں فساد ڈلواتے ہیں۔ جہنم میں جائیں یہ دوست!

(زینب کی آواز حیدر سُن رہا ہے۔ اِس کشمکش میں زینب مطب کے دروازے تک پہنچ جاتی ہے)

ڈاکٹر یزدانی۔ (کواڑ پر زور سے ہاتھ مار کر اندر سے بولتا ہے)

حیدر صاحب! اِس وقت آپ تشریف لے جائیے۔ معاف کیجئے گا مجبوری ہے۔ انشاء اللہ پھر کسی روز ملاقات ہوگی۔

حیدر۔ (مطب کے اندر سے گھبرائی ہوئی آواز میں) بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ میں جاتا ہوں، جاتا ہوں ...... خدا حافظ .... خدا حافظ۔

ڈاکٹر یزدانی۔ (گھبراہٹ میں چلا کر) خدا حافظ!!

زینب۔ میرے گھر میں قدم رکھا تو ...... ڈاکٹر یزدانی اپنا ہاتھ زینب کے منہ پر رکھ دیتا ہے)

(دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کے کھڑاکے)

حیدر۔ (باہر گلی میں جا کر بڑبڑاتا ہے) بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا اِس عورت نے .... ورنہ یاروں نے تو آج ڈاکٹر کا بیمہ کر ہی لیا تھا۔

شہکار

ستاروں کو جو شرمائے وہ تصویرِ حسیں دیدے
مَیں اِس نقشِ حسیں کو اپنی آنکھوں سے لگاؤں گا
مَیں تیرے حُسن کا پیکر تصوّر میں بساؤں گا
مجھے اے ماہ وش اپنا یہ عکسِ دل نشیں دیدے

سحر کو جب ہوا دھیمے سُروں میں گیت گائے گی
چمن کے گوشے گوشے سے پکاروں گا بہاروں کو
دکھاؤں گا تری تصویر جب روشن نظاروں کو
تو ہلکی شبنمی خوشبو فضا میں پھیل جائے گی

رہے گی یوں تری تصویر دل میں جاگزیں ہو کر
میں اِس شہکار کو اپنے خیالوں میں چھپالوں گا
تخیّل کی ہنر مندی سے خواب اس کو بنالوں گا
جہاں والوں سے چھپ جائیگی یہ خلوت نشیں ہو کر

مرے اشعار بن جائیں گے اُن خوابوں کی تعبیریں
یہ اِک پیکر بنا دے گا کئی رنگین تصویریں

جلیل حسین جلیلؔ

یوسف ظفر

غزل

قصّے اپنے حرفِ وفا کے آخر اتنے عام ہوئے
نگر نگر میں چرچے پھیلے، گلی گلی بدنام ہوئے

رخصت کا اِک رنگیں لمحہ ساری حیات پہ چھایا تھا
تارے جتنے تھے آنسو تھے، دن جتنے تھے شام ہوئے

جاتے دن یا آتی راتیں اپنی نظر میں ایک سی تھیں
زیست کو پھر مڑ کر بھی نہ دیکھا، ہم ایسے ناکام ہوئے

اب آؤ تو ایک بھی آنسو، ایک بھی نغمہ پاس نہیں
اب وہ تمام و کمال ارادے صرفِ غمِ ایام ہوئے

اپنی ظفر گم کردہ رہی بھی جادہ شناسِ منزل ہے
سُونی راہوں کے سنّاٹے بھی اُن کا ہمیں پیغام ہوئے

چارلس ڈکنز

(ترجمہ باختصار از حامد علی خاں)

مسٹر منز اور اُن کے پھُپھیرے بھائی

ڈکنز، (۱۸۱۲-۱۸۷۰) بعض نقادوں کی نظر میں گذشتہ صدی کا بہترین افسانہ نگار، ایک غریب کلارک کا بیٹا تھا، وہ وکیل کے منشی اور اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے بڑھ کر عظیم الشان مصنف بن گیا۔ فطری مہارت کے باعث مجمع عام میں اس کا اداکارانہ اندازِ افسانہ خوانی بے حد مقبول ہوا۔ قہقہہ آور مزاح، خاکہ اڑانے کی عدیم النظیر قابلیت، قابلِ رشک کردار نگاری اسکی تمام تصانیف کا خاصہ ہے لیکن دلچسپی پیدا کرنے کیلئے ڈکنز کبھی کبھی مبالغے سے بھی کام لیتا ہے۔ ح

مسٹر آگسٹس منز کنوارے تھے۔ اُن کی عمر اپنے قول کے مطابق تقریباً چالیس سال اور احباب کے قول کے مطابق اَٹھ چالیس سال کے قریب تھی۔ وہ ہر وقت بہت صاف ستھرے، باقاعدہ اور خوش پوش بلکہ کسی حد تک بنے ٹھنے سے رہتے تھے۔ لیکن اُن کی طبیعت بے حد خلوت پسند واقع ہوئی تھی۔ وہ سومرسٹ ہاؤس میں کلارک تھے لیکن اپنے قول کے مطابق وہ ایک ذمہ دارانہ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ اُن کا مشاہرہ کافی تھا اور معقول ترقی بھی ملتی رہتی تھی۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے تقریباً دس ہزار کا سرمایہ نفع کی غرض سے تجارتی کمپنیوں میں بھی لگا رکھا تھا۔ اور وہ ایک مدت سے شہر کے ایک اچھے حصے کے ایک خوشنما مکان میں اطمینان سے رہتے تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جاندار مخلوق کی دو قسموں سے اُنہیں بڑی وحشت ہوتی تھی، اور یہ دو قسمیں تھیں کُتّے اور بچّے! مسٹر منز دل کے بُرے نہ تھے لیکن اس کے باوجود وہ کسی کُتّے کی پھانسی یا کسی بچے کے قتل کا منظر بڑے اطمینان آمیز سکون کے ساتھ دیکھ سکتے تھے کیونکہ یہ دونوں فطرۃً باقاعدگی کی ضد ہیں اور مسٹر منز کو باقاعدگی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ لندن میں مسٹر منز کا کوئی عزیز نہ تھا مگر شہر کے مضافات میں اُنکے ایک پھُپھیرے بھائی مسٹر اوکٹیویس بڈن موجود تھے۔ مسٹر منز اپنے پھُپھیرے بھائی سے بہت کم ملتے تھے۔ بڈن نے غلہ فروشی کے کاروبار سے اچھی خاصی دولت پیدا کر لی تھی اُ چونکہ انہیں دیہاتی زندگی سے بہت دلچسپی تھی اِس لئے اُنہوں نے سٹیمفرڈ ہل کے نزدیک ایک بنگلہ بھی خرید لیا تھا۔ یہیں وہ اپنی چہیتی بیوی اور اکلوتے بیٹے ماسٹر ایلیگزانڈر آگسٹس بڈن کے ساتھ رہنے سہنے لگے تھے۔ مسٹر منز اپنے اس پھُپھیرے بھائی سے ملتے جلتے ... سمجھتے تھے کہ اُنہوں نے اب تک اس کے کمسن بیٹے کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

ایک شام جب مسٹر اور مسز بڈن بیٹھے اپنے بچے کی خوبیوں پر ناز کر رہے تھے تو اُس کی تعلیم کے مسئلہ پر بھی اُن کی گفتگو ہوئی۔ اُس وقت مسز بڈن نے بہ اصرار اپنے شوہر کو مجبور کیا کہ وہ کم از کم اپنے بیٹے ہی کے مستقبل کے خیال سے اپنے ممیرے بھائی مسٹر منز سے بہتر تعلقات پیدا کریں۔ اِس پر مسٹر بڈن نے اپنی بیوی سے کہا: "جہاں تک میرا تعلق ہے پیاری! میں بیگانگی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہنے دوں گا۔ میں آیندہ ہی اتوار کو اُنہیں اپنے ہاں شام کے کھانے کی دعوت دیئے دیتا ہوں، جانِ من!"

بیوی نے یہ سُنتے ہی خوش ہو کر کہا" تو بڈن پھر خدا کے لیے

جلد خط لکھو۔ کیا معلوم اُنہیں میرے ایلیگزانڈر سے دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اور وہ اسی کو اپنی جائداد کا وارث بنادیں ـــــــ ایلک نیچے دیکھو کرسی پر جوتا مت رکھو۔

مسٹر بڈن کو بیوی کا یہ خیال بہت پسند آیا اور وہ بولے بالکل بجا پیاری! بالکل بجا! ایسا ہی ہوگا۔ بجا! بجا!"

دوسری صبح کو جب مسٹر منز اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے کسی نے اُن کے مکان کا بیرونی دروازہ دھڑا دھڑ بڑے زور سے کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر کے بعد مسٹر منز کا ملازم اُن کے کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے ایک بہت ہی ننھا سا ملاقاتی کارڈ لاکر اُن کے حوالے کیا۔ اِس کارڈ پر جلی حروف میں یہ الفاظ درج تھے:

"مسٹر ادکیٹولیس بڈن۔ ایمیلیا کاٹیج (مسز بڈن کا نام ایمیلیا تھا) پوپلر واک سٹیمفرڈ ہل"۔

مسٹر منز کارڈ دیکھ کر حیرت سے بولے "ہائیں! بڈن! یہ اُجڈ جانگلو کیسے یہاں پہنچ گیا ـــــــ کہہ دو سو رہے ہیں ـــــــ کہہ دو باہر گئے ہیں اور اب کبھی واپس نہیں آئیں گے ـــــــ خدا کے لئے کچھ کہہ دو، تاکہ وہ اُوپر نہ آنے پائے"۔

نوکر نے جواب دیا "مگر حضور! وہ صاحب تو اُوپر چلے آ رہے ہیں"۔ اور اِس بات کی شہادت میں زینے پر وزنی بوٹ کی رُوح فرسا چرچراہٹ اور بھدّے بھدّے قدموں کی بدرا لبھد اور دھڑا دھڑی کی سی آواز کے ساتھ ایک پُر اسرار سی ٹپاپٹ! ٹپاپٹ! ٹپاپٹ! بھی سُنائی دی جسے سُن کر مسٹر منز کو بہت حیرت ہوئی، کیونکہ اُن کی عقل اِس آواز کی توجیہ سے بالکل قاصر تھی۔

آخر بدقسمت اور قابلِ رحم کنوارے منز نے کھانس کر نوکر سے کہا "اچھا صاحب کو اندر لے آؤ"۔

نوکر ابھی باہر نکلا ہی تھا کہ ادکیٹولیس بڈن ایک بڑے قد کے سفید کُتے کے پیچھے پیچھے اندر آ دھمکے۔ اب "ٹپاپٹ" کی آواز کا راز تو کھُل گیا لیکن کُتے کی صورت دیکھ کر مسٹر آگسٹس منز کے قدم لڑکھڑا گئے۔

بڈن نے اندر داخل ہوتے ہی چلّا کر کہا "کہو میرے یار کیسے مزاج ہیں؟"

وہ ہمیشہ اپنے گلے کی پوری طاقت سے بولا کرتے تھے اور ایک ہی بات کو دُہرائے جانے کے عادی تھے چنانچہ پھر چلائے:

"ہاں تو کہو پیارے! کیسے مزاج ہیں؟"

مسٹر منز نے گھبراہٹ میں کہا "مسٹر بڈن براہِ کرم تشریف رکھیے۔ کہیئے خیریت تو ہے؟"

"شکریہ! شکریہ! ہاں تو تمہارے کیسے مزاج ہیں؟"

مسٹر منز نے کہا میری صحت بفضلِ خدا غیر معمولی طور پر اچھی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی اُنہوں نے کُتے پر ایک غضب آلود نگاہ ڈالی کیونکہ اب اُس کی اگلی دونوں ٹانگیں ناشتے کی میز پر تھیں اور پچھلی فرش پر، اور وہ ایک تشتری سے ڈبل روٹی کا ایک مکھن لگا ٹکڑا کھینچ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا، یہ روٹی کھانے اور قالین پر مکھن پھینکنے کی تمہید تھی۔

مسٹر بڈن کُتے کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے بولے "بدمعاش! دیکھو منز پیارے! یہ بھی میری طرح بالکل بے تکلف ہے۔ ہر گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہے ـــــــ شریر کہیں کا (بہ آوازِ بلند) ہاں تو میں آج سٹیمفرڈ ہل سے یہاں تک پیدل آیا ہوں۔ کیا بتاؤں پاؤں کتنے جل رہے ہیں اور کس شدّت کی بھوک لگی ہے دوست!

مسٹر منز نے متانت سے پُوچھا "آپ نے ناشتا نہیں کیا؟"

"نہیں میرے یار میں تو آج تمہارے ہاں ناشتا کرنے آیا تھا۔

ذرا گھنٹی تو بجاؤ، بھائی جان! اور ایک اور پیالہ اور تشتری منگوا لو، اور کچھ نمکین خشک گوشت۔ میرا گھر ہے یہ بھی۔ دیکھا میں کتنا بے تکلف ہوں۔ ہا ہا ہا۔ تمہاری جان کی قسم سخت بھوک لگ رہی ہے۔" اس کے بعد مسٹر ہڈن ایک نفیس میز پوش سے اپنے جوتے کی گرد جھاڑنے لگے۔

منز نے گھنٹی بجائی اور متبسم ہونے کی ناکام کوشش کی۔

ہڈن نے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "توبہ میں نے عمر بھر کبھی اتنی گرمی محسوس نہیں کی۔ لیکن منز کہو تمہارے مزاج کیسے ہیں؟ تمہاری جان کی قسم تمہاری صحت نہا ——— یت اعلٰے معلوم ہوتی ہے۔"

مسٹر منز نے پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اچھا آپ کا بھی یہ خیال ہے؟"

"تمہاری جان کی قسم!"

"مسز ہڈن تو بخیریت ہیں؟ اور ——— وہ ———

کیا نام؟ کیا نام؟ ——— ہاں ہاں! ——— امل اور ——— تو اچھا ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے میرا بیٹا ایبک۔ ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! بالکل تندرست ہے۔ پوپلر واک جہاں ہمارا مکان ہے وہ تو جگہ ہی ایسی ہے کہ کوئی وہاں بیمار ہونا بھی چاہے تو نہیں ہو سکتا بھائی میرے! اس کے علاوہ ......"

مسٹر منز نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "کیا خیال ہے مسٹر ہڈن اگر آپ گوشت کو دوسری طرح کاٹیں تو کیا آپ زیادہ پسند نہیں کریں گے؟"

دراصل مسٹر منز نے ناقابلِ بیان تکلیف کے احساس کے ساتھ یہ دیکھا تھا کہ اُن کا مہمان تمام مسلّمہ قواعد و ضوابط سے قطع نظر گوشت کو کاٹ نہیں رہا بلکہ اسے بیجا لنگڑا لولا کر رہا ہے۔

مسٹر ہڈن نے احساسِ جرم سے پوری وحشیانہ بےخبری کے ساتھ جواب دیا "نہیں نہیں! شکریہ! شکریہ! اگر مجھے اسی طرح پسند ہے۔ بات یہ ہے دوست! یوں ذرا جلد کھایا جاتا ہے۔ لیکن منز یہ تو بتاؤ تم ہمارے ہاں کب آ رہے ہو؟ تم وہاں آ کر بہت خوش ہو گے ——— مجھے یقین ہے۔ ایمیلیا گزشتہ ہی رات تمہارا ذکر کر رہی تھیں ——— ہاں ایک چمچہ شکر کا اور شکریہ! ———

ہاں تو ایمیلیا کہہ رہی تھیں .... ——— (بہ آوازِ بلند) ابے کیا کر رہا ہے تو؟ لعنت ہو اس کتے پر منز یہ تو تمہارے تمام پردے خراب کر دیگا۔ ہا ہا ہا! ہا ہا ہا!

منز کو جیسے بجلی کا سا جھٹکا لگا ہو۔ وہ ایک دم اُچھلا اور کتے سے بہ ادب کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر گھبراہٹ میں چلانے لگا "اب دیکھیے! جناب! نیچے اُتریئے۔ باہر آئیے جناب باہر! باہر جائیے جناب باہر! ہُو اُدُھر اُدھر ہُو! بڑی تگ و دو، چیخ پکار اور چھتری اور چھڑی کی مدد سے کتا جو بار بار تپائیوں اور میزوں کے نیچے گھس جاتا تھا، باہر نکالا گیا لیکن دروازے کے باہر جا کر اُس نے نہایت کریہہ اور خوفناک طور پر بلند آواز سے بھونکنا اور رونا شروع کر دیا اور اُس کے ساتھ ہی بڑی سرگرمی اور تن دہی سے وہ مسٹر منز کے نفیس روغنی کواڑوں کو اپنے ناخنوں سے کھرچنے لگا تا آنکہ وہ بالکل زرد کے تختے بن کر رہ گئے۔

اب مسٹر ہڈن نے غمزدہ منز کو بڑی متانت سے مخاطب کیا اور کہا یہ کتا دراصل دیہات کے لئے بہت موزوں ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟ منز پیارے! یہ پابندی سے بہت گھبراتا ہے۔ مگر جانِ من! یہ تو کہو کب آتے ہو ہمارے ہاں؟ دیکھو! دیکھو، اب میں کسی قسم کا بہانہ نہیں سننے کا۔ ہاں یاد رکھو۔ اچھا دیکھو آج جمعرات ہے جمعرات! کہو اتوار کو آتے ہو؟ دیکھو۔ انکار نہیں سُنوں گا۔ بس ٹھیک ہے

اتوار کو، اور یاد رکھنا ہم پانچ بجے کھانا کھاتے ہیں۔

بڑی ردوقدح کے بعد مسٹر منز نے سخت مایوسی اور بےچارگی کے عالم میں دعوت منظور کی اور آیندہ اتوار کو ٹھیک پونے پانچ بجے پوپلر واک پہنچنے کا وعدہ کر لیا۔

اس پر مسٹر بڈن نے خوش ہو کر کہا "اب ذرا ہمارے گھر کا راستہ بھی ٹھیک طرح سے سمجھ لو۔ بشپس گیٹ کے بازار سے ہر آدھے گھنٹے کے بعد ٹمٹم چلتی ہے۔ سو ان پہنچ کر جہاں ٹمٹم رکے گی، تمہیں ایک سفید مکان دکھائی دیگا......"

مسٹر منز اپنے ملاقاتی اور اس کے سلسلۂ گفتگو دونوں سے بیک وقت نجات پانے کے لئے بیتابی سے بیچ میں بول اٹھے، "اور یہی سفید مکان آپ کا گھر ہے۔ بس میں بالکل ٹھیک سمجھ گیا۔"

"نہیں نہیں۔ وہ گھر میرا نہیں ہے دوست! وہ تو ہے لوہے کے سوداگر گروگس کا مکان! میں تو تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ یہاں سے مڑ جاؤ اور سفید مکان کے پہلو بہ پہلو سیدھے آگے چلے جاؤ۔ اس کے بعد جہاں سامنے کا راستہ بند پاؤ وہاں سے —— ہاں یاد رکھنا۔ سیدھے ہاتھ کو مڑ جاؤ۔ اب تم کو کچھ طویلوں کے پاس سے گزرو گے۔ سمجھے۔ —— اس کے بعد ایک دیوار پر تمہیں یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے نظر پڑیں گے "کُتّے سے خبردار!" (منز لرز اٹھا) اس دیوار کے برابر چل کر دو فرلانگ اور آگے بڑھ جاؤ۔ یہاں جس سے پوچھو گے وہ تمہیں میرا گھر بتا دیگا۔"

"بہت خوب مسٹر بڈن شکریہ —— خدا حافظ"

"وقت کی سخت پابندی ہوگی۔ ہم ٹھیک پانچ بجے کھانا کھاتے ہیں۔ یاد رہے۔"

"ہاں ہاں ضرور یاد رکھوں گا۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ!"

اب مسٹر بڈن رخصت ہو گئے اور بیچارا منز بصد حسرت دیا آیندہ اتوار کے جان لیوا تصور میں ڈوب گیا۔

آخر اتوار آ گیا۔ اس دن آسمان بہت صاف اور روشن تھا۔ بازاروں میں غیر معمولی سرگرمی اور گہما گہمی نظر آتی تھی۔ آج مسٹر آگسٹس منز کے سوا ہر شخص کا چہرہ روشن اور پُرمسرت تھا۔

تیز چلنے والوں کے لئے یہ دن کچھ زیادہ ہی گرم تھا۔ جب مسٹر منز بشپس گیٹ پہنچے تو انہیں بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی، اس پر وقت بھی کچھ زیادہ ہی ہو چکا تھا۔ مگر اتفاق سے ایک ٹمٹم اس وقت وہاں کھڑی مل گئی۔ مسٹر منز اس میں بیٹھ گئے اور اگرچہ ٹمٹم والے نے اس وقت بڑے قطعی انداز میں کہا تھا کہ "ایک منٹ میں چلتا ہوں سرکار!" لیکن مسٹر منز کی انتہائی بیقراری کے باوجود اس نے آدھے گھنٹے سے پہلے جنبش تک نہ کی۔ "ایک منٹ میں چلتا ہوں سرکار!" تو اس کا تکیۂ کلام تھا۔ یہی فقرہ اس نے کم از کم تیس دفعہ دُہرایا۔ آخر جب مسٹر منز گھبرا کر ٹمٹم سے نکل بھاگنے کو تھے تو گھوڑے کی ٹاپ اور پہیوں کی روح فرسا گڑگڑاہٹ کے ساتھ ٹمٹم چل دی، مگر تھوڑی دُور جا کر پھر رُک گئی۔ اب مسٹر منز سکڑ سمٹ کر بن بتقدیر ٹمٹم کے ایک گوشے میں ہو بیٹھے۔ کیونکہ یہاں سے ایک بچہ، اس کی ماں، ایک پٹارا اور ایک چھاتا اُن کے ہمسفر ہو رہے تھے۔

ننھا بڑا مخلص اور محبت کرنے والا تھا چنانچہ وہ جلد ہی مسٹر منز کو اباجان سمجھ کر اُن سے ہم آغوش ہونے کے لئے بانہیں پھیلائے اور چیخنے لگا۔

ماں اُسے چُپ کرنے کے لئے بولی "بس بس ننھے۔ یہ بےصبری اچھی نہیں۔ آرام سے بیٹھو۔ یہ نہیں ہیں تمہارے ابا۔"

اس پر مسٹر منز نے دل میں کہا خدا کا شکر ہے میں ابا نہیں ہوں۔ اُس نامبارک صبح سے لے کر شام تک اُنھوں نے پہلا اطمینان کا سانس لیا اور اُن کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

خواجہ حالی کا ایک خط

(بنام مرزا اسد اللہ خاں غالب)

مولانا حالی کا یہ غیر مطبوعہ خط جو انہوں نے اپنے استاد مرزا غالب کے نام لکھا تھا غالب اور حالی کے تعلقات پر ایک نئی روشنی ڈالتا ہے۔ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ دقت پسند غالب نے نظیری کے کسی شعر کو شاید مہمل قرار دیا تھا اور اس کے متعلق اپنے ہونہار شاگرد خواجہ حالی سے اُن کی صحیح صحیح رائے دریافت کی تھی۔ حالی نے بڑے ادب کے ساتھ اپنے جلیل القدر اُستاد سے اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے اور بڑی جسارت کے ساتھ "مشکل پسندوں" کے اس بادشاہ کے عقدۂ مشکل کی کشائش کی کوشش کی ہے۔ مدیر

قبلہ و کعبہ سخنے را کہ دندازہ دانانِ گفتار و ادا شناسانِ معنی از نظرِ اعتبار انداختہ باشند۔ گو ہمہ از نظیری و عرفی باشد بہیچ تاویل و توجیہ طراز قبول نتواں داد خامۂ بیسی ہیچ مدانے کہ بلدِ را دسخن و مردِ ایں فن خود نیم چگونہ ایں نقش درست تواند نشست۔ الحق شکستہ را بستن گمشدہ را پیدا نمودہ را دوختن کارے است بس دشوار و دشوار تر از ان است طرف شدن بہ اُستادانِ فن و مردانِ کار۔ و آنگاہ با کسیکہ در سخنوری و سخندانی نکتہ سنجی و نکتہ رانی یگانۂ روزگار بودہ باشد۔ حقا کہ پاسِ امتثال امر واجب الاذعان و نظر دارم ورنہ در نگارشِ معنیٔ شعرِ نظیری کہ مخدوم آں را نظر بر داشتہ اند ہرگز جرأتے بکار نمی رفت۔ چہ مرا کہ از آں چشمہ آب خوردہ ام و از اں مائدہ زلہ ربودہ ام۔ اگر بفرضِ محال یارائے در فہمِ معنیٔ شعر بر صواب بودہ باشد۔ درچرا برگفتگوئے کہ با آں حضرت درمیان آید چارہ جز تسلیم و جواب جز خموشی نیست۔ للہ الحمد کہ سر از فرمان نہ پیچیدہ ام۔ اگرچہ رشتۂ ادب از دست رفتہ است۔ خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم۔ والتسلیم مع التحیۃ والتکریم۔

قالَ نظیری

جذبِ عشقم فی المثل در حُسن پیدا ساختن   خضرِ چاہِ یوسفم از آبِ حیواں نیستم

بدانست خاکسار قائل از عشق و حسن دریں شعر عشق و حُسنِ مطلق خواستہ است۔ چنانکہ ایں ہر دو مفہوم از حدیثِ قدسی کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ مستفاد مے شود۔ کنزِ مخفی ہماں حُسنِ مطلق است و اقتضائے ذاتی کہ از لفظ اَحْبَبْتُ متبادر میشود تعبیر از آں بعشق میتواں کرد اگرچہ منشائے ظہور کنزِ مخفی ہماں اقتضائے ذاتی است و بس۔ اما اطلاق منشائیت بر اعیانِ موجودات ہم کہ بمنزلۂ علۃ مادیۃ اند۔ مر آں ظہور را در امثالِ مقدماتِ خطابیہ و شعریہ میتواں کرد قائل دعوائے میکند و در دعوائے خود صادق است کہ منکہ از جملۂ اعیانِ موجود ام در پیدا ساختنِ حُسنِ مطلق حکم جذبِ عشق پیدا کردہ ام۔ گویا خضرم کہ از چاہِ یوسف نشان میدہم نہ آں خضر کہ از آبِ حیواں نشان دہد۔ پس خود را بجذبِ عشق۔ و کنزِ مخفی را کہ عبارت از حُسنِ مطلق است بیوسف در چاہ افتادہ تشبیہ دادہ است و وجوہِ تشبیہ ظاہر است۔ فقط۔

حامد علی خاں

منشورات

سر تیج بہادر سپرو کا انتقال

ہمیں نہایت افسوس ہے کہ دو سال سے زائد عرصے کی طویل علالت کے بعد ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو نصف شب کے قریب مشہور اعتدال پسند مدبّر اور محبِّ اُردو سر تیج بہادر سپرو الہ آباد میں انتقال فرما گئے۔ اِس وقت اُن کی عمر ۷۴ سال تھی۔

سر سپرو نے بہت کامیاب اور مصروف زندگی گزاری۔ اس کے باوجود انہیں ابتدا سے اُردو زبان سے جو لگاؤ تھا وہ برابر برقرار رہا اور اِس زبان کی تائید و حمایت میں وہ ہمیشہ اپنی مخلصانہ آواز بلند کرتے رہے۔ مرحوم کشمیری پنڈت تھے۔ جوانی کے زمانے میں اُنہوں نے خود ایک اُردو رسالہ "کشمیر درپن" جاری کیا تھا۔ اور اس زمانے میں نہ صرف "مخزن" کو اُن کی معاونت حاصل رہی تھی بلکہ اپنے رسالے کے ذریعے سے بھی اُنہوں نے اُردو کی قابلِ ذکر خدمات انجام دی تھیں۔ اہلِ اُردو اِس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ "انجمن ترقی اُردو" کو ہمیشہ اُن کی سرپرستی حاصل رہی اور وہ اِس کے سرگرم مددگاروں میں نہایت ممتاز تھے۔

موت کے بعد تمام اختلافات ختم ہو جاتے ہیں اور اگر سر تیج بہادر پاکستان کے قیام سے قبل مطالبۂ پاکستان کے جواز کو کماحقہ سمجھنے سے قاصر رہے تو اب اس کا ذکر قطعاً غیر ضروری ہے البتہ اُن کی اِس نیک نیتی اور بے تعصبی کو ضرور خراجِ تحسین ادا کرنا چاہیے کہ اُنہوں نے اپنی قوم کے ایک بہت بڑے طبقے کے اِس غلط خیال کو کبھی قابلِ اعتنا نہ سمجھا کہ اُردو زبان کی حیثیت "مذہبی" ہے اور اسے صرف مسلمانوں نے بنایا ہے" اور یہ انہیں کی "غیر ملکی" زبان ہے۔ غلط تعصبات کے اِس طوفان میں جن لوگوں نے اپنا دامن تر نہ ہونے دیا وہ بہرحال قابلِ مبارکباد اور لائقِ احترام ہیں، اور سر تیج بہادر سپرو کا مرتبہ ایسے لوگوں میں بہت بلند نظر آتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کی روح کو اطمینان و سکون بخشے اور اُن کے متعلقین کو صبر کی توفیق عطا ہو۔

ہماری رائے میں انجمنِ ترقیٔ اُردو کو کسی نہ کسی رنگ میں سر تیج بہادر سپرو کی کوئی شایانِ شان یادگار قائم کرنی چاہیے۔

اُردو اور ہندوستان

مہاتما گاندھی نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اُردو زبان اور اُردو رسم الخط کی حفاظت کے لئے بارہا آواز بلند کی تھی اِس کے باوجود ہندوؤں کے ایک بڑے طبقے کے زیرِ اثر ہندوستان کی صوبوں حکومتوں نے اُردو کو ملک بدر کرنے کی ٹھان لی اور اس کی جگہ سنسکرت نما ہندی کو رائج کرنے کا تہیہ کر لیا لیکن مخالفت کے اِس طوفان میں بھی اُردو اپنی بقا کے لئے ہاتھ پاؤں مارتی نظر آتی ہے اور خود ہندوستان کے ہندوؤں میں اس کے حامی بڑی جرأت سے اِس کے حق میں آواز بلند کر رہے ہیں۔ اِس سے کم از کم یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اُردو کسی مذہبی طبقے کی زبان نہیں اور ہند کے عام ہندوؤں اور مسلمانوں کی یہ مشترکہ زبان بہ آسانی جلاوطن بھی نہیں ہو سکتی۔ ہمیں تو

ہے کہ اگر ہند کی اس خوبصورت زبان کو مٹا کر کوئی مصنوعی زبان جبراً رائج کر دی گئی اور بفرضِ محال کسی طرح عوام سے اس کے استعمال کا حق چھین بھی لیا گیا تو وہ جبراً رائج کی ہوئی زبان خود ارتقا کی منزلیں طے کر کے حسبِ سابق پھر اُردو بن جائے گی جو بچپن سے گزر کر پھر جوان ہو گی اور پھلے پھولے گی۔

ہمیں مسرت ہے کہ جنوری ۱۹۴۹ء سے اُردو کے ہندوستانی رسائل میں ایک اور اضافہ ہوا ہے۔ نئی دہلی سے مسٹر گوپال متل نامی ایک ہونہار نوجوان ادیب نے "تحریک" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

"تقسیم کے بعد ہندوستان میں اِسی قسم (فاشزم) کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ وہ تو کہیے گاندھی جی آڑے آ گئے ورنہ ہم لوگ یا تو تعمیر فروشی پر مجبور ہوتے یا قتل ہو چکے ہوتے۔ گاندھی جی کی بے مثل قربانی نے تعصب اور ہٹ دھرمی کے خوفناک طوفان کا زور توڑ دیا۔ . . . لیکن گاندھی جی کے کام کی تکمیل ابھی باقی ہے اور ادیب اِس کام کو پورا کرنے کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ اُردو کے ادیبوں کی گزشتہ روایات شاہد ہیں . . . کہ کبھی ہمارے قلم نفرت کے پرچار سے آلودہ نہیں ہوئے۔ جس زبان کے ادیبوں کا ماضی اتنا درخشاں ہو اُسے کون مٹا سکتا ہے۔ اُردو کے ادیبوں کو سپاہی کے اِس احساس کو خیرباد کہہ دینا چاہئے کہ جس زبان میں وہ لکھتے ہیں اس کا مستقبل تاریک ہے . . . . . اُردو میں زندہ رہنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔"

اِسی مضمون میں آگے چل کر مسٹر متل لکھتے ہیں:-

"بعض حلقے اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کی حیثیت سے زندہ رکھنے کا مطالبہ کر رہے ہیں، ہم اِس روش کے خلاف ہیں۔ یہ سراسر رجعت پسندی اور جہالت کی وضاحت بے معانی ہے . . . . . اُردو ایک مشترکہ ورثہ ہے اور مسلمان اگر چاہیں بھی تو ہم انہیں اِس کا واحد وارث نہ بننے دیں گے۔"

مسٹر متل کے خیالات بہت صاف اور صحت مندانہ ہیں لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے اِس معاملے میں مسلمانوں نے کبھی تنگ نظری سے کام نہیں لیا۔ مسلمانوں نے اُردو کو کبھی "صرف اپنی زبان" نہیں کہا بلکہ وہ اِس مشترکہ زبان کو مشترکہ سمجھ کر ہمیشہ خوش ہوتے رہے ہیں۔ اُنہوں نے اِسے کبھی محض اِس بنا پر ترک کر دینے کا ارادہ بھی نہیں کیا کہ ہندو بھی اِس زبان کو استعمال کرتے ہیں بلکہ صحیح الخیال مسلمان ادیب تو اُن مسلمان نقادوں کو قابلِ ملامت سمجھتے ہیں جنہوں نے دانستہ یا نادانستہ ہندو ادیبوں سے پورا انصاف نہیں کیا۔ ہندوؤں کا جو طبقہ محض اِس بنا پر اُردو کو چھوڑتا ہے اور اپنی اس دلکش ترقی یافتہ اور ترقی کرنے والی زبان سے اِس لئے محروم ہوتا ہے کہ مسلمان بھی اس کے مداح ہیں۔ اُس کا عمل ہمارے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے کوئی اِس بنا پر اپنا خوبصورت مکان گروا دے کہ یہ ہمسایوں کی آنکھوں کو بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ زبان وہی رہنی چاہئے جسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں نے اُردو کو اِس بنا پر چھوڑ کر کہ اِسے ہندو بھی لکھتے بولتے ہیں کوئی ناقابلِ فہم زبان اختیار کر لینے کا کبھی خیال بھی نہیں کیا۔

ہمیں توقع ہے کہ مسٹر گوپال متل اور اُن کے رفقائے کار کامیاب ہوں گے۔ اُنہیں یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اُردو کی قدیم راجدھانی میں بیٹھے ہیں۔

پاکستان کی عورتوں کے نام

بیگم لیاقت علی خاں نے پچھلے دنوں وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے لاہور کے زیرِ اہتمام ایک نسوانی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے پاکستان کی عورتوں کو بیداری اور فرض شناسی کا ولولہ خیز پیغام دیا اور اُنہیں سمجھایا کہ وہ پاکستان کی نئی قومی زندگی کے متعلق اپنے فرائض کا صحیح احساس پیدا کریں۔ اُنہوں نے عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے پُر زور الفاظ میں دعوت دی کہ وہ کاہلی، بے اعتنائی، غفلت اور بوسیدہ رسم و رواج کی زنجیروں کو توڑ پھینکیں اور پُوری ہمت، جرأت اور قابلیت کے ساتھ اپنے اہم فرائض کی انجام دہی کے لئے تیار ہو جائیں۔

بیگم لیاقت علی خاں نے پُرجوش آواز میں خواتین سے یہ سوالات کئے:۔

"کیا ہمارے ہسپتال لیڈی ڈاکٹروں کے لئے، نرسوں کے لئے اور رضا کارانہ امداد کے لئے، ترستے رہیں گے؟ کیا ہمارے زنانہ کالج اور مدارس قابل پروفیسروں اور اُستانیوں سے محروم رہیں گے؟ کیا ہماری آیندہ نسلیں زچہ خانوں، بچوں کی تربیت گاہوں اور امدادی اداروں کی کمی کے باعث بیماری، افلاس اور بے ہمتی کی وارث بنیں گی؟ کیا پاکستان اپنی آدھی سے زیادہ آبادی (عورتوں) کی غفلت، کمزوری اور بے چارگی کے بھینٹ چڑھا دیا جائے گا؟ —— وہ پاکستان جو ہمارے لاکھوں آدمیوں کے خون، پسینے، آنسوؤں اور قربانیوں سے حاصل ہوا ہے۔ پاکستان کی عورتو! میں تم سے، تم سب سے، بلا امتیازِ مذہب و نسل و رنگ پھر سوال کرتی ہوں کیا ایسا ہو گا؟ تمہاری قوم تمہارے جواب کی منتظر ہے، لیکن زبانی جواب کی نہیں، وہ عملی جواب کی متوقع ہے —— عمل، متحدہ، منظم اور پاکستان کی تمام عورتوں کی طرف سے، بلا امتیازِ جماعت و رنگ۔ اب خود غرضانہ آرام پسندی بے پروائی، حسد و بغض، علٰحدگی اور رجعت پرستی کا دور گزر چکا ہے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمیں محض اپنی ہی قوم پر نہیں بلکہ دُنیا پر ثابت کرنا ہے کہ پاکستان کی عورتیں ایک زندہ اور متحرک قوت ہیں۔ اور وہ اپنی جماعت، اپنی قوم اور بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے آزادی کا صحیح استعمال جانتی ہیں۔ پاکستان زندہ باد!"

ملک کے تمام ترقی پسند عناصر بیگم لیاقت علی خاں کے ان خیالات سے متفق ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستان کی نوجوان خواتین پر بیگم لیاقت علی خاں کے اِس زندگی پرور پیغام کا اثر خاطر خواہ ہو گا۔

جنگ اور صلح

تقسیم کے بعد ملک میں بربریت کا جو طوفان برپا ہوا اُسکا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اُصولِ تقسیم کو تسلیم کر لینے کے باوجود اہلِ کانگرس کا ایک بڑا گروہ دل سے اِسکا قائل نہ تھا، وہ لوگ چاہتے تھے کہ پاکستان ناکام ہو کر بالآخر ہندہی کے زیرِ نگیں ہو جائے۔ بدی کی قوتوں نے کانگرس کے اِس جذبے سے صرف ناجائز فائدہ ہی نہ اُٹھایا، اس سے شہ بھی پائی اور پھر انتقام در انتقام نے صورتِ حال کو بد سے بدتر بنا دیا۔ جنگِ کشمیر کے التوا سے نفرت کے اُبلتے ہوئے طوفان میں پہلی دفعہ ایک وقفہ آیا ہے اور لوگ عقل و ہوش سے کام لینے کے قابل ہو سکے ہیں۔ کاش حکومتِ ہند اِس عارضی صلح کو مستقل تعاون میں تبدیل کرنے کی توفیق پا سکے اور جس طرح پنڈت نہرو بلکہ سردار پٹیل تک اب پاکستان کو بطور ایک مسلّمہ حقیقت کے سمجھ چکے ہیں کہ بقول اُنکے "اب اگر پاکستان چاہے بھی تو وہ اُسے ہند میں شامل نہ ہونے دینگے"، اُسی طرح وہ اِس حقیقت کو بھی سمجھ سکیں کہ کشمیری اپنے وطن کو پاکستان ہی میں شامل دیکھنا چاہتے ہیں۔ کشمیر کو ہند کے زیرِ نگیں کرنے کیلئے کروڑوں روپیہ برباد کرنا اور ہند و پاکستان میں ایک مُستقل مخاصمت کھڑی رکھنا خود ہند کیلئے بھی مضر ہے[1]

[1] ظاہر ہے کہ ہند و پاکستان کا اقتصادی تعاون نہ صرف ہمارے دونوں ملکوں کے لئے بلکہ دنیا بھر کے باعثِ برکت ہو گا۔

اور پھر نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کا ایک پُرخلوص خادم!

—— بشیر احمد

نزع میں

(انتخاب)

میری محبوب! اِن فضاؤں میں — تیرگی بڑھتی جا رہی ہے کیوں؟
طاق پر جھلملاتی مشعل کی، — روشنی گھٹتی جا رہی ہے کیوں؟

آسماں پر مہرِ درخشندہ — کس لئے زرد ہوتا جاتا ہے؟
سرد کہساروں میں ریحانہ — کیوں ہر اک ذرّہ سوتا جاتا ہے؟

میرے پاس آؤ — میرے پاس آ جاؤ — اپنی قندیلِ رُخ مجھے دکھلاؤ
میں تمہارا منتظر ہوں ریحانہ! — مجھ سے بے سُود یوں نہ گھبراؤ!

کیا ہوئی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا! — کیوں مری سانس رُکتی جاتی ہے
جانے نشتر چلا رہا ہے کون — ہر رگِ زیست دُکھتی جاتی ہے!

اِن درختوں کے سرسراتے برگ — موت کی گھنٹیاں بجاتے ہیں
ہر ہر اک سمت پر فشاں جگنو — مرگھٹوں کی کتھا سناتے ہیں!

دُور اُن کھیتیوں کے پرے پار — میری ماں، آہ میری مُردہ ماں
ہاتھ پھیلائے مجھ سے کہتی ہے — "میرے لال آؤ میرے پاس یہاں!"

گھلتے جاتے ہیں یہ در و دیوار — پگھلا جاتا ہے زندگی کا وجود
بجھ رہے ہیں شرارِ ہستی کے — مٹ رہی ہیں حدودِ بود و نبود!

—— عارف عبد المتین

"امروز"

(قسمتِ علمی و ادبی)

ترقی پسندوں کا اعترافِ حقیقت

ہم مانتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں ہم میں سے چند ایک ادیب تقسیم کی حقیقی روح اور ثقافتی ضرورت کو سمجھنے میں ناکام رہے، اِن ادیبوں کو انسان کی فطری کمزوری اور واقعے کی فوری نوعیت کے مدِنظر معاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اب تو پاکستان کسی بھی ادیب کے نزدیک فرقہ پرستی کا کارنامہ نہیں رہا بلکہ تمام ترقی پسند مانتے ہیں کہ پاکستان کی معاشی اور اقتصادی خوشحالی ہی سے اُن کی اور اُن کے ساتھ کروڑوں عوام کی بہبود وابستہ ہے۔ پاکستان ہماری توقعات اور دعاؤں کے برخلاف، بالکل اچانک طور پر ایک زبردست تیزی سے نقشۂ عالم پر اُبھرا، جو لوگ ابتداً اس تاریخ کے اِس کرشمے اور سیاست کے اِس معجزے کو حیطۂ ادراک میں نہیں لا سکے تھے ان کا تصور صرف اتنا تھا کہ تاریخی روایتوں نے انہیں ایسے کارناموں کے لئے لمبی لمبی مدتیں بتائی تھیں۔ تاریخ کی ایک عظیم المرتبت شخصیت نے جس کارنامے کو چند ہی برسوں میں سرانجام دے دیا، تو دو قسم کی ذہنی لہروں کا چلنا ضروری تھا ایک رو توصیف و تکریم کی تھی اور دوسری استعجاب کی، اِس استعجابیہ لہر کی زد میں آ کر شروع شروع میں چند ادیبوں نے تقسیمِ ہند کو ذہنی طور پر قبول کرنے میں ہچکچاہٹ سی محسوس کی، مگر اب تو مطلع صاف ہو چکا ہے۔ اب پاکستان کا وجود، پاکستان کی تعمیر و پاکستان کا روشن و نیک نام مستقبل ترقی پسندوں کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

احمد ندیم قاسمی

"نفسیات"

خواب کی حقیقت

(ملخص)

فرائیڈ غالباً پہلے عالم تھے جنہوں نے خواب کے معنی معلوم کرنے کے لئے موزوں حیثیات کے علاوہ خواب دیکھنے والے کی ذاتی زندگی پر سے ظلمت کا پردہ اٹھانے کے لئے کام کیا۔ ان کی تحقیقات کا نتیجہ یہ تھا کہ "خواب کے معنی ہوتے ہیں" خواب کے پیدا کرنے کا باعث تھے۔ کسی مرض کی مخصوص علامات کی طرح خواب بھی ایک طرح کی علامت ہے جسے خواب دیکھنے والے کی ذاتی زندگی کی روشنی میں پڑھا جا سکتا ہے۔ یہاں ذاتی زندگی سے مراد کسی شخص کا لاشعوری حصہ نفس ہے۔ کیونکہ خواب کے پیدا کرنے میں ہمیشہ لاشعور کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے خوابوں کو لاشعور نفس کی شاہراہ قرار دیا جاتا ہے۔ جب بھی ہمیں کسی خواب کی تعبیر کرنی ہوگی۔ لاشعور کو ہی کریدنا ہوگا۔

اس سوال کے جواب کے لئے کہ خواب کے معانی اصل خواب سے کیوں اتنے مختلف ہوتے ہیں۔ لاشعور ہی کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ہمارے دل میں بے شمار ایسی عجیب و غریب خواہشات موجزن ہوتی ہیں جنہیں اخلاقی اور معاشرتی وجوہ کی بنا پر پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی تمام خواہشات لاشعور ہی کو اپنی جائے قیام مقرر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جلاوطنی اختیار کرنے کے بعد ان کی تمام فعالیتیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ یہ کردار انسانی کو متاثر کرنے کے لئے اتنی ہی بے تاب ہوتی ہیں جتنی مقتنع ہونے سے پہلے تھیں۔ نیند کی حالت میں شعور کا سنسر چونکہ فعال نہیں رہتا۔ اس لئے یہ خواہشات بھیس بدل کر اور سنسر کی نظر بچا کر شعور میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اصطلاح میں خواہشات کی اس تبدیلی کو خواب کہتے ہیں۔ تعبیر خواب ایک ایسا عمل ہے جس سے محلل نفسی ان پوشیدہ خواہشات پر سے ظلمت کا پردہ اٹھا کر ان کی اصلیت کو آشکار کر دیتا ہے۔ یہ خواب باد

دیکھئے کہ خواب کا مخفی مواد اور خواب کے معانی ایک ہی موضوع کی دو مختلف زبانیں ہیں، جن کے مطالب سے آگاہ ہونے کے لئے مروجہ زبان میں اس کا ترجمہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تعبیر خواب گویا ترجمہ ہی کے عمل کا دوسرا نام ہے۔

بے شمار خوابوں کی تعبیر کے بعد فرائیڈ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہر خواب کسی دبی ہوئی خواہش کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے بچوں کے خواب جو انتہائی سادہ ہوتے ہیں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ فرائیڈ کی چھوٹی لڑکی کو معدے کی شکایت کی وجہ سے سارا دن بھوکا رہنا پڑا۔ خواب میں وہ رنگ رنگ کے پھل دیکھتی ہے جو اس کے کھانے کے لئے موجود تھے۔ میٹرک کا ایک طالب علم ناکام ہونے کے دوسرے ہی دن اپنے تئیں کالج میں شامل دیکھتا ہے۔ اور اس طرح اس کی نامکمل خواہش وقتی طور پر خواب میں پوری ہو جاتی ہے۔

خواب کسی معمولی واقعہ کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس کا تعلق ہمیشہ کسی غیر معمولی اور ذاتی خواہش سے ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم اس واقعہ کو بظاہر اپنی زندگی کے لئے اہم خیال نہ کریں لیکن تحلیل نفسی کے بعد خواب ہمیشہ کسی نہایت ہی ضروری خواہش کو ظاہر کرے گا۔ جو کسی وجہ سے بیداری کی حالت میں پوری نہیں ہو سکی یا پوری نہیں کی جا سکی۔ یہی وجہ ہے کہ فرائیڈ تمام اقسام کے خوابوں کو تکمیل کا خواہش سے ملقب کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ خواہش زمانہ حال ہی سے پیوستہ ہو، بلکہ اکثر اوقات اس خواہش کا تعلق انسان کی گزشتہ زندگی بلکہ بچپن کے فراموش شدہ واقعات سے ہوتا ہے۔ خوابوں کو اور زیادہ کریدنے سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ مخفی خواہشات بالعموم جنسی الاصل ہوتی ہیں یعنی کسی ایسی جنسی خواہش کو ظاہر کرتی ہیں، جو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اور جو حال ہی میں کسی وجہ سے متحرک ہو گئی ہے لیکن جسے شعور میں داخل ہونے سے سنسر نے روک دیا گیا ہے، جب تک کہ وہ اپنی اصلی ہیئت کو تبدیل نہ کرلے

خواب کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لاشعور خیالات اور خواہشات کو جو نیند میں مخل ہو سکتے ہیں تسکین پہنچا کر انہیں نیند میں مارج ہونے سے باز رکھے۔ اگر خواب نہ ہوں تو ہو سکتا ہے کہ سونے والا نیند کے دوران میں بڑبڑا اُٹھے اور اُس کی نیند پوری نہ ہو سکے۔ فرائیڈ خواب کو ہمیشہ نیند کا محافظ قرار دیتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خواب کی وجہ سے ہم بخوبی سو نہیں سکے۔ تو اس کا حقیقت میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض خیالات جو شعور میں داخل ہونے کے لئے بے تاب تھے، ایسا نہیں کر سکے۔ بلکہ دوبارہ لاشعور میں چلے جانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اِس قسم کی ذہنی نزاع کے باعث ہماری نیند خراب ہو گئی ہے۔

خواب کا ایک عنصر ہزارہا خیالات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ صرف اسی جز کی تعبیر کے لئے کئی دن تک خیالات کا سلسلہ جاری رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختصر سا خواب بھی لمبی چوڑی تعبیر کا محتاج ہوتا ہے اور اسکی کامیاب تعبیر کے لئے کئی سالوں کے دفن شدہ خیالات کی تجدید کرنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر فرنک ایک خاتون کا خواب تحریر کرتے ہیں۔ اِس کی مدد سے خواب کے "اختصار" اور مخفی خواہش کی اہمیت کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ "یہ خاتون اپنی ایک سہیلی کے ساتھ کسی بازار میں جا رہی تھی، ایک دکان کے سامنے ٹھہر کر وہ ٹوپیاں دیکھتی ہے۔ اور ایک ٹوپی خریدنے کی خاطر دکان میں داخل ہوتی ہے۔"

سہیلی کے لفظ سے خواب دیکھنے والی کو ایک دن پہلے کا واقعہ یاد آجاتا ہے۔ وہ فی الواقع اس سہیلی کے ساتھ بازار میں پھر رہی تھی۔ لیکن اس نے کوئی ہیٹ نہیں خریدا تھا۔ جب اسے خیالات کا تسلسل جاری رکھنے کے لئے کہا گیا، تو اُس نے بتایا کہ اُس روز اُس کا خاوند بیمار تھا۔ اُس کی علالت کی وجہ سے وہ پریشان تھی۔ اسے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ کہیں اس کا خاوند مر نہ جائے۔ اس کی پریشانی کو دیکھ کر اُس کے خاوند ہی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی اس سہیلی کے ہمراہ باہر سیر کو چلی جائے، تاکہ اس کا دل بہلے۔ راستے میں جب وہ اپنی سہیلی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی تو اُسے اپنی شادی کے زمانے سے پہلے کا ایک دوست یاد آیا۔ جب اسے اس دوست کے متعلق مزید واقفیت بہم پہنچانے کے لئے کہا گیا تو اُس نے تسلیم کیا کہ اُس زمانے میں اسے اس سے محبت تھی، لیکن اُس کی دولتمندی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اس سے شادی نہ کر سکی۔ یہ اس کا ایک احمقانہ فعل تھا جسے بھول جانا ہی بہتر ہے۔

ہیٹ کے متعلق اُس نے بتایا کہ اس دکان پر اسے بہت خوبصورت ہیٹ نظر آئے اس کا دل بھی چاہتا تھا کہ ان میں سے ایک کو اپنے لئے خریدے لیکن وہ اپنے خاوند کی غربت کی وجہ سے ایسا نہ کر سکی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب اس نامکمل خواہش کے متعلق تھا، جو خواب میں پوری ہو چکی ہے لیکن اچانک اس خاتون کو یاد آیا کہ یہ ہیٹ جو اس نے خواب میں خریدا، سیاہ رنگ کا تھا۔ خواب سناتے وقت یہ ایک نہایت ہی ضروری عنصر فراموش کر چکی تھی (سیاہ رنگ ماتم کا رنگ قرار دیا جاتا ہے) یہ اسے صرف خیالات کا تسلسل جاری رکھتے وقت یاد آیا۔ اس کی فراموشی کی وجہ کیا تھی؟

فرنک نے معلوم کیا کہ خواب کی تعبیر حقیقت میں یہ تھی۔ خواب دیکھنے کی رات سے پہلے اِس عورت کو اپنے خاوند کے مرنے کی (کیونکہ وہ بیمار تھا گو اس کی بیماری پریشان کن نہ تھی) تشویش لاحق ہو گئی۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ماتمی رنگ والا ہیٹ خرید رہی ہے۔ اِس طریقے سے اُس نے اپنی ایک خواہش پوری کر لی ہے۔ بیداری کی حالت میں وہ اپنے خاوند کے افلاس کی وجہ سے اس ہیٹ کو نہ خرید سکی لیکن خواب میں وہ ہیٹ کے خریدنے میں کامیاب ہو سکی ہے۔ یعنی خواب میں اُس کا خاوند دولتمند ہے۔ تسلسل خیالات یہاں سے اُس کے شادی کے زمانے سے پہلے کے دوست کی طرف جاتا ہے۔ اِس لئے یہ معلوم کرنا چنداں مشکل نہیں رہتا کہ وہ خواب میں اپنے اسی دوست کو اپنا خاوند دیکھتی ہے۔

کیونکہ یہی اُس کا محبوب تھا۔ اگر یہ اُس کی بیوی ہوتی تو اُسے پیٹ خریدنے میں کبھی بابو سی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ نوجوان عورت اپنے خاوند سے تنگ آ چکی ہے۔ اس کی اپنے خاوند کے متعلق یہ تشویش کہ کہیں وہ مر نہ جائے، حقیقت میں ایک دبی ہوئی خواہش پر مشتمل ہے۔ وہ چاہتی یہی ہے کہ وہ مر جائے تاکہ وہ اُس دولت مند آدمی سے شادی کر سکے۔ چنانچہ خواب میں وہ اپنے اِن دونوں مقاصد میں کامیاب ہو گئی ہے۔

مختصراً "فعلِ خواب" کا اِس کے سوا کوئی کام نہیں کہ خواب کے خیالات کو ناقابلِ فہم شکل دے کہ اس پر گمنامی کا پردہ ڈال دے۔ اس سے تخلیقی کام کی توقع رکھنا فضول ہے۔ نیز استدلال وغیرہ کے قانون کے تابع ہے فعلِ خواب کے کام کرنے اور سوچنے کا طریقہ بیداری کی حالت سے بالکل ہی مختلف ہوتا ہے اِس لئے عام قوانین کا اس عجیب و غریب زندگی پر اطلاق کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

عبدالحی علوی

"تحریک"

مسلمان اُردو کے واحد وارث نہیں

(ذیل کا اقتباس رسالہ "تحریک" کے پہلے پرچے کے افتتاحی مضمون سے لیا گیا ہے۔ یہ رسالہ مسٹر گوپال متل کی ادارت میں جنوری ۱۹۶۰ء سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ "مخزن")

ہمارے نزدیک ادب ایک نفسیاتی جنگ ہے۔ کچھ چیزوں کے خلاف اگر کسی بلند آدرش کی وجہ سے نہیں تو خود اپنی بقا کے لئے بھی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ بہتر سماجی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ تعصب اور ہٹ دھرمی کا جو فاشزم کے اہم ...... اجزائے ترکیبی ہیں۔ سب سے پہلا وار ادیبوں اور ادب پر ہی ہوتا ہے۔ جرمنی اور اٹلی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ جہاں روشن خیالی سب سے بڑا گناہ شمار ہوتی

تقسیم کے بعد ہندوستان میں بھی اسی قسم کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ وہ تو کہئے گاندھی جی آڑے آ گئے۔ ورنہ ہم لوگ یا تو ضمیر فروشی پر مجبور ہوتے یا قتل ہو چکے ہوتے۔ گاندھی جی نے اپنی بے مثل قربانی سے تعصب اور ہٹ دھرمی کے اس خوفناک طوفان کا زور توڑ دیا جو اگر کامیاب ہو جاتا تو ہر نیکی اور ہر شرافت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا۔ لیکن گاندھی جی کے کام کی تکمیل ابھی باقی ہے۔ اور ادیب اِس کام کو پُورا کرنے کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔

اُردو کے ادیبوں کی گزشتہ روایات اِس بات کی شاہد ہیں کہ اُنہوں نے جہاد بالقلم کے مقدس فرض سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک اُنہوں نے آزادی اور مساوات کی ہر تحریک کا پُورا پُورا ساتھ دیا ہے اور غیر ملکی حکومت کا جبر بھی اُنہیں اِس راستے سے منحرف نہیں کر سکا۔ ہمیں فخر ہے کہ نفرت اور تعصب کے موجودہ طوفان میں بھی ہم لوگوں کے قدم نہیں ڈگمگائے، اور ہمارے قلم نفرت کے پرچار سے آلودہ نہیں ہوئے۔ جس زبان کے ادیبوں کا ماضی اتنا درخشاں ہو اُسے کون مٹا سکتا ہے۔

اُردو کے ادیبوں کو پسپائی کے اِس احساس کو خیرباد کہہ دینا چاہئے کہ جس زبان میں وہ لکھتے ہیں اس کا مستقبل تاریک ہے۔ ضرورت صرف کام کرنے کی ہے۔ اُردو میں زندہ رہنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔

پھر ہم لوگوں کو یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہئے کہ تحفظِ اُردو کی لڑائی صرف ایک زبان کے تحفظ کی لڑائی نہیں ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس محاذ پر فرقہ پرستی کی تمام طاقتوں سے لوہا لیا جا سکتا ہے۔ اُردو ہمارے مشترکہ تمدن کی مظہر ہے، اور اس کی حفاظت مشترکہ تمدن

تاجور ۔ میں بہار بھر کو سوگوار و بہار بن کے گزار دوں ،
تری یہ رضا ہے تو اس رضا پہ بہار بھر نثار ہے ،

۶ ۔ بحرِ منسرح (مطوی ۔ کف ۔ وروقف کے زحاف سے)

غالب ۔ وہ بھی نہ کوئی دم دیکھ سکا سے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

نامعلوم ۔ دیدۂ عبرت کشا قدرتِ حق را ببیں
شامتِ اعمال ما صورتِ نادر گرفت

معیوب مثال ۔ صرف ایک مصرع کافی ہے ۔ ع
دل کو مرے کھا رہا ہے یہی غم رات دن ،

۷ ۔ بحرِ ہزج (شتر کے زحاف سے)

غالب ۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

معیوب مثالیں ۔

شعری ۔ اک نگاہ برہم کے ساتھ ساتھ رہتی ہے ،
گردشیں زمانے کی چھین کر زمانے سے

شاد عارفی ۔ تم سے بڑی اب تک بن بیاہ بیٹھی ہے
دیکھتی ہے کنبے کی رسم و راہ بیٹھی ہے

نوٹ :۔ دوسرے مصرع میں اور باتوں کو چھوڑیے ۔ صرف شکست ہی کو دیکھیے ۔

۸ ۔ بحرِ ہزج (قبض کے زحاف سے)

داغ ۔ ساقی تری محفل میں چرچا نہیں مے کا
اس سے تو یہ بہتر تھا کچھ ذکرِ خدا ہوتا

جلیل ۔ زیبا یہ نہ تھا تم کو دل لے کے دغا کرنا
ان ہونٹوں سے کیا کہنا ان باتوں سے کیا کرنا

معیوب مثالیں ۔

سیماب ۔ انوارِ حقیقت کے تو عرش سے چن لایا
عالم کو شناسائے اسرار کیا تو نے ،

مقبول حسین احمد پوری

وہ بادلوں کی یورش ہو جائے جو لیں برہم
اور پھول جھڑیں تاروں سے چاند ہنسے یک دم ،

اندرجیت ۔ خاموش تری ہستی رکا ہو گا رباب اک دن ،
موجوں کے تھپیڑے میں ٹوٹے گا حباب اک دن

۹ ۔ بحرِ مضارع (خرب کے زحاف سے)

امیر مینائی ۔ آزاد رہ کے ہم نے دن عمر کے گزارے
دو چار دن سفر میں دو چار دن وطن میں

علی حزیں ۔ اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

سودا ۔ کونین تک بھی ملتی جس دل کی مجھ کو قیمت
قسمت کہ اک نگہ پہ میں اس کو ڈال آیا

معیوب مثالیں ۔

نخشب ۔ ہر نوجواں کو پیرِ صد سال کر دیا ہے ،
سبزہ کو کیا چمن کو پامال کر دیا ہے

ذوق ۔ پابوس نقشِ پا سے تیرے جو کنکری ہو ،
جا کر فلک پہ اس کو تاروں سے برتری ہو

آفتاب ۔ لرزاں تھا جس کے بچوں کا نام سن کے عالم ،
ہوتا تھا جن کے آگے شیروں کا ختم دم خم

اندرجیت ۔
اے قوس تیرے دل کش دھونے میں کیا گماں ہے ،
تو پر تو جمالِ خلاقِ دو جہاں ہے ،

(اقتباس)

تقاضا

مخمور لکھنوی

(انتخاب)

یہ آنکھیں شرابی یہ عارض گلابی
یہ روشن جبیں اور یہ ڈورے کتابی
یہ کاکل کی لہریں سحابی سحابی
یہ شکل آفتابی یہ رخ ماہتابی

چلا آ شتابی چلا آ شتابی

یہ پُرلطف موسم یہ ٹھنڈی ہوائیں
مہکتی مہکتی یہ دلکش فضائیں
گلہ اپنے دل کو کسے ہم دکھائیں
کہ ہر ہر نفس ہے یہاں انقلابی

چلا آ شتابی چلا آ شتابی

یہ صحن چمن اور یہ فصل بہاری
یہ چھٹکی ہوئی چاندنی پیاری پیاری
دلہن ہے گلستاں کی اک ایک کیاری
یہ رنگین راتیں ہوائیں شہابی

چلا آ شتابی چلا آ شتابی

شراب محبت سے مخمور ہو کر
مئے عشوہ و ناز سے چور ہو کر
اندھیرے میں شمع سر طور ہو کر
دکھا اپنے عارض گلابی گلابی

چلا آ شتابی چلا آ شتابی

*

*

تبرکاتِ مخزنِ قدیم

خدا کی امانت

منقول از مخزن فروری ۱۹۰۳ء

(تلوک چند محروم)

یہ بھی خبر ہے او غمِ دنیا نہ دوں دل تجھے
سر اپنا لاکھ پیٹ مگر دل نہ دوں تجھے
دل جانتا ہے صورت صید زبوں تجھے
ورنہ میں دل کے نام پہ قرباں کروں تجھے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

او قاصد شباب! نہ لانا پیام عشق
تیاری دل کی ہے یہاں حسن کے نام عشق
موجود ہیں یہاں تو جاں نثار دل سے غلام عشق
ممکن ہے بھول جاؤں کہیں پی کے جام عشق

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

او حسن فتنہ زا تجھے دیکھتا تو ہوں
ہے تیرا سحرِ سامری بے شک تو افسوں
بہتر ہے تیرے عشوؤں سے نا آشنا رہوں
تو لاکھ عشوہ باز ہو یہ دل تجھے نہ دوں

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

مجنوں کا دل ہے خواہشِ لیلیٰ کے واسطے
وامق کا دل ہے داغِ عذرا کے واسطے
بلبل کا دل بنا گل رعنا کے واسطے
پھر دل مرا ہے کس کی تمنا کے واسطے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

پنہاں اسی میں راز ہیں کچھ راز دار کے
لایا تھا ساتھ عرش بریں سے اتار کے
دامن میں پھول کچھ ہیں کہیں کی بہار کے
پہلو میں کچھ ہیں داغ کسی لالہ زار کے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

کتنے ہی اس کے چاہنے والے ہیں تاک میں
دم کر رکھا ہے نفس ستمگر نے ناک میں
مل جائے آہ آہ مرا دل نہ خاک میں
کیا چیز لے کے جاؤں گا درگاہ پاک میں

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

صیادِ نفس! طائرِ دل سے ذرا پرے!
کمبخت اپنے جال کو جا کر بچھا پرے
دانا ہے کب فریب میں آتا ہے جا پرے
مکار جا کے مکر کے دانے گرا پرے

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

کس کام کا وہ دل ہے جو ناپاک ہو گیا
ناچیز ہو گیا خس و خاشاک ہو گیا
دل جو مریدِ راندۂ افلاک ہو گیا
آلودۂ گناہ تہِ خاک ہو گیا

یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

شاعر کا دل

منقول از مخزن جون ۱۹۰۲ء

صادق از سرینگر (کشمیر)

شاعر کے دل کو چاہیے محزوں سدا رہے
کوئی نہ کوئی اس پہ غضب ٹوٹتا رہے

یہ دل نہیں ہے عیش و تنعم کے واسطے
بیجا نہیں گر اس پہ قیامت بپا رہے

اک رمز ہے کہ ہوں بہم افلاس و شاعری
ممکن نہیں کہ گوشت سے ناخن جدا رہے

اس باغِ دہر میں جنہیں ہونا ہے بارور
اشجار شاخ و برگ سے وہ بینوا رہے

ایا جب اس شعر نے بستر لیا اٹھا
مردہ وہ دل ہے جس میں نہ کچھ ولولا رہے

دولت بڑھی تو شاعری روپوش ہو گئی
پاس اس اصول کا شعرا کو ذرا رہے

تہذیبِ نو جو آئی مٹا شاعری کا نام
اب والمیک و سعدیؔ و ہومر کہاں رہے

شاعر نہیں وراثتِ قاروں کے واسطے
یہ تیرا ملک تجھ کو مبارک شہا رہے

اس چشمِ سیر چشم میں کیا سلطنت ہے مال
یہ آشیانہ وہ نہیں جس میں ہُما رہے

اس دل کو چاہیے کہ نہ دولت پرست ہو
یہ کعبۂ خلیل ہے اس میں خدا رہے

شاعر کا دل ہو چاہیے آئینہ کی مثال
بیجا کدورتوں سے ہمیشہ صفا رہے

شاعر کے دل کو چاہیے ہو منبعِ حیات
جاں بخش مثلِ چشمۂ آبِ بقا رہے

راہِ طلب میں چاہیے طالب کو دم نہ لے
پیدل ہو یا سوار دوا دو سدا رہے

پیشِ نظر مظاہرِ قدرت کی ہو کتاب
جویائے علم و طالبِ صدق و صفا رہے

کرتا ہے رازِ حسنِ حقیقت کو بے حجاب
خو کردہ جبر احسنِ تیغِ ادا رہے

بیجا نہیں ہے نازِ ترا حسن بے نیاز
وہ عشق ہی نہیں جو نہ صرفِ وفا رہے

مشقِ جفائے ناز کر اور حسن پہ وہ دلہ
خوں عاشقوں کا تجھ کو الٰہی روا رہے

ایڈیٹر کے نام

"دلی مرحوم"

(ملا محمد واحدی مدیر نظام المشائخ)

جنوری ۱۹۵۰ء کا مخزن موصول ہوا۔ شکریہ۔ تیسرے دور کے مخزن نے دوسرے سال میں قدم رکھا ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ اس دفعہ آپ نے "جامع مسجد دہلی کے اردگرد کے حالات" ستمبر ۱۹۱۰ء کے مخزن سے نقل کئے ہیں۔ یہ مضمون غالباً شمس العلما منشی ذکاء اللہ مرحوم کا ہے۔ اس وقت مخزن نے دلی کے متعلق منشی صاحب کے متعدد مضامین شائع کئے تھے۔ وہ تمام مضامین دوبارہ سامنے آجائیں تو کوئی صاحب جو انقلاب کے بعد دلی کی ہر ہر چیز جمع کر رہے ہوں ان سے کام لے سکتے ہیں۔ دلی صرف دلی والوں کا شہر نہیں ہے۔ پنجاب کے زندہ دلوں کو بھی اس کوشش میں شریک ہونا چاہئے کہ دلی کاغذ پر محفوظ رہ جائے آپ چند مہینے مخزن کے پرانے پرچوں میں سے دلی کے سوا کوئی مضمون اور انتخاب نہ کیجئے تو کافی مواد فراہم کر دیں گے۔

"مخزن" افسوس ہے کہ قدیم مخزن کے بہت کم پرچے ہمارے پاس موجود ہیں جن حضرات کے پاس پرانی جلدیں موجود ہوں وہ اس سلسلے میں تعاون کریں تو ہم ممنون ہوں گے۔

"رنگ و بو"

(امین الرحمٰن)

فیاض محمود کے افسانوں پر "مخزن" میں جو دو مضمون چھپے ہیں نہایت اچھے ہیں۔ فیاض صاحب کے ساتھ جو بے انصافی ہوتی چلی آتی ہے کچھ حد تک اس کی تلافی حمید احمد خاں صاحب کے مضمون سے ہو گئی ہے لیکن پھر بھی فیاض محمود کی افسانہ نگاری کے دو تین اہم پہلو ابھی تک نمایاں نہیں کئے گئے

اگر میرے پاس فیاض صاحب کے افسانوں کا مجموعہ "رنگ و بو" ہوتا تو میں ضرور ایک مضمون لکھتا۔

آپ نے اچھا کیا کہ "مخزن" کا سرورق تبدیل کر دیا ہے۔ "مخزن" میں ابھی تک ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ تصویروں کا فقدان ہے۔ تصویریں چھاپنے کا انتظام ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔

مخزن کا سال ماسبق اور نئی تجاویز

(علی امیر صاحب ناظم)

مخزن کے تیسرے دور کی پہلی سالگرہ پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

ہمارے نوزائیدہ ملک کی ادبی زندگی کا یہ سال ہر لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اگر بعض بے لوث اور مخلص حضرات نے کچھ تعمیری کام اور مفید ادبی خدمات انجام دی ہیں تو تخریبی کام کرنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی ہے۔ بڑے بڑے ادیب اور شاعر اپنے نصب العین سے ہٹ کر ارزاں شہرت اور ذاتی منفعت کے حاصل کرنے میں لگے رہے یہ دیکھ کر بڑی مایوسی اور تکلیف ہوتی ہے کہ ادب اور صحافت کے اس ہنگامہ خیز دور میں بعض وہ بزرگ بھی جن کے کارنامے ہمارے واسطے مشعل راہ ہونے چاہئے تھے اپنے آپ کو گروہ بندی سے محفوظ نہ رکھ سکے یہی نہیں بلکہ انہوں نے رکیک جذبات اور اوچھے خیالات کے اظہار میں بھی پس و پیش نہ کیا۔

یہ نہایت اطمینان و مسرت کا مقام ہے کہ ادبی انتشار اور پریشانی کے اس افسوسناک دور میں بھی "مخزن" نے ملک کے علمی و ادبی رسائل میں ممتاز اور باوقار حیثیت حاصل کر لی ہے اور اس ناسازگار فضا میں سانس لینے کے باوجود آپ نے اپنے دامن کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھا ہے۔ امید ہے کہ اعتدال پسندی

ایڈیٹر کے نام

مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق"

"مخزن" کی شکل دیکھتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ اور بچپن کی خوشگوار یادیں لوٹ آئیں۔

شروع شروع اُردو جن چند پرچوں سے سیکھی تھی، اُن میں سرِ فہرست یہی "مخزن" مرحوم سلمہ اللہ تھا۔

"مخزن" ایک شریف پرچہ، شریفوں کا پرچہ اُس وقت بھی تھا، آج بھی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی رہیگا——— اس کی زندگی پر جامع تبصرہ صرف ایک لفظ میں آگیا۔

اللہ آپ سب لوگوں کی عمر میں، ہمت میں، صلاحیتوں میں برکت دے۔ خصوصاً آپ کے محترم مدیر اعزازی اور بانی اوّل کی عمر و ہمت میں۔

دریاباد ۱۰ رجنوری

منشی تلوک چند صاحب محروم مدیر "نتیج" دہلی

"مخزن" کا پہلا نمبر دیکھ کر قریب قریب اتنی مسرت حاصل ہوئی جتنی شیخ صاحب کی ملاقات سے ہوتی تھی——— اور پھر میرا تصور مجھے نصف صدی پیچھے لے گیا اور دیر تک بنّوں کے لہلہاتے کھیتوں میں پھرا تا رہا۔ جہاں میں نے "مخزن" کے لئے پہلی نظم لکھی تھی۔

اِن حالات اور اس عمر میں قلمی خدمت جو کچھ ہو سکیگی اس سے دریغ نہ ہوگا۔ عزیز جگن ناتھ بھی ضرور لکھے گا۔ شیخ صاحب کی خدمت میں میرا اسلام ضرور پہنچا دیجئے گا۔

دہلی ۲۰ رجنوری

جناب محی الدین صاحب شان مدیر "پرواز" بہاولپور

مَیں "مخزن" کے اجرا پر مبارکباد عرض کرتا ہوں ......

.... شمارہ اوّل میں آپ نے جس بلند معیار اور تعمیری رجحان، کا اظہار کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ دُعا ہے کہ خداوندِ کارساز آپ کو زیادہ سے زیادہ اُردو علم و ادب کی خدمت کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ آمین!

بہاولپور ۹ رجنوری

جناب جمیل صاحب راز بنگش مدیر "تعمیرِ نو" پشاور

ممکن ہے آپ مجھے بھول چکے ہوں۔ مگر یہ ایک واقعہ کا اظہار ہوگا اگر میں کہوں کہ "ہمایوں" کے اُس شاندار دور کے بعد بھی میری نظریں رسائل میں آپکا نام تلاش کرتی رہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ آپ نے وطن لوٹ کر "مخزن" کی ادارت سنبھال لی ہے

بازآمد شاہِ ما در کوئے ما

بازآمد آبِ جاں در جوئے ما

"ہمایوں" کا گزشتہ شاندار دور آج بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ اس حالت میں، میرا "مخزن" کے شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کرنا بے محل نہ ہوگا، خدا آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ میں ہر قسم کی اعانت کے لئے تیار ہوں۔

پشاور ۹ رجنوری

سید نذیر حسین صاحب ناشاد (انبالوی)

آپ نے اور شیخ صاحب قبلہ نے تو مجھے یاد نہ فرمایا۔ مگر میرا شوق دیکھئے کہ آپ کا اشتہار دیکھ کر میں دریافتِ حال کرتا کرتا آپ کے

دفتر تک پہنچا اور وہاں سے رسالہ "مخزن" خرید کر لایا۔ رسالے کو بڑے شوق سے دیکھا۔ جس دھوم دھام کا پرچہ پہلا ہونا چاہئے تھا ویسا تو نہیں مگر بُرا بھی نہیں ہے۔ ایک نظم ہندی اور ایک نظم معرّا بھی نظر سے گزری۔ اوّل نظم تو ایسی ہے کہ اِس کے بعد کوئی اُور نمونہ آیندہ شائع ہونا ہی نہ چاہئے۔ دوسری نظم اُس بے تُکی شاعری کا ایک نمونہ ہے جو یورپ اور امریکہ سے چلی ہے اور جس کی تقلید خواہ مخواہ ہندوستان اور پاکستان میں کی جاتی ہے۔ اگر آپ اپنے رسالے کی گرم بازاری کے لئے ایسی شاعری کو شائع کرنا چاہیں تو غیروں زبرِ "مخزن" کی روایات کے خلاف ہے۔ رسالے کی کتابت باریک ہے مگر شاید زمانۂ حال کا تقاضا ہے۔ والسلام۔

لاہور ۹ رجنوری

سید حسن صاحب طاہر

"مخزن" دَورِ سوم کا پہلا نمبر دیکھا۔ پرانے مخزن جو ہم نے بطور "آثارِ قدیمہ" دیکھے تھے اُن کی ہلکی سی جھلک اِس جدید رنگ میں بھی ہے اور قدیم و جدید کا یہ امتزاج بہت خوب ہے مقالات خصوصاً بہت قابلِ قدر ہیں اور نظمیں بھی بہت اچھی ہیں۔

کوئٹہ ۵ رجنوری

سید اختر حسین صاحب اختر

"مخزن" کا پرچہ ملا۔ اچھی طرح سے دیکھا۔ پرچہ نہایت کامیاب ہے۔ دعا ہے کہ خدا "مخزن" کو دن دُونی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ اور جدید مخزن، قدیم مخزن کی روایات کو زندہ رکھے اور اُن میں گرانقدر اضافہ کرے۔ آمین۔

شجاع آباد ملتان۔ ۷ رجنوری

جناب محمد ضرار صاحب اعظمی

"مخزن" کا پہلا پرچہ مقامی ایجنٹ "راجہ برادرز" سے ملا۔ مضامین کی ترتیب اور تنوّع کے اعتبار سے یہ اسکے کامیاب مستقبل کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ڈیرہ اسمٰعیل خاں ۸ رجنوری

آنسہ قمر القادری

"مخزن" کی نشأۃ الثانیہ پر صمیم قلب سے ہدیۂ تبریک پیش کرتی ہوں۔ اللہ کرے پہلے سے کہیں بڑھ کر پھلے پھُولے اور آسمانِ علم و ادب پر نیّرِ درخشاں بن کر چمکے!

لاہور ۱۶ رجنوری

شیخ محمد رمضان اختر

"مخزن" پڑھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز دوبارہ مل گئی ہو۔ "مخزن" کا دوبارہ اجرا اُردو ادب کو مبارک ہو۔

دہاڑی (ملتان) ۱۹ رجنوری

جناب محمد نواز صاحب شہید

"مخزن" کے دوبارہ اجرا پر مبارکباد۔ اُمید ہے کہ یہ رسالہ جناب کے زیرِ نگرانی اور بابائے اُردو کی رہنمائی میں پاکستان کا بہترین مجلۂ ادب ثابت ہوگا اور اُردو کو قومی زبان بنانے کے ساتھ ساتھ قوم میں نہ صرف وحدتِ فکر پیدا کرنے کی مساعی بروئے کار لائیگا بلکہ قومی ادب پر بیرونی تحریکوں کے فکری حملوں سے جو بُرے اثرات پڑ چکے ہیں۔ انھیں دُور کر کے صحیح اور صالح ادب کی تخلیق کریگا۔ دُعا ہے کہ آپ اپنی مبارک کوششوں میں کامیاب ہوں۔

فاضل پور (ڈیرہ غازی خان) ۹ رجنوری

حضرت نقوی

"مخزن" دیکھا، بے حد خوشی ہوئی اور مٹتے ہوئے نقوش پھر سے اُجاگر ہو گئے۔

بہاولپور۔ ۱۹ رجنوری

بچے کی طبیعت میں محبت کے ساتھ شوخی کی خوش آیند آمیزش بھی تھی۔ جب اسے معلوم ہو گیا کہ مسٹر منز اس کے ابّا نہیں ہیں تو اس نے اُن کو متوجہ کرنے کے لئے اُن کی دبیز اُونی پتلون پر اپنے ناصاف جُوتوں کو رگڑنا شروع کر دیا کبھی اُن کی چھاتی کو اپنی اماں کی چھتری سے کُریدتا اَور کبھی اِس قسم کی اَور پیاری پیاری حرکتیں کرتا جو کم سِنی کا خاصہ ہیں۔ اِس طرح وہ سفر کی کوفت کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا اَور کم از کم وہ خود اِس طریقے سے بہت مطمئن نظر آتا تھا۔

جب آفت کا مارا منز 'سُوان' پہنچا تو اُسے یہ دیکھ کر بیحد پریشانی ہوئی کہ پانچ بج کر پاؤ گھنٹہ اُوپر بھی ہو چکا ہے۔ سفید مکان، طویلے، کُتّے سے خبردار!' یہ سب نشانات اِس تیزی سے گزر گئے کہ اُسے خبر بھی نہ ہوئی۔ مسٹر منز کے سے پابندِ وقت اَور بھاری بھرکم آدمی کے لئے دیر سے پہنچنا قیامت سے کم نہ تھا۔ بہر حال وہ منزلِ مقصود پر پہنچے۔ مکان اَور اُس کی مخصوص آرائش سے مسٹر اَور مسز بڈن کا ذوق نمایاں ہو رہا تھا۔ مثلاً بیرونی دروازے کے دونوں طرف سنگریزوں اَور سیپیوں کے ڈھیروں پر دو کیوپڈ رکھے گئے تھے۔ مسٹر منز نے دروازے پر دستک دی تو اُونی وردی اَور سُوتی موزے پہنے ہوئے ایک بھدا سا نوعمر لڑکا باہر نکلا جو مسٹر منز کو ڈرائنگ روم تک پہنچا گیا۔ تعارف کی رسوم کے بعد مسٹر منز بیٹھے تو وہ اِس احساس سے کچھ گھبرائے گھبرائے سے نظر آتے تھے کہ وہ نہ صرف سب کے بعد پہنچے ہیں بلکہ کسی نہ کسی وجہ سے وہی تقریباً آدھی درجن نظروں کا مرکز بھی بنے ہوئے ہیں۔

میزبان نے ایک ادھیڑ عمر کے مہمان سے مخاطب ہو کر کہا "کہو بروگسن وزرا کا ارادہ کیا ہے؟ مستعفی ہوتے ہیں یا کیا؟" مسٹر بروگسن اخبار پڑھنے کے بہانے دراصل نظر بچا کر کن انکھیوں سے مسٹر منز کی وضع قطع اور لباس کی تراش خراش کا جائزہ لے رہے تھے۔ چنانچہ وہ کسی قدر کھسیانے ہو کر بولے۔

"تم جانتے ہی ہو بڈن، میں سیاسی اُلٹ پھیر سے کس قدر ناواقف ہوں۔ تمہارے بھائی صاحب اپنے عہدے کے اعتبار سے اِس سوال کا جواب دینے کے لئے موزوں ترین آدمی ہیں"۔

مسٹر منز نے مسٹر بروگسن کے خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ "اگرچہ میں سومرسٹ ہاؤس میں ہوں لیکن مجھے ملکِ معظم کے وزرا کے آیندہ منصوبوں کے متعلق قطعاً کوئی اطلاع نہیں"۔

مہمانوں نے مسٹر منز کے اِس بیان کو قابلِ اعتبار نہ سمجھا لیکن چونکہ اِس کے بعد کسی نے قیاس آرائی بھی نہ کی اِس لئے گفتگو میں ایک طویل وقفہ پیدا ہو گیا جس کے دوران میں کھانسنے اَور ناک صاف کرنے کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ بالآخر مسز بڈن ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں اَور سب لوگ اُن کی تعظیم کے لئے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اب کھانا تیار ہونے کا اعلان کیا گیا، جس کے بعد مہمان مسز بڈن اَور مسٹر منز کے پیچھے پیچھے کھانے کے کمرے کی طرف بڑھے۔

کھانا معمول کے مطابق شروع ہُوا اَور انجام کو پہنچا۔ چھری کانٹوں کے ٹکرانے کی جھنجھناہٹ اَور مہمانوں کی گفتگو کی ملی جلی آوازوں کے درمیان کبھی کبھی مسٹر بڈن اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں کسی مہمان کو شراب پیش کرتے اَور اُسے یقین دلاتے کہ تمہاری آمد میری دلی مسرت کا باعث ہوئی ہے۔

اِس دوران میں مسز بڈن کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ قابلِ دید رہا۔ جب کسی نوکر سے کوئی غلطی ہو جاتی تو اُن کے غصے کا پارہ بھی چڑھ جاتا اَور جب کوئی نوکر اپنا فرض خوش اسلوبی سے ادا کر لیتا تو اُن کے بُشرے سے طوفان کے فرو ہو جانے کی خبر بھی مل جاتی۔

کھانے کے بعد جب مہمانوں کے سامنے خشک میوہ اَور

شراب رکھی گئی تو ایک ملازم مسز بڈن کا اشارہ پاکر ماسٹر الیگزانڈر کو لے آیا۔ وہ نیلے لباس میں ملبوس تھے، جس میں چاندی کے چمکیلے بٹن ٹنک رہے تھے۔ بچے کے بالوں کا رنگ بھی تقریباً نقرئی ہی تھا۔ ماں کی طرف سے بچے کی تعریف و توصیف اور باپ کی طرف سے آدابِ مجلس کا خیال رکھنے کے متعلق متعدد ہدایات کے بعد ماسٹر الیگزانڈر "چچاجان" کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

مسٹر منز نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اُن کی حالت ایسی ہی تھی جیسی لال خاں کے کٹہرے میں بندھے ہوئے بندر کی۔ آخر وہ بڑے سوچ بچار کے بعد لڑکے سے یوں مخاطب ہوئے:

"تم تو بہت اچھے بچے معلوم ہوتے ہو۔ ہونا؟"

"جی ہاں۔"

"عمر کیا ہے تمہاری؟"

"آیندہ بُدھ کو پورے آٹھ سال۔ اور آپ کی ---؟"

ماں نے گھور کر بچے سے کہا "خاموش! الیگزانڈر تمہیں مسٹر منز سے اُن کی عمر دریافت کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟"

"اُنہوں نے بھی تو مجھ سے میری عمر پوچھی تھی!"

مسٹر منز نے اُسی وقت دل میں فیصلہ کرلیا کہ اس لڑکے کو تو ایک پینی نہیں چھوڑوں گا۔

بچے کی "خاطر تواضع" پر جب مہمانوں کی ہنسی ذرا تھمی تو بڑی بڑی زرد مونچھوں والا ایک ٹھگنا سا آدمی جو میز کے دوسرے سرے پر بیٹھا تھا اور کھانے کے دوران میں بھی اپنی بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ برابر گفتگو کا موقع پانے کا منتظر رہا تھا، بڑے بزرگانہ انداز میں بچے سے یوں مخاطب ہوا۔

"اچھا ایک بتاؤ تو "ہونا" کلمے کی کونسی قسم ہے؟"

"فعل"

مسز بڈن بڑے ناز سے بولیں "شاباش بچے! اب یہ بتاؤ فعل کیا ہوتا ہے؟"

"فعل! جس میں ہونا، کرنا یا سہنا پایا جائے ---- اب مجھے ایک سیب دو ماموں!"

مچیل مہمان جو گھرانے کا خاص دوست تھا اور جسے مسز بڈن اپنے شوہر کی خواہش یا عدمِ خواہش کے باوجود موقع بے موقع ہمیشہ مدعو کرلیا کرتی تھیں۔ وہ پھر بچے کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "میں خود تمہیں سیب دوں گا لیکن یہ تو بتاؤ "ہونا" کس کو کہتے ہیں؟"

"ایک پرندہ ہے۔"

"مسز بڈن گھرک کر بولیں "کیا ہوگیا تمہیں بچے!"

گھرانے کا دوست خوشامد سے ہنسنے لگا "ہی! ہی! ہی! ہی! ہی! ہی!"

اب مسٹر بڈن نے اُٹھ کر نہایت بلند آواز سے کہا "حضرات! براہِ کرم اپنے اپنے جام بھر لیجئے۔ میں ایک جامِ صحت ......"

مہمان بیچ میں چلا اُٹھے "ہیئر ہیئر!" اور کھنکھناتے جام میز پر گردش میں آنے لگے۔

جام بھر گئے تو بڈن کی آواز پھر بلند ہوئی "ہمارے درمیان اِس وقت ایک ایسی ہستی ہے ......"

گھرانے کا پست قد مچیل دوست پھر تملق سے چلایا "ہیئر! ہیئر!"

اِس پر بڈن نے ملامت آمیز انداز سے کہا "جونز! براہِ کرم ذرا صبر سے کام لو۔ ہاں تو حضرات! ہمارے درمیان اِس وقت ایک ایسی ہستی ہے جس کی موجودگی ہم سب کی دلی مسرت کا باعث ہوئی ہے اور جس کی پُر لطف گفتگو سے ہم سب حد درجہ محظوظ ہوتے ہیں۔"

مسٹر منز نے اطمینان سے پہلو بدلا اور دلچسپی سے کھانسے۔

انہیں یقین ہو گیا کہ یہ جامِ صحت کسی اور کا ہے کیونکہ گھر میں داخل ہونے کے وقت سے اب تک اُن کی زبان سے بمشکل دس بارہ لفظ ہی نکلے ہوں گے۔

مسٹر بڈن کی تقریر جاری تھی "حضرات میں ایک بہت ہی عاجز آدمی ہوں۔ اُس ہستی سے دوستی یا محبت کا دعوےٰ کرنا میرے لئے چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اُس بڑی ہستی کا جامِ صحت پینے کی تجویز پیش کر رہا ہوں اور اِس جرأت کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ وہ ایسی ہستی ہے کہ جو لوگ اس کی خوبیوں سے واقف ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ —— یہ کہ —— وہ اُسے بے حد عزیز رکھتے ہیں اور جو لوگ اس کی خوبیوں سے واقف نہیں وہ بھی، میرا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی —— یعنی کہ —— وہ بھی —— اس کے گرویدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

مہمان تائید اور حوصلہ افزائی کے انداز میں چلّائے "ہیئر! ہیئر!"

مسٹر بڈن نے کہا "حضرات میرے بھائی جو ایک ہر صفت موصوف آدمی ہیں وہ —— وہ —— وہ —— وہ میرے اپنے عزیز ہیں۔" (ہیئر ہیئر!) منز کچھ بڑبڑایا۔

مسٹر بڈن کی تقریر جاری تھی "میں اپنے بھائی کو یہاں دیکھ کر بے حد خوش ہوں اور اگر وہ اِس وقت یہاں نہ ہوتے تو ہم اُس مسرت سے یقیناً محروم ہو جاتے جو اُن کی موجودگی سے ہمیں حاصل ہوتی ہے۔ (ہیئر! ہیئر! کا شور) حضرات مجھے احساس ہے کہ میں نے آپ کی بہت سمع خراشی کی ہے۔ اِس لئے اب میں جذباتِ مسرت و —— مسرت و —— مسرت و —— اور"

"تشکر" (گھرانے کے چھبیل دوست نے لقمہ دیا)

"تشکر کے ساتھ مسٹر منز کا جامِ صحت پینے کی جسارت کرتا ہوں"

اُن تھک چھبیل دوست پھر بولا "حضرات براہِ کرم اُٹھ کر —— کھڑے ہو کر —— اور تمام آداب کے ساتھ۔ لیجئے —— ہپ! ہپ! ہپ —— زا —— ہپ! ہپ! ہپ! زا —— ہپ! ہپ! —— زا آ آ!"

اِس وقت سب نظریں مسٹر منز پر جمی ہوئی تھیں جو اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے اپنا پورٹ وائن کا پورا جام اِس طرح یکبارگی ڈکوس گئے کہ اُن کا دم گُھٹ گُھٹ گیا۔ آدابِ مجلس جس لمبے سے لمبے وقفے کی اجازت دے سکتے تھے اُس کے بعد مسٹر منز جواب دینے کے لئے اُٹھے۔ معزز مہمان کی تقریر میں سے صرف یہی الفاظ وقتاً فوقتاً سُنائی دیتے رہے "حضرات ...... باعثِ افتخار .... تقریب .... نہایت مسرت ...." یہی الفاظ بار بار دہرائے گئے، لیکن مسٹر منز کے چہرے پر گھبراہٹ اور دلی اذیت کے احساس کے آثار دیکھ کر مہمانوں کو یقین ہو گیا کہ انہوں نے کوئی نہایت زوردار اور پُرمغز تقریر کی ہے۔ چنانچہ جب وہ کرسی پر بیٹھے تو کمرہ تحسین و آفرین کی تالیوں اور زندہ باد کی آوازوں سے گونج اُٹھا۔ اس کے بعد جونز جو بڑی دیر سے موقع کے منتظر تھے، پھدک کر اُٹھے اور مسٹر بڈن سے پوچھا کیا مجھے ایک اور جامِ صحت تجویز کرنے کی اجازت ہے؟"

"ضرور! ضرور!" مسٹر بڈن یہ الفاظ کہتے ہوئے مسٹر منز کی طرف جھک گئے اور سرگوشی کے انداز میں اُن سے کہنے لگے "شیطان سے زیادہ ذہین ہے یہ شخص۔ تم اس کی تقریر سُن کر بہت خوش ہو گے

ہر موضوع پر فی البدیہہ بہترین تقریر کر سکتا ہے۔" مسٹر ہنز نے اخلاقاً سر جھکا لیا اور جونز نے تقریر شروع کی۔

"صاحبو! بہت سے مواقع پر متعدد تقریبوں میں، مختلف حالات کے اندر، اور گوناگوں صحبتوں کے درمیان مجھے یہ فخر حاصل ہوتا رہا ہے کہ میں نے اُن لوگوں کا جامِ صحت تجویز کیا جن کی موجودگی سے میں اس وقت سرفراز تھا۔ بعض مواقع پر ——— میں برضا و رغبت اعتراف کرتا ہوں ——— اور اخفا سے فائدہ بھی کیا ہے ——— مجھے اس اہم فرض کی مشکلات کا شدید احساس بھی ہوتا رہا ہے، اور میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ میں اس اہم موضوع پر تقریر کرنے کے قابل نہیں۔ اب اندازہ کیجیے کہ جب بعض گزشتہ مواقع پر میری یہ حالت رہی ہے تو اس موقع پر میرے احساسات کی کیفیت کیا ہوگی۔ اب ——— کہ ایک بالکل غیر معمولی صورتِ حال درپیش ہے (ہیئر! ہیئر!) میرے جذبات کی شرح ممکن نہیں، حضرات میرے جذبات کی شرح صرف ایک اقتباس سے ہو سکتی ہے، جو اس وقت اتفاقاً میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ ایک موقع پر جب وہ حقیقی عظیم الشان انسان، شیریڈن ———"

اب معلوم نہیں غریب شیریڈن کی رُوح پر کن کن اتہامات کا طومار باندھا جاتا، اگر دفعتہً اُونی پتلون والا لڑکا ہانپتا ہوا یہ اطلاع دینے کو نہ آ جاتا کہ چونکہ بارش ہو رہی ہے، اس لئے نو بجے کی ٹرام والا چکر لگا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے اگر کوئی شہر کی سواری ہو تو ایک نشست خالی موجود ہے۔

مسٹر ہنز یہ سنتے ہی یکایک اُچھل پڑے اور تعجب، التجا اور فریاد کے کئی مظاہروں کے باوجود اُنھوں نے خالی نشست سے فائدہ اُٹھانے پر اصرار کیا، لیکن اس گھبراہٹ کے عالم میں اُنھوں نے اپنا بیش قیمت ریشمی ہیٹ غائب پایا جو باوجود تلاش کے نہ مل سکا۔ اُدھر ٹرام والا زیادہ انتظار نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ مسٹر ہنز کے نام یہ پیغام چھوڑ کر شوان چلا گیا کہ "وہاں تک ایک دوڑ لگا کر آ جائیے۔ میں تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر انتظار کروں گا"۔ چونکہ مسٹر ہنز کو کہیں دس منٹ بعد یہ خیال آیا کہ وہ اپنا چھاتا پہلی ٹرام ہی میں بھول چکے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ دوڑ بھاگ کے عادی بھی نہ تھے اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ جب وہ "دوڑ لگانے" کی مہم سر کرنے کے بعد شوان پہنچے تو نہیں معلوم ہوا کہ ٹرام ——— اُس رات کی آخری ٹرام ——— اُن کے بغیر ہی جا چکی ہے۔

صبح کے تقریباً ۳ بجے ہوں گے جب بھیگے، ٹھٹھرے، زندگی سے بیزار، قابلِ رحم ہنز نے اپنے لندنی مکان کے دروازے پر لرزو رسی دستک دی۔ دوسرے ہی دن اُنھوں نے اپنی وصیت لکھی اور اُن کے مشیرِ قانونی کے بیان کے مطابق اس میں نہ مسٹر اوکٹیویس بڈن کا نام تھا، نہ مسز امیلیا بڈن کا اور نہ ماسٹر الیگزانڈر آگسٹس بڈن کا۔

سیفؔ

آج اشکوں کا تار ٹوٹ گیا رشتۂ انتظار ٹوٹ گیا
یوں وہ ٹھکرا کے چل دیئے گویا اِک کھلونا تھا پیار ٹوٹ گیا

غالبؔ

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

جلد   نمبر ۳

مخزن

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور۔ مارچ سنہ ۱۹۴۹ء

سلسلہ مطبوعاتِ نوائے وقت

سالانہ	سات روپے
ششماہی	چار روپے
ایک پرچہ	دس آنے

The Makhzan Lahore.

مدیر	صفحۂ اوّل،
پروفیسر حمید احمد خاں،	راوی کے کنارے، ۳
اثر صہبائی،	سرِ دلؤ، ۸
امین الرحمٰن،	تحریکِ تاثریت کے متقدمین، ۹
پروفیسر آغا صادق،	ترانۂ اُردو، ۱۷
ڈاکٹر محمد باقر،	سر ڈینیسن راس، ۱۸
پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی،	غزل، ۲۶
عارف عبدالمتین،	غزل، ۲۷
حسین اعظمی،	گزشتہ اجلاس کی کارروائی، ۲۸
قیوم نظر،	یاد، ۳۲
عبدالمجید بھٹی،	مَیں نے تجھے پایا، ۳۳
کیپٹن ضمیر جعفری،	غزل، ۳۳
ونگ کمانڈر سید فیاض محمود،	"یارِ ثبت نہ سمجھے ہیں......" ۳۴
محمد خلیل الرحمٰن،	فکر و تفکر، ۳۹
شیر محمد اختر،	حقیقت نگاری اور احساسِ حقیقت، ۴۱
مقبول حسین احمد پوری،	گیت، ۴۴
الطاف پرواز	غزل، ۴۴
انور جلال،	ریل میں گفتگو، ۴۵
محمد رشید الدین،	رشوت، ۴۹
نذر محمد انور طور،	مدیرِ اعزازی کے حضور میں، ۵۲
مدیر،	نشورات، ۵۴
مدیر،	مخزن المخازن، ۵۷
قارئین،	ایڈیٹر کے نام، ۷۱

صفحۂ اوّل

گزشتہ پرچے میں ہم نے حضرتِ مدیرِ اعزازی کی علالت اور صحت یابی کی اطلاع شائع کی تھی۔ الحمد للہ کہ شیخ صاحب کی ترقیٔ صحت قابلِ اطمینان ہے اور تندرستی بتدریج بحال ہو رہی ہے لیکن ابھی طبّی مشیروں نے آپ کو خط و کتابت کرنے اور لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔

بعض احباب "مخزن" کے مضامین شیخ صاحب قبلہ کے نام بھی بھیج رہے ہیں، لیکن یہ طریقہ غیر ضروری تضییعِ اوقات کا موجب ہو رہا ہے۔ مخزن کے مضامین مدیرِ مخزن ہی کے نام دفتر "مخزن" شاہدین بلڈنگز، مال روڈ لاہور کے پتے سے آنے چاہئیں۔ اہم اور ضروری امور کے متعلق مدیرِ اعزازی کے مشورہ و اجازت کا انتظام حسبِ ضرورت دفترِ مخزن خود کر سکتا ہے۔ امید ہے کہ احباب ان سطور کو پیشِ نظر رکھیں گے۔

"مخزن" کے عہدِ نو کا یہ تیسرا پرچہ ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ مخزن اِس قلیل وقت میں ایسے کہنہ مشق اُدبا کی توجہ کو جذب کرنے میں بھی کامیاب ہُوا ہے جو مدتوں سے بزمِ ادب میں نظر نہیں آئے تھے۔ تازہ پرچہ بہت سے نئے اُدبا کی نظم و نثر سے بھی مزیّن ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مخزن "تجربے" اور "ترقی" کا سنگم بن جائے۔

تصاویر مصوّری میں "تاثریت" کی تحریک کے متعلق جو مضامین چھپ رہے ہیں اُن کی تصویری توضیح کے لئے موجودہ پرچے میں چند تصویریں بھی شائع کی جا رہی ہیں جن کی تفصیل آگے درج کی جاتی ہے:۔

جزیرے میں اتوار کی شام، یہ ژارژ سورا کی تصویر ہے مصوّری میں تنقیطیت کے طریقِ کار کا ذکر مذکورۂ صدر مضامین میں آیا ہے۔ یہ تصویر تنقیطیت کا ایک عمدہ نمونہ ہے تنقیط میں رنگ کے گول گول اور برابر جسامت کے نقطے ایک دوسرے کے قریب اِس طرح لگائے جاتے ہیں کہ ایک رنگ دوسرے رنگ میں نہایت قدرتی طریقے سے ضم ہو جاتا ہے تنقیط کے طریقِ کار سے رنگوں کی چمک دمک بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ہم رنگین تصویر شائع کر سکتے تو اِن دونوں نکتوں کی بہتر توضیح ہو سکتی تھی۔

فولیئے بیرژیر کا شراب خانہ، یہ مانے کی مشہور تصویر ہے۔ اِس سے تاثریت کا یہ طریقِ کار واضح ہوتا ہے کہ مصوّر کے ذہن پہ کوئی منظر پہلی نظر میں جو تاثر کرے، تصویر اُسی کی کیفیت ہونی چاہئے۔ اِس تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل شراب خانے کی ایک ملازمہ نے مصوّر کی توجہ کو سب سے زیادہ جذب کیا چنانچہ اِس لڑکی کے علاوہ منظر کی دیگر تفاصیل درجہ بدرجہ مبہم اور دُھندلی ہوتی گئی ہیں۔ علاوہ بریں سامنے رکھی ہوئی بوتلیں بھی الگ الگ نہیں دکھائی گئیں اِس کا مفہوم یہ ہے کہ اِن بوتلوں نے مصوّر کے ذہن پر محض ایک "مجموعی بصری تاثر" کیا ہے۔ اِسی لئے اِس بات کو تصویر میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی کہ بوتلیں فی الحقیقت کہاں کہاں پڑی تھیں۔

درناں کا گرجا، یہ مونے کی ایک تصویر ہے۔ اِس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کسی منظر کے پھیلاؤ کی کونسی تفاصیل مصوّر کی نگاہ کو اوّل اوّل جذب کرتی ہیں۔ مونے کے مُوقلم کے "بکھرے مَس" مشہور ہیں۔ اِس تصویر میں پانی پر روشنی کے اثرات دکھانے میں اُس نے اِسی طریقِ کار سے کام لیا ہے۔ روشنی کی مدد سے وہ پانی کی لپکپاہٹ، حرکت اور زندگی کی تصویر کشی میں بھی کامیاب ہو گیا ہے۔

مدیر

"مخزن"

راوی کے کنارے

جرمن مصنف ایمل لڈوگ نے اپنی کتاب "داستانِ نیل" لکھ کر یہ دکھا دیا کہ ادب میں سوانح نگاری کا مفہوم کتنا وسیع ہے، اور اگر دریا کی زندگی کو بھی اُس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے جس سے بڑے آدمیوں کو اُن کے سوانح نگار دیکھتے ہیں تو اکابر کی شخصیت کی طرح دریاؤں کی "شخصیت" بھی نہ صرف پُرعظمت معلوم ہوگی بلکہ اُس میں اور بڑے آدمیوں کی زندگی میں ایک حیرت انگیز مماثلت بھی نظر آئیگی۔ "راوی کے کنارے" بہت چھوٹے پیمانے پر اُردو میں اُسی جذبے کا پہلا اظہار ہے جسے لڈوگ نے بہ کمالِ فن اپنی "داستانِ نیل" میں پیش کیا تھا؛

جہاں کلّو کی پہاڑیاں ڈوبتے سورج کا رُخ کئے ہوئے حسرت بھری نظروں سے کشمیر کے سبز پوش کہساروں کو دیکھتی ہیں، وہاں ایک چھوٹی سی ندی سر پٹکتی ہوئی اُٹھتی ہے، اور بڑی تیزی سے جنوب مغرب کی راہ لیتی ہے۔ چمبہ کے کوہ و دشت کو اپنی تیز رفتار میں پیچھے چھوڑتی وہ گرداس پور کے علاقے میں کچھ یوں ہی سا سستاتی ہے اور پھر مچلتی ہوئی اپنی منزلِ مقصود کی طرف چل دیتی ہے۔ اب مغربی پنجاب کے میدان اس کی جولاں گاہ ہیں۔ اب وہ دبتی اور سمٹتی نہیں ہے۔ اب وہ لہراتی اور پھیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور اپنی سبک رَوی میں لاہور کے دامن کو بوسے دیتی تھوڑی دیر کے لئے یوں رُکتی ہوئی نظر آتی ہے جیسے ولیوں، شاعروں اور بادشاہوں کے اِس شہر نے اس کا دل موہ لیا ہے۔ مگر نہیں، اس کی منزل ابھی دُور ہے۔ اس کے پاؤں بدستور حرکت میں ہیں۔ لاہور کے طواف کی ناکام کوشش میں وہ جنوب کی طرف ذرا سا خم کھاتی ہے۔ اور پھر تیر کی طرح سیدھی اپنے سفر میں رَوانہ ہو جاتی ہے۔ خوش نما قصبات، ہرے بھرے کھیت، دہقانوں کے گیت، اسے پکارتے ہیں، مگر وہ سُنی اَن سُنی ایک کئے، اپنے آئینۂ رخسار میں ہزاروں آفتابوں کا عکس لئے ہوئے، چپ چاپ آگے نکل جاتی ہے۔ اس کی پیشانی

کا نور سندھ کے سہانے ریگزاروں کو ڈھونڈتا ہے، جن کے پیچھے عرب کا سمندر اُسے اپنی پناہ میں لینے کے لئے بیقرار ہے! اب ریت کا علاقہ شروع ہو چکا ہے اور جلد ہی اُسے مغرب کی طرف سے آنے والی ہواؤں میں چناب کی موجوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ اپنے اِس رفیقِ سفر کی آواز پر وہ دفعتہً ایک قوس بنا کر قبلہ رُو ہو جاتی ہے، اور اِس تیزی سے سفر کا یہ حصہ طے کرتی ہے کہ سبک رفتار چناب کو ملتان پہنچنے سے پہلے پہلے جا لیتی ہے: بحیرۂ عرب ابھی دُور ہے، لیکن اس کا علیٰحدہ سفر چناب میں مل کر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ ہے راوی: شمالِ مغربی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پہلا دریا۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اسے تیسرے اور مرکزی دریا کی حیثیت حاصل تھی۔ اب مغربی پنجاب کی سرحد کا دریا بن جانے پر بھی اِس کی مرکزی حیثیت قائم ہے، کیونکہ لاہور — صوبے کی حکومت کا صدر مقام اور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر اِس کے کنارے آباد ہے۔ کلو کی پہاڑیوں سے نکل کر چناب تک ساڑھے چار سو میل کی مسافت ہے، پنجاب کا محکمۂ آبپاشی تین مرتبہ اِس دریا کی دھند کھولتا ہے۔ بالائی نہر باری دوآب مادھوپور کے مقام پر راوی میں سے نکالی گئی ہے۔ اور زیریں نہر باری دوآب بلوکی کے مقام پر دریا سے نکلتی ہے۔ یہ وہی بلوکی ہے جس کا پل ۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور پاکستان کے لاکھوں انسانوں کی گزرگاہ کا کام دے رہا تھا۔ بلوکی کے مقام پر بالائی نہر چناب راوی میں ڈالی گئی ہے۔ ایک طرف چناب کا پانی راوی میں گرتا ہے اور دوسری طرف زیریں نہر باری دوآب کے ذریعے نکال لیا جاتا ہے، یہ دوسری نہر تحصیل چونیاں کے شمال مغربی حصے سے گزرتی ہوئی ضلع منٹگمری میں داخل ہو جاتی ہے۔ ایک تیسری نہر چناب کے سنگم سے چند میل اوپر کاٹی گئی ہے۔ یہ نہر سدھ رائے ہے، جو سردی کے موسم میں اکثر خشک رہتی ہے، لیکن برسات کے مہینوں میں جب دریا چڑھا ہوا ہوتا ہے اِس نہر کا پانی اردگرد کی بنجر زمین کو بخوبی سیراب کر سکتا ہے۔

راوی کا سرچشمہ اگرچہ کوہستانِ ہمالیہ کی برف ہے لیکن پگھلی ہوئی برف سے جو پانی ملتا ہے، وہ میدانی علاقے میں دریا کے پاٹ کو پوری طرح نہیں بھر سکتا۔ دریا کے پاٹ کا لطف دیکھنا ہو تو برسات میں نظر آتا ہے جب برساتی ندی نالے بڑے جوش و خروش سے آکر اِس میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن پانی کی موجودہ کمی نہروں کے کٹ جانے کی وجہ سے ہے۔ یہ کیفیت ہمیشہ سے نہ تھی۔ خود اِس دریا کے نام پر غور کیجئے جب آریا وسط ایشیا سے چل کر پہلے پہل پنجاب میں داخل ہوتے تو اُنہوں نے راوی کو "ایراوتی" یعنی "پانی والی"، کا نام دیا۔ جس وادی میں سے راوی گزرتی ہے وہ یکساں طور پر زرخیز نہیں ہے۔ ناقص زمین کے ٹکڑے بھی اِس وادی میں ملتے ہیں لیکن اِس میں کوئی شبہہ نہیں کہ زیریں نہر باری دوآب نے بعض ایسے علاقوں کو جو بالکل بنجر پڑے تھے سرسبزی کے لحاظ سے جنت کا نمونہ بنا دیا ہے۔ منٹگمری کا ضلع پہلے ایک ویران جنگل تھا جہاں جنڈ اور پیلو کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لوگ عام طور پر اسے گنجی بار کہتے تھے۔ لیکن اب اِس خارزار کی جگہ ہرے بھرے اور لہلہاتے کھیتوں نے لے لی ہے۔ راوی کے کنارے کنارے چلے جائیے۔ گیہوں کی فصل سب سے زیادہ بہتات سے ملے گی۔ یہ ربیع کی فصل ہے۔ خریف میں مکئی، جوار، باجرا بھی کثرت سے ہوتا ہے۔ سردی اور گرمی میں موسم کا فرق انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ سردی ایسی کہ راتوں کو پودے ٹھٹھر کر سوکھ جاتے ہیں، اور پالا ایسا پڑتا ہے کہ صبح اُٹھیے تو کھیت سفید نظر آتے ہیں۔ جب گرمی کا موسم آتا ہے تو اِس علاقے

حمید احمد خان

کی تپش پورے برِ عظیم میں کسی دوسری جگہ سے پیچھے نہیں رہتی۔ اِس لئے یہاں کے رہنے والے صحیح معنوں میں سرد و گرم چشیدہ اَور ہر قسم کی کڑیاں جھیلنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

ابھی ہم نے منٹگمری کے ضلع کا ذکر کیا تھا جو زیریں بہن باری دو آب کی تعمیر سے پہلے ایک ویرانہ تھا لیکن اِس علاقے کی حالت ہمیشہ سے ایک بیابان کی نہ تھی۔ پانچ ہزار سال پیچھے چلئے تو اِسی منٹگمری کے قریب ایک پُر رونق شہر آباد نظر آتا ہے ہڑپا کی تہذیب کنارِ راوی کی پہلی تہذیب ہے۔ یہ تہذیب برِ عظیم ہند و پاکستان ہی کی نہیں ، دُنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کی ہم عصر ہے۔ اِس تہذیب کی عبادت گاہوں اَور کوچہ و بازار سے ، اِس کی تفریحات اَور میلوں سے ، راوی کو اُتنا ہی قریبی تعلق تھا جتنا لاہور میں زندگی کے موجودہ ہنگاموں سے ، ایک ہزار برس گزر گئے اَور پھر آریا پنجاب میں داخل ہوئے۔ ہڑپا کی تہذیب کے بیشتر آثار کو وقت کا دریا بہالے گیا۔ آبادیاں جنگل بن گئیں ، اَور آریاؤں کی کھیتی باڑی ہی راوی کے میدانوں سے اِن کے تعلق کا تنہا ثبوت رہ گئی لیکن ایک نئی تہذیب کے پودے نے پھر بہت جلد اِس دریا کی وادی میں جڑ پکڑلی۔ تین ہزار سال ہوئے ویدوں کے سب سے پرانے بھجن اِسی علاقے میں گائے گئے۔ اَور عجب نہیں دریاؤں کی مذہبی پاکیزگی کا وہ تصوّر جو ہندوؤں سے مخصوص ہے۔ سب سے پہلے راوی مائی کے جھکاوں کی صورت میں یہیں ظاہر ہُوا ہو۔ رِگ وید کے بہت سے منتر آریاؤں نے اِسی علاقے کے زمانۂ قیام میں لکھے۔ چند سو برس اَور گزر گئے۔ آریائی تہذیب نے اپنے نئے نئے مرکز تلاش کئے۔ دوسری قومیں شمال مغرب کے پہاڑی دروں میں سے ہوتی ہوئی راوی کے کناروں پر پہنچتی رہیں۔ دو ہزار برس سے اُوپر کا عرصہ ہُوا ، سکندر کے طوفانی دستے یہاں پہنچے اَور اُنہوں نے راوی کو کہیں اِسی جگہ کے قریب عبور کیا جہاں آجکل کا لاہور آباد ہے۔ قدیم ہندو لاہور غالباً اِس جگہ واقع تھا جہاں اب اچھرے کا قصبہ ملتا ہے۔ راوی بھی اس وقت یقیناً اِسی مقام کے قریب بہتی تھی اِس لئے کہ دریا نے بتدریج شمال کی طرف پیچھے ہٹنے کی جو روش کئی صدیوں سے اختیار کر رکھی تھی اس کے بعض اَور ثبوت بھی ہمارے سامنے ہیں۔ ڈیڑھ ہزار سال اَور گزر گئے اَور اب غزنویوں اَور غوریوں کے قدم راوی کے کنارے تک پہنچے۔ مسلمان حکمرانوں کے مختلف خاندان صدیوں تک راوی کے علاقے سے وابستہ رہے۔ آخر وہ دن بھی آیا جب ظہیرالدین بابر راوی کے پانی میں اُترا اَور تیر کر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ پٹھان بادشاہوں کے وقت میں بھی یہ علاقہ ایک پُر امن اَور مضبوط حکومت سے بہرہ مند تھا لیکن مُغلوں کے آنے سے راوی کے میدانوں کو چار چاند لگ گئے۔ اکبر اَور جہانگیر نے خاص طور پر اِس علاقے کی رونق میں اضافہ کیا۔ نئے شہر بسائے ، باغ لگائے ، رفیع الشان محلات کھڑے کر دیئے۔ دو سو سال اسی امن و امان اَور عیش و نشاط میں گزر گئے۔ اِس کے بعد رنجیت سنگھ نے کچھ عرصے کے لئے اِس علاقے پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ رنجیت سنگھ کے بعد ۱۸۴۹ء میں تقریباً ایک سو سال کے لئے انگریز آئے۔ ڈیڑھ سو برس کے اِس وقفے کو چھوڑ کر دیکھئے تو جے پال کی شکست سے لے کر آج تک کے ایک ہزار سال راوی کے میدانوں نے مسلمان حکمرانوں کے زیرِ سایہ بسر کئے۔

دراصل ہڑپا کی تباہی کے بعد راوی کی تہذیبی تاریخ لاہور ہی کو مسلسل اپنا مرکز بناتی رہی ہے۔ تقریباً ایک ہزار

برس تک ہندو اس شہر پر قابض رہے لیکن آج قدیم ہندو دَور کی کوئی عمارت شہر میں کہیں نظر نہیں آتی۔ لاہور کے قلعے میں ایک پرانا مندر ہے لیکن اسے بھی تاریخ لاہور کے بہت ابتدائی دَور سے منسوب کرنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اچھرے کے پاس بھیروں کا مندر البتہ ہندوؤں کی پراچین تہذیب کی یادگار ہے۔ ہندوؤں کے بعد غزنوی اَور غوری عہدِ حکومت کی عمارتوں کو بھی لاہور نے قائم نہیں رکھا۔ ایک آدھ مسجد، ایک آدھ مقبرہ پانچ سَو سال کے بعد اُس تعلق کا نشان دیتا ہے جو پٹھان حکمرانوں کو لاہور سے رہا۔ اس کے برعکس مغلیہ فنِ تعمیر کے بہت سے نمونوں کو لاہور نے بڑی محبت سے محفوظ رکھا ہے۔ راوی نے گزشتہ دو صدیوں میں اپنا رُخ بدل کر کئی عمارتوں کو سَیلِ فنا کے حوالے کر دیا ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی بڑی عمارت نابُود نہیں ہوئی۔ اورنگ زیب کے وقت میں راوی شاہی قلعے کی دیواروں کے پاس بہتی تھی۔ اس کے دوسرے کنارے پر اُمرا کے محلات اَور باغات تھے۔ یہ سب راوی کی بپھرتی موجوں کی نذر ہو چکے ہیں۔ کسی شام لاہور سے نکل کر راوی کے پُل پر کھڑے ہو جیئے اَور پچھم کی طرف نظر دوڑائیے۔ شفق کی سرخی پانی میں جھلک رہی ہے۔ لیکن اس سے اُوپر دریا کے شمالی کنارے پر ایک تنہا عمارت اپنی ویرانی کے باوجود زمین میں اپنے پیر مضبوط کیے جائے آپ کو گھُور رہی ہے۔ یہ ہمایُوں کے بھائی مرزا کامران کی بارہ دری ہے اَور لاہور کی سب سے پہلی مغلیہ عمارتوں میں سے ہے۔ جو خوبصورت باغ اس کے ساتھ شامل تھا، اُس کو دریا کی موجیں بہا لے جا چکی ہیں۔ اَور خود بارہ دری کی عمارت بھی اس کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ اِس بارہ دری سے کچھ فاصلے پر بجانب شمال مشرق نورجہاں بیگم کا مقبرہ ہے اَور اس کے قریب ہی ایک وسیع احاطے میں ایک اُجڑے ہوئے مگر خوبصورت گنبد کے نیچے

نورجہاں کا بھائی آصف جاہ محوِ خواب ہے۔ آصف جاہ کے مقبرے سے متصل جہانگیر کی آخری آرام گاہ کی حسین و جمیل عمارت اَور اِس کا دلکشا باغ ہے۔

گزشتہ و موجودہ زندگی کے یہ سب نظارے راوی کی پُرسکون روانی کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال کی نظم کنارِ راوی کے پس منظر میں کچھ اِسی قسم کے احساسات جھلک رہے ہیں۔

سکُوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پُوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدے کا یہ زیر و بم ہُوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہُوا مجھ کو

برنیر اَور دوسرے یورپین سیاح جنھوں نے عہدِ مغلیہ کے لاہور کو اپنی آنکھوں دیکھا ہے اپنے روزنامچوں میں اس کی رونق اَور خوبصورتی کا ایک ایسا نقشہ چھوڑ گئے ہیں جو پرانی داستانوں کے شہروں کی یاد دلاتا ہے۔ اِس کا پھیلاؤ سولہ یا سترہ میل سے کم نہ تھا۔ شہر کو ہر طرف خوبصورت باغ اَور گلزار گھیرے ہوئے تھے جن میں نہریں اَور فوارے اَور آبشار جاری رہتے تھے۔ سڑکیں لمبی اَور بارونق اور پختہ تھیں اور ان میں سے اکثر راوی کے پانی سے دُھلتی تھیں۔ برنیر نے عمارتوں کی بلندی کی خاص طور پر تعریف کی ہے اَور لکھا ہے کہ اِس معاملے میں لاہور نے آگرے اَور دلی کو مات کر دیا ہے۔ راوی کا پاٹ چوڑا تھا اَور گہرائی اِتنی تھی کہ ملتان اَور سندھ سے تجارت کے جہاز ہر وقت آتے جاتے رہتے تھے۔

لیکن لاہور کی عمارتیں اَور راوی کے کنارے صرف عہدِ ماضی کا ایک نقشِ جمیل بن کر نہیں رہ گئے، اُن کو عہدِ حاضر کی سرگرمیوں سے بھی ویسا ہی گہرا اَور دلچسپ تعلق ہے۔ خود میں نے اپنی زندگی میں

ایسی کیفیتیں دیکھی ہیں جن میں راوی کی روانی اُن تاریخی انقلابات کی ہمدوش و ہم آہنگ تھی جنہوں نے عظیم الشان واقعات کا رُخ پلٹ دیا۔ اُنیس برس ہوئے اِسی راوی کے کنارے شیشم کے درختوں کے سائے میں مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگرس کی طرف سے ہندوستان کی کامل آزادی کا اعلان کیا۔ پھر دس برس گزر گئے اور اِسی فضا میں ملّتِ اسلامیہ کے پاسبان قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنی پُرشکوہ، اور گونجتی ہوئی آواز میں پاکستان کے قیام کے لئے اپنا نعرۂ حق بلند کیا۔ اِس اعلان کے لئے نئی راوی کا نہیں بلکہ عہدِ اورنگ زیب کی پُرانی راوی کا کنارہ پسند کیا گیا۔

پچھلے دو سال میں راوی نے انسانی آبادیوں کا ردّوبدل دیکھا ہے لیکن اُن لاکھوں نئی صُورتوں سے جو اب راوی کے کناروں پہ گھومتی نظر آتی ہیں، راوی کی موجیں بہت جلد مانوس ہو گئی ہیں۔ زندگی حرکت کا دوسرا نام ہے۔ راوی کا پانی ہزاروں سال سے حرکت میں ہے اور اِس راز کو سمجھتا ہے کہ اِس حرکت پر جس سے زندگی کی پاکیزگی اور نکھار میں اضافہ ہو، کائنات کی بنیاد ہے۔

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

حمید احمد خاں

دریائے عظیم ——— فرات

(ڈی۔ جی۔ ہوگارتھ)

.... ہمارے سامنے، بتدریج بلند ہوتے ہوئے، بھورے بھورے ٹیلوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ، اُفق تک موجزن نظر آتا تھا اور ہمارے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی کوہستانی جھاڑیاں، پتھروں کے بیچ میں سے سر نکالے جھانک رہی تھیں۔ اِسی پتھریلی سرزمین میں ساعت بر ساعت، ہم اپنے تھکا دینے والے سفر کی منازل طے کرتے رہے اور ہماری نگاہیں پانی کی ایک جھلک کے لئے صبر پیمانہ اضطراب سے دائیں، بائیں، سامنے اور پھر دائیں بائیں بھٹکتی رہیں۔ لیکن دوپہر ہونے تک، بلکہ اِس کے دو گھنٹے بعد بھی، ٹیلوں کی بنجر یکسانی میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا، اِس کے برعکس زمین کے ارتفاع میں برابر کچھ ترقی ہی نظر آتی رہی۔ جب طرفۃ العین میں غیر متوقع طور پر سطحِ مرتفع پھٹ گئی جیسے کسی دیو کی بھاری کدال نے اُسے کاٹ کر دو ٹوک کر دیا ہو، اور ایک ہزار فٹ نیچے، نیلگوں دریا ایک متحرک قوس کی شکل میں، چمکتا، دمکتا، بوجھل رفتار دکھائی دیا ——— یہ تھا، فرات، آخر کار!

جب ہم نے ہتھیلیوں کے بل چٹان سے نیچے اُترنا شروع کیا، تو دھاڑتے ہوئے دریا کی پُرعظمت گرج اور گونج ہمارے استقبال کے لئے اُوپر کو اُٹھی۔ طوفانی دریا کچھ جھلّایا ہوا تھا ....

*"راوی کے کنارے" کی اشاعت کے لئے ہم ریڈیو پاکستان کراچی کے ممنون ہیں۔

حضرتِ اثرؔ صہبائی

سرودِ نو

چمن کے نغمہ گر اپنی نوا بدل ڈالیں　　چمن کا رنگ، چمن کی فضا بدل ڈالیں
خزاں کی شام گئی، صبحِ نوبہار آئی　　نہائیں غنچہ و گُل اور قبا بدل ڈالیں
اگر ہیں اُن کی اداؤں سے خار آزُردہ　　تو پھول شوخیٔ ناز و ادا بدل ڈالیں
نہ راس آئے اگر سرو لالہ و گُل کو　　تو آؤ باغ کی آب و ہوا بدل ڈالیں
چراغِ حق سے اگر اُنکے ہاتھ خالی ہوں　　نکالیں راہ نئی، رہنما بدل ڈالیں
نئے نئے ہیں سمندر، نئے نئے طوفاں　　رکھیں خدا پہ یقیں ناخُدا بدل ڈالیں
اگر ہے گردشِ ارض و سما خلافِ مزاج　　مزاجِ گردشِ ارض و سما بدل ڈالیں
دُعا کے ساتھ ہو تیغِ عمل بھی ہاتھوں ہیں　　جُھکے قضا بھی جو طرزِ دُعا بدل ڈالیں

وطن کی پاک زمیں کا ہے نام "پاکستاں"
اثرؔ دلوں کو اب اہلِ ریا بدل ڈالیں

امین الرحمٰن:

تحریکِ تاثریت کے متقدمین

اِس سلسلے کا پہلا مضمون "آرٹ میں تاثریت کی تحریک" فروری میں شائع ہو چکا ہے۔ "تاثریت" مصوری کے ایک نسبتاً نئے مسلک کا اصطلاحی نام ہے جس کی ابتدا انیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد فرانس میں ہوئی اور جس کے پیرو جلد ہی انگلستان اور دوسرے یورپی ممالک میں بھی پیدا ہو گئے۔ "تاثریت" اساتذۂ قدیم کے وضع کردہ "رواجی" "ضابطۂ فن" کے خلاف ایک بغاوت تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مصور کو اشیائے مصورہ کی ہیئت و حقیقت سے بے تعلق ہو کر پردۂ تصویر پر محض اپنا "تاثر" پیش کرنے کی آزادی ہو۔ تاثر سے مراد یہ ہے کہ ایک خاص وقت اور حالت میں کوئی شے یا اشیا خود مصور کے ذہن اور آنکھ کو کیسی نظر آئیں۔ اِس سلسلے کا آخری مضمون "تاثریت کا جمالیاتی پہلو" اپریل میں شائع ہوگا۔ — مدیر

تاثریت کی تحریک کو آرٹ کی دنیا میں متعارف اور رائج کرنے میں بیک وقت بہت سے مصوروں کی کوششوں کو دخل ہے۔ اِن کوششوں میں فرانسیسی مصوروں کا بالخصوص بہت بڑا حصہ ہے۔ اِن لوگوں کا اپنے نصب العین میں اعتقاد، اِن کے مقاصد کا خلوص اور اُن کا عزم ایسا تھا کہ مخالفوں کی تنقیدوں، تعریضوں اور طنزوں کے باوجود بالآخر یورپ، انگلستان اور امریکہ کے جدت پسند اور طباع مصور اِس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے مصوری کی اِس نئی تکنیک کو اپنانے میں نہایت فراخدلی اور وسعتِ قلب کا ثبوت دیا اور اسے بہت جلد آرٹ کی دنیا میں ایک ایسی زوردار تحریک بنا دیا جس نے قدیم اور جدید اسلوبِ فن کے پیروؤں کے فکر و عمل میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آرٹ کا اظہار محض چند کڑے اور جامد قوانین پر عمل کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ آرٹ فکر و عمل کے لحاظ سے دیگر ذہنی اداروں کے مانند ایک ایسا نامیاتی ادارہ ہے جس کے قوانین میں زمانے کے تقاضوں اور انفرادی احساسات کے مطابق رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اور وہ فن کار جو اپنے فن کا اظہار کرنے کے لئے صدیوں پرانے اصول اور قواعد کا تتبع سختی سے کرتے ہیں، خواہ اُن اصولوں اور قاعدوں کے پس پشت صدیوں کی روایات اور منطقی توجیہات ہی کیوں نہ ہوں، اُس وقت تک کوئی نیا شاہکار پیش نہیں کر سکتے جب تک وہ اپنے فن کے تار و پود میں اپنے زمانے کے مخصوص تقاضوں کی جھلک نہ دکھائیں اور اسے اپنے ذاتی احساسات سے آب و رنگ نہ دیں۔ انھوں نے سوچا کہ اِس قسم کا فن جو محض ماضی کی روایات کے بل بوتے پر زندہ ہو ایک قسم کی نقالی ہے۔ جس کے جمالیاتی جواز کے لئے اکثر نقادوں کو منطقی توجیہات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اِس قسم کا فن ہمیشہ مائل بہ انحطاط رہتا ہے اور بہت جلد اپنی موت مر جاتا ہے بخلاف اِس کے سچا فن ماضی کی روایات کو اپنانے کے بعد اُن میں ایسی نئی روایات کا اضافہ کرتا ہے جو ماضی کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی روح کو بھی اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہوتی ہیں۔

اگر اِس اصول پر تاثریت پسند مصوروں کے متقدمین کے فکر و عمل کو پرکھا جائے تو آرٹ کا غیر جانبدار نقاد اُن تنقیدوں

اُور تعریفوں کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ڈھونڈ سکے گا جو تحریک تاثریت کے بانیوں پر اُن کے معصر نقادوں اور ہم پیشہ فن کاروں کی طرف سے روا رکھی گئی تھیں۔ کیونکہ دراصل تاثریت کی تحریک آرٹ میں کوئی بالکل نئی تحریک نہ تھی بلکہ یہ تحریک مصوری کے بعض ایسے "ٹیکنیکی" عملوں کو ایک باضابطہ شکل دینے کی کوشش تھی جو اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے بعض مصوروں کی ٹیکنیک کا جزو رہتے۔ چنانچہ اس تحریک کے متقدمین جن میں مانے، مونے، رینوآ، پسارو اور دے گا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ محض اس لئے مورد الزام نہیں ٹھہرائے جا سکتے کہ انہوں نے آرٹ کے رائج الوقت اور مسلمہ اصولوں کو توڑا اور قدیم روایات سے بغاوت کی۔ کیونکہ جہاں تک آرٹ کے اصولوں کو توڑنے کا سوال ہے، یہ بات خود محل نظر ہے کہ آرٹ کے کسی قسم کے مستقل اصول بھی ہو سکتے ہیں، اور جہاں تک قدیم روایات سے بغاوت کرنے کا الزام ہے یہ معاملہ بھی چنداں اہم قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تقریباً تمام تاثریت پسند مصوروں نے کسی نہ کسی رنگ میں قدیم روایات کی اُس حد تک ضرور پیروی کی جس حد تک ان کے انفرادی آرٹ کی مخصوص نوعیت نے انہیں اجازت دی۔ چنانچہ آرٹ کی روایات میں تاثریت پسند مصوروں نے اپنے فکر و عمل سے جو نئی مثالیں قائم کیں، اُن سے نہ صرف اِس تحریک کو فروغ پانے میں مدد ملی بلکہ اُن سے آرٹ کے خزینے میں بھی گرانقدر اضافہ ہوا۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی کے اختتام تک اِس تحریک نے نہ صرف فرانس ہی میں جو اس کا جنم بھوم تھا اپنا لوہا منوا لیا بلکہ یورپ بھر میں آرٹ کی تمام سرگرمیوں میں ایک نئی رُوح دوڑا دینے میں کامیاب ہو گئی۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک یورپ، انگلستان اور امریکہ میں پھیل گئی۔ انیسویں صدی کے فرانسیسی حقیقت پسند مصور مانے کو تو خیر اس تحریک کا بانی کہا ہی جاتا ہے اُس کے ہمعصر مونے، رینوآر پسارو، دے گا اور سسلے وغیرہ بھی اس تحریک کو مقبول بنانے میں اُس سے پیچھے نہیں رہے۔ اور دراصل یہ اسی گروہ کی مسلسل کوششوں اور اپنے مقصد سے خلوص کا نتیجہ ہے کہ تاثریت کی تحریک اور ٹیکنیک آج بھی آرٹ کی اُن تمام چھوٹی موٹی تحریکوں کا سرچشمہ ہے جو آئے دن آرٹ کی دنیا میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

تاثریت کی اصطلاح اگرچہ کلود مونے کی ایک تصویر کی وجہ سے وضع ہوئی جس کا نام "تاثرات" تھا لیکن تاثریت کو ایک باضابطہ تحریک بنانے کے سلسلے میں ایدوار مانے کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ ایدوار مانے ۱۸۳۲ء میں ایک متوسط درجے کے خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ ایک مجسٹریٹ تھا اس لئے وہ اپنے بیٹے کو بھی قانون کی تعلیم دلانا چاہتا تھا لیکن مانے کا میلان مصوری کی طرف زیادہ تھا اس لئے اُس نے مصوری کی تربیت کو قانون کی تعلیم پر ترجیح دی۔ مانے کا اُستاد اُس زمانے کا ایک مشہور مصور تاماکُوتر (۱۸۱۵ء - ۷۹) تھا۔ بدقسمتی سے اُستاد اور شاگرد میں فنی لحاظ سے کوئی گہرا رشتہ قائم نہ ہو سکا کیونکہ مانے کی طبیعت کو جو ہمیشہ سے کڑے اصولوں کے خلاف بغاوت کرنے پر مائل رہا کرتی تھی اپنے اُستاد کی قدامت پسندانہ تعلیم پسند نہ آئی۔ وہ نیچر کو بہت قریب سے دیکھنا پسند کرتا تھا اور اپنے اصل احساسات کے موافق کینوس پر اُس کی نقل اتارنا چاہتا تھا لیکن اس کے برخلاف اُس کا اُستاد کلاسیت اور رُومانیت کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی تھا۔

مانے نے اپنے فن کی تکمیل کے لئے جرمنی، آسٹریا اور اٹلی کا

سفر بھی کیا تاکہ وہاں کے عجائب گھروں اور آرٹ کی اکادمیوں میں جاکر قدیم اساتذۂ فن کے نمونوں اور شاہکاروں کو دیکھ سکے۔ مگر مانے کو مصوری میں اپنا مطمحِ نظر پیشی مصوروں ویلازکے اور گویا کی تصاویر میں ملا جو فرانس کے عجائب گھر واقع لُوور میں موجود تھیں۔ مانے کو شروع ہی سے تصاویر میں روشنی کی اہمیت کا خاص خیال تھا، چنانچہ جب اُس نے اِن اساتذہ کی تصاویر میں روشنی کا مناسب اور کامیاب استعمال دیکھا تو اُس نے غیر شعوری طور پر اپنے ذہن میں فنِ مصوری میں ایک نئی ٹیکنیک کے اصول وضع کر لئے جن کی مدد سے اُسے بعد میں اپنی بعض نہایت اہم تصاویر بنائی تھیں۔ لیکن مانے صرف اِن ہی دو مصوروں سے متأثر نہ ہوا تھا۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں فرانسیسی آرٹ میں کچھ ایسی تحریکات پیدا ہو چکی تھیں جن کا مقصد جھوٹی قسم کی "کلاسیت" کے خلاف بغاوت کرنا تھا۔ چنانچہ مصوروں کے جس طبقے نے اِس کلاسیکی فرسودگی کے خلاف بغاوت کی اُنہیں لوگ حقیقت پسند کہنے لگے۔ اِن مصوروں کا سرگروہ ایک فرانسیسی مصور گستاو کوربے (۷۷-۱۸۱۹ء) تھا۔ کوربے نے مصوری کے موضوعات کے متعلق تقریباً انہیں خیالات کا اظہار کیا اور اُن پر عمل بھی کیا جو انگریز شاعر ورڈز ورتھ نے اپنی اور کولرج کی نظموں کے مشترکہ مجموعے (۱۸۰۰ء) کے دیباچے میں قلمبند کئے تھے۔ کوربے نے زندگی کے نہایت ہی معمولی واقعات کو اپنی تصویروں کا موضوع بنایا۔ عام لوگوں کی زندگی میں اُسے اصل حقیقت نظر آئی۔ کوربے کے نزدیک مصوری چونکہ ایک بصری فن ہے اِس لئے مصوروں کو صرف اُن ہی موضوعوں پر تصویریں بنانی چاہئیں جن کا ادراک انسانی بصارت کر سکتی ہے۔ اِس لحاظ سے کوربے رومانیت کے اُسی قدر خلاف تھا جس قدر رومانیت کے پیرو کلاسیت کے خلاف۔ وہ فوق العادت موضوعوں کی تصویریں بنانے کا سخت مخالف تھا۔

اسے یہ بات قطعاً ناپسند تھی کہ پرستانی داستانوں، یا رُوما نوں میں سے موضوع لے کر تصویریں بنائی جائیں۔ اُس کے متعلق ایک مشہور روایت ہے کہ ایک دفعہ اُس سے کسی گرجا میں تصویریں بنانے کے لئے کہا گیا جن میں فرشتوں کی تصاویر بھی تھیں۔ کوربے نے اِس پیشکش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ "میں اُس شے کی تصویر کیسے بنا سکتا ہوں جسے میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں!"

فی الحقیقت …بے کا ذکر کئے بغیر ہم تأثریت پسند مصوروں کے متقدمین کے فکر و عمل کے پس منظر کو پوری طرح سے سمجھ نہیں سکتے۔ کیونکہ فرانسیسی تأثریت پسند دراصل انہیں حقیقت پسندوں کی معنوی اولاد ہیں جن کا سرگروہ کوربے تھا۔ کوربے نے نہ صرف دیگا اور مانے جیسے تأثریت پسندوں پر براہِ راست اثر ڈالا بلکہ اُس نے اُنہیں اس ٹیکنیک کا راستہ بتا دیا جس پر انہیں بعد میں چلنا تھا۔ اگر مانے اور ہسلر، مونے اور پسارو کے نظریۂ فن کا تجزیہ کیا جائے تو اُس میں اور کوربے کے نظریے میں چنداں فرق نظر نہ آئے گا۔ کوربے نے اپنی تصاویر کی مرتبہ فہرست پر دیباچہ کے طور پر لکھا تھا "اپنے احساس کے مطابق اپنے زمانے کے طور طریقوں، خیالات اور مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرنا، اور صرف ایک مصور بننا ہی نہیں بلکہ اِس سے بڑھ کر ایک انسان بننا، ایک لفظ میں یوں سمجھو کہ زندہ آرٹ کی تخلیق کرنا، یہ ہے میرا مطمحِ نظر!"

نوجوان مانے ویلازکے اور گویا کے علاوہ اِسی مصور کے فکر و عمل سے زیادہ متأثر ہوا تھا اور اگر مانے کے کینوس پر پیشی مصوروں ویلازکے اور گویا کی ٹیکنیک کے اثرات نظر آتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی موضوع کے اعتبار سے اُس کی تصاویر اِسی فنی کلیے سے مشتق ہیں جسے تأثریت پسند مصوروں کی پہلی پشت نے

تمام وکمال کورُبے سے مستعار لیا تھا۔

مانے کورُبے کے فن کا اِس حد تک جائز وارث تھا کہ اُس نے بھی کورُبے کی مانند انسانی زندگی کے عام موضوعات پر تصویریں بنائیں لیکن دونوں کے مزاج میں کسی قدر اختلاف بھی تھا۔ کورُبے سوسائٹی کے نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا اِسی لئے اُس نے اپنی تصاویر کے لئے بھی پرولتاری طبقے کے لوگوں اور اُن کی زندگی کو اپنا موضوعِ فن قرار دیا اور مانے فرانسیسی سوسائٹی کے خوشحال متوسط درجے کے طبقے سے تعلق رکھتا تھا اِس لئے اُس کا مزاج کورُبے سے زیادہ امیرانہ تھا چنانچہ اُس کی تصاویر میں فرانسیسی سوسائٹی کے متوسط درجے کی خوشحال زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔

ابھی تاثریت کی کوئی باقاعدہ تحریک شروع نہ ہوئی تھی، اور اُس کی ٹیکنیک کا کوئی باضابطہ پیرا اختراع نہ ہوا تھا کہ مانے نے مصوری کی رائج الوقت ٹیکنیک سے انحراف کرکے تصویروں میں سایہ اور روشنی کا ایک اَور ہی طریقے سے استعمال شروع کر دیا۔ دراصل تو اِس ٹیکنیک کا سرچشمہ سپینی مصور ولازکے اور گویا کی تصاویر تھیں لیکن کورُبے کی تصاویر نے بھی اِس سلسلے میں مانے کی فنی رہنمائی کرنے میں بہت کام کیا۔ مانے کا مشاہدہ تھا کہ فطرت میں اُس قسم کے خطوط کا کوئی وجود نہیں جن کی مدد سے مصور اپنی تصویر کی بیرونی حدود بناتے ہیں اور نہ رنگوں کا امتزاج اِس طرح ہوتا ہے کہ ایک رنگ کے ختم ہوتے ہی دوسرا رنگ شروع ہو جائے بلکہ وہاں رنگوں کا امتزاج اِس پُر اسرار طریقے سے واقع ہوتا ہے کہ یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ ایک رنگ کی حد کب ختم ہوئی اَور کب دوسرا رنگ شروع ہوا۔ چنانچہ مانے نے اپنی تصاویر میں بیرونی خطوط کا استعمال یکسر چھوڑ دیا اور رنگوں کے نازک نازک لمسوں کی مدد سے تصویر کے اجزا کو ہیئت دینی شروع کی۔ مانے رنگوں کو اِس طرح استعمال کرتا تھا کہ وہ ہم آہنگ ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے تھے گویا مختلف پانیوں والے دو دریا ایک دوسرے میں سما گئے ہوں۔ پھر رنگوں کے استعمال کے علاوہ مانے کے نزدیک تصویر کے اہم ترکیبی اجزا میں سے ایک اہم شے روشنی بھی تھی۔ ایک دفعہ کسی نے اُس کی ایک تصویر کے متعلق پوچھا "اِس تصویر میں اہم شخصیت کونسی ہے؟" مانے نے جواب دیا "اِس تصویر کی اہم شخصیت روشنی ہے!" اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مانے کو تصویروں روشنی کے صحیح صحیح استعمال کا کس حد تک خیال رہتا تھا۔ رنگوں اور روشنی کے استعمال کے لئے مانے سپینی مصور ولازکے اور گویا کا ممنونِ احسان ہے۔ اِن مصوروں کی تقلید میں اُس نے بھی اپنی تصاویر کی سطح کو نمایاں آب و رنگ دینے اَور خوبصورت بنانے کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی۔ اور اگر مجھے موسیقی کی ایک اصطلاح کو استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ مانے نے مختلف رنگوں کے "زیر و بم" کو اِسی طرح استعمال کیا ہے جس طرح ولازکے استعمال کیا کرتا تھا۔ مانے کے ہم عصر مصور اور نقاد یہ دیکھ دیکھ کر لرزا اُٹھتے تھے کہ وہ مصوری کے مسلّمہ اصولوں سے کس باغیانہ حد تک انحراف کرنے پر کمر باندھے رہتا ہے۔ مانے نے فرانس کے سرکاری "سالون" میں اپنی تصاویر کی ۱۸۶۱ء میں پہلی بار نمائش کی۔ اِن تصویروں میں خود مانے کی اَور اُس کی نوجوان بیوی کی تصویر تھی۔ اِس کی ایک اَور تصویر کا عنوان تھا "سپین کا ایک گٹار بجانے والا"۔ اِن تصاویر پر حقیقت پسندی کا الزام لگایا گیا۔ اُس زمانے میں حقیقت پسندی فرانس میں زیرِ عتاب تھی اَور اِس کا تتبع کرنے والے بہت بُری نظر سے دیکھے جاتے تھے لیکن پھر بھی "سالون" کی رپورٹ میں مانے کا ذکر احترام سے

کیا گیا لیکن کلاسیکی سکول کے حامی سالوں پر کچھ اِس طرح سے چھائے ہوئے تھے کہ اُنہوں نے دو سال بعد یعنی ۱۸۶۳ء میں مانے کو اِسی طرح کے اَور بہت سے جدّت پسند اور ترقی پسند مصوروں کے ساتھ سالوں سے خارج کر دیا۔

مانے کے خلاف جو شور اُٹھتا رہا اِس کا باعث کچھ تو اُس کی حقیقت پسندی تھی اَور کچھ قدیم روایات سے اُس کی بغاوت۔ جب ۱۸۶۳ء میں اُس نے اپنی تصویر "اولمپیا" بنائی جو بستر پر لیٹی ہوئی ایک عُریاں عورت کی تصویر ہے تو کلاسیکی سکول کے حامیوں میں ایک شورش بپا ہوگئی۔ مخالفت، نفرت اور حقارت کا اِس قدر خوفناک طوفان اُٹھا کہ خود تصویر بھی لرز اُٹھی ہوگی۔ حالانکہ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جاتا تو مانے نے "اولمپیا" بنا کر روایات کی اُسی اصل رُوح کو برقرار رکھا ہے جس نے ویلازکے کی تصویر "وینس آئینہ دیکھ رہی ہے"، گویا کی تصویر "عُریاں ماجا" اور گیورگیونے اور ٹائی ٹین کی تصویر "وینس استراحت کر رہی ہے" کو جنم دیا تھا۔ یہ تصویر اب لُوور میں موجود ہے۔ مخالفت نفرت اور حقارت کا طوفان مانے کی ایک اَور تصویر پر بھی بپا ہوا تھا اُس تصویر کا عنوان ہے "سبزہ زار میں ناشتا"۔ اِس تصویر میں ایک عُریاں عورت دو مردوں کے ساتھ سبزہ زار میں بیٹھی دکھائی گئی ہے جو وہاں پکنک کی غرض سے گئے ہیں۔ تصویر کی ترکیب میں سبزہ زار اور اُس کا پس منظر بہت دلاویز ہے اور رنگوں کا مخصوص امتزاج مانے کے اسلوب کو ظاہر کرتا ہے۔ اِس تصویر میں ویلازکے کے اثرات بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ جس نے اپنی کھلی فضا کی تصویروں میں روشنی، دھوپ اور سائے کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ اِس تصویر کے متعلق مانے کے مخالفوں کا اعتراض ہے کہ یہ تصویر ڈیزائن کے تمام اُصولوں کو توڑ کر بنائی گئی ہے۔

لیکن اِس الزام سے محض مانے کے مخالفین کی ناواقفیت کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ اِس تصویر کا ڈیزائن مرکینٹونیو کی ایک اَنگریونگ کی ہُوبہو نقل ہے جس میں اُس نے رفیئل کی ایک تصویر "نیپچیون اور پریاں" کا چربہ اُتارا تھا۔

مانے کے متعلق بڑی آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حقیقت پسند زیادہ تھا اور تأثریت پسند کم۔ کیونکہ تأثریت کی تحریک شروع ہونے سے بہت پہلے وہ ایک حقیقت پسند مصور کی حیثیت سے روشناس ہو چکا تھا۔ مانے کی مشہور تصویروں میں سے جو اب تأثریت کی ٹیکنیک کے مثالی نمونوں کے طور پر پیش کی جاتی ہیں، اُس کی تصویریں "بیئر کا ایک مزیدار گلاس" (۱۸۷۳ء) "بیئر پلانے والی" (۱۸۷۹ء) اور "فولیئے بیئر ژیر کا شراب خانہ" (۱۸۸۲ء) قابلِ ذکر ہیں۔ "بیئر پلانے والی" اور "فولیئے بیئر ژیر کا شراب خانہ" دونوں تصاویر میں رنگوں کا نہایت نازک فرق ہے اَور دونوں تصویریں حقیقی زندگی کے بہت قریب ہیں۔

شراب خانے والی تصویر میں میز پر پڑی ہوئی تمام بوتلیں علیحدہ علیحدہ دکھائی نہیں گئیں بلکہ تمام بوتلیں ایک دوسرے کے تعلق میں دکھائی گئی ہیں۔ یہ تأثریت کی ٹیکنیک کا ایک خاص پہلو ہے جس میں تصویر کے مختلف اجزا کو یوں باہم مرکب کیا جاتا ہے کہ اُن سے وہی اثر پیدا ہو جو متعلقہ اشیا کو پہلی نظر میں دیکھنے سے ہوتا ہے۔ "بیئر پلانے والی" میں رنگوں، روشنی اور سائے کا نبھاؤ خوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی تصویروں کو تأثریت کی مثالی تصویریں کہا جاتا ہے۔

"بیئر کا ایک مزیدار گلاس" ایک ایسی تصویر ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مانے پر شبیہ کاری کے معاملے میں ویلازکے، ہالز اور گویا کے علاوہ کُوربے کا کتنا گہرا اثر پڑا تھا۔ یہ تصویر مانے کے ایک دوست بیلو کی ہے جو اَنگریور تھا۔ بیلو نے اِس تصویر کے لئے مانے کو اسّی نشستیں دی تھیں۔ یہ تصویر فن کے اعتبار سے کُوربے کی تصویروں

کا بہ نسبت زیادہ "آزاد" اور برجستہ ہے۔ اس کی سطحیں زیادہ صاف ہیں۔ تاہم ساخت کے اعتبار سے اسے بہت زیادہ طبعزاد یا انقلاب آفریں نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اسے کوربے کی حقیقت پسندی کے تسلسل کا جسے مانے نے اپنے ابتدائی فن میں جاری رکھا تھا ایک مرحلہ کہہ سکتے ہیں۔

مانے کے بعد جس مصور کا نام تاثریت کی تحریک سے سب سے زیادہ وابستہ رہا ہے وہ کلود مونے ہے۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ تاثریت کی اصطلاح مونے ہی کی ایک تصویر کی بنا پر وضع ہوئی تھی جس کا عنوان "تاثرات" تھا۔ کلود مونے ۱۸۴۰ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ مصوری میں بوداں اس کا استاد تھا جس سے اس نے بہت کچھ سیکھا۔ مونے بعد میں گلیئر کے سٹوڈیو میں داخل ہو گیا۔ رینوآ اور سسلے سے اس کی ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ مونے کی ابتدائی تصویروں پر بوداں اور کورو کا اثر سب سے نمایاں ہے۔ اس مضمون کی پہلی قسط میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۸۶۳ء میں جب فرانس کے "سالون" میں فرانسیسی مصوروں کے ایک جدت پسند طبقے کو اپنی تصاویر کی نمائش کی اجازت نہ دی گئی تو انہوں نے ایک علیحدہ کمرے میں اپنی تصویروں کی نمائش کی، جس کے لئے نپولین سوم نے انہیں خاص اجازت دی تھی۔ اس نمائش میں کلود مونے بھی شریک تھا اور یہیں اس کی مانے سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ مانے اس سے سات برس چھوٹا تھا۔ چونکہ دونوں ایک ہی مقصد کے علمبردار تھے اس لئے بہت جلد دونوں میں دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ مونے ہی کی وساطت سے مانے، رینوآ اور سسلے سے متعارف ہوا۔ جو پہلے ہی سے ویسلر، استاد گلیئر کے سٹوڈیو میں تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ دو اور فنکاروں یعنی کیمیئے پسارو اور دیگا کی شمولیت سے فرانس میں مصوروں کا ایک چھوٹا سا گروہ بن گیا جس نے بعد میں تاثریت جیسی زوردار تحریک کی داغ بیل ڈالی۔

مونے کی تصویر "درناں کا گرجا" تاثریت کی ٹیکنیک کے ایک اہم پہلو کی ترجمانی کرتی ہے یعنی یہ کہ ہمیں کسی شے پر پہلی نظر ڈالنے سے کیا دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ جب ہم کسی منظر کو پہلی نظر میں دیکھتے ہیں تو منظر کے تمام پھیلاؤ کی پوری پوری تفاصیل ہماری بصارت اور توجہ کو جذب نہیں کرتیں بلکہ اس منظر کی صرف ایک آدھ شے یا کوئی ایک حصہ جو نگاہ کے سامنے پہلے آ جائے۔ یہی بات مونے نے اپنی اس تصویر "درناں کا گرجا" میں دکھائی ہے لیکن یہی نہیں اس تصویر میں روشنی کے اثرات کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے پانی کی موجوں میں جو عکس پڑ رہا ہے اس سے نہ صرف روشنی کی کپکپاہٹ ہی ظاہر ہوتی ہے بلکہ حرکت اور زندگی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے جو مونے کی مخصوص ٹیکنیک کا ایک خاص پہلو تھا۔ مونے کی ایک اور تصویر جس کا عنوان "لا دا کور" ہے اور جو ایک "ارغنانہ" ہے تاثریت کی ٹیکنیک کی بہترین مثال ہے۔

تاثریت کی ٹیکنیک میں مونے نے سائے اور روشنی کے سلسلے میں اہم اضافے کئے ہیں۔ مونے کی تصاویر روشنی کے اثرات کے لحاظ سے تاثریت کے ٹیکنیکی پہلو کو بہت اچھی طرح ظاہر کرتی ہیں۔ مونے کے "ارغنانوں" میں روشنی کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اور یہ بات مونے ہی کو سوجھی تھی کہ روشنی کے اثرات کسی شے پر مختلف اوقات میں مختلف ہوتے ہیں اور اگر کسی ایک ہی شے کی تصویریں مختلف اوقات میں بنائی جائیں تو روشنی کے اثرات کے لحاظ سے وہ سب مختلف ہوں گی۔ چنانچہ اس نے اس طرح تصویروں کے کئی سلسلے بنائے جن میں سے "گھاس کے گٹھے"، "پاپلر کے پیڑ"، "واٹرلو کے پل کے قریب دریائے ٹیمز"، "روآں کا گرجا" اور

"آپی تیلوفر" بہت مشہور ہیں۔

تاثریت پسندوں کے گروہ میں تیسرا اہم نام آگست رینوآ (۱۹۱۹-۱۸۴۱ء) کا ہے۔ یہ فرانسیسی مصور لیموژ کے مقام پر پیدا ہوا تھا۔ جہاں اس کا باپ خیاطی کا کام کرتا تھا۔ تیرہ برس ہی کی عمر میں وہ روزی کمانے کے لئے چینی مٹی کے ظروف پر نقش و نگار بنانے لگا۔ اس ابتدائی تربیت نے اس کی تمام تصاویر پر اپنا ایک گہرا اثر چھوڑا ہے۔ جن میں ضمنی آرائش کو بہت بڑا دخل ہے۔ رینوآ کے تمام دوست "ارضانہ کار" تھے لیکن وہ خود ایک "تشبیہہ کار" تھا۔ آرٹ کی تاریخ میں رینوآ کا نام تاثریت پسندی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے زمانے کے آرٹ کو فرانس کے اٹھارھویں صدی کے آرٹ سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں بھی کی ہیں۔

رینوآ ایک طویل مدت تک تاثریت کی ٹیکنیک کا حامی رہا لیکن اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اس نے اشیاء کے ہنگامی بصری تاثرات کو ترک کر دیا اور اپنے لئے اشیا کی ہیئت کی ایک .. اور مستقل حقیقت تلاش کر لی۔ اس نے روشنی اور سائے کا ایک پیچیدہ نظام اختراع کیا جس کی نظیر مظاہر فطرت میں نہیں مل سکتی اور اشیاء کی سطوح پر کہیں تو روشنی اور کہیں سایہ ڈالنے سے خاص قسم کے اثرات پیدا کئے جو اب اسکی ٹیکنیک کا ایک اہم جزو سمجھے جاتے ہیں۔ اس کی آنکھ کسی شے کو اس طرح دیکھتی تھی کہ وہ اسے نیم کرّوی ابھاروں اور اسطوانوں کا ایک سلسلہ سا دکھائی دیتی تھی اس لئے وہ اپنی تصاویر میں ہر ابھار کے واضح ترین حصہ کو روشنی کی مدد سے زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتا۔ اس طرح اس کی بنائی ہوئی تصویریں ابھراں بن جاتیں۔

کیمیئے پسارو (۱۹۳۰-۱۸۳۰ء) تاثریت پسندوں کے متقدمین میں ایک اور اہم نام ہے وہ فرانسیسی مصور کورو کا شاگرد تھا۔ اس کے عام اسلوب اور رنگ آمیزی کی طرز پر اس کے استاد کورو کا اثر بڑا نمایاں ہے۔ اور موضوع اور ڈرائنگ کے معاملے میں وہ میلے کا تتبع کیا کرتا تھا۔ پسارو تاثریت پسند ملا میں عمر کے لحاظ سے سب سے بڑا تھا۔ وہ تمام عمر مصوری میں نئے نئے تجربے کرتا رہا لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیشہ دوسروں کے تجربوں اور فنی اختراعوں پر بھی ہمدردانہ غور و خوض کیا کرتا تھا۔ آخری عمر تک وہ رنگوں کے "زیر و بم" اور ان کی ماہیت کے متعلق تجربے کرتا رہا۔ پسارو کے بنائے ہوئے "ارضانے" یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس میں کلاسیت اور تاثریت کو سمونے کی کس قدر قابلیت تھی۔ چنانچہ اس کی تصویر "لاندرے کا منظر" یہی ظاہر کرتی ہے۔

پسارو (۱۸۷۱ء) میں مونے کے ساتھ انگلستان بھی گیا تھا۔ جہاں اسے ٹرنر کی تصاویر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور رنگوں کے امتزاج کے متعلق دونوں کے خیالات ٹرنر کے طریق اور عمل سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ جدید سکول پر ٹرنر کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اور جب یہ دونوں مصور فرانس واپس آئے تو انہوں نے اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا جن میں الیفرڈ سسلے (۹۹-۱۸۳۹ء) بھی تھا۔ سسلے کے والدین انگریز تھے لیکن وہ فرانس ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے آرٹ کی نشو و نما بالکل مونے کے موافق ہوئی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دونوں کی تصاویر کا انداز ایک سا ہے اور آپس میں ملتی جلتی ہیں۔

دیگا (۱۹۱۷-۱۸۳۴ء) کی ٹیکنیک اور اس کا طریق:

اگرچہ تاثریت پسندوں سے کوئی علاقہ نہ رکھتا تھا لیکن پھر بھی اسے عام طور پر اسی گروہ میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ وہ تاثریت پسند مصوروں کے گروہ سے دوستی کے رشتہ میں منسلک تھا۔ اور انکی

تصاویر کی نمائشوں میں بڑے خلوص اور ہمدردی سے حصہ لیا کرتا تھا۔ دیگا کی تصویریں حرکت کے اظہار کے لئے مشہور ہیں۔ اور چونکہ وہ حقیقت پسند تھا اِس لئے اپنی اِس دلچسپی کی وجہ سے بھی وہ اِس گروہ سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اُس نے بھی مسلّمہ اُصولوں اور قدیم روایات سے انحراف کیا ہے لیکن اِس انحراف کے پس پردہ اُس میں کچھ ایسی خصوصیات بھی ہیں جو کلاسیکی نوعیت کی ہیں مثلاً تصویر کی متوازن ترتیب اور اُس کے ترکیبی خطوط کا آہنگ دار بہاؤ اُس کی مصوری کی ایسی خصوصیات ہیں جس میں سوائے اِنگرے کے اُور کوئی حریف نہیں۔

وِہسلر (۱۹۰۳-۱۸۳۴ء) ایک امریکی مصور تھا جو تأثریت کی تحریک کے آغاز ہی سے اُس سے وابستہ رہا تھا۔ اُس کی تصاویر میں عموماً کہریلی فضا کی چمک دمک یا پانی پر چاندنی کے اثرات دکھائے جاتے ہیں۔ ابتدا میں اُس کی تصاویر پر نقادوں نے مخالفانہ تنقیدوں کی بہت بوچھاڑ کی لیکن جب بعد میں کچھ نقادوں نے اُس کی ٹیکنیک پر ہمدردانہ غور کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اُس نے تأثریت کی ٹیکنیک میں کتنا بڑا اضافہ کیا ہے۔ آج کل کی مصوری پر وِہسلر کا بہت گہرا اثر ہے۔ وِہسلر اپنی تصویروں کے رنگوں کی باہمی ترکیب میں بڑی نزاکت سے کام لیتا تھا۔

تأثریت کی تحریک میں دو اُور بھی اہم نام ہیں۔ اُن میں سے ایک تو فرانسیسی مصور ژارژ سورا (۱۸۵۹-۹۱ء) ہے، اور دوسرا پوسی نیار (۱۸۶۳ء)۔ اِن مصوروں نے تأثریت میں "تقسیمیت" اور "تنقیط" کے متعلق تجربے اُور اختراعیں کیں اُور اُن میں اِس حد تک فنی غلو پیدا کر دیا کہ تأثریت کی ٹیکنیک نے ایک میکانکی پہلو اختیار کر لیا۔ اِن لوگوں نے موسنے کے طریق تقسیمیت کو سائنٹیفک بنا دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ لوگ تصویر کے ترکیبی اجزا کو رنگوں کے گول گول نقطوں سے بناتے ہیں جو جسامت میں ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں، اور جن کے درمیانی فاصلے بھی برابر برابر ہی ہوتے ہیں۔ اِن نقطوں کا درمیانی فاصلہ بالکل سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ نظری طور پر اُن نقطوں کا مقصد طیف کے رنگوں کی اصل شدت کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اِس طرح جو تصاویر بنائی گئی ہیں وہ سخت "میکانکی" ہوتی ہیں۔ سورا نے بعد میں اِس طریق کار کو ترک کر دیا اور تنقیط کا ایک کم کڑا اُصول اختیار کر لیا۔ چنانچہ اب اِسی لئے سورا کو تأثریت اور مصوری کے موجودہ رجحانات مثلاً مابعد تأثریت کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

تأثریت پسند مصوروں کے متقدمین نے تأثریت کی بنیادوں کو اِس قدر مضبوط کر دیا تھا کہ ردِ عمل کی کوئی رَو اُنہیں متزلزل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی حالانکہ بیسوی صدی کے آغاز ہی سے اِس تحریک کے خلاف ایک قسم کا ردِ عمل شروع ہو گیا تھا۔ اِس کے برعکس تأثریت کی تحریک فنِ مصوری میں اتنی ہمہ گیر ثابت ہوئی ہے کہ کوئی نئی تحریک خواہ وہ مابعد تأثریت جیسی مخالفانہ تحریک ہی کیوں نہ ہو اِس کے اثرات سے قطعی طور پر غیر متأثر رہنے کا دعوےٰ نہیں کر سکتی۔

اصطلاحات جو اِس مضمون میں استعمال کی گئیں :- (۱) شبیہ کار Portrait painter (۲) ارضانہ Landscape (۳) ارضانہ کار Landscape Painter (۴) متوازن ترتیب Balanced arrangement (۵) آہنگ دار بہاؤ Rhythmic flow (۶) ترکیبی خطوط Compositional lines (۷) رنگوں کا زیر و بم Tones of colours (۸) نیم کُرّوی Hemispherical (۹) اسطوانہ Cylinder (۱۰) اُبھار Bow.

پروفیسر آغا صادق

ترانۂ اُردو

یہ دلچسپ نظم ہمیں حضرت شیخ عبدالقادر مدظلہ مدیرِ اعزازی کے توسط سے وصول ہوئی ہے۔ اقبالؒ کا مشہور ترانۂ اُردو کے اِس ترانے کا پس منظر ہے۔ اِس سے نظم کی دلچسپی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ترانۂ اُردو میں ہند و پاکستان کے تمام بہی خواہانِ اُردو کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ مدیر

ہر اِک زباں سے پیاری اُردو زباں ہماری
رُوح و رواں ہم اس کے یہ جانِ جاں ہماری

لب پر کوئی زباں ہو رہتی ہے جاں اِسی میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی جاں ہو جہاں ہماری

شاعر وہ غالبؔ ایسا، اقبالِؔ نکتہ آرا
بزمِ سُخن ہے اِن سے مُعجز بیاں ہماری

دامن میں پل رہے ہیں اسکے ہزاروں مضموں
محفل ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہماری

اُردو نہیں سکھاتی آپس میں بیر رکھنا
ہوگی زبان سب کی اِک دن زباں ہماری

اسے قدردانِ اُردو وہ دن ہیں یاد تجھ کو
دلّی کی سلطنت تھی جب قدرداں ہماری

صدیوں کے سائے میں یہ پل کر جواں ہوئی ہے
قومی نشاں ہمارا، قومی زباں ہماری

پُرکیف خلوتوں میں ہوتی ہیں اِس سے باتیں
بنتی ہے محفلوں میں یہ ترجماں ہماری

تہذیب اپنی اِس میں، تاریخ اپنی اِس میں
اُردو کی داستاں بھی ہے داستاں ہماری

کہتے نہیں کسی سے صادقؔ ہم اپنے دل کی
ہم اِس کے رازداں ہیں یہ رازداں ہماری

ڈاکٹر محمد باقر

سر ڈینیسن راس

(میرے اُستاد)

"میرے اُستاد" ایک سلسلۂ مضامین ہے جو جنوری سے شروع ہوا تھا مگر اس کی یہ دوسری قسط دو مہینے کی تاخیر سے آئی ہے۔ ڈاکٹر باقر نے ابتدا اتفاق سے اپنے مغربی نژاد اساتذہ سے کی ہے جن کا اپنے اپنے فن میں انہماک اور اس کے ساتھ ہی محبتِ قوم کا جذبہ بیدار پاکستان کی نئی پود کے لئے قابلِ تقلید ہونا چاہئے۔ البتہ جہاں تک استعمار پرستی کی بداخلاقی کا تعلق ہے خدا اس سے اپنی قوم کو بھی بچائے اور دیگر اقوام کو بھی

سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز نام کو تو لندن کی ایک درسگاہ ہے لیکن کام اور وقار کے لحاظ سے لندن یونیورسٹی کا یہ کالج بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اس درسگاہ کا سرپرست ہمیشہ انگلستان کا بادشاہ ہوتا ہے اور اسکی منتظمہ کمیٹی میں انگلستان کے وہ تمام مدبرین اور رؤسا شامل ہیں جن کو مشرقی سیاسیات سے دلچسپی ہے۔ اس درسگاہ کے اساتذہ میں مشرق کے ہر ملک کے لوگ موجود ہیں لیکن مشرقی زبانوں اور مشرقی تاریخ کے ہر محکمے کا نگران انگریز ہی ہے۔ اس درس گاہ کی اہمیت اور فرنگی کے محکمۂ خارجہ کی پالیسی کا آپس میں گہرا تعلق ہے، اور وہ اس طرح کہ اس درس گاہ کے مختلف محکموں کے صدور برطانوی حکومت کے لئے مشرقی ممالک کی سیاسی الجھنوں کے متعلق تجربہ کار مشیر کا کام دیتے ہیں۔ انہی مشیروں میں سے ایک میرے معزز اُستاد سر ڈینیسن راس تھے۔ جو میرے لندن پہنچنے سے ایک سال پہلے اس درسگاہ کے ڈائرکٹر اور لندن یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر تھے۔ میں جب لندن پہنچا تو درس گاہ کی ڈائرکٹری سے تو فارغ ہو چکے تھے لیکن ابھی لندن یونیورسٹی میں بدستور فارسی اور اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ میں ڈاکٹر بیلی سے ملنے کے بعد اُن کے مشورے کے مطابق سر ڈینیسن راس سے ملنے گیا۔ کیونکہ میرے مقالے کے فارسی حصے کی نگرانی اُن کے سپرد ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بیلی نے ٹیلیفون پر میرے آنے کی اطلاع اُن کو دے دی تھی اور ڈاکٹر بیلی سے ایک گھنٹہ پنجابی گفتگو کرنے کے بعد میں ڈرتا ڈرتا اور گھبرایا ہوا اُن کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھبراہٹ یہ تھی کہ ڈاکٹر بیلی سے تو پنجابی میں گفتگو کسی نہ کسی شکل میں نبھ گئی تھی۔ اِن سے فارسی کون بولے گا۔ بہرصورت جب میں نے دستک دی تو آواز آئی: "COME IN"۔ میں سمجھا کام بن گیا۔ لندن یونیورسٹی میں ہر پروفیسر مشرقی زبان تھوڑا ہی بولتا ہے۔ لیکن کمرے میں داخل ہوا تو "گڈ مارننگ" کے جواب میں جب ایک اجنبی انداز میں (بعد میں معلوم ہوا یہ خالص ایرانی لہجہ تھا) "بفرمائید" سُنا، تو حواس نے ایک دفعہ پھر جواب دے دیا۔ چند لمحوں کے لئے پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کردہ فارسی کی سندات آنکھوں کے سامنے اُبھریں، گھومیں اور پھر بے معنی سے کاغذ بن کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل، ایم۔ اے اور ایم۔ او۔ ایل کرنے کے بعد بھی آدمی ایران کے اُس "بفرمائید" کا مطلب نہیں سمجھتا جو وہ ایک خاص

پُرتپاک انداز اور عقیدت سے بھرے ہوتے لہجے میں اپنے ملاقات کرنے والے سے اِس لئے کہتا ہے کہ مہمان یا آنے والا کمرے میں بہترین نشست پر قابض ہوکر میزبان کی عزت افزائی کرے۔ "بفرمائید" میں "تشریف رکھئے" "مجھے نوازیئے" "قدم رنجہ فرمائیے" اور "آپ کی تشریف آوری کا شکریہ" سبھی مفہوم اور جذبات ایرانی نے بہ یک جا جمع کر دیئے ہیں۔

میں کھڑا ہوا بے معنی انداز میں اُس متبسّم آدمی کو تک رہا تھا جو میرے سامنے کرسی میں پھنسا پھنسا بیٹھا تھا۔ چندیا چمکدار ہی تھی۔ یہودیوں کی سی لمبی ناک کے سوا چہرے کے باقی خد و خال منگولوں کی طرح تھے۔ سفید و سرخ رنگ، چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اُبھرے ہوئے رخسارے جن پر گوشت بہت عرصہ رہنے کے بعد اُکتا کر نیچے لٹک آیا تھا۔ ٹھوڑی اور گردن کے فاصلے کو کم کر رہا تھا۔ گردن سے نیچے سارا جسم ایسے جیسے سوٹ نے لپیٹ باندھ کر رکھا ہو ورنہ ابھی کھل کر اور بکھر کر کرسی سے نیچے جا پڑیگا۔ صورت میں چھوٹے بچوں کی سی معصومیت اور آنکھوں میں غیر معمولی ذکاوت کی چمک۔ یہ تھے سر ڈینیسن راس۔ لندن یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر۔ میری سراسیمگی سے محظوظ ہوتے ہوئے آپ نے ایک دفعہ پھر فرمایا "بفرمائید" اور ساتھ ہی ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے اپنے آپ کو اِس کرسی پر معاً گرا دیا۔ وہ کچھ عرصہ فارسی میں گفتگو کرتے رہے۔ اور میں ہمہ تن گوش ہوکر سننے کے باوجود بہت کچھ سمجھ نہ پایا۔ اندازِ تکلم، لہجہ، تلفظ اور الفاظ سبھی کچھ نامانوس معلوم ہوتے تھے۔ میں نے یہ فارسی کبھی پڑھی ہی نہ تھی۔ خود میرے نام کو وہ "باغر" کہہ رہے تھے "ہال ہندی" سے مراد وہ "ساختۂ ہند" لے رہے تھے۔ "چہ طور کنند" کو "چہ جُور کنند" کہہ رہے تھے۔ میری ہندی فارسی اُن کا کہاں تک ساتھ دیتی۔ بالآخر میں نے انگریزی میں معذرت بھی کی اور بہت سی باتوں کی وضاحت بھی چاہی لیکن سر ڈینیسن کسی طرح بھی فارسی کے سوا اور کوئی زبان بولنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد مجھے بھی اُنہوں نے اپنے راستے پر لگا لیا۔

پہلی نشست میں مجوزہ مقالہ کے عنوان اور مضمون پر کافی طویل بحث ہوئی۔ اور جب یہ فیصلہ ہوا کہ چونکہ مقالہ اُردو اور فارسی کے مضمون سے متعلق ہے اِس لئے ڈگری INDO-IRANIAN (اُردو۔فارسی) میں ملنی چاہئے۔ تو آپ نے فوراً رجسٹرار کو فون کیا کہ اگرچہ لندن یونیورسٹی نے پہلے کسی طالب علم کو کبھی پی ایچ۔ ڈی کی ایسی ڈگری نہیں دی لیکن اب حالات کا تقاضا ہے کہ ایسی ڈگری طالب علم کے کامیاب ہونے کی صورت میں دے دی جائے۔ رجسٹرار کچھ زیادہ مطمئن نہ ہوا اور اُس نے معاملہ تعلیمی کونسل کے سامنے پیش کرنے پر اصرار کیا۔ فارسی کی تعلیمی کونسل کے صدر بھی آپ ہی تھے اِس لئے آپ نے اِس تجویز کو مان لیا۔ جب یہ معاملہ غور کے لئے پیش ہوا تو آپ نے نہایت شفقت سے میرے نقطۂ نظر کو کونسل کے سامنے پیش کیا اور کونسل نے کم از کم ایک مرتبہ اُردو فارسی کی ڈگری دینے کی سفارش یونیورسٹی سے کر دی جو مان لی گئی۔

مقالہ شروع ہوا تو یہ طے پایا کہ ہر دو ہفتوں کے بعد میں نئے باب کے ماخذوں کی فہرست آپ کے سامنے پیش کیا کروں۔ یہ فہرست دیکھ کر آپ آیندہ باب کے نفسِ مضمون پر بحث فرماتے اور بالآخر یہ طے ہو جاتا کہ یہ باب اِس اسلوب سے لکھا جائے۔ ڈاکٹر بیلی کی طرح ہر باب مکمل ہونے پر آپ نہ سنتے بلکہ یہ وعدہ کیا کہ تمام مقالہ مکمل ہونے پر ایک دفعہ دیکھ لوں گا۔ فارسی پڑھنے والے ہندوستانی طالب علم دو تین تھے جن میں سب سے ممتاز حیدرآباد دکن کے ایک معزز خاندان کی لڑکی مس۔ زینب تھیں۔ معلوم نہیں وہ اب کہاں

ہیں لیکن سرڈینیسن راس اِس خیال سے علم ماذکر ہے۔ فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ہم سب میں سے اِن کی فارسی اُن کو بہت پسند ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ مس نمازی نسبی طور پر ایرانی تھیں۔ سرڈینیسن کی طبیعت میں مزاح اور لطیفہ گوئی کو بہت دخل تھا بلکہ اُن سے گفتگو کرنے والا یہ محسوس کرتا کہ اِس آدمی کو متین امور سے کم تعلق ہے۔ مَیں نے ایک دن کہا: "آپ مس نمازی کی بہت تعریف کرتے ہیں، لیکن آپ کے طالب علم ایرانی بھی تو ہیں جو اِن سے یقیناً فارسی بہت اچھی بولتے ہوں گے"۔ کہنے لگے: "از این امام زادہ چراغی روشن نمی شود"۔ میں خاموش ہو گیا۔ اُن دنوں جرمنوں کے اکسانے پر ایران میں ایرانی انگریزوں سے نہایت بدسلوکی سے پیش آ رہے تھے۔ انگریزوں کو ایران میں ہر طرح سے ذلیل کیا جا رہا تھا لیکن انگریز یہ سب کچھ اِس لیے برداشت کر رہے تھے کہ اُفقِ یورپ پر ایک ایسا فساد پھیلتا ہوا نظر آ رہا تھا جس کے دامنے جرمنوں کی ایران میں ریشہ دوانیاں کوئی حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ سرڈینیسن راس مشرقِ وسطیٰ کے لیے برطانوی حکومت کو کانوں اور آنکھوں کا کام دے رہے تھے۔ اور ایران اور فارسی سے دلی لگاؤ ہونے کے باوجود اُن دنوں آپ کے دل میں ایرانیوں کے خلاف ایک قسم کی کدورت سی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد جب وہ ایک دن بادشاہ سے مسئلہ فلسطین کے متعلق گفتگو کرنے کے بعد مجھ سے ملے تو اُنہوں نے قضیۂ فلسطین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:۔ "فلسطین میں تو انگریزوں کو اب اقتدار ختم کرنا ہی ہو گا لیکن مجھے یہ خدشہ ہے کہ ایران میں بھی ہماری ساکھ بگڑ رہی ہے۔ میں نے کہا "فلسطین پر انگریزوں کا قبضہ تو کبھی ایک امانت کی حیثیت رکھتا ہے اگر فلسطینی اپنی امانت واپس لینا چاہیں، تو آپ کو اصولی طور پر تو اِس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ ایران سے سیاسی تعلقات بگڑنے کی صورت میں انگریزی سرمایہ کو اینگلو ایرانین آئل کمپنی چھن جانے سے بہت نقصان ہو گا"۔ سر ڈینیسن راس ایک لحظہ خاموش رہے۔ ایک لمحہ کے لیے اُن کے چہرے پر بے بسی کے آثار ہویدا ہوئے اور پھر یکا یک اُن کی آنکھوں کی چمک واپس آ گئی۔ اُن کے اُبھرے ہوئے رخساروں میں خون جلدی جلدی گردش کرنے لگا اور میز پر ہاتھ مار کر کہنے لگے: "ایں جنگ جنگی است کہ باید یک طرف بکلی از میان برود"۔ اور چند سال بعد جب میں نے سنا کہ رضا شاہ تخت چھوڑ کر بر ازیل جا رہے ہیں تو مجھے سرڈینیسن راس کے الفاظ پھر یاد آ گئے۔

سرڈینیسن کا علمی اور تحقیقی ذوق نہایت پختہ تھا اور برٹش میوزیم کے علاوہ لندن میں قلمی مسودات کی تجارت کرنے والے کتاب فروش اکثر آپ کے مشوروں سے مستفید ہوا کرتے تھے۔ اِن کتاب فروشوں سے میری بھی راہ و رسم تھی۔ اِن میں سے سب سے مشہور اور ممتاز لوزک اینڈ کمپنی ہے۔ ان کی دکان برٹش میوزیم کے عین سامنے ہے۔ لوزک کی دکان باہر سے تو ایک بساطی کی دکان سے زیادہ بڑی نظر نہیں آتی۔ اور یہ ہے بھی حقیقت کہ اُن کی دکان کے سامنے سے نظر آنے والے حصے میں مشکل سے دو چار سو کتابیں پڑی ہوں گی۔ لیکن عربی اور فارسی کے طالب علم یہ جانتے ہیں کہ مشرقی زبانوں کی کتابوں کی تجارت کے سلسلے میں لوزک کی دکان بین الاقوامی منڈی کا کام دیتی ہے۔ اِن زبانوں کی کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کتاب ایسی نہیں جو لوزک مہیا نہ کر سکتا ہو۔ یا اُس کا سراغ نہ دے سکتا ہو لیکن لوزک کا کام صرف مطبوعہ کتابیں ہی مہیا کرنا نہیں بلکہ اُس کی زیادہ منفعت بخش تجارت وہ قلمی مسودات ہیں جو دفینہ کی شکل میں اپنی دکان کے

نچلے حصے میں رکھتا ہے۔ جان پہچان ہونے کے بعد لوزک کا مالک مجھے اکثر اس حصے میں لے جاتا تھا اور میں عربی اور فارسی کے نوادر میں گھرا ہوا اُس سے چائے پیا کرتا تھا۔ چائے کے دور کے ساتھ ساتھ وہ مجھے نایاب اور کمیاب نسخے فارسی اور عربی کی کتابوں کے بڑے فخر سے دکھایا کرتا تھا۔ اِن کتابوں میں سب سے بیش قیمت وہ نسخے تھے جو اپنے عہد کی تصویروں سے بھی مزین تھے۔ اِن تصویروں کو دکھاتے ہوئے لوزک نہایت دلچسپ انداز میں ایرانی اور مغل مصوروں کے شہ کاروں کے متعلق بحث کرتا اور اُن سنہری، زرد پیلی اور دیگر رنگوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتا جو اِن تصویروں میں استعمال کئے گئے تھے۔ ہندوستان سے جانے سے پہلے میرے ایک اور مرحوم اُستاد حافظ محمود شیرانی نے مجھے اِن چیزوں سے روشناس کرایا تھا، اور وہ ذوقِ نظر پیدا کیا تھا جس کی تربیت لندن جا کر برٹش میوزیم اور لوزک کی دکان پر ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ دلچسپی کاغذ، خطاطی اور مصوری کی نوک پلک دیکھنے اور پرکھنے کے ذوق میں تبدیل ہو گئی۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے اواخر میں ایک امریکی رئیس لوزک کی دکان پر پہنچا جسے بوسیلۂ ذوق کم لیکن بہ افراطِ زر زیادہ فارسی کے مصور مخطوطات جمع کرنے کا جنون تھا۔ تفصیلی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ اِس لئے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اِن مخطوطات کو خرید کر کیا کرتا تھا۔ لیکن ایک دن لوزک نے خاص طور پر ٹیلیفون سے مجھے چائے کی دعوت دی اور جب میں دکان پر پہنچا تو لوزک نے بیٹھتے ہی دیوانِ حافظ کا ایک مطلّا مخطوطہ میرے ہاتھ میں دیا جس کے حاشیے میں عمر خیام کی رباعیات درج تھیں۔ ابتدائی دو صفحات پر سونے کے ورق کچھ اِس طرح چڑھائے گئے تھے کہ نظر پھسل پھسل جاتی تھی۔ میں نے سرسری طور پر یہ نسخہ پہلے بھی دیکھا تھا۔ میں نے کتاب کھولتے ہوئے پوچھا: "فرمائیے آپ کیا چاہتے ہیں؟" کہنے لگا "بھئی ایک معما درپیش ہے، حل کرو تو شکریے کے علاوہ نذر بھی پیش کروں گا۔" میں نے کہا "کہئے؟" بولا "وہ امریکی رئیس دیکھتے ہو نا جو کئی دنوں سے تمہارے سامنے میری دکان پر آ رہا ہے۔ دیگر مخطوطات کے علاوہ اُسے یہ دیوانِ حافظ بھی پسند آیا ہے لیکن تمہارے اُستاد سر ڈینیسن نے اُسے گمراہ کر دیا ہے۔" میں نے پوچھا "کیسے؟" کہنے لگا "سر ڈینیسن اُس سے کہتا ہے کہ حاشیے پر جو رباعیات لکھی ہوئی ہیں وہ سب کی سب مصدقہ طور پر عمر خیام کی نہیں۔ اب امریکی اِس شک سے بدک گیا ہے ورنہ ہمارے بیس پونڈ کھرے تھے۔" میں نے کہا کہ "معاملہ تحقیق طلب ہے اگر آپ مجھے کتاب عاریتہً دیں تو میں ابھی برٹش میوزیم میں کسی مستند نسخے سے مقابلہ کر لیتا ہوں۔" لوزک نے ایما دیا۔ میں مخطوطہ برٹش میوزیم میں لے گیا۔ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ بالکل ویسا ہی ایک قلمی نسخہ دیوانِ حافظ کا برٹش میوزیم میں محفوظ تھا جس کے حاشیے پر رباعیاتِ عمر خیام لکھی ہوئی تھیں۔ اور اِس نسخے کی مسلّمہ تفصیل میں یہ درج تھا کہ تمام رباعیات خیام کی ہیں۔ میں نے چند گھنٹے مقابلہ کرنے میں صرف کئے، پھر اور نسخوں سے بھی مقابلہ کیا۔ اور شام کو جب مجھے یقین ہو گیا کہ لوزک کے نسخے کے حاشیے کی تمام رباعیات خیام کی ہیں، تو میں لوزک کو کتاب واپس دے کر یہ کہہ آیا کہ اگر امریکی پھر آئے تو مجھے بھی بلا لیجئے۔ چنانچہ دو دن کے بعد لوزک نے مجھے پھر اس وقت بلا لیا جب امریکی اُس سے اِس دیوانِ حافظ کے متعلق بحث کر رہا تھا۔ میں اپنے ساتھ راڈول اور فٹز جیرلڈ کے خیام کے وہ مطبوعہ نسخے لے گیا جن میں فارسی کی رباعیات کے پہلو بہ پہلو انگریزی ترجمہ بھی چھپا ہوا ہے۔ میں نے امریکی کو یہ نسخے دکھا کر کہا کہ لوزک کے نسخے میں ایسی کوئی رباعی نہیں جو اِن میں درج نہ ہو

امریکی کہنے لگا" لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ راڈمل اور فٹز جیرلڈ دونوں دھوکا کھاگئے ہوں"۔ میرے پاس اس کا کیا جواب تھا۔ خاموش ہو گیا۔ یکایک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے لوزک کا نسخہ ہاتھ میں لیکر کہا، میرے ساتھ ذرا برٹش میوزیم تک آئیے۔ چنانچہ ہم تینوں برٹش میوزیم کے وسیع میدان کو عبور کرتے ہوئے اور سامنے کی متعدد سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میوزیم کے مشرقی کتاب خانے میں پہنچ گئے۔ میں نے میوزیم کا نسخہ طلب کیا اور لوزک اور میوزیم کا مخطوطہ پہلو بہ پہلو کھول دیا۔ دونوں نسخوں میں ایک ایک سطر اور ایک ایک شعر بجنسہٖ ہُوبہُو لکھا ہوا تھا۔ کتاب خانے کی فہرست ساتھ منگوالی گئی جس میں میوزیم کے نسخے کی تفصیل درج تھی، امریکی نے چند لمحے غور کیا اور پھر بولا" I WILL GO IN FOR IT "۔

ہم واپس لوزک کی دکان پر آئے اور امریکی نے بیس پونڈ کا چیک دے کر دیوانِ حافظ کے ساتھ گھر کی راہ لی۔ میں بھی لوزک سے رخصت ہوکر گھر چلا آیا۔ شام کو کھانے پر بیٹھے تو ماما نے ڈاک لاکر دی۔ ایک لفافہ میں لوزک نے پانچ پونڈ کا چیک شکریہ کے ساتھ مجھے بھیج دیا تھا۔ یہ میری نذر تھا۔ چند دنوں کے بعد سر ڈینیسن سے ملا۔ تو میں نے یہ واقعہ اُن کے سامنے ڈرتے ڈرتے دُہرایا۔ خیال تھا کہ شاید اپنے شاگرد کے ہاتھوں اپنے علم کی تحقیر ہوتے دیکھ کر وہ ناراض ہوں گے، لیکن تحقیق کے سلسلے میں اس واقعہ کا ذکر بھی ضروری تھا۔ جونہی میں نے بات ختم کی وہ مسکراتے ہوئے بولے" اگر میں امریکی کے دل میں شبہہ نہ ڈالتا تو وہ پانچ پونڈ کی کتاب بیس پونڈ میں کبھی نہ خریدتا"۔ میں نے پوچھا" تو آپ نے یہ دانستہ کیا تھا؟" کہنے لگے" دانستہ نہیں۔ وہ کتاب میرے پاس لایا تھا۔ مجھے ایک دو رباعیات کھٹکی تھیں۔ اور میں نے سرسری طور پر کہہ دیا تھا۔ کسی خاص معرکے کا ارادہ نہیں تھا جو تم نے پُورا کر دکھایا"۔ اور پھر اُنہوں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

سر ڈینیسن راس کی خوش ذوقی اور اخلاقِ عالیہ کے واقعات بیان کرنے لگوں تو اس فرصت میں ختم ہی نہ ہوں۔ صرف ایک اور واقعہ عرض کروں گا۔ فلسطین اور یہودیوں کے سب سے بڑے دارالعلوم ہیبریو یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر ڈاکٹر ہیودا ۱۹۳۹ء کے آغاز میں لندن پہنچے۔ آپ نے لندن میں عربی پر مختلف جگہوں پر لیکچر دیئے۔ انڈیا ہاؤس نے بھی آپ سے درخواست کی اور آپ نے قرآنِ مجید کی خطاطی پر ایک لیکچر دینا منظور کیا اور اس لیکچر کے ساتھ ہی ایک نمائش بھی منعقد کی جس میں قرآنِ مجید کی خطاطی کے وہ تمام نمونے جمع تھے جو ابتدائی عہد سے لیکر اب تک محفوظ ہیں۔ یہ تحریریں اُونٹ کی ہڈیوں، ٹھیکریوں اور کاغذ پر محفوظ ہونے کے علاوہ کوفی رسم الخط سے لے کر عہدِ جدید کے خطِ نسخ تک عہد بہ عہد قرآنِ مجید کے رسم الخط کا مکمل ارتقا پیش کرتی تھیں۔ اور تعجب انگیز امر یہ تھا کہ اِس بیش بہا اور لاثانی متاعِ دین و دُنیا کا واحد مالک یہ یہودی تھا، جس کا دعوےٰ یہ تھا کہ قاہرہ کے کتاب خانے (جہاں قرآنِ مجید کا اوّلین ترتیب دیا ہوا مکمل نسخہ بھی موجود ہے) کے بعد قرآنی خطاطی کے سب سے زیادہ نمونے اُس کی ملکیت تھے۔ خیر یہ تو ضمنی طور پر عرض کر رہا تھا قصہ یہ ہوا کہ جب ہم ڈاکٹر ہیودا کا لیکچر سننے انڈیا ہاؤس کی لائبریری میں جمع ہوئے تو میرے برابر کی نشست پر عبد اللہ یوسف علی آکر بیٹھ گئے صدارت سر عبد القادر فرما رہے تھے۔ سر فیروز خاں نون نے فاضل مقرر کا استقبال کیا۔ حاضرین میں دیگر پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ سر ڈینیسن راس بھی موجود تھے۔ میرے ایک دوست نے اُنہی دنوں ایک قلمی حمائل مجھے ہندوستان سے اِس غرض سے بھجوائی تھی کہ لندن میں شاید اُس کا ہدیہ ہندوستان کی بہ نسبت زیادہ

بل سکے۔ یہ حمائل کسی مصری امیر کے لئے لکھی گئی تھی۔ ہندوستان میں کیسے پہنچی اِس کا حال نہ مالک کو معلوم تھا نہ مجھے۔ موقع غنیمت سمجھ کر میں اِس جلسے میں یہ حمائل بھی ساتھ لے گیا تاکہ ڈاکٹر بیہودا کو دکھا دی جائے اور اگر اُسے پسند آئے تو دوست کو اُس کا فائدہ پہنچ سکے۔ ابھی تقریر شروع ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ عبداللہ یوسف علی صاحب نے مجھ سے حمائل دیکھنے کی اجازت چاہی۔ میں نے جواب دیا بخوشی دیکھئے۔ چند ورق اُلٹ کر اُنہوں نے حمائل لوٹا دی۔ میں نے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے؟" کہنے لگے "کاتب نے کافی محنت نہیں کی۔" میں نے پوچھا کیسے؟ آپ نے سُورۃُ النّاس کھول کر ایک سطر پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا: "یہ دیکھئے یہاں "مَلِكِ النّاس" لکھا ہوا ہے۔ "مَالِكِ النّاس" چاہیئے تھا۔ مجھے بچپن سے یہ سُورۃ یاد کرائی گئی تھی۔ اور میرے ذہن میں "مَلِكِ النّاس" ہی محفوظ تھا۔ میں نے عرض کیا، آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ لیکن آپ اپنی اصلاح پر مُصر تھے۔ یہاں تک کہ میں کچھ تو پاسِ ادب سے اور کچھ اُنہیں قرآنِ مجید کا سب سے مقبول ترجمہ کرنے والا سمجھ کر اور شش و پنج میں پڑ کر خاموش ہو گیا۔ میری لیشہ ... پر سرڈینیسن بیٹھے ہوئے تھے۔ چاہا کہ ان سے رجوع کروں لیکن اتنے میں تقریر شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر بیہودا نے بعض مقامات پر اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے اور خطاطی کے نمونے پیش کرنے کے لئے لیکچر کے دوران میں ہمیں کچھ سلائیڈیں بھی دکھائیں۔ اتفاق دیکھئے کہ سُورۃُ النّاس کی سلائیڈ دو تین مرتبہ دکھائی گئی۔ چونکہ ہم اُس خطاطی بالخصوص کوفی رسم الخط سے بالکل نامانوس تھے اِس لئے سلائیڈ پردہ پر دکھا کر ڈاکٹر بیہودا سطر بہ سطر ساری سورۃ پڑھتے۔ اور ہر مرتبہ اُنہوں نے "مَلِكِ النّاس" ہی پڑھا۔ میں نے اشارے سے عبداللہ یوسف علی صاحب کو ہر بار اُس طرف توجہ دلائی لیکن۔

وہ کچھ انجان سے بنے رہے اور لیکچر کے ختم ہوتے ہی اُٹھ کر چلے گئے۔ اِس سے میری بے چینی رفع نہ ہوئی اور میں نے سرڈینیسن سے اِس واقعہ کا ذکر کیا اور قرآنِ مجید کے ترجمہ کا حوالہ دیتے ہوئے دبی زبان میں شکایت بھی کی کہ ایسے آدمی ایسے عظیم الشان کام میں کیوں ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے: "بیک پیراہن از شما بیشتر پارہ کردہ است۔"

۱۹۳۵ء کے آغاز میں حکومتِ برطانیہ یہ سوچ رہی تھی کہ مشرقِ وسطیٰ اور بالخصوص ایران میں نازیوں کی ریشہ دوانیوں کو ختم کرنے کے لئے سرڈینیسن راس کو سفیر بنا کر ایران بھیج دیا جائے۔ اِس وقت آپ لندن یونیورسٹی میں فارسی کی پروفیسری سے فارغ ہو کر سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز میں اسلامی تاریخ اور اسلامی ہندی تاریخ کے لیکچرر مقرر ہو چکے تھے۔ مجھ سے آپ نے اِس کا ذکر کیا۔ میرا مقالہ اُن دنوں ختم ہو چکا تھا اور صرف انٹرویو باقی تھا۔ کہنے لگے "اگر ایران میرے ساتھ چلو تو کیسا رہے؟" میں نے عرض کیا، سوچ کر بتاؤں گا۔ میرے ایران میں کچھ لوگوں سے نجی مراسم تھے۔ میں نے بذریعہ خط و کتابت اُن کی رائے پوچھی۔ سب لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے ایران میں سرڈینیسن کے ساتھ ملازمت کے سلسلے میں نہیں جانا چاہئے۔ ایران میں ایرانی انگریزوں سے برسرِ پیکار تھے۔ اور جو ہندوستانی انگریزوں کے ساتھ کام کرتے تھے انہیں ایران میں انگریزوں کا جاسوس سمجھ کر نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، یہاں تک کہ ایسے ہندوستانیوں کی جان بھی بعض اوقات خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ میں نے اِس مشورہ پر غور کیا تو بڑی حد تک اِس کو قابلِ قبول پایا چنانچہ میں نے چند ہفتوں کے بعد سرڈینیسن سے جا کر کہہ دیا کہ مجھے ایران جانا منظور نہیں۔ آپ نے وجہ پوچھی تو میں نے دوستوں کی رائے

اُن کے سامنے پیش کر دی۔ دو سال کے عرصے میں یہی ایک موقع تھا جب میں نے اُن کو آزردہ ہوتے دیکھا۔ کہنے لگے "سیاست کے شاطر جان کی پروا نہیں کیا کرتے۔" اُس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ آج میرے اُستاد سر ڈینیسن راس گفتگو نہیں کر رہے بلکہ برطانوی شہنشاہیت کا ایک نمایندہ اپنے غلام سے بات کر رہا ہے۔ بات یہیں ختم ہو گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ حکومت نے اُنہیں ایران بھیجنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور ایک سال بعد اُنہیں ٹرکی میں برطانوی سفارت خانے میں محکمہ اطلاعات کا نگران بنا کر بھیجا جہاں ۱۹۴۰ء میں کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا اور وہ استنبول میں دفن ہوئے ؎

آخر گِل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ایڈورڈ ڈینیسن راس ۶ جون ۱۸۷۱ء کو بمقام سٹیپنی پیدا ہوئے آپ کے والد ڈاکٹر اے۔ جے۔ راس اسی جگہ پادری تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ یونیورسٹی کالج، لنڈن میں آئے جہاں آپ نے مشرقی زبانوں سے دلچسپی لینا شروع کی لیکن عربی اور فارسی کے لئے خاص ذوق آپ نے پیرس اور سٹراس برگ میں پیدا کیا۔ آپ اپنے اُستادوں اور محسنوں میں اکثر انگلستان کے ای جے ڈبلیو۔ گب، پیرس کے چارلز شیفر، سینٹ پیٹرز برگ کے برن روزان اور سٹراس برگ کے پروفیسر نولڈکے کے نام گنوایا کرتے تھے۔ آپ نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے موخر الذکر کی نگرانی میں مقالہ لکھا تھا۔ اور اسی زمانے میں وسطی ایشیا کی مشہور عالم تاریخ تاریخِ رشیدی کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا اور پھر اسی تاریخ کے اقتباسات ایشیا کا دل کے نام سے انگریزی میں پیش کئے۔

۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۱ء تک آپ یونیورسٹی کالج لنڈن میں فارسی کے پروفیسر رہے جس کے بعد آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل ہو کر ہندوستان آ پہنچے۔ ۱۹۱۱ء میں وہ اپنے اس عہدہ کے ساتھ ہی حکومتِ ہند کے ریکارڈ کے نگران اور محکمہ تعلیم کے اسسٹنٹ سکرٹری بھی مقرر ہو گئے۔ اس عرصے میں اُنہیں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں کام کرنے کا موقع ملا اور آپ نے عربی اور فارسی کے ذوق کو جلا دینے کے علاوہ سنسکرت، چینی اور تبتی زبانوں کی تحصیل کی۔ بانکی پور میں خدا بخش کے کتب خانے کی فہرست بھی آپ نے اسی دوران میں ترتیب دی۔ ان تمام خدمات کے صلہ میں برطانوی حکومت نے آپ کو ۱۹۱۲ء میں سی۔ آئی۔ ای کا خطاب دیا۔

۱۹۱۴ء میں آپ ہندوستان سے فارغ ہو کر انگلستان واپس چلے گئے اور برٹش میوزیم کے پرنٹ اور ڈرائنگ کے شعبے میں بطور اسسٹنٹ کے ملازم ہو گئے۔ یہاں یہ وسطی ایشیا سے سر آرل سٹین کے لائے ہوئے نوادر کی ترتیب میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں جنگِ عظیم شروع ہو گئی، اور برطانوی محکمہ دفاع نے آپ کو اپنے سنسر اور فوجی اطلاعات کے محکمہ میں بھی لے لیا۔ جہاں آپ کے مشرقی زبانوں کے علم سے خوب فائدہ اُٹھایا گیا اور صلہ کے طور پر ۱۹۱۸ء میں سر کا خطاب عطا کیا گیا۔

۱۹۱۶ء میں جب کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد لنڈن سکول آف اورینٹل سٹڈیز کی بنیاد یونیورسٹی کی منظوری کے ساتھ رکھی گئی تو ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو ڈاکٹر ڈینیسن راس سکول کے پہلے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ یکم نومبر ۱۹۱۶ء کو اپنے عہدے کا چارج لیا اور اکیس سال تک اس عہدے پر فائز رہ کر جولائی ۱۹۳۷ء

میں اِس عہدہ سے سبکدوش ہو گئے۔ لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ آپ نے یونیورسٹی کی پروفیسری اور سکول کی ڈائرکٹری کرنے کے بعد اِس درسگاہ میں ایڈیشنل لکچرر ہونا بھی منظور کر لیا۔

جنوری سنہ ۱۹۴۲ء میں آپ ترکی میں برطانوی سفارت خانے میں شعبۂ اطلاعات کے صدر کی حیثیت سے استنبول چلے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر اُنہتر سال کے قریب تھی۔ وہ کمال اتاترک کے ذاتی دوست تھے اور اُنھیں ترکی میں رہنا بہت مرغوب تھا لیکن یہ خوشی دیر پا ثابت نہ ہوئی۔

سر ایڈورڈ ڈینیسن راس نے سنہ ۱۹۰۴ء میں مسٹر ڈبلیو۔ ڈی۔ رابنسن کی ایک لڑکی ڈورا سے شادی کی تھی۔ لیڈی راس نہایت با اخلاق اور باوقار خاتون تھیں اور ساری عمر اُس نے سر ایڈورڈ کے اہم مشیر کی حیثیت سے اُن کا ساتھ دیا۔ یہ خاتون ترکی بھی اِن کے ساتھ گئیں اور وہیں سنہ ۱۹۴۳ء کے اپریل میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سر ایڈورڈ کے لئے دراصل رفیقۂ حیات کی موت کا صدمہ پیغامِ اجل بن کر آیا۔ ورنہ اپنی صحت کے لحاظ سے وہ ابھی بہت دن جینے کے قابل تھے۔

لنڈن سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز کے وجود کے ساتھ سر ایڈورڈ کا نامِ نامی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اِس سکول کو شروع میں لوگ راس کا سکول کہتے تھے۔ اِس درسگاہ کے دروازوں سے اب تک سات ہزار طالب علم شرقی زبانوں کی سندات لیکر نکل چکے ہیں۔ اِس وقت اِس سکول میں ایک سو اُستاد ہیں۔ اور اس کی آمدنی اِس وقت ساڑھے پانچ لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔ یہ ذکر کرنا غالباً دلچسپی کا موجب ہوگا کہ دنیا میں مشرقی زبانوں کی اِس سب سے بڑی درسگاہ کے قیام کا خواب سر ایڈورڈ نے ہندوستان میں دیکھا تھا لیکن ہندوستانیوں کی نا اہلی کی وجہ سے یہ خواب لندن جا کر شرمندۂ تعبیر ہوا۔ وہ کہا کرتے تھے "جب سر ہارکورٹ بٹلر وائسرائے کی کونسل میں محکمۂ تعلیم کے ممبر تھے تو میں نے کلکتہ میں ایک ایسی درسگاہ قائم کرنے کی تجویز کی تھی جس میں یورپ اور امریکہ کے چھوٹے بڑے مستشرقین آ کر ہندوستانی معلموں کے پہلو بہ پہلو درس و تدریس اور تحقیق کا کام کریں۔ خیال یہ تھا کہ اِس سے نہ صرف مشرقی علوم کی ترویج اور اشاعت ہوگی بلکہ اِس سے مشرق و مغرب میں ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے کے بہت سے مواقع پیدا ہوں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ میری منصوبہ بندی کے دوران میں ہندوستان کا دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گیا۔ انگریزوں کو اپنے نئے سیاسی مسائل سے فرصت نہ تھی اور ہندوستانیوں نے میری تجویز پر گرمجوشی کا اظہار نہ کیا اور یہ تجویز اپنی موت آپ مر گئی۔

اُستاد کا ذکر۔ اُس نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دکھایا وہ کسی کی خوشامد، کسی کی سفارش، یا کسی خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا۔ وہ تھا! اور دُنیا کا وسیع اکھاڑا۔ وہ اپنے دستِ بازو کے بھروسے پر اس میدان میں اُترا۔ ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت، دہمت سے کیا جس کام میں ہاتھ ڈالا اُس کی تکمیل میں خون پسینہ ایک کر دیا، کہ بے یاری و مددگاری ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں، جو بہ آسانی ہٹائی نہ جا سکیں جب کبھی جوش میں آتے تو ہمیشہ I am a self-made man کا فقرہ ضرور استعمال کرتے تھے"

(نذیر احمد کی کہانی فرحت اللہ بیگ کی زبانی)

جوش ملسیانی

غزل

پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی اُردو کے قدیم شیداؤں اور "مخزن" کے اوّلین کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ اُنھوں نے جالندھر سے اپنی یہ گراں پایہ غزل "مخزن" کے لئے بھیجی ہے جسے ہم بہت مسرت سے شائع کرتے ہیں۔

برگشتہ دل نہ ہوں گے تمہاری جفا سے ہم
جب تک ہے تن میں جان لڑیں گے قضا سے ہم

طولِ سفر نے دونوں کو حیران کر دیا
ہم سے تو رہ نما ہے خفا، رہ نما سے ہم

اتنی خوشی ہوئی ہے ترے التفات سے
عمرِ گزشتہ مانگ رہے ہیں خدا سے ہم

جز اشک و آہ تجھ میں ہے کیا اے دیارِ عشق
بیزار ہو گئے تری آب و ہوا سے ہم

روشن تو ہو چلی تھی قفس میں بھی زندگی
پھر بجھ کے رہ گئے ہیں چمن کی ہوا سے ہم

ہر جادہ رہ گزر ہے تری، جائیں کس طرف
حیران ہو گئے ہیں ترے نقشِ پا سے ہم

ہوتا نہ جرمِ عشق نہ ہوتے وہ ملتفت
خوش ہو رہے ہیں اپنے کئے کی سزا سے ہم

جینے کی کچھ خوشی ہے نہ مرنے کا غم ہے جوش
رہتے ہیں بے نیازِ بقا و فنا سے ہم

عارف عبدالمتین

غزل

نظمِ آزاد کے ایک ہنگامہ خیز دور کے بعد بہت سے نوجوان شعرا پھر غزل گوئی کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ اسے غزل کے غیر محدود امکانات کو نوجوانوں کا خراجِ عقیدت سمجھنا چاہئے۔

تمہاری دید سے یُوں دل مچل مچل جائے،
مرے فسانے کا عنواں بدل بدل جائے،

وہ آئے اور ہر اِک دل کو گدگدا سے گئے،
نسیم آئے تو چھُو کر کنول کنول جائے،

یہ آرزُو ہے کہ تیری لگن کی تابش سے،
مثالِ شمع مری جاں پگھل پگھل جائے،

ترے خیال سے غافل ہوں تو ڈُوبتا جائے،
ترا خیال جو آئے، سنبھل سنبھل جائے

تری نگاہ اگر دل کو روک روک نہ لے،
یہ قیدِ کون و مکاں سے نکل نکل جائے،

ہمیں تو ضبطِ محبّت قبُول ہے لیکن،
وہ موج سی جو رگوں میں اُچھل اُچھل جائے،

ہمیں بھی یاد ہے اُنکی وہ بے رُخی عارف،
جو ایک پَل میں کئی دل مَسل مَسل جائے،

حسین اعظمی

گزشتہ اجلاس کی کارروائی

اُردو کی ادبی محفلوں کی ابتدا مشاعرے سے ہوئی، جس نے بعد میں "مناظمے" کی صورت بھی اختیار کی۔ دورِ حاضر چونکہ بیشتر نثر کا دور ہے۔ اِس لئے اب "مناثرے" بھی شروع ہو گئے ہیں یعنی اب ایسی مستقل ادبی مجالس قائم ہو گئی ہیں، جن میں نظم کم اور نثر زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ مشاعروں میں سامعین کا شعراء کو اور شعراء کا ایک دوسرے کو بجا و بے جا داد دیتے جانا داخلِ آداب تھا، اور اگر کبھی کبھار کسی طرف سے کوئی مخالفانہ فقرہ چُست ہو جاتا، تو مشاعرہ حضراتِ شعراء کے دنگل کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ ہمارے نوجوان اُدبا کی نئی مجالس میں یہ ایک خوشگوار تبدیلی ہے کہ ان کا مقصد صرف داد وصول کرنا نہیں ہے بلکہ سامعین اور ادیب خود ایک دوسرے پر ہر قسم کی اخلاقی تنقید کر سکتے ہیں جو بخندہ پیشانی برداشت کی جاتی ہے اور کسی دنگل کی صورت پیدا نہیں ہونے پاتی۔ اب تنقید کا مقصد مخالفت نہیں اصلاح ہے اور یہ ہر طرح سے مناسب ہے لیکن شاید بہت کم لوگوں کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی ہو کہ گزشتہ دس پندرہ سال کے عرصے میں جب سے ایسی مجالس قائم ہوئی ہیں ہماری مجلسی تنقید اور نتیجۃً خود ہمارے ادب کے معیار میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی۔ جو حالت پہلے دن تھی وہی اب بھی ہے۔ غالباً اسی احساس کے زیرِ اثر حسین اعظمی صاحب نے یہ طنزیہ مقالہ لکھا ہے جو کچھ تیز تر ہو گیا ہے مگر ہمیں اعظمی صاحب کی نیک نیتی میں شک نہیں۔ وہ بھلے آدمی ہیں۔ صرف اصلاح و ترقی چاہتے ہیں اور عجب نہیں کہ اُن کے طنزیہ اشارات نہ صرف ہمارے نقادوں کو بہتر نقاد اور ہمارے شعراء و اُدبا کو بہتر ادیب و شاعر بننے کی تحریک کر سکیں بلکہ مزید برآں ہماری مجالس کے سکریٹریوں کو بھی بہتر سکریٹری اور ہمارے صدروں کو بھی بہتر صدر بننے پر مائل کر دیں۔

۲۳ دسمبر کو ساڑھے گیارہ بجے دن کے اس انجمن کا ایک ہفتہ وار اجلاس جسے عام لوگ غلطی سے جلسہ کہتے ہیں سدا گنگھر ہال میں منعقد ہوا۔ ٹیگر کندھاروی نے اجلاس کی صدارت کی۔ پہلے سیکرٹری نے اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ حسبِ معمول محشر کبلابی نے بحث کی ابتدا کرتے ہوئے خواجہ حیدر علی آتش کے انداز میں کھڑے ہو کر کہا، یہ رپورٹ غلطیوں سے پُر ہے۔ سرے سے رپورٹنگ کا انداز غلط ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے گزشتہ اجلاس میں کم از کم دس بار تو کھڑے ہو کر اعتراضات کئے تھے اور نہ جانے بیٹھے بیٹھے میں کتنی بار بولا تھا لیکن ساری رپورٹ میں میرا نام صرف ایک جگہ آیا ہے حالانکہ میں نے صرف ایک بات چھ بار کہی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ میں جتنی بار بولا ہوں اور میں نے جو جو اعتراضات کئے ہیں اُن سب کا تذکرہ بالتفصیل ہوتا، لیکن اس کے بجائے سکریٹری صاحب نے میرے تمام اعتراضات جمع کر کے ایک جگہ لکھ دیئے ہیں۔ اب یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ تمام اعتراضات کس کس موقع پر کئے گئے ہیں، میرے بعض اعتراضات بظاہر متضاد ہیں اُن کو اگر اُس ترتیب میں نہیں لکھا گیا جس ترتیب میں وہ وارد کئے گئے تھے تو رپورٹ سُننے والے اس

غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے کہ ایک شخص نے ایک ہی وقت میں متضاد باتیں کہی ہیں۔ رمزی نے کہا، سکریٹری صاحب رپورٹ بیٹھ کر کیوں پڑھتے ہیں، کھڑے ہو کر کیوں نہیں پڑھتے؟ طرزی نے کہا۔ اُس دن اجلاس میں حکیم کو تین بار ہچکی آئی تھی مگر رپورٹ میں اُس کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔

رپورٹ کے بعد دل بھوتسلوی نے اپنا ایک افسانہ "ٹکڑے" پیش کیا جس میں چند ایسے افراد کا ذکر کیا گیا تھا جو بظاہر مہاجر ہیں اور مستقل چوریاں کرتے ہیں۔ محشر کجلاہی نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ اس افسانہ پر "فسٹ انفرمیشن رپورٹ" کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور افسانہ نویس کو انہیں پلیس کے حوالے کرنا چاہیئے۔ بدل اشتراکی نے کہا تقسیم ملک کے بعد سے اس قسم کے واقعات میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ مہاجر بھوک سے مر رہے ہیں، چوریاں نہ کریں تو اور کیا کریں۔ نہ اُن کے کھانے کو پیٹ بھر روٹی اور نہ پہننے کو تن بھر کپڑا میسر ہے۔ ہمارے ارباب حل و عقد نکمے ہیں اور ہم اُن کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے!

عقیل سلیمی نے کہا تعجب ہے افسانہ نگار صاحب یہاں کھڑے افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ اُن کا تو فرض تھا کہ وہ اِن چوروں کو اِس کام سے باز رکھتے۔ اُن کو سمجھاتے بجھاتے۔ اُن سے کہتے بھائی یہ کیا کر رہے ہو، کہیں کوئی ایسا بھی کرتا ہے۔ چوری بُری چیز ہے۔ ہاں۔ اِس سے باز آؤ۔ اِس اثنا میں عقیل سلیمی کو زبردست کھانسی اُٹھی اور وہ تقریباً ساڑھے سینتیس سیکنڈ تک خاموش رہے۔ منظر نجمی نے کہا، برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں بھی تو چوریاں ہوتی ہیں، حالانکہ وہاں بھوک نہیں۔ بدل اشتراکی نے منظر نجمی کو جواب دیتے ہوئے کہا، اخلاقیات کا انحصار بڑی حد تک معاشیات پر ہے۔ شاید منظر نجمی صاحب آجکل اخبارات کا مطالعہ نہیں کر رہے ہیں ورنہ اُن کو معلوم ہو جاتا کہ اِس وقت امریکہ اور برطانیہ میں کتنا افلاس ہے۔ وہاں لوگ گیہوں کے آٹے کو ترستے ہیں، لوگوں کو ادنیٰ کپاس کی کپڑا بھی میسر نہیں آتا۔ ہندوستان کی ملوں کا بنا ہوا کپڑا بہت بڑی مقدار میں بھیجا جا رہا ہے پاکستان سے شکر اور روس سے گیہوں کے بورے کے بورے امریکہ اور برطانیہ بھیجے جا رہے ہیں۔ فرانس میں تو اِن دنوں بڑے پیمانے پر ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ روس میں ایسا نہیں ہوتا۔ روس نے اپنے اقتصادی مسائل کا حل تلاش کر لیا ہے۔

محشر کجلاہی نے کہا۔ افسانہ نگار نے اِن چوروں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں پیدا کی۔ کشفی مراغی نے کہا اقتصادی بدحالی کا اِن چوریوں سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض لوگ فطرتاً چور ہوتے ہیں اِس لئے چوریاں کرتے ہیں۔ منظر نجمی نے کہا گزشتہ اجلاس میں یہ بات طے ہو گئی ہے کہ تمام بد اخلاقیوں کی وجہ معاشی بے انصافی ہے۔ کچھ لوگوں نے اِس افسانہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ملکہ وصیہ اور فریدہ کی طلاقوں کا بھی ذکر کیا۔ احمد ظہیر نے کہا۔ ابھی تک افسانہ کے پلاٹ ٹیکنیک اور دوسری فنی خوبیوں اور کمزوریوں پر بحث نہیں ہوئی۔ لہٰذا انہوں پر بھی کچھ کہنا چاہیئے۔ جناب صدر نے جواب دیا، اِس افسانہ پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ لہٰذا مزید بحث کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

افسانہ پر بحث ختم ہونے کے بعد محشر کجلاہی نے اپنی نظم "راہ گیر" پیش کی۔ نظم بالکل مبہم تھی۔ جناب صدر نے حاضرین جلسہ سے بحث کرنے کو کہا۔ احمد نے کہا، نظم میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پہلے کوئی صاحب اِس کی تشریح کریں۔ بعض لوگوں نے کہا نظم تو بالکل صاف ہے، اِس میں سمجھنے کی کیا بات

ہے۔ احمد پھر گہرے سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس نے صدر سے کہا نظم اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کرئی مجھے سمجھا دے۔ جناب صدر نے ذہین سلیمانی سے کہا۔ آپ اس نظم کا مفہوم واضح کیجئے۔ ذہین سلیمانی نے کھڑے ہو کر کہا نظم تو بالکل صاف ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ نظم کیوں نہیں آتی۔ شاعر کا مطلب یہ ہے۔ لیکن نظم تو اتنی واضح ہے کہ اس کی تشریح نہیں ہو سکتی اور پھر ذہین سلیمانی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ جناب صدر نے کہا۔ تشریح کے بعد تو غالباً یہ نظم تمام لوگوں کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ احمد نے کہا۔ میں اب بھی نظم کا مفہوم نہیں سمجھا۔ محقق نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ اس نظم پر آئندہ ہفتے بحث کی جائے غالباً اتنے عرصے میں، لوگ نظم کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ جبل المتین شاہد نے کہا۔ اگرچہ میں بھی یہ نظم نہیں سمجھا، تاہم ایک روز محشر کجکلاہی نے لارنس گارڈن میں اس نظم کا مفہوم واضح کیا تھا۔ اُس دن ہم دونوں بنچ پر بیٹھے شعر و سخن کی باتیں کر رہے تھے۔ اسی وقت یہ محشر کجکلاہی نے یہ نظم سُنائی۔ میں بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن میرے پلّے کچھ نہ پڑا۔ محشر نے پوچھا۔ کیوں تم چُپ کیوں ہو گئے۔ میں نے کہا۔ میں نظم کو معنی پہنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن ابھی تک پہنا نہیں سکا۔ پھر محشر کجکلاہی نے خود ہی اس نظم کی توضیح کرتے ہوئے کہا۔ میں ایک دن یہیں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ میرے پاس سے ایک بھینس گزری جس کی گردن میں گھنٹی بندھی تھی جو بار بار بج رہی تھی۔ میرے دماغ میں معاً یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر یہ بھینس نہ ہوتی بلکہ کوئی لڑکی ہوتی اور یہ آواز اُس گھنٹی کے بجائے اُس کی پازیب کے گھنگروؤں کی ہوتی تو میرے دل میں کیا احساسات پیدا ہوتے۔ میں نے انہی احساسات کو نظم کر دیا ہے۔ نظم کے معنی متعین ہو جانے کے بعد اس پر بحث شروع ہوئی۔ منظر نجمی نے کہا۔ یہ پوری نظم غالب کے اس شعر کا بھونڈی تفسیر ہے :-

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

احمد نے پوچھا۔ کیسے ؟ منظر نے کہا۔ بات یہ ہے کہ اس نظم میں بھی ایک مصرع میں سنگ و خشت اور دوسرے میں رونے کا ذکر ہے اور اس میں بھی یہ تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

حکیم نے کہا۔ اس نظم کا ایک مصرع ناموزوں ہے۔ جناب صدر نے ذہین سلیمانی سے کہا۔ آپ اس کا جواب دیجئے۔ ذہین سلیمانی نے کہا۔ میرے کانوں کو یونہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ محشر کجکلاہی نے کہا۔ مصرع کا ناموزوں ہونا کوئی ایسا عیب نہیں اور کوئی شاعر اس عیب سے پاک نہیں۔ خود جناب صدر کی نظم "بیانگِ دل" کا ایک مصرع ناموزوں سا ہے۔

حیدر نقوی نے کہا۔ اس نظم میں سات مصرعے دوسرے شعرا کے نظم ہو گئے ہیں۔ محشر کجکلاہی نے کہا ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ مجھے اس کا علم نہیں۔ پھر بھی بقیہ مصرع تو میرے ہیں۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں یہ سات مصرع خود بھی موزوں کر سکتا ہوں۔ محقق نے کہا۔ ایک مصرع میں داغ دہلوی کے ایک مصرع کا ایک فقرہ "نظم ہو گیا ہے لہٰذا اُسے واوین کے بیچ میں کر دیا جائے تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ نظم پر بحث ہو چکنے کے بعد ماہتاب شمسی نے ذوق کی شاعری پر ایک مقالہ پڑھا۔ محشر کجکلاہی نے بحث کی ابتدا کرتے ہوئے کہا۔ مقالہ میں جا بجا تصوف کا ذکر آیا ہے۔ مقالہ نگار کو چاہیئے تھا کہ وہ اس ضمن میں تصوف کی مختصر تاریخ بھی بیان کر دیتا۔ اس طرح مقالہ کی افادیت میں بھی اضافہ ہو جاتا۔ شیخ عبدالحی نے کہا۔ مقالہ میں کروچے کا بھی بار بار ذکر آیا ہے۔ اس لئے صاحبِ مقالہ

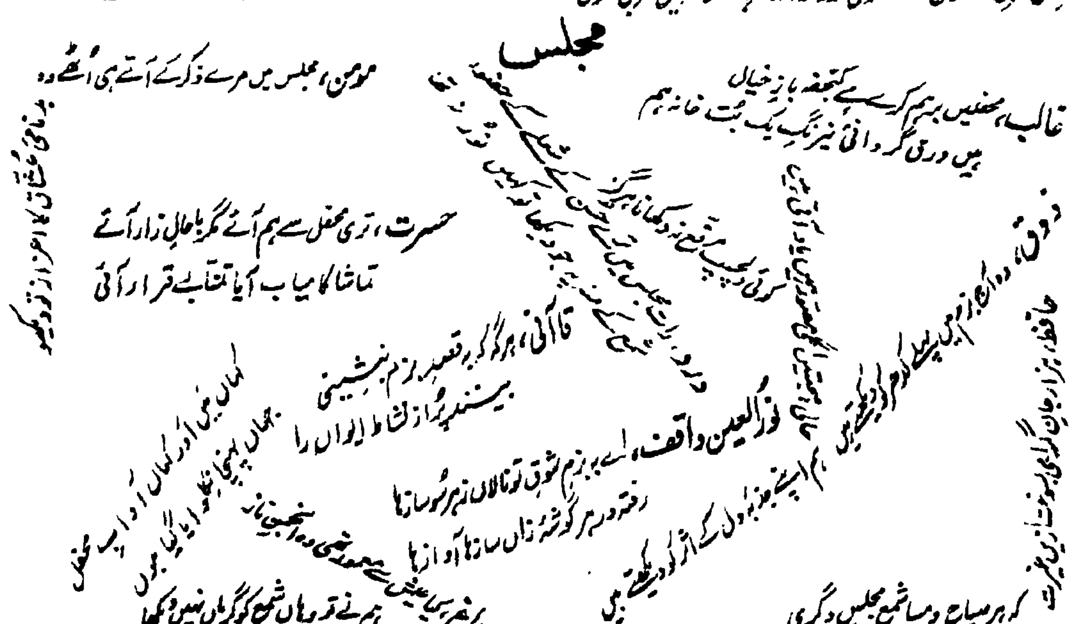
اگر کردیتے کے خاندان پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈال دیتے تو اچھا ہوتا۔ محشر بخاری نے جواب دیتے ہوئے کہا، لیکن مقالہ تو ذوق کی شاعری پر لکھا گیا ہے اور کردیچے کا ذکر تو ضمناً آ گیا ہے۔ اِس لئے اِن جزئیات کی تفصیل لکھنا غیر ضروری ہے۔ منظر نجمی نے کہا۔ مقالہ نگار نے اپنا نقطۂ نظر واضح نہیں کیا۔ بحر یعقوبی نے فراق کی شاعری پر تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کی گزشتہ چالیس سال کی سیاست پر سیر حاصل روشنی ڈالی اور اِس سلسلہ میں اُنہوں نے فراق کی شخصیت کے مختلف پہلو اُجاگر کئے۔ صاحب مقالہ ماہتاب شمسی نے کہا لیکن آپ نے تو ہندوستان کی سیاست اور فراق کی شاعری پر تقریر کر دی۔ میرے مقالہ کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ بحر یعقوبی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ اصل میں آپ کے مقالے سے فراق کی شخصیت میرے ذہن میں آ گئی۔

فیروز آصف صراحی نے کہا۔ مقالہ نگار کا تلفظ قابلِ اصلاح ہے۔ اُس نے ردی کو رَدّی کہا ہے حالانکہ صحیح عربی رَدی ہے۔ اِسی طرح انہوں نے شکوی کو شکوہ کہا ہے حالانکہ صحیح عربی شکوی بر فتح اوّل ہے۔ فارسی الفاظ کا تلفظ بھی غلط کیا ہے تشنہ نہیں صحیح فارسی تَشنہ ہے۔ اِسی طرح شناس نہیں صحیح فارسی شَناس ہے یعنی حرفِ اوّل مفتوح ہے۔

ریختہ دہلوی نے کہا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اردو میں کہاں تک اصل عربی اور فارسی الفاظ کے تلفظ کو برقرار رکھنا ضروری ہے؟

سیّد انشا——

جنابِ صدر نے ٹوک کر کہا سیّد انشا کی بحث غیر متعلق ہے۔ اِس وقت بحث چند الفاظ کے تلفظ کے متعلق ہے۔ آپ کو کچھ کہنا ہو تو تلفظ کے بارے میں کہئے۔ اِس کے بعد جنابِ صدر نے اجلاس برخاست کرتے ہوئے کہا۔ مجھے خوشی ہے کہ اجلاس بہت کامیاب رہا۔ میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اجلاس کے پروگرام میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا، اور بہت فاضلانہ طریقے سے بحث میں حصہ لیا۔ جس سے میں خود بہت مستفید ہوا۔



قیوم نظر

یاد

اپنی خوشبوؤں کی مانند مجھے
موسمِ گُل کی ستم سازہوا
لئے پھرتی ہے جہاں بھی چاہے
شام کے دامنِ رنگیں کا فسُوں
اَن گنت ننھے دیئے کیا جاگے
پابہ زنجیر نظر آیا جُنوں

دشت، آبادی، ہرے کھیت، چمن
نیم رس پودے، چٹکتی کلیاں،
میری آنکھوں میں ہرے کھیت، چمن
خاک اُڑاتا ہوا اِک راہگذر
اُسی دیوار کے پہلو سے ابھی
گھوم کر جاتا ہے ہنگامِ سفر

نرم رَو جھونکے اُٹھے آئے گئے
چھو لیتے پھولوں کے نوخیز بدن
اِنہی ہنگاموں میں گرمائے گئے
جس کے روزن سے ہمیشہ جھلکی
ایک قندیلِ جمیل و خاموش
پرتوِ مہ سے ضیا میں ہلکی

تھم گئی وقت کی گردش جیسے
ہر طرف تیرگی و ویرانی ہے
اِس در و بام پہ میں پھر کیسے

ایک گیت اور ایک غزل

مجید بھٹی

مَیں نے تجھے پایا

آشا، سُکھ سپنے، رَس جھُولے
مَن بھٹکا، یہ نینیاں بھُولے
کیسا بھید چھُپایا
مَیں نے تجھے پایا

سونا، رُوپا، ہیرے، موتی
جھُوٹی مایا، جھُوٹی جوتی
جگ جیون اُلجھایا
مَیں نے تجھے پایا

چھان کے دُودھ، بلو کر پانی
کہنے کو کہتے ہیں گیانی
تیری کایا مایا
مَیں نے تجھے پایا

میری ہیں یا تیری نگاہیں
مَن میں ڈُوب گئی ہیں راہیں
کچھ نہ سمجھ میں آیا
مَیں نے تجھے پایا

کیپٹن ضمیر جعفری

فروغِ موسمِ گُل چہرۂ نگار نہیں
بہار ہے پہ وہ رنگینیٔ بہار نہیں

بہار حُسنِ نظر ہی کا نام تھا شاید
کہ اب بہار بھی میرے لئے بہار نہیں

خیالِ ترک ابھی، اشتیاقِ دید ابھی
خود اپنے ترکِ طلب پر بھی اختیار نہیں

نہ جانے کونسے عالم میں آج کل دل ہے
کوئی تلاش نہیں، کوئی انتظار نہیں

وہ لمحہ دل پہ بڑا ہی گراں گزرتا ہے
جو تیرے غم، تیری یادوں میں سوگوار نہیں

مجھے تو غم کی بدولت عزیز ہے جینا
مٹے جو غم سے اُسے زندگی سے پیار نہیں

یہی فسُردہ نوائی ہے کائناتِ ضمیر
کہ میرے پاس کوئی نغمۂ بہار نہیں

ونگ کمانڈر سیّد فیاض محمود

"یارب وہ نہ سمجھے ہیں......"

(افسانہ)

سید فیاض محمود ایک مدت سے خاموش تھے اور اُنکی بلا ویز افسانہ نگاری کی قدر شناس آنکھیں انکی تحریر کو ترس گئی تھیں۔ راقم کی درخواست پر اُنہوں نے اپنی گوناگوں اہم مصروفیات کے باوجود خوش قسمتی سے پھر لکھنا شروع کیا ہے۔ اُنکے نئے افسانے میں ماحول اور کردار ضرور کچھ بدل گئے ہیں لیکن دل کو جس چیز کی تلاش تھی وہ پھر اِس میں موجود ہے۔ م

کلیم کی سانولی رنگت، مضبوط جبڑا، چمکیلی آنکھیں اور لمبے لمبے بال عام طور پر اس کے ملنے والوں کو یہ اندازہ دلاتے تھے کہ اُس کی طبیعت درشت، اُس کی آواز کرخت اور اُس کا دل سخت ہوگا۔ مگر اس سے ملنے کے بعد لوگ متعجب ہو کر اپنا خیال تبدیل کرنے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔ اُس کا دل نرم، گفتگو شیریں اور طبیعت حسّاس تھی۔ بظاہر وہ ایک سرکاری افسر تھا۔ اُس کے قد و قامت میں قدرت نے خود رعب اور وقار کے عناصر جمع کر دیئے تھے۔ لباس بھی وہ خوش قطع نہیں پہنتا تھا۔ اپنے کام میں اچھا ہونے کی وجہ سے اس میں جو خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی وہ اس کی آواز کے سکون سے جھلک پڑتی تھی۔ دورانِ گفتگو میں اُس نے کبھی اپنی آواز کو اُونچا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ ہر دلیل پر قادر اور ہر نکتے پر حاوی تھا مگر اُس کا سکوت بھی اُس کی شخصیت کو مکمل کر دینے میں اتنی ہی مدد دیتا تھا جتنا کسی شخص کی تقریر یا لسانی۔

اُس کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ بیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہو گئی مگر وہ بیوی پانچ سال کی خوشگوار اور پُر مسرّت زندگی گزارنے کے بعد اپنی پہلی زچگی میں رحلت کر گئی۔ کلیم کو اس سے بہت محبت تھی۔ اس کی موت پر اُسے اتنا صدمہ ہوا کہ گیارہ سال گزر جانے پر بھی وہ شادی کے لئے راضی نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی ماں بہنوں نے بہت سمجھایا مگر وہ ہمیشہ ٹالتا ہی رہا۔ اور اب دو سال سے اِس لیت و لعل کی کچھ اور ہی حیثیت ہو گئی تھی۔ اب وہ شادی کا مخالف نہیں تھا مگر جس لڑکی سے اُسے محبت تھی وہ اُس سے شادی کرنا یا شادی کے لئے درخواست کرنا عقلاً اپنے لئے مفید نہیں سمجھتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اس شادی سے اسے سکون اور راحت نصیب نہیں ہو سکتی۔ مگر اس محبت نے اسے دو دن کے لئے قرار نہیں دیا تھا۔

لڑکی کی عمر بیس سال کی تھی وہ پڑھی لکھی تھی۔ شائستہ، آزاد خیال، اُس کا درمیانہ قد، بھرا ہوا جسم، بھرپور جوانی، بکھرے ہوئے بال، دمکتی ہوئی آنکھیں ہر وقت کلیم کے سامنے موجود رہتیں۔ دفتر میں کاغذات دیکھتے وقت، ماتحتوں کو احکام صادر کرتے ہوئے، کھانے کی میز پر، موٹر چلاتے اُسے قمر جیسی کی آنکھیں، اُس کے اُڑتے ہوئے بال، اُس کے بھرے ہوئے گوٹھے، اُس کے ہونٹوں کی مسلسل حرکت دکھائی دیتی۔ ناول پڑھتے ہوئے صفحوں پر سے اُس کا چہرہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ رقص کرتا ہوا گزر جاتا، لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے

بغیر سُنے وہ اپنے ذہن کے پردوں میں قمرجبیں کے قہقہہ کی بازگشت سُن لیتا۔ اس لڑکی کی ہر حرکت اُس کے لئے جاذب اور اُس کی شرارت اُس کے لئے باعثِ کلفت تھی۔

ملاقات کے وقت وہ چُپ اور قمرجبیں متکلم، تنہائی میں قمرجبیں چُپ اور اُس کے دماغ میں باتوں کا اُبال، خیالات کی یورش، جذبات میں آویزش، طبیعت میں انتشار! بار بار عہد کرتا کہ اب اُن کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ جانا لازمی نہیں، اُس کے والد میرے والد کے دوست تھے، وہ کوئی رشتہ دار نہیں۔ میرا جانا ضروری نہیں۔ مَیں نہ جاؤں تو وہ بُرا نہیں مان سکتے۔ میرا ہم عمر وہاں کوئی نہیں۔ دو تین لڑکیاں جن میں سے کسی کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں۔ اور پچیس سال کی وہ جو بیاہی ہوئی۔ اُن کا بڑا بھائی ملازمت پیشہ، وہ سال میں دو ایک بار سے زیادہ نہ ملتا تھا۔ اُسی سے دوستانہ بھی تھا۔ اِن لڑکیوں سے واسطہ؟ میں اُن سے عمر میں پندرہ سال بڑا۔ میری اُن سے کیا نسبت؟ انھیں مجھ سے کیا دلچسپی؟ اور قمرجبیں تو بالکل اکیس سال کی، وہ ابھی جوان اور کیسی جوان! اور میں ادھیڑ عمر کا کالا کلوٹا بے رنگ انسان۔ اسے التفات ہو تو کیونکر ہو!

اس کا دِل کہتا کہ التفات تو ہے، وہ تمہاری موجودگی میں کھِل جاتی ہے، چہرے پر تازگی، مزاج میں شوخی، آنکھوں میں رونق، ہونٹوں پر تبسم آ جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ آنکھوں میں ہنسی اور ہوا میں قہقہوں کی گونج! ان باتوں کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ تم سے باتیں کرتے وقت چہرے پر تازگی کیوں ہوتی ہے۔ تمہارا استقبال لبوں کی اِک متبسم جنبش سے کیوں ہوتا ہے۔ تم کسی پارٹی میں شریک ہو تو اُس کا شمول اس میں کیوں لازمی ہو جاتا ہے مگر دماغ کہتا کہ اگر یوں ہے تو تم سے مس ہونا تک اُسے کیوں ناپسند نہیں۔ تمہارا اتفاقیہ ہاتھ چھُو جانا کیوں اُسے ناگوار ہوتا ہے۔ اُس دن گول کمرے میں جو ہنسی مذاق ہو رہا تھا اور تم نے ہنسی ہنسی میں جرأت کر کے اُس کی کمر پر ہلکی سی تھپکی دے دی تھی تو غصے سے اُس کا منہ لال کیوں ہو گیا تھا۔ اُس نے یہ کیوں کہا تھا "یہ جرأت؟" دِل کہتا کہ یہ غصہ میں نہیں کہا تھا، وہ شوخی تھی تمہاری بے تکلفی کی رسید، تمہاری محبت کا اقبال تھا۔ دِل و دماغ، خواہش اور عقل کی یہ جنگ کلیم کے لئے ایک مسلسل کیفیت کی صورت میں ذہن کا ایک جزو بن چکی تھی۔ مجھ سے اُسے محبت کیسے ہو سکتی ہے۔ میں رنگ کا کالا، میری شکل سے وحشت ٹپکتی ہے، میری آنکھوں سے ہوس لپک کر اُس کے جسم کے خم اور خطوط سے لپٹ جاتی ہے۔ میری نظر میں اس کے شباب، اُس کی کمر، اُس کی آنکھوں میں گڑی رہتی ہے۔ میں بھوکوں کی طرح اس کے ہونٹوں کی ہلکی سے ہلکی جنبش کا منتظر رہتا ہوں۔ میں اُن کے گھر کی طرف اِس طرح بلا اختیار چل اُٹھتا ہوں، جیسے ایسے بڑے شہر میں میرا ملاقاتی یہی اور کوئی نہیں! مجھ جیسے بھکاری سے اسے کیوں محبت ہو گی۔ یہی کچھ سوچتا رہتا۔

ایک دن جب کلیم اُن کے ہاں پہنچا تو گول کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہ بے تکلف "کوئی ہے؟" کہہ کر داخل ہو گیا۔ بیرا بھی اُدھر دکھائی نہیں دیا۔ اخبار اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ سگرٹ سلگایا۔ دو منٹ کے بعد نظر جو اُٹھی تو سامنے سے قمرجبیں آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہی بکھرے ہوئے بال، وہ چُست اُون کی جرسی جس سے بدن کا ایک ایک خم واضح ہوتا تھا اور وہ ہلکی سی لبوں کے گوشوں میں مسکراہٹ۔ کلیم بوکھلا اُٹھا۔ اور منہ کھول کر "آئیے" کہنے کو تھا کہ زبان بند ہو گئی، منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ قمر نے کہا۔ بیٹھئے "مزاج اچھے ہیں؟" کلیم نے بمشکل کہا "نوازش" اور بیٹھ گیا۔

گفتگو کچھ اِس طرح ہونے لگی۔

"آج امی اور آپا بازار گئی ہیں۔"

"جی"

"کچھ دنوں سے شاپنگ کا بھوت سوار تھا۔ آج نہ رہا گیا۔"

"جی"

"آپ اچھے ہیں؟"

"جی"

"خالہ کیسی ہیں، آپا شمشاد دیر ہوئی نہیں ملنے آئیں۔ اُن سے کہیئے تاکہ کبھی آجایا کریں۔"

"بہت اچھا۔"

"میرا خیال ہے اُن کی دعوت کی جائے پھر تو آئیں گی ہی نا۔ کچھ سہیلیوں کو بُلائیں گے۔ وہ پردہ کرتی ہیں، مردوں کو نہیں بُلائیں گے۔"

"جی"

"اچھا! تو میں آپا سے مشورہ کر لوں، پھر کسی اتوار کو بُلائیں گے۔ ٹھیک ہے!"

کلیم نے جواب نہ دیا۔ دیکھتا تو قمر کی طرف تھا۔ مگر جواب ندارد۔

قمر نے دو ایک باتیں اَور کیں مگر کلیم نے جواب ایسے گھُٹے گھُٹے دیئے کہ قمر یہ کہہ کر اُٹھ گئی آپ کے لئے چائے لاتی ہوں۔ چائے پی رہے تھے کہ قمر کی والدہ اور اُس کی بہنیں آگئیں۔ ایک دو ملنے والے بھی آگئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں کلیم صاحب سے لوگوں نے کبھی اِس بارے میں رائے لی، کبھی اس میں۔ مثلاً کلیم صاحب! کشمیر کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا واقعی اقوامِ متحدہ کی کمیشن کچھ اختیارات رکھتی ہے؟ کلیم نے حسبِ معمول اپنے متین لہجے میں سب باتوں کا جواب دینے کی کوشش تو کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بے اختیار ہو ہو کر قمر کی طرف نگاہ اُٹھ جاتی تھی مگر قمر نے نگاہ جو نیچی کی تو اُس وقت بھی نہ اُٹھائی جب کلیم بے معنی سا بہانہ کر کے وہاں سے چلا گیا۔

اپنے آپ پر بہت جبر کر کے تین دن تک کلیم قمر کے ہاں نہ گیا۔ پھر مجبور ہو کر کشاں کشاں اُدھر ہی چل دیا۔ اُس دن اُن کے ہاں دو تین مہمان آئے ہوئے تھے کلیم کی اُن سے جان پہچان نہ تھی۔ تعارف کرایا بھی گیا مگر کلیم دو ایک رسمی باتیں کرنے کے بعد ایک طرف بیٹھ گیا۔ قمر اپنی بہنوں کے ساتھ مہمانوں کی تواضع میں مشغول تھی۔ مگر کچھ دیر بعد غالباً اُسے کچھ فراغت ہوئی تو وہ کلیم صاحب کے برابر کی کرسی پر آ بیٹھی۔ پوچھا۔

"آپ اچھے ہیں۔"

"جی نوازش! بہت اچھا ہوں"

"آپ دو ایک روز سے تشریف نہیں دئے"

"کچھ کام تھا"

"پہلے تو آپ کام زیادہ ہونے کے باوجود گھڑی گھڑی ہو جایا کرتے تھے۔"

"جی کچھ ایسی ہی وجہ تھی"

"کیا ہم لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے؟"

"نفرت!"

"نظریں نیچی کئے: تو اَور کیا؟"

"مجھے اَور آپ سے نفرت!"

"تو پھر آپ ہم سے کیوں اِس قدر تکلف سے پیش آتے ہیں۔"

"کیا عرض کروں"

"(رُک رُک کر) کہیئے"

"کیا کہوں، کچھ کہا نہیں جاتا"

"(ہنس کر) کچھ ایسی ہی بات ہے کیا؟"

"آپ تو پہلے ہی ہنس دیں، میں کیا کہہ سکوں گا"

"(ہنسی کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) آپ تو بہت ہی مشکل میں پڑ گئے"

"(اور بھی متین لہجے میں) جی کچھ مشکل ہی بات تھی"

"تو بتائیے نا"

"آپ نہیں سمجھ سکتیں"

"(ہنس کر) واہ وہ بھی کیا بات ہوئی۔ ہم کیوں نہیں سمجھ سکتے"

"جی کچھ ایسی ہی بات تھی"

"تھی!"

"جی!"

"اب نہیں؟"

"اب نہیں ہو سکتی"

"تعجب ہے! آپ تو پہیلیوں میں بات کرتے ہیں"

"جی ہاں! بعض باتیں پہیلیوں ہی میں کہی جا سکتی ہیں"

اتنے میں قمر جبیں کی بڑی بہن ثریا جبیں چاء کی پیالی لے کر کلیم بھائی کو دینے آئیں۔ اور قمر وہاں سے اُٹھ گئی۔ ثریا پاس بیٹھ گئی۔ پوچھنے لگی "کلیم بھائی قمر آپ کو تنگ کر رہی تھی؟"

"کچھ نہیں"

"آپ اسے کچھ نہیں کہتے۔ وہ بہت گستاخ ہو گئی ہے"

"نہیں گستاخ تو نہیں۔ شوخ ہے مگر اُس کی شوخی اُسے سجتی ہے"

"ایسی بھی کیا؟"

"یہ نہ کہیئے۔ قمر تو قدرت کا عطیہ ہے۔ اُس کا دل معصوم ہے۔ خدا نے اسے مسرت کا تحفہ عطا کیا ہے۔ خوشی اُس کے رگ و ریشہ میں موجود ہے۔ وہ اُس کی سانس سے خوشبو بن کر نکلتی ہے۔ ہنسی تو اُس کی فطرت ہے، اُس کی ہنسی کا کون بُرا مان سکتا ہے"

ثریا جبیں کلیم صاحب کی باتیں سُن کر متعجب ہوئی۔ مگر کلیم فوراً ہی یہ بات ختم کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

. . . .

رات کے سنّاٹے میں کلیم اپنے بستر پر لیٹا، قمر سے اپنی گفتگو کو ذہن میں دُہرانے لگا۔ اُس کو ایک ایک لفظ یاد تھا۔ قمر نے بیٹھتے ہی پوچھا تھا۔

"آپ اچھے ہیں؟"

کلیم نے جواب دیا تھا۔ "نوازش ہے، آپ کو دیکھ لیا تو اچھا ہی ہو گیا"

"ثریا (ہنس کر) واہ میں بھی کوئی پیٹنٹ دوا ہوں"

"آپ سَو دواؤں کی ایک دوا ہیں"

"وہ کیسے؟"

"میرے لئے تمہاری ایک جُنبشِ لب ہی جلا دینے کے لئے کافی ہے"

"واہ واہ میں اب مسیحا بھی ہو گئی"

"تم تو قدرت کی روح ہو، تم ہی مسیحا ہو، تم تو مجسّم بہار ہو، تمہیں خود معلوم نہیں تم کیا ہو۔"

"میں تو نہیں سمجھی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میرے لئے تم ایک لپکتا ہوا شعلہ ہو، ایک ہنستا ہوا پھول، تم ایک کرنوں کا ہار ہو، ایک تاروں کی مالا، ہوا کی نکہت ہو، زندگی کی دھڑکن، تم جانِ آرزو ہو......"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں......"

"تم نور کا فوّارہ ہو، تم ہنسی کا سراغ ہو، تم روحِ مسرّت ہو، تم جوانی کی تان ہو......"

"میں نہیں سمجھی......"

"ہواؤں کی مستی ہو، ندی کا راگ ہو، برسات کی نیند ہو، صبح کی آواز......"

"میں نہیں سمجھی......"

واقف

بہ کنارِ کسے نمی آئی

تو بہ کارِ کسے نمی آئی

بہ چہ اُمّید می تواں مُردن

بہ مزارِ کسے نمی آئی

محمد خلیل الرحمٰن

فکر و نظر

دورانِ انقلاب میں شیطنت کی قوتیں ایسے ننگِ انسانیت اعمال سے رُوسیاہ ہوئیں کہ لاکھوں حساس دل سوگوار ہوگئے۔ اپنے غم سے مغلوب ہوکر معدودے چند ادبا سے ایسی نظم و نثر بھی سرزد ہوئی جس سے خیال پھیلا کہ یہ لوگ در پردہ آزادیٔ وطن کے دشمن ہیں اور ہمیں بھڑکا کر پاکستان سے برگشتہ دل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سخت غلط فہمی ہے کیونکہ پاکستان کا ہر ادیب دل سے پاکستان کا فدائی ہے۔ جذبات سے مغلوب ہوجانا یا شکست خوردہ ذہنیت رکھنا ذہنی بیماری تو ہے لیکن بیماری اور وطن دشمنی لازم و ملزوم نہیں۔ البتہ یہ ہمیں تسلیم ہے کہ عوام کے سچے ہمدردوں کا فرض انہیں اُنکے غم کی مکرر تصاویر دکھا کر زیادہ غمزدہ کردینے کے بجائے یہ ہونا چاہیئے کہ انکا غم ہلکا کرکے انکا حوصلہ بلند کریں تاکہ وہ عام انسانی ترقی کے جہاد کیلئے تیار ہوسکیں۔ یہ نظم اس لحاظ سے صحت مند ادب کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

یہ کیا زندگی ہے ؟!
ہر اک سمت سے تیرگی ہی اُمڈتی نظر آ رہی ہے
فضاؤں میں انسان کی سسکیوں، آہوں اور آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے
ہواؤں میں انسان کے خُون کی بُو کا سیلِ رواں ہے
کہیں روشنی کی کوئی بھولی بھٹکی کرن تک نہیں ہے
یہ کیا زندگی ہے!

اُدھر فاصلے کے تہاں خانے اُن پاکدامن خواتیں سے بھرپور ہیں جو
درندوں کی محفل میں رقصِ برہنہ کے شعلوں میں لپٹی
فغاں تک کی مہلت سے ناآشنا ہیں!
کہیں خُون ہے قتل و غارت گری ہے
کہیں موت اِک شکوۂ بے زباں بن گئی ہے
کہیں زندگی موت سے بھی کڑی ہے!

یہ کیا زندگی ہے!

یہی مسئلہ دل پہ چھایا ہُوا تھا
شب و روز میں بس یہی سوچتا تھا
کہ یکبارگی دیدۂ دل کھُلا اور دیکھا
گزشتہ زمانوں کی بے رنگ اور دُھندلی فضا میں
ہیں خاموش سے زرد رُو فلسفی، کھوئے کھوئے مفکّر، زخود رفتہ صوفی، خدامست درویش، سنجیدہ راہب،
اور اُن میں سے ہر ایک اپنی زباں میں یہی کہہ رہا ہے
بنی نوعِ انساں ہمیشہ سے یُونہی مصیبت زدہ ہے!
کبھی اِس جہانِ ستم گر کا دامن مظالم کے داغوں سے خالی رہا ہے؟
یہاں راہِ اُمید ہی راہِ نور و ضیا ہے

اُٹھ اور گرمیٔ عزم سے گُل شدہ مشعلِ راہ پھر سے جلا دے
اور اِس ظلم سہتی ہوئی سہمی سہمی سی مخلوق کو راہِ رفعت دکھا دے
اِسے زندگی کے بلاخیز طوفاں کی بے باک موجوں سے لڑنا سکھا دے
اِسے وحشیوں اور درندوں کی دُنیا کو برباد کرنے کے قابل بنا دے

یہی فرضِ انساں ہے جو ہر آدمی ہے
یہی رہبری ہے
یہی زندگی ہے!

خلیل الرحمٰن

حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں پڑھی گئی

شبیر محمد اختر

حقیقت نگاری اور احساسِ حقیقت

(ایک نفسیاتی جائزہ)

ادب میں حقیقت نگاری کا کیا مفہوم ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق نقادوں میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم اِس اختلاف کی روشنی میں ایک نئے زاویۂ نگاہ سے حقیقت نگاری کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ممکن ہے اِس سے یہ نظریہ نئی قدر و قیمت حاصل کر سکے۔

سوال یہ ہے کہ کیا کسی تجربے کا من و عن ڈرامائی انداز میں پیش کر دینا حقیقت نگاری ہے؟ - کیا اِس سے ادب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔؟ ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک وہ خود قاری کے دل میں 'احساسِ حقیقت' پیدا نہ کر سکے، حقیقت نگاری کچھ بھی نہیں ——— اور 'احساسِ حقیقت' کیا ہے؟ تجربے کے بیان اور کسی خاص شخص کے فلسفۂ زندگی کا باہم تعلق ——— اِسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زندگی حقیقت ہے اور ادب احساسِ حقیقت - اِن دونوں کے امتزاج کے بغیر اعلیٰ ادب پیدا نہیں ہو سکتا - ادب کی ادنیٰ شکل میلوڈراما سے لے کر ادب کی اعلیٰ ترین شکل تک میں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے زندگی کو ادب میں یا حقیقت کو احساسِ حقیقت میں منتقل کرنے کی تخلیقی خواہش۔

حقیقت اور احساسِ حقیقت میں کافی فرق ہے جسے ہم فلسفے کی زبان میں یوں کہیں گے کہ حقیقت وجود سے متعلق ہے اور احساسِ حقیقت اقدار سے۔ جب بنظرِ تحقیق اِس فرق کو دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تجربات جو حقیقت نگاری کا خام مواد ہیں، خود بخود اپنے معنی نہیں دیتے، اِس کے لئے ایک ایسے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے جو تجربے (وجود) کو معنی (اقدار) میں منتقل کر سکے۔ اِن دونوں کے درمیان ایک نفسیاتی خلیج حائل ہوتی ہے جو صرف تخلیقی ذہانت کے ذریعے سے عبور کی جا سکتی ہے۔

مثلاً ابتدا میں محض بدی انسان کو ڈرا نہیں سکی تھی۔ اِس کا اثر اُس پر اچھا ہوتا تھا نہ بُرا لیکن اِس کے بعد انسانی تخیل اِس کی حقیقت کے احساس سے بہرہ ور ہوا اور بدی کے خلاف ایسی تحریکات چل نکلیں کہ بدی سے چھٹکارا پانا مذہب کا ایک جزو بن گیا۔ جب تک بدی محض ایک حقیقت تھی اس کا وجود جوں کا توں رہا، لیکن جب یہ احساسِ حقیقت میں منتقل ہوئی تو انسان بدی سے متنفر ہونے لگا۔ ادب کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ زندگی ہو اور زندگی حقیقت ہے، لیکن ہم کہیں گے کہ ادب حقیقت سے بھی زیادہ حقیقی ہے کیونکہ احساسِ حقیقت حقیقت سے بھی زیادہ شدید حقیقت ہے۔

ذہنِ انسانی کے مطالعے میں جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا انسان زندگی، موت، جنگ، بدی یا حماقت سے ڈرتا ہے، تو تحقیق کے بعد یہی کہنا پڑتا ہے کہ نہیں۔ وہ جن چیزوں سے ڈرتا ہے وہ ہیں زندگی کے بارے میں علم۔ موت کی حقیقت کا

احساس، جنگ کی حقیقت (تباہ کاری)، بدی کا انجام اور حماقت کے اثرات۔ یوں کہئے کہ حضرتِ انسان احساسِ حقیقت سے زیادہ کسی چیز سے نہیں ڈرتے۔

حقیقت کو ادب کی رُوح کہا جاتا ہے لیکن احساسِ حقیقت سے عام لوگوں کو نفرت ہوتی ہے۔ اِسی لئے میلوڈراما عام پسند چیز ہے۔ کیونکہ اِس میں حقیقت نگاری کو عام انسانی خواہش کے تابع کر دیا جاتا ہے۔ اِسی ضمن میں جاسوسی کہانیاں، گھٹیا ناول، جنہیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں، جذباتی ڈرامے اور ریڈیو مالا بھی آجاتی ہے۔ اِن کے مطالعے سے آدمی تسکین پاتا ہے۔ ایسے ادب کے لئے ایک نیا نعرہ "ادب برائے تسکینِ قلب" ایجاد کیا جا سکتا ہے۔ ایسا ادب انسان کی حقیقت پسندی کی حِس تک اثر تو کرتا ہے اور احساسِ حقیقت کو خوابیدہ چھوڑ دیتا ہے۔

لیکن اِس کی مدد سے ہم تخلیقی فن کار اور عوام، زندگی اور ادب، حقیقت اور فریبِ نظر، احساسِ حقیقت اور حقیقت پسندی (رومانیت) کو سمجھ سکتے ہیں۔ ادب جو صرف تسکینِ قلب کے لئے ہوتا ہے اُس میں ایک عام آدمی کے روایت پسند جذبات سے مطابقت ہوتی ہے۔ اُس کے فلسفۂ حیات کو (جو صرف اُس کا اپنا ہوتا ہے) ایسے ادب سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ وہ ناگوار احساسات سے بچا رہتا ہے۔

لیکن اعلیٰ تخلیقی ادب میں احساسِ حقیقت کار فرما ہوتا ہے۔ اسے انسان کے روایتی جذبات کا پاس نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسے ادیب جو اپنے ادب کے لئے عوامی ذہن سے تحریک حاصل کرنے کے قائل ہیں ان کا ادب ایک عمدہ فوٹوگرافی حقیقت تو بن سکتا ہے لیکن چونکہ وہ احساسِ حقیقت سے عاری ہوتا ہے اِس لئے اعلیٰ ادب نہیں بن سکتا۔ اعلیٰ فن کار وہی ہو سکتا ہے جو آپ اپنا قانون ہو۔ اس کا اپنا فلسفہ ہو اور اُسے اپنے آپ پر کامل یقین بھی ہو۔

لیکن یہاں ایک بات قابلِ لحاظ ہے۔ ہمارے ہاں یہ فیشن ہو گیا ہے کہ ہم رومانی ادب کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور جب حقیقت پسندی سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو اُسے بُری طرح دُور پھینک دیا جاتا ہے۔ حال آں کہ رومان حقیقت یا حقیقت نگاری ہی کی ایک فطری صورت ہے۔ اِن دونوں میں فرق صرف موضوع کے انتخاب کے نظریے میں ہے۔ ایک ادیب اپنے مزاج کے مطابق حقیقت کا جذباتی پہلو لے کر تصویر کشی کرتا ہے اور دوسرا اپنی اُفتادِ طبع کے پیشِ نظر حقیقت کے تجرباتی پہلو کو لے کر اپنی تصویر بناتا ہے۔ عظیم فن کار ان دونوں پہلوؤں سے کام لیتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو رومان پسندی اور حقیقت پسندی کی تفریق اتنی واضح نہیں جتنی حقیقت نگاری اور احساسِ حقیقت کی ہے۔ کیونکہ اگر حقیقت نگاری اور احساسِ حقیقت کی روشنی میں ادب کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کون ادیب محض فوٹو اتار کر پیش کرتا ہے اور کون حقیقت کو فلسفۂ حیات بخشتا ہے۔ لیکن ایک رومانی شاعر بیک وقت حقیقت پسند بھی ہو سکتا ہے اور رومانی بھی کیونکہ وہ حقیقت ہی کے جذباتی پہلو کو تو پیش کرتا ہے۔

احساسِ حقیقت کی روشنی میں ادب کا جائزہ لینے سے ہمیں ایک تیار راستہ ملتا ہے۔ تحلیلِ نفسی نے اس راستے کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ انسانی ذہن کا مطالعہ کرنے سے تحلیلِ نفسی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ انسان کا ذہن اتنا پُرسکون اور خود بخود کام کرنے والا نہیں، جتنا وہ ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جسے اِن مختلف اثرات کا جو اس کے خیال اور عمل کی تشکیل کرتے ہیں، بہت دھندلا سا شعور ہوتا ہے۔ وہ ذہنی طاقتیں

جو اُسے شعور کی بلندیوں کی طرف لے جانا چاہتی ہیں، وہ اُن کی اندھا دھند مزاحمت کرتا ہے۔

زندگی خود آشکارا نہیں۔ زندگی کی حقیقت اُسی وقت حقیقت بنتی ہے جب تخیل اُسے بارِ دگر تشکیل دے کر اس میں احساس اور نظر کی گہرائی بھر دے۔ یہ کام صرف فن کار اور فلسفی ہی کر سکتے ہیں۔ عوام کا یہ حال ہے کہ وہ زندگی کو تو برداشت کر لیتے ہیں لیکن فلسفے کو نہیں۔ جب کوئی فن کار فلسفہ لے کر عوام کے بتوں کو توڑنا چاہتا ہے تو وہ اُس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ احساسِ حقیقت کی تلخی ہوتی ہے جو اُن سے برداشت نہیں ہو سکتی۔

جوشؔ اور اقبالؔ دو ایسے شاعر ہیں جن میں سے ایک حقیقت کا مصوّر ہے اور دوسرا ترجمانِ احساسِ حقیقت ایک جو کچھ دیکھتا ہے، اُسے الفاظ کا جامہ پہنا کر سامنے رکھ دیتا ہے۔ دوسرا دیکھتا ہے اور اپنے فلسفۂ حیات کے ذریعے اپنے تجربات کو احساس میں منتقل کرتا ہے۔ ایک وجود ہے دوسرا اقدار۔

ادب کو بلند کرنے کا ذریعہ ہمارے نزدیک محض حقیقت پرستی نہیں بلکہ احساسِ حقیقت ہے۔ ادب میں جس قدر حقیقت یا مغالطہ (Delusion) چاہیں بھر دیں۔ اِس سے ادب کبھی اعلیٰ ادب نہیں بنے گا۔ اعلیٰ و ارفع وہی ادب ہے جس سے ہمارے دل میں احساسِ حقیقت پیدا ہو، عوام کے اوہام کا ازالہ ہو۔ اس پر عوام شور تو ضرور مچائیں گے اور ہنگامہ بھی بپا کریں گے۔ شاید ادیب کے لئے دار و رسن تک تجویز کئے جائیں لیکن کمالِ فن اِسی میں ہے۔

ایک عام انسان کے لئے میلو ڈراما حقیقت ہوتی ہے۔ زندگی کا خام مواد بھی میلو ڈراما ایسا ہی ہوتا ہے۔ اِس میں بھی کشمکش اور اُلجھاؤ کے مناظر ہوتے ہیں۔ جب تک فن کار کا ساحرانہ ہاتھ اُنہیں چھوتا نہیں زندگی کے یہ اجزا بکھرے رہتے ہیں احساسِ حقیقت زندگی سے آگہی کا نام ہے جو فن کی حسّاس آنکھ کی مدد سے حاصل ہوتی ہے۔ یوں کہیئے کہ زندگی حقیقت ہے اور فن احساسِ زندگی ——— یہی حقیقی ادب ہے۔

میلو ڈراما کے عناصر

ابتداً اگر رومان اور سنسنی کے علاوہ گانوں کی بھرمار بھی میلو ڈراما کے لوازم میں شامل تھی، لیکن اب مسلسل اور سریع الحرکت عمل، سنسنی دوڑا دینے والے ہنگامہ خیز مواقع، اظہارِ جذبات کا جوشیلا انداز، اور ہیرو اور ویلین کے کردار میں شدید طور پر نمایاں تضاد، میلو ڈراما کے عناصر میں داخل ہے۔ یہ ادب حقیقت سے زیادہ عوام کی "خواہشات" کے تابع ہوتا ہے

ایک گیت اور ایک غزل

مقبول احمد پوری

صبحِ وطن ہے شامِ غریباں محفلِ یاراں دُور ہوئی!
شمع کی بتّی دونوں طرف سے جلنے کو مجبور ہوئی!

مدھوبن کے ادویت پجاری[1] بن مالی[2] کا لیکے دُولار
چلے گئے یا پریم پپیہے اُڑ گئے نیلے[3] نبھ کے پار

حسن بتوں میں ہے مانا پر آنکھوں میں وہ نور نہیں
عشق کی مستی لیکے کروں کیا قدرِ جنوں منظور نہیں

پریت کی جوالا میں جلتے اِس جیون کا اب یہی، اَنت
پریم اسمرتی[4] کی سیما[5] میں ہی سکھ کا رچالے ایک بسنت

[1] وحدانیت پرست
[2] وشنو جی۔ کنھیا جی
[3] آسمان
[4] محبت کی یاد
[5] حد

الطاف پرواز

فریب ہے رسمِ باغبانی نظامِ گلشن تمام دھوکا
روش روش پر قدم قدم پر ہے بوئے گل کا خرام دھوکا

یہ وہ عنادل نہیں جو آنکھوں سے ماتمِ گل میں خوں بہائیں
خزاں میں سازش ہے شغل ان کا بہار میں انکا کام دھوکا

خودی سے آگاہ رند اس میکدے میں کیسے قدم رکھیں گے
ریا ہے ساقی، سراب مے ہے، فریب مینا ہے جام دھوکا

خلوص کی راہ میں چراغوں پہ کیکپی ہو گئی ہے طاری
سحر کے بھولے ہوؤں کو دینے چلے ہیں آثارِ شام دھوکا

گلوں کی آنکھوں میں گرم آنسو لبوں پہ کلیوں کے مسکراہیں
نسیمِ صبحِ بہار کی ہے ہر ایک سعی کلام دھوکا

ہمیں جنوں کے معاملے میں خرد کی بازی تو ہارنا تھی
مگر بساطِ جنوں پہ بھی ہے ہر ایک بازی کا نام دھوکا

ہجومِ نیرنگِ آرزو میں نگاہ کھوئی گئی کچھ ایسی
کہ ہم نے سب جانتے ہوئے بھی دیا ہی خود کو مدام دھوکا

ہمیں گزرنا پڑا ہے اکثر کٹھن مراحل سے زندگی میں
قدم قدم پر ہوا ہے ثابت نگاہ کا ہر مقام دھوکا

انور جلال

ریل میں گفتگو

(دُھوئیں کی گاڑی اُڑائے لئے جائے)

ریل کے فائدوں میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اِس میں آدمی کو اپنے "ساتھیوں" سے ملنے کا موقع ملتا ہے اور اگر غور کیا جائے تو ملاقات کی صورتوں میں سب سے بہتر اور سب سے دلچسپ یہی ہے۔ کسی دوسری جگہ ہم اکثر اُنہی بنی نوعِ انسان سے کتراتے ہیں لیکن ریل میں ہم چاہیں یا نہ چاہیں ہمیں ہر قسم کے آدمی کو دیکھنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ جتنی روحانی تکلیفیں بعض لوگوں کو ریل کے سفر میں پہنچتی ہیں اور کہیں نہیں پہنچتیں۔ لیکن جتنی عجیب وغریب معلومات انسان کو یہاں سے حاصل ہوتی ہیں اور کہیں سے نہیں ہوتیں۔

مثال کے طور پر دو آدمیوں میں بحث ہو رہی ہے اس پر غور نہ کیجئے کہ بحث کا موضوع کیا ہے مگر آپ یہ محسوس کریں گے جیسے یہی لوگ نظامِ کائنات کو سنبھالے ہوئے ہیں اور اگر خدانخواستہ یہ نہ رہیں تو دنیا یتیم ہو جائے گی۔ بعض اوقات بحث کا موضوع زبان ہوتا ہے، ہر شہر اور صوبے اور قسم کی تہذیب اور تمدن کے متعلق تمام معلومات بہم پہنچا کر دو شخص ایک دوسرے کو قائل کرنا چاہتے ہیں کہ میں زبان کے متعلق جس شہر کو پیش کر رہا ہوں وہ بہترین ہے اور وہاں کے لوگ بہترین زبان بولتے ہیں، اور اکثر اِس زبان کی بحث کی نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتی ہے اور اُن سب لوگوں کو اِس بحث میں شریک ہونا پڑتا ہے جو اب تک انجان بنے بیٹھے تھے۔ ایک دفعہ ریل میں میرے قریب بہت سادہ مگر کافی امیر دو شخص بیٹھے تھے کہ اُن کے درمیان بحث چھڑ گئی کہ انگلستان دنیا کا متموّل ترین اور خوشحال ملک کیوں ہے۔ اِن دونوں میں جہاں تک میں اندازہ کر سکا شرافت کی کمی تھی مگر پھر بھی وہ نہایت متانت کے ساتھ ایک دوسرے کی دلائل کے خلاف دلائل پیش کر رہے تھے۔ ایک شخص جس کی دولت کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ پیدل چلنے کے قابل نہیں تھا یہ بات نہایت زور سے کہہ رہا تھا کہ "انگلستان کی یہ حالت اِس لئے ہے کہ حکومت دولتمندوں کا بہت ہی خیال رکھتی ہے"۔ اور اِسی کو وہ خوشحالی کی وجہ بتاتا تھا لیکن دوسرے کو اِس نظریے سے قطعاً اختلاف تھا، وہ انگلستان کی ترقی کا راز فرض شناسی کو سمجھتا تھا اور اِس سلسلے میں ہر قسم کی غلط بیانیوں سے کام لے رہا تھا، مثلاً وہ کہہ رہا تھا کہ "انگریز فرض شناس ہوتے ہیں اور قانون کا احترام کرتے ہیں"۔ اگر آپ نے انگریزوں کو دیکھا ہے تو آپ اُس کے جھوٹ کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں! ایک طویل سفر میں مجھے دو چھوٹے طبقے کے آدمیوں سے واسطہ پڑا اُن میں سے ایک جس کا چہرہ باوازِ بلند چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ میں احمق ہوں۔ اُتنی ہی بلند آواز میں کہہ رہا تھا "ڈنمارک نے قبول کر لیا یونان اور ترکی نے قبول کر لیا ہم کیوں نہ کریں، امریکہ اور جرمنی میں بھی یہی ہے انگلستان میں بھی یہی ہے تو پھر ہم کیوں

نہ کریں۔ آخر ہم کیوں علٰحدہ رہیں ——— پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد اُس نے قریب قریب چیخ کر کہا " فرانس میں بھی یہی ہے تو ہم کیوں نہ اِسے اپنا لیں ——— " اور جب وہ یہ کہہ رہا تھا تو اُس کے چہرے سے ایک تکلیف کا اندازہ ہو رہا تھا۔ جیسے اگر وہ جو چاہ رہا ہے نہ ہوا تو دنیا تاریک ہو جائے گی۔ دوسرا آدمی جس کے ہاتھوں میں ہر قسم کے اخباروں کا ایک پلندہ تھا اپنی آواز کو اتنا ہی بلند کرتے ہوئے بولا ———

" اِس لئے کہ ہم سمجھدار ہیں ——— اِس ——— لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے ——— اِس لئے کہ ہمارے اپنے نظریے بھی ہیں، اِس لئے کہ ہم ——— لکیر کے فقیر نہیں ——— " پہلے آدمی نے تعجب سے اپنے ساتھی کو دیکھا اور کھوئی ہوئی آواز میں کہا ——— " کیا واقعی ؟ " اور اس کے ساتھی نے بڑے وثوق سے جواب دیا " ہاں ! انگلینڈ کو کس نے بنایا ہے ؟ " اور پہلے آدمی نے بلا سوچے سمجھے کہا ——— " خدا نے " اور دوسرے آدمی کے اوپر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا اور اُس نے ہمت کر کے رُکتے رُکتے کہا۔ " ہاں ! تم ٹھیک کہتے ہو مگر میرا مطلب تھا کہ انگلستان کو آزاد تجارت نے بنایا ہے " اور یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا دایاں ہاتھ اِس زور سے بائیں ہاتھ پر مارا کہ قریب ہی سوئے ہوئے ایک بچے کی آنکھ کھل گئی اور اُس نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔ اور خدا خدا کر کے بحث کچھ عرصے کے لئے رُک گئی۔ بچے کے چپ ہو جانے پر پہلے آدمی نے آہستہ سے کہا۔ " بات یہ ہے کہ میں یہ بات ثابت کر سکتا ہوں " دوسرے آدمی نے دلچسپی کا اظہار کئے بغیر کہا " کیا واقعی ؟ " اور پہلے آدمی نے اپنی بات کو صحیح ثابت کر دیا۔ اور جب یہ بات ثابت کرتے وقت اُس کی آواز درجہ بدرجہ بلند ہوتی گئی تو اُس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بڑھتے گئے لیکن دوسرے آدمی نے اُسی بے تعلقی سے کہا ——— " کیا احمقانہ بات ہے " اور اس کے بعد ایک خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد پہلے آدمی نے جیب سے سگریٹ نکال کر لبوں میں رکھا اور دیا سلائی ڈھونڈنے کے لئے جیبیں ٹٹولنے لگا کہ دوسرا آدمی غراتے ہوئے بولا

" تم سگرٹ نہیں پی سکتے۔ یہ " سموکنگ روم " نہیں ہے " اور اُس بیچارے نے سگریٹ کو جیب میں رکھ دیا اور ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بصد کوشش پیدا کرتے ہوئے بولا " اچھا یہ بات ہے " اور پھر باقی سفر میں وہ ایک دوسرے سے آنکھ بچاتے رہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اسی قسم کی گفتگو کا آغاز کمپارٹمنٹ کے ایک کونے میں ہوا۔ اِس گفتگو میں حصہ لینے والے دو حضرات تھے۔ ایک صاحب لمبے قد، ورزشی جسم اور دو عدد خوفناک مونچھوں کے مالک تھے وہ بڑے اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے اور ٹانگوں پر ایک قیمتی کمبل ڈالے سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگا رہے تھے اور غالباً ذہنی طور پر چہل قدمی بھی کر رہے تھے۔ اور دوسرے صاحب پست قد، نازک جسم اور آنکھوں کے درمیان ایک بہت لمبی ناک لگائے ہوئے تھے (یہ لگائے ہوئے میں نے صرف اِس لئے کہا ہے کہ وہ ناک میں یقین سے کہہ سکتا ہوں اُن کی نہیں تھی) اور اپنی نشست پر پہلو بدل رہے تھے۔ میں سمجھا شاید انہیں کمبل نہ ہونے کے احساس سے بے چینی ہے یا کوئی اور تکلیف ہے۔ مگر اُنہوں نے اپنے پہلو بدلنے کے راز کا انکشاف کمبل والے شخص سے گفتگو شروع کر کے یوں کیا۔

" کیوں صاحب آپ کا نام فتح محمد خاں تو نہیں ؟ "

دوسرا آدمی۔ جی معاف کیجئے ! شاید آپ مجھ سے مخاطب ہیں ؟

پہلا آدمی۔ جی ہاں! میں پوچھ رہا تھا کہ آپ کا نام فتح محمد خاں تو نہیں؟"

دوسرا آدمی۔ جی! ہاں صاحب نام تو میرا یہی ہے (وقفہ) اور پھر فتح محمد خاں نے اِن صاحب کو بڑی متجسّانہ نگاہوں سے پورے کا پورا دیکھا اور "زیرِ مونچھ" ایک ہلکی سی مسکراہٹ پیدا کر کے بولے۔
اور آپ بھی معاف کیجئے۔ آپ کا نام کہیں اصغر بیگ تو نہیں ——— ؟

اصغر بیگ۔ اوہ ہاں ہاں، (بڑے اشتیاق سے) جی بالکل۔ بالکل۔ آپ نے ٹھیک پہچانا ہے۔

فتح محمد۔ آداب عرض ہے بیگ صاحب۔

اصغر بیگ۔ آداب عرض قبلہ ——— خوب ملاقات ہوئی ہے صاحب۔

فتح خان۔ واقعی!

اصغر بیگ۔ (سرگوشی کے انداز میں) کہیئے! کیا کر رہے ہیں آج کل؟

فتح خان۔ حضرت! پہلے آپ کہیئے۔

اصغر بیگ۔ (شرما کر) جی کیا عرض کروں۔

(وقفہ)

فتح خان۔ اجی اِس میں جھجکنے کی کیا بات ہے بھلا!

اصغر بیگ۔ کوئی بھی تو نہیں۔

فتح خان۔ تو پھر ———

اصغر بیگ۔ (بات کاٹ کر) جی میں ———

فتح خان۔ خوب! ماشاءاللہ۔

اصغر بیگ۔ آپ فرمائیے نا۔

فتح خان۔ کیا عرض کروں۔ بیگ صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دلّی میں میری قالینوں کی دکان تھی۔ فسادات کے بعد اُسے چھوڑ چھاڑ کر میں اپنی سسرال والوں کے ہاں راولپنڈی چلا آیا۔ یہاں پہنچ کر کچھ دن آرام کیا تو حواس درست ہوئے پھر لاہور جا کر دکان کے لئے درخواست دی، اور کیا عرض کروں۔ ہاہاہا۔ اوہ ہاہی ہا ——— (بے تکے انداز میں ہنستا ہے)

اصغر بیگ۔ خیر صاحب! کہیئے آپ کی بیگم کا کیا حال ہے؟ بچے تو ٹھیک ہیں نا؟

فتح خان۔ (مونچھوں کا پھیلاؤ بڑھ جاتا ہے) جی بچے تو ٹھیک ہیں ذرا بیگم کی طبیعت ناساز ہے کچھ پیٹ کی شکائیتیں ہیں۔

اصغر بیگ۔ ہاں صاحب! اور اکثر یہ عورتوں ہی کو ہوتی ہیں۔ اِس کی وجہ جہاں تک میرا خیال ہے بدہضمی ہے۔

فتح خان۔ کہیئے آپ نے بھی شادی کی یا ابھی ———

اصغر بیگ۔ نہیں صاحب! اور نہ ارادہ ہی ہے۔ میں تنہا ہوں۔ (وقفہ) اور خان صاحب ایمان کی بات تو یہ ہے کہ تنہائی بڑی نعمت ہے۔

فتح خان۔ جی ہاں! یہ سب کچھ تو جگر پر منحصر ہے۔

اصغر بیگ۔ (ہنستا ہے) کہیں پڑھا ہے یہ فقرہ۔ اچھا ہے بھئی خوب ہے!

فتح خان۔ یہ سوزش صاحب کا ہے۔ کبھی ملے ہیں آپ اُن سے۔
اِس گفتگو کے دوران میں اِردگرد کے تمام مسافر سو چکے تھے صرف میں اِن باتوں کو بڑے خلوص کے ساتھ سُن رہا تھا۔ اصغر بیگ صاحب فتح محمد خان صاحب کے کمبل سے اپنی ٹانگیں چھپا چکے تھے۔ اب دونوں حضرات کی حالت یہ تھی کہ ایک غنودگی

چھائی ہوئی ہے۔ اور ایک دوسرے کی بات کا جواب دے کر گویا احسان فرما رہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد کچھ اِس قسم کی باتیں ہونے لگیں :

فتح خان ۔ (جماہی لیتے ہوئے) صحت برقرار رکھنے کے لئے نیند بڑی ضروری چیز ہے۔

اصغر بیگ ۔ (ٹھنگ کر) کیا کہا آپ نے —— جی ہاں! گستاخی نہ ہو تو ذرا سا کمبل اُدھر آپ اِدھر سرکا دیجئے۔

فتح خان ۔ یہ کمبل میری بیگم کا ہے —— بیگ صاحب!

اصغر بیگ ۔ بڑا پیارا —— بڑا خوبصورت —— بڑا ملائم ہے یہ ——

فتح خان ۔ یہ کوئی اسّی روپے میں خریدا تھا بیگ صاحب!

اصغر بیگ ۔ راحت کے لئے دولت کی ضرورت ہے! ذرا آجکل خان صاحب آپ کو کیا معلوم —— انڈوں کا بھاؤ ——

فتح خان ۔ ہاں میاں —— کاروبار بھی ایک جُوا ہے۔

اصغر بیگ ۔ اچھا! خاں صاحب بھی شرما رہے تھے آپ کاروبار کے متعلق بتاتے ہوئے۔

فتح خان ۔ ارے بھئی شرم کا ہے کی ——

اصغر بیگ ۔ ہاں! بالکل ——

فتح خان ۔ کیا چیز —— ؟

اصغر بیگ ۔ چاہے کچھ ہی ہو ——

فتح خان ۔ (ذرا بلند آواز میں) آپ کو نیند آئی ہے بیگ صاحب!

اصغر بیگ ۔ (ذرا چونک کر) خدا نہ کرے —— کیا کہا آپ نے نیند —— اوہ —— اجی خان صاحب میں نے ہفتہ ہفتہ بھر ریل میں سفر کیا ہے مگر نیند کبھی نہیں آئی مجھے ——

فتح خان ۔ (وثوق سے) بیگ صاحب! یہ تو کمزوری صحت کی نشانی ہے۔

اصغر بیگ ۔ نہیں صاحب!

اتنے میں گاڑی کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہو گئی، اور جیسے ہی گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی۔ تو میں نے دیکھا کہ فتح خان اصغر بیگ سے یہ سوال کر رہے تھے کہ "بھئی اِس دفعہ وہ اُس کو —— کیا نام ہے اُس کا بھئی اُس کو —— کا ہے کا خطاب ملا ہے بھلا —— لو میں بھُول گیا ——"

اِس تمام گفتگو کو نوٹ کرنے کے لئے میں ٹرین سے اُتر کر ویٹنگ روم میں گیا اور میرا خیال ہے کہ میں نے یہ گفتگو لفظ بہ لفظ نقل کر دی ہے۔ اور آج تک میں اِسی سوچ میں ہوں کہ گفتگو بے موضوع تھی یا اِس کا کوئی موضوع تھا، غیر مربُوط تھی یا اِس میں کوئی ربط تھا۔ کچھ بھی ہو اب یہ آپ کے سامنے موجود ہے اور اب آپ اِس کے متعلق سوچئے —— اگر آپ کے پاس بہت فالتو وقت ہو۔

نظیری

چہ خوش است از دو یک دل سرِ حرف باز کردن
سخنِ گذشتہ گفتن گِلہ را دراز کردن

اثرِ عتاب بُردن ز دلِ ہم اندک اندک
بہ بدیہہ آفریدن، بہ بہانہ ساز کردن

چیخوف

(ترجمہ از محمد رشید الدین)

رشوت

(افسانہ)

دوپہر کا وقت تھا۔ والدریو ایک دراز قد اور جسیم آدمی، سر پہ مختصر اور چھوٹے چھوٹے بال، بڑی بڑی روشن آنکھیں، بائیں ہاتھ پر اوورکوٹ لٹکائے، رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کمیٹی کے دفتر میں داخل ہوا۔

اُس نے ایک طرف کھڑے ہو کر دفتر کے وسیع کمرے کا جائزہ لیا۔ پاس پاس میزوں پر بیٹھے کچھ آدمی لکھنے میں معروف تھے۔ اُس نے کچھ دیر یہ سوچا کہ ان میں سے کس کو مخاطب کرے اتنے میں دفتر کے کسی کمرے سے ایک چپراسی بلوریں گلاسوں سے سجا ہوا طشت اُٹھائے چلا آ رہا تھا۔ جب والدریو کے قریب پہنچا تو والدریو نے اُس سے کہا "دیکھو بھئی! میں کسی مقدمے کے بارے میں یہاں سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں، کس سے پوچھوں؟"

چپراسی چلتے چلتے رُکا اور اُس نے طشت کے ساتھ ہی اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ اُس طرف تشریف لے جائیے وہ سامنے کھڑکی ہے نا۔ بس وہیں۔"

والدریو کھنکارا اور گلا صاف کر کے اُسی کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ کھڑکی کے پاس ایک نوجوان میز پہ بیٹھا تھا۔ اُس کی میز پر سبز رنگ کی پرانی سی فلالین کا ٹکڑا منڈھا ہوا تھا جس پر سرخ و سیاہ روشنائی کے بڑے چھوٹے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ لڑکے کا لباس بڑا میلا تھا، اور سر پہ لمبے لمبے بال چار حصوں میں بٹے ہوئے پتا دے رہے تھے کہ وہ کسی معمولی گھرانے کا گھٹیا درجے کا کلرک ہے۔ وہ کچھ لکھ رہا تھا اور اُس کی ناک پر مکھی بیٹھی بھنبھنا رہی تھی۔

کچھ توقف کے بعد پھر جرأت کر کے والدریو نے کہا "اجی ...... مسٹر! سنئے گا ذرا، میں آپ سے مخاطب ہوں جناب! مجھے کمیٹی کے ۲۔ مارچ والے ریزولیوشن کی نقل مطلوب ہے۔"

کلرک نے قلم کو دوات میں ڈبو کر نکالا، نب کو دیکھا، روشنائی زیادہ آ گئی تھی، اُس نے زائد سیاہی چھڑک دی تاکہ تحریر میں کاغذ پر دھبا نہ پڑے۔ پھر جلدی جلدی لکھنا شروع کر دیا۔ اُس کے ہونٹ ڈھیلے پڑ گئے، مکھی ناک سے اُڑ کر کان پر آ بیٹھی۔

کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہنے کے بعد والدریو نے کلرک سے پھر کہا "جناب! میں آپ سے کچھ دریافت کر سکتا ہوں؟ میں ایک زمیندار ہوں۔ میرا نام والدریو ہے۔"

کلرک اپنے ہی دھیان میں پکارا "آیون آکسچ!" جیسے اُس نے والدریو کو دیکھا ہی نہیں "کیا تم یالیکوتا مبر کو بتا دو گے کہ اُسے اُس شکایت نامے پر دستخط کرنے ہیں جو پولیس کے پاس ہے؟ میں نے اُسے کئی مرتبہ یاد دلایا ہے۔"

والدریو نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی "اے جناب! میں اپنے اُس مقدمے کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں جو شہزادی گنگولی

کے وارثوں کے خلاف چل رہا ہے۔ اِس قصے کا تو سبھی کو علم ہے، ذرا میری بات بھی سُنیئے سرکار!"

والدریو کی بات پر کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے کلرک نے اپنے ہونٹ پر بیٹھی مکھی کو ہاتھ مار کر پکڑ لیا، اور ایک لمحہ بے معنی نظروں سے اُسے دیکھ کر پھر ہوا میں چھوڑ دیا۔

اب کے والدریو منہ پر رومال رکھ کر زور سے کھنکارنے اور ناک صاف کرنے لگا۔ اِس پر بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ کوئی اُس کی طرف متوجہ نہ ہُوا۔ ٹھیک تین منٹ تک بالکل سکوت رہا۔ پھر نہ جانے والدریو کو کیا خیال آیا، اُس نے جیب سے ایک رُوبل (چاندی کا ایک سکہ) نکال کر کلرک کے پاس پڑی ہوئی ایک کھُلی کتاب پر رکھ دیا۔ کلرک کی پیشانی پر ہلکے سے بل نمودار ہوئے۔ اُس نے کتاب کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بند کر دیا۔

اب اُس نے پھر بڑی لجاجت سے کہا "اِک معمولی سی بات ہے۔ مَیں صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہُوں کہ شہزادی گیگولن کے وارثوں نے کس بنا پر ...... کیا مَیں جناب کو کچھ تکلیف دے سکتا ہُوں؟"

کلرک بدستور لکھنے میں مصروف رہا۔

کچھ دیر بعد کلرک اپنی کہنی کو کھجلاتا ہُوا کرسی پر سے اُٹھا۔ اور فائلوں اور مِسلوں سے بھری ہوئی الماری کی طرف گیا، فائلیں اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا ــــــ ایک لمحہ کے لئے والدریو کو خیال ہُوا کہ شاید اُسی کے واسطے مقدمے کے متعلق کچھ تلاش کرنے اُٹھا ہے ــــــ مگر کلرک پھر واپس آ کر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

والدریو بہت جھنجھلایا، مگر ناچار زہر کے سے گھونٹ پی گیا۔ کچھ سوچ کر اب اُس نے ایک اور رُوبل میز پر دھر دیا۔ اور تھوڑے توقف کے بعد بولا "میں آپ کو صرف ایک منٹ کے لئے تھوڑی سی تکلیف دینا چاہتا ہوں ــــــ آپ سے ایک بات پُوچھنی ہے اور بس ......"

کلرک نے پھر بھی کوئی توجہ نہ کی اور اُسی طرح لکھنے میں لگا رہا۔ والدریو بہت جھلایا۔ اُس نے کلرک کی اِس لاپروائی کو اپنی توہین سمجھا، اور اُسے کلرک پر بڑا غصہ آیا، اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُسے گریبان سے پکڑ کر دو گھونسے اُس کے جبڑوں پر ایسے رسید کرے کہ اُس کی بتیسی ہل جائے۔ مگر مصلحت کے خیال سے غریب پھر چُپ ہو رہا۔ کلرک کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہا۔ اور اُس کی بے پروائی سے افسردہ ہو کر دل ہی دل میں کہنے لگا "اُف! اِس کی تو کمبخت لکھائی ہی ختم نہیں ہوتی۔ بڑا آیا ہے ماں کا منشی بن کر، کچھ سُنتا نہیں خبیث ......"

اب والدریو میز سے ہٹ کر الگ جا کھڑا ہُوا۔ وہ کلرک سے بالکل نااُمید ہو چکا تھا۔ اور واپس جانے ہی کو تھا کہ وُہی چپراسی پھر اُدھر سے گُزرا۔ اُس نے شاید والدریو کے چہرے سے اُس کی مایُوسی کو بھانپ لیا، چنانچہ اُس نے پاس آ کر پُوچھا "کیوں صاحب! وہ کام ہو گیا جس کے لئے آپ آئے تھے؟"

"کہاں یار۔ ہزار بار تو بُلا چکا ہوں یہ صاحب بولتے ہی نہیں ہیں۔"

چپراسی نے والدریو کے کان میں سرگوشی کے انداز سے کہا "آپ اِن کو تین عدد رُوبل دے دیجئے تو دیکھئے آپ کا کام فوراً ہو گا۔"

"دو رُوبل تو دے چکا ہوں ......"

"تو بس پھر ایک اور سہی۔" چپراسی یہ الفاظ کہہ کر چلا گیا۔ والدریو پھر میز کی طرف بڑھا۔ اور اُس نے بڑھ کر ایک

کھلی ہوئی کتاب پر تیسرا رُوبل رکھ دیا۔ کلرک نے کتاب کو اپنی طرف کھینچ لیا اور ورق اُلٹنے لگا۔ اب چند حروف تحریر کرکے وہ یُوں چونک کر والدریو کی طرف متوجہ ہُوا جیسے والدریو ابھی ابھی اُس کے پاس آیا ہو۔ ناک کو کھجاتے ہوئے، بناوٹی تبسّم کے ساتھ کہنے لگا "آیئے صاحب! کہیئے میرے لائق کوئی خدمت؟"

"مَیں اپنے مقدمے کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، میرا نام والدریو ہے اَور۔۔۔۔۔۔"

"اوہ! ہاں ہاں۔ وہی شہزادی گیگولن والا مقدمہ! وہی ناں؟" اب کلرک نے والدریو کو کرسی پیش کی اور بڑی عزت سے بٹھا کر پھر بولا "اچھا، تو یہ قصہ اصل میں کیا ہے جناب؟"

والدریو نے سب قصہ بہ تفصیل بیان کر دیا۔

کلرک نے ایک رجسٹر سے مطلوبہ امور کے متعلق تمام ضروری تفصیلات دیکھ کر والدریو کو بتا دیں اَور پھر اُس ریزولیوشن وغیرہ کی پُوری نقل کا انتظام بھی خود ہی کر دیا۔ یہی نہیں، بلکہ پھر موسم اَور فصلوں کے متعلق بھی والدریو سے بڑی دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ اَور یہ سب کچھ یُوں کرتا رہا جیسے والدریو اسی کے محکمے کا کوئی محسن افسر ہو یا پھر کوئی مخلص دوست یا رشتہ دار ہو۔ اس کے بعد وہ بڑے مؤدبانہ طریق سے والدریو کو سیڑھیوں تک پہنچانے کے واسطے ساتھ چلا آیا۔

چلتے چلتے جانے والدریو کے دل میں کیا خیال آیا کہ اُس نے ایک اَور رُوبل نکال کر کلرک کے ہاتھ میں تھما دیا — کلرک نے بڑے ادب سے سر جھکاتے ہوئے رُوبل لے کر ہنستے ہنستے جیب میں ڈال لیا۔۔۔۔۔۔

والدریو نے دل میں کہا "توبہ!!! کس قدر گھٹیا اَور کمینہ آدمی ہے، خدا کی مار۔۔۔۔۔۔" اَور پھر حسبِ عادت چہرے کو رُومال سے پونچھتا ہُوا دفتر سے رخصت ہُوا۔

اینٹن چیخوف ۱۸۶۰ء میں، رُوسی کسانوں کے ایک گھرانے میں پیدا ہُوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سولہ ہی سال کی عُمر میں وہ "طالب علم معلّم" بن گیا۔ پھر اُس نے ماسکو میں طب کی تعلیم بھی حاصل کی، لیکن ادب ہی اُس کا مشغلہ بنا اَور ۲۷ سال کی عُمر میں اُس کا پہلا ڈراما "آئیوی نوف" چھپا۔ اس کی آخری کتاب "چیری آورچرڈ" کریمیا میں لکھی گئی، جہاں وہ خرابیٔ صحت کی وجہ سے مقیم تھا۔ ۱۹۰۴ء میں جب اس کا انتقال ہُوا وہ جرمنی میں تھا جہاں سے اُس کی نعش تجہیز و تکفین کے لئے ماسکو پہنچائی گئی۔

نذر محمد انور طورؔ

"مخزن" کا خیر مقدم

(شیخ عبدالقادر بالقابہ مدیر اعزازی کے حضور میں)

اب سے بہت پہلے کہ میرا بچپن تھا پر اور اکبر پروفیسر طورؔ مرحوم کی وساطت سے رسالہ "مخزن" پڑھنے کا مسلسل موقع ملا کرتا تھا اور یہ "مخزن" ہی کا فیض تھا کہ راقم الحروف نثر و نظم سے شناسا ہو کر اُردو دان اصحاب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے قابل ہوا۔ الحمدللہ کہ جناب نے "مخزن" کو از سر نو فروغ بخشا ہے اور فہرست مضامین میں حضرت کیفی صاحب کا مضمون اس امر کا ضامن ہے کہ گزشتہ ایام میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ جلد ہی دُور ہو جائیں گی۔ شیخ و برہمن مخزن سبھا میں دوش بدوش نظر آئیں گے اور ہندوستان اور پاکستان میں اُردو کو مساوی حمایت حاصل رہے گی۔ ذیل کے چند اشعار بطور خیر مقدم میرے دِل پُر شوق کے آئینہ دار ہیں۔ اُمید ہے کہ جناب شرف قبول عطا کر کے انہیں صفحات مخزن میں شائع فرما کر خاکسار کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ پروفیسر طورؔ کا نام "مخزن" کے ایک دَور میں حضور کے نام نامی کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے اور میرے لئے بھی یہ مقام فخر ہے کہ میرا کلام بھی "مخزن" کے سابقہ دَور میں شائع ہوتا رہا ہے امید کہ آئندہ بھی یہ خاکسار انشاءاللہ تعالےٰ بذریعۂ مخزن اپنے خیالات ناظرین مخزن کی خدمت میں پیش کرتا رہے گا۔ والسلام

پسرور۔ ۱۳؍ جنوری ۱۹۴۹ء

احقر نذر محمد انور طورؔ

مخزن سبھا کو آپ نے بخشا ہے پھر فروغ ۔۔۔ برِ عظیم میں وُہی کیف و سرور ہے

طالب بنارسی کو ہوئی آرزوئے زیست ۔۔۔ حسرت ہے شاد وجد میں اقبالؔ طورؔ ہے

جنت سے لوٹنے کو وہ تیار ہو گئے ۔۔۔ بے تاب زیر خاک وہ داغؔ و سرورؔ ہے

سیراب تیرے نطق سے سائلؔ حفیظؔ و ذوقؔ ۔۔۔ تیرے سخن میں شہد و شکر کا وفور ہے

اعجاز و شبلی نادر و ناصر ہوئے گواہ ۔۔۔ حضرت کا جو کلام ہے گفتار نور ہے

اُردو کا جو عدو ہے وہ ہندی کا ہے عدو — لاریب اُس کے سر میں سراسر فتور ہے

بانٹا گیا ہے مُلک تو کیا اس میں ہی ضرر — فرقت پسِ وصال یہ رسمِ دہور ہے

جوہر کو آرزو تھی جو آہر کو جستجو — جنّاح و گاندھی ان کا بھلا کیا قصور ہے

مخزن نے پھر سے جلوہ دکھایا برنگِ نو — لاہوریوں کی زندہ دلی کا ظہور ہے

اہلِ مذاق کے لئے مخزن سرورِ شوق — عشّاق کے لئے یہ نوائے زبور ہے

مخزن کی میم میمِ محمدؐ سے عکس گیر — خ سے ظہورِ لطفِ خدائے غفور ہے

زا زرعِ عشقِ حق کے لئے سازگار تر — اور نون چاہِ غبغب و رخسارِ حور ہے

آ ہم نشیں کہ خدمتِ خلقِ خدا کریں — منظور جو خدا کو ہے ہونا ضرور ہے

اُلفت سے راہِ حق میں ہزاروں سنور گئے — ہاں اے صنم تو کس لئے مجھ سے نفور ہے

اکبر سے کل یہ کہتے تھے سرشار اور شرر — لاہور رشکِ قرطبہ و نیشاپور ہے

ضامن ہو اس کا پاکستان، شرق و غرب میں — اُردو کے سر پہ سایۂ ربِّ غفور ہے

ہے آرزو کہ آ کے میں لاہور میں رہوں
پسرور تیری بزم سے اے شیخ دُور ہے

منشورات

پاکستان میں حکومتِ اسلامی

پاکستان میں ایک بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی ہے جس کی یہ خواہش ہے کہ پاکستان کا قانون شرعِ اسلام کے مطابق ہو۔ جہاں تک پاکستان کے غیر مسلموں کا تعلق ہے، اسلام اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتا کہ اُن پر جبراً ہر اسلامی قانون کی پیروی لازم قرار دی جائے۔ پاکستان کے نظامِ حکومت کی تشکیل میں اس بات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوگا۔ اِس وقت جو نظامِ حکومت ہمارے ہاں قائم ہے وہ اپنی ہر تفصیل میں اگرچہ لازماً خلافِ اسلام نہیں ہے تاہم اسے اسلامی قانون نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ ظاہر ہے کہ صدیوں کے بگاڑ کی اصلاح ایک دن میں نہیں ہو سکتی۔ یوں بھی نظامِ حکومت کی تشکیل بچوں کا کھیل نہیں۔ اِس کے لئے بہت سوچ بچار اور غور و خوض کی ضرورت ہے جس کے لئے وقت درکار ہے۔ جو لوگ نظامِ شرعی کے فوری نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں اُن میں سے بعض تو نیک نیت ہونے کے باوجود ناتجربہ کار اور بھولے بھالے آدمی ہیں اور بعض وہ لوگ ہیں جن کو ہر قائم شدہ حکومت سے خدا واسطے کا یا کسی قسم کا خود غرضانہ بیر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ طرح طرح کے ناممکن مطالبات محض حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کو عادتاً پیش کرتے رہتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک بھولے بھالے مولوی صاحب نے حکومت کو حکم دیا تھا کہ "پندرہ دن کے اندر اندر نظامِ اسلامی نافذ کرنے کا انتظام کرو، ورنہ بندہ مرن برت رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔"

مولوی صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ خودکشی کا یہ طریقہ گلگت کی ایجاد ہے اور اسے مہاتما گاندھی مجبوراً اور وہ بھی علی العموم ایک غیر ملکی حکومت کی بے انصافیوں کے خلاف استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اِس سے شرعِ اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔ خودکشی تو ازروئے اسلام یوں بھی حرام ہے۔

معلوم نہیں اِس قسم کے مولوی حضرات کس وجہ سے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پاکستان کا نظامِ حکومت ابداً کر غیر اسلامی ہی ہوگا۔ حالانکہ حضرت قائدِ اعظمؒ کے علاوہ متعدد اور ذمہ دار اصحاب بھی بار بار پاکستان میں بالآخر نظامِ اسلامی کے نفاذ کا اعلان اور وعدہ کر چکے ہیں۔ یہ لوگ اِس حقیقت کو بھی ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے کہ نظامِ حکومت کی تشکیل اربابِ حکومت کی کسی محدود "مخالفِ اسلام" جماعت کے سپرد نہیں۔ یہ کام تو مسلمانوں کے وہی نمایندے انجام دیں گے جن پر مسلمانوں کو اعتماد ہے۔

پاکستان کا قیام تو طرفۃ العین میں محض معجزانہ طور پر عمل میں آ گیا تھا لیکن مسلمانوں کو صحیح مسلمان بنانا، یا تمام غریبوں کو امیر کر دینا، یا گوناگوں بے سروسامانیوں اور بہت کٹھن مشکلات کے اندر نظامِ شرعی کی تشکیل اور اُس کا نفاذ، ایسے کام نہیں کہ آنکھ جھپکتے میں طے پا جائیں۔ ہر شخص معجزے نہیں دکھا سکتا،

نہ معجزے روز روز دیکھنے میں آتے ہی ہیں۔

بہرحال خدا کا شکر ہے کہ مذکورہ صدر مولوی صاحب کی جان بچ گئی، کیونکہ غالباً پندرہ دن گزرنے سے پہلے ہی حُسنِ اتفاق سے وزیرِ اعظم نے اپنی ایک تقریر میں پاکستان میں نظامِ اسلامی کے متعلق حکومت کا بارہا دہرایا ہُوا وعدہ ایک بار پھر دہرا دیا۔ ہمارا خیال ہے وزیر اعظم کے یہ الفاظ بہت واضح ہیں اور مولوی صاحب اگر اعتبار کریں تو اب بہ اطمینان سے اپنی بقیہ زندگی گزار کر طبعی موت مر سکتے ہیں۔

وزیرِ اعظم پاکستان نے ۲۱ رفروری کو مسلم لیگ کی کاونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے :۔

"آج مسلم لیگ کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ ہے کیونکہ اب پاکستان قائم ہو چکا ہے اور ہمیں اس کی تشکیل و تعمیر اسلام کی مطابقت میں کرنی ہے۔ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے ایک ایسی سیاسی جماعت کا وجود بھی ناگزیر ہے جو اسلام سے اور اصولِ اسلام سے واقفیت رکھتی ہو۔" وزیر اعظم نے کہا "ہم نے حصولِ پاکستان سے قبل مسلمان رائے دہندوں سے جو وعدے کئے تھے، میں انہیں بھُولا نہیں۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ اِس بنا پر کیا تھا کہ مسلمان اپنی زندگی کو اسلامی احکام کے قالب میں ڈھال سکیں۔ ہم نے ایک ایسے "مملکت" کے قیام کا مطالبہ کیا تھا، جہاں ایک ایسی حکومت بنائی جاسکے، جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو، جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی۔ اِسی مقصد کے لئے ہزارہا مسلمانوں نے اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔ تقریباً ستر لاکھ مسلمانوں نے اِسی مقصد کے لئے اپنا گھر بار چھوڑا، اور مرتے کٹتے پاکستان تک پہنچے۔

ہم نے مسلمان عوام سے جو وعدہ کیا تھا، اب ہمیں اُسے پُورا کرنا ہے اور ایک ایسی حکومت قائم کرنی ہے، جس کا نصب العین سچا اسلامی نصب العین ہو۔ دنیا کو آج اسلام کی ضرورت ہے۔"

قول اَور عمل

ہم میں سے بہت کم لوگوں کو یہ احساس ہے کہ بہت سی خرابیوں کا آسان ترین حل خود ہمارے ہی قبضۂ اختیار میں ہے اور اِس میں ہمارے قول و عمل کی کامل مطابقت کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ ہم میں کتنے لوگوں نے کبھی یہ غور کیا ہے کہ ہمارے قول و عمل میں کتنا تضاد ہے۔ ہر شخص دوسروں کے اعمال کو اپنے "اقوال" کی کسوٹی پر پرکھتا ہے لیکن اپنے اعمال کا قطعاً محاسبہ نہیں کرتا۔ اگر ہر شخص کم از کم خود سچا مسلمان بننے کی کوشش کرے تو موجودہ معاشرہ کی بہت سی اُلجھنیں دُور ہو سکتی ہیں۔ قانون کے دباؤ سے مسلمانوں کے مسلمان یا مومن بننے میں وہ لطف نہیں جو رضاکارانہ طاعتِ حق میں ہے۔ نظامِ حکومت کا تابعِ اسلام ہونا لازم ضرور ہے لیکن خود سچے مسلمانوں کے لئے خدا کا قانون اپنے نفاذ کے لئے کسی حکومت کے رُعب اَور دبدبے کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ہم سچے مسلمان بن جائیں تو کسی حکومت کا کوئی قانون ہمیں کسی غیر اسلامی قاعدے کا پابند نہیں بنا سکتا۔

گزشتہ مہینے لاہور میں پاکستان کے وزیر نا ربہ نے تقریر کرتے ہوئے خوب کہا تھا کہ :۔

"پاکستان کے مطالبے کی پوری بنیاد ہی اِس بات پر

رکھی گئی تھی کہ اسلامی تعلیم پر عمل کرکے دنیا پر اُس کی صداقت ظاہر کی جائے تاکہ بنی نوعِ انسان کو نیکی کی ترغیب ہو، لیکن پاکستان کے قیام کے باوجود ہم نے عملی طور پر اسلامی زندگی اختیار نہیں کی۔ ہم پر یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور ہمیں اپنے اعلانات کا احترام کرنا چاہیئے۔ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کا صداقت آج بھی صداقت ہے اور اس سے روگردانی ہمیں محض تباہی کی طرف لے جائیگی تقسیم کے بعد ہند اور پاکستان کے باشندوں نے دنیا کے سامنے کوئی قابلِ تقلید مثال پیش کرنے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ بدی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جائیں۔ اسلام نے تو بدی کے بدلے نیکی کرنے کی تلقین کی تھی تاکہ کل کے دشمن آج ہمارے دوست بن جائیں۔ مگر کیا ہم نے اس تعلیم پر عمل کیا ہے ؟"

عورتوں پر ظلم

ہند و پاکستان کے نام پر یہ نہایت مکروہ دھبا ابھی باقی ہے کہ کم و بیش دونوں ملکوں کے بعض غنڈوں کے پاس اب بھی ایسی بیکس عورتیں محبوس ہیں جو فسادات میں اپنے متعلقین سے بچھڑ گئی تھیں یا اُن سے بہ جبر چھین لی گئی تھیں۔ پچھلے دنوں دونوں حکومتوں نے پھر اس مسئلے پر غور کیا تھا اور خواجہ شہاب الدین اور مسٹر گوپال سوامی آئینگر نے نہ صرف اِس معاملے میں دونوں حکومتوں کے گہرے تعاون کی ضرورت تسلیم کی تھی بلکہ اپنے اپنے ملک کے عوام سے بھی مدد کی درخواست کی تھی۔ ہمیں افسوس ہے کہ برِ عظیم کے لوگوں کے افسوسناک جموٗد میں اب تک کسی حرکت کے آثار پیدا نہیں ہوئے حالانکہ اِس معاملے میں جتنی تاخیر ہوگی اتنی ہی اُلجھنیں بڑھتی جائیں گی۔ یہ دیکھ کر زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ دونوں طرف کی عورتوں نے بھی بہ حیثیتِ مجموعی اپنی مظلوم بہنوں کی نجات کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا حالانکہ اُنہیں عورتوں کی حالت کا زیادہ اندازہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور اُنکی مدد بے حد مفید بھی ہو سکتی تھی۔

دونوں حکومتوں پر اب یہ خوب واضح ہو چکا ہوگا کہ شرافت کی ترغیب غنڈوں پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتی اور قانون کی کل کو حرکت میں لائے بغیر اِس ظلمِ عظیم کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ پچھلے دنوں کسی اخبار میں ایک خط چھپا تھا، جس میں مکتوب نگار نے دونوں حکومتوں کو سختی برتنے کی ترغیب کے ساتھ اپنی طرف سے اِس قسم کی تجاویز بھی پیش کی تھیں :-

دونوں حکومتیں کوئی خاص تاریخ مقرر کرکے اعلان کریں کہ جس شخص کے پاس کوئی محبوس عورت ہو وہ اُسے معیّنہ میعاد کے اندر اندر اپنی حکومت کے حوالے کردے، اُس کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جائیگی لیکن تاریخ معیّنہ کے بعد اگر کسی شخص کی تحویل میں کوئی ایسی عورت پائی گئی تو عہدے اور مرتبے کا لحاظ کئے بغیر اُسے برسرِ عام بید کی سزا دی جائیگی۔ مجرم اگر سرکاری ملازم ہوگا تو وہ نہ صرف یک قلم برطرف کر دیا جائیگا بلکہ دوسروں ہی کی طرح اُس کا تمام سامان اور جائداد بحقِ حکومت ضبط کرلی جائیگی۔ اِس دوران میں عورتوں کو نقصان پہنچانا یا اُن کو کسی دوسری جگہ بھیجنے کی کوشش کرنا بھی شدید سزا کا مستوجب ہوگا۔

ظاہر ہے کہ ان احکام کے نفاذ کے لئے دونوں حکومتوں کو خاص آرڈیننس جاری کرنے پڑینگے، اِس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تجاویز کہاں تک قابلِ عمل ہو سکتی ہیں، لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس ظلمِ عظیم و اِس قابلِ نفرت اور ننگِ انسانیت بداخلاقی کا انسداد محض سخت گیری اور انتہائی سخت گیری ہی ہو سکتا ہے۔

"م"

مخزن المخازن

عنوان بالا حضرت شیخ عبدالقادر مدظلہٗ مدیرِ اعزازی کا تجویز کردہ ہے۔ "مخزن" کے دورِ اوّل میں دیگر رسائل کے دلچسپ و دل افروز مضامین کے اقتباسات کی اشاعت کا اہتمام شیخ صاحب قبلہ کے زیرِ غور رہا، مگر کثرتِ مشاغل کے باعث وہ اِس تجویز کو جامۂ عمل نہ پہنا سکے۔ آپ کے ارشاد کے مطابق اب "مخزن" کے عہدِ نو میں اِس کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ یہ عنوان پاکستان و ہند کے بہترین اُردو رسائل کے اقتباسات کے لئے مستقلاً وقف رہے گا۔

ماہِ نو

چھنّا جان

مرزا غالب کا ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ہے جس میں اُنہوں نے مہر کی محبوبہ کے انتقال پر تعزیت ادا کی ہے اور تعزیت میں ظرافت کا پہلو پیدا کر کے ادبیت کا وہ کمال دکھایا ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اُس خط کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:-

"شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی، تمہاری محبوبہ، تمہارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اُس کو مار رکھتے ہیں میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا اُن دونوں کو بخشے اور ہم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔"

اِس میں کوئی شُبہ نہیں کہ مہر اِس خط کو پڑھتے جاتے ہونگے اور اُن کا دل ہلکا ہوتا جاتا ہوگا یہاں تک کہ جب وہ اِن جملوں پر پہنچے ہونگے "بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں، اُس کو مار رکھتے ہیں۔" تو غم کے بادل چھنٹ چکے ہونگے اور جب اِس کے بعد ہی یہ جملے نظر آئے ہوں گے "میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔" تو چہرے پر مسکراہٹ نمایاں ہو گئی ہوگی۔ روتوں کو ہنسانے کی اِس سے بہتر مثال کہاں ملے گی؟

یہ خط بھیجنے کے کچھ دن بعد مرزا نے مہر کو دوسرا خط لکھا وہ بھی اِس سانحے کی تعزیت کے سلسلے میں ہے۔ اور اِس میں بھی ظرافت نگاری کا یہی کمال صرف کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّا جان نہ سہی مُنّا جان سہی۔

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اُسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اِس تصور سے جی گھبراتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہی زمرّدیں کاخ، وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشمِ بد دُور وہی ایک حُور۔"

اس عبارت میں یہ جملہ "اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چُنّا جان نہ سہی مُنّا جان سہی" پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہاں چُنّا جان اور مُنّا جان سے کوئی خاص عورت مراد نہیں ہے بلکہ مہر کی محبوبہ کوئی بازاری عورت تھی اور غالب نے اِس طبقے کی عورتوں کے دو مشہور نام لکھ دیئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نہ بازاری عورتوں کی کمی ہے نہ اُن کا ملنا دشوار ہے۔ اگر ایک عورت نہ رہی تو ویسی ہی دوسری مل سکتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چُنّا محبوبہ کا نام تھا جس کی تعزیت میں غالب نے مذکورہ بالا دو خط لکھے ہیں۔

چُنّا جان کی زندگی کے حالات تو معلوم نہیں۔ اُن کی موت کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ ورمِ جگر کے مرض میں اُن کی جان گئی۔ ۱۲۷۰ھ میں ذیقعدہ کی نویں تاریخ پنج شنبے کے دن اُنکا انتقال ہوا، اور شبِ جمعہ کو وہ سپردِ خاک کی گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ چُنّا جان بڑی دیندار اور عبادت گزار تھیں۔ مہر نے اُن کے انتقال پر بیاز قطعاتِ تاریخ لکھے ہیں جن میں کئی جگہ اُن کو "مومنہ" کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ مہر کے بھائی مرزا عنایت علی ماہ نے اپنے قطعۂ تاریخ میں مادۂ تاریخ یہ نکالا ہے "مرقدِ مومنہ و زاہدہ شیدائے بتول"۔

مہر کے دوست مولوی عبدالوہاب نے پانچ قطعاتِ تاریخ لکھے ہیں۔ ایک قطعے کا پہلا شعر یہ ہے :-

رفت لے وا رو ہر چُنّا جان - آنکہ می کرد طاعت اللہ را

اور دوسرے شعر کا پہلا مصرع یہ ہے

"فاطمہ را کنیز بود از دل"

اِسی قطعے کا ایک شعر یہ ہے :-

جاں بجاں آفریں سپرد نمود — طے بہ ایمانِ کامل ایں رہ را

ایک دوسرے قطعے میں اُنہوں نے بھی چُنّا جان کے لئے "مومنہ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مہر نے ایک جگہ چُنّا جان کا نام کئی توصیفی فقروں کے ساتھ اِس طرح لکھا ہے :-

"شیدائے اہلِ بیت طاہرین او والۂ پنجتن پاک و ائمۂ معصومین، فریفتۂ شہدائے کربلا، مفتونِ حضرات آلِ عبا، کنیز قنفہ، خاکِ نعلین فاطمہ زہرا علیہا السلام، چُنّا جان نام"۔

مہر چُنّا جان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ ایک پنج شنبے کو اُن کے ایک دوست بھی ساتھ تھے۔ قبر پر پہنچ کر مہر نے کسی کا یہ مطلع پڑھا :-

مزارِ جیہ بکہ با ہمچو حالِ زار آیم — تو مُردہ باشی و من زندہ بر مزار آیم

اس کو سُن کر آپ کے دوست نے یہ مطلع پڑھ دیا :-

چہ خونِ جگر در غمِ خوردہ باشم — تو بر خاکم آئی و من مُردہ باشم

مہر کہتے ہیں کہ یہ مطلع سُن کر میرے دل پر غم کی گھٹا چھا گئی اور میری جان ہونٹوں پر آگئی۔

چُنّا جان کی موت سے متأثر ہو کر مہر نے ایک مسدس اور دو غزلیں کہی تھیں۔ اس مسدس کے چند بند اور ان غزلوں کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں :-

اِک مادرو کا داغ ہُوا مہرؔ کے لئے   تاگور یہ چراغ ہُوا مہرؔ کے لئے
گلشن جہاں کا باغ ہُوا مہرؔ کے لئے   بر رِنج و غم ایاغ ہُوا مہرؔ کے لئے

رحمے بہ غربتِ دلِ دیوانہ اش کنید
رقت بہ گریہ ہائے غریبانہ اش کنید

نقدِ سرورِ عیش و طرب سب تلف ہُوا   ہنگامہ گرمِ سازِ دلِ پُر شغف ہُوا
سینہ خدنگِ رنج و الم کا ہدف ہُوا   بیت الملال مہرؔ کا بیت الشرف ہُوا

از بے دلی بہ کنجِ غمے عہد بستہ است
در بیکسی بہ ماتمِ خود خود نشستہ است

افسانہ دردناک ہے مہرؔ ملول کا   دورِ فلک کہہ رہا ہے تصدق رسول کا
اللہ اِس دُعا میں اثر دیدے قبول کا   بخشش ہو چُھنّا جان کی صدقہ بتول کا

در خاک و خوں کشید غمِ رسیم بر مرا
پیش از اجل رسید قیامت بہ سر مرا

ہمیں کیا کام اگر کوئی حسیں ہے   ہمارا چاہنے والا نہیں ہے
نہیں کنجِ تنہائی بنے کون   فقط میں ہوں دلِ اندوہگیں ہے
ملے ہیں خاک میں گل رو ہزاروں   عجب گلزار اِک زیرِ زمیں ہے
نہیں میں دیکھتا ہے وجہ اُس کو   ترا ہم شغل کچھ ماہِ مبیں ہے

غزل میں بھی کہو مہرؔ اُن کی تاریخ
"جواں مرحومہ و خلدِ بریں ہے"

خوشی کی بات پر بھی غمزدے کب شاد ہوتے ہیں
ہمارے سامنے اب کوئی ہنستا ہے تو روتے ہیں
ترا پڑے آنسوؤں کے پڑ رہے ہیں دیدۂ تر سے
نہیں چھٹتا یہ داغِ دل ہمارا روز دھوتے ہیں
اگر ہم چشم ہے اپنی تو بے شک شمعِ تربت ہے
کہ وہ بھی اور ہم بھی دونوں اِک عالم میں روتے ہیں
خبر آئندہ کی دیتے ہیں کیونکر بے خبر کہئے
ہمیں غفلت سی چونکاتے ہیں خود مرقد میں سوتے ہیں
دُعائیہ کہوائے مہرؔ تاریخ اِس غزل میں بھی
"جہاں میں وہ ہنسے واں ہم یہاں ہم جس کو روتے ہیں"

چُھنّا جان کے بارے میں اُوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے ایک رسالے سے ماخوذ ہے جس کا تاریخی نام "بیانِ بخشایش" ہے اور جو مطبع حیدری، آگرہ میں ۱۲۶۷ھ میں چھپا تھا۔ اس رسالے کا جو نسخہ میرے کتب خانے میں ہے اس کے آخر میں چند سطریں مہرؔ نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے دستخط کر دیئے ہیں۔

مہرؔ کے دیوان "الماس درخشاں" میں دو قطعۂ تاریخ ہیں جن کے عنوان "تاریخ آغاز بنائے مسجدِ چُھنّا جان" اور "تاریخ مسجدِ چُھنّا جان" ہیں۔ یہ دونوں قطعے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

از حیدری و پیتی و مُنّا و چُھنّا جاں   در کربلا ببیں چہ بنا گشت مسجدے
تحریر کرد مصرعِ تاریخ کلکِ مہرؔ   اللہ اکبر ایں چہ بنا گشت مسجدے

اِس مسجدِ بلند کا شمسہ ہے آفتاب   ہر دم رکوع میں ہے یہاں گنبدِ سپہر
بانی ہیں پیتی مُنّا و چُھنّا و حیدری   "تعمیر ثبت یہ کعبہ ہے" تاریخ لکھدے مہرؔ

اِن قطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چُھنّا جان نے ایک مسجد بنوائی تھی جس کی تعمیر ۱۲۴۵ھ میں شروع اور ۱۲۴۹ھ میں تمام ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس مسجد کی تعمیر میں حیدری، پیتی اور مُنّا بھی چُھنّا جان کے ساتھ شریک تھیں۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ تینوں چُھنّا جان کی بہنیں ہوں۔ ان کے ناموں میں بھی "جان" کا لفظ شامل ہوگا، جو

یہاں حذف کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے قطعے میں چنیا جان کا نام فقط چنیا لکھا گیا ہے۔ غالب نے تو اپنے خط میں چنیا جان کے ساتھ "منا جان" محض قافیے کی رعایت سے لکھا ہوگا۔ مگر اتفاق سے وہ چنیا جان کی شریک کار نکلیں۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ چنیا جان کا انتقال ۱۲۷۶ھ میں ہوا۔ غالب نے تفتہ کو پہلا تعزیتی خط اسی سنہ میں لکھا ہوگا۔ اس خط میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے :-

"ہم مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک کو میں نے مار رکھا ہے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔"

غالب کے اِس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی محبوبہ تھی جس کا انتقال ۱۲۷۶ھ سے چالیس بیالیس برس پہلے یعنی ۱۲۳۵ھ کے قریب ہوا تھا۔ غالب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے تھے اِس لئے اس واقعے کے وقت اُن کی عمر کم و بیش ۲۲ برس کی ہوگی۔

غالب کی محبوبہ کا نام و نشان تو معلوم نہیں، مگر قیاس کہتا ہے کہ اُسی کی موت سے متاثر ہو کر اُنہوں نے وہ غزل کہی ہوگی جس کا مطلع یہ ہے :-

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اِس غزل کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی مرحوم نے دیوانِ غالب کی شرح میں اس غزل کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ ساری غزل معشوق کا مرثیہ ہے" اِس پر اتنا اضافہ کر لینا چاہئے کہ یہ کسی ڈومنی معشوقہ کا مرثیہ نہیں ہے، بلکہ شاعر نے اپنی محبوبہ کے انتقال پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

غالب کے تذکرہ نویسوں [illegible]

از سید مسعود حسن رضوی

"ہمایوں"

نواب بہادر یار جنگ اور قائد اعظم

(اقتباس)

قائد اعظم کی ذات سے اُن کو والہانہ عقیدت تھی۔ میری [illegible]

میں آکر ہماری مجلس ناظرہ میں شریک ہوئے تو بغیر تمہید کے قائد اعظم کی مدح سرائی میں موتی بکھیرنے شروع کر دیئے اور فرمایا "جناح جناح نہیں، خدا کی رحمت ہے جو ہم گنہگار مسلمانوں پر آسمان سے نازل ہوئی ہے۔" ایک دفعہ میں قائد اعظم سے ملنے دہلی گیا۔ نواب صاحب مرحوم ملاقات سے فارغ ہو کر باہر آئے تو قائد اعظم کے دربان غلام محمد کو دس روپیہ کا نوٹ دینا چاہا۔ اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ جب باوجود اصرار اور تقاضے کے نواب صاحب اُس کو مائل نہ کر سکے تو فرمایا "دیکھو غلام محمد تم قائد اعظم کے دربان ہو، اس لئے تمہارا مقام بہت اونچا ہے، جسے تم محسوس نہیں کرتے۔ خدا گواہ ہے، اگر قائد اعظم قبول فرمالیں، تو، تمہاری جگہ میں اُن کی دربانی کو اپنے لئے سعادت دین و دنیا سمجھوں گا۔" اور یہ کہہ کر کچھ آبدیدہ ہو گئے۔ مجھ پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ میں نے بھی غلام محمد کو سمجھایا چنانچہ اُس نے وہ رقم قبول کر لی۔

غلام عباس
(صدر آزاد کشمیر)

قائدِ اعظم رح

(انتخاب)

میں نے چاہا تھا کہ یا بات وہ اٹھ جائیں
ایک ہی میری تمناؤں کا معبود رہے
عشقِ جاناں نہ رہے، یا غمِ ملت مٹ جائے
لب شرر بار ہوں، یا چشم نم آلود رہے

نبضِ تقدیرِ مقدر کا ستارہ چمکا
عرش پر میری تمنا کی ہوئی شنوائی
شمعِ تجدید لئے قائدِ اعظم آئے
چہرۂ شاہدِ ملت پہ جوانی آئی

اب مری روح کو اندیشۂ ملت نہ رہا
آگیا پیکرِ ملت کا نگہبانِ حیات
وہ جواں عزم مجاہد، وہ کہن سالِ امیر
مری ملت کا سہارا، مری ملت کی نجات

اس نے پھر سینۂ ملت کو حرارت بخشی
آتشِ شوق سے گرمایا غلاموں کا لہو
میں اسیرِ ہوس کاکلِ جاناں ہی رہا
مری محبوب رہی مستیٔ چشمِ آہو

آہ وہ عہدِ فراغت کہ شب و روز ندیم
عشقِ جاناں کے سوا کوئی مجھے کام نہ تھا
مری دُنیا پہ مسلط تھے شراب اور شباب
مرے آغاز کو اندیشۂ انجام نہ تھا

پرچمِ قوم اٹھائے وہ بڑھا جاتا تھا
مری منزل، کہ مری قوم کی منزل کی طرف
تند موجوں سے الجھتا ہوا، لڑتا ہوا
کشتیٔ قوم کو وہ لے گیا ساحل کی طرف

اِک نئی قوم نیا ملک، بنایا اُس نے
ندرتِ فکر و عمل، ذہن کی دراکی سے
نبضِ گیتی کے بم و زیر کو محسوس کیا
اپنے اندیشۂ چالاک کی چالاکی سے

میں سے و مطرب و مینا سے ہم آہنگ رہا
کہہ پیچھے تھا مرے اور کلیسا آگے
دین کا شانہ دشمن تھی، سیاست اُس کی
اُس کی آواز سے اغیار کے لشکر بھاگے

انور علی انور

ادبی دنیا

ابّا جان مرحوم[1]

(اقتباس)

جولائی ۱۹۱۸ء میں دفعتہً امّاں کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ابّا جی کی عمر چونتیس برس تھی۔ یہ اُن کی زندگی کا بہت بڑا موڑ تھا۔ اُن کی شگفتگی کا خاتمہ ہوگیا۔ ہم پانچ بھائی ہیں اور سب میں چھوٹی ایک بہن ہے۔ بہن کی عمر اس وقت نو ماہ تھی۔ سب سے بڑے بھائی کی گیارہ سال، باقی سب بھائیوں کی عمریں چھ برس سے نیچے۔ اس وقت انہوں نے تہیہ کر لیا کہ پھر شادی نہ کریں گے۔ دو ایک سال گزرنے پر دوستوں نے فہمائش کی کہ شادی کے بغیر بچوں کا سنبھالنا آسان نہیں۔ مرحوم سر اقبال نے بھی کئی بار ان سے یہی کہا مگر ٹالتے رہے۔ ماں کے تمام فرائض اپنے کندھوں پر اُٹھا لئے۔ نہ کوئی انّا رکھی نہ رشتہ داروں میں کسی عورت سے مدد لی۔ مجھے اُن کی ابتدائی مشقتوں کا پورا تصور نہیں۔ مگر ان دنوں کا اچھا خاصا نقشہ ذہن میں ہے۔ جب وہ چاروں چھوٹے بچوں کو اپنے ہی بستر پر ساتھ سُلا لیتے۔ بچے جن مختلف طریقوں سے رات کو جگاتے اور پریشان کرتے ہیں اس کا آپ کو اندازہ ہے۔ کبھی کمبل اُتر گیا ہے کبھی نیند اُچٹ گئی ہے۔ اب کپڑے بدلنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ پھر گھر کی دیکھ بھال، سودا سلف لانا، صفائی کا اہتمام، غرض تمام گھریلو ضروریات کا پورا کرنا یہ بھی اپنی جگہ اس سے بڑا کام ہے جس سے اُن کو آخری دم تک فرصت نہ ملی۔ اس کے ساتھ آپ یونیورسٹی کے بھاری فرائض کا تصور بھی کیجئے۔

جب ہم ذرا بڑے ہوئے تو ماں اور باپ کی حیثیتوں کے علاوہ انہوں نے استاد کی جگہ بھی لے لی اور جس جس مضمون میں ذرا بھی توجہ دی وہ ہمیشہ کے لئے اس مضمون میں تیز ہوگیا۔ سب سے بڑے بھائی کو ریاضی میں چمکایا۔ مجھے عربی پڑھائی۔ سو اب تک میں نے ساتھیوں میں کبھی کسی کو اس میں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ مضامین کے انتخاب میں انہوں نے ہمیں مکمل آزادی دے رکھی تھی، اُن کو اس کا بڑا شوق تھا کہ ہم اُن سے اپنے مضامین میں مدد لیا کریں اور جب کبھی ہم پڑھنے لکھنے سے کتراتے تو بہت ناراض ہوتے۔ برابر محنت پر آمادہ کرتے۔ امتحانوں کے اچھے خاصے نتیجوں پر اُن کو تسلی نہ ہوتی، اور یہ کہتے کہ تمہیں اپنی ہمت سے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا ہے۔ مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ میں تمہاری سفارشیں کرتا پھروں گا۔ میں نے خود اپنے لئے زندگی میں کسی کے سامنے سوال کا ہاتھ نہیں پھیلایا۔ خدا کے لئے مجھے اس ذلت سے بچائے رکھنا۔

شروع شروع میں اُن کو ایک مشکل رہی۔ جب وہ کالج جاتے تو ہماری نگرانی کی طرف سے مطمئن نہ ہوتے۔ چنانچہ موٹر میں سب کو ساتھ لے جاتے۔ ہال کے کمرے کے باہر موٹر کھڑی کر دیتے۔ کھانے کو بسکٹ اور بچوں کی مٹھائیاں وہیں مہیا ہو جاتیں۔ ذرا ذرا دیر بعد کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیتے کہ خیریت ہے۔

ہر شام سب کو سیر کے لئے لے جاتے۔ اُن کو ہر وقت یہ خیال رہتا کہ ہم سب ہر وقت اُن کی آنکھوں کے سامنے رہیں۔ جب ہم میں سے کوئی کسی غرض سے باہر جاتا اور واپسی میں دیر ہو جاتی تو دروازے پر آکر بے چینی سے ٹہلتے رہتے، اور جب وہ آجاتا تو جان میں جان آتی اور کہتے کہ تم کسی روز میری جان لے کر رہو گے۔

[1] ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور۔

(ماں کی وفات کے بعد انہوں نے فضل نوازی) اور رنگینی بالکل چھوڑ دی جس زمانے میں ہم سنٹرل ماڈل سکول میں پڑھتے تھے۔ اباجی موٹر پر ہمیں سکول خود پہنچا کر آیا کرتے تھے موٹر ہمیشہ خود چلاتے۔ اٹھارہ انیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کبھی نہ بڑھتے۔ اُن کے کالج کے اوقات تقریباً گیارہ سے ایک بجے تک ہوتے لیکن محض ہماری خاطر سے نو بجے پہنچ جاتے۔ ابھی کالج میں بھنگی جھاڑو دے رہا ہوتا۔ اسی ویران اور اُداس فضا میں جا کر بیٹھ جاتے۔ پھر ڈیڑھ دو بجے کالج چھٹی کے بعد خالی ہو جاتا۔ تنہائی میں وقت کاٹتے رہتے اور انتظار کرتے کہ چار بجے ہمیں چھٹی ہو تو ہمیں ہمارے سکول سے اور بہن کو اس کے سکول سے لیکر واپس چلیں۔ اُس وقت ایک عجیب ناگوار بات ہوتی ماسٹر صاحبان اکثر چھٹی کی گھنٹی کے بعد چار پانچ منٹ تک سب لڑکوں کو روکے رکھتے، گھر کا کام دیا جاتا۔ اباجی باہر بیٹھے جھنجلاتے اور جب ہم پہنچتے تو ناراض ہوتے کہ میں یہاں کھڑا سوکھتا رہتا ہوں تمہیں میرا کچھ خیال نہیں۔

عام ملنا جلنا انہوں نے بالکل ترک کر دیا تھا۔ لوگوں کی نکتہ چینی کی پروا نہ کی وہم سے کہا کرتے تھے لوگ شام گزارنے کو کلب چلے جاتے ہیں مجھے اس کی کیا ضرورت ہے۔ میرے دوست میرے بچے ہیں۔ ہم سے خوب بے تکلف بھی تھے، مگر ساتھ ہی اپنا رعب کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اُن کو دیکھ کر جہاں محبت کی لہر اٹھتی تھی، اُس کے ساتھ ہی ڈر کی لہر بھی آتی تھی۔

محمد داؤد رہبر

"شاہکار"

علامہ اقبال سے ایک ملاقات

(از بابا عالم سیاہ پوش)

(ملخص)

۱۹۳۵ء میں حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ مبارک سے "فیض عالم" نامی ایک رسالہ نکلا کرتا تھا، جس کی ادارت کے فرائض میں انجام دیتا تھا۔ رسالہ کا دفتر درگاہ مبارک کی چار دیواری کے اندر ایک حجرے میں تھا، ماحول نہایت ایمان افروز تھا۔ اُن دنوں میرے قلب کو جس قدر سکون اور اطمینان نصیب ہوا میں اس کی یاد کبھی نہیں بھول سکتا۔ داتا صاحب کا عرس قریب تھا۔ میاں حسن محمد صاحب سجادہ نشین نے مجھ سے کہا کہ فیض عالم کا عرس نمبر بڑی آب و تاب سے شائع کرنا چاہئے۔ مضامین کے سلسلے میں میاں صاحب صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ ایم۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج اور پروفیسر محمد دین تاثیر ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی سے ملے۔ انہوں نے نہایت بصیرت افروز مضامین عرس نمبر کے لئے مرحمت فرمائے۔ اب ہمیں بلند پایہ نظموں کا اہتمام کرنا تھا باتوں باتوں میں یہ طے پایا کہ علامہ سر ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے درخواست کی جائے۔ دوسرے دن میں، میاں صاحب اور میرے ایک دوست جن کا نام بھی اقبال تھا، جاوید منزل جا پہنچے۔

ہم کوٹھی کے صحن سے گزر کر برآمدے میں آئے، برآمدے کے اندر کا دروازہ علی بخش نے کھولا۔ سامنے ایک چھوٹے سے کمرے میں علامہ صاحب پلنگ پر دراز تھے۔ تدبر، متانت اور ذہانت کا نور اُن کی پیشانی پر برس رہا تھا۔ ہم کمرے میں داخل

ہوئے، میں نے آگے بڑھ کر اُن سے ہاتھ ملایا، اور اُن کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ پلنگ کے سامنے چند کرسیاں رکھی تھیں ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ آپ کسی خانقاہ کے مجاور ہیں۔ میں نے کہا میں اپنی حسرتوں کے مزار کا مجاور ہوا ہوں۔ ایک ہلکا سا تبسم اُن کے ہونٹوں پر نمودار ہوا۔ کمرے کی باوقار فضا میں علامہ کا دلکش تبسم، مزار اور حسرتوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتا ہوا گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ آپ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور مجھ سے ارشاد فرمایا کہ کرسی میرے قریب کھینچ لو۔ میں نے اُنکے مشفقانہ ارشاد کے جلو میں کرسی پلنگ کے قریب کھینچ لی۔ میاں حسن محمد بولے خدا جانے آپ کا دل کونسی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ آپ کے کلام میں بلا کی تاثیر ہے۔ تبسم بدستور اُن کے ہونٹوں پر اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ آپ نے نرم لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ دل مٹی کا نہیں ہوتا۔ میں نے یہ عرض کی کہ یہ دراصل آپ کے قلبی احساسات اور جذبات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ آپ نے مسکراتے ہوئے میری طرف نظریں اُٹھائیں۔ اُن کی آنکھوں میں علم و حکمت، تدبّر و دانش، اسرار و رموز کا بحرِ بے پایاں موجزن تھا، جس کی لامشہود گہرائیوں اور غیر مرئی پہنائیوں کا راز میری سمجھ سے باہر تھا۔ خود بخود میری نگاہیں جھک گئیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کیا آپ فقیر ہیں۔ میں نے عرض کیا نہیں اسیر ہوں۔ فرمایا اسیر ہونا مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔ مسلمان کو جذبات، احساسات اور توہمات کے بُت اسیر نہیں کر سکتے۔ مسلمان اِن قیود سے ہمیشہ آزاد رہتا ہے۔ ہم ایسی فقیری کے قائل ہیں جس کی ٹھوکروں میں تاجِ شاہی پڑا ہو۔ بوریا اُس وقت بچھانا چاہیے جب مسندِ شاہی قدم بوسی کر رہی ہو۔ زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ زندگی ایک ایسی کتاب ہے جس کے پہلے اور آخری اوراق کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ کتابِ زندگی کا جو ورق تمہارے سامنے ہے اسے پڑھنے کی کوشش کرو۔ وہ اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں ہمارے سامنے زندگی کی نقاب کشائی کر رہے تھے، زندگی کی تصویر کھینچ رہے تھے اور ہم دم بخود حیرت میں ڈوبے ہوئے زندگی کی صحیح تصویر کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

پلنگ کے سرہانے کی طرف ایک چھوٹی سی الماری رکھی تھی جس میں چند کتابیں تھیں۔ آپ نے انگلی کے اشارے سے مجھے ایک کتاب اُٹھانے کا حکم دیا، میں نے کتاب اُٹھائی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ زبورِ عجم تھی، ضربِ کلیم یا جاوید نامہ بہرحال وہ اُن کے فارسی کلام کی ایک کتاب تھی۔ مجھے ۱۱۳ یا ۱۱۴ نمبر صفحہ پر چھپے ہوئے اشعار پڑھنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ میں نے پہلا شعر پڑھا۔ اُس کی شرح علامہ صاحب نے جس انداز میں بیان فرمائی میں اُسے آخری دم تک نہیں بھول سکتا۔ فرمایا، اے رنگ و بُو پریدہ پھول تو اپنی کھوئی ہوئی رنگت اور اُجڑی ہوئی خوشبو کو آزاد فضاؤں میں نہ ڈھونڈ بلکہ پھر اسی شاخ کی جانب متوجہ ہو جا، جہاں سے تو نے پہلے اس رنگ و بُو کو حاصل کیا تھا (اے اُمتِ محمدیہ) یہ لفظ کہنے کے ساتھ ہی اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا اور آپ کی آواز گلوگیر ہو گئی، فرمایا۔ اے اُمتِ محمدیہ تو اپنے مٹے ہوئے وقار اور لٹی ہوئی عظمت کو تاریخ کے اوراق میں نہ ڈھونڈ بلکہ پھر سے اسی مظہرِ صفاتِ کملی والے کی جانب متوجہ ہو جا جہاں سے کہ تو نے پہلے اس وقار اور عظمت کو حاصل کیا تھا۔ کئی منٹ آپ شعر کی شرح فرماتے رہے اور روتے رہے۔ مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ میرے جسم کے تمام اجزا حیرت انگیز طور پر بیقرار رہتے ہیں

زار و قطار رو رہا تھا اور اُن کی چارپائی کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ علی بخش پھر نمودار ہوا اسے علامہ صاحب سے بہت محبت تھی۔ بیچارہ یہ سوچ کر آیا ہوگا کہ ڈاکٹر نے تو انہیں باتیں کرنے سے منع کر رکھا ہے اور یہ لوگ خدا جانے ان کے پاس کیا کہانیاں لے کر آ بیٹھے ہیں وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ علامہ صاحب نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور باہر جانے کا اشارہ کر دیا علی بخش چپ چاپ باہر چلا گیا۔ چند منٹ ہم سب گہری خاموشی میں ڈوبے رہے میں نے آہستہ سے کہا کہ یہ لڑکا جو میرے ساتھ ہے بہت اچھا گاتا ہے اگر آپ ارشاد فرمائیں تو کچھ:...... فرمایا ہاں سناؤ مگر آہستہ آہستہ چھوٹی آواز کے ساتھ میرے دوست نے ایک فارسی غزل کا یہ مطلع گایا:۔

ترسم کہ تو سے طلبی آبلے بر سر آب اندر
آں راز مکاشف را جویاں بر کتاب اندر

آپ نے اشارے سے گانا بند کرا دیا اور پوچھا یہ کس کا شعر ہے؟ میرے دوست نے بتایا کہ یہ ایک بی اے شاعر کا کلام ہے۔ آپ نے فرمایا۔ بی اے انسانیت اور شاعری کے لئے کوئی سند نہیں۔ نہایت فضول شعر ہے۔ اِس غزل کو یہیں ختم کر دو۔ اور کوئی دوسری چیز سناؤ۔ میں نے اپنے دوست کو ایک پرانا ہندی گیت گانے کی فرمائش کی۔ صبح نو دس بجے کا وقت تھا اُس نے اساوری میں جب یہ گیت گایا:۔

"آ پیتم گل لاگ اساڈے"

تو علامہ صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ گائے جا رہا تھا۔

تو رے ملن کو میں تیاں باوری
لگ رہیاں انکھیاں نس دن جاگے
آ پیتم گل لاگ اساڈے

اور وہ روئے جا رہے تھے۔ بہت دیر تک وہ روتے رہے۔

پھر میاں صاحب نے علامہ سے کہا کہ اگر آپ درگاہ داتا صاحب میں ہر روز آیا کریں اور داتا صاحب کے سرہانے کی طرف جو چھوٹا سا حوض ہے اس میں سے پانی پیا کریں تو انشاء اللہ گلے کی تکلیف بغیر کسی دوائی کے دُور ہو جائے گی۔ علامہ صاحب نے فرمایا کہ میں تو یہاں بھی اُنہیں کے حضور میں رہتا ہوں۔ میاں صاحب نے رسالہ "فیض عالم" کے لئے نظم طلب کی آپ نے فرمایا میں نے داتا صاحب کے لئے بہت پہلے ایک نظم لکھی تھی اور اب خرابیٔ صحت کے باعث مزید نظم لکھنے سے معذور ہوں۔ میں نے اجازت طلب کی اور عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو میں کبھی کبھی نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا کروں۔ فرمایا ہاں آپ جب چاہیں آسکتے ہیں۔

"فردوس"

مولانا راشد الخیری

(شام زندگی کی تصنیف)

(مقتبس)

شیخ عبدالقادر صاحب (جو اب سر عبدالقادر ہیں) بیرسٹری پاس کر کے تشریف لائے تو اُنہوں نے دلّی میں پریکٹس شروع کی۔ اُن کے ساتھ اُن کا مشہور و معروف رسالہ "مخزن" بھی لاہور سے دلّی آ گیا۔ سر عبدالقادر کا دفتر وکالت کشمیری دروازہ، کچہری کے قریب تھا۔ اور "مخزن" کا دفتر کوچہ چیلان میں: میرے مکان کے پاس۔ مولانا راشد الخیری بھی کوچہ چیلان

سے بالکل ملا ہوا ایک محلہ ہے کلاں محل، وہاں رہتے تھے۔ مولانا کی کتاب "مصالحات" شائع ہو چکی تھی، مولانا کے مضامین "مخزن" میں نکلتے تھے لیکن "مخزن" کے دلی پہنچنے تک میں مولانا سے واقف نہ تھا۔ میں تو خیر کیا واقف ہوتا۔ میری عمر اور میری بساط ہی اس وقت کیا تھی۔ بڑے بڑے دلی والے نہیں جانتے تھے کہ کلاں محل کی گلیوں میں یہ جو شخص چلتا پھرتا ہے وہ کیا چیز ہے! اور شاید مولانا تک کو خبر نہ تھی کہ اُن کے اندر کیسے کیسے جواہر پوشیدہ ہیں۔ علم و ادب کے جوہری سر عبدالقادر کی مولانا پر نظر پڑی۔ اور سر عبدالقادر نے انہیں گوشۂ گمنامی سے شہرت کے میدان میں لا کھڑا کیا۔

مولانا کی دو کتابیں "منازل السائرہ" اور "صبح زندگی" مخزن کے دَور میں شائع ہوئیں۔ مخزن میں بے شمار مضمون نکلے۔ یہاں تک کہ سرکاری نوکری چھوڑ کر مخزن کی ایڈیٹری اختیار کر لی اور مخزن کے ساتھ ساتھ شیخ محمد اکرام مرحوم نے اور مولانا نے مل کر زنانہ رسالہ "عصمت" جاری کیا۔ مگر مخزن اور مخزن کے مالک سر عبدالقادر کے دوبارہ لاہور جا بسانے سے مولانا کو ٹھونکنے والا کوئی نہیں رہا اور مولانا نے کئی سال تک کتاب لکھنے کی طرف توجہ نہ فرمائی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا اور میں نے مولانا سے عرض کیا کہ زاہدہ خاتون کے لئے صبح زندگی کا دوسرا حصہ شام زندگی لکھ دیجئے۔ زاہدہ خاتون میری بڑی لڑکی کا نام ہے، اُس وقت اُس کی عمر دو ڈھائی سال کی تھی۔ مولانا میرے قابو میں تو کیا آتے، البتہ لڑکی کا نام سن کر متأثر ہو گئے۔ لیکن حسب عادت مہینوں ٹالا کئے اور اُڑان گھائیاں دیا کئے۔ آخر ناروں صاحب نے اور میں نے یہ سازش کی کہ مکان کی ایک کوٹھڑی میں ایک میز ایک کرسی اور ایک آرام کرسی اور لکھنے کی سب چیزیں رکھ دیں اور مولانا تشریف لائے تو انہیں وہاں بٹھا کر باہر سے کُنڈی لگا دی۔ اور کہہ دیا کہ لکھئے یا نہ لکھئے، دو گھنٹے کوٹھڑی میں بند رہنا پڑے گا۔ کوٹھڑی کا صرف ایک روشندان کھلا تھا، گرمی کا موسم، پنکھا مفقود، دو گھنٹے بعد مولانا برآمد ہوئے۔ پسینے میں ڈوبے ہوئے مگر بہت شگفتہ، ہم نے کہا: "سنائیے کیا لکھا ہے؟" مولانا نے پہلے روز زاہدہ خاتون سے خطاب کیا تھا کہ یہ کتاب میں تیرے لئے لکھ رہا ہوں، تجھے اس سے کام لینا نصیب ہو۔ تو اس سے یہ فائدہ اُٹھائے، تو اس سے وہ فائدہ اُٹھائے۔ "شام زندگی" ساری اسی طرح لکھی گئی کہ مولانا کوٹھڑی میں بند کر دیئے جاتے اور دو گھنٹے کے بعد مسکراتے ہوئے نکلتے اور لکھا ہوا سناتے اور ہمیں اپنا دیوانہ بنا لیتے "شام زندگی" بائیس دن میں ختم ہوئی تھی۔ بائیس دن میں یا چوالیس گھنٹے میں۔

محمد واحدی

اکبر الٰہ آبادی کی نثر

(ملخص)

لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی کی نظم، فرط شہرت سے نہ کسی تعریف کی محتاج ہے اور نہ تعارف کی۔ لیکن اُن کی نثر کے جوہر اب بھی اُن کے بہت سے قدر دانوں، اور ادب اُردو کے طالب علموں پر نہیں کھلے۔ اس مضمون میں کوشش کی جائیگی کہ اُن کے دُرہائے منثور، نگاہِ خلق کے سامنے لائے جائیں۔ حضرت اکبر نے اُردو نثر میں کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ صرف ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ "مستقبل اسلام" کے نام سے کیا تھا۔

پر شاید اب مشکل ہی سے دستیاب ہو سکے۔ اس کے علاوہ اُن کے مکاتیب کے چار مجموعے۔ اور سب اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔

آیئے سب سے پہلے مجموعۂ خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی صاحب کا جائزہ لیں۔ یہ خطوط ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک حضرت اکبر کے انتقال سے چند روز قبل تک کی مدت پر حاوی ہیں۔ ایک خط بغیر کسی القاب و آداب اور مکتوب نگار کے نام کے ہے۔ اور اس میں صرف ایک شعر پر اکتفا کی ہے۔ آیئے ہم بھی اسی سے ابتدا کریں ؎

قدم انگریز کلکتے سے دہلی میں جو دھرتے ہیں
تجارت خوب کی، اب دیکھیں شاہی کیسی کرتے ہیں

یہ شعر حضرت اکبر نے اس وقت فرمایا ہے جبکہ انگریزوں نے دارالحکومت کلکتے کی بجائے دہلی کو مقرر کیا تھا۔

تیسرے خط میں حضرت اقبال کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں اور اپنے اصل رنگ میں محو ہو کر فرماتے ہیں :-

"حضرت اقبال کی مشغولی فی الطاعت سے نہایت خوشی ہوئی۔ اس سے دل لگ جائے تو سلطنت ہیچ ہے"

اِس خط میں یہ بھی مرقوم ہے کہ اخبار "زمیندار" لاہور نے پیپر نمبر نکالا اور حضرت اکبر سے اس کے لئے اشعار آبدار کا سرگرم تقاضا کیا۔ اِس تقاضے پر جز بز ہو کر حضرت اکبر لکھتے ہیں :-

"زمیندار صاحب نے مجھ کو بھی ایک اسامی سمجھ رکھا ہے تار پر تار آتے کہ پیپر نمبر کے لئے کچھ بھیجئے۔ اوّل تو پیپر پر تعجب کیا۔ لیکن اسی خیال سے چپ ہو رہا ؎

کیا تعجب ہے جو نکلا ہے پیپر نمبر[عہ]

اچھا نہ تھا۔ طبیعت حاضر نہ تھی۔ بالآخر چار مصرعے لکھ بھیجے ؎

مہر و مہ خوش ہیں، روز خوش، شب خوش
وحشیٔ دشت خوش، مہذب خوش
ہیں غرض آپ کی ولادت سے
مسٹر ابلیس کے سوا سب خوش"

اِس مکتوب سے خود حضرت اکبر کی زبان سے یہ انکشاف ہُوا کہ اُن کو لسان العصر کا خطاب میر غلام بھیک صاحب نیرنگ نے دیا تھا۔ زندہ دلانِ پنجاب کے ایک فرو نے ملک کے سب سے بڑے زندہ دل شاعر کو ایک ایسا حسبِ حال خطاب دیا، جو اس وقت بھی قائم ہے اور جب تک اُردو زندہ اور قائم ہے برابر قائم اور زبان پر چڑھا رہے گا۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی پر اُس دور میں (یعنی فروری ۱۹۱۶ء کا ہے) فلسفیت کا غلبہ تھا۔ اور اُن کے خلاف دکن کے بعض اخبارات نے فتاویٰ شائع کئے تھے، حضرت اکبر اُن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"ماجد میاں کے باب میں آپ کے خیال سے مجھ کو اتفاق ہے۔ ماجد کے اس کہنے پر کہ میں خدا کو نہیں جانتا، اتنا غصہ نہیں آتا جتنا غیر ماجد کے اس کہنے پر غصہ آتا ہے کہ میں آپ سے زیادہ خدا کو جانتا ہوں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ میں خدا کو جانتا ہوں لیکن مانتا نہیں

اُدھر بھولا پن ہے، اِدھر خیرہ سری"

ایک خط میں یہ شعر قابلِ ملاحظہ ہے ؎

اجل آپہنچی قبل اسکے کہ سمجھیں راز ہستی کا بکار آموز تھے، اور نہیں سمجھے بنے کیوں تھے

عہ انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر قبر

ایک جگہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ محاورہ کی تبدیلی کا مشورہ کس دلچسپ انداز میں دیا ہے :۔

"پا بہ رکاب ہوں، کیا پیارا محاورہ ہے، ابھی گھوڑے پر سوار ہوں گے، باگ، اپنے ہاتھ میں ہوگی لیکن اب تو شاید ٹکٹ بدست ہوں، زیادہ صحیح ہو۔"

۱۹۱۵ء میں حضرت اکبر کی اُن نظموں پر جو اُنھوں نے بیجا آزادیٔ نسواں اور اُن کی بے حجابی پر کہی تھیں۔ لاہور کے نسوانی رسالہ "تہذیب نسواں" نے طوفانِ مخالفت اُٹھایا۔ آپ نے اس سلسلہ میں خواجہ صاحب کے نام خط لکھ کے اپنی پوزیشن واضح کی اور اپنی حمیتِ دین کا ثبوت دیا :۔

"اِس میں کیا رسوائی ہے کہ سورۂ والنور پر سختی سے عمل کرنے کا طالب ہوں۔"

ایک دوسرے خط میں :۔

"میری نظموں نے پردے کے جذبات نہیں قائم کئے۔ بلکہ قوم میں پردے کے جذبات سے میری نظمیں پیدا ہوئیں۔ قرآن اُن کا مؤید، تجربہ اُن کا سفارشی، پردہ کہاں جاتا ہے اور میری نظموں کو کون مٹا سکتا ہے ؎

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

۱۹۲۰ء میں جب ترکِ موالات (نان کوآپریشن) کی تحریک گاندھی جی کی رہنمائی میں شباب پر تھی۔ حضرت اکبر سے بھی ترکِ خطاب کے بارے میں اصرار کیا گیا۔ اکبر صاحب خالص مذہبی شخص رہے۔ اصرار کرنے پر یوں خطاب فرمایا :۔

"واپسیٔ خطاب پر اصرار کے فوائد ہنوز آشکارا نہیں ہوئے۔ جہاد یا صبر و یکسوئی کا بیان تو کتابوں میں ہے

لیکن ہتیا چڑھانے اور جیو دینے کے مصالح کہیں نہیں بیان کئے گئے ہیں۔ اِسی لئے غیر مسلم لیڈر کی ضرورت ہے۔"

آئیے اب مکاتیب کے دوسرے مجموعہ پر جو مرزا سلطان احمد (قادیان) کے نام ہے ایک نگاہ ڈالیں۔ اِس میں دسمبر ۱۹۰۵ء سے جنوری ۱۹۲۱ء تک کے خطوط ہیں۔

ایک بار مرزا صاحب نے حضرت اکبر کے نام کے ساتھ لفظ "مولانا" لکھ دیا۔ حضرت نے اِس پر تحریر فرمایا :۔

"آپ نے حسنِ ظن سے میرا بڑا اکرام کیا اور میرے نام کے ساتھ مولانا لکھا۔ اِس عہد میں تو یہ الفاظ مولوی یا مولانا بہت سستے ہیں لیکن میں اپنے کو ان کا مستحق نہیں سمجھتا۔ بہرکیف جو مرضی آپ کی ہو..... جو دو شخص آپس میں صرف خدا کے لئے محبت رکھتے ہیں، وہ درحقیقت عبادت کرتے ہیں۔"

حضرت اقبال کی جب مثنوی اسرارِ خودی پہلے پہل شائع ہوئی تو اس میں حافظ شیرازی کا تذکرہ کچھ ایسے پیرائے میں تھا کہ حضرت اکبر کو خاصا ناگوار گزرا۔ اس زمانہ میں تصوّف کے بارے میں بھی اقبال اور اکبر کے خیالات میں نمایاں فرق تھا۔ مکاتیب میں اس ناگواریٔ طبع کی جھلک جابجا ملتی ہے۔ لیکن اِس کے باوجود اقبال کے کمالِ فن اور بلندیٔ طبع کے حضرت پوری طرح مدّاح اور معترف تھے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :۔

"حضرت اقبال نے کیا بلند اور روشن طبیعت پائی ہے، اور کیا طرز ادا ہے، کیا بلاغت ہے، مغربی لٹریچر کی تکمیل، اُس پر یہ رنگِ طبیعت کہ بیدل کا یہ مصرع اُن کا ہمعصر ہو، تذکرہ ہنگامۂ ایجاد من سینہ

یں کبھی نہیں بھولتا "

ایک اور خط میں حضرت اقبال سے اپنی ملاقات کا جو ۱۹۱۴ء میں بمقام الہ آباد ہوئی تھی، ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"ڈاکٹر اقبال صاحب بلحاظ جملہ حالات کے اس حلقہ میں آیاتِ الٰہی میں سے ہیں "

تبرکاتِ "مخزن"

طالب علی خان عیشی

(منقول از "مخزن" جنوری ۱۹۰۲ء)

شعرائے دورِ چہارم میں سے جو فیضِ سخن مصحفی سے جاری ہوا اُس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی اور کیوں نہ ہو کمالِ سخندانی و کہنہ مشقی نے انہیں اس مرتبہ پر پہنچا دیا تھا کہ ہر طالبِ کمالِ شاعری اُن سے مستفید ہونے کو اپنا فخر سمجھتا تھا۔ خواجہ حیدر علی آتش و مظفر علی خاں اسیر کے اسمائے مبارک سے کون واقف نہیں یہ حضرات انہیں کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ کرامت علی خان شہیدی و منور علی خاں فاتل کے کلام نے بھی شہرتِ عام حاصل کی ہے۔

اِن مشاہیر شعرا کے علاوہ شاگردانِ مصحفی میں اور بھی چند لوگ ایسے گزر گئے ہیں جن کا کلام شائع نہیں ہوا اور اس لئے اُنہوں نے زیادہ شہرت نہ پائی۔ لیکن یہ گمنامی اُن کے نقصِ سخن کے باعث سے نہیں ہے بلکہ اتفاقاتِ عجیب کا نتیجہ ہے۔

میر حیدر علی گرم، نور الاسلام منتظر، محمد عیسیٰ تنہا، طالب علی خاں عیشی انہیں لوگوں میں سے ہیں۔

اِس مرقع پر میں عیشی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

طالب علی خاں نام اور عیشی تخلص تھا ریختہ میں مصحفی اور فارسی میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے باوجود سکونتِ لکھنؤ شاگردیِ مصحفی نے حضرتِ عیشی کو بلائے خشک کلامی سے بچا لیا ہے۔ اور جا بجا اُن کے کلام میں زبانِ میر و مصحفی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں :-

نالہ سو بے اثر ہے دعا ہے سو نا قبول
کیا جانیے آ گیا تھا وہ نامہرباں کہاں

جہاں میں خفتگانِ خاک کی کیا خوب گزری ہے
نہ فرقِ بادشاہی ہے نہ تمیزِ گدائی ہے

اساتذۂ دہلی خصوصاً خاندانِ غالب و مومن میں فارسی ترکیبوں کا استعمال اکثر ہے اور بڑی خوبی سے ہے اور علاوہ اس کے کہیں کہیں بجائے اصل فارسی ترکیبوں کے اُن کے ترجمے اُردو میں اس دلآویزی کے ساتھ کئے گئے ہیں کہ قدر دانانِ سخن ہی کا دل جانتا ہے اور یہ بات شعرائے لکھنؤ میں بہت کم پائی جاتی ہے لیکن عیشی کا کلام اِس قسم کی خوبہائے لطیف سے لبریز نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں سہ

ہوا سرمایۂ صد الاماں ناسُور سینے کا   بنا صبحِ قیامت مرہم کافور سینے کا

کبھی صیاد چھیڑے ہاتھ گاہے باغباں ڈالے
چمن میں کیا سمجھ کر کوئی طرحِ آشیاں ڈالے

شور افگندن کا ترجمہ کرتے ہیں :-

نہ چھیڑ اے باغباں گُل کو مبادا آہ و نالے سے
چمن میں شورِ محشر بلبلِ آتش زباں ڈالے

بجوہم ناتوانی کم نہیں تسخیرِ عیشی کو
کوئی کیوں پاؤں میں ایسے کے زنجیرِ گراں ڈالے

اُسے آتے جو دیکھا بلبلوں نے سیرِ گلشن کو
کئے شکر کے سجدے بچھا کر گُل کے دامن کو

جنوں نے پائے وحشت آشنا باہر نکالے ہیں

مرے دامن سے ٹانکو حصۂ محشر کے دامن کو

پاسئے وحشت آشنا کی ترکیب ملاحظہ ہو:۔

گریباں گیر گردوں ہے غبارِ راہ محسہ بوری
کسی کی خاک سے جھٹکا کسی ظالم نے دامن کو
نقابِ یار جب خلوت سرائے ناز میں اُٹھا
بنایا عکسِ رُخ نے برگِ گُل ذرّاتِ روزن کو
نہ دیکھا نازنینانِ چمن کا سانحہ عیشی
جہاں سے اُٹھ گیا میں چھوڑ کر آبادِ گلشن کو

یہ اشعار خوبیٔ ترکیب میں اپنا آپ ہی جواب ہیں۔

خوبیٔ شعر میں نزاکتِ مضمون و لطافتِ الفاظ کو بہت بڑا دخل ہے اور استاذ کامل کے کلام میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ وہ جس قسم کا مضمون ادا کرتے ہیں اُسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مرزا اصغر علی خاں نسیم کی ایک غزل ہے دامن تک۔ گلشن تک۔ اُس میں اپنے آپ کو بلبلِ پابند قرار دے کر شکوۂ محرومی یوں کرتے ہیں۔

چمن میں فصلِ گُل آئی ہے میں کنجِ قفس میں ہوں
مبارک باد مجھ کو ڈھونڈ جاتی ہے نشیمن تک

روز ابر میں انتہائے شوقِ مے نوشی کو یوں ظاہر کرتے ہیں۔

برستا ہے جو ابرِ تر تمنّا ئیں ٹپکتی ہیں
ڈبو دے آبِ مے میں آج ساقی مجھ کو گردن تک

شوقِ مے کے متعلق نسیم کے الفاظ رنگین و لطیف نے کس قیامت کی بے ساختگی و رسیدگی پیدا کر دی ہے۔ خصوصاً مصرعِ ثانی سے جو بات نکلتی ہے اُس کی کیفیت بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

ہاں تو غرض یہ ہے کہ عیشی کے کلام میں بھی یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں اور اکثر پائی جاتی ہیں۔ اپنے جوشِ وحشت میں کہتے ہیں۔

یہی وحشت ہے تو اک دن لگا کر آگ گلشن میں
پڑے رہنے لگے لپیٹے منہ کسی صحرا کے دامن میں

دامنِ صحرا کی ترکیب کو کیا خوب نباہا ہے۔

کہتے ہیں ؎

جلایا زمزمہ سنے اُس کے دل ہم دردمندوں
لگا دے آتشِ گُل کوئی بلبل کے نشیمن میں

بددعا بھی دی ہے تو کس مزے کی۔

جوشِ بہار کی جنوں انگیزیوں کی یوں تصویر کھینچتے ہیں:۔

کون پابندِ جنوں فصلِ بہاراں میں نہ تھا
اس برس تنگ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا

نازک مزاجیٔ محبوب کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

فرشِ گُل پر گر قدم رکھتا ہے وہ نازک مزاج
پاؤں اپنے پونچھتا ہے چادرِ مہتاب سے

اور کہتے ہیں:۔

ہستی کا جو ابن مجھے مختار بناتے
سو بار مٹا تا ئیں جو سو بار بناتے
نے کبھی رونے نہ ٹپکا سر کو گا ہے سنگ پر
مفت اپنا خوں ہوا جرمِ شکستِ سنگ پر
میں نے عیشی سے جو پوچھا دلِ پُر خون کا حال
اک صراحی سے گلگوں کی بھری دکھلائی

اس قسم کے صدہا اشعار ہیں جن کے اسبابِ دلپذیری محتاجِ بیان نہیں ہیں۔ (اقتباس)

سید فضل الحسن حسرت موہانی

ایڈیٹر کے نام

پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی

"مخزن" کا تیسرا دورِ حیات شروع ہونے پر مسرت ہوئی۔ محترمی شیخ صاحب کا یہ حسنِ ظن ہے کہ موصوف نے مجھے بھی "مخزن" کے متوقع معاونین میں شمار فرمایا۔ اس میں شک نہیں کہ احباب کی یہ تازہ کوشش اُردو کی حیاتِ تازہ کا پیغام ہے۔ دعا ہے کہ یہ مشکور کوشش ہمیشہ بارور اور کامیاب ثابت ہو۔ ایک غزل برائے اشاعت ارسال کر رہا ہوں۔ خدا کرے کہ آپ کو پسند آئے۔ زیادہ اظہارِ خلوص۔

جالندھر۔ ۲۲ر جنوری

جناب مسعود اشعر صاحب

نئے مخزن کو دیکھ کر "مخزن" کی وہ شان جو اس کے پہلے پرچوں میں دیکھی تھی پھر نظر کے سامنے آ گئی۔ کیونکہ پرانے پرچوں کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی زمانے میں یہ اپنی طرز کا واحد رسالہ نکلا کرتا تھا۔ اب اس کے سہ بارہ اجرا پر خوش ہونا قدرتی بات تھی؟۔ کیونکہ اس وقت جتنی سخت ضرورت "مخزن" کی ہے شاید پہلے نہ ہو گی؟۔ اُردو کے لئے مخزن پہلے بھی ایک معلّم کی حیثیت رکھتا تھا اور اب بھی پہلا ہی پرچہ ہر حیثیت سے اچھا ہے!

ہندوستان کے بہت سے لوگ بڑی تیزی سے اُردو کے تنزل کے درپے ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ ایک دم ہزاروں سال پیچھے لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ عام طور سے ہندوستان میں اُردو سے وہ سلوک کیا جا رہا ہے کہ خدا دشمن سے بھی ایسا معاملہ نہ کرائے؟ ——— رام پور ایک ایسی جگہ ہے جہاں کا بچہ بچہ صاف اور شستہ اُردو بولتا ہے (ہندو اور مسلمان دونوں)۔ مگر اب وہ لوگ بھی جو اچھی طرح "اُردو" بولتے اور پڑھتے تھے اپنے آپ کو اُردو سے لاعلم ظاہر کرتے ہیں جیسے وہ کبھی "اُردو" جانتے ہی نہ تھے۔

اور اب تو "سیاسی معاملات" بھی کچھ ایسے آ پڑے ہیں کہ اُردو کا نام لیتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں اُردو والے بھی اسے "ہندستانی" کہتے ہیں اور پھر ٹھیک ہی ہے۔ وقت ہی کچھ ایسا آ پڑا ہے کہ اگر ذرا بھی اُردو کا نام لیا جائے تو چاروں طرف سے اینٹ پتھر کی بارش ہو جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اب تو اُردو والے بھی کہتے ہیں کہ "ہندستان کی قومی زبان ہندستانی ہی ہو سکتی ہے" حالانکہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر نہیں۔ وہ کہتے ہیں اور ایسے یقین کے ساتھ کہتے ہیں جیسے اُن کے باپ دادا یہی کہتے چلے آ رہے ہوں۔ اس چیز کو دیکھ کر مجھ پر نا امیدی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ ایسی حالت میں اُردو باقی رہ سکتی ہے؟ جہاں تک "ہندستانی" کا معاملہ ہے؟۔ تو میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ ہندستانی کیا ہے؟ کیونکہ جب سید سلیمان صاحب "ہندستانی" کا ذکر کرتے ہیں تو غالباً وہ اس سے مراد وہ زبان لیتے ہیں جو وہ "معارف" میں لکھتے لکھواتے ہیں۔ اور جب پنڈت سندر لال "ہندستانی" کا نعرہ لگاتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس سے مراد "نئے ہندستان" کی زبان لیتے ہیں، جس میں سنسکرت کی بھرمار ہوتی ہے! غرض عجیب گڑبڑ ہے۔ اُردو والے "بیچارے" صرف اس لئے "ہندستانی" سے خوش ہیں کہ شاید اسی کی وجہ سے اُردو باقی رہ جائے۔ مگر یہ خیال خام ہے۔ کیونکہ جب عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کی بجائے "ہندستانی" ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی تو وہی اخبار جو "ہندستانی" کی مالا جپ رہے تھے ایک دم چیخ

اُٹھے:" ہے ہے یہ کیا غضب ہوا ؟" وہ سمجھتے تھے کہ وہاں آل انڈیا ریڈیو والی "ہندستانی" ٹھونس دی جائے گی جس کے متعلق خود ہندو اخباروں نے لکھا تھا کہ "آل انڈیا ریڈیو سے ایسی زبان میں پروگرام نشر ہوتے ہیں جسے لوگ نہیں سمجھتے اور پاکستان کا ریڈیو سُننے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔" یہ معاملات تو ہندستان میں اُردو کو باقی چھوڑتے ہیں نہ ہندستانی کو ؟ ۔

"محترم ! کیا کیا لکھوں ؟ ۔ کہاں تک روؤں ؟ ۔ اِن حالات کو دیکھ کر تو نیاز صاحب فتحپوری کی تائید کرنا پڑتی ہے ۔ مگر پھر وہ بھی ایک ناقابلِ معافی جرم ہے ؟ ۔ جن لوگوں کے دل میں لگن ہے وہ برابر اُردو کے لئے کوششیں کر رہے ہیں اور یونہی کرتے رہیں گے ۔

رام پور ۔ ۲۸ر جنوری

حضرت اثر صہبائی

رسالے کی ترتیب کے متعلق آپ نے حسبِ معمول حُسنِ ذوق کا ثبوت دیا ہے ۔ آپ کے عہدِ ادارت میں "ہمایوں" اپنی انتہائی بلندیوں پر تھا ۔ مجھے اُمید ہے کہ "مخزن" بھی انشاء اللہ آپ کے ہاتھوں میں بہت ترقی کرے گا ۔ مستقل مضامین کے نیچے جو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آپ نے شائع فرمائے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ رسالے کی ترتیب میں محنت سے کام لیتے ہیں ۔ یہ "محنت" بڑی چیز ہے جو ہر مدیر کے حصے میں نہیں آتی ۔ حالیؔ مغفور اور سرسیدؒ کے تبرکات نوادرِ ادب کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ غالب کے متعلق حمید صاحب کا مضمون نہایت خیال انگیز ہے ۔ عسکری صاحب کا مضمون بھی اچھا ہے ۔ جیمس جائس پر ایک مضمون انہوں نے ساقی میں لکھا تھا وہ مجھے بہت پسند آیا تھا ۔ میرے خیال میں غیر ملکی شعراء کے متعلق اِس قسم کے مضامین کا سلسلہ اُردو شعراء اور اُدباء کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے ۔

"مخزن" میں قدیم و جدید ادب پہلو بہ پہلو ہے ۔ مجھے امید ہے کہ آپ اُردو ادب کے جدید رجحانات کی قدر کریں گے اور "خُذ ما صفا ودع ما کدر" کے زریں اصول پر کاربند رہیں گے ۔

سیالکوٹ ۔ ۲۹ر جنوری

جناب محمد صادق صاحب

دوبارہ ادبی زندگی اختیار کرنے پر ہدیۂ تبریک اور ترقی و شادکامی کی آرزوئیں پیش کرتا ہوں ۔ خدا کرے کہ "مخزن" میں آپ کی ادارت کی عمر آپ کی ادارتِ "ہمایوں" سے بھی طویل بنے ۔

بنگلہ نہر جہانیاں (ضلع ملتان) ۹ر جنوری

جناب عبداللطیف صاحب شمیم مدیر "تعمیرِ نَو"

"مخزن" کے اجرا پر مبارکباد قبول فرمائیے ۔ مخزن کی گذشتہ روایات اور خود آپ کی علمی و ادبی زندگی اس امر کا یقین دلا رہی ہے کہ آپ موجودہ تخریبی ادب کی روک تھام کے لئے کامیاب کوششیں عمل میں لائیں گے ۔ یہ ادب خاکم بدہن پاکستان اور ملتِ اسلامیہ کی تخریب چاہتا ہے ۔ دراصل اس میں غیر ملکی سیاست کام کر رہی ہے ۔ چونکہ دنیا کی عام اقتصادی حالت خراب ہو چکی ہے اس لئے روٹی اور مفلسی کو سامنے لا کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرنا بدباطن لوگوں کو آسان معلوم ہوتا ہے ۔ لطف یہ ہے کہ ایسا تخریبی ادب پیدا کرنے والے خود عموماً خوشحال اور کھاتے پیتے لوگ ہیں اس لئے وہ اخلاص اور دیانت سے اقتصادی مسائل پر غور نہیں کرتے ، وہ محض پیٹ کا نعرہ لگا کر اپنی ادبی شہرت اور تصنیفات کو فروخت کرنے کا سامان کر لیتے ہیں ۔ اور اِس طرح عوام کو دھوکا دینا چاہتے ہیں ۔ "مخزن" اصلاحِ حال کے لئے اِس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتا ہے ۔

پشاور ۔ ۲۴ر جنوری

[illegible] "مخزن" [illegible] لاہور سے شائع کیا

جلد ۱ — نمبر ۴

مخزن

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور۔ اپریل سنہ ۱۹۴۹ء

سلسلۂ مطبوعاتِ نوائے وقت

سالانہ	سات روپے
ششماہی	چار روپے
ایک پرچہ	دس آنے

The Makhzan, Lahore.

مدیر،	صفحۂ اوّل،
مدیر اعزازی،	طلوعِ اقبال، ۳
علامہ اقبال،	عبدالقادر کے نام، ۶
آنریبل پنڈت جواہر لال نہرو،	قومی زبان کا مسئلہ، ۷
ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم،	عہدِ نو، ۱۱
نذیر مومن،	اقبال کی شاعری کا نفسیاتی پس منظر، ۱۲
تابش دہلوی،	خلدِ ارضی، ۱۷
طالوت،	زبان دانی، ۱۸
حکیم خورشید حسن خورشید سہارنپوری،	کشمیر، ۲۶
جلیل حسن جلیل،	دعوتِ کشمیر، ۲۷
مظفر علی سید،	کلاسیکی ادب اور ہم، ۲۹
جگن ناتھ آزاد،	بہارِ آزادی، ۳۶
صادق قریشی،	جلال پور کا چودھری، ۳۷
حقیقت نورانی،	ہندوستان اور اُردو، ۴۴
حسن طاہر،	شاعر، ۴۴
انور جلال،	ایک جینیس کی ڈائری، ۴۵
امین الرحمٰن،	اے بہار تو ایک خطا ہے...، ۵۳
اثر صہبائی،	کتنی حسیں ہے کائنات، ۵۴
اختر جہاں فیروز الدین،	بہار ایک رنگین قہقہہ، ۵۵
مدیر،	منشورات، ۵۶
مدیر،	مخزن المخازن، ۵۷
قارئین،	ایڈیٹر کے نام، ۷۰
معاصرین،	مخزن معاصرین کی نظر میں، ۷۱

صفحۂ اوّل

مخزن کی موجودہ اشاعت کو ہم اقبال نمبر تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس میں اقبال کے متعلق بہت سے مضامین اور نظمیں اور انتخابات ضرور جمع ہو گئے ہیں۔ یہ محض حُسنِ اتفاق نہیں اس سے مقصود احترامِ یومِ اقبال ہے۔ (۲۱ اپریل)

حضرت مدیر اعزازی کا مضمون طلوعِ اقبال لاہور ریڈیو سے نشر ہو چکا ہے۔ اسے ہم تبرکاً بھی شائع کر رہے ہیں اور اس خیال سے بھی کہ یہ ایک بڑے آدمی کے متعلق ایک اور بڑے آدمی کے جذباتِ عقیدت ہیں۔ اس مضمون میں اقبالؒ کے متعلق ایسی معلومات ملتی ہیں جو اور کہیں سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ان کا محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

حضرت تابش کی نظم اُن سے کہہ کر مخزن کے لئے لکھوائی گئی تھی لیکن کسی سُوءِ اتفاق سے وہ ۲۴ مارچ کے ایک لاہوری روزانہ پرچے کے خاص نمبر میں شائع ہو گئی ہے۔ یہ اطلاع ہمیں اُس وقت ملی جب مخزن کے وہ صفحات جن میں حضرت تابش کی نظم ہے چھپ چکے تھے۔ امید ہے کہ قارئین یہ معذرت قبول فرمائیں گے۔

موجودہ اشاعت میں احباب کے خطوط کے علاوہ مخزن کے متعلق [illegible] تبصرے بھی [illegible] ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ برِ اعظم پاکستان و ہند کے بہی خواہانِ اُردو نے مخزن کی نشاۃِ ثانیہ پر نہ صرف دلی مسرت کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کے مضامین کو غائر نظروں سے دیکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی (مدیر صدق) نے مخزن کے مضامین [illegible] پر چھپے ہوئے اخلاق و اصلاحی رنگ کا سُراغ لگایا ہے، وہی مخزن کی [illegible] ہے۔

موسمِ بہار کے خیر مقدم کے طور پر دو مختصر مضامین اور ایک نظم اس اشاعت میں شامل ہیں۔ اگر موسمِ بہار کے آغاز میں ہمارے جرائد و رسائل بہار نمبر شائع کیا کریں تو شاید مناسب ہو۔ ایشیائی قوموں کو زندگی اور زندہ دلی سے بہت کم نسبت ہے بلکہ اُن کے شاعر اور فلسفی انہیں دنیا کے حُسن و مسرت سے نفرت کرنے کا سبق دیتے رہے ہیں۔

"تاثریت" کے سلسلہ مضامین کی تیسری قسط ہے "تاثریت کا جمالیاتی پہلو" [illegible] اس اشاعت میں شامل نہیں ہو سکا۔ مئی کے مخزن میں شائع ہو جائے گا۔

جناب صادق قریشی کا افسانہ "جلال پور کا چودھری" اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اس میں پنجاب [illegible] معاشرت کی بہت اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی نے اس کی زبان اور انداز بیان میں [illegible] دیہاتی رنگ نمایاں ہے۔ ہماری دیہاتی معاشرت اب تک ہر قسم کے بیرونی اثرات [illegible] اور نئی تہذیب کے تصنع سے پاک ہے۔ اس لئے دیہاتی ماحول کے متعلق افسانے اور نظمیں خاص قدر کی نظر سے دیکھی جائیں گی۔

"کلاسیکی ادب اور ہم" میں نوجوان مضمون نگار نے اپنے معاصر اُدبا کی توجہ ایک اہم ضرورت کی طرف منعطف کی ہے۔ ممکن ہے اُن کی بعض آرا قابلِ ترمیم ہوں لیکن اس مضمون کا بنیادی مقصد یعنی اصلاحِ حال کی دعوت [illegible]

مدیر

"مخزن"

"طلوعِ اقبال"

(اثرِ خامۂ حضرت شیخ عبدالقادر مدیرِ اعزازی)

شیخ عبدالقادر نے اقبالؒ کی زندگی میں ان کے متعلق یہ الفاظ لکھے تھے:۔

"جب شیخ محمد اقبال کے والد بزرگوار اور اُن کی پیاری ماں اُن کا نام تجویز کر رہے ہوں گے تو قبولِ دعا کا وقت ہوگا کہ اُن کا دیا ہوا نام اپنے پورے معنوں میں صحیح ثابت ہوا۔۔۔۔ جناب داغؔ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی اُن لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی۔ مجھے دکن میں اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات اُنکی زبان سے سُنے۔۔۔۔ ابتدائی مشق کو چھوڑ کر اقبال کا اُردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے تقریباً شروع ہوتا ہے۔ شیخ محمد اقبال نے اپنی وہ نظم جس میں ہمالہ سے خطاب ہے، ایک جلسے میں پڑھ کر سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات تھے اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اس میں موجود تھی۔۔۔۔ اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ۔۔ رسالہ مخزن جاری کرنے کا ارادہ کیا۔۔۔ میں نے اُن سے وعدہ لیا کہ وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں۔۔۔۔ (جب) پہلا پرچہ شائع ہونے لگا۔۔۔ میں نے کہا وہ ہمالہ والی نظم دے دیجیے۔۔۔۔ انہیں خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں مگر میں دیکھ چکا تھا کہ وہ نظم بہت مقبول ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے زبردستی وہ نظم اُن سے مخزن کے پہلے نمبر کے لئے لے لی۔

۔۔ اوّل اوّل جو نظمیں پڑھی جاتی تھیں وہ تحت اللفظ پڑھی جاتی تھیں، اور اس طرز میں بھی ایک لطف تھا۔ مگر بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسۂ عام میں شیخ محمد اقبال سے بہ اصرار ترنم میں پڑھنے کے لئے کہا۔ اُنکی آواز قدرتاً بلند اور خوش آئند ہے۔۔۔۔ ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا۔۔۔۔ پہلے تو صرف خواص ہی اُن کے کلام کے قدردان تھے، اب عوام بھی کھنچ آئے۔۔۔ (اب) جو سمجھتے ہیں وہ بھی محو اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی محو ہوتے ہیں"

اقبالؒ کے مرنے کے بعد شیخ صاحب نے انہیں یاد کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے:۔

میں نے ستارۂ اقبال کا طلوع دیکھا۔ وہ چند ابتدائی منازلِ ترقی میں اقبال کا ہم نشین اور ہم سفر تھا۔ دو چار تصویریں اُس ابتدائی دور کی پیش کرتا ہوں۔ لاہور میں ایک بزمِ مشاعرہ بازار حکیماں میں حکیم امین الدین صاحب مرحوم کے مکان پر ہوا کرتی تھی۔ ایک شب اس بزم میں ایک نوجوان طالب علم اپنے چند ہم عمروں کے ساتھ آ کر شریک ہوا۔ اُس نے ایک سادہ سی غزل پڑھی جس کا مقطع یہ تھا ؎

شعر کہنا نہیں اقبال کو آتا لیکن
آپ کہتے ہیں سخنور تو سخنور ہی سہی

اس "سخنور ہی سہی" کی بے ساختگی اور پڑھنے کے بے ساختہ انداز سے سخن فہم سمجھ گئے کہ اُردو شاعری کے اُفق پر ایک نیا ستارہ

فسدار ہوا ہے۔ اِسی غزل میں ایک شعر اَور تھا جس کی سامعین نے خوب داد دی اور تقاضا کیا کہ اقبال صاحب اگلے مشاعرے میں بھی ضرور شامل ہوں۔ وہ شعر یہ تھا ؎

خوب سوجھی ہے تہِ دام پھڑک جاؤنگا
میں چمن میں نہ رہوں گا تو مرے پر ہی سہی

جب اقبال صاحب دوسرے مشاعرہ میں آئے تو اُنھوں نے ایک اَور غزل پڑھی جس کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

یہ تھا آغاز اُس تدریجی ارتقا کا جو غزل گوئی سے "تصویرِ درد" اَور "شکوہ" جیسی نظموں تک پہنچا اَور "بانگِ درا" کی منزلیں طے کرتا ہُوا "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" اور "پیامِ مشرق" وغیرہ غیر فانی نظموں کے عروج پر پہنچا۔

اقبال کی پہلی نظمیں جس نگارگاہ میں لکھی جاتی تھیں وہ اسی بازار حکیماں کے اختتام پر شہر کے بھاٹی دروازہ سے داخل ہوتے وقت دائیں ہاتھ کی دکانوں پر ایک چھوٹا سا بالاخانہ تھا، جو سفرِ ولایت کے وقت سے پہلے پروفیسر اقبال کا مسکن رہا۔ یہ مکان اب تک موجود ہے مگر افسوس ہے کہ اقبال کے مداحوں کی اتنی جماعتوں اور گروہوں میں سے کسی کو آج تک یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اِس مکان کی ملکیت حاصل کر کے اسے قوم کے لئے محفوظ کر لیں، تاکہ ہماری نئی پود جب اِس عظیم الشان شاعر کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اُن کے تفصیلی حالاتِ زندگی جاننے کی خواہش مند ہو، تو اس مسکن کو بھی دیکھ سکے، جس میں بیٹھ کر اقبال نے اپنے ادبی کام کا ایک معقول حصہ تصنیف کیا اور جس کے ساتھ اُن سے متعلق کئی روایات و حکایات وابستہ ہیں۔

یہی وہ مکان ہے جس میں بیٹھ کر "اِک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی" والی نظم لکھی گئی تھی۔ وہ ایک صحیح واقعہ کا صاف صاف بیان تھا۔ جس سے شاعر کی عجیب سادہ اور پیچیدہ شخصیت پر بہت سی روشنی پڑتی ہے۔ جن دکانوں پر اقبال کا یہ مسکن واقع تھا، انہی پر اُن کے مکان کے دوسری طرف ایک مولوی صاحب رہتے تھے۔ جو ایک مقامی کالج میں عربی پڑھاتے تھے۔ انہیں حق مغفرت کرے بہت نیک آدمی تھے اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ خود بھی بوڑھے نہ تھے۔ ادھیڑ عمر کے تھے مگر اقبال جوان تھا۔ اقبال کی وہ متضاد صفات جن کا اس نظم میں تذکرہ ہے اُن کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ اُنھوں نے کسی کے روبرو اظہارِ تعجب کیا۔ اُس نے وہ بات اقبال کو سُنا دی اور یہ اچھی خاصی تاریخی نظم ہو گئی۔ اقبال نے اِسی تضاد کا ذکر اِس شعر میں کیا ہے :-

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اِس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

یہ کچھ بناوٹ نہ تھی کہ یہ کہا گیا۔ یہ بات بطور تمسخر نہیں کہی گئی تھی۔ وہ وقت بہت دیر میں آیا جب اقبال نے خودی کی حقیقت سمجھی اَور بیان کی اور اُسے اپنی خودی کا احساس ہُوا۔ جس نے اُسے درویشی اور قلندری کا درجہ عطا کر دیا۔

یہی چھوٹا سا مکان جس کا میں نے ذکر کیا ہے میری اَور اقبال کی بیشتر ملاقاتوں اور نشستوں کا مرکز تھا۔ دو تین اور دوست بھی رہیں شام کو جمع ہو جاتے تھے۔ جن میں دو ایک طالبعلم تھے۔ جو اسی امید پر آتے تھے کہ اقبال سے کوئی نیا شعر سُنیں گے اور نوٹ کر لیں گے۔ پنسل اور کاغذ تیار رہتا تھا اَور وہ لکھنے پر کمر باندھے ہوئے ہوتے تھے۔ اقبال کا ایک ملازم

علی بخش اوپر کی منزل میں چولھا گرم رکھتا تھا۔ تاکہ اپنے مالک کا حقہ ساعت بساعت تیار کرتا رہے۔ جب طبیعت شعر پر مائل ہوتی تو اقبال حقہ پیتے جاتے تھے اور شعر کہتے جاتے تھے یہ دلچسپ صحبتیں بہت دیر تک رہیں۔ میں اُن دنوں انگریزی میں اخبار نویسی کرتا تھا۔ کچھ عرصہ سے رسالۂ "مخزن" بھی جاری تھا۔ جس میں اقبال کا تازہ کلام درج ہو جاتا تھا۔

اتنے میں مجھے سفرِ انگلستان کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے اقبال سے ذکر کیا کہ میں انتظامِ سفر کر رہا ہوں اور عنقریب جاؤں گا۔ اسی سے اقبال کو بھی تحریک ہوئی کہ وہ بھی وہاں پہنچیں۔ کہنے لگے "میں بھی بھائی کو لکھتا ہوں، اگر وہ بندوبست کر سکے تو تمہارے جانے کے بعد ایک سال کے اندر میں بھی وہاں پہنچوں گا" مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی۔ اتفاقِ حسنہ دیکھیئے کہ ہم دونوں اپنے اس ارادے کی تکمیل کر سکے۔ جس سال میں وہاں گیا اُس سے ٹھیک ایک سال بعد اقبال بھی پہنچے پروفیسر آرنلڈ کی وہاں موجودگی اقبال کے لئے خاص کشش رکھتی تھی آرنلڈ صاحب ایک متبحر فلسفی اور اقبال کے شفیق اُستاد تھے۔

جو دو سال میرے اور اقبال کے انگلستان میں مشترک گزرے وہ بہت دلچسپ تھے۔ گو وہ کیمبرج میں رہے اور میں لندن میں تھا۔ مگر اُن سے ملنے کے بہت موقع ملتے رہے۔ وقتاً فوقتاً لندن آتے تھے۔ تو یا میرے مکان میں انہیں کمرہ مل جاتا تھا یا کسی پاس کے مکان میں۔ کبھی کبھی میں کیمبرج جاکر اُن سے ملتا تھا۔ وہاں اُن دنوں حیدرآباد کے مشہور عالم سید علی بلگرامی ملازمت سے پنشن پاکر یونیورسٹی میں مرہٹی زبان پر لیکچرر مقرر تھے اور مع قبائل وہاں رہتے تھے۔ اقبال اوقاتِ فرصت میں اُن کے ہاں جا بیٹھتے تھے۔ وہاں ہر وقت علم و فضل ہی کا چرچا تھا۔ اور اقبال وہاں گھر کی طرح بے تکلف تھے۔

جب اقبال لندن آتے تو بیرسٹری کے لکچروں یا کھانوں کے لئے ہم مل کر جاتے۔ بعض علمی مجالس میں بھی اکٹھے شریک ہوتے تھے۔ اور ہمارے بعض احباب بھی مشترک تھے۔ مگر اقبال کی طبیعت کی دو عادتیں وہاں زیادہ نمایاں ہوتی جاتی تھیں۔ ایک تو اُن کی کم آمیزی جس کا اشارہ انہوں نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔ وہ بہت سے دوست نہیں بناتے تھے۔ دوسری عادت نقل و حرکت میں تساہل و تکاسُل تھی۔ وہ کئی دفعہ کسی جگہ جانے کا وعدہ کرتے تھے اور پھر کہتے تھے "یہ بھی کون جائے اس وقت تو کپڑے پہننے یا باہر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم انہیں ہنسی سے "قطب از جا نہ جنبد" کی کہاوت سنایا کرتے تھے۔

مگر لندن ایسی جگہ ہے جہاں کم آمیزوں کو بھی کبھی کسی سے ملنے کا وقت دینا پڑتا ہے اور ملاقات کا وعدہ لے کر کہیں منتظر رہنا ہوتا ہے۔ کسی ایسی ہی ملاقات کا اشارہ اس شعر میں ہے ؎

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اسکی
کہیں سرِ رہگذار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

مجھے اپنے پروگرام کے مطابق اقبال سے ایک سال پہلے انگلستان چھوڑنا پڑا۔ وہ میرے بعد آئے۔ اُنہوں نے لاہور میں وکالت شروع کی۔ میں نے دہلی میں۔ دہلی سے آکر میں لائل پور چلا گیا۔ وہ لاہور ہی میں رہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ع

کہ روزی میکند از ہم جدا یارانِ ہمدم را

علامہ اقبال

عبدالقادر کے نام

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دِکھا کر اُن کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں

رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اُٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رُخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

دیکھ! یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بے کار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

بادہ دیرینہ ہو، اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں

گرم رکھتا ہے ہمیں سردیِ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

"ہرچہ در دل گذرد وقفِ زباں دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع"

پنڈت جواہر لال نہرو

قومی زبان کا مسئلہ

اس ترجمے کے لئے ہم "انڈین انفرمیشن سروسز" کے ممنون ہیں اور یہ مضمون شیخ عبد القادر قبلہ کے حسب ہدایت شائع کیا جاتا ہے۔ پنڈت نہرو نے ہندوؤں کو پھر ایک بار یہ بھولی ہوئی حقیقت یاد دلائی ہے کہ اصلی سنسکرت ویدوں کی زبان سے بہت دُور ہے۔ اور قدیم فارسی بہت قریب۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی قوم کو نہ صرف فارسی الفاظ کے اندھا دُھند مقاطعہ سے روکا ہے بلکہ اُردو رسم الخط کے بائیکاٹ کا مشورہ بھی نہیں دیا۔ پنڈت نہرو اُن لوگوں کے ہاتھوں بالکل بے بس معلوم ہوتے ہیں جو علم زبان سے تو دُور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے لیکن متعصبانہ جذبات کو خوب بھڑکا سکتے ہیں۔ افسوس انگریزوں کے خود غرضانہ پروپیگنڈا کے زیر اثر ہندو ودوان اُردو کی حقیقت کو بھول گئے کہ یہی اصل ترقی یافتہ ہندی تھی اور اسے مسلمان بادشاہوں نے نہیں، ہندی عوام نے پیدا کیا تھا۔ بادشاہ تو اپنی فارسی کو چھوڑ کر عوام کی اس زبان سے رشتہ جوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہندو عوام نے اپنی اس ہندی میں خود سبک فارسی الفاظ داخل کئے جنھیں اب ہندی حکومت، ہندی ریڈیو، اور نا سمجھ ہندی ودوان نکال کر بھاری بھرکم سنسکرت شبد داخل کر رہے ہیں۔ گویا یہ زبان بھی اب عنقا سے چھین کر دیوبانی بن رہی ہے۔ کاش ودوان پنڈت نہرو کی بات سمجھ سکیں۔ م

میرے خیال میں کسی قوم کا کیرکٹر جانچنے کے لئے زبان سے بہتر کوئی اور کسوٹی نہیں۔ اگر کسی زبان میں طاقت اور قوت ہے تو اس زبان کے بولنے والے بھی طاقتور اور مضبوط ہوں گے۔ اور اگر وہ حشو و زوائد سے پُر ہے، مرصع پُر تکلف اور پیچیدہ ہے۔ تو پھر ان خصوصیات کی جھلک آپ کو اس قوم کے کیرکٹر میں بھی نظر آئے گی، لیکن اس بات کو اُلٹ کر بیان کرنا زیادہ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ دراصل زبان کی خالق تو قوم ہوتی ہے۔ لیکن صداقت کا شائبہ اس امر میں بھی ہے کہ زبان بھی لوگوں کے کیرکٹر کو ڈھالتی ہے۔

ایک ایسی زبان جو باضابطہ اور شاندار بھی ہو لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ پابند رسوم بھی ہو۔ وہ جلد ہی بدلتے ہوئے ماحول اور عوام سے اپنا رشتہ کھو بیٹھی ہے۔ اس کا یقینی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبان کی قوت میں کمی آجاتی ہے اور اس میں بناوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نتائج کسی زمانے میں بھی پسندیدہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ خاص کر اس انقلابی زمانے میں جبکہ ہمارے گرد و پیش کی ہر چیز بدل رہی ہے ہماری زبان بھی ان بُرائیوں سے مردہ ہو جائے گی۔ اس لئے ایک زبان کو اپنے مقاصد کے پُورا کرنے میں اسی تدریجی اصول کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیئے، اور اس کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر وسیع تر ہونا چاہیئے۔

انسانی سماج کے ارتقا میں قدیمی (classical) زبانوں نے بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ لیکن اُنھوں نے عوامی زبانوں کی ترقی میں رُکاوٹ بھی ڈالی ہے۔ جب تک علماً قدیمی زبانوں میں سوچتے اور لکھتے رہیں گے عوامی زبانوں کو حقیقی ترقی حاصل نہیں ہوگی۔ سولھویں صدی تک یورپ میں لاطینی زبان وہاں کی عوامی زبانوں کی ترقی میں رکاوٹ بنی رہی اور ہندوستان

میں سنسکرت کا اثر اس قدر غالب رہا کہ عوامی زبانوں کی جو بعد میں صوبائی زبانیں بن گئیں، ترقی رُک گئی۔ اس کے بعد ہندوستان کے بڑے بڑے علاقوں میں فارسی علما کی زبان بن گئی اور یہ بھی ہندوستان کے کچھ حصوں میں عوامی زبان کی ترقی میں حائل رہی۔

ہمیں اس اہم مسئلے پر غور کرتے وقت ان بنیادی امور کو یاد رکھنا چاہیئے۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ سیاسی طور پر یا جذبات یا تعصب کی بنیاد پر اگر کوئی عاجلانہ فیصلہ کیا گیا تو شاید وہ بعد میں نقصان دہ ثابت ہو۔ ہمیں آیندہ کے لئے تعمیری کام کرنا ہے، اور اگر غلط بنیادوں پر کام شروع کیا گیا۔ تو صرف لسانی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ثقافتی اور انسانی نقطۂ نگاہ سے بھی ترقی رُک جائے گی۔ زبان ایک بڑا ہی نازک آلہ ہے۔ اس کے اعلےٰ تصورات کی تخلیق بلند و مانع خواص کرتے ہیں۔ اور عوام اسے قوت بخشتے ہیں۔ زبان پھول کی طرح پرورش پاتی ہے اور کھلتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس زبان کو کیا نام دیا جائے۔ ہندی کہا جائے یا ہندوستانی کے نام سے پکارا جائے۔ یہ کوئی بنیادی یا اہم بات نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر لفظ کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ اور وہ لفظ کسی قطعی امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ میری رائے میں ہمیں اپنے سامنے ایک ایسی زبان رکھنی چاہیئے جس کا مزاج مذکورہ خصوصیات کا حامل ہو۔ جس میں بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت ہو۔

اس زمانے میں انگریزی زبان بہ نسبت دوسری زبانوں کے سب سے زیادہ تاثیر پذیر اور لچک دار ہے۔ اس میں بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ اور اسی وجہ سے زبان کی حیثیت سے یہ اہم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری زبان بھی دنیا میں اسی طرح بڑھے

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا خزانہ اور سب سے اعلےٰ ورثہ کیا ہے تو میں فوراً بلا جھجک کہہ دُوں گا کہ سنسکرت اور اس کا ادب۔ یہ ایک عظیم الشان ترکہ ہے جو ہمیں اپنے پیشروؤں سے ملا ہے۔ جب تک یہ زندہ ہے اور جب تک اس کا اثر باقی ہے ہندوستان کی اصلی روح کا بنیادی عنصر باقی رہے گا۔

سنسکرت خواہ کتنی بھی عظیم الشان زبان کیوں نہ ہو۔ اور ہم میں اسے ترقی دینے کی خواہش کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو۔ پھر بھی یہ ایک زندہ زبان نہیں بن سکتی لیکن اسے پہلے کی طرح ہماری زیادہ سے زیادہ زبانوں کی اصل بنیاد اور اعلیٰ مواد کے طور پر قائم رہنا چاہیئے۔

گزشتہ چند صدیوں میں فارسی نے ہماری صوبائی زبانوں اور خصوصاً ہندوستانی زبان کے ارتقا میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ اور ہمارے اندازِ فکر پر بہت حد تک اثر انداز ہوئی ہے۔ اسی طرح ہم کو یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ کوئی زبان فارسی سے زیادہ سنسکرت کے قریب نہیں۔ اور سچ پوچھئے تو ویدک سنسکرت اور کلاسیکل سنسکرت زیادہ قریب نہیں بلکہ ویدوں کی سنسکرت اور قدیم پہلوی ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لیے ان دونوں میں کسی حد تک تطبیق و تصادم کا ہونا بہت اغلب ہے۔ لیکن اس سے ہماری زبان کی روح یا ہماری نسلی خصوصیات کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا ہے۔

اگر ان امور کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ہمیں یہ جاننا پڑیگا کہ جس کُل ہند زبان کو ہم ترقی دینا چاہیں اُسے لچکدار اور تاثیر پذیر ہونا چاہیئے۔ اور گزشتہ زمانوں میں جو ثقافتی خصوصیات اس میں مدغم ہو چکی ہیں، انہیں قائم رہنا چاہیئے۔ اسے لازمی

طور پر علمائے ایک مخصوص طبقے کی نہیں بلکہ عوامی زبان ہونا چاہیئے۔ اُسے باوقار اور پُر قوت ہونا چاہیئے۔

جہاں تک کہ اصطلاحات کا تعلق ہے۔ ہمیں اوّلاً ہر اُس لفظ کو منظور کر لینا چاہیئے جسے قبولِ عام کی سند مل چکی ہو اور مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تین ہزار کے قریب ایسے مشہور و معروف بنیادی الفاظ چن لئے جائیں جن کو لوگ عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان میں ایسے ہم معنی الفاظ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ جو عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے ہوں۔ یہ ایک ایسا بنیادی ذخیرۂ الفاظ ہو جس کا علم ہر اُس آدمی کو ہونا چاہیئے جو کُل ہند زبان جاننا چاہے۔ لیکن ان مذکورۂ بالا اُصولوں کے مطابق اصطلاحی الفاظ کی ایک فہرست بھی مرتب کی جائے۔ اگر یہ دو فہرستیں تیار کر لی جائیں تو پھر باقی کام زبان کے قدرتی ارتقا پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ کسی طرزِ تحریر پر کوئی ایسی قدغن اور پابندی نہ لگائی جائے جسے خالص ادبی ہندی یا اُردو کہا جا سکے۔ تعلیم کی اشاعت اور ناظرین کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ مصنفین اور مقررین دونوں اس سے اثر اندوز ہو سکتے ہیں۔ اور میری رائے میں رفتہ رفتہ بلا کسی بیرونی دباؤ کے ایک حسین اور پُر قوت زبان بنتی اور بڑھتی جائے گی۔

یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ہم زبان کے متعلق تو اس قدر بحث و تمحیص میں پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس ایک بھی اچھی لغات نہیں ہے۔ دنیا کی کسی دوسری اعلےٰ زبان پر نظر ڈالیئے اور دیکھئے اس میں لغات اور انسائیکلوپیڈیا کی کس قدر جلدیں موجود ہیں۔ ہماری زبان کی کسوٹی وہ زبان ہے جو عدالتوں میں یا مدرسوں کی درسی کتب میں کام آتی ہے۔ اس لئے ہمارا ایک سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہم سنسکرت کی اور اپنی نئی زبانوں کی عالمانہ اور مستند ڈکشنریاں تیار کریں۔

رہا رسم الخط کا سوال۔ تو یہ ظاہر ہے کہ ناگری لکھاوٹ غالب رہے گی۔ لیکن میں چونکہ ثقافتی اور سیاسی نقطۂ نگاہ سے الگ تھلگ رہنے کے اصول کو غلط سمجھتا ہوں۔ اس لئے میرے خیال میں جہاں ضروری ہو وہاں اُردو رسم الخط کو تسلیم کرایا جائے اور اُس کو سکھایا جائے۔ ہم سب لوگوں سے دونوں لکھاوٹوں کے سیکھنے کے لئے نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو بہت بڑا بوجھ بن جائے گا۔ لیکن دستاویزات اور دوسرے کاغذات کی تحریر کے لئے خاص کر۔ اور جہاں طلبہ کی مناسب تعداد چاہے۔ وہاں اسکولوں میں تعلیم کے لئے اُردو رسم الخط تسلیم کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں۔ ہمارے لئے بڑے پیمانہ پر رومن حروف کا اختیار کرنا ممکن نہیں لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ یہ طریق فوج میں نہایت کامیاب رہا ہے۔

میں نے اِس مضمون کے آغاز میں لکھا تھا کہ میں یہ مضمون بحیثیت ایک مصنف کے لکھ رہا ہوں۔ اِس لئے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں مصنفین اور خاص کر ہندی اور اُردو کے مصنفین سے بھی ایک بات کہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی ہے کہ ہمارے بعض اچھے مصنفین کی پست حالی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔

اخبار نویس تو آرام سے رہتے ہیں لیکن حقیقی جوہر رکھنے والے مصنفین کے لئے کوئی مستقبل نہیں۔ میں ایسے ناشرین کو جانتا ہوں۔ جنہوں نے ہندی کتابوں کے کاپی رائٹ کوڑیوں کے مول لئے۔ کیونکہ بیچارا مصنف تنگ دستی کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ان ناشرین نے ان کتابوں سے بہت سا روپیہ کمایا لیکن مصنف اُسی طرح فاقہ کرتا رہا۔ میرے خیال میں

یہ بڑی شرمناک بات ہے۔ لہٰذا میں ناشرین سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مصنفوں سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں۔ ناشرین صرف اس وقت پنپ سکتے ہیں جبکہ مصنف بھی خوشحال ہوں۔ خود ناشرین کے نقطۂ نگاہ سے یہ احمقانہ پالیسی ہے کہ مصنفین کا گلا کاٹا جائے یا اُنہیں قابلِ قدر کام کرنے سے روک دیا جائے۔ لیکن قومی نقطۂ نگاہ سے یہ مسئلہ اَور بھی اہم ہے اور یہ قوم کا فرض ہے کہ وہ اِس بات کا اہتمام کرے کہ صلاحیت رکھنے والے مصنفین کو اچھا کام کرنے کا موقع مل سکے۔

اُردو اور ہندی

(پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی)

پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اس زبان کی نسبت جس کے کئی نام ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کی تحقیقات کس نتیجے پر پہنچی ہے۔ لکھا ہے :-

"اکثر کہا گیا ہے کہ ہندوستانی ایک بے قاعدہ کھچڑی بولی ہے جو ان بہت سی زبانوں کے مستعار الفاظ سے بنی جو دہلی کے بازار میں بولی جاتی تھیں۔ لیکن یہ نظریہ رد ہو چکا ہے۔ جب یہ دریافت ہوا کہ وہ (ہندوستانی) ایک زندہ سلامت زبان ہے اور اپنے موجودہ مولد و منشا میں صدیوں سے مروج ہے۔ اور یہ کہ یہ زبان شورسینی پراکرت کی بیٹی ہے تو یہ کہنا کہ ایک بے میل زبان ہے جس نے بازار یا لشکر میں ترکیب پائی واقعات کو اُلٹ بیان کرنا ہے۔ امرِ واقع یہ ہے کہ یہ دہلی کے آس پاس لوگوں کی اصلی اور فطری زبان تھی اور وہ اسے بازار تک لائے اس وجہ سے وہ بازار کی زبان مشہور ہو گئی ...... دیسی آدمی اسی کو ہمیشہ اُردو یا اُردو زبان کے نام سے پکارتے ہیں۔ اُردو میں فارسی الفاظ اور ڈھنگ بھرنے کے ذمہ دار مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ تر ہندو ہیں"

یہ ہے ایک غیر جانب دار یوروپین محقق کی رائے، اب ایک ہندو مستشرق اور عالم کی جو ہندی کے مخلص خدمت گزار اور لسانیات کے ماہر بھی ہیں، اِس بارے میں رائے ملاحظہ فرمائیے۔ بنارس کی مشہور ناگری پرچارنی سبھا کے بانی سکریٹری رائے شام سندر داس اپنی ہندی کتاب مسمی ہندی بھاشا کا وکاس میں لکھتے ہیں :-

"ہندی بھاشا کی نثر للو لال جی کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ اُردو کی نثر اس سے بہت پرانی ہے۔ کھڑی بولی (ہندی) کی نظم نئی چیز ہے۔ اُردو کی نظم اس سے بہت پرانی ہے۔" (صفحہ ۸۰)

للو لال جی کا زمانہ وہی فورٹ ولیم کالج کا زمانہ ہے یعنی پچھلی صدی کی پہلی چوتھائی اُنھوں نے یہ کیا کہ اُردو میں سے فارسی اور عربی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت تت سم اور تدبھو لغات رکھ دیئے۔ یہ ہے ہندی نثر کی ابتدا۔ پنڈت گلیری کا ارشاد بھی ملاحظہ فرمائیے۔ کہتے ہیں :-

"کھڑی بولی یا ریختہ کی نظم و نثر کے مطالعے سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ فارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت لغات بھرنے سے ہندی بنی تھی۔" (ہندی بھاشا کا وکاس صفحہ ۵۸)

اب کوئی دیکھ لے کہ اس کے معنے اس کے سوا اَور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہندی صرف اُردو کی ایک قسم کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اس کی لسانیاتی حیثیت کچھ بھی نہیں +

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

عہدِ نو

انساں کی بدل رہی ہے تقدیر ہے ٹوٹ رہی ہر ایک زنجیر
زنداں کے تمام در کھلے ہیں پنچھی اُڑتے ہیں پَر کھلے ہیں
پیکار یہ عدل اور ستم کی تمہید ہے اک نئے جنم کی
تابندہ جو اِس قدر اُفق ہے ظالم کے لہو کی یہ شفق ہے
شاہی باقی نہ اب کوئی شہ ہر تخت کا بن گیا ہے تختہ
اب کون ڈریگا ناکسوں سے شاہیں نہ دبے گا کرگسوں سے
قائم ہیں کہاں وہ اب سہارے سیلاب ہے توڑتا کنارے
پہلے ہیں کہاں حدود باقی اُن کا نہیں اب وجود باقی
گزری ہوئی شے کا نام کیا لیں تقویم کہن سے کام کیا لیں
مُلّا کی گرفت اب ہے ڈھیلی ہے اس کے خلاف چرخِ نیلی
جب خوابِ گراں سے جاگتے ہیں پیروں سے مرید بھاگتے ہیں
آقائی گئی، گئی غلامی سیرت سے ہے آدمی گرامی
تھوڑا ہے قدیم رنگ باقی آزادی کی کچھ ہے جنگ باقی

نذیر مومن

اقبال کی شاعری کا نفسیاتی پس منظر

یہ مضمون شعر سے زیادہ شاعر کا مطالعہ ہے۔ "مخزن المخازن" میں "اقبال کا بچپن" بھی اِس سلسلے میں قابلِ توجہ ہے۔
لیکن "ماہرِ نفسیات" کو اقبال کا یہ پیغام بھی نہ بھولنا چاہئے۔ کہ ؎

کھلتے نہیں اِس قلزمِ خاموش کے اسرار
جب تک تُو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

شاعر اور فن کار پر ماحول کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے جس قسم کے نظامِ زندگی میں کوئی شاعر پل کر بڑا ہوگا شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس کا تصورِ کائنات، اور اس کی فکری ساخت کے مختلف پہلو اس سے ضرور متاثر ہوں گے۔ یہی نہیں بلکہ کسی قوم کی روایاتِ ماضی، اُس کی قدیم ذہنی وراثتیں۔ اور قومی نظریات بھی اُس کے افراد کی فکری ساخت پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ایک حساس فن کار کے اوائلِ عمر کے احساسات، اُس کے ابتدائی تجربات اور اُس کی نیم خوابیدہ خواہشات اُس کے شاعرانہ تصورات میں ایک ضروری جزو بن کر زندہ رہتے ہیں۔ بعض حالات میں فن کار کی یہ خواہشات ماحول کی دوسری مجبوریوں کی وجہ سے تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں اور ذہن کے اُس حصے میں جسے تحت الشعور کہتے ہیں پرورش پاتی رہتی ہیں۔ تحت الشعور میں دبے ہوئے احساسات چونکہ نہایت بے ترتیبی سے پرورش پاتے ہیں اور اُن کا کوئی حصہ زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، کوئی حصہ دب کر رہ جاتا ہے، اِس لئے ایک خاص نوعیت کے جذبات کسی نہ کسی متغیر شکل میں انسان کے زندہ تجربات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ تحت الشعور میں ڈوب کر نکلے ہوئے تجربات میں تسلسل اور ہم آہنگی نہ ہو یا یہ فن کار کے عام احساسات سے مختلف ہوں۔ لیکن یہ لازم طور پر فن کار کی شخصیت کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔

اقبال کو ہم ایک عظیم الشان شاعر، بلند پایہ مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اقبال بھی ہماری طرح ایک انسان ہی تھا، اور اُس کا بچپن ایک معمولی طالب علم کی طرح گزرا۔ وہ تعلیم و تدریس کے بجائے کھیل کود اور تفریح کو زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اقبال کے بچپن کے ساتھی بتاتے ہیں کہ مدرسے سے آتے ہی وہ اپنی کتابوں کو پھینک کر یا تو کبوتر اُڑانے میں مشغول ہو جاتا تھا یا پتنگ اُڑانے میں لیکن جوں جوں اُس کے حالات بدلتے گئے اُس کا یہ تفریحی شوق دبتا گیا۔ جب وہ انارکلی لاہور میں رہتے تھے اُس وقت تک اُنہوں نے بدستور کبوتر پال رکھے تھے، جن کی دیکھ بھال بھی وہ خود ہی کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب دُنیا اُن کو ایک قومی شاعر کی حیثیت سے جاننے لگی تو اِس مشغلے کے لئے وقت نکالنا دشوار ہو گیا۔ چونکہ اقبال کا ذہنی شعور

سن بلوغت کو پہنچ چکا تھا۔ اور ایک حسّاس شاعر کے شعور کی بلوغت اپنے ساتھ ہزاروں طوفان لے کر آتی ہے —— اُس کے دل میں صرف اپنا نہیں بلکہ سارے جہان کا درد سما جاتا ہے، یہ اس "حسرت خانۂ فردا و دوش" کی تخلیق کے متعلق سوچنا شروع کرتا ہے —— اس لئے نوجوان اقبال پر بھی جذبات و احساسات کے طوفان مسلط ہو گئے ؎

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

. . . .

مری فطرت آئینۂ روزگار غزالانِ افکار کا مرغزار

اِن سب زندہ داریوں اور فکر آرائیوں کے باوجود اقبال کے دل کی گہرائیوں میں کبوتر بازی کا معصوم شوق بدستور موجیں مارتا رہا۔ جب کبھی یہ شاعر بلند خیال عالمِ ماوراکی وسعتوں سے نیچے اُتر کر ایک معمولی انسان کی حالت میں رُونما ہوتا، وہی شوق، وہی سودا پھر دل میں چٹکیاں لینے لگتا۔ اور وہ لبِ بام کھڑا ہو کر سوچنے لگتا کہ طرح طرح کے کبوتر پالوں، چھت پر اُن کے لئے چھتری لگاؤں، کابک سجاؤں، ایک ایک کو باری باری ہاتھ میں لے کر فضا میں اُڑا دوں۔ وہ اُڑتے اُڑتے آسمان کی وسعتوں میں کھو جائیں۔ میں پہروں اُن کا انتظار کرتا رہوں۔ میری نگاہیں نیلی نیلی فضاؤں میں ہر موہوم دائرے کو اپنے کبوتر کا پر سمجھ کر تعاقب کرتی رہیں اور آہستہ آہستہ یہ کبوتر شاخِ نشیمن پر نظر جمائے آسمان کے دائروں سے نیچے اُتر آئیں۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ بسنت رُت میں جب پیلے پیلے پیرہن ہوا کی سرسراہٹوں سے مرمریں کو ٹھوں پر لہراتے ہوں۔ تو لبِ بام کھڑا قوسِ قزح کے آنچلوں کی طرح کے پتنگ ہاتھ میں لئے فضا کی پہنائیوں میں دیکھنے لگوں، ہر طرف کنکوّے ہوا میں تیرتے ہوئے آئیں اور اُن کے استقبال کے لئے میں اپنے پتنگ کو اُن کی طرف بڑھا دوں۔ لیکن بقولِ غالب ع

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے!

یہ معصوم سا شوق اقبال کے لئے ایک نفسیاتی اُلجھن بن کر رہ گیا۔ اور آہستہ آہستہ کبوتر اُس کے خیال کی وسعتوں میں پرواز کرنے لگے، اور سرزمینِ شعر میں بسنے لگے۔

نفسیاتی اُلجھنیں خواہ کتنے ہی عامیانہ احساسات کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہوں جب کسی بڑے فن کار کے ذہنی قالب میں ڈھل کر نکلتی ہیں تو اُن کی ہیئت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی کبوتر اقبال کی شاعری میں غزل کے تخیلات کی بلند پروازی بن کر نمودار ہوئے ہیں۔ اور یہی کبوتر اس کی محبت، وفا اور پاکیزگی کی روح بنتے ہیں۔ جب اقبال کبوتر کو تارِ لبنتے ہوئے دیکھتا تو اسے خود بلند پروازی کا ایک احساس ہوتا۔ وہ محسوس کرتا، جیسے نیلی نیلی فضاؤں میں وہ خود اُڑتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن جوں جوں اقبال کے شاعرانہ نظریات پختگی اختیار کرتے گئے اُسے محسوس ہونے لگا کہ جس کو میں بلند پروازی سمجھتا ہوں وہ بھی پرواز کی کوتاہی ہے۔ اب اسی کے شوقِ پرواز نے ایک ایسی چیز کی تخلیق کی جسے اُس نے شاہین کا نام دیا۔ اقبال کے کلام میں اِس شاہین کی تاریخ ارتقا کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا

یہ شاہین اقبال کی محبوب ترین تخلیق ہے۔ اِس کے پر پرِ ہُما کے نیچے مکان و لامکان کی وسعتیں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ اس کے پَرِ شہپرِ جبریل سے بھی قوی ہیں۔ جبریل اس کے مقابلے میں

کنجشک وست آموز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شاہین منزلِ سدرہ سے بھی آگے تک پرواز کرتا ہے ؎

تُو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اس شاہین کا کام صرف نیلگوں فضاؤں میں تیرتے پھرنا ہے۔ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ کبوتر کی طرح اس کے لئے کابک بنانے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ کارِ آشیاں بندی کو آئینِ بلند پروازی کے منافی سمجھتا ہے۔ یہ مرغ درویش و غنی ہے:

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا — جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو — ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری نہ گلچیں نہ بلبل — نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم — ادائیں ہیں اُن کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جوانمرد کی ضربتِ غازیانہ

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اقبال کبوتر کی پرواز سے چل کر شاہیں کی بلند پروازی تک پہنچا ہے۔ یہ شاہیں کبوتر پر جھپٹتا ہے، چکوروں کے خون سے اپنے پنجے رنگین کرتا ہے:-

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تُو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اقبال کی طیور سے دلبستگی شاہین کی ضد کے طور پر بھی ایک اور طائر کی تخلیق کرتی ہے جس کو اقبال کرگس کا نام دیتا ہے۔ یہ کوتاہ پرواز عالمِ سفلی کی فضاؤں میں لڑھکتا پھرتا ہے۔ شکارِ زندہ کی لذت سے محروم ہے۔ جہاں شاہیں ـــ وہ طائرِ لاہوتی، سفلی فضاؤں میں اُتر کر شکار کرنا، رزق کی تلاش کرنا گناہ سمجھتا ہے' وہاں کرگس شکارِ مُردہ کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ شاہباز کا انداز الگ ہے ؏

شکارِ مُردہ سزاوارِ شاہبازے نیست

اقبال اپنے شاہیں کو ہر لمحہ بلند پرواز دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے اسے مرغانِ سرا کی صحبت سے منع کرتا ہے۔ اسے صحبتِ کرگس و زاغ سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اور اگر سال ہا سال کی صحبتِ کرگس میں پلا ہوا "فریب خوردہ شاہیں" آئینِ بلند پروازی اور "راہ و رسمِ شاہبازی" سے محروم ہو چکا ہے تو اقبال نااُمید اور مایوس نہیں ہوتا بلکہ اس خاکباز شاہیں سے مخاطب ہو کے کہتا ہے ؏

تیز و بال و پر کشا پرواز تو کوتاہ نیست

اور ؎

"تدرو زیرِ درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بندی"
بہ پرواز آ کہ صیدِ مہر و ماہے میتواں کردن

ابتدا میں ممکن ہے کہ اقبال نے شاہین کو محض اپنی ذات کے لئے ایک بلند نصب العین کی علامت کے طور پر متصور کیا ہو لیکن بعد میں اُن کے ہمہ گیر اور زبردست تخیل نے پوری قوم کو اپنی ذات میں ضم کر دیا۔

جب اقبال کا یہ فلسفہ بڑی حد تک پختہ ہو گیا تو عالمِ تغزل کو اس کی شاعری میں زوال آگیا، جس زمانے میں شاعر یورپ کے

تجربات سے بہرہ اندوز ہو رہا تھا جرمنی کے فلسفے اور نظریاتِ زندگی کے اثر و نفوذ نے اُس کی شخصیت کے ارتقا میں بہت حصہ لیا تھا۔ اس سے کچھ پہلے اقبال کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دی گئی، وہ اس شادی سے اتنے "غیر مطمئن" تھے کہ محترمہ عطیہ فیضی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اگر سماج مجھے اتنی اجازت بھی نہیں دیتا کہ میں اپنی شریکِ حیات اپنی مرضی سے تجویز کر سکوں حالانکہ ایسی راحتیں میرا فطری حق ہیں۔ اگر خدا اور سماج مجھ سے یہ راحتیں بھی چھیننے کی کوشش کریں گے تو میں دونوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دوں گا۔" اِس قسم کے حالات ہی غالباً اقبال کے حساس دماغ میں باغیانہ خیالات کی نمو کا سبب بنے۔ ممکن ہے ان دنوں اقبال پر نطشے کے فلسفے کا بھی اثر ہؤا ہو! اقبال اس حالت میں کائنات کو اہرمن کی تخلیق تصور کرتا ہے۔ جہاں انجم کج رو ہیں۔ آدمِ خاکی بے بصر ہے۔ وہ تصورات کی دُنیا میں سوچتا ہے اگر میں مر کر خدا کے سامنے گیا تو پوچھوں گا کہ اُس نے مجھے کیوں تخلیق کیا۔ اِس موقع پر اقبال بائرن، گوئٹے اور دوسرے باغی شعراء کا ہمصفیر نظر آتا ہے۔ لیکن ابھی اقبال اپنی ارتقائی منازل میں تھا۔ اُس کا تصورِ کائنات ابھی پختہ اور بدیہی نہ ہؤا تھا۔ اس کے دماغ میں ابھی اُلجھنیں تھیں تاہم اقبال میں چونکہ خیر گیری کی صلاحیت موجود تھی اِس لئے بالآخر وہ پیرِ رومی کی راہبری اور قرآنِ حکیم کے غائر مطالعہ سے اپنے مقام کو پا گیا۔ اس کے گریز اور بغاوت کے تصورات آہستہ آہستہ سلجھے تو ایک ایسے تصور کی تخلیق ہوئی جو اُس کے فلسفۂ حیات کی جان بن کر رہ گیا۔ ابلیس کا تصور بھی آخر کار پیکارِ حیات میں انسان کے امتحانِ عقل و دین کے لئے ایک کسوٹی بن گیا اور انسانیت کی جلا کے لئے اس کا وجود ضروری نظر آیا ؎

مزی اندر جہانے کور ذوقے — کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

بلکہ اقبال کے تصورِ خودی کے استحکام کے ساتھ ابلیس کی ہستی بھی بجائے مجسمۂ تخریب کے خودی اور خودداری کی علامت بنتی گئی۔ شیطان نے اپنے محبوب معبود کے دربار سے ہمیشہ کے لئے نکلنا گوارا کر لیا لیکن اُس نے اس سر کو جسے وہ اپنے معبود کے سامنے جھکا چکا تھا معبود کے کہنے پر بھی کسی اَور ہستی کے آگے نہیں جھکایا ؎

مری سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پہ حرام

اقبال کا مردِ کامل ایک ایسا خوددار مجاہد ہے جو اپنے پست جذبات سے جنگ کرتا ہے، شعلوں سے کھیلتا ہے لیکن دامن کو پھر بھی سلامت رکھتا ہے۔ وہ مشکلاتِ زندگی سے گھبراتا نہیں، بلکہ اپنے زورِ بازو کو آزمانے کے لئے مخالف طاقتوں کے وجود کو ضروری سمجھتا ہے۔ چنانچہ مشکلاتِ زندگی کی اُلجھنیں اقبال کو گریز پر مجبور نہیں کرتیں، بلکہ اُس کی تخلیقی قوتوں کو بیدار کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ دنیا کے دوسرے مفکروں کی طرح اقبال کے دماغ میں بھی یہ احساس پوری شدت کے ساتھ موجود تھا کہ کائنات کے مقابلے میں انسان ایک ذرۂ ناچیز ہے۔ کائنات کی محدود وسعتوں کا خیال مفکر کو انسان کی کم مائگی کے احساس پر مجبور کرتا ہے اور ادنٰے درجے کے مفکروں کے دماغوں میں کسی نہ کسی طرح احساسِ کمتری کی نمود ہوتی ہے یہی احساسِ کمتری انسان کو رہبانیت اور دنیا سے گریز پر مجبور کرتا ہے لیکن اقبال مشکلاتِ زندگی سے گھبرانے اور مغلوب ہونے کے بجائے اُن کو دعوتِ مقابلہ دیتا ہے اور پھر اُن پر حاوی ہونے میں کمالِ انسانیت سمجھتا ہے۔ اقبال

کا حریف بھی کمزور نہیں ہے۔ "خواجۂ اہلِ فراق" ابلیس وہ ہستی ہے جو شکستِ عناصرِ انسان سے کشمکش میں لذت محسوس نہیں کرتا۔ "بندۂ فرماں پذیر" کی بجائے اُسے "بندۂ صاحبِ نظر" اور "حریفِ پختہ تر" کی تمنا ہے۔ اُسے انسانِ کامل کی آرزو ہے جو اُسے شکست دے سکے۔ ابلیس اس لذتِ شکست پر مرتا ہے۔ دوسری طرف مردِ کامل وہ آدمِ خاکی ہے جس نے یزداں کی آغوش میں جنم لیا اور ابلیس کے پہلو میں پل کر جواں ہوا اس مردِ کامل کو خدا سے کسی ایسے ابلیس کی تخلیق کی تمنا ہے جو اس کے مقابلے میں آنے کی جرأت کر سکے، اور اگر خدائے مطلق ایسے ابلیس کی تخلیق گوارا نہیں کرتا تو پھر وہ کسی دوسرے آدم کی تخلیق کرے جو ابلیس سے کمتر ہو ؎

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک
یا دگر ابلیس بہرِ امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کن یا چنیں

انتخابِ کلامِ اقبالؒ

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
سفینۂ برگِ گُل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تُو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تُو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تُو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تُو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

ابش دہلوی

خُلدِ ارضی

قدسیو عظمتِ آدم کے ترانے گاؤ!! — آج پھر بارگہِ قدس میں مغرور ہیں ہم
آج پھر بارگہِ قدس کا مردود انساں۔ — ہم — اُسی عظمتِ مقصود کے حامل خود ہیں
شورشِ دہر ہوا جس کے عناصر کا خمیر!! — ذہنِ قدرت جسے انساں کی امانت سمجھا
جس پہ تہمت رہی بے حرمتیِ خلدِ بریں — "یعنی ہم اپنی تمنا کے مقابل خود ہیں"
عرشِ اعظم پہ کیا جس کو فرشتوں نے حقیر!! — ہمیں سرگرمِ طلب ہیں، ہمیں مقصودِ طلب
جس کا مقسوم ہیں بیتابیٔ دل، سوزِ حیات — راہرو، راہگذر، رہبر و منزل خود ہیں
جبرِ ہستی ہے فقط جس کی متاعِ تقدیر!! — تھے امیں جس کی بہاروں کے جناح و اقبال
دونوں عالم کے علاوہ جسے بخشش میں ملے — ہم اُسی مزرعِ اُمید کا حاصل خود ہیں
نارسا فکر و دلِ خستہ و بیدار ضمیر!! — کرلیا عظمتِ گم گشتہ کو حاصل ہم نے —
اپنے پندارِ شرافت پہ ہوا ہی نازاں!!! — قدسیو عظمتِ آدم کے ترانے گاؤ!!

"طالوت"

زباں دانی

یہ مضمون حضرت مدیرِ اعزازی کے حسبِ ارشاد عام اظہارِ خیال کے لئے مخزن میں شائع کیا جاتا ہے ۔ موجودہ طرزِ املا کا ابہام بھی غلط تلفظ کے رواج کا ایک باعث ہوا ہے ۔ جن لوگوں کی مادری زبان اردو نہیں وہ اس وجہ سے بھی بہت بلکہ اہلِ زبان تلفظ میں زیادہ غلطیاں کرتے ہیں بشلاً اہلِ پنجاب معروف اور مجہول "و" اور "ی" کے درمیان امتیاز نہ کر سکنے کے باعث بعض عام الفاظ کا بھی صحیح تلفظ نہیں کر سکتے ۔ تلفظ اور املا میں حتی الامکان یکسانی پیدا کرنے کیلئے ایک ایسی ہی اتر علمی مجلس کا قیام ضروری ہے جو یہ فیصلہ بھی کرے کہ ایک سے زیادہ تلفظ رکھنے والے الفاظ میں سے کس تلفظ کو اُردو میں رائج کیا جائے ۔

ہم لوگ جن کی مادری زبان اُردو نہیں طالبِ علم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس بات کے محتاج ہیں کہ ہمارے اغلاط کی تصحیح ہوتی رہے ۔ مگر غلطی ہمیشہ عدمِ علم ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی ، بعض اوقات غلطی کی تصحیح کرنے والے بھی بہ تقاضائے فطرتِ انسانی بعض غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے اس سلسلے میں مذاکرات اور اساتذۂ فن کی طرف رجوع کوئی بے جا بات نہیں ۔ مجھے پڑھنے لکھنے سے شغف ہے اور زبان دانی کے متعلق جہاں جہاں سے استفادہ ہو سکتا ہو میں نے اس میں کبھی کوتاہی نہیں کی ۔ بڑے تو بہر صورت بڑے ہیں ۔ اُن کی باتیں تو بہرحال قابلِ استناد ہیں ، میں نے عموماً چھوٹے لوگوں سے بھی غلطیوں کی تصحیح میں فائدہ اٹھایا ہے ۔ اسی شغف کی بنا پر میں نے پچھلے دنوں پنجاب کے ایک ہونہار زباں داں مولوی فضل الٰہی صاحب عارف کی کتاب "زباندانی" کا مطالعہ کیا اور اس سے بہت کافی فائدہ اُٹھایا ۔ بھلا جس کتاب کی تصدیق و توثیق میں مولانا عبد المجید صاحب سالک ، مولانا چراغ حسن صاحب حسرت ، مولانا تاجور اور حضرت حفیظ جالندھری جیسے اساتذۂ فن کی تقریظیں موجود ہوں وہ کیونکر قابلِ قدر نہیں ہوگی ۔ مگر اپنی کم علمی کی وجہ سے بعض بعض جگہ مجھے لغت کی طرف بھی رجوع کرنا پڑا ۔ خالص عربی الفاظ کو عربی لغات میں دیکھا ۔ اُردو کی لغات میں سے چونکہ صرف فرہنگِ آصفیہ ہی مجھے میسر آسکی ہے اس لئے اسی سے استفادہ کیا لیکن اس کوشش کے بعد بھی بعض الفاظ کے تلفظ وغیرہ میں اطمینانِ قلب حاصل نہ ہو سکا ۔ بنا بریں میں اُردو کے استاذ الاساتذہ قبلہ شیخ عبد القادر مدظلہ کی طرف رجوع کر رہا ہوں تاکہ وہ اپنے تبحرِ علمی سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمائیں ۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ قبلہ شیخ صاحب باوجود ضعفِ پیری اور دوسری مصروفیات کے اپنے "مخزن" کے لئے اپنے اوقاتِ ثمینہ کا کچھ حصہ عنایت فرماتے ہیں ۔ اب میں نمبروار ان الفاظ کو لکھتا ہوں جن کے متعلق میں اپنی کم علمی کی وجہ سے کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا ۔

(۱) تلفظ کے عنوان کے تحت عارف صاحب لکھتے ہیں :-

آئندہ صفحات میں مختلف الفاظ کے صحیح تلفظ کی تشریح کی گئی ہے ۔ اس فہرستِ الفاظ میں عام طور پر وہ عربی مصادر جن کا تلفظ معلوم کرنے کے لئے مخصوص وزن (باب) مقرر ہیں نہیں دیئے گئے ان کے متعلق قاعدہ کلیہ بتا دینا کافی ہوگا ۔ جو لفظ جس باب میں آتا ہو اس کے اعراب وہی ہونگے جو اصل باب کے ہیں ۔ اس کے بعد ابواب کے نام لکھ کر ان کے سامنے مثال

[redacted]

ے طور پر چند مصادر تحریر فرمائے ہیں۔

اِنْفِعَال ہ کے سامنے یہ مصدر لکھے ہیں۔ اِنبعاث۔ ئہدام۔ اِنتقام۔ اِنتظام وغیرہ، پھر کتاب کے صد ۱ پر ذکیر و تانیث کے عنوان میں لکھا ہے کہ جو الفاظ اِفتعال کے زن پر ہوں وہ مذکر ہیں اور اِفتعال کی مثالیں یہ دی ہیں مثلاً تنظار، احترام، اہتمام، اِنتظام وغیرہ۔

اب یہ تو یقینی بات ہے کہ اِنتظام انفعال اور افتعال دونوں ابواب سے نہیں ہو سکتا۔ بہرصورت اسے کسی ایک ب کے ساتھ مخصوص کریں گے۔ جہاں تک عربی والوں کا لق ہے وہ اسے (اور اسی طرح انتقام کو) افتعال کے بیلے میں شمار کرتے ہیں۔ اگرچہ انتقام و انتظام کو انفعال میں لکھ دینے سے تلفظ میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ لیکن ایسی اچھی کتاب میں ایسی چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی کیوں باقی رہے اس کی تصحیح ہو جانی چاہیئے۔

۲ ۔ اسپغول ۔ عارف صاحب اس میں الف اور پ پر زیر بتلاتے ہیں ۔ مگر فرہنگ آصفیہ میں اسے اِسْپَغول بکسرالالف منبط کیا ہے ۔ لغات کے ضبط میں اگرچہ کتابت کی غلطی کا احتمال موجود ہے مگر دیباچے میں مصنّف نے اپنے ضبط کے لئے خاص طور پر لکھا ہے کہ "لغات کے عبارتی حلیہ کی بجائے اعراب دیئے ہیں"! اور "لغات کے اعراب میں جہاں زیر پیش یا جزم نہ ہو وہاں زبر سمجھنا چاہیئے" گویا اُنہوں نے ضبطِ اعراب میں خاص اہتمام کیا ہے اس لئے اُس پر اعتبار کرنا چاہیئے ۔

۳ ۔ بُرل و براز ۔ براز میں ب کے نیچے زیر ہے (زباندانی) مگر عربی میں یہ لفظ بفتح الباَ ہے ۔ کیا اہلِ زبان اسے بکسرالباَ پڑھنے پر مُصر ہیں اور بفتح الباَ غلط ہے؟

۴ ۔ بُلقیس ۔ ب پر زبر (زباندانی) مگر فرہنگ میں بکسرالباء اسے منبط کیا ہے ۔

۵ ۔ بلُّوْر ۔ براوِ معروف (زباندانی) مگر فرہنگ میں لکھا ہے ۔ کہ بفتح بائے موحدہ ۔ اور بغیر تشدید بھی درست ہے ۔

۶ ۔ بَنِج بیوپار ۔ ن کے نیچے زیر (زباندانی) مگر فرہنگ کے ضبط میں ن پر جزم ہے ۔

۷ ۔ بھونڈا ۔ براوِ مجہول (زباندانی) واوِ مجہول کی تصریح کے ساتھ عارف صاحب نے بھ پر زبر لکھی ہے ۔ مگر فرہنگ میں بھ پر پیش ہے ۔

۸ ۔ بِیَابَان ۔ پہلی ب کے نیچے زیر (زباندانی) فرہنگ میں بَیَابَاں دونوں جگہ با پر زبر ہے ۔

۹ ۔ بیگُم ۔ گ پر پیش (زباندانی) فرہنگ میں گ پر زبر کے ساتھ (بیگَم) ضبط کیا ہے ۔ مگر آگے خطوطِ ہلالی میں یہ بھی لکھ دیا ہے (صحیح بکسر کاف فارسی) خدا جانے اِن تین حرکتوں میں سے صحیح کونسی ہے؟ یا سب صحیح ہیں ۔

۱۰ ۔ جِدّ و جَہد ۔ پہلی جیم کے نیچے زیر دوسری پر زبر (زباندانی) عربی کے لحاظ سے یہ اعراب صحیح ہیں مگر فرہنگ آصفیہ میں جِدّ و جُہد دونوں جیموں پر کسرہ کے ساتھ ضبط کیا ہے یہ فیصلہ اہلِ زبان یا ماہرینِ فقہ لسان ہی کر سکتے ہیں کہ اِس لفظ کو کس طرح پڑھنا چاہیئے ۔

۱۱ ۔ جَزَرع ۔ ر ساکن (زباندانی) فرہنگ میں زخم اور گھاؤ کے معنے میں ر کے پیش کے ساتھ ضبط کیا ہے ۔

۱۲ ۔ جُزْیان ۔ ر پر زبر اور ساکن دونوں طرح (زباندانی) فرہنگ

میں ج کی زبر کی بجائے زیر کے ساتھ ضبط کیا ہے۔

۱۳۔ جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ۔ قمری مہینوں میں سے پانچویں
اور چھٹے مہینے کا نام ہے۔ عربی گرامر کے رُو سے
جمادی الاولیٰ اور جمادی الأخریٰ صحیح ہے۔ جمادی الاول
اور جمادی الآخر صحیح نہیں (زباندانی)

عربی قواعد کے لحاظ سے تو یہ الفاظ بھی غلط ہیں۔ اور
صرف جُمَادَیٰ الاُوْلیٰ اور جُمَادَیٰ الآخِرَۃ صحیح ہیں۔ اسی طرح
رَبِیعُ الاَوَّل اور رَبِیعُ الآخِر کے سوا دوسرے تلفظ اور
صورت خطیاں غلط ہیں۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اہلِ علم
سے لے کر عوام تک سب جُمَادِیُ الاَوّلیٰ، جُمَادِیُ الاَوّل اور
جُمَادِیُ الاُخریٰ اور جُمَادِیُ الثّانی اور جُمَادِیُ الثّانیہ اور رَبِیعُ الثانی
عام بولتے اور لکھتے ہیں۔ اور تو اور لغات نویس (خواہ وہ
اُردو کے ہوں یا فارسی کے) بھی اس صحت کی پروا نہیں
کرتے۔ اب یہ فیصلہ اکابرِ فن کے ہاتھ میں ہے کہ وہ کس
کس تلفظ اور صورت خطی کو جائز قرار دیتے ہیں اور کس کس
کو غلط۔

۱۴۔ چہَل قدَمی۔ چہل میں ہ متحرک ہے ساکن نہیں (زباندانی)
لیکن عارف صاحب نے ہ پر صرف زبر ہی ضبط کیا۔
فرہنگ میں زبر اور زیر دونوں کو جائز ٹھیرایا ہے۔

۱۵۔ حَجَلہ۔ ح پر زبر ج ساکن (زباندانی) مگر عربی میں ج بھی
متحرک ہے۔

۱۶۔ حَقَارت۔ ح پر زبر (زباندانی) مگر عربی میں دونوں
حرکتیں ح پر (زبر اور زیر) جائز ہیں۔

۱۷۔ خَلعت۔ ل پر زبر (زباندانی) عربی میں اصل لفظ بسکون اللام
ہے۔ اب خدا جانے نظر کی طرح اُردو میں آ کر یہ بفتح اللام

ہُوا ہے یا چگونہ؟

۱۸۔ حَوْل۔ ح پر زبر (زباندانی) عربی میں یہ لفظ بضم الحاء
ہے۔

۱۹۔ حُلیہ۔ ح پر پیش (زباندانی) عربی بکسر الحاء (حِلیَہ)
ہے۔

۲۰۔ خَزاں۔ خ پر زبر (زباندانی) فرہنگ میں ہے کہ لغات
مالوں نے دونوں طرح درست لکھا ہے یعنی بکسر اوّل بھی درست ہے۔

۲۱۔ خصُومت۔ خ پر زبر (زباندانی) مگر عربی میں خ پر پیش
ہے۔

۲۲۔ خفگی۔ ف پر زبر (زباندانی) فرہنگ میں ف پر جزم
سے ضبط کیا ہے۔

۲۳۔ دُرویش۔ گدا کے معنے ہوں تو دال پر زبر، صاحبِ معرفت
کے معنوں میں دال پر پیش (زباندانی) حقیقۃً لفظ ایک
ہی ہے اور وہ دال کی زبر کے ساتھ ہے۔ مرادی معنے
کے طور پر اہلِ معرفت کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔
پھر اس میں یہ تفریق کیونکر آ گئی۔ فرہنگ میں دونوں
معنوں کے لئے دَرویش بفتح الدال ضبط ہُوا ہے فارسی
سے یہ لفظ عربی میں بھی چلا گیا اور وہاں بھی یہ بفتح الدال
ہی استعمال ہوتا ہے۔ ممکن ہے اُردو تک پہنچتے پہنچتے
زبر پیش سے بدل گئی ہو۔ اہلِ فن اس کے متعلق تصریح
فرمائیں۔

۲۴۔ دُلھن، دُولھا۔ ہائے مخلوط التلفظ ہے۔ لام ساکن کے
ساتھ صحیح نہیں (زباندانی) اہلِ زبان کو اسی طرح بولتے
سُنا ہے مگر فرہنگ میں دُلہن اور دُلہا ہی لکھا گیا ہے۔
خدا جانے یہ کاتب کا تصرف ہے یا دونوں تلفظ صحیح ہیں۔

[redacted]

۲۵- دِنامُت - دال کے نیچے زیر (زباندانی) مگر عربی میں یہ لفظ بفتح الدال ہے۔

۲۶- زَبُرْ بِیَتْ - ریہ زبر (زباندانی) مگر عربی میں بضم الرأ ہے۔

۲۷- مُساعَدْ - ع پر زبر (زباندانی) عربی میں یہ لفظ بکسر العین ہے۔ فرہنگ میں بھی بکسر العین ضبط کیا ہے۔ خود عارف صاحب نے بھی کتاب کے اوائل میں اسم فاعل میں الف کے بعد والے حرف کے نیچے زیر بتلائی ہے۔ (اگرچہ کاتب صاحب کے تصرف سے وہاں زیر کی بجائے زبر ہی چھپ گیا ہے) پھر ساعد کی کونسی خصوصیت ہے کہ اس میں زَبر پڑھی جائے؟

۲۸- شُبْہہ - ب ساکن (زباندانی)، عربی میں دو لفظ ہیں اَلشُّبْہُ اور اَلشُّبْہَۃُ - اور دونوں صحیح ہیں - اُردو میں عموماً پہلا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے جس کی صورت خطی "شُبْہ" ہونی چاہیئے - ہاں اگر دوسرا لفظ استعمال ہوتا ہے تو پھر اس میں کیا شبہ ہے کہ عارف صاحب کی صورت خطی صحیح ہے۔

۲۹- شَعْبَدَہ - ش پر زبر (زباندانی) مگر فرہنگ میں لکھا ہے کہ مشہور بضم اوّل ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ مشہور صحیح بھی ہے یا نہیں۔

۳۰- صَلْح - ل ساکن (زباندانی)، عربی میں لام کے سکون اور فتح دونوں طرح سے جائز ہے۔ کیا پنجاب میں جب عام طور پر ل کی زیر پڑھی جاتی ہے۔ اصلیت کی صحت کی وجہ سے اسے صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۳۱- طَمْطَراق - دونوں جگہ ط پر زبر (زباندانی)، مگر فرہنگ میں دونوں جگہ ط پر پیش ضبط کیا ہے اور اسے طُمْ (بلند) اور طُراق (خوشی) سے مرکب بتایا ہے۔

۳۲- عَدْن - دال ساکن (زباندانی)، عَدْن بہشت کا مضاف الیہ ہونے کی حیثیت سے تو اسی طرح بسکون الدال ہے جیسا حافظ فرماتے ہیں ؎

بہشتِ عدن اگر خواہی بیا بامابئے خانہ
کہ از پائے خمت یکسر بحوضِ کوثر اندازیم

مگر جب اِس سے عرب کا مشہور شہر مراد ہو تو عربی میں یہ مفتوح الدال آتا ہے اور شاید اِسی طرح فارسی میں بھی۔ اُردو دان حضرات فیصلہ فرمائیں کہ اُردو میں جب شہر مراد لیا جائے تو بسکون الدال بتدش کی جائے یا بفتح الدال؟

۳۳- عِشْوَہ - عین کے نیچے زیر (زباندانی)، عربی میں عین پر تینوں حرکات (زبر، زیر، پیش) جائز ہیں، کیا اُردو میں صرف عِشوہ صحیح ہے یا عُشْوَہ کو صحیح تسلیم کیا جا سکے گا؟

۳۴- عَلَوِی بمعنے اولادِ علیؓ، عُلْوِی، بلندی سے نسبت رکھنے والا (زباندانی)، پہلے لفظ میں تو کوئی شُبْہہ نہیں اس میں عین اور لام دونوں مفتوح ہیں۔ دوسرے میں عین کے پیش کی تحدید اگر اہلِ زبان سے ثابت ہے تو آمنّا و صدقنا ورنہ بناوٹ کے لحاظ سے عربی میں (اَلْعَلْوُ، اَلْعِلْوُ اور اَلْعُلْوُ) تینوں حرکات عین پر آ سکتی ہیں۔ عَلْوِی، عِلْوِی، عُلْوِی تینوں طرح درست ہوگا۔ اور تینوں جگہ ل پر علامتِ جزم ہی رہے گی۔ عَلْو عِلْو عُلْو کے ساتھ ایک اور لفظ عُلُوّ بھی آتا ہے یہ نسبت اس کی طرف نہیں ہے ورنہ عُلُوِّیّ کہنا پڑے گا اگرچہ اصل بناوٹ

کے لحاظ سے اسے بھی غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۳۵۔ عُقُوبت۔ عین پر زبر (زباندانی) عربی میں عین پر پیش ہے۔

۳۶۔ عِیْدُ الاَضحیٰ۔ قربانی کی عید، اگرچہ عید الضُحیٰ بھی لکھتے ہیں لیکن قربانی کا مفہوم ادا کرنے کے لئے موزوں لفظ عیدُ الاضحیٰ ہے (زباندانی) سیاقِ کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عارف صاحب عید الضحیٰ کو بھی جائز سمجھتے ہیں حالانکہ معنوی لحاظ سے عید الضحیٰ قطعاً غلط ہے۔ عید قربان کے معنے تو صرف عید الاضحیٰ ہی دے سکتا ہے کیا فتویٰ ہے علمائے فقہ لسان کا؟ عید الضحیٰ کے بارے میں۔

۳۷۔ فِراغ۔ ف کے نیچے زیر (زباندانی) عربی میں فَراغ بفتح الفا اور فِراغ بکسر الفاء، دونوں لفظ موجود ہیں۔ فَراغ بفتح الفا کے معنے فراغت کے ہیں اور فِراغ بکسر الفا کے معنے ہیں ڈول کا کنارہ یا بڑا پیالہ۔ اب یہ فیصلہ فقہائے زبان ہی کر سکتے ہیں کہ اردو کس لفظ کو اپنالے۔

۳۸۔ فِضا۔ ف کے نیچے زیر (زباندانی) مگر فرہنگ میں ف پر زبر (فَضا) کے ساتھ ہے۔ عربی میں بھی فَضا بفتح الفا ہے۔

۳۹۔ فی البدیہہ (زباندانی) اس لفظ میں عارف صاحب نے سوائے ضبطِ اعراب کے اور کوئی تصریح نہیں فرمائی۔ عربی میں اَلْبَدَاھَۃ اور اَلْبَدِیْھَۃ دونوں ہیں اور دونوں علےٰ کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں عَلَی الْبَدِیْھَۃ اور عَلَی الْبَدَاھَۃ۔ اردو میں جب ان میں سے کوئی لفظ استعمال کیا جائے گا تو دوسری تا کو ہا بنایا جا سکتا ہے۔ کیا بغیر آخری ہا کے " فی البدیہ" کہنا جائز ہے یا نہیں؟

۴۰۔ فِی الواقعہ فی الواقعی لکھنا فصیح نہیں (زباندانی) مگر کیا فی الواقعہ لکھنا فصیح ہے؟ فرہنگ میں اس لفظ کی صورتِ خطی " فی الواقع " دی ہے۔ واقع اور واقعہ عربی میں تذکیر و تانیث کے فرق کے ساتھ دونوں موجود ہیں مگر اردو میں فی کے ساتھ ان میں سے کونسا استعمال ہو سکتا ہے؟ کیا دونوں طرح جائز ہے؟

۴۱۔ قَبُول۔ ق پر زبر (زباندانی) عربی میں ق پر زبر اور پیش دونوں جائز ہیں۔ کیا اردو میں صرف زبر ہی جائز ہے یا پیش کے جواز کی بھی گنجائش ہے؟

۴۲۔ قراءَت۔ بروزنِ کتابت۔ قراءت بروزنِ جرأت غلط ہے (زباندانی) اس میں شک نہیں کہ عارف صاحب نے اس لفظ کی جو تصحیح فرمائی ہے عقل و نقل دونوں طرح درست ہے۔ قرأت کے معنے عربی میں وبا کے ہیں اور قراءَت کے معنے علمِ تجوید کے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اہلِ زبان کُلّہم (الاماشاءاللہ) قرأت ہی تلفظ فرماتے ہیں بلکہ عموماً قرأۃ ہی پر اکتفا فرما لیا جاتا ہے۔ خود فرہنگِ آصفیہ میں اگرچہ وزن کی تصریح نہیں مگر صورتِ خطی قرأت ہی کی لکھی ہے۔ یعنی ہمزہ الف کے اوپر ڈالا ہے۔ علمائے فقہ لسان اس کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ صادر فرمائیں۔

۴۳۔ قَلعہ۔ ق پر زبر (زباندانی) عربی میں بھی یہ لفظ قاف کی زبر کے ساتھ ہے۔ مگر فرہنگ میں زبر زیر دونوں حرکات منضبط ہوئی ہیں۔ علما فیصلہ فرمائیں کہ صرف

زیر لازم ہے یا دونوں حرکتیں جائز ہیں۔

۴۴۔ قماش۔ ق کے نیچے زیر (زباندانی) عربی میں بضم القاف ہے۔ فرہنگ میں دونوں حرکتیں زیر اور پیش منضبط ہوئی ہیں۔

۴۵۔ قَولَنج۔ ق پر زبر (زباندانی) فرہنگ میں ق پر پیش لکھا ہے اور لام پر زبر اور زیر دونوں منضبط ہیں۔

۴۶۔ کِتم۔ ک کے نیچے زیر ت ساکن (زباندانی) عربی میں ک پر زبر ہے۔

۴۷۔ کِشتی۔ بار دریائے خطا سے مری کشتی ہو جائے۔ دوزخی بھی تیرے صدقے سے بہشتی ہو جائے (زباندانی) اس سند سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کشتی بکسر الکاف ہونا چاہئے۔ مگر فرہنگ میں اس کی زیر اور زبر دونوں منضبط ہیں۔ کیا زبر کے ساتھ پڑھنا لکھنا ممنوع ہے؟

۴۸۔ لہو و لَعِب۔ ع کے نیچے زیر (زباندانی) عربی میں لَعْب بسکون العین اور لَعِب بکسر العین دونوں طرح جائز ہے۔ کیا اُردو میں بسکون العین اس کی بندش غلط ہے۔

۴۹۔ مُبلَغ۔ روپوں کی تعداد ظاہر کرنے کے لئے یہ لفظ بولتے ہیں اس میں ل مشدّد نہیں اور م پر پیش ہے (زباندانی) یہ لفظ عربی ہی سے ماخوذ ہے اور عربی میں اس کا تلفظ ان معنوں (الکمیۃ من الدراھم) میں مَبلَغ بفتح المیم وبفتح اللام اور بغیر تشدید کے ہے۔ یا تو اُردو میں وہی تلفظ باقی رکھا جائے ورنہ عام مروج تلفظ مُبلِّغ بضم المیم وکسر اللام کو صحیح مانا جائے۔ کیا ارشاد ہے علمائے فقہ اللغۃ کا اس میں؟

۵۰۔ مِٹّی۔ م کے نیچے زیر ہے مَٹّی زبر کے ساتھ صحیح نہیں (زباندانی) فرہنگ میں یہ لفظ زبر کے ساتھ عوام کی زبان بتلایا گیا ہے لیکن کیا عوام کی زبان کا ہر لفظ غلط ہوتا ہے؟ یا کم از کم غیر فصیح ہوتا ہے؟

۵۱۔ مُہیب۔ م پر زبر (زباندانی) مگر فرہنگ میں میم کے پیش کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے اور عربی قواعد کے لحاظ سے بھی میم پر پیش ہونی چاہئے۔ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مُرید، مُجیب، مُحیط کی طرح۔ کیا اہلِ زبان میم کی زبر کے ساتھ بولتے ہیں؟

۵۲۔ مَنافی۔ م پر زبر (زباندانی) مَنفی کی جمع قیاس کی رُو سے مَنافی آ سکتی ہے مگر یہ لفظ تو مُنافی میم کے پیش کے ساتھ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مُہاجر، مُقابل، مُناظر کے وزن پر۔ کیا اہلِ زبان اس میں میم کی زبر ہی بولتے ہیں؟

۵۳۔ نَجَس۔ ن اور ج پر زبر (زباندانی) عربی میں یہ لفظ نَجْس (جیم کی جزم ن کی زبر) نِجْس (ن کی زیر ج پر جزم) نَجِس (ن اور جیم پر زبر) نَجِس (ن پر زبر جیم پر زیر) نَجُس (ن پر زبر جیم پر پیش) سب طرح جائز ہے کیا اُردو میں اس کا صرف ایک ہی تلفظ جائز ہے یا کچھ وسعت ہے؟

۵۴۔ نَزَد۔ ن پر زبر (زباندانی) فرہنگ میں ن پہ زبر اور زیر دونوں ضبط کئے ہیں۔ کیا دونوں صحیح ہیں یا صرف زبر؟

۵۵۔ نِفاذ۔ ن کے نیچے زیر (زباندانی) عربی میں یہ لفظ ن کی زبر کے ساتھ آتا ہے۔ کیا اگر کوئی شخص وہی اصلی تلفظ بولے تو اُسے غلط قرار دیا جائے گا۔

۵۶۔ نفی۔ ف ساکن (زباندانی) بے شک مصدر کا تلفظ عربی میں یہی ہے مگر نَفِیْ ف کے زیر کے ساتھ بھی ایک لفظ عربی میں موجود ہے جو مَنفی کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ کیا فرماتے ہیں علمائے فقہ اللغۃ اِس بارے میں؟

۵۷۔ نُفُوْر۔ ن پر پیش (زباندانی) مصدر میں یہ اعراب صحیح مگر اس کے معنے ہوں گے نفرت کرنا۔ اگر اسم فاعل کے معنے میں استعمال کرنا ہو جیسے وہ اس سے نفور ہے تو وہ بفتح الفا (نَفُوْر) ہے۔ ظَلُوْم و جَہُوْل کے وزن پر۔ عربی میں دونوں لفظ موجود ہیں۔ اُردو میں جہاں تک میرا خیال ہے لفظ مصدری معنے میں کم ہی استعمال ہوتا ہے پھر اس کی بضم النون تحدید خدا جانے کہاں تک درست ہے۔ اہلِ زبان ہی اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

۵۸۔ نَہْج۔ ہ پر زبر (زباندانی) فرہنگ میں نَہْج بسکون ہا ضبط کیا ہے اور لکھا ہے کہ فارسی والے بفتحتین پڑھتے ہیں۔ عربی میں دونوں لفظ موجود ہیں۔ ہا کی جزم کے ساتھ اس کے معنے راستہ اور طریقہ کے ہیں اور ہا کی زبر کے ساتھ اس کے معنے ہانپنا کے ہیں۔ اُردو میں طریق واضح اور راستے ہی کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے تلفظ بھی وہی بسکون الہاء ہونا چاہئے۔ لیکن اگر یہ اہلِ زبان کے ہاں درست ہو تو۔

۵۹۔ نِوَالہ۔ ن کے نیچے زیر (زباندانی) فرہنگ میں نُوالہ ن کی زبر کے ساتھ ضبط کر کے آگے لکھا ہے کہ مشہور بکسرِ اول ہے۔ اب خدا جانے یہ مشہور غیر فصیح ہے یا فصیح۔ اہلِ زبان ہی فیصلہ فرما سکتے ہیں۔

۶۰۔ نَہْرُنی۔ ن پر زبر ہ پر پیش (زباندانی) فرہنگ میں نَہرنا اور نُہرنی ن کے پیش اور ہ کی زبر کے ساتھ ضبط کیا ہے خدا جانے وہ صحیح ہے یا یہ؟

۶۱۔ وَکَالت۔ و پر زبر (زباندانی) عربی میں و پہ زبر زیر دونوں جائز ہیں خدا جانے اُردو میں و کی زیر کیوں جائز نہیں۔

۶۲۔ وِلَایت۔ و کے نیچے زیر (زباندانی) عربی میں اس میں بھی زبر زیر دونوں حرکتیں جائز ہیں جیسے وزارت میں۔

۶۳۔ وِلَادت۔ و کے نیچے زیر (زباندانی) عربی میں و پہ زبر ہے۔

۶۴۔ ہِجْر۔ ج ساکن (زباندانی) عربی میں ہَجْر، ہِجْر، ہُجْر تین لفظ ہیں۔ ہ کی زبر کے ساتھ ترک و فراق کے معنے ہیں، ہ کی زیر کے ساتھ اچھے اُونٹوں کے معنے ہیں اور ہ کے پیش کے ساتھ اس کے معنی بکواس ہیں۔ یہ اہلِ زبان ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ اُردو میں کس لفظ کو کس تلفظ کے ساتھ کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

۶۵۔ ہَجُوْم۔ ہ پر زبر (زباندانی) فرہنگ میں ہ کے پیش کے ساتھ ضبط ہوا ہے۔ عربی میں بھی ہ پہ پیش کے ساتھ آتا ہے۔

۶۶۔ ہِذْیان۔ ہ کے نیچے زیر (زباندانی) عربی میں یہ لفظ ہَذَیان ہ اور ذ دونوں کے زبر کے ساتھ ہے۔ اُردو میں ذ کو تو یقیناً ساکن کیا جا سکتا ہے (دیکھیے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں، حالی) مگر یہ معلوم نہیں کہ اہلِ زبان ہ پہ زبر کی بجائے زیر ضروری سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص نثر میں ہَذَیان بفتحتین استعمال کرے تو اس استعمال کو خلافِ اہلِ زبان سمجھا جائے گا یا اسے برداشت کر لیا جائے گا۔

۶۷۔ ہِراس۔ زیر کے ساتھ (زباندانی) فرہنگ میں ہراس اور ہراساں دونوں کو ہ کی زبر کے ساتھ ضبط کیا ہے

۶۸۔ ہِرَن۔ ہ کے نیچے زیر (زباندانی) فرہنگ کے ضبط میں ہ پہ

زبر ہے۔

۶۹۔ یکُم، دُوُم وغیرہ یکم کے ک پر پیش، دوم سوم چہارم وغیرہ سب میں م سے پہلے حرف پر پیش ہے (زباندانی) فرہنگ میں دُوُم اور سِوُم منضبط ہوتے ہیں۔ آخر حرف کے ماقبل پر تو پیش ہے مگر کیا دال پر زبر اور س پر زیر بھی ضروری ہے؟ عارف صاحب دال پر پیش لکھتے ہیں۔

۷۰۔ لفظ دفعتہً میں ع کے بعد دو دانہ نہیں ڈالنا چاہئے۔ دفعتہً لکھنا چاہئے اور دفعتاً لکھنا بھی غلط ہے (زباندانی) بات تو عارف صاحب ہی کی صحیح معلوم ہوتی ہے مگر فرہنگ کی صورتِ خطی دفعتاً ہے جو عربی قواعد کے خلاف ہے۔ کیا اُردو میں اس کی پابندی کی جائے یا نہیں۔

۷۱۔ اَعْراب۔ (عرب کے بادیہ نشین) (زباندانی) اَعْراب کے معنے عربی میں ہیں جنگل کے رہنے والے (سکان البادیۃ) کیا اُردو میں اس کے معنے عرب کے بادیہ نشین بن جاتے ہیں۔

۷۲۔ زِمامت۔ (زباندانی) فرہنگ میں الف کی زیر منضبط ہوئی ہے اور عربی قواعد کے لحاظ سے بھی الف کی زیر ہونی چاہئے۔

۷۳۔ جَبِیْں۔ پیشانی، ماتھا (زباندانی) عربی اَلْجَبْهَۃُ ماتھا ہے اور اَلْجَبَۃ ماتھے کی فراخی اور حسن (اتساع الجبہۃ وحسنہا) کو کہتے ہیں۔ اَلْجَبْهَۃُ اُردو میں جَبْہَہ بنے گا جبہ نہیں بنے گا علمائے فقہ زبان ارشاد فرمائیں کہ کونسا صحیح ہے۔

۷۴۔ کُنْہ، حقیقت (زباندانی) یہ لفظ عربی میں اَلْکُنْہُ ہے اُردو میں اس کی صورتِ خطی اور تلفظ کُنْہ ہوگی نہ کہ کُنْہَہ۔

۷۵۔ جُزْ تُوْمَہ۔ (زباندانی) عربی میں جیم کے پیش کے ساتھ ہے۔

۷۶۔ دُکّان، جمع دَکاکین (زباندانی) عربی میں جمع بفتح الدال ہے۔

۷۷۔ دُوَل، جمع دُوَل (زباندانی) عربی میں جمع دال کے پیش اور زبر کے ساتھ ہے۔ زیر کی کوئی سند نہیں۔

۷۸۔ زباندانی میں اسمائے تصغیر میں مرغ، کتا، گائے، بھینس، گھوڑا ہاتھی کے اسمائے تصغیر چوزہ، پلا، بچھڑا بچھیا، کٹیا، بچھیرا، پاٹھا لکھے ہیں۔ کیا یہ اسمائے تصغیر ہیں؟ لغوی لحاظ سے نہیں اصطلاحی لحاظ سے۔

حضرت شیخ صاحب قبلہ خصوصی توجہ فرما کر مجھ جیسے کم علموں اور کم سوادوں کی مشکلات کو حل فرمائیں۔ نیز دوسرے اساتذہ بھی اگر اپنی رائے کا اظہار فرمائیں تو انتہائی ذرہ نوازی ہوگی۔ کیا تلفظ کی ایسی غلطیاں جن سے لفظ اپنی (عربی) اصلیت کے موافق ہوجائے قابلِ عفو نہیں سمجھی جاسکتیں؟

"طالوت"

زیر و زبر

لفظ	دہلی میں عام تلفّظ
مُرْشِد (بہ معنی ہدایت دہندہ)	مُرْشَد
مُبْتَلا	مُبْتِلا
سِلْوَٹ	سَلْوَٹ
نِشْتَر	نَشْتَر
بابِ اِفْتِعال و اِنْفِعال	"اِفْتَعال و اِنْفَعال" (ان ابواب کے تابع تمام الفاظ کا تلفظ بھی یونہی کیا جاتا ہے) ح

حکیم خورشید حسن خورشید سہارنپوری

کشمیر

میں سُن تو رہا ہوں گریاں سا میں پڑھ تو رہا ہوں حیراں سا
کچھ ٹوٹا ٹوٹا قصہ سا کچھ مٹتا مٹتا عنواں سا

کشمیر کی وادی وہ وادی جو وادی وادیٔ جنّت تھی
منکر بھی جہاں کا تھا ایسا، ہے گویا مردِ مسلماں سا

اس باغ میں وحشی آتے ہیں کلیوں کو مسلتے جاتے ہیں
ہر غنچہ دل کا پھپھولا سا ہر پھول ہے زخم نمایاں سا

اس دَور کا انساں کیسا ہے، اس دَور کے انساں کے ہاتھوں
ہے عصمت چاک گریباں سی، ہے حُسن دریدہ داماں سا

تن اُجلا ہے من میلا ہے یہ شور جہاں میں پھیلا ہے
سیرت میں جفا جُو حیواں سا صورت میں ستمگر انساں سا

اب اُن کو جلایا جاتا ہے جو دل کی آگ بجھاتے تھے
یہ انساں کی تصویر کا ہے پس منظر عریاں عریاں سا

روتی ہے سحر کشمیر کی اب کچھ شبنم سے کچھ بادل سے
ہر بوند ہے اِک چنگاری سی ہر قطرہ شعلہ بداماں سا

خورشید جو وادی جنّت تھی اس دَور میں اسکی صُورت ہے
اِک بکھری بکھری حسرت سی اِک سمٹا سمٹا ارماں سا

جلیل حسن جلیل

"دعوتِ کشمیر"

نغمے بکھیرتے ہوئے کشمیر جائیں گے
آزادیٔ وطن کے ترانے سنائیں گے
لیجا کے تم کو ڈل کے کنارے بٹھائیں گے
غنچے ہیں محوِ خواب انہیں گدگدائیں گے
جنت جو لُٹ چکی ہے اُسے پھر بسائیں گے
نغمے بکھیرتے ہوئے کشمیر جائیں گے

بیٹھیں گے اور سامنے تم کو بٹھائیں گے
مستی بھری نظر سے نظر کو ملائیں گے
چلنے لگو تو راہ میں آنکھیں بچھائیں گے
رُوٹھو گے تم تو گیت سُنا کر منائیں گے
غزلیں سُنائیں گے کبھی نظمیں سُنائیں گے
نغمے بکھیرتے ہوئے کشمیر جائیں گے

صحنِ چمن میں جائیں گے اور مُسکرائیں گے
کلیوں کا رنگ لیکے ہوا میں اُڑائیں گے
چھیڑیں گے یاسمن کو گلوں کو ہنسائیں گے
نسرین و نسترن کا تبسم جگائیں گے
گلشن میں جا کے گیت محبت کے گائیں گے
نغمے بکھیرتے ہوئے کشمیر جائیں گے

کشمیر کی فضاؤں میں مثلِ بہار چلے

دامانِ پہلگام میں ہوں نغمہ بار چل
ماضی کی کلفتوں سے نہ ہو دلفگار چل
گلمرگ ہو کے جائیں گے ہم شالا مار چل
اِس وادیٔ حسیں کو پھر اپنا بنائیں گے

نغمے بکھیرتے ہوئے کشمیر جائیں گے

ہر صبح اُٹھ کے برف کے گالوں سے کھیلنا
دیودار کے حسین تنہاؤں سے کھیلنا
ٹستانِ شالا مار کے پالوں سے کھیلنا
گلشن کے تازہ برق جالوں سے کھیلنا
ہر شام آپ ہم تمہیں جھولا جھلائیں گے

نغمے بکھیرتے ہوئے کشمیر جائیں گے

پھولوں کی سرزمین میں لے جائینگے تمہیں
دنیا میں جو بہشت ہے دکھلائینگے تمہیں
نغمے بھی آبشار کے سُنوائیں گے تمہیں
لے جا کے مرغزار میں بہلائینگے تمہیں
اپنی محبتوں کے فسانے سنائیں گے

نغمے بکھیرتے ہوئے کشمیر جائیں گے

اُڑتی ہوئی ہوا میں جب آئینگی تتلیاں
وجد آفریں ترانے سُنائینگی تتلیاں
گائیں گی اور مست بنائیں گی تتلیاں
پھولوں کا رس پروں میں چھپائیں گی تتلیاں
اُس دم ہم ایک راز بھی تمکو بتائیں گے

نغمے بکھیرتے ہوئے کشمیر جائیں گے

جمیل

مظفر علی سید

کلاسیکی ادب اور ہم

(مضمون نگار کی ہر رائے سے "مخزن" کا اتفاق لازم نہیں - مدیر)

انگریزی ادب کا کوئی غبی سے غبی طالب علم بھی کبھی اپنے ذہن کو اس طرف نہیں لے جا سکتا کہ ٹی ایس ایلیٹ آڈن، ہکسلے یا برنارڈ شا، چاسر، شیکسپیئر، ڈرائیڈن، پوپ اور ملٹن وغیرہ سے الگ اور آزاد ہو کر کوئی فنی تخلیق پیش کر سکتے ہیں۔ یقیناً ایسی آرا کی ادب میں کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ اب بھی اگر کوئی فرعون بے سامان ادب میں صرف تجربے کے پیشِ نظر تمام روایات کو خیرباد کہہ کر ماضی سے اپنا دامن چھڑا لے اور اس سے کوئی علاقہ نہ رکھے۔ تو وہ حال کی عکاسی بھی نہیں کر پائے گا۔ مگر آج کا اُردو شاعر اور افسانہ نگار ان سب قیود سے بالاتر ہے۔ اور شاید انفرادی آزادی کے نظریے کے پیشِ نظر اُس نے ہر قسم کی روایت کی "جکڑ بندیوں" سے اپنے آپ کو آزاد سمجھ لیا ہے۔ موجودہ اُردو ادب کا معتد بہ حصہ کلاسیکی ادب سے بالکل کٹا ہوا ہے اور دَورِ حاضر کے ادیبوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ کسی مسئلہ کے متعلق اس کے پیشرو کیا خیال ظاہر کر چکے ہیں، اُنہوں نے کون سے الفاظ استعمال کئے اور کیا اسلوب اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں قدیم اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے وہی لوگ ہیں جنہیں نستعلیق قسم کے بزرگ کہا جاتا ہے۔ جدید دَور کے شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنے ماضی سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھنا چاہا۔ اس کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں۔

تنقید میں جب سے ادعائیت (Dogma) کا سلسلہ جاری ہوا ہے۔ ہر قسم کی قدیم تخلیق کے خلاف صرف تنگ نظری کی بنا پر کوئی خاص فتوے صادر کر دیا جاتا ہے پھر اس کے ہر پہلو کو ناقابلِ اعتنا سمجھ کر اس پر غور نہیں کیا جاتا۔ قصیدے ہی کو لیجئے جسے نئے لوگوں نے نہایت حقیر چیز سمجھ لیا۔ اُن کا قول ہے کہ قصیدہ گو شعرا کا بادشاہوں کی مدح سے طلبِ زر کے سوا کوئی مقصد نہ تھا۔ اور اس مسلسل تُک بندی میں کوئی معنی خیز بات ہو بھی نہیں سکتی۔ یہ فتوے نئے لوگوں کے کسی ایسے لیڈر نے دیا جس کو خود اُردو کلاسیکی ادب کی روایات اور مقتضیات کا کوئی علم نہ تھا۔ صرف غلط اخلاقی برتری کے احساس سے سودا۔ ذوق اور دوسرے لوگوں کے قصیدے اپنی تمام کلاسیکی خصوصیات کے ساتھ کسی الگ تھلگ گوشے میں پھینک دیئے گئے۔

پھر یہیں سے ایک اور خیال چلا کہ پرانے لوگ سامنتی (FEUDAL) دَور کے تھے۔ ان کے اذہان بہت پست تھے اور وہ ہا و ہُو کے سوا کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ اُن کی قنوطیت کسی انقلاب کے لئے البتہ ردِ عمل کے رجحانات پیدا کر سکتی تھی۔ عشق کے متعلق بھی ان کا نظریہ بڑا غیر صحت مند سمجھا گیا۔ "اَمرد پرستی" کی دشمنی نے اُردو شاعری کے معتد بہ حصے

کر دُور پھینک دیا۔ اور تمام اُردو ادب "سامنتی عہد کی پیداوار ہو کر رہ گیا۔

اُردو میں جب بے ساختہ نثر کے نظریے نے زور پکڑا لوگوں نے مقفیٰ نثر کو ہاتھ لگانا بھی چھوڑ دیا مبادا کوئی گزند پہنچ جائے۔ میر امّن اور دلّی تک چھوٹ گئے۔ اور نئے لکھنے والوں نے جب بڑی حد تک مذہب سے قطع تعلق کیا تو اسلام چھوڑ کر انہیں مسلمانوں کے کسی خاص فرقے کے عقائد سے کیا غرض ——— سو انیسؔ، دبیرؔ وغیرہ بھی چھوٹ گئے ——— چلو چھٹی ہوئی۔

دنیا زیادہ "علمی" ہوتی گئی تو تمام خرقِ عادت واقعات اور داستانوں کو بھی محض اوہام کی پیداوار سمجھ کر پرے پھینک دیا گیا۔ الف لیلہ اور طلسم ہوشربا تو اپنے متروکات اور قدیم اندازِ بیان کی وجہ سے پہلے ہی "تقویم پارینہ" ہو چکے تھے۔ اب میر حسن کی سحرالبیان، فسانۂ عجائب اور بیشتر دوسری تخلیقات بھی اسی بے اعتنائی کی نذر ہو گئیں۔ ورنہ خرقِ عادت واقعات و سوانح کو دوسری زبانوں کے ادب میں جتنی اہمیت حاصل ہے اتنی ہی اُردو ادب میں بھی ہوتی۔ پریوں اور دیودں کی کہانیوں کو غیر علمی سمجھ کر نظر انداز کر دینا "قرینِ مصلحت" ہو تو ہو مگر یوں تو موجودہ انسان بھی ترقی یافتہ توہم کے دام سے نہیں نکل سکا۔ انگریزی ادب میں کولرج کی شاعری اور الف لیلہ کے انگریزی تراجم ٹکسال باہر قرار نہیں دے دیئے گئے۔ مگر اپنے یہاں تو ہر چیز کو صرف کسی محدود نقطۂ نظر سے جانچا جاتا ہے اور جو چیز اس کے مطابق نہ ہو وہ مردود ہو جاتی ہے، چنانچہ ہمارے نئے ادب نے بھی اسی طرح پرانے ادب سے تعلقات منقطع کر لئے۔

دو حادثوں نے اِس خلیج کو اَور بھی وسیع کر دیا۔ ان میں سے ایک نظم میں نئی ہیئت کا مسئلہ تھا لیکن متقرر ارکان سے آزادی حاصل کرنا اگر انگریزی ادب کی تقلید میں ضروری تھا تو انگریزی ادب کی طرح اسے ماضی کے رابطوں سے بندھا ہوا بھی ہونا چاہیئے تھا۔ دورِ جدید کی آزاد انگریزی نظم شیکسپیئر اور ملٹن کی بے قافیہ نظم اور پابند شعرا کی بہترین تخلیقوں سے اس قدر الگ تھلگ نہیں جس قدر ہماری نئی نظم۔ ہمارے ہاں فرض کر لیا گیا کہ غزل تنگ بندی ہے اور ہر شعر میں قافیہ کا سہارا ڈھونڈنے کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کی تخلیق تسلسلِ خیال اور منطقی ربط سے عاری ہے۔ اور اس کے پاس مسلسل اظہارِ خیال کے لئے کوئی موضوع نہیں چنانچہ تنگنائے غزل سے نکل جانے ہی کو بہترین اجتہاد سمجھا گیا۔ اُدھر غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن قرار دے کر نئے لوگوں نے اُردو میں نظمیہ عناصر کو داخل کرنے پر زور دیا۔ تمام غزل گو شعرا تنگ بند قرار دے دیئے گئے۔ بخلاف اس کے پُرانے لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ نئے شاعر قافیہ اور مساوی ارکان سے اِس لئے گھبراتے ہیں کہ قادر الکلام نہیں۔ یہ لفظ تو تحریر میں استعمال نہیں کروں گا مگر اتنا ضرور ہے کہ ادب میں اظہار کے طریقوں کی واقفیت پُرانی انواع و اصناف کے مطالعے ہی سے ہوتی ہے۔ نئے شاعروں کو اگر اُردو میں نظمیہ عناصر لانا تھے تو غزل کو متروک قرار دینا ضروری نہ تھا۔ وہ اُردو کے کلاسیکی ادب کو بھی پہچانتے تو انہیں خود غزلوں میں نظمیہ عناصر مل جاتے اور اگر وہ ان کے اسلوب کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرتے تو ان کی بہترین خصوصیات آپ سے آپ نئی شاعری میں جذب ہو کر اسے زیادہ پُراثر

اور موزوں طریقۂ اظہار کے مطابق بنا دیتیں۔ مَیں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ نئی ہیئت کی بذاتِ خود کوئی ضرورت ہی نہ تھی مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ہیئت اس حد تک الگ اور مختلف نہ ہو جاتی۔ نئی ہیئت کی تلاش ہی اگرچہ شاعری نہیں مگر نئی ہیئت نئے اندازِ خیال کے لئے ایک مسبّب کی حیثیت ضرور رکھتی ہے۔ اُردو میں آزاد نظم کا نعرہ اسی دلیل کے ماتحت بلند کیا گیا کہ اسلوب اور موضوع پر کوئی خارجی پابندی عاید نہیں کی جا سکتی۔ قافیہ اور وزن اگر خارجی پابندیاں ہوتے اور نقصان پہنچا... داخلی جذبات کو ان سے کوئی ہم آہنگی نہ ہوتی تو یہ نعرہ واقعی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا مگر چونکہ ایسا نہیں تھا اس لئے اس نے صرف یہ کام کیا کہ نئی پود کو پرانے ادب سے بدظن کر کے خود اُسے نقصان پہنچایا۔

ہمارے نئے ادب میں شہوانی عنصر بھی ایک نیا بحث ہے۔ نئے ادیبوں کی اس سے وابستگی ایک نئے ادبی مذہب کا رنگ اختیار کر رہی ہے۔ نئے ادیب اس کے جواز میں ہر قسم کے دلائل استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جب بعض نئے لکھنے والوں کی شہوانی تحریروں کے متعلق کچھ کہا سُنا گیا تو اُنھوں نے اِدھر اُدھر سے ہاتھ مار کر پرانے لکھنے والوں کے بھی کچھ شعر نکال کر رکھ دیئے۔ خود منٹو نے مومن اور اثر کی مثنویوں میں سے کچھ اشعار نکال کر انہیں شہوانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بتایا منٹو کو غالباً خود ان کے سیاق و سباق کا علم نہ تھا اور پھر جب وہ خواب و خیال کے مصنف کو درد دہلوی کہہ دیں تو ہمارے لئے بحث کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔ کچھ اَور لوگوں نے آتش اور دوسرے لکھنوی شاعروں کو شہوت پرست بتایا اور کلاسیکی ادب ان حوالوں سے بھی سنجیدہ طبقے سے دُور ہو گیا۔

مگر یہ کسے خبر تھی کہ کلاسیکی ادب سے کٹ کر زبان اور بیان کی نئی راہیں تراشنا ناممکنات میں سے ہے۔ نئے لوگوں نے زبان کو خاص اہمیت نہ دی۔ نثر نگاروں نے انگریزی اور فارسی اندازِ تحریر اختیار کرنا شروع کر دیا۔ اُردو کی خصوصیات دب کر رہ گئیں۔ جہاں کہیں زبان اور روزمرہ کے استعمال کا موقع آیا دامن بچا کے نکل گئے، یا کوئی فارسی ترکیب یا کسی انگریزی جملے کا ترجمہ لکھ کے ٹال دیا۔

ترقی پسند تحریک کے پیشرو نقاد شاعر اور نثر نگار بھی پرانے ادب سے بدظن تھے۔ اختر حسین رائے پوری نے پرانے ادب کو اپنے زمانے کے واقعات کی عکاسی سے خالی بتایا اور اُردو ادب کو صرف اِسی لئے مطعون قرار دے دیا کہ قدیم شاعروں نے پلاسی کی جنگ پر کوئی نظم کیوں نہ لکھی۔ قصیدہ اور غزل پر وہ پہلے ہی لعن طعن کر چکے تھے۔ نظریات کی باری آئی تو حُسن و عشق کے بارے میں قدیم نظریات کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ہر جگہ مایوسی ہی مایوسی نظر آئی۔ وہی پرانا رونا۔ سو قدیم ادب یک قلم گردن زدنی قرار دے دیا گیا اور اختر حسین رائے پوری جو جدید روسی ادب کو کلاسیکی روسی ادب کی ایک نئی کامل صورت بتاتے ہیں۔ اُردو ادب میں "انقلاب" لانے پر تُل گئے۔ نئی نسل پر ان پیشروؤں کا خاصا اثر ہوا اور اُس نے اُنکی بات کو وحی آسمانی سمجھ کر کلاسیکی ادب سے ایک منظم بے اعتنائی شروع کر دی چنانچہ اُردو کلاسیکی ادب کی چھان بین کرنے والے الگ ہو گئے اور جدید تحریکوں سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا۔ چونکہ پرانے ادب کے معتد بہ حصے کا صرف نشان ہی ملتا تھا۔ اور بیشتر کتابیں یا تو چھپی نہ تھیں یا عام طور سے ملتی نہ تھیں۔ ان کی تلاش اور طباعت کے لئے ایک خاص پرانا طبقہ مخصوص ہو گیا۔ اور عبدالحق، مسعود حسن رضوی، محمود شیرانی، حامد حسن قادری،

احسن مارہروی، نصیر الدین ہاشمی، سید عبداللہ اور دوسرے لوگ بالکل الگ پارینہ دفتروں کی چھان بین میں لگ گئے۔ نئے لوگوں نے ان کے کام سے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔

حال میں بڑی شدت سے یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ نئی پود اپنے پرانے ادب سے روز بروز بے خبر ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ بزرگوں نے بھی تنبیہ کی ہے اور خود نوجوانوں میں سے بھی پڑھے لکھے طبقے نے پرانے ادب پر ناقدانہ نظریں ڈالنا شروع کر دی ہیں۔ ان میں ہر قسم کے نقطۂ نظر کے ترجمان موجود ہیں۔ فراق اور مجنوں گورکھپوری ایسے بزرگ بھی ہیں جو پرانے ادب کی بہترین خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر چکے ہیں۔ اور تخلیقی تنقید سے ان کو زندہ رکھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اور کلیم الدین احمد ایسے نوجوان بھی تھے جو ہر پرانی چیز میں کیڑے نکالتے تھے۔ فراق نے مصحفی، آتش، میر، ذوق اور غالب میں سے ہر ایک کی بہترین روایات کو اپنا مسلک بنا لیا۔ اور جدید انداز تنقید کے مطابق ان پر غور و خوض بھی کیا۔ انھوں نے غزل میں نظمیہ عناصر کا اضافہ کیا اور غزل کی اہمیت کی توضیح کی اور اردو کی عشقیہ شاعری کے بنیادی جذبات کا تجزیہ کر کے ان کی اہمیت جتائی اور نئی پود کو بتایا کہ تم میں کیا کیا لوگ تھے۔ مجنوں گورکھپوری نے اثر، میر اور قائم و بیدار وغیرہ کی شاعری پر مضمون لکھ کر اردو شاعری کے کئی پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کرنے کے بعد ان کی خصوصیات بتائیں اور لوگوں کو ان کی تنقیدی اہمیت سے آشنا کیا۔ کلیم الدین احمد نے شروع میں اگرچہ تذکروں کے چند ادبی نقاروں سے جمع کئے ہوئے حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ اردو میں سرے سے تنقید کا وجود ہی نہیں۔ اور اردو کی غزل کی شاعری بھی بہت زیادہ قابلِ قدر نہیں۔ مگر اس کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ایک تعمیری کام میں لگا لیا۔ اور نئی پود کی دلچسپی کے لئے اپنی کتاب "داستان گوئی" میں بوستانِ خیال کے غیر فطری اور فوق العادۃ واقعات کی اس خوبی سے تفسیر کی کہ جدید علمی دنیا کے ہوشمند انسانوں کو اس پر ناک بھوں چڑھانے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اور اردو کے قدیم اسالیب پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر اس کی خوبیاں گنوائیں۔ دوسرے نقاروں میں سے بھی بعض نے میر حسن اور نظیر اکبرآبادی کو موضوع بنا کر قدیم کلاسیکی ادب کی روایات کو زیادہ صداقت سے پیش کیا۔ فراق کی مساعی غزل کے تجزیہ کی حد تک تو ضرور کامیاب ہو گئیں مگر پرانے ادب پر تحقیقی انداز سے نظر ڈالنے کے کام میں زیادہ تیزی کی ضرورت تھی غالباً پرانی قسم کے لوگوں کے سوا کوئی یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس کی تکمیل اب تک نہیں ہو سکی۔

نئے لوگوں میں سے کسی نے، خصوصیت سے نثر نگاروں کو اب تک یہ احساس نہیں دلایا کہ تم میر امن، آزاد، سرشار، سرسید، نذیر احمد اور ناصر نذیر فراق کے اسالیب سے بے نیاز ہو کر فائدے میں نہیں رہو گے۔ اسی کمی کی وجہ سے نئے لوگوں کا ذخیرۂ الفاظ اور طریقِ اظہار ان کے موضوعات کے تنوع کا ساتھ نہیں دے سکا۔ احمد علی اور فرحت اللہ بیگ کے علاوہ بہت کم لوگوں نے عوامی روزمرہ کو ڈھب سے استعمال کیا۔ نئے لوگوں میں سے کسی نے زبان کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ محمد حسن عسکری نے اپنے افسانوں

ہیں۔ اشرف صبوحی نے اپنی کتاب "دلّی کی چند عجیب ہستیاں" میں جس قسم کی زبان استعمال کی وہ نذیر احمد اور ناصر نذیر فراق کے اسالیب سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ان کی خصوصیات کو جلو میں لئے ہوئے ہے۔ اِس کے برعکس منٹو نے جس کا موضوع (طوائف) نسوانی زبان کے گہرے مطالعہ کا مقتضی تھا محاوراتِ نسواں کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی اور یہ نہ دیکھا کہ ان کی زبان پر پرانے لوگ کس قدر اچھا اثر ڈال سکتے ہیں۔ البتہ عصمت چغتائی زبان کے معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں کیونکہ اُنہوں نے اُردو کے ذخیرۂ الفاظ سے فائدہ اُٹھا کر اپنی تحریر میں خاطر خواہ اثر پیدا کر لیا۔ کرشن چندر شاعرانہ زبان میں اُلجھے رہے۔ اُنہوں نے اپنے ماحول سے واقفیت کا سوال پیدا ہوتے ہی نہ دیا، اور جب کبھی اس کا موقع آیا تو بات ٹال گئے۔ راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ وغیرہ بھی قدیم اُردو ادب سے ناواقفیت کے باعث ناقص زبان لکھتے رہے۔ پرانے اُدباء میں بھی پریم چند نے اپنے آپ کو نذیر احمد سے بہت دُور کر لیا تھا۔ دیہاتیوں کے کرداروں میں بھی انہوں نے ان کی زبان کے استعمال کو خاص اہمیت نہ دی تھی۔ اُن سے زیادہ تو خواجہ حسن نظامی نے دھوبیوں نائیوں کے مکالموں میں روزمرہ گفتگو کا نمونہ پیش کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پریم چند کے پیروؤں میں سدرشن۔ علی عباس حسینی، اعظم کریوی اور اپندر ناتھ اشک نے بھی زبان کی مقامی حیثیت پر توجہ نہ کی اور صرف سادہ سپاٹ زبان استعمال کی۔ "زبان کا چٹخارا"، "روزمرے کی چستی" اور ایسی ہی چیزیں شاید اپنے مضحکہ خیز ناموں کی وجہ سے غیر مقبول رہیں۔ اُردو کا بہت بڑا ذخیرۂ الفاظ فسانۂ آزاد، آبِ حیات، نیرنگِ خیال، نذیر احمد کے ناولوں، "ملاقتوں کی کہانیاں"، چار چاند اور دوسری چھوٹی موٹی کتابوں میں ہے۔ ناصر نذیر فراق کے ایک چھوٹے سے افسانے "اختر محل" کے متعلق سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ نے لکھا کہ آپ نے اتنے چھوٹے سے افسانے میں اتنے دلّی کے ٹھیٹ محاورے بھر دیئے کہ مجھے حیرت ہے۔ ناصر نذیر فراق کے بعد دلّی کے لکھنے والوں میں سے فرحت اللہ بیگ کی زبان و بیان کو خاص اہمیت حاصل ہے اُنہوں نے نازک سے نازک مواقع پر نہایت جامع اور مختصر الفاظ و محاورات کا استعمال کر کے دکھا دیا کہ اُردو کا یہ نثر نگار آزاد، سرشار اور نذیر احمد کی روایات سے آزاد نہیں ہے بلکہ ان سب کی خصوصیات اس میں مجتمع ہو گئی ہیں۔ زبان کی جامعیت اور اختصار موضوع کو برجستہ اور مؤثر بنانے میں جس قدر مدد دے سکتا ہے اس کے لئے مجھے حالی اور شبلی کے حوالے دینے کی ضرورت نہیں بلکہ خود انگریزی ادب کی مثالیں میں جس قدر دے چکا ہوں ان پر یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ نثر میں چارلس ڈکنز نے جس تفصیلی محاکات کے نمونے پیش کئے، الیکشن اور لڑائیوں کے جیسے مناظر قلم بند کئے اگر وہ صرف "انقلابی" ہوتا اور ماضی کے رابطوں سے بندھا ہوا ادیب نہ ہوتا تو اپنے فن میں اتنا کامیاب نہ ہو سکتا۔

زبان اور اسالیب کی تعمیر کے علاوہ قدیم ادب اپنے زمانے کے واقعات اور حالات سے آزاد نہیں ہے۔ امجد علی شاہ کے زمانے کے ادب میں، شوق کی مثنویوں میں، دریائے تعشق، واجد علی شاہ اختر میں۔ اثر دہلوی، میرزا سودا اور

میرؔ کے کلام میں واقعاتِ عہد اگرچہ براہِ راست تفصیل سے بیان نہیں ہوئے مگر اُن کا کافی گہرا عکس موجود ہے۔ نظیرؔ اکبر آبادی کی شاعری اگر صرف لفظوں کی جادوگری قرار دے دی جائے اور اُس کے نٹ کھٹ پن کو مداری کے کرتب کہہ کر جی خوش کرلیا جائے یا صرف یہی کہہ دیا جائے کہ اس کی نظموں سے ہمارے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے یا اظہار کے نئے نئے طریقے سوجھتے ہیں تو یہ بھی نظیرؔ کی ہتک ہے، نظیرؔ اپنے وقت کا عکاس بھی ہے اور اس نے بنجارہ نامہ، آدمی نامہ اور رقص جیسی نظموں میں اپنے زمانے کے حالات کی جو جھلکیاں دکھائی ہیں ان سے کوئی صاحبِ ہوش آنکھ بند نہیں کرسکتا۔ میرحسنؔ اور میرؔ کی شاعری صرف رومانیت ہی نہ تھی، بہترین شاعری کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس میں اپنے زمانے کی خواہشات کا پرتو بھی تھا اور اخترحسینؔ رائے پوری کی طرح ہر کسی کی ہمت نہیں کہ کھینچ تان کر قدیم شاعری کو وقت کے اثرات سے بے نیاز ثابت کر دکھائے۔

اُردو شاعروں کو میں خالص قافیہ پیمائی کی مشق کا مشورہ نہیں دے سکتا لیکن آزاد نظم جس کی مقبولیت فراقؔ اور اُس کے معتقدین کے اثر سے کم ہوتی جا رہی ہے اگر صرف ضرورت کے مواقع پر کہی جاتی اور پُرانے ادب کے مطالعے سے اس کی ضرورت کو حتی الوسع کم کر دیا جاتا تو ہماری شاعری میں اس کی وجہ سے آئی ہوئی غیرشاعرانہ بے اعتدالیاں رُک سکتی تھیں۔ موجودہ زمانے میں بھی فیضؔ، ندیمؔ قاسمی، ساحرؔ لدھیانوی اور قیومؔ نظر اچھی غزل لکھنے کے ساتھ پابند نظم بھی لکھتے ہیں مگر وہ آزاد شعراء سے کسی طرح پیچھے نہیں بلکہ غالباً اُن سے زیادہ مقبول ہیں۔

بعض مواقع پر تو آزاد نظم آنا مکروہ سا تصوّر پیدا کرتی ہے کہ اس سے بیزار ہو جانے کو جی چاہتا ہے خصوصیت سے جہاں لکھنے والے نے نثری انداز تحریر میں شعریت کا خون کرکے رکھ دیا ہو۔ مجھے تصدقؔ اور تلکؔ تولسوی کی آزاد نظم میں کبھی راشدؔ کی آزاد نظم کے سے تکنیکی شعور کا احساس نہیں ہوا۔

عہد حاضر کے پابند لکھنے والوں میں سے جوشؔ ملیح آبادی اپنے جدِ امجد فقیر محمد خاں گویاؔ اور اُن کے ہم عصر مرثیہ گو شعراؔ کے اسالیب سے بہت متاثر ہیں۔ مگر وہ اپنے مغلق اور پُرشور انداز تحریر میں وہ نرمی اور شیرینی کی چاشنی نہ لا سکے، جو میرؔ، آتشؔ اور مصحفیؔ کی وجہ سے حسرتؔ، فراقؔ اور ان کے معتقد غزل گو شعراء کے کلام میں ملتی ہے۔ یگانہؔ، چنگیزیؔ اگرچہ عزیزؔ لکھنوی کی رقابت کی وجہ سے غالبؔ کو جلی کٹی سنانے میں بہت بے باک ہیں۔ مگر اپنی شاعری میں وہ بھی پرانے ادب کی بہترین خصوصیات کے اتنے ہی بڑے محافظ ہیں جتنے بڑے حسرتؔ موہانی اور فراقؔ وغیرہ۔

اقبال باوجود اپنے ٹھوس استدلال اور نئے پیغام کے اُردو ادب کے قصیدہ، مرثیہ اور غزل کی روایات سے الگ نظر نہیں آتے۔ وہی شوکت، وہی چستی وہی مرصع انداز اُن کے کلام میں موجود ہے۔ جو سوداؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور انیسؔ سے اُن تک پہنچا ہے۔

آخر میں شاید یہ بات واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میرا مقصد قدامت پرستی کی جا و بے جا تلقین نہیں ہے مثلاً تنقید ہی کے مسئلے کو لیجئے۔ ہمارے زمانے میں ادبی تنقید کا فن بہت ترقی کرچکا ہے۔ اس لئے آزادؔ، حالیؔ اور شبلیؔ کو ہم اپنے لئے قطعی دلیلِ راہ نہیں بنا سکتے تاہم ہم آبِ حیات، شعر العجم، موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ اور مقدمہ شعر و شاعری سے

پوری طرح قطع تعلق کرنا بھی مناسب نہ ہوگا، بلکہ اُن کے خوبصورت ترین حصوں کی بہترین خصوصیات کو نکھارنا اور اُبھارنا ہمارا مقصد ہونا چاہیئے اور اگر ہم اس کے ساتھ ساتھ تنقید کو زیادہ آسان، زیادہ موثر اور زیادہ علمی بنا سکیں تو یہ آزاد، حالی اور شبلی کی خدمت میں نذرِ عقیدت ہی نہیں اُردو زبان و ادب کی بھی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

مظفر علی سیّد

پیامِ اقبال

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوّت کی جہانگیری، محبّت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گُم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

کیا صُوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
اُن کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے
کب تک رہے محکومیِ انجم میں مری خاک
یا مَیں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے
بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے
عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ ادراک نہیں ہے

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

جگن ناتھ آزاد

بہارِ آزادی

(۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی یاد میں)

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری

فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں اُن کی
جنونِ سرفروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
مَیں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

نشانِ برگِ گل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گزری

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہُوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گزری

صادق قریشی

جلال پور کا چودھری

(پنجابی دیہاتی افسانہ)

برسیم کی بھینی بھینی خوشبو نے کریم کی دُبلی پتلی گائے کو وارفتہ کر دیا۔ وہ اپنے کھونٹے کے گرد زور زور سے گھومنے لگی۔ اور ایک بار جب ہوا کا ایک جھونکا خوشبو کے خزانے لٹاتا آیا تو گائے نے ایک ہی زوردار جھٹکے میں رسّا توڑ دیا اور بھاگ کر برسیم کے کھیت میں جا دم لیا۔

اسی وقت کھیت کے دوسرے سرے سے سمندرے خاں شیر کی طرح گرجنے لگا۔ اِس دیو قامت زمیندار کی بھاری آواز انسان چھوڑ بیلوں تک کو ڈرا دیا کرتی تھی۔ کریم قریب ہی چارہ کاٹ رہا تھا۔ چودھری کی آواز سُن کر چونکا اور لپک کر گائے کے پاس پہنچ گیا۔ اُس کی اُبھری ہوئی پسلیوں پر کریم نے دو تین تیز تیز جڑ دیئے۔ اور کان سے کھینچ کر پھر کھونٹے پر لا باندھا۔

اگلے دن کریم اپنے لڑکے فضل کو مدرسے سے اُٹھا لایا، تاکہ وہ اس کے پاس رہ کر ڈھور ڈنگر کی نگرانی کرے اور اس طرح چودھری کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچاؤ ہو سکے۔ مدرسے کے منشی نے لاکھ کہا کہ فضل ہونہار لڑکا ہے۔ پانچویں پاس کر لے تو اُٹھا لینا مگر کریم نے ایک نہ سُنی۔

جلال پور میں کریم کا گھر سمندرے خاں کی حویلی کے قریب ہی تھا فضل کا بچپن اسی حویلی میں کھیلتے گزرا تھا۔ سمندرے خاں کی لڑکی ریشمے اس کی ہمجولی تھی۔ اس کے ساتھ کھیلنے سے فضل کو بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ اکثر اپنے گھر سے گڑ، گنے اور رس وغیرہ کھانے پینے کے لئے لا دیا کرتی تھی۔ کبھی وہ سارا سارا دن کنوئیں پر ریت کے گھروندے بنا بنا کر کھیلتے رہتے اور گہری شام کو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھروں کو لوٹتے۔

اب فضل بھی سیانا ہو چکا تھا اور ریشمے بھی۔ وہ سارا دن بیلوں کے پیچھے پھرتا رہتا اور یہ گھر کا کام کاج ختم کرنے میں لگی رہتی۔ اب دونوں کو آپس میں ملنے اور اکھٹے بیٹھنے کا موقع بہت کم ملتا تھا، بلکہ ریشمے کو تو اُس کی ماں نے ایک دن فضلو کے سامنے کھِل کھِلا کر ہنسنے پر ڈانٹ بھی پلائی تھی ـــ تو اچھی لگتی ہے گھوڑی کی طرح ہنہناتی، بوتے کے برابر ہو گئی ہے اور بچپن نہیں گیا، چل اندر جا کر چرخا کات!

ریشمے گئی تو فضل کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے سینے کے اندر کوئی زخمی پرندہ پھڑپھڑا رہا ہے۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ حویلی سے باہر نکل کر بھی وہ اس دھڑکن پر قابو نہ پا سکا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ریشمے

کی ماں نے اسے فضل کے سامنے سے اتنی سخت ملامت کے ساتھ ہٹایا تھا۔ فضل نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنے آپ کو مخاطب کیا اور کہا ——— "فضل! دُنیا کی کوئی طاقت ریشمے کو تجھ سے نہیں چھڑا سکتی۔ وہ تیری ہے اور صرف تیری۔"

مگر عین اسی وقت اس کے اندر سے اس کا کوئی دشمن بول اٹھا ——— "جھوٹا ہے تو، ریشمے تیری کس طرح ہو سکتی ہے؟ وہ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار کی اکلوتی بیٹی اور تو ایک کنگال مزارع کا کنگال بیٹا۔ تیری اُن کے سامنے کیا حیثیت ہے؟" اور پھر دیر تک اُس کے دل میں اِس قسم کے جذبات کی کشمکش رہی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے دو زبردست فریق جھگڑ رہے ہوں۔ کبھی ایک کا پلّہ بھاری ہو جاتا کبھی دوسرے کا۔ آخر لاچار ہو کر اُس نے ٹھان لی کہ اِس جھگڑے کو چکانے کے لئے ریشمے ہی کو منصف بنایا جائے۔

دو تین دن اسی کشمکش میں گزر گئے اور فضل کو ریشمے سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ آخر ایک دن اُسے ایک بہانہ ہاتھ آیا۔ صبح ریشمے نے کچھ کپڑے دھو کر منڈیر پر سُوکھنے کے لئے پھیلائے تھے۔ دوپہر کو اُن میں سے ایک کپڑا ہوا کے زور سے باہر گلی میں گر پڑا۔ فضل اُسے اُٹھا کر اُن کے گھر دینے گیا۔ دالان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ریشمے کی ماں گہری نیند سو رہی ہے۔ ریشمے دہلیز میں بیٹھی کروشئے کی مدد سے دھاگوں کا جال سا بُن رہی تھی۔ فضل کو دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔

"ریشمے! یہ کپڑا گلی میں گرا ہوا تھا۔ تمہارا ہے کیا؟"

"اچھا تو میرے کُرتے کو بھی نہیں پہچان سکتے؟ دو ہی تو میرے کُرتے ہیں۔ ایک پہن رکھا ہے، دوسرا یہ ہے۔"

"اتنے بڑے زمیندار کی لڑکی ہو اور صرف دو ہی کُرتے ہیں تمہارے؟"

"نہیں۔ دو ریشمی قمیصیں بھی ہیں۔ جو ٹرنک میں بند ہیں۔ عید پر دیکھی نہیں تھی تم نے وہ پھولدار دل کی پیاس؟"

ریشمے یہ باتیں کرتی ہوئی فضل کے ساتھ باہر صحن میں آ گئی۔ اور دھوپ سے بچنے کے لئے دونوں دیوار کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

فضل نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "دل کی پیاس کا کیا پوچھتی ہو ریشاں۔ یہ تو بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اِدھر تمہارا ملنا دشوار ہوا جا رہا ہے۔"

ریشمے نے جواب میں سر جھکا لیا، اور زور سے سانس لیا۔

"ریشمے! میں ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ میرے دل کے اندر ایک عجیب قسم کا جھگڑا سا پیدا ہوتا رہتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کے اندر کوئی دشمن گھس آیا ہے۔ جب میں کہتا ہوں کہ ریشمے میری ہے اور زندگی بھر میری رہے گی تو وہ جھٹ جواب دیتا ہے منہ دھو رکھو۔ تم ریشمے کی گرد تک کو بھی نہیں پہنچ سکو گے۔ ...... ریشمے! میں اِس دشمن کو خوب پہچانتا ہوں۔ اور یہ میری غریبی ہی تو ہے، اور کون ہو سکتا ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

ریشمے خاموش رہی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد سوچ کر پاؤں سے زمین کو کریدتے ہوئے بولی ــــ "اس دشمن کو تم ختم نہیں کر سکتے؟ مرد ہو، مرد کیا کچھ نہیں کر سکتے۔"

فضل نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا ــــ "فضل سب کچھ کرے گا۔ مگر ریشمے! ایک بات پوچھوں؟"

"کیا؟"

بات یہ ہے کہ فضل تو ریشمے کا ہے۔ مگر ریشمے بھی فضل کی ہے یا نہیں؟"

ریشمے نے اثبات میں سر ہلایا تو فضل کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔

فضل دل میں سوچنے لگا کہ کس طرح روپیہ پیدا کروں۔ ان دنوں جنگ چھڑ چکی تھی۔ اور فوجی بھرتی زوروں پر تھی۔ بھرتی کا ایک افسر جلال پور بھی آیا۔ فضل نے اس کے پاس جا کر سب باتوں کا پتہ لیا اور باپ سے مشورہ کر کے اپنا نام لکھوا دیا۔ کچھ مدت کے بعد وہ بہت دُور کسی چھاؤنی میں پہنچ گیا۔ اس نے موٹر ڈرائیوروں میں نام لکھوایا تھا۔ اسی کام کی وہ تربیت پانے لگا۔ تیس روپے ماہوار اُس کے باپ کو پہنچنے لگے۔ جب پہلا منی آرڈر کریم کو ملا، تو تمام گاؤں میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی کہ فضل نے تیس روپے گھر بھیجے ہیں۔ لوگ مبارک باد کہنے کے لئے اس کے گھر آنے لگے۔ ریشمے بھی کسی غرض سے اُن کے ہاں گئی تو دبی زبان سے فضل کی ماں کو مبارکباد کہہ آئی۔ کچھ دنوں کے بعد یہ خبر دوسرے گاؤں میں بھی پہنچ گئی۔ کریم کا ایک ماموں زاد بھائی اپنی لڑکی کے رشتے کے لئے فوراً چلا پڑا۔ پہنچ گیا۔ کریم نے اس بارے میں فضل سے مشورہ لینا ضروری سمجھا۔ اور گاؤں کے منشی شریف سے اُس کے نام خط لکھوایا۔ شریف فضل کا گہرا دوست تھا۔ اور فضل کی طرف سے آتے ہوئے خط وہی پڑھا کرتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد فضل کا جواب آ گیا۔ کریم اُس وقت سمندے خاں کی حویلی کے پاس درختوں کے نیچے بیٹھا تھا۔ سمندے خاں اور دو تین حقہ پینے والے اور بھی موجود تھے۔ دہاتی چٹھی رساں کریم کو خط دے کر حقے کے ایک دو کش لگانے کے لئے بیٹھ گیا۔ کریم یہ کہتے ہوئے اُٹھا "چلیں ذرا منشی شریف سے خط پڑھوا لیں۔"

سمندے خاں نے کہا ــــ "شریف تو شہر گیا ہوا ہے صبح رستے میں مجھے ملا تھا۔ یہ چٹھی رساں پڑھ دے گا۔ اسی سے پڑھوا لو۔"

چٹھی رساں نے غبار آلود جیب سے ایک بوسیدہ سی عینک نکالی اور لگا کر پڑھنے لگا۔

"جناب چاچا صاحب جی۔ السلام علیکم، از طرف آپ کا تابعدار فرزند فضل۔ میں خداوند کریم کے فضل سے خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ آپ کا خط ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ میری شادی کے متعلق آپ نے جو لکھا ہے۔ اس کی بابت عرض ہے کہ ابھی میری شادی کا فکر نہ کریں۔"

چٹھی رساں خط پڑھ رہا تھا۔ کریم کچھ بے چین سا تھا کہ اس طرح کھلے بندوں خط نہیں پڑھوانا چاہیے تھا، نہ جانے

خط میں کیا لکھا ہو۔

"جب میں نوکری پوری کرکے آؤں گا تو دیکھا جائے گا۔ ابھی آپ روپیہ جمع کریں۔ اور کچھ جائداد بنانے کی فکر کریں۔"

کریم اس ذاتی صلاح مشورے کو بھری مجلس میں سننا پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس کی پشیمانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"آخر ہم بھی چودھری سمندے خاں کی طرح کیوں نہ خوشحال بنیں۔ ہم بھی کیوں نہ زمینوں کے مالک بنیں۔"

سمندے خاں نے کھنکارتے ہوئے مونچھوں کو تاؤ دیا کریم کی پشیمانی اب گھبراہٹ میں تبدیل ہوگئی۔

"باقی سب کو دعا سلام۔ اور ہاں منشی جی ریشمے کا کیا حال ہے۔ خدا کے لئے یہ راز کی بات کسی کو بتا نہ دینا۔ بھئی اس کے باپ سے ڈر لگتا ہے' چودھری جو ہوا......."

کریم کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ابھی خط ختم نہیں ہوا تھا، مگر اس نے چِٹھی رساں کے ہاتھ سے چھین لیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی خط کی طرف دیکھتا کبھی سمندے خاں کی طرف۔ سمندے خاں کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ کریم جلدی سے اُٹھ کر چپ چاپ گھر چلا آیا۔

اگلے دن اس خط کا مضمون گاؤں کے ہر مرد و عورت کی زبان پر تھا۔ سمندے خاں کی غیرت کا سیلاب کریم کے سارے خاندان کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانا چاہتا تھا۔ ادھر کریم بھی کچھ کم دل گُردے کا آدمی نہیں تھا۔ اُس نے برابر کے گاؤں میں کھیتی باڑی سنبھال لی۔ اور فوجی ملازم کا باپ ہونے کی حیثیت میں اپنا دم خم خوب قائم رکھا۔ سمندے خاں کی عداوت نے اسے کئی بار مصیبتوں میں مبتلا کیا۔ مگر وہ ان مصیبتوں کے ہجوم سے کبھی نہ گھبرایا۔ سارا دن وہ اپنے نئے کھیتوں میں کام کرتا رہتا اور گہری شام کو گھر آتا۔ بیٹے کی پانچ تنخواہوں سے اُس نے کچھ زمین رہن لے لی اور اس زمین میں اچھی سے اچھی فصل پیدا کرنے کے لئے محنت مشقت سے کام لینا شروع کیا۔

بہار کے شروع میں فضل چھٹی پر گھر آیا۔ سمندے خاں سے تعلقات ٹوٹنے کا علم اسے ہو چکا تھا۔ کریم نے گھر بار کی سب باتیں سنانے کے بعد کہا۔ "کاکا! تم نے ایسی بات خط میں کیوں لکھ دی تھی۔ جس نے میری جان جوکھوں میں ڈال دی۔ میں اب جوان نہیں۔ جوان ہوتا تو مشکلات کا پہاڑ بھی اُٹھا لیتا اور سی نہ کرتا۔ خیر ڈرنے دبنے والا تو اب بھی نہیں۔ خدا کا فضل ہونا چاہیئے۔"

فضل نے کہا ––– "کوئی بات نہیں چاچا، سمندے خاں کا زمانہ گزر چکا، اب کریم کا زمانہ آئے گا۔ میں لام سے واپس آکر ایک ایک بُرائی کا بدلہ گن گن کر لوں گا۔"

اگلے دن دوپہر کو وہ اپنے باپ کے نئے کھیتوں سے واپس آ رہا تھا کہ رستے میں اُس کی ریشمے سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ وہ اسے دور سے دیکھ کر اپنا رستہ چھوڑ کر اس پگڈنڈی پر ہو لیا تھا جس پر دوسری طرف سے وہ آ رہی تھی۔ وہ دوپہر کا کھانا لے کر آئی تھی۔ دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کا استقبال کیا۔ ریشمے نے آہستہ سے کہا ––– "اس طرح کیا کرتے ہیں؟ خط لکھ کر مجھے بدنام کر دیا۔"

"کوئی بات نہیں میری ریشاں، میں ایسا نہ کرتا تو اب تک

میری شادی کے انتظامات ہو گئے ہوں گے۔"

"تو اب کیسے رُک جائیں گے۔"

"کیوں نہیں۔ تمہیں فضل پر اعتبار نہیں رہا؟ اس نے جھوٹی قسمیں کھائی تھیں؟ ریشاں فضل اپنی بات پر قائم ہے۔ تم اپنی فکر کرو۔"

اس وقت گندم کی فصل پکنے کے قریب تھی۔ دونوں پگڈنڈی پر ایک جھاڑی کی اوٹ میں کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے۔ فضل کی بات پر ریشمے نے سر جھکا لیا۔ اور پھر ایک دو بار فضل کی طرف دیکھا۔ گویا وہ کچھ کہنا چاہتی تھی اور کہہ نہیں سکتی تھی۔

"کہو کیا بات ہے۔ مگر خدا کے لئے ٹھیک ٹھیک کہنا۔"

"کچھ بھی نہیں۔ کہنا کیا ہے۔ تم نے خط لکھ کر سب انتظام درست کر دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب کوئی فکر نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔ تمہاری شادی کی گھر میں کوئی بات ہوئی تھی؟"

"ہوتی ہی رہتی ہے۔"

"کیا بات ہوتی ہے؟ کوئی رشتہ آیا تھا؟"

"نہیں"

"تمہارے باپ نے کوئی رشتہ تلاش نہیں کیا؟"

"..........."

"جواب کیوں نہیں دیتیں میری ریشاں۔ دیکھو نا۔ اب ہماری ملاقات معلوم نہیں کب ہو۔ کیوں نہیں دل کی بات کہہ دیتیں۔"

"میرے دل کی بات سے تم ابھی تک ناآشنا ہو؟"

"نہیں، نہیں۔ وہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم میری ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہاں وہ رشتے کی بات کیا ہے؟"

"کوئی نہیں۔ تم کتنی چھٹی لیکر آئے ہو فضل؟"

"بیس دن۔ دو گزر گئے۔ بس دو اتوار درمیان میں تیسرے کو جاؤں گا۔"

"اتنی جلدی چلے جاؤ گے؟ وہاں سے میرے لئے کیا لائے ہو؟"

"تمہارے لئے بہت کچھ لانا چاہتا تھا؟"

"مگر لائے کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں یہ تو نہیں۔ یہ لو انگوٹھی۔ خالص سونے کی ہے۔ میں نے خود ایک اتوار کو شہر جا کر سنار سے بنوائی تھی تمہارے لئے۔ پہن کر دکھاؤ نا کیسی لگتی ہے؟"

"واہ، انگلی پر کیسے فٹ آئی ہے۔ سنبھال کر رکھو۔ میری نشانی ہے۔ اور ہاں ریشاں وہ بات کہو نا رشتے کی۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم تو پیچھے ہی پڑ گئے۔ بات یہ ہے کہ چاچا کہتا ہے کہ میں کس منہ سے کہیں رشتہ لینے جاؤں۔ فضل کے خط کا چرچا تو دُور دُور تک پھیل چکا ہے۔"

"او۔ ویری گُڈ۔ اب کوئی فکر نہیں۔ اچھا ریشاں اب میں ڈبل کر کے گھر پہنچوں گا۔ پھر کب ملاقات ہو گی؟"

"جب تم چاہو گے۔"

منشی شریف اور دوسرے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں چھٹیاں گزارنے کے بعد فضل واپس چلا گیا۔

سمندے خاں کا ستارا اب گردش میں معلوم ہوتا تھا۔ دو ماہ بعد اُس کے کھلیان میں جو آگ لگی وہ چھ چھ کوس سے نظر آتی تھی۔ سمندے خاں نے اگلے دن شہر جاکر کریم کے نام کی رپٹ لکھوا دی کہ اس نے میرے کھلیان کو آگ لگائی ہے۔ تھانے والوں نے کچھ پکڑ دھکڑ بھی کی۔ مگر کھلیان جلانے کا ثبوت کہاں سے ملتا ہے کس نے اسے آگ لگاتے دیکھا تھا ہ کچھ بھی نہ بن سکا۔ اس سے پہلے سمندے خاں کی ایکھ کی فصل بھی کھڑی کی کھڑی سوکھ گئی تھی۔ جڑوں میں کوئی ایسی بیماری پیدا ہوگئی تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے تین بگھے تک پھیل گئی۔ دوسری طرف فضل چھٹیوں میں بیلوں کی ایک عمدہ جوڑی اور تھوڑی سی اور زمین خرید گیا تھا۔ کریم کی اب چڑھت تھی۔ اپنے ساتھ اُس نے اب دو مزارع بھی رکھ لئے تھے۔

تین سال کے بعد فضل واپس آگیا۔ جنگ ختم ہوگئی تھی۔ واپس آکر فضل کاروبار کے سلسلے میں شہر گیا اور کچھ دنوں کے بعد اپنے گاؤں سے شہر تک لاری چلانے کا کام سنبھال بیٹھا۔ کچی سڑک تھی۔ لاری کا ادھر کبھی کبھار ہی گزر ہوتا تھا۔ اب باقاعدہ ہر روز فضل گاؤں سے شہر اور شہر سے گاؤں تک لاری چ۔نے لگا۔ وہ لاری کا ڈرائیور تھا۔ مالک شہر کی کوئی کمپنی تی۔

فضل کی لاری نے لوگوں کو بہت آرام طلب بنا دیا۔ پہلے شہر جانے والے اس دس بارہ کوس کی مسافت کو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اب لاری کے سوا جاتے ہی نہیں تھے۔ چھ آنے کے پیسے دیئے اور شہر پہنچ گئے۔ اِس لاری میں فضل کے ساتھ ریشمے بھی ہر روز شہر جاتی تھی۔ فضل شہر پہنچ کر لاری ہی میں اسے سارے شہر کی سیر کراتا۔ پھر اسے اچھے اچھے کپڑے اور زیور خرید دیتا۔ ریشمے آنکھیں مٹکا مٹکا کر سب چیزوں کو دیکھتی۔ اور پھر کھانے پینے کی مزیدار چیزیں کھاتی بیٹھی لاری میں گھر پہنچ جاتی۔ ریشمے کی یہ خیالی سیر صبح لاری کا ہارن بجنے پر شروع ہوتی اور شام کو ہارن کی پوں پوں کے ساتھ ختم ہوجاتی۔ اور پھر وہ فضل کو گلی میں سے گزرتے دیکھنے کے لئے کسی نہ کسی بہانے کوٹھے پر چلی جاتی۔ جہاں چودھری کریم کے مکان کا پکی اینٹوں کا نیا دروازہ بالکل سامنے تھا۔

ایک دن سمندے خاں کو کسی کام کے لئے شہر جانے کی ضرورت پڑی۔ اُس نے فضل کی لاری میں بیٹھنے کی بجائے پیدل چلنا پسند کیا۔ پہلے وہ آسانی سے چار گھنٹوں میں شہر پہنچ جایا کرتا تھا۔ آج معلوم نہیں کیوں یہ سفر کٹنے میں نہیں آتا تھا۔ سمندے خاں کو محسوس ہوا کہ اس کے قویٰ اب مضمحل ہو رہے ہیں۔ وہ دو کوس ہی گیا ہوگا کہ پیچھے سے لاری گرد اڑاتی اس کے پاس سے گزری۔ وہ دل ہی دل میں فضل کو بُرا بھلا کہتا ہوا ایک طرف کو ہٹ گیا، اور پٹکے سے چہرہ صاف کرنے لگا۔ لاری تھوڑی دُور جاکر کھڑی ہوگئی۔ فضل لاری سے اُتر آیا۔ اتنے میں سمندے خاں بھی قریب پہنچ گیا۔ فضل نے اسے لاری میں بیٹھ جانے کو کہا۔ اُس نے انکار کیا۔ فضل نے کہا ـــــ "آپ کی ناراضی چاچا سے ہوگی۔ میں تو آپ کو اب بھی تایا سمجھتا ہوں۔ جب تک آپ نہیں بیٹھیں گے میں لاری نہیں چلاؤں گا۔"

سمندے خاں کے دل میں نہ جانے کیا آئی۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ کر لاری میں بیٹھ گیا۔ دو تین مسافروں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا۔ لاری

پھر چل پڑی۔ سمندے خاں نے فضل کی طرف دیکھا۔ حسین، گبرو جوان، چہرے پر سرخی دوڑ رہی تھی۔ دونوں کے دل میں اس وقت ریشمے کا خیال تھا۔

سمندے خاں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ خاموش باہر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے پوچھنے لگا۔

"کتنی تنخواہ ملتی ہے تمہیں فضل یہ موٹر چلانے کی ؟"

"اسی روپے، اور پچیس مسافروں سے زیادہ جو آئیں وہ بھی میرے۔"

اتنے میں ایک آدمی نے سامنے سے ہاتھ دکھایا۔ لاری کھڑی ہو گئی۔ چار آدمی سوار ہو گئے اور مسافروں کی بھیڑ میں گھس کر بیٹھ گئے۔ لاری سٹارٹ کرنے کے بعد فضل بولا۔

"یہ مسافر اب میرے ہیں نا۔ دو تین روپے دن میں اس طرح بچ رہتے ہیں۔ بس جی۔ آپ کی دعا سے خدا نے بہت کچھ دیا ہے۔"

سمندے خاں اب پھر چپ تھا۔ شام کو جب وہ واپس آیا۔ تو اُس کے دماغ میں خیالات کا ایک عجیب تلاطم برپا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ حقہ پینے کے ساتھ ساتھ گہرے خیالات میں گم رہا۔ پھر وہ اُٹھا۔ حقہ اسی طرح ہاتھ میں تھا۔ آہستہ آہستہ وہ کریم کے گھر پہنچ گیا۔ کریم اپنے دروازے کے سامنے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ سمندے خاں کو آتے دیکھ کر اُس نے منہ پھیر لیا۔

"چودھری کریم! فضل کہاں ہے ؟" سمندے خاں نے یہ پوچھ کر کریم کو حیران کر دیا۔ اُس نے لاپروائی سے جواب دیا "اندر ہے۔ ابھی شہر سے آیا ہے۔"

"فضل او فضل تیرا تایا آیا ہے۔ ذرا باہر آنا۔"

فضل باہر نکلا۔

"یہ موٹر کا کرایہ دینا تھا۔"

"نہیں نہیں رہنے دیجئے۔ میں نہیں لوں گا۔ آج نہیں تو کسی دن تو ہمارے تعلقات اچھے تھے۔ بہت اچھے تھے۔"

"آج بھی کچھ نہیں ہوا بیٹا، اب اپنے باپ اور تایا کی صلح کرا دو نا۔ تمہیں نے تو یہ لڑائی کرائی تھی۔"

کریم کھنکار کر اُدھر دیکھنے لگا۔

عید کے چاند فضل اور ریشمے کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ چند روز بعد ریشمے لاری کی اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی شہر کی سیر کو جا رہی تھی۔ فضل نے اُس کیلئے اچھی اچھی چیزیں خریدنے کے لئے پچاس روپے جیب میں ڈال لئے تھے۔

حقیقت نورانی

"ہندوستان اور اردو"

کہاں ہیں میرؔ و مومنؔ اور کہاں ہیں غالبؔ و سوداؔ
کہاں ہیں ناسخؔ و سیفیؔ تعشقؔ مونسؔ و آتشؔ
کہاں سرشارؔ بیٹھے ہیں کہاں چکبستؔ ہمدم ہیں
نسیمِ مثنوی گو اور حضرتِ برقؔ ہیں کس جا
ذرا دیکھیں تو آ کر حالتِ مظلومیٔ اردو
ذرا دیکھیں تو آ کر ہندیوں کا طورِ نازیبا
وہ اردو جو کہ تھی تعمیرِ ہندستان کی ضامن
تعصب نے اسی کو باعثِ تخریب ہے سمجھا
وہ اردو جو کہ وصلِ مسلم و ہندو کا حاصل تھی
اسی اردو کو چشمِ تفرقہ پرداز سے دیکھا
خدا ہی اب محافظ اس چمن زارِ زباں کا ہے
یہ وہ جنت ہے جس کو ہم نے اپنے خوں سے سینچا ہے

حسن طاہر

شاعر

اگرچہ دل زدہ و غم رسیدہ ہیں ہم لوگ
برائے اہلِ نظر نورِ دیدہ ہیں ہم لوگ
ہزار کم سخن و آرمیدہ ہیں ہم لوگ
جہانِ درد میں حشر آفریدہ ہیں ہم لوگ
خوشی سے خوش ہیں نہ رنج و الم سے افسردہ
وہ سرد و گرم زمانہ چشیدہ ہیں ہم لوگ
جہانِ حسن و محبت کی یادگار ہیں ہم
رُخِ بہار کا رنگِ پریدہ ہیں ہم لوگ
چلو میں چلنے پہ فردوس تو مُصر ہے مگر
عجیب شان سے دامن کشیدہ ہیں ہم لوگ
ازل میں دیکھی تھی حسنِ ازل جھلک تیری
اور اس پہ از ہمہ عالم بریدہ ہیں ہم لوگ
ہے عشق و شعر طبیعت کا اقتضا طاہرؔ
پیامِ شاہدِ معنی شنیدہ ہیں ہم لوگ

انور جلال

ایک جینیس کی ڈائری کے چند اوراق

۸ رمئی

صبح اُٹھا تو سر میں سخت درد تھا، گردن اکڑی ہوئی تھی، سوچا ڈاکٹر کو بُلا لوں، پھر خیال آیا کیا ہوگا؟

گزشتہ رات کی ڈنر پارٹی بھی خوب تھی، مجھے میزبان کی نوجوان لڑکی نوضیہ کی وہ پیار بھری نگاہیں کتنا سکون بخشتی تھیں، وہ گڈول گرے کی تابانیاں، وہ مسکراتے ہوئے چہرے، وہ خوش رنگ لباس، رات کی پارٹی خوب کامیاب رہی، اور سب سے بڑی کامیابی تو یہ تھی کہ نوضیہ میرے ساتھ باتیں کرتے کرتے باہر کوٹھی کے باغ میں آگئی۔ کتنی ملائمت سے مسکرا رہی تھی وہ، اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا، مسکراتے ہوئے میری باتیں سُنیں، اور مسکراتے ہوئے ہلکی پھلکی باتیں کیں، رات میں چاندنی کے روپہلی آنچلو اور مسکراہٹوں کے سیکڑوں ہیولوں میں گھرا ہوا تھا۔

اور وہ شخص —— وہ کمینہ حق داد، کتنا گھٹیا اور ٹھوس نام ہے، کمبخت جانے کہاں سے میرے اور نوضیہ کے درمیان آگیا۔ یکدم نا ہنجار نے سارے ماحول کو بے رنگ بنا دیا، اتنے پُرکیف اور مدہوش لمحات میں اُس خر دماغ نے اپنے مکروہ اور بھدے ہونٹ پھیلاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپ نے یہ ٹائی کتنے میں خریدی ہے؟"

یہ لوگ ایسی محفلوں میں جانے خرید و فروخت کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ نوضیہ نے بہت ہی اچھا کیا جو چلی گئی ورنہ میں اُسے غصے میں ضرور کچھ سُنا دیتا، پھر اُس نے میرے تمام لباس، چشمے کے سنہرے فریم اور جانے کن کن چیزوں کی قیمتیں دریافت کیں، اور پھر ستم ظریفی ملاحظہ ہو، کاؤدی نے سوالات کرتے کرتے یہ بھی پوچھ لیا۔

"حضرت آپ بال کہاں سے کٹواتے ہیں —— ؟

یہ شیو آپ خود بناتے ہیں یا ؟"

اور آخر جب اُس نے اپنے ڈنر سوٹ کی سوانح حیات پر کچھ روشنی ڈالنا چاہی، تو میں بھاگ کر سیدھا اپنے گھر پہنچا —— اُف توبہ۔

جبھی میرے سر میں درد ہے!

۹ رمئی

میرے سر میں اب بھی درد ہے، اخبار میں پرسوں کی دعوت کا ذکر ہے، مہمانوں کی ایک طویل فہرست میں میرا نام بھی شامل ہے۔ اور اُس ناہنجار حق داد کا نام نہیں۔ کتنی نفیس غلطی کی ہے اخبار والوں نے، مجھے تو اسپرو کا کام دے رہا ہے یہ بات ——

آج میں اپنے "سٹوڈیو" میں بہت تھوڑے وقت

کے لئے گیا، کلرک نے بتایا ایک لڑکی آئی تھی، جب اُس نے نام بتایا تو سُن کر بہت مایوسی ہوئی ـــــ

ریحانہ! یہ لڑکی بھی عجیب ہے، جاسوس معلوم ہوتی ہے۔ باقاعدگی سے تعاقب کرتی ہے، اور پھر ـــــ اُس کے مسلسل سوالات!

"میرا لباس کیسا ہے؟ آپ کو پسند آیا؟"

"یہ پرس کیسا ہے؟"

"نیل پالش کا یہ شیڈ مجھے کیسا لگتا ہے؟"

"لپ سٹک کا یہ شیڈ تمہیں کیسا لگتا ہے؟"

"میں کونسی گاڑی خرید لوں؟"

"بیوک کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

کاش ریحانہ کبھی اپنے متعلق پوچھے، تو صاف صاف اُس سے کہہ دوں، ریحانہ تم ـــــ لڑکی بہت ہی کم ہو شو کارڈ زیادہ ہو۔ میرا مطلب ہے تم نمائش کا ایک رنگین پوسٹر ہو، جوہری کا "شوکیس ہو ـــــ" تم آرائش زیادہ ہو ریحانہ بہت ہی کم ہو۔

مگر نہیں ـــــ وہ یہ کبھی نہیں پوچھے گی۔

۱۲ مئی

آج سینما میں فوضیہ اپنے والدین کے ساتھ آئی ہوئی تھی ـــــ کتنی پیاری لگ رہی تھی وہ سفید ساڑھی میں، میں اُس کے والدین سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ پھر پکچر ختم ہونے پر اُنھوں نے مجھے اپنے گھر چلنے کو کہا۔

میں اُن کے ساتھ ہو لیا، وہ اگر نہ بھی کہتے تو میں اُن کے ساتھ ضرور جاتا۔ آج فوضیہ بہت ہی پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے اور کافی پیتے رہے۔ پھر فوضیہ کے والد اور والدہ چلے گئے۔

ہم دونوں خاموش کچھ دیر یونہی بیٹھے رہے۔ پھر فوضیہ میرے کاروبار کے متعلق یونہی سی باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہم اِس ماحول سے اُکتا کر باہر باغ میں چلے آئے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ فوضیہ آج کچھ سوچنے کے موڈ میں تھی، وہ کسی گہرے سوچ میں گھری ہوئی تھی۔ میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔

مگر خیریت ہی گزری، کوئی خاص بات نہ تھی، وہ صرف پکچر سے متاثر ہوئی تھی، جو ہم کچھ دیر پہلے دیکھ کر آئے تھے۔ ہیرو کے دردناک انجام نے اُسے غمگین کر دیا تھا، میں نے اُسے تسلی دی اور کہا ـــــ "فوضیہ! افسردہ تو مجھے ہونا چاہئے تھا، یہ تم میرا غم کیوں محسوس کر رہی ہو؟" وہ شاید یہ سُن کر گھبرا گئی، وہ باغ میں تیز تیز چلنے لگی، پھر ہم خاموش رہے۔

اور پھر فوضیہ سڑک تک مجھے پہنچانے کے لئے آئی ـــــ

۱۶ مئی

تین دن میں بہت مصروف رہا ـــــ "سٹوڈیو" میں کام زیادہ تھا، پل بھر کی فرصت نہیں ملی، کوئی ملنے کے لئے بھی نہیں آیا۔

ریحانہ بھی آجکل تعاقب نہیں کر رہی ہے۔

۲۳ مئی

پچھلا ہفتہ نہایت اچھا گزرا، فوضیہ قریب قریب روز ہی ملتی رہی، ریحانہ نے دو مرتبہ تعاقب کیا، مگر کامیاب نہ ہو سکی، بہرحال اُس نے اپنے وہ سوال ضرور کسی اور سے کئے ہوں گے۔

سلیم اکراچی سے واپس آ گیا ہے، اُس کی صحت پہلے

سے کچھ خراب ہے، شاید آب و ہوا موافق نہیں آئی اُسے، ویسے
کاروبار اچھا ہے اُس کا وہاں۔

۲۴ رمئی

آج سلیم آیا تھا، میری طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی، میں اُسے
اچھی طرح نہ مل سکا، اُس نے کچھ بُرا مانا۔ جبھی اُس نے بہانہ
کیا کہ میں اپنی چھڑی لینے آیا ہوں، جو میں یہاں بھول گیا تھا،
میرے ہاں اُس کی چھڑی نہ مل سکی، اور وہ منہ بنائے
ہوئے چلا گیا۔

۲۷ رمئی

آج میں نے سلیم کو ایک نئی چھڑی خرید کر بھیج دی ہے،
اب شاید وہ غم بھول جائے جو میں نے اُسے دیا تھا، آج نوفینہ
بھی نہیں ملی۔

ریحانہ نے آج مجھے چائے کی دعوت دے کر سوالات
کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، چائے بہت
مہنگی پڑی۔ رات اِسؔ "بوریت" کی وجہ سے اچھی طرح
نیند بھی نہ آئی

۲۸ رمئی

آج کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

۲۹ رمئی

سلیم نے عجیب خط لکھا ہے۔

میرے دوست ـــــ میرے بھائی
بُرا مان گئے۔ مجھے تو یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ
چھڑی میرے گھر میں موجود ہے، میں نے خواہ مخواہ
تمہیں تکلیف دی، بہرحال تمہاری بھیجی ہوئی چھڑی
بہت خوبصورت ہے۔ یہ نوفینہ کا انتخاب ہے
گیا ہے؟ اچھا بھئی تمہارے اِس تحفے کا شکریہ۔

سلیم

عجیب آدمی ہے یہ بھی۔ نوفینہ میرے دوستوں کے لئے
چیزیں بھی تو انتخاب کرے گی۔ ہوں! اُسے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی
میرے دوستوں سے۔

۲ رجون

آج نوفینہ نے مجھ سے اچھی طرح بات نہ کی۔

نوفینہ کو جانے کیا ہو گیا ہے، کچھ مغرور ہو گئی ہے شاید،
یا شاید کچھ فکر مند رہتی ہو ـــــ مگر اُسے بھلا فکر کا ہے کی، ویسے
بھی کچھ کمزور ہو گئی ہے، رخساروں پر زردی آ گئی ہے، مجھے تو
کچھ پوچھنا ہی تھا، مگر جانے کیوں وہ مجھے دیکھ کر جیسے چڑ سی گئی۔
عجیب سی صورت بنائی تھی اُس نے مجھے دیکھ کر۔

خیر پھر ملوں گا، شاید بدل جائے۔

۳ رجون

آج سٹوڈیو جانے کو بالکل جی نہ چاہتا تھا مگر جوں توں
کر کے پہنچ ہی گیا، کلرک عجیب بے تکی باتیں کرنے لگا ہے، کمبخت
ڈھیل دے دو اِن دو دو ٹکے کے آدمیوں کو تو جانے خود کو کیا
سمجھنے لگتے ہیں، میں نے بھی خوب خبر لی ہے بدتمیز کی۔

آئندہ سوچ کر بات کرے گا۔

میری میز پر گرد پڑی تھی، شاید صاف نہ کی گئی تھی چپراسی
بھی کلرک کو دیکھ کر بگڑ گیا ہے۔ جب نوکری کے لئے آتے ہیں
تو کتنے مسکین صورت ہوتے ہیں یہ لوگ، اور کچھ دنوں بعد تو
جہاں نوکری کرتے ہیں مالک سمجھنے لگتے ہیں خود کو۔

ذرا ڈانٹ بتائی، تو رونے کے لئے تیار ہو گیا کمبخت۔

۴ رجون

آج ایک گاہک سے لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی، یہ مانا کہ دکاندار کو بڑی نرمی اور تحمّل سے کام لینا چاہئیے، مگر یہ بھی کیا کہ گاہک اِس کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانے لگے۔

خواہ مخواہ ضد کر رہے تھے کہ اُن کی ناک میں نے ٹیڑھی بنا دی ہے۔

تھینڈ کہیں کے۔ اتنا ناک کا خیال تھا، تو خودکشی کیوں نہ کرلی غیرت سے!

۱۱رجون

پچھلے تمام دن بہت بُرے گزرے ہیں، ہر شے سے جیسے نفرت ہو گئی ہے، کسی کام کو بھی تو جی نہیں چاہتا، ہر شخص زہر دکھائی دیتا ہے ریحانہ اِن دنوں اچھا ہُوا جو نہیں ملی، ورنہ شاید بیچاری کے نازک خیالات کے مرمریں ایوان میری چند باتوں سے ڈھیر ہو جاتے۔

اب تو میں یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے زندگی ایک بوجھ ہو گئی ہے، ایک ناقابلِ برداشت بوجھ۔ صبح، شام، دن، رات کسی میں بھی تو کوئی دلکشی نہیں رہی —— وقت کی رفتار جانے اتنی سست کیوں ہو گئی ہے۔

میں شاید کچھ قنوطی بھی ہو گیا ہوں، مگر نہیں، ماحول ہی بڑا ذلیل رنگ اختیار کر گیا ہے، اِس میں میرا کوئی قصور نہیں، ساری دنیا کی مخلوق ہی کچھ اُکتائی ہوئی، کچھ تھکی ہوئی معلوم ہو رہی ہے، اب تمام کائنات کے باشندے تو قنوطی نہیں ہو سکتے، یا شاید ہو سکتے ہیں —— ناممکن تو شاید کوئی بات بھی نہیں —— اور پھر اِس موجودہ دَور میں۔

۱۷رجون

فوضیہ ایک مدت سے کراچی گئی ہوئی ہے، اِتنا بھی نہ ہو سکا اُس سے کہ اطلاع ہی کر جاتی، یا پھر وہاں جا کر کوئی خط لکھتی۔

شاید بہت مصروف ہو سیر و تفریح میں، یا شاید وہ یہ بتانا ہی نہ چاہتی ہو، ہو سکتا ہے کہ اُسے مجھ سے کوئی شکایت ہو، مگر میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی، پھر کیا بات ہو سکتی ہے؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ مجھ سے اُکتا چکی ہو۔

یا پھر کوئی اَور اس کی زندگی میں آ گیا ہو —— نیز کراچی سے اُس کی واپسی تک یہ تمام سوالات میرے ذہن ہی میں گونجتے رہیں گے، اِن کا جواب تو فوضیہ ہی دے سکتی ہے۔

۲۱۔جون

میں نے ایک کُتا خرید لیا ہے، بڑا خوبصورت ہے یہ کُتا۔ سفید اور سیاہ، باسلیقہ، خاموش مزاج، شرمیلا، بااخلاق۔ خوبصورت جسم اور چمکدار نرم بال

انسان سے تو یہ کُتا ہی اچھا ہے، اس میں کس چیز کی کمی ہے۔ صورت اور سیرت میں میرا یہ کُتا ایک مثال کی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

۲۳رجون

کُتے کے ساتھ میرے تعلقات بہت خوشگوار ہوتے جا رہے ہیں، وہ میرے ہر اشارے اور ہر موڈ کو سمجھنے لگا ہے، وہ مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے، میری طرف ہر آن متوجہ رہتا ہے، ہر اشارے کا منتظر رہتا ہے۔

میرا خیال ہے یہ میری زندگی کا بہترین ساتھی ثابت ہوگا۔

۲۷رجون

اب شام کی سیر میں کُتا میرا بڑی خوش اسلوبی سے ساتھ

دیتا ہے، وہ باقاعدہ ہر قدم میرے ساتھ اُٹھاتا ہے، وسیع اور پُر رونق سڑکوں پر چلتے ہوئے لوگ حسرت اور رشک سے ہم دونوں کو دیکھتے ہیں، مگر میرا کُتا میری ہی طرح بے نیاز بڑے سکون اور اطمینان سے چلتا رہتا ہے۔

کبھی میں کتے کو سیر کرانے اور کبھی کتا مجھے سیر کرانے لے جاتا ہے، دوستی میں ہونا بھی یونہی چاہیئے، دوست کو دوست کا خیال رکھنا چاہیئے، اور اگر یوں ہو، تو دوستی حسین، مکمل اور دیرپا ہوتی ہے۔

۴ر جولائی

آج میں نے اپنے کتے کا نام تجویز کیا ہے، اُسے یہ نام بہت ہی پسند آیا ہے۔ "رفیق" سُنتے ہی وہ اُچھل پڑتا ہے اور والہانہ انداز میں قدموں میں لوٹنے لگتا ہے۔ وہ بے حد شکر گزار معلوم ہوتا ہے۔ خوش ذوق جو ٹھہرا اسی لئے میرے دیئے ہوئے نام کی قدر کرتا ہے۔

۵ر جولائی

میں نے آج "رفیق" سے کہہ ہی دیا، مگر بڑے سرگوشی کے انداز میں اور بڑی ملائمت کے ساتھ۔ "دیکھو رفیق! بُرا نہ ماننا، بات یہ ہے کہ مَیں تمہیں کتا نہیں سمجھتا۔ اِس لئے پیارے تم مجھے دیکھ کر دُم نہ ہلایا کرو۔

وہ پہلے تھوڑی دیر میری طرف دیکھتا رہا، پھر منہ پھیر کر مسکرایا ـــــ اور مَیں نے محسوس کیا کہ اُس نے میری بات کا بُرا نہیں مانا۔

۶ر جولائی

آج ریحانہ چائے پر میرے گھر آئی تھی، اُسے "رفیق" بہت پسند آیا ہے، مگر وہ شکایت کرتی تھی کہ "رفیق" مجھ سے بیگانگی برت رہا ہے۔ اُس نے "رفیق" سے باتیں کیں، اُسے پیار کیا، اُسے چاکلیٹ کھلایا۔ "رفیق" نے سب کچھ برداشت کیا مگر میری طرف دیکھتا رہا۔

ریحانہ "رفیق" سے گفتگو میں اِتنی مگن ہوئی کہ وہ اپنے تمام سوالات بھول گئی۔

آج ریحانہ مجھے اچھی لگ رہی تھی ـــــ!

۱۰ر جولائی

میں جانتا ہوں کہ ڈائری روز لکھنی چاہیئے، مگر پھر بھی نہیں لکھی۔

ہشاؤ بھئی!!

۱۲ر جولائی

آج فوضیہ کا تذکرہ آیا تھا، فوضیہ کراچی سے واپس آ گئی ہے، اُس نے آج مجھے چائے پر مدعو کیا تھا، میں چائے پر گیا، فوضیہ نے مسکراتے ہوئے بڑے گرم جوش اور پیار بھرے انداز کے ساتھ میرا استقبال کیا، مگر پھر بھی اس استقبال میں "رفیق" کا سا خلوص نہ تھا۔

وہ چائے پر کراچی کی بہت سی باتیں سُناتی رہی۔ اپنی سہیلیوں کے قصے، سمندر کے کنارے کا دلکش اور پُر رونق قصیدہ اور جانے کیا کیا۔

مگر میں زیادہ وقت وہاں نہ ٹھہر سکا۔ فوضیہ نے تعجب ظاہر کیا، مگر میں مجبور تھا۔ میں نے صاف صاف کہدیا "فوضیہ! معاف کرنا، مجھے شام کی سیر کے لئے "رفیق" کے ساتھ جانا ہے"

فوضیہ نے اِس بات کا بُرا مانا، مگر میں اِس سلسلے میں بھلا کیا کر سکتا تھا، اب یہ تو مجھ سے ہو نہیں سکتا، کہ میں انسان کے لئے اپنے مخلص "رفیق" کا ساتھ چھوڑ دوں!

یہ تو مجھ سے کسی صورت نہیں ہو سکتا۔

۱۷ر جولائی

فوضیہ اب کچھ ضرورت سے زیادہ ملنسار ہوگئی ہے، اب تو وہ سٹوڈیو میں دن میں دو تین بار آتی ہے۔ اس کی فرمایش ہے کہ میں اس کی تصویر بنا دوں!

مگر میں آج کل بہت مصروف ہوں، بازار کا کام بھی چھوڑ رکھا ہے۔ میں "رفیق" کا (PORTRAIT) تیار کر رہا ہوں۔

بہرحال میں نے فوضیہ سے وعدہ کر لیا ہے، کیا حرج ہے بنا دیں گے اس کی بھی تصویر۔ فوضیہ چاہے حالات کی وجہ سے کچھ بھی ہو جائے، مگر جہاں تک میرا خیال ہے وہ دل کی بُری نہیں۔

۱۹ر جولائی

دو دن فوضیہ نہیں ملی —— ریحانہ آئی تھی، وہ اپنے جنم دن کی تاریخ بتا گئی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اُسے جنم دن پر کیا تحفہ دُوں، میرا خیال ہے کہ اُس کو اُس کی تصویر بنا کر پیش کر دُوں، یہ تحفہ ٹھیک رہے گا، کم از کم "انفرادیت" تو ہوگی اِس میں۔

۲۰ر جولائی

آج سلیم آیا تھا، وہ کل ہی کراچی سے واپس آیا ہے، اُسے "رفیق" بہت پسند آیا ہے۔ "رفیق" بھی سلیم کو پسند کرتا ہے، گو اُس سے بے تکلف قطعاً نہیں ہے ——!!

۲۴ر جولائی

آج میں نے رفیق کی سالگرہ منائی تھی —— اور اُسے اُس کی تصویر اپنی طرف سے پیش کی۔ تمام مہمانوں نے "رفیق" کو مختلف تحائف دیئے، رفیق نے تمام تحائف قبول کر لئے۔ مگر دو تحفے شکریے کے ساتھ رد کر دیئے۔

پہلا تحفہ تو ایک آئینہ تھا، جو اُس نے اپنے مہمان کو واپس دیتے ہوئے کہا: "حضرت! مجھے پُورا اعتماد ہے کہ میں خوبصورت ہوں!"

دوسرا تحفہ ایک خوبصورت پاکٹ واچ تھی جسے بعد احترام واپس کرتے ہوئے اُس نے کہا —— "معاف کیجئے مجھے زمان و مکان کی حدُود میں مت اُلجھائیے ——"

میری دی ہوئی تصویر دیکھ کر وہ شرمایا، تمام مہمانوں نے "رفیق" کو باری باری مبارکباد دی، فوضیہ کچھ بُرا محسوس کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

ریحانہ نے رفیق کو بہت سی ٹافی دی، مگر "رفیق" کچھ ریحانہ سے کھنچا کھنچا سا رہتا ہے، میرا خیال ہے سادگی پسند "رفیق" ریحانہ کی آرایش سے کوفت محسوس کرتا ہے، مگر یہ اُسے کہہ کیوں نہیں دیتا؟ شاید بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتا!——

۲۸ر جولائی

آج میں فوضیہ کے ہاں ڈنر پر مدعو تھا۔ میری طبیعت کچھ اچھی نہ تھی۔ مگر اِس کے باوجود میں وہاں پہنچا، فوضیہ کچھ سنجیدہ تھی، کھانا کھا چکنے کے بعد کافی کا دَور چلا، کافی پی چکنے کے بعد دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، فوضیہ اِس دوران میں بالکل خاموش رہی۔

پھر سب چلے گئے اور میں اور فوضیہ اکیلے رہ گئے۔

فوضیہ نے بڑی معصومیت سے مجھ سے سوال کیا: "آپ سے ایک بات پُوچھوں؟"

مَیں پہلے تو بہت حیران ہُوا، میں نے زندگی میں فوضیہ

کہ کبھی اِس درجہ سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔

میں نے کہا "ہاں! فوضیہ! تم جو جی چاہے پوچھو۔"

اِس کے بعد فوضیہ نے بڑی سنجیدگی سے شکایات کا ایک طویل سلسلہ چھیڑ دیا۔

"آپ بدل گئے ہیں، آپ کی ہر بات میں بیگانگی ہے، آپ بڑی رُوکھی باتیں کرتے ہیں۔ آپ بالکل وہ نہیں رہے، کیا میں اِسی برتاؤ کے قابل ہوں؟ آپ کی نظریں بدلی ہوئی ہیں۔ آپ وہ تمام باتیں فراموش کر چکے ہیں جن کے ساتھ میری زندگی اور میری زندگی کی تمام رعنائیاں وابستہ تھیں، آپ مجھ سے علیحدہ ہونے کے لئے پورے طور پر کوشاں ہیں، اب آپ بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں —— آپ میرا قصور بتائیے؟ آپ مجھے میری بے تعلقی کی مجھے بتا کر سزا دے سکتے ہیں —— اگر آپ کے دل میں کوئی بات ہے تو آپ صاف صاف کہیئے، آپ تو مرد ہیں۔"

اور اِس کے بعد ——

فوضیہ کی آنکھیں شبنمی ہو گئیں۔ اُس کے گلابی ہونٹوں کے گوشے کپکپانے لگے، لمبی پلکیں بھیگ کر جھک گئیں، ابرؤں کا تناؤ ٹوٹ گیا، پیشانی کی شکنیں اُلجھ گئیں، اور تابندہ رخسار جلنے لگے، اُس کے کندھے ڈھلکے ہوئے تھے ——

میرے تمام بدن میں ایک بجلی سرایت کر گئی، میں نے ندامت محسوس کرتے ہوئے کہا —— "فوضیہ! یہ سب کچھ غلط ہے، تم نے مجھے غلط سمجھا ہے، اب میں اِن تمام باتوں کا جواب دے کر تم پر یہ اثر نہیں چھوڑنا چاہتا کہ میں تمہیں دلاسے اور تسلیاں دے رہا ہوں —— میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، تم مجھے "رفیق" کی طرح عزیز ہو —— بلکہ ایک لحاظ سے میں تمہیں رفیق سے زیادہ چاہتا ہوں —— تم میری اِس سے پہلے کی دوست ہو۔

میں دیر تک بولتا رہا —— اور پھر آہستہ آہستہ شکوک کے گہرے بادل چھٹ گئے، مسکراتے ہوئے چہرے سے ایک روشنی پھیل گئی اور اِس مسکراہٹ کی کرنوں سے ماحول جگمگا اُٹھا۔

۱۱ر اگست

آج ریحانہ کا جنم دن تھا —— میں زیادہ دیر اِس کے ہاں نہ ٹھہر سکا، میں نے ریحانہ کے جنم دن پر اُس کی تصویر جو میں نے بنائی تھی اُسے پیش کی اور گھر چلا آیا۔

۱۴ر اگست

ریحانہ نے مجھے خط لکھا ہے، بڑے غصے میں لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

—— !

مجھے افسوس ہے کہ تم نے میری سالگرہ پر ایک ہجوم میں میرا مذاق اُڑایا ہے، یہ بھلا کیا تصویر بنائی تھی۔ تم نے! میرے کپڑے، بال، لپ اسٹک، ناخن اور ہار تو واضح تھے، اور میرے چہرے کے نقوش بالکل غائب، نہ آنکھیں نہ آنکھ، اور ہونٹوں کی جگہ بھی لپ اسٹک کے بھدے نشان —— اگر لپ اسٹک لگانی نہ آتی تھی تو مجھے بلا لیا ہوتا ——

بہرحال میں نے بھرے ہجوم میں کہہ دیا، "حضرات! میرے یہ دوست ذرا، اِن کا دماغ غیر حاضر رہتا ہے، جانے جلدی میں کوئی پوسٹر اُٹھا لائے ہیں سٹوڈیو سے ——، خیر! تم نے

مجھ سے زیادتی کی ہے۔ فقط

ریحانہ

۱۷راگست

فوضیہ اور "رفیق" کے تعلقات بہت اچھے ہوگئے ہیں۔ رفیق میرے بعد اب فوضیہ سے بھی خلوص برتنے لگا ہے۔

۱۸راگست

اب فوضیہ مجھ سے بہت خوش ہے، میں نے اُس کی تصویر شروع کر دی ہے۔

۲۰راگست

آج شام کی سیر میں رفیق اور فوضیہ میرے ساتھ تھے، ہم نے بہت لمبی سیر کی، بہت سہانا موسم تھا، تمام ماحول میں رنگینی تھی، ہر طرف مسکراہٹیں تھیں اور خوشی کی ایک لہر نے ہر چہرے کو جاذبِ نظر بنا رکھا تھا

۲۸راگست

پچھلے تمام دن بہت خوبصورتی اور مصروفیت سے گزرے، فوضیہ کا (PORTRAIT) تیار ہوگیا ہے، وہ اِس تصویر پر بہت نازاں ہے۔ یہ احساس میرے لئے بھی کم تسکین دہ نہیں۔ "رفیق" کچھ دنوں سے سُست ہے، کچھ بڑی مسلسل اور مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے اِس نے، مجھے تو بیمار معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اسے کوئی غم ہے۔

۳۰راگست

آج "رفیق" کو میں پھر ڈاکٹر کے پاس لے گیا، کیونکہ اُس کی خاموشی شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر مُصر ہے کہ اسے کوئی جسمانی مرض نہیں، بلکہ اسے کوئی رُوحانی تکلیف ہے، میرا خیال ہے اِسے کسی مشہور ماہرِ نفسیات کے پاس لے جاؤں۔

۲ستمبر

آج میں "رفیق" کو ایک مشہور ماہرِ نفسیات کے پاس لے گیا، اُس نے کافی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسے کوئی روحانی صدمہ پہنچا ہے، یہ پرانے تمام واقعات بھول گیا ہے، اب یہ مشکل ٹھیک ہوگا ـــــ فوضیہ کا کہنا ہے کہ اسے گھر سے نکال دیا جائے، میرا بھی یہی خیال ہے۔ اب اِس بیچارے کا اِس کے سوا اور کیا علاج کر سکتا ہوں، میری اَن تھک کوشش کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔

۴ستمبر

"رفیق" کو میں نے گھر سے نکال دیا ہے، گھر کچھ خالی سا معلوم ہوتا ہے، کچھ اُداس سا معلوم ہوتا ہے، مگر نہیں اِس میں اب فوضیہ کے قہقہے گونجتے ہیں، اور پھر کچھ دنوں بعد یہ قہقہے سدا اِسی گھر میں گونجا کریں گے۔

۷ستمبر

"رفیق" سڑک پر اِدھر اُدھر تنہا پھرتا اور کچھ سوچتا ہُوا نظر آتا ہے، کبھی کبھی تو میں اُس کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ اِس تمام کھیل کا ذمہ دار میں ہوں، میرے ہی رویے کی وجہ سے "رفیق" کا یہ انجام ہُوا ہے اور یہ خیال جب شدت سے مجھے گھیر لیتا ہے، تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ انسان کتنا کمینہ ہے، اُس وقت انسان کی ذلت کے احساس سے میری آنکھیں جھک جاتی ہیں۔

انور جلال

امین الرحمٰن

بہار کا خیر مقدم

"اے بہار! تو ایک خط ہے جو میں اُسے لکھتا ہوں!"

آج صبح جب میں سو کر اُٹھا تو کوئی نامعلوم ننھا پرندہ میرے دریچے کے پاس پھولوں کی بیل میں بیٹھا خوشی سے چہچہا رہا تھا۔ اس کا من موہنا راگ سُروں کے زیر و بم سے بے نیاز تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا فضا میں ایک خاموش سی مسرت کے شادیانے بج رہے ہیں اور جب میں نے دریچے میں سے نظر دوڑائی تو فضا میں ایک سنہرا غبار چھایا ہوا تھا۔ گویا سورج کی کرنیں سونے کا بُرادہ بکھیر رہی ہوں۔

بیل کی شاخیں چکنے چکنے پتوں سے بوجھل ہو رہی تھیں اور میں نے دیکھا کہ کتنی ہی شرمیلی کلیاں میری طرف جھکی جھکی خاموش نظروں سے دیکھ رہی ہیں: گویا مجھے کوئی پیغام دے رہی ہوں۔ گلاب کے پودوں پر سنہری مکھیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک سُریلی سی بھنبھناہٹ کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھیں، اور بادِ نسیم کی چال اپنے اتار چڑھاؤ میں لطیف اور نرم تھی!

اور یہ سنہری صبح یقیناً بہار کی آمد کی غمازی کر رہی تھی جس کا راز پھول پتوں نے تمام موسم سرما میں مجھ سے چھپا رکھا تھا۔ اور یہی وہ دن ہے جب آسمان اور زیادہ شفاف اور نیلگوں دکھائی دیا کرتا ہے۔ ایک بے پایاں ازلی راز کے مانند، جسے کوئی نہ پا سکے، اور یہی وہ دن ہے جب میں اپنی "سٹیلا" کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا کرتا ہوں، اُس "سٹیلا" کے لئے جو خود ایک بے کراں راز کے مانند ہے، اُتنا ہی گہرا راز، جتنا میرا وہ خاموش جذبہ جو میرے دل کے عمیق ترین گوشے میں رہتا ہے، سمندر کی عمیق ترین تہ کے کسی مرجان کے مانند، سمندر کے مد و جزر سے بے پروا پانی کی نیلگوں دھندلاہٹ میں اپنے وجود کو چھپائے ہوئے۔

ہاں یہی وہ دن ہے جب میں "سٹیلا" کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا کرتا ہوں، کسی طویل خط کا کوئی حصہ، کسی نظم کا کوئی بند یا نثر کا کوئی پارہ، اُس "سٹیلا" کے لئے جو لفظوں کی روح ہے اور جس کا ذکر کرنے کے لئے لُغات کا ہر لفظ ترستا رہتا ہے' اور میں سوچتا ہوں کہ میں آج "سٹیلا" کے لئے کیا لکھوں؟

بہار کا پہلا دن ہے اور میں اس کے خوشگوار اثر کو اپنے رگ و ریشے میں ایک قوت آفریں نشے کے مانند محسوس کر رہا ہوں، ذہن خیالات سے اسی طرح پُر ہے جس طرح بہار میں تمام سرزمین نیلے، زرد، سبز اور سرخ پھولوں سے معمور ہو جاتی ہے، اور میں سوچنے لگتا ہوں۔

کیا "سٹیلا" نے بہار کی شیریں سانس میں محبت کی مٹھاس کو محسوس نہیں کیا ہوگا؟ کیا "سٹیلا" نے ننھے پرندوں کے مسرور گیتوں میں محبت کی تڑپ کو نہیں پایا ہوگا؟ اور کیا "سٹیلا" نے محبت کے اُس خاموش پیغام کو وصول نہیں کر لیا ہوگا جو بہار کا ہر پھول اپنی سرخ، نیلی اور زرد پتیوں میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے؟

تو پھر میں کیوں نہ "وکٹر ہیوگو" کے لفظوں میں بہار سے یہ کہہ دوں:-

"اے بہار! تو ایک خط ہے جو میں اُسے لکھتا ہوں!"

اثر صہبائی

کتنی حسیں ہے کائنات!

روئے سحر کی تازگی! بادِ صبا کی سرخوشی!
غرقِ نشاط پھول پھول! مستِ طرب کلی کلی!
ساغرِ آفتاب میں بادۂ نورِ زندگی!
کتنی حسیں ہے کائنات!
کتنی حسیں ہے کائنات!

گیسوئے شب کی تیرگی! نکہتوں میں بسی ہوئی!
وجد میں، بزمِ آسماں گرمِ سرودِ خامشی!
طاری ہے کائنات پر رقصِ نشاط و بیخودی!
کتنی حسیں ہے کائنات!
کتنی حسیں ہے کائنات!

پچھلے پہر کی چاندنی! پیکرِ حسن و سادگی!
چاند کے جامِ نور میں اُتری ہے نور کی پری!
قلب و نظر کے واسطے نور و سرور و آگہی!
کتنی حسیں ہے کائنات!
کتنی حسیں ہے کائنات!

اختر جہاں فیروز الدین

بہار، ایک رنگین قہقہہ

......اور ایک دفعہ پھر مادرِ گیتی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُس کی رگ رگ میں حرکت، جوش اور گرمی کے آثار نظر آنے لگے، گویا کسی بے جان شئے میں یکایک جان سی پڑ گئی ہو۔

ایک طویل مدت سے جو شیریں تنفس خزاں کے بوجھ سے گھُٹا گھُٹا سا تھا، پھر جاری ہو گیا ہے اور تمام فضا ایک بار پھر ایسی موہنی سے معمور ہو گئی ہے جو دل کو فرحت بھی بخشتی ہے اور تقویت بھی۔

وہ مسکراتی ہے، گاتی ہے اور قہقہے لگاتی ہے۔ ہاں اُس کے بے تاب قہقہے آسمان کے اس نیلگوں گنبد میں بار بار گونجتے ہیں اور نہ جانے ان میں کیا جادو ہے کہ ان کی گونج کہیں تو زمین پر ملکوتی سفیدی بن کر ظاہر ہوتی ہے اور کہیں بے کراں نیل۔

اور ان قہقہوں کی گونج کہیں مخملیں سبزے میں تھرتھراتی ہے تو کہیں گھاس کی ہریالی میں کپکپاتی ہے اور کہیں انہیں قہقہوں کی ایک طویل رنگین گونج سرخ، زرد، گلابی، نیلگوں، ناسی، نارنجی اور سفید رنگ کے بڑے بڑے دھبوں کی صورت میں زمین کے زمردیں پس منظر میں، لرزتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اُس کے قہقہے بلند اور نغمہ خیز ہیں اور اُن کی گونج کہیں ان پرندوں کی چہچہاہٹ میں سنائی دیتی ہے جو اپنے گیتوں کی دھن میں مست نظر آتے ہیں تو کہیں مدھ مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں اور کہیں بادِ نسیم کی سرسراہٹ میں جو خشک اور تر و تازہ شاخوں میں سے مسلسل گزرتی رہتی ہے، اور یہی قہقہے جب باغ و راغ میں بلند ہو جاتے ہیں تو شگوفے کھِل جاتے ہیں جو بے شمار ننھے ننھے خوش رنگ پرندوں کے مانند خالی شاخوں پر نزاکت سے بیٹھے، اپنی ننھی ننھی حیران سنہری آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں اور یہی شگوفے جب پھول بن جاتے ہیں تو اُن شریر بچوں کے گروہ کے مانند دکھائی دیتے ہیں جو اِن جلیبوں پر زور زور سے قہقہے لگا رہے ہوں یہاں تک کہ اُن کے چمکتے ہوئے تر و تازہ رخساروں پر شبنمیں آنسو بہنے لگتے ہیں۔

اُس کا تبسم کہیں تو قوسِ قزح کے اُن رنگوں میں دکھائی دیتا ہے جو نہایت ملائمت سے ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور کہیں چمکتی ہوئی شبنم کی لرزش میں، کہیں ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی میں تو کہیں شام کے ستارے کی مسرور ٹمٹماہٹ میں اور کہیں چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنوں میں۔

مادرِ گیتی ایک بار پھر شباب کی طرف لوٹ آئی ہے۔ وہ اپنی بازیافتہ نوجوانی کے نشے میں اِس قدر سرشار ہے کہ اُسے اِس بات کا احساس ہی نہیں کہ اُس کے سینے سے کتنا خون بہہ چکا ہے، اُس کے جسم میں ابھی کتنے زخم رِس رہے ہیں اور اُس کے کتنے بڑے بڑے نقصانات کی تلافی ابھی تک نہیں ہوئی لیکن پھر بھی وہ اِن سب باتوں سے بے پروا ہے اور کچھ عرصے کے لئے ماضی اور مستقبل اُسے پریشان نہیں کر سکتے بس حال ہی اُس کی زندگی ہے، وہ حال جو حُسن، موسیقی اور رعنائی سے بھرپور ہے۔

اُس کی رُوح بہترین کیفیتوں سے سرشار ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ فطرت کی ہر شے پھول، پتے، ندی، شفق، چاند، تارے، سب اپنے آپ میں ایک نئی زندگی، ایک نئی تازگی محسوس کر رہے ہیں۔

اے بہار! تو فطرت کا ایک رنگین قہقہہ ہے جس کی آواز مدتوں بعد بھی کانوں میں گونجتی رہے گی۔

منشورات

بُلبلِ ہند سروجنی نائڈو

مسز سروجنی نائڈو (پیدائش ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء وفات ۲ مارچ ۱۹۴۹ء) اُن خواتین میں سے تھیں جن کی ذات پر پورا برِاعظم ہند و پاکستان فخر کر سکتا ہے۔ صداقت، خلوص، قابلیت اور حبِ وطن کے بغیر فانی اوصاف موت کے بعد بھی انکا نام زندہ رکھیں گے۔ وہ غلط تعصبات سے اتنی بلند تھیں کہ جن دنوں کانگریس اور مسلم لیگ میں سخت اختلاف تھا اور حضرت قائدِ اعظم کے متعلق مخالفین ہر قسم کا جھوٹا پروپیگنڈا جائز سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے کانگریس میں ہوتے ہوئے یہ اعلانِ حق کرنے میں تامل نہ کیا کہ "اگر ہندوستان بھر میں کوئی ایسا شخص ہے جس کی دیانت کو کوئی قیمت نہیں خرید سکتی تو وہ شخص جناح ہے۔" دونوں ملکوں میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے ایسے لیڈروں کی بیحد ضرورت تھی۔ سروجنی نائڈو کی جگہ کوئی دوسرا شخص پُر نہیں کر سکتا۔ خدا اُن کی رُوح کو تسکین دے۔

راقم الحروف نے نومبر ۱۹۲۵ء میں اُن کی دو نظموں کا ترجمہ کیا تھا۔ فنی خامیوں کے باوجود اُن میں سے ایک نظم ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ یہ نظم اُن کے مقاصدِ حیات کی توضیح کرتی ہے ـــــ شاعری اور خدمتِ وطن۔ بلاشبہہ اُن کی زندگی فائز المرام ہوئی۔ اُن کی شاعری نے نوجوانی ہی میں اُنہیں "بُلبلِ ہند" کا لقب دلوایا اور خدمتِ وطن کے طفیل بڑھاپے میں اُنہوں نے اپنے وطن کو نہ صرف آزاد و خودمختار دیکھ لیا بلکہ ہند کے ایک بڑے صوبے کی پہلی خاتون گورنر بنکر اُنہوں نے برِاعظم کی عورتوں کے لئے قابلیت کی ایک قابلِ رشک مثال قائم کر دی۔ نظم یہ ہے:۔

موت سے خطاب

جو حال دیکھ کر مرا
کچھ اُس کو رحم آ گیا
تو میرے سر پہ ہاتھ رکھ کے آج موت نے کہا کہ پیاری بچی قیدِ غم سے میں کروں تجھے رہا؟
تجھے نیا جہاں ملے، ترے نئے ظہور کو،
کنول ہوں اُن مستیاں ہوں نغمۂ طیور ہو،
یہ شوخ و شنگ تتلیاں
یہ پھول اور اُن کی مستیاں
یہ ابرِ نو بہار، یہ ہوا اور اُس کی شورشیں سبھی یہ تیری رُوح کا مکانِ آخری نہیں
کہا یہ میں نے موت سے یہ رحم یہ کرم ترا
مرے لئے ہے وجہِ ننگ سُن تو موت آہ کیا
عبث ہے میری زندگی؟
مری غرض نہیں کوئی؟
میں زندگی کی سختیوں سے تھک کے ہار جاؤں کیوں ہنسی خوشی زمانے کے ستم نہیں اُٹھاؤں کیوں
ہو، تاکہ حاصل اپنی زندگی کا مُدعا مجھے
سخن سے، خدمتِ وطن سے، مل چکے بقا مجھے

مخزن المخازن

”آفاق“

اقبال کا بچپن

کچھ دن ہوئے سیالکوٹ کے صدر بازار کے ٹکڑے پر کشمیریوں کے مشہور محلہ چوڑی گراں کی گلیوں میں ننھے اقبال کے ساتھ کھیلنے والوں میں سے ایک بزرگ جناب تقی شاہ صاحب سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ آپ اقبال کے شہرہ آفاق استاد میر حسن صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ اور آج کل بھاٹی دروازے کے باہر ایک مختصر سے مکان میں اقامت فرما ہیں۔ شاہ صاحب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں، حافظہ بھی اتنا اچھا نہیں رہا۔ میرے اصرار پر اُنہوں نے اقبال کے بچپن کے حالات جستہ جستہ بیان کئے جو میں کم و بیش اُنہی کی زبان میں نیچے لکھ رہا ہوں :-

اقبال اور میں ہم عمر تھے۔ میں شروع میں تو اُنہیں جانتا نہیں تھا۔ لیکن جب اُنہوں نے میرے والد کے پاس پڑھنے کے لئے آنا شروع کیا تو میرا اور اقبال کا یارانہ ہو گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں میری اور اُن کی گاڑھی چھننے لگی۔

میں نے پوچھا: ”اقبال کا آپ کے ہاں آنا کیسے شروع ہوا۔“

اُنہوں نے فرمایا: ”ہمارے زمانے میں لڑکے کو کاروبار میں لگانے سے پہلے قرآن پاک ختم کرایا جاتا تھا۔ چنانچہ اقبال نے مولوی غلام حسن صاحب سے مسجد میں ناظرہ قرآن پڑھا۔ ختم قرآن کے سلسلے میں اقبال کے والد میاں نور محمد جن کی کُنیت نانک چھدنے کی نسبت سے تھو تھی، میرے والد کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ شاہ صاحب! کل اقبال کے ختم قرآن کی تقریب ہے، آپ ضرور تشریف لائیے گا۔ پرسوں سے وہ انشاء اللہ دُکان پر بیٹھنا شروع کر دے گا۔ اقبال کے والد کی دُکان ٹوپیاں بنانے اور ”تِلّے“ کا ڑھنے کی تھی۔ چنانچہ اقبال کے لئے نئی سوئیوں کا فلیتہ اور دھاگوں کے کچھ گچھے خرید بھی جا چکے تھے۔

اگلے روز میرے والد حکیم حسام الدین کی مسجد میں گئے۔ جہاں ختم قرآن کی تقریب ہونا تھی۔ میرے والد نے اقبال کو پہلی مرتبہ غور سے دیکھا۔ اس کی چمکتی آنکھوں، بلند پیشانی اور گورے گورے دلفریب چہرے کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے، اور اقبال کے والد کی طرف مخاطب ہو کر بولے کہ اس کی تعلیم کو جاری رکھنا چاہیئے۔ اس کو کل دکان پر بٹھانے کی بجائے میرے پاس بھیج دینا۔

دعائے خیر کے بعد بتاشے تقسیم ہوئے اور میرے والد اقبال کو اپنے ساتھ ہی گھر لیتے آئے۔ اور راستے میں اُن سے پیار اور محبت کی باتیں کر کے اقبال کے دل میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے شوق کی چنگاری سلگا دی۔ اب اقبال نے ہمارے ہاں بلا ناغہ آنا شروع کر دیا۔

ہمارے محلے میں ایک بزرگ سائیں مہر بخش صاحب تھے۔

اُنھوں نے ایک دن اقبال کو فرفر پڑھتے دیکھ کر انہیں "تھا پڑھا" دیا۔ میرا یقین ہے کہ اسی تھا پڑے کی برکت سے اقبال نے اس قدر عروج حاصل کیا۔

اقبال نے میرے والد سے اُردو کے علاوہ عربی اور فارسی بھی پڑھنا شروع کر دی۔ مجھ سے بڑی میری ایک ہمشیر تھی، جو عربی اور فارسی کی بڑی عالم تھیں۔ اقبال عربی کی گردانیں اُن کی مدد سے رٹا کرتے تھے۔

سیالکوٹ میں سردار سندر سنگھ صاحب پڑھانے میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ ان کا ایک لڑکا سردار اقبال سنگھ ڈپٹی کمشنر تھا۔ لیکن ماسٹر سندر سنگھ بہت غریب طبیعت کے آدمی تھے۔ میرے والد نے سندر سنگھ سے کہا کہ وہ ہم دونوں کو حساب پڑھا دیا کریں۔ چنانچہ میں اور اقبال عربی اور فارسی کا سبق لینے کے بعد ماسٹر سندر سنگھ کے پاس حساب پڑھنے کیلئے مہینوں باقاعدہ جاتے رہے۔

کبوتروں کا شوق

ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم شام کو ماسٹر سندر سنگھ کے ہاں سے حساب کے سوال نکال کر آ رہے تھے۔ جب ہم کبوتروں والی مسجد کے پاس سے گزرے تو اقبال کی نگاہ اُڑتے ہوئے کبوتروں پر پڑ گئی، اور وہ وہیں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اور دیر تک کبوتروں پر نظریں جمائے آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ لوٹن کبوتروں کو ہوا میں قلابازیاں کھاتے کھاتے زمین کی طرف آتے دیکھ کر اقبال کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ اِس نظارہ بازی کے بعد اقبال نے مجھ سے کہا "یہ کبوتر کتنے خوبصورت ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ ان کو دیکھتا ہی رہوں"

چھوٹی عید پر مجھے گھر سے دو آنے خرچ کرنے کے لئے ملے تھے۔ اقبال کے پاس بھی دو آنے تھے۔ اقبال نے تجویز کی کہ ان پیسوں سے کبوتر خریدنے چاہئیں۔ میں چٹورا تھا۔ میں نے کہا اگر یہ پیسے کبوتروں پر خرچ کر دیئے تو ہم چٹ پٹے کباب کیسے کھائیں گے۔ اقبال نے کہا "چھوڑو یار۔ کھانے کا کیا ہے۔ میری تو خوبصورت کبوتروں کو دیکھ کر ہی بھوک جاتی رہتی ہے"

ہماری یہ سرگوشیاں میری والدہ نے بھی سُن لیں اور ڈانٹ کر بولیں "اگر شاہ صاحب کو پتہ چل گیا کہ تم لوگ کبوتروں کے پیچھے وقت ضائع کرتے ہو تو قمچیاں مار مار کر کھال ادھیڑ دیں گے"

لیکن کبوتروں کے عشق میں ہم نے اس انتباہ کی پروا نہ کی۔ اور حسین و جمیل کبوتروں کے دو جوڑے خرید لائے۔ اب سوال یہ تھا کہ انہیں رکھا کہاں جائے۔ بڑے سوچ بچار کے بعد طے پایا کہ ایک ساتھی کے دوست کے ہاں انہیں رکھا جائے۔ اور جب بھی موقع ملا کرے، ان سے دل بہلا آیا کریں گے۔

کبوتر پالنے کی خوشی میں اقبال نے کچھ تک بندی بھی کی تھی چنانچہ چند "شعر" مجھے اب تک یاد ہیں، اور وہ یہ ہیں ؎

دل میں آئی جو تھی کے تو کبوتر پالے
جمع لا لا کے کئے لال، ہرے، مٹیالے
اِن میں ایسے ہیں جو ہیں پہروں کے اُڑنے والے

(دوسرا مصرع انہیں یاد نہ رہا)

اب یہ ہے حال کہ آنکھیں ہیں کہیں پاؤں کہیں
پاؤں کے نیچے نہ معلوم زمین ہے کہ نہیں

کبوتروں کی طرف توجہ زیادہ ہوئی تو تعلیم کی طرف رغبت کم ہونے لگی۔ میرے والد اس ٹوہ میں تھے کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ بالآخر انہیں پتہ چل گیا کہ ہمارے لیل و نہار کس دھن میں

بسر ہو رہے ہیں۔ ایک دن شاہ صاحب نے اقبال کو بلا کر کہا کہ ان بے زبان قیدیوں کو چھوڑ کر دو۔ چنانچہ میں نے اور اقبال نے دل پر پتھر رکھ کے کبوتروں کو چھوڑ دیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو کبوتروں کا شوق ہمیشہ رہا۔ جب وہ انارکلی والے مکان میں رہتے تھے، تو وہاں بھی اُنہوں نے کبوتر پال رکھے تھے۔ اور کبوتروں کا ایک جوڑا تو اُنہوں نے مکہ شریف سے بھی منگوایا تھا۔

جب اقبال بڑے آدمی بن گئے تو میں ایک بار اُن سے ملنے گیا۔ اُنہوں نے اُس زمانے میں "پرندہ کی فریاد" نظم لکھی تھی، مجھے پڑھ کر سنائی اور جب یہ شعر پڑھا ؎

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دُعا لے

فرمانے لگے "تقی شاہ تمہیں یاد ہوگا کہ یہ آخری مصرع شاہ صاحب کی زبان فیض ترجمان سے نکلا تھا۔ جب کہ اُنہوں نے ہمیں کبوتروں کے چھوڑ دینے کو کہا تھا۔

اقبال آٹھویں جماعت میں تھے کہ مجھے سیالکوٹ چھوڑ کر لاہور آنا پڑا۔

اِس کے بعد کے واقعات جناب تقی شاہ صاحب کے ذہن سے اُتر چکے ہیں۔ اُنہیں صرف یہ یاد ہے کہ جب اقبال تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور تشریف لائے تو اُن سے گاہے گاہے ملاقات ہوا کرتی تھی۔

محمد شفیع

"ھمایوں"

اقبالؔ

بدلتا رہتا ہے ہر لحظہ زندگی کا نظام
یہ کائنات ہے ہر دم تغیرات کا نام
عروج ایک کو ہوتا ہے دوسرے کو زوال
کہیں بہار کا آغاز ہے کہیں انجام
رلی ہوئی ہیں عروج و زوال کی کڑیاں
اِسی طرح سے ہے قائم تسلسلِ ایام
نہیں عروج سے کچھ کم کرشمہ ہائے زوال
زوال ہی میں ستور تھی ہی قسمتِ اقوام
اِسی سے فطرتِ آدم ہے انقلاب پذیر
اِسی سے ہوتا ہے بیدار ذوقِ سعیٔ تمام
زوال، بحرِ حوادث کا اِک کنارا ہے
شبِ سیاہ میں اُمید کا ستارا ہے
تجھے بھی باعثِ رحمت ہُوا زوال ترا
کہ اِس زوال سے ٹوٹا طلسمِ وہم و خیال
عروج کا تھا نتیجہ سکونِ فکر و عمل
زوال کا ہے تقاضا شکستِ گردشِ حال
ترے عروج کا حاصل تھے عرفی و طالب
ترے زوال نے دی تجھ کو دولتِ اقبال
حقیر ذرّوں سے اِک اور آفتاب اُبھرا
ہوئی سیاہیٔ شب جس کے نور سے پامال
ہزار سالہ حکومت کی داستانوں میں
تجھے ملیگی نہ ڈھونڈے سے کوئی اُسکی مثال
تو بے مقام تھا اُس نے دیا مقام تجھے
تو تشنہ کام تھا بخشا ہے اُس نے جام تجھے

کرم حیدری

"ساقی"

دل کی بستی

(مفض)

دلّی کیا تھی! اِس حقیقت سے آج تک کوئی آگاہ نہ کر سکا۔ دلّی نہ "آریئے جاریئے بابا شیا" بولنے والوں میں تھی، نہ بلّی ماراں یا قاسم جان کی گلی میں، نہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اور نہ کوچہ رحمان سے نکل کر گھنٹہ گھر کے اِدھر اُدھر چاندنی چوک میں۔ دلّی صاحب جو دلّی والوں کے دلوں میں تھی اور بس! اُجڑے دلوں کی تفسیریں کس دل سے بیان کی جائیں کہ اِس بستی کا حال معلوم ہو۔

دلّی صاحب جو محسوس کرنے کی چیز تھی۔ کوئی بیان کیسے کرتا۔ اُس دھڑکن سے جو اصل میں دلّی تھی، کوئی کیسے آشنا کراتا۔ یوں دلّی کی تاریخی عظمت سے کون واقف نہیں۔ کبھی سارا عالم یہاں سمٹ آیا تھا، سمرقند و بخارا، بغداد و بصرہ، غزنی غور اور کابل، شیراز کے بیش بہا ہیرے جواہرات اور نایاب موتیوں نے اس کے خزانے معمور کئے۔ رُوئے زمین کے بہترین پھول دلّی کے چمن میں سرسبز و شاداب ہوئے، مسلمانوں نے اپنے تہذیب و تمدن کے بیج یہاں بوئے، پھول کھلے اور دلّی کا چمن وسیع ہوتا گیا یہاں تک کہ سارے عالم پر چھا گیا۔ بڑے بڑے طوفان اور تیز تیز آندھیاں آئیں، لیکن دلّی اپنی جگہ قائم رہی۔ دلّی کو اصل میں اُسکے بے پناہ حسن نے تباہ کیا۔ دُور دُور سے بڑے بڑے جنگجو شہزادے اس حسین شہزادی کو اپنا بنانے کی فکر میں اس کے قدموں میں آئے۔ کچھ ہمیشہ کے لئے اِسی کے ہو رہے اور کچھ اس کے قیمتی زیورات چرا کر چل دیئے۔ یہ دُلہن بار بار لُٹا کی، لیکن پھر سنور سنور گئی۔ لیکن اس بار دُلہن نہیں لُٹی، بلکہ وہ جن کے دم سے اس کا سہاگ قائم تھا، دُلہن کی شوخیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے اُس سے چھین لئے گئے۔

شاید پچھلے پہر اہلِ دل اُس کی آہیں سنتے ہوں، ایک شہر جمنا کے کنارے آباد ہے، محفل گرم ہے، جانِ محفل کے بغیر یہ شمع بھی روشن ہے جیسے ہر رنگ میں سحر ہونے تک جلنا ہے جلتی رہے گی۔

عام طور پر اُس بستی کو جو جمنا کے کنارے آباد تھی دلّی کہا کرتے تھے۔ اب لوگوں کو کون سمجھائے کہ دلّی جمنا کے اِس پار بھی سینکڑوں میل آباد تھی۔ دلّی کی وسعتیں ایک ذرا سے خطّہ میں کیسے سما سکتی تھیں۔ یوں تو ہمارے زمانہ کے ہندوستان میں ہر ہر بستی میں دلّی بسی تھی، لیکن چند بستیاں بالکل دلّی کے سانچے میں ڈھلی تھیں اور پوری طرح دلّی کہلانے کی مستحق۔ مثال کے لئے ایک قصبہ کی جھلک کافی ہو گی۔

دلّی سے پورے سو میل پر نہر گنگ کے کنارے ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے جس کو منگلور کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کسی راجہ منگل سین نامی نے آباد کیا۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں ایک فوجی مرکز تھا۔ اصل شہرت مغلوں کے عہدِ حکومت میں پائی۔ دلّی کے اُمرا اور سپہ سالار یہاں آ کر آباد ہوئے۔ جنہوں دلّی کی طرز پر شہر کا نقشہ بنایا، مسجدیں بنائیں، عمارتیں کھڑی کیں اور باغات لگائے، آبادی اور وسعت کے مطابق وہی دلّی جیسی جامع مسجد، قلعہ اور اُونچے اُونچے دروازے والے مکانات جن میں سہ دریاں، پنج درے، شہ درے، لکڑی کے دروازوں کی جگہ بھاری پردے، رہن سہن کے طریقے، روایات اور رسمیں بالکل دلّی جیسی، کمروں میں قالین

چاندنیوں کے فرش، گاؤ تکیے، حقے اور پیچوان، خاصدان میں گلوریاں، تفریح کے لئے چوسر، پچیسی اور شطرنج، بالا خانوں پر کنکوے، اور کبوتروں کی چھتریاں، محفلوں میں قوالیاں مشاعرے، غالب و ذوق کے موازنے، داغ کی زبان میں گفتگو، شریف منزل کے تعلیم یافتہ حکیم، چاندنی چوک کی دکانوں میں بیٹھے ہوئے سوداگر، دلی کے ادب اور شعرا کی صحبت سے فیضیاب اتالیق، مفتی قاضی بزرگوں کے مزار، فاتحہ خوانی اور قوالیاں، میلے، بوند پڑنے پر باغوں کی سیریں، پیری مریدی، مدناں خانوں میں پاندانوں کا رقص، شادی بیاہ کے تذکرے۔ قصہ مختصر منگلور کی ہر ہر چیز ہر ہر بات بالکل دلی کے انداز پر تھی۔ یہاں آ کر دلی والے خود کو اجنبی نہ محسوس کرتے۔

ایک دلی والے شفاء الملک منزل میں میری باتیں سُن کر بولے "خوب خوب گویا آپ کو ہم دلی والا مان لیں، جی نہیں، پہلے پورے ۱۲ برس دلی کی گلیوں کی خاک چھانئے۔"

اب اِس ستم ظریفی کو کیا کہیئے عزیزوں کو بُھلا بیٹھے۔ اور ہمیں غریب جان کر ہنس ہنس کر پکارنے لگے۔ اچھا پیارے تم دلی والے سہی اور ہم غیر! منگلوری ہی سہی، دس بار منگلوری لیکن اب دلی ہے نہ منگلور، پھر رشتہ کیا جوڑیں، شکوے شکایات کس سے کریں۔

سُننے ہیں اب پھر ہماری دلی اپنی پُوری شان و شوکت کے ساتھ آباد ہو رہی ہے لیکن اُس جگہ نہیں جہاں پہلے تھی بلکہ پورے پاکستان میں جہاں کی ساری بستیاں اُسی دلی کی گلیاں بنیں گی جو کبھی ہمارے دلوں میں آباد تھی۔ وہاں ہم سب دلی والے ہی کہلائیں گے۔ زندہ باد دلی، پائندہ باد دلی۔

جمنا کے کنارے ایک شہر آباد ہے جسے نہ معلوم کیوں اب بھی لوگ دلی کہتے ہیں۔

مجاہد کاظمی

"چندن"

افسانے کی امتیازی صفت

(ملخص)

افسانہ، کہانی، قصہ، یہ سب ہم معنی الفاظ ہیں۔ دنیا کے سب سے پہلے نقاد ارسطو نے کہانی کی یہ امتیازی صفت بتائی۔ کہ اس میں ایک شروع کا حصہ ایک درمیانہ حصہ اور ایک خاتمہ ہونا چاہیئے۔ اور یہ بھی بتایا کہ اکثر کہانیوں میں شروع کی حالت خاتمہ پر بالکل متضاد حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پروفیسر پیریٹ نے لکھا ہے۔ کہ افسانہ کی روح واقعہ (EVENT) ہے۔ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی قصہ کی جان ہے۔ اور یہ تبدیلی سننے والوں کی توجہ کامل طور پر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ سننے والا یہ پوچھتا رہتا ہے کہ آگے کیا ہوا؟

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مختصر افسانہ کوئی واقعہ ہی نہیں رکھتا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ مختصر افسانے میں ایک واقعہ سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اِس واحد واقعے میں بھی شروع، درمیان اور آخر ہونا ضروری ہے۔ جدید مختصر افسانہ کا موجد امریکن اڈگر ایلن پو ہے۔ اس کے تمام افسانے ایک واقعہ پر مبنی ہیں۔ ہر افسانے میں ایک ہی واقعہ ہے۔ مگر یہ واقعہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ اور اختتام تک ہم اس میں تمام توجہ کے ساتھ محو رہتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اختصار سے قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے، اِن لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مختصر افسانہ بھی اپنی امتیازی صفت

نمایاں کرتا ہے۔ (دنیا کے مختصر انعام یافتہ افسانے کو پڑھئے)

ریل میں سفر کرتے ہوئے ایک صاحب نے اپنے ہم سفر سے کہا۔

"میں بھوت پریت کا عقیدہ نہیں رکھتا۔"

ہم سفر نے کہا: "اچھا!" اور غائب ہو گیا۔

اِس دو جملوں کے افسانے میں افسانہ کے ظاہری لوازم سے قطع نظر ایک پورا واقعہ مع اپنے شروع، درمیان اور خاتمہ کے موجود ہے۔ اِس میں وہ تبدیلی موجود ہے جو ہر افسانے کی جان ہوتی ہے۔

مکالمہ افسانہ کے لوازم میں سے ہے۔ مگر محض مکالمہ ہی افسانے کو افسانہ نہیں بناتا۔

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ جس پارے میں ہم واحد تاثر پاتے ہیں اسے افسانہ کہتے ہیں۔ واحد تاثر وہ صفت ہے جو افسانے کو ناول سے مختلف کرتی ہے! اور افسانہ کے اختصار سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ مگر واحد تاثر کس اچھے مختصر ادب پارے میں نہیں ہوتا افسانے میں افسانویت ہونا، قصہ پن ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی نثر پارے میں یہ نہ ہو، تو چاہے اس میں کردار ہو، موضوع ہو، مکالمہ ہو، واحد تاثر ہو، وہ افسانہ کہلانے کے قابل نہیں ہے۔

اکثر افسانے خاکے ہی ہو کر رہ جاتے ہیں اور اکثر خاکے بڑھ کر افسانہ کی حد میں آجاتے ہیں۔ اکثر مضمون اس قدر افسانے سے مناسبت اختیار کر لیتے ہیں کہ اگر ان کو افسانہ کہا جائے تو بے جا نہیں معلوم ہوتا۔ مگر ان کی رُوحیں مختلف ہیں۔

مختصر ادبی نثر پاروں کے سلسلے میں تین عناصر خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ اول "واقعہ" دوم "تصویر" سوم "موضوع" یعنی یا تو وہ کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے یا کسی حالت کو دکھاتا ہے اور یا کسی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ اب اگر اس کا زور اول عنصر پر ہے تو وہ پارہ افسانہ ہوگا، اگر دوسرے پر تو وہ خاکہ ہوگا، اور اگر تیسرے پر تو وہ مضمون ہوگا۔

افسانے اور خاکے میں وہی فرق ہے جو ایک چلتی ہوئی چیز اور ساکت چیز میں، اول میں کچھ ہونا اور اس کا نتیجہ نکلنا بہت ضروری ہے جبکہ دوسرے میں ایک ہی حالت کا قیام کافی ہے۔

اس وقت ہمارے اچھے نثر نگار افسانے، خاکے، مضامین سب ہی کچھ لکھ رہے ہیں۔ مگر ان میں اکثر چونکہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی مشہور ہو گئے ہیں۔ اس لئے ان کی تمام تصانیف کو افسانہ ہی کہا جاتا ہے۔ مثلاً کرشن چندر۔ مگر وہ یقیناً اپنے افسانوں کو افسانے، خاکوں کو خاکے اور مضامین کو مضامین کہتے ہوں گے۔

دوسرا فرق افسانہ اور مضمون کے درمیان کرنا ہے۔ عام طور پر مضمون محض تنقیدی مضمون کو کہا جاتا ہے اور عام مضمون یعنی (ESSAY) کو بھی افسانہ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں اکثر خیالات کا انکشاف بیان کے ذریعہ سے نہیں بلکہ مکالمے کے ذریعہ سے ہوتا ہے ایک مجموعہ میں ای وی لوکس کا مضمون "فیس آن دی وال" مجھے افسانوں میں شامل دکھائی دیا، حالانکہ مضمون کو افسانہ کی سی سرخی دے کر اور موضوع کو بجائے بحث کے ایک افسانہ کے ذریعے واضح کر کے لوکس نے اپنے مضمون کو حد سے زیادہ دلچسپ بنایا ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد اپنا موضوع ہی ہے۔ اور اِس لئے اس کا مضمون مضمون ہی ہے افسانہ ہرگز نہیں ہے۔ عصمت چغتائی کا 'نفرت' ایک نہایت عمدہ مضمون ہے۔ حالانکہ اس کا پیرایہ افسانے کا سا ہے۔ مگر یہ پارہ مضمون ہی ہے افسانہ یا خاکہ نہیں۔

(مختصراً) لفظ افسانہ اسی چیز کے لئے استعمال کیا جا سکتا

ہے جس میں "قصہ پن" یا "واقعہ" ہو۔ اگر کسی پارے میں یہ صفت نہیں ہے تو اُسے جو کچھ بھی کہا جائے، وہ افسانہ تو نہ ہوگا۔

(ملخص از دلشاد کلانچوی) محمد احسن فاروقی

"ادبِ لطیف"

ٹرنک کال

(انتخابِ اشعار)

آج اُس نے کیا تھا فون مجھے
اُس کی آواز سُن رہا تھا میں
نرم لہجے، مہکتی سانسوں کے
پھول ہنس ہنس کے چُن رہا تھا میں

وہ کنائے، اشارے، تلمیحیں
وہ لگاوٹ وہ لذّتِ تقریر
کھینچ دی تھی فضا کے سینے پر
شوخ فقروں نے نقرئی سی لکیر

آرہا تھا ہوا کی لہروں پر
لبِ نازک کی لرزشوں کا پیام
میں نے بے اختیار چُوم لیا
چھلکا چھلکا ہوا سا رنگیں جام

ذہنِ انساں نے کر دیا آزاد
سب پیادوں کو سب سواروں کو
اُڑ گئے نامہ بر کبوتر آج
سونپ کر راز برق پاروں کو

کچھ نہیں وقت وفا صد لیکن
خون "ایکسچینج" "کاروبار" میں ہے

دستِ انساں کی ہر حسین ایجاد
اہلِ دولت کے اختیار میں ہے

کیفی اعظمی

"نیا دور"

ماں

دلّی آٹھ مہینے بعد

سب سے پہلا اثر دلّی دیکھ کر یہ ہُوا کہ یہ وہ دلّی نہیں جو ہم نے سات مہینے پہلے چھوڑی تھی۔ اس کی آبادی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ شہر کے کوچہ و بازار تنگ ہو گئے تھے۔ اچھے دنوں میں دلّی کی آبادی چھ لاکھ تھی، جنگ کے زمانے میں بارہ لاکھ اور اب سترہ لاکھ تھی پھر بازار میں کئی کئی بازار بن گئے تھے، وہ اس طرح کہ بازار کی دونوں پٹریوں پر بھی ایک ایک بازار شرنارتھیوں نے لگا لیا تھا۔ یہ لوگ تخت اور چوکیاں لگا کے دنیا بھر کا سودا بیچ رہے تھے

ایک دوست کی وساطت سے دلّی کا ایک چکر لگانے کا موقع ملا۔ اخباروں کے ذریعہ معلوم ہُوا تھا دلّی کی ساری مسجدیں خالی کرا لی گئی ہیں لیکن دیکھا یہ کہ آدھی سے زیادہ اب بھی آباد ہیں۔ پولیس انہیں اُٹھا کر نکال جاتی ہے اور تالا توڑ کر یہ پھر آباد ہو جاتے ہیں۔ جو مسجدیں شہید کر دی گئیں۔ وہاں اُن کے اب آثار بھی باقی نہیں ہیں پھر خمروالاں کی سرخ پتھر کی مسجد کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔ ایک صاحب نے وہاں گھر یا مندر تعمیر کرانا شروع کر دیا تھا۔ مگر حکومت نے تعمیر رکوا دی، پہاڑ گنج اور سبزی منڈی میں سب مسجدیں آباد ہیں۔ اُن کے نل اور بجلی کے سلسلے کاٹ دیئے گئے ہیں لیکن مکین اب بھی انہیں نہیں چھوڑتے، چھوڑیں تو جائیں کہاں؟ مسلمانوں کے جتنے مکان تھے، اُن پر قبضے پہلے کئے جا چکے تھے،

جو بچے ہوئے تھے اُن پر کسٹوڈین کا قبضہ ہو گیا۔ پھر مسلمانوں نے خود پیشگی کرائے اور پگڑیاں لے کر شرنارتھیوں کو آباد کر دیا کہ کسٹوڈین کی گھتی میں جائداد نہ پڑ جائے۔ دلّی میں امن کی خبریں سُن کر اکثر دلّی والے پاکستان سے واپس آ رہے تھے۔ لیکن اُن کے رہنے کے لئے مکان نہیں تھے۔ جو اُن کے ذاتی مکان تھے، وہ یا تو شرنارتھیوں کو الاٹ ہو چکے تھے، یا شرنارتھیوں سے کچھ لے کر خود مسلمانوں نے انہیں بسا دیا تھا۔ اُن کے خالی ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اور حکومت نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ مکان واپس نہیں دلائے جا سکتے۔ واپس آنے والے مسلمان مارے مارے پھر رہے تھے۔ جو صاحبِ جائداد تھے، چاہتے تھے کہ اپنی جائدادیں بیچ ڈالیں تو حکومت اِس کی بھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ نہ بیچنے کی اور نہ تبادلے کی۔ اِس باب میں حکومتوں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا اور نہ اب تک کوئی فیصلہ ہوا ہے۔ کہا یہ جاتا تھا کہ انکم ٹیکس والوں سے واجبات سے بری الذمہ ہونے کا سرٹیفکیٹ لے آؤ تو جائداد بک سکتی ہے لیکن اس کے باوجود کسٹوڈین کی طرف سے اجازت نہیں ملتی۔ اِس کے برعکس کراچی میں ہندوؤں نے اپنی جائدادیں اور کاروبار خوب پگڑیاں لے لے کر بڑے بڑے منافعوں پر بیچا۔ اور گھر کی ایک ایک چیز کوڑی کے داموں پر فروخت کی۔ علاوہ کر بھاڑے وتکٹ بیچی اور آرام سے پاکستان اور جناح کو کوستے اور گالیاں دیتے بمبئی روانہ ہو گئے۔ کراچی میں مجال ہے کسی کی کہ کسی گھر پر قبضہ تو کر لے، اُسی وقت پولیس آکر ہتھکڑی لگا لیتی ہے۔ دلّی میں مسلمانوں کو زبردستی گھر سے نکال کر شرنارتھی بس جاتے ہیں اور جو تھانہ پولیس کرو تو یہی مشورہ دیا جاتا ہے کہ تمہارے لئے پاکستان بن گیا ہے'

وہاں چلے جاؤ، اور اِن غریبوں کو یہاں رہنے دو، خوشی سے نہیں تو ناخوشی سے رہنے دو گے۔ زندہ چلے جاؤ ورنہ کوئی مار ٹور دے گا۔

چاندنی چوک میں اب سات بازار ہیں۔ دو اصل بازار اور پانچ شرنارتھیوں کے گھنٹہ گھر پر چھولے، دہی بھلے، کباب اور وہ تمام سودے جو آج تک وہاں کبھی نہیں فروخت ہوئے، ٹھیلوں پر خوب بکتے ہیں۔ مقامی ہندو بڑے پریشان ہیں، بارہا کوشش کی جا چکی ہے کہ شرنارتھیوں کو کہیں اور ہٹا دیا جائے، مگر ان کا کہنا بھی بجا ہے کہ جنگل میں ہم سے سودا خریدنے کون آئے گا۔ حکومت انہیں نوٹس بھی دیتی رہتی ہے کہ اپنے تخت اور ٹھیلے ایک مہینے میں ہٹا لو، ورنہ قید اور جرمانہ ہو گا، مگر جب میعاد پوری ہوتی ہے تو اُن کے نمائندے حکومت سے بات کر لیتے ہیں اور ایک مہینے کی میعاد اور مل جاتی ہے، عذر ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ شرنارتھیوں کا یہی احسان کیا کم ہے کہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں اور امنِ عامہ میں خلل نہیں ڈالتے۔ اگر انہیں ستاؤ گے تو یہ بھی ستائیں گے۔ بس بھر یہ بے گھر اور بے در لوگ دھوپ میں بیٹھے سودا بیچتے ہیں اور ان کی عورتیں اور بچے گلیوں میں پڑے رہتے ہیں۔ رات کو انہی تختوں پر اگر جگہ ہوئی تو یہ بھی آ پڑتے ہیں۔ ورنہ جہاں جگہ مل گئی پڑ رہتے ہیں۔ شہر کی گندگی میں اضافہ ہونا ہی چاہئے۔ یہی غنیمت ہے کہ کوئی وبائی بیماری شہر میں نہیں پھیلی۔ شہر کے بڑے بازاروں میں مسلمانوں کی دکانیں خال خال رہ گئی ہیں۔ اور اُن کا جا رہنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے۔ مشہور دکاندار سب غائب ہو چکے ہیں۔ سراج الحق گوٹے والے کی دکان میں ہوٹل ہے۔ شاہی حلوا سوہن والوں کی دونوں دکانوں میں

ہندو حلوائی آبیٹھے ہیں۔ میوہ فروش پٹھان اپنی دکانیں بیچ بیچ کر بھاگ گئے۔ فتح پوری کے دو مشہور ہوٹلوں میں رنگ والوں کی دکانیں کھل گئی ہیں، دو چار مسلمان دکاندار جو باقی ہیں اُنھوں نے اپنے کارکن اور ملازم ہندو اور سکھ رکھ لئے ہیں۔ اکثر جانے پہچانے چہرے اب شناخت میں نہیں آتے۔ کسی نے ڈاڑھی صاف کرا دی ہے تو کسی نے بھدرا ہی کرا ڈالا ہے۔ عام کوشش یہی ہے کہ صورت اور لباس سے مسلمان مسلمان نہ معلوم ہو۔ عبدالغنی عطر فروش کا ڈاڑھا، سرسید مرحوم کی تصویر یاد دلاتا تھا۔ اُن کے لڑکوں کی بھی چھالریں اور گز ٹیں تھیں۔ بڑے میاں کا انتقال ہو گیا۔ لڑکے کلین شیوڈ ہو گئے۔ آدھی دکان ایک سکھ کو دے دی، ڈرے سہمے، دکان پر بیٹھے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے روزگار ٹھک گئے اور عام رجحان یہی ہے کہ مسلمان سے بدرجۂ مجبوری کام لیا جائے۔ اپریل میں اس کا بڑا اچرچا تھا کہ دلّی سے مسلمان حیدر آباد جائیں اور حیدر آباد کو دبائیں کہ ہند میں شریک ہو جائے۔ ہندی مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے۔ ارونا آصف علی اپنی تقریروں میں صاف صاف یہی کہتی تھیں۔ جمیعت والے بھی دبک کر بیٹھ رہے تھے اور مسلمانوں کا کوئی حامی نہیں رہا تھا، مسلمان غدار سمجھے جاتے اور دھڑا دھڑ پکڑے جاتے، اور جریدۂ سرکاری میں شائع کیا جاتا کہ آج اتنے غنڈے پنجاب تحفظ ایکٹ کے تحت گرفتار کر لئے گئے۔

مَیں دلّی میں بارہ دن رہا۔ یہ بارہ دن، بارہ سال ہو گئے۔ بہت بددل ہو کر وہاں سے لوٹا، ہندو دوستوں میں بہت کم ایسے تھے، جن کی نظروں میں فرق نہ آیا ہو۔ خلوص اور بناوٹ کا فرق الگ معلوم ہو جاتا تھا۔ یہ میرا وطن تھا جو مجھی کو کاٹنے دوڑ رہا تھا۔ میرے آبائی مکان میں جس میں "ساقی" کا دفتر تھا ایک ہندو سب انسپکٹر پولیس آباد ہے۔ یہ ڈپٹی نذیر احمد مترجم قرآن کا مکان تھا۔ محمد حسین آزاد کے مکان میں سکھ رہتے ہیں۔ منشی ذکاء اللہ کی حویلی میں شرنارتھی آباد ہیں۔ ڈپٹی غداء اللہ کے مکان میں پنجاب کا ایک اچار مربے والا اپنا کارخانہ لئے بیٹھا ہے۔ علامہ راشد الخیری، پروفیسر مرزا محمد سعید، خواجہ فضل احمد، احتشام الدین، آغا طاہر، ظریف دہلوی، سب کے مکانوں میں ہندو اور سکھ رہتے ہیں۔ یہ تو میری دلّی نہیں ہو سکتی۔ اور وہ در و دیوار جن سے بقول انشاء اللہ خاں" لطافت برستی تھی" اب تُستی پُستی سے گونجتے رہتے ہیں۔ سرِ راہ نلوں پر عورتیں ننگی ہو کر نہاتی ہیں اور بے حیائی عام ہو گئی ہے۔ دلّی کی ہندو عورتوں نے بازاروں میں نکلنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ امن اتنا ہے کہ مسلمان پہاڑ گنج اور سبزی منڈی میں بھی چلا جاتا ہے لیکن ایک خوف، ایک ہراس، ہر وقت طبیعت پر طاری رہتا ہے۔ غیر محفوظ ہونے کا احساس، ہر وقت خطرے میں رہنے کا احساس، ہر طرح کی بے اطمینانی، جیسے یتیم دیسیر، نہ اِدھر کے اور نہ اُدھر کے ؎

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم در کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

مَیں اپنی ماں کی گود میں دلِ شکستہ لے کر آیا تھا اور دلِ مُردہ لے کر واپس آیا۔ ماں کا رنڈ سالہ دیکھا، بیوگی کے آنسو دیکھے۔ شاہجہانی مسجد کو ملگجی چاندنی میں دیکھا تو سمجھا کہ ماں کے دونوں ہاتھ، دعا کے لئے آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے ہیں، اور مریم کی طرح اُس کے دل میں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ تصور کچھ ایسا بندھا ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔ اور بار بار دل میں یہ سوال

سلہ جامع مسجد کے جنوب مشرقی رُخ [illegible] خدا جانے کیسے آگ لگ گئی [illegible] مسجد کے [illegible]

پیدا ہوتا ہے "ماں! کیا تیرا سہاگ ہمیشہ کے لئے اُجڑ گیا؟"
(مضمون سے اقتباس) **شاہد احمد دہلوی**

"آجکل"

نیا گیت

گیت نیا ہے، تان نئی ———
آج ہمارے ہونٹوں پر جیون کی ہر مسکان نئی!
گیت نیا ہے، تان نئی ———
مست پون لہراتی آئی،
کلیوں نے پھر لی انگڑائی!
اِن کلیوں کا رُوپ انوکھا، رنگ نرالا، شان نئی!
گیت نیا ہے تان نئی!
آج ہمارے ہونٹوں پر جیون کی ہر مسکان نئی!
گیت نیا ہے تان نئی ———

سلام مچھلی شہری

"شاہراہ"

نئی شاعری کی زبان اور ہیئت

کسی بھی دور کی شاعری کا خام مواد وہ زبان ہوتی ہے جو اُسے ورثے میں ملتی ہے۔ نئی شاعری کو جاگیردارانہ نظام کی شاعری کی زبان ملی۔ اُس نے جس وقت ایک نئی حقیقت کی طرف جست لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ پرانا سرمایہ بہت کم ہے۔ اسی وجہ سے اُس نے پرانے سرمایہ کے ساتھ لا پروائی بھی برتی۔ اور آج جبکہ یہ اپنے پرانے سرمایہ کو سہار سہار کر استعمال کر رہی ہے تو اسے دونوں قسم کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔

ایک طرف تو یہ احساس ہے کہ ہم پرانی زبان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اور دوسرا یہ احساس کہ سائنسی دور کی حقیقت بیان کرنے میں ہمیں بہت سے نئے الفاظ، تشبیہیں، نئے تصورات استعمال کرنے پڑیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دشنہ اور خنجر کا لفظ کیوں محبوب ہے اور بندوق اور بم کا لفظ کیوں مکروہ سمجھا جاتا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ادبی دنیا میں الفاظ اپنی تاریخ خود مرتب کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس چیز کو معیار بنایا جائے تو بات قابلِ قبول ہے ورنہ تبدیلی سے گھبرا اُٹھنا تو ایک بیماری کی علامت ہے۔ اسی طرح اکثر پرانی علامتیں اور تلمیحیں مفہوم کو بھرپور طور سے ادا نہیں کر پاتی ہیں۔ اگر ان کا استعمال بحسن و خوبی ہو سکے تو کیا کہنا کیونکہ نئے خیال کو پرانے لباس میں پیش کرنا قلب و ذہن پر سحر کر دینے کے مترادف ہے۔ لیکن اگر یہ مقصد ہی فوت ہو جائے تو پھر اس ساحری سے باز آنا ہی اچھا ہے۔ آج سماجی زندگی میں اتنی بہت سی طاقتیں کارفرما ہیں اور وہ ایک دوسرے سے کچھ اس طرح برسرِ پیکار ہیں کہ شمعِ انجمن کو متعین کرنا ہی مشکل ہو گیا ہے۔ یہی دشواریاں وضاحت کے لئے مجبور کر رہی ہیں۔ غزل کی زبان میں اتنی وسعت ہرگز نہیں ہے کہ وہ حقیقت کے نئے تصورات کو بخوبی ادا کر سکے۔ نئی شاعری نئی زبان بھی خلق کر رہی ہے۔ زبان کے سرمایہ میں وسعت یوں ہی پیدا ہوتی ہے۔ اگر بزرگوں کو یہ حق تھا کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق زبان کو گھڑ سکیں تو یہ حق ہمیں کیوں نہیں دیا جاتا۔

جہاں تک ہیئت اور اسلوب کا تعلق ہے اس کے متعلق بھی غور کرنا ہے۔ قدیم شاعری صداقتوں کے بندھے ٹکے تصور پر قائم تھی۔ جو صداقتیں ابتدائی عہد میں مرتب کی جا چکی

تھیں۔ وہ سینہ بسینہ پہنچتی رہیں۔ ایک ہی قسم کی صداقتوں کو مختلف تشبیہ و استعارہ اور تمثیل و کنایہ کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا۔ صداقت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے لئے غزل کا ایک شعر کافی ہو جاتا تھا۔ حُسن و عشق کے موضوع کو بھی اتنے دنوں تک دھویا گیا تھا کہ سامعین ہر استعارے کو بہ آسانی سمجھ لیتے تھے۔ واردات قلب کے اظہار میں بھی وہ عمومیت پیدا ہو چکی تھی کہ اس کے اختصار ہی میں لطف آتا تھا۔ یہ دونوں حقیقتیں غزل کو بہت دنوں تک تھامے رہیں۔ نئی شاعری چونکہ ایک نئی حقیقت کو لے کر میدان میں آئی۔ اس لئے شرح کے ساتھ سمجھانے کی ضرورت پڑی۔ غزل نما نظمیں کہاں تک قافیوں کو مہیا کرتیں۔ اس لئے نظم مسلسل کی مختلف صنفیں اختیار کی گئیں۔ پھر بھی چند دشواریاں باقی رہ گئیں۔ قافیہ کا التزام اکثر خیالات کو مجروح کر دیتا ہے۔ اگر صوتی اعتبار سے وہی سنگیت بغیر قافیے کے پیدا ہو سکے تو کوئی وجہ نہیں، کہ آزاد نظموں کو کیوں نہ رائج کیا جائے۔ میری ناقص رائے میں آزاد نظموں میں صوتی ترنم اور داخلی موسیقیت کی شرط لگانا ضروری ہے۔ کیونکہ شاعری اور سنگیت کا سمبندھ بہت قدیم ہے۔ اور یہ رشتہ ہر دور کی شاعری میں پایا گیا ہے۔ (مضمون سے اقتباس)

ممتاز حسین

"سنگِ میل"

گیت

نئی ڈگر پہ چلی جوانی ——— دنیا جھوم گئی
جھوم گئی جب رات سہانی ——— دنیا جھوم گئی

ہم نے جن کے دیکھے سپنے
آ پہنچے وہ دوارے اپنے!

جیت گئی جب پریت پرانی ——— دنیا جھوم گئی
نئی ڈگر پر چلی جوانی ——— دنیا جھوم گئی

چھنن چھنن جب چھاگل چھنکی
سدھ بدھ بھول گئی تن من کی

سنتے سنتے روپ کہانی ——— دنیا جھوم گئی
نئی ڈگر پر چلی جوانی ——— دنیا جھوم گئی

جنم جنم کے دکھڑے بھولے
ڈال دیئے باہوں نے جھولے

اُشاؤں نے کی من مانی ——— دنیا جھوم گئی
نئی ڈگر پر چلی جوانی ——— دنیا جھوم گئی

دل کو ہم نے دل سے تولا
سانسوں کو سانسوں میں گھولا

جھوم گئی دنیا دیوانی ——— دنیا جھوم گئی
نئی ڈگر پر چلی جوانی ——— دنیا جھوم گئی

قتیل شفائی

"زمانہ"

علامہ اقبال شعر کس طرح کہتے تھے؟

سر راس مسعود مرحوم ۱۹۳۵ء میں بھوپال میں وزیر تعلیم ہو کر تشریف لائے۔ یہی زمانہ تھا کہ لاہور میں علامہ اقبال کے سینہ و حلق پر امراض کا حملہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے بجلی کے علاج کا مشورہ دیا۔ بھوپال میں اس علاج کا نہایت معقول انتظام تھا۔ اور شعبۂ معالجات سر راس مسعود کے زیر نگرانی تھا۔ اس لئے مرحوم کی خواہش پر علامہ صاحب بھوپال تشریف لائے۔ سر راس کا قیام شہر سے نا صلہ پر کوٹھی

"ریاض منزل" میں تھا۔ اس لئے "شیش محل" میں جو شفاخانہ کے قریب واقع ہے، علامہ مغفور کا قیام تجویز کیا گیا۔ سر راس مسعود کے ذریعہ راقم الحروف کو علامہ کی خدمت میں شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ مرحوم کی آواز میں بہت خستگی آگئی تھی۔ معالجین نے بات چیت کرنے سے منع کر دیا تھا۔ مگر مرحوم جب کسی موضوع پر اظہارِ خیال کرنے پر آتے تھے تو اُن کی گفتگو نہایت پُرجوش اور مفصل ہوتی تھی۔ اُس وقت وہ کسی احتیاط کی پروا نہ کرتے تھے۔ عام طور سے مغربی سیاست، عالمِ اسلام کی زبوں حالی اور رسائی کے عنوانات زیرِ بحث رہتے تھے۔ اس زمانہ میں علامہ مغفور کی روح کسی "مردِ کامل" کی تلاش کے لئے بیقرار تھی۔ اِس جستجو میں وہ بھوپال کے کئی بزرگوں اور صوفیوں سے اُن کے جائے قیام پر جا کر ملے بھی، ایک دن باتوں باتوں میں خود ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا ذکر چھڑ گیا، اور اُن اسباب پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی گئی جو اُن کی شاعری کے محرک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ :۔

"ابتدا میں تو مَیں نے بھی محض تفریحاً شعر کہنا شروع کیا تھا اور میری شاعری کی حد بھی صرف غزل تک تھی۔ لیکن یہ زمانہ بہت مختصر تھا۔ اس کے بعد میں نے کبھی تفننِ طبع کے طور پر شعر نہیں کہے نہ طبیعت کو شعر کہنے پر مجبور کیا۔ میری شاعری کے محرک درحقیقت وہ حالات و واقعات ہوئے ہیں، جو نہایت تیزی کے ساتھ میرے زمانہ میں پیش آتے رہے۔ ماحول سے متاثر ہو کر بعض خیالات میرے ذہن میں آئے۔ جنہیں مَیں ملک و قوم کے لئے مفید سمجھتا تھا۔ اوّلاً مَیں نے اپنے تاثرات کو نثر کی صورت میں قلمبند کیا لیکن جلد ہی مجھے اِس بات کا احساس ہو گیا کہ نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔ عموماً لوگ نظم کو نثر سے زیادہ رغبت و شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ نظم دلوں پر بہت جلد اثر کر جاتی ہے، اس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد مَیں نے نظم کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فکرِ شعر کے متعلق فرمایا کہ :۔

"مَیں شعر کہنے کے لئے کوئی تیاری نہیں کرتا، عموماً ہوتا یہ ہے کہ کوئی خیال دماغ میں آتا ہے جس کا اظہار مفید معلوم ہوتا ہے۔ یہ خیال دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ پھر کسی وقت بغیر کسی ارادہ کے نظم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اکثر ایسا ہوا ہے کہ یک وقت پوری رباعی یا نظم موزوں ہو گئی گویا کہ کسی نے لکھوا دی ہے۔ بعض وقت تو شعر اس تیزی سے نظم ہوتے ہیں کہ اُن کا لکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر کئی کئی روز تک ایک شعر بھی موزوں نہیں ہوتا۔ کوشش اور ارادہ بھی ناکام ثابت ہوتا ہے" قیامِ بھوپال کے زمانہ میں کئی بار دیکھا گیا کہ ڈاکٹر صاحب خاموش لیٹے ہوئے ہیں حاضرین میں کوئی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب غور سے سُن رہے ہیں۔ یکایک چہرے پر سرخی نمودار ہوئی۔ ہاتھ کے اشارہ سے حاضرین کو خاموش کیا۔ خود اُٹھ بیٹھے اور لکھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پنسل کاغذ رکھ کر لیٹ گئے اور بحث کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کے بیشتر مقامات اور "ضربِ کلیم" کے متعدد اشعار "شیش محل یا کوٹھی" ریاض منزل بھوپال میں اسی حالت میں لکھے گئے تھے۔ کتب مذکورہ کے حاشیوں پر اس قسم کے نوٹ موجود ہیں۔

(مضمون سے انتخاب)

مائل نقوی

تبرکاتِ مخزن

(منقول از مخزن ماہ جولائی ۱۹۰۲ء)

ماتمِ پسر

ہمارے ایک عنایت فرما رئیسِ بارہ مولا علاقۂ کشمیر خواجہ صمد جُو صاحب ککرُو ہیں۔ انہیں چند ماہ ہوئے اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹے کی مرگِ ناگہاں دیکھنا نصیب ہوا۔ خواجہ صاحب ذی علم، علم دوست رئیس ہیں اور خود زبانِ فارسی میں طباع شاعر ہیں۔ اور مقبل تخلص کرتے ہیں۔ مگر اِس رنج نے ان کی طباعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا۔ اور انہیں تصویرِ غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے اُن کی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا ہے جو درج ذیل ہے :-

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا　　وہ خورشیدِ روشن نہاں ہو گیا
بیاباں ہماری سرا بن گئی　　مسافر وطن کو رواں ہو گیا
گیا اُڑ کے وہ بُلبلِ خوشنوا　　چمن پائمالِ خزاں ہو گیا
نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار　　نظر سے جو وہ گُل نہاں ہو گیا
گیا کارواں اور ہمیں راہ میں　　غبارِ رہِ کارواں ہو گیا
گرا کثرت کے آنکھوں سے لختِ جگر　　مرے صبر کا امتحاں ہو گیا
بڑھا اور اک دشمنِ جانستاں　　دُھواں آہ کا آسماں ہو گیا
ستم اِس غضب کا خزاں نے کیا　　بیاباں مرا بوستاں ہو گیا
ہوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے　　کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہو گیا
کسی نوجواں کی جُدائی میں قد　　جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا
جدائی میں نالاں ہو بُلبل نہ کیوں　　وہ گُل زیبِ باغِ جناں ہو گیا
وہ سرخی ہے اشکِ شفق رنگ میں　　حریفِ مئے ارغواں ہو گیا
بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں　　وہی نذرِ برقِ تپاں ہو گیا
کروں ضبط اے ہم نشیں کس طرح　　کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہو گیا
غضب ہے غلامِ حسن کا فراق　　کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہو گیا

دیا چُن کے وہ غم فلک نے اُسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہو گیا

سحرِ حلال

از ترجمانِ حقیقت اقبال

(منقول از مخزن فروری ۱۹۱۷ء)

کوئی خوش اعتقادی پر محمول کرے یا واقعیت پر لیکن ہم بلا خوفِ لومۃ لائم کہتے ہیں اور ہزاروں میں کہنے کے لئے تیار ہیں کہ ایشیائی شاعری جس وسیع شخصیت اور جن دلگداز جذبات پر ہمیشہ فخر کریگی، وہ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت اور ان کے جذبات ہیں۔ زمانہ ہزار دل گردشیں کرے گا لیکن صدیوں میں ایسے دل و دماغ کا انسان ایسے شاندار جذبات کا مخترع، ایسا پیکرِ کمال اہلِ دنیا پر پیش کر سکے گا۔ ذیل میں آپ کی ایک غزل جو اب تک منصۂ صحافت پر جلوہ گر نہیں ہوئی اور ہمیں ایک محترم کے ذریعہ سے وصول ہوئی ہے درج کی جاتی ہے :-

پردہ چہرے سے اُٹھا انجمن آرائی کر　　چشمِ مہر و مہ انجم کو تماشائی کر
ہو تری خاک کے ہر ذرہ میں تعمیرِ حرم　　دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر
نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات　　تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمکِ پنہاں کیسی　　بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
تا کجا طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم　　اپنی مٹی سے عیاں شعلۂ سینائی کر
اِس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا　　ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر
پہلے خود دار تو مانندِ سکندر ہو لے　　پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر

مل ہی جائیگی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

ایڈیٹر کے نام

جناب جگن ناتھ صاحب آزاد نائب مدیر "آجکل"

"مخزن" نہایت باقاعدگی سے موصول ہو رہا ہے۔ آپ نے اِس پرچے کو دوبارہ جاری کر کے ایک بہت بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ "مخزن" اپنے پہلے دَور میں ایک ایسا چراغ تھا جو بجھ جانے کے بعد بھی ہندوستان میں اپنی ضیا پھیلاتا رہا۔ جن لوگوں نے "مخزن" کی پرانی فائلوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ "مخزن" نے اپنے وقت میں صحت مند ادب پیدا کر کے ملک میں کتنی بڑی کمی کو پورا کیا تھا۔ اِس پرچے کا بند ہو جانا ایک بہت بڑا ادبی حادثہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی کوششوں کی بدولت اُردو کا یہ معیاری جریدہ پھر منظرِ عام پر آیا ہے۔ میری دعا ہے کہ "مخزن" حسبِ دستورِ سابق سیاست کی گرد سے اپنا دامن بچاتے ہوئے خدمتِ ادب کی شاہراہ پر گامزن رہے۔ اور ہندو اور مسلمان دونوں اسے اس طرح پیار کریں جس طرح پہلے دَور کے "مخزن" سے کرتے تھے۔ آمین!

دہلی۔ ۷ مارچ ۱۹۴۹ء

جناب مختار الدین صاحب آرزو ایڈیٹر علی گڑھ میگزین

"مخزن" کا دوسرا نمبر ملا۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ نے مخزن کے تنِ بے جان میں رُوحِ زندگی دوڑا دی۔ مضامین بہت اچھے ہیں، آپ کا مضمون 'احیائے اسلام میں حالی کا حصہ' اور 'آرٹ میں تاثریت کی تحریک' خاص طور پر پسند آئے۔ آپ نے یہ خوب کیا کہ بودیلیئر پر حسن عسکری صاحب سے مضمون لکھوایا، بہت دنوں سے اُن کا کوئی مضمون پڑھنے کو جی چاہ رہا تھا اور بودیلیئر تو اُن کا محبوب مصنف ہے لیکن یہ مضمون ذرا اَور پھیلا کر لکھا جاتا تو اچھا ہوتا، اُردو داں طبقہ تو اس مصنف کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ یہ "مخزن المخازن" کا سلسلہ بے حد مفید ہے۔ ہو سکے تو اس میں کچھ اَور صفحات کا اضافہ فرما دیجئے۔ تبرکات کا سلسلہ بھی مجھے بے حد پسند آیا۔ انشاء اللہ میں بھی کچھ چیزیں اس سلسلہ کی بھیجوں گا۔

علی گڑھ۔ ۱۵ فروری ۱۹۴۹ء

انوار الدین صاحب سدید

مخزن کا پہلا پرچہ نظر نواز ہوا۔ اس کی نمایاں کامیابی پر رسماً نہیں قلباً مبارکباد عرض ہے۔ جس گرمجوشی اور محبت سے اُردو زبان کے اِس تاریخی پرچے کے دَورِ جدید کا استقبال کیا گیا ہے وہ اِس امر کا شاہد ہے کہ اچھے، صالح اور صحت مند ادب کے پرچے اِس دَور میں بھی جبکہ کفر و الحاد کی حد ہو چکی ہے خوب خوب پنپ سکتے ہیں۔

مستقل عنوانات میں سے "تبرکاتِ مخزن" مجھے سب سے اچھا معلوم ہوا ہے۔ اس سے نئے اور پرانے ادب کا جہاں موازنہ ہوتا رہے گا وہاں پرانی تحریریں پڑھنے کا بھی موقع ملتا رہے گا۔ میرے خیال میں نئی کتابوں پر تبصرہ کرنا بھی اگر آپ شروع کر دیں تو قارئین کو اپنے انتخاب میں کافی مدد ملتی رہے گی۔

رسول۔ ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء

"مخزن" معاصرین کی نظر میں

"قومی زبان" کراچی
(انجمن ترقی اُردو پاکستان)

مخزن ۱۱ فروری (۲) مارچ

فروری کی اشاعت میں پہلا مضمون رسالے کے مدیر شہیر حامد علی خاں صاحب نے "احیائے اسلام میں حالی کے حصہ" پر لکھا ہے۔ یہ بہت مختصر اور زیادہ تر مسدس حالی سے بحث کرتا ہے۔ لیکن فی الواقع یہی وہ پہلی اور عجیب نظم تھی، جس نے ہندی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا نقش اتنا گہرا دلوں میں اُتار دیا کہ پھر مغربی تعلیم و وطنیت کے خطرناک تیزاب تک اسے نہ مٹا سکے۔ یہی تصور چند سال بعد زیادہ شدت اور یقین کے ساتھ "شکوۂ ہند" کی جذبہ انگیز نظم کی تہ زمین بنا، اور مسلمان شاعر کی ہندوستان سے دل دوز الوداع نے ہی گویا ملتِ اسلامی کو جداگانہ وطن تلاش کرنے پر آمادہ کیا جس نے بالآخر پاکستان کی شکل اختیار کر لی۔

امین الرحمٰن صاحب نے فنِ تصویر کشی کی جدید تحریک "تاثریت" کی کیفیت (دو قسطوں میں) تحریر کی ہے۔ ممکن ہے بعض اصطلاحات میں کلام کیا جا سکے لیکن اُردو میں اِس موضوع پر لکھنا دشواری سے خالی نہ تھا۔ لائق مضمون نگار نے بہت خوبی سے مطالب کو ادا کر دیا ہے۔ واضح رہے ہر نقاش کی پسند اور مذاقِ طبعی کا تصویر کشی میں دخل ہوتا ہے اور اسی کو تاثر سے منسوب کر سکتے ہیں لیکن اِس حقیقت کو تفصیل سے سمجھنا سمجھانا اور مجتہدانہ طور پر کام میں لانا عہدِ جدید کا کارنامہ ہے۔ اِسی قسم کے یورپی مذاق کا مضمون حسن عسکری صاحب نے عہدِ جدید کے فرانسیسی شاعر بودلیئر پر سپردِ قلم کیا، اور اُس کی شاعری کو اخلاقیات کی طرف بازگشت، اور ضرورتِ مذہب کی شہادت، قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر عاشق حسین صاحب کی تمثیل "بیمہ ایجنٹ" نہایت پُرلطف ہے، حضرت کیفی، اثر صہبائی اور دوسرے مشاق شعرا کے کلام سے رسالہ کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔ مارچ کی اشاعت میں اثر صاحب کی ایک اُردو غزل "سرودِ نو" کے عنوان سے چھپی اور غالب کی

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

کی نوائے بازگشت کا مزہ رکھتی ہے۔ اِسی رسالے میں تاثریت کے دو نمونے شامل کر دیئے ہیں۔ اگرچہ یہ عکسی تصویریں جیسی چاہیئے صاف اور کئی رنگوں میں نہیں چھپ سکیں۔

رسالے کے آخر میں منتخب مضامین کے اقتباسات بھی چھاپے جاتے ہیں۔ مارچ کے پرچے میں "ماہِ نو" سے مسعود حسن صاحب رضوی کی تحقیقات نقل کی گئی ہے کہ مرزا حاتم علی مہر کی محبوبہ چُنّا جان (جس کا غالب کے خطوں میں ذکر آیا ہے) غالباً کوئی بازاری عورت نہ تھی۔ بلکہ بڑی دیندار، عبادت گزار، مومنہ، والا نژاد تو پاک بھی۔ چنانچہ غزل ؎

"درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے"

کی نسبت لکھتے ہیں کہ وہ کسی واقعی معشوق کا مرثیہ ہے جس نے غالب کی جوانی میں وفات پائی۔ مگر خود طرزِ کلام سے اندازہ

ہوتا ہے کہ یہ غالب کے ابتدائی اور مشکل پسندی کے زمانے کی نہیں ہو سکتی۔ فاضل مضمون نگار نے مرزا عبدالقادر بیدل کا ایک مطلع بھی نقل کیا ہے (صفحہ ۵) شاعر کا نام تو شاید عمداً نہ لکھا ہو مگر شعر غالباً سہواً غلط ہو گیا۔ ہمیں اِس طرح یاد ہے ؎

بر زیرِ زمیں تا چہ خوں خوردہ باشم
کہ بر عالم آئی و من مُردہ باشم

معنوی اعتبار سے رسالہ کی ترقی لائقِ رشک نظر آتی ہے۔ اللّٰھم زِد فَزِد۔

۱۵ر مارچ ۱۹۴۹ء

"صِدق"، لکھنؤ

(زیرِ ادارت مولانا عبدالماجد دریابادی)

"مخزن" لاہور۔ مدیر حامد علی خاں صاحب، مدیر اعزازی سر شیخ عبدالقادر، قیمت سالانہ سات روپے، فی پرچہ ۱۰/، دفتر رسالہ "مخزن" دی مال۔ لاہور۔

"مخزن" کا نام آتے ہی ذہن کے سامنے تصویر آج سے ۴۰، ۵۰ سال قبل کی اُردو دنیا کی آجاتی ہے۔ آج کے متعدد ادیب اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، اور جو تھے بھی، اُن میں سے اکثر اُس وقت اُردو لکھنا سیکھ رہے تھے۔ مخزن بہتوں کے لئے اُس وقت ایک خاموش اُستاد کا کام دیتا تھا، کیسے خیال ہو سکتا تھا کہ بے نشان و گمان آج پھر اُس کا جلوہ نظر افروز ہو جائے گا ــــ "بے نشان و گمان" اس لئے کہ اندیشہ یقین کے کم از کم علاقۂ اودھ میں تو پاکستان کے کسی اُردو اخبار کی رسائی نہیں، اس لئے اس کا اشتہار وغیرہ کچھ بھی نظر سے نہیں گزر سکا تھا۔

لیکن یخرج الحیّ من المیّت کے کرشمہ سازی کے لئے کسی قالبِ بے جان میں از سرِ نو رُوح پھونک دینا کیا دشوار تھا۔ مخزن نکلا، اور نکلا ہی نہیں، بلکہ شائستگی، تہذیب و متانت کی اُسی شان اور شگفتگی و ادبیت کی اُسی آن و بان کے ساتھ نکلا، جو دورِ اوّل میں اُس کی خصوصیات رہ چکی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

"مے کشوں کے سر پہ یارب پیرِ میخانہ رہے"

کی دُعا کا عملی ظہور، شیخ عبدالقادر سلمہ اللہ و مدظلہ پھر بدستور سرپرست یا مدیرِ اعلیٰ!ــــ پرچہ بظاہر صرف علمی و ادبی ہے۔ لیکن اس کا اخلاقی، اصلاحی، رُوحانی بین السطور ہر صاحبِ فہم و ادراک کے لئے غیر مخفی ہے۔ ابھی ایک ہی نمبر نکلا ہے۔ لیکن توقع ہے کہ مابعد کا ہر نقش نقشِ اوّل سے بڑھ چڑھ ہی کر نکلے گا۔

۲۸ر جنوری ۱۹۴۹ء

"آجکل" دہلی

"مخزن" لاہور جلد اوّل کا دوسرا شمارہ ہماری نظر کے سامنے ہے سُنتے ہیں کہ اِس جریدے کا یہ تیسرا دور ہے۔ آج سے نصف صدی قبل اسکے مقاصد خواہ کچھ بھی رہے ہوں لیکن ہمیں پوری پوری اُمید ہے کہ زندگی کے نئے تقاضوں اور مسائل سے چشم پوشی نہیں کی جائے گی۔ زیرِ نظر شمارہ ظاہری اور معنوی اعتبار سے بہت اچھا ہے۔ بالخصوص جناب امین الرحمٰن (آرٹ میں تاثریت کی تحریک) جناب بشیر محمد (دیوالا کا نفسیاتی پس منظر) اور جناب محمد حسن عسکری (یہ ولیئر) کے مضامین خوب ہیں حلقۂ ادارت میں شیخ عبدالقادر صاحب اور جناب حامد علی خاں کے اسمائے گرامی کو دیکھتے ہوئے بلا خوفِ ابطال پیشگوئی کر سکتے ہیں کہ یہ جریدہ دو ہمسایہ ممالک کی قابلِ قدر ادبی خدمات انجام دے سکے گا۔ مارچ ۱۹۴۹ء

(عبدالحمید نظامی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے امرت الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مخزن" مال روڈ لاہور سے شائع کیا)

جلد — نمبر

مخزن

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور — مئی ۱۹۴۹ء

سلسلۂ مطبوعاتِ نوائے وقت

سالانہ:- سات روپے

ششماہی:- چار روپے

ایک پرچہ:- دس آنے

The Makhzan, Lahore

مدیر،	صفحۂ اوّل،
سید عابد علی،	حروفِ تہجی کی غنائی اہمیت، ۳
یوسف ظفر، اثر صہبائی، عبدالمجید بھٹی،	نظم، غزل اور گیت، ۱۲
امین الرحمٰن	تاثریت کا جمالیاتی پہلو، ۱۷
نارش رضوی،	غزل، ۲۵
عسکری،	احمد علی کا ایک ناول، ۲۶
قیوم نظر،	رات بھر، ۳۵
ابنِ حسن زیدی،	مقتول شکاری، ۳۷
عبدالمجید حیرت، سہام،	دو غزلیں، ۴۶
انور جلال،	یوں بھی ہوتا ہے، ۴۷
جیمنی سرشار،	گناہِ محبت، ۵۲
مدیر،	مخزن المخازن، ۵۳
قارئین،	ایڈیٹر کے نام، ۶۹
معاصرین،	مخزن معاصرین کی نظر میں، ۷۱
" "	مطبوعات، ۷۲

صفحۂ اوّل

سید عابد علی صاحب نے اِس دفعہ بہت اچھوتے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ حروفِ تہجّی کی ترتیب اور اُن کی غنائی اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اُنھوں نے اساتذہ کی غزلوں کے اشعار اور اُن کے دواوین کی ترتیب کو بھی اُصولِ موسیقی کا پابند بتایا ہے۔ یہ بہت وسیع، دلچسپ اور سیر حاصل موضوع معلوم ہوتا ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ سید صاحب کی خواہش کے مطابق اسکے متعلق دوسرے اہل الرائے حضرات بھی قارئینِ مخزن کو اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں گے۔

مصوّری میں تأثریت کی تحریک کے سلسلے کا تیسرا مضمون اِس پرچے میں شائع ہو رہا ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہمارا یہ سلسلۂ مضامین بہ نگاہِ قدر دیکھا گیا ہے۔ ”مابعدِ تأثریت“ کے عنوان سے اِس سلسلے کا ایک اور مضمون کسی آیندہ اشاعت میں شریک ہوگا۔

اپریل کے پرچے میں ”طالوت“ نے فضل الٰہی صاحب عارفؔ کی کتاب ”زبان دانی“ پر مفصل تبصرہ کیا تھا اور ”طالوت“ کی خواہش کے مطابق ہم نے اہلِ نظر حضرات کو اِس تبصرہ پر اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ دعوت رائگاں نہ جائے گی۔

مشہور کتابوں پر مفصل تبصرے لکھنے کا خیال بہت اچھا ہے۔ جو لوگ اِن کتابوں کو پڑھ چکے ہوں وہ اِن تبصروں سے موضوعِ کتاب کے متعلق بہتر رائے قائم کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں اور جن لوگوں کی نظر سے کوئی خاص کتاب نہ گزری ہو اُن کے دل میں اُس کتاب کے پڑھنے کا شوق پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بعض قارئین نے ہم سے ”زبان دانی“ کے متعلق استفسارات بھی کیے ہیں۔ یہ کتاب اُردو اکیڈیمی پنجاب (لوہاری دروازہ لاہور) نے ۱۹۴۲ء میں شائع کی تھی اور اُن دنوں اس کی قیمت ڈیڑھ رُپے کے قریب تھی۔ ”لکھنے والوں“ کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے۔ یہ اُن کے لیئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ بہتر ہو کہ عارف صاحب نظرِ ثانی کے بعد اس کا ایک نیا ایڈیشن بھی شائع فرما دیں۔

ہمیں مسرت ہے کہ ”زبان دانی“ پر ”طالوت“ کے تبصرے کے بعد اِس دفعہ پھر ایک اور کتاب پر ایک ایسا ہی مفصل تبصرہ شائع ہو رہا ہے۔ اُمید ہے کہ احمد علی کے ناول پر عسکری کی تقریظ یا ستائش آمیز تبصرہ بہت سے دلوں میں اِس ناول کو پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ پڑھنے کا شوق پیدا کر دے گا۔

جو اصحاب ”مخزن“ کے لیئے افسانے بھیج رہے ہیں ہم اُن کے ممنون ہیں۔ ہم ”مخزن“ میں افسانوں کی تعداد بڑھانا ضرور چاہتے ہیں۔ لیکن اپنے معاونین پر یہ امر بہ ادب ظاہر کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ بد مذاقی کی حد تک پہنچی ہوئی عریانی یعنی ”عریانی برائے عریانی“ کی اشاعت سے ”مخزن“ معذور ہے۔ ”مخزن“ نہ ”زاہدِ خشک“ ہے نہ غیر ترقی پسند، لیکن ترقی اور ”تنزّل“ میں یہ کوئی حدِ فاصل ضرور قائم رکھنا چاہتا ہے۔

ہم نے قارئین کی خواہش اور متعدد اہل الرائے اصحاب کی تحسین سے متأثر ہو کر ”مخزن المخازن“ کے صفحات میں اضافہ کر دیا ہے۔ اور مشاہیر کی نظم و نثر کے اقتباسات اور خلاصوں کی ایک باقاعدہ ترتیب سے اسے مزید دلچسپ اور جامع معلومات بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہند و پاکستان کے جن معاصرین نے ”مخزن“ کی خدمات کو سراہا ہے اور اُسکے نئے پرچوں کی قدر افزائی کی ہے ”مخزن“ اُن کا شکر گزار ہے۔ ہم خوش ہیں کہ پاکستان کے علاوہ ہندوستان کے لوگ بھی ”مخزن“ سے غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں، اور اُن میں مسلمان اور ہندو ہی شریک نہیں، پڑھے لکھے اور خوش ذوق سکھ حضرات بھی شامل ہیں۔ یہ قدر افزائی اُردو کی ہمہ گیر مقبولیت کی دلیل ہے۔ ”ح“

مخزن

حروفِ تہجی کی غنائی اہمیت

(پرنسپل عابد علی)

اُردو میں حروفِ تہجی کی ترتیب پر غور کرنے سے ظاہر ہوگا کہ اُن کی سلسلہ بندی یا گروہوں کی تعیین بیشتر مخارجِ صوتی کے اعتبار سے ہے لیکن یہ سوال فوراً پیدا ہوتا ہے کہ کسی ایک گروہ یا سلسلے میں حروف کی جو ترتیب معیّن کی گئی ہے، اِس کی بنیاد بھی مخارجِ صوت پر ہے یا نہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف ہر سلسلے اور گروہ کی اندرونی ترتیب غنائی ہے۔ بالفاظِ دیگر یُوں کہہ لیجئے کہ ہر سلسلہ یا گروہ مخارجِ صوت کے ایک خاص دائرے سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اس گروہ کے حروف کی اندرونی ترتیب اِس طرح کی گئی ہے کہ ہر حرف کو ایک سُرتی مان لیا گیا ہے۔

ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی سات بنیادی سُر تیوں کو پہچانتی ہے، جسے اصطلاح میں سرگم کہتے ہیں۔ یعنی کھرج، رکھب، گندھار، مدھم، پنچم، دھیوت اور نکھاد۔ انہیں سُرتیوں کو سا رے گا ما پا دھا نی کہا جاتا ہے۔ یہ سات سُر پنڈتوں نے شُدھ سُر تسلیم کئے ہیں کہ سنسکرت میں شُدھ یا شُدھ کے معنی پاک اور خالص کے ہیں۔ اِن سات شُدھ سُروں کے علاوہ پانچ سُر بِستک ہیں اور بھی پہچانے جاتے ہیں جن کو اصطلاح میں وکرت یا اپنی جگہ سے ہٹا ہُوا کہتے ہیں۔ اِن پانچ میں سے چار سُر اپنے مقامِ صوت سے گرتے ہیں اور ایک سُر بجائے گرنے کے کچھ سُرتیاں چڑھ گیا ہے۔ مقامِ صوت سے گرے ہوئے چار سُر کومل کہلاتے ہیں جس کے معنی نرم

اور تار جگ ہیں۔ چڑھا ہوا سُر تیور کہلاتا ہے۔ جس کے معنی تیز کے ہیں۔ اُترے ہوئے چار سُروں کے نام یہ ہیں۔ کومل رکھب، کومل گندھار، کومل دھیوت اور کومل نکھاد۔ چڑھا ہوا سُر تیور مدھم کہلاتا ہے۔ پنڈتوں نے شدھ سُروں کو اِس اعتبار سے کہ کومل سُروں کے مقابلے میں چڑھے ہوئے ہیں تیور کہہ کر بھی پکارا ہے۔ یہ پانچ سُروں کی داستان ہوئی۔ باقی جو دو سُر رہ گئے ہیں یعنی کھرج اور پنچم۔ یہ سنگیت میں نہ اُترتے ہیں نہ چڑھتے ہیں۔ اِس لئے اِن کو اچل کہتے ہیں یعنی جو اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

سُرتیوں کی اِس تقسیم پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سنگیت یا موسیقی درحقیقت فقط ایک تیور سُر کو پہچانتی ہے۔ یعنی تیور مدھم یا کڑی مدھم۔ باقی تمام سُر شدھ ہیں یا کومل ہیں۔ اور اگر مدھم کے علاوہ کسی کو تیور کہا جاتا ہے، تو وہ نسبتاً کہا جاتا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ حروفِ تہجی کے گروہوں کی اندرونی ترتیب غنائی ہے یعنی مان لیا گیا ہے کہ ہر گروہ کا ہر حرف ایک سُرتی ہے۔ اب اِن گروہوں کی سُرتیوں کی ترتیب دیکھئے۔ ا کو چھوڑ دیجئے کہ حرفِ علت ہے اور حروفِ علت سے جُدا گانہ بحث ہوگی۔ پہلا گروہ دیکھئے۔ ب پ ت ٹ ث۔ مان لیجئے کہ یہ سُرتیاں ہیں۔ تو فوراً واضح ہوگا کہ ب شدھ ہے۔ پ تیور یا چڑھا ہوا سُر ہے۔ ت کومل یا اُترا ہوا سُر ہے۔ ٹ بہت چڑھا ہوا یا ات تیور سُر ہے۔ ث بہت اُترا ہوا یا ات کومل سُر ہے۔ ج چ ح خ۔ ج شدھ ہے۔ چ تیور ہے۔ ح کومل ہے۔ خ ات تیور ہے۔ د ڈ ذ۔ د شدھ ہے اور ڈ تیور ہے۔ اور ذ کومل ہے۔ ر ڑ ز ژ۔ ر شدھ ہے۔ ڑ تیور ہے۔ ز ژ کومل ہیں۔ س ش شدھ اور تیور ہیں۔ صرف انہیں مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ اب معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہر گروہ میں غنائی ترتیب یہ ہے۔ شدھ تیور یا شدھ تیور کومل۔ ات تیور یا ات کومل۔ بہر حال آپ دیکھیں گے کہ یہ ترتیب ہر جگہ ملحوظ ہے! سنگیت کی سُرتیوں اور حروفِ تہجی کی سُرتیوں میں ایک نمایاں فرق بھی ظاہر ہوا اور یہ کہ جہاں سنگیت فقط شدھ اور کومل تیور کو پہچانتی ہے۔ اور فقط ایک سُر کو یعنی مدھم کو تیور مانتی ہے، وہاں اُردو ہر گروہ میں علیحدہ علیحدہ شدھ اور تیور رکھتی ہے۔ اور بعض گروہوں میں کومل اور ات کومل اور ات تیور سُرتیوں کو بھی پہچانتی ہے۔ اور شاید اِس اعتبار سے اُردو کے حروفِ تہجی تمام مشرقی زبانوں سے زیادہ ارتقا یافتہ ہیں، کہ ات تیور کی شکلیں اِس میں سب سے زیادہ ہیں۔ مثلاً ٹ ڈ ڑ۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ بعض گروہ ایسے ہیں جن میں فقط شدھ اور تیور سُر ہیں۔ مثلاً س ش، ص ض، ع غ، یہ سلسلے کومل سُرتیوں سے نا آشنا ہیں۔ یہ حروف جن قوموں سے ہمارے ہاں آئے ہیں۔ غالباً اُن کی زبانوں میں ات تیور سُروں سے بھی نا آشنائی مسلّمہ ہے۔

یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ سنگیت میں دو سُر یعنی کھرج اور پنچم اچل ہیں۔ اُردو کے حروفِ تہجی میں بھی دو سُر اچل ہیں۔ ایک ل اور دوسرا م ن۔ م ن کو میں نے ایک سُر اس لئے مانا ہے کہ تبادلۂ حروف کے قانون کے مطابق یہ ہمیشہ ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے آئے ہیں۔ انبہ اور آم۔ انبالہ۔ امبالہ۔ یہ سب م ن ہی کے کرتب ہیں۔ لیکن اگر آپ کو یہ توجیہ پسند نہ آئے، تو آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ سنگیت کے دو اچل سُروں کے مقابلے میں حروفِ تہجی میں تین سُر اچل ہیں۔

آپ آگاہ ہونگے کہ صدا یا آواز کی دو بنیادی قسمیں ہیں! ایک

صدائے مطلق یا آوازِ صرف یا آوازِ محض۔ یہ وہ آواز ہے جس کا تناسب معین نہیں۔ اور جس کے تموجات کی گنتی نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً گولہ پھٹنے کی آواز، بجلی کی کڑک، بادل کی گرج، یہ تمام آوازِ صرف یا آوازِ محض کی مثالیں ہیں۔ اسکے مقابلے میں صدائے موسیقی ہے جو ہمیشہ متناسب اور متواتر اثر پیدا کرتی ہے۔ متناسب کے معنی یہ ہیں کہ صدا کے پیدا ہونے سے جو صوتی لہریں یا تموجات پیدا ہوں، اُن کا درمیانی فصل ہمیشہ ایک نسبت پر قائم رہے۔ تمام سُرتیاں موسیقی کی صدائیں ہیں۔ اِس اعتبار سے حروفِ تہجی کو سُرتیاں تسلیم کرلیں تو ماننا پڑیگا کہ اُن کی ایک تکرارِ خاص سے نغمہ پیدا ہوگا۔ سُرتیوں کی کس قسم کی تکرار اور ترتیب سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ سوال میرے موضوعِ بحث سے خارج ہے، لیکن یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری میں غنائی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے نغمہ کا رنگ پھیکا، مدھم یا نازک ہوسکتا ہے یا شوخ، تیکھا، تیز اور روشن۔ اب شاید یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ کومل سُروں کے بیشتر استعمال سے لطیف، نازک اور نفیس دھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور تیورا ورات تیور سُروں کے استعمال سے شوخ، شدید اور پُر جوش نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ اُردو میں حروفِ تہجی کو سُرتیاں مان لینے کے بعد ہم اصولاً فقط اِس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کومل حروف سے نغمے اور ترنم کا لطیف پہلو جھلکے گا، اور تیور حروف نغمے کے شوخ اور روشن پہلوؤں کی راہنمائی کریں گے۔ لیکن یہ بات کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ شاید لطیف ترین جذبات اپنے اظہار کے لئے کومل سُرتیوں کا تقاضا کرتے ہیں، اور شدید اور تیکھے جذبات طبعاً تیورا ورات تیور سُروں کا قالب ڈھونڈتے ہیں۔ اب میں اُردو شاعری میں کومل، تیورا ورات تیورا اور شُدھ سُرتیوں کی تکرار سے جو شکل پیدا ہوتی ہے، اسکی کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں۔ آپ اِس پر بھی غور کرتے جائیے کہ کومل سُرتیوں کے ذریعے سے کس قسم کے جذبات اور تیور سُرتیوں کے ذریعے سے کس قسم کی واردات کا اظہار کیا گیا ہے:

شُدھ سُر

بچا گر ناز سے تو اس کو پھر انداز سے مارا

شُدھ اور کومل

کوئی انداز سے مارا تو کوئی ناز سے مارا

غزل سُنتے ہی میرے مُغنّی کی ہوئی حالت
کہ اُس نے ساز مارا سر اور سر ساز سے مارا

جہاں تک سازداری تھی لکھی دشمن کے طالع میں
ہمیں بدنام کرکے طالعِ ناساز سے مارا

شُدھ اور تیور سُر

شب وہ اِن آنکھوں کو شغلِ اشکباری دے گئے
لے گئے خواب اِن کا اور اختر شماری دے گئے

خواب و خور صبر و سکون یکبار سب جاتا رہا
بیقرار اپنے کو کیسی بے قراری دے گئے

گو ہوا عزمِ سفر اُن کا سحر پر مصحفیؔ
وقتِ شام آکر مجھے اپنی کٹاری دے گئے

ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا
مجھ پر تو اِک قیامت عہدِ شباب لایا

بزمِ نظارہ ہے پھر آج سراپا گستاخ
جلوہ بے باک نگہِ شوخ تماشا گستاخ

نازِ بے جا سے بڑھی جاتی ہے شانِ ابرام

لہو ہُوا جاتا ہے عنوانِ تقاضا گُستاخ

تیور

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے
تیغ تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی جو تھی پیئے ہوئے وہ گھاٹ گھاٹ کے
دم اَور بڑھ گیا تھا لہُو چاٹ چاٹ کے

بہار آئی اِک دھوم سی مچ گئی   عرُوسِ چمن رنگ میں رچ گئی
شگوفے لگے شاخ پر پھُوٹنے   عنادل کے چھکّے لگے چھُوٹنے
یہ عالم جو دیکھا تو فصلِ گُلاں   ہُوا پارہ پارہ دلِ عاشقاں

اِن اشعار میں اچل سُروں کی بہار بھی دیکھیئے۔

دل کو تری دُزدیدہ نظر لے کے گئی ہے
اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے
اُس بزم سے آزُردہ نہ آئے گی تمنّا
آئینِ وفا مدِّنظر لے کے گئی ہے
بےعیب لے کے گئی ہے مجھے تا کوُئے ملامت
مجبوُریٔ دل خاک بسر لے کے گئی ہے

زیادہ مثالوں سے اجتناب کرتا ہوں۔ آپ خود اب اُردو کے اشعار سامنے رکھ کر حروفِ تہجی کی اِس اہمیت پر غور فرمائیں گے، تو زیادہ مناسب ہوگا۔ البتہ ایک اشتباہ اِس مرحلے ہی پر رفع ہو جائے تو بہتر ہے۔ شُدھ، تیور، کومل کی ترتیب سے ممکن ہے یہ شبہ پیدا ہو کہ اُردو کے حرُوفِ تہجی میں تیور، شُدھ سے جتنا چڑھا ہُوا ہے کومل اُس سے دُگنا اُترا ہُوا ہے یا بالفاظِ دیگر یہ خیال پیدا ہو کہ سُرتیاں قائم کرتے وقت تیور کو شُدھ اَور کومل کے درمیان رکھا جاتے گا، یہ مغالطہ ہے۔ دراصل تیور شُدھ سے جتنا چڑھا ہُوا ہے کومل اُتنا ہی اُترا ہُوا ہے۔ یعنی شُدھ سُرتی، کومل اَور تیور سُرتیوں کے درمیان واقع ہے۔ اصطلاح میں اس کا فعل اَور اس کی نسبت کومل اَور تیور سے یکساں ہے یہی وجہ ہے کہ جن اشعار میں تیور سُرتیوں کی کثرت ہوتی ہے، وہاں شُدھ بھی تیور کا رُوپ دھار لیتی ہے۔ اَور جن اشعار میں کومل سُرتیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہاں شُدھ سُرتیاں بھی کومل کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ البتہ کومل اَور تیور کبھی میل نہیں کھاتے۔ اَور اُن کا فعل ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ جو اشعار اُوپر لکھے گئے ہیں۔ اُن پر اِسی اعتبار سے غور فرمائیے گا۔

اب جو ہم اِس مرحلے پر آ پہنچے ہیں تو یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اُردو میں دواوین کی ترتیب جو حرفِ آخر کے اعتبار سے کی گئی ہے، وہ کسی مخصوص غنائی پہلو کی طرف اشارہ تو نہیں کرتی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دواوین کی یہ ترتیب کسی اُصول پر قائم ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ وہ اُصول غنائی ہو کہ حرُوفِ تہجی کی ترتیب کے اُصول سے ہم آہنگ ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ جس طرح اُردو کے بیشتر شاعر حروفِ تہجی کی غنائی اہمیت سے بتدریج بےخبر ہوتے چلے گئے، اسی طرح دواوین کی ترتیب اپنے اُصول سے ہٹ کر رُوایت پر مبنی ہوتی چلی گئی۔ ورنہ اُصول ضرور یہی ہوگا کہ آخری حرف نہ صرف اِس بات کی طرف اشارہ کرے گا کہ کسی غزل کے بیشتر سُر شُدھ ہوں گے یا تیور یا کومل، بلکہ یہ بھی بتائے گا کہ کس خاص سُرتی کی تکرار زیادہ ہوگی۔ فارسی میں نظامی کا دیوانِ غزلیات اگر وہ بھول نہیں رہے، تو اِسی اُصول پر مبنی ہے! اَور امیر خسرو کے تمام دیوانوں میں یہی اُصول کارفرما ہے۔ اُردو شاعروں کے ہاں بھی یہ کھیل بڑی کاریگری سے کھیلا گیا ہے۔ مثال کے طور پر میں فقط غالب

کی بعض مشہور غزلوں کے مطلع لکھتا ہوں جن میں آخری حرف
غزل کا واو ی شُر ہے یعنی بہت جھلایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ بھی
ماہے کہ اکثریت کن سُریتوں کی ہے۔

ملاسے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

رہ زما ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پہ
مَیں ہُوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پہ

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سَر ہونے تک

مصحفی کی یہ غزلیں بھی ملاحظہ ہوں۔

یہ دلی کا نقشہ سنوارا زمیں پر
کہ لا عرش کو یاں اُتارا زمیں پہ

ہم نے لُٹا دیا ہے گھر بار تیری خاطر
بیٹھے ہیں ہم پہن کر زنار تیری خاطر

اب حروفِ علت کو لیجیئے۔ حروفِ علت یعنی ا، و، یٰ
درحقیقت اُردو شاعری میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو سنگیت
میں ٹھاٹھ۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے۔ پنڈتوں نے لکھا ہے
کہ سنگیت کے تین گرام ہیں، یعنی کھرج گرام، گندھار گرام
اور مدھم گرام، اور اِن گراموں میں ساتوں سُروں کے
سلسلہ وار آرام تار چڑھاؤ کو یعنی ارو ہی امرو ہی کو مورچھنا کہتے
ہیں۔ اور اسی سے تمام راگ پیدا ہوتے ہیں یعنی سا رے گا ما
پا، دھا نی۔ سا۔ اور سانی۔ دھا۔ پا ما گا رے۔ سا۔ اِسی چیز کو
آج کل ٹھاٹھ کہتے ہیں۔ جب کسی راگ یا راگنی کے سُر دریافت
کرنے مقصود ہوں تو پہلے اِس کا ٹھاٹھ دریافت کرتے ہیں۔ چونکہ
تمام راگ ٹھاٹھوں ہی سے استخراج کئے جاتے ہیں۔ اِس لئے اُنکا
جنک ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا لازم ہُوا کہ وہ سمپورن ہوں۔
یعنی اُن میں ساتوں سُر پائے جائیں۔ اب یہ امر ملحوظ رکھیئے کہ
اُصولاً اُردو شاعری میں حروفِ علت کو ٹھاٹھ کی شکل معین کرنے
کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ ردیف پر جو اِس قدر زور دیا جاتا
ہے تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ ردیف کے حروفِ علت ساری غزل
کا ٹھاٹھ بتاتے ہیں اور اِس بات کی طرف راہنمائی کرتے ہیں کہ
کونسا حرفِ علت زیادہ جھلایا جائے گا جس سے ٹھاٹھ کی شکل
پیدا ہوگی۔ اُردو کے اکثر شاعر اس نکتے سے آگاہ ہیں اور
ردیف کے حروفِ علت کے ذریعے ٹھاٹھ کی شکل دکھاتے ہیں
مثلاً ؎

بچا گر ناز سے تو اِس کو پھر انداز سے مارا

مصحفی کی اس غزل میں ردیف کا آخری حرف ا ہے۔ کہ
حرفِ علت ہے۔ اور ساری کی ساری غزل میں بار بار جھلایا
گیا ہے۔ اِس لئے یہ کہنا جائز ہے کہ یہ غزل ا ٹھاٹھ کی ہے۔
اِس کے سُر جیسا پہلی مثالوں میں آپ دیکھ چکے ہیں، شُدھ
ہیں۔ اِس لئے غنائی اصطلاح میں کہا جائے گا کہ یہ شُدھ
سُروں میں ا ٹھاٹھ کی غزل ہے۔

ساقی شراب لایا، مطرب رباب لایا
مجھ پر تو اِک قیامت عہدِ شباب لایا

دل درد و غم کی اُس کے آخر نہ تاب لایا
یہ ہر گھڑی کا رونا قہر اور عذاب لایا

مصحفی کی یہ غزل تیور سُروں میں ا ٹھاٹھ کی غزل ہے۔

یہ چاکِ گریباں تو داماں سے گزرا
مَیں شوریدہ ایسے گریباں سے گزرا

تیور سُروں میں و ٹھاٹھ کی غزل ہے۔

داغؔ کی غزل۔

نہیں معلوم اِک مُدّت سے قاصد حال کچھ واں کا
مزاج اچھا تو ہے یا دشمنِ بےخبر اس آفتِ جاں کا
ہوا ہے جب سے شہرہ اُس عدوئے دین و ایماں کا
خدا حافظ نہیں ہوتا کسی مردِ مسلماں کا

یتو رمذ دں میں ا کھا ڈھ کی غزل ہے۔

نہ نکلی نہ دل کی چور زُلفِ عنبریں نکلی
اِدھر لا ہاتھ مُٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

داغؔ کی یہ مشہور غزل 'ی' کھا ڈھ میں ہے۔

یہاں شاید یہ التباس پیدا ہو کہ ردیف کا کوئی حرفِ علّت کھا ڈھ پیدا کر دیتا ہے۔ اُصولاً ایسا ہونا چاہیئے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ایسا ہو۔ بعض اوقات ردیف کا حرفِ علّت اَور ہوتا ہے، اور کھا ڈھ کا حرفِ علّت اور۔ مثلاً غالبؔ کی اِس غزل میں۔

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

اِس کی ردیف 'ی' ہے لیکن درحقیقت یہ 'ا' کھا ڈھ کی غزل ہے۔ چنانچہ ساری غزل میں 'ا' کو نہایت نمایاں طور پر جھلایا گیا ہے۔ مثلاً

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

اِسی طرح غالبؔ کی اِس غزل میں۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

آخری حرفِ علّت 'ی' ہے لیکن دراصل یہ غزل 'ا' کھا ڈھ کی ہے۔ اب شاید یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا ہوگا کہ ہمارے تمام عروضیوں نے حرفِ علّت کے دبنے کو نہایت مکروہ عیوب میں کیوں شمار کیا۔ اِس کی وجہ ظاہر ہے۔ حرفِ علّت کھنچا ہوا ہو، تو صدائے موسیقی ہے کہ ایک اکائی کو دُونا کر دیا گیا ہے لیکن اگر دب جائے تو صدائے محض ہے۔ کیونکہ اِس صورت میں یہ قباحت لازم آئے گی کہ حرفِ علّت کے تموّجات کم و بیش ہوتے رہیں، اَور ایک ہی سُرتی کے تموّجات میں کمی بیشی ناممکن ہے۔

حرفِ علّت کی غایت کو سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھ لینا بھی چنداں مشکل نہ رہے گا کہ کثرتِ اضافات کے متعلق بیان اور معانی کے فاضلوں میں اختلاف کیوں ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اضافت کی کثرت مخلِ فصاحت ہوتی ہے۔ لیکن نقادِ فکرِ بلیغ میں اور شبلؔی نے اکثر اِس خیال کا اظہار کیا کہ بعض جگہ کثرتِ اضافات مخلِ فصاحت ہوتی ہے اور بعض جگہ نہیں، غنائی اعتبار سے دونوں دعوے غلط ہیں۔ اضافتوں کی کثرت بہ طورِ خود نہ مخلِ فصاحت ہے نہ مویدِ فصاحت۔

بات دراصل یہ ہے کہ اضافت کی اگر تکرار ہو، تو یا ساری اضافتیں کھنچی ہوئی ہونی چاہئیں، یا اُن کی تشکیل محض کسرہ کی ہونی چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تین اضافتوں میں سے دو اضافتیں بشکلِ یا ہیں، اور ایک اضافت محض کسرہ ہے یا اِس کے برعکس ہے۔ تو اضافت کی غنائی وحدت میں خلل پیدا ہوگا۔ شاعر مجاز ہے کہ ایک شعر میں اُسے کسرہ تصوّر کرے یا۔ یا۔ لیکن یہ جائز نہیں کہ اضافت کے ایک ہی سلسلے میں کہیں اضافت کسرہ ہو اور کہیں یا۔ اُصول اس کا یہی ہے کہ سُرتی کے تموّجاتِ صوتی ہمیشہ یکساں رہنے چاہئیں۔ اِس لئے یہ مصرع۔

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا

غنائی اعتبار سے ناقص ہے۔ کیونکہ پہلی دو اضافتیں بشکلِ یا ہیں اور تیسری کسرہ۔ غالب کے اِس مصرع کی شکل غنائی اعتبار سے درست ہے کیونکہ دونوں اضافتیں بشکلِ "یا" ہیں،

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا

یہ مصرع لیجئے ؎

تغافل سازِ گارِ دردِ اہلِ شوق کیا ہوگا

اِس میں پہلی اضافت بشکلِ یا ہے اور دوسری کسرہ کی شکل میں ہے۔ تیسری پھر بشکلِ یا ہے۔ اِس لئے غنائی اعتبار سے ناقص ہے۔ اب یہ اُلجھن رفع ہوگئی۔ کہ شاد اور شبلی نے یہ دعوے کیوں کیا تھا، کہ بعض جگہ اضافت کی کثرت مخلِ فصاحت ہوتی ہے اور بعض جگہ نہیں۔

یہ ہے لَے کا اجمالی بیان۔ اب لے کے بڑھنے اور گھٹنے میں حروف کا دخل دیکھئے۔ لَے حقیقت میں حرکت کے درجے اور اُس کے تناسب کی تعیین ہے۔ اِس کا کام یہ ہے۔ کہ جو آوازیں یکے بعد دیگرے ہمارے کان میں پڑتی ہیں۔ اُن کا زمانہ اور فصل ناپ کر رکھے۔ سب آگاہ ہیں کہ عروض میں حروف کی حرکت اور سکون کے ناپنے کے پیمانے کو بحر کہتے ہیں۔ یہی سنگیت کی لَے ہے۔ ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت لَے کی تین قسمیں پہچانتی ہے۔ یعنی دلمبت، مدھ اور دُرت۔ اگرچہ اِن تینوں قسموں میں صرف ایک دوسرے کی نسبت سے لَے کے نام بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تینوں قسمیں موجود ضرور ہیں۔ سنگیت کے لئے تال کے سولا ماترے کافی ہیں۔ اِس کے خلاف اُردو میں لَے فقط دلمبت اور دُرت آتی ہے۔ اِس کی وجہ بھی ظاہر ہے لَے کے اعتبار سے ہندوستانی سنگیت دُنیا کا سب سے ارتقا یافتہ غنائی نظام ہے۔ دلمبت لَے میں چکر نسبتہً دیر سے پُورا کیا جاتا ہے۔ اور دُرت لے میں چکر نہایت تیزی میں پُورا ہوتا ہے یعنی دلمبت کے معنی دھیمے اور دُرت کے معنی تیز کے ہیں۔

اگر آپ کسی بحر کے ارکان کے عام حروف کو ماترے تسلیم کریں، تو ہر رکن ماتروں کا ایک علٰحدہ سلسلہ قرار پائے گا۔ ہزج کی شکل یہ پیدا ہوگی۔ پہلے مفاعیلن چار بار اور پھر مفاعیلن چار بار۔ ہر رکن میں سات ماترے ہوں گے۔ یعنی مَ ایک۔ فا دو۔ عی دو۔ اور لُن دو۔ یہ ہر سات ماتروں کا ایک گروہ یا سلسلہ ایک علٰحدہ رکن ہے۔ بحرِ ہزج میں لَے کے دلمبت ہونے کی شکل یہ ہے کہ جب الفاظ کے حروف ماتروں میں اِس طرح تقسیم کئے جاتے ہیں کہ ایک ہی لفظ کے کچھ حروف سات ماتروں کے پہلے سلسلے میں آجاتے ہیں اور کچھ حروف دوسرے سات ماتروں کے سلسلے میں چلے جاتے ہیں۔ تو کم رفتاری اور دیر حرکتی کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی دلمبت لَے ہوتی ہے، یا بالفاظِ دیگر۔ اگر ارکان کے سلسلوں میں الفاظ اِس طرح بانٹے جائیں کہ ایک لفظ کے کچھ حروف پہلے رکن میں رہ جائیں اور کچھ دُوسرے رکن میں چلے جائیں اور یہ عمل اِسی طرح بیشتر تیسرے چوتھے پانچویں چھٹے رکن میں ہوتا رہے۔ تو لَے دلمبت ہوگی، اِس کے برخلاف اگر لفظوں کا ایک مکمل سلسلہ ماتروں کے ہر سلسلے سے ہم آہنگ ہوجائے اور کوئی لفظ تقسیم ہو کر نہ جائے تو دُرت لَے پیدا ہوگی یہاں میں عرض کر دُوں کہ اُردو شاعری میں لے کاری بہت کم ہے۔ اِس لئے صحیح دلمبت اور صحیح دُرت کی مثالیں نہایت نایاب ہیں۔ اُصولاً یہ ہونا چاہئے کہ کسی غزل یا نظم میں پہلے دلمبت کا رنگ دکھلایا

جائے۔ پھر ورت کی شکل قائم کی جائے۔ اور اس کے بعد پھر ولمبت لَے پر ختم کیا جائے۔ لَے کے اِسی اتار چڑھاؤ میں لَے کاری کے اسرار پوشیدہ ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف اُردو میں دیکھا جاتا ہے کہ شاعر ایک مصرع ولمبت میں کہتا ہے، تو ایک ورت میں کبھی شروع ہی ورت میں کر دیتا ہے۔ یعنی لَے کسی اصول پر قائم نہیں رہتی۔ اب میں مثال کے طور پر دو بحروں میں ولمبت اور درت کی مثالیں دکھاتا ہوں۔ باقی بحروں کو انھی پر قیاس کر لیجئے۔ ان میں سے ایک بحر ہزج ہے، جس میں عرب لوں نے اپنے سب سے دلفریب نغمے محفوظ کر دیئے ہیں۔ بحر ہزج ولمبت۔ مفاعیلن، مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔ آٹھ بار۔

نہ چھُو پیارے، مفاعیلن، کہ تیری زُل، مفاعیلن فِ کا ہرتا مفاعیلن، رنازک ہے مفاعیلن۔ تو کا فر بل مفاعیلن نہ دے اس کو مفاعیلن کہ یہ ترفا مفاعیلن، رنازک ہے مفاعیلن،

اِس میں آپ ملاحظہ فرمائیے کہ پہلے ماتروں کے دوسرے سلسلے کا ایک لفظ تیسرے میں اور تیسرے کا ایک لفظ چوتھے میں بٹ گیا ہے۔ لیکن پہلے اور دوسرے ماتروں کے سلسلے کے درمیان یہ عمل نہیں ہوا۔ دوسرے مصرع میں تقسیم فقط تیسرے اور چوتھے سلسلے کے درمیان ہوئی ہے یعنی ولمبت بھی ناقص ہے۔

گُل ونسری مفاعیلن، ل سنبل ہیں مفاعیلن، سبھی نازک مفاعیلن، تر نہ نازک مفاعیلن۔ نہ تنہا اس مفاعیلن، چمن کی نر مفاعیلن، گس بیما مفاعیلن، رنازک ہے مفاعیلن، یہ بھی ولمبت ہے لیکن ناقص۔ اس کے بعد تیسرے شعر کا پہلا مصرع خالص درت میں ہے اور دوسرا مصرع خالص ولمبت میں۔ یعنی

ترے چہرے کے ہنگام تماشا دل دھڑکتا ہے
نگاہیں سخت ہیں بیباک اور رخسار نازک ہے

ترے چہرے مفاعیلن، کے ہنگام مفاعیلن تماشا دل مفاعیلن دھڑکتا ہے مفاعیلن۔ نگاہیں سخ مفاعیلن، ت ہیں بیبا مفاعیلن ک اور رخسا مفاعیلن، رنازک ہے مفاعیلن،

دوسری بحر جسے میں نے مثالوں کے لئے انتخاب کیا ہے، بحر کامل سالم یعنی متفاعلن آٹھ بار۔ اِس میں ولمبت اور درت کا کھیل نہایت دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ طویل ہونے کی وجہ سے ولمبت کی سست رفتاری اور درت کی تیزی دونوں کو بوجہ احسن دکھا سکتی ہے۔ اِس لَے میں اقبال نے اپنی ایک نظم میں لَے کاری کا بڑا کمال دکھایا ہے۔ اگرچہ ایک آدھ جگہ درت ناقص ضرور ہوئی ہے۔ اور کہیں کہیں ولمبت میں بھی خلل پیدا ہوا ہے۔ لیکن لَے کاری کے اُصول سے سرمُو انحراف نہیں ہوا۔ کہ ولمبت سے شروع ہوا ہے۔ درت پر گیا ہے اور پھر ولمبت پر آیا ہے

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری
میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بُو
میں حکایتِ غمِ آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری

یہ ولمبت تھی۔ صرف ایک آدھ جگہ ناقص۔

اب ورت ملاحظہ ہو۔ وہ بھی صرف ایک آدھ جگہ ناقص۔

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم، گرو عجم، ترا دیں خریدۂ کافری۔
دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا، کہ یہی ہے شانِ قلندری

جس چیز کو ہمارے فاضل بزرگ ترصیع کہتے ہیں۔ وہ فی الحقیقت مدرت کی ایک نامکمل سی شکل پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ کیونکہ اس میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے۔ کہ اترے کا ہر سلسلہ یا ہر رکن الفاظ کے ایک سلسلے کو تقسیم کرنے کے بغیر محفوظ کرے بلکہ بعض اوقات الفاظ کو تقسیم سے بچانے کے لئے فصل دو رکنوں میں قائم کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ان شعروں میں ایک قسم کی ترصیع کے ذریعے لفظوں کا ایک مکمل سلسلہ دو دو رکنوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔

مرے دل کا اب تو یہ رنگ ہے نہ اُمنگ ہو نہ ترنگ ہے
نہ حریفِ نغمۂ چنگ ہے نہ حریفِ بادۂ و جام ہے
وہی میں ہوں پھر وہی سرخوشی وہی صبح و شام کی بے خودی
وہی جلوۂ لبِ بام ہے کہ حریفِ ماہِ تمام ہے

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختصر سا مقالہ حروفِ تہجی کی غنائی اہمیت کو معیّن کرنے کی ایک نامکمل سی کوشش ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں اس موضوع پر کام کرنے کا اہل ہوں لیکن اگر اس مقالے کے ذریعہ سے واقعی فاضل بزرگوں کی توجہ اس مسئلے کی طرف منعطف ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے ایک کام کیا ہے۔

حروفِ تہجی

(ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

حروفِ (تہجی) کے مجموعے کو "ابجد" کہتے ہیں۔

(ابجد کا حرف ابتدائی حروف ا ب ج د سے بنا ہے)

چونکہ اُردو زبان ہندی، فارسی اور عربی سے مل کر بنی ہے لہٰذا اس میں ان سب زبانوں کے حروف موجود ہیں۔

خاص عربی حروف یہ ہیں :۔

ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق۔

یہ حروف قدیم فارسی اور ہندی یا سنسکرت میں نہیں پائے جاتے لیکن ذ قدیم فارسی میں بھی پائی جاتی ہے اور اب بھی بعض فارسی الفاظ ذ سے لکھے جاتے ہیں۔

ٹ، ڈ، ڑ خالص ہندی ہیں، عربی فارسی میں نہیں آتے۔

ز، ف، خ، غ کی آوازیں ہندی میں نہیں۔ عربی فارسی دونوں میں ہیں۔

ژ خاص فارسی حرف ہے، ہندی میں نہیں آتا۔ ۔ ۔ ۔

یوسف ظفر

نظم، غزل اور گیت

جائزہ

نظر اُٹھی تو یہ دنیا طلسم خانہ تھی

ہر ایک رنگ اچھوتا، ہر ایک بات نئی

ہوا سے پتّوں کی لرزشں ترنّم آلودہ

ٹپکتے قطروں پہ اِک رقصِ سرمدی کا گماں

نفیس ریت کے ذرّے، ہمیل راہ کی خاک ـــــ

اُٹھے تو خواب کی دُھندلاہٹیں بکھرنے لگیں

بڑھے تو ایک فسوں گام گام تھا ہمراہ ـــــ

نگاہِ مادرِ مشفق میں اِک تبسّمِ ناز

پدر کی مہر و محبّت کا بولتا انداز

یہ صبح و شام، یہ شمس و قمر بدلنے لگے

حسیں مناظرِ فطرت نظر بدلنے لگے

نظر بڑھی تو فسانہ ہوئی وہ رعنائی

نظر نے دل سے کہا، دل نے اشک برسائے
ذرا سے دل کی وہ نازک سی دھڑکنیں جاگیں
کہ جن کے نغمہ و آہنگ کی ترازو میں
تمام خواب تمام آرزوئیں تلنے لگیں
نہ اب وہ لذّتِ نظارہ تھی، نہ لطفِ خرام
مگر وہ ہم سبق وہم تخیّل وہم گام

نظر نے پھیل کے آواز دی کہ آپہنچا
وہ مرحلہ کہ جہاں میں ہوں اور کوئی نہیں
مرے وجود کی خاطر وجودِ ارض و سما
مرے لئے یہ مساجد، یہ مقبرے یہ قدا
مری اُڑان کی زد میں یہ کائنات ہے، کیا
وہ سیم و زر مری کاوش کی گردِ راہ میں ہے
کہ جس کے سائے میں ہر عشرتِ جہاں رسوا

مرے تخیلِ رنگیں کے خُسم میں بال آیا
سمٹ گئی مری دُنیا، ترا خیال آیا

نظر سمٹ کے ترے رنگِ رُخ میں ڈوب گئی

حیات ایک ہی مرکز پہ اِس طرح آئی
کہ پھر نہ کوئی تمنا، نہ کوئی حرفِ سوال
بس ایک تیرا تصور، بس ایک تیرا خیال

نظر اب ایک تمنّائے دل کی ضامن ہے

یہ سرزمیں مرے خوابوں مرے گلوں کا وطن
مرے خیالوں کی دُنیا، تہالوں کا مسکن
یہ دیس جس کیلئے لاکھوں بے کسوں کا لہو
بہا ہے آبِ رواں کی طرح — یہ پاکستاں
کہ جس کی ذات سے ہے اب مری بہار و خزاں
یہ خاکِ پاک اُجالوں سے ایسے بھر جائے

یہ سرزمیں گُل و نغمہ سے یُوں سنور جائے
کہ ہو مسرت و نصُرت نظر جدھر جائے

اثرؔ صہبائی

غزل

جب تری چشمِ التفات نہیں
زندگی میں بھی کوئی بات نہیں

کچھ عجب زندگی ہے تیرے بغیر
رُوح میں لرزشِ حیات نہیں

تجُھ سے ہے کائنات کی رونق
تُو نہیں ہے تو کائنات نہیں

دردہی میں تلاش کر درماں
درد سے جب کہیں نجات نہیں

ہر گھڑی ایک نُور کا عالم!
عشق میں دن ہی دن ہے رات نہیں

تیری ہی یاد میں اگر گزُرے
کونسی شب شبِ برات نہیں

حُسنِ کردار لازوال اثر
حُسنِ رُخسار کو ثبات نہیں

عبدالمجید بھٹی

جاگ، محبّت جاگ!

دیکھ رہی ہے رَین اندھیری
جاگ رہی ہے قسمت میری
جگ جیون کی لاگ
جاگ، محبّت جاگ!

آہیں آنسو، آگ اور پانی
اُلفت کی رنگین کہانی
کڑوے میٹھے راگ
جاگ، محبّت جاگ!

دُنیا جاگے، دُنیا سوئے
کوئی پائے، کوئی کھوئے
اپنے اپنے بھاگ
جاگ، محبّت جاگ!

امین الرحمٰن

تاثّریت کا جمالیاتی پہلو

تاثریت پسند مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھ کر اکثر لوگوں کو کچھ اِس قسم کا خیال آتا ہے: "آخر کینوس پر بے پروائی سے ڈالے ہوئے رنگوں کے یہ بے ترتیب چھینٹے، رنگوں کی یہ ٹیڑھی ترچھی بے ربط لکیریں، اور رنگوں کے یہ گول گول نقطے۔ جو بے ہنگم اور مبہم قسم کی تصویریں تخلیق کرتے ہیں اُن میں فنِ مصوری کی جمالیات کے کون سے پہلوؤں کی نقاب کشائی کی جاتی ہے؟ آخر وہ کون سے فنی تقاضے ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے مصوروں کے کسی گروہ کو ضرور اسی قسم کی بے ہنگم تصویریں بنانی پڑیں جن میں سرے سے اُن تمام خصوصیات کا فقدان ہے، جو ہمیشہ سے مصوری کی روایات کا ایک ضروری جزو سمجھی جاتی رہی ہیں۔ مثلاً آہنگ، تشاکل، ترکیب اور توازن وغیرہ؟ اور پھر احساسِ حُسن کا آخر وہ کونسا معیار ہے جو اِن ڈیزائن سے مبرّا اور توازن سے آزاد تصویروں کو "حسین" قرار دیتا ہے؟

یقیناً احساسِ حُسن کا کوئی ایسا معیار موجود نہیں جو قطعی ہو اور جمالیات کا کوئی کُلیہ ایسا نہیں جو معیارِ حُسن کے معاملے میں اتمامِ حجت کا دعوےٰ کر سکے۔ تاہم اُصولاً آرٹ کے کسی نئے اُسلوب کو پسند کرنے کے معاملے میں اُس اُسلوب کی خصوصیات سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے! ورنہ تاثّریت جیسے نئے مسلک کے جمالیاتی پہلوؤں پر نہ ہی اور نہ ہی اسی صورت میں ہمدردانہ غور و خوض کر سکتے ہیں۔ جب انہیں مصوری کی اِس نسبتہً نئی ٹیکنیک کے اُصولوں کا پوری طرح سے علم ہو۔

تاثریت کی ٹیکنیک کے دو اہم بنیادی اُصول ہیں۔ ان میں سے ایک تو تاثریت کا نفسیاتی پہلو ہے اور دوسرا طبیعیاتی پہلو۔ اور انہیں اُصولوں کی بنا پر تاثریت کی ٹیکنیک مصوری کے کسی دوسرے طریقِ کار کی بہ نسبت نہ صرف زیادہ منطقی اساس پر قائم ہے بلکہ ساتھ ہی اِسے سائنس کا مضبوط سہارا بھی حاصل ہے۔ لیکن نفسیات اور سائنس کے انہیں اُصولوں کو تاثریت کے مخالفین اِس طریقِ کار کی مخالفت میں پیش کرتے ہیں، خاص کر جب اعتراض کرتے وقت وہ یہ کہتے ہیں کہ "کیا فنونِ لطیفہ کے کسی شعبے کو نفسیات اور سائنس کے اُصولوں کے تابع کر دینا ایک غیر فنی حرکت نہیں؟ اور کیا نفسیات اور سائنس کے اُصولوں کی امداد سے جمالیات کا کوئی کُلیہ وضع کرنا فنکار کے احساس، ذوق اور ایقان کو جامد اُصولوں کے ماتحت کرنا نہیں ہے؟"

درفی الواقع اِن لوگوں کو یہ بات نہایت تعجب خیز معلوم ہوتی ہوگی کہ مصوری کے کسی سکول کے اُسلوب کی جمالیات کو سمجھنے کے لئے آنکھ کی فزیالوجی اور بصارت کے نفسیاتی فعل یا روشنی اور رنگوں کی طبیعیاتی ماہیت کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ اعتراض تنقیدِ فن کے اُس مسلک کے خلاف کئے جاتے ہیں جس کا مقصد جمالیاتی اقدار کو سائنس یا فلسفے کے باضابطہ اُصولوں کی مدد سے پرکھنا ہوتا ہے یا بالفاظِ دیگر جمالیات کو علومِ معیاری کے زمرے

یں سے نکال کر علومِ ثابتہ کی فہرست میں جگہ دینا ہوتا ہے۔

خواہ مخالفین کے یہ اعتراض کتنے ہی وقیع اور وزنی کیوں نہ ہوں، کم از کم تاثریت کے اُسلوب کی جمالیات کو سمجھنے کے لئے ہمیں نہ صرف آنکھ کی فزیالوجی کا علم ہونا ضروری ہے بلکہ بصارت کے نفسیاتی فعل اور رنگوں کی طبیعیاتی ماہیت کا جاننا بھی لازمی ہے، کیونکہ مصوری کے اس اسکول کی بنیاد ہی ان امور پر رکھی گئی ہے اور جب تک ان کا تاثریت کے مخصوص نقطۂ نگاہ سے مطالعہ نہ کیا جائے تو تاثریت کا طریق کار اور تاثریت کا اُسلوب اپنے مفہوم اور مقصد کے لحاظ سے، بعض لوگوں کے نزدیک نرالا اور کسی قدر مُہمل بنا رہے گا۔

اس بات کو ہم یوں واضح کر سکتے ہیں کہ فرض کیجئے ایک تاثریت پسند مصور کو چند سفید رنگ کی بکریوں کی تصویر بنانا ہے جو ایک پیڑ کے نیچے سبز گھاس پر بیٹھی ہیں۔ تاثریت پسند مصور کے لئے بالخصوص یہ معاملہ بڑا اہم ہے کہ وہ اپنی تصویر میں رنگوں کی کونسی ترکیب ظاہر کرے کہ منظر کے اصل رنگوں کے تمام روپ نمایاں رہیں۔ اگر وہ بکریوں کو سفید رنگ سے بنائے اور ہلکے سبز رنگ سے سبزہ ظاہر کرے تو پھر پیڑ کا سایہ کس رنگ سے ظاہر کرے؟ اگر سفید بکریوں پر سیاہ سایہ پڑ رہا ہے تو نظری طور پر اُن کی سفیدی سیاہی میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہوتا کیونکہ بکریوں کا رنگ اصل منظر میں ویسے کا ویسا سفید رہتا ہے۔ اس مثال کی مشکل کو ایک تجربہ کار مصور اس طرح حل کرے گا کہ وہ سفید بکریوں کو بھورے رنگ سے بنا دے گا اور سبزے کو گہرے سبز رنگ سے ظاہر کر دے گا۔ صرف اسی صورت میں وہ اصل منظر کے رنگوں کو کسی حد تک قائم رکھ سکے گا۔ یہ اور اسی قسم کے کئی اور پیچیدہ مسئلے تاثریت پسند مصور کی قوتِ مشاہدہ کا امتحان لیتے ہیں۔ اور وہ سے اپنی تصاویر میں روشنی کی مختلف کیفیات کا، روشنی اور رنگوں کے باہمی تعلقات کا اور رنگوں اور سایوں کا ایک دوسرے پر جو ردِ عمل ہوتا ہے اُس کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔

اسی لئے بصری احساس اور بصری ادراک کا مسئلہ تاثریت پسند مصوروں کے لئے انتہائی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ذہنِ انسانی کے اس مخصوص احساس اور اس مخصوص ادراک کی مدد سے یہ مصور اپنی قوتِ مشاہدہ کو اپنے مسلک کی خاص ضرورتوں کے مطابق تربیت دیتے ہیں۔ بصری احساس کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ خارج میں کوئی ایسا ہیّج جو خواہ خود روشن ہو یا اُس پر کسی دوسرے مبدا سے روشنی کی رنگیں پڑ کر اُسے روشن بنا رہی ہوں، جب آنکھ کے پردۂ شبکیہ کو متاثر کرتا ہے اور پردۂ شبکیہ مہیّج کے اِن اثرات کو عصبۂ باصرہ کے ذریعہ سے دماغ تک پہنچاتا ہے تو بعض نخاعی فعلوں کی وجہ سے بصری احساس یا بصارت کا فعل واقع ہوتا ہے۔ طبیعیات کے رو سے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم کسی شے یا منظر کو دیکھتے ہیں تو اُس شے یا منظر پر روشنی کی جو کرنیں پڑتی ہیں وہ منعکس ہو کر آنکھ کے پردۂ شبکیہ کے مرکز پر پڑتی ہیں جہاں بصارت کا فعل رسیّے نمایاں ہوتا ہے۔ عام طور پر نگاہ کا پھیلاؤ بہت وسیع ہوتا ہے اور اس پھیلاؤ میں وہ سب کچھ شامل ہوتا ہے جو ایک خاص وقت میں آنکھوں اور سر کے مقررہ مقام سے دیکھنے والے کو نظر آتا ہے۔ لیکن عملی طور پر ہم صرف انہیں اشیا کو اچھی طرح سے دیکھ سکتے ہیں جو نگاہ کے اس پھیلاؤ کے عین مرکز میں ہوتی ہے۔ تاثریت پسند مصور کسی شے کی تصویر بناتے وقت سب سے

پہلے اپنی نگاہ کے پھیلاؤ کے اس مرکز کو متعین کرتے ہیں تاکہ اُس مرکز کے حوالے سے، جسے ہم مصوّر کی نگاہ کا نقطۂ ماسکہ بھی کہہ سکتے ہیں، وہ اپنی تصویر کے دوسرے ترکیبی اجزا کو تصویر میں موزوں ترتیب دے سکیں۔

لیکن تأثریت پسند مصوّروں کے لئے بصری احساس کی بہ نسبت بصری اِدراک کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ بہت سے بصری ہیجوں میں سے جو آنکھ کے پردۂ شبکیہ کو ایک خاص وقت میں متأثر کرتے ہیں صرف انہیں کو اپنے تصویری مقاصد کے لئے انتخاب کرتے ہیں جو موضوع کے اظہار کے لئے ضروری ہوتے ہیں اور باقی تمام ہیجوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا اگر تصویر کی ترکیب میں اُن کا دکھانا ایک خاص حد تک ضروری ہی ہو تو وہ انہیں تصویر کے دیگر اجزا کی اضافی اہمیت کے لحاظ سے اِس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ نہ تو اِس سے تصویر کی ترکیب ہی پر کچھ اثر پڑتا ہے اور نہ موضوع ہی کو عجزِ اظہار کی وجہ سے نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اِس معاملے میں ہر اُس بصری ہیج میں، جو تأثریت پسند مصوّر کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کا باعث ہوتا ہے، کئی ایسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو مصوّر کے مقاصد کے اظہار کے لئے ضروری ہوتی ہیں مثلاً روشنی کی تیز چمک کسی مدھم ٹمٹماہٹ سے نسبتہً زیادہ توجہ مبذول کرانے کا باعث ہوتی ہے۔ اِسی طرح کسی شئے یا منظر کا کوئی شوخ رنگ کسی مدھم رنگ کی بہ نسبت تأثریت پسند مصوّر کے لئے زیادہ پُرکشش ہوگا۔ اگر آپ مانے کی تصویر "سڑک کی مرمت کرنے والے" (۱۸۷۸ء) دیکھیں تو آپ کو اِس تصویر میں رنگوں کے بہت سے دھبّے دکھائی دیں گے۔ یہ دھبّے دراصل اُن دکانوں کے رنگا رنگ سائن بورڈ ہیں جو سڑک کے کنارے پر واقع ہیں۔ ان کے مختلف رنگوں نے مصوّر کے لئے بصری ہیج مہیا کئے اور مصوّر کی نگاہ و توجہ کو جذب کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مصوّر نے منظر کی بیسیوں دیگر تفاصیل کو چھوڑ کر اپنی تصویر میں انہیں رنگوں کو دھبّوں کی صورت میں دکھانا ضروری سمجھا ہے۔ تأثریت پسند مصوّروں کے لئے بصری ہیج جتنا زیادہ شدید ہوگا اُتنے ہی زیادہ اہتمام سے وہ اُس ہیج کے اثرات کو اپنے کینوس پر منتقل کریگا۔ یہی وجہ ہے کہ تأثریت پسند مصوّروں کے بنائے ہوئے "ارضانوں" میں منظر کے زیادہ باریک اور لطیف خال و خط کی بہ نسبت بڑے بڑے اور موٹے موٹے خط و خال زیادہ نمایاں طور پر دکھائے جاتے ہیں۔ اگر آپ کانسٹیبل، ٹرنر، ریلاکروئے اور لونگٹن وغیرہ کے بنائے ہوئے ارضانوں کا مقابلہ سسلے، پسرو، مونے اور رینو آ جیسے تأثریت پسند مصوّروں کی تصویروں سے کریں تو اِس فرق کا بآسانی پتا چل جائے گا۔

بصری احساس اور بصری ادراک کے درمیان کوئی خطِ فاصل کھینچنا کئی لحاظ سے مشکل ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ بصری احساس کا عمل کم و بیش، ایک قسم کا میکانیکی عمل ہوتا ہے، لیکن اِس کے برخلاف بصری ادراک میں ذہنِ انسانی کی وہ تمام کیفیات حصہ لیتی ہیں جنہیں لاشعور، مُبہم شعور اور واضح شعور کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جب تأثریت پسند مصوّر کوئی تصویر بناتا ہے، تو بصری ادراک کی یہ تینوں کیفیات درجہ بدرجہ اُس کی تصویر کی ترکیب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر ذہنِ انسانی میں شعور کی یہ تینوں تدریجی کیفیتیں نہ ہوتیں اور صرف ایک ہی کیفیت ہوتی یعنی واضح شعور کی کیفیت تو مصوّری میں تأثریت کی کوئی الگ، جداگانہ ٹیکنیک نہ ہوتی۔ اُس صورت میں مصوّری میں

حقیقت پسندی کا صرف ایک ہی اُسلوب ہوتا جس کی انتہائی صورت ماقبل رفائیل سکول کی تصویروں میں دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ اِس سکول سے تعلق رکھنے والے مصوروں مثلاً روزیٹی میلیس وغیرہ کی بنی ہوئی تصویریں اپنے اجزائے ترکیب کی بھرپور تفاصیل کے لحاظ سے، مصور کے اُس بصری ادراک کا نتیجہ ہوتی ہیں جسے واضح شعور کہا جاتا ہے لیکن چونکہ ہماری نفسیاتی زندگی میں لاشعور کے علاوہ مُبہم شعور کا حصہ بھی ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ توجہ کا فعل کبھی مطلق نہیں ہو سکتا بلکہ جب ہم کسی شئے کو توجہ سے دیکھتے ہیں تو بصری ادراک کے اِس عمل میں واضح شعور کے علاوہ مُبہم شعور کی کیفیت بھی شامل ہوتی ہے۔ اور اِسی نفسیاتی اصول کا تأثریت پسند مصور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

تأثریت کی ٹیکنیک پر ایک اور بات بھی اثرانداز ہوتی ہے اور وہ یہ کہ کسی شئے کا بصری ادراک کرتے وقت تأثریت پسند مصور کا ذہن بہت سے خارجی ہیجوں کے زیرِ اثر ہوتا ہے اگرچہ یہ سب ہیجے ملے جُلے ہوتے ہیں لیکن ادراک کے عمل میں ان تمام ہیجوں کو ذہنِ انسانی میں خلط ملط یا مرکب کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ بصری ادراک کا یہ عمل انتخابی بھی ہوتا ہے۔ جب ہم کسی پیچیدہ شئے مثلاً کسی منظر یا چہرے کی طرف دیکھتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں "اپنی توجہ اُس طرف مبذول کرتے ہیں" تو منظر یا چہرے کی تمام تفاصیل کو بیک وقت اِس طرح دیکھ لیتے ہیں گویا وہ منظر یا چہرہ اپنی تمام تفاصیل کی ایک اکائی ہو۔ اسے وحدتِ تأثر بھی کہا جا سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پس منظر میں جو اشیاء موجود ہوتی ہیں وہ اِس وحدتِ تأثر میں اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہیں، نہیں بلکہ وہ بھی اِس وحدتِ تأثر میں اضافی اور مناسب حصہ لیتی ہیں۔ پس منظر اصل تصویر کا ایک اہم جزو ہوتا ہے۔ اور جہاں مصور اپنی تمام تر توجہ تصویر کے اصل حصے پر مرکوز رکھتا ہے۔ وہاں پس منظر کے اجزاء خواہ وہ کتنے ہی مُبہم کیوں نہ ہوں تصویر کے مجموعی تأثر کی تکمیل کرتے ہیں چنانچہ جب تأثریت پسند مصور اُڑتی ہوئی کونجوں کی ایک ڈار کو دیکھتا ہے تو وہ اِن سب کو ایک "کُل" کے طور پر دیکھتا ہے اور کینوس پر ان کی تصویر بناتے ہوئے ہر کونج کو علیٰحدہ علیٰحدہ نہیں بناتا بلکہ اُن سب کے بال و پر کو اِس طرح باہم دگر منسلک کر دیتا ہے گویا وہ سب کی سب ایک اُڑتا ہوا سفید بادل سا ہیں۔

یہی اُصول مانے نے اپنی تصویر "بیرتیر کا شراب خانہ" بناتے وقت ملحوظ رکھا ہے۔ شراب خانے کے کاؤنٹر پر دائیں بائیں جو بوتلیں پڑی ہیں مانے نے اِن بوتلوں کا بصری ادراک کرتے وقت وحدتِ تأثر کو اپنی تصویر میں قائم رکھا ہے اور بجائے الگ الگ دکھانے کے اُن سب کو جُڑواں بنا دیا ہے۔ اِسی طرح اِس تصویر کے پس منظر میں دراصل بے شمار آدمی ہیں لیکن مانے نے انہیں رنگوں کے بے شمار مُبہم "مسوں" کی صُورت میں دکھایا ہے۔

بصری ادراک کے معاملے میں ایک اور اہم قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ ہم عموماً محض اشیاء کو دیکھتے ہیں اور اُن ہیجوں کو نہیں دیکھتے جو ہمیں اِن اشیاء کا بصری ادراک کراتے ہیں۔ حالانکہ ہیجے بھی خارج میں ویسے کے ویسے ہی موجود ہوتے ہیں جیسا کہ نظر آنے والی اشیاء فی الواقع موجود ہوتی ہیں۔ تأثریت پسند مصوروں کے نزدیک اشیاء کا قائم بالذات وجود اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت وہ ہیجے رکھتے ہیں جو اِن اشیاء کا بصری تأثر

پیدا کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خارجی ماحول کے ہیجوں کو ایک تأثریت پسند مصوّر اصل اشیأ کی بہ نسبت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ فی الواقع یہ ہیج خارجی اشیأ کے "علائم" ہوتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے عام طور پر کسی شئے کی محض ایک علامت ہوتی ہے اور نفسیاتی اصطلاح میں اُس شئے کا ادراک کرتے وقت ہم اُس علامت میں معانی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً میز پر پڑے ہوئے سنگترے سب سے پہلے نارنجی رنگ کی ایک علامت بن کر ہمارے پردۂ شبکیہ پر اپنا عکس ڈالتے ہیں لیکن فوراً ہی ہماری قوتِ ادراک سنگتروں کی اِس علامت کو معانی کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ اور ہم نارنجی رنگ کی اِس علامت کو محض ایک سیلے نام علامت ہی نہیں سمجھتے بلکہ اِسے سنگترہ سمجھ کر دوسری اشیأ سے ممیّز بھی کرتے ہیں۔ اکثر اوقات تأثریت پسند مصوّر محض ہیج سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اَور اپنے کینوس پر کسی شئے یا منظر کو صرف زیادہ نمایاں ہیج ہی ظاہر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ میز پر سنگترے پڑے ہیں لیکن سنگتروں کے بجائے وہ نارنجی رنگ کے چند گول گول دھبّے بنا دیں گے جو بیک وقت سنگترے کی قائم بالذّات ہیئت کو بھی ظاہر کریں اور ساتھ ہی سنگتروں کے ہیج کو بھی۔ ظاہر ہے کہ اِس قسم کا عمل نہایت مشکل ہوتا ہے۔ اَور اِس عمل میں تأثریت پسند مصوّر کی مہارتِ فن کا اصل راز چھپا ہوتا ہے کیونکہ ہیجوں کی یہ علامتیں اپنی اصلی اشیأ کے مقابلے میں بڑی سرسری سی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب درخت، مکان، جانور، انسان وغیرہ دُور سے دکھائی دیتے ہیں تو ان کی ہیئت کے بیرونی خطوط فاصلے کی دُوری کی وجہ سے مبہم ہو جاتے ہیں اَور یہ اشیأ ہمیں دُھندلی دُھندلی اور غیر واضح سی دکھائی دیتی ہیں۔

لیکن ضروری نہیں کہ تأثریت پسند مصوّر ایک تصویر میں توجہ اور بصری ادراک کا صرف ایک ہی نقطۂ ماسکہ رکھیں تأثریت پسند مصوّروں کے مشاہدے میں توجہ اور بصری ادراک کے جو دو اہم مرحلے آتے ہیں اُن میں توجہ کا ہٹنا یا دھیان کا بٹنا بھی شامل ہوتا ہے۔ آنکھ کی حرکات توجہ کے فعل میں تغیر و تبدل پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔ عام طور پر آنکھ ایک شئے سے دوسری شئے پر غیر شعوری طور پر جا پڑتی ہے۔ اگر آپ ایک ہی شئے پر نظر جمائے رکھیں تو تھوڑے عرصے بعد توجہ کا عمل اپنا مرکز بدل لیتا ہے کیونکہ توجہ کا عمل ہمیشہ انتخابی ہوتا ہے۔ اور ہر نیا ہیج توجہ کو پہلے نقطۂ ماسکہ سے ہٹا سکتا ہے اَور اِس کی جگہ توجہ کا ایک نیا نقطۂ ماسکہ انتخاب کر لیتا ہے۔ توجہ کے اِس تغیّر و تبدّل سے تأثریت پسند مصوّروں کی ٹیکنیک میں کڑا پن نہیں رہتا بلکہ ایک قسم کا لوچ سا پیدا ہو جاتا ہے جس سے تصویر کی ترکیب میں حسبِ منشا تنوّع پیدا کیا جا سکتا ہے۔ توجہ کے نئے نئے نقاطِ ماسکہ انتخاب کرنے میں تأثریت پسند مصوّر کے سابقہ تجربے اور مشاہدہ کو بڑا دخل ہوتا ہے اَور اِس معاملے میں اُس کا ذوقِ سلیم اَور وجدانِ صحیح اُسکی رہنمائی کرتا ہے کہ اُسے کس شئے کو تصویر کی ترکیب میں اہم جزو کی حیثیت سے پیش کرنا ہے اَور کس شئے کو کم اہمیت دینا ہے۔

بصری احساس، بصری ادراک اور توجہ کے بیان سے آپ کو اِس بات کا اندازہ بخوبی ہو گیا ہوگا کہ تأثریت کی ٹیکنیک کس حد تک ان نفسیاتی اُمور پر منحصر ہے۔ بصری احساس اَور بصری ادراک کے معاملے میں رنگوں کا احساس بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اَور بصری تأثرات پیدا کرنے میں تو رنگوں کا بالخصوص بہت بڑا حصہ ہوتا ہے کیونکہ تأثریت پسند مصوّر بالعموم رنگوں ہی

کے ذریعے سے اپنا فنی مافی الضمیر بیان کرتے ہیں اور بصری تأثرات کا اظہار رنگوں ہی کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔ سوائے چند مستثنیات کے، تمام تأثریت پسند مصوروں نے اپنی بہترین تصاویر لطیف رنگوں ہی میں بنائی ہیں۔

رنگوں کے بارے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی شئے میں رنگوں کا قائم بالذات وجود نہیں ہوتا بلکہ کسی رنگ کی آفرینش اُس وقت ہوتی ہے جب کسی شئے پر روشنی کی کرنیں پڑیں۔ گویا اگر روشنی کا وجود نہ ہو تو رنگوں کا بھی کوئی وجود نہ ہو۔ ہر شئے کا یہ خاصہ ہے کہ جب اُس پر روشنی پڑتی ہے تو وہ اُس کی کرنوں کو جذب کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر کرنوں کو جذب کرنے کی یہ خصوصیت انتخابی ہوتی ہے یعنی ہر شئے اپنے طبیعیاتی مزاج کے مطابق روشنی کی مختلف کرنوں کو جذب کرنے کی خصوصیت رکھتی ہے اور روشنی کی بعض کرنوں کو جذب کر لیتی ہے بعض کو نہیں۔ جو شئے روشنی کی تمام کرنوں کو پورے طور پر جذب کر لے وہ شئے سیاہ دکھائی دیتی ہے۔ جو شئے روشنی کی تمام کرنوں کو مساوی طور پر جذب کر لے لیکن مکمل طور پر جذب نہ کر سکے، وہ بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہے لیکن جو شئے روشنی کی تمام کرنوں کو غیر مساوی طور پر جذب کرے وہ رنگین دکھائی دیتی ہے۔ اِس لحاظ سے رنگوں کی طبیعیاتی ماہیت کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفید روشنی کے بعض اجزا کو (یہاں روشنی کے اجزا سے مختلف طول کی روشنی کی لہروں سے مراد ہے) جب کوئی شئے اپنے آپ میں جذب کر لیتی ہے تو روشنی کے باقی اجزا جو آنکھ پر اپنا عکس ڈالتے ہیں اُس شئے کو ایک مخصوص رنگ بخشتے ہیں۔

کسی رنگ کا نمایاں طور پر ظاہر ہونا بھی روشنی ہی پر منحصر ہے۔ اگر کسی سفید رنگ کے کاغذ کو مختلف رنگ کی روشنیوں میں باری باری رکھا جائے تو وہ کاغذ ہر بار اُس روشنی کا مخصوص رنگ اختیار کرے گا۔ نیلی روشنی میں نیلا، سبز روشنی میں سبز دکھائی دے گا۔ لیکن بعض حالتوں میں اِس کا اُلٹ بھی ہو سکتا ہے جیسے اگر آپ سرخ رنگ کے لالے کے پھول کو نیلی روشنی میں دیکھیں تو وہ سیاہ دکھائی دے گا کیونکہ اس صورت میں لالے کا سُرخ پھول نیلی روشنی کو تمام و کمال جذب کر لے گا۔ اِسی طرح سرخ روشنی میں یہ پھول شوخ رنگ کا نظر آئے گا۔ زرد روشنی میں کم زرد، اور سبز روشنی میں بہت گہرا سبز، نارنجی یا زرد روشنی میں عام نیلا رنگ سیاہ نظر آتا ہے۔ اور سبز روشنی میں سبزی مائل، کیونکہ نیلے رنگ کے بہت سے رُوپ سبز رنگ کو مکمل طور پر جذب نہیں کر سکتے۔

فرانسیسی مصور دو برژی کو رنگوں اور روشنی کی اہمیت کا بڑا احساس تھا۔ اور اُس کے بعد کے مصوروں نے بالخصوص روشنی اور اشیا کے رنگوں کے باہمی تعلق کا زیادہ سائنٹیفک بنیادوں پر مطالعہ کرنا شروع کیا۔ دیلاکروئے نے تو اِس معاملے میں اپنی غیر معمولی قوت مشاہدہ سے بڑا کام لیا۔ اُس نے اپنے جرنل میں روشنی اور رنگوں کے متعلق اپنے مشاہدات اور تأثرات کو قلمبند کیا ہے۔ جن دنوں وہ مراکو میں مقیم تھا اُس نے دہقان لڑکوں کے چہروں پر روشنی کے اثرات مشاہدہ کئے۔ اُس نے اپنے جرنل میں لکھا کہ "زرد رنگت والے لڑکے کے چہرے پر بنفشی سائے جھلملاتے نظر آتے تھے اور سرخ رنگت والے لڑکے کے چہرے پر سبز رنگ کے سایوں کی جھلک دکھائی دیتی تھی"۔

دیلاکروئے کے اِس مشاہدے سے مصوری میں "اُلٹے رنگوں"

کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا۔ طبیعیات میں طیف کے دو مختلف رنگ اُس وقت ایک دوسرے کے امدادی رنگ کہلاتے ہیں جب دونوں مل کر سفید روشنی کا رنگ پیدا کر سکیں۔ مثلاً طیف کے رنگوں میں زرد رنگ نیلے آسمانی رنگ کا امدادی رنگ ہے یا بنفشی رنگ کا امدادی رنگ سبزی مائل زرد ہوتا ہے۔ ڈیلاکروے نے مصوّری میں امدادی رنگوں کے استعمال کی اہمیت پر بڑا زور دیا۔ چونکہ ہر رنگ کا کوئی نہ کوئی امدادی رنگ ضرور ہوتا ہے، اس لئے ہر رنگ دوسرے رنگ پر ایک خاص قسم کا ردّ عمل پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ بات مصوّری کے عمل میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اور اسی وجہ سے ڈیلاکروے نے یہ بات دریافت کی کہ کسی رنگ میں پوری پوری تابانی اور شوخی پیدا کرنے کے لئے اُس رنگ کے ساتھ اُس کے امدادی رنگ کو ضرور استعمال کرنا چاہئے۔ یہ بات تاثریت پسند مصوّروں کے مفید مطلب تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی ٹیکنیک میں اسے بڑی اہمیت دی یہاں تک کہ تاثریت کی ٹیکنیک کا ایک عمل "تنقیط" کے نام سے موسوم ہوگیا۔ اور خاص کر جن تاثریت پسند مصوّروں کا دائرۂ فن منظر کشی تک محدود رہا وہ اپنی تصویروں میں امدادی رنگوں سے بڑی مدد لیتے ہیں۔ اِن لوگوں نے یہ بات مشاہدہ کی کہ سایوں میں ہمیشہ روشنی کا امدادی رنگ دکھائی دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی تصویروں میں سیاہ رنگ کا استعمال یکسر ترک کر دیا کیونکہ جو ہوا اور روشنی کے اثرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُنھوں نے مشاہدہ کیا کہ مظاہرِ فطرت میں خالص سیاہ رنگ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس لئے گہرے سے گہرا رنگ جو وہ استعمال کرتے تھے نیلا، گہرا سبز، یا گہرا بنفشی رنگ ہوتا تھا۔ زیادہ تر وہ طیف کے رنگوں مثلاً نیلے، زرد، نارنجی، سُرخ اور بنفشی وغیرہ سے ملتے جُلتے رنگ استعمال کیا کرتے تھے۔

اِس سے یہ ظاہر ہوگیا ہوگا کہ تاثریت کی ٹیکنیک میں رنگوں کے صحیح استعمال کی کتنی ضرورت ہے۔ اور اُن کے بصری اثرات، اُن پر روشنی کے ردّ عمل اور اُن کے امدادی رنگوں سے واقفیت رکھنا کتنا ضروری ہے۔ جب تک کوئی تاثریت پسند مصوّر رنگوں کی اِس چہل پہل کا اچھی طرح سے مشاہدہ نہ کرے اُس کیلئے رنگوں کے تاثراتی پہلو کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اور تاثریت کے نقاد کو بھی یہی بات ملحوظ رکھنی ہوتی ہے کہ کسی تاثراتی تصویر میں جو مخصوص رنگ استعمال کئے گئے ہیں اُن کے استعمال کا صحیح موقع و محل کیا ہے، کیونکہ جب تک نقاد تاثراتی تصویروں میں موقع و محل کے مطابق رنگوں کے استعمال کو نہ پہچانے گا وہ اِن تصویروں کے جمالیاتی پہلو کی صحیح تقریظ نہیں کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تاثراتی تصویروں کی صحیح تقریظ یا تنقید کے اہل وہی نقاد ہوسکتے ہیں جو رنگوں کی طبیعیاتی ہیئت اور اُن کے جمالیاتی خواص سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔

تاثریت کی جمالیات جن امور پر مبنی ہے اُنہیں دیکھتے ہوئے بعض نقاد تاثریت کو غلطی سے محض سائنٹیفک آرٹ سمجھ لیتے ہیں حالانکہ تاثریت کی ٹیکنیک بھی مصوّری کے اُنہیں جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرتی ہے جنہیں مصوّری کے دیگر اُسلوب پورا کرتے ہیں، مگر اِس بات کو سمجھنے کے لئے جمالیات کے مفہوم کو ذرا زیادہ وسیع کرنا پڑے گا۔ اور جمالیات کی بہت سی اصطلاحوں کو معانی کے چند نئے رُوپ دینے ہوں گے۔

جمالیات کی تاریخ میں یوں تو مختلف زمانوں میں "حسین" کا تصور مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کیا جاتا رہا ہے اور اِس معاملے میں جمالیات میں کئی نئے مسلک اور کئی نئے مسلک پیدا

ہونے کا میرے خیال میں ان تمام کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو یونانِ قدیم کے تصوّرِ حسین کو مستند مانتا ہے اور دوسرا وہ جو "حسین" کے معاملے میں کسی سند کا قائل نہیں بلکہ اسے شدید احساسات کا ایک آزاد اور برجستہ اظہار قرار دیتا ہے۔ پہلے گروہ کو ہم کلاسیکی کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو رُومانی۔ کلاسیکی جمالیات میں "شئے حسین" کے جن عناصر کو اہمیت دی جاتی ہے وہ آہنگ، تشاکل، اور ترتیب ہیں۔ اور یہ "شئے حسین" کے تمام اجزا نہ صرف انفرادی طور پر آہنگ، تشاکل اور ترتیب کے مظہر ہوں بلکہ ایک دوسرے سے اس طرح باہم مربوط بھی ہوں کہ علیحدہ علیحدہ ہونے کے باوجود ان میں ایک قسم کی وحدت پائی جائے۔ بخلاف اس کے جمالیات کے رومانی مسلک میں محض معنوی اظہار کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تأثریت پسند مصوّر اس لحاظ سے جمالیات کے اسی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک اپنے موضوع کے واضح اظہار کے سوا آرٹ کا اور کوئی مقصد نہیں۔ اور اگر موضوع کا اظہار رنگ ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے پروائی سے ڈالے ہوئے رنگوں کے بے ترتیب چھینٹوں، رنگوں کی ٹیڑھی ترچھی بے ربط لکیروں، اور رنگوں کے گول گول نقطوں سے ہو سکتا ہے۔ تو تأثریت پسند مصوّر موضوع کے اس اظہار کو ہمیشہ آہنگ، تشاکل اور ترتیب پر ترجیح دیں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تأثریت کی ٹیکنیک میں کلاسیکی جمالیات کے ان اصولوں یعنی آہنگ، تشاکل اور ترتیب کی کوئی قدر و قیمت نہیں، بلکہ بخلاف اس کے تأثریت پسندی میں آہنگ، تشاکل اور ترتیب کی اصطلاحات کے مفہوم کو قدرے وسیع کر لیا گیا ہے۔ اور جب ہم تأثریت کے معاملے میں ان اصطلاحات کو استعمال کرتے ہیں تو ان سے اُن تأثرات کا آہنگ، تشاکل اور ترتیب مراد ہے جو تأثریت پسند مصوّر کو مظاہرِ فطرت میں اپنے مشاہدے اور توجہ کے مخصوص نقطۂ نگاہ کی وجہ سے نظر آتی ہو۔ تأثریت کی جمالیات کا راز یہی ہے کہ مصوّر کی توجہ اور مشاہدے کا ہر نقطۂ نگاہ ایک خاص قسم کا آہنگ تخلیق کرتا ہے، ایک خاص قسم کا تشاکل مہیا کرتا ہے، اور ایک خاص قسم کی ترتیب پیدا کرتا ہے، اگرچہ یہ سب کچھ بہت حد تک داخلی ہوتا ہے لیکن موضوع کے معنوی اظہار میں اس سے خارج میں ایک ایسے تصویری حُسن کی تخلیق ہوتی ہے جس کی بہترین مظہر مانے، مونے، رنوآ، دیگا اور سیزان کی تصاویر ہیں!

اس مضمون کی اصطلاحات

امدادی رنگ	COMPLEMENTARY COLOUR	حسین	THE BEAUTIFUL
آہنگ	HARMONY	مہیج	STIMULUS
تشاکل	SYMMETRY	پردۂ شبکیہ	RETINA
ترکیب	COMPOSITION	عصبِ باصرہ	OPTIC NERVE
توازن	BALANCE	نخاعی	CEREBRAL
رُوپ	SHADES	مس	TOUCH
بصری احساس	VISUAL SENSATION	علائم	SYMBOLS
بصری ادراک	VISUAL PERCEPTION	طیف	SPECTRUM

ابوظفر نازش رضوی

غزل

آنکھ کیا اُن کی بدل کر رہ گئی
تھی چھُری جو دِل پہ چل کر رہ گئی

پاسِ رُسوائی سے جی بھر کے نہ رو سکے
آنکھ کی ندّی اُچھل کر رہ گئی

عشق کے عبرت نُما انجام پر
ایک دُنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

دیکھ کر بے مہریٔ اہلِ وطن
رُوح قالب میں دہل کر رہ گئی

کون روتا مرگِ پروانہ پہ شب
شمع بھی کچھ دیر جل کر رہ گئی

یاس دیکھی ابتدائے عشق میں
گھُٹنیوں اُمّید چل کر رہ گئی

وہ مرے پہلو سے اُٹھ کر کیا گئے
جان ہی تن سے نکل کر رہ گئی

اُس نے یُوں دیکھا نگاہِ ناز سے
دِل کی دُنیا ہی بدل کر رہ گئی

اب کہاں نازشؔ جوانی کی اُمنگ
دُھوپ آخرکار ڈھل کر رہ گئی

محمد حسن عسکری

احمد علی کا ایک ناول

سنہ ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے کہ احمد علی کا انگریزی ناول "شامِ دہلی" شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ نئے ادیبوں میں سے بیشتر ابھی بی اے یا ایم اے میں پڑھتے تھے، ترقی پسند تحریک ابھی ایسی پرانی نہیں ہوئی تھی، طبیعتوں میں جوش تھا، تخلیقی کوششوں کو محبت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور ادب میں ابھی "حدِ شرعی" نافذ نہیں ہوئی تھی۔ احمد علی ابھی تک "چھٹنی" میں نہیں آئے تھے، بلکہ اُن کا شمار نئے ادب کے اماموں میں ہوتا تھا، اُن کی کتاب شائع ہو اور ادبی حلقوں میں ہنگامہ نہ ہو، یہ کیسے ممکن تھا؟ دگنی دگنی قیمت پر لوگ کتاب لائے، اور پھر بھی یہ حال کہ ایک پڑھ رہا ہے تو چار انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد بحث کا دور چلا۔ چونکہ ای، ایم، فورسٹر اور ایڈون میور جیسے نقادوں کی تعریف کتاب کے ساتھ شامل تھی۔ للہٰذا بحث میں اور بھی گرمی آگئی۔ چونکہ لکھنؤ ایک نیم سیاسی اور نیم ادبی انجمن کا صدر مقام تھا، اس لئے سُنا ہے کہ وہاں تو فوراً یہ فیصلہ ہو گیا کہ ایک انحطاط پذیر طبقے کے متعلق مصنّف کا رویّہ ہمدردانہ ہے، للہٰذا ناول اچھا نہیں ہے۔ مگر الٰہ آباد میں "عزتِ کفر" پھر بھی ذرا باقی تھی، اور ادب کے بارے میں کُھلّم کُھلّا سیاسی نوعیت کے فیصلے کرتے ہوئے لوگ تھوڑا بہت شرماتے تھے، اس لئے ہمارے یہاں اصل کتاب کے بارے میں "تو" صاحب رائے حضرات نے رشک آمیز اور جھینپی جھینپی سی خاموشی اختیار کئے رکھی۔ البتہ فروعی چیزوں پر اعتراضات ہوئے۔ مثلاً بعض لوگوں نے کہا کہ صاحب، احمد علی بھی قسم کھا کے بیٹھے تھے کہ جتنے بھی انگریزی لفظ یاد ہیں سبھی لکھ دیں گے۔ بعضوں نے کہا کہ انہوں نے تو بالکل دسویں کے لڑکوں کی سی انگریزی لکھی ہے۔ کسی کو تفصیلات غیر ضروری معلوم ہوئیں۔ ایک صاحب یہ معلوم کر کے لائے کہ اصل میں ناول احمد علی نے نہیں لکھا، بلکہ فلاں صاحب نے لکھا ہے۔ اور آخر مثنوی گلزارِ نسیم والی بات پیدا ہو گئی، یعنی جو زیادہ باخبر اور دُور کی کوڑی لانے والے تھے انہوں نے اعلان کر دیا کہ یہ ناول اصل میں فورسٹر کی تصنیف ہے۔

ذاتی طور پر مجھے یہ ناول پڑھ کر بڑی تسکین ہوئی کہ اِدھر کچھ دن سے احمد علی نے جو "دیارِ شفق" جیسی نیم سیاسی اور جذباتی چیزیں لکھنی شروع کر دی تھیں وہ محض ایک وقتی کیفیت تھی، اور "ہماری گلی" "اُستاد شمو خاں" جیسے افسانوں میں انہوں نے جس معنی خیز حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی تھی اُسے ابھی ترک نہیں کیا۔ اُس وقت جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ ایک تو میر نہال کا کردار تھا، دوسرے کھجور کے پیڑ کی علامتی معنویت، اور تیسرے ایک بڑی بنیادی افسردگی کا احساس جو کہانی کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا جاتا تھا، انسانوں پر وقت کا بیدردانہ اور ظالمانہ عمل، زندگی کی بہار کا بتدریج خزاں میں تبدیل ہو جانا، اِس عمل کے سامنے انسانوں کی بے بسی، زندگی کے بے بنیاد ہونے کی چُبھن، بلکہ خود زندگی کی معنویت کے بارے میں قدرے شک آمیز رویّہ ــــ کتاب کے مجموعی تاثر میں یہ سب کیفیتیں

شامل تھیں، چنانچہ مجھے یہ ناول اُس وقت بہت پسند آیا۔

آٹھ سال بعد جب یہ کتاب پھر میرے ہاتھ پڑی، اور میں نے محض دلّی کی یاد تازہ کرنے کے لئے اِسے دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو مجھے یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ اِس مرتبہ کہیں مجھے مایوسی نہ ہو، کیونکہ آٹھ سال میں تو انسان بہت کچھ بدل جاتا ہے، اُس کی ذہنی اور جذباتی ضرورتیں وہ نہیں رہتیں جو پہلے تھیں، اِس دوران میں نئے ادبی تجربوں سے دوچار ہونے کے بعد پختگی آئی ہو یا نہ آئی ہو، مگر ممکن ہے کہ ہمارے ادبی احساس اور ادراک کا رُخ ہی بدل گیا ہو۔ آٹھ سال کے عرصے میں آدمی کی بعض صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں تو بعض گھٹ بھی جاتی ہیں۔ چنانچہ جب میں نے احمد علی کا ناول دوبارہ پڑھنا شروع کیا، تو ایک طرح سے میں اِسے پہلی مرتبہ پڑھ رہا تھا، مجھے یہ ضد نہیں تھی کہ اِس مرتبہ بھی اپنی پہلی رائے پر ہی قائم رہوں، بلکہ میں نئے تاثر کے لئے پُوری طرح تیار تھا۔ مگر فی الجملہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی، میرا پہلا تاثر بدستور قائم رہا، بلکہ اس دفعہ مجھے کتاب کے اور پہلوؤں پر بھی غور کرنے کا موقع ملا، اور میں نے اِس ناول کے مقصد، انداز نظر اور طریقۂ کار کو بھی وضاحت سے سمجھا۔

خلوص کے ساتھ پڑھنے والوں کو بھی جو چیز اِس ناول میں گراں گزرتی ہے وہ تفصیلات ہیں۔ کتاب میں رسموں، تہواروں اور روزمرّہ کی زندگی کا بیان ایسی تفصیلوں کے ساتھ ہوا ہے جو واقعی ہمارے لئے بے مصرف ہیں، ہم اِن سے اتنی اچھی طرح واقف ہیں کہ ان کے بیان سے ہمیں کوفت ہوتی ہے۔ مگر یہ اعتراض صرف ایک لحاظ سے درست ہے یعنی اگر آپ اس کتاب کو ایک عام ناول کی حیثیت سے پڑھیں تو، لیکن اگر آپ یہ بات نظر میں رکھیں کہ یہ ناول کن لوگوں کے لئے اور کس مقصد سے لکھا گیا ہے تو پھر چاہے آپ کو اِن تفصیلات سے بدستور کوفت ہوتی رہے، مگر یہ تفصیلات بجائے خود بے مصرف نہیں رہتیں۔ تفصیلات تو ثانوی چیز ہیں، اصل چیز تو فن کار کا مقصد ہے۔ اگر تفصیلات مقصد کے تابع ہیں تو پھر ہم اعتراض نہیں کر سکتے —— ویسے اعتراض کرنا آپ کا، میرا، سب کا جمہوری حق ہے، جسے کوئی نہیں چھین سکتا۔

اِس ناول کے اصل میں دو مقصد ہیں جن میں سے ایک تو ادبی، تخلیقی اور فنّی ہے، دوسرا قطعی غیر ادبی ہے، اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کتاب میں کوئی اندرونی تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ اگر فنّی مقصد پر لکھنے والے کی گرفت مضبوط ہے تو غیر فنّی مقصد سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ یہ غیر فنّی مقصد تخلیق کا بہانہ بن جاتا ہے۔

تو احمد علی کے ناول کا پہلا اور غیر ادبی مقصد تو ہے انگریزوں کے لئے رہنمائے دہلی لکھنا، رہنمائے دہلی میں اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ میں کتاب کے اِس پہلو کو جان بُوجھ کر مضحکہ خیز بنانا چاہتا ہوں۔ یہ فقرہ استعمال کر کے میں دیکھنا یہ چاہتا ہوں، کہ مضحکہ خیز بننے کے بعد بھی کتاب باقی بچتی ہے یا مضحکہ خیز بنتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر جب میں اپنے احساسات کا جائزہ لیتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ کتاب کا مذاق اُڑا لینے کے بعد بھی میرے اصلی تاثر میں کوئی کمی نہیں آئی، چنانچہ میں بے خوف ہو کے دہرا سکتا ہوں کہ مصنّف نے یہ کتاب انگریزوں کے لئے لکھی ہے جو دہلی کی زندگی سے واقف نہیں ہیں، مصنّف اُنہیں اِس زندگی سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔ لہٰذا تفصیلات کا ایک

مصرف تو یہ نکل آیا۔ اس مقصد کو نظر میں رکھ کے غور کیجئے تو یہ ساری تفصیلات بے معنی نہیں رہتیں، بلکہ ناگزیر بن جاتی ہیں۔ ویسے ان تفصیلات کا ایک فنی مصرف بھی ہے جو میں آگے چل کے بتاؤں گا۔

اس غیر ادبی مقصد نے مصنف پر ایک اور پابندی عائد کر دی، وہ یہ کہ دہلی کی زندگی کا بیان انگریزی زبان میں ہو مگر انگریزی زبان دہلی کی زندگی کے اظہار کے لئے ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اب مصنف کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ ایک ایسا اُسلوب ایجاد کیا جائے جو انگریزی ہوتے ہوئے بھی انگریزی نہ ہو، اور جس کے ذریعے دہلی کی زندگی کے آہنگ کو ایک اجنبی زبان میں منتقل کیا جا سکے۔ خواہ انگریزی کو تھوڑا بہت توڑنا مروڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں احمد علی اس کوشش میں بہت کامیاب رہے ہیں، اور انہوں نے ایک غیر زبان کو اپنی فنی مرضی کا پابند بنا لیا ہے۔ یہ کامیابی ایسی معمولی چیز نہیں ہے۔ غالباً ایڈون میور نے کہا ہے کہ اس کتاب سے چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ احمد علی نے واقعی پری کو شیشے میں اُتار لیا ہے۔

اب اُس دوسرے یعنی ادبی مقصد کی طرف آئیے۔ احمد علی نے محض چند افراد کا قصہ نہیں لکھا، بلکہ ایک طبقے، ایک شہر، ایک خاص تہذیب کے ایک مخصوص دور کی کہانی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا موضوع چند کردار یا اُن کی سوانح عمریاں نہیں ہیں، بلکہ پورا ایک شہر، یہ اصل میں ایک اجتماعی ناول ہے جس کا ہیرو دلّی شہر ہے۔ یہاں یہ اعتراض بجا طور پر ہو سکتا ہے کہ آخر مسلمانوں ہی کو دلّی کیوں سمجھا گیا۔ اور مسلمانوں میں بھی ایک خاص طبقے کو؟ تو یہ تو انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے۔ انسان حقیقت کو صرف اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور ہے۔ یوں تو دلّی میں جتنے آدمی بستے تھے اتنی ہی دلّیاں بھی ہوں گی، مگر احمد علی صرف ایک ہی دلّی پیش کر سکتے تھے ——— اپنی دلّی، جسے اُنھوں نے صرف دیکھا ہی نہیں تھا، بلکہ اپنی رگ و پے میں محسوس کیا تھا۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ جس چیز کو احمد علی نے دلّی سمجھا ہے وہی کروڑوں مسلمانوں کے لئے بھی دلّی ہے۔ چاہے طبقاتی معاشرہ ہو چاہے غیر طبقاتی، ہر معاشرے میں کوئی نہ کوئی گروہ، چھوٹا یا بڑا، ایسا ضرور ہو گا جس کی حیثیت مرکزی ہو اور جو تہذیبی اقدار کا منبع ہو، دلّی سے بھی تہذیبی اقدار کا ایک خاص نظام مراد ہے، اور اس نظام سے پیدا ہونے والی فضا اور مزاج۔ احمد علی کے ناول کا موضوع یہی تہذیبی نظام ہے ——— اِس نظام کا وہ دور جب اس کا مرکز ثقل مدت ہوئے غائب ہو چکا تھا اور اجزا بکھرنے لگے تھے۔ اِس شکست و ریخت کا مطالعہ بڑی ایمانداری اور جراٴت سے کرنے کے باوجود احمد علی اِس بات کو نہیں چھپاتے کہ اُنہیں اِن مٹتی ہوئی اقدار سے محبت ہے، اور اُن کے مٹنے کا رنج ہے، مگر رنج کا اظہار وہ اِس انداز سے نہیں کرتے کہ فن کا رانہ توازن اور وقار ہاتھ سے نکل جائے۔

مَیں نے اِس کتاب کو اجتماعی ناول بتایا ہے۔ آج کل جس قسم کے اجتماعی ناول رائج ہیں اُن میں ایک آسانی یہ ہوتی ہے کہ اجتماعی زندگی کو پورے کے پورے ہجوم کے افعال و اعمال کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے، اور پس منظر میں عموماً کوئی انقلابی تحریک یا جنگ ہوتی ہے۔ مگر کسی معاشری

وحدت کو روزمرہ والی زندگی کے آئینے میں پیش کرنا، جہاں ایسے بڑے بڑے ہیجان انگیز واقعات ہوتے ہی نہیں، اور پھر اس طرح پیش کرنا کہ فنی حیثیت سے بھی ناول کامیاب ہو بڑا مشکل کام ہے، مگر احمد علی نے کر دکھایا ہے۔

ایک شہر کی زندگی پیش کرنے کے لئے احمد علی نے ایک خاندان لے لیا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ اس خاندان کے افراد کو عام زندگی میں کن باتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ باتیں بالکل سیدھی سادی ہیں، کھانا پینا، سونا، تہوار، میلے ٹھیلے شادی بیاہ، پیدائش، موت، چھوٹا موٹا عشق، لڑائی جھگڑائی وغیرہ، چنانچہ اس ناول کا وہی پلاٹ ہے جو عورتوں کے لکھے ہوئے ناولوں کا عموماً ہوتا ہے، اور واقعات بھی تقریباً ویسے ہی ہیں۔ بس فرق ہے تو یہ کہ ان واقعات کی ترتیب اور طرح کی ہے، اور ان میں معنویت بھی بڑی بنیادی اور آفاقی پیدا کی گئی ہے۔ چونکہ ناول کا مقصد اجتماعی زندگی کا بیان ہے، اس لئے تفصیلات کی حیثیت بھی معلوماتی نہیں رہتی۔ انہیں تفصیلات میں تو اس اجتماعی وحدت کی اقدار اور اس کا مزاج جھلکتا ہے۔ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذریعے تو ہم اجتماعی زندگی اور زیر غور معاشرت کی روح سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ تفصیلات اس کتاب کے فنی مقصد کے لئے بھی اتنی ہی ضروری ہیں جتنی پہلے والے غیر فنی مقصد کے لئے۔

واقعات کے علاوہ، اجتماعی زندگی کے اظہار کا دوسرا ذریعہ افراد ہیں۔ اجتماعی ناول میں افراد کو وہ اہمیت نہیں دی جا سکتی جو عام ناولوں میں دی جاتی ہے۔ اُن کا عمل دخل تو صرف اتنی ہی دیر ہوتا ہے جتنی دیر اُن کی ضرورت پڑے، مگر ایسے ناولوں کے مصنف اکثر کرداروں کی انفرادی حیثیت بالکل ہی ختم کر دیتے ہیں، اور انہیں مختلف رجحانات کی نشانیاں بنا دیتے ہیں۔ احمد علی نے اس کے برخلاف اپنے ہر کردار کو اپنے اپنے مقام پر پوری طرح زندہ رہنے کی اجازت دے دی ہے، بلکہ اپنی جگہ تو ہر کردار اتنا اُبھر آتا ہے کہ ہم وقتی طور پر اُسی میں جذب ہو جاتے ہیں اور اُس پورے نامیاتی جسم کی طرف سے غافل ہونے لگتے ہیں جس کا وہ صرف ایک عضو ہے۔

دو کرداروں کو احمد علی نے نشو و نما پانے کا موقع دیا ہے، کچھ تو اصغر کو، اور اُس سے کہیں زیادہ میر نہال کو۔ اصغر زندگی میں تین دفعہ محبت کرتا ہے، اور محبت کی موٹی موٹی تین یہی قسمیں ہیں جن سے ایک عام آدمی کو سابقہ پڑتا ہے۔ پہلے تو وہ عشق بازی کے سلسلے میں ایک طوائف سے رسم و راہ پیدا کرتا ہے، طوائف اُس پر جان چھڑکتی ہے، مگر اصغر کا دل بھر جاتا ہے اور وہ اُسے چھوڑ دیتا ہے، پھر اُسے بلقیس سے عشق ہوتا ہے، اور تھوڑی سی کھینچاتانی کے بعد شادی بھی ہو جاتی ہے۔ یہ گویا کامیاب محبت ہے۔ مگر پھر گھر کی مُرغی دال برابر والی بات پیش آتی ہے، اور وہ اُس سے بے رُخی برتنے لگتا ہے، جب وہ بیمار پڑ جاتی ہے تو اُس کی محبت عود کر آتی ہے، مگر اسے محبت نہیں، رحم سمجھنا چاہیئے۔ بلقیس کی موت کے تھوڑے ہی دن بعد اُس کی چھوٹی بہن سے اصغر کی اٹ سٹ لڑ جاتی ہے مگر شادی نہیں ہو سکتی، اور یہ محبت ناکامیاب رہتی ہے، گویا اس کردار میں احمد علی نے ایک عام آدمی کے جذباتی اُتار چڑھاؤ کا نقشہ پیش کیا ہے، اصغر کی ایک اور حیثیت

بھی ہے۔ دلی کی تہذیب نے جو متوازن اور اندرونی طور سے ہم آہنگ مرکب پیش کیا تھا اُس کا نمونہ میر نہال ہیں۔ مگر اب وہ توازن بگڑ چکا ہے۔ حالات نے دلی میں ایک نیا انسان پیدا کیا ہے جس کی زندگی میں نہ گہرائی ہے نہ وسعت، نہ توازن ہے نہ ہمواری، جو تہذیبی اعتبار سے دوغلا، بلکہ بیچ میل ہے اور قدروں سے مبتذل ـــــ جس کے لطیف ترین جذبات بھی حُسن اور وقار سے خالی ہیں، کیونکہ یہ سب چیزیں ایک ہم آہنگ تہذیبی روایت سے حاصل ہوتی ہیں۔ اِس نئے انسان کا نمونہ اصغر ہے۔ مگر توازن مکمل ہو کر جمود اور موت بن جاتا ہے۔ میر نہال کی کہانی اِسی ناول کے ساتھ ساتھ ختم ہو گئی۔ ابتذال اور عدم توازن بہرحال زندگی سے سمجھوتے کا نام ہے۔ لہٰذا اصغر کی کہانی اِس ناول کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ ناول کے آخر میں وہ شکستہ تو ضرور نظر آتا ہے، مگر یہ اُس کی آخری شکست نہیں ہے۔ ابھی اُس میں کہیں اور آنکھ لڑانے کی صلاحیت باقی ہے۔ اِس ناکامی سے اُس کی کمر تو نہیں ٹوٹی، البتہ میر نہال کی حسرتوں میں ضرور اضافہ ہو گیا ہے۔

اِس کتاب کا سب سے عجیب و غریب کردار میر نہال ہے۔ اِس کردار میں ایک ایسی عجیب و غریب بات ہے، جو آپ کو شاید کسی اور کتاب میں نہیں ملے گی۔ ناولوں کے کردار عموماً ہمارے سامنے تشکیل پاتے ہیں، یا ہماری نظروں کے سامنے اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ میر نہال کا کردار کتاب شروع ہونے سے پہلے ہی تشکیل پا چکا تھا۔ اب اُن کے اندر کسی بنیادی تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں۔ یہی اُن کے کردار کی حیثیت قطعاً انفعالی ہے۔ یوں تو پہلے بھی اُن کی دو ہی دلچسپیاں تھیں، کبوتر اور اپنی محبوبہ بنّن جان۔ بنّن جان مر گئی تو اُنہوں نے کبوتر اُڑانے بھی چھوڑ دیئے اور ملازمت سے بھی استعفا دے دیا۔ اب اُنہوں نے اپنے جیسے دو چار بڈھے مُعَذّے جمع کر لئے۔ اور کیمیا اور تصوّف کی پناہ لے لی۔ مطلب یہ تھا کہ زمانے کی تبدیلیاں نظر نہ آئیں، اور دُنیا سے بےتعلق ہو جائیں۔ چنانچہ اُن کی حیثیت تماشائی کی سی ہو کے رہ گئی ہے۔ اصغر کی شادی اُن کی مرضی کے خلاف ہوئی، چھرو کی شادی میں بھی اُن کی بات نہ چلی۔ سیاسی دُنیا ہو یا خاندانی معاملات۔ اُن کی خواہشات ہر جگہ بےمعنی تھیں۔ پہلے تو اُنہیں زمانے کی گردش پر رونا بھی آتا تھا، آخر آخر میں تو اِس کا بھی دم نہیں رہا تھا۔ اصغر انگریزی کپڑے پہن کے سامنے آتا، مگر اُنہیں ٹوکنے کا بھی خیال نہ آتا۔ جسم تو مفلوج ہوا ہی تھا، دل و دماغ بھی سُن ہو کے رہ گیا تھا۔ زندگی کی بہار ہوا ہو چلی تھی، اب تو چل چلاؤ لگ رہا تھا۔ بنّن جان مری، جوان بہو مری، بیٹا مرا، اپنے منہ چڑھے نوکر غفور کے لئے پندرہ برس کی دُلہن بیاہ کے لائے تھے وہ چلتی بنی، بیٹی کی شادی کیا ہوئی تھی زندہ درگور ہوئی تھی۔ ہر طرف موت ہی موت تھی، یا محرومی، ناکامی، حسرت، نامرادی، میر نہال بستر پہ پڑے ٹک ٹک دیکھا کرتے، اور دم نہ مار سکتے۔ پڑتی دوسروں پر تھی، اور اُن سے زیادہ بھگتتے تھے میر نہال۔ اصغر جیسے لوگ تو ممکن ہے اپنے غم بھول جاتے ہوں، مگر اُن کے لئے بھول جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ اُن کی اور سب جسمانی اور دماغی طاقتیں تو سلب ہو چکی تھیں۔ بس ایک حافظہ ابھی زندہ تھا۔ وہ مجسّم یاد بن کے رہ گئے تھے۔ اِس لئے سب کے رنج و الم اُن کے

حسن عسکری

احساس پر لدتے چلے جاتے تھے۔ اُن کے شعور میں پہنچ کر سارے المناک واقعات گھُل مل جاتے تھے، اَور سب کا زہر اُن کے رگ و پے میں بیٹھ چکا تھا۔ اُن کی آخری ذمّہ داری اَور آخری فرض یہی رہ گیا تھا کہ وہ سب کی طرف سے رو دیں۔ ساری کتاب میں تو اُن کی حیثیت صرف انفعالی تھی، مگر آخر میں اُن کے شعور کا عمل اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ وہ سب کرداروں کے المیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے، زمانے کی تمام تبدیلیوں کے اثرات اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ کتاب کے چھوٹے سے چھوٹے فرد کا غم میر نہال کا غم بن جاتا ہے، اَور اُنہیں کا شعور ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح ہم میر نہال کے شعور کو دلّی شہر کا شعور بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو اپنے تمام فرزندوں کے دُکھ سہہ رہا ہے، اَور ساتھ ہی خود بھی تحلیل ہوا جا رہا ہے، مگر مر بھی رہا ہے تو ایک وقار کے ساتھ۔ کتاب کے آخر میں اِتنی شدّت آجاتی ہے کہ میر نہال تو کیا، خود زندگی اپنی بے مائگی، لاچاری اَور بے بُنیادی پر افسوس کرتی، اپنی حقیقت کے بارے میں بڑے شک آمیز سوالات کرتی معلوم ہوتی ہے۔

اِس کردار کی تخلیق احمد علی کا ایک کارنامہ ہے، مگر اُس کردار کو کتاب سے الگ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ساری کتاب اس کے اندر سما گئی ہے۔ میر نہال کی بیماری کا بیان بھی اپنی جگہ شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُردو ناولوں کا تو ذکر ہی کیا، مغربی ناولوں میں بھی اس کے مقابلے کی چیز روز نہیں مل سکتی۔ خصوصاً دو جگہ تو فلوبیر کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ احمد علی کو اپنے کرداروں سے انتہائی ہمدردی ہے، فلوبیر کا رویہ ایسے مقامات پر مخاصمانہ ہوتا ہے۔ اِس لئے احمد علی کے یہاں طنزیہ عناصر بھی رحم کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ایک جگہ تو وہ ہے جہاں میر نہال کے علاج کے لئے لوگ بڑی مشکل سے حواصل پکڑ کے لاتے ہیں، اَور اُس کے ذبح ہونے کا تماشا دیکھنے کے لئے بچے تو بچے بڈھی خادمہ دل چین تک نکل آتی ہے۔ دوسری جگہ وہ ہے کہ جب میر نہال کا ایک ہاتھ حرکت کرنے لگا ہے، اور وہ دل بہلانے کے لئے لیٹے لیٹے چوہے دان سے چوہے پکڑا کرتے ہیں۔ ایک دن ایک نیولا اور اُس کی مادہ کھلاڑیاں کر رہے ہیں، اتفاق سے مادہ چوہے دان میں آجاتی ہے، مگر میر نہال کو بتن جان یاد آجاتی ہے اور وہ کھٹکا نہیں کھینچتے بلکہ اُس دن سے چوہے دان ہی اُٹھوا دیتے ہیں۔

بیماری یا موت وغیرہ ایسے مقامات ہیں جہاں لکھنے والے کا امتحان ہوتا ہے۔ ایسے وقت یا تو آدمی جذباتی ہو جاتا ہے یا پھُسپھُسا، مگر احمد علی دونوں باتوں سے بچ نکلے ہیں۔ کتاب میں ایک تو بلقیس کی موت کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہوا ہے، دوسرے حبیب الدین کی موت کا، یہ دونوں چیزیں احمد علی نے بڑی احتیاط اَور بڑی پُرکاری کے ساتھ لکھی ہیں۔ پہلی جنگ کے بعد جو وبا آئی تھی اُس کے ذکر میں بھی احمد علی نے بڑی چابک دستی دکھائی۔ اُنہوں نے جس انداز سے گورکنوں، غسّالوں، کفن فروشوں اور کفن چوروں کی لُوٹ کھسوٹ کا حال بیان کیا ہے اُس کا جواب بھی ذرا مشکل ہی سے ملے گا۔ عالمگیر موت اور عالمگیر بے ایمانی کی جو مہلک فضا احمد علی نے قائم کی ہے وہ واقعی اُنہیں کا حصہ ہے۔ مَیں تعریف کے ایسے روایتی الفاظ یوں استعمال کر رہا ہوں کہ دو چار ٹُوٹے پھُوٹے افسانے مَیں نے بھی لکھے

ہیں۔ اپنے فن کے داؤ پیچ ماہرانہ انداز سے استعمال ہوتے دیکھ کر آدمی کے منہ سے سبحان اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا، غیر رسمی الفاظ ڈھونڈنے کا خیال بعد میں آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احمد علی کا ناول دوبارہ پڑھ کر میں نے افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی اِس سے کچھ حاصل کیا ہے۔

اِس نقطۂ نظر سے ناول کے پہلے باب کو بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اِس باب میں احمد علی نے دو باتیں بڑی خوبی سے کی ہیں۔ ایک طرف تو دہلی کے ایک عام مسلمان گھرانے کی فضا بڑی فن کارانہ چابک دستی سے پیش کر دی ہے۔ دوسری طرف اپنی کہانی بھی شروع کر دی۔ یہ باب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ احمد علی کو تفصیلات کے انتخاب اور استعمال کا کیسا سلیقہ ہے اور وہ کم سے کم تفصیلات کو کتنا معنی خیز بنا دیتے ہیں۔ احمد علی کے انداز میں ایسی روانی اور سادگی ہے کہ عام پڑھنے والے کو محسوس نہیں ہوتا کہ چند صفحوں میں کسی تہذیب کے متعلق اِتنا کچھ کہہ دینا کتنا مشکل کام ہے۔ میرا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ احمد علی کو یورپ کے بڑے بڑے ناول نگاروں کے جا بھڑاؤں، مگر یورپ کے بہ اچھے ناول میں بھی ایسے کامیاب بیانیہ ٹکڑے نہیں ملیں گے۔ پورے خاندان کی زندگی کو دس پندرہ صفحوں میں منتقل کر دینے کے سلسلے میں دو چیزیں بہت مشہور ہیں۔ ایک تو بالزاک کے ناول "بڈھا گوریو" میں ایک عورت کے گھر کا نقشہ جس کے یہاں لوگ کرائے پر رہتے ہیں یا کھانا کھانے آتے ہیں۔ دوسرے زولا کے ناول "جرمینل" میں ایک مزدور کے خاندان کا بیان۔ میں پھر عرض کئے دیتا ہوں کہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ احمد علی کو بالزاک کے برابر جا بٹھاؤں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ بالزاک اور زولا نے جن چیزوں کے متعلق لکھا ہے، وہ بذاتِ خود غیر معمولی اور دلچسپ تھیں۔ اس کے برخلاف احمد علی نے جس خاندان کا نقشہ کھینچا ہے وہ بالکل معمولی اور بظاہر بے رنگ ہے۔ اِس اعتبار سے احمد علی کا کام مشکل تھا، مگر اُنھوں نے اِس بے رنگی میں بھی رنگ پیدا کر دکھایا ہے۔

اِس ناول کے انسانوں کو تو ہم دیکھ چکے، مگر ایک اور عنصر ہے جسے مصنف نے انسانوں کے برابر ہی اہمیت دی ہے۔ وہ ہے فطرت ــــ دلّی کے دن رات، صبح و شام، گرمی، برسات، آسمان کے بدلتے ہوئے رنگ، ہوا، لو، آندھی، دھوپ۔ اِن سب چیزوں کو احمد علی نے ایک علیحدہ زندگی بخش دی ہے۔ ناول میں یہ چیزیں بذاتِ خود ایک الگ وجود رکھتی ہیں۔ پھر جگہ جگہ شہر کی گلیوں، نالیوں، گٹے، بتیوں اور آسمان پر اُڑتے ہوئے کبوتروں، چیلوں اور پتنگوں کا ذکر آتا ہے۔ اِن موسمی تبدیلیوں، فضائی کیفیتوں اور ان سب چیزوں کی مدد سے احمد علی نے دلّی کو ایک مستقل اور زندہ شخصیت دے دی ہے۔ اور موسموں کی بہ نسبت احمد علی کو گرمی کا احساس زیادہ ہے، اور اُس میں بھی ایسے دنوں کا جب لو زور کی چل رہی ہو اور آسمان گرد سے اٹا ہو، اور زندگی کے آثار کم ہو گئے ہوں۔ اتفاق سے یہ چیز یہاں اُن کے بہت کم آئی ہے۔ وہ دلّی کی تہذیب کا انتشار اور خاتمہ دکھانا چاہتے تھے۔ لہٰذا یہ فضائی کیفیتیں ایک علامتی کیفیت اختیار کر گئی ہیں، بلکہ پورے ناول کی فضا ہی یہ ہے، اور ساری کہانی اِسی فضا کے اندر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ جہاں تک فطرت کے احساس کا تعلق ہے، احمد علی کے اعصاب اِس معاملے میں زیادہ لطیف نہیں ہیں۔ اُن کا

ردِ عمل بالکل ایک عام آدمی کا سا ہے۔ مگر اُردو کے مصنفوں میں تو اتنا احساس بھی نایاب ہے۔ یہ ناول تو ضرور انگریزی میں ہے، مگر احمد علی آخر اُردو کے مصنف ہیں، اس لئے اُردو کے لکھنے والوں سے اُن کا موازنہ کیا جانا ہوگا۔ اُردو میں تو مجھے کوئی ناول یا افسانہ ایسا یاد نہیں آتا جس میں فطرت اس طرح زندہ ہوگئی ہو، یا ناول کو معنی خیز بنانے میں فطرت کو اتنا دخل ہو۔ فطرت کے متعلق احمد علی کے احساسات میں مغربی مصنفوں کی سی نزاکت اور باریکی نہ سہی، مگر شیرینی ضرور ہے۔ اور اس قسم کے اجتماعی ناول میں احساس کی لطافت ایسی ضروری بھی نہیں، بلکہ بہت ممکن تھا کہ لطافت عمومیت میں مخل ہوتی۔ فی الحال احمد علی کا احساس اور اُن کے کرداروں کا احساس بالکل ایک ہے، اور اس سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ اتنے دکھ کے باوجود دلّی والوں کے احساسات کند نہیں ہوئے ہیں۔ اب بھی اُن کی زندگی چنبیلی کی خوشبو میں بسی ہوئی ہے، اور جب ہم کتاب ختم کر لیتے ہیں تو ہمیں بھی فورسٹر کی طرح یہ احساس ہوتا ہے کہ دُنیا سے حسن رخصت ہوگیا ہے۔

پھر ایک اور چیز جس نے کتاب میں ایک وحدت اور شدت پیدا کر دی ہے، وقت کے گزرنے کا احساس ہے۔ اس چیز کا احساس احمد علی کے اندر اتنا شدید ہے کہ احمد علی کا تخیل بھی اِس سے حرکت میں آتا ہے۔ اور وہ اپنی فنکارانہ قوت یہیں سے اخذ کرتے ہیں۔ وقت کی کارگزاریوں کے متعلق احمد علی دو چار جذباتی فقرے ضرور لکھ گئے ہیں، مگر اُنکا یہ احساس کتنا غیر جذباتی اور ٹھوس ہے۔ اُس کا اندازہ میر نہال کے کردار ہی سے ہو سکتا ہے۔ اِس بات میں بھی اُردو کے مصنفوں میں کوئی اُن کا ثانی نظر نہیں آتا۔ احمد علی کے یہاں اِس احساس کے ٹھوس اور کائنات گیر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے اندر یہ احساس محض ذاتی زندگی کے تجربات سے پیدا نہیں ہوا، بلکہ ایک پوری تہذیب سے عقیدت اور محبت کی بنا پر۔ اِسی لئے اُن کے یہاں وقت کا احساس محض تاسف، یا رنج و غم پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اپنے اندر المیہ عناصر رکھتا ہے۔

چونکہ وقت کا عمل صرف دلّی تک ہی محدود نہیں، بلکہ پوری انسانیت پر حاوی ہے۔ اِس لئے یہ ناول محض دلّی کی داستان ہو کے نہیں رہ جاتا، بلکہ ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی کہانی بھی ہے۔ جب ہم یہ ناول ختم کرتے ہیں تو ہمارے المیہ احساسات کا مرکز صرف دلّی نہیں ہوتا، بلکہ براہِ راست پوری انسانی زندگی، اس کتاب کا مجموعی تاثر ہمیں زندگی اور کائنات کے متعلق بڑے ٹیڑھے اور بنیادی سوال کرنے پر اُکساتا ہے۔ حُسن کیوں فنا ہوتا ہے؟ زندگی بیلے تابانہ موت کی طرف کیوں دوڑتی ہے؟ اگر فنا لازمی ہے تو زندگی کیوں وجود میں آئی؟ اِن سوالوں کا جواب معلوم کرنا کتنا مشکل ہے وہ اِسی سے ظاہر ہے کہ کتاب کے آخر میں فطرت اپنی تمام وحشت اور ہیبت کے ساتھ انسان پر چھا جاتی ہے، اور انسان اُس کے اندر کھو جاتا ہے۔

یہ ہے اِس کتاب کا مجموعی تاثر۔ احمد علی نے تصویر کا ایک رُخ تو دکھا دیا، مگر ابھی ایک رُخ باقی ہے۔ میر نہال خود تو مفلوج پڑے ہیں، مگر پوتے کو نصیحت کر رہے ہیں کہ بڑے ہو کے آزادی کے لئے جہاد کرنا۔ میر نہال مر کھپ گئے ہوں گے، مگر اُن کے پوتے نے ایک نئی زندگی،

ایک نئے توازن، ایک نئی تہذیب کا خواب ضرور دیکھا ہوگا۔ مرزا دودھ والے نے اپنے بیٹے کو آزادی کی راہ میں قربان کر دیا تھا۔ ایسے جگر دار تو ابھی اور سینکڑوں ہوں گے۔ شامِ دہلی ہی سے صبحِ پاکستان پیدا ہوئی ہے۔ جب تک احمد علی اِس ناول کا دوسرا حصہ نہ لکھیں، اُن کی کتاب تشنۂ تکمیل رہے گی +

ناول کی ترکیب میں "واقعیت" اور "وحدت"

(حمید احمد خاں)

ناول کا دائرہ مختصر افسانے سے قدرۃً زیادہ وسیع ہے۔ ناول کا مصنف نہ صرف ایک سلسلۂ واقعات کا بیان پوری تفصیل سے کر سکتا ہے بلکہ اپنے قصے کے افراد کا ذکر بھی اِس طرح کرتا ہے کہ اُن کی سیرت کے چھوٹے چھوٹے پہلو اُبھر کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ناول لکھنے والا زندگی کے متعلق جو نقطۂ نگاہ رکھتا ہے اُس کی جھلک اِس کے بیان کئے ہوئے واقعات کے پیچھے بخوبی نظر آتی ہے۔ ناول لکھنے کی بنیادی شرطیں دو ہیں ایک یہ کہ کہانی کے ہر حصے میں اصلیت کا رنگ ہو (واقعیت)، دوسری یہ کہ شروع سے آخر تک تمام واقعات باہم مربوط ہوں۔ (وحدت)

قیوم نظر

رات بھر

رات کی وسعتوں میں اپنے تقاضوں کو لئے
بڑھ بڑھا آتا چلا جاتا ہے سمٹتا دریا
جس میں گاہے کسی مچھلی کے اُچھلنے سے فضا
اک نئی تان کی رعنائی میں کھو جاتی ہے

عالم خواب میں ہیں نرم ہوا کے جھونکے
تھک گئے ہوں گے حسینوں کا بدن سہلاتے
نازنیں زلفوں کی پہنائیوں کے گُن گاتے
اونگھنے پیڑوں میں ہے راہگذر خوابیدہ

وقت کے سائے میں تھے طرفہ اُمنگوں کے محل
آپ سے آپ جو اب گرتے چلے جاتے ہیں
ہر طرف پھیلے اندھیرے میں ڈھلے جاتے ہیں

رات آدھی سے زیادہ ہی گئی ہے شاید

کتنی پُرکار ہے ہیبت سے بھری تاریکی
جیسے جان لینے کو ہر شاخِ شجر آتی ہے
گھاس کے تنکوں میں بھی موت نظر آتی ہے
کیا اِسی ہَول پرستی سے خُدا زندہ ہے

شل ہُوا جاتا ہوں یخ بستہ پہاڑوں کی طرح
جن کے سینوں ہی میں رہتے ہیں بقا کے اسرار
جانے خاموش ہے کیوں زاہدِ شب زندہ دار
جانے کب جاگے گی آوازۂ ہُو کی دُنیا

تیرہ تر رات ہوئی جاتی ہے تنہائی میں
نیند آتی ہے نہ لاتی ہے اچھوتا سپنا
بڑبڑاتا چلا جاتا ہے سمٹتا دریا
کسے معلوم کہ یُوں جینا بھی کیا ہوتا ہے

(حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں پڑھی گئی)

قیوم نظر

(مترجمہ)
ابنِ حسن زیدی

داستانِ جرائم

مقتول شکاری

(ایک ہائی کورٹ کے چیف جج کے قلم سے)

"داستانِ جرائم" ایک سلسلۂ مضامین ہے جو میں "مقتول شکاری" سے شروع کیا چاہتا ہوں۔ یہ مضامین اُن مختلف النوع جرائم کو ہمارے سامنے لائیں گے جن سے آئے دن ہماری اجتماعی زندگی متزلزل ہوتی رہتی ہے۔ ان مضامین سے ظاہر ہوگا کہ اچھے شہریوں کی حیثیت سے قانون کا احترام ہمارے لئے کتنا ضروری ہے بعض لوگ جو آزادی کا غلط مفہوم لیکر شُتر بے مہار بنے پھرتے ہیں اور قانون کا وقار اُن کی نظروں سے اُٹھ گیا ہے انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ قانون کا احترام حکومت ہی کے لئے نہیں خود عوام کی نجی زندگی کے لئے بھی۔ بے حد ضروری ہے۔ — زیدی

جرائم کی تاریخ میں شیر محمد کا سانحۂ قتل ایک سخت حیرت انگیز اور المناک داستان ہے۔ دُنیا میں قتلِ عمد کے مختلف سنگین اسباب ہوا کرتے ہیں لیکن شیر محمد کے واقعۂ قتل کے اسباب اپنے اندر ایسی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ نہ کسی رقابت کی وجہ سے مارا گیا تھا، نہ کسی لالچ کے لئے۔ اُس کی جان نہ انتقاماً لی گئی تھی نہ کسی وقتی جذبۂ اشتعال کے ماتحت۔ وہ نہ کسی بلوہ میں کام آیا تھا نہ کسی کے ہاتھ سے حفاظتِ نفس کے لئے نشانۂ اجل بنایا گیا تھا۔ اُس کی ہلاکت کا باعث محض ایک بیہودہ خوف تھا یا اخفائے جرم کا ایک غلط طریقہ! اُس کی داستانِ ہلاکت، اُس شدید انسانی کمزوری کا اظہار کرتی ہے جو نااہل انسانوں کی بزدلی، اخلاقی پستی اور جاہلانہ خوف و ہراس سے پیدا ہوتی ہے اور جس کے زیرِ اثر وہ انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں سمجھتے۔

شیر محمد قوم کا بنجارا اور پُرانا شکاری تھا۔ شکاری کی حیثیت سے وہ بہت مشہور رہا تھا اور والسرائے ہند کے شیر کے شکار کے اہتمام میں اُس کا نام منتخب شکاریوں کی فہرست میں درج ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ وہ صوبے کے گورنر کے شکار کی پارٹی میں بھی ہانکا کرنے والوں میں شریک ہوا تھا اور اس موقع پر ایک شیر نے اُس کے دائیں بازو کو اس بُری طرح سے چبا ڈالا تھا کہ اُس کا ہاتھ صحت یاب ہونے پر بھی دوہرا ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسے کہ اُس کی اُنگلیاں اور پہنچا اندر کو مُڑے رہتے تھے جس کے باعث اُس کا دایاں ہاتھ گویا ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گیا تھا۔ اِس جانکاہ اذیت کے بعد اُس نے شکار کے مشغلے سے توبہ کر لی تھی اور وہ زیادہ تر ذاتی کاروبار اور گاؤں کے نجی اشغال میں منہمک رہتا تھا۔ لیکن شکار کا وَلولہ اس کے بعد بھی کبھی کبھی اُس کے دل میں اُٹھتا تھا۔ چنانچہ جو غیر متوقع حادثہ اُسے اس کے بعد اتفاقاً ایک شکاری جماعت میں پیش آیا وہ اُس کی جان ہی لیکر رہا۔ اپنے آخری لمحات میں غریب شیر محمد کو خیال آیا ہوگا کہ شیر نے تو میری جان بخشی کر دی تھی لیکن ظالم انسان سے جان نہ بچ سکی۔

جس اتفاقی شکاری صحبت کا اُوپر حوالہ دیا گیا ہے اُس کے سربراہ اور روحِ رکن نوجوان زمیندار فخرالدین تھے، اور غالباً

اُن کا بھی یہ آخری ہی شکار ہوگا کیونکہ قانونی بازپرس کے مجرمانہ خوف کے ماتحت دو شکاری اِس بدانجام پروگرام کے بعد ایسے غائب ہوئے گویا خود شکار ہو کر رہ گئے۔ اِس پارٹی میں اُن کا دوست ابراہیم اور ایک اور دوست خلیل بھی شریک تھے جو انہی کے ہم پلہ معزز زمیندار تھے۔

۲۸ نومبر ہفتہ کی صبح کو ابراہیم نے میاں خلیل کو یہ خط لکھا:-

خلیل بھائی تسلیم

مہربانی کر کے حامل رقعہ کے ساتھ جلد شکار کے لئے تیار ہو کر آجائیے۔ فخرالدین آپ کا انتظار کر کے کل واپس گئے۔ وہ کہہ گئے ہیں کہ آج میں ضرور آپ کو ساتھ لے کر چلا آؤں۔ اگر آپ نہیں آئیں گے تو فخرالدین کو سخت شکایت ہوگی۔ ہم آج تین بجے موٹر سے روانہ ہو کر کل صبح فخرالدین سے جا ملیں گے۔ جلد تشریف لائیے

آپ کا منتظر۔ ابراہیم

چنانچہ ابراہیم خلیل کو ساتھ لے کر ۲۹ نومبر کی صبح کو ایک کاشتکار کریم کے مکان پر پہنچے جہاں فخرالدین سے ملنا طے ہو چکا تھا۔ کریم سرکاری جنگل کے قریب ہی رہتا تھا اور اُس کے ہاں میاں فخرالدین مع اپنے ایک اور دوست علی احمد اور اپنے نوکر علی بخش کے ہفتہ کی شام سے اِن کے منتظر تھے۔ دوست دوستوں سے ملے۔ شکار کے مشورے ہوئے۔ اتوار اور پیر کا دن (۲۹، ۳۰ نومبر) اِن لوگوں نے وہیں ندی میں مچھلی کا شکار کھیلنے اور جنگل کی راہ گھاٹ دیکھنے میں گزارے۔ منگل یکم دسمبر کو یہ پانچوں آدمی چار بندوقوں کے ساتھ (علی بخش ملازم فخرالدین کے پاس کوئی بندوق نہ تھی) بڑے شکار کو چلے۔ راستے میں اِن کو سوہن مہتر اپنے گاؤں کے قریب ملا جسے اِن لوگوں اپنے ساتھ شکار چلنے کو کہا اور وہ ساتھ ہو لیا۔ شیر محمد شکاری بھی اِسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ چند قدم چل کر وہ بھی مل گیا اور چونکہ وہ جنگل سے خوب واقف تھا فخرالدین نے اُسے بھی ساتھ لے لیا۔ شیر محمد کو مدت کے بعد شکار کا موقع ملا تھا، بلا تامل چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ اُس کا جنگل کا ہتھیار کلہاڑا اُس کے ہاتھ میں تھا۔ القصہ یہ لوگ چائے اور سگریٹ وغیرہ پینے کے بعد جنگل کا شکار کھیلنے کی غرض سے آگے بڑھے۔ سرکاری جنگل سے متصل زمینداری ٹکڑے میں یہ کھیلنے کے مجاز تھے لیکن شیر محمد نے بتایا کہ جنگل کے وافر شکار کی اُمید سرکاری جنگل ہی میں ہو سکتی تھی جس کی اُن کے پاس اجازت نہ تھی اور پکڑے جانے کا احتمال تھا۔ اِس پر تامل اور اختلاف رائے ہوا اور پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ خلیل اور علی احمد نے سرکاری جنگل میں داخل ہونے سے انکار کیا اور کہا کہ "...... بھائی ہم تو زمینداری جنگل ہی میں گھوم لیں گے۔ جو کچھ ملنا ہے یہیں مل جائے گا"۔ فخرالدین، اُن کا نوکر علی بخش، ابراہیم، سوہن مہتر اور شیر محمد سرکاری جنگل میں گئے۔ دونوں پارٹیوں میں طے ہوا تھا کہ شام کو دن چھپتے چھپتے سب کریم کاشتکار کے مکان پر واپس آملیں گے۔ چنانچہ خلیل اور علی احمد تو کچھ نہ ملنے پر دن تمام ہونے سے پہلے ہی پہلے مستقر کو لوٹ آئے۔ فخرالدین، ابراہیم اور علی بخش دیر سے واپس آئے۔ سوہن اور شیر محمد اُن کے ساتھ نہ تھے۔ جن کی نسبت ظاہر کیا گیا کہ وہ اپنے گاؤں کو واپس ہو گئے۔ یہ لوگ کچھ چپ چپ تھے۔ اگلے دن کے لئے پروگرام بنانے میں کسی سرگرمی کا اظہار نہیں کیا گیا اگرچہ بظاہر یہ طے تھا کہ کریم کے مکان پر کئی دن قیام کر کے شکار جاری رکھا جائے گا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد فخرالدین نے غیر متوقع طور پر فوراً واپسی کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کہا "...... میں بالکل بھول گیا تھا کل

میونسپل بورڈ کا الیکشن ہے اور میرے والد کینڈیڈیٹ کے اُمیدوار
ہیں۔ مجھے ضرور واپس جانا ہے تاکہ ووٹنگ کے کام میں اُن کا
ہاتھ بٹا سکوں۔ کھانا کھالو اور چلو......" خلیل نے بعد ازاں
ہم سے بیان دیا اُس سے واضح ہوا کہ یہ لوگ کھانا کھانے کے بعد فوراً
ایک بیل گاڑی پر واپس چل پڑے تھے۔ علی بخش بیل ہانک
رہا تھا۔ آدمی زیادہ ہونے کی وجہ سے دو تین آدمی باری باری
پیدل چلتے اور باقی گاڑی میں بیٹھتے تھے۔ پھر انہیں راستے میں
سوختہ کی گاڑیاں مل گئیں اور پیدل چلنے والے اُن میں بیٹھ گئے
اِس طرح اگلے دن ۱۱ بجے کے قریب یہ لوگ اپنے اپنے گھر واپس
پہنچے۔

اُدھر شیر محمد شکاری گاؤں میں واپس نہیں آیا۔ اُس کا
باپ نذر محمد ایک دن پہلے سے اپنے بیٹے کے مفقود الخبر ہو
جانے سے سخت پریشان تھا۔ کیونکہ شیر محمد نے شکار کو جاتے ہوئے
بھی اپنے باپ کو مطلع نہیں کیا تھا بلکہ وہ باہر ہی باہر ان لوگوں
کے ساتھ ہولیا تھا۔ شام کو گھر لوٹ کر نہ آنا دیہاتی زندگی میں
سخت پریشان کن سمجھا جاتا ہے۔ شیر محمد کے گھر سے غیر حاضر ہونے
کی اُس دن کوئی خاص وجہ بھی نہ تھی۔ اُسے نہ کہیں باہر کوئی کام
تھا نہ کہیں جانے کو اُس نے کہا تھا۔ اِس لئے نذر محمد اگلے دن
تشویش کے عالم میں اپنے چار پانچ ہمسایوں کو ساتھ لے کر صبح ہی
اُس کی تلاش میں نکلا۔ خیال ہوا کہ وہ جنگل لکڑی لینے نہ چلا گیا
ہو اور وہاں سے کسی وجہ سے رات کو نہ لوٹ سکا ہو۔ لیکن
جنگل میں بھی اُس کا کوئی سراغ نہ ملا اور جب شام کو یہ لوگ
اُس کی تلاش سے ناکام واپس آرہے تھے تو ایک آدمی نے
انہیں بتایا کہ ایک دن قبل میں نے سوہن مہتر اور شیر محمد کو کچھ
شکاریوں کے ساتھ جنگل کو جاتے دیکھا تھا اِس لئے سوہن سے
اُس کا پتہ مل سکے گا۔ یہ سُن کر فوراً نذر محمد اور اُس کے ساتھی
سوہن مہتر کے گھر پہنچے اور اُس سے استفسار احوال کیا۔ سوہن
کی حالت مشتبہ پائی گئی اور اُس کے جوابات غیر تسلی بخش۔ اُس
نے کہا "......ہاں شیر محمد اور میں کچھ شکاریوں کے ساتھ کل جنگل
گئے تو تھے لیکن اُس کے بعد میں نے اُسے نہیں دیکھا"

نذر محمد کا ماتھا ٹھنکا۔ گاؤں والے ایسے معاملات میں ایک
دوسرے کے قرائن اور ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے میں بہت
تیز ہوتے ہیں اور دیہات کی فضا کے موافق مشتبہ چیزوں
کا کھوج لگانے میں اُن کو خاص ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ رات زیادہ
جا چکی تھی اِس لئے اُس وقت تو نذر محمد نے خموشی سے واپس
چلا آنا ہی مناسب سمجھا لیکن اگلے دن صبح ہی اُس نے گاؤں
کے پچاس آدمیوں کو اکٹھا کر کے سوہن مہتر کے مکان پر گھیرا
ڈال دیا اور سخت احتجاج کیا کہ "......بتا میرا لڑکا کہاں ہے"

سوہن گھبرایا۔ اُس نے کہنا شروع کیا "......چودھری!
دیکھو میں سچ سچ بتائے دیتا ہوں۔ جنگل میں فخر الدین میاں کی
پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک پارٹی کے ساتھ میں
گیا تھا اور دوسری کے ساتھ شیر محمد۔ بعد ازاں پرالی گھاٹی
کی طرف سے ہمیں اُن کے ایک فائر کی آواز سنائی دی تھی۔
بہتر ہے کہ وہیں کہیں شیر محمد کی تلاش کرو" یہ آخری جملہ پُرمعنی
تھا۔ بعض لوگ جب کسی راز کو چھپانا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی
یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ اُن کے علم میں ہے وہ سچ سچ
بتانے کو تیار ہیں تو وہ عموماً اِسی قسم کا پیرایۂ بیان اختیار کرتے
ہیں۔ ورنہ فائر کی آواز کے ذکر کا یہاں کوئی موقع نہ تھا۔ ایسے
بیان میں الفاظ سے زیادہ اشارہ و کنایہ کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے،
جس میں یہ لوگ کافی مشاق ہوتے ہیں۔ غریب گاؤں والے

کسی واردات کی نسبت اپنے ذاتی علم کا اظہار کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں بلکہ وقوعہ کے دوران میں بھی وہ اپنی معلومات کو محدود ہی رکھنے کے قائل ہیں۔ اُن کا خیال ہوتا ہے کہ کسی واردات کی نسبت ذاتی علم کا اظہار کرنا اُس میں ناحق کھنچے کھنچے پھرنے کا باعث ہوتا ہے وہ عموماً صلح پسند اور جھگڑے سے دُور بھاگنے والے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دیہاتی کسی وقوعہ میں ازخود شرکت سے پہلو تہی کرتا ہے تاوقتیکہ اُس معاملے سے اُس کا کوئی گہرا تعلق نہ ہو۔ اُس کے نزدیک۔ اُس کی اپنی عافیت۔ اور ذاتی حفاظت ہر شئے پر مقدم ہے۔ یہ وہ طرزِ عمل ہے جو اُسے غلط قانون اور غلط تر طرزِ تفتیش نے سکھایا ہے۔ کیونکہ انگریزی عملداری میں پولیس نے عام طور پر اپنے مقدمات کی تکمیل میں جائز ناجائز کی پروا نہیں کی۔ اِس میں اصلاح کی ضرورت ہے اور جوں جوں ہماری پولیس زیادہ ہوشیار و تربیت یافتہ ہوتی جائے گی اور اُس کی فنّی لیاقت و مہارت بڑھتی جائیگی یہ شکایت خود بخود رفع ہو جائے گی۔

نذیر محمد شکاری کا باپ اپنے بیٹے کے ساتھی سے اِس قسم کا جواب پاکر سخت مخمصے میں مبتلا ہوگیا۔ سوہن نے مزید رُک رُک کر بیان کیا "...... جنگل سے واپسی پر ہم کریم کے مکان پر گئے تھے۔ وہیں شکاری لوگ مقیم تھے۔ اور وہیں دوسری پارٹی کے لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ شیر محمد اپنے گھر کو واپس چلا گیا ہے ......"

سوہن اپنے بیان سے نذر محمد پر اُس کے بیٹے کے متعلق اپنی ذاتی لاعلمی کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ تاہم وہ اُن کے ساتھ شیر محمد کی تلاش میں ہیروالی گھاٹی جانے کو تیار ہوگیا۔

جنگل میں پہنچ کر یہ لوگ کئی حصوں میں بٹ گئے اور جنگل کے ہر حصے کی تلاش شروع کی گئی۔ صبح نو بجے سے ڈھونڈتے ڈھونڈتے دوپہر کے بارہ بج گئے اور مسلسل تین گھنٹے تک سوہن برابر اِس طرح اُن کے ساتھ شریکِ جستجو رہا، گویا شیر محمد کی تلاش میں بہت کوشاں ہے۔ یہاں یہ چیز قابلِ غور ہے کہ دورانِ تلاش میں وہ ایک مخصوص سمت میں اشارہ کر کے بتاتا رہا کہ اِس طرف سے اُسے بندوق کے چلنے کی آواز سنائی دی تھی اور اسی طرف ڈھونڈنا بہتر ہوگا مگر خود اِدھر اُدھر منہ لاتا رہا گویا کوئی اور ہی شخص بتا چلا ہے اور معاملے سے اُس کے ذاتی علم کا راز افشا نہ ہو۔ اُس کے باربار اشارے اور اصرار پر کہ "یہیں ڈھونڈو۔ ہاں اِسی طرف ڈھونڈو ......" آخر ایک آدمی کو سوکھے پتوں پر خون کے کچھ چھینٹے نظر آئے اور کچھ بُو بھی محسوس ہوئی۔ مزید تلاش پر وہیں نیچے کھالے میں پتوں کا ڈھیر ہٹانے پر ایک سربُریدہ لاش برآمد ہوئی۔ لاش کو معمولی طریقے سے پتوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا غالباً اِس خیال سے کہ جلد جنگل کے جانور گیدڑ وغیرہ متوجہ ہو کر بہ آسانی اُس تک پہنچ سکیں اور اُسے نوچ کھسوٹ کر ناقابلِ شناخت بنا دیں مزید احتیاط کے طور پر سر پہلے ہی قطع کر لیا گیا تھا جو شناخت کا خاص ذریعہ ہوتا ہے۔ لیکن بدقسمت نذر محمد کو اپنے بیٹے کی لاش پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ اُس کے ٹوٹے ہاتھ، اُس کے کوٹ، کُرتے اور دھوتی سے جو لاش پر موجود تھے بیک نظر پہچان گیا کہ یہ میرے مظلوم بیٹے کی لاش ہے!

جنگل جہاں لاش پائی گئی تھی کریم کے مکان سے چند فرلانگ سے زیادہ دُور نہ تھا۔ مرنے والے کے دونوں ہاتھ

زیدی

اُس کی پگڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ اُس کے پیٹ پر گولی کا نشان اور اُس کے ساتھ اُس کی انتڑیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ نذر محمد اپنے بیٹے کی لاش کو اِس حالت میں پاکر درد و غم سے بے حال ہو گیا اور کمر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہمدرد ساتھی رنج و افسوس سے محوِ حیرت کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور سوہن جھتر کی حالت سے بھی کچھ ایسا ہی ظاہر ہوا کہ گویا یہ حادثہ اسی وقت اُس کے علم میں آیا ہے۔ سب نے مل کر نذر محمد کو وہاں سے اُٹھایا۔ اور لاش کو بدستور وہیں رہنے دیا۔ گاؤں کا چوکیدار اور ایک اور ہمسایہ اُسے ساتھ لے کر تھانے میں رپٹ لکھوانے چلے جو اُن کے گاؤں سے تین میل دُور تھا۔ شام کے چار بجے تک یہ لوگ تھانے پہنچے۔ جمعرات کا دن تھا۔ نذر محمد نے رپورٹ لکھوائی کہ منگل کے دن شیخ فخر الدین اپنے چند دوستوں کو لے کر ہمارے گاؤں کی طرف شکار کھیلنے آئے اور سوہن جھتر نیز میرے لڑکے شیر محمد کو اپنے ساتھ شکار میں لے گئے۔ قریب کے جنگل میں اُنہوں نے شیر محمد کو بندوق سے مار ڈالا اور اُس کا سر کاٹ لیا۔ رپورٹ میں سوہن جھتر پر بھی شبہہ کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ شریکِ جرم معلوم ہوتا ہے اور اُسے سب کچھ معلوم ہے۔ وہی ہم لوگوں کو جنگل میں اُس مقام تک لے گیا جہاں لاش چھپائی گئی تھی۔ اِس کے علاوہ شیر محمد کی گمشدگی سے لے کر اُس کی لاش کے برآمد ہونے تک کے کل واقعات بھی لکھوائے گئے۔ سوہن نے اس واقعہ کے متعلق جو کچھ کہا اُس کی تفصیل بھی درج کرائی گئی۔

نور احمد سب انسپکٹر انچارج اُس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ رات کو آٹھ بجے وہ لوٹ کر آئے تو ہیڈ محرر نے انہیں رپورٹ پڑھ کر سنائی اور وہ فوراً تحقیقات کو روانہ ہوگئے۔ گاؤں میں پہنچ کر سرسری تفتیش کے بعد انہوں نے ایک لالٹین لی اور چند آدمیوں کو ساتھ لے کر جائے وقوع کی طرف جنگل کو چلے۔ رات کے تین بج گئے تھے جنگل میں انہیں شیر محمد کا باپ نذر محمد اور اُس کا ایک چچا لاش کی نگرانی کرتے ہوئے موجود ملے۔ تھانیدار صاحب نے لاش کو بغور دیکھا اور موقع کا معائنہ کیا۔ لاش کا سر غائب تھا۔ جہاں لاش پڑی تھی وہاں گردن کے قریب کافی خون زمین میں جذب پایا گیا جس سے ثابت ہوا کہ سر وہیں کاٹا گیا تھا۔ لاش سے تقریباً ۳۰ قدم کے فاصلے پر ایک اور جگہ بہت سا خون گرا ہوا ملا۔ اور اُس سے متصل ہی گھاس کی ڈھانک کے قریب ایک اُونچے درخت کے تنے پر زمین سے ڈیڑھ فٹ کی اونچائی پر ایک گولی لگنے کا نشان پایا گیا لیکن گولی اُس میں نہ تھی۔ درخت کی چھال اور لکڑی کے ریشے تازہ ٹوٹے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ چیزیں ضبطِ تحریر میں لانے کے بعد تھانیدار نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دیا اور اُن آدمیوں کے بیان لئے جنہوں نے منگل کے دن شیر محمد اور سوہن کو شکاریوں کے ساتھ جاتے دیکھا تھا سوہن حراست میں لے لیا گیا۔ دوسرا ضروری کام سب انسپکٹر کے لئے فخر الدین کے گھر جا کر اُسے جلد از جلد گرفتار کرنا تھا۔ فخر الدین اپنے گھر سے غائب پائے گئے۔ اُن کا نوکر علی بخش سب انسپکٹر کے ہاتھ آیا جسے انہوں نے گرفتار کر لیا۔ ۵ ستمبر کو تھانیدار نے علی بخش سے مجسٹریٹ کے سامنے بیان دلوا دیا جس میں اُس نے بڑی حد تک اقبالِ جرم کیا۔ اگرچہ بعد ازاں وہ اس سے پھر بھی گیا تھا۔ اِس سلسلے میں یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ سب انسپکٹر نے علی بخش کی گرفتاری سے قبل سوہن جھتر کا بیان

قلمبند کر لیا تھا جس سے علی بخش کے بیان کی مطابقت ہوتی تھی۔

ابراہیم کی گرفتاری ۵ دسمبر کو عمل میں آئی اور تلاشی پر اُس کے گھر سے ایک کوٹ بھی برآمد ہوا جس پر کچھ خون کے دھبے تھے۔ یہ کوٹ سب انسپکٹر نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

۵ دسمبر کو لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ رپورٹ یہ تھی کہ گولی پُشت کی جانب سے داخل ہو کر بائیں پسلی کو توڑتی ہوئی اور جگر میں چھید کرتی ہوئی پیٹ سے پار ہوئی ہے۔ چونکہ مرنے والا اِس سے بھی جانبر نہ ہو سکتا تھا۔ اِس لئے سر قلم کرنے کا مطلب شناخت میں دقت پیدا کرنے کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ رگوں کی حالت سے خون کا اخراج ظاہر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سر جدا کرتے وقت تک یہ آدمی زندہ تھا۔

۲۴ دسمبر کو ابراہیم اور علی بخش پر قتل کا مقدمہ چلایا گیا فخر الدین فرار ہو گئے اور کوئی سراغ اُن کا نہ مل سکا۔ سوہن چہتر مقدمے میں خاص گواہ تھا۔ معاملے کی نوعیت سے اُس کے بیان کی تصدیق بھی ہوتی تھی۔ اُس نے بتایا کہ "میں میاں فخر الدین کو مدت سے جانتا اور شکار میں اکثر اُن کے ساتھ رہا ہوں۔ وہ ایک معزز شیخ زمیندار ہیں۔ شکار میں ساتھ چلنے کے لئے وہ مجھے مزدوری دیتے رہے ہیں مگر اس موقع پر دو روٹیوں کے سوا جو کریم کے مکان پر مجھے دی گئی تھیں اور کچھ نہیں ملا......"

شیر محمد کے باپ سے سوہن کے بیان کا اختلاف اور اُس کی وجوہ بھی صاف ظاہر ہیں۔ فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ معاملے میں سوہن کا رویہ بہت صاف رہا ہے اور اس کا بیان سچا معلوم ہوتا ہے اور کوئی ایسی وجہ دشمنی بھی سوہن کی ابراہیم اور علی بخش سے ثابت نہیں ہوتی جس کی بنا پر وہ اُن کے خلاف بیان دے رہا ہو اور اُنہیں پھنسانے کی کوشش کر رہا ہو۔

اُس نے بیان دیا:...... سرکاری جنگل میں کچھ دور ہانکا کرنے کے بعد ہمیں ایک جھانک رجیتل کا نر ملا۔ میاں فخر الدین نے اُس پر گولی چلائی لیکن جھانک صاف نکل گیا، اور گولی اُس کے بجائے شیر محمد پر پڑی جس نے جھانک کو ہانکا کر باہر نکالا تھا۔ شیر محمد ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ ہم دوڑ کر اُس کے پاس گئے۔ وہ پچیس تیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ گولی اُس کی پیٹھ میں لگی تھی۔ میاں فخر الدین، ابراہیم اور علی بخش مجھ سے علیحدہ مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ ابراہیم نے کہا:۔ اِسے ختم کر دینا ہی بہتر ہے، ورنہ اس کے چلانے کی آواز سُن کر کوئی نہ کوئی یہاں آ جائے گا اور ہم سب گرفتار ہو جائیں گے۔ تینوں شیر محمد کو اُٹھا کر نالے پرے لے گئے جو وہاں سے بیس پچیس قدم کے فاصلے پر ہے۔ میں نالے کے باہر چُپ چاپ کھڑا رہا۔ شیر محمد چیخیں مارنے لگا تو اِن لوگوں نے اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ ابراہیم نے شیر محمد کے دونوں ہاتھ پکڑ کر نیچے دبائے رکھے۔ یہ نالہ بہت تنگ اور گھنے جنگل میں واقع ہے۔ اس کی چوڑائی دو گز ہوگی۔ سوکھے پتے اُس میں بھرے رہتے ہیں۔ جب شیر محمد کے منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا تو وہ لاتیں مارنے لگا۔ اِس پر علی بخش نے اُس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں اور فخر الدین نے اپنے بڑے شکاری چاقو سے اُس کی گردن قطع کر کے سر کو ٹاٹ کی اس بوری میں لپیٹ لیا جو شکار کے لئے علی بخش ساتھ لایا تھا۔ دھڑ کو وہیں پتے کُرید کر نالے میں لٹا دیا اور پتوں سے خوب ڈھانپ دیا۔ اِس کے بعد میاں فخر الدین اور ابراہیم میرے پاس آئے اور کہنے لگے"...... سوہن اگر اپنی جان کی خیر

چاہتے ہو تو اِس بات کا کسی سے رتّی بھر ذکر نہ آئے اَور تا زندگی کسی سے یہ راز نہ کہنا۔ ورنہ تمہارا بھی یہی انجام ہوگا۔ سمجھے ؟" میں نے ڈر کے مارے ہاتھ جوڑ کر عرض کی، حضور میری طرف سے اطمینان رکھیئے، میں جیتے جی کسی سے ایک لفظ نہ کہونگا۔ اِس کے بعد علی بخش نے ایک ہاتھ میں شیر محمد کے جُوتے اُٹھائے اَور دوسرے ہاتھ میں اُس کا کُلھاڑا لیا۔ فخر الدین میاں نے اُس کا سر اَور اپنی بندوق سنبھالی اَور ہم چلے شام ہو چکی تھی، تاریکی غالب آ رہی تھی۔ جب ہم جنگل سے باہر نکلے تو مجھ سے ابراہیم نے کہا ہمیں کریم کے گھر کے راستے پر ڈال دے اَور تو اپنے گھر جا۔ میں اُنہیں تھوڑی دُور راستہ بتانے کے بعد اپنے گھر کو مُڑ گیا۔ چلتے چلتے اِن لوگوں نے مجھ سے پھر کہا، ہم چار دن تک کریم ہی کے مکان پر ٹھہریں گے اگر تم نے ذرا بھی اِس بات کا کسی سے ذکر کیا تو تم جانوگے میں نے کہا نہیں سرکار ! ہرگز نہیں۔ جمعرات کے دن شیر محمد کا باپ جب میرے پاس آیا تو میں اُس کے اَور گاؤں کے دیگر آدمیوں کے ساتھ شیر محمد کو ڈھونڈنے جنگل جانے پر راضی ہو گیا۔ اَور چونکہ مجھے جگہ بخوبی معلوم تھی میں نے اپنی زبان سے کچھ کہے بغیر شیر محمد کی لاش موقع واردات سے برآمد کروا دی۔ مجھ پر اُس وقت تک اُن لوگوں کا خوف اِس قدر غالب تھا کہ مجھے خود افشائے راز کی جرأت نہیں ہوئی ۔"

واقعاتی نوعیت کے لحاظ سے اِس معاملے کے متعلق یہی کہا جانے لگا کہ اس کی ابتدا ایک شدید و ناگہانی آفت سے ہوئی۔ فخر الدین کو شکار کی دُھن میں خیال نہ رہا کہ غریب شیر محمد کدھر ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ ایسی احمقانہ غفلت کا مواخذہ ضروری ہے اِس لئے کہ جو لوگ بندوقیں لے کر تفریح کرنے نکلتے ہیں اُن کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں اَور اُنہیں نہایت احتیاط و ہوشیاری کے ساتھ بندوقوں کا استعمال کرنا چاہیئے۔ یقیناً شیر محمد جھاڑیوں کو پیٹتا ہوا آگے آگے چل رہا ہوگا اَور جھانک کے اُٹھنے پر فخر الدین کے فائر کرنے میں ایک لمحے کے تامل نے جانور کو ایک جست آگے اَور اُس کا پیچھا کرنے والے شیر محمد کو دو قدم اُدھر رکھ دیا ہوگا۔ جس سے ایک آفتِ ناگہانی کی طرح گولی شیر محمد شکاری پر سر ہو گئی ہوگی۔ دُنیا میں شادی و غم بعض اوقات کس قدر نزدیک سے گزر جاتے ہیں۔ ایک لمحہ پھُرتی سے فائر کرنے پر شکاریوں کو اُن کا مرغوب ترین "جھانک" مل جاتا اَور ایک پل کے توقف سے جانور کے بجائے آدمی ڈھیر ہو گیا۔ لیکن کچھ بھی ہُوا ہو، فخر الدین اَور ابراہیم معزز و تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اُن میں یہ اخلاقی جرأت ہونی چاہیئے تھی کہ وہ مہذّب اَور پابندِ قانون شہریوں کی طرح اپنی غلطی کا کھُلے دل اعتراف کرتے ہوئے عدالت سے معذرت خواہ ہوتے۔ اِس سے قانون کی نظر میں اُن کا جُرم بہت ہلکا ہو جاتا۔ عام انسانی شرافت و ہمدردی کا اِقتضا تھا کہ وہ مصیبت زدہ شیر محمد کو اپنی حماقت اَور فاش غلطی کا نشانہ بنانے کے بعد اُس کی جانبری کے لئے اُسے طبّی امداد بہم پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے نہ کہ بیہودہ طور پر اپنے جرم کو چھپانے کے لئے اُس کا سر کاٹ کر ایک دوسرے بڑے سنگین جرم کا ارتکاب کرتے اَور قانون کے نزدیک قتلِ عمد جیسے شدید جرم کے مرتکب ہوتے۔ وہ بہت آسانی سے سوہن یا علی بخش کو بھیج کر گاؤں سے ایک بیل گاڑی منگا کر زخمی شیر محمد کو قریب کے ہسپتال میں بھیج سکتے تھے۔ اُس کے غمزدہ بوڑھے باپ کی تشفی اَور کچھ رقم کے ساتھ اُس کی دل دہی کر سکتے تھے، اَور قانون سے

حالات و واقعات کی روشنی میں رحم و عفو کے طالب ہو سکتے تھے۔ یقیناً اُس صورت میں اُن کو بہت کم سزا دی جاتی۔ لیکن اُنہوں نے غلط راستہ اختیار کیا۔

علی بخش نے ۷ دسمبر کو جو اقبالی بیان سرکاری گواہ بن کر گلو خلاصی ہو جانے کی امید میں مجسٹریٹ کے روبرو دیا تھا، ۱۶ دسمبر کو وہ اُس سے بالکل منحرف ہو گیا۔ اُس نے عدالت میں بیان کیا کہ مجھے تھانیدار صاحب نے بہت مارا تھا اور ایک ٹھوکر میرے منہ پر ایسی ماری جس سے میرا ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔ پھر تھانیدار نے مجھے بلا کر سمجھایا کہ اگر اقبال کر لو گے تو تمہیں بچا لوں گا۔ اِس لئے میں نے اُن کا بتایا ہوا اقبالی بیان مجسٹریٹ کو دے دیا تھا ورنہ وہ سراسر غلط ہے۔ میں صحیح بیان خدا کو حاضر و ناظر جان کر آج دیتا ہوں کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ شیر محمد فخر الدین میاں کی گولی سے مرا تھا... مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ واقعی وہ کسی کی گولی سے مارا گیا ہے۔ میں جنگل میں شیر محمد یا فخر الدین میاں کے ساتھ نہیں تھا.... میں نے شیر محمد کی گردن نہیں کاٹی، نہ کسی کو اُس کی گردن کاٹتے دیکھا...... میں نے اُس کا گلا کاٹنے میں اُس کی ٹانگیں نہیں پکڑیں...... میری موجودگی میں کسی نے اُس کا گلا نہیں کاٹا...... مجھے معلوم ہی نہیں وہ کب اور کیونکر مرا۔ میں نے شیر محمد کا جوتا یا اُس کا کلہاڑا نہیں اُٹھایا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کیوں مجھے شیر محمد کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اُس دن میں، ابراہیم، خلیل اللہ اور علی احمد فخر الدین میاں کے ساتھ شکار کو ضرور گئے تھے۔ فخر الدین میاں نے راستے میں کھیت پر سے سوہن مہتر کو بلوا لیا تھا۔ سوہن نے میاں فخر الدین سے شیر محمد کو بھی ساتھ لے چلنے کو کہا۔ سوہن ہی اُسے بلا کر لایا۔ پھر جب ہم جنگل میں پہنچے تو میں خلیل اللہ اور علی احمد ایک طرف کو گئے اور ابراہیم، سوہن مہتر اور شیر محمد دوسری طرف گئے۔ ہم شام کو کریم کے مکان پر ان لوگوں سے پہلے واپس آ گئے تھے۔ میں نے کوئی فائر کی آواز نہیں سُنی۔ میاں فخر الدین کے ساتھ سوہن مہتر یا شیر محمد کریم کے مکان پر واپس نہیں آئے...... وغیرہ۔

ابراہیم نے مندرجہ ذیل بیان عدالت میں دیا جو اُس کے پہلے بیان کی طرح تھا: "...... میں فخر الدین کو جانتا ہوں۔ میں اُن کے ساتھ اُس دن شکار کو گیا تھا۔ میں پہلے سے شیر محمد کو نہیں جانتا تھا...... اب جانتا ہوں کہ اُس دن جو ایک اور شخص گاؤں سے ہمارے ساتھ گیا تھا اُس کا نام شیر محمد تھا...... مجھے معلوم نہیں آیا وہ فخر الدین کے ہاتھ سے مارا گیا..... اُس دن میرے پاؤں میں تنگ جوتے کی وجہ سے تکلیف تھی جس کے باعث میں فخر الدین سے بہت پیچھے رہ گیا تھا...... میں نہیں کہہ سکتا کہ واقعی شیر محمد گولی سے مارا گیا تھا یا نہیں..... میں نے شیر محمد کی گردن ہرگز نہیں کاٹی۔ گردن کٹتے وقت اُس کے ہاتھ پکڑے.... میرے سامنے کسی نے اُس کا گلا نہیں کاٹا اور مجھے اُس کے کسی طرح بھی مارے جانے کا علم نہیں۔ سوہن مہتر کو معلوم ہوگا۔ وہ شیخ فخر الدین کے ساتھ تھا۔ وہ جانتا ہوگا۔ اِسی لئے وہ مجھ کو موردِ الزام بنانا چاہتا ہے...... مجھے اور کچھ نہیں کہنا..... میں بے قصور ہوں......"

اِس طرح دونوں ملزمین نے اپنی اپنی برأت کے لئے جُرم کو تنہا روپوش فخر الدین کے سر منڈھنے اور سوہن کو بڑی ترکیب کے ساتھ اُس کا شریک کار ثابت کرنے کی کوشش

کی کہ وہی بشیر محمد کو بلا کر لایا تھا اور وہی فخر الدین کے ساتھ آسے لے کر ایک طرف جنگل میں گیا اور وہاں پہنچ کر اُسے کسی نہ کسی طرح فخر الدین کے ہاتھ سے مروا دیا!

لیکن فاضل جج نے اس سے اپنی رائے کو غلط طور پر متاثر نہیں ہونے دیا۔ اُس نے اپنے منصفانہ فیصلے میں ابراہیم اور علی بخش کو صحیح معنے میں مجرم گردانا ہے۔ ابراہیم کے لئے اُنہوں نے اس کی وحشیانہ ترغیب و اعانتِ جرم کی پاداش میں سزائے موت تجویز کی اور علی بخش کو مفرور فخر الدین کا ملازم ہونے کی حیثیت سے زیادہ تر اپنے آقا کے زیرِ فرمان عمل پیرا پاتے ہوئے حبسِ دوام کی سزا دی۔ سوہن مہتر اپنے صاف و غیر متزلزل بیان کی بنا پر بے قصور قرار دیا گیا اور بری۔

فخر الدین اگرچہ راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن انہیں "خونی" قرار دے کر اُن کی تمام جائداد بحق حکومت ضبط کر لی گئی۔ وہ اگر قانون کے ہاتھ نہ آئے تو بھی عمر بھر رُوپوشی کی زندگی گزارتے پھریں گے۔ یہ زندگی کوئی زندگی نہیں۔ خود اُن کا ضمیر اُن کے کرپنے فعل پر اُنہیں ملامت کرتا رہیگا اور وہ خود اس طرح کی زندگی سے اُکتا کر کبھی نہ کبھی اپنے گھر کو واپس چلے آئینگے۔ انسان کی آخر کار اپنے وطنِ عزیز کو لوٹ آنے نیز اپنے آبائی گھر اور اپنے عزیز و اقارب کے حلقے میں جان دینے کی خواہش اس قدر قوی ہوتی ہے کہ لوگ سالہا سال کے بعد واپس آتے ہیں اور اکثر بارہ بارہ، پندرہ پندرہ برس گزر نے پر قاتلوں پر خون کے مقدمے چلائے گئے ہیں اور انہیں پھانسیاں دی گئی ہیں۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ منہ چھپائے پھرنے کی زندگی سے تنگ آ کر مدتوں بعد قاتلوں نے اپنے تئیں خود قانون کے سپرد کر دیا اور سزائے موت قبول کرنا پسند کیا ہے۔

سر سیسل والش

قتل

(شریمد بھگود گیتا)

ارجن :-

"میں اپنوں کو قتل کرنا گوارا نہیں کروں گا۔
"خواہ میں خود اُن کے ہاتھوں قتل ہو جاؤں
"ترلوک کے راج کا لالچ بھی مجھے اِس پر آمادہ نہیں کر سکتا۔
"اِس دھرتی کے تاج و تخت کا تو کیا ذکر!
"او بھگوان! دھرت راشٹر کے بیٹوں، اپنے رشتہ داروں
کو قتل کر چکنے کے بعد

"ہمارے لئے کونسی خوشی باقی ہو گی!
"وہ بُرے سہی لیکن اُن کو تباہ کر چکنے کے بعد
"ہم خود گنہگار ہو جائیں گے
"ہمیں دھرت راشٹر کے بیٹوں، اپنے رشتہ داروں
کا قتل زیبا نہیں
"او مادھو! اپنے رشتہ داروں کو قتل کرنے کے بعد
"کیا ہم پھر کبھی خوش ہو سکیں گے؟"

دو غزلیں

عبد المجید حیرت

کچھ نقطۂ نگاہ، ہمارا ہی اَور تھا
ورنہ کسی نظر کا اشارا ہی اَور تھا

شمس و قمر تو آج بھی ہیں جلوہ گر مگر
جو چھپ گیا وہ آنکھ کا تارا[۱] ہی اَور تھا

یا بات بات پر ہیں، زباں پر شکایتیں
یا صبر و ضبط کا ہمیں، یارا ہی اَور تھا

جیتا، مریضِ ہجر، دواؤں سے تا بہ کے
اُس کی تو زندگی کا سہارا ہی اَور تھا

پہلے پہل یہ کشتیِ اُمّید و آرزو
ٹکرائی تھی جہاں وہ کنارا ہی اَور تھا

حیرت، تو آج بھی ہے وہی بندۂ وفا
اے دوستو، خیال، تمہارا ہی اَور تھا

سہام

بیکلی کو قرار مان گئے
اے غمِ زیست ہار مان گئے

آپ کے ساتھ ہی بہار گئی
آپ کا اختیار مان گئے

نہ وہ آئے نہ تجھ کو چین آیا
اے دلِ بیقرار مان گئے

اُس نے جو بھی کہا مرے حق میں
لوگ بے اختیار مان گئے

زندگی تیرے ہاتھ ہے ساقی!
مے ملی میگسار مان گئے

[۱] ابنِ حیرت، عمر ۶ سال، وفات ستمبر ۱۹۲۲ء۔

انور جلال

یوں بھی ہوتا ہے

دنیا میں سب سے بڑی لعنت ناکام فن کار ہونا ہے۔ آپ کسی ایسے مصوّر کو جانتے ہوں تو اُس سے ملئے، پھر دیکھئے وہ کیا کہتا ہے۔ اُس کا نگارخانہ اُس کی ناکامیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اُسے اتنی ہمت بھی نہیں ہوتی کہ وہ اِن شاہکاروں کو چاک کر دے جو مقبول نہیں ہوتے اور اُسے اِتنی ہمت بھی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی ناکامی کے ان مادّی مظاہر سے پناہ ڈھونڈنے کے لئے کہیں اور ایک آدھ کمرہ رہنے کے لئے کرائے پر لے لے۔

نجم چاہے کچھ بھی نہ ہو ناکام مصوّر ضرور تھا۔ اُس کا نام سُن کر لوگ مصوّری ہی سے متنفر ہو جاتے تھے۔ اُس کی تصاویر کا کوئی خریدار نہ تھا۔ تاہم اُس کی تصویروں کا بھی دُنیا بھر میں ایک مدّاح موجود تھا۔ نجم کے دوست اُس کو نجمی کہہ کر پکارتے تھے اور اُس کی تصویروں کے ذکر سے یوں بچتے تھے جیسے وہ کوئی ناگوار موضوع ہو، وہ اُس سے عموماً گھُڑدوڑ، اچھے کپڑوں، اچھے کھانوں کی باتیں کرتے تھے۔ نجم جس ایک فرد کا ممدوح تھا وہ اُس کی بیوی تھی۔ نجم اس کے متعلق اکثر کہا کرتا تھا کہ ثریا اس کی زندگی ہے۔ اور میں چونکہ نجم کو اچھی طرح جانتا ہوں، مجھے اِس بات کا یقین ہے، ثریا میں سوائے اس کے کہ وہ قبول صورت تھی اور کوئی نمایاں خوبی نہ تھی۔ اُس کو دیکھ کر البتہ ایک اثر ضرور ہوتا تھا کہ قوی ارادے کی مالک ہے اور اگر وہ کسی کام کے متعلق کوئی فیصلہ کر لے گی تو اُسے انجام تک ضرور پہنچائیگی۔

نجم کی خوش قسمتی سے ثریا نے اُسے کامیاب بنانے کا مصمّم ارادہ کر لیا تھا۔ نجم کی آمدنی کا ذریعہ کچھ موروثی زمینیں تھیں جن سے ہر چھ مہینے بعد کچھ آمدنی ہو جاتی تھی اور اگر یہ دونوں میاں بیوی زندگی کو نظریاتی طور پر نہ گزارتے تو اِس آمدنی میں اُن کی گزران مشکل تو کیا بالکل ناممکن تھی۔ ثریا کا خیال تھا کہ بچے کی متوقع ولادت مصارف میں اضافہ کر دے گی۔ اُسے قوی اُمید تھی کہ لڑکی ہوگی اور اِسی تصوّر کے زیرِ اثر اُس نے بچی کا نام ریحانہ بھی تجویز کر لیا تھا، اور وہ اکثر اُسے ریحانہ کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ثریا تھی ہی کچھ اِس قسم کی عورت!

ستمبر کی ایک خوشگوار صبح کو اُس نے نجم کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "سُنو تو"! اور نجم نے اپنے منہ سے سگریٹ نکالا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ثریا نے کہا ——— "اگر تم نے اپنی کچھ تصاویر نہ بیچیں تو ہمیں بھکاری بننا پڑے گا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیئے۔ جنگ کے شروع سے تم تصاویر بنا رہے ہو اور اب تک تم نے ایک تصویر بھی تو نہیں بیچی"۔

نجم نے بات سُن کر افسردہ لہجے میں کہا ——— "تم جانتی ہو ——— اِس ذکر سے میری رُوح زخمی ہوتی ہے"۔

ثریا نے متانت سے اپنی گفتگو جاری رکھی: "لیکن پیارے نجمی! دوسرے مصوّر اپنی تصویریں بیچتے ہیں حالانکہ اُنکی تصویریں تمہاری تصویروں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوتیں"۔

نجم کا چہرہ کھِل گیا مگر فوراً ہی اُس پر افسردگی چھا گئی ——— وہ سرگوشی کے لہجے میں بولا ——— "بات یہ ہے کہ اُن کا پروپیگنڈا خوب ہوتا ہے اور آجکل دُنیا پروپیگنڈا ہی کے سہارے قائم ہے۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی پائپ سے ایک لمبا کش لیا

اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا جیسے اُسے اطمینان ہے کہ اُس نے جو بات کہی تھی کہہ دی ہے۔"

ثریا سوچ رہی تھی اور نہ جانے کیا سوچتے سوچتے اُس نے پروپیگنڈا کے لفظ کو کئی بار دُہرایا۔ نجم نے دلچسپی سے اُس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "کچھ سوچ رہی ہو، دیکھیں کیسی تجویز ہوتی ہے۔"

ثریا نے کہا "میں سوچ رہی ہوں کہ تمہارا ابھی پروپیگنڈا ہو۔ اِس کے لئے ہمیں کوئی فریب تراشنا چاہئے۔" یہ کہہ کر وہ پھر سوچنے لگی۔

کچھ دیر تو نجم اطمینان سے بیٹھا رہا، پھر اُس نے پہلو بدلنے شروع کئے اور رفتہ رفتہ اُس کی حالت غیر ہو گئی اور اُس نے گڑگڑاتے ہوئے ثریا سے کہا —— "بس بھئی ہو چکی —— تمہاری آنکھوں کی چمک کہہ رہی ہے کہ تم سوچ کر کچھ طے کر چکی ہو ——"

ثریا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے چپ رہنے کے لئے کہا۔ اور پھر بولی۔ —— "تمہیں ڈبو دیا جائے ——؟!"

نجم نے قریب چیختے ہوئے کہا "کیا؟"

"یعنی تمہیں ڈبو دیا جائے اور پھر ڈوبتے ہوئے لیا جائے۔"

نجم نے عمر بھر میں پہلی دفعہ ثریا سے اختلاف کرتے ہوئے کہا —— "میں اس کے لئے قطعاً تیار نہیں ہوں۔"

ثریا نے اُسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں یہ کرنا ہی پڑے گا —— میرے لئے پیارے! تمھی ریجانہ کے لئے! ہماری یہ تجویز ضرور کامیاب ہو گی، تم دریا میں کود پڑنا اور میں مدد کے لئے چلاؤں گی، کوئی نہ کوئی تمہیں بچانے کے لئے تیرے گا اور تمہیں نکال کر لے آئے گا۔

نجم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا —— "فرض کرو کہ میں نہ بچا پھر ——؟"

ثریا نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "بچ جاؤ گے ہر شخص بچ جاتا ہے، اگر وہ جان بوجھ کر ڈوبنا نہ چاہے، اور پھر تم اچھے تیراک بھی تو ہو۔ اِس لئے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے اور جب تمہیں کنارے پر پہنچا دیا جائے گا تو اخباروں کے نمائندے تمہارے گرد جمع ہو جائیں گے، اُن سے میں نمٹ لوں گی۔ تم اُن جلی عنوانات کا خیال تو کرو جو دوسرے دن اخباروں میں نظر آئیں گے۔ مثلاً"

مصوّر کو دریائے راوی سے ڈوبتے ہوئے بچا لیا گیا

اُس کی بیوی کی دُکھ بھری داستان

نجم نے پوچھا —— "اِس کا فائدہ؟"

"پروپیگنڈا! تم خود ہی تو کہتے ہو کہ تمہیں پروپیگنڈا کی ضرورت ہے، اور پھر اُس دن تمہیں اپنا پُرانا سا سوٹ پہننا ہو گا۔"

نجم نے یہ سمجھتے ہوئے کہ احتجاج بے اثر ہے، مکمل طور پر خاموشی اختیار کر لی۔

اور پھر ایک سہانی شام کو پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس نجم دریائے راوی میں کود پڑا، وہ دن گرم تھا۔ میاں بیوی نے ہر بات پہلے ہی طے کر رکھی تھی بلکہ وہ ریہرسل کر چکے تھے اور کوئی شخص بھی جس نے انہیں پل پر کھڑے دیکھا ہو اور اُن کی گفتگو سنی ہو اِس بات کا اندازہ کر سکتا تھا کہ اُنہوں نے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ پل سے نیچے جھانکتے ہوئے نجم نے کہا "پانی بہت نیچا ہے۔"

ثریا نے جواب دیا۔ —— "دیکھو تم جی چھوڑ رہے ہو۔"

انور جلال

نجم نے کہا "ہرگز نہیں"۔ اور فوراً دریا میں کود گیا۔ ثریا کی چیخیں قدرتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لئے خیال آیا کہ کاش اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنایا جاتا۔ لیکن نجم اچھا تیراک تھا اور اُسے پانی میں دیکھ کر اُسے اطمینان ہو گیا۔" اب ایک دم اُسے اپنا پارٹ یاد آ گیا، اور پُل کا سہارا لیتے ہوئے اُس نے مدد کے لئے چلّانا شروع کیا۔ اُس کی چیخیں بیکار تھیں۔ ہجوم پہلے ہی کافی ہو چکا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ اُس نے مجمع کو کنکھیوں سے دیکھا اور اُسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ لوگوں کی دلچسپی کچھ زیادہ نہ تھی۔ ایک بُڑھیا اُس کے قریب کھڑی تھی جس نے رحم سے نجم کو دیکھتے ہوئے کہا ——— "بیچارہ! اسے ہم پھر کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔" اور لوگوں نے بھی پُل کے کھمبوں پر چڑھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ مگر ثریا کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ مجمع میں کوئی شخص بھی نجم کو بچانے کے لئے کوشاں نظر نہ آتا تھا۔ وہ مُڑی اور مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے چلّائی "کیا تم میں سے کوئی مرد نہیں ہے؟ کوئی اس ڈوبتے ہوئے کو نہیں بچا سکتا؟"

برابر سے ایک عورت نے مایوسانہ لہجے میں کہا "بے کار چیخ رہی ہو۔ تم مردوں کی بات کرتی ہو۔ یہ مرد ہیں؟ کاش میں مرد ہوتی!" مجمع میں کوئی ہنسا، ثریا رو دی، ہزاروں خیال اُس کے ذہن میں آئے، اور اُس وقت اُس کی اُمیدوں کے رنگ محل آن کی آن میں مسمار ہو گئے۔ نجم کیا کہے گا؟ اگر تجویز ناکام رہی تو وہ بُرا تو نہ مانے گا، وہ اپنے کپڑے بدل لیگا، مسکرائیگا، اور سگریٹ کے بجائے پائپ سُلگا لے گا اور یہ اُس کی خفگی سے زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ اور یہ مجمع! کاش وہ بھاگ سکتی۔ اتنے میں اُسے ایک سپاہی نظر آیا اور اُس کے حواس اور جرأت دونوں نے جواب دے دیا۔ اب کیا ہوگا؟ اتنے میں قریب سے کسی نے اِس ہجوم کا سبب دریافت کیا اور ایک لمبے ورزشی جسم اور خوبصورت چہرے والا آدمی ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھا۔ اور ثریا کے قریب عین اُس وقت پہنچا جب نجم پانی کی سطح پر نظر آ رہا تھا۔ اجنبی نے ایک نظر میں تمام بات بھانپ لیا، نیچے پانی میں دیکھا اور پانی میں کود گیا۔ بُڑھیا نے نوجوان کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "دیکھا! یہ ہے مرد! اب اگر ———" اور اُس کی آواز ہجوم کے شور و غل میں دب گئی۔

نوجوان نجم کو کاندھے پر اُٹھائے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا، اور جُوں ہی وہ کنارے کے قریب پہنچا، ہجوم نے کنارے کا رُخ کیا، ثریا لپکی کسی نے پیچھے سے کہا ——— "بی بی کو راستہ دو۔" اور ثریا کنارے کے قریب پہنچ گئی۔ مدد کرنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اجنبی چیخا "پیچھے ہٹ جاؤ۔" اور پولیس کے دو آدمی جو قریب پہنچ چکے تھے اُنہوں نے ہجوم کو منتشر کرنا شروع کر دیا۔ اجنبی نے ایک نظر نجم پر ڈالی۔ نجم اپنی طرف سے پُوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ ڈوبا ہوا ہی معلوم ہو۔ ثریا نجم پر جھکی، اور اُس نے اندازہ کر لیا کہ حالات خراب نہیں۔ اُس نے دل میں کہا یہ اخبارات کے نمایندے کہاں ہیں، پھر اُس نے اُچٹتی ہوئی نگاہوں سے تمام ماحول کا جائزہ لیا۔ مگر کوئی بھی نمایندہ موجود نہ تھا۔ اُسے قدرے مایوسی ہوئی۔ اِتنے میں عینک لگائے ہوئے داڑھی مونچھ صاف ایک شخص نظر آیا معلوم ہوا وہ ڈاکٹر ہے۔ ثریا کی بے چینی بڑھ رہی تھی، اُس کے صبر کی انتہا ہو چکی تھی کہ اِتنے میں دو آدمی نوٹ بُک لئے ہوئے آگے بڑھے اُن میں سے جو ذرا معمّر تھا اُس نے اپنے ساتھی سے کہا "کچھ نہیں بھئی۔ ——— یہاں تو سب ٹھیک ہے' پھر وہی پُرانی کہانی۔ کسی بیوقوف نے خودکشی کی ناکام کوشش

کی ہوگی۔ چلو چلتے ہیں۔" ثریا نے سوچا قسمت اُس کے خلاف ہے۔ اجنبی جو اپنے کپڑوں سے پانی نچوڑ رہا تھا اُس نے ڈاکٹر پر ایک نظر ڈالی اور ثریا کی طرف بڑھا، اُس کی آواز اچھی تھی، ثریا نے بس یہ محسوس کیا جیسے وہ اجنبی اُسے بہم اور مسلسل یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ نجم کا کچھ نہیں بگڑا، اور ثریا نے اُس کی اُلجھی ہوئی مسکراہٹ اور تعجب کی نظر کو فراموش کر دیا۔ اجنبی اُس کی شادی کی انگوٹھی دیکھ رہا تھا۔ نوٹ بک والے نوجوان نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہے اور تھوڑی دیر بعد تیزی سے آگے بڑھے، اُن میں سے جو معمّر تھا اُس نے اجنبی سے مسکراتے ہوئے کہا —— "معاف کیجئے اقبال صاحب۔ اجنبی ایک دم سے "کیا" کہہ کر مڑا۔ پھر اُس نے ایک قہقہہ لگایا۔ جیسے کوئی بات مذاق کی ہو۔

ثریا نے یہ بدلتے ہوئے حالات دیکھے اور یہ بھی دیکھا کہ دونوں سپاہی اور ڈاکٹر نجم کو ایک موٹر کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ پھر اُس نے اخبار کے نمائندوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا "وہ اُسے لئے جا رہے ہیں، میں اُس کی بیوی ہوں کیا تم کچھ ——" لیکن اُس کی آواز شور میں دب گئی، اخبار کے نمائندے اجنبی کی طرف متوجہ تھے۔ ثریا رو دی۔ اُسے ایک دم احساس ہوا کہ اجنبی ہزاروں بلکہ لاکھوں سنیما دیکھنے والوں کا محبوب ترین ایکٹر ہے اور اُسے اجنبی سے انتہائی نفرت ہو گئی۔ کیوں نہ یہ کسی فلم کمپنی میں اس وقت شوٹنگ میں مشغول ہوا ہمارے منصوبے کو اس نے خاک میں ملا دیا ہے۔ جیسے اس کو ابھی کچھ اور شہرت درکار تھی کہ یہ اپنا جیسا ایک شہرت یافتہ وجود لیکر ہماری اُمیدوں کو ملیامیٹ کرنے کیلئے آ گیا۔ اُس نے ایک اور آخری کوشش کی۔

اخبار کے نمائندے نے جھلّاتے ہوئے ثریا سے کہا —— "آپ تنگ نہ کیجئے۔" مگر اجنبی نے بھی اخبار کے نمائندوں کو درشتی سے جواب دیا —— "میں ایک بھی سوال کا جواب نہ دُونگا۔ میں اِس خاتون سے بات کرنا چاہتا ہوں، تم لوگ میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

اخبار کے نمائندے پیچھے ہٹ گئے، اور اجنبی ثریا کا ہاتھ تھام کر اُسے تقریباً گھسیٹتا ہوا ہجوم سے نکل گیا، اور اِس سے پہلے کہ ثریا ہوش میں آئے وہ اُسے اپنی سفید کار میں بٹھا چکا تھا۔ موٹر کے جھٹکے سے نجم نے کراہتے ہوئے ایک آواز نکالی، اور ثریا کی طرف طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور کہا "مجھے سردی لگ رہی ہے۔" کچھ دیر بعد اُس نے اجنبی کا شکریہ ادا کیا، اِس کے بعد کافی دیر تک خاموش رہا۔ اِس دوران میں اجنبی کافی غور سے نجم کو دیکھتا رہا۔ دُبلا پتلا جسم، تیکھے نقوش، لمبے اور سنہرے بال اور بوسیدہ کپڑے۔ ثریا نے تعارف کراتے ہوئے کہا —— "میرا خاوند نجم —— مصوّر۔"

اقبال نے کہا "اور خاکسار مشہور اداکار اقبال، گفتگو بعد میں ہوگی پہلے تو ہمیں کپڑے تبدیل کرنے چاہئیں۔ کوئی بیس منٹ کے بعد نجم احتجاج کے باوجود اپنے گھر میں پلنگ پر لٹا دیا گیا تھا۔ اور ثریا اور اداکار صوفوں پر اطمینان سے بیٹھے تھے۔

اداکار نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا "گرم چائے بھی عجیب اثر رکھتی ہے۔ چائے کے اثر نے میرے اندر سوال کرنے کی جرأت پیدا کر دی ہے، یہ آپکے خاوند دریا میں کیوں گرے تھے ——؟"

ثریا جھجکی اور پھر اُس نے جلدی جلدی جو سچ تھا بتا دیا۔ اداکار ہمدردی سے سُن رہا تھا۔ اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "پروپیگنڈا کا خیال بہت خوب ہے۔ یہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ اِس سے پہلے کہ میں رخصت ہوں۔ ذرا میں نجم صاحب کی تصاویر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ثریا اداکار کو نجم کے "سٹوڈیو" میں لے گئی۔ تھوڑی دیر میں اُس نے تمام تصاویر دیکھ ڈالیں۔ اور اُس کو نجم کی تصاویر پسند بھی آ گئیں پھر وہ جلدی میں نجمی کے کپڑے پہنے ہوئے رخصت ہو گیا۔

ثریا نے پشیمانی کے لہجے میں کہا ——" اچھا! یوں ہونا تھا، لیکن یوں ہی ہونا تھا"

اداکار جیسے ہی اپنے ہوٹل میں پہنچا اُس نے کپڑے تبدیل کیے اور ٹیلیفون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کمیں ٹیلیفون کرنے کے بعد اُس نے رسیور رکھتے ہوئے کہا۔ ——" کیا کیا جائے ؟ اور کرنا ضرور کچھ چاہیئے ۔"

دوسری ہی صبح کھیل کا آغاز ہو گیا یعنی ثریا اخبار کی سُرخی پڑھتے ہوئے خوشی سے اُچھل پڑی ————

"مشہور اداکار اقبال نے نوجوان مصوّر کو بچا لیا"

اور اس کے نیچے ایک لمبے کالم میں پُورا قصہ تھا بلکہ اداکار اور نجم کی تصویریں بھی تھیں۔ نجم نے کچھ کہنا چاہا، ثریا نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ——" یہ اُس وقت لی ہوگی جب ہم کار میں بیٹھ رہے تھے لیکن اُنہوں نے اخبار پڑھنا شروع کیا تو اُن کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب حادثے کی تفصیلات اور اداکار کی زندگی کے کچھ واقعات کے بعد اداکار سے کسی اخبار کے نمائندے کا انٹرویو بھی چھپا تھا۔ اداکار نے اپنے متعلق ہر قسم کی بات کہنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا "میں ہمیشہ مصوّری سے دلچسپی لیتا رہا ہوں، یہ نوجوان مصوّر ایک قابلِ فخر دریافت ہے اور اِس کے لئے دنیا کو میرا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ میں نے اِس نوجوان مصوّر کی تین تصویریں خریدی ہیں۔ اور جنہیں مصوّری سے ذرا بھی دلچسپی ہے وہ میری تقلید کریں گے۔ میں اُس نوجوان مصوّر نجم کے فن سے اِتنا متاثر ہوا ہوں کہ عنقریب اُس کی تصویروں کی ایک بہت بڑی نمائش کا انتظام بھی کر رہا ہوں —— ثریا کے ہاتھوں سے اخبار گر گیا، اور اُس نے محسوس کیا جیسے وہ نجمی کے سینے پر سر رکھ کر بیک وقت رونا اور قہقہے لگانا چاہتی ہے۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ثریا نے کہا " آجائیے"۔ دو آدمی داخل ہوئے، ایک بچہ جس کے پاس موٹا سا بنڈل تھا، سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ ثریا نے بنڈل لیا، اور اِن دو نئے آدمیوں نے نجمی کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ کر دی، بنڈل میں نجمی کے کپڑے تھے اور اس کے ساتھ ایک خط، ثریا نے اخباری نمایندوں سے اجازت لے کر خط پڑھنا شروع کر دیا ————

"میرا خیال ہے مجھے کسی معذرت کی ضرورت نہیں' مجھے واقعی آپ کے خاوند کا فن پسند ہے جن تین تصویروں کے نام نیچے لکھے ہیں وہ میں خریدنا چاہتا ہوں ۔"

اِس کے بعد تصویروں کے ناموں کے علاوہ صرف ایک جملہ تھا لیکن ثریا اُس کا مطلب نہ سمجھ سکی اور اب بھی جبکہ ایک زمانہ بیت گیا ہے اور نجم کافی امیر اور مشہور مصوّر بن چکا ہے وہ اِس جملے کا مطلب نہیں سمجھ سکے، وہ جملہ تھا :-

"بُرا آدمی وہ ہے جس سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے"۔
لیکن میرا خیال ہے کہ آپ اِس کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

صنعت گرِ نقاش چیں رو صورتِ یارم بیں
خسرو:- یا صورتے کش ایں چنیں یا ترک کن صورت گری

جیمنی سرشار

گناہِ محبّت!

قبلہ و کعبہ عالی جناب شیخ صاحب! چند روز ہوئے نکودر گیا تھا۔ وہاں قبلہ جوشؔ صاحب ملسیانی کے ہاں "مخزن" کے نئے دور کا پہلا پرچہ دیکھا۔ رہا نہ گیا۔ ایک چھوٹی سی غزل ارسالِ خدمت ہے۔ جو بھی خدمت ممکن ہے بجا لایا کروں گا۔ حد ادب۔
بندۂ ناچیز جیمنی سرشار ایڈیٹر نیا جیون فیروزپور چھاؤنی

ذرا سا سہارا نگاہِ محبّت! کہ ہے سخت دُشوار راہِ محبّت
ہم ارماں بھرے دل کا نذرانہ لیکر چلے ہیں سُوئے بارگاہِ محبّت
یہ ہر روز حملے! یہ ہر وقت دھاوے! دلوں پر سرِ شاہراہِ محبّت
وفاؤں کے بدلے جفاؤں کے طوفاں! تعجب میں ہے دادخواہِ محبّت
سُنیں آپ نے شیخ صاحب کی باتیں؟ ہیں بیگانۂ رسم و راہِ محبّت
زمانے میں ناقابلِ درگزر ہے قصورِ وفا اور گُناہِ محبّت
مُبارک ہو زاہد تجھے زہد اپنا! مجھے اپنا ذوقِ گُناہِ محبّت
اُدھر جبر و جور و عناد و کدُورت اِدھر جذبۂ بے پناہِ محبّت

بہت ہم نے سرشارؔ دل کو سنبھالا
مگر یہ تمہاری نگاہِ محبّت!

مخزن المخازن

"علی گڑھ میگزین"

حسرت موہانی

دل اُن سے مل کے اب اُن کو بھلا نہیں سکتا
مگر یہ کیوں ہے، میں خود بھی بتا نہیں سکتا

بقدرِ حوصلۂ عاشقی ہے شوق وصال
مگر وہ شوق جو دل میں سما نہیں سکتا

یہ کس کے عجزِ تمنا کا پاس ہے کہ وہ شوخ
بہ زعم ناز بھی دامن چھڑا نہیں سکتا

تری نظر کا ہے ناوکِ ناوکِ دل دوز
نشانہ کوئی بھی جس کا بچا نہیں سکتا

انہیں یقینِ محبت نہیں، غضب تو یہ ہے
کہ چیر کر میں دل اپنا دکھا نہیں سکتا

اگرچہ میں ہمہ تن درد ہوں مگر حسرت
کوئی جو پوچھے، کہاں ہے؟ بتا نہیں سکتا

جھگڑالو

(رشید احمد صدیقی کے قلم سے)

آپ جہاں بھی کوئی جھگڑا دیکھیں گے بالآخر یہی معلوم ہوگا کہ کوئی ایک شخص ہے جو اپنے نفس کی خاطر معاملہ کو رُو براہ نہیں ہونے دیتا۔ جو لوگ ہاضمہ کے فتور میں مبتلا ہیں اُن کو میں سب سے مخلص جھگڑنے والا سمجھتا ہوں اور اُن کی بڑی قدر کرتا ہوں، اس لئے کہ وہ جھگڑتے ہیں محض جھگڑے کی خاطر۔ اس میں نفع نقصان، دُنیا آخرت، زید بکر کسی کی قید نہیں۔ آرٹ برائے آرٹ۔ ہمارے یہاں اب مقبول رہا ہو یا نہیں لیکن جھگڑا برائے جھگڑا کی عظمت کا میں ہمیشہ سے قائل رہا!

اس دنیا میں جھگڑنے سے زیادہ آسان مشغلہ ہمارے آپ کے لئے شاید ہی کوئی اور ہو۔ اور اس فن میں عورتوں اور ایڈیٹروں سے شاید ہی کوئی اور بازی لے گیا ہو۔ اس بنا پر عورتوں سے گھر کے اندر اور ایڈیٹروں سے گھر کے باہر کی دُنیا قوٗ علی نور ہوتی ہے۔ یہ تمانا تو آسان ہے لیکن اس کا مان لینا مشکل کہ جنت میں شیطان نے عورت کو بہکایا، یا عورت نے شیطان کو۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ مرد اور شیطان دونوں وہاں سے نکالے گئے۔ بہکانے اور جھگڑنے میں فرق ضرور ہے لیکن دراصل بہکانے اور جھگڑا کرنے میں صرف مقدم اور مؤخر کا فرق ہے۔ بہکانے میں جھگڑے کی نیت یقیناً پوشیدہ ہوتی ہے۔ عورت اور شیطان اِس جرم میں جنت سے نکالے گئے اور اِس دُنیا میں آئے۔ بہت سے ایسے ہیں جو شیطان اور عورت ہی کے واسطے سے اِس دُنیا کو جنت سے کم نہیں سمجھتے!

گھر میں عورت اور گھر سے باہر ایڈیٹر طرح طرح سے جھگڑا لیتے ہیں۔ عورت کروڑپتی ہی کی بیوی کیوں نہ ہو اُس کی شکایت کرے گی کہ اُسے پیسے میسر نہیں۔ ظاہر ہے اُس کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے لیکن وہ شوہر سے جھگڑے گی اِس لئے کہ وہ دولت پیدا

کرنے کے علاوہ دوسروں کی بیویوں کو کیوں نہیں مار ڈالتا۔ وہ نوکر سے اس لئے جھگڑے گی کہ نوکر تو صرف نوکر ہوتے ہیں، تنخواہ یا معاوضہ سے کیا سروکار۔ یہ کھاتے پیتے سوتے جاگتے کیوں ہیں۔ وہ دوسروں کی بیویوں سے جھگڑے گی، اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ وہ خود ان کے بارے میں جیسی رائے رکھتی ہے اُس سے کہیں زیادہ تند و تاریک رائے دوسری عورتیں اُس کے بارے میں رکھتی ہیں۔ وہ خدا سے جھگڑا مول لے گی اس لئے کہ خدا کا تعلق دُنیا کی عورتوں سے کیوں ہے!

ایڈیٹروں کی کرامات کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک ایڈیٹر صاحب نے انتقال فرمایا۔ یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ جس روایت کا میں تذکرہ کرنے والا ہوں وہ بیان کی ہوئی تو ہے ایک ایڈیٹر صاحب کے ہم پیشہ کی لیکن دوسری یعنی اُن کا انتقال فرمانا ایک ایسی ایجنسی سے ہے جس کا کوئی تعلق پہلی سے نہیں ہے۔ مرحوم ایڈیٹر صاحب کی رُوح جنت کے دروازہ پر پہنچی تو داروغۂ جنت نے اُس کی پذیرائی کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جنت میں ایڈیٹر کا کام نہیں۔ وہاں سے رُوح جہنم کے دروازہ پر آئی، مالکِ دوزخ نے بھی اُس کو قبول کرنے سے انکار کیا کہ دوزخ کسی ایڈیٹر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ایڈیٹر صاحب کی رُوح نے بغیر کسی تکلیف کے جنت اور دوزخ کے درمیان اپنا آفس کھول دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن اُن کو دو دعوتی کارڈ وصول ہوئے۔ ایک جنت سے دوسرا جہنم سے!

دوسرا قصہ اسی دُنیا کا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک بستی میں دو اخبارات تھے ایک کا نام بچھو تھا اور دوسرے کا نام بھالا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بستی میں کہرام مچ گیا۔ نہ کسی کی جان کی خیر تھی نہ مال کی نہ آبرو کی۔ آخر میں ایک شریف آدمی نے بڑی جد و جہد کے بعد دونوں اخباروں کے ایڈیٹروں کو مدعو کیا تاکہ وہ صلح کر لیں، اور بستی کے لوگ حیاتِ مستعار کے کچھ دن امن و عافیت سے بسر کر لیں۔

بچھو کے مدیرِ مسئول صاحب تشریف لائے جو ہر حیثیت سے اسم با مسمّٰی تھے۔ اب تلاش شروع ہوئی کہ بھالا کے سمپادک صاحب کہاں تشریف رکھتے ہیں، بڑی دیر کی جستجو اور دَوڑ دھوپ کے بعد بچھو صاحب نے ظاہر فرمایا کہ موصوف ہی بھالا کے بھی ایڈیٹر تھے۔

اِس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اِس سعادت مند فرقہ کے بارہ میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جھگڑنا اکثر غم و غصہ یا حماقت کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ محض ایک مشغلۂ زندگی کے طور پر۔ جیسے شعر کہنا، خضاب لگانا، یا افیون کھانا۔ ایک زمانہ میں میرا قیام ایک ایسے محلّہ میں تھا، جہاں دو پڑوسیوں میں مکان کی تقسیم کا جھگڑا تھا۔ یہ جھگڑا ہر منزل سے گزر کر عدالت تک پہنچا اور مکان دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا لیکن جھگڑے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سورج ڈوبتے ہی ڈیورنڈ لائن کے اِدھر اُدھر دو بڈھے دکھائی دیتے۔ پہلے ایک آیا۔ ایک ہاتھ میں بڑا سا رُومال، دوسرے میں حُقّہ، دوسرے صاحب بھی فوراً نمودار ہوئے۔ ایک ہاتھ میں رُومال دوسرے میں بٹیر۔ دونوں نے اپنے اپنے رومالوں سے بیٹھنے کی جگہ صاف کی۔ ایک نے اللہ کا نام لیا اور بیٹھ گیا۔ دُوسرے نے نزلہ کو گالی دی اور بیٹھ گیا۔ ایک نے کہا آداب بجا لاتا ہوں میرن صاحب، دوسرے نے کہا مجرا عرض ہے مخھو صاحب۔ اس کے بعد بحث شروع ہوئی۔ ۱۵ منٹ تک میرن صاحب بے نقط سناتے

رہے۔ اور منجھو صاحب خاموش سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے۔

اِس کے بعد منجھو صاحب نے حقہ میرن صاحب کے اور میرن صاحب نے بٹیر منجھو صاحب کے حوالے کی جن کو دونوں نے فرشی سلام کے ساتھ قبول کیا اور دوسرے ۱۵ منٹ تک منجھو صاحب میرن صاحب کو صلواتیں سُناتے رہے اور میرن صاحب خاموش سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے۔ دو گھنٹے مسلسل میر صاحبان جھگڑتے رہے اور حقہ اور بٹیر باری باری بدلتے رہے، حقہ جل جاتا تو نوکر دوسرا حقہ لاکر رکھ دیتا اور پہلا حقہ اُٹھا لے جاتا۔ یہ ناممکن تھا کہ جب ایک گلفشانی کر رہا ہو تو دوسرا حقہ چھوڑ کر جواب دے۔ یہاں تک کہ وقت ختم ہو جاتا اور میر صاحبان ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو جاتے۔ (تلخیص)

مولانا احسن مارہروی کا خط

عبداللطیف اعظمی (جامعی) کے نام

لُطف فرمائے تسلیم

گرامی نامہ پہنچا۔ یاد آوری کا شکریہ جس مسئلہ کے متعلق جناب نے خاکسار کی رائے دریافت کی ہے۔ اس کا جواب حسب ذیل ہے:-

لفظ "نکات" کے باب میں مجھے ان حضرات کی رائے سے اتفاق ہے جو بکسرِ اول صحیح سمجھتے ہیں اگر کسی لفظ کی صحت و عدم صحت کا مدار لُغت پر ہے تو غیاث اللغات کی یہ عبارت پڑھی جائے۔ "نکات بکسرِ اول جمع نکتہ و بضم محض غلط، چراکہ وزن فعال بضم از اوزان جمع نیست۔ (از منتخب و مدار و بہارِ عجم و مزمل) نکتے کی ایک جمع 'نکت' بھی ہے وہ بضم نون ہے۔ جو حضرات نکات کو بضم نون غلط العام فصیح کے تحت میں لانا چاہتے ہیں۔ اگر مسٹر ہنسلے آئی سی ایس قسم کے لوگ ہیں تو ان کے نزدیک مرض، عرق، ورق، شرف وغیرہ بھی بہ سکونِ اوسط ہونا چاہئیں۔ در آں حالیکہ یہ الفاظ بفتحتین ہیں۔ اِسی طرح حذف بسکونِ اوسط ہے۔ مگر آج کل یہ امد اِس قسم کے دوسرے الفاظ تمام پی ایچ ڈی قسم کے حضرات کی زبانوں سے غلط استعمال ہوتے ہیں، بیشک بعض الفاظ ایسے ملتے ہیں جنہیں خلافِ لغت استعمال کیا گیا ہے، تحقیق لغت میں قیاس آرائی بے کار ہے صرف استعمال مستند و معتبر ہے۔

امروز، شب، امسال پر قیاس کرکے ام سحر، امشام، ام لیل نہیں بول سکتے۔ وہ اہلِ علم اور اربابِ قلم جن کی تحریریں مسلّم و معتبر ہیں اور جنہیں مجتہد فن کا مرتبہ حاصل ہے۔ اگر ان کے استعمال میں کوئی لفظ خلافِ لغت مستعمل ہو گیا ہے اور متفق علیہ مروّج ہو چکا ہے وہ فصیح سمجھا جائے گا اور انہیں فصحاء کو زمرۂ عام میں مانا جائیگا۔ ورنہ بلحاظِ استعمال تخت، وقت (بسکونِ اوسط) کو 'تخت' 'وقت' بفتحتین بولتے۔

مخصر کو منصر اور فصیل کو فیصل بولنے والے جُہلا اور بازاری لوگ ہیں اور اِس زمرے میں وہ حرف شناس آجاتے ہیں۔ جنہیں فن سے آگاہی نہیں اور ادبی حیثیت نہیں رکھتے ان کو عوام کہا جائے گا نہ عام۔ میرے نزدیک غلط العام فصیح کے ساتھ یہ فقرہ بڑھانا چاہیئے کہ غلط العوام قبیح"۔

۴ مارلین روڈ - ۲۶ اپریل ۱۹۳۷ء

ھمایوں

محرومی

(مصنفہ مائن رِیش مائنے ترجمہ از عبادت بریلوی)

صبح جب جھانکتی ہے پربت سے

اُٹھ کے مَیں پوچھتا ہوں حیرت سے

آج آئے گی وہ یہاں ہمدم!
مُسکرا کے آئے گی وہ یہاں ہمدم
شام ہو جاتی ہے یُونہی آخر
پھیل جاتی ہے تیرگی آخر
پھر بھی رہتی ہے وہ یہاں سے دُور
میری اِس چشمِ خوں فشاں سے دُور
رات کی تیرگی ہے چھائی ہوئی
نیند ہر چیز کو ہے آئی ہوئی
جاگنا چاہتا نہیں، لیکن
نیند آتی نہیں مجھے تجھ بن
اور اِسی طرح میرے روز و شب
گزرے جاتے ہیں اُف یہ رنج و تعب!

"ساقی"

حکومتِ پاکستان کی قراردادِ مقاصد

(محمد حسن عسکری)

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

بعض حضرات کو خدشہ ہے کہ خدا کو مختارِ کُل ماننے سے آمرانہ رجحانات کو تقویت پہنچے گی اور کوئی ایک آدمی یا چند آدمی خدا کے نائب بن بیٹھیں گے۔ مگر یہ خطرہ کچھ اسی عقیدے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ناجائز فائدہ اٹھانے والے ہر عقیدے سے فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسے ملک موجود ہیں جہاں عوام کو مختارِ کُل سمجھا جاتا ہے، مگر چند لوگ عوام کے نائب بن بیٹھے ہیں۔ یہ اعتراض بجا ہے کہ خدا تو ایک مُبہم اور داخلی تصور ہے۔ ہم اُس کی مرضی کا تعیّن براہِ راست نہیں کر سکتے۔ مگر دراصل عوام کا تصور بھی کچھ ایسا کم غیر مُبہم، غیر داخلی اور غیر متشابہ نہیں ہے۔ ایمانداری کے ساتھ کوئی کہہ سکتا ہے کہ عوام کی مرضی کا حقیقی تعیّن ممکن ہے؟ تقسیم سے پہلے ہم روز دیکھتے تھے کہ مسلم لیگ کہتی تھی عوام پاکستان چاہتے ہیں، کیمونسٹ کہتے تھے کہ نہیں، عوام پاکستان سے زیادہ روٹی چاہتے ہیں۔ آج بھی پاکستان کی حکومت کہتی ہے کہ عوام سب سے پہلے اپنے ملک کو دشمن سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، کیمونسٹ کہتے ہیں کہ نہیں، عوام کے ذہن میں اِس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے، عوام روٹی مانگتے ہیں۔ اب بتائیے کہ عوام کی خواہشات کا فیصلہ کیسے ہو؟ سیاست میں جس چیز کو عوام کی مرضی کہتے ہیں وہ ایک ایماندارانہ یا نیم ایماندارانہ یا غیر ایماندارانہ مفروضہ ہے۔ اگر عوام کا مطلب ایک اجتماعی نامیاتی جسم اور شخصیت ہے تو اُس کی اندرونی تحریکات کا فیصلہ یوں دو لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔ البتہ عملی سیاسیات میں، بلکہ روزمرّہ زندگی میں بھی ان تحریکات کے بارے میں مفروضے قائم کرنا پڑتے ہیں۔ یہ ایک عملی ضرورت ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ اب اِن مفروضوں کو سیاسی لوگ اپنی شخصی یا جماعتی اغراض کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ سب مفروضوں میں فریب کاری کی گنجائش ہے البتہ میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ بعض مفروضوں میں فریب کاری کی گنجائش زیادہ ہے۔ مثلاً عوام کی مختاری کے نظریے ہیں۔ دوسرے مفروضے تو ایسے ہیں جن میں ایک طبقہ دوسرے طبقے کو فریب دیتا ہے، اور اس کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ فریب خوردہ طبقہ ایک نہ ایک دن ہوش میں آ جائے گا۔ مگر اِس مفروضے میں تو ہر آدمی اپنے جال میں پھنستا ہے، اور ایسی مطلق خود پرستی کے

جال سے نکلنا ناممکن ہے۔ یہ جادو اُس وقت تک نہیں ٹوٹتا، جب تک کہ آدمی کو متواتر ناکامیابیوں کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ اور آدمی دس پانچ مرتبہ اپنا اور کائنات کا مقابلہ و موازنہ نہ کرلے۔ اب تک انسان نے جتنی بھی شہنشاہیاں ایجاد کی ہیں۔ اُن میں عوام کی مطلق شہنشاہی رُوحانی سکون کے لئے سب سے زیادہ مہلک ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ یہ بات آپ کو بُری لگی ہوگی، کیونکہ آپ اور ہم سب عوام میں شامل ہیں، اور ہم سب کو اپنی (خودی نہیں) خود پرستی عزیز ہے۔ مگر ناراض ہونے سے پہلے اِس پر غور کرلیجئے کہ عوام کی شہنشاہی کے تصوّر کے ساتھ ساتھ اور کون کون سے تصوّرات اور احساسات شامل ہیں۔ ایک تو یہ بات نظر میں رکھیئے کہ آج کل عوام سے اُوپر کوئی اور طاقت نہیں مانی جاتی، پھر یہ سوچیئے کہ عوام کی خصوصیات کیا بتائی جاتی ہیں۔ عوام کی شہنشاہی کے پہلو بہ پہلو انسان کی فطرت کے متعلق بھی ایک ایسا نظریہ رائج ہے جس میں زندہ انسانوں کے ٹھوس تجربات سے آنکھیں بند کرکے انسان بلکہ انسانیت پر ایک مطلق و مجرّد تصوّر کی حیثیت سے غور کیا گیا ہے۔ اِس نظریے کے مطابق انسان فطرۃً انتہائی معصوم، پاک صاف، نیک طینت، تمام ممکن اچھائیوں کا مالک اور بے حد و حساب صلاحیتوں کا مخزن ہے، اِن دونوں نظریوں کا ناگزیر نتیجہ آمریت ہونا چاہئے، اور رُوس میں ایسا ہو بھی رہا ہے۔ عوام مختارِ کُل سہی، مگر وہ اس اختیار کا استعمال اصالتہً نہیں بلکہ وکالتہً ہی کرسکتے ہیں۔ اِس لئے عملی طور سے اصلی اختیار کے مالک "عوام کے نمایندے" ٹھہرے، پھر چونکہ عوام انسان کی حیثیت سے معصوم ہیں، اِس لئے اُن کے نمایندے بھی معصوم ہوئے ...... جن سے کوئی غلطی سرزد نہیں سکتی۔ چنانچہ کامریڈ سٹالن ہر قسم کی لغزشوں سے ماورا ہیں، چونکہ وہ عوام کے سب سے بڑے نمایندے ہیں۔ اِس لئے وہ گویا مجسّم عوام ہیں، اور اُن کی ذات میں جملہ برکات نے پڑاو ڈال رکھا ہے۔ فارسی کے ایک قصیدے میں تو ہم نے بس اِتنا ہی پڑھا تھا کہ :-

نہ کرسیٔ فلک نہد اندیشہ زیرِ پا
تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلاں دہد

مگر اِس بات پر نہ تو بادشاہ کو یقین آیا ہوگا، نہ خود شاعر کو، دونوں جانتے تھے کہ یہ تو لفظوں کا کھیل ہے۔ مگر رُوس کے ادیبوں نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ "عظیم اسٹالن کے عظیم الشان عہد میں دنیا کا عظیم ترین ادب پیدا ہوگا"۔ ایسی چاپلوسی اور ایسی ذہنی غلامی کی مثال تو دنیا کی تاریخ میں ملنی محال ہے۔ اِسے چاپلوسی بھی نہیں کہا سکتا، کیونکہ ...... میں گواہی دے سکتا ہوں کہ اِن حضرات کو اپنے ایک ایک لفظ پر پُورا یقین ہوگا، اور اُنھوں نے یہ بات پُورے خلوص کے ساتھ کہی ہوگی، کیونکہ اسٹالن تو رُوسی قوم کا، لہٰذا ہر رُوسی کا، خارجی اور مثالی مظہر ہے۔ لہٰذا اُن کی تعریف کرتے ہوئے ہر رُوسی یہ محسوس کرتا ہے جیسے اپنی تعریف کر رہا ہو، اور اِس طرح نفس کو خوراک ملتی رہتی ہے۔ البتہ ایک بات سے مَیں واقعی مرعوب ہوتا ہوں۔ رُوس کے معاشی اور سماجی نظام میں کوئی تو ایسی بات ضرور ہوگی جس سے ان لوگوں کے اندر ایسی خود اعتمادی پیدا ہوئی اور وہ ایسا زبردست دعویٰ کرسکے۔ مگر یہ خود اعتمادی حاصل کرنے کے لئے ان لوگوں نے اپنا دل، دماغ، رُوح سب چیزیں بیچ دی ہیں۔

مگر کیا ایسی خود اعتمادی انسان کے لئے جائز ہے، کیا انسان اسے قائم رکھ سکتا ہے، کیا یہ رویہ صحت مند انہ ہے؟ یہ تو اسی سے ظاہر ہے کہ انقلاب کے بعد سے اب تک رُوس کے کئی بڑے ادیبوں اور فن کاروں کو خود کشی کرنی پڑی ہے۔ (اور ایسے لوگوں کو جنہیں آخر تک انقلاب کی بنیادی اقدار پر یقین تھا، مگر یہ اقدار اب ان کے لئے ناکافی ثابت ہو رہی تھیں) اور کئی اچھے ادیبوں کا منہ حکومت کو بند کرنا پڑا ہے۔ بات یہ ہے انسانیت پرستی سے جو خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اُس کی عمر چار دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ انسان کی طاقتوں کو لامحدود ماننے سے کیا ہوتا ہے، ہر آدمی کا ذاتی تجربہ تو اس عقیدے کو جھٹلاتا ہے۔ اِس باب میں اجتماعی تجربے کی کیفیت بھی ایسی دل خوش کن نہیں۔ یوں لوگ دل بہلانے کو جو جی چاہے کہتے رہیں۔ آدمی کی اُمیدیں جتنی زیادہ ہوں گی اُس کی مایوسی بھی اتنی ہی زبردست ہوگی۔ جو تہذیبیں یہ سمجھتی ہیں کہ ہم انسان کو، یا عوام کو کائنات کی سب سے بڑی طاقت سمجھ کر دو تین سَو سال تک متوازن طور پر ترقی کر سکتے ہیں؛ وہ جھوٹے اور طفلانہ نظریوں کے نشے میں ہیں۔ بیس تیس سال میں اِس بات کا پتہ نہیں چلتا، ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ انسان کی ہستی کو کائنات پر مسلط کر دینے کا خیال بڑا مبارک ہے، مرداں چنیں کنند۔ مگر کائنات ہماری خواہشوں کا احترام نہیں کرتی۔ ایسی خود اعتمادی کا نتیجہ ہمیشہ زندگی سے محرومی ہوتا ہے۔

پاکستان میں اس قرارداد کے بعد اس قسم کی انسانیت پرستانہ خوش فہمیوں کے لئے گنجائش باقی نہیں رہی، جہاں تک عوام کی اہمیت کا سوال ہے وہ اپنی جگہ مسلّم ہے، انسان کی ہمت افزائی بھی درست ہے۔ مگر پاکستان میں اِس نئے بُت یعنی عوام (بحیثیت ایک مطلق و مجرد تصوّر کے) یا اُس دوسرے بُت یعنی انسان کی پرستش نہیں ہوگی۔ جب تک ہمارے عوام اسلامی عقیدوں پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اپنے آپ کو نہیں پُوج سکتے۔ ہم نے موجودہ زمانے کی سامریت سے محفوظ رہنے کا عہد کر کے واقعی بُت شکنی کی ہے، اور ہم اسے ایک انقلابی فعل سمجھ سکتے ہیں، جو در اصل تیرہ سَو سال پرانا ہے، مگر جس کی تجدید برابر ہوتی رہنی چاہیئے، ورنہ انسان ہر وقت جھوٹے خداؤں کو پُوجنے پر آمادہ رہتا ہے، اور جس بُت کو پُوجنے کی ترغیب سے بچنا اس کے لئے سب سے مشکل ہے، وہ خود انسان ہے۔

ہم نے انسان پرستی سے بچ کر ایک صالح زندگی کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے اُصولوں پر قائم نہ رہ سکیں، یا ان اُصولوں کی تمام شرائط پوری نہ کر سکیں۔ بہرحال ہماری قومی زندگی کی حدیں تو مقرر ہوگئیں۔ اس کے بعد صالح زندگی کی تعمیر کا دارومدار ہماری ہمتوں اور ہمارے تخیّل پر ہے۔" (اقتباس)

"چٹان"

تھکی ہوئی آواز

(جوشؔ ملیح آبادی)

خوابیدہ زندگی کو جگانے سے فائدہ
اب بار بار خواب میں آنے سے فائدہ
جس کو بجھا چکی ہیں زمانے کی آندھیاں
پھر دل میں وہ چراغ جلانے کا فائدہ
اِس نامرادی عقل کے دورِ سیاہ میں
بے ہوشیوں کو ہوش میں لانے سے فائدہ
کیا آشیاں کا ذکر قفس بھی نہیں رہا

اپنے بجلیاں چمن پہ گرانے سے فائدہ
جن کو جگا سکے گا نہ شورِ نشور بھی
اِن ولولوں کی قبر پہ آنے سے فائدہ
جن کے گلے ہیں وقت کی تلوار سے فگار
اُن روز و شب کو بار نبھانے سے فائدہ
جو اپنے ہی وجود سے رُوٹھا ہوا ہو دل
اِس تنگیِ زندگی کو منانے سے فائدہ
جس میں نہ شمع و گل ہو نہ پروانہ و ہزار
اِس انجمن میں عُود جلانے سے فائدہ
خود کو جو کھو چکا ہو غبارِ حیات میں
اِس وحشیِ رمیدہ کے پانے سے فائدہ
اُس کو جسے پسند ہوں جنگل کی ٹھوکریں
آواز دے کے راہ بتانے سے فائدہ
جس چاندنی میں غرق تھیں راتیں بہار کی
اس چاندنی کو یاد دلانے سے فائدہ
دامانِ ذوقِ جامہ دری کب سے چاک ہے
اب مسکرا کے سامنے آنے سے فائدہ
جو آرزو سہاگ کے نشایاں نہیں رہی
اس آرزو کا سوگ بڑھانے سے فائدہ
اے جوشؔ بدنصیب کے مجبورِ آخری
پچھلا پہر ہے خواب میں آنے سے فائدہ

"سلسبیل"

اورنگ زیب کی داستانِ عبرت

اورنگ زیب جیسا دیندار اور متقی شخص جسے اقبال مرحوم نے۔ع

نرکشِ مارا خدنگِ آخریں

قرار دیا ہے۔ اِس کے احوال میں مولانا ابوالکلام تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اُسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا لیکن ایک زمانے میں گوشت و پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا۔"

اور جب وہ گوشت و پوست کا آدمی تھا، تو موسیقی کے ہاتھوں اِس پر کیا گزری؟ زین آباد کی رہنے والی ایک مغنیہ نے جو زین آبادی کے نام سے مشہور ہوئی، اورنگ زیب کو اتنا بے قابو کر دیا تھا۔ کہ "اس کے عشق و شیفتگی میں اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالمِ نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا۔"

بالآخر ایک روز زین آبادی نے اپنے دستِ حنائی سے ایک جامِ رنگین بھرا اور اورنگ زیب کو دے کر اصرار کیا کہ لبوں سے لگالے۔ یہاں تک کہ "وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا۔ کی پوری روداد پیش آگئی۔" اور قریب تھا کہ شہزادہ بے بس ہو کر اِس ساغرِ زہر کو چڑھا لے، جو اُس کی عظمت اور تقویٰ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے، کہ خود اسی ملائکہ فریب زین آبادی کو رحم آ گیا اور اُس نے فوراً پیالہ شہزادے کے لبوں سے کھینچ لیا۔

اُسی زمانے کا ذکر ہے کہ دارا شکوہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا۔ کہ "ببینید این مزوّرِ ریائی بہ صلاح و تقویٰ ساختہ است۔"

لیکن جب اورنگ زیب کی طبیعت کی اُفتاد نے اپنی اصل راہ اختیار کی، یعنی عملی زندگی کی حقیقتوں سے دوچار ہوا تو موسیقی اور اُسکے ذوق و اشتغال سے بالکل کنارہ کش ہو گیا بقول مولانا ابوالکلام اُس نے سرے سے یہ کارخانہ ہی بند کر دیا۔"

"گرد و پیش"

گاؤ جھوم جھوم کے

(قتیل شفائی)

مسکراؤ، گنگناؤ، گاؤ جھوم جھوم کے، گاؤ جھوم جھوم کے

مسکرا رہی ہے رات
گنگنا رہی ہے رات
چاندنی کے ساز پہ
گیت گا رہی ہے رات

کہہ رہی ہے کائنات ہم سے گھوم گھوم کے، گاؤ جھوم جھوم کے

عشق جاوداں رہے
حسن شادماں رہے
زندگی کا کارواں
دم بدم رواں رہے

رہگزار خود کہے، پاؤں چوم چوم کے، گاؤ جھوم جھوم کے

"آجکل"

اقبال کے فلسفۂ خودی کا ارتقا

(میکش اکبرآبادی)

دوسرے نظریات کی طرح فلسفۂ خودی کے متعلق بھی اقبال کے خیالات میں ارتقا ہوتا رہا ہے۔ "اسرارِ خودی" میں جو خیالات پائے جاتے ہیں وہ اپنے بعد کے خیالات کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور سلجھے ہوئے نہیں ہیں۔ مغربی فلسفے سے اندازِ بیان کی مشابہت نے اس موضوع کو اور بھی غیر واضح کر دیا ہے۔ "اسرارِ خودی" میں خودی کا جو تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس میں وحدت الوجود کو نفی خودی کا مرادف سمجھا گیا ہے اس کے علاوہ خدا اور خودی کا ربط بھی مبہم ہے۔ لیکن آگے چل کر یہ تصور "اسرارِ خودی" کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا ہے[۱]:

"ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ حیات تمام و کمال انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ خود خدا بھی ایک فرد ہی ہے اگرچہ فردِ کامل ہے۔ کائنات افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ لیکن اس مجموعے میں جو نظم و نسق اور توافق و تطابق پایا جاتا ہے بذاتہٖ کامل نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ افراد کی جبلّی کوششوں کا نتیجہ ہے ـــــ" "حیات کیا ہے؟ فرد کا دوسرا نام حیات ہے۔ اور فرد کی اعلےٰ ترین صورت جو اس وقت تک معلوم ہو سکی ہے (EGO) ہے۔ جب حیات انسانیت کا جامہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نام ایغو یا شخصی خودی ہو جاتا ہے۔

"اسرارِ خودی" میں اس خاکے سے زیادہ وضاحت نہیں ہے نظم مسائل کے بیان کے لئے زیادہ موزوں بھی نہیں ہے۔ کیونکہ نظم یہ حسن تفصیل اور تجزیہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ غالباً اسی لئے ڈاکٹر نکلسن نے علامہ سے وضاحت کی فرمائش کی ہوگی تاہم "اسرارِ خودی" چونکہ اصل ہے اس لئے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ "اسرارِ خودی" میں خودی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِ او پیداست از اثباتِ او
در جہاں تخمِ خصومت کاشت است — خویشتن را غیرِ خود پنداشت است

[۱] اس تشریح سے مراد ہے جو علامہ نے ڈاکٹر نکلسن کی فرمائش پر لکھی تھی۔

سازد از خود پیکرِ اغیار را
تا فزاید لذّتِ پیکار را

عذرِ این اسراف و این سنگیں دلی
خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

شعلۂ خود در شرر تقسیم کرد
جزپرستی عقل را تعلیم کرد

خودشکن گردید و اجزا آفرید
اندکے آشفت و صحرا آفرید

باز از آشفتگی بیزار شد
وز بہم پیوستگی کہسار شد

وانمودن خویش را خوئے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است

خلاصہ یہ کہ تمام عالم خودی کا ظہور ہے۔ کیونکہ خودی ہی تمام مشاہدات کی خالق ہے۔ حقیقت میں خودی کا کوئی غیر نہیں ہے۔ بلکہ لذّتِ عمل اور جمالِ معنوی کی تکمیل کی خاطر اس نے اپنے آپ کو اپنا غیر فرض کر لیا ہے۔ جیسے شعلہ اپنے آپ کو شراروں میں تقسیم کر لیتا ہے، خودی کو سکون نہیں ہے۔ ظاہر ہونا اُس کی فطرت ہے۔ وہ طرح طرح سے اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے کبھی منتشر ہو کر صحرا ہو جاتی ہے۔ اور جب اس طرح بھی سکون میسر نہیں آتا تو مجتمع ہو کر کہسار بن جاتی ہے۔

اسرار کے فلسفہ کی وضاحت کرتے ہوئے علّامہ نے ظاہر کیا ہے کہ وہ کائنات کو افراد کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ افراد میں اختلاف، امتیاز اور علیحدگی کے معنی پوشیدہ ہیں اس مجموعے میں بدنظمی اور انتشار بھی پایا جاتا ہے۔ مگر اس کا رُخ ترتیب اور نظم کی طرف ہے۔ اِس طرح علّامہ غالباً لیبنز کے وارد کئے ہوئے اِس اندیشہ سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں، کہ اگر ان وحدتوں میں عمل و تعامل کا تعلّق مانا جائے تو اِس سے ہر وحدت کے استقلال میں فرق آ جاتا ہے۔ لیکن اِسی کے ساتھ علّامہ عالم کو ایک منتشر اور بے ربط وحدتوں کا مجموعہ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ اِس طرح تمام ترقیاں خواہ وہ اخلاقی اور رُوحانی ہوں یا میکانکی اور مادّی، ختم ہو جاتی ہیں۔ اِس لئے اُنہوں نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ تاکہ افراد کی انفرادیت میں بھی فرق نہ آئے، اور ارتقا کا امکان بھی باقی رہے۔

علّامہ نے اسرارِ خودی میں انائے مطلق اور انائے انسانی کی نہ تشریح کی ہے اور نہ ان کا باہمی تعلّق یا فرق بیان کیا ہے لیکن یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا تشریح صرف انائے انسانی ہی کی ہے۔ غالباً اس وقت علّامہ کے ذہن میں خدا کی فردیت کا تصوّر تو تھا جو ایک انا کہی جا سکتی ہے، مگر انائے مطلق یا انائے انسانی کا کوئی مربُوط تصوّر نہ تھا۔ یہ بات کہ اسرارِ خودی میں انائے انسانی ہی کو بیان کیا گیا ہے، بالکل ظاہر ہے۔ تاہم اس کی وضاحت میں علّامہ کا یہ بیان کافی ہوگا۔

> "یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پُر اسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ خودی یا انا یا میں جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے۔ مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی ......"
>
> (دیباچہ اسرارِ خودی)

لیکن بعد میں خودی کا یہ تصوّر انفرادیت سے کلیت کی طرف بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ گلشن راز جدید میں خدا کی فردیت مطلقیت سے مطابق معلوم ہوتی ہے۔

جو مطلق دریں دیرِ مکافات
کہ مطلق نیست جز نورُ السمٰوات

اِسی طرح خودی یا حیات بجائے جزئی حقیقی کے کلی طبعی

تسلیم کی جانے لگی ہے۔

سرو برگِ شکیبائی نہ دارد — بجز افراد پیدائی ندارد

کائناتِ عالم اور اس کے تعینات محض اعتباری ہیں۔ اِس طرح انفرادیت ایک وہم ہو کر رہ گئی ہے۔ کیونکہ تعیّن اور فرد ایک ہی شے ہے۔

زمانش ہم مکانش اعتباری است — زمین و آسمانش اعتباری است

عالم اگرچہ افراد کا مجموعہ ہے۔ متعین ہے۔ محدود ہے۔ مگر یہ سب اعتبارات ہیں۔ اُن کی حقیقت مطلق اور لامکانی یعنی غیر محدود ہے۔ یہ حدود جن سے افراد کا فرق اور کثرت محسوس ہوتی ہے محض دکھاوا ہیں۔ باطن یعنی حقیقت میں سوائے مطلقیت کے کچھ نہیں ہے۔

حقیقت لازوال و لامکان است — مگو دیگر کہ عالم بیکران است

کرانِ او درون است و برون نیست — درونش پست و بالا کم فزون نیست

حقیقت را چو ما صد پارہ کردیم — تمیز ثابت و سیارہ کردیم

خرد در لامکاں طرحِ مکاں بست — چو زنّارے زماں را در میاں بست

اسرارِ خودی میں ہمیں اِس سوال کا جواب بھی نہیں ملتا کہ خودی اور خدا میں کوئی ربط و تعلق ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔ اسرار کے دیباچے میں صرف اِتنا کہا گیا ہے۔

"جو (خودی) اپنے عمل کی رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر ہے۔"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خودی کی حقیقت، نامعلوم اور مجہول ہے۔ لیکن گلشنِ راز میں صراحت سے کہا گیا ہے کہ قدیم اور حادث یا خودی اور خدا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ظاہر و باطن اور خلوت و جلوت میں خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ یہ کثرتِ محسوس یا خودی کے تعیّنات اور افراد کی یہ جدائی محبت کے کرشمے ہیں۔ ورنہ عالمِ محسوس عدمِ محض ہے۔ اور ظاہر میں بھی سوائے حق کے کچھ نہیں ہے۔ اِس جدائی ہی نے ہم میں "انا" یا خودی کا احساس پیدا کیا ہے۔ اگر "انا" کا احساس نہ ہو تو کاروبارِ محبت ختم ہو جائے۔ اِس لئے اُس نے خود اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے یہ انجمن آرائی کی ہے۔ اور اپنے آپ کو غیر بنا کر پیش کیا ہے۔ اپنی رویت اور اپنا مشاہدہ بغیر اِس آئینۂ غیریت کے ممکن بھی نہ تھا۔ اب یہی بات علاّمہ کی زبان سے سُنیئے:-

خودی را زندگی ایجادِ غیر است — فراقِ عارف و معروف خیر است

قدیم و محدثِ ما از شمار است — شمارِ ما طلسمِ روزگار است

از و خود را بُریدن فطرتِ ماست — تپیدن نارسیدن فطرتِ ماست

جُدائی عشق را آئینہ دار است — جدائی عاشقاں را سازگار است

اگر ما زندہ ایم از دردمندی است — وگر پائندہ ایم از دردمندی است

من و او چیست اسرارِ الٰہی است — من و او بردوام ما گواہی است

محبت دیدہ ور بے انجمن نیست — محبت خود نگر بے انجمن نیست

بہ بزمِ ما تجلّی ہاست بنگر — جہاں ناپید و او پیداست بنگر

ز خود نارفتہ بیروں غیر بین است — میانِ انجمن خلوت نشین است

اگر خدا اور خودی دو مختلف الحقیقت افراد ہیں تو بندے اور خدا میں ربط، احاطہ اور قرب وصل، جس کی قرآن و حدیث میں صراحت موجود ہے سب ناممکن ہیں۔ ترقی و ارتقا سب وہم ہیں، یا پھر حلول و اتحاد تسلیم کرنا پڑے گا، جو اسلامی نقطۂ نظر سے کفر و شرک اور عقلی نقطۂ نظر سے محال ہے۔ صُوفیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دو موجود ہی نہیں ہیں۔ اِس لئے حلول و اتحاد باطل ہے۔

اور اِس لئے اپنا عرفان یا خودی کا عرفان ہی خدا کا عرفان ہے۔ علاّمہ نے حلول و اتحاد کے محال ہونے اور خدا اور خودی کے ایک ہونے کو کس خوبی سے بیان فرمایا ہے۔

خودی اندر خودی گنجد محال است   خودی را عینِ خود بُودن کمال است

یہ خودی محض وہم نہیں بلکہ حق ہے۔ اس کا عرفان خدا کا عرفان ہے۔ خدا کے عرفان کا طریقہ سوائے اِس کے کچھ نہیں کہ اپنی خودی میں ڈُوب کر اپنا عرفان حاصل کیا جائے۔ کیونکہ خودی عین خدا ہے۔ اِس لئے چاہیے کہہ لیجئے کہ سوائے خدا کے سب ہیچ ہے۔ یا یہ کہہ لیجئے کہ سوائے خودی کے سب کچھ ہیچ ہے۔

خودی را حق بداں باطل مپندار   خودی را کشتِ بے حاصل مپندار
وجود کوہسار و دشت و در ہیچ   جہاں فانی خودی باقی دگر ہیچ
دگر از شنکر و منصُور کم گوے!   خدا را ہم براہِ خویشتن جوے
بخود گم بہرِ تحقیقِ خودی شو   انا الحق گوے صدیقِ خودی شو

(گلشنِ راز جدید، زبورِ عجم)

"طلوعِ سحر"

غزل

(فراق گورکھپوری)

مطرب سے کہو آج اِس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی، ہر آنکھ بھر آئے
پلکوں کے تلے میکدۂ راز کے جلوے
ظلمت میں گناہوں کے چراغوں کو جلائے
دوشیزہ جوانی کی اِدھر حُبیت سی انگڑائی
تصویر اُدھر قوسِ قزح کھینچتی جائے
وہ شوخیٔ محتاط کے بچتے ہوئے انداز
دنیا بھی نہ رہتے دے، قیامت بھی نہ ڈھائے
یہ کم نگہی چشمِ فسُوں ساز کی کیسی
دیوانہ بناتا ہے تو دیوانہ ــــــــ بنائے
برسات کی اس رات ہیں لے دوست تری یاد
اِک تیز چھُری ہے، کہ جو کٹتی چلی جائے
کیوں تیرے غمِ ہجر ہیں دل ڈُوب چلا ہے
کیوں یاد تری آتے ہی تارے نکل آئے
کچھ ایسی بھی گُزری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

"قندیل"

قائدِ اعظم

مجھ کو اب تک یاد ہے

(پیرزادہ عبدالوحید)

سٹینڈرڈ کے وسیع ہال میں آرکسٹرا بیٹھے بیٹھے نغمے بکھیر رہا تھا۔ اور ہم صوبائی فیڈریشن کی مجلسِ عاملہ کے ارکان اپنے پیارے قائد کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ قاسم، قریشی، امجد اور احسان کبھی باہر دالان میں جا کھڑے ہوتے اور کبھی اندر آ کر کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور دل ہی دل میں قائدِ اعظم سے پُوچھنے کے سوالوں کو دُہرا لیتے۔ آج ہم نے قائدِ اعظم کو عصرانہ پر مدعو کیا تھا۔ خضر حیات کی غداری سے صوبہ کے حالات نے خطرناک پلٹا کھایا تھا اور ہم گورنمنٹ سے پہلی مرتبہ ٹکر لے رہے تھے۔ آج کی مجلس کا اصل مقصد حالاتِ موجودہ کے تحت اپنے بوڑھے جرنیل سے احکام اور پروگرام حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ ہم اسی خوشی اور شوق میں اندر باہر آ جا رہے تھے کہ کسی نے بلند آواز

سے کہا: "قائد اعظم آگئے"۔ نہ جانے اِن الفاظ نے کیا اثر کیا کہ ہم شوق اور نامعلوم خوف کے ملے جُلے جذبات میں باہر دوڑ پڑے۔

باہر ایک خوبصورت سی کار آکر رُکی۔ کار پر لیگ کا ننھا سا ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ قاسم اور ضیاء آگے بڑھے۔ کار کا دروازہ کھولا اور قائد اعظم جناح کیپ اور خوبصورت رنگ کی بہترین سِلی ہوئی شیروانی زیب تن کئے باہر تشریف لائے۔ اُن کو ایک عجیب سے پُرشوق جذبہ میں اندر لایا گیا۔ ہم کرسیوں کے پاس کھڑے اُن کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگے۔ صدر نے کھڑے کھڑے ہمارا تعارف کرانا شروع کیا۔

صوبہ کے صدر نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ہیں جالندھر فیڈریشن کے صدر" اور ایک لانبا سا گورا ہاتھ مصافحہ کے لئے میری جانب بڑھا۔ میں نے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو بغور دیکھا اور سوچنے لگا کہ کیا یہ وہی ہاتھ ہے جس کی ایک مخصوص اور ہلکی سی جنبش لاکھوں انسانوں کے مجمع کے دلوں میں ایک بجلی کی لہر پیدا کر دیتی ہے اُن کی کدورتوں کو چیرتی ہوئی ان میں خلوص اور یقین چھوڑتی ہوئی واپس اسی سرچشمہ میں جا چھپتی ہے میں دل پر فوراً ید بیضا کے متعلق سوچنے لگا۔ دل نے کہا کہ وہ ہاتھ بھی ضرور ایسے ہی ہوں گے۔ یکا یک میں نے اپنے ہاتھ کو ایک مضبوط گرفت میں محسوس کیا قائد اعظم ہاتھ ملا رہے تھے! اور میں نے دل میں کہا کہ اِن بوڑھے ہاتھوں میں اب بھی کس قدر طاقت موجود ہے۔ ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے قائد کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ لبوں پر ایک نُورانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو کمزور سے کمزور دل کو بھی بہادر بنائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔

تعارف کے بعد ہم اپنے قائد کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

اتفاقاً قائدِ اعظم عین میرے مقابل کی کرسی پر بیٹھے میں اُن کی مسحور کن شخصیت سے دب کر ایک بُت کی طرح ساکن بیٹھا تھا چائے آئی۔ بنائی گئی اور پی جانے لگی۔ میں نے بھی پیالی بنا کر اپنے سامنے دھر لی۔ جو اخیر تک پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی۔ کیونکہ میں اُن کی نگاہوں اور موجودگی سے اِس قدر سراسیمہ ہو چکا تھا کہ پینے کا خیال ہی نہ رہا۔

کسی نے گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا اور قائد اپنے مخصوص انداز میں دلوں میں اُمید اور فتح کے دیئے جلا رہے تھے۔ ہر کوئی اُن سے کسی مشکل کا ذکر کرنے کی کوشش کرتا۔ اور وہ اس کا جواب اِس انداز میں دیتے کہ کہنے والا اپنے سوال پر نادم ہونے لگتا اور اس کے دل میں اعتماد جاگ اُٹھتا۔ مگر اس کے باوجود قائد کا انداز دوستانہ بلکہ مشفقانہ تھا۔ اِس رویّہ نے مجھ میں جراٴت پیدا کی اور میں نے موقع پاتے ہی ایک مشکل جس کا مجھے ہر وقت دھیان لگا رہتا تھا، پیش کر دی۔ میں نے عرض کیا "کہ موجودہ حالات میں جب تک ہمارے پاس اپنا پریس نہ ہو ہم اپنا پروپیگنڈا جاری نہیں رکھ سکتے۔"

قائد یہ سُن کر کچھ رُک سے گئے۔ حقیقت میں اِس نازک وقت میں جبکہ ہم لیگ کی سرگرمیوں میں پہلی بار حکومت سے ٹکر لے رہے تھے۔ یہ نہایت ہی ضروری تھا کہ ہمارے پاس جماعت کے اخبار موجود ہوتے۔

میں نے محسوس کیا کہ قائد اعظم بھی میرے ہمنوا تھے چنانچہ فوراً ہی قائد اعظم نے مسکرا کر انگریزی میں فرمایا "میں یہ سُن کر بہت خوش ہوا ہوں۔" میں چکر میں پڑ گیا۔ کہ خدایا معاملہ کیا ہے۔ میں تو ایک کمزور پہلو پر روشنی ڈال رہا ہوں، اور قائد اعظم خوش ہیں تو کس بات پر؟ مگر میری یہ کشمکش صرف چند لمحوں کی تھی۔ فوراً ہی قائد اعظم نے ایک پُروقار انداز میں کہا:

"جب کوئی قوم کسی ضرورت کو محسوس کرے۔ تو سمجھو وہ پوری ہوگئی۔"

قائد اعظم کے اِن الفاظ نے اُن کی عظمت اور دانائی ہمارے دلوں پر منقش کردی۔ اور میں فخریہ انداز میں سوچنے لگا کہ میری قوم کس قدر خوش قسمت ہے کہ اسے محمد علی جناح جیسا ذہین اور دُور اندیش قائد ملا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے ہماری تسلی کے لئے بتایا کہ وہ لاہور سے دو اخباروں کا انتظام کر رہے ہیں۔ ایک اُردو کا۔ ایک انگریزی کا۔ اُردو اخبار کا تو انھوں نے نام بھی بتا دیا کہ اُس کا نام "نوائے وقت" تجویز ہوا ہے، اور دوسرا شاید "ایسٹرن ٹائمز" کو خرید کر فروغ دینے کا ارادہ تھا۔

جنگ کے متعلق انھوں نے حکم دیا کہ صرف قانون کی حدود میں رہ کر لڑی جائے۔ اور اِس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ برادرانِ وطن کو کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔ اور یہ تمام جنگ ایک منظم طریقہ پر ہو۔ برادرانِ وطن کے نقطہ پر میرا دل اُن کی فراست پر جھوم سا گیا۔ واقعی اِس نقطے کے اشارہ میں بہت سی چیزیں مضمر تھیں۔ چنانچہ بُوڑھے جرنیل کے نوجوان سپاہیوں نے اِس قدر منظم اور موثر طریقہ پر جنگ۔ لڑی کہ بہت ہی کم عرصہ کے اندر اندر غدار سر کے بل گر پڑا۔ اور قوم اپنی صلاحیتیں محسوس کر کے دنگ رہ گئی۔

چنانچہ اب بھی جب ہم پاکستان کی تعمیر کے سلسلہ میں آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو ہماری پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی ضرورتوں کو زیادہ سے زیادہ محسوس کریں تاکہ اُن کی تکمیل کا عرصہ کم سے کم ہو جائے۔ اور کانوں میں قائد اعظم کے (خدا اُن کے مرقد پر رحمت کے پھول برسائے) الفاظ گونجنے لگ جاتے ہیں:۔

When a nation feels the necessity of something, think it is done.

پاکستان

(ایس اے رحمٰن)

اِک مومن کا خوابِ دلکش، اک مومن کا کام
جس کو دیکھا ہے دُنیا نے یوں چڑھتے پروان
پیارا پاکستان

"منزل"

ہند کے عوام کی زبان

ہند کی متعدد جماعت نے ہندوستانی یا ہندی زبان کی ترقی یافتہ صورت کے خلاف جسے بعد میں عوام نے اُردو کا نام دیا تھا جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کے باوجود بہت سے لوگ بلا اختلافِ مذہب و ملت اِس کے شیدا نظر آتے ہیں۔ چنانچہ برِ اعظم کی آزادی کے بعد بھی ہند میں متعدد نئے اُردو رسائل جاری ہوئے ہیں۔ حال میں خلیق ابراہیم اور شریا مسری نالفہ وغیرہما کے اشتراک سے لکھنؤ میں ایک نیا ادبی رسالہ "منزل" کے نام سے جاری ہوا ہے جس کی نظم و نثر کا معیار بہت اچھا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہند کے علاوہ پاکستان کے بہی خواہانِ اُردو بھی ایسے رسائل کی سرپرستی کریں۔ ہم "منزل" کا ابتدائی مقالہ اور اُس سے حضرت جگر کی ایک غزل قارئینِ "مخزن" کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:۔

"نئے رسالوں کی اشاعت کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں لیکن اُردو کی کس مپرسی کے اِس دَور میں یہ قدم اُٹھانا، خاصی ہمت

اَور جو المروی کا کام ہے۔ ہم نے جب "منذر" کے نکالنے کا ارادہ کیا تو بہت سے لوگوں کو تعجب ہُوا اَور اُنہوں نے ازراہِ ہمدردی سمجھایا بھی کہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اِس قسم کا اقدام دانشمندی کے سراسر خلاف ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک اَور گروہ ایسا بھی تھا جس نے ہمارے اِس نیک ارادے کا خیر مقدم کیا اَور ہماری ہمتیں بڑھائیں۔ یہ سچ ہے کہ اُردو آج اپنی تاریخ کے نازک ترین دَور سے گزر رہی ہے لیکن اِسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو کی خدمت اَور اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے اِس سے بہتر اَور کوئی موقع نہیں ہو سکتا۔ سازگار حالات میں کسی مقصد کے لئے کام کرنا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی ناسازگار حالات میں۔

آج جو لوگ اُردو کے مستقبل سے مایوس ہیں، وہ زمانہ کی رفتار سے ناواقف ہیں اَور اُنہوں نے صحیح طور پر تاریخ اَور سماج کے ربط کو نہیں سمجھا ہے۔ کلچر اَور زبان عوام کی صدیوں کی سماجی جدوجہد کا ثمرہ ہوتی ہے۔ کوئی حکومت یا کوئی بھی مستبد ادارہ اِن چیزوں کو نہ تو مٹا سکتا ہے اَور نہ کسی مصنوعی کلچر اَور زبان کو عوام پر مسلط کر سکتا ہے۔ تقریباً ہزار سال تک ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی سرکاری زبان فارسی رہی، اَور انگریزوں کے دَورِ حکومت میں انگریزی کو سرکاری زبان کا مرتبہ حاصل رہا۔ لیکن فارسی اَور انگریزی کبھی ہندوستان کی عوامی زبانیں نہیں بن سکیں۔ یہ ضرور ہے کہ اُنہوں نے ہندوستان کے عوام کی بول چال پر مستقل اَور صحت مند اثر ڈالا ہے۔ اُردو یا ہندوستانی اِس ملک کے عوام کی صدیوں کی کوششوں کا حاصل ہے۔ یہ اِس عظیم کلچر کی آئینہ دار ہے جس کی تشکیل میں گزشتہ ایک ہزار سال کا عرصہ لگا ہے۔ اِس کلچر اَور اِس زبان پر جو حملہ ہوتا ہے وہ ہندوستان کی عوامی قوتوں کے خلاف ہوتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جمہور کی آواز دبائی نہیں جا سکتی۔ اُن کے حقوق کو ہمیشہ ہمیش کے لئے پامال نہیں کیا جا سکتا۔ جابرانہ قوتوں کا انجام ہمیشہ تباہی اَور شکست رہا ہے۔ آج جو لوگ عوامی طاقت کی ناشکستگی اَور جمہوریت کی فتح پر یقین نہیں رکھتے وہ تاریخ کے منطقی تقاضوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ اگر ہندوستان میں عوامی طاقتوں کو فتحمند ہونا ہے، اگر جمہوریت کو اِس ملک میں فروغ پانا ہے تو اُردو کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، جو لوگ اُردو کے مستقبل سے مایوس ہیں وہ ہندوستان میں جمہوریت کی شکست کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ شکست خوردگی کی ذہنیت نہ صرف یہ کہ ذہنی خودکشی کے مترادف ہے بلکہ یہ اندازِ تفکر بالواسطہ طور پر غیر جمہوری فسطائی طاقتوں کو مدد پہنچاتا ہے۔ آج اُردو کے لئے جدوجہد کرنا، جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔ جو اس سے رُوگردانی کرتا ہے وہ عوامی طاقتوں، اَور جمہوری حقوق سے روگردانی کرتا ہے۔

"منذر" اِس عزم کے ساتھ شائع ہو رہا ہے کہ وہ عوام کی خدمت کرے گا۔ اس میں جو ادب پیش کیا جائے گا وہ جمہوری ادب ہوگا۔ زندگی اَور حُسن "منذر" کا مطمحِ نظر ہے۔ بنی نوعِ انسان کی بہبودی اَور خوشحالی اس کا مقصد ہے:-

غزل

احساسِ شباب سے آغازِ محبت تک

(جگر مرادآبادی)

وہ احساسِ شوقِ جواں اوّل اوّل
وہ اِک عالمِ گلفشاں اوّل اوّل
مجسّم وہ تعبیرِ خوابِ محبت

وہ نظّارۂ ناگہاں اوّل اوّل
وہ موہوم سا اِک طلسمِ تمنّا
وہ مبہم سی اِک داستاں اوّل اوّل
وہ اِک کلفتِ شادماں تازہ تازہ
وہ اِک عشرتِ سرگراں اوّل اوّل
تخیّل میں رنگینیاں رفتہ رفتہ
تصوّر میں تصویرِ جاں اوّل اوّل
وہ اِک پیکرِ حُسن معصوم و سادہ
وہ اِک جلوۂ بے اماں اوّل اوّل
تکلّم میں بے ربط سا اِک تسلسل
خموشی میں حُسنِ بیاں اوّل اوّل
جگر آہ انجام و آغازِ اُلفت
سکوت آخر آخر فغاں اوّل اوّل

تبرّکاتِ "مخزن"

آفتاب

(اقبالؒ)

(منقول از مخزن ماہ اگست ۱۹۰۲ء)

ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں۔ یہ دعا اعترافِ عبودیت کی صورت میں گویا اُن تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظامِ عالم کے حیرتناک مظاہر کے مشاہدے سے اوّل اوّل انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اِس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم عقل و النفس کے عالموں کے لئے انتہا درجہ کا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے انسان کے رُوحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ دُعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اِس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ محققینِ السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں اُن کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونز مرحوم کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ زبانِ سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اِس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اِس مقام پر یہ ظاہر کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ سوِتر استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے اُردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اِس لفظ سے مراد اُس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسبِ ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیائے اللہ تعالےٰ کی ہستی کو نُور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے "اَللہُ نورُ السمٰوات و الارض" اور شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علیٰ ہٰذ القیاس افلاطونِ الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران کے قدیم انبیا کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اِس خاص صورت میں یہ وقت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل الفاظ کی آواز کی موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو اُن کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اُردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعرا ٹنی سن مرحوم کی طرح اپنے اشعار

ہیں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں حروفِ علت اور
میم کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو
جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔
اسی مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمہ کی بنیاد اس سوکت
(گفتارِ زیبا) پر رکھی ہے جس کو سریا نرائن اپنیشد میں گائیتری
مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ ترجمہ کرنے کو تو میں نے
کر دیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس
پر وہی رائے قائم کریں گے جو جیپسن نے پوپ کا ترجمۂ
ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گائیتری نہیں
ہے۔ محمد اقبال

اے آفتاب روحِ روانِ جہاں ہے تو!
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو!
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا!
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا!
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے!
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے!
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے!
تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے!
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے!
دل ہے خرد ہے روحِ رواں ہے شعور ہے!
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو!
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو!
تیرا کمال ہستیٔ ہر جان دار میں!
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں!
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو!
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو!
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری!
آزادِ قیدِ اول و آخر ضیا تری!

---

[1] یزدان کو قدیم حکمائے ایران اصل نور تصور کرتے ہیں۔ اس واسطے خالق کی جگہ یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ [2] یعنی دیوتا سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے ہیں۔ ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً اُن کا مفہوم وہی ہوگا جس کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اقبال

ایڈیٹر کے نام

سردار گوربخش سنگھ صاحب ادیب فاضل منشی فاضل

میں نے تیج دہلی میں پڑھا کہ رسالہ مخزن آپ کے زیر ادارت از سر نو کسوتِ حیات پہن کر جلوہ گر ہو رہا ہے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں اُردو ادب کا بے حد دلدادہ و شیفتہ ہوں۔ اگرچہ ہندوستان کی تقسیم نے بالعموم اور پنجاب کی تقسیم نے بالخصوص زبانِ اُردو کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اب اُردو زبان ایسٹ پنجاب میں کوئی دن کی مہمان ہے اس کو ملیامیٹ کرنے کے لئے لنگر لنگوٹے کسے جا رہے ہیں۔ خیر اس موضوع پر کسی دوسری فرصت میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔

۲۶ر جنوری۔ دیوراج ہائی سکول۔ موگا فیروزپور

جناب پورن چند صاحب اشا کر چیف ایڈیٹر "بندے ماترم" دہلی

سچ جانیے مخزن کا تازہ پرچہ دیکھ کر دل کو جو خوشی ہوئی وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ اِس تیسرے دَور کے ساتھ محترمی شیخ عبدالقادر اور آپ کے نام کا تعلق اس کے اچھا ہونے کی کافی دلیل ہے۔ یوں تو آجکل سینکڑوں رسالے اور جرائد نکل رہے ہیں مگر اُن پر پیسے خرچ کرنے کے بعد افسوس ہوتا ہے۔ لیکن مخزن خرید کر انسان محسوس کرتا ہے کہ اُس نے اپنے پیسوں کی صحیح قیمت وصول کی ہے۔ اِس وقت ملک، اگرچہ تقسیم ہو چکا ہے مگر مخزن کی قدردانی تقسیم نہیں ہوئی۔ اس کے قدردان جتنے پاکستان میں ہیں اس سے کہیں زیادہ ہندوستان میں ہیں۔ کسی اچھے پرچے کے درشنوں کو آنکھیں ترس گئی تھیں مگر آپ کے مخزن نے پربیاس بجھا دی ہے۔ آپ کے پرچہ کا اکثر انتظار رہتا ہے۔

حضرت باقر رضوی لکھنؤ

مارچ کا مخزن دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ آپ کی ادارت میں مخزن کے اس نئے دَور سے یہ توقع رکھنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اِس بحرانی دَور میں ایک صالح، صحت مند اور سلیقہ پسند ادب کی ترجمانی کریگا۔

اس کے کم و بیش تمام مضامین اور نظمیں اپنی نوعیت اور اسلوب کے لحاظ سے قابلِ قدر اور معیاری ہیں۔ رسالہ کی ترتیب سے بھی سلیقہ کا اظہار ہوتا ہے، سرورق پر رنگوں کا امتزاج البتہ صوفیانہ اور پُرمتانت نہیں۔ رسالہ کا نام جس طرزِ کتابت میں لکھا گیا ہے وہ نیا سہی مگر اس کے پڑھنے میں ذرا تکلف ہوتا ہے۔

حسین اعظمی نے ادیبوں کے "جلسہ کی کارروائی" پر بڑا حقیقت آمیز اور کامیاب طنزیہ لکھا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں مجھے اِس قسم کے جلسوں میں شرکت کا اکثر موقع ملا ہے۔ ان میں بہت کچھ وہی ہوتا ہے جس کا اظہار حسین اعظمی نے اپنے مقالہ میں کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ادیبوں کی عملی سرگرمیوں، ادبی نمونوں اور عوامی ادب پیدا کرنے کے بلند آہنگ دعووں میں بڑا تضاد ہے۔

شیر محمد اختر کا مختصر مضمون غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر کا مضمون اسلوب کے لحاظ سے قابلِ توجہ ہے۔ خوشی کی بات ہے کو آپ سید عیاض محمود کو افسانہ نویسی کی دنیا میں پھر کھینچ لائے ہیں۔ اُردو افسانہ کو ابھی اُن کی ضرورت ہے۔

مخزن المخازن کا مستقل باب خاصہ کی چیز ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اقتباسات میں اختصار اور تنوع کا خیال بہت ضروری ہے، نثر کے علاوہ نظم کے انتخاب کا جو طریقہ آپ نے رکھا ہے وہ بہت مناسب ہے۔ مختلف رسالوں میں چھپنے والی غزلوں کے اچھے شعروں کا انتخاب بھی گاہے ماہے دے دیا جایا کرے تو کیا مضائقہ ہے۔

حصۂ نظم میں اثر صہبائی اور الطاف پرواز کی غزلیں بہت اچھی ہیں۔

۲۹ مارچ۔ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی

مدت سے آپ کی خیریت سے محروم تھی۔ یہ معلوم کرکے خاص مسرت ہوئی کہ آج کل آپ "مخزن" کی ادارت کا اہم کام انجام دے رہے ہیں۔

آپ کی ادبی سرگرمیاں "مخزن" کو نئی زندگی دیں گی اور آپ کی توجہ "مخزن" کے لئے بہت مبارک ثابت ہوگی۔

راولپنڈی۔ ۵ مارچ

نبی احمد صاحب مہتمم کتب خانہ جامعۂ دہلی

رسالہ مخزن مدیر رسالہ جامعہ کے نام پہنچا۔ رسالہ آج کل بند ہے۔ کوشش ہے کہ جلد از جلد دوبارہ شائع ہو جائے۔ لیکن ابھی کچھ وقت لگے گا۔ اگر جناب مناسب خیال فرمائیں تو اُس وقت تک اپنا رسالہ بھجواتے رہیں۔ کیونکہ اس طرح کتب خانۂ جامعہ کے قارئین (طلبہ، اساتذۂ جامعہ) آپ کے رسالہ سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

مخزن کے دوبارہ بلکہ سہ بارہ اجرا پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ اُمید ہے آپ اس کی پرانی روایات کو زندہ رکھنے کی پوری کوشش فرمائیں گے۔ تازہ شمارے میں ڈاکٹر محمد باقر کا مضمون "مسٹر ڈیبنیس راس" خوب ہے۔ اِس قسم کے مضمون ضرور ہونے چاہئیں۔ مخزن المخازن بھی خوب ہے۔ ہر انتخاب لاجواب ہے۔

۱۲ مارچ

جناب علی امیر صاحب ناظم واسطی

مخزن کے احیاء ثالث پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، ہماری زندگی اور ادب کے اس نازک دور میں مخزن کا اجرا ایک نیک شگون ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ حضرت شیخ صاحب قبلہ کی رہنمائی اور آپ کی ادارت میں اپنی گزشتہ روایات کی پوری طرح پابندی کرتا ہوا ہر قسم کی افراط و تفریط سے بچ کر صالح اور صحت مند ادب کا واحد نمایندہ ثابت ہوگا۔ انگریزی ادیبوں کی زندگی اور کارناموں پر تنقید اردو ادب میں بالکل نئی چیز ہے۔ اور ہر حیثیت سے مخزن کے نمایاں شان ہے ہم کو ابھی انگریزی ادب سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

کیمبلپور۔ ۱۴ فروری

میر شوکت الزاہدی

الحمدللہ کہ جدید مخزن نہ صرف قدیم مخزن ہی کی شاندار روایات کو از سرِ نو زندہ کر رہا ہے۔ بلکہ اس میں مزید گرانقدر اضافوں کا بھی متمنی ہے۔ خدا آپ کو نیک ارادوں اور مبارک کوششوں میں کامیاب و کامران کرے تاکہ مخزن پھر اپنی گزشتہ روایات سے بھی کہیں بڑھ کر آسمانِ علم و ادب کا نیّرِ درخشاں بن کر چمکے۔

دارالامان بخشنے والا۔ ۴ فروری ۱۹۴۹ء

مخزن معاصرین کی نظر میں

"تیج" دہلی

"مخزن" پہلے پہل ۱۹۰۱ء میں لاہور سے سر شیخ عبد القادر نے جاری کیا تھا اور ملک بھر میں اس نے قابلِ رشک مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ شیخ صاحب کی سرکاری مصروفیتوں کی وجہ سے دو بار بند ہوا۔ آخری بار تو گویا اس کی زندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ اب پھر شیخ صاحب موصوف کی سرپرستی اور حامد علی خاں کی ادارت میں جنوری سے اس کا دورِ سوم شروع ہوا ہے۔ سرپرستوں کی فہرست میں ہندوستان گیر شہرت کے ادیبوں کے نام شامل ہیں۔ شیخ صاحب کے علاوہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، میر غلام بھیک نیرنگ، ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب، پروفیسر حمید احمد خاں، حضرت اثر صہبائی کے اسمائے گرامی مخزن کی کامیابی کے لئے کافی ضمانت ہیں۔

اپنے دورِ اوّل میں مخزن خالص ادب کا علمبردار تھا۔ مذہبی اور سیاسی مضامین سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اسی وجہ سے ہر طبقے اور ہر مذہب میں آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ اس موجودہ دور کا یہ نمبر بھی اپنی اوّلین روایات کا حامل ہے۔ ہم سر شیخ عبد القادر کی ذاتِ گرامی اور حامد علی خاں کی ادب دوستی سے توقع رکھتے ہیں کہ مخزن اپنی روش کو نباہے گا اور پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی اپنی پہلی ہر دلعزیزی حاصل کرلیگا۔

۱۷ جنوری ۱۹۴۹ء

"ماہِ نو" کراچی

مخزن کا نام زبان پر آتا ہے اور اب سے آدھی صدی پہلے کی ادبی زندگی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اُردو صحافت میں مخزن کے اجرا اور اس کی اشاعت کی حیثیت ایک اہم سنگِ میل کی سی ہے۔ اُردو کے اچھے رسالوں کے متعلق کوئی گفتگو ہو تو ناممکن ہے کہ مخزن کی مہتم بالشان خدمات کا ذکر نہ آئے۔ اِس کی یہی ادبی اہمیت ہے جس کی بنا پر مخزن کے ایک دفعہ بند ہو جانے کے بعد بار بار اس کے احیا کی کوششیں کی گئیں لیکن بدقسمتی سے مخزن اپنے کسی دور میں اِس بلندی تک نہیں پہنچ سکا جو اِس کے دورِ اوّل کا طرۂ امتیاز تھی۔

مخزن اب پھر نکلنا شروع ہوا ہے۔ اب تک اس کے دو شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اِن دونوں کے مطالعہ کے بعد یہ یقین ہوتا ہے کہ مخزن کا یہ دورِ نو، اِس کے دورِ اوّل کی خصوصیات کا حامل ہو گا۔ رسالہ کی ادارت اُردو کے مشہور ادیب اور مدیر حامد علی خاں کے سپرد ہے۔ علامہ عبد القادر نے بھی اسکی اعزازی ادارت قبول فرمائی ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو یقین کو اور بھی محکم بناتی ہیں۔

مارچ ۱۹۴۹ء

مدیر "نظام" کراچی

"مخزن" کے دو شمارے نظر سے گزرے۔ ادب کے اِس ہنگامی دور میں ایک سلجھے ہوئے معیاری پرچے کی اشد ضرورت تھی جو اُمید ہے "مخزن" سے پوری ہو گی۔

جبریل

مطبوعات

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنی ضروری ہیں

خمِ کاکل۔ سیف الدین سیف کا مجموعۂ کلام ہے سیف صاحب نے نظم، غزل، گیت اور رباعی سبھی اصنافِ کلام پر طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل سے انہیں خاص شغف معلوم ہوتا ہے چنانچہ ۱۳۶ صفحات میں سے ۸۰ صفحے صرف غزل کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ غزل کہنا آسان ہونے کے باوجود بہت مشکل ہے، کیونکہ جب تک جذبات کی فطری صلاحیت ساتھ نہ دے محض قادر الکلامی کے بل پر غزل جیسے غزل کہا جاسکے سرانجام نہیں پاتی۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ سیف صاحب اُن چند نوجوان شعرا میں سے ہیں جو غزل کے اشعار کہہ سکتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

کیا منزلِ غم سمٹ گئی ہے
اِک آہ میں راہ کٹ گئی ہے

پھر سامنے ہے پہاڑ سی رات
پھر شام سے نیند اُچٹ گئی ہے

یہ رنگ یہ رُوپ ارے توبہ کندن سے شعلے اُٹھتے ہیں
جلوے کی نظر کو تاب کہاں جوبن سے شعلے اُٹھتے ہیں

یہ سرد ہوا کے جھونکے بھی کچھ دل کی لگی بھڑکاتے ہیں
آتش سا برستا ہے پانی ساون سے شعلے اُڑتے ہیں

بوسے وہ کچھ ایسی لے رہی ہے
دل ہی میں رہا سوال اپنا

جس دن سے بھلا دیا ہے تُو نے
آتا ہی نہیں خیال اپنا

اِس مجموعہ میں نظمیں گو نسبتاً کم ہیں لیکن بحیثیتِ مجموعی شاید غزل سے بھی زیادہ کامیاب ہیں۔ اور موضوع اُن کا بھی بیشتر غزلیہ ہی ہے۔ سیف صاحب کی نظم "ناچ" الفاظ کی موسیقی کی وجہ سے خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:۔

بانہوں کے رس بھرے لُبھاؤ میں
لوچ ہو لچک ہو اور کچھ نہ ہو
چھن چھنا چھنک ہو اور کچھ نہ ہو
پنڈلیوں کے مرمریں تناؤ میں
ساز کی لپک ہو اور کچھ نہ ہو
گونج کی گمک ہو اور کچھ نہ ہو
بازوؤں کے رس بھرے لُبھاؤ میں

گیتوں کی تعداد اور بھی کم ہے لیکن وہ بھی ایسے ہی دل کش ہیں۔ اِس مجموعے میں رباعی کی شرکت محض برائے نام معلوم ہوتی ہے یعنی آخر میں چار رباعیاں دے دی گئی ہیں، جو بُری نہیں۔ کاغذ، جلد اور کتابت و طباعت قابلِ تعریف ہے۔ قیمت دو [۲] روپے۔

"نیا ادارہ" لاہور سے ملتی ہے۔

مظاہرِ ذہنیات۔ یہ کتاب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ایم۔ ڈی کی تصنیف ہے۔ اِس کا موضوع کچھ نفسیاتی ہے اور کچھ طبّی۔ مصنّف کا مقصد یہ ہے کہ فرد اپنی جسمانی اور ذہنی تربیت اِس اُسلوب سے کرے کہ وہ زندگی میں کامیابی حاصل کر سکے۔ اِسی لئے اِس کتاب کا دوسرا نام "مشعلِ کامیابی" رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس کتاب کی تصنیف میں یورپ کے بڑے بڑے ماہرینِ نفسیات کی کتابوں سے بھی مدد لی ہے۔ اور بہت مفید معلومات جمع کر دی ہیں۔ ابتدا میں حقیقتِ نفس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اِس کے بعد نفس کی قوّتِ مدرکہ کی تشریح و توضیح کے بعد ذہنی تربیّت کے گُر بتائے گئے ہیں۔ بعض عنوانات یہ ہیں (۱) قوّتِ حافظہ (۲) عملِ فراموشی (۳) توجہ (۴) ترقیٔ حافظہ کے علمی طریقے (۵) ترقیٔ حافظہ کے عملی قواعد (۶) مطالعہ کرنے کا طریقہ (۷) توجہ کی یکسوئی (۸) اعتقاد سے صحت کس طرح مطابقت کرتی ہے (۹) کامیاب اور ناکام شخص کی صفات وغیرہ۔ اِس کتاب کا مطالعہ نوجوانوں سے زیادہ جوانوں کے لئے اور اُن سے زیادہ بوڑھوں کے لئے مفید ہے۔ حجم بڑی تقطیع کے ۱۰۵ صفحات، قیمت دو [۲] روپے۔

پتا:۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ایم پی آئی۔ ایم ڈی۔ بادامی باغ۔ لاہور

(عبدالحمید نظامی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے امرت الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مخزن" مال روڈ لاہور سے شائع کیا) "م"

جلد

مخزن

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور۔ جون سنہ ۱۹۴۹ء

سلسلۂ مطبوعات نوائے وقت

سالانہ:۔ سات روپے

ششماہی:۔ چار روپے

ایک پرچہ:۔ دس آنے

The "MAKHZAN" Lahore

مدیر،	صفحۂ اول،	
محمد حسن عسکری،	سرریئلزم،	۳
منشی تلوک چند صاحب محروم،	غزل،	۱۱
جلیل حسین جلیل،	چاندنی رات میں…،	۱۲
جیلانی،	سنہ ۱۹۴۷ء،	۱۵
خادم ہوشیارپوری،	مادرِ ہندوستان کے نام،	۳۴
قادر فریدی،	نذرِ آزاد،	۳۵
ابن حسن زیدی،	قربانی،	۳۶
خلیفہ عبدالحکیم،	خدا اور شاعری،	۴۴
جلال الدین اکبر،	غزل،	۴۵
امین الرحمٰن،	پرستانی کہانیاں،	۴۶
اثر صہبائی،	تجلیات،	۵۱
سلیم واحد سلیم،	غزل،	۵۲
نشتر جالندھری،	اصلاحِ زباں،	۵۳
سید نذیر حسین ناشاد،	کراچی،	۵۵
سید آغا حسین،	شکاری جانوروں کا شوق،	۵۸
مدیر،	مخزن المخازن،	۶۱
مدیر،	مطبوعات،	۶۷

صفحۂ اوّل

جون کی اشاعت کے ساتھ "مخزن" کی پہلی جلد تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ ماہوار رسائل کی جلدیں عموماً بارہ پرچوں پر مشتمل ہوتی ہیں، لیکن مخزن کے ماہوار پرچوں کی ضخامت اتنی کافی ہے کہ سال بھر کے پرچوں کی یکجا جلد زیادہ بھاری ہو جائیگی۔ یہ ظاہر ہے کہ جلد اگر نسبتہً ہلکی پھلکی ہوگی تو جلد بندی کے بعد مطالعے میں بہت آسانی رہے گی۔ اِسی بنا پر ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مخزن کی جلدیں چھ چھ مہینوں کی اشاعتوں پر محتوی ہوں۔

موجودہ پرچے کے آخر میں ہم پہلی جلد کے تمام مضامین کی ایک مکمل فہرست یکجا[1] شائع کر رہے ہیں۔ جلد بندی کے وقت یہ فہرستِ مضامین حسبِ پسند جلد کے شروع میں بھی رکھی جا سکتی ہے۔ اسی غرض سے اس پر صفحات کے نمبر بھی درج نہیں کئے گئے۔ گزشتہ مہینوں کے بعض زاید پرچے ابھی ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ اگر کسی خریدار کے پاس کوئی پرچہ موجود نہ ہو تو بروقت۔ فرمائش پر وہ اسے بذریعہ وی پی حاصل کر سکتے ہیں۔

ہمیں مسرت ہے کہ موجودہ اشاعت کے ساتھ "مخزن" نے اپنے دَورِ سوم کی پہلی منزل بخیر و خوبی طے کر لی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان و ہند میں اُردو کے جن بہی خواہوں نے "مخزن" کے اجرا پر اِس کا پُرجوش خیر مقدم کیا تھا وہ اِس خوشی میں ہمارے ساتھ شامل ہیں۔

اِس موقع پر ہم اُن تمام بزرگوں اَور دوستوں کا پُرخلوص شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے "مخزن" کے مرتب کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹایا اَور جن کی مدد کے بغیر ہم کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ سب سے پہلے ہم "مخزن" کے بانی اور مدیرِ اعزازی حضرت شیخ عبد القادر مدظلہ العالی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی سرپرستی اَور ہمت افزائی کے بغیر "مخزن" مخزن نہ بن سکتا تھا۔ دوسرے بزرگوں میں سب سے بڑھ کر ہم پنڈت برجموہن دتاتریا کیفی دہلوی مدظلہ کے شکر گزار ہیں جنکی بزرگانہ کرم گستری اَور عالمانہ نظم و نثر نے "مخزن" کے اوراق کی توقیر بڑھائی۔ شعرا میں حضرت نیرنگ کی بزرگانہ توجہات پر ہم دلی شکر گزاری کے جذبات پیش کرتے ہیں۔ "مخزن" کے قدیم کرمفرماؤں میں منشی تلوک چند صاحب محروم اَور پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی کے نام بہت ممتاز ہیں۔ ہمیں دلی مسرت ہے کہ یہ دونوں بزرگ دَورِ سوم میں بھی "مخزن" کو نہیں بھولے اَور ان کی توجہات ہمارے شاملِ حال ہیں۔ جوان اَور نوجوان ادبا و شعرا میں ہم حضراتِ ذیل کے خاص طور سے ممنونِ احسان ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، حضرت اثر صہبائی، ڈاکٹر محمد باقر، جنابِ محمد حسن عسکری، امین الرحمٰن صاحب، شیخ محمد اسمٰعیل، حضرات مقبول احمد پوری، بسمل، جگن ناتھ آزاد، ونگ کمانڈر سید فیاض محمود، پروفیسر حمید احمد خاں، پرنسپل عابد علی، محترمہ اختر جہاں فیروز الدین، حضرت تابش دہلوی، شیر محمد صاحب اختر، حضرت ناشاد، حضرت عاشق بٹالوی، حضرت یوسف ظفر، حضرت قیوم نظر، جناب جلیل، جناب عارف عبد المتین، جناب حسین اعظمی، کیپٹن ضمیر جعفری، حضرات صادق قریشی، الطاف پرواز، انور جلال، نذیر مومن، مظفر علی سید، ابن حسن زیدی، ناز ش رضوی، حسینی سرشار، عبد المجید صاحب حیرت وغیرہم۔

[1] فہرست سے کام لینے کے لئے مخزن کے صفحوں کے نیچے لکھے ہوئے نمبر دیکھئے۔

"مخزن"

سوررئیلزم

(محمد حسن عسکری)

اب سے دس بارہ سال پہلے "سوررئیلزم" کی وہ دھوم تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ادب اور آرٹ کی قدریں ہی بالکل بدل جائیں گی، اور ایک بالکل نئی قسم کا ادب اور آرٹ پیدا ہوگا، یا کوئی بنیادی طور سے اتنی مختلف چیز پیدا ہوگی جسے ادب اور آرٹ کہنا ہی ناممکن ہوگا۔ ایک زمانے میں تو اس تحریک سے ایسی اُمیدیں یا ایسے خدشے وابستہ تھے، یا پھر اب وہ زمانہ آیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ تحریک بالکل ہی مرگئی، اور مداری تماشا دکھا چلتا بنا۔ اور تو اور اس تحریک کے پُرانے حامیوں تک کو اپنے پُرانے رویّے پر شرم آنے لگی ہے۔ اور وہ یا تو بالکل ہی بے تعلقی ظاہر کرنے لگے ہیں، یا پھر اپنے تعلق کی عجیب و غریب تاویلیں پیش کرنے لگے ہیں۔ مگر بے تعلقی کے ان دعووں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ یہ تحریک پورے ادب اور خصوصاً شاعری پر زبردست اثرات چھوڑ گئی ہے۔ نظریاتی طور سے چاہے یہ تحریک ختم ہوگئی ہو، مگر عملاً اب بھی جاری ہے، البتہ مختلف گروہوں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق اس میں اور عناصر شامل کر لئے ہیں۔ یہ حال تو انگلستان اور امریکہ کا ہے۔ رہا فرانس، تو وہاں ابھی تک یہ تحریک ایک تحریک کی حیثیت سے کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ آندرے برتوں جو ایک طرح اس تحریک کے بانی ہیں ابھی تک اُسی جوش و خروش کے ساتھ لکھ رہے ہیں، بلکہ پکاسو بھی ۲ اپنے کمیونسٹ ہونے کا اعلان

کر چکے ہیں، سوررئیلزم کے اثرات سے آزاد نہیں ہیں۔ اُنہوں نے جنگ کے بعد سے لیکر اب تک جو تصویریں بنائی ہیں اُنہیں صُوری اُور معنوی دونوں طرح اِسی تحریک کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اِس تحریک کے ابتدائی دَور میں بعض لوگوں نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ یہ تحریک تو بس ایک پھلجھڑی ہو کے رہ جائے گی، وہ غلط ثابت ہوئی۔ فرانس میں اِس تحریک کا زمانہ سنہ ۱۹۲۵ء سے سنہ ۱۹۳۹ء تک ہے، اُور انگلستان میں سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۳۹ء تک۔ ادب اُور آرٹ کی اُور تحریکوں کو دیکھتے ہوئے تو اِس تحریک کی عمر بہت کم رہی ہے، مگر اس کے اثرات مقابلۃً کہیں زیادہ ہیں۔ اُور اِس تحریک کا خاتمہ بھی اِس طرح نہیں ہوا جیسے اُور تحریکوں کا ہوتا ہے، یعنی ایک تحریک پیدا ہوئی، اُس نے چند شاہکار پیش کئے، پھر جب اُس کے تمام امکانات ختم ہونے لگے تو آہستہ آہستہ مر گئی۔ سوررئیلزم اِس فطری طریقے سے ختم نہیں ہوئی، بلکہ جنگ نے اُسے ختم کر دیا۔ جنگ کی وجہ سے دنیا کے خارجی حالات اُور لوگوں کے ذہن اُور جذباتی رجحانات بالکل ہی بدل گئے تھے، اُور زندگی کی معمولی، چھوٹی چھوٹی، سادہ چیزیں زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھیں۔ اِن حالات میں ظاہر ہے کہ سوررئیلزم جیسی تحریک نہیں پنپ سکتی تھی، مگر چونکہ یہ تحریک اپنے ساتھ احساس اُور اظہار کے نئے طریقے لائی تھی، جن سے ادب اُور آرٹ میں واقعی اضافہ ہوا تھا، اِسی لئے اِس تحریک کے کئی بنیادی عناصر ادب میں مستقل طور سے شامل ہو گئے ہیں۔ میرا مطلب سوررئیلزم کے نظریات اُور عقیدوں سے نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں نے جو نئے اسالیبِ اظہار ایجاد کئے تھے اُن کے بنیادی عناصر سے ہے۔ یہ تحریک جو اپنے علمبرداروں کے دعوے کے مطابق ادب اُور آرٹ (یعنی روایتی ادب اُور آرٹ) کو ختم کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی، اب خود ادب اُور آرٹ کا ایک حصہ اُور خود ایک روایت بن گئی ہے، اُور اس نے ادب کو واقعی فائدہ پہنچایا ہے۔ جو لوگ اِس تحریک سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں، دراصل وہ خود اِسی تحریک سے پیدا ہوئے ہیں۔

بظاہر یہ تضاد بھی اچھا خاصا مُعمّا ہے۔ مگر یہ اُلجھن اُسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ ہم سوررئیلزم کو ایک ایسی تحریک سمجھتے رہیں، جس کے مخصوص نظریات تھے، جو ایک خاص وقت میں پیدا ہوئی اُور ایک خاص وقت پر مر گئی۔ اگر ہم اپنا نقطۂ نظر ذرا سا بدل دیں تو یہ پہیلی اپنے آپ سے اپنے آپ حل ہو جاتی ہے۔ سوررئیلزم صرف ایک تحریک نہیں تھی، بلکہ جیسا خود اِس تحریک کے ایک علمبردار نے کہا ہے، سوررئیلزم ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ اِس کیفیت کے مظاہر صرف پچھلے پچیس سال ہی میں نہیں، بلکہ ادب اُور آرٹ کی پُوری تاریخ میں وقتاً فوقتاً نظر آتے رہے ہیں، خصوصاً انگریزی ادب میں؛ جہاں تک بیچارے سوررئیلسٹوں کا تعلق ہے اُنہوں نے بھی کبھی یہ دعوےٰ نہیں کیا کہ ہم ایک بالکل نئی چیز شروع کر رہے ہیں بلکہ اُنہوں نے تو پُرانے ادب میں سے وہ مقامات اُور وہ عناصر بڑی محنت سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکالے جو اُن کے نظریوں سے مطابقت رکھتے تھے۔ اِس سلسلے میں اُن کی پشت پناہی سب سے زیادہ انگریزی ادب نے کی، اُور سترھویں اُور اٹھارھویں صدی کے وہ ناول نمونے کے طور پر پیش کئے گئے جو عام طور سے مزخرفات سمجھے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو اتنا مبالغہ کیا کہ ہوریس والپول، مُنک لوئس اُور خوفناک کہانیوں کے مصنفوں کو جین آسٹن، تھیکرے اُور ڈکنز سے

بھی بہتر بنا دیا۔ شاعری میں اپنی تائید کے لئے انہیں بلیک، لوئس کیرل اور ایڈورڈ لیئر کی نظمیں ملیں۔ اور شیکسپیئر کے یہاں تو خیر ہر چیز ہی نکل آتی ہے۔ اس طرح یہ تو ثابت ہو گیا کہ یہ لوگ جو نئی باتیں کرنا چاہتے تھے ان کا جواز ادب میں موجود ہے، اور عام طور سے اس تحریک کی جو مخالفت ہوئی وہ محض ذہنی کاہلی یا ادب کو پوری توجہ سے نہ پڑھنے کے باعث ہوئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرض کیا کہ یہ رجحانات ہمیشہ سے ادب میں موجود تھے، مگر خاص طور سے اسی وقت یہ رجحانات کیوں اُبھرے اور اس تحریک نے کیوں زور پکڑا۔ خود اس تحریک کے اولین علمبرداروں کا یہ دعویٰ تھا کہ سوررئیلزم ایک تاریخی ضرورت ہے، ہمارے زمانے کی سیاسی اور اقتصادی حالت اور ادب کی نشو و نما کا انداز ہمیں یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

جہاں تک خارجی دنیا میں اس تحریک کے جواز کا تعلق ہے وہ بالکل سیدھی سادھی بات ہے۔ ہماری دنیا میں ایک چھوٹا سا طبقہ بڑے طبقے کی محنت سے ناجائز فائدہ حاصل کر رہا ہے۔ چنانچہ انسانوں کی اکثریت پر عرصۂ حیات تنگ ہے یہ زندگی بذاتِ خود ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ اِس لئے اِس زندگی کے اظہار کے لئے ڈراؤنے خوابوں کی ہیئت استعمال کرنی لازمی ہے۔ پھر با اقتدار طبقے نے اپنی سیاسی مصلحتوں اور مجبوریوں کی بنا پر ایک خاص قسم کے اخلاقی نظام کو رواج دیا ہے جو انسان کی جبلتوں اور خصوصاً جنسی جذبوں پر ناجائز پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اِن حالات میں انسان بڑی گھٹن محسوس کرتے ہیں، اور ناجائز پابندیوں کی وجہ سے اُن کے اندر نفسیاتی اُلجھنیں، ہسٹیریا اور جنون پیدا ہوتا ہے۔ نفسیاتی طور سے بیمار شخصیت ہمارے زمانے کے اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی نظام کا لازمی نتیجہ ہے جیسی روح ویسے فرشتے۔ اگر ہمارے زمانے کی جذباتی زندگی ہسٹیریا کا دوسرا نام ہے، تو ہمارے ادب اور آرٹ کا موضوع بھی ہسٹیریا ہو گا، اور اُن کی اوضاع بھی ہسٹیریا، ڈراؤنے خوابوں یا اِسی قبیل کی دوسری چیزوں سے اخذ کی جائیں گی، اِن حالات کے پیشِ نظر سوررئیلسٹ لوگ اپنے انداز کو بیسویں صدی کا لازمی ذریعۂ اظہار سمجھتے تھے۔ اگر آپ یہ دلیل مانتے ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ سوررئیلزم آج بھی ویسی ہی لازمی اور معنی خیز ہے جیسی آج سے پچیس سال پہلے تھی، کیونکہ جن خارجی حالات کی طرف یہ لوگ اشارہ کرتے تھے انہیں دوسری جنگِ عظیم نے بھی کچھ زیادہ نہیں بدلا۔

سوررئیلزم کا دوسرا جواز نئے علوم ہیں، خصوصاً فرائڈ کی نفسیات۔ فرائڈ نے انسانی نفسیات کا جو نیا تصور پیش کیا ہے اُس میں جبلتیں ہی سب کچھ ہیں، اور عقل کا عمل دخل یوں ہی معمولی سا ہے۔ یہ جبلتیں سب سے واضح شکلیں خواب، ہسٹیریا اور اسی قسم کی ذہنی بیماریوں میں حاصل کرتی ہیں۔ چنانچہ ان کے مشاہدے، اور مطالعے کا بہترین موقع اُسی وقت ہوتا ہے جب آدمی سوتا ہو یا اُسے کوئی نفسیاتی عارضہ لاحق ہو۔ اِس نئے علم کے زیرِ اثر سوررئیلسٹوں نے بھی نفسیاتِ فاسدہ کو زیادہ اہم سمجھا، بلکہ ان چیزوں کو موضوع بنانا تو الگ رہا، اپنی ٹیکنیک تک اُن اصولوں کے مطابق وضع کی جن کے مطابق خواب ظہور پذیر ہوتے ہیں، یا کسی پاگل کا دماغ عمل کرتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی تصویروں اور نظموں کے لئے علامتیں اور علامتوں کی تفسیریں بھی فرائڈ سے مستعار لیں۔ جس طرح فرائڈ کے نزدیک خواب کے معنی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو بالکل ظاہر ہوں، اور دوسرے وہ جو ظاہری شکلوں

کے نیچے تہ بہ تہ چھپے ہوئے ہوں۔ اِسی طرح سوررئیلسٹوں کی تخلیقات میں بھی ایک ایک چیز کے کئی کئی معنی ہوسکتے ہیں۔ چونکہ ہر زمانے کا ادب اور آرٹ اُس دَور کے تازہ ترین علمی نظریات سے فیض یاب ہوتا ہے، اس لئے سوررئیلسٹ کہتے ہیں کہ فرائڈ کی نفسیات کو اپنانا ایک تاریخی ضرورت ہے۔

یہ سارے جواز اور دلیلیں تو خارجی دُنیا سے متعلق تھیں اب ادب کی اندرونی تحریکوں کی طرف آیئے، اور یہ دیکھئے کہ سوررئیلزم واقعی ناگزیر تھی یا محض تھکے ہوئے دماغوں نے اپنی دل لگی کے لئے یہ کھیل کھیلا تھا۔ مگر اس دوسری صورت میں بھی ایک بات قابلِ لحاظ ہے۔ اگر ہم مخصوص حالات میں اور مخصوص ادبی رجحانات کے ماتحت دماغوں کا تھک جانا ضروری سمجھ لیں تو اس طرح بھی سوررئیلزم ناگزیر بن جاتی ہے۔ بہرحال، اب ہم پچھلے ڈیڑھ سو سال کے مغربی ادب اور آرٹ پر غور کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں فرانس کی اہمیت دوسرے مغربی ممالک سے زیادہ ہے کیونکہ ہر تحریک کے لئے نظریے وضع کرنے اور ان نظریوں کے مطابق اپنے تخلیقی عمل کو آخری منطقی حدوں تک پہنچانے کا شوق سب سے زیادہ فرانسیسیوں ہی کو ہے اِس ڈیڑھ سو سال کی ادبی تاریخ پر غور کرتے ہوئے ایک بات اور ذہن میں رکھیئے۔ اِس دوران میں اقتصادی اور سیاسی حالات بنیادی طور سے (رُوس کے علاوہ) سارے یورپ میں ایک خاص قسم کے رہے ہیں۔ اِس لئے جو رُجحانات ڈیڑھ سو سال پہلے پیدا ہوئے تھے اُن میں تبدیلی ہونے کے بجائے شدت ہی آتی چلی گئی ہے۔

رومانی تحریک کی سب سے بڑی دریافت یہ تھی کہ انسان کے اندر سب سے اہم چیز اُس کے جذبات ہیں، اُن پر عموماً عقل کا زور نہیں چلتا، اور شاید چلنا بھی نہیں چاہیئے۔ جذبات پرستی کے ساتھ داخلیت اور انفرادیت پرستی آئی، یعنی فرد کو معاشرہ سے الگ کرکے، بلکہ عموماً معاشرہ کو اُس کا مخالف سمجھ کے، فرد کے جذبات پر غور ہونے لگا۔ یوں تو رومانی تحریک کے خلاف ردِّ عمل بھی ہوا، رومانیت کی مخالفت بھی کی گئی، لیکن بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اس دَور کے سارے ادب اور آرٹ کا جزو بن کے رہ گئیں۔ اِس کا احساس خود رومانیت کے مخالفوں کو بھی رہا ہے۔ ژ ولانگ نے اعتراف کیا ہے کہ مجھ میں رومانیت کا زہر سرایت کرگیا ہے۔ جذبات کو اس سارے ادب میں وہی اہمیت حاصل رہی ہے، البتہ جذبات پر غور کرنے کا انداز بدل گیا ہے۔ رومانی لوگ اپنے اندر محض جذبے کی پیدائش ہی کافی سمجھتے تھے، اس کے بعد وہ اُس جذبے سے لطف اندوز ہونے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ مگر جذبات صرف خوشگوار ہی نہیں ہوتے ناخوشگوار بھی ہوتے ہیں۔ پھر خوشگوار جذبات بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتے۔ اُن کا ردِّ عمل ہمیشہ بدمزگی یا بیزاری ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ جذبات اپنی شدید شکل میں خوفناک بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جذبات سے دلچسپی بہت جلد نفسیات فاسدہ اور تجزیے کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ دلاکرواکی تصویروں میں جو رومانیت اور حقیقت پسندی ان دو تحریکوں کے بیچ میں ہے، اذیت پسندی بہت نمایاں ہے۔ یہ تو میں نے ایک موٹی سی مثال لی ہے، ورنہ نفسیاتی پیچیدگیاں ہر رومانی ادیب، شاعر اور مصوّر کے یہاں ملیں گی۔

اس کے بعد جب حقیقت پسندی کا دَور شروع ہوا تو جذبات سے دلچسپی کم نہیں ہوئی، بلکہ ناخوشگوار جذبات سے دلچسپی بڑھ گئی۔ البتہ اب جذبات پر علمی طریقے سے غور کرنے اور ناگہ نہیں

پھر پھاڑ کر اُن کی تہ تک پہنچنے کی کوشش ہونے لگی۔ چنانچہ اب ادب اور آرٹ کا موضوع جذبات نہیں بلکہ جبلتیں بن گئیں شاعری میں جن لوگوں کے یہاں نفسیاتی پیچیدگیاں، اعصابی اختلال اور شدید جذباتی کشمکش زیادہ نمایاں ہے، اور جنہیں سورریلسٹوں نے بھی اپنا پیش رو مانا ہے وہ ژیرار دَ نیروال اور بودلیئر ہیں۔ پھر جب میلارمے، ورلین وغیرہ کے ساتھ علامتی تحریک کا نمبر آتا ہے تو نا ور داخلی تجربات کی طرف توجہ زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور اظہار کے روایتی اسالیب سے لوگ ہٹ کے چلنے لگتے ہیں۔ اس تحریک کے پہلو بہ پہلو آرٹ میں فان گوگ اور گوگاں وغیرہ ہیں — اور ہاں۔ وُہ آئیے رُدسو، اُنیسویں صدی کے آخری تیس سال میں دو ایسے آدمی پیدا ہوئے ہیں جن کے عزائم تقریباً وہی ہیں جو سورریلسٹوں کے آگے چل کر ہوئے۔ راں بور روایتی ادب کا سخت مخالف تھا، اور اسے بالکل ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اُس کا دوسرا اُصول یہ تھا کہ جبلتوں کو عقل کی پابندیوں سے آزاد کر کے براہِ راست ظاہر ہونے کا موقع دیا جائے۔ وہ تو اس بات کا قائل تھا کہ حواسِ خمسہ کا فرق بھی مٹ جائے، جو چیز دیکھنے کی ہے وہ سونگھی جائے، جو چھونے کی ہے وہ سُنی جائے۔ چنانچہ ایک نظم میں اُس نے مختلف حروفِ علت کے رنگ تک مقرر کر دیئے ہیں۔ دوسرا آدمی جس کی وجہ سے ادبی اسالیب میں آگے چل کر انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ لوتریامون تھا جس کا اصلی نام دیوکاس ہے اور جو بیس بائیس سال کی عمر میں مرگیا۔ اُس زمانے میں تو لوگوں نے اُس کی طرف توجہ بھی نہیں کی مگر پہلی جنگِ عظیم کے قریب کے زمانے میں اُس کا اثر ہونا شروع ہوا، اور جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی سُن لیجیے کہ دوسری جنگ کے بعد تو اُس کا شمار فرانس کے زبردست مصنفوں میں ہونے لگا ہے۔ اُس کی کتاب کا نام ہے "مال دورور کے نغمے"۔ اِن نغموں کو چاہے نثر سمجھ لیجیے چاہے نظم، ہیئت اور معنی دونوں کے لحاظ سے یہ کتاب انقلابی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس میں ہر قسم کی اخلاقی قدروں اور پابندیوں کو خیرباد کہہ دی گئی ہے۔ اِس سے زیادہ فحش باتیں شاید اور کتابوں میں مل جائیں، لیکن گھناؤنے پن میں کوئی کتاب اِس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بعض دفعہ تو لوتریامون محض ایک نفسیاتی مریض یا جنونی اور مجذوب معلوم ہونے لگتا ہے۔ اگر بعض پابندیاں نہ ہوتیں تو میں دس پانچ سطروں کا ترجمہ ضرور پیش کرتا جس سے آپ کو اِس کتاب کے نفسِ مضمون کا تھوڑا سا اندازہ ہو جاتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ لوتریامون نے اسالیبِ بیان میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں، اُس نے لغت اور قواعد کو اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کیا ہے۔ بعض دفعہ لفظوں کی الگ الگ کوئی ہستی نہیں ہوتی، بلکہ پورا ایک ٹکڑا کوئی معنی یا تاثر پیدا کرتا ہے۔

اُوپر میں نے لوتریامون کے متعلق جو کچھ کہا ہے اُس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے کہ یہ شخص یا سورریلزم کی تحریک فحش نگاری یا انسان دشمنی ہے۔ ظاہر میں تو واقعی یہ لوگ انسان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں، مگر بنیادی تحریک اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ ایک طرف تو لوتریامون اپنے قاری کو مشورہ دیتا ہے کہ پہلے تو کسی بچے کا خون پینا شروع کرو، پھر اُسے پُچکارو، اِس طرح تمہیں دو باتوں کا مزا ملے گا، ایک تو تم کسی انسان کو اذیت پہنچا لوگے، دوسرے ایک ایسا انسان تم سے محبت کرنے لگے گا جسے تم نے اذیت پہنچائی ہے، اور یہ دو لذتیں ایسی ہیں جن سے بڑھ کے اور کوئی لذت انسانی تخیل میں آ ہی نہیں سکتی۔

سرمایہ دارانہ نظام پر اس سے زیادہ خوفناک طنز آج تک

کسی انسانیت پرست ادیب سنے کی ہے؟

دوسری طرف وہ سُنتا ہے کہ ایک آدمی نے میری کمر میں چھرا بھونک دیا تھا، جب سے بیسیوں حکیم، فلسفی، ریاضی داں، میرے زخم کو اچھا کرنے کی کوشش کر چکے ہیں، مگر وہ سب احمق ہیں، بھلا کہیں انسان کے ہاتھ کا زخم بھی بھرا ہے!

ابھی میں نے کہا تھا کہ لوتریامون اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ اس کی اخلاقیات کیا ہیں "کہیں انسان کے ہاتھ کا زخم بھی بھرا ہے!" یہ جملہ دیکھ کر تو وہی بات کہنے کو جی چاہتا ہے جو فلابیر نے اپنی کتاب کے بارے میں کہی تھی، یعنی یہ کہ اگر لوگ لوتریامون کی کتاب پڑھ لیتے تو نہ پہلی جنگ ہوتی نہ دوسری۔

لیکن چونکہ لوگوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی تھی، لہٰذا جنگ ہوئی، اور ساتھ ہی ساتھ ۱۹۱۶ء کے قریب ادب اور آرٹ میں دادا تحریک نمودار ہوئی۔ یہ لوگ سخت نراجی تھے، ان کا مقصد محض تخریب تھا۔ یہ لوگ ادب، آرٹ، تہذیب سب کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ اس تحریک کے رہنما زارا، دیوشاں اور پکابیا تھے۔ جب ان لوگوں کا ابتدائی جوش ذرا کم ہوا، اور جو لوگ اس تحریک سے کسی قدر متاثر ہوئے تھے انہوں نے اس تحریک کو محض تخریب سے ہٹا کر اس میں کوئی مقصد اور منتہا پیدا کرنا چاہا، تو پھر سوررئیلزم کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس کے امام آندرے بریتوں تھے، جنہوں نے ۱۹۲۴ء میں اس کا پہلا اعلان نامہ شائع کیا۔

ان دونوں تحریکوں میں فرق یہ ہے کہ سوررئیلسٹوں نے اپنی تحریک کی بنیاد فرائڈ کے علمی نظریوں کو بنایا۔ چنانچہ انہیں اصرار تھا کہ ہماری تحریک یوں ہی دماغ کا خلل نہیں ہے، بلکہ سائنٹفک طور سے صحیح اندازِ نظر ہے۔ دوسری طرف انہوں نے مارکس کی جدلیاتی مادّیت کو بنیادی عقیدے کے طور پر اختیار کر لیا۔ چنانچہ یہ تحریک محض ذہنی "نراجیت" نہیں تھی، بلکہ اس کی ایک خاص سمت، ایک خاص مقصد، خاص پروگرام اور ایک معنی میں ایک باقاعدہ قسم کا اسلوب بھی تھا۔

اس تحریک کا سب سے پہلا اور بنیادی مقصد تو یہ تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی پیدا کی ہوئی سیاسیات اور اخلاقیات وغیرہ کی بیخ کنی کی جائے، اور ادب وفن کی موجودہ اقدار کو ختم کیا جائے۔ یہ لوگ کلاسیکیت کے سخت دشمن تھے، اور اسے سیاسی اور معاشی استحصال بے جا کا ایک شاخسانہ سمجھتے تھے۔ کلاسیکیت اظہار کے موضوع اور اسالیب مقرر کرتی ہے۔ یہ لوگ کسی حد بندی کے قائل نہ تھے۔ یہ لوگ اُسی رُومانی اصول کے پیرو تھے کہ ہر موضوع اپنی ہیئت خود پیدا کر لیتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ "ہیئت" کے تصور کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے اور موضوعات کے معاملے میں ان کے یہاں ہر جنسی جبلت پر لکھنے کی پوری آزادی تھی، کیونکہ وہ کسی جبلت کو بذاتِ خود بُرا نہیں سمجھتے تھے جیسا روایتی اخلاقیات سمجھتی ہے۔ اس تحریک کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ جنسی جبلتوں کو اظہار کا موقع دے کر انسانوں کی شخصیت کو نفسیاتی اُلجھنوں سے آزاد کرایا جائے۔

جبلتوں کے مکمل اظہار کے لئے صرف اخلاقی اور سماجی پابندیوں کا دُور ہونا ہی کافی نہیں، عقل کا پہرا بھی اُٹھ جانا چاہئے۔ چنانچہ ان لوگوں کا تخلیقی کام عقل کی سرحد کے اُس پار سے شروع ہوتا ہے۔ اس کام میں ہر وہ چیز مدد کرتی ہے جو آدمی کو شعور کی دنیا کے دوسری طرف لے جا کے لاشعور کی سرزمین میں پہنچا دے۔ مثلاً نیند، بیداری کے خواب، ہپناٹزم، سرسام، ہسٹیریا، جنون وغیرہ۔ ان لوگوں کے نزدیک سوچے سمجھے فعل کی بہ نسبت فوری

اور لمحاتی فعل زیادہ معنی خیز ہے، کیونکہ اس میں لاشعور عقل کی مداخلت کے بغیر براہ راست ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے تو اس طرح نظمیں لکھی ہیں کہ جو جو لفظ ذہن میں آتے گئے کاغذ پر لکھتے گئے، اور بعد میں انہیں جوڑ کے نظم بنالی۔ اور تو اور اس نظریے کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر آپ نے کسی چیز کو شدت سے پسند کیا ہے تو وہ آپ کی تخلیق ہوگئی، کیونکہ اس پسند میں آپ کے لاشعوری رجحانات کا اظہار ہوتا ہے، اور ایک معنی میں تخلیق انتخاب ہی کا نام ہے۔

عقل کو معطل کرنے اور جبلتوں کو آزاد چھوڑ دینے کے معنی ایک طرح یہ ہیں کہ آدمی پھر سے بچہ بن جائے، یا وحشیوں کی حالت کو پہنچ جائے۔ اِس بات سے سوررلیسٹ شرماتے نہیں تھے، بلکہ وہ تو کہتے تھے کہ تخلیق کے لئے ایسا ہونا ضروری ہے۔

ان سے پہلے سترھویں صدی کے اطالوی فلسفی ویکو نے بھی یہی بات کہی ہے کہ اگر آدمی اچھا شاعر بننا چاہتا ہے تو اُسے اپنا علم بھول کے بچہ بن جانا چاہیئے۔ ویکو کی بات اس وجہ سے اہم ہے کہ ہمارے زمانے میں اُس کی طرف خاصی توجہ کی گئی ہے، اور کم سے کم جیمز جوئس پر اس کا بہت اثر پڑا ہے۔

عقل کو معطل کرنے کے بعد ہم بے عقل نہیں بن جاتے، بلکہ فوق العقل تک جا پہنچتے ہیں۔ یہ فوق العقل اجتماعی لاشعور ہے جو اجتماعی تجربات کا خزانہ ہے۔ چنانچہ سوررلیسٹ انفرادیت پرستی کے الزام کو تسلیم نہیں کرتے۔ لاشعوری زندگی میں ایک معاشرے کے سب ارکان شریک ہوتے ہیں، چنانچہ ہمیں خوابوں میں جو شکلیں اور تصویریں نظر آتی ہیں اُن کی مدد سے ہم ایک عالمگیر مائیتھولوجی مرتب کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ایسی عالمگیر مائیتھولوجی آج تک پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ اس میں ایک حد تک دونوں طبقوں کا فرق بھی مٹ جاتا ہے۔ یہ لوگ کارل مارکس کی اِس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ موجودہ زمانے میں مائیتھولوجی ازکار رفتہ ہوگئی ہے۔ مارکس کا خیال تھا کہ جب تک انسان کے پاس فطرت کو قابو میں لانے کے ذرائع نہیں تھے، اُس وقت تک وہ فطرت کے متعلق قصے گھڑ کے اپنی تسکین کر لیا کرتا تھا، مگر اب انسان کو فطرت پر براہ راست حکومت کرنے کے عملی ذرائع حاصل ہیں، اس لئے اب مائیتھولوجی کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ سوررلیسٹ کہتے ہیں کہ معروضی حقیقت اور موضوعی واہمہ کے درمیان جو کشمکش جاری رہتی ہے اُس میں توازن پیدا کرنے کے لئے مائیتھولوجی کا وجود لازمی ہے۔ یہ کام آج کل آرٹ کا ہے، اور آرٹ کی بھی ایک الگ جدلیات ہے۔ چنانچہ سوررلیسٹ آرٹ کا مقصد یہ ہے کہ ایک نئی مائیتھولوجی تخلیق کرکے انسانوں کی زندگی میں توازن اور ان مذکورہ بالا مخالف قوتوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ سوررئیلزم صرف اظہار ہی کا ایک طریقہ نہیں، بلکہ زندگی کا ایک اسلوب بھی ہے۔ یہ آرٹ اپنے سامنے ایک عملی مقصد رکھتا ہے۔ اور اس کی بھی ایک افادیت ہے۔ یہ آرٹ خواب اور بیداری کے درمیان ایک پُل کا کام دیتا ہے، تاکہ انسان ایک اندرونی تضاد کا شکار نہ ہو کے رہ جائے۔ چنانچہ یہ آرٹ ہر آدمی کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو تخلیق کے قابل سمجھے۔ چونکہ توازن ہر آدمی کی زندگی میں ضروری ہے، اور یہ توازن صرف آرٹ کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے، اِس لئے ہر آدمی کو آرٹ تخلیق کرنا چاہیئے۔ اور وہ کر بھی سکتا ہے۔ فن کار کے ایک نادر مظہر ہونے کا تصور حکمران طبقے نے پھیلایا ہے۔ آرٹ کی تخلیق کرکے ہر آدمی اپنی تنہائی ختم کر سکتا ہے، اور اجتماعی لاشعور کی معرفت حاصل کرکے دوسرے انسانوں کی زندگی میں شریک ہو سکتا ہے۔ اِس طرح سوررئیلزم اپنے علمبرداروں کے دعوے کے مطابق ایک انقلابی تحریک

بن جاتی ہے جو نہ صرف خارجی دُنیا میں بلکہ انسانوں کی داخلی زندگی میں بھی انقلاب پیدا کرتی ہے۔

اِس تحریک کے بڑے بڑے اُصول تو یہ ہو گئے۔ اب دو ایک ضمنی باتیں بھی سُن لیجئے۔ یہ لوگ، واہمہ پر بہت زور دیتے ہیں جس کی وجہ سے اُن پر اکثر اعتراض ہوا ہے۔ ان لوگوں کو جواب یہ ہے کہ روایتی ادب اور آرٹ اور موجودہ سماجی نظام نے انسان کے اندر تحیّر کی صلاحیت بالکل ختم کر دی ہے۔ ہم اس صلاحیت کو پھر سے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تحیّر کو بیدار کرنے کا بنیادی اُصول یہ ہے کہ معمولی چیزوں کو غیر معمولی گرد و پیش میں پیش کیا جائے، اور غیر معمولی چیزوں کو معمولی گرد و پیش میں۔ مثلاً اگر کوئی خوبصورت سا مجسمہ عجائب خانے میں رکھا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، لیکن اگر یہی مجسمہ نالی میں پڑا ہو تو سب لوگ اسے حیرت سے دیکھیں گے۔ یہی بات کو تریامون نے یوں ادا کیا ہے کہ وہ چیز ایسی حسین ہے جیسے جراحی کی میز پر سینے کی مشین اور چھتری کی اتفاقیہ ملاقات۔" چنانچہ سوررئیلسٹوں کی تخلیق میں جو چیز سب سے پہلے آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ غیر معمولی اور معمولی چیزوں کی یہی حیرت ناک آمیزش اور ترکیب ہے۔

ان لوگوں نے IMAGE کی جو تعریف کی ہے وہ ادبی تنقید کا ایک لازمی جزو بن کے رہ گئی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ IMAGE محض ایک استعارہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں دو مختلف حقیقتیں آکر ملتی ہیں۔ چنانچہ در اصل نہ تو ان دونوں کو الگ کیا جا سکتا ہے، اور نہ IMAGE کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں حقیقتیں ایک دوسرے سے جتنی زیادہ دُور ہوں گی، IMAGE میں اُتنی ہی زیادہ قوت اور اثر پیدا ہوگا۔ غالباً یہ نظریہ ادب میں ایک مستقل اضافہ ہے۔ ان لوگوں کی تحریک ختم ہو گئی، اُس کے نظریات کی اب وہ وقعت نہیں رہی، مگر اُنہوں نے شاعروں اور فن کاروں کا انداز احساس بدل دیا۔ جو لوگ سوررئیلزم کو از کار رفتہ سمجھتے ہیں اُنہیں کے یہاں اس قسم کے IMAGES کی زیادہ ریل پیل ہے۔ چنانچہ یہ تحریک اور اس کا شور و شغب رائگاں نہیں گیا، اور اس نے فن و ادب میں بہت سی نئی راہیں نکالی ہیں۔ اور یہی کیا کم ہے کہ اُس نے سالوادور دالی، شیریکو، پول کلی جیسے مصوّر اور آندرے برتوں، پول ایلوار جیسے شاعر اور ادیب پیدا کئے ہیں، بلکہ ہمارے زمانے کا سب سے بڑا مصوّر پکاسو، اور یورپ کا سب سے بڑا ناول نگار جیمز جوائس اِس تحریک کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ اِس تحریک کی تخلیقات کو ناپسند کیا جا سکتا ہے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے مغربی ادب اور آرٹ میں تازگی پیدا کی ہے، اور اظہار کے بالکل ہی نئے اور اہم اسالیب دریافت کئے ہیں۔ اِس لئے سوررئیلزم کو محض پاگل پن کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔

آخر میں ایک معلوماتی سی چیز اور بتا دوں۔ "سوررئیلزم" کا لفظ اس کے علمبرداروں کی ایجاد نہیں ہے، بلکہ سنہ ۱۷ء سے پہلے ہی اس تحریک کے ایک پیش رو آپولی نیر نے ایک ڈرامے کے متعلق استعمال کیا تھا جس کا نام "تی ریسے سی آ کیپستان" تھا۔

عسکری

بسکہ حیرت سے ز پا اُفتادۂ زنہار ہے
ناخنِ انگشت تبخالِ لبِ بیمار ہے

زلف سے شب درمیاں دادن نہیں ممکن دریغ
ورنہ صد محشر بہ رہنِ صافیِ رخسار ہے

در خیال آبادِ سودائے سرِ مژگانِ دوست
صد رگِ جاں جادہ آسا وقفِ نشتر زار ہے

منشی تلوک چند محروم

غزل

کچھ کم نہیں ندامتِ پنہاں خطا کے بعد
بے سود ہے ہر ایک سزا اس سزا کے بعد

فکرِ معاشِ اہلِ محبت نہ پوچھیے
کھانے کو خونِ دل ہے فریبِ وفا کے بعد

اس دور میں کرم کا روادار کون ہے
پچھتائے کیوں کوئی ستمِ ناروا کے بعد

شاہوں کے ساتھ یہ بھی ہے تقدیر کا مذاق
رزقِ ہما ہوں سایۂ بالِ ہما کے بعد

اس کا علاج کیا ہے بجز ترکِ مدعا
جب سامنا ہو یاس کا ہر مدعا کے بعد

تاریخ اس کو بھول نہیں سکتی اے وطن!
آئیگا ذکرِ کرزن ترا کربلا کے بعد

بے مہریِ بتاں سے خدا یاد آگیا
محروم کس کو یاد کروگے خدا کے بعد؟

جلیل حسین جلیلؔ

چاندنی رات میں دریائے چناب کے کنارے

ہے دلکش و رنگیں مرے افکار کی دُنیا
بستے ہیں تخیّل میں حسیں کتنے نظارے
چاہوں تو تصوّر میں تجھے پاس بلا لوں
چاہوں تو نکل آئیں ابھی چاند ستارے

انسانوں کی بستی ہے جو غم دینے پہ مائل
جذبات کی دُنیا میں تو مجبور نہیں ہوں
آئینۂ دل میں ہے ترا عکس ہویدا
مَیں تیرے شبستاں سے بہت دُور نہیں ہوں

تُو پاس نہیں ہے تو تصوّر تو ہے تیرا
مَیں جس سے کیا کرتا ہوں تنہائی میں باتیں
غمگیں ہو محبت تو بہل جاتی ہے اِس سے
رنگین تصوّر میں گزر جاتی ہیں راتیں

بھُولیں نہیں اب تک مجھے گلشن کی بہاریں
دُہراتا ہُوں خوابوں میں وہ پُرکیف کہانی
ہے یاد اِنھیں تیرا شفق رنگ فسانہ
سُن لیتا ہُوں جب چاہوں ستاروں کی زبانی

وہ نرگسِ بیمار کی بیمار نگاہیں ——
کلیوں کا شباب اور وہ پھولوں کی جوانی
جذبات کی دُنیا میں جب اُٹھتی تھیں گھٹائیں
لا سکتا ہوں جب چاہوں میں وہ شام سُہانی

یاد آئیں جو آغازِ محبّت کے فسانے
مہتاب کو ہمراز بنا لیتا ہوں اکثر
لب تک کبھی فریاد کو آنے نہیں دیتا
اشکوں کو میں گیتوں میں چھپا لیتا ہوں اکثر

افسانۂ دل کہہ کے بعنوانِ غمِ دل
احباب کو غمگین بنایا نہیں کرتا
ہنس دیتا ہوں جب ٹوٹے کوئی تازہ مصیبت
جو دل پہ گزرتی ہے سُنایا نہیں کرتا

آنکھوں میں اُمڈ آتے ہیں جب اشکوں کے طوفاں
پیمانۂ لبریز چھلکنے نہیں دیتا
دل میرا تڑپتا ہے تو تھا ماں لیتا ہوں آنکھیں
لیکن کبھی آنسو کو ڈھلکنے نہیں دیتا

مُدت سے شبِ غم بھی ستاتی نہیں مجھ کو
جی لیتا ہُوں آیندہ اُمیدوں کے سہارے
بہلاتی ہیں آ کر مجھے مہتاب کی کرنیں
آجاتے ہیں شب کو مری محفل میں ستارے

اِس مُرغِ گرفتار کو بہلانے کی خاطر
فطرت مری آنکھوں میں بساتی ہے نظارے
مَیں اپنے دلِ زار کو سمجھانے کی خاطر
آجاتا ہُوں شب کو کبھی دریا کے کنارے

آوارہ نکل آیا ہُوں مہتاب کی ضَو میں
بُھولی ہوئی راتوں کا سماں ساتھ ہے میرے
آنکھوں میں سمٹ آئے ہیں دیکھے ہُوئے منظر
اِک تیرے تصوّر کا جہاں ساتھ ہے میرے

پھر اپنے شبستاں کو مَیں تابندہ بناؤں
افشاں کا تُو اِک ٹُوٹا ستارا مجھے دیدے
ہو جائیں نہ مُبہم تری تصویر کے خاکے
پھر اپنے تصوّر کا سہارا مجھے دیدے

جیلانی

۱۹۴۷ء

(میرے گاؤں کے چند منظر)

دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں چار سوار نہر کے پُل پر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے جو فربہ اور معمّر تھا، اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے اردگرد نگاہ دوڑائی، کپاس کے قریبی کھیت میں ایک کاشتکار نلائی کر رہا تھا، چاروں نے اپنے گھوڑوں کا رُخ اسی طرف پھیر دیا۔

فربہ اور معمّر سوار نے نہایت شریفانہ انداز میں کاشت کار سے کہا "بھائی ہمیں پینے کے لئے پانی مل جائیگا؟"

نلائی کرنے والے نے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ دل میں ڈرا، اُس نے کھرپی پھینک دی اور بڑے ادب سے کہا "جی ہاں سائے میں بیٹھئے، میں ابھی پانی لائے دیتا ہوں۔"

چاروں شخص گھوڑوں سے اُتر آئے اور سائے میں کھڑے ہوگئے۔ ان کے پاس لمبے لمبے نیزے تھے۔ اُن کے اعلےٰ نسل کے درازقد گھوڑے ہنہناتے اور زور زور سے زمین پر اپنے سُم پٹک رہے تھے۔

پانی پینے کے بعد اُنہوں نے ممنونِ احسان نگاہوں سے پانی پلانے والے کو دیکھا اور اس کا نام پوچھا۔ کاشتکار نے اپنا نام غلام حسن بتایا۔

پھر سواروں میں سے ایک نے سوال کیا "کہو بھائی تمہارے گاؤں میں تو خیریت ہے؟"

غلام حسن نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا "جناب اِس وقت تک تو خیریت ہے۔ اِس سے اگلی گھڑی کا علم نہیں۔"

فربہ اور معمّر آدمی نے اسی شریفانہ انداز سے کہا "بھائی امن اور خیریت ہی کی دعا کرنی چاہیئے۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں لڑائی جھگڑے سے فائدہ کیا۔"

اس کے بعد جب سوار جانے کے لئے تیار ہوئے تو غلام حسن نے یہ سوچ کر کہ ان سے پُوری واقفیت تو حاصل کر لینی چاہیئے سوال کیا:-

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"ہم چک نمبر ۱۲۵ سے آ رہے ہیں۔"

"اور کدھر کا ارادہ ہے؟"

سب سے اگلے سوار نے کچھ جواب دیا۔ مگر غلام حسن سمجھ نہ سکا اور وہ چلے گئے۔

گھاس کھودنے سے فارغ ہونے کے بعد جب غلام حسن جھکڑا اپنے گاؤں کی طرف لوٹ رہا تھا، اُسے ابراہیم ٹھیکیدار کے مربع کے قریب فقیر ارائیں ملا۔ علیک سلیک کے بعد گفتگو شروع ہوئی تو غلام حسن نے سواروں کا قصہ سنایا۔ قصہ سُننے کے بعد فقیر نے وہی سوال کیا جس کا جواب خود غلام حسن بھی معلوم نہ کر سکا تھا۔

غلام حسن نے کہا "میرا خیال ہے وہ چک نمبر ۲۴۳ کی طرف گئے ہیں۔"

فقیر نے تعجب اور گھبراہٹ سے پوچھا "چک نمبر ۲۴۳ کی طرف؟ ۲۴۳ میں تو سکھوں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا ہے"

جب یہ گاؤں میں پہنچے، چکی کے پاس اللہ بخش اور صالح کھوجی آپس میں ایک بچھڑے کا سودا کر رہے تھے۔ بچھڑا اللہ بخش کا تھا اور صالح کھوجی خریدار تھا۔

"تم جانتے ہو میں اسے پورے ایک سال سے پال رہا ہوں۔ یہ مجھے اپنی جان سے بھی عزیز ہے۔"

صالح کھوجی نے ذرا تیزی سے کہا۔ "پاگل! اسی لئے تو میں بھی ڈھائی سو روپے قیمت دے رہا ہوں۔"

فقیر بھی اِس پُر لذت گفتگو میں شریک ہو گیا۔ ایک کاشتکار کے لئے اِس سے زیادہ پُر لطف موقع کیا ہو سکتا ہے۔ بیلوں کا موضوع ہو اور کوئی کاشتکار اس میں حصہ نہ لے، بھلا یہ کیونکر ممکن ہے۔

جب بہت بحث تکرار کے بعد بھی اللہ بخش تین سو روپیہ سے ایک دمڑی کم لینے پر راضی نہ ہوا، تو صالح نے تنگ آ کر کہا۔ "بڑے ضدی ہو۔ خدا جانے کل کو کیا ہو جائے۔ کمبخت سکھوں کے معلوم نہیں کیا کیا خطرناک ارادے ہیں!"

اِس پر فقیر بولا۔ "تم نے سُنی وہ بات؟ آج غلام حسن کو چار سکھ ملے، وہ برچھیوں، بندوقوں اور پستولوں سے لیس تھے۔ چک نمبر ۲۴۳ کی طرف گئے ہیں جہاں سکھوں کا ایک بھاری جلسہ ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں وہ کسی حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔"

"اور تم کیا سمجھتے ہو، کیا وہ غافل بیٹھے ہیں؟ وہ مسلمانوں کی طرح غافل نہیں ہیں۔ آج افضل نے خبر سُنائی کہ سکھوں نے ہوشیار پور کے قریب مسلمانوں کے چار گاؤں بالکل خاکستر کر دیئے ہیں اور مسلمانوں کے دُودھ پیتے بچوں تک کو مار ڈالا ہے۔"

اِتنے میں مستری نور بھی دکان سے باہر نکل آیا۔ وہ ابھی ابھی ایک تلوار بنا کر آیا تھا۔ بھٹی کے سامنے بیٹھے بیٹھے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ جب اُس نے غلام حسن کا واقعہ سُنا تو وہ تیز ہو کر بولا۔ "ہوش کی دوا کرو، سکھ حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں! اور اگر اُنہوں نے حملہ کر دیا تو یہ یاد رکھو کہ وہ مسلمانوں کو ذرا اپنی ہتھیلی اوپر اُٹھاتے ہوئے) یوں ہتھیلی پر اُٹھا لیں گے۔"

صالح بولا۔ "میری بات سُنو، میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

لیکن مستری اپنے جوش میں بولتا گیا۔ "مسلمان تو ہتھیار بنوانے سے بھی بیزار ہیں۔ غور کرو۔ تلوار بنانا کتنا کٹھن کام ہے۔ اِس کی اجرت کیا دس روپے زیادہ ہے؟ آج عبداللہ نے تلوار بنوائی، صبح سویرے سے لیکر دوپہر تک بھٹی کے سامنے بیٹھے بیٹھے میرا جسم بھی کوئلہ ہو گیا اور وہ پانچ روپے پھینک تلوار لے چلتا بنا۔"

چکی کے پاس لوگ برابر جمع ہوتے جا رہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ سیاسیاتِ حاضرہ کا موضوع زیادہ سرگرمی سے کھنگالا جانے لگا۔ مجلس معلوم نہیں کتنی دیر تک ختم نہ ہوتی اگر قریب کے جوہڑ میں دو بھینسیں آپس میں گتھم گتھا نہ ہو جاتیں۔ دونوں کے سینگ لڑتے لڑتے ایک دوسرے میں اُلجھ گئے تھے۔ اسمٰعیل نے فقیر کو آواز دی، وہ جوہڑ کی طرف لپکا اور اُس کے پیچھے دوسرے لوگ بھی اُدھر کو دوڑے۔ بڑی تگ و دو کے بعد ان لوگوں نے بھینسوں کو علیحدہ کیا اور اس کے بعد بھینسوں کی لڑائیوں کا ذکر کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر جب نمازی مسجد سے نکلے تو مہر شہاب نے امام صاحب سے کہا۔ "میاں جی! آپ نے سُنا، غلام حسن کو آج چالیس سکھ ملے، اُنہوں نے اُسے پستول دکھا کر ڈرایا اور کہا تیار ہو جاؤ ہم حملہ کرنے والے ہیں۔"

یہ خبر واقعی بڑی تشویش انگیز اور خوفناک تھی۔ شام کے

وقت جب یہ خبر گلاب خاں تک پہنچی تو اُس نے اپنے سر سے پگڑی اُتار کر کھٹیا کے پائے پر رکھ دی اور کہا "بس اب خاتمہ سمجھو۔"

گلاب خاں اس وقت گنگا رام کی دکان کے سامنے بیٹھا تھا فضل قصائی بھی وہیں موجود تھا اور اللہ دتا بھی۔ گلاب خاں کے الفاظ نے سب پر مایوسی طاری کر دی۔ کچھ دیر تک وہ چُپ بیٹھے حُقّہ پیتے رہے۔ آخر فضل نے سلسلۂ کلام شروع کیا "مسلمان واقعی اسی لائق ہیں۔"

اللہ دتا یکایک بولا "لیکن مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ کیا ہے؟"

گلاب خاں کی آنکھیں حسبِ معمول جوش سے سُرخ ہو گئیں۔ اگرچہ شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا، تاہم گلاب کے چہرے کا بھورا رنگ سیاہی میں بھی نمایاں تھا۔ اُس نے رقت آمیز انداز میں کہا "سچ پوچھو، تو یہ ہمارے ایمان کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو، ہمارا کوئی عمل اسلام کے مطابق ہے؟ جھوٹ ہم بولتے ہیں، دغا کرنے سے ہم باز نہیں آتے، چوری کرنے سے ہم نہیں ٹلتے۔ شرابیں ہم پیتے ہیں، جوا مسلمان کھیلتے ہیں، رنڈی کا گھر مسلمان کے دم قدم سے آباد ہے۔ بڑے سے لیکر چھوٹے تک کوئی بھی مسلمان اسلام کا پابند ہے؟ پھر ہم خدا سے رحمت کی توقع رکھیں تو کیا یہ بے حیائی نہیں ہے؟"

اندھیرے میں گلاب خاں کی آواز لرز رہی تھی۔ اُس کی باتوں میں اثر اور درد تھا۔ معلوم ہوتا تھا یہ باتیں اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہیں۔

فضل قصائی گلاب خاں سے ٹھٹھا مذاق کرنے کا عادی تھا۔ یکایک وہ بولا "آیا بڑا مولوی، تم خود کیا کرتے ہو؟ بتاؤ تو سہی۔"

گلاب خاں نے تیزی سے جواب دیا "مَیں بھی تو اُنہیں مسلمانوں میں سے ہوں اور تم کیا کم ہو؟"

اِتنے میں مسجد کی بائیں طرف سے ایک سائیکل کی کھڑکھڑاہٹ سُنائی دی۔ برکت ماشکی شہر سے آ رہا تھا۔ گلاب خاں نے جلدی سے آگے بڑھ کر پُوچھا "اخبار لائے ہو؟"

برکت نے ہینڈل کے ساتھ لٹکے ہوئے تھیلے میں سے اخبار نکالا اور کہا "ظلم کی انتہا ہو گئی ہے۔ ہوشیار پور اور لدھیانہ میں لُوٹ کا بازار گرم ہے۔ مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں جلائے جا رہے ہیں۔ دُودھ پیتے بچے تک قتل کئے جا رہے ہیں۔ بھوکے پیاسے اور بیمار مسلمانوں کا عضو عضو کاٹ کر انہیں مارا جاتا ہے۔ اُن کی عورتیں چھینی جاتی ہیں اور اُن پر ایسے ایسے ظلم ڈھائے جاتے ہیں جن کے تصوّر سے بھی رُوح کانپ جاتی ہے۔"

ایک لمحہ کے لئے ایسا معلوم ہوا گویا تمام کائنات سناٹے میں آ گئی۔ گلاب خاں نے ضبط سے کام لیا۔ اور دکان کے پاس آیا۔ گنگا رام دکان میں دیئے کے سامنے اپنی بہی کھولے حساب کر رہا تھا۔ گلاب خاں نے غم و غصہ سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "گنگا رام ذرا دیا لانا۔" گنگا رام نے گلاب کے چہرے کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ تازہ اخبار آیا ہے۔ اُس نے دیا دکان کی دہلیز میں رکھ دیا۔ گلاب خاں اخبار اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اخبار سکھوں کے منظم حملوں اور پٹیالہ کی فوج کے ظلم و ستم کی داستانوں کی تفصیل سے پُر تھا۔

فضل قصائی نے کچھ انتظار کے بعد کہا "خاں جی! ہمیں بھی سُنایئے۔"

گلاب خاں نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہا "اخبار پڑھا نہیں جاتا۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی آنکھیں دیئے کی مدھم لَو

میں پُرنم دکھائی دے رہی تھیں۔ اِس کے بعد اُس نے کہا "فضل میرا ارادہ ہے، عشاء کی نماز کے بعد تمام گاؤں کو بُلا کر اخبار سنایا جائے۔"

عشاء کی نماز سے پہلے ہی گاؤں کے چاروں گوشوں سے لوگوں کی ٹولیاں نکل نکل کر مسجد کے پرے ریت کے ٹیلے کی طرف جا رہی تھیں۔ ٹیلے پر لوگوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ مجمع کے چاروں طرف برچھے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ اور مجمع کے درمیان ایک مدھم لالٹین کے سامنے گلاب خاں اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔ اس نے اس وقت عینک لگا رکھی تھی۔ یہ عینک گنگا رام کی تھی جو گلاب خاں اس سے اکثر پڑھنے کے لئے مستعار لے لیا کرتا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ سیاہی مائل کھیت دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے اور تاریک اُفق کے کنارے درختوں کے جھنڈ کالی روشنائی کے دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ گلاب خاں لرزتی ہوئی آواز میں خبریں سنا رہا تھا۔ ظلم کے ہر واقعہ کی اطلاع کو وہ دہرا دہرا کر پڑھتا۔ مجمع میں سے وقتاً فوقتاً ٹھنڈی آہ یا ہائے ہائے کی آواز بے اختیار اُٹھتی۔ اخبار کا ایک صفحہ پڑھنے کے بعد گلاب خاں کی زبان لڑکھڑا گئی۔ اور اب اُس کی زبان سے لفظ اُلٹ پلٹ نکلنے لگے۔

مجمع سکوتِ غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب گلاب خاں نے اخبار پڑھنا بند کیا تو مجمع میں سے ایک مغلظ گالی ہوائی کی طرح چھوٹی۔ لوگوں میں تبصرہ و تنقید شروع ہو گئی۔ گلاب خاں نے لالٹین اُٹھالی اور تمام حاضرین کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ "میرے خیال میں راتوں کو تمام گاؤں کے گرد پہرہ بٹھا دینا چاہیئے۔"

کئی آوازیں اُٹھیں "ضرور! ضرور!"

اِس کے بعد گلاب خاں نے چوکیدار سے کہا۔ "غلام محمد! دیکھو تم ہر گھر سے ایک نوجوان ہر رات لے لیا کرو۔ اور تمام گاؤں کا چکر لگایا کرو۔"

اس رات وسطی کنوئیں پر پانچ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، اور اُن پر نو نوجوان دراز تھے۔ ایک ماہیا گا رہا تھا، ایک دوسرا لیٹے لیٹے ہی اُسے تال دے رہا تھا، اور غلام محمد، گاؤں کا چوکیدار اپنے برچھے سے ٹیک لگائے اُونگھ رہا تھا۔

حملہ

"پیارے دوست! ہمارے قریبی شہر میں فساد کی چنگاری بھڑک اُٹھی ہے۔ لوگ گھبراتے ہیں تو مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کا کیا بنے گا! اور اس سب ہوگا؟ میں چُپ ہو جاتا ہوں۔ آخر میں اِن سوالوں کا کیا جواب دے سکتا ہوں۔ جو کچھ ہو رہا ہے جن کو معلوم نہیں وہ بھی چُپ ہیں اور جن کو معلوم ہے اُن کے لبوں پر بھی مہرِ خاموشی لگی ہوئی ہے۔ واقعات کی اس عظیم رَو کی انتہا کیا ہے؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

چودھری منصور نے یہ خط لکھتے ہوئے کاغذ سے نظر اُٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ چار دنوں کی متواتر بارش کے بعد مطلع صاف ہوا تھا تو دھوپ کس قدر چمکیلی اور نکھری ہوئی تھی گویا پانی سے دُھل گئی ہو اس کی کھڑکی کے سامنے بوڑھے پیپلو کے درخت پر ننھی منی چڑیاں پھُدک رہی تھیں۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھا اور کچھ دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہ کر کتابوں کی الماری کی طرف مڑا۔ میز پر وہ کتاب ابھی تک کھلی پڑی تھی جسے وہ کل پڑھتے پڑھتے چھوڑ گیا تھا۔ وہ کل کتنی لذت سے اِس کتاب کو پڑھ رہا تھا لیکن اُس وقت اُس کا جی کتاب کے دیکھنے کو بھی نہ چاہ رہا تھا۔ اُس نے الماری سے دو چار کتابیں نکالیں، اُن کی ورق گردانی کی، اور اُنہیں پھر دہیں رکھ دیا۔

کمرے میں اُمس سی پیدا ہوگئی تھی۔ سورج جوں جوں بلند ہو رہا تھا گرمی بڑھ رہی تھی، اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا کوئی چیز اس کی توجہ کو اپنی طرف نہ کھینچ سکی۔ اِس پر اُس نے اپنی چھڑی اُٹھائی اور باہر نکل گیا۔

احاطے میں اُس کی تاکید کے باوجود کوئی شخص موجود نہ تھا۔ اُس نے احاطے کے وسط میں کھڑے ہوکر اِدھر اُدھر دیکھا ایک پیپل کے نیچے کرم دین لنگڑا اور شہادت علی بڈھا بیٹھے ہوئے تھے دونوں عمر کی آخری منزلوں میں پہنچ چکے تھے۔ وہ بڑے سکون سے حقہ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ اور اُن کے قریب اندھی گدھی گھر کے سامنے کھورے کے ڈھیر پر منہ مار رہی تھی۔ جب اُنہوں نے چودھری کو اپنی طرف آتے دیکھا تو دونوں چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کرم دین نے بڑی محبت سے اپنے نوجوان مالک کی پُشت پر ہاتھ پھیرا۔

چودھری نے کہا "بیٹھو بابا بیٹھو۔ یہ تمام لوگ کہاں گئے ہیں؟"

کرم دین نے لجاجت سے کہا "چودھری جی! وہ سب کھالا صاف کرنے گئے ہیں، ابھی لوٹ آتے ہیں۔"

چودھری کا غصہ قدرے فرو ہوا۔ اُس نے اپنی چھڑی گھمائی اور جانے کے لئے مڑا۔

شہادت علی نے حقے کی نے کرم دین کی طرف پھیرتے ہوئے کہا "کیوں چودھری جی سُنا ہے سکھ حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں؟"

نوجوان چودھری نے مسکرا کر مستفسر کی طرف دیکھا "اگر وہ حملہ کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔" دن میں سینکڑوں بار اس سے یہی سوال کیا جاتا اور وہ ہر ایک کو یہی جواب دیتا۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ اس قسم کے جواب خوفزدہ دلوں کو سہارا دینے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

گاؤں کے جوہڑ میں ڈھور ڈنگر کلیلیں کر رہے تھے۔ اس کے پرے گنے کے کھیت اُفق تک پھیلے ہوئے تھے۔ چودھری کھیتوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر ہولیا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف جوار کے کھیت کھڑے تھے۔ جب وہ بڑے کھالے پر پہنچا تو تمام مزارع اسے صاف کرنے میں مصروف تھے۔ چند پھاوڑے سے ریت نکال نکال کر ٹوکریوں میں بھرتے جاتے، باقی ریت کی بھری ہوئی ٹوکریاں باہر سڑک پر پھینکتے جاتے۔ ان کے جسم پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ چودھری کو دیکھ کر مزارعوں نے کام چھوڑ دیا۔ ایک نے آگے بڑھ کر وہیں شیشم کے سائے میں اپنا صافہ بچھا دیا، لیکن چودھری نے اس طرف مطلقاً توجہ نہ کی اور کھالے کے کنارے پر کھڑا ہوگیا۔ کھالے کے کنارے کنارے نہر تک شیشم کے درختوں کا ایک سلسلہ چلا گیا تھا۔

"میری تاکید کے باوجود تم سب احاطہ خالی چھوڑ کر کیوں چلے آئے ہو؟"

چودھری نے اپنے چہرے پر غصے کی مصنوعی علامتیں پیدا کرلیں۔ اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی اور اُس کے باریک نتھنے ذرا سے پھولے ہوئے تھے۔ اس سوال پر کامل خاموشی چھا گئی۔ تمام مزارع نگاہیں جھکائے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صرف نہر کے کنارے ایک اُونچے درخت پر کسی پہاڑی کوے کی بھدی کائیں کائیں سُنائی دے رہی تھی۔

"تم لوگ واقعی اُجڈ ہو، خود ہی سوچو تم اِن کھالوں اور کھیتوں کو کیا کروگے اگر زندگی ہی باقی نہ رہی۔ بتاؤ تو اگر اِس وقت گاؤں پر حملہ ہو جائے تو کیا ہو؟"

ان میں سب سے بوڑھا اور معتبر ابراہیم مزارع تھا۔ وہ اگرچہ

بیاہ خام تھا تاہم اس سے بڑھ کر کلام کرنے کا سلیقہ کسی کو نہ تھا۔ اُس نے اپنی بھوری اور چمکیلی آنکھیں اُٹھا کر چودھری کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی بڑا چھوٹے کی طرف دیکھتا ہے۔

"اگر عرض کرنے کی اجازت ہو تو کچھ کہوں۔" ابراہیم نے کچھ اس لجاجت سے یہ الفاظ کہے کہ چودھری کے لبوں پر مسکراہٹ پھسل پڑی۔ اس پر دوسرے مزارعوں کی جھکی ہوئی گردنیں بھی اُٹھ گئیں۔

"عرض یہ ہے میں نے احاطے سے نکلتے ہوئے اِن سب بیوقوفوں سے کہا بھی تھا کہ صرف چند آدمی چلیں، باقی احاطے ہی میں رہ جائیں، لیکن جب میں یہاں پہنچا تو دیکھا کہ سب کے سب موجود تھے۔ اب کی بار تو معاف کیا جائے آئندہ غلطی ہوئی تو سزا دی جائے۔"

چودھری نے باوقار سکوت کے ساتھ سب چہروں کی طرف دیکھا اور پیچھے ہوتے ہوئے صافے پر بیٹھ گیا۔ اب سورج شیشم کے بلند درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ گیا تھا اور کھیتوں میں ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ مزارعوں نے کھانے کو پوری طرح صاف کر لیا تھا۔ اور اب وہ اپنے صافوں سے اپنے چہرے پونچھ رہے تھے اور اپنی جوتیاں جھاڑ رہے تھے۔

ایکا ایکی نہر کے کنارے غبار کا ایک بگولا سا اُٹھا۔ اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ سب مزارعوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ چودھری بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب غبار چھٹا تو سواروں کی صورتیں دکھائی دیں، وہ جنگلی لوگ تھے۔

چودھری نے ایک لڑکے سے کہا "اسمٰعیل ان کو بلا دو تو۔" لڑکا حکم پاتے ہی اُٹھ دوڑا اور سب سے اگلے سوار کی لگام تھام لی اور انہیں چودھری کے پاس لے آیا۔ یہ چار سوار تھے معمولی حیثیت کے مزارع، اُنھوں نے نیلے تہبند باندھ رکھے تھے۔ اور اپنے چہروں کو ڈھاٹوں میں لپیٹ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے تھے۔ چودھری کو دیکھ کر وہ کچھ ڈرے۔ لیکن جب چودھری نے کہا: "بھائی کوئی خبر سناؤ" تو وہ ڈھب سے اپنی کاٹھیوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک جو ذرا زیادہ دلیر انسان تھا۔ بولا۔ "ہم چک نمبر ۲ کی طرف سے آ رہے ہیں۔ ہمیں چک نمبر ۲ سے پرے چک نمبر ۱ کو جانا تھا لیکن چک نمبر ۲ کی رجبہا پر سکھوں کے ایک جتھے نے ہمیں لوٹا دیا۔ ہم نے کوئی مزاحمت نہ کی اور واپس چلے آئے۔"

جب چودھری اپنے مزارعوں کی معیت میں گاؤں پہنچا تو گاؤں سنسان پڑا تھا۔ اُن کے آگے چند چارے سے لدے ہوئے چھکڑے گاؤں میں داخل ہوئے۔ چودھری نے ابراہیم سے کہا "دیکھا، یہ لوگ کتنے احمق ہیں۔ باوجود بار بار کہنے کے تمام لوگ گاؤں چھوڑ کھیتوں کو نکل گئے ہیں۔ افسوس ہے ان پر۔"

گھر پہنچا تو اُسے خوب بھوک لگ رہی تھی، وہ کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ اُس کے تھکے ہوئے اعضا میں نیند آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ اور اونگھ میں اُس نے محسوس کیا گویا وہ بادلوں کی سفید چٹائی پر پھسلتا جا رہا تھا۔

اسے نیند کا ایک جھونکا ہی آیا تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ "کون ہے؟" نوجوان چودھری جھنجھلا کر اُٹھا اور کھڑکی میں سے جھانکا۔ دروازے پر محمد علی مزارع کھڑا تھا۔ اس کی پگڑی سر سے لٹک کر گلے میں پھندا بن گئی تھی اور وہ کھڑا کانپ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" چودھری نے نیم وا آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سوال کیا۔

چودھری کو دیکھتے ہی اُس نے ہاتھ اُٹھائے اور دُہائی دی۔

"چودھری جی! چک نمبر۱۵ اور نمبر۱۶ کو سکھوں نے ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب وہ چک نمبر۶ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔" اتنا کہتے ہی وہ دوڑتا ہوا صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔

چودھری کی پتلیاں پھیل گئیں۔ اور اُس نے ایسا محسوس کیا گویا اس کی ریڑھ کی ہڈی میں کوئی شے رینگ رہی ہے "حملہ" اُس نے آہستہ سے کہا۔ اُس کا دل کانپنے لگا۔ اتنے میں نقارے پر چوٹ پڑی اور تمام گاؤں جھنجھناہٹ سے بھر گیا۔ اس کی بندوق دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اور اُس کے اُوپر کھونٹی میں گولیوں کا وزنی تھیلا لٹک رہا تھا۔ اُس نے سوچا "ہر چیز اور ہر کام کے لئے ایک وقت ہوتا ہے۔ اب اس کا وقت بھی آ گیا۔"

صفدر نے جلدی سے اپنے قمیص کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا اسے سوائے بندوق اور گولیوں کے اور کسی شے کی حاجت نہ تھی۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلا، تو دو بوڑھی عورتیں اُس کی طرف تیز تیز قدم اُٹھاتی آ رہی تھیں، اُن کے لہنگے پھیل کر چھتریوں کے مانند ہو گئے تھے۔

"بیٹا چودھری، ہمارا کیا بنے گا؟" ایک بوڑھی نے ہچکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"چچی چچی، میاں کیسی بات کر رہی ہو۔ سکھ کبھی حملہ کر بھی سکتے ہیں؟ اطمینان سے گھروں میں بیٹھی رہو۔"

چودھری انہیں پیپل کے نیچے ہائے ہائے کرتے ہوئے چھوڑ کر چلا گیا۔ احاطے میں کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تاجو کے چھپر کے نیچے چار لڑکے برچھے لئے کھڑے تھے۔ محمد علی اور احمد دین دوڑتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر گئے لیکن ابراہیم کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چودھری تیزی سے احاطے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ابراہیم کی آواز آئی "چودھری جی! ٹھہریئے۔" اس کے ساتھ شمو اور لال دین تھے۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اُس نے بڑے ادب سے کہا "چودھری جی! آپ جہاں کہیں جایئے اپنے آدمیوں کو ساتھ لیتے جایئے۔"

گاؤں میں اک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لوگ سڑکوں پر اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ عورتیں اور بچے چھتوں پر چڑھ کر چلّا رہے تھے۔ چودھری وسطی کنوئیں کی طرف بڑھا۔ کنوئیں کے سامنے گنگا رام کی دکان پر گلاب خاں پستول میں گولیاں بھر رہا تھا۔

چودھری نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا "معاملے کا صحیح علم بھی ہوا ہے یا نہیں؟"

گلاب خاں کے بدن پر ہلکا سا رعشہ طاری تھا۔ اُس کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اُس نے پستول بھر کے اپنی دھوتی کے پلو میں باندھ کر اُسے اپنی کمر میں اُڑس لیا۔

"عبدالکریم نے بتایا ہے کہ چک نمبر۹۶ سے ایک شخص آیا ہے جس نے اطلاع دی ہے کہ چک نمبر۶ والوں نے مدد طلب کی ہے۔"

چودھری کو دیکھ کر دو چار مزارع اور مسجد کے میاں جی بھی آ گئے۔

"جب تک کوئی مستند اطلاع نہ ملے اُس وقت تک آپ لوگ کیوں خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں؟"

نقارہ زور زور سے بج رہا تھا، اور گاؤں کے چاروں گوشوں سے گیدڑوں کی سی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ جنگلی لوگوں کی مدد کی پکار ہے۔ چھکڑے کھڑکھڑاتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ گاؤں کی بیرونی سڑک پر غبار کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ اِتنے میں مسجد کے عقب سے تین سوار نمودار ہوئے۔

اُن کا دم پھُولا ہُوا تھا اور اُن کے چہروں سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ اُنہوں نے چودھری کے پاس پہنچ کر گھوڑے روک لئے اور کہا "ہم چک نمبر ۹۶ سے آرہے ہیں۔ چک نمبر ۹۷ پر واقعی حملہ ہوگیا ہے۔ اِس لئے اپنے کچھ آدمی مدد کے لئے بھیجئے۔ اب ہم چک نمبر ۷۰ کی طرف جارہے ہیں "۔

ایک مزارع نے پوچھا " بھائی لسّی پانی پیوگے ؟"

" نہیں "۔ یہ کہہ کر اُنہوں نے گھوڑوں کا رُخ پھیرا، اور انہیں ایڑ لگائی۔ چند ہی لمحوں میں وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور صرف غبار باقی رہ گیا۔

اِن سواروں کے جاتے ہی گاؤں میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ آناً فاناً تمام گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ عورتوں کے بین کی آوازیں بلند تر ہوتی جارہی تھیں۔ نقارے پر چوٹ اس قدر زور سے پڑنے لگی کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ منشی کرم دین مسجد سے بھاگا بھاگا نکلا۔ اور لوگوں کے مجمع میں آگیا۔ وہ حسبِ معمول دھوتی اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔

اُس نے چلّا کر کہا " یہ کون نقارہ بجا رہا ہے۔ بند کرو اسے فوراً بند کرو "۔

تھوڑی دیر کے بعد نقارہ بند ہوگیا۔ اور اسماعیل کی بلند آواز یہ کہتے سنائی دے رہی تھی " تم نے کس کی اجازت سے نقارہ بجانا شروع کیا تھا ؟"

نقارے کے بند ہوتے ہی گاؤں میں قدرے سکون ہوگیا، گاؤں کے لوگ رفتہ رفتہ چودھری کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ وہ مختلف تجویزیں پیش کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا ابھی جتھا بند ہو کر ۹۷ کی طرف چلا جائے۔ دوسرے کہہ رہے تھے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں۔ گاؤں کو یُوں خالی چھوڑ کر جانا سخت حماقت ہے۔

عورتیں بھی گھروں سے نکل نکل کر کنوئیں کی جانب آرہی تھیں، اُن کی کافی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ یکایک منشی کرم دین کا غصّہ دبی ہوئی چنگاری کی طرح بھڑک اُٹھا۔ اور وہ باؤلے کُتّے کی طرح عورتوں پر جھپٹا۔

" تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم گھر میں امن سے بیٹھ نہیں سکتیں "۔
منشی کو دیکھتے ہی عورتیں بھاگ گئیں۔

چودھری صفدر خاموشی سے مجمع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لوگوں کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ ایک اپنی بات پُوری نہ کرنے پاتا کہ دوسرا بیچ میں بول اُٹھتا۔ پھر ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ کر بلند آواز سے بولنے کی کوشش کرتا۔ بالآخر چودھری نے ہاتھ سے سب کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا " یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں۔ ہمیں کچھ کرنا چاہیئے "۔

مجمع میں پھر باتیں شروع ہوگئیں۔ اِس پر مستری نور کو غصہ آگیا " تم لوگ کیسے گنوار ہو، ایک بات کرے تو سب کو چُپ ہو جانا چاہیئے "۔

چودھری نے اپنی تقریر پھر شروع کی " گاؤں کو خالی کر کے جانا سخت حماقت ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ گاؤں کے چاروں ناکوں پر پہرہ بٹھا دیں۔ اور باقی لوگ نہایت ہوشیاری سے اپنے اپنے گھر کے آگے کھڑے ہو جائیں "۔

مستری نور نے پُوچھا " چک نمبر ۹۷ کو کتنے آدمی بھیجنے چاہئیں "۔

" میرا خیال ہے ہم فی الحال پانچ شخص گھوڑیوں پر بھیج دیں۔ وہ چک نمبر ۹۶ پہنچیں اور وہاں سے صحیح صحیح حالات معلوم کر کے اپنے میں سے ایک شخص کو یہاں بھیج دیں۔ اگر مزید مدد کی ضرورت ہوئی تو ہم اور بھی آدمی بھیج دیں گے "۔

تین چار آوازیں بلند ہوئیں " بالکل ٹھیک ہے "۔

چک نمبر ۹۶ کون جائے گا؟ لوگوں میں پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ چودھری نے بلند آواز سے کہا "چک ۹۶ کون کون جائیگا"

پھر مستری نور نے بلند آواز سے کہا "بتاؤ بھائی چک ۹۶ کون کون جائے گا؟"

لوگوں نے چودھری اور مستری کی طرف دیکھا لیکن پھر باتوں میں مصروف ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ گاؤں سے باہر قدم رکھنے سے ہچکچا رہے تھے۔

گلاب خاں جو دیر سے چپ کھڑا تھا تیزی سے بولا "یار تم لوگ عجب احمق ہو، باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ رحیم تم تیار ہو کر جاؤ۔ اللہ دتا تم بھی جاؤ۔"

رحیم چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد سفید گھوڑی پر سوار ہو کر آگیا۔ اس کے ساتھ اللہ دتا بھی ہولیا۔ اور جب وہ چک نمبر ۹۶ کی طرف چلنے کو تیار ہوئے تو ان کے ساتھ لوگوں کی ایک بھیڑ ہولی۔

منشی کرم دین تیزی سے چلایا "ہمارا گاؤں کتنا بیوقوف ہے۔ پہلے کوئی چلنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ اور اب چلے ہیں تو سبھی ساتھ ہولئے ہیں۔ صرف پانچ جاؤ باقی لوٹ آؤ۔"

جانے والوں کو پیچھے سے "لوٹ آؤ، لوٹ آؤ" کی پکار سنائی دی، کچھ لوگ لوٹ آئے باقی چلے ہی گئے۔

چودھری نے اپنی بندوق کندھے پر رکھ لی اور کہا "اب پہرے بیٹھ جائیں، میں تمام گاؤں کا چکر لگاؤں گا" یہ کہہ کر وہ چلا اور اس کے ساتھ منشی کرم دین، مستری نور اور محمد صدیق ٹھیکیدار کا چھوٹا بھائی ساتھ ہولئے۔ گلاب خاں وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

گاؤں کے چاروں ناکوں پہ پہرے بیٹھ گئے۔ مغربی ناکا جو چک نمبر ۹۶ اور نمبر ۹۰ کے رخ پر واقع تھا گاؤں کے منتخب جوانوں سے بالخصوص مضبوط بنایا گیا تھا۔ کھالے کی پلیا سے لیکر سکول تک برچھا برداروں کا ایک جم غفیر کھڑا تھا۔ مشرقی ناکا بھی کافی پُر رونق تھا۔ یہ پکی مسجد کے ساتھ تھا۔ یہاں ایک شیشم کا موٹا درخت تھا جس کے سائے نے بہت سے پہرے داروں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہاں پہرے دار ایک پرے کی شکل میں کھڑے تھے۔

جنوبی اور شمالی چوکیاں زیادہ پُر رونق نہ تھیں۔ اس جانب حملے کا امکان بھی کم تھا۔ اس لئے یہاں بلغمی اور سوداوی طبائع کے پہردار متعین تھے۔ وہ کم گو تھے۔ اگر وہ فسادات پر گفتگو کر رہے تھے تو نہایت غیر جانبداری سے۔ ان کی بات چیت کا سب سے بڑا موضوع پانی کی بندی تھا۔ اور یہ کہ سکھوں نے نہر کو جگہ جگہ سے کاٹ دیا ہے۔ اس کے خلاف مغربی اور مشرقی محاذ اپنے جوانوں کے جوشیلے پن اور سرگرم گفتگو سے ہنگامہ خیز بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی خبروں پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ چند لوگ تو اس قدر جوش میں آگئے کہ اپنے دشمنوں کو بے نقط سنانے لگے۔ چودھری صفدر نے ہر لگے پر صبر اور تحمل کی تلقین کی۔ وہ خبروں اور اخباروں کے نقطۂ نگاہ سے کچھ مختلف خیال ہی ظاہر کر رہا تھا۔ امن و امان کی تعلیم میں وہ اُن سے الگ رائے رکھتا تھا جو ہر خبر کو منتقمانہ پیرائے میں بیان کرنے کے عادی تھے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک ناکے سے دوسرے کی طرف جا رہا تھا۔ گاؤں کے گرداگرد یہ اس کا تیسرا چکر تھا۔ وہ سر سے لیکر پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھی مستری نور، منشی کرم دین اور محمد صدیق تھک کر گنگا رام کی بیری کے نیچے چارپائی پر بیٹھ گئے، جہاں اُن سے قبل گلاب خاں محفل جمائے بیٹھا تھا لیکن نوجوان چودھری اسی طرح قدم اُٹھائے جا رہا تھا گویا کہ اس کے دل میں کوئی آگ سلگ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت چمکیلے بال پریشان ہو کر اُس کی پیشانی پر گر رہے تھے اور پسینے کی دھاریں اُس کے

سرسے پھوٹ پھوٹ کر اُس کے سینے تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کا قمیض اس کے جسم کے ساتھ چپک گیا تھا۔ اور اُس کا تہبند بار بار اُس کی ٹانگوں میں اُلجھتا۔ اب وہ مغربی ناکے پر پہنچ گیا۔ وہ پہرہ داروں میں تکان کی علامات دیکھ رہا تھا۔ باتوں میں اب ویسی گرمی باقی نہ تھی۔ چند پہرے دار بیٹھے جمائیاں لے رہے تھے وہ دیر کے گھروں کو چلے گئے ہوتے اگر وہ اپنے گاؤں کے جواں سال زمیندار کو یوں سرگرم اور پُرجوش نہ پاتے۔ اُس نے پلیا کے اُوپر کھڑے ہو کر چک نمبر ۲۶ کی طرف دیکھا کھُلی سڑک کے کنارے کیکروں کی مسلسل قطار چلی گئی تھی۔ دُور ایک چھکڑا آہستہ آہستہ اُن کے گاؤں کی طرف چلا آ رہا تھا۔ دھوپ کی تیزی میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ ایک مزارع نے پوچھا "کیوں چودھری جی چھتری لے آؤں؟"

چودھری نے انکار کر دیا "دنیا میں ایک وقت آرام کا ہوتا ہے تو ایک وقت تکلیف کا بھی ہوتا ہے۔ ہمیں سخت کوش بننا چاہیئے۔"

مزارع جوان چودھری کی بات سُن کر دل ہی دل میں خوش ہوا "چودھری جی! آپ تو باغ کے پھول ہیں کہیں کمھلا نہ جائیں۔ ہم تو جھاڑ کے کانٹے ہیں کہ جنگل کی نرمی سختی سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔"

چودھری مسکرا کر چل دیا۔ ایکا ایکی وسطی کنوئیں سے ایک لمبی دردناک چیخ سُنائی دی۔ اور ایک دم تمام گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ پہرے پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ اُٹھ بھاگنے کو تیار ہوئے لیکن چودھری نے چلا کر کہا "اپنے محاذ کو مت چھوڑو، اگر ضرورت پڑی تو تمہیں بُلا لیا جائے گا۔" اتنے میں گاؤں سے ایک ٹھنگنے قد کا شخص نکلا اور اُس نے چلا کر کہا "چودھری جی بھاگیئے، چک نمبر ۲۶ کے سکھوں نے حملہ بول دیا ہے۔" یہ چک مشرقی ناکے کے رُخ پر واقع تھا۔

مکانوں کی چھتوں پر عورتیں اور بچے چڑھ گئے اور زور زور سے چلانے لگے۔ عورتوں کے رونے اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ چودھری کے منع کرنے کے باوجود تمام پہرے دار بھاگنے لگے۔ گاؤں کے چاروں گوشوں سے لوگ مشرقی ناکے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ باوجود قوت اور ہمت کے چودھری نے محسوس کیا گویا اُس کی ٹانگیں سُن ہوتی جا رہی ہیں۔ اُس نے تھیلے کو کھول کر گولیاں نکالنی چاہیں لیکن اُس نے دیکھا کہ اُس کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں اور اُسے تھیلے کا تسمہ کھولنے میں وقت لگا۔ اُس کے قریب لوگ دوڑتے جا رہے تھے۔ اُن کی رفتارِ قدم ظاہر کر رہی تھی کہ موت کا کوئی خوف اُن کے اعصاب کو شل نہ کر رہا تھا۔ وہ ایک حیوانی ابتہاج کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ گویا وہ مُدت سے اپنی جبلتِ حرب کی تسکین کے لئے ترس رہے تھے۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اُسے ایک بڈھا نظر آیا جو چھت پر کھڑا زور زور سے چلا رہا تھا "بھاگنے نہ پائیں" لوگ گھروں سے برچھے لئے مشرقی محاذ کی طرف دوڑ رہے تھے ایک شخص چلایا "چودھری جی! اب کیوں آہستہ چل رہے ہو، یہی تو دوڑنے کا وقت ہے۔" اس پر چودھری نے تیز قدم اُٹھائے لیکن اُس نے محسوس کیا کہ یہ کوشش بیکار تھی، کیونکہ اُس کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ اُس کے دل میں بلکلفت ایک خیال اُبھرا "میرے لئے مرنا کیا ضروری ہے؟ مجھے اپنا آپ بچانا چاہیئے۔ میں دُنیا میں جو کام کرنا چاہتا ہوں وہ ادھورا ہی رہ جائے گا۔ مجھے قدرت کی طرف سے جو عالی دماغ ملا ہے اُس کی کرشمہ سازیاں بے سود ہی رہ جائیں گی؟ میرے خیال میں جو کام میں کرنا چاہتا ہوں وہ کُل نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے ہے۔ اگر

میں قتل ہو گیا تو اسے کون مکمل کرے گا؟" لیکن نفسانیت کے اس جذبے پر وہ خود ہی شرما گیا۔

اس کے باوجود وسطی کنوئیں تک پہنچتے پہنچتے وہ بے دم سا ہونے لگا۔ مسجد کے قریب ایک شخص اپنا صافہ ہلا رہا تھا، اور بآوازِ بلند پکار رہا تھا: "کوئی خطرہ نہیں، کوئی خطرہ نہیں۔" یہ سنتے ہی اُس کے جسم میں گویا جان سی پڑ گئی، اور رُکا ہوا خون پھر چلنے لگا۔ وہ تیزی سے بڑھا اور مسجد تک پہنچا۔ مسجد کے سامنے لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ چودھری کو دیکھ کر تمام لوگ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کیا معاملہ تھا؟"

اللہ بخش بولا: "ایک سکھ یہاں سے گزرنے لگا کہ چند لڑکے اُس کے پیچھے لگ گئے۔ وہ اپنی کرپان پھینک سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ہم نے انہیں واپس بلا لیا ہے۔"

چودھری نے غصے سے پوچھا: "کون کون تھا ویسا لڑکا؟"

"ایک نائی تھا اور دو ارائیں لڑکے تھے۔"

چودھری نے تیوری چڑھا کر اُن کی طرف دیکھا: "بے وقوفو تمہاری ایک غلطی سے لاکھوں جانیں تلف ہو سکتی ہیں۔ اب وہ اپنے گاؤں میں پہنچ کر کیا خبر سنائے گا؟ اگر یہ جگہ میدانِ جنگ بن جائے تو یہ مت سمجھو کہ یہیں خون بہے گا۔ اس خون کا رنگ تمام ملک کو اپنے رنگ میں رنگ لیگا۔ ہم یہاں ایک سکھ ماریں گے تو وہ لوگ ہمارے دس بھائی وہاں قتل کر دیں گے۔ اگر تمہیں ان پر ترس نہیں آتا تو اپنے بھائیوں ہی پر رحم کرو۔"

مستری نور جو چودھری کی پشت پر کھڑا تھا۔ نہایت طیش سے آگے بڑھا اور نائی کو گریبان سے پکڑ کر بولا: "تمہیں کس نے پردھان بنایا؟" دوسرے لوگ بھی پل پڑے اور اُسے سخت سست کہنے لگے لیکن منشی کرم دین ان سب پر پل پڑا: "بادتم عجیب لوگ ہو؟ جب یہ اُس سکھ کے پیچھے بھاگے تھے تو اُس وقت تم انہیں پکڑ کر روک نہیں سکتے تھے؟"

دُور کھیتوں کے درمیان ایک شخص گھوڑی پر لادی لادے آ رہا تھا۔

"وہ کون ہے؟"

سب کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایک لڑکے نے کہا "چک نمبر ۴۲ کا کھتری ہے۔ شہر سے سودا سلف لئے آ رہا ہے۔"

منشی کرم دین نے اسماعیل سے کہا: "جاؤ اس سے کہو کہ بے خطر چلا آئے۔" لڑکا اُس کی طرف لپکا۔ گھوڑی والے نے جونہی اس ہجوم کو دیکھا اُس نے فوراً اپنی گھوڑی کا رُخ پھیر لیا، اور اُسے ایڑ پر ایڑ لگانے لگا۔ لیکن گھوڑی تھکی ہوئی تھی وہ اَڑ گئی۔ لڑکے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر کھتری نے گھوڑی سے چھلانگ لگا دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ لڑکے نے آواز دی: "لالہ گھبراؤ نہیں چلے آؤ۔" اس پر دو چار لڑکے اور بھی اس کے پیچھے بھاگے۔ مگر لالہ نے ایک نہ سُنی اور سرپٹ بھاگتا گیا۔ لڑکے بھی اس کے پیچھے لگے پکارتے چلے جا رہے تھے۔ لالہ ایک کھالا پھلانگنے لگا کہ پاؤں رپٹ گیا اور منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ لڑکوں نے اُوپر سے جا لیا اور اُسے پکڑ کر اُٹھایا۔ لالہ ہانپ رہا تھا اور بک رہا تھا: "میں شہر گیا تھا، ہاں میں شہر گیا تھا سودا لانے۔" لڑکے زور زور سے ہنسنے لگے۔ اور لالہ اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔

چودھری بھی موقع پر پہنچ گیا۔ اُس نے لالہ کو تسلی دی۔ لالہ کا دم میں دم نہ آ رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا: "بُرا ہو زمانے کا، آجکل مہاجن بھی دشمن دکھتا ہے۔"

چودھری نے لالہ کو گھوڑی پر سوار کیا اور اُسے خود مغربی چک کی حد تک پہنچا کر آیا۔

مغربی چوکی کے پہرے داروں نے چودھری کے لئے دُودھ کی لسّی تیار کر رکھی تھی۔ وہ چودھری کی دوڑ دھوپ کو مشکر اور احسان کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ مغربی چوکی پر پہنچا تو ایک مزارع نے اُٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے کشاں کشاں اس چارپائی کی طرف لے گیا جو کیکروں کے سایے میں بچھی ہوئی تھی۔

"چودھری جی! ذرا سستا لیجیئے۔" سب پہرے دار اس کے گرد گھیرا ڈال کر زمین پر بیٹھ گئے۔ اور چودھری لسّی پینے لگا۔ چودھری نے لسّی کا ایک گلاس ہی پیا تھا کہ دُور چک نمبر ۶۶ کی طرف سے دو گھڑ سوار آتے دکھائی دیئے۔ کسی نے کہا سفید گھوڑی تو رحیم کی ہے یہ دوسرا کون ہے؟

اللہ بخش نے نظر پر زور ڈال کر دیکھا "یہ حسن بلوچ نہیں؟ گھوڑا تو وہی ہے!"

اللہ بخش کا قیافہ درست نکلا۔ رحیم چودھری کو دیکھتے ہی گھوڑی سے اُتر آیا" کوئی فکر کی بات نہیں بالکل خیریت اور امن امان ہے سکھوں نے کوئی حملہ نہیں کیا۔ چک نمبر ۲۵ کے سکھوں اور جنگلیوں کے درمیان ایک بھینس کے سودے پر تنازع ہو گیا تھا لیکن چند داناؤں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔"

حسن بلوچ کا بلند قامت اور مضبوط گھوڑا زور زور سے ہنہنا رہا تھا۔ وہ اسے ایک جگہ کھڑا کرنے کے لئے باگیں کھینچ رہا تھا لیکن وہ دُگنی قوت سے چک پھیریاں لینے لگا۔ حسن بلوچ ایک مضبوط اور طاقتور جوان تھا۔ اُس کی کمر کے ساتھ پستول بری خول میں لٹک رہا تھا۔ اور اُس کے بائیں ہاتھ میں ایک لمبا برچھا تھا۔ اُس نے پہرے داروں کو خطاب کیا" شاباش جوانو! کفر و اسلام کی جنگ ہے۔ اپنے گھروں کی حفاظت کے لئے جانیں ہتھیلی پر لئے رہو"

کفر و اسلام کے الفاظ چودھری کے دل میں ترازو ہو گئے۔ وہ خاموش نگاہوں سے بلوچ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چودھری اُس کی طرف دیکھتا رہا تا آنکہ وہ گھوڑے کی ٹاپوں سے اُڑتے ہوئے غبار میں گم ہو گیا۔

چودھری گھر پہنچتے ہی بے بس ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ وہ یکایک تھکن سے اس قدر چُور ہو گیا کہ اس کو کروٹ لینا بھی گوارا نہ تھی۔ وہ کامل سکون چاہتا تھا۔ اس کی والدہ اس کے لئے دُودھ کا پیالہ لائی، لیکن اُس نے پینے سے انکار کر دیا۔ وہ صرف سکون اور تنہائی چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ ہلکی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ باہر آسمان پر بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اور ڈوبتے سورج کی کرنیں پیلو کے پتّوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ وہ دیر تک غمگین خیالات میں ڈوبا رہا۔

زندگی کے تاریک پہلو اس کے سامنے پرے باندھے آ رہے تھے اور شام کے پردے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ پیلو کی سبزی سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ اور پرندوں کے غول اپنے آشیانوں کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ نوجوان مفکّر کے جسم کی تکان اب میٹھے سکون میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں خیالات کی تیزی اور ہیجان قدرے کم ہوا۔ اور اس کے ساتھ اُس نے محسوس کیا کہ ان مسائل کے حل کی اُمید ابھی باقی ہے۔ مسجد سے شام کی اذان کی آواز آئی۔ چودھری جلدی سے اُٹھا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ جب وہ ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہا تھا تو اسے قرآن کی بتائی ہوئی ایک حقیقت یاد آئی۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (آگاہ رہو کہ خدا کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان

حاصل ہوتا ہے۔)

انتقال

شام کے قریب اللہ بخش نے کرتار سنگھ کو رجبہا کے کنارے اپنے بال بچوں سمیت جاتے دیکھا۔ اللہ بخش نے اپنے بیل کو رجبہا میں دھکیل دیا اور کرتار سنگھ کی طرف بڑھا۔ کرتار سنگھ نے چھکڑے کو روک لیا۔ وہ اللہ بخش کی طرف سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اور اُس کی بیوی رونے لگی۔

اللہ بخش نے نزدیک آتے ہوئے کہا "مجھ سے ڈرو نہیں ہم وہی ہیں جو اکٹھے بھیڑیں چراتے تھے اور خزانچی کے باغ سے آم توڑتے تھے۔"

کرتار سنگھ نے اپنی قمچی ہاتھ سے رکھ دی اور اپنی پگڑی کا پلّو آنکھوں پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اللہ بخش ضبط نہ کر سکا اور اُس کی چیخیں نکل گئیں۔

کرتار سنگھ نے روتے ہوئے کہا "یہ تقدیر ہے، یہ موت ہے، کون جانتا تھا کہ ہم ہرے بھرے کھیتوں کو چھوڑ کر یُوں جائینگے کون جانتا تھا کہ بچوں کے شور و غل اور میاں بیوی کی محبت سے معمور گھر تج کے ہم کو جانا پڑے گا۔ اے ٹھور ٹھکانے والے ہم سے پوچھ موت کیا ہے؟ ہم سے پوچھ دل پر پتھر رکھ کے زندگی چھوڑنا کیا ہے؟"

کرتار سنگھ کی بیوی کا سر چھکڑے کے بانسوں پر رکھا تھا۔ اس کا چہرہ بے رنگ تھا۔ وہ ایسی نظر آتی تھی گویا آسیب زدہ ہے، پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اُس نے اللہ بخش کی طرف دیکھا، اور پھر اپنے گاؤں کی سمت میں دیکھنے لگی۔ دونوں وقت مل رہے تھے، بجھے ہوئے اُفق سے سیاہی کے بخارات آہستہ آہستہ اُبھر رہے تھے۔ اللہ بخش کے ڈھور ڈنگر کٹی ہوئی چری کی کھونٹیوں پر منہ مار رہے تھے۔

"بھائی اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے آنا۔ اگر چاہو تو کولہو منگوا لو۔ اگر تمہیں بھینس کی ضرورت ہو تو وہ لے لو۔ ایک سیاہ رنگ کا گھوڑا پچھلے مہینے خریدا تھا وہ بھی تمہاری نذر ہے۔"

کرتار سنگھ اپنی ناک جھاڑ رہا تھا لیکن اللہ بخش چپ کھڑا سرخ آنکھوں سے چھکڑے کے پہیے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا ایسے دُکھی لوگوں کا مال جائز ہے؟ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں! جس مال نے ان سے وفا نہیں کی وہ کسی دوسرے سے کب وفا کرے گا؟

بیلوں نے سر ہلائے اور گھنٹی کی ٹن ٹن نے کوچ کا پیغام سنایا۔ کرتار سنگھ نے قمچی اُٹھالی اور بیلوں کو ہانکنے لگا "ہماری قسمت میں لکھا تھا کہ کسی کے کرموں کا پھل ہمیں چکھنا ہے۔ اچھا رب نے چاہا تو پھر ملیں گے۔"

کرتار سنگھ کی آنکھیں پھر ڈبڈبا آئیں۔ اُس نے اللہ بخش کی طرف دیکھا لیکن جلدی سے بیلوں کی طرف مڑا اور اُنہیں ٹٹکارتے ہوئے ہانک دیا۔ چھکڑے کے پہیے چرچرائے اور اُس لیک پر چلنے لگے جو اس سے پہلے گزرتے ہوئے چھکڑوں کے بوجھ سے گہری ہو چکی تھی۔

بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ چھکڑا اب بوڑھے کیکر کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اللہ بخش نے اپنے بیل کی طرف دیکھا جو رجبہا کے چلتے ہوئے پانی میں زور زور سے سانس لے کر پانی پی رہا تھا۔ اُس کا دل غمگین تھا۔ اُس نے ایک بار پھر مڑ کر چھکڑے کی طرف دیکھا۔ چھکڑے سے سسکیوں کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

اللہ بخش نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنے بیل کو رجبہا سے نکالا۔ جب وہ رجبہا کی پٹڑی سے نیچے اُتر رہا تھا۔ تو اُس کے منہ سے

بے ساختہ مُنہ سے نکل گیا "کلجگ ہے میاں کلجگ۔" جب وہ اپنے کھیتوں میں پہنچا تو ڈھور ڈنگر گھر کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے اپنے اس بچھڑے کو تاکا جسے وہ پُورے ایک سال سے اس اُمید پر پال رہا تھا کہ ایک دن وہ بیل بن جائے گا اور اُس کے کام آئیگا۔ لیکن وہ چلنے کی بجائے زور سے پھنکارا۔ الٰہی بخش کے دل میں جس قدر غم بھرا ہوا تھا اسی قدر طیش بھر گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس پر تابڑ توڑ چھڑیاں برسانی شروع کر دیں۔ بچھڑا گھبرا کر بھاگا اور اس کے ساتھ تمام چوپائے بھاگتے ہوئے کپاس کے کھیت میں گھس گئے۔ اُس نے سرعت سے اُن کا رُخ پگڈنڈی کی طرف پھیرا۔ جب وہ گاؤں کے نزدیک پہنچا اور کھیتوں سے دوسرے چوپائے بھی لوٹتے دیکھے تو یکا یکی اس کا جی چاہا کہ کاش میں کرتار سنگھ کے ڈھور ڈنگر لے ہی لیتا۔

گدھ

علی الصباح پو پھٹنے کے قریب دو گولوں کے چھوٹنے کی آواز آئی۔ ایک گولہ اس وقت چھوٹا جب مُرغ نے پہلی بانگ دی اور دوسرے گولے کی اُس وقت آواز آئی جب میاں جی نے اذاں دی۔ اس کے بعد کامل خاموشی رہی۔ مسجد میں مستری نُورا اور الٰہی بخش بھی آگئے اور فتح محمد نے ڈول کنوئیں میں اُتار دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر جب نمازی باہر نکلے تو چک نمبر ۸۶ کی جانب سے نُورا دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ وہ دُور ہی سے اپنا صافہ ہوا میں ہلا رہا تھا۔ مستری نور گھبرا کر شیشم کے درخت سے لگ گیا۔ جو مسجد کے صدر دروازے کے عین سامنے تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور اُس کا دل اس طرح دھک دھک کر رہا تھا گویا وہ پکار رہا ہو "حملہ، حملہ، حملہ!"

غلام حسن اور ابراہیم بھی باہر نکل آئے۔ نُورا اب قریب آگیا تھا۔ مستری نے ہکلاتے ہوئے پُوچھا "کیوں کیوں کیا ہے؟"

"چک نمبر ۸۶ بالکل خالی ہو گیا ہے۔"

نُورا کا سانس پھُولا ہوا تھا مگر وہ ہراساں نہ تھا۔

مستری نے پُوچھا "کیا مطلب؟" وہ پُورا معاملہ سمجھنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔

"اُنہوں نے گاؤں خالی کر دیا ہے۔ وہ چلے گئے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

الٰہی بخش نے پوچھا "تم اُس وقت کہاں تھے؟"

"مَیں صبح سویرے اسماعیل کے مربع میں گھاس کھودنے گیا تھا کہ میں نے چھکڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سُنی۔ میں نے سمجھا سکھ حملہ کرنے آئے ہیں۔ مَیں نے پہلے تو ارادہ کیا کہ بھاگ جاؤں پھر مَیں نے سوچا کہ اصل بات تو معلوم کر لوں۔ چنانچہ میں سرکنڈوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اُن کے چھکڑے ایک قافلے کی صورت میں گاؤں سے نکل رہے تھے اور وہ زار و قطار رو رہے تھے۔"

اتنا کہہ کر نُورا تیزی سے چلا گیا۔ لیکن وہ ایسی بات کہہ گیا جس کو دل فوراً قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو رہے تھے۔ مستری نُور کا دل قدرے ٹھنڈا ہوا تو اُس نے تھوکتے ہوئے کہا "یہ دھوکا ہے۔ سکھ گاؤں خالی کر کے کبھی جا ہی نہیں سکتے۔ یہ ایک چال ہے۔"

لیکن الٰہی بخش معاملے کو راست دیکھنا پسند کرتا تھا۔ "اُنہوں نے گاؤں ضرور خالی کر دیا ہے۔ پرسوں کرتار سنگھ مجھے جاتے ہوئے ملا۔ اُس نے خود مجھے بتایا۔"

مستری نے تیزی سے کہا "میاں کچھ ہوش کی دوا کرو کبھی یہ بھی ممکن ہے؟"

اِس گفتگو میں فضل بھی شریک ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ پہلا جب کھڑا سُنتا رہا لیکن جب اُس نے مستری کی ہٹ دھرمی

دیکھی تو اُس نے بھی غیر جانبداری کا دامن چھوڑ دیا۔"

"چچا تم کیسی باتیں کرتے ہو، اِس قوم کو ہمارا ملک چھوڑنا ہی تھا۔ جس طرح اُنہوں نے ہمارے بھائیوں کو اُن کے گھروں سے نکالا اسی طرح وہ بھی نکالے جائیں گے۔"

مستری اس کا جواب تیزی سے دینے ہی والا تھا کہ سب کی نظریں رحمت کے چھکڑے کی طرف اُٹھ گئیں جو بڑی تیزی سے اُسے بھگاتا لا رہا تھا۔ وہ بیلوں کے کُولھوں میں زور زور سے پچیاں چبھو رہا تھا اور پکار رہا تھا: "گاڑی چلی ہے مال لانے۔" اس کے پیچھے نور گدھی پر پالان ڈالے چلا آ رہا تھا۔ وہ گدھی کو چک نمبر ۲۸۶ کی طرف کھینچ رہا تھا لیکن وہ اپنے گاؤں ہی میں رہنے پر مُصر تھی۔ نور نے غصّے سے اُس کی دُم مروڑی اور گویا اسے کوک لگ گئی ہو وہ نہایت پھرتی سے چلنے لگی۔ اس کے بعد دو تین اور مزارع نمودار ہوئے اور وہ سب ۲۸۶ کی طرف رُخ کئے ہوئے تھے۔

"یہ عجیب تماشا ہے۔" مستری کا غصہ حیرت میں ڈوب گیا۔

ایکا ایکی فضل بھی اُچھلا اور گھر کی طرف اُٹھ دوڑا۔

مستری نے زور سے پکارا: "فضل، او فضل! مت جاؤ خطا کھاؤ گے۔"

اللہ بخش نے بھی آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف قدم اُٹھائے وہ سوچ رہا تھا اگر وہ کرتار سنگھ سے گھوڑے لیتا تو کیا حرج تھا۔ اُس کا سیاہ گھوڑا کتنا خوبصورت تھا۔ اور خیال ہی میں اُس نے اپنے تئیں سیاہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار اپنے مربع کا چکر لگاتے دیکھا۔ دل نے کہا اب بھی موقع ہے، مجھے چک نمبر ۲۸۶ ضرور جانا چاہیئے۔ مستری اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اور اُس کی آواز ابھی تک سُنائی دے رہی تھی: "یہ چال ہے، یہ چال ہے۔"

اللہ بخش گھر آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ احاطے میں ہر جگہ ۲۸۶ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ احاطے میں ایک جگہ حقّے کے گرد مجمع لگا تھا، اور کریم نائی کہہ رہا تھا: "گولے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی، میرے قریب میرا لڑکا لیٹا ہوا تھا، وہ ڈر گیا، میری بیوی کہنے لگی کمبخت سکھ کہیں حملہ تو نہیں کرنے والے۔"

صالح کھوجی نے حقّے کا کش لگایا۔ اور نہایت سکون سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا: "ابھی تارے مغرب کی طرف جھکے نہیں تھے جب میری آنکھ کھلی۔ بھینس چرنی کے پائے کے ساتھ سینگ مار رہی تھی۔ کھٹ کھٹ سے نیند اُچٹ گئی۔ میں نے اسے کھول کر الگ کھونٹے پر باندھا۔ اس وقت رمضان چلم بھرنے کے لئے آگ سُلگا رہا تھا۔ میں پھر لیٹ گیا۔ ابھی لیٹا ہی تھا کہ گولہ چلنے کی آواز آئی۔ میں نے کہا یہ کیا۔ رمضان بولا، یہ بم ہے جو مسلمانوں کو ڈرانے کے لئے پھینکا گیا ہے۔"

صالح کے پاس ایک دُبلا پتلا نوجوان بیٹھا تھا، وہ ٹھیکیدار ابراہیم کا بیٹا تھا۔ اور اُس نے مڈل تک تعلیم پائی تھی۔ اُس نے کہا: "وہ سکھ واقعی جا رہے ہیں؟ لیکن کیوں؟"

صالح نے جواب دیا: "کیوں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں؟" وہ اپنے کرتوتوں کے خوف سے بھاگ رہے ہیں۔ جانتے ہو اُنہوں نے وہاں کیا کیا۔ ان کے ادنیٰ سے ادنیٰ جاروب کش سے لے کر بڑے سے بڑے افسر تک مسلمانوں کو وطن بدر کرنے پر تُلے ہوئے ہیں، اور وہ سب ایک منظم سازش کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ ان کی فوج مسلمانوں کو قتل کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اب وہ اپنے انجام کے خوف سے پہلے ہی سے بوریا بستر گول کر کے جا رہے ہیں۔ ان کو کسی نے نکالا تو نہیں۔"

اتنے میں احاطے میں رحمت کا چھکڑا داخل ہوا، اُس کا

چھکڑا گندم کی بوریوں، چارپائیوں، کرسیوں اور میزوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ تمام احاطے میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگ حقہ چھوڑ رحمت کے چھکڑے کی طرف لپکے۔

"کیا سکھ واقعی جا چکے ہیں؟"

"تمام گاؤں خالی پڑا ہے۔ گندم کی بوریوں کے انبار لگے ہیں، گڑ کے ڈھیر لگے ہیں، شکر بازاروں میں مٹی کی طرح بکھری ہوئی ہے، ڈھور ڈنگر کھیتوں میں آوارہ پھر رہے ہیں۔"

پھر رحمت نے اپنے بھائی اللہ دتا کو پکارا۔ اس کی بیوی اور بہن تیزی سے باہر نکلیں اور چھکڑے سے کرسیاں کھینچ کھینچ کر اتارنے لگیں۔

اس کے بعد احاطے میں کھٹ کھٹ کی آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئیں۔ بیلوں کی گھنٹیاں ایک مسلسل شور کے ساتھ بجنے لگیں۔ اور اس کے چند لمحوں کے بعد ایک زبردست گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ چند چھکڑے احاطے سے باہر نکل رہے تھے۔

الہ بخش بے چینی کے عالم میں اپنے گھر کے سامنے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس کی بیوی رحمت کا سامان دیکھنے گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا چک نمبر ۹ میں جانا خالی از خطرہ ہے یا پُر از خطرہ۔ شاید یہ واقعی سکھوں کی چال ہو۔ وہ گاؤں سے نکل کر قریب کے کھیتوں میں چھپ گئے ہوں کہ جونہی مسلمان آئیں ان کا قلع قمع کر دیں لیکن چھکڑوں کی گھڑگھڑاہٹ اور رحمت کے گھر کی کھٹا کھٹ اس کے دل پر ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ اس کے پاؤں گھر کے آنگن میں گڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس کا تخیل چک نمبر ۹ کی گلیوں میں گندم کی بوریوں اور گڑ شکر کے ڈھیروں کو ڈھونڈتا پھرتا جا رہا تھا۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی آ گئی۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے اور خشک تھے۔ وہ بہت گندی عورت تھی۔

"تم نہیں جاؤ گے؟"

بیوی کے اس سوال سے اس کا دل مردانگی سے بھر گیا۔ اس نے سوچا مجھے ضرور جانا چاہیے۔ گھر میں گندم کی آخری بوری ختم ہونے کے قریب ہے۔ اگر میں آج نہ گیا تو کل کو گندم کہاں سے آئے گی؟ ہم غریبوں کی امیدوں کا آخری سہارا گنگا رام بھی سدھار چکا ہے۔ اب میں کس کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہوں۔

اس کی بیوی چیخی: "تم تو سدا سوچ ہی میں ڈوبے رہو گے۔ اچھا بیٹھے رہو۔ لو میں جا رہی ہوں۔"

الہ بخش کا سویا ہوا غصہ جاگ اٹھا۔ وہ زور سے چلایا۔

"چڑیل کہیں کی، مت جا۔"

"کیوں اور یہاں بیٹھ کر تمہارا منہ دیکھوں۔ میں جا رہی ہوں۔"

"بیوقوف، یہ بھی سکھوں کی ایک چال ہے۔ وہ ایکھ کے کھیتوں میں چھپے بیٹھے ہیں، اور موقع پا کر نکل آئیں گے۔"

لیکن اس نے الہ بخش کے غصے کو کوئی وقعت نہ دی اور اندر چلی گئی۔ پھر الہ بخش کے دل میں خیال آیا۔ رحمت اتنا سامان لے کر آ رہا تھا مگر اسے تو راہ میں ٹوکنے والا کوئی نہیں ملا۔ اس کے بعد اس نے اپنا حقہ اٹھا لیا اور گاؤں کے چوک کی طرف چل دیا۔

چوک میں گنگا رام کی اجڑی ہوئی دکان کے سامنے چارپائیوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چودھری صفدر ان کے درمیان ایک بڑی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے چوک سے گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ گلاب خاں بھی موجود تھا۔ وہ بھی گاؤں کا سربرآوردہ شخص تھا۔

اس مجلس میں بھی وہی گفتگو ہو رہی تھی۔ لوگ قدرتی طور پر

چودھری کے خیالات معلوم کرنے کے خواہاں تھے۔ کیونکہ وہ گاؤں کا چودھری بھی تھا اور نیک آدمی بھی۔ چودھری نے ہلکی سی آہ بھری اور کہا "بھائیو تم ہی بتاؤ یہ کُلش جائز ہے؟ ایک طرف تمہارے بھائی خون کی ندیوں میں نہا رہے ہیں۔ وہاں قیامت برپا ہے اور دوسری طرف تم ہو کہ تمہیں لُوٹ مار کی سُوجھ رہی ہے۔ افسوس تمہیں قیامت کا خوف نہیں۔ تم جانتے نہیں کہ دُنیا فانی ہے اور دُنیا کا مال بالآخر دُنیا ہی میں رہ جائے گا؟"

منشی کرم دین نے حقے کا کش لگایا۔ اور کہا "دراصل بات یہ ہے کہ ہمارا گاؤں سخت گندا ہے۔ اگر گاؤں کے سب لوگ چودھری کی بات مان لیں تو ایک بہت بڑے گناہ سے بچ جائیں۔"

چودھری نے پھر کہا "یہ حق اصل میں اُن پناہ گزینوں کا ہے جنہیں یوں بے یار و مددگار گھروں سے نکالا گیا ہے۔ یہ خالی شدہ گاؤں حکومت کا حق ہیں۔ ملٹری کو چاہیئے تھا کہ وہ فوراً آ کر ان پر قبضہ کر لیتی یا ان کی حفاظت کا کوئی اور بندوبست حکومت کی طرف سے کر دیا جاتا، اور ان میں آنے والے پناہ گزینوں کو درجہ بدرجہ بسا دیا جاتا۔"

اب ڈھور ڈنگر جوق در جوق گزرنا شروع ہو گئے۔ بے پناہ گرد و غبار فضا پر محیط ہو گیا۔ گلاب خاں نے کھانستے ہوئے بہت طیش سے کہا "یہ انسانوں کا کام ہے؟ یہ لوگ تو گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔" وہ پھر کھنکارا۔ "مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ نالائق کے بچے اتنے جانوروں کو لے کر کیا کریں گے؟" پھر اُس نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا "بھائیو خوب یاد رکھو، خدا بھی سر پہ ہے۔ اگر تمہارے یہی اعمال ہیں تو فصلِ خریف کا اللہ بیلی۔"

الٰہی بخش نے دل میں سوچا۔ چودھری نے بالکل سچ کہا ہے۔ یہ سب ڈکیتی ہے بلکہ یہ لُوٹنے والے مُردار خور گدھ ہیں۔ مگر اس کے دل میں بھی سخت ہیجان برپا تھا۔ بالآخر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بازار کے سرے پر دو مزارع نظر آئے۔ اُس نے قصداً اُن کو روک لیا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ رائے عامہ پاکستان جانے کے حق میں ہے یا اس کے خلاف۔ اُنہوں نے اسے تازہ ترین خبر سنائی کہ سورنا عیسائی ہندوستان سے بھاگا بھاگا آیا ہے اور اُس نے بتایا ہے کہ ملٹری گاؤں میں قبضہ کرنے کے لئے پہنچ گئی ہے۔ اس خبر نے گویا اُس کے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا "میں نے اچھا کیا جو اُن بے وقوفوں کے ساتھ نہیں گیا۔"

لیکن جب وہ احاطے میں پہنچا تو بچے کھچے لوگ بھی پاکستان جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ الٰہی بخش چلّایا "او پھتو، او کریم پاکستان مت جائیو، ملٹری پہنچ گئی ہے۔" کریم نے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا، اور اپنا چھکڑا درست کرنے میں پھر مصروف ہو گیا۔

پھتو بولا "یہ جھوٹی بات ہے۔ ملٹری ولٹری کوئی نہیں پہنچی، یہ خبر اُن لوگوں نے اُڑائی ہے جو سب سے پہلے پاکستان پہنچے ہیں تاکہ دُوسرے لوگ اپنا حصہ نہ لیں۔"

الٰہی بخش کے دل کی اندرونی کشمکش اُسی شدّت سے پھر شروع ہو گئی۔ جب وہ گھر پہنچا تو دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔ بند دروازہ بتا رہا تھا کہ گھر کی مالکہ پاکستان چلی گئی ہے۔ وہ چھپر کے نیچے چارپائی پر بیٹھ گیا اور بُجھے ہوئے حقے کے کش لگانے لگا۔ وہ کش لگا رہا تھا اور بیلوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو کٹی ہوئی چری کھا رہے تھے۔ اُس کا لاڈلا بچھڑا بھی چارے پر منہ مار رہا تھا۔ اس وقت سارا احاطہ چھکڑوں سے خالی ہو چکا تھا۔ صرف اسی کا چھکڑا کھڑا تھا۔ وہ یکایک اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا۔

ناچار اُٹھ کر کھڑا ہوگیا مکھیاں بھنبھناتی ہوئی اُس کے چہرے کے گرد اگرد چکر لگاتیں اور وہ جھلا کر اُن پر ہاتھ سے وار کرتا۔

باہر پھر چھکڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ ایکا ایکی مال اسباب اور گندم کی بوریوں سے لدے ہوئے چھکڑے احاطے میں داخل ہونے لگے تھے۔ عورتیں لپک کر اُنکی طرف بڑھیں اور دھڑا دھڑ اسباب چھکڑوں سے اُترنے لگا۔

جب چھکڑے خالی ہو چکے تو گاڑیبان لسّی پینے لگے۔ اُن کے چہرے پسینے سے بھیگ رہے تھے۔ وہ لسّی کا ایک گلاس چڑھا لیتے اور چہرے سے پسینہ پونچھ لیتے۔ الٰہ بخش کے قدم خود بخود اپنے چھکڑے کی طرف اُٹھ گئے۔ اُس نے چھکڑے کو لکڑی کا سہارا دے کر کھڑا کیا، اور اُس کا ایک پہیا اُتار کر اُس کے دُھرے کو تیل اور صابون کے آمیزے سے چکنا کیا۔ پھر اُس نے پہیا دُھرے میں لگا کر زور سے اُسے گھمایا۔ پہیا پھرکی کی طرح گھومنے لگا۔ پھر اُس نے دوسرا پہیا اُتارا اور دُھرے کے اس سرے پر بھی یہی آمیزہ لگایا۔ جب چھکڑا بالکل تیار ہوگیا تو اُس نے گاڑیبانوں کی طرف دیکھا، وہ بھی تیار تھے۔

جونہی احاطے سے باہر کے چھکڑوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز کان میں پڑی، سارے گاڑیبان اُچھل کر چھکڑوں پر بیٹھ گئے۔ الٰہ بخش نے بھی یکایک بیلوں کو غیر معمولی قوت سے چھکڑے کی طرف دھکیلا اور اُن کی گردنوں پر جوا رکھ، اُچھل کر خود بھی چھکڑے پر سوار ہوگیا۔

چھکڑے ایک قطار میں گاؤں سے نکل رہے تھے، اِس قافلے میں مستری نور کا بیٹا بھی شریک تھا اور گلاب خاں کا بھائی بھی!

جیلانی

۱۹۴۷ء

(قرول باغ دہلی میں ایک مسلمان کا مکان)

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز ــــــ اور پھر:

"بہاری لال! او بہاری لال!"

بالاخانے سے زید۔ ننھا سا لڑکا خوفزدہ نگاہوں سے جھانکتا ہے، پھر دفعتہً کچھ سوچتا ہے اور دلیری سے تن کر مطمئن آواز سے کہتا ہے:

"سردار جی! یہ بہاری لال کا مکان نہیں ہے!"

"آں، آں، آں ؟؟؟"

"سردار جی! بہاری لال یہاں تو نہیں رہتا۔ یہ تو محمد گوپال کا مکان ہے۔"

خادم ہوشیارپوری

"مادرِ ہندوستاں" کے نام!

اس انقلابِ خونیں کے صدقے میں ایسی جگہ مجبورِ زیست ہوں جہاں کی فضائیں جذبات کش ہیں۔ پھر اس محروم رُوماں واَدب علاقے میں "مخزن" کا دستیاب ہونا اور مجھ ایسے کس مپرس و گمنام کو درحقیقت ایک معجزہ سے کم نہیں! ادب اگرچہ میرا اوڑھنا بچھونا رہا، مگر بہت کم کلام شائع کرنے کی طرف توجہ کی۔ اور اب تو اس گردشِ روزگار نے تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کلام کو قربانِ آزادی کر کے رکھ دیا

دل و دماغ پر ایک عجیب و غریب حالتِ جُمود طاری ہے۔ متاعِ ماضی گم ہو چکی، حال بے حال ہے، مستقبل کی خدا جانتا ہے! بہرکیف دو غزلیں جو غالباً ایامِ اسیری (۲۸ جون ۱۹۴۲ء تا ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء) کی ہیں۔ اور ایک نظم جو سہ داستانِ درد کہتا ہوں زبانِ شعر میں۔ کی مصداق ہے، حاضر ہے۔ فقط والسلام۔

مرزا خادم ہوشیارپوری از خان پور ضلع جہلم

رُباعی

اغیار کے چنگل سے چھڑانے کے لئے
کڑیاں سہیں خوشحال بنانے کے لئے
جب ٹوٹے غلامی کے سلاسل خادمؔ!
مجبور ہوئے ہند سے جانے کے لئے

داد تجھ سے چاہتا ہُوں مَیں تری بیداد کی
آہ اے ہندوستاں! یہ لے مری فریاد کی!

جانتا ہے تُو کہ مَیں خدمت تری کرتا رہا
عُمر بھر تیری محبت کا مَیں دم بھرتا رہا

عُمر پیکارِ مسلسل میں کٹی تیرے لئے
سامراجی جور کے سب وار اپنے پر لئے

ہتھکڑی ہاتھوں میں پہنی تیری اُلفت کے طفیل
جیل کی کڑیاں سہیں تیری محبت کے طفیل

ہر مصیبت پر کہا لبیک ہاں تیرے لئے
مَیں نے ہر سختی سہی ہندوستاں! تیرے لئے

جشنِ آزادی بنا پیغامِ بربادی مجھے
راس آیا خوب یہ اعلانِ آزادی مجھے

جُرمِ اُلفت میں تھا مَیں نِدائی اہلِ فرنگ جب ہوا پنجاب میں آغازِ قتلِ بے درنگ
خوں کے پیاسے بنے سب ہمدم و ہمراز بھی اپنے بیگانے بنے، قاتل بنے دمساز بھی
قتل و غارت کا ہوا ہنگامہ برپا چار سُو خاک پر تیری بہا میرے عزیزوں کا لہو!
آہ! مستورات جو آٹھوں پہر مستور تھیں آج وہ بے پردگی پر کی گئی مجبور تھیں
دو قدم پیدل سفر جن کے لئے تھا ننگ و عار پا پیادہ چل رہی تھیں سوگوار و دل فگار
پاؤں میں چھالے، زبانیں خشک، چہروں پر ہراس پیکرِ غم، دل فسردہ، حال ابتر، گم حواس
عمر بھر کی کاوشوں کی یہ سزا اچھی ملی! پیار کرنے کی مجھے تجھ سے سزا اچھی ملی
نذر کر کے جا رہا ہوں حشمت و مال و منال! مضمحل، پژمردہ دل، مجبور، خستہ، پائمال
عمر بھر کا لُٹ گیا سرمایۂ شعر و سخن کتنی عبرت خیز ہے میری تباہی اے وطن!
جا رہا ہوں اب وطن سے پھر نہ آنے کیلئے بن کے پردیسی مقدّر آزمانے کیلئے

یہ صِلہ تیرے سپوتوں نے محبت کا دیا؟
مرحبا اے مادرِ ہندوستاں! صد مرحبا!

قادر فریدی

نذرِ آزاد

اپریل کے "مخزن" میں ادیب الملک لالہ جگن ناتھ آزاد کی گراں بہا نظم "بہارِ آزادی" سے متأثر ہو کر...... قادر فریدی

جنوں میں جوش کے ہاتھوں گریبانوں پہ کیا گزری
نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری

مآل اُن کا ہوا کیا، سوختہ جانوں پہ کیا گزری
خدارا کچھ بتا اے شمع پروانوں پہ کیا گزری

کیا تاراج اپنا گلستاں خود اپنے ہاتھوں سے
کہیں کیا فصلِ آزادی میں فرزانوں پہ کیا گزری

تمہیں معلوم تیرے عہد میں اے پیرِ میخانہ
مع شیشوں کے ٹکرانے سے پیمانوں پہ کیا گزری

بتائیں کیا، یہاں شیخ و برہمن کے تصادم سے
مساجد کا ہوا کیا حشر بت خانوں پہ کیا گزری

بجائے برگ و گل بکھرے پڑے ہیں ہر طرف کانٹے
وطن کے رشکِ صد جنت گلستانوں پہ کیا گزری

ہمارے دم قدم سے جو کبھی آباد تھے، یارو
ہمارے بعد اُن آباد ویرانوں پہ کیا گزری

بتائے کون ہنگامِ تعدی جبر کے ہاتھوں
بکھر کر پیار کی تسبیح کے دانوں پہ کیا گزری

خدا کے واسطے اتنا بتا دے اے دلِ مضطر
شبِ ہجراں ترے بے تاب ارمانوں پہ کیا گزری

ترجمہ
(ابنِ حسن زیدی)

داستانِ جرائم

۲- قربانی

(چیف جج سر پیشل والش کے قلم سے)

(اُن معصوم بچوں کے نام جو انسانی جہالت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیئے گئے)

داستانِ جرائم ایک سلسلۂ مضامین ہے۔"قربانی" جس کی دوسری کڑی ہے۔ یہ مضامین اُن مختلف النوع جرائم کو ہمارے سامنے لاتے ہیں جن سے آئے دن ہماری اجتماعی زندگی متزلزل ہوتی رہتی ہے۔ ان مضامین سے یہ ظاہر ہوگا کہ اچھے شہری ہونے کی حیثیت سے قانون کا احترام ہمارے لئے کتنا ضروری ہے۔ جو لوگ آزادی کا غلط مفہوم لے کر شتر بے مہار بن جاتے ہیں اُن کو بھی یہ مضامین پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا کہ قانون کا احترام حکومت ہی کے لئے نہیں خود عوام کی نجی زندگی کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ زیدی

۱۱ر نومبر کی شام کو قصبے کے تھانے میں رام سرن نے انتہائی غم و اندوہ کی حالت میں اپنے دو سال کے بچے سوہن کی گم شدگی کی خبر درج کرائی۔ اُس صبح ، نبجے تک، اُس کا بچہ صحیح و سالم موجود تھا۔ ہندوستان کے دیہات میں خورد سال بچوں کے قتل کے واقعات عام ہیں۔ عموماً اس کے دو سبب ہوتے ہیں، یا تو کوئی ہمسایہ عورت جاہلانہ دشمنی کے باعث اپنی دشمن ہمسایہ عورت کے بچے کو موقع پا کر مار ڈالتی ہے ——— یہ صورت عموماً بہت چھوٹے بچوں کے سلسلے میں پیش آتی ہے ——— یا کوئی ظالم بدمعاش کسی بچے کو گھر سے باہر پھرتا ہوا پا کر اُسے بہکا کر کہیں لے جاتا ہے، اور اُس کا معمولی چاندی کا زیور (جو دیہاتی ماں باپ بڑے شوق سے پہناتے ہیں) اُتار کر اُس کو جان سے مار کر کہیں پھینک دیتا ہے یا کسی کنوئیں میں دھکا دے کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے لیکن ننھے سوہن کے معاملے میں اس قسم کی کوئی بات نہ تھی۔ اُس کی ماں کو گاؤں کی کسی عورت سے دُور کی بھی دشمنی نہ تھی اور غریب والدین نے اُس کو کوئی زیور بھی نہیں پہنا رکھا تھا جس کے باعث کسی پر اُس کی جان لینے کا شک کیا جا سکتا۔

رام سرن اور اُس کے دوست گاؤں کے آس پاس گوشہ گوشہ ، چپہ چپہ چھان چکے تھے اور کسی طرح اُس کا کوئی سُراغ نہ ملنے پر تھانے میں رپورٹ کرانے آئے تھے۔ وہ پولیس کو اِس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکے کہ گھر سے باہر جہاں سوہن دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کوئی سیانی لڑکی آئی اور سوہن کا ہاتھ پکڑ کے کسی بہانے اُسے وہاں سے لے گئی۔ یہ بات انہیں دوسرے بچوں ہی سے معلوم ہوتی تھی۔ لیکن کوئی بچہ یہ نہ بتا سکا تھا کہ وہ لڑکی کون تھی اور سوہن کو کہاں لے گئی؟ محض اِتنے اشارے پر پولیس کے لئے معاملے کی کوئی تفتیش کرنی دشوار تھی۔

۱۳ر نومبر کو رام سرن نے اپنے لختِ جگر کو تھانے میں پایا! گاؤں کے کسی آدمی نے اُسے اطلاع دی تھی کہ تھانے میں کوئی بچہ آیا ہے جو شاید اُس کا ہو! تھانے میں پہنچ کر رام سرن نے اپنے

بچے کو سخت خراب حالت میں پایا۔ اُس کی ننھی رانوں سے گوشت کے ٹکڑے کاٹے گئے تھے اور وہ زخموں سے چوُر چوُر ہو رہا تھا۔ رام سرن نے جب "سوہن" "سوہن"! پکارا تو ننھے بچے نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں کھول کر اپنے باپ کو دیکھا اور پھر غافل ہو گیا......اُس کے تھانے میں لائے جانے کی تفاصیل بھی عجیب تھیں۔ من رکھن نامی کوئی شخص ایک دوسرے آدمی متھرا پرشاد کے ساتھ اُسے تھانے میں لایا تھا۔ من رکھن کا بیان تھا کہ میں نے بچے کو گاؤں سے باہر ایک نالے میں پڑا پایا تھا —— جب میں اُدھر سے گزر رہا تھا تو کسی بچہ کے رونے اور کراہنے کی آواز سُنائی دی۔ متھرا پرشاد بھی اسی وقت اُدھر سے گزرا تو میں نے اُسے روک کر نالے کی طرف اُس آواز کی سمت میں چلنے کو کہا۔ دونوں وہاں پہنچے تو یہ بچہ یہیں نالے میں پڑا ہوُا ملا ——

سب انسپکٹر پولیس نے من رکھن اور متھرا پرشاد سے علٰحدہ علٰحدہ سوالات کئے۔ متھرا پرشاد کی بات سے معلوم ہوُا کہ بچہ اُن کو مدہوش حالت میں ملا تھا اور اُس میں چیخنے چلّانے کی طاقت نہ تھی، لیکن من رکھن کا بیان تھا کہ میں نے بچے کے رونے اور چلّانے کی آواز سُنی تھی اور اِسی بات نے مجھ کو نالے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس بات سے تھانے دار کو شُبہہ ہوُا کہ ممکن ہے من رکھن کو درپردہ اِس معاملے سے تعلّق ہو اور وہ بچے کی نالے میں موجودگی کے بارے میں پہلے سے آگاہ ہو لیکن گاؤں والوں کا شبہہ من رکھن اور متھرا پرشاد دونوں پر تھا کہ دونوں معاملے کے متعلّق ضرور اس سے زیادہ جانتے ہیں جتنا اُنھوں نے بیان کیا ہے۔ رام سرن کے بچے کی گم شدگی گاؤں میں کوئی چھپی ہوئی بات نہ تھی۔ غریب رام سرن نے اپنے بچے کی بازیابی کے لئے گاؤں میں یہ اعلان بھی کیا تھا کہ جو کوئی میرے بچے کو صحیح سلامت میرے پاس لائے گا پچاس روپے انعام پائے گا۔ اِس لئے من رکھن اور متھرا پرشاد کو گاؤں سے متّصل ہی کسی بچے کو پڑا ہوُا پا کر فوراً رام سرن کے گمشدہ بچے کا خیال آنا چاہیئے تھا اور اُسے کئی میل کے فاصلے پر تھانے پہنچانے کا خیال کرنے کے بجائے پہلے گاؤں میں رام سرن کے پاس یہ معلوم کرنے کے لئے لانا چاہیئے تھا کہ یہ بچہ اس کا تو نہیں۔ گاؤں والوں کا شُبہہ معقول تھا!

بہرحال بچہ تھانے سے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ اُس کے بدن پر وہی کرتا تھا جو وہ گمشدگی کے دن پہنے ہوئے تھا لیکن اُس کے کرتے پر خون کا کوئی دھبا نہ تھا۔ ہسپتال میں زخموں کا معائنہ ہوُا تو وہ خاصے بڑے پائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بچے کی رانوں پر سے گوشت کے ٹکڑے کسی تیز چاقو سے باقاعدہ طور پر کاٹ کر جُدا کئے گئے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر نے غالباً اُن لوگوں سے موافقت کا پہلو اختیار کرتے ہوئے جن کا معاملے سے درپردہ تعلّق تھا اور جن کی ذات پر انجام کار مقدمے کی بنیاد ٹھہری اپنی رپورٹ میں ظاہر کیا کہ اغلب ہے زخم جنگلی جانوروں، گیدڑوں یا کُتّوں کے نوچنے کاٹنے سے پیدا ہوئے ہوں۔ واقعات کی روشنی میں یہ بات صریحی طور پر غلط ثابت ہو جاتی ہے چونکہ اِس کا امکان جبھی ہو سکتا تھا کہ بچے کا اُس نالے میں زیادہ دیر تک پڑا رہنا تسلیم کیا جا سکے —— کم ازکم ایک شب کے لئے —— اُس حالت میں بھی یہ ماننا ہوگا کہ جب جنگلی جانور مجتمع ہو کر کسی بچے کو اپنا شکار بنائیں گے تو اُسے زندہ نہ چھوڑ دیں گے۔ علاوہ ازیں بچے کے بدن اور اُس کے کُرتے کی حالت سے یہ بالکل ظاہر نہ ہوتا تھا کہ اُس پر جنگلی جانوروں نے حملہ کیا ہے۔ اُس کے بدن پر اُس کا کُرتا بالکل صحیح، سالم تھا جسم پر کسی جانور وغیرہ کے پنجے، ناخن یا

دانت کا کوئی نشان نہ تھا۔ زخم بھی تازہ نہیں معلوم ہوتے تھے وہ خشک اور خاک کی باریک تہ سے ڈھکے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے اُن کو خون کا اخراج بند کرنے، انہیں اچھا کرنے یا چھپانے کے لئے باقاعدہ خاک چھڑکی ہے۔ گاؤں والے اِس مطلب کے لئے خاک کو استعمال کرتے بھی ہیں۔ ڈاکٹر کی رائے میں زخم چوبیس گھنٹے پہلے آئے تھے۔ بچہ اپنے مہلک زخموں کی تاب نہ لا کر ایک ہفتے کے قریب ہسپتال میں ایڑیاں رگڑ کر زخموں کے سڑنے اور خون فاسد ہو جانے سے مرگیا اور کسی طرح جانبر نہ ہوسکا۔

رام سرن غم سے دیوانہ ہوگیا۔ اپنے معصوم بچے کے اِس وحشیانہ ظلم کا شکار ہو جانے پر اُس کا کلیجہ پاش پاش ہوگیا۔ اُس نے اپنے گاؤں کے ساتھیوں کے حلقے میں بڑے جوش کے ساتھ کہا: "جب تک مَیں اُس ظالم ہاتھ کا پتا نہ چلا لُوں گا جو میرے لاڈلے سوہن کی طرف بلاوجہ اس ستم کے لئے بڑھا، چین نہ لُوں گا......" لیکن اِس اعلان کے بعد اُس نے عملاً اپنے بچے کے قاتل کی تلاش میں کوئی خاص تگ و دو نہ کی اور رو پیٹ کر بیٹھ رہا۔ گاؤں میں عام افواہ تھی کہ کسی نے چوری سے رام سرن کے بچے کو دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا! ہندوستان کے دیہاتی ماحول کی یہ خصوصیت ہے کہ وہاں سنگین وارداتوں کا کھوج اکثر افواہوں سے لگایا جاتا ہے یہ بسا اوقات سچی ثابت ہوا کرتی ہیں اگرچہ کبھی کبھی یہ غلط بھی ثابت ہوتی ہیں یا یوں سمجھئے جب ہم اُن کا پُورا احاطہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں تو وہ بظاہر غلط ثابت ہو جاتی ہیں! افواہوں کے پس پردہ گاؤں کی عورتوں کا پروپیگنڈا اور مُلّاؤں کا علم و تعین کام کیا کرتا ہے۔ بات دھیمے انداز میں شروع ہو کر بتدریج پھیل جاتی ہے ہسپتال میں بچے کی بیماری کے دوران میں جب وہ حیات و ممات کی درمیانی منزل سے گزر رہا تھا گاؤں کی اکثر عورتیں تقریباً روزانہ اُس کی خیریت معلوم کرنے رام سرن کے یہاں آتیں اور از راہِ ہمدردی جو الفاظ زبان پہ لاتیں یا راہ میں آتے جاتے ایک دوسرے سے کہتیں اُن سے اِس بات کی تصدیق ہوتی گئی کہ ضرور کسی پاپی نے خرد سال سوہن کے گوشت سے دیوی جی کو خوش کیا ہے! ہسپتال کے سنسان راستے سے گاؤں کے پُر خلوص لوگ ہر روز بچے کی عیادت کے لئے گزرتے۔

اِن آنے جانے والوں میں رام سرن کی بیوی نے ایک اجنبی عورت کو بھی دیکھا جو نہ صرف روزانہ بلا ناغہ بچے کو دیکھنے ہسپتال آتی تھی بلکہ اُس کے اندازِ پرسش میں ایک خاص تشویش اور اضطراب اور غیر معمولی ہمدردی و غمخواری پائی جاتی تھی! معلوم ہوتا تھا کہ اگر بچہ اچھا نہ ہوا تو وہ اِسے ایک ذاتی صدمے کی طرح محسوس کرے گی۔ رام سرن کی بیوی کو کچھ تعجب ہوا اور اُس نے اِس کا ذکر اپنے شوہر سے کیا۔ لیکن اُس نے اِتنا کہہ دینے کے سوا کہ "ایک نہ ایک دن سچائی ظاہر ہو کر رہے گی" اور کچھ نہ کیا۔ ایک قسمت پر شاکر رہنے والے منطقۂ حارّہ کے اصلی سست و غبی باشندے کی طرح اُس نے اپنے لختِ جگر کی ہلاکت سے وابستہ ایک خاص کڑی کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لینے کے بجائے اِس قدر بے پروائی سے نظر انداز کر دیا کہ پولیس کو بھی اِس افسانے کی خبر تک نہ کی یہاں تک کہ بچے کی موت کو تین مہینے یوں ہی گزر گئے۔ لیکن پولیس اپنے طریقے پر کھوج لگا رہی تھی۔ جنوری کی ایک شام کو جب تھانیدار رام سرن سے کچھ گفتگو کر رہا تھا رام سرن نے دورانِ گفتگو میں تذکرۃً تھانیدار کو بتایا کہ اُن

دنوں ہسپتال میں گاؤں کی ایک اجنبی عورت بھی بچے کو دیکھنے روزانہ میری بیوی کے پاس آیا کرتی تھی اور میری بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کی باتوں سے ایک خاص دلچسپی اور دلی پریشانی کا اظہار ہوتا ہے"...... تھانیدار نے کہا" یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی تھی......؟" مگر یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ گویا ایک نکتہ اُس کے ہاتھ آ گیا۔ اگلے ہی دن سے پولیس نے گاؤں کی عورتوں کو جوق در جوق رام سرن کی بیوی کے پاس لانا شروع کیا اور جنوری کی آخری تاریخوں میں یہ لوگ ایک عورت کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ جسے رام سرن کی بیوی نے پہچان لیا اور کہا "یہی وہ اجنبی عورت ہے جو میرے بچے کا طوفانِ غم لئے روزانہ ہسپتال میں میرے پاس آیا کرتی تھی!" اُس کا نام لڈیتی تھا، وہ نائن تھی۔ لڈیتی نے کہا کہ مجھے ارتکابِ جُرم سے کوئی علاقہ نہیں۔ اِس لئے میں بلا خوف جہاں تک مجھے واقعات کا علم ہے بیان کر دُوں گی۔ اُس نے کہا" میں ذات کی نائن ہوں اور گاؤں کے مشہور زمیندار برہمن گھرانے میں معمولی کام کاج پر نوکر ہوں۔ چرونجی بائی اُس گھر کی رانی یعنی زمیندار مہیش لال کی بیوی ہے۔ گھر میں دوسری بڑی عورت چرونجی بائی کی ساس یعنی مہیش لال کی بیوہ ماں ہے۔ ان کی حویلی ایک اچھی کوٹھی کی شکل میں گاؤں سے باہر واقع ہے جس میں خاندان کے یہ تینوں نفر دو تین نوکروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ کم و بیش تین مہینے ہوئے ہوں گے جب ایک دن سہ پہر کے قریب جیسے ہی میں کام کے لئے وہاں گئی میں نے گھر کے آنگن میں ایک دو سال کے بھولے بالک کو پڑے پڑے بیٹھے دیکھا تھا اور قبل اس کے کہ میں کچھ معلوم کرنے یا سمجھنے کی کوشش کرتی مجھ سے وہاں سے چلے جانے کو کہا گیا تھا۔ پھر اُس کے دو دن بعد مجھ سے چرونجی بائی نے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا" لڈیتی! دیکھ یہ میرا ایک کام ہے۔ خبردار کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ ہسپتال میں ایک بچہ زخموں سے بیمار داخل ہوا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تو روزانہ چپکے سے وہاں جا کر کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر اُس کے حال کی خبر مجھے لا دیا کرے۔ میں تجھے ایک روپیہ روزانہ دیا کروں گی۔ ایشور کرے وہ ٹھیک ہو جائے۔ مجھے اُس کے چنگا ہونے سے بڑی خوشی ہو گی" اور میں ہسپتال گئی اور جیسا کہ رام سرن کی بیوی کا بیان ہے، روزانہ اُس کی خیریت معلوم کرنے وہاں جاتی رہی۔ اور اگرچہ چرونجی بائی نے مجھے اور کچھ نہ بتایا تھا۔ مگر میری سمجھ میں آ گیا کہ یہ وہی بچہ ہے جسے میں نے اُس دن زمیندار کی حویلی کے آنگن میں دیکھا تھا۔ اور پھر گاؤں کی افواہوں کے ساتھ سب کچھ میرے علم و یقین میں آ گیا۔ اب مجھے خود اس نر دوش بالک اور اُس کے دکھی ماں باپ سے ایک طرح کی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چرونجی بائی کی اس سخت ہدایت کے باوجود کہ دیکھ دُور ہی سے بچے کی خیریت کا پتا لگا کر چلی آیا کرنا، میں رام سرن کی بیوی سے ملے اور اُس کے اندوہ کی بات سُنے بغیر نہ آتی تھی تا آنکہ بچہ ہسپتال میں مر گیا۔ اِس کے سوا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ہاں میرا خیال ہے کہ شاید اُس گھر میں کام کرنے والی دوسری عورت جو ایک کہارن ہے اور جس کا نام چھنکیا ہے۔ اِس معاملے کی نسبت مجھ سے کچھ زیادہ جانتی ہو"۔ یہ کافی تھا۔ پولیس نے لڈیتی کے بیان پر فوراً چھنکیا کو ماخوذ کر لیا اور وہ تھانے میں لائی گئی۔ چھنکیا کا بیان پُورے واقعات کو روشنی میں لاتا ہے۔ اُس نے کہا" جو شخص اُس بچے کو چرونجی بائی کے گھر لے کر آیا تھا اُس کا نام دُوارکا پرشاد ہے۔ دوارکا پرشاد من رکھن کے لڑکے کا نام ہے جو بچے کو زخمی حالت میں نالے کے اندر پانے کا مدعی ہوا ہے اور

جو اُسے تھانے میں پہنچانے گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن سب کی پہلے سے ملی بھگت تھی اور دُوارکا پرشاد اِس کام پر مامور کیا گیا تھا کہ گاؤں سے کسی غریب کے بچے کو اِس مقصد کے لئے زمیندار کے گھر اُٹھا لائے۔

"صبح کا وقت تھا جب دُوارکا پرشاد ایک بچے کو لئے حویلی میں داخل ہوا۔ میں اُس وقت برتن مانجھ رہی تھی۔ بڑی زمیندارنی (چرونجی بائی کی ساس) نے مجھے جلد برتن صاف کرکے دیوی جی کی پُوجا تیار کرنے کو کہا۔ میں نے چبوترا لیپ کر تیار کر دیا اور پھول لاکر دیوی کی مورتی کے پاس رکھ دیئے۔ اُس کے بعد میں اُس وقت تک وہاں موجود رہی جبکہ پُوجا کے ساتھ کوئی خاص رسم گھر میں ادا ہونے کو تھی۔ میرے سامنے چرونجی بائی، اُس کا شوہر مہیش لال، بڑی زمیندارنی (مہیش لال کی ماں) متھرا پرشاد، دُوارکا پرشاد، رام نرائن (مہیش لال کا ایک رشتہ دار) اور سادھو مہنت کرشنا راؤ جی سب وہاں اکٹھے ہو چکے تھے۔ اس وقت مجھ سے کام ختم کرکے چلے جانے کو کہا گیا۔ دوسرے دن جب میں وہاں پہنچی تو میں نے اُس بچے کو ایک کھٹولے میں پڑا ہوا پایا۔ اُس کا بدن ایک سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا جس پر خون کے دھبے تھے۔ بچہ درد و کرب سے نحیف آواز میں چلا رہا تھا۔ کبھی ہوش میں آتا کبھی غافل ہو جاتا تھا۔ مجھ سے پھر دوسری طرف اپنا کام دیکھنے چلے جانے کو کہہ دیا گیا۔ اگلے دن میں نے گاؤں میں سُنا کہ رام سرن کا بچہ گاؤں کے نالے میں کسی کو زخمی حالت میں پڑا ہوا ملا ہے اور اُسے تھانے پہنچا آئے ہیں۔ میں حیران رہ گئی اور سمجھ گئی کہ ضرور جس بچے کو میں نے زخمی حالت میں زمیندار کے یہاں دیکھا تھا وہ رام سرن ہی کا تھا اور یہ سب کھیل اُسی غریب کے ساتھ کھیلا گیا ہے ——— اِس سے زیادہ اور مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

یہ دونوں صاف اور واضح بیان چرونجی بائی، اُس کے شوہر اور اُن کے دیگر رفقا کے خلاف بارِ ثبوت فراہم کرنے کو کافی تھے لیکن درمیانی کڑیاں ابھی تک غائب تھیں اور قتل کے مقدمے کو کامیاب بنانے کے لئے پولیس کو عینی قسمِ واردات کی کوئی شہادت ابھی تک نہ ملی تھی۔ اُنہوں نے بہت ہوشیاری سے چرونجی بائی یا اُس کے شوہر پر ہاتھ ڈالے بغیر بالا ہی بالا پہلے سادھو جی کرشنا راؤ کے ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ مقدمے کی تفتیش انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس کی نگرانی میں ہو رہی تھی، اور وہ ڈپٹی کمشنر سے ہم مشورہ ہو کر ہدایات جاری کرتا تھا۔ غالباً کسی مخالف جماعت کے آدمی نے ڈپٹی کمشنر کو کوئی اطلاع دے دی تھی جس کی بنا پر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور حاکم ضلع نے متفق الرائے ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ سادھو کو حراست میں لینے سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ اپنی گلوخلاصی کے لئے سارا الزام چرونجی بائی اور اُس کے شوہر وغیرہ کے سر رکھ کر واقعات کو کسی نہ کسی پیرائے میں سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کرے۔ اِس طرح مقدمہ کی وضاحت کے لئے ایک عینی شہادت میسر آ جائے گی۔ چرونجی بائی، اُس کے شوہر اور دوسرے لوگوں کی گرفتاری بعد میں مناسب ہوگی۔ بدیں خیال اُنہوں نے سادھو جی کو فوراً گرفتار کر لیا لیکن سپرنٹنڈنٹ پولیس اور کلکٹر کی توقعات کے خلاف سادھو کرشنا راؤ نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ زمیندار کے گھر کا خاندانی پجاری اور گرُو ضرور ہے، یہ ماننے سے صاف انکار کر دیا کہ کوئی غیر معمولی پُوجا جیسی مسماۃ پھُلیا کہتی ہے زمیندار کے گھر کی گئی تھی یا کوئی بچہ اُس کی موجودگی میں کسی مذہبی رسم کی غرض سے وہاں لایا گیا تھا۔ اب پولیس کی کارگزاریاں ایک طرح سے مسدود ہو کر رہ گئیں۔

لیکن تھوڑے ہی توقف کے بعد جبکہ ہنوز سادھو کرشنا راؤ پولیس کی حراست میں تھے، ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک دوسرے مقام پر انہیں گرو کرشنا راؤ جی کے ایک اور واردات میں ملوث ہونے کی خبر آئی۔ کسی عورت کو اُس کے دو ہزار روپے کے زیور کے لئے گرو جی نے دیوی کی خدمت میں بُلایا اور اُس کا کُل زیور دیوی جی کی نذر کرکے اُسے رخصت کر دیا۔ گرو جی کے دو چیلے جو اِس قصے میں شریک کار تھے وہاں پکڑ لئے گئے تھے اور گرو جی یہاں ایک معصوم بچے کی غارتگری کے سلسلے میں بند تھے۔ اب کام بن گیا۔ گرو جی نے جب دیکھا کہ میں دو طرف سے پھنس گیا ہوں تو غالباً یہ خیال کیا کہ مناسب بیان دے کر اِس بچے کے جھگڑے سے تو چھٹکارا حاصل کر لوں پھر دوسری اُفتاد سے بھی کسی طرح نبٹ لوں گا۔ چنانچہ وہ بیان دینے کے لئے رضامند ہو گئے۔ اُنہوں نے کہا: "مہیش لال زمیندار کی بیوی چرونجی بائی اولاد نہ ہونے کے باعث سخت بے چین رہتی تھی۔ یہ خیال اُسے کھائے جاتا تھا کہ وہ کوئی بیٹا نہیں جن سکی، اِس لئے مہیش لال دوسری شادی کر لیگا۔۔۔ ایک ہندو کے لئے بیٹے کی آ۔۔رزو اُس کے اِس جیون اور پرلوک دونوں کے لئے سخت اہمیت رکھتی ہے۔ چونکہ دنیاوی جائداد کی وراثت کے علاوہ جب کوئی ہندو مرتے وقت بیٹا نہیں چھوڑتا تو اُس کی کِریا کرم اور دوسری دنیا کے واسطے اُس کے لئے دعا کرنے کا حق اولاد کے سوا اور کسی کو نہیں پہنچتا۔ مہیش لال اور اُس کی ماں اِس کے لئے کئی بار میرے پاس آ چکے تھے۔ کسی بڑے مہاتما نے (جن کا نام مہیش لال نے مجھے نہیں بتایا) اِن لوگوں سے کہا تھا کہ چرونجی بائی کو دیوی کی پُوجا میں بٹھا کر اگر کسی خورد سال زندہ لڑکے کے گوشت کا ٹکڑا کھلایا جائے اور اُس کا تازہ خون چٹایا جائے تو اُس کے ضرور لڑکا پیدا ہو سکے گا۔ اِس مقصد کے لئے وہ بہت ملتجیانہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں کر پُوجا کرا دیجے۔ سب کام تیار ہے۔ چنانچہ مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ مہیش لال، اُس کی ماں، چرونجی بائی، متھرا پرشاد، دوارکا پرشاد اور رام نرائن سب مہیش لال کے گھر میں پُوجا کے لئے اکٹھے ہوئے۔ ایک بچہ اِنہوں نے کہیں سے حاصل کرکے وہاں چارپائی پر لٹا رکھا تھا جسے بھنگ پلا کر مدہوش کیا گیا تھا تاکہ اُس پر پُوجا کی کارروائی کی جا سکے۔ پُوجا کی جگہ گائے کے گوبر سے لپی ہوئی تیار تھی اور اُس کے ایک طرف دیوی کی مُورتی پھولوں سے سجی ہوئی بٹھا دی گئی تھی۔ مدہوش بچے کو اُٹھا کر لپی ہوئی جگہ کے بیچ میں دیوی کے چرنوں میں رکھا گیا اور چرونجی بائی کو بلا کر اُس کے قریب بٹھا دیا گیا پھر اِن لوگوں نے مجھ سے دیوی کی پُوجا شروع کرنے کو کہا، اور میں آنکھیں بند کرکے زور زور سے منتر پڑھنے لگا۔ منتر ختم کرنے کے بعد بے سُدھ بالک کے ماتھے پر تلک کا نشان لگا کر میں وہاں سے اُٹھ گیا اور اِن لوگوں سے دُور جا بیٹھا۔ پھر اِن میں سے دو آدمیوں نے (جنہیں اب میں پہچاننے سے قاصر ہوں) اپنا اپنا چاقو نکال کر بچے کی رانوں سے گوشت کے پارچے جُدا کئے اور اُس کے گلے کے پاس چاقو چبھو کر اُس سے پیتل کے ایک چھوٹے گلاس میں خُون لیا جو چرونجی بائی کو پلا دیا۔ پہلے اِس خون میں تنکے سے دیوی کے چرنوں میں ایک دنیا رکھا گیا اور چرونجی بائی کے ماتھے پر نشان لگایا گیا۔ پھر یہ لوگ درد و کرب سے کانپتے ہوئے بے ہوش بالک کو ایک سفید چادر میں لپیٹ کر وہاں سے اُٹھا لے گئے اور میں بھی گھر سے باہر نکل آیا۔۔۔۔۔۔ وہ بچہ کسی کا بھی ہو اور اُسے جو بھی بِپتا دیوی کے اِن پجاریوں کے ہاتھوں

بھوگنی پڑی ہو مجھ پر اُس کی کچھ ذمہ داری نہیں آتی۔ میں تو دوش ہوں۔ میں تو وہاں پُوجا کرانے کے لئے بُلایا گیا تھا اور بس۔ میں اِتنے آدمیوں کو اُن کا گرُو سادھو ہوتے ہوئے کیونکر اُنکی دیوی کی بھینٹ سے روک سکتا تھا؟ جب کہ خود مہیش لال بھی اس میں ناکام رہا۔ وہ خود نہیں چاہتا تھا کہ یہ پُوجا کی جائے۔ مگر عورتوں کے مقابلے میں اُس کی ایک نہ چلی اور پُوجا ہو کر رہی......"

سادھو کرشنا راؤ کے اِس بیان میں جس قدر سچ اور جھوٹ ہے ظاہر ہے۔ مقدماتِ فوجداری کی یہ خصوصیت کہ جب کئی اشخاص کسی جُرم میں مشترک طور پر مُلوّث ہوں تو اکثر یہ صُورت پیش آتی ہے کہ جو شخص اپنی جان بچانے کے لئے واردات کے متعلق عینی شہادت پیش کرتا ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنا کیا بُرا بھی دوسروں ہی کے سر منڈھ دے۔

واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب و غریب تھا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے ہندوؤں کی قدیم ترین کتابوں میں بھی اِس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا کہ دیوی کی پُوجا کی کوئی صورت کسی مقصد کے لئے بھی ایک زندہ بچے کے جسم پر ایسا وحشت ناک عمل چاہتی ہو۔ انسانی قربانی بجائے خود ایک فعلِ مذموم ہے لیکن اِس معاملے کے قانونی پہلو پر نظر ڈالئے تو یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اِس وحشیانہ اور مجنونانہ مذہبی رسم سے بچے کی جان لینا کسی کا بھی مُدّعا نہ تھا۔ چنانچہ فارغ ہونے کے بعد اشخاصِ متعلقہ نے گاؤں کے رواج اور اپنی عقل کے موافق زخموں پر مرہم کے بجائے خاک کی تہ جما کر چاہا کہ بچہ اِس حادثے کا متحمل ہو کر جی سکے اور اپنے ماں باپ کے پاس واپس پہنچ جائے۔ اِس سلسلے میں خود چرو نجی بائی کے نازک نسوانی جذبات کا جائزہ لیجئے کہ افشائے راز کے خطرے کی قیمت پر وہ خوشامد کر کے لڈیتی کو بچے کی خیریت معلوم کرنے ہسپتال بھیجتی رہی۔ لیکن اس کے باوجود قانون اِن لوگوں کے جرم کو قابلِ معافی نہیں سمجھ سکتا۔ آخر اِن لوگوں کو کسی ایسی خوفناک مذہبی رسم کی بجا آوری کا حق ہی کب پہنچتا تھا جس کی اجازت قانون نہ دیتا ہو؟ یعنی جب ہندو مت کی "ستی" جیسی اہم و بنیادی رسم بھی جو اِس قدر مروّج تھی قانوناً بند کر دی گئی ہو تو دیوی کے اِن عقیدت مند فرزندوں کو مہیش لال کے یہاں ایک عدد بیٹا تولّد کرانے کے لئے کسی کے معصوم بچے سے خون کا یہ کھیل کھیلنے کی اجازت کب تھی؟ چرو نجی بائی بھی اپنے نسوانی جذبات کے عذر سے قانون کی نظر میں قابلِ رحم نہیں ٹھہر سکتی۔ عورتیں وہم پرست تو ہُوا ہی کرتی ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ چرو نجی بائی نے ایک بیٹے کی ماں بننے کی جاہلانہ حسرت میں یہ نہ دیکھا کہ وہ کسی ماں کے جیتے جاگتے معصوم فرزند سے کیا سلوک کر رہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعد ازاں اُسے اِس ظلم کا احساس بھی پیدا ہُوا ہو اور ایک معصوم بچے کی انتہائی اذیت کی تصویر بھی بار بار اُس کی آنکھوں میں کھنچ کر اُس کے دل کو دردمند کرتی رہی ہو لیکن یہ پچھتاوا بے وقت تھا اور اِسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی خونی خون کر کے پچھتائے۔ قانون کی نظر میں اِس کا کوئی پاس و احترام نہیں ہو سکتا۔

بہرحال چرو نجی بائی نے جو بیان دیا اُس سے ثابت ہو گیا کہ پُوجا کا پُورا منصوبہ گرُو مہاراج کرشنا راؤ کے دماغ سے نکلا تھا اور اس کے لئے انہیں دو سو روپے نذرانہ دیا گیا تھا۔ خود چرو نجی بائی اور اُس کا شوہر اِس پُوجا پر دل سے راضی نہ تھے، کرشنا راؤ کے بار بار اصرار پر کہ دیوی جی تو اِسی طرح راضی ہو سکتی ہیں، اُنھوں گرُو جی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ بچے پر چاقو کا عمل بھی مذہبی اشلوکوں کے ساتھ از اوّل تا آخر گرُو جی

ہی کے دستِ مبارک سے ہوا۔

بُزدل مہیش لال نے اپنے بیان میں جس طرح سب الزام اپنی بیوی کے سر تھوپتے ہوئے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی، وہ ایک ہندو شوہر کے لئے باعثِ شرم و ذلّت ہونا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ مہیش لال اگر بیوی کو بچانیکی کوشش کرتا بھی تو وہ قانون کے پنجے سے نہیں بچ سکتی تھی، لیکن شوہر ہونے کی حیثیت سے اُس کا طرزِ عمل غیر شریفانہ ہے۔

سب سے ذلیل کردار سادھو کرشنا راؤ کا ہے۔ اِس کم بخت نے اپنی مذہبی حیثیت کو سراسر بالائے طاق رکھتے ہوئے ہر جگہ فریب اَور غلط بیانی سے کام لیا ہے اَور اِسی لئے وہ قانون کی نظر میں اَور زیادہ مجرم ہے۔ اپنی لغو تعلیم کو کسی نامعلوم مہاتما کے نام سے منسوب کرنے کے بجائے اگر وہ مذہبی عقیدت کے ساتھ عدالت کے سامنے اپنی اِس عجیب پُوجا کی کوئی قدیم روایتی اہمیت بیان کرتا اَور اپنی کسی مذہبی کتاب سے اُس کا سلسلہ ظاہر کرتے ہوئے جو کچھ کیا تھا اُس پر راسخ الاعتقاد رہتا تو ممکن تھا عدالت اِس کو ایک طرح کی مذہبی دیوانگی قرار دیتے ہوئے اُس کے جُرم کو کچھ ہلکا تصوّر کرتی۔ لیکن قانون کے دیو کے سامنے سادھو جی کا اپنی دیوی جی سمیت دم دبا کر بھاگنے کی کوشش کرنا اِس بدکرداری و بدنفسی کا بیّن ثبوت تھا کہ گُرو جی نے اپنے گاؤں کے چیلوں کے حلقے میں جو کھیل کھیلا تھا اُس پر وہ خود مذہبی حیثیت سے کوئی یقین نہیں رکھتے تھے۔

بالفرض یہ مان لیا جائے کہ یہ عجیب پُوجا سادھو جی کی اپنی اختراع نہ تھی تو پھر ایک مذہبی گُرو کی حیثیت سے اُن پر اِس بات کی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ کیوں اُنہوں نے ایک ایسی پُوجا ہونے دی جس پر اُنہیں خود یقین و اعتقاد نہ تھا؟ گُرو ہوتے ہوئے اُنہوں نے اُن اندھے پجاریوں کو کیوں ایک معصوم بچے پر یہ ظلم و ستم روا رکھنے سے نہ روکا؟ یقیناً وہ اُنہیں اُپدیش اَور تلقین کے ذریعے سے اِس فعلِ شنیع سے باز رکھ سکتے تھے یا کم از کم خود اُس میں شریک ہونے اَور اُس کا افتتاح کرنے سے انکار کر سکتے تھے۔

اِن دلائل کی روشنی میں خورد سال سوہن کے خونِ ناحق کی تمام ذمہ داری گُرو جی مہاراج پر آ پڑتی ہے۔ فاضل جج نے اِس پر خوب تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے سادھو کرشنا راؤ کو اس کے قابلِ نفرت جُرم کی پاداش میں سزائے موت دی۔ چرونجی بائی کو بیس سال قید کی سزا ہوئی اَور دُوارکا پرشاد کو (جو بچے کو بہکا کر لانے کا مُرتکب ہوا تھا) نیز مہیش لال کو جس پر گھر کا مختارِ اعلےٰ اَور چرونجی بائی کا شوہر ہونے کی ذمہ داری تھی، سات سات سال قیدِ با مشقت کا حکم سُنایا گیا۔

اِس طرح دیوی کے یہ وحشی پجاری اَور اِن کے گُرو کیفرِ کردار کو پہنچ گئے۔

اقبالؒ

یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

خدا اور شاعری

ہے کرتا خدا استعارے میں بات
کسی شاعرانہ اشارے میں بات

خدا کا ہمیشہ ہے موزوں کلام
ہے دُنیا بھی اِک شاعرانہ نظام

کہیں نظم میں اُس کی سکتہ نہیں
کہیں کوئی مصرعِ اٹکتا نہیں

بیاں میں نہیں اُس کے تکرار کچھ
کہ جدّت ہے مضموں میں ہر بار کچھ

خدا شاعروں کا جو اُستاد ہے
تخیّل کی دُنیا میں آباد ہے

اُسی سے ہے شاعر کی دِیدہ وری
کہ ہے شاعری جُزوِ پیغمبری

ہیں شاعر کی فِطرت سے سرگوشیاں
کہ فِطرت ہی شاعر کی ہے ہم زباں

ہے بے شعر مذہب میں لذّت کہاں
نہ ہو شاعری گر تو جنّت کہاں

یہی ہے خدا کی شرابِ طہور
یہیں پر ہیں فردوس و حُور و قصور

جلال الدین اکبر

یا ز گلبانگِ پریشاں می زنم

(تقریباً بارہ سال کی خاموشی کے بعد راقم کی درخواست پر حضرتِ اکبر نے دوبارہ اپنے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت منظور فرمائی ہے۔ ح)

یہ کائنات، یہ بزمِ ظہور کچھ بھی نہیں — تری نظر میں نہیں ہے جو نور، کچھ بھی نہیں

نگہ اگر ہو تو ہر ذرّہ میں ہزاروں طُور — نگہ اگر نہ ہو، بالائے طُور کچھ بھی نہیں

ترے جمال کا پرتو ہے میرا جذبۂ عشق — مجھے وفاؤں پر اپنی غُرور کچھ بھی نہیں

وہ تیرے ذکر کی مستی، وہ تیرے فکر کا کیف! — کہ جس کے سامنے جامِ طہور کچھ بھی نہیں

مجھے بھی اِذنِ فغاں بخش کر تماشا دیکھ — یہ حشر خیزیٔ آوازِ صُور کچھ بھی نہیں

یہ قُرب و بُعد بمقدارِ شوقِ سالک ہیں — جسے تُو دُور سمجھتا ہے دُور کچھ بھی نہیں

یہ نکتہ مجھ پہ کھُلا ہے فتوحِ غیبی سے — جو آنکھ وا ہو تو غیب و حضُور کچھ بھی نہیں

سمجھ رہا ہوں تقاضائے خود نمائیٔ حُسن — حکایتِ یدِ بیضا و طُور کچھ بھی نہیں

ترا نیاز نہیں بے نیازِ غیر ابھی — تری نماز میں سوز و سُرور کچھ بھی نہیں

یہ فیضِ حضرتِ حاکم علیؒ[۱] ہے اے اکبرؔ
مجھے کمالِ سُخن پر غُرور کچھ بھی نہیں

۱؎ شاعر کے مرشدِ طریقت

امین الرحمٰن

پرستانی کہانیاں

"ستیلا! معلوم نہیں پچیس چھبیس برس کی عمر کو پہنچ کر پرستانی کہانیوں کے متعلق تمہارے خیالات کیا ہوں گے۔ کیا اب بھی اِن میں تمہارے لئے کوئی دلچسپی باقی ہے یا اب وہ کہانیاں تمہارے لئے اپنی کشش بالکل کھو چکی ہیں جن کے سُننے کے لئے بچپن کے زمانے میں کبھی تم آدھی آدھی رات تک جاگا کرتی تھیں؟ ہوسکتا ہے اِس عمر میں تمہارے لئے اِن کہانیوں میں دلچسپی کا کوئی شائبہ نہ رہا ہو لیکن مجھے اعتراف ہے کہ بیس پچیس برس گزر جانے کے بعد بھی پرستانی کہانیاں میرے روزمرہ کے مطالعہ کا ویسا ہی ایک اہم جزو ہیں جیسا بچپن میں جب میں درسی کتابوں کے مطالعہ پر انہیں پڑھنے کو ترجیح دیا کرتا تھا۔

پرستانی کہانیوں کا نام آتے ہی تخیّل ماضی کے پُر اسرار دُھندلکوں میں سے ہوتا ہوا بچپن کے اُس معصوم اور بے آلام زمانے میں پہنچ جاتا ہے جب غم کے بھیانک احساس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اور میں ایک بار پھر عالمِ خواب کے اُن محلات کی غلام گردشوں میں گھومنے لگتا ہوں جہاں حبشی غلام زرق برق لباس پہنے کامدار پٹکے باندھے ایک ایسی حسین شہزادی کی خدمت کے لئے کمربستہ رہتے ہیں۔ جو کہانی کے بادشاہ کے ہاں ہزاروں منتوں، دعاؤں اور آرزوؤں کے بعد پیدا ہوئی تھی، یا میرا تخیّل مجھے خوف کے ایک دبے ہوئے جذبے کے ساتھ اُس سنگین قلعے کی چار دیواری کے قریب لے جاتا ہے جس میں ایک دیو نے ایک خوبصورت شہزادی کو قید کر رکھا تھا اور جب وہ دیو شام کے وقت اپنے قلعہ کی طرف لوٹتا تو اُس کے آنے سے پہلے آندھی اور گرد و غبار کا ایک طوفان آیا کرتا تھا، یا پھر میرا تخیّل اُن گھنے جنگلوں میں بھٹکنے لگتا ہے جہاں بادشاہ شکار کھیلتے کھیلتے راستہ بھول جایا کرتے تھے۔ اور پھر کسی ایسی جھونپڑی کے قریب جا نکلتے تھے جہاں کوئی غریب لکڑہارا یا پسن ہارا رہا کرتا تھا اور اُس کی کوئی نہ کوئی خوبصورت لڑکی ضرور ہوتی۔

لیکن مجھے پرستانی کہانیوں کا مطالعہ محض اِسی لئے پسند نہیں کہ میں بیسویں صدی کی اِس ہنگامہ آفریں دنیا سے اُکتا کر جہاں مشین نما انسانوں کی زندگی کا چکر صبح و شام بھاپ اور بجلی کی قوت سے چلتا ہے اور جہاں پرستانی کہانیوں کی دُنیا کے سُنہرے دُھندلکے کی جگہ کارخانوں کی اُونچی اُونچی چمنیوں کا کثیف دُھواں چھایا رہتا ہے۔ اپنے فراریت پسند ذہن کو کچھ عرصے کے لئے رُومان اور طلسم کی رنگین دُنیا میں پرستانی رہواروں کے مانند فراٹے بھرنے کے لئے چھوڑ سکتا ہوں رُومان اور طلسم کی اُس رنگین دُنیا میں جہاں رُوپہلے پانی والی ندیاں شفق زاروں میں سے ہو کر آتی ہیں، جہاں آبشاروں کے سُریلے نغمے سُنائی دیتے ہیں اور جہاں زمردیں پتوں والے درختوں میں پھلوں کے بجائے لعل، یاقوت اور نیلم لگا کرتے ہیں، نہیں بلکہ مجھے پرستانی کہانیوں کا مطالعہ اِس لئے پسند ہے کہ میں کم از کم کچھ عرصے کے لئے اپنے ماضی اور حال کو ہم آہنگ کر سکتا ہوں۔ میں ایک بار پھر اپنے آپ کو بچپن کی سادہ اور معصوم دُنیا میں موجود پاتا ہوں اور یہ کہانیاں اکثر اوقات میرے بچپن

کے اُن خوشگوار دنوں کو ذہن میں دوبارہ تازہ کر دیتی ہیں اور وہ بھُولے بسرے واقعات دوبارہ یاد دلا دیتی ہیں جنہیں اب ماضی کے گہرے دُھندلکے نے حافظے کی پُر پیچ تہوں میں چھُپا دیا ہے۔

پرستانی کہانیوں' کا خیال آتے ہی نامعلوم طور پر میں ایک بار پھر موسمِ سرما کی تاریک' سرد اور طوفانی راتوں کو اپنے حافظے کے بعید ترین گوشوں سے اُبھرتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ میں ایک بار پھر اُس بڑے سے کمرے میں جہاں ہم تمام بھائی بہنوں کی چارپائیاں ساتھ ساتھ بچھی ہوتی تھیں چلا جاتا ہوں اور چپکے سے ایک لحاف کی گرم گرم تہوں میں اپنے آپ کو چھُپا لیتا ہوں۔ کمرے کے آتش دان میں خوشگوار بھڑکیلی آگ کمرے کی ٹھنڈک کو اپنی آتشیں زبانوں سے چاٹ چکی ہے اور اب ایک فتح مندانہ احساس سے آہستہ آہستہ جل رہی ہے۔ میں لکڑیوں اور کوئلوں کے چٹخنے کی آواز صاف طور پر سُن سکتا ہوں جو کبھی کبھی کمرے کے اندرونی سکوت کو محض لمحے دو لمحے کے لئے توڑ ڈالتی ہے۔ یہ موسمِ سرما کی ایک طوفانی رات ہے اُن ہزاروں طوفانی راتوں کے مانند جن کا نقش بچپن سے ہمارے ذہنوں میں مرتسم ہے۔ سرد ہوا کے جھونکے کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکراتے ہیں اور پھر سیٹیاں بجاتے اور ایک مسلسل گونج پیدا کرتے ہوئے گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک کے ساتھ بادل کی گرج بھی سُنائی دے جاتی ہے۔ اور مینہ کے تریڑوں کا شور کبھی تو ہوا کی سائیں سائیں میں گم ہو جاتا ہے اور کبھی خاموشی کے وقفوں میں صاف صاف سُنائی دے جاتا ہے۔ اور یہ وہ رات ہے جب ہم اور تم ضرور ہی اپنی دادی امّاں سے کوئی کہانی سنتے، کسی شہزادی کی، کسی دیو کی، یا کسی پری کی۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں دادی امّاں کا سنجیدہ چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ آتش دان کے قریب فرش پر بیٹھی، ہر رات سونے سے پہلے ضرور ہی چرخا کاتا کرتی تھیں۔ کمرے کی فضا میں گھُوں گھُوں کا نغمہ ایک مسلسل گونج کا ارتعاش پیدا کئے ہوئے ہوتا اور ہم سب بھائی بہن اپنے اپنے لحافوں میں دبکے ہوئے دادی امّاں کے ہاتھوں کی پھُرتی کو ایک پُر سکوت حیرت سے تکا کرتے جو پُونیوں کے سفید سفید انڈوں کو ہر بیس پچیس منٹ کے بعد اُتارنے میں بہت مُستعد دکھائی دیتے۔ یہی وہ وقت تھا جب ہم سب بھائی بہن دادی امّاں سے کہانی کہنے کی فرمائش کرتے اور وہ بظاہر انکار کر دیتیں لیکن ہمارا اصرار ایک ملے جُلے شور کی صُورت میں کمرے میں بلند سے بلند تر ہوتا جاتا۔

"اچھی دادی امّاں اب کہئے بھی نا کہانی ؟"

"اب تو دادی امّاں ہم نے سکول کا کام بھی ختم کر لیا ہے"

"اچھی دادی امّاں دیکھئے نا پھر ہمیں نیند آ جائے گی۔"

"ہائے اللہ جلد بھی سُنایئے نا وہ کہانی۔"

اور پھر دادی امّاں جان بُوجھ کر ہمیں چڑانے کے لئے کہتیں، "آج تو کوئی کہانی یاد نہیں۔" اور پھر یہ بھی کہہ دیتیں "یہ بھی کیا ضروری ہے کہ آدمی ہر روز تمہیں کہانی ہی سُناتے۔ چلو اپنے اپنے لحافوں میں دبک کر سو جاؤ۔ صبح پھر جلد آنکھ نہیں کھُلے گی......"

اِس پر پھر ایک بار شور مچتا۔ "ہم ضرور کہانی سُنیں گے۔" "کہانی سُن کر ہی دم لیں گے۔" کے فقرے کمرے کی فضا میں گونجتے، اور پھر دادی امّاں کہانی شروع کر ہی دیتیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کہانی ضرور ہی کسی بادشاہ سے متعلق ہوتی جو بہت پُرانے زمانے میں کسی ملک پر حکومت کرتا تھا، ایسے ملک

پر جس کا دُنیا کے نقشے میں کبھی کوئی وجود نہیں تھا لیکن بچپن کے رُومانی تخیل نے اُس کی حدود اربعہ اور محلِ وقوع کو کچھ اس طرح سے یاد رکھا کہ برسوں گزر جانے کے بعد بھی اُس ملک کا وجود ذہن سے محو نہیں ہونے پاتا۔ کہانی کا آغاز ہمیشہ یا تو اس فقرے سے ہوتا تھا کہ "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی دُور دراز ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا"...... یا اِس فقرے سے کہانی شروع ہوتی "ایک دفعہ کوئی بادشاہ شکار کھیلتے کھیلتے جنگل میں راستے سے بھٹک گیا"!... اور پھر ایک خاموش فضا میں کہانی کا چکر چلنے لگتا جو کبھی تیز ہو جاتا اور کبھی ہلکا۔

اُن تمام پرستانی کہانیوں میں سے جنہیں ہم دادی اماں سے سُنا کرتے تھے ہمیں خوابیدہ شہزادی کی کہانی بہت ہی پسند تھی۔ جو پُورے سو سال تک طلسم کے زیرِ اثر سوتی رہی تھی اور جسے سو سال کے بعد ایک شہزادے نے آ کر جگایا تھا۔ ہر دوسرے یا تیسرے ہفتے دادی اماں سے اِسی کہانی کو دُہرانے کی فرمائش ہُوا کرتی تھی۔

"اچھی دادی اماں آج تو وہی کہانی سُنائیے نا ـــــ؟"

"دادی اماں وہی کہانی جس کی شہزادی سو سال تک سوتی رہی تھی"!

دادی اماں کہتیں: "ارے وہ تو ابھی میں نے تم کو پچھلے ہفتے سُنائی تھی"۔

"نہیں دادی اماں آپ ایک بار پھر سُنا دیجئے۔ ہمیں وہ بہت پسند ہے۔ بہت ہی اچھی لگتی ہے۔ ہائے سُنائیے بھی نا.....!"

اور پھر ہمارے پُرزور اصرار پر دادی اماں ہماری پسندیدہ خوابیدہ شہزادی کی کہانی شروع کرتیں:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک بہت دُور دراز ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا......

اور بیچ میں سے کوئی بول اُٹھتا: "دُور دراز ملک میں؟ کتنا دُور ہو گا وہ ملک؟ دس ہزار میل دُور؟"

اور پھر دادی اماں چڑ جاتیں اور کہتیں "اگر تم لوگ اِس طرح بیچ میں بولتے رہے تو پھر میں کہانی نہیں سُناؤں گی"۔ اور کہانی دوبارہ شروع کرتیں:

"......بادشاہ کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ سر کے لئے سونے کا تاج، بیٹھنے کے لئے سنہری تخت۔ پہننے کے لئے زربفت اور کمخواب کے لباس، اور رہنے کے لئے سنگِ مرمر کا بنا ہُوا نہایت خوبصورت محل جس کے بُرج اتنے اُونچے تھے گویا آسمان سے باتیں کر رہے ہوں......"

اور دادی اماں کے زورِ بیان کے ساتھ ساتھ ہمارا بچپن کا لاأبالی تخیل بھی بیدار ہو جاتا، ہم تصور میں سنگِ مرمر کے بنے ہوئے ایک محل کو دیکھتے جس کی فصیل کے بُرج بیچ بیچ اتنے اُونچے ہوتے کہ آسمان کے نیلے بادلوں میں اُن کی بُرجیاں غائب ہوتے ہوئے دکھائی دیتیں، اور محل کے ایک بڑے سے کمرے میں ایک بوڑھا بادشاہ سنہری تخت پر بیٹھا ہُوا اتنا قریب محسوس ہوتا کہ اُس کے سونے کے تاج کی چمک دمک ہمارے تصور سے آنکھ مچولی کھیلتی!

دادی اماں برابر چرخا چلاتی رہتیں اور ساتھ ہی کہانی بھی جاری رکھتیں: "اس بادشاہ کو ایک غم کھائے جاتا تھا۔ اُس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ نہ کوئی لڑکا تھا اور نہ کوئی لڑکی....." اور پھر جب دادی اماں یہ بتاتیں کہ ہزاروں منتیں ماننے کے بعد آخر کار بادشاہ کے ہاں ایک نہایت خوبصورت شہزادی پیدا ہوئی تو ہمارا دل بھی بادشاہ کی بے پناہ خوشی میں نہایت خلوص سے شریک ہو جاتا اور ہم بھی اپنے آپ کو شہزادی کی پیدائش کے شاہی جشن

کے مناظر میں محسوس کرتے۔ اس جشن میں بادشاہ نے تمام پریوں کو بھی بُلایا تھا مگر ایک بدمزاج پری کو بلانا یاد نہ رہا تھا۔۔۔

جوں جوں رات زیادہ ہوتی جاتی کہانی کی دلچسپی شدت اختیار کرتی جاتی، مگر ساتھ ہی کہانی کی دلچسپی اور نیند میں ایک کشمکش بھی شروع ہو جاتی۔ ننھی مُنّی پلکیں آپ ہی آپ بند ہونے لگتیں اور اس سے پہلے کہ کہانی ختم ہوتی خواب ہمیں اپنے شیریں آغوش میں چھپا کر اُسی دنیا میں لے جاتا جس کا ذکر کہانی میں ہوتا۔ عالیشان محلوں، پُرپیچ غلام گردشوں، اُونچے بُرجوں والے قلعوں، گھنے جنگلوں، وادیوں اور کہساروں کی پرستانی دُنیا میں۔۔۔۔۔۔ اور ہم بھی اُس شہزادی کے ساتھ ہی اُس خواب زار میں چلے جاتے جہاں شہزادی کو بدمزاج پری کی بددُعا کی وجہ سے سو سال کی نیند سونا تھا۔ اور اُس نیند کا طلسم ایک شہزادے کو آکر توڑنا تھا۔

بچپن کا تخیل کس قدر فیاض ہوتا ہے ہمیں یہ محسوس کرنے میں کوئی دقت نہ ہوتی کہ ہم ہی وہ شہزادے ہیں جس کے مقدر میں خوابیدہ شہزادی کی صدسالہ نیند کا طلسم توڑنا لکھا ہے۔ اور ہم تصور ہی تصور میں گھنے جنگلوں کی پُرپیچ اور تنگ پگڈنڈیوں پر سے اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے خوابیدہ شہزادی کے محل کی طرف جا رہے ہوتے۔۔۔۔۔

"سٹیلا! بڑے ہو کر پرستانی کہانیاں یاد نہیں رہتیں۔ ہاں ہماری یاد کا ایک دُھندلا سا جزو ضرور بن جاتی ہیں، بچپن کی باتیں بچپن کے ساتھ گئیں۔ اس معصوم زمانے کو وقت کا تیز رَو سیلاب بہا کر لے گیا۔ اور اب پچیس برس بعد میں اپنے آپ کو پرستان کے اُن خواب زاروں میں نہیں پاتا جہاں سحر، طلسم اور رُومان کا دَور دَورہ ہوتا تھا بلکہ اپنے آپ کو بیسویں صدی کی ہنگامہ آفریں زندگی کی شورشوں میں حصہ لیتے ہوئے پاتا ہوں۔ دُھوئیں، بھاپ اور بجلی کے اس تمدن میں رُومانی تخیل کے پنپنے کے بہت کم مواقع ہیں۔ بچپن کے معصوم زمانے میں شہزادگی کا جو تاج ہم اپنے خوابوں میں پہن لیا کرتے تھے حقیقت کے کھردرے ہاتھ کا ایک ہی جھٹکا اُسے اتار پھینکنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی شور و غل کی اس دُنیا میں جہاں زندگی کا چکر اپنی انتہائی تیزی سے چلتا ہے۔ میں اس زندگی سے اُکتا کر کبھی کبھی اپنے تخیل کے رہوار کو اُس محل کی طرف موڑ دیتا ہوں جس کے سال خوردہ در و دیوار کو میرے بچپن کے خواب زار اب بھی اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں؛ اور اُس وقت میرا تخیل پل بھر میں جنگلوں، وادیوں اور کہساروں کی تمام دُوریاں طے کر کے اُس سحر زدہ محل کے صحن میں جا پہنچتا ہے۔ اور میں اُس صدیوں پُرانے کمرے میں اپنے آپ کو موجود پاتا ہوں جہاں میری خوابیدہ شہزادی پلنگ پر محوِ خواب ہے کمرے کی نیم وا کھڑکیوں سے جنگلی گلاب کی بیلیں اپنی ڈالیوں میں زرد زرد پھول لئے شہزادی کے حُسنِ خوابیدہ کی پاسبانی کر رہی ہیں، کمرے کی ہر شے محوِ خواب نظر آتی ہے۔ حسین کنیزیں فرش پر سو رہی ہیں، حبشی غلام دروازوں کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے سو رہے ہیں۔ اُن کے مرصع خنجروں کی چمک دمک ماند پڑ چکی ہے، اور کامدار پلنگوں کا طلا سیاہ پڑ گیا ہے، کمرے کے صدیوں پُرانے سکوت کو شہزادی کے شیریں تنفس کا ہلکا ہلکا نغمہ توڑ رہا ہے، اور اُس کے زیر سینے کا مد و جزر نرم اور نازک ہے؛ اور میں اپنی خوابیدہ شہزادی کے سرہانے دم بخود کھڑا اُس لمحے کا انتظار کر رہا ہوں جب سو سال کا طلسم ختم ہوگا اور میں اُس کے عنابی لبوں پر ایک شیریں نقش نرمی سے ثبت کر دوں گا اور جس کے

ثبت کرتے ہی میری خوابیدہ شہزادی ایک خمار آلود مسکراہٹ کی دلآویزی کے ساتھ اپنے خواب کا طلسم توڑ دے گی۔ مگر کسی کارخانے کا بھیانک سائرن نیچے پُرہجوم بازار میں کسی موٹر کے ہارن کی کرخت آواز۔ یا ٹیلیفون کی گھنٹی کی دل خراش گھر رگھر ر ..... سُنائی دی .....

اور اس سے پہلے کہ میں اپنی خوابیدہ شہزادی کے عنابی ہونٹوں پر ایک نرم و نازک نقش ثبت کروں، میرے تخیل کا یہ طلسم اُس بلبلے کی مانند ٹوٹ جاتا ہے جسے ہم اپنے بچپن میں صابن کے جھاگ سے پیدا کیا کرتے تھے۔ اور میں پھر بیسویں صدی کی اس مشینی دُنیا میں واپس آجاتا ہوں۔

اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے دُور دُور تک اُونچے مکانوں کی چھتیں ہی چھتیں دکھائی دیتی ہیں، کارخانوں کی اُونچی چمنیاں بجلی کے تاروں کے کھمبے، ٹیلیفون کے تاروں کے جال، اور نیچے بازار میں تارکول کی سڑک پر مشین نما انسانوں کا انبوہ۔ فراٹے بھرتی ہوئی موٹروں کی قطاریں، اُن کے انجنوں کا شور .....

"سٹیلا! یہ میری بیسویں صدی ہے، مشینی دَور کی ایک اہم صدی، لیکن پھر بھی یہ میرے تخیل کو اُس رومان سے محروم نہیں رکھ سکتی جو صدیوں سے ہر نوجوان کا حق چلا آرہا ہے، میں بھی اُسی طرح اپنی "سٹیلا" اپنی خوابیدہ شہزادی کی ایک آدھ جھلک اس بیسویں صدی کی تمام مادی مصروفیتوں کے باوجود دیکھ لیتا ہوں، جس طرح ہر زمانے کا نوجوان اپنے عنفوانِ شباب کا خوش آیند تصور کرتا چلا آیا ہے، سحر زدہ محل، خود رَو گلاب کی جھاڑیاں، اور خوابیدہ شہزادی ......

حضرت اثرؔ صہبائی

تجلّیات

غرقِ خیالِ دوست جو شام و سحر رہا
شام و سحر کے دَور سے وہ بے خبر رہا

فصلِ خزاں میں بھی ہے بہار آفریں نظر
پائندہ حُسن سے مرا حُسنِ نظر رہا

اُس دل میں دَورِ نغمہ و نکہت رہا مُدام
تیرے خیال کا جو کبھی رہگذر رہا

منزل کی آرزو تو تھی، منزل کہیں نہ تھی
منزل کی جُستجو میں سفر ہی سفر رہا

طاری رہی ہے رُوح پہ اِک سرخوشی اثرؔ
وہ حُسنِ شادماں مرے پیشِ نظر رہا

سلیم واحد سلیم

غزل

سلیم واحد صاحب ایران میں پیدا ہوئے اور اُنھوں نے وہیں اپنی عمر کے ابتدائی بیس بائیس سال گزارے۔ ان کی مادری زبان ایرانی ہے اور اب بھی گھر میں وہ ایرانی ہی بولتے ہیں۔ دو تین سال ہوئے کہ وہ اپنے آبائی وطن پاکستان میں پہلی دفعہ وارد ہوئے تھے۔ اس قلیل مدت میں اُنھوں نے نہ صرف اُردو زبان سیکھ لی ہے بلکہ انھیں اس میں اتنی مہارت بھی حاصل ہو گئی ہے کہ وہ بہت صاف اُردو غزل لکھنے لگے ہیں۔ — مدیر

مجھے حوادث کی برق سامانیوں کا خوف و خطر نہیں ہے
کہ زندگی ہے تو زندگی کے غموں سے ہرگز مفر نہیں ہے

مری دُعا میں اثر نہیں ہے مری نوا کارگر نہیں ہے
مگر ترا غم ہے روز افزوں کمی کہیں ذرّہ بھر نہیں ہے

یہ میکدہ ہے یہ میکدہ ہے جو ہو سکے تو ذرا ٹھہر جا
کہ اِس سے آگے کوئی مقامِ علاجِ دردِ جگر نہیں ہے

مَیں تیرے جلووں میں کھو گیا ہُوں نگاہ گُم ہے تجلّیوں میں
تری تجلّی کی موج بن کر مری نظر اب نظر نہیں ہے

نہ ہوگی توہینِ ضبط اے دل کسی طرح بھی مجھے گوارا
ہزار صدمے اُٹھا رہا ہُوں مگر مری آنکھ تر نہیں ہے

مَیں تیرے عیش و طرب کی محفل کا لُطف کیسے اُٹھا سکونگا
کچھ اِس طرح غم میں کھو گیا ہوں کہ فرصتِ یک نظر نہیں ہے

سلیم گو شب کی ظُلمتوں کا طلسم ٹوٹا ہُوا ہے لیکن
سحر جسے ہم سمجھ رہے ہیں بجُز فریبِ سحر نہیں ہے

نشتر جالندھری

اصلاحِ زباں

گر از سرِ گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

عرصہ ہوا، میں نے اصلاحِ زباں کی غرض سے یہ سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ جسے پاک و ہند کے اکابرِ زباں اور اربابِ علم و نظر نے پسند فرمایا۔ جس طرح میں نے پہلے کسی نثار یا شاعر کا نام لئے بغیر اغلاط کی توضیح کی تھی، اسی طرح اب بھی کرونگا۔ وبیدٖالتوفیق۔

نثر

فقرہ - ابوسفیان کے ہوش و حواس اُڑ گئے۔

اصلاح - ابوسفیان کے ہوش اُڑ گئے۔

وجہ - "ہوش اُڑنا" محاورہ ہے۔ اور محاورے میں تصرف جائز نہیں۔

فقرہ - اُسے حق حاصل ہے کہ وہ تمام سامان اپنے ہی ماحول سے حاصل کرے۔

اصلاح - وہ اپنے ہی ماحول سے یہ سارا سامان حاصل کرنے کا مستحق ہے۔

وجہ - (۱) "حاصل" کی تکرار اچھی نہیں۔ (۲) "وہ یہ" کی یک جائی پسندیدہ نہیں۔ (۳) "تمام" تعداد اور "سارا" مقدار کے لئے افصح ہے۔

فقرہ - جو طالب علم یہ چیستان حل کرے گا۔ اُسے پانچ روپے انعام دیا جائے گا۔

اصلاح - "چیستان" کی جگہ "معما" لکھنا چاہیئے۔

وجہ - "چیستان" میں کسی چیز کا نام پوچھا جاتا ہے۔ اور "معمے" میں اشارہ یا نام بتا کر حل کرنے کی ترکیب پوچھی جاتی ہے۔

فقرہ - چُپ کرو۔ شور نہ مچاؤ۔

اصلاح - چُپ رہو۔ شور نہ مچاؤ۔

وجہ - "چُپ کرنا" کے معنی ہیں "خاموش کرنا"، "بولنے سے روکنا" یہ اصلاح فصحائے لکھنؤ کے روزمرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔ ورنہ میری رائے میں "چُپ کرنا"، "خاموش ہونا" کے معنی میں درست ہے۔ اور فصحائے دہلی کا بھی یہی مسلک ہے۔ (مراۃ العروس) بی آپا چُپ کرو۔ تمہاری سُسرال سے ماما آئی ہے۔

("مخزن" مراۃ العروس میں ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے بھی اسے پنجابی محاورہ کہا ہے)

فقرہ - "سر سہرا رہنا" کے بجائے "سر پہ سہرا رہنا" کا استعمال بول چال کے خلاف ہے۔

اصلاح - "بول چال" کی جگہ "محاورہ" لکھنا چاہیئے۔

وجہ - "بول چال" میں الفاظ اپنے اصلی معنی دیتے ہیں۔ یہ "محاورے" کا محل ہے۔

فقرہ - آپ نہ صرف مرادف المعانی الفاظ ڈھونڈتے ہیں۔ بلکہ ایک عمدہ سسٹم الفاظ کا اُردو میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اصلاح - آپ نہ صرف مترادف الفاظ ڈھونڈتے ہیں۔ بلکہ اُردو میں الفاظ کا ایک عمدہ سلسلہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔

وجہ - (۱) "مرادف المعانی" کی ترکیب غیر ضروری ہے۔ کیونکہ خود "مرادف" میں "معانی" کا مفہوم موجود ہے۔

(باقی برصفحۂ آئندہ)

نظم

شعر۔ قسم ہے مجھ کو مرے اضطرابِ پیہم کی
وہ دل ہی کیا جو نہ فرقت میں بیقرار رہے

غلطی۔ پہلے مصرع میں "مرے" غلط ہے۔ یہ "اپنے" کا محل ہے۔

شعر۔ زمیں پہ آج ہو رہی ہیں بارشیں شراب کی
اُفق پہ محوِ رقص ہیں ترادشیں شراب کی
عنایتیں شباب کی، نوازشیں شراب کی

غلطی۔ ایطاء جلی کے باعث قافیے غلط ہیں۔ "بارش" کا صحیح قافیہ "نگارش" "ترادش" کا "کاوش" اور "نوازش" کا "سازش" ہے۔

"بارش" "ترادش" اور "نوازش" میں ایطاء خفی ہے لہٰذا انہیں جائز رکھا گیا ہے۔ کیونکہ ایک حرف (ش) کی زیادتی کے باعث قبح زیادہ نمایاں نہیں ہوتا لیکن اس شعر کے اندر جمع کی صورت میں تین زائد حروف (شیں) آنے کی وجہ سے ایطاء جلی کا عیب پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ ناجائز اور غلط ہے۔ کیونکہ قبح صاف اور زیادہ نمایاں ہو رہا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ دوسرے حضرات کو اختیار ہے۔

شعر۔ لہو کھنچ کھنچ کے دل کا دیدۂ خونبار میں آئے
مگر دھبا نہ کوئی دامنِ پندار میں آئے

غلطی۔ (۱) دوسرے مصرع میں "میں" غلط ہے۔ یہ "پر" کا مقام ہے۔
(۲) یہ "پندار" کا نہیں "ضبط" کا محل ہے۔
(پندار کو اگر خودداری کا مرادف سمجھا گیا ہے تو یہ قطعاً غلط ہے)

شعر۔ کل تجھ کو لوں گا۔ اگر وعدہ ہوا ایفا نہ آج
سوچ لو رسوا کریگا یہ تمہارا آج کل

غلطی۔ (۱) "وفا ہونا" اور "ایفا کرنا" افصح ہے۔
(۲) "آج کل" اِن معنی میں مؤنث ہے۔

(تشنہ جالندھری)

چیستاں

کسی قسم کا اتا پتا خواہ نظم میں خواہ نثر میں بتا کر اس چیز کا نام دریافت کرنے کو چیستاں کہتے ہیں۔ مثلاً:

"خدا کا دیا سر پر" یعنی چاند

دیگر

رنگش چو رنگِ زعفران پریاں چو جانِ عاشقاں
یاد آرد و پیرہم بداں جاناں بگو ایں چیستاں (پاپڑ)

دیگر

یک جفت کبوترانِ ابلق   ہستند جدا جدا معلق
پرواز بہ آسماں نمایند   از خانۂ خود بروں نیایند (آنکھیں)

سید آغا حسین ارسطو جاہی[1]

ایک خط

(راقم کے فرزندِ اکبر کے نام)

شکاری جانوروں کا شوق

ایک خط پہلے لکھ چکا ہوں جس میں اپنے مشہور کتب خانۂ ارسطو جاہ کی بعض کتب کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ یہ خط رسالۂ "ہمایوں" بابت ماہ جولائی ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا ہے۔ عقابوں، بازوں، شاہینوں، باشوں اور جرّوں کے علاوہ لگڑ، جھگڑ، چرغ بلکہ جملہ اقسام گلال چشم و سیاہ چشم کا مجھے بچپن سے شوق ہے۔ ہمارے گھر میں اِن سب شکاری جانوروں کا شوق کئی پشت سے چلا آتا ہے۔ نواب میر محمد جعفر خاں فوجدار تہاڑا (جالندھر دوآب) نے بھی سب اقسام کے شکاری جانور اپنے قلعہ واقع ملونڈی سادات تحصیل جگراؤں ضلع لدھیانہ میں جمع کر رکھے تھے۔ جس زمانے میں اُن کے کوئی اولاد نہ تھی ایک دن تیتر کے شکار کے لئے جا رہے تھے۔ اتفاقاً راستے میں ایک مجذوب سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے دیکھ کر دُعا دی کہ آپ کے اولاد ضرور ہوگی صاحبزادے کا نام فقیر اللہ رکھنا۔ اِس پر نواب مرحوم نے فرمایا کہ اُس کو شکار کا شوق بھی ہوگا؟ جواب میں مجذوب نے کہا "نہیں" فرمانے لگے مجھے ایسی اولاد کی ضرورت نہیں جسے شکار کا شوق نہ ہو۔

جناب ارسطو جاہ بہادر کے والد نواب سید علی بخش مرحوم کو بھی یہی شوق ورثے میں ملا تھا بخصوصاً باشہ رکھنے میں کمال مہارت تھی۔ کئی قسم کے باشے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ گرمیوں میں اکثر باشے کُریز کے لئے بٹھائے جاتے تھے۔ کسی اچھے منظورِ نظر باشے کا کُریز میں کامیاب ہو جانا اچھے خاصے جشن کا باعث ہوتا تھا۔ میرے پاس ان باشوں کی تصاویر بھی موجود ہیں۔ ایک باشے کا نام "غلام حسین" تھا بعض شعراء نے اُس کی تعریف میں نظمیں بھی کہی ہیں۔ جب نواب مرحوم کا انتقال ہوا تو یہ باشہ آٹھویں نویں دفعہ کُریز مکمل کر چکا تھا۔ اس کی بہت سی قلمی تصاویر بنائی گئیں۔ ایک تصویر مشہور مصوّر مرزا محمود ثانی نے بنائی تھی وہ میرے پاس موجود ہے۔ مرزا مرحوم اپنے زمانے کے بہت بڑے مصوّر تھے۔ سر جارج کلارک لفٹنٹ گورنر جنرل صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے لئے اُنہوں نے ایک مرقع تیار کیا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں جناب ارسطو جاہ بہادر مرزا صاحب موصوف کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے گئے تھے۔ جارج کلارک نے دربارِ اودھ کے پُرانے مصوّروں کے ساتھ اس باکمال مصوّر کا مقابلہ کرایا تھا اُن سب نے مل کر ان کے کمال کا اعتراف کیا تھا اور مرزا مرحوم کو اپنا اُستاد تسلیم کیا تھا۔

ہاں تو جب کوئی نیا جانور نواب سید علی بخش مرحوم کی خدمت میں پیش ہوتا تھا تو قابل اور تجربہ کار بازداروں کے سپرد کیا جاتا۔ اُن بازداروں کی یادگار اُستاد عالمگیر اور اُستاد عمرو داز کو میں نے بھی دیکھا ہے جس طرح کوئی موجودہ طالب علم فلسفے یا تاریخ کے باب یاد کرے اسی طرح بازناموں کے خاص خاص حصے بازداروں کو یاد کرائے جاتے تھے۔ قلمی شاہناموں کی وہ تصاویر دکھائی جاتی تھیں جن میں ایرانی اور مغل مصوّروں نے شاہانِ ایران اور مغل شہزادوں کے مشہور کارناموں کو زندہ جاوید بنا دیا تھا۔ ایسے کئی نایاب مصوّر شاہنامے ہمارے کتب خانے میں موجود تھے جن میں ایک مغل مصوّری کا شاہکار تھا جس کے

[1] سید آغا حسین نواب ارسطو جاہ بہادر مرحوم کے خاندان سے ہیں۔ ان کا بیش قیمت خاندانی کتب خانہ انقلاب ہند کی نذر ہو گیا ...

پاس موجود ہے۔ جس میں چار سو کے قریب قلمی تصاویر بنائی گئی ہیں۔ بیرونِ سند کے بنے ہوئے کاغذ پر اسے خطِ نستعلیق میں کتابت کیا گیا ہے۔ مغل شہزادوں کی ایسی ہی تصاویر کے مرقع جن میں شکاری لباس میں ان کی مختلف قسم کی تصویریں اور اُنکی شکارگاہوں کے مناظر دکھائے جاتے تھے ہمارے کتب خانے کی زینت تھے مجھے رنگ محل[1] کے وہ مرقع اب تک یاد ہیں جن کو بچپن میں جا کر گھنٹوں دیکھا کرتا تھا۔ سرسبز اور شاداب وادیوں میں جھیلوں چشموں اور ندی دریاؤں کے کنارے مرغابیوں کے شکار کے منظر جا بجا بڑی عرق ریزی کے ساتھ نمایاں کئے گئے تھے۔ شکاری بہریوں[2] کی پرواز، مرغابیوں کا اُن سے ڈر کر لمبی سایہ دار گھاس میں چھپنے کی کوشش کرنا، سدھے ہوئے شاہینوں اور بہریوں کی عقابی آنکھوں سے مرغابیوں کا سہم جانا، اور چھوٹے چھوٹے آبی پرندوں کا مغربی اُفق پر چھپتے ہوئے سورج کی ہلکی مدھم روشنی میں دُور تک غائب ہوتے جانا فنِ تصویر کا ایسا نادر مرقع تھا کہ کیا کہوں۔ اِس قسم کے شکار کا بابر اور جہانگیر کو خاص طور سے شوق تھا۔ انہیں کے تتبع میں اکثر مغل امرا نے ایرانی روایات کو زندہ کر دکھایا۔ ہر وقت ایران و توران کے ساتھ سلسلۂ آمد و رفت جاری تھا۔ ایران کے بہترین فنکار، شاعر، بذلہ سنج، عالم اور طبیب اس طرف کھنچے چلے آ رہے تھے ہم نے خالص ایرانی شاہکار بھی دیکھے ہیں لیکن اُن کی شکارگاہوں میں وہ بات وہ نفاست اور وہ لطافت نہیں جو ایرانی اور مغل فن کے امتزاج کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہاں آ کر واقعی آرٹ نے کیا بلحاظِ شاعری اور کیا بلحاظِ مصوری بہت ترقی کی۔

ابو الفضل نے ایک خاص باب اِس بارے میں لکھا ہے آئینِ اکبری کا بھی ایک نہایت بیش قیمت مصور قلمی نسخہ اِس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ چاہتا تھا کہ اس کے کچھ انتخابات پیش کروں لیکن اس کے لئے ایک علیحدہ باب درکار ہوگا۔ آج صرف بازداری اور شکارگاہوں پر تبصرہ مطلوب ہے میں فارسی شعرائے ایران کے کلام کا انتخاب بھی کرنا چاہتا ہوں۔

اِس زمانے میں پاکستان کے اندر ایسے اشخاص موجود ہیں جن کو شکار کے مختلف طریقوں، بازوں، جرّوں، باشوں، لغر، جگر، بہریوں، عقابوں اور شاہینوں کی پرواز دیکھنے اُن کو سدھانے اور اُن سے شکار کھیلنے کا شوق ہے لیکن یہ فن اور اُس کے جملہ متعلقہ لوازم بحیثیت ایک فن کے رفتہ رفتہ فنا ہو رہے ہیں۔ بظاہر اِسکی تجدید ہونی ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آسٹریا، ہنگری، ڈنمارک اور سکاٹ لینڈ میں بھی اب صرف چند خاندان ایسے ہونگے جنکو اِس قسم کے شکار کی کچھ روایات یاد رہ گئی ہونگی۔

میرا خیال ہے ہند میں تو کوئی امکان ہی نہیں کہ یہ فن کسی طرح باقی رہ سکے۔ اِس قسم کا شکار اور بازداری کی روایات خالص اسلامی چیزیں ہیں۔ ایرانی اور مغل اُستادوں سے بعض غیر مسلم اشخاص نے ان طریقوں کو سیکھ لیا تھا بازناموں کے فارسی ابواب پڑھ لئے تھے اب وہ لوگ ہرگز ان روایات شکار کو زندہ نہ رکھ سکیں گے۔ گورکھی اور ہندی میں یا جنوبی ہند کی تاریک بازاری میں جہاں "ڑ" اور "ڈ" کی تکرار نہایت بھیانک اور خوفناک صورت میں موجود ہے بازناموں کے ترجمے پیش کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ یہ قابلیت تو ترکی، فارسی اور اُردو زبانوں میں ہے کہ اِس عدیم النظیر فن کے کارناموں کو زندہ رکھ سکیں۔ ایرانی مصوروں کے علاوہ ایرانی شعرا نے بھی اِس طرف خاص توجہ کی۔ بہشتی اصفہانی نے اِس فن کا ذکر ایک تمثیل کے طور پر اپنے ایک مشہور قطعہ میں کیا ہے۔ یہ قطعہ آتشکدۂ آذر میں موجود ہے۔ شاعر ملازمت کی ہجو کرتا ہؤا تمثیلاً کہتا ہے ؎

شبے بازے بر بازے گفت در دشت — کہ تا کے کوہ و صحرا می تواں گشت

بیا تا سوئے شہر آریم پرواز — کہ با شہزادگاں باشیم ہمراز

بشب ہا شمع کافوری گدازیم — بروزاں با شہاں نخچیر بازیم

گہے بر دستِ مہرویاں نشینیم — گہے با گلرخاں خلوت گزینیم

جوابش داد آں بازِ نکو رائے — کہ اے نا داں و دوں ہمت سراپائے

۱؎ رنگ محل جناب ارسطو جاہ بہادر کی حویلی واقع حمایت نگر کا ایک حصہ تھا۔ ۲؎ اُردو میں اس لفظ کا املا ہائے ہوز سے ہے مگر ترکی لغت میں

آغا حسین

تمامی عمر گرد کوہسارہا — جنائے برف بینی جوئے باراں
کشی در ہر نفس صد گونہ خواری — ز چنگالِ عقابانِ شکاری
بسے بہتر کہ بر تختِ زر افزد — ولے محکومِ حکمِ دیگرے بود

بازوں کی سرشت کی کس قدر اصلی تصویر کھینچی ہے جو کچھ مصور اپنے مو قلم سے کرتا ہے شاعر اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ایرانی استاد نے بڑی بڑی شکارگاہوں کے منظر دیکھے ہیں، عقابوں اور بازوں کے ساتھ زندگی بسر کی ہے دشوار گذار پہاڑوں اور تپتے ہوئے صحراؤں کو عبور کیا ہے۔ برفانی چوٹیوں پر خیمے نصب کئے ہیں اور اپنی جوانی کی بہت سی بہاریں اسی طرح گزاری ہیں کہ دن کہیں ہوا اور رات کہیں آئی تبھی شاعر اس قابل ہوا ہے کہ اسکے سیدھے سادھے اشعار اس طرح اثر انداز ہو سکیں۔

ہاں تو میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ ہمارے جدِ امجد نواب سید علی بخش مرحوم نے باشوں کے رہنے کیلئے اپنی فرودگاہوں میں خاص خاص جگہیں مقرر کر رکھی تھیں منظورِ نظر باشے بیپر میشی کے کشمیری، ایرانی اور چینی قلمدانوں میں شدید سرمائی راتیں آرام سے بسر کرتے تھے بقول شاعر

بشب با شمع کافوری گدازیم
بروزاں با شہاں نخچیر بازیم

باشہ نہایت نرم و نازک جانور ہے اگر تھوڑا سا تجاوز طعمہ میں ہو جائے تو اُس کا بچنا محال ہے یوں سمجھو کہ مغل آرٹ کی کوئی نازک ترین تصویر ہے یا باریک رنگین منقش کاسۂ چینی کے مشابہ قدرت کا ایک لطیف شاہکار۔

گھوڑوں اور ہرنوں کی تصاویر بنانے میں مغل مصوروں نے واقعی کمال کر دکھایا لیکن شکاری پرندوں کی تصاویر بنانے میں چینی فن کاروں کو خاص امتیاز حاصل ہے جس طرح چینی کے پرانے برتنوں پر شکارگاہیں بنائی گئی ہیں، کاغذ پر بھی اسی طرح چینی آرٹ نے مختلف صدیوں میں کچھ ایسے نقوش اور رنگ چھوڑے ہیں جن کی داد نہ دینا ایک گناہِ عظیم ہے۔ چینی فن کاروں نے جانوروں کی تصاویر بنانے میں واقعی کمال کر دکھایا تھا اُن کے رنگوں میں ایسی پختہ کاری اور رونق موجود ہے جو کہیں اور غیر ممکن ہے۔ ہمارے پاس "عجائب المخلوقات" کا جو نسخہ ہے جسے حال ہی میں جناب آنریبل قانسل کمشنر ہیلور نے ملاحظہ فرمایا تھا اور مجھے اُس کے بچا کر پاکستان میں لے آنے پر داد دی تھی اُس میں کئی سو تصاویر صرف جانوروں کی ہیں۔ فرشتوں اور آسمانی بروج کی علمِ ہیئت والی تصاویر اُن کے علاوہ ہیں۔ جس طرح مصور عبد الرحمان صوفی اندلسی کی مشہور کتاب "العنوز" میں بروجِ آسمانی کی تصاویر بنائی گئی ہیں۔ چینی تصاویر اور چینی فن کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایلورا اور ایجنتا کی مشہور و معروف تصاویر سے اُن کے رنگ مستعار لئے گئے ہیں یا ہڑپا، موہنجوڈارو (سندھ) کے پرانے کھنڈروں سے ابھی ابھی اُن کو برآمد کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فابری (سابق کیوریٹر میوزیم لاہور) کا خیال ہے کہ یہ کتاب چینی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔

میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ کسی زمانے میں اپنے ماموں صاحبان سید علی اکبر مرحوم و سید محمد محسن مرحوم کے ہمراہ چرغوں اور بہریوں کی پرواز دیکھنے کے لئے جایا کرتا تھا وہ او۔ اہا۔ ہا۔ ہا میرے کانوں میں اب تک گونج رہی ہے۔ اب انشاء اللہ ملکِ سندھ یا ایران کو جاتے ہوئے چند ایسے سدھے ہوئے باز، جُرّے، باشے اور چرغ لے جائیں گے اور ایرانی شکارگاہوں میں ان سے کام لیں گے یا پاکستان کے کسی صحرائی حصہ میں بودوباش اختیار کریں گے ✦

سید نذیر حسین ناشاد

کراچی

(عروسِ پاکستان)

کنارِ بحر پہ اِک لطف کا سماں دیکھا — نئی زمین نیا ایک آسماں دیکھا
کُشادہ سڑکیں ہر اِک سمت خوشنُما دیکھیں — نرالی شان کا بازار اور مکاں دیکھا
جہاز دیکھے سمندر میں کشتیاں دیکھیں — لگا ہوا کہیں کشتی پہ بادباں دیکھا
کھو گئے دل میں سمندر کو ہمنے دیکھ لیا — نکل کے دیکھو کچھ آگے ابھی کہاں دیکھا
نظارہ ارضِ مقدّس کا دُور ساحل سے — نگاہِ شوق نے با نالہ و فغاں دیکھا
زمینِ مقتلِ مظلُومِ کربلا دیکھی — مزارِ اقدسِ سرکارِ دو جہاں دیکھا
نجف کی طُوس کی بغداد کی زیارت کی — سوادِ دلکشِ شیراز و اصفہاں دیکھا
یہ سطحِ آب پہ اِک گھر کا گھر رواں آہا — سوار جس پہ ہے ہستی کا کارواں دیکھا
وہ کل کی کشتی پہ ناشاد سیرِ دریا کی — تماشا بحر کا قطرے میں بیگماں دیکھا
جہازِ عمر ہے یُونہی رواں تلاطم میں — یہ نقشہ ہستیٔ انساں کا الاماں دیکھا
چمن بہت پئے تفریح جا بجا دیکھے — یہ شہر دیکھا کہ صحرا میں گلستاں دیکھا
دفاتر اور عمارات دل نشیں دیکھیں — اور اُن پہ قوم کا اُڑتا ہوا نشاں دیکھا
خوشی سے دل کا کنول کھل گیا ملب دیسیا — جو بحری فوج کو ملت کا پاسباں دیکھا
بہارِ خُلد نظر آگئی ہمیں جس دم — کنارِ بحر کلفٹن کا گلستاں دیکھا

حسین گھاٹ پہ بیٹھے ہوئے جو ان دیکھے
سفید ریت پہ اُن کو رواں دواں دیکھا

میانِ بحر قیامت کا سامنا ہوگا
نظارہ دُور سے لہروں کا الاماں دیکھا

ہوا میں رات کو خنکی شروعِ سرما کی
عجیب موسمِ گرما میں یہ سماں دیکھا

ہے دُھوپ تیز مگر لُو نہیں کبھی چلتی
اثر یہ بحر کی قُربت کا بیگماں دیکھا

یہ حُسن و خُوبی یہ وسعت یہ لُطفِ آب و ہوا
پکڑ کے رہ گئے دل کو جہاں جہاں دیکھا

رواں جو ہوتیں کہیں اپنی جا بجا نہریں
تو ہم یہ کہتے کہ ہاں رشکِ جناں دیکھا

ہجومِ اہلِ عقیدت کا اُس پہ صبح و مسا
مزارِ قائدِ اعظم پہ یہ سماں دیکھا

یہاں پڑا ہے وہ شیرِ ژیانِ حُرّیت
کوئی نہ ایسا سیاست کا نکتہ داں دیکھا

ٹلے زمان و مکاں پر نہ اُس کا عزم ٹلا
نہ ایسا قائدِ لشکر نہ حکمراں دیکھا

پلٹ کے رکھ دے جو اس طرح ملک کی کایا
نہ انقلاب کوئی زیرِ آسماں دیکھا

خدا کا فضل و کرم تھا کہ جانِ نزار بچی
گھرا یہ آگ کے شعلوں میں آشیاں دیکھا

ملی کہیں نہ اماں جور و ظلمِ اعدا سے
وطن سے نکلے تو ملت کا آستاں دیکھا

تمام عالمِ اسلام میں ہے اِک ہلچل
بڑا یہ ملتِ بیضا کا امتحاں دیکھا

عجب نہیں کہ مسلماں کی پھر بڑھے توقیر
کہ ہم نے یُوں بھی ہے قدرت کو مہرباں دیکھا

ڈھلکتے آتے ہیں الفاظ موتیوں کی طرح
یہ نظم دیکھی، یہ ناشاد کا بیاں دیکھا؟

مخزن المخازن

نیا دور

فسادات اور گمراہ کن افسانے

محمد حسن عسکری

(اقتباس)

اب تک اُردو میں فسادات پر جو افسانے لکھے گئے ہیں اُن میں اکثر و بیشتر چند مخصوص خیالات کی حمایت کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ان فسادات میں جس بہیمیت کا اظہار ہوا ہے وہ بہت بُری چیز ہے۔ یہ افسانے اس بہیمیت کے خلاف نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کی وجہ بھی ڈھونڈتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایسی بربریت عام طور سے انسانوں میں نہیں ہوتی یہ تو سیاسی حالات نے پیدا کی ہے، اور یہ سیاسی حالات اور یہ نفرت انگریزوں نے اپنے سیاسی فائدے کے لئے پیدا کی ہے۔ انگریزوں کی ایک چال ہندوستان کی تقسیم ہے۔ اگر تقسیم نہ ہوئی ہوتی، تو فسادات بھی نہ ہوئے ہوتے۔ اور ہندو مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے امید ہے کہ یہ نفرت جلد غائب ہو جائیگی اور بھائی بھائی پھر گلے مل جائیں گے۔ بعض افسانہ نگار سمجھتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان پھر ایک ہو جائیں گے۔ چنانچہ ان افسانوں میں کوشش کی جاتی ہے کہ الزام دونوں میں سے کسی کو بھی نہ دیا جائے بلکہ انگریز کو ملزم گردانا جائے۔ لہٰذا مظالم دونوں طرف یکساں دکھائے جاتے ہیں۔ اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہ مشرقی پنجاب میں جو کچھ ہوا ہے اسے بیان کرنے کے لئے تو اب لغت میں کوئی لفظ ملتا ہی نہیں۔

غرض یہ ہے ان افسانوں کا ذہنی پس منظر۔ اول تو یہ نظریاتی تانا بانا ایسا ہوا ہے کہ خود لکھنے والوں کو بھی اس پر یقین مشکل ہی سے ہوگا نفرت کو محض انگریزوں کی سیاست کا ناشناسانہ سمجھنا یا تو کسی سادہ لوح سے ممکن ہے یا کسی حیلہ ساز سے۔ فرض کیا کہ لکھنے والوں کی نیت نیک ہے مگر جو باتیں وہ پیش کرتے ہیں اُن پر خود اُنہیں یقین نہیں۔ اور وہ جانتے ہیں کہ ہم یہ باتیں کر کے اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہے ہیں اور دوسروں کو بھی۔ چنانچہ یہ سارا ادب بالکل بے خلوص، بے جان اور کھوکھلا ہے۔ اس میں پُر زور خطابت بھی تو نہیں ملتی۔ کیونکہ سارا نظریاتی ڈھانچہ ہی مصنوعی ہے۔ یہ افسانے محض مصنوعی ہی نہیں، اِن کا ایک خطرناک پہلو بھی ہے۔ ان میں مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف بڑا زہریلا پروپیگنڈا ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سب باتیں بالکل انجان پنے میں اور معصومیت کی وجہ سے کی جاتی ہوں مگر ان کا مجموعی اثر مسلمانوں کے خلاف ہے۔ اوّل تو فسادات کی زیادہ ذمہ داری مسلمانوں کے سر رکھی جاتی ہے۔ دوسرے تقسیم کو بِس کی گانٹھ بتایا جاتا ہے، حالانکہ تقسیم یعنی پاکستان کا قیام مسلمانوں کا عزیز ترین سیاسی نصب العین رہا ہے۔ اِن افسانوں میں کوشش ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو پاکستان کے بنیادی اُصول سے بدظن کیا جائے۔

ہمارے ادیبوں کی طرف سے (یعنی جو ادیب پاکستان کے حامی ہیں) اِس ادبی حملے کا جواب دینے کی کوئی معقول کوشش نہیں ہوئی ہے، آخر تھوڑی بہت قومی خدمت وقتاً فوقتاً ہمیں بھی کر لینی چاہیئے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ہندوستان

سے خلاف تعصب پھیلائیں یا کسی کو بدنام کریں۔ یہ کام تو دوسروں ہی کو مبارک رہے ہمیں اپنے سوا کسی سے کیا غرض ہے ہمیں تو اپنے ادیبوں سے صرف اتنی بات چاہیئے کہ وہ ہمیں بتائیں ہمارے اُوپر کیا بیتی ہے اور کیوں بیتی ہے ہمیں ہزار ہا مسلمانوں کے قتلِ عام پر نوحے اور مرثیے نہیں چاہیئں۔ لاکھوں آدمیوں کی موت بھی بذاتِ خود کوئی اہم معنویت نہیں رکھتی۔ اگر ہمارے پچاس لاکھ آدمی خوددار انسانوں کی طرح ظالموں کا مقابلہ کرتے ہوئے مرجائیں، تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن اگر ہمارے پانچ آدمی جان بچانے کے لالچ میں میدان سے بھاگ کھڑے ہوں تو یہ ہمارے لئے ایک المیہ ہے۔ ہم تو بس یہی چاہتے ہیں کہ ہمارے ادیب ہمارے کردار کا محاسبہ کریں اور ہمیں بتائیں کہ ہمارے ساتھ کیا ٹریجڈی واقع ہوئی ہے۔ ہمارا کردار ہماری روایتوں کے شایانِ شان ہے یا نہیں۔ بس اتنی قومی خدمت ہم اپنے ادیبوں سے ضرور لینا چاہتے ہیں۔ دوسروں پر تنقید نہیں اپنی قوم پر تنقید۔

"نقوش"

شنبہ، ۱۱ بجے شب، ۱۱ ستمبر ۴۸ء

(مقبول حسین احمد پوری)

جگ کے رَب پرکاش ہوئے گم
بُجھے بُجھے ہیں نبھ کے تارے
مُسلِم پریمی، ہندو سنیہی، ———
قائدِ اعظم!
پریم دھام جنّت کو سدھارے

چھمن دیڈنا کی کہتی ہے
زندگیہ امرتا جس نے پائی
اُس کی اِس سوئمبل کایا میں
اے دیا گُل مَن، کہاں سمائی؟!

مُسلم جیون کے سنچالک
راج نیتی سے دھرم کے پالک
پریم بھاؤ رکھنے میں اُتم
قائدِ اعظم!
پریم دھام جنّت کو سدھارے!

"ماہِ نو"

ڈاکٹر اقبالؒ کی معیت میں چند لمحات

(ضیاء الدین احمد برنی)

دوسری گول میز کانفرنس سے لوٹتے وقت ڈاکٹر اقبال چند دن کے لئے تلاوت ہاؤس بمبئی میں قیام پذیر رہے۔ ان ہی دنوں کی ایک سہانی شام کو ڈاکٹر صاحب عطیہ بیگم صاحبہ کے دولت کدہ "ایوانِ رفعت" میں چائے نوشی پر مدعو تھے۔ بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر صاحب سے تعارف کرانے کے لئے بمبئی کی بعض ممتاز ہستیوں کو بھی بلایا تھا۔ جن میں جسٹس مرزا علی اکبر خاں مرحوم مولانا عرفان مرحوم، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ "ایوانِ رفعت" کے کھلے صحن میں جو پھولدار پودوں کی کثرت اور اپنے مخصوص ماحول کے باعث جنّتِ نگاہ بنا رہتا تھا ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرایا گیا۔ اِس کے بعد حاضرین نے اُن سے متفقہ طور پر درخواست کی کہ وہ کوئی پیغام دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے حاضرین کے پیہم اصرار پر پہلے تو ایک مختصر سی تقریر انگریزی

لہ روشنیاں لہ آسمان سہ اکنت کہنے والا لکہ مقام شہ سوندروں کی خلش لتہ ابدی غیر فانی زندگی شہ خرابی پیکر خاک یعنی جسم شہ ... لہ قرار لہ ناخدا لہ ساست لہ ست ... ا۔ الا ...

ہم کی اور پھر اپنا ایک فارسی کا شعر پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ بس میرا اتنا ہی پیغام ہے۔ وہ شعر یہ ہے :-

چناں بزی کہ اگر مرگ تست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

حاضرین میں جو لوگ فارسی سمجھتے تھے وہ ڈاکٹر صاحب کے شعر سے بیحد لطف اندوز ہوئے اور بہت دیر تک ان کے پیغام کی بلندی اور عظمت کے بارے میں آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے رہے لیکن جو فارسی داں نہیں تھے اُنھوں نے تقریر ختم ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب کو گھیر لیا اور درخواست کی کہ اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ لکھوا دیجئے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا ترجمہ لکھوایا :-

LIVE SO BEAUTIFULLY, THAT IF DEATH
IS THE END OF ALL,
GOD HIMSELF MAY BE PUT TO SHAME
FOR HAVING ENDED THY CAREER.

اس کے بعد "ایوانِ رفعت" کے ہال میں رقص و سرود کی محفل گرم ہوئی۔ ایک دُبلی پتلی پکّے رنگ کی لڑکی نے اپنے رقص کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے جس انداز سے رقص کیا ڈاکٹر صاحب اُس سے بالکل متأثر نہیں ہوئے۔ اس کے بعد گانا ہوا۔ اسی دوران میں اُنھوں نے ایک کاغذ طلب کیا اور اس پر فارسی میں ذیل کے تین شعر لکھ کر عطیہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ وہ اشعار یہ ہیں :-

تو ہم کہ مَی رانی ز دِرق بر سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر

برکشت و خیاباں پیچ بر کوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ بہ خود پیچید میرد بہ سحاب اندر

ایں صحوتِ دلآویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجورِ جہاں حورے نالد بہ رباب اندر

پھر ایک اور کاغذ لے کر اس پر ذیل کا مزاحیہ شعر لکھ دیا، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے اور اسے پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے وھُوَ ہٰذا :-

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیئے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں؟

اِن دونوں تحریروں پر ڈاکٹر صاحب کے دستخط موجود ہیں اور اس پر تاریخ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء درج ہے۔ پہلے اشعار کے آخر میں "در دولت کدۂ عطیہ بیگم" کے الفاظ بھی درج ہیں۔

جلسے سے پہلے اور بعد میں بہت دیر تک ڈاکٹر صاحب کی مختلف لوگوں سے دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب اس دن بیحد مسرور تھے۔ ممکن ہے ان کی مسرت وقتی ماحول کی رہینِ منت ہو۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ایسے ہی موقعوں پر اپنی بہترین صفات کے ساتھ جلوہ گر ہوا کرتے تھے۔

آج بھی جب کبھی مجھے اس دن کی یاد آجاتی ہے جسے میں اپنی زندگی کے بہترین دنوں میں شمار کرتا ہوں تو مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو باسویل یا ماہادیو دیسائی جیسا تذکرہ نویس نہیں ملا ورنہ جس طرح ڈاکٹر جانسن اور گاندھی کی ایک ایک بات محفوظ کر لی گئی ہے۔ اِسی طرح ڈاکٹر اقبال کی باتیں بھی قلمبند کر لی جاتیں اور ہمارا بہت بڑا قومی سرمایہ بنتیں۔

"ساحِل"

حامد علی خاں

ساقی نے سب کو محرمِ اسرار کر دیا

خود مست ہو تو ہو، ہمیں ہشیار کر دیا
راتوں کی نیند لے گئی وہ چشم نیم خواب
اِک بے خبر نے سب کو خبردار کر دیا
اپنے بکنے کی ہے یہ سزا چُپ ہُوں اِس لیئے
میری وفا نے اُس کو جفا کار کر دیا
یہ بیکسی کی حد ہے کہ اِک نامراد کو
پہچاننے سے تُو نے بھی انکار کر دیا
حامدؔ مری بلا کو ہو دنیا و دیں سے کام
اِس دل کو ہجر یار نے بیکار کر دیا

سراب

(نریش کمار شادؔ)

جب کبھی مجھ کو تیرا خیال آگیا
میرے چہرے کی ساری تھکن دُھل گئی
میرے دل میں خوشی کے کنول کھل گئے
میرے احساس میں چاندنی گُھل گئی
اَور پھر اِک مچلتے ہوئے جوش سے
چل پڑا مَیں تری جُستجو کے لئے
اپنی واماندہ آنکھوں کی محراب میں
کِتنی گُلرنگ شمعیں فروزاں کیئے
جانے کب تک ترے رنگِ رخسار کو
آرزؤں کے ناکوں میں بھرتا رہا
لے کے تخیل کے بازوؤں میں تجھے
گیت گاتا رہا، رقص کرتا رہا
یُونہی گاتے ہوئے رقص کرتے ہوئے
مَیں بھٹکتا رہا کتنے صحراؤں میں
رُوح میں تو اُمنگیں مہکتی رہیں
اَور کانٹے کھٹکتے رہے پاؤں میں
مُدتوں تک تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے
آ ہی پہنچا بالآخر میں تیرے قریں
آنکھ اُٹھا کر جو دیکھا تری شکل کو
مجھ کو ڈسنے لگا میرا خوابِ حسیں
کیا یہی وہ بھیانک خد و خال تھے
جو مرے عزم کو گدگداتے رہے
جن کی خاطر مرے نوجواں ولولے
زندگی بھر مصائب اُٹھاتے رہے

"چٹان"

ناول

(آل احمد سرور)

ناول اُس وقت وجود میں آیا، جب ادبیات میں ایک نمایاں پختگی اَور گہرائی آ چکی تھی۔ اَور سوسائٹی تہذیب کا ایک اچھا خاصا معیار حاصل کر چکی تھی۔ ناول نے براعظم یورپ اَور امریکہ میں ایک خاص اہمیت حاصل کی ہے۔ اَور فرانس، رُوس، جرمنی اَور ناروے کے بعض مصنفین نے ناول کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ خصوصاً رُوسی ناول نگاروں نے اُنیسویں صدی کے رُوس کی رُوح کو جس طرح بے نقاب کیا ہے اس کا جواب دوسرے ادبیات میں مشکل سے ملیگا۔ ناول ہمارے ادب میں انگریزی کے اثر سے آیا ہے۔

ناول، قصے کہانی سے مختلف ہے، قصے کہانیاں انسان کے ساتھ وجود میں آئے، ناول کا صحیح معنی میں آغاز اُسوقت ہوا

جب سماج نے ایک خاص منزل تک ترقی کرلی۔ ناول کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ تفریحی پہلو کے علاوہ بعض اور بڑے اثرات بھی یہاں کام کرتے رہے ہیں۔ پہلے مصنف اشخاصِ قصہ کو انگلی پکڑ کر چلاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اب جبر کی جگہ اختیار نے لے لی ہے۔ پہلے قصے میں ڈرامائی رنگ، واقعات، ہنگامہ، قتل و خون، شدید عشق اور شدید نفرت کے واقعات زیادہ ہوتے تھے۔ اچھے ناولوں میں یہ سب چیزیں اب بھی ملتی ہیں۔ مگر ناول کا رُخ عمل سے کردار کی طرف، ہنگامہ خیز واقعات سے زیادہ تفسیر و تشریح کی طرف اور ظاہر سے باطن کی طرف ہو گیا ہے۔ رُومانیت کی جگہ حقیقت نگاری نے لے لی ہے۔ واقعات کے بیان میں صحت، اصلیت اور وضاحت کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جزئیات کی مصوری میں گہرائی اور تفصیل سے کام لیا جاتا ہے۔

ناول کے فارم میں بڑی لچک اور گنجائش ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے خوب کام لیا ہے۔ اور ناول کو کہیں پروپیگنڈا اور کہیں ایک علمی تصنیف بنا دیا ہے۔ اس نے ذہن کو خیرہ کرنے اور خوابوں کے جزیرے بنانے یا تلخیوں کو گوارا کرنے پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ذہنی غذا فراہم کی ہے۔ خواب اور حقیقت کی کشمکش دکھائی ہے۔ اور ہر تلخی میں شیرینی اور ہر شیرینی میں تلخی دریافت کی ہے۔ یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہوا۔ اس میں تقریباً دو سو برس صرف ہوئے ہیں اور تقریباً اتنا ہی زمانہ اس کے لئے میدان صاف کرنے اور فضا ہموار کرنے میں گزرا ہے۔

اُردو میں ناول غدر کے بعد لکھے گئے ہیں۔ فنی حیثیت سے نذیر احمد کے ناول اُردو میں اوّلیت کے مستحق ہیں لیکن درا صل پہلے بڑے ناولسٹ سرشار ہیں۔ نذیر احمد، سرشار، شرر، رسوا، پریم چند اور راشد الخیری ان میں سے کوئی بھی انگریزی ناول سے اچھی طرح واقف نہیں۔ پریم چند کا مطالعہ بھی گہرا نہ تھا لیکن بعض مغربی ناول نگاروں سے وہ متأثر ضرور ہوئے تھے خصوصاً ٹالسٹائی سے، پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارا اُردو داں طبقہ ناول کے ارتقا، اُس کے نشیب و فراز اور موجودہ منزل سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔ جیسے رُومان کے لئے شہزادی، امیرزادی، بیگم یا طوائف موزوں تھی، اب کالج کی لڑکی یا مزدور یا مزدور کی بیٹی نے اس کی جگہ لے لی ہے۔

ہمارے ادب میں ایک تو گہرائی کی بڑی کمی ہے دوسرے توازن کی، پریم چند کے یہاں عشق بچوں کا سا ہے، اس میں وہ گھلاوٹ، لذت اور رس نہیں جو مرد عورت کے فطری میلانات کا نتیجہ ہے۔ اس پر رُوحانیت، تقدس اور ماورائیت کا سایہ ہے۔ فن اور فارم کا احساس اگرچہ دیر میں شروع ہوا ہے، مگر ملنے لگا ہے، یہ اچھی علامت ہے۔

ناول کا آرٹ تفصیل، وضاحت اور صراحت کا آرٹ ہے، افسانے کا آرٹ نازک اور لطیف اشارے کا آرٹ ہے۔ ناول میں ضبط اتنا ضروری نہیں، جتنا کہ گہرا اور شدید احساس، جمہوریت کے اُصول آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں اور انسان آج بھی اچھے اور بُرے خواب دیکھتا ہے۔ مگر اچھے خوابوں اور اچھے اُصولوں کے خلاف طاقتیں زیادہ منظم ہو گئی ہیں۔ یہ کشمکش، ناول، افسانے اور ڈرامے کا موضوع بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے خیال میں موجودہ انقلابی دور کی ہوشربا مشکلات کے باوجود ہمارے یہاں ناول کا مستقبل خاصا شاندار ہے۔

ناول میں آج بھی قصہ گوئی کا اُصول برتا جاتا ہے۔ مگر موجودہ ناول اس کے علاوہ ایک علمی و تہذیبی کارنامہ بھی ہے۔ ہر ناولسٹ ایک قصہ گو ہی نہیں، ایک معلّمِ حیات اور فلسفی ذہن بھی ہے۔

کیونکہ ہر ناول ایک ذہنی سفر، ایک حسیاتی تجربہ اور ایک جذباتی مرقع ہے۔ نثر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی بنا پر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ناولسٹ کی پیغمبری کا دور اب آیا ہے۔

ناول کے اصولوں کا مطالعہ مغرب کے ذہن اور جذبے کا مطالعہ ہے اور مشرق کے ذہن اور جذبے کو معیار اور قدریں دینے کا ذریعہ۔ اردو میں اچھے ناول کچھ زیادہ نہیں ہیں مگر ناول پر اچھی کتابیں تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ علی عباس حسینی نے ناول کی تاریخ و تنقید میں فن اور فارم پر مفید اشارے کئے ہیں مگر وہ بھی بہت تشنہ ہیں۔ (مجیب ارشاد کلانچوی)

تبرّکاتِ مخزن

دلِ پُر درد

(منقول از "مخزن"، مارچ ۱۹۰۳ء)

اِس مہینے مخزن کو ایک ناقابلِ برداشت صدمہ ہمارے ایک نہایت قابل اور ہونہار مضمون نگار مولوی عبدالرشید صاحب چشتی بی اے کے بے وقت اور افسوسناک انتقال سے پہنچا ہے۔ مرحوم کی صحت کچھ عرصہ سے بگڑی ہوئی تھی، اور عارضۂ اسہال قریب قریب دوامی ہو گیا تھا۔ بہتیرے علاج کئے گئے مگر مرض میں پیچیدگیاں بڑھتی گئیں، اور آخر ۶ مارچ ۱۹۰۳ء کو اِس جہانِ فانی کو خیرباد کہہ گئے۔ خدا انہیں غریقِ مغفرت کرے، اور اُن کے پسماندگاں کو اور بالخصوص اُن کے والد بزرگوار مولوی حامد علی صاحب چشتی کو جو لاہور کے ایک ذی علم خاندان کے رکنِ اعلیٰ ہیں صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ یقیناً وہ سب حضرات جو عبدالرشید صاحب کے بیش بہا تراجم، جو انہوں نے مکالے کی تقریروں اور بعض اور لکچروں کے کئے تھے، پڑھتے رہے ہیں۔ اِس اظہارِ رنج و ہمدردی میں ہمارے شریک ہوں گے کیونکہ مرحوم اُن چند ڈگری یافتہ نوجوانوں میں تھے جنکی انگریزی اور اُردو دونوں تحریریں مقبول ہوئی ہیں۔ اور جنہیں علومِ ادبیہ کا ایسا چسکا تھا کہ وہ اپنی عمر ان مشاغل میں وقف کرنے کا قصد رکھتے تھے۔ اُن کی خصوصیتوں میں ایک قابلِ قدر خصوصیت اُن کا دلِ پُر درد تھا۔ اور ہم آج اُن کو نہیں رُوتے، بلکہ ایک دلِ دردمند سے ایک دلِ پُر درد کا نوحہ لکھ رہے ہیں۔ مگر ہم کیا نوحہ لکھیں گے، مرحوم اپنا مرثیہ خود کہہ گئے ہیں۔ اور طُرفہ یہ کہ ہمیں آج تک معلوم نہ تھا کہ اُن کی طبعِ رسا شعر بھی موزوں کر لیتی ہے۔ نہ کبھی کہیں اُن کا کوئی شعر شائع ہوا۔ مگر اب اُن کے والد صاحب نے اُن کے کاغذات میں کچھ اشعار پائے ہیں۔ جو اُن کے آخری جذباتِ دل کی تصویر ہیں۔ اور جنہیں ہم اُمید کرتے ہیں، ایک خاص دلچسپی سے دیکھا جائے گا۔ کیونکہ وہ دل اب اُس پہلو میں نہیں دھڑکتا، اور وہ زبان جس سے یہ کلام نکلا ہے ہمیشہ کے لئے گویائی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکی ہے اور وہ ہاتھ جن کی مدد سے یہ الفاظ صفحۂ کاغذ پر اُترے تھے، ہمیشہ کے لئے آرام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید ۔۔۔ نویسندہ را نیست فردا اُمید

بس کُوچ کا آ گیا ہے پیغام ۔۔۔ پُر ہو چکا اپنی عُمر کا جام
دن عمر کا اپنی ڈھل چکا ہے ۔۔۔ کچھ کرنے کا وقت ٹل چکا ہے
لو کھیل ہوا تمام اپنا ۔۔۔ یہ آخری ہے سلام اپنا
رحلت کا ہے وقت آخرِ کار ۔۔۔ رخصت کا ہے وقت آخرِ کار

تھا ایک طلسم کا تماشائی میں ۔۔۔ اور ایک جنون کا تھا سودائی میں
یاں کی ہے شناخت ناشناسی گویا ۔۔۔ ہوں جتنے حواس بے حواسی گویا

کچکول

نہیں رازِ ہستی جتانے کے قابل
یہ پردہ نہیں ہے اُٹھانے کے قابل

زمانے نے ڈالا جُدائی کا پردہ
ہوئے جب وہ جلوہ دکھانے کے قابل

طلب سے مری مسکرا کر وہ بولے
ہوئے تم بھی ہم کو بُلانے کے قابل

ہوا مسئلہ عشق کا حل نہ اُن سے
ہوئے دم بخود یاں زمانے کے قابل

مرے زخمِ دل دیکھ کر یار بولا
کہ مجروح ہے رحم کھانے کے قابل

(ایڈیٹر) (میر مہدی مجروحؔ)

بِکے مفت ہم یاں زمانہ کے ہاتھوں
پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

(امانت رام) (حالی)

حالِ دل دیکھنا نہ ہو گر تو کبھی آ دیکھو
مرغِ بسمل کے تڑپنے کا تماشا دیکھو

دستِ گستاخ کو تھام آہ یہ اُن کا کہنا
ہم بھی پھر چھیڑا کریں گے تمہیں اچھا دیکھو

نذرِ اُلفت میں تم سمجھو تو کیا لگتا ہے
یُوں بُرا اپنا نہیں مفت میں اچھا دیکھو

سلطنت مے کے عوض نور جہاں کو دیدی
نشہ میں شاہِ جہانگیر کا سودا دیکھو

دو قدم گھر سے نکل کر نہ کیا استقبال
اور جہانگیر کا اس دور سے آنا دیکھو

(جہانگیر)

حسرتِ زار کو یارانِ وطن بھُول گئے
مرغِ پابند کو مُرغانِ چمن بھُول گئے

ہم نے تکلیفِ محبت میں وہ لذّت پائی
کہ طریقِ گلۂ رنج و محن بھُول گئے

خوبرُوئی تیری مشہور ہوئی عالم میں
لوگ افسانۂ عذرا و ومن بھُول گئے

نہ ملیں گے دلِ بیتاب کے اصرار پہ بھی
ہم بھی جا اب تجھے اے عہد شکن بھُول گئے

غلبۂ درد سے ہیں درد سرا پا اشعار
یعنی ہم پیروئ اہلِ سُخن بھُول گئے

کر دیا اُن کے تصوّر نے شبِ غم بیخود
کلفتِ کشمکشِ رنج و محن بھُول گئے

ایک ہمدردئ رُسوا تھی انہیں حسرتؔ
سو وہ رسوا بھی اُسے جا کے دکن بھُول گئے

(حسرت موہانی)

لبریز ہے حسرتوں سے میرا سینا
ہر روز مجھے خُونِ جگر ہے پینا
کرتا ہُوں دُعا کہ یا الٰہی اب تو
منظور نہیں ہے اِس طرح کا جینا

(دویا نرائن نگم)

مطبُوعات

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنی ضروری ہیں)

چاکِ گریباں - یہ آغا بابر بٹالوی کے آٹھ "خاکوں" اور افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آغا صاحب اُردو کے اُدبا میں اب تک بہت نام پیدا کر چکے ہیں۔ وہ اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کا سیر حاصل دماغ سرکاری ملازمت کی ادب کُش مصروفیتوں سے بھی مفلوج نہیں ہونے پاتا۔ وہ ابتدا میں بھی زندہ اور جوان تھے اور اب بھی اُسی طرح زندہ اور جوان ہیں۔ دنیاداری، زندگی سے اُن کی صحت مندانہ دلچسپیوں کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

آغا صاحب کا بہار آفریں قلم باد رفتار ہے۔ کثرتِ مشق سے اُن کی تحریر بہت پختہ ہو گئی ہے اور اُس میں جگہ جگہ بے تکلفانہ انداز میں لکھے ہوئے ایسے فقرے مل جاتے ہیں جن کی پختگی اور برجستگی اُن کی مشاقی کا پتا دیتی ہے۔ لیکن ایک بات کا ذکر ہم ضرور کرنا چاہتے ہیں۔ ابتدا سے اُنھوں نے غالباً یہ اُصول بنایا تھا کہ وہ اپنی اُردو کو پنجابی سے زیادہ بیگانہ نہیں رکھیں گے۔ اُنکے ہاں پنجابی الفاظ و محاورات بہت کثرت سے ملتے ہیں اور راقم اگرچہ اِس طریقے کے خلاف قلم اُٹھانے کی جرأت تو نہیں کر سکتا لیکن اس کی حمایت کا بھی فی الحال اپنے آپ کو اہل نہیں پاتا۔

ان افسانوں اور خاکوں میں جگہ جگہ ہمیں اپنی معاشرت کی ہُو بہُو صحیح تصویریں ملتی ہیں۔ آغا صاحب حقیقت نگار ہیں اور یہ خوشی کی بات ہے کہ اُنھوں نے اپنے قلم کو کسی قسم کے احتساب کا پابند نہیں بنایا۔ اُن کا دلکش انداز، ان گہرے ادبی خلوص اور لطیف مزاح کی چاشنی سے مرکب ہے۔ اُنھوں نے اپنے ماحول کو کھلی آنکھوں اور ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا ہے۔ گویا زندگی زندوں کی طرح بسر کی ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانے بھی زندگی کی طرح رواں دواں ہیں:

ذیل میں مثال کے طور پر آغا صاحب کی تحریروں کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں جن سے اُن کے مطالعۂ زندگی کی گہرائی اور اُن کے جذبات کے خلوص کا اندازہ ہو سکتا ہے

"دفتر میں بیسیوں لوگ تھے مگر سب سے مختلف طبیعت کے۔ بال بچوں والے بھی تھے، جنھیں ٹال سے سوکھی لکڑی نہ ملنے کی شکایت رہتی تھی اور جو اکثر سر جوڑ کر کہیں سے خالص گھی منگوانے کے جتن کیا کرتے تھے"

"(بیگم جان) بھی گانا سیکھنے آیا کرتی تھی۔ اس وقت اس کا آغازِ شباب تھا۔ وہ ایک سال میں اس کی آواز نکھر گئی اور اُس نے وہ رنگ روپ نکالا، کہ چلتے راہ گیر گم سم ہو جاتے اور کہتے خدا جانے یہ بجلی کہاں گرے گی۔ بس ایک بلا تھی۔ فتنۂ جہاں آشوب، آسمان کے تارے توڑتی۔ ریشم و پرنیاں میں لپٹا ہوا شعلۂ جوالہ چہرے کے وہ حسین نقوش اب اِس عمر میں بھی نہیں مٹے۔ رات دیکھا ہو گا آپ نے اُس کی خواب آلودہ آنکھوں میں ابھی تک لہر بہر ہے"

یہ مجموعہ مکتبۂ جدید لاہور نے شائع کیا ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۲۲۰ صفحات۔ کاغذ کتابت طباعت اور جلد وغیرہ نفیس ہے۔ قیمت سے ۳ روپے

م م

فہرستِ مضامین

"مخزن"

(دَورِ سوم)

جلدِ اوّل از ماہِ جنوری ۱۹۴۹ء تا ماہِ جون ۱۹۴۹ء

ماہ	نمبر	صاحبِ مضمون	مضمون	صفحہ
جنوری	۱	مدیر،	صفحۂ اوّل،	۲
	۲	شیخ عبدالقادر بالقابہ،	مخزن کے دَورِ سوم کا آغاز،	۳
	۳	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم،	زندگی،	۹
	۴	پنڈت برجموہن دتاتریا کیفی دہلوی،	سیاسی انقلاب اور مخزن کی حیاتِ نو،	۱۰
	۵	میر غلام بھیک نیرنگ،	مخزن کا خیر مقدم،	۱۴
	۶	حامد علی خاں،	سر سید احمد خاںؒ کے چند نادر خطوط،	۱۶
	۷	جناب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی،	حالی کا غیر مطبوعہ کلام،	۲۳
	۸	پروفیسر حمید احمد خاں،	غالب کی شخصیت،	۲۴
	۹	اثر صہبائی،	قطعات،	۲۹
	۱۰	امین الرحمٰن،	زینت مر چکی ہے،	۳۰
	۱۱	مقبول احمد پوری،	پردہ،	۳۷
	۱۲	محمد حسن عسکری،	ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ،	۳۸
	۱۳	بھٹی،	تلاش،	۴۳
	۱۴	ڈاکٹر محمد باقر،	ڈاکٹر گریہم بیلی،	۴۴
	۱۵	حامد علی خاں،	غزل،	۵۲
	۱۶	حامد علی خاں،	ایک برشکالی رات،	۵۳
	۱۷	مدیر،	منشورات،	۵۶
	۱۸	مدیر،	مخزن المخازن،	۶۰

	۱۹	قارئین،	ایڈیٹر کے نام،	۷۱
فروری	۲۰	مدیر،	صفحۂ اوّل،	۷۴
	۲۱	حامد علی خاں،	احیائے اسلام میں حالی کا حصہ،	۷۵
	۲۲	پنڈت برجموہن دتاتریا کیفی دہلوی،	سکون کا ایک لمحہ،	۸۰
	۲۳	امین الرحمٰن،	آرٹ میں تاثریت کی تحریک،	۸۲
	۲۴	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	دل بر کیفی تو ــــــ	۸۸
	۲۵	شبیر محمد اختر،	دیومالا کا نفسیاتی پس منظر،	۸۹
	۲۶	خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی،	تجلیات،	۹۳
	۲۷	محمد حسن عسکری،	بودلیئر،	۹۴
	۲۸	عبدالمجید بھٹی،	دل نہیں بہلے رہے،	۱۰۰
	۲۹	علی ناصر زیدی،	چاند کی سیر،	۱۰۱
	۳۰	سید نذیر حسین ناشاد،	آمدِ بہار،	۱۰۵
	۳۱	ڈاکٹر عاشق حسین،	بیمہ ایجنٹ،	۱۰۶
	۳۲	جلیل حسین جلیل،	شہکار،	۱۱۷
	۳۳	یوسف ظفر،	غزل،	۱۱۸
	۳۴	حامد علی خاں،	مسٹر منمز اور اُن کے پھپھیرے بھائی،	۱۱۹
	۳۵	حالی،	مرزا غالب کے نام خط،	۱۲۷
	۳۶	حامد علی خاں،	منشورات،	۱۲۸
	۳۷	مدیر،	مخزن المخازن،	۱۳۱
	۳۸	قارئین،	ایڈیٹر کے نام،	۱۴۳
مارچ	۳۹	مدیر،	صفحۂ اوّل،	۱۴۶
	۴۰	پروفیسر حمید احمد خاں،	راوی کے کنارے،	۱۴۷
	۴۱	اثر صہبائی،	سرودِ نو،	۱۵۲
	۴۲	امین الرحمٰن،	تحریکِ تاثریت کے متقدمین،	۱۵۳
	۴۳	پروفیسر آغا صادق،	ترانۂ اردو،	۱۶۱
	۴۴	ڈاکٹر محمد باقر،	سر ڈینیسن راس،	۱۶۲
	۴۵	پنڈت لبھورام جوش ملسیانی،	غزل،	۱۷۰
	۴۶	عارف عبدالمتین،	غزل،	۱۷۱
	۴۷	حسین اعظمی،	گزشتہ اجلاس کی کارروائی،	۱۷۲
	۴۸	قیوم نظر،	یاد،	۱۷۶
	۴۹	عبدالمجید بھٹی،	میں نے تجھے پایا،	۱۷۷
	۵۰	کیپٹن ضمیر جعفری،	غزل،	۱۷۷
	۵۱	ونگ کمانڈر سید فیاض محمود،	"یارب وہ نہ سمجھے ہیں ......"،	۱۷۸
	۵۲	محمد خلیل الرحمٰن،	فکر و نظر،	۱۸۳

	۵۳	شیر محمد اختر،	حقیقت نگاری اور احساسِ حقیقت،	۱۸۵
	۵۴	مقبول حسین احمد پوری،	گیت،	۱۸۸
	۵۵	الطاف پروانہ،	غزل،	۱۸۸
	۵۶	انور جلال،	ریل میں گفتگو،	۱۸۹
	۵۷	محمد رشید الدین،	رشوت،	۱۹۳
	۵۸	نذر محمد انور طور،	مدیر اعزازی کے حضور میں،	۱۹۶
	۵۹	مدیر،	منشورات،	۱۹۸
	۶۰	مدیر،	مخزن المخازن،	۲۰۲
	۶۱	قارئین،	ایڈیٹر کے نام،	۲۱۵
اپریل	۶۲	مدیر،	صفحۂ اوّل،	۲۱۸
	۶۳	مدیر اعزازی،	طلوعِ اقبال،	۲۱۹
	۶۴	علامہ اقبالؒ،	عبدالقادر کے نام،	۲۲۲
	۶۵	آنریبل پنڈت جواہر لال نہرو،	قومی زبان کا مسئلہ،	۲۲۳
	۶۶	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم،	عہدِ نو،	۲۲۷
	۶۷	نذیر مومن،	اقبال کی شاعری کا نفسیاتی پس منظر،	۲۲۸
	۶۸	تابش دہلوی،	خلدِ ارضی،	۲۳۳
	۶۹	طالوت،	زباں دانی،	۲۳۴
	۷۰	حکیم خورشید حسن خورشید سہارنپوری،	کشمیر،	۲۴۲
	۷۱	جلیل حسین جلیل،	دعوتِ کشمیر،	۲۴۳
	۷۲	مظفر علی سید،	کلاسیکی ادب اور ہم،	۲۴۵
	۷۳	جگن ناتھ آزاد،	بہارِ آزادی،	۲۵۲
	۷۴	صادق قریشی،	جلال پور کا چودھری،	۲۵۳
	۷۵	حقیقت نورانی،	ہندوستان اور اردو،	۲۶۰
	۷۶	حسن طاہر،	شاعر،	۲۶۰
	۷۷	انور جلال،	ایک جینیس کی ڈائری،	۲۶۱
	۷۸	امین الرحمٰن،	اے بہار تو ایک خط ہے ......،	۲۶۹
	۷۹	اثر صہبائی،	کتنی حسیں ہے کائنات،	۲۷۰
	۸۰	اختر جہاں فیروز الدین،	بہار ایک رنگین قہقہہ،	۲۷۱
	۸۱	مدیر،	منشورات،	۲۷۲
	۸۲	مدیر،	مخزن المخازن،	۲۷۳
	۸۳	قارئین،	ایڈیٹر کے نام،	۲۸۶
	۸۴	معاصرین،	مخزن معاصرین کی نظر میں،	۲۸۷
مئی	۸۵	مدیر،	صفحۂ اوّل،	۲۹۰
	۸۶	سید عابد علی	حروفِ تہجی کی غنائی اہمیت،	۲۹۱

۸۷	یوسف ظفر،	جائزہ،	۳۰۰	
۸۸	اثر صہبائی،	غزل،	۳۰۳	
۸۹	عبدالمجید بھٹی،	جاگ، محبت جاگ!	۳۰۴	
۹۰	امین الرحمٰن،	تاثریت کا جمالیاتی پہلو،	۳۰۵	
۹۱	نازش رضوی،	غزل،	۳۱۳	
۹۲	عسکری،	احمد علی کا ایک ناول،	۳۱۴	
۹۳	قیوم نظر،	رات بھر،	۳۲۳	
۹۴	ابنِ حسن زیدی،	معقول شکاری،	۳۲۵	
۹۵	عبدالمجید حیرت،	غزل،	۳۳۴	
۹۶	باقی صدیقی از سہام،	غزل،	۳۳۴	
۹۷	انور جلال،	یوں بھی ہوتا ہے،	۳۳۵	
۹۸	جیمنی سرشار،	گناہِ محبت،	۳۴۰	
۹۹	مدیر،	مخزن المخازن،	۳۴۱	
۱۰۰	قارئین،	ایڈیٹر کے نام،	۳۵۷	
۱۰۱	معاصرین،	مخزن معاصرین کی نظر میں،	۳۵۹	
۱۰۲	" م "	مطبوعات،	۳۶۰	
۱۰۳	مدیر،	صفحۂ اوّل،	۳۶۲	جون
۱۰۴	محمد حسن عسکری،	سودرریلزم،	۳۶۳	
۱۰۵	منشی تلوک چند صاحب محروم	غزل،	۳۷۱	
۱۰۶	جلیل حسین جلیل،	چاندنی رات میں دریائے چناب کے کنارے،	۳۷۲	
۱۰۷	جیلانی،	۱۹۴۷ء	۳۷۵	
۱۰۸	خادم ہوشیارپوری،	مادرِ ہندوستان کے نام،	۳۹۳	
۱۰۹	قادر فریدی،	نذیرِ آزاد،	۳۹۵	
۱۱۰	ابنِ حسن زیدی،	قربانی،	۳۹۶	
۱۱۱	خلیفہ عبدالحکیم	خدا اور خداسری۔	۴۰۴	
۱۱۲	جلال الدین اکبر	غزل،	۴۰۵	
۱۱۳	امین الرحمٰن،	پرستانی کہانیاں،	۴۰۶	
۱۱۴	اثر صہبائی،	تجلیات،	۴۱۱	
۱۱۵	سلیم واحد سلیم	غزل،	۴۱۲	
۱۱۶	نشتر جالندھری،	اصلاحِ زباں،	۴۱۳	
۱۱۷	سید نذیر حسین ناشاد،	کراچی،	۴۱۵	
۱۱۸	سید آغا حسین،	شکاری جانوروں کا شوق،	۴۱۷	
۱۱۹	مدیر،	مخزن المخازن،	۴۲۱	
۱۲۰	" م "	مطبوعات،	۴۲۷	

(عبدالمجید نظامی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے امرت الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "مخزن" مال روڈ لاہور سے شائع کیا)

[redacted]

جلد ۲ نمبر ۱

مخزن

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور۔ جولائی سنہ ۱۹۴۹ء

سلسلۂ مطبوعات نوائے وقت

سالانہ:۔ سات روپے

ششماہی:۔ چار روپے

ایک پرچہ:۔ دس آنے

The "Makhzan" Lahore

مدیر، صفحۂ اوّل، ۱

پروفیسر انور رومان، پاکستانی ادب ......، ۳

مسعود اشعر / جگن ناتھ آزاد / مقبول احمد پوری — نظم، غزل اور گیت، ۲۱

امین الرحمٰن، بہار کی ایک صبح (ڈراما)، ۲۴

محمد خلیل الرحمٰن، جذب، ۳۶

کیپٹن خیرالدین احمد صدیقی، سیلی (افسانہ)، ۳۷

محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی / طفیل ہوشیارپوری — دو غزلیں، ۵۱

ڈاکٹر گیان چند ایم اے ڈی فل، بوستانِ خیال کی تاریخ، ۵۲

ظفر اقبال حشر، غزل، ۵۶

مدیر، مخزن المخازن، ۵۷

ساقی (کراچی) فسادات کے افسانوں کا پروپیگنڈائی پہلو، ۵۷

ایشیا (بمبئی)، ایک ترقی پسند غزل اور نظم، ۶۲

ماہِ نو (کراچی)، مشرقی پاکستان میں اردو، ۶۲

روحِ ادب (کراچی) چناروں کی چھاؤں میں، ۶۵

ہمایوں (لاہور) قائد اعظم سے ملاقات، ۶۶

" " غزل، ۶۸

معارف (اعظم گڑھ)، ہندوستان اور مسلمان، ۶۹

فردوس (کراچی)، نشاطِ گریۂ آب، ۷۱

تبرکاتِ مخزن، تصویرِ یار، ۷۱ + تبصرہ ۷۲

صفحۂ اوّل

"مخزن" کی دوسری جلد کا پہلا پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جلد اوّل کے چند مکمل، خوبصورت مجلد نسخے ہمارے پاس محفوظ ہیں، جنہیں شائقین حسبِ ضرورت خرید سکتے ہیں۔

بعض مضمون نگار اور شاعر حضرات اپنا کلام بھیجنے سے قبل "مدیرِ مخزن" سے اجازت طلب فرماتے ہیں۔ یہ تکلفات قطعاً غیر ضروری ہیں اور ان سے بجز تضیعِ اوقات کے کچھ حاصل نہیں۔ "مخزن" کی طرف سے اچھے مضامین کی اشاعت پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ عام خیال کے برعکس مضمون نگار، افسانہ نویس یا شاعر کا مشہور ہونا بھی مضامین کی اشاعت کے لئے کوئی شرط نہیں۔ مخزن میں صرف مشہور لوگوں کے مضمون شائع نہیں ہوتے، ہر اچھے مضمون کے لئے اس کے صفحات کھلے ہیں۔ ع گیر و دار حاجب و درباں دریں دربار نیست۔

جو لوگ مشہور ہیں وہ اچھا لکھنے سے مشہور ہوئے ہیں۔ جو لوگ مشہور نہیں ہیں، وہ اچھا لکھنے سے مشہور ہو جائیں گے۔

اپنے مضمون نگاروں سے ہمیں صرف ایک درخواست کرنی ہے اور وہ یہ کہ مضمون لکھتے ہوئے وہ اس بات کو ضرور ملحوظِ خاطر رکھیں کہ "مخزن" ایک ماہوار رسالہ ہے جس کی ضخامت محدود ہے اور جس کا نظامِ ترتیب اِس بات کا متقاضی ہے کہ وہ ہر مہینے متنوع موضوعات پر چند ایسے مضامین شائع کرے جو حتی الامکان بجائے خود مکمل ہوں۔ طویل تحریریں دوسرے مضامین کی جگہ لیکر ہماری ترتیب کو غیر متوازن کر دیتی ہیں اور قسط وار مضامین سے اِس ماہوار پرچے کی انفرادی اشاعتوں میں ایک ایسی ناتمامی کا سا احساس پیدا ہو سکتا ہے جو زیادہ مقبول نہیں۔ بہتر ہے کہ ہمارے معاونین ایسا جامع و مانع اندازِ تحریر اختیار کریں کہ مفصل ترین موضوعات سے بھی وہ زیادہ سے زیادہ دس بارہ صفحوں میں عہدہ برآ ہو جائیں۔ عام مضامین کے لئے چھ سات یا اس سے کچھ کم و بیش صفحات کافی ہونے چاہئیں۔

ہمارے نوجوان دوست پروفیسر انور رومان نے اِس دفعہ ایک ضروری موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ انور رومان صاحب جدید اُدباء کے بہت مدّاح معلوم ہوتے ہیں۔ اور غالباً بلا امتیاز وہ ہر نئے ادیب کو "ترقی پسند" کا نام دیتے ہیں۔ شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ نام اب ادیبوں کی ایک خاص جماعت نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ انور رومان صاحب نے غالباً اسی ناواقفیت کی وجہ سے بعض ایسے لوگوں کا نام بھی "ترقی پسندوں" میں لکھ دیا ہے جو "ترقی پسندوں" کے نزدیک شاید "تنزّل پسند" ہیں۔ قدیم و جدید ادب کے مقابلے میں کہیں کہیں رومان صاحب کی جدت پرستی نے اچھی خاصی ناانصافی کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ترقی پسندوں سے پہلے اُردو کے تنقیدی سرمایہ میں "شعر العجم" پہلی اور آخری تحقیق تھی۔ ایک اور جگہ اُنہوں نے لکھا ہے کہ ترقی پسندی سے پہلے اُردو نثر بالکل تہی مایہ تھی۔ جدید اُدباء کی حمایت کے ساتھ رومان صاحب کے دل میں پنجاب اور پنجابیوں کی پُرجوش محبت بھی موجود ہے جو قطعاً قابلِ ملامت نہیں ہو سکتی، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس سلسلے میں اُنہوں نے دوسرے لوگوں سے صریح ناانصافی کی ہے۔ اِن جزوی اختلافات کے باوجود ہمارے دل میں اپنے نوجوان دوست کی محنت اور تحقیق و تدقیق کی بہت قدر ہے اور جب ہم انور رومان صاحب کے دل میں پاکستان کی محبت اور پاکستانی ادب کے مقتضیات کے متعلق اُن کے صالح خیالات دیکھتے ہیں تو اِس قدر و منزلت میں دوچند اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اُن کا یہ مضمون اپنی تفاصیل کے باوجود دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

مدیر

مخزن

پاکستانی ادب

اس کا ماضیٔ قریب اور اس کی ذمہ داریاں

(پروفیسر انور رومان)

میرے اِس مقالے کے نظریات مختصراً یہ ہیں:-

۱- ترقی پسند تحریک اُردو زبان کی بلاشک وشبہہ نہایت اہم، بسیط اور مؤثر تحریک ہے اور بعض بلند پایہ اُدبا کے ساتھ ساتھ اس نے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے انشاپرداز بھی پیدا کئے ہیں لیکن اس میں چند خامیاں ہیں۔

۲ ہمارا موجودہ ادب پاکستانی ادب نہیں ہے۔ پاکستان کے قیام کی وجہ سے بہت سے نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں اور بہت سے نئے موضوعات پر لکھنے کی ضرورت ہے اور اسے ایک شعوری، ارادی اور باقاعدہ تحریک ہونا چاہیئے

۳- پاکستانی ادب کی تخلیق کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اُردو زبان کے بعید و قریب ادب کے اچھے اور مفید پہلوؤں کو اپنے میں جذب کر سکے ....

یہاں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ میں کسی کا مخالف نہیں ہوں لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ پاکستان کو زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا حق ہے اور یہ حق اس نے لاکھوں انسانوں کی مالی و جانی قربانی سے جیتا ہے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اس جائز ترقی کو روک سکے۔ (ا۔ ر)

۱- پاکستانی ادب کا ماضیٔ قریب

قوموں کی زندگی میں سب سے بڑا حادثہ غلامی ہے۔ غلام قوم کی زندگی کی ٹریجیڈی یہ ہے کہ وہ زندہ ہوتے ہوئے زندہ نہیں ہوتی۔ اُس کے افراد، اُس کے ارادے اور اُس کی معاشرت غرضکہ اُسکی انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر شعبہ صرف سانس لیتا ہے لیکن زندہ نہیں ہوتا۔ حاکم و غاصب قوم سب سے بڑا اجتماعی ظلم اُس وقت کرتی

ہے جب وہ محکوم قوم کی قوتِ امتیاز کو مسخ کر ڈالتی ہے۔ اس کی تاریخ، اس کے ادب اور اس کی سیاست پر ایسی کڑی پابندیاں لگا دیتی ہے کہ اس کے ذہن کی بنیادیں اور اس کی تہذیب کے اساسی نظریات کھوکھلے ہو جاتے ہیں اور ایک کامل ذہنی خلا پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۷۰۷ء (اورنگ زیب کی وفات) سے ۱۸۵۷ء تک یعنی ڈیڑھ سو سال کا زمانہ ہماری تاریخ کا وہ تاریک اور بنجر زمانہ ہے جب حالات کی برق رفتاری کے مقابلے پر ہمارے یہاں روحانی اور الہامی قیادت کا فقدان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ریت کے وہ مقام سوتے خشک ہو گئے تھے، جنہوں نے اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب پیدا کئے۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے طالب علم کی آنکھیں بیرم خان، ابوالفضل، علامہ سعد اللہ خان وغیرہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاتی ہیں لیکن اس ڈیڑھ سو سال میں، اتنے لمبے عرصے تک اسے صرف سامنے ملتے ہیں اور دوسری طرف کلائیو، ہیسٹنگز، ولزلی، ڈلہوزی وغیرہ نظر آتے ہیں، جو پلاسی، بکسر اور میسور ہوتے ہوئے بہادر شاہ ظفر کو رنگون بھیجتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ڈیڑھ سو سال ہمارے ڈوبنے اور انگریزوں کے ابھرنے کا وقت ہے لیکن ہندوستانی اسلامیت میں دبی دبی، تھکی تھکی، ہلکی ہلکی سی لہریں موجود ضرور تھیں ......

۱۸۵۷ء کا غدر (جو محض اس لئے غدر ہے کہ وہ ناکام رہا ورنہ وہ جنگِ آزادی تھا) وہ وقت ہے جب ہماری ہر قدیم چیز کی آزمائش ہوئی، اسے تولا گیا اور اس کی جزوی قوت کے باوجود اسے شکست ہو گئی۔ اس "غدر" کی ناکامی کا یہ اثر ہوا کہ قدیم تہذیب شکست کھا کر کہیں دبک گئی اور نئی تعمیر کے مواقع مسدود ہو گئے۔ آہستہ آہستہ ہمارے رگ و پے میں چند ان تھک ہستیوں کی وجہ سے زندگی کی حرکت عود کر آئی اور ہم ۱۹۰۵ء، ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۸ء، ۱۹۳۰ء، ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء سے ہوتے ہوتے یہاں پہنچے جہاں ہم آج ہیں۔

اس دورِ غلامی کے آخر میں مسلمانوں میں علامہ اقبالؒ اور ہندوؤں میں ٹیگور پیدا ہوئے۔ یہ دونوں ادیب اپنی اپنی مختلف قومی روایات کی پیداوار تھے اور ان دونوں میں وہی فرق تھا جو ہندو اور مسلمان میں۔

ٹیگور چونکہ صرف بنگالی اور انگریزی میں لکھتے تھے اس لئے اردو پر ان کا اثر بہت کم پڑا، اگرچہ ان کے ترجمے نہایت شوق سے لکھے اور پڑھے گئے اور ترقی پسند دور سے پہلے بعض نوجوان رومانوی فنکاروں پر بھی ان کی شعریت کا اثر ہوا لیکن علامہ اقبالؒ فارسی اور انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی لکھتے تھے اس لئے اردو زبان پر ان کا براہِ راست اثر پڑا۔

وہ ایک فکر پسند، عمیق النظر اور حقیقت جو انسان تھے اس لئے محض شاعری سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو عموماً اور ہندی مسلمانوں کو خصوصاً گرتے ہوئے اور مرتے ہوئے دیکھا۔ وہ کیوں شکست کھا گئے تھے؟ وہ کیوں گر رہے تھے؟ یہ تھے وہ ابتدائی سوالات جو علامہ اقبال کے ذہنی اضطراب کا باعث بنے۔

انہوں نے ابتدائی اسلامی تاریخ پر نظر دوڑائی۔ یہاں کا منظر بالکل ہی مختلف تھا۔ یہاں مٹھی بھر مسلمان جرار لشکروں کو تتر بتر کر رہے تھے اور اپنے فلسفہ و تحقیق سے انسانی ذہن کو گرما رہے تھے۔ یہ ایک عجیب تضاد تھا۔ یعنی یا تو وہ اتنی قلیل تعداد اور دنیا کی فاتح اور تہذیب کی خالق اور یا یہ تعدادِ کثیر اور سب کی سب غلام اور جامد؟ یہ تضاد کیوں تھا؟

دن رات کے ان تھک مطالعہ، مشاہدے اور غور و فکر سے اُنہوں نے اِن سوالات کو حل کر لیا۔ مسلمان اس لئے گر رہے تھے کہ وہ اصلی صحت مند اسلام کے امین نہیں رہے تھے اور تضاد اِس لئے تھا کہ غیر اِسلامی تصوّف کے نظریات مسلمانوں پر چھا گئے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اسلام کے حیات پرور نظریات کی توضیح و تبلیغ کے لئے فلسفۂ خودی مرتب کیا۔

وہ دولت مند لوگوں سے نو اُمید تھے لیکن عام مسلمانوں میں اس انقلابی چنگاری کو دیکھ رہے تھے جو زندگی نیز ... ریوں کو بھسم کر سکتی تھی۔ اِس لئے اُن کا مخاطب شروع سے آخر تک فرد یعنی عام مسلمان تھا۔ لیکن ان کا ذریعۂ اظہار تھا ایسی شاعری جسے سمجھنے کے لئے وسیع علم و نظر کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو اِس عظیم ترین ہستی کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کی ضرورت تھی لیکن پیشتر اس کے کہ یہ ہو سکتا اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک پیدا ہوئی ــــ جو ان تھک، جاذب اور سلیس تھی۔ چونکہ اس تحریک کا اثر ہمارے ادب پر بہت گہرا ہے۔ اس لئے میں اس کے چند پہلوؤں پر بہ تفصیل غور کروں گا لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ علامہ اقبال ہماری گزشتہ اجتماعی زندگی کے غلط اُصولوں کو ختم کر کے بہتر اور اصل ماضی کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے مستقبل کو اُن کے ماضی کا ارتقا سمجھتے ہوئے، اور وقت کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے یورپ کے سیاسی معاشری و معاشی نظریات کے نقاد تھے۔ وہ شاعرِ مستقبل تھے اور تخریب کو تعمیر کا آلہ سمجھتے تھے لیکن اس کے برعکس ترقی پسند تحریک عموماً ماضی (اصلی ہو یا نقلی) کے خلاف تھی، یہ ہنگامی، ہجرانی اور جوشیلی تھی اور زیادہ تر سلبی دکھائی دیتی تھی لیکن یہ تحریک، تحریکِ پاکستان کی طرح اقبالیت کو سمجھنے کے لئے ضروری تھی۔ اس نے اُردو زبان کو سلیس، عوامی اور وقت کے مطابق بنایا ہے، تخریب پر زیادہ زور دیکر اقبالیت کی مدد کی ہے اور تعمیر کو پس پشت ڈال کر اقبالیت کو وقت کا اہم ترین تقاضا بنا دیا ہے۔

ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک کے متعلق پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دلی یا لکھنؤ یا حیدر آباد وغیرہ کے خلاف اس کا مرکز لاہور (پنجاب) کیوں بنا ہے؟ اس سوال کو حل کرنے سے پیشتر یہ اضافہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر ادبی تحریک کے لئے تخلیقی عنصر کے علاوہ ساز گار فضا کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے مقامات کی قید نہیں ہے بلکہ جہاں کہیں بھی یہ دو اجزا اکھٹے ہو جائیں گے تحریک پھلے پھولے گی۔ اِس معیار کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اُردو زبان کے قدیم مراکز پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ وہاں یہ فضا میسر نہ تھی۔ دلی اپنی لسانی اہمیت کھو چکی تھی اور اس کی اہمیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ یہ برطانوی سامراج کا پُر جلال مرکز تھی۔ لکھنؤ بھی مدتوں سے سویا پڑا تھا۔ حیدر آباد میں اُردو سرکاری و تعلیمی زبان ضرور تھی لیکن اس کے مقابلے میں دوسری باشعور زبانیں موجود تھیں اور پھر چونکہ اس کے علمبردار مسلمان حکّام تھے اِس لئے اس کا عوامی بننا مشکل تھا..... لکھنؤ اور دلی اُردو کے قدیم مرکز ہونے کی وجہ سے اپنی فرسودہ لیکن پُر قوت مقامی روایات کی گرفت میں تھے اور روایت بعض حالات میں اُس جدت پرستی کی دشمن ہے جو تہذیب کو رواں دواں رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ لکھنؤ اور دلی لسانی اعتبار سے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار بھی تھے اِس لئے اس نئی تحریک کا مرکز یُوپی نہ بنا اگرچہ وہاں باغی اجزا موجود تھے جو اس تحریک کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوئے۔

اس کے برعکس لاہور (پنجاب) میں فضا زیادہ ساز گار تھی:۔

لاہور، دلی یا لکھنؤ یا حیدر آباد ہی کی طرح تعلیم کا مرکز تھا اس لئے یورپ کے جدید ترین نفسیاتی وادبی ومعاشی نظریات کی درسگاہ تھا۔ لاہور میں نہ کوئی لسانی کشمکش تھی اور نہ روایتی پرخاش، اس لئے ہر تخلیق کے لئے چمکنے کا موقع تھا۔ روایت پرست دلی اور لکھنؤ نئی ادبی راہوں کو دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے تھے۔ لیکن لاہور ادبی لحاظ سے جوان تھا اور تجربات سے خائف نہ تھا اس لئے وہ لکھنؤ اور دلی کی زبان سے کر اور یورپ کے جدید ترین ادب کا مطالعہ کرکے اسے اُردو کا جامہ پہنا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں برِ عظیم کے بعض دوسرے صوبوں کے خلاف پنجاب کی اپنی مقامی زبان کچھ زیادہ طاقت ور نہ تھی۔ انتہائی مشرقی پنجاب پر دلی کا اثر تھا۔ انتہائی مغربی پنجاب کی پنجابی مختلف تھی، جنوبی پنجاب میں ملتانی کا دور دورہ تھا اور وسطی پنجاب کی پنجابی پھر مختلف تھی اور بحیثیت مجموعی پنجابی بگڑی ہوئی ہندی معلوم ہوتی تھی اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی زبان، زبان کی حیثیت سے موجود ہی نہ تھی، لہٰذا اُردو زبان کو یہاں قدم جمانے کے لئے کچھ زیادہ مشکلات کا سامنا نہ تھا۔ لیکن لاہور کی یہ مرکزی شان محض اسی تحریک سے شروع نہیں ہوئی بلکہ بیسویں صدی کے شروع سے لاہور اُردو کا مرکز رہا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد کی شخصیت لاہور کے لئے ایک لسانی ہنگامے کا پیش خیمہ تھی۔ "پیسہ اخبار" یہیں سے نکلا تھا۔ پھر اس صدی کی ابتدا میں سر عبدالقادر کا "مخزن" منصۂ شہود پر آیا۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور "زمیندار"، "ہمایوں"، سالک، مہر، تاجور، حفیظ وغیرہ اس نئے لسانی مرکز کی نشان دہی کر چکے تھے بلکہ اسے قائم کر چکے تھے۔ اس کے برعکس لکھنؤ اور دلی میں نہ ادبی شخصیتوں کا ایسا علی الترتیب ظہور ہوا اور نہ ایسی صحافتی دنیا میسر آئی۔

پرانے ادب سے بغاوت بھی ترقی پسند تحریک کو وراثت میں ملی۔ علامہ اقبال نے اپنی ہمہ گیر شخصیت سے غزل کا رُخ موڑ دیا تھا۔ اُن کے ہاں غزل اس عامیانہ نا و نوش اور ہاؤ ہو کا آلہ نہیں رہی تھی جو دلی اور لکھنؤ کا خاصہ بن گئی تھی بلکہ اُن کے فلسفۂ حیات کا ذریعۂ اظہار بن گئی تھی۔ اُن کی مقبولیت کی وجہ سے غزل ایسے مرتبہ پر چلی گئی تھی کہ مبتدی اور نوجوان فن کاروں کے لئے اس سے آگے جانا مشکل نظر آتا تھا، اس لئے اس تحریک کو ایک نیا پیرایہ یعنی آزاد نظم اختیار کرنا پڑی لیکن اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی صرف یہی ایک وجہ تھی۔

لاہور کی اہمیت کا ایک سبب یہ تھا کہ شمال مغربی ہندوستان سارے ہندوستان کا فوجی لحاظ سے اہم ترین حصہ تھا، اور یہیں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مسلمانوں کے لیڈر عموماً اقلیتی صوبوں میں پیدا ہوتے تھے کیونکہ اقلیتی صوبوں میں ہندو اکثریت کو جس طرح محسوس کیا جا سکتا تھا ایسا اکثریتی علاقوں میں ممکن نہ تھا۔ بہر حال ان لیڈروں کی توجہ شمال مغربی ہندوستان پر زیادہ تھی اور تحریکِ پاکستان کے بعد تو ان علاقوں پر اور بھی زیادہ توجہ دی گئی تھی اور شمال مغربی ہندوستان میں لاہور ہی سب سے بڑا علمی و ادبی مرکز تھا اس لئے یہاں بیٹھ کر سارے شمال مغربی ہندوستان کو ہلایا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ پنجاب اور یو۔پی کے معاشی نظام میں بھی بہت فرق تھا۔ یو۔پی میں عموماً دو طبقے تھے یعنی تعلقہ دار اور مزارعین — ایک کار فرما اور دوسرا کارکن، ایک انتہائی امیر اور دوسرا انتہائی غریب۔ لیکن پنجاب میں متوسط طبقہ موجود تھا اور اس درمیانی طبقے کی موجودگی

قومی احساس اور ملّی بیداری کے لئے بہت مفید کام ادبی نشاۃ الثانیہ کی آماجگاہ تھی۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ پنجاب کے باشندوں کی افتادِ طبع بھی اس کے لئے بہت سازگار تھی۔ پنجابی فطرتاً جوشیلا ہے اور وہ ہر کام جوش میں یہ کر کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بعض اوقات ذہنی اعتدال کھو دیتا ہے لیکن وہ اپنی شرکت سے ہر تحریک میں جوش و خروش اور ایک نیا خون دوڑا دیتا ہے۔ لاہور نے اس برِّعظیم کی تاریخ میں ہر تحریک کے لئے خون بہایا ہے اور یہ تاریخی حقیقت بھی اسی جغرافیائی حقیقت کا ثبوت ہے۔ اس کے برعکس یوپی کا باشندہ متحمل مزاج ہے اور کم انقلابی۔

پنجابی فطرتاً خود پرست بھی ہے۔ وہ کسی کے بتائے ہوئے رستے پر مشکل سے چلتا ہے اور اپنا راستہ خود پیدا کرنا چاہتا ہے۔ موجودہ ہندوستان و پاکستان کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کریں تو اس سے بھی یہی عیاں ہوتا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے باوجود یہاں احرار، نیلی پوش، خاکسار، جماعتِ اسلامی وغیرہ نہ جانے کتنی چھوٹی چھوٹی تحریکات پیدا ہوئی ہیں۔ اتنی پُرجوش، پُرکار اور خود اندیشانہ سی جدّت پسندی شاید ہی کسی اور صوبے میں ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس میں ایک پُرسوز یقین اور خلوص ہے اور اسی لئے خودی کے اقبالی فلسفے کی تخلیق کیلئے موزوں ترین منبع یہی سرزمین تھی، یہی حال ادبی زندگی کا ہے۔

خود اردو زبان کی لچک اور تغیر پذیری بھی پنجاب کی ادبی تحریک کی مددگار رہی۔ اگر اردو زبان میں لچک نہ ہوتی تو آج نہ ہماری صحافت یہاں ہوتی اور نہ ادب اور نہ پاکستانی حکومت اردو کو قومی زبان تسلیم کر سکتی۔ اردو کی بنیادی خوبی یہ تھی کہ یہ ہر ماحول اور ہر سرزمین کے مطابق ڈھلتی چلی جاتی تھی۔ بدلتی چلی جاتی تھی، بڑھتی چلی جاتی تھی۔ دلّی ہو یا لکھنؤ، کلکتہ ہو یا علیگڑھ، حیدرآباد ہو یا لاہور — یہ ہر جگہ پرانے، شوخ شوخ رنگوں کو اپنے دامنوں میں سمیٹے ہوئے۔ نئے نئے روپ دھارتی چلی جاتی تھی اور حسین تر، رنگین تر، جاذب تر اور پائندہ تر ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہی لچک اس کا حُسن ہے اور اسی حُسن کے بل پر یہ پاکستانی انقلاب کی ہم آہنگ ہو کر دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہو سکے گی۔

ترقی پسند تحریک کے متعلق یہ سوال حل کرنے کے بعد میں ترقی پسند ادب کے اہم پہلوؤں پر تبصرہ کروں گا۔ چونکہ یہ تحریک اردو ادب میں بہت اہم اور موثر تحریک تھی اس لئے اس کے میدانِ کار، قوّتِ کار اور اس کے امکانات سے واقف ہونا ضروری ہے:-

اس تحریک کی زبان لکھنؤ اور دلّی کی زبان سے قدرے مختلف تھی۔ اس اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ لاہور — لکھنؤ یا دلّی نہیں تھا اور اکثر ترقی پسندوں کا پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ایک اور بات یہ تھی کہ پنجاب میں اردو بولی نہیں جاتی لیکن سکولوں میں تحتانی اور وسطانی تعلیم کا ذریعہ یہی زبان تھی۔ اس لئے پنجاب کے ادیبوں کی زبان ماحولی طور پر پنجابی تھی لیکن ادبی طور پر اردو۔ گھر اور سکول بہت اہمیت رکھتے ہیں اس لئے ایک "نئی" اردو کا پیدا ہونا لازم تھا۔

لکھنؤ اور دلّی میں اردو ان دونوں زمینداروں کی لونڈی تھی اور زیادہ تر غزل تک محدود۔ اس کا تعلق عوامی زندگی سے نہ تھا اس لئے "عوامی" نمائندگی کی وجہ سے اس میں ردّ و بدل ہونا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ بیرونی ادب، نئی اصطلاحات اور جدید تحقیقات و انکشافات کی وجہ سے بھی نئے الفاظ وجود میں آتے گئے لیکن لکھنؤ و دلّی کی زبان مری نہیں ہے۔ اس میں صرف ایک خوشگوار مزاجی تبدیلی ہو گئی ہے۔ اس تحریک کے

علمبرداروں کی زبان سادہ، تازہ، جاندار اور "عوامی" تھی۔

اس تحریک سے پیشتر اُردو شعری ادب میں کافی مالدار تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اُردو زبان کا ادب زیادہ تر شعری ادب تھا اور نثر میں بہت پیچھے تھا۔ چنانچہ اس خلا کو پُر کرنے کا بیڑا ترقی پسند ادب نے اُٹھایا۔

اس تحریک نے اُردو ادب کے عظیم ترین افسانہ نگار پیدا کئے جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے میدان کا مردِ ہے۔ پروفیسر احمد علی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، منٹو، عسکری، مفتی، شفیق الرحمان، بیدی، شیریں، عصمت وغیرہ بے شمار افسانہ نویس ہیں جو اپنے اپنے رنگ میں زندگی کے ہر موضوع پر افسانے لکھتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تحریک نے ایک سال میں اتنا افسانوی ادب پیدا کیا جتنا اُردو نے اپنی ساری عمر میں نہیں کیا تھا اور پھر یہ نہیں کہ یہ محض بھرتی کا تھا بلکہ ان افسانہ نگاروں نے سماجی، سیاسی، رومانی، اخلاقی، معاشی، جنسی غرضکہ ہر موضوع پر افسانے لکھے جنہیں اُردو ادب نہایت فخر سے دوسروں کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ اس افسانوی اجتہاد کا نتیجہ یہ ہے کہ افسانوی اعتبار سے اُردو زبان شعری ادب سے بھی زیادہ مالدار ہو گئی ہے اور صرف انہی افسانوں کے بل پر دنیا کی ایک بڑی زبان کہلا سکتی ہے۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فن کاروں کو افسانہ اتنا کیوں بھایا؟ انہوں نے اس لئے افسانے زیادہ نہیں لکھے کہ وہ افسانوی مزاج کے تھے بلکہ وقتی ضروریات ایسی تھیں کہ وہ افسانے زیادہ لکھنے پر مجبور تھے۔ افسانہ اپنے اختصار اور بے تکلفی کی وجہ سے بھی موجودہ حالاتِ زندگی کے زیادہ مطابق ہے۔ اس سے بڑی وجہ یہ بھی کہ افسانے میں لچک زیادہ ہے اور یہ نہایت آسانی سے اِدھر اُدھر مڑ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے ڈراما یا ناول میں کردار فنکار کو جکڑ لیتے ہیں لیکن افسانے میں بسرعت "فضائیت" اور انسان کا ہر ہنگامی جذباتی تاثر یا احساس ادا ہو سکتا ہے۔ گویا اس میں اختصار کے باوجود لچک ہے، وسعت ہے اور اس کی وسعت میں گیرائی ہے۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ افسانہ انفرادیت کے زیادہ قریب ہے۔ ترقی پسند فنکار اس لئے لکھتے تھے کہ خود ان کی زندگی گھٹی گھٹی تھی اس لئے وہ اپنی گھٹن سے دوسروں کی گھٹن کو سمجھتے تھے اور ظاہر کر سکتے تھے۔ ان فن کاروں کو لکھنے کی ابتدائی تحریک اپنی ہی زندگی سے ہوتی تھی اور افسانہ نہ زیادہ وقت لیتا تھا۔ نہ انہیں اُلجھاتا تھا اور مزہ یہ ہے کہ ضروری تاثر بھی جلدی سے پیدا ہو سکتا تھا اور اُن کا انفرادی نقش بھی بن جاتا تھا لہٰذا افسانہ موزوں ترین میدان تھا۔

ڈرامے بھی لکھے گئے لیکن اس میدان میں ترقی پسند ادیب زیادہ بارور نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے پاس ڈرامائی صلاحیت کی کمی تھی یا اس کی مانگ نہیں تھی بلکہ کچھ خارجی وجوہات اس کے ذمہ دار تھے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہمارے یہاں سٹیج کا فقدان ہے۔ شاعری مشاعرہ کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے لیکن ڈراما سٹیج کے بغیر نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ڈراما ایک روح ہے اور سٹیج اس کا جسم۔ تمثیل کی زندگی اسی میں ہے کہ دنیا اس کا روپ دھارے اور تمثیل نگار کا حاصلِ فن اور روحِ فن یہی ہے کہ اس کے قلم کی ترتیب کردہ باتیں کی آوازیں بن جائیں اور اس کے ذہن کی حرکتیں زندہ انسانوں میں حلول کر سکیں، اس لئے سٹیج کے بغیر ڈراما لکھنا بڑی حد تک بے سود ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ فلمی دیوتاؤں نے ہمارے عوام کو مدتوں سے ایک ہی قسم کی کہانیاں سنائی اور دکھائی ہیں جس سے عوامی ذوق یک رنگا ہو گیا ہے اور وہ سٹیج پر اسی چیز کا متوقع ہے جسے وہ

فلموں میں دیکھنا ہے حالانکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے لکھے پڑھوں پر ابھی تک شیکسپیئر اس بُری طرح حاوی ہے کہ وہ اُردو کے تمثیل نگاروں پر تو کیا برنارڈ شا وغیرہ پر بھی پُوری توجہ نہیں دے سکے...... اس کے باوجود قاسمی، کرشن، سیٹھی، اشک، جاوید وغیرہ نے ریڈیائی، فلمی وغیرہ ڈرامے لکھے ہیں۔ قاسمی نے ان تھک جولانیٔ طبع کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے ریڈیائی اور منظوم ڈرامے لکھے ہیں منٹو نے اس برِ عظیم کی صنعتِ فلم کو ایک موثر کہانی "بیگم" دی ہے لیکن اس قافلے کے سالار بلاشک و شبہہ سید امتیاز علی تاج ہیں جنہوں نے "انارکلی" لکھا اور اس تحریک سے متعلق نہ ہونے کے باوجود اُردو ڈرامے کو ایک نیا مقام اور معیار بخشا۔

ترقی پسند ادیب ناول کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دے سکے لیکن یہاں بھی اُنھوں نے اپنی امکانی صلاحیت کا پتا ضرور دیا ہے۔ میرے خیال میں کرشن چندر اُردو کا بہترین ناول نگار ہو سکتا ہے کیونکہ وہ محض تجزیاتی نہیں بلکہ اُسے انسان سے اور اس لئے اپنے کرداروں سے بہت گہری ہمدردی ہے جو اس کی تحریرات کے پس منظر میں نہیں رہتی بلکہ اُن سے ٹپکتی ہے۔ اس کا مشاہدہ اتنا عمیق ہے کہ وہ ایک کردار کو پیش کر کے اس جیسے سینکڑوں کرداروں کی نقاب کشائی کر جاتا ہے اور اپنے بے شمار کرداروں کو ایک لڑی میں پروتے ہوئے ان میں نہایت آسانی سے حدِ فاصل قائم رکھتا ہے کیونکہ اس نے انہیں پوری طرح سمجھا ہے...... ترقی پسندوں کے ناول کی طرف توجہ نہ دے سکنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کی زندگی میں سکون و یکسوئی کی نسبت التہاب و اضطراب زیادہ ہے اور ناول لکھنے کے لئے یکسوئی کی ضرورت ہے اور بے پناہ کاوش کی تاکہ ذہن کلیۃً ایک ہی موضوع کے لئے دیر تک وقف رہ سکے اور کردار ذہن میں متواتر ڈیرے ڈالے رہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں لمبی لمبی کتابیں پڑھنے کی فرصت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس زندگی سے زیادہ ہم آہنگ مختصر افسانے ہیں۔

اُردو ادب کی تنقیدی کائنات بھی دوسرے کئی شعبوں کی طرح بنجر نہیں تو بنجر سی ضرور تھی۔ شعر العجم اس کی پہلی اور آخری تخلیق معلوم ہوتی تھی۔ اس تحریک کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ تنقیدی معیار کا بدلنا اور بڑھنا ضروری تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن علمِ تنقید پر بذاتِ خود ضروری توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُردو زبان فوقانی تعلیم کا ذریعہ نہ تھی۔ اس کے علاوہ ترقی پسند فن کاروں کی توجہات تخلیقی سرگرمیوں پر مرکوز تھیں اور ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ایک ہی شخص معیاری نقاد بھی ہو اور مصنف بھی!

ترقی پسندوں کے ایک گروہ نے نفسیات پر توجہ دی اور اپنے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ کیا۔ اس علمی و ایجابی ذوق کی معراج ماہنامہ "نفسیات" لاہور ہے جس کے مدیر اعلیٰ شبیر محمد اختر ہیں۔

اس کے علاوہ ایسی کتابیں بھی شائع کی گئیں جو بہت سے فن کاروں کی تخلیقات کا مجموعہ تھیں۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے فن کاروں کے تراجم شائع کئے گئے اور اس طرح اہلِ ادب کو دوسری متوازی ہمعصر زبانوں کے ادب کو سمجھنے کا موقع ملا اور اہلِ تنقید کو بھی آسانیاں ہو گئیں۔ احمد ندیم قاسمی نے "نقوش لطیف" مرتب کی جس میں نسوانی فن کاروں کی تخلیقات کے علاوہ مختلف ادبی پہلوؤں پر ان کی آرا مندرج کی گئیں۔

اسی سلسلے میں مکتبہ اُردو لاہور "ادبِ لطیف" نیا دور، ادبی دُنیا، ہمایوں، ساقی، حلقۂ اربابِ ذوق لاہور وغیرہ نے

بہت کام کیا ہے۔ بہرطور ترقی پسند ادب کا نثری میدان اتنا وسیع ہے کہ اُس کو صرف کوزے میں بند کیا جا سکتا ہے اور اس کی قوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت سارے پاکستان کی نثر وہی ہے جو ترقی پسند ادب کی تھی۔

شعری ادب میں بھی ترقی پسندوں نے بہت کام کیا ہے لیکن چونکہ یہ تحریک ایک بغاوت تھی روایات کے خلاف اس لئے اس کی شاعری کا معتد بہ اور مخصوص حصہ وہ شاعری ہے جسے آزاد شاعری کہتے ہیں اور جو بہت بدنام ہے اگرچہ احمد ندیم قاسمی نثر و نظم دونوں پر حاوی ہونے کے علاوہ شعری میدان میں بھی قدیم و جدید کے علمبردار رہتے اور دونوں میں تازہ گو ——

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں نے آزاد شاعری کیوں شروع کی؟ اس کے ممکن دو باتیں یہ ہو سکتی ہیں:-
ترقی پسند اردو کو ایک مکمل زبان نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے لئے روایات کی زنجیریں بھی نہیں تھیں اس لئے وہ اردو زبان کو ہر غیر مانوس اسلوب سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ آج اگر اردو شاعری سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ نئے پاکستانی ماحول کی آئینہ دار ہو سکے گی تو اس کی بہت بڑی وجہ یہی ترقی پسند مصنف ہیں جنہوں نے اسے لچکدار بنانے میں بہت مدد دی ہے۔ دوسری وجہ خود غزل کی سیرت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو غزل اتنی عام ہونے کے باوجود فارسی غزل کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے یہاں بہترین غزل گو شاعر ہوئے اور ہیں لیکن عام طور پر فارسی غزل میں جو سوز، گرانی اور اثر ہے وہ اردو غزل میں نہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میرے ایک فاضل دوست نے تصوف اور فارسی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ فارسی غزل قلب و ذہن پر جو کیفیت طاری کرتی ہے وہ اردو غزل نہیں کر سکتی۔ اس پر میرے ایک اور دوست کہنے لگے کہ اردو اُس وقت شروع ہوئی جب ہندی مسلمانوں میں خلوص کا فقدان تھا اس لئے وہ سوز اور جذبہ نہ آ سکا لیکن اس کے باوجود یہ عناصر اس سے قطعاً مفقود نہیں ہیں —— میرے نزدیک اس فقدان کی وجہ محض یہی نہیں بلکہ جغرافیائی بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی موزوں ترین جگہ ایران تھا یہاں غزل کا خمیر پوری طرح نہ اُٹھ سکا۔ بہرحال کچھ ہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غزل حسن و عشق، سوز و گداز، اور جذب و کیف کی تخلیق ہے اور انقلابی نہیں مگر ترقی پسند انقلابی تھے اس لئے قدرتی طور پر اُن کی توجہ زیادہ تر نظم پر رہی ...... تقلید پرستوں کے لئے ہر نئی چیز بُری ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی تنقید طرازیوں کو تو خاطر میں لانے کی ضرورت نہیں لیکن یہ بات بھی مانی نہیں جا سکتی کہ ہر نئی چیز اچھی ہے۔ بہرکیف یہ تجرباتی دور تھا اور مختلف تجربے کئے گئے۔ آزاد شاعری، گیت، منظوم ڈرامے لکھے گئے۔ اکثر لوگوں کو اعتراض تھا کہ وہ مبہم ہیں بلکہ ناقابلِ فہم۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ قارئین اس شاعری سے ناآشنا تھے۔ وہ شروع سے غزلیں سنتے آئے تھے اس لئے یہ نئی چیزیں نہ نظروں میں جچتی تھیں نہ کانوں کو بھاتی تھیں اور نہ ذہن ہی میں سماتی تھیں۔ ہر نئی چیز کا استقبال انسان نے اسی طرح کیا ہے لیکن وقت ہر مبہم چیز کو واضح کرتا رہا ہے چنانچہ آج ہمارے رسائل میں قدیم غزلوں کے پہلو بہ پہلو نئی نظمیں بھی چھپتی اور مقبول ہوتی ہیں لیکن یہاں خود بعض ترقی پسندوں نے اس جدت کو نقصان پہنچایا۔ وہ ایسی نظمیں بھی لکھتے رہے جو یا تو محض رنگین الفاظ و تراکیب کا ایک گورکھ دھندا ہوتی تھیں اور یا غیر واضح، مبہم اور

تاریک گویا الفاظ کا ہر مجموعہ نظم ہے اور ادراک سے پرے ہو جانا حُسنِ نظم! اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگ اب تک یہ کہتے ہیں کہ ترقی پسندوں نے آزاد شاعری اس لئے اختیار کی کہ وہ آرام پسند تھے اور قافیہ و ردیف کو جاننے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترقی پسند شاعری پر اعتراض کیا گیا لیکن نثر پر کیوں نہیں؟ اس کی وجہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اُردو زبان کا نثری میدان کافی حد تک بے آباد تھا، لیکن اس کے برعکس شاعری کی ٹھوس روایات تھیں اور اُن کے علمبردار، پیرو اور استاد موجود تھے یعنی حزبِ مخالف موجود تھا اس کے برعکس نثر میں خود پنجاب کا جدت پسند سکول موجود تھا۔ اس کے لئے ترقی پسند نثر اپنا ہی ایک ارتقائی تسلسل تھا اس لئے نہ اعتراض کی ضرورت تھی اور نہ گنجائش!!

موضوعاتی لحاظ سے ترقی پسند تحریک اچھوتی تھی اور ایسا ہونا ہمارے سماجی حالات کی وجہ سے ناگزیر تھا اس لئے کہ ترقی پسند زمینداروں، نوابوں اور رئیسوں کے دست پروردہ نہ تھے۔ وہ رتن ناتھ سرشار وغیرہ کے نام نہاد ناول کی طرح اپنے "عوامی" کرداروں کو زمینداروں کے تفننِ طبع کا سامان نہیں بناتے تھے۔ ترقی پسند موضوعات کا اہم ستون ایک پالیسی کے ماتحت مظلوم طبقہ تھا یعنی مزدور، کسان، بیوہ، طوائف، مزارع، پناہ گزین، بیوپاری، سپاہی، کلرک، قلی، نوکر، مدرّس وغیرہ، گویا اس لحاظ سے ترقی پسند ادیب قوم کا زیادہ سے زیادہ نمائندہ ہے۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ترقی پسند حقیقت نگار ہیں۔ اُن کے کردار فرضی نہیں ہیں۔ وہ غاروں اور کوہ قاف میں نہیں رہتے وہ زندہ، جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان ہیں۔ اُنہوں نے ایک خاص مقصد تک پہنچنے کے لئے (خواہ وہ تاریخی حقیقت ہو یا ذہنی مفروضہ) ہوائی کردار پیدا نہیں کئے اور نہ اُن کی زبان بے جان اور غیر فطری رکھی ہے جیسے مولانا شرر وغیرہ کے ناولوں میں ہے۔

اُن کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض کہانیاں نہیں سناتے بلکہ اُن میں سے بعض کے ہاں افسانوی پہلو بہت کم ہے۔ وہ زیادہ تر اپنے کرداروں کی ذہنی کشمکش سے وابستہ ہیں یعنی عمل سے پہلے اُن کے ادراک و احساس سے۔ اس لحاظ سے اُن کے افسانے انسانی ذہن کے تجزیے ہیں لیکن کہانی کا عنصر غائب نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض نے نہایت اچھوتے انداز میں تحلیلِ نفسی کے ساتھ ساتھ دلچسپ کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

ترقی پسند ادب کے یہاں الفاظ کی کمی نہیں ہے۔ اُنہوں نے اُردو زبان کے بہت سے زنگ خوردہ الفاظ کو صیقل کیا ہے بہت سے الفاظ دوسروں سے لے لئے ہیں اور بہت سے ترجمہ یا وضع کر لئے ہیں۔ یہی حال تشبیہات و استعارات کا ہے لیکن مجموعی طور پر اُن کی زبان مشکل نہیں سلیس ہے۔ انہوں نے موجودہ سماج کے معمولی سے معمولی پہلو پر خامہ فرسائی کی ہے اور "گرم کوٹ" سے "اَن داتا" تک مختلف موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔ اُن کے ہاں ہماری سماجی زندگی پر بہت لطیف، چبھتی ہوئی اور کھٹکتی ہوئی، کھلی اور چھپی ہوئی چوٹیں ہیں بلکہ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ہر افسانے میں ہماری زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا خاکا ہی اُڑایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے سنجیدہ ہو کر بھی لکھا ہے۔

اعتقادی لحاظ سے ترقی پسند ادیب اشتراکیت سے متاثر ہیں ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی ہے کہ وہ اپنی سماج کے مظلوم طبقوں کو

دیکھئے یہ اسی اشتراکیت کا اثر ہے کہ ترقی پسند ادیب عموماً (سب کے سب نہیں) خدا سے گریزاں ہیں اور مذہبی اعتقادات کا مذاق اُڑاتے ہیں یہ غلط ہے یا صحیح۔ - اس کا میں بعد میں ذکر کرونگا۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟ کیا یہ محض اشتراکی نظریات کا اثر ہے یا نہیں۔ ہمارے ہاں خدا کی مخالفت ترقی پسندوں سے شروع نہیں ہوئی بلکہ جب سے یہاں موجودہ سائنس نے رواج پایا ہے اُس وقت سے خدا سے بغاوت ہو رہی ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ سائنس خدا کی اتنی مخالف نہیں ہے جتنی اُسے خدا شناسی کے لئے کم فرصتی ہے عین ممکن ہے کہ ایک سائنسدان خدا سے منکر نہ ہو لیکن وہ اپنی ایجادی مصروفیات کی وجہ سے محض خود مرکوز ہو کر رہ جائے۔ بہر حال خدا سے انحراف اشتراکیت کا کرشمہ نہیں بلکہ سائنس کا طفیل ہے۔ لیکن بعض ترقی پسند خدا کا مذاق اُڑاتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ تحریک ایک بغاوتی تحریک اور ماضی کے خلاف ایک ردِ عمل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے مذہبی علما بےحد قدامت پرست ہیں اور انہوں نے وقت کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا ہے۔ اجتہاد کے دروازے بند سمجھتے ہیں اور مذہب کو ایک ساکن، جامد اور غیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔ انہوں نے فروعات کو مذہب کا درجہ دے کر اسے تماشہ اور گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لکھا پڑھا نوجوان اپنے اس مذہب اور موجودہ تعلیم میں تناسب نہ سمجھ سکا کہ پیشین تشریحات کی رَو میں بہ گیا۔ اس کے علاوہ علمائے سُو نے ہماری سیاسی جد و جہد کے مختلف ادوار میں جس تذبذب ایمان کا ثبوت دیا وہ بھی اہلِ نوجوانان کو مذہب سے بددل کرنے میں کافی مددگار بنا۔ کفر کے فتوے اتنے عام ہو گئے کہ مسلمان نوجوان کو یہ بھی یقین نہ رہا کہ وہ مسلمان بھی ہے یا نہیں۔ یہ تشکک مذہب کے لئے سم قاتل ہے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند ادیب پرانے مقتدر طبقے کے خلاف تھا جو بالعموم دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھا تھا لہٰذا سرمایہ دار اور جاگیردار کے ساتھ ساتھ اس کی نفرین ملاؤں پر بھی پڑیں جو مذہب کا اجارہ دار بنا ہوا تھا اور جب چاہتا تھا کسی کو کافر بنا دیتا تھا اور جب چاہتا تھا کافر کو مسلمان کہہ دیتا تھا۔ مزید برآں مذہبی تفریق صرف مسلمانوں کے اندر ہی نہیں تھی بلکہ مجموعی لحاظ سے سارے ہندوستان میں مختلف مذاہب کی وجہ سے خلفشار برپا تھا اور چونکہ انتہا پسند اور نعرہ باز ترقی پسند طبقہ اشتراکی انقلاب کا حامی تھا (اور نتیجۃً ہندوستان کی متحدہ قومیت کا علمبردار تھا) اس لئے وہ کسی طبقے یا ملت یا قوم کا نمایندہ نہیں تھا بلکہ محض ہندوستان کے مظلوم طبقہ کا ترجمان تھا لہٰذا وہ آئے دن کے ہندو مسلم فسادات سے یہ نتیجہ نکالتا تھا کہ مذہب ہی اس خلفشار کی بنیاد ہے اور تقسیم و امتیاز کو اپنے تصور کردہ "عوامی انقلاب" کے لئے خطرناک سمجھتا تھا۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ ان ترقی پسندوں کو مسلمانوں یا ہندوؤں سے من حیث الاقوام کوئی ہمدردی نہیں تھی اور نہ انہوں نے کبھی ہندو مسلم سوال پر سنجیدگی سے غور کیا اور اس لحاظ سے پاکستان کی تولید نہ صرف ہندو سیاست کی شکست تھی بلکہ اس انتہا پسند ادبی گروہ کی بھی شکست تھی!!

یہاں تک میں نے صرف ترقی پسند ادبا کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے اور اُن کی مشکلات اور اُن کے خیالاتی پس منظر کو واضح کیا ہے لیکن ادب انفرادی یا طبقاتی اجارہ نہیں بلکہ ایک سماجی اور اجتماعی سرمایہ ہے اور اگر خود پرست شہری یا ذخیرہ اندوز یا نفع خور یا ڈاکو کسی معاشرہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو ایک گمراہ ادیب بھی قوموں کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارے کے سارے ترقی پسند ایسے ہیں۔ میرا روئے سخن صرف انتہا پسند طبقے کی طرف ہے یا اُن لکھنے والوں

کی طرف جو ترقی پسند ادب کی لسانی و اسلوبی آزادی سے فائدہ اٹھا کر "فنکار" بن گئے ہیں۔

ترقی پسندوں کے خلاف یہ شکایت عام ہے کہ اُن کے ہاں "عریانی" ہے۔ عریانی سے مطلب یہ ہے کہ وہ جنسی جذبات کو پردوں میں بیان نہیں کرتے اِس لئے وہ قارئین کے اخلاق پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔

جہاں تک انسانی تجربات کو برملا بیان کرنے کا تعلق ہے، یہ ادب کی بہت بڑی خوبی یعنی زندگی کی پُوری ترجمانی ہے، اس لئے عریانی ادب کی کوئی برائی نہیں بلکہ اس کی گہرائی، وسعت اور طاقت پر دلالت کرتی ہے۔ ادب خود عمل عریاں کاری ہے۔ لیکن یہاں ہمیں یہ یاد رکھنا ہے کہ ادب عام طور پر دو قسم کا ہوتا ہے۔ یعنی گھٹیا اور بڑھیا۔

گھٹیا ادب وہ ہے جو زندگی کی نامکمل، بھونڈی، ہیجان انگیز اور شہوانی تصویر کھینچتا ہے اور اپنے رسیا کو عمل کے آنگن کدے کی بجائے شراب خانے یا دوسرے کسی ایسے اڈے کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ گزرتے ہوئے لمحے سے لپٹ کر اپنے آپ کو اور دُنیا و مافیہا کو بھول سکے۔ ایسا ادب یقیناً گھٹیا، قابلِ تعزیر اور زہرناک ہے کیونکہ وہ زندگی کی کسی مشکل کو حل نہیں کرتا، کوئی راستہ نہیں بتاتا اور کسی منزل کا تصور نہیں دے سکتا۔ ایسا ادب نشے کی ایک لہر ہے جس کی رَو میں بہنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ زمان و مکان کے ورا و ماورا میں تیر رہا ہے لیکن نشہ اترنے کے ساتھ ہی زمین پر دھڑام سے آ گرتا ہے۔ یقیناً یہ مدہوش جتنا عرصہ نشے کے عالم میں رہا، اتنا عرصہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا، اس کے سینکڑوں ساتھی آگے نکل گئے اور اسے اب تنہا ماحول کی بوجھل ظلمتوں سے کشتی لڑنا ہوگی اور اس کا ذمہ دار گھٹیا ادیب ہے۔

اِس کے برخلاف بڑھیا ادب زندگی کی مکمل، حقیقت پرور اور قوت بخش تصویر ہے۔ اس ادب کی مانگ زندگی میں ہمیشہ کے لئے ہے۔ زندگی کے سیلاب کو تھمنا نہیں چاہئے ورنہ وہ ایک متعفن جوہڑ بن جائے گا، جو جراثیم کو پال کر انسان کی ہلاکت کا سامان پیدا کرے گا۔ ادبی اخلاق کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ انسان رُکنے کی بجائے آگے چلتا جائے۔ بقول رلیف فاکس "جدید حقیقت پسندی کو انسان نہ صرف بحیثیت نقاد دکھانا چاہئے اور نہ سماجی حالات کے سامنے ایک مجبور و مقہور ذرہ، بلکہ اسے انسان کو عمل کرتے ہوئے دکھانا چاہئے —— اپنی زندگی کے حالات کا رُخ موڑتا ہوا، زندگی کو فتح کرتا ہوا، تاریخی ارتقا کے پہلو بہ پہلو چلتا ہوا اور اپنی تقدیر کا مالک بنا ——"

گویا گھٹیا اور بڑھیا ادب کا فرق مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ گھٹیا ادب تخریبی ہے اور بڑھیا ادب تعمیری۔ اس لحاظ سے عریانی بھی دو قسم کی ہوئی یعنی تخریبی اور تعمیری، جنسی اور ارتقائی! ادب اور عریانی نہ چھپ رہ سکتے ہیں اور نہ چھپائے جا سکتے ہیں، وہ خود منہ سے بول کر قاری کو بتا دیتے ہیں کہ وہ تخریبی ہیں یا تعمیری۔

اب سب ترقی پسند اپنے آپ کو تعمیری سمجھتے ہیں لیکن اُن میں سے بعض کے ہاں ایک ذہنی تعیش اور جنسی تلذذ پایا جاتا ہے، یہ فنکار نہایت مزے لے لے کر جنسی کہانیاں لکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی ان کہانیوں کے ذریعے سے جو اثر طاری کرنا چاہتے ہیں اس میں وہ کامیاب ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ قاری کا لاشعور بھی اسی لذیذ تجربے سے گزرتا ہے لیکن اگر ان کا مقصد اس ذریعے سے اصلاح کرنا ہے تو وہ اس میں قطعاً ناکام ہیں۔ جب صحیح الفکر نقادوں نے ایسے فنکاروں کی توجہ اس طرف مبذول کروائی تو انہوں نے بڑے طمطراق سے کچھ ایسا

جواب دیا "آپ خود اس کردار کے مالک ہیں۔ آپ کی ساری معاشرت ایسی ہے اور ہم تو آئینہ ہیں۔ اس لئے جب آپ ہماری کہانیوں میں اپنا عکس دیکھتے ہیں تو ہمیں کوسنے کی بجائے اپنے آپ کو کوسئے اپنے آپ کو بدلئے"...... کیا اس جواب کا کوئی جواز ہے؟

اوّل تو یہی صحیح نہیں کہ ادیب محض ایک آئینہ ہے۔ یہ ادب کے ساتھ بہت بڑا مذاق ہے۔ اگر ادب محض آئینہ ہی ہے تو ادب اور تاریخ میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟ یہ بجا ہے کہ ادیب اپنے ماحول کا عکس ہے لیکن کیا محض **انعکاس** ہی اس کا کام ہے؟ یقیناً نہیں۔ اسے ایک ماحول کا پابند ہوتے ہوئے اس ماحول سے اونچا اٹھنا ہے اور اس مقام کی نشان دہی کرنا ہے جہاں انسان زیادہ خوش رہ سکے اور بہتر اور بلند تر ادب کے لئے ساز گار فضا مل سکے یہ بات کس قدر ناروا ہے کہ کوئی ادیب ایک طرف تو معلم رہنے کا دعویٰ کرے اور دوسری طرف وہ قارئین سے یہ کہے کہ چونکہ تم بُرے ہو اس لئے میں بھی بُرا بنوں گا اور چونکہ تم گرے ہوئے ہو اس لئے میں بھی گرا رہوں گا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لوگ اپنی اصلاح خود کر سکتے ہیں؟ اگر وہ کر سکتے ہیں تو فن کا وجود (اور زندگی کے ہر تہذیبی شعبہ کا وجود) بالکل بے ضرورت اور مضحکہ خیز ہے لیکن اگر وہ خود بدل نہیں سکتے تو پھر یقیناً انہیں کسی انقلابی یا اصلاحی ادارے کی ضرورت ہے۔ دنیا بھر کے حکماء و اُدباء کے اقوال کا لبِ لباب یہ ہے کہ ادب ایک ایسا ہی ادارہ ہے۔ پھر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ اپنے آپ کو نہ بدلیں، اپنے آپ کو بلند انسان نہ بنائیں اور دوسروں کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کریں؟ اس مرحلے پر پہنچ کر زیادہ تر ترقی پسند ادب محض تخریبی نظر آتا ہے اور بقول ان مصنفین کے محض موجودہ سماج کا آئینہ بن کے رہ گیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ سماج کیچڑ میں لت پت ہے اور یہ فن کار دوسروں کو لکھ لکھ کر بتا رہے ہیں کہ ہم کیچڑ میں لت پت ہیں اور بس...... ان حالات میں اصلاح کی توقع کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ معالج جو مریض کی نازک حالت کو دیکھ کر بار بار کہتا جائے کہ "مریض جاں بلب ہے، مریض مر رہا ہے، مریض غلیظ ہے، مریض مر جائیگا" اُس کے متعلق آپ کیا رائے قائم کریں گے سوائے اس کے کہ وہ معالجہ کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔

پھر یہ فنکار اپنی مخصوص لن ترانیوں میں اس کا ایک اور جواز پیش کرتے ہیں کہ "اس کہانی میں ایک نفسیاتی نکتے کو ایک نوجوان کردار کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔" اب ان کے افسانوں کو پڑھئے اور سوچئے۔ ہو سکتا ہے ان "حقیقت نگاروں" نے ایک نفسیاتی نکتے ہی کو لذّتی پیرائے میں بیان کیا ہو لیکن وہ اس نفسیاتی حقیقت کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ جب محض کسی خوفناک چیز کی موجودگی ایک بلی کے نظامِ ہاضمہ کو بگاڑ دیتی ہے تو انسان تو پھر انسان ہے۔ اس کے یہاں تو نظامِ ہاضمہ صرف خوفناک یا نفرت انگیز چیز کی موجودگی ہی سے نہیں بگڑتا بلکہ محض اُس کے خیال سے بھی تہ و بالا ہو جاتا ہے، اس لئے اگر ذہن میں ناخوشگوار خیالات یا ہیجانی واقعات کا مد و جزر رہے تو جسم مُرجھا جاتا ہے اور انسانی جسم کے نازک ترین حصے یعنی نظامِ عصبی کو غذائی قلت کے ساتھ ساتھ زیادہ کام کرنا پڑتا ہے —— اس لئے یہ لذّت ناک عریانی تو بجز انہی فن کاروں کو زیب دے سکتی ہے جو پاگلوں کی طرح کدال پکڑ کر عمارت کی بنیاد کو کھوکھلا کر رہے ہوں یا نشتر پکڑ کر ایک انسانی جسم میں اتنے چھید کرتے جائیں کہ جگہ جگہ سے خون کے دھارے بہہ نکلیں اور اس کے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہ رہے۔ بقول عبادت بریلوی "لذّت کے پہلو افادیت پر غالب آ گئے"...... اس سے سماجی زندگی کے مسموم ہونے کا خطرہ ہے کیونکہ یہ ذہنی و جسمانی اعتبار سے سماج کے افراد کو غیر صحت مند

کمزور اور نکما کر دے گی!"

اگر ادب "برائے زندگی" ہے تو وہ آتنا خود سر اور مسموم نہیں ہونا چاہیئے لیکن یہ ادیب ہم سے رُوٹھ گئے ہیں۔ اس روٹھنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم بدل نہیں سکے۔ اُنہوں نے کچھ نظریات اخذ کئے تھے۔ پھر انہوں نے ان نظریات کو اپنی کہانیوں میں سمویا۔ بدقسمتی سے وہ ان نظریات کو واضح نہ کر سکے اس لئے وہ ہم سے رُوٹھ گئے، اس سماج سے رُوٹھ گئے اور ان تمام انسانوں سے رُوٹھ گئے جو اُن کے مخاطب تھے اور اب وہ ٹھہر ٹھہر کر ہم سے اس کا انتقام لے رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ وہ ہمیں اس طرح ٹھیک کر لیں گے!!.....

ان ہونہار اور غصیلے فن کاروں نے مظلوم طبقے کے متعلق دردناک کہانیاں لکھی ہیں مظلوم طبقے کی نمایندگی وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی جسے اُنہوں نے پُورا کیا۔ مزدور، مزارع وغیرہ سب اُن کی "نگارشات" کی زینت بنے۔ اسی سلسلے میں انکی نظریں بھکارن پر بھی پڑیں۔

انہوں نے بھکارن کے تار تار کپڑوں ہی کا جائزہ نہیں لیا بلکہ اس کی زندگی کی تمام محرومیوں، مختلف تہواروں پر اُسکے خیالات اور عام روزمرہ زندگی میں اس کی اُلجھنیں اُجاگر کیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد بھکارن کے لئے ہمدردی پیدا کرنا تھا اور بھکارن کو ایک نمونہ بنا کر سماجی جبر و اکراہ کو بے نقاب کرنا تھا لیکن جس طریقے سے وہ اس مقصد کو پُورا کرنے ہیں اُس کا تجزیہ یُوں کیا جا سکتا ہے :-

(الف) وہ بھکارن کو کسی سرمایہ دار کی نفس پرستی کا زخم خوردہ بتاتے ہیں۔

(ب) اس طرح وہ اس نظام کو بے نقاب کرتے ہیں جس کی وجہ سے عورت بھیک مانگنے پر مجبور ہوئی اور ہمارے دلوں میں اس کے لئے ہمدردی پیدا کرتے ہیں۔

(ج) اور آخر میں وہ خود اس بھکارن کو اپنی حرص کا آلۂ کار بناتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اور پھر یہ بھکارن تک ہی محدود نہیں بلکہ طوائف، نوکرانی، مزدور وغیرہ بھی اسی زد میں آجاتے ہیں۔ اب آپ خود ہی بتائیے کیا یہ تعمیری ادب کے پہلو ہیں؟ کیا اس سے قارئین کا وہ جہادی ولولہ بیدار ہو سکتا ہے جو اس فاسد نظام کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے؟ یہ بجا ہے کہ وہ اس نظام کے خلاف ہیں جو بھکاری پیدا کر رہا ہے۔ لیکن وہ ڈاکو بن کر خود بھی اسی ظالم طبقے میں کیوں شامل ہو جاتے ہیں؟ کیا ان کا مقصد یہ ہے کہ اس طریقے سے قارئین کو آمادہ کر سکیں کہ وہ ڈاکو سے نفرت کریں خواہ وہ خود ہی کیوں نہ ہوں لیکن اُن کا خود ہی افسانے میں ڈاکو بن جانا ان معصوم توقعات کا خاتمہ ہے جو عوام کو اُن سے ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ وہ غیر شعوری طور پر آنے والے فن کاروں کے باپ ہیں اور عوامی بہتری کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ بقول طاہرہ دیوی شیرازی کے "افسانہ نگار اور شاعر زندگی سے کھیلتے ہیں، زندگی کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔"

اگر وہ فی الحقیقت ایسے ہیں کہ موقع ملنے پر انسانیت کے لئے اسی قدر سفاک ہو جائیں جتنے سرمایہ دار۔ تو وہ پہلے درجے کے سنگدل، خود فریب اور انسان کُش ہیں..... مستقبل میں ہمارے فن کاروں کو نہ صرف فن کار بننا ہوگا بلکہ اچھا شہری بھی!.....

ترقی پسندوں کی مشکلات کو سمجھنے کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ جذباتی رَو میں بہہ کر کام کرنے کے عادی تھے۔ اُنہوں نے مغربی یا مستعار نظریات کی چھان بین نہیں کی۔ اُنہوں نے یہ نہیں سوچا کہ ان کے کون سے حصے ہمارے مطابق ہیں اور کونسے غیر مطابق۔ انہیں اس بات کا ہوش نہیں رہا کہ وہ جس منزل کی طرف جانا چاہتے

ہیں اسی طرف جا رہے ہیں یا نہیں۔ وہ نوجوان تھے، تعلیم یافتہ تھے اور بُری طرح الجھنوں میں گرفتار تھے اس لئے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ اُن کی تحریک نئی تھی اس لئے مخالفت ضروری تھی چنانچہ مخالفت شروع ہوئی۔ نئی تحریک کے علمبرداروں کا جواب دینا ضروری تھا چنانچہ اُنہوں نے نہایت زور شور سے دندان شکن جواب دیئے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے لیکن اصلاح کے موقع نایاب نہیں ہوتے، بشرطیکہ اصلاح پذیری کا مادہ ہو۔ اگر کسی تحریک کو قائم رکھنے کے لئے جوابی کارروائیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے دم رہنے کیلئے مخالفانہ تنقید کے ساتھ ساتھ اپنا محاسبہ کرنے اور بدلنے کی بھی ضرورت تھی لیکن ترقی پسند اپنے مخصوص نظریات پر اڑے رہے اور اس کا نتیجہ وہ ادب ہے جو پیدا ہوا —— اس برِ عظیم کی سرزمین میں بویا ہوا غیر ملکی پودا!

بعض ترقی پسند ادیبوں نے شروع سے ہی خدا کی مخالفت کو اپنے ادب کا ایک اہم ستون بنایا۔ بلند طبقہ تو خیر ان الجھنوں سے پاک ہی تھا۔ متوسط طبقہ پیٹ پالنے کے لئے لڑ رہا تھا اور عوام افلاس و جہالت کے باعث بے حس تھے۔ لیکن یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ وہ اس جہالت اور غریبی کے باوجود زندہ تھے اور ہیں۔ وہ کیوں زندہ ہیں اور کیسے زندہ ہیں؟ اس سوال پر ان ادیبوں نے غور نہیں کیا۔ انہی کے بقول عوام کے لئے زندگی میں کوئی کشش نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ کیوں زندہ ہیں؟ کیا اس لئے کہ "قومیں مرجاتی ہیں لیکن عوام زندہ رہتے ہیں"؟ نہیں۔ یہ کوئی جواب نہیں۔ آپ اس سوال پر دن رات غور کرتے جائیے۔ آپ کو صرف ایک ہی جواب مل سکتا ہے اور یہ جواب کسی فلسفے کی کتاب میں نہیں، خود ان عوام کے اندر ہے۔ انہی سے پوچھئے، انہی کا مطالعہ کیجئے، انہی پر غور کیجئے اور آپ کو جواب مل جائے گا۔

یہ جواب ہے خدا کا تصور۔ اُن کے لئے خدا ایک "بیکار" چیز نہیں ہے بلکہ وہ ایک زندہ، حرکی اور کارگر طاقت ہے۔ وہ اپنی بڑی سے بڑی ناکامی کے مفلوج کن اثرات کو اُس کا نام لیکر ختم کر سکتے ہیں اور اپنی سخت ترین محرومی و ناداری پر اُس کا نام لے کر قابو پا جاتے ہیں۔ اُن کے لئے خدا مسرت کا ایک عالمگیر پرتو ہے، ایک لامتناہی امید جو طول و عرض سے بے نیاز ہے۔ اس برِ عظیم کے ان کروڑوں، غلیظ، پسماندہ اور دُور افتادہ دیہاتی عوام کو دیکھئے اُن کی زمینیں قُرق ہوئی ہیں۔ وہ قرضے کی وجہ سے جیلوں میں سڑتے ہیں، اُنہوں نے چلچلاتی دُھوپ میں ہل چلایا ہے، اُنہوں نے کڑکڑاتے جاڑے میں نلائی کی ہے، اُنہیں زمیندار اور ساہوکار نے لُوٹا ہے، غلاظت کے باعث اور دواؤں کی کمی کی وجہ سے وہ مکھیوں کی طرح مرے ہیں، اُنہوں نے بڑے بڑے ہلاکت انگیز قحط دیکھے ہیں، اُنہوں نے مہینوں تک مون سون کا بے فائدہ انتظار کیا ہے، اُنہوں نے اپنے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو دریا بُرد ہوتے ہوئے دیکھا ہے لیکن وہ زندہ ہیں، پھر بھی زندہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جغرافیہ اور تاریخ کے سارے انقلاب اُن سے ٹکرا ٹکرا کر دم توڑ گئے ہیں لیکن وہ زندگی اور قوتِ عمل سے اسی طرح بھرپور ہیں۔ یہ سب کچھ خدا کے تصور کی وجہ سے ہے۔

اب جو شخص عوام کی نمائندگی کا دعویٰ رکھتے ہوئے اس بنیادی حقیقت کو بھول جاتا ہے یا اُسے غلط کہتا ہے وہ یا تو فریب خوردہ ہے یا فریب کار!

یہ کہنا کہ ترقی پسند تحریک، سوسائٹی کو بالکل نئی بنیادوں پر اور اچھوتے انداز میں کھڑا کرنا چاہتی ہے اور اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہر پرانے نظریہ کو ختم کر دیا جائے، تاریخی طور پر غلط ہے اور

اس تحریک کی خودکشی پر دلالت کرتا ہے۔ اگر یہ حالت ہوتی تو آج تہذیبِ انسانی جیسی کوئی چیز ہی مرتب نہ ہو سکتی تھی اور نہ ماضی، حال اور استقبال کا کوئی باہمی رابطہ رہ سکتا تھا۔ اور پھر ماضی سے بغاوت کا مطلب اگر ان اُدبا نے یہ لیا ہو کہ ماضی کے ہر حصے کو ختم کر دیا جائے تو وہ یہاں بھی غلط اندیش ہیں، تاریخ کا کوئی ورق اُلٹ کر دیکھیں۔ ماضی سے بغاوت کا مطلب صرف ماضی کے اُس حصے سے بغاوت ہے جو تبدیل شدہ حالات کی وجہ سے بیکار ہو گیا ہو لیکن پرانا مقتدر طبقہ اسے اپنی سربلندی کے لئے قائم رکھنے پر تُلا ہُوا ہو۔ یہ بات بھی نہیں کہ خدا کا تصور انسانی ترقی کے خلاف ہے یہ تو وحدتِ انسانیہ کی ابدیت کا اعتراف ہے اور اس کے علاوہ ایک ایسا مقدس جذبہ جس کے بل پر ہم آگے ہی آگے بڑھتے جائیں۔ ضرورت صرف اِس امر کی ہے کہ عوام کو یہ بتا دیا جائے کہ خدا کے سوا کسی اور خدا کو نہ مانو۔ یہی تمام بادشاہوں، آمروں، زمینداروں، نوابوں، رئیسوں، سرداروں، وڈیروں، ٹھاکروں، سرمایہ داروں اور مذہب کے "اجارہ داروں" وغیرہ اور اُن کے فاسد و باطل نظامات کو ختم کرنے کے لئے انسانی تاریخ کا پہلا اور آخری انقلابی منشور ہے!!

نئے ادب کی ایک اور "تبلیغی دلآویزی" یہ بھی ہے کہ ٹُوٹے پھُوٹے انسان کی بے بسی دیکھ کر خدا کو جی بھر کے کوسا جائے۔ اِن اُدبا کا خیال یہ ہے کہ اس سے بے کسوں کو تقویت پہنچتی ہے۔ یہ گویا ان اُدبا کا مشہور و معروف نسخہ ہے جس سے "رِستی ہوئی انسانیت" کے مصائب کو دُور کرتے ہیں۔ ممکن ہے اسے تسلیم بھی کر لیا جائے بشرطیکہ اس سے کوئی مشکل حل ہوتی ہو لیکن غور کیا جائے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک "ترقی پسند فراریت" ہے اور یہی افلاس کا ایک ثبوت اور میں ممتاز شیریں سے متفق ہوں کہ "ہائے ترقی پسندی!

تیرے نام پر کیا کیا لکھا جا رہا ہے!"

ان مصائب سے قطعِ نظر ترقی پسند تحریک ایک مفید تحریک تھی۔ اُس نے اُردو زبان کی خدمت کی، لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کے انتہا پسند اور نعرہ باز طبقے نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے نظریات کا پرچار کیا جنہیں ملک یا قوم یا عوام سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ اخلاقِ فاضلہ یا تہذیبِ ماضیہ یا نفسیاتِ ملّیہ سے کوئی رابطہ۔

یہ تھا وہ مقام جہاں ہمارا ادب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کھڑا تھا۔

۲۔ پاکستانی ادب

"قرار دادِ پاکستان" ۱۹۴۰ء میں منظور کی گئی تھی اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا ملک دنیا کے نقشے پر آ گیا۔ گویا ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ تحریکِ پاکستان کا زمانہ ہے لیکن ان سات آٹھ سالوں میں اس تحریک کا ادب بہت کم پیدا ہُوا حالانکہ ہمارے یہاں اُدبا یا رسائل یا ادب نواز طبقے کی کمی نہیں تھی۔ پاکستانی ادب کے مقام کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے اور اس کے رستے متعین کرنے کے لئے اس اُلجھن کو یعنی پاکستانی ادب کے فقدان کو اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے۔

اِس فقدان کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ دوسری جنگِ عالمگیر کا زمانہ تھا اس لئے برِّ عظیم کے باشندوں کی نگاہیں زیادہ تر دوسرے مسائل پر تھیں۔ گرانی بڑھ گئی تھی۔ انگریزی شہنشاہیت بین الاقوامی میدان میں جتنی زک اُٹھا رہی تھی اتنی ہی اُس نے ہندوستان مرحوم پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی اور خصوصاً جاپان کے جنگ میں آنے کی وجہ سے تو ہندوستان اتحادی دفاع کا اہم ترین مرکز بن گیا تھا، اور بقول مسٹر چرچل کے اُن دنوں ہندوستان میں اتنی انگریزی فوج

تھی جتنی اس سے پہلے کبھی نہیں رہی تھی۔ اس لئے یہاں فوجی دباؤ بڑھ گیا تھا۔ برِ اعظم ہند کے باسیوں کی زندگی اس وقت اُمید و بیم کی ایک مسلسل کشمکش تھی۔ جنگ کی شفقی دھاریوں میں ہمارے لاکھوں نوجوان معاشی تسکین کی زرتار کرنیں دیکھ رہے تھے لیکن دوسری طرف قلب و ذہن کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی انگریزوں کی شکست کی دعائیں تھیں۔ ایک بے پناہ ہماہمی کہاکہی کا عالم تھا اور چاروں طرف جنگ کی وحشت ناک خبریں، لاتعداد افواہیں اور دل خوش کن، من گھڑت، ان گنت امیدیں تھیں۔ ان حالات میں تحریکِ پاکستان مستقبل کی طرح پردوں میں چھپی رہی۔

اس کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ برِ اعظم ہند میں اُردو زبان کے لئے سب سے زیادہ کام لاہور میں ہو رہا تھا اور لاہور اسکول پر ترقی پسند تحریک غالب تھی۔ ترقی پسند تحریک ایک اندھا دھند اُبال نہ تھا۔ یہ کسی حد تک ایک ارتقائی تحریک تھی لیکن زیادہ تر ایک طے شدہ پالیسی جس کے سیاسی و معاشی نظریات اشتراکیت سے ماخوذ تھے۔ یہ تحریک نہ مسلمان تھی اور نہ ہندو، اس لئے یہ نہ تو تحریکِ پاکستان سے نہ کوئی ہمدردی رکھ سکتی تھی اور نہ اس سے کسی ہمدردی کی متحمل ہو سکتی تھی لہٰذا پاکستانی ادیب کو ایک باشعور حریف سے واسطہ تھا۔ ان حالات میں تحریکِ پاکستان کی گونج اُردو ادب میں آتی تو کیسے؟

اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ پاکستان کا نظریہ کلیتہً سیاستدانوں کے ذہن کا نظریہ نہ تھا بلکہ ایک قرارداد تھی جسے وقت نے نظریے میں بدل دیا۔ اس لئے پاکستان کا تخیل ہمارے قیاداتی طبقے کے ذہن میں زیادہ واضح نہیں تھا لیکن ہوا یہ کہ اِدھر قرارداد پاکستان (لفظ پاکستان بھی استعمال نہیں کیا گیا) منظور ہوئی اُدھر ہندو پریس اور قیادت نے شور مچا دیا اور اسی شور و غل سے آہستہ آہستہ خود ہندوؤں کا سیاسی، سماجی اور معاشی ظلم برہنہ ہوتا گیا۔ شاعر کے خواب کی تعبیر اُبھرنے لگی اور سیاسی مفکر کا نظریہ واضح ہونے لگا۔ اگر اُردو کے عام اُدبا اسے اپنی تخلیقات پر غالب نہ کر سکے تو وہ مجرم نہیں ہیں۔ آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان ہندی مسلمانوں کی زندگی میں ایک ضروری انقلابی تحریک تھی۔ اس تحریک کی اہمیت پوری طرح اُس وقت واضح ہوئی جب بہار، گڑھ مکتسر، مشرقی پنجاب وغیرہ میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا اور لاکھوں مسلمانوں کو ہندوستان سے ہجرت کرنی پڑی۔

پاکستان اسلامی ہندوستان کا وارث ہے اس لئے وہ ہندی مسلمانوں کے تمام اثاثوں کا محافظ بھی ہے لیکن یہاں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ محض عجائب گھر نہیں ہے۔ وہ لکھنؤ، دلی یا حیدر آباد کو اس لئے اپنے سینے سے نہیں چمٹا سکتا کہ وہ کسی وقت ہمارے تمدنی مرکز تھے۔ ادب میں بھی پاکستانی ادیب کو سوچنا ہے کہ جو کچھ اسے مل رہا ہے وہ پاکستانی ماحول کے مطابق ہے یا نہیں اور اس میں کوئی قابلِ قدر سامان ہے یا نہیں اور اس فیصلہ کے بعد اُسے ضروری، افادی اور موافق حصے کو لے کر اپنے ادب میں سمونا ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے موجودہ پاکستان ایک بنجر، بے آباد ملک نہ تھا بلکہ اس کا اپنا ادبی مسلک بھی موجود تھا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان کی پیدائش سے لے کر اب تک یہی سکول سب سے زیادہ [illegible] رہا ہے۔ میں ترقی پسند ادب کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ یہ پاکستان کی اپنی تحریک ہے جو لاہور میں پھلی پھولی اور اس لئے پاکستانیوں کے لئے بہترین اور فطری مسلک یہی ہے لیکن پاکستانی ادیب کو دو باتوں کا خیال رکھنا ہوگا یعنی اُسے بعید و قریب ادب کی خامیوں سے بھی واقف ہونا ہوگا۔ نیز چونکہ پاکستان کی آمد اپنی حیرت انگیز جلدی کی وجہ سے ذہن کو معطل کر

دینے والی تھی اور بہت سے لوگ تو چندھیا کر رہ گئے اور بہتوں نے اس نئے، بہرحال اُمید افزا انقلاب کو حقیقت سمجھ کر تسلیم کر لیا، لیکن ان کے علاوہ بعض ایسے بھی تھے جو اپنے پرانے رستوں ہی پر چلتے رہے یا اب تک چل رہے ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء ہماری اور بہت سی چیزوں کی طرح ترقی پسند ادب کے لئے بھی ایک ہنگامہ خیز انقلاب تھا۔ ہندو سکھ فن کار ہندوستان چلے گئے لیکن مسلمان ترقی پسندوں میں سے بعض نے اس موقع پر بیدار مغزی کا ثبوت نہیں دیا۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان فوراً ایک بہشت بن جائے حالانکہ یہ ایک سیدھی سادھی حقیقت ہے کہ ملکوں کا بننا طلسمی کھیل نہیں اس کے لئے وقت درکار ہے۔ اُنھوں نے خود اس تخلیق کے لئے کوئی تعمیری جدوجہد نہیں کی اور نہ یہ سوچا کہ قوموں کی زندگی میں وہ وقت نازک ترین اور اہم ترین ہوتا ہے جب ایک پردہ گرتا ہے، اور دوسرا پردہ اٹھتا ہے اور یہ کہ اُس وقت ایک "الہامی" حقیقت شناس اور عاقبت اندیش قیادت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن قیادت تو برطرف ان اُدبا نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ دوسرا پردہ اُٹھ چکا ہے حالانکہ یہ غضبناک لوگ اگر ان دو باتوں پر سنجیدگی سے غور کرتے، تو یقیناً وہ اپنے آپ کو بدلنے پر مجبور ہو جاتے۔ اوّل یہ کہ تحریک پاکستان کے پیچھے لاکھوں مقروض، لُٹے پٹے انسان تھے جو ہندو ساہوکاروں کے پنجے میں گرفتار تھے۔ کروڑوں مسلمانوں کو اچھوت سمجھا جاتا تھا، اور کانگریسی "جمہوریت" میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہ تھا۔ (۲) یہ کہ بین الاقوامیت بہت اچھی چیز سہی لیکن قومیتی نشوونما کے بغیر اس میں کود جانا نہ صرف توہین آمیز ہے بلکہ خطرناک بھی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے ادب نے اس نئے انقلاب کو محسوس ہی نہیں کیا۔ اس انقلاب کو ہمارے دوسرے اُدبا نے (جن میں اعتدال پسند اور قومی ترقی پسند طبقہ ہے) محسوس کیا ہے اور اپنے اپنے رنگ میں افسانے، ڈرامے، نظمیں وغیرہ لکھتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، فیض احمد فیض، قیوم نظر وغیرہ انہی اُدبا میں سے ہیں۔

اس کے برعکس ایک اور طبقہ ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ اُردو ادب اب اپنے انجام کو پہنچ چکا۔ میرے ایک رفیق کار نے (جو شاعر بھی ہیں) پاکستان کی آزادی کے بعد مجھ سے پوچھا "آپ کے خیال میں اب یعنی پاکستان کی آزادی کے بعد اُردو ادب کا مستقبل کیا ہے؟" میں نے انہیں جواب دیا "اتنا ہی شاندار جتنا خود پاکستان کا"۔ اس پر انہیں کچھ دھچکا سا لگا اور کچھ لمحوں کے بعد اُنھوں نے ایک بڑے ڈاکٹر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "ان کا خیال تو یہ ہے کہ اب اُردو ادب میں جان نہیں رہے گی کیونکہ ہم آزاد ہو چکے ہیں"۔

میں نے یہ بات اِس لئے لکھی ہے کہ پاکستان کی آزادی کے بعد ہمارے ادب کے متعلق کچھ اور لوگوں کا بھی یہی خیال ہے اور یہ ہمارے ملک تک ہی محدود نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی ایسے قنوطی جوتشی موجود ہیں۔ میں اس نظریئے کو غلط سمجھتا ہوں کیونکہ پاکستان کے حصول کے بعد ہمارے تمام مسائل حل نہیں ہو گئے بلکہ بعض مسائل اور زیادہ شدید ہو گئے ہیں۔ مہاجرین کی آمد نے ان مسائل کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب ادب میں جان نہ رہے۔ تصوّراتی طور پر پاکستان ایک ذہنی بہشت تھا لیکن واقعی طور پر پاکستان بہشت نہیں بلکہ ایک ملک ہے، ایک نیا ملک جس کے لوگ ابھی نوزائیدہ ہیں، جس کے بعض کوہ و صحرا پہلی دفعہ انسانی شور و شغب سے آشنا ہوئے ہیں، جس کی پرانی آبادی اپنی پرانی ڈگر پر جا رہی ہے اور نئی آبادی لُٹ پٹ کر پریشان حال ہو کر آئی ہے، جسے فوری دفاعی خطرے درپیش ہیں، جہاں کے

فی صدی سے زیادہ عوام ابھی تک بے تعلیم ہیں، جہاں لاکھوں پرانے اور نئے بھکاری ہیں، جہاں کروڑوں مزارعین اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے نوکروں کی طرح رہتے ہیں، جہاں بہت سی ضروریاتِ زندگی باہر کے ملکوں سے درآمد کرنی پڑتی ہیں، جہاں بعض قوم فروش غدّار ابھی تک بغاوت کے مراکز سے منسلک ہیں، جہاں کئی حکّام ابھی تک انگریزی زمانے کے خواب دیکھ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ وہ ملک ہے جسے حاصل کرنے کے لئے لاکھوں انسانوں نے بیش بہا مالی اور جانی قربانیاں دی ہیں، جہاں کے باشندے جوان، تازہ دم، محنتی اور آزادی پسند ہیں اور یہ وہ ملک ہے جو تمام اسلامی ممالک اور مظلوم ایشیا کی آخری امیدگاہ ہے!

کیا ان حالات میں ہمارے ادب کا کام ختم ہو چکا؟ کیا محض سیاسی انقلاب ہی ادب کا مقصد تھا؟ کیا پاکستان سے پہلے کا ادب پاکستانی تھا؟ کیا ادب کی قدر و قیمت اور قوت انقلاب کی آمد تک ہے؟ کیا محض سیاسی انقلاب ہی انقلاب ہے؟ کیا دوسرے ممالک میں انقلاب کے بعد ادب ختم ہو گیا تھا یا اس میں جان نہیں رہی تھی؟ —— ان سوالات کا جواب پُرزور نفی میں ہے۔ جب تک یہاں اخوّت، مساوات اور حرّیت کا دَور دورہ نہیں ہو جاتا اُس وقت تک ادیب کیسے چُپ رہ سکتا ہے! اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ اُس وقت بھی جب یہ تمام عقدے حل ہو جائیں بلکہ اُس وقت تک کہ انسانی زندگی اِس کُرۂ خاکی پر موجود ہے، ادب کیسے مُہر بلب رہ سکتا ہے؟ اس کا کام تو ابد تک زندگی کی تنقید اور رہنمائی کرنا ہے۔ اور یہاں تو بقول غالبِ بخاری ع

ابھی آغازِ سفر ہے ابھی رُکنا کیسا؟

غرض کہ ادب زندہ رہے گا لیکن پاکستانی ادب محض پرانے ادب کا ایک تسلسل نہ ہوگا۔ پاکستان کی آزادی سے بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور بہت سے نئے موضوعات پر لکھنے کی ضرورت ہے۔ اب پاکستانی ادب محض ایک نابینا اور نااندیش ادب نہیں رہ سکتا بلکہ اسے ایک شعوری، ارادی اور باقاعدہ تحریک بننا ہے۔

مَیں پاکستانی ادب کی مشکلات سے بے خبر نہیں ہوں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اعلیٰ ادب پیدا کرنے کے لئے ایک متفقہ اور سرتوڑ کوشش کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ ادب کو ایک ہمدرد، وقت شناس اور ادب نواز حکومت، ایڈیٹر، ناشر، عوام اور اُدبا کے ایک صالح امتزاج اور تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسے معاشی نظام کی جس میں انسان محتاج نہ ہو اور وہ اپنی خودداری قائم رکھ سکے، پاکستان محض گورنمنٹ آف انڈیا کا تسلسل نہیں ہے۔ اگر اس کے معاشی نظام میں کوئی فوری تبدیلی نہیں ہو سکی تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ حکومت وہ تبدیلی نہیں چاہتی بلکہ یہ وجہ ہے کہ پاکستان کو شدید دفاعی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

اِس لئے پاکستانی ادیب کا نقطۂ نظر یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان دوسروں کا محتاج نہ رہے، نہ کسی سے خائف ہو اور نہ پاکستانی ادیب ہی کسی کا دستِ نگر یا کسی سے مرعوب ہو! اور اگر خدانخواستہ عمّالِ حکومت میں سے بعض میں انگریزیت باقی ہے اور اُن میں نئی انقلابی روح نہیں آئی تو بھی پاکستانی اُدبا کا فرض ہے کہ وہ ملک کے حسّاس ترین افراد ہونے کی حیثیت سے ایسے بے حس افراد کو صحیح احساسات سے بہرہ ور کریں۔ اُدبائے پاکستان سے ملک کو کیا توقعات ہیں اور اُن کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس کے متعلق میں اِس مضمون کی آئندہ قسط میں اظہارِ خیال کروں گا ✦

نظم، غزل اور گیت

طلوع

مسعود اشعر (از رام پور)

پُرہول اندھیری بیت گئی کرنوں نے بانہیں پھیلائیں
چاندی کی چھڑیاں برسائیں
دم توڑتی رات کے اشکوں سے پُر ہو کر کلیاں مُسکائیں

ماضی کے فسانے خواب ہوئے مستقبل کا آنچل سرکا
دل کانپ گیا دُنیا بھڑکا
سب ڈھکی چھپی باہر آئی، سب بھیدوں کا پردہ اُٹھا

افکار نے وہ چولا بدلا اقوال کا جادو ٹوٹ گیا
ہر جھوٹا ساتھی چھوٹ گیا

اسیرانِ طلسمِ وہم سے آزاد یہ کہہ دو
یہ رنگ و نور و نکہت کا ہجومِ بیکراں کب تک

گیت

مقبول احمد پوری راز لکھنؤ

بڑھے چلو راہِ جستجو پر زمانہ خود سازگار ہوگا
خمار زائل ہو غفلتوں کا تو فضلِ پروردگار ہوگا
بچی رہے دُھن جو کھوج کی تو اُبھاؤ[1] بھر جائینگے دلوں کے
یہ جال سپنوں کی موہ مایا کا ٹوٹ کر تار تار ہوگا

خرد سے خورسند ہو جوانی ہے زخمہ زن سازِ زندگانی
جنوں خروشِ خزاں لیئے تھا، خرد خرامِ بہار ہوگا
ابھی جو بھرمائے[2] اور جھولے ترنگ دل میں نہ چال میں گت[3]
رکھو جو مشتک[4] کو اپنے اونچا بھرم کا گھیرا ابھی پار ہوگا

نظر میں ناکامیاں اگر ہیں تو دل سے جولانیاں نہ جائیں
جو خار پیرا خزاں ہے کیا غم، بہار کو بھی قرار ہوگا

[1] "عدم حصول مقصد" [illegible]

نبھاؤ نج[5] نیہہ[6] کا نیم[7] وہ جو اُر[8] میں پتھر کے گھاؤ کر دے
سمٹ کے پاپی کے دل کا سب پاپ، آپ ہی آپ بھار[9] ہو گا

قدم قدم پر قریب چھوٹے سے ساحلوں کی قطار بھی ہے
نہ اِن سے ٹکراؤ تم خدارا، کہ سعیٔ منزل پہ بار ہو گا
پھنسو نہ پھسلانیوالے موہوں[10] میں، سادھنا[11] کا سدھار[12] سادھو
اِسی میں جیون کی سِدھیوں[13] کا وِکاس[14] ہو گا اُبھار ہو گا

خرد کا مضبوط ہو سفینہ تو کیا کرے گا جنوں کا کینہ
فنا کے دھارے بھی دم میں ہارینگے خود پہ گر اختیار ہو گا
ہیں ویدنائیں[15] بڑی مدھر[16] وہ، دِگدھ[17] رہتیں وِویک[18] سے جو
اتھل پتھل میں بھی دھیر[19] دھیرج کی جن سی ساہس[20] اپار[21] ہو گا

بڑھے چلو راہِ جستجو پر، زمانہ خود سازگار ہو گا!

---

[5] اپنا، [6] خلوص، [7] دستور، [8] دل، [9] بوجھ، [10] لالچ، [11] ریاضت، [12] سنبھالو،
[13] تکمیل، [14] نشو و نما، [15] سوزِ دروں، [16] شیریں، [17] دہکتی ہوئی،
[18] عقل، [19] شکیب فراز، [20] ہمت، [21] انتہا،

امین الرحمٰن

بہار کی ایک صبح

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

کردار

شاہدہ۔ اٹھارہ برس کی ایک خوش شکل لڑکی۔ دھیمے انداز میں گفتگو کرنے کی عادی ہے۔ اور اُس کی گفتگو کے دوران میں خاموشی کے وقفے اکثر آتے رہتے ہیں۔

تسنیم۔ شاہدہ کی چچیری بہن، اُس سے دو ایک برس عمر میں چھوٹی۔ شاہدہ کے برعکس تیز تیز باتیں کرنے کی عادی۔ باتوں کے دوران میں جا و بیجا ہنستی چلی جاتی ہے۔

نسیم۔ تسنیم کا حقیقی بھائی۔ عمر چوبیس برس کے قریب۔

آصف۔ ان کا ایک قریبی عزیز۔ نسیم کا تقریباً ہم عمر۔ سنجیدہ مزاج۔

مقام۔ لاہور۔

زمانہ۔ ۱۹۴۷ء۔

(موسم بہار کی ایک صبح۔ شاہدہ کا ڈرائنگ روم۔ کھڑکیوں پر سے پردے کھینچ لئے گئے ہیں تاکہ کمرے میں بہار کی ہوا آتی رہے۔ بڑی کھڑکی میں سے باغ کا کچھ منظر دکھائی دے رہا ہے۔ شاہدہ کھڑکی کے قریب کھڑی صوفے پر ایک پاؤں رکھے کھڑکی میں سے منہ نکالے باغ کی طرف دیکھ رہی ہے۔ باہر سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کسی پرندے کے چہچہے سنائی دیتے ہیں۔ تسنیم مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ شاہدہ اُس کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی صوفے پر پڑے ہوئے کشیدہ کاری کے فریم کو اُٹھا لیتی ہے)

تسنیم۔ شاہدہ باجی! شاہدہ باجی! توبہ اللہ کوئی اتنے اچھے موسم میں بھی کمرے کے اندر بیٹھتا ہے۔ ہائے اللہ ہم سے تو نہیں بیٹھا جاتا ایسے اچھے موسم میں، اُٹھو بھی نا باجی!

شاہدہ۔ (چڑ کر) تو اُٹھ کر کوئی کیا کرے؟

تسنیم۔ ہائے کیا کہا؟ (اسی کے الفاظ دُہرا کر) اُٹھ کر کوئی کیا کرے؟ کرے کیا باغ میں چل کر نہ پھرے۔ ایسی اچھی صبح بھلا روز روز آتی ہے۔ امی بہتیرا ہی روکتی رہیں بھاگ ہی آئی۔ باجی اب چھوڑ دیجی نا اِس کم بخت کشیدے کو۔ ہائے بھلا

یہ بھی کوئی وقت ہے اِس کا۔ ذرا کھڑکی میں سے تو دیکھو....

شاہدہ۔ (بے پروائی سے) کیا دیکھوں ؟

تسنیم۔ (اُسی کے الفاظ دُہرا کر) کیا دیکھوں ؟ توبہ اللہ یہ بھی معلوم نہیں کہ کونسا موسم جا رہا ہے..... بہار ہے! بہار!!

شاہدہ۔ (نہایت بے پروائی سے) تو پھر کیا ہوا۔ آخر ہر سال ہی تو آتی ہے بہار، کونسی انوکھی بات ہے ؟

تسنیم۔ (طنز سے) ٹھیک ہے آخر ہر سال ہی تو آجاتی ہے بہار.

شاہدہ۔ شاید میں نے کوئی بہت ہی مضحکہ خیز بات کہدی ہے...

تسنیم۔ نہیں تو۔ پر نجانے کون کمبخت ہے جس نے کہا ہے بہار زندگی میں صرف ایک ہی بار آتی ہے۔

شاہدہ۔ کہا ہوگا، کسی بے تکے شاعر نے، ایسی باتیں اُنہیں ہی سوجھتی ہیں، پر مجھے اچھی نہیں لگتیں۔

تسنیم۔ باتیں تو خیر باجی تمہیں بہت سی اچھی نہیں لگتیں۔ کہوں تو بُرا مان جاؤ گی۔

شاہدہ۔ نہیں ضرور کہہ دو!

تسنیم۔ نا بھئی ہم نہیں کہتے، تمہیں کوئی ناراض تھوڑا ہی کرنا ہے باجی۔ اچھی باجی آؤ بھی نا ذرا باغ میں چلیں۔ چھوڑو بھی نا اِس کردشتے کو، میں بھی تو ہوں نا امی کے کتنے ہی کام چھوڑ چھاڑ تمہارے پاس بھاگ آئی ہوں۔ ہائے اللہ باجی پھر دھوپ آجائے گی نا باغ میں.....

شاہدہ۔ اتنا بھی باغ کا کیا خبط ؟

تسنیم۔ سو کام چھوڑ کر آئی ہوں، آپا شائستہ کو اُسکی شادی پر امی جو جوڑا دے رہی ہیں اُس کے دوپٹے میں پلّا ٹانک رہی تھی کہ تمہارا خیال آگیا، بھاگ ہی آئی، امی آوازیں ہی دیتی رہ گئیں۔

شاہدہ۔ پر آصف بھائی بھی تو آج صبح سے آپ کے یہاں آئے ہوئے ہیں ؟ حیرت ہی ہے کہ تم یہاں آجاؤ۔

تسنیم۔ بس اتنی سی بات پر حیرت ؟

شاہدہ۔ نہیں کوئی خاص حیرت کی بات بھی نہیں..... لیکن خیر چھوڑو یہ قصّہ۔

تسنیم۔ کونسا قصّہ ؟ باجی سچ سچ کہو! میرے متعلّق تمہارا دل صاف نہیں ہے، میں بھلا جانتی نہیں۔

شاہدہ۔ میرا دل صاف نہیں ؟

تسنیم۔ یہ تو کہنے کی باتیں ہیں باجی۔ ذرا اپنے دل کو بھی ٹٹولا ؟

شاہدہ۔ کیوں دل میں کیا ہے ؟

تسنیم۔ باجی تم خود اچھی طرح سے جانتی ہو، اِس میں میرا کیا قصور ؟

شاہدہ۔ میں نے کبھی کسی کا نام لیا ہے ؟

تسنیم۔ صاف صاف کہہ دُوں باجی بُرا تو نہ مانوگی ؟

شاہدہ۔ صاف صاف کیا کہہ دوگی ؟

تسنیم۔ باجی میں کیسے یقین کر لُوں تمہیں کچھ معلوم نہیں ؟ توبہ اللہ کس مصیبت میں جان آگئی ہے۔

شاہدہ۔ تمہاری جان کس مصیبت میں آگئی ہے ؟

تسنیم۔ دیکھو باجی میں بھلا کوئی بچی ہوں، جانتی نہیں ہوں اِن باتوں کو۔ اگر آصف بھائی کسی وجہ سے آپ کے یہاں نہیں آتے تو اِس میں میرا کیا قصور ؟

شاہدہ۔ (پریشان ہو کر) یہ تم کیا کہہ رہی ہو تسنیم، تم سے کس نے صفائی پیش کرنے کے لئے کہا ہے ؟

تسنیم۔ میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں باجی!

شاہدہ۔ (تقریباً رُوانسی ہو کر) ٹھیک ہو یا غلط مجھے قطعاً کوئی

دلچسپی نہیں ایسی باتوں سے۔

تسنیم۔ پر باجی میں تمہیں اپنی طرف سے یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کم از کم مجھے اُن سے (دبی زبان سے) آصف بھائی سے کوئی دلچسپی نہیں۔

شاہدہ۔ (چڑ کر) اور اگر ہو بھی تو مجھے کیا، مجھے کیا؟

تسنیم۔ توبہ اللہ! میں آئی تھی سو کام چھوڑ کر، شائستہ کے دوپٹے میں لچکا ٹانکنے کا کام بھی ابھی ختم نہیں ہوا۔ امی جان میری جان کو رو رہی ہوں گی۔ اچھا تو پھر میں جاتی ہوں۔

(جانے لگتی ہے)

شاہدہ۔ نہیں نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں۔

تسنیم۔ تم ناراض ہو گئی ہو۔

شاہدہ۔ (دبی زبان سے) نہیں ناراض تو نہیں ہوئی۔

تسنیم۔ ہائے میری اچھی باجی خدا کے لئے اتنے اچھے موسم میں مجھ سے ناراض مت ہونا دیکھو تو باغ میں سے کتنے ہی پرندوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

شاہدہ۔ مجھے اِن کم بخت پرندوں کی آوازیں ذرا نہیں بھاتیں، ہر وقت میری کھڑکی کے نیچے چہچہاتے رہتے ہیں، سر میں بھی درد ہو جاتا ہے۔

تسنیم۔ ہائے اللہ! کتنی اچھی صبح تھی پر کیسے برباد گئی۔ اب تھوڑی دیر میں باغ میں دھوپ ہی دھوپ آجائیگی۔

شاہدہ۔ (جیسے موضوع بدلنا چاہتی ہو) شکر ہے آخر شائستہ کی بھی نسبت ہو گئی۔

تسنیم۔ کیوں؟

شاہدہ۔ خاندان میں تو شادی ہونے سے رہی تھی، میری طرح معمولی شکل و صورت ہی کی تو ہے نا بے چاری!

تسنیم۔ اچھا رشتہ مل گیا ہے، آپا اُلفت کی سسرال میں سے ہے لڑکا۔

شاہدہ۔ معمولی حیثیت کا سُنا ہے۔

تسنیم۔ پر سبھی رشتے کو پسند کر رہے ہیں۔

شاہدہ۔ (آپ ہی آپ) چلو شائستہ کے لئے اِس سے بہتر اور رشتہ کیا ہوتا، کون سی حور رہ گئی ہے معمولی شکل تو ہے بے چاری کی میری طرح، رنگ البتہ سفید ہے، پر وہ بھی جیسے کسی نے پاؤڈر کی بجائے میدہ چہرے پر بُرک رکھا ہو۔ اور پھر کبھی بھویں اتنی موٹی نہ ہوتیں نا اُس کی۔

تسنیم۔ خیر یہ تو نہ کہو باجی۔ شائستہ کے رنگ کے تو سبھی مدّاح ہیں، معلوم نہیں پرسوں بھائی جان سے کون کہہ رہا تھا کہ رنگ ہو تو ایسا ہو، ہاں ندیم بھائی ہی تو ذکر کر رہے تھے۔

شاہدہ۔ ندیم بھائی جان کا کیا ہے، وہ تو شمسہ کی ناک کو بھی خوبصورت سمجھتے ہیں، حالانکہ سبھی جانتے ہیں کہ شمسہ کی ناک ہی تو لے ڈوبی ہے اُس کے چہرے کی ساری خوبصورتی کو۔ کبھی اِتنی پتلی نہ ہوتی نا اُس کی ناک۔

تسنیم۔ اصل میں بات یہ ہے شاہدہ باجی تم جس معیار پر لوگوں کو پرکھتی ہو اُس پر تو شاید ہی کوئی خوش قسمت پُورا اترے ہم نے مانا تمہاری صورت ہم سب سے اچھی ہے پر آخر ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خوبی تو ہوتی ہی ہے نا؟

شاہدہ۔ ہاں ہوتی کیوں نہیں؟ مانتی ہوں ناکہ شائستہ کا ماتھا خوبصورت ہے، اگرچہ بے چاری کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ (ہنستے ہوئے) تر یہ سبھی تو ہیں۔

تسنیم۔ باجی تم شائستہ کی شادی پر جاؤ گی؟
شاہدہ۔ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اگر وقت ملا تو شاید جا سکوں۔
تسنیم۔ باجی آخر تم رشتہ داروں سے ملنے جلنے سے اتنا کتراتی کیوں ہو؟
شاہدہ۔ رشتہ دار بھی تو ہوں کسی کام کے!
تسنیم۔ میں تو سمجھتی ہوں باجی رشتے دار پھر بھی رشتے دار ہوتے ہیں، خواہ کوڑی کے ہوں۔
شاہدہ۔ امی اور ابا جان جو ملتے رہتے ہیں، پھر مجھے ان لوگوں سے ملنے کی کیا ضرورت ہے؟
تسنیم۔ مانا اختر، زاہدہ اور کلثوم ہماری طرح کالجوں میں نہیں پڑھتیں لیکن پھر بھی تمہاری قریبی رشتے دار ہیں۔ میں نے نہیں دیکھا کبھی تم نے اُن سے دلچسپی لی ہو؟
شاہدہ۔ (طنز سے) اونہہ! دلچسپی اُن سے کوئی کیا لے، نہ بات کرنے کا سلیقہ انہیں نہ کپڑے پہننے کا ذوق، کلثوم کو دیکھا تھا اُس دن آپا زاہدہ کے ہاں؟ خیر سے ناخن پالش کرکے آئی تھیں۔ مجھے تو اُس کے ناخن دیکھ کر متلی ہوگئی۔ ہاں سچ کہتی ہوں تسنیم۔
تسنیم۔ توبہ! باجی تم بھی تو غضب کرتی ہو۔ لوگوں کو ذلیل کرنے میں تمہیں لطف آتا ہے۔ اچھا تو باہر چلو گی باغ میں؟ تم سے ایک ضروری بات کہنی تھی اصل میں۔
شاہدہ۔ (چونک کر) کیا بات؟
تسنیم۔ کوئی بات ہے۔
شاہدہ۔ یہیں کیوں نہیں بتا دیتیں؟
تسنیم۔ لمبی باتیں ہیں۔ باغ ہی اچھا ہے ایسی باتوں کے لئے۔
شاہدہ۔ آخر کچھ پتا تو چلے؟
تسنیم۔ صاف صاف کہہ دوں؟ بُرا تو نہیں مانو گی؟
شاہدہ۔ کیا صاف صاف کہہ دو گی؟
تسنیم۔ (رک رک کر) دیکھو باجی تمہیں یہ خیال ہے کہ آصف بھائی میری وجہ سے تمہارے یہاں نہیں آتے۔
شاہدہ۔ (پریشان ہوکر) مجھے ـــــ یہ تم کیا کہہ رہی ہو تسنیم؟
تسنیم۔ میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں باجی!
شاہدہ۔ (چڑ کر) مجھے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ایسی باتوں سے۔
تسنیم۔ لیکن تمہیں آصف بھائی سے تو......
شاہدہ۔ (تقریباً چلا کر) میں کچھ نہیں سنوں گی۔ مجھے کسی سے دلچسپی نہیں۔
تسنیم۔ یہ تو میں کبھی مان نہیں سکتی۔ اب نہ ہو لیکن کبھی تو تھی تمہیں دلچسپی اُن سے۔
شاہدہ۔ غلط ہے بالکل غلط۔ لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ کیا تم میرا مذاق اتنا ہی پست سمجھتی ہو؟
تسنیم۔ اُف توبہ! باجی تم آصف بھائی کی توہین کر رہی ہو؟
شاہدہ۔ (غصے میں) لیکن تم لوگ ایسی باتیں کرکے میری توہین نہیں کرتے؟
تسنیم۔ باجی غصے میں نہ آؤ۔ اس میں توہین کیسی؟ کسی سے دلچسپی لینے میں توہین کا کیا ذکر؟
شاہدہ۔ بس تسنیم میں ہرگز یہ باتیں نہیں سنوں گی۔
تسنیم۔ دیکھو باجی خفا نہ ہوئیں تو دراصل تمہیں اپنی طرف سے یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ مجھے کم از کم اُن سے کوئی دلچسپی نہیں۔
شاہدہ۔ اور اگر ہو بھی تو مجھے کیا؟

تسنیم۔ میرا خیال ہے شاہدہ باجی کسی زمانے میں آصف بھائی تمہیں بہت پسند کیا کرتے تھے۔ تمہاری ہر بات کو پسند کرتے تھے، لیکن اب کیا بات ہے، میرا خیال ہے تمہارے متعلق اب اُن کی رائے ...... (بات فوراً ہی بدل کر) لیکن شاہدہ نہیں بھئی مجھے ایسی باتیں کہنے کا کیا حق ہے!

شاہدہ۔ (تقریباً روانسی ہو کر) کہہ دو، کہہ دو،

(رونے لگتی ہے)

تسنیم۔ ارے! باجی تم تو رونے لگ گئیں۔ ہائے میرے اللہ، دیکھا اسی لئے میں یہ باتیں کرنا پسند نہ کرتی تھی۔ ہائے باجی خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔

شاہدہ۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) میں جانتی ہوں تسنیم کچھ دنوں سے تم مجھے چڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

تسنیم۔ نہیں شاہدہ باجی یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں تو چاہتی تھی کہ میرے متعلق تمہارے دل میں جو میل آ گیا ہے وہ دُور ہو جائے۔ (باہر سے نسیم کی آواز آتی ہے) لو نسیم بھائی آ رہے ہیں۔ ہائے تو بکتی ابھی ساری صبح یونہی برباد گئی....

(دروازے پر دستک کی آواز)

شاہدہ۔ (جلدی سے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے) نسیم بھائی آپ ہیں، آ جائیے۔

نسیم۔ (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) تسنیم تم یہاں مزے سے بیٹھی ہو، اور اُدھر امی جان تمہیں ڈھونڈھ رہی ہیں۔

تسنیم۔ میں تو امی جان سے کہہ آئی تھی اچھا تو آصف بھائی چلے گئے؟

نسیم۔ نہیں ابھی تو وہیں تھے۔

تسنیم۔ اُنہیں تو یہاں بھی آنا تھا

نسیم۔ تم جاؤ بھی نا! امی انتظار کر رہی ہیں......

تسنیم۔ (جھلا کر) توبہ امی جان کہیں بیٹھنے بھی نہیں دیتیں۔

(کمرے سے باہر چلی جاتی ہے)

نسیم۔ کیا باتیں ہو رہی تھیں؟

شاہدہ۔ کچھ بھی نہیں۔ (خاموش رہتی ہے)

نسیم۔ خاموش کیوں ہو، میرا آنا ناگوار گزرا ہے؟

شاہدہ۔ کیا آپ کا آنا مجھے ناگوار گزرا کرتا ہے؟

نسیم۔ میں سمجھا شاید اِس وقت ناگوار گزرا ہے، کیونکہ....

شاہدہ۔ کیا؟

نسیم۔ کچھ نہیں، آج آصف آیا ہوا تھا۔ عجیب آدمی ہے۔

(طنزاً ہنستا ہے)

شاہدہ۔ کیوں؟

نسیم۔ بنتا بہت ہے۔

شاہدہ۔ آپ کی کیوں اُن سے نہیں بنتی؟

نسیم۔ نہیں بنتی؟ تمہیں کیسے معلوم ہے؟

شاہدہ۔ آپ کی باتوں سے اکثر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

نسیم۔ کیا واقعی؟

شاہدہ۔ میرا تو یہی خیال ہے۔ کوئی بات تو ہو گی؟

نسیم۔ ہو گی، پر چھوڑو یہ باتیں شاہدہ۔ اِتنے اچھے موسم میں کون بیٹھتا ہے کمرے میں۔ باہر باغ میں چلیں؟

شاہدہ۔ ابھی تسنیم بھی مجھ سے یہی کہہ رہی تھیں پر میرا جی نہیں چاہتا۔

نسیم۔ جی کیوں نہیں چاہتا؟ طبیعت ناساز ہے؟

شاہدہ۔ نہیں تو۔

نسیم۔ تو پھر؟

شاہدہ۔ بس ایسے ہی۔

نسیم ۔ تم نے غور کیا آج کل کا موسم بھی کیسا ہے، یا تو طبیعت یکلخت بشاش ہو جاتی ہے یا یکلخت اُداس، ویسے بہار کے موسم میں تو طبیعت زیادہ ہشاش بشاش رہنی چاہیئے۔

شاہدہ ۔ میرے لئے تو سب موسم ایک جیسے ہیں۔ مَیں تو نہیں سمجھتی کسی ایک موسم کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

نسیم ۔ شاہدہ تمہاری بھی عجیب عادت ہے۔ جو لوگ تمہیں دُنیا جہاں سے نرالا سمجھتے ہیں سچے ہیں۔

شاہدہ ۔ وہ آخر ہیں کون؟

نسیم ۔ اپنی امّی جان ہی کو لے لو۔ پھر تمہارے تایا جان ہیں پھر اپنے ماموں جان کو لے لو۔ رفعت، سعیدہ اور کلثوم کو تو خیر چھوڑ دو۔

شاہدہ ۔ رفعت، سعیدہ اور کلثوم کی رائے کو تو میں کوئی رائے سمجھتی ہی نہیں۔

نسیم ۔ بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔

شاہدہ ۔ تو خیر چھوڑیئے اِسے۔ سُنا ہے آصف بھائی آپ کے یہاں آئے ہوئے ہیں۔

نسیم ۔ کیا بات ہے اب آصف آپ کے یہاں نہیں آتا کوئی خاص بات ہے؟

شاہدہ ۔ مَیں تو نہیں سمجھتی۔

نسیم ۔ کچھ تو ہوگی، کوئی وجہ؟

شاہدہ ۔ وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ آپ کے خیال میں کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

نسیم ۔ میرے خیال میں؟ مَیں کسی کے دل کا حال کیا جان سکتا ہوں۔ لیکن کوئی وجہ تو ہوگی نا، صاف صاف کہدوں؟

شاہدہ ۔ کیا؟ (چونک کر)

نسیم ۔ اِس کی وجہ مَیں تو نہیں؟

شاہدہ ۔ (چونک کر) آپ؟ وہ کیسے؟

نسیم ۔ میرا خیال ہے۔

شاہدہ ۔ آپ کا خیال ہے۔ مَیں تو یہ نہیں سمجھتی۔

نسیم ۔ تم آصف کو نہیں جانتیں شاہدہ۔

شاہدہ ۔ مَیں اُنہیں بھی اتنا ہی جانتی ہوں جتنا آپ کو، بلکہ آپ سے زیادہ اُنہیں جانتی ہوں۔

نسیم ۔ وہ کیسے؟

شاہدہ ۔ وہ تو شروع ہی سے ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے وہ پڑھنے لکھنے اور دوسرے کاموں میں زیادہ مصروف رہتے ہیں اِس لئے نہیں آتے۔

نسیم ۔ (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) شاید! شاید!

شاہدہ ۔ مَیں تو کم از کم یہی سمجھتی ہوں۔

(باہر سے تسنیم اور آصف کے باتیں کرنے کی آواز آتی ہے)

تسنیم ۔ (داخل ہوتے ہوئے) لو باجی مَیں آصف بھائی کو لاتی ہوں۔

شاہدہ ۔ آداب عرض آصف بھائی۔

آصف ۔ آداب۔

تسنیم ۔ کتنی مدت بعد آصف بھائی آپ آج یہاں آئے ہیں؟

آصف ۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کل کی بات ہو، اِس کمرے کا نقشہ بالکل وہی ہے جو آج سے چھ مہینے پہلے تھا مَیں غالباً پچھلی گرمیوں میں آیا تھا آپ کے یہاں؟

شاہدہ ۔ جی ہاں۔

نسیم ۔ اچھا شاہدہ مجھے اجازت دیجئے۔

شاہدہ ۔ ہیں؟ امّی جان سے ملے ہیں آپ؟

نسیم ۔ وہ تو غالباً غسل خانے میں ہیں، اُن سے بھی مل لُوں گا۔
تسنیم تم چلوگی میرے ساتھ یا یہیں بیٹھوگی ؟

تسنیم ۔ نہیں بھائی جان! مَیں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں، امّی جان میرا انتظار کر رہی ہیں۔ شاہدہ باجی مَیں تھوڑی دیر بعد پھر آؤں گی۔

(تسنیم اور نسیم دونوں جاتے ہیں)

شاہدہ ۔ آپ واقعی ہمارے گھر بہت مدت کے بعد آئے ہیں!

آصف ۔ جی ۔

شاہدہ ۔ مَیں وجہ پوچھ سکتی ہوں ؟

آصف ۔ وجہ ؟

شاہدہ ۔ جی ہاں ۔

آصف ۔ وجہ تو کوئی نہیں۔ بس کچھ جی ہی نہیں چاہتا ۔

شاہدہ ۔ لیکن آپ دوسرے عزیزوں کے گھروں میں تو آتے جاتے ہیں ؟

آصف ۔ جہاں تک میرا خیال ہے بہت ہی کم آتا جاتا ہوں کوئی خاص ضرورت ہی ہو تو جاتا ہوں ورنہ نہیں ۔

شاہدہ ۔ لیکن جہاں تک مَیں سمجھتی ہوں آپ بڑے ممانی جان کے یہاں تو اکثر جاتے ہیں ۔

آصف ۔ مہینے میں شاید ایک بار! لیکن آپکو اِس سے کیا دلچسپی ؟

شاہدہ ۔ مجھے ہونی تو نہیں چاہیئے، لیکن میرا خیال ہے آپ وہاں جس غرض کے لئے جاتے ہیں، اُس سے مجھے ضرور دلچسپی ہے ۔

آصف ۔ (گھبرا کر) کس غرض کے لئے ؟ مَیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ؟

شاہدہ ۔ آپ نہیں جانتے ؟ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے ؟

آصف ۔ آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے ؟

شاہدہ ۔ میرا اشارہ خواہ کسی کی طرف ہو، لیکن کیا آپ اِس بات سے اِنکار کر سکتے ہیں ؟

آصف ۔ اگر مَیں آپ کی بات کو سچ تسلیم کر لوں تو پھر ؟

شاہدہ ۔ تو پھر مَیں آپ سے یہ کہوں گی کہ آپ جس کی خاطر وہاں جاتے ہیں، اُسے قطعاً آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ۔

آصف ۔ (گھبرا کر) کوئی دلچسپی نہیں یہ آپ کو کیسے معلوم ہے ؟

شاہدہ ۔ اِس لئے کہ مجھے خود اُس کی زبانی معلوم ہوا ہے !

آصف ۔ آپ کا اشارہ غالباً تسنیم کی طرف ہے !

شاہدہ ۔ جی ہاں، اور جتنی آپ کو اس سے دلچسپی ہے ۔ اُتنا ہی وہ آپ کا ذکر رُکھائی سے کرتی ہے ۔

آصف ۔ (پھیکی سی ہنسی سے) لیکن کیا آپ سمجھتی ہیں کہ مجھے اُس سے واقعی کوئی دلچسپی ہے ؟

شاہدہ ۔ وہ تو ظاہر ہے ۔ آپ اُس کی ہر بات کے مدّاح ہیں ۔ تسنیم خوبصورت ہے، سلیقہ شعار ہے ، ذوق بہت اچھا ہے ، بال کسی کے اچھے ہیں تو تسنیم کے، آنکھیں تو خیر تسنیم کی مانی ہوئی ہیں ۔

آصف ۔ یعنی یہ کہ آپ میرے دل کی ترجمانی کر رہی ہیں ؟

شاہدہ ۔ جی ہاں !

آصف ۔ لیکن کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ واقعی تسنیم کے متعلق میرے یہی خیالات ہیں ؟

شاہدہ ۔ جی ہاں، مَیں نے حرف بحرف آپ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے ۔

آصف ۔ تو معاف کیجئے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے !

شاہدہ ۔ غلط فہمی ہوئی ہے وہ کس طرح ؟

آصف۔ مجھے تسنیم سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں!

شاہدہ۔ (حیران ہو کر) قطعاً کوئی دلچسپی نہیں؟

آصف۔ جی ہاں۔ مَیں سچ کہہ رہا ہوں!

شاہدہ۔ مجھے آپ بنا رہے ہیں؟

آصف۔ کم از کم مَیں لوگوں کو بنایا نہیں کرتا۔ مَیں سچ کہہ رہا ہوں۔

شاہدہ۔ تو کیا آپ تسنیم کے مدّاح نہیں ہیں؟ آپ کو اُس کی باتیں پسند نہیں ہیں؟

آصف۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ میری ایک عزیز ہے مَیں اُس کی بعض باتوں کو پسند کرتا ہُوں لیکن جہاں تک اُس سے دلی جذبات کی وابستگی کا تعلق ہے مجھے اُس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

شاہدہ۔ کوئی دلچسپی نہیں۔ واقعی؟

آصف۔ جی ہاں۔ کیونکہ مَیں سمجھتا ہوں کہ بعض انسان زندگی میں صرف ایک بار ہی محبت کر سکتے ہیں۔ کامیاب یا ناکام۔

شاہدہ۔ مَیں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی تھی۔

آصف۔ وہ کیا؟

شاہدہ۔ آپ کو میرے متعلق غلط فہمی ہے۔

آصف۔ شاید!

شاہدہ۔ آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے نسیم صاحب سے دلچسپی ہے؟

آصف۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ آپ کے متعلق ایسی باتیں سوچنے کا مجھے کوئی حق ہے!

شاہدہ۔ نسیم صاحب کو مَیں اپنا ایک ویسا ہی عزیز سمجھتی ہوں جیسے میرے دوسرے عزیز ہیں جلیل، قدیر وغیرہ!

آصف۔ لیکن آپ کو یہ اعتراف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

شاہدہ۔ تاکہ آپ کی غلط فہمی دُور ہو جائے!

آصف۔ یعنی نسیم سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں!

شاہدہ۔ لیکن یہ مَیں مانتی ہوں کہ اُنہیں ضرور مجھ سے دلچسپی ہے۔

آصف۔ لیکن شاہدہ مجھے معاف کیجئے اگر مَیں ایک بات صاف صاف کہہ دُوں؟

شاہدہ۔ (گھبرا کر) کیا؟

آصف۔ آپ نے میری طرح اب نسیم کو ایک غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے!

شاہدہ۔ آصف بھائی آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

آصف۔ مَیں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہُوں!

شاہدہ۔ آپ کا اِس سے مطلب کیا ہے؟

آصف۔ مطلب تو صاف ہے۔ دیکھئے اگر مَیں کُھلم کُھلا کہہ دُوں تو آپ بُرا تو نہ مانئے گا؟

شاہدہ۔ (بجھے ہوئے دل سے) نہیں آپ بے خطر کہہ دیجئے!

آصف۔ دُنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی سے محبت نہیں کر سکتے، البتہ لوگوں کو غلط فہمی میں ضرور ڈال سکتے ہیں۔

شاہدہ۔ جیسے؟

آصف۔ جیسے آپ!

شاہدہ۔ (تقریباً بوکھلا کر) مَیں؟

آصف۔ جی ہاں!

شاہدہ۔ مَیں نے کب کسی کو غلط فہمی میں ڈالا ہے

آصف۔ مثلاً سب سے پہلے مجھی کو لے لیجئے؟

شاہدہ۔ (حیران ہو کر) آپ کو؟

آصف۔ جی ہاں مجھے کسی زمانے میں یہ غلط فہمی تھی کہ آپ کو مجھ سے دلچسپی ہے، اور یہ غلط فہمی مدت تک رہی۔ اور جب مجھے حقیقت معلوم ہوئی تو آپ جان سکتی ہیں کہ میرے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی!

شاہدہ۔ کیسی حقیقت؟

آصف۔ یہی کہ آپ کو دراصل مجھ سے کبھی کسی قسم کی دلچسپی نہیں تھی، یہ میری غلط فہمی تھی۔

شاہدہ۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی شاید یہ بھی آپ کی غلط فہمی ہو!

آصف۔ خوب! گویا آپ مجھے دوبارہ غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتی ہیں! لیکن افسوس چار سال پہلے جو بات تھی وہ اب نہیں رہی۔

شاہدہ۔ کون سی بات؟

آصف۔ جب زندگی کا نصب العین صرف کسی ایسی لڑکی کو حاصل کر لینا ہوتا ہے جس سے آدمی محبت کر سکے۔

شاہدہ۔ اور اب؟

آصف۔ اور اب معلوم ہوا ہے کہ زندگی کسی کی محبت حاصل کئے بغیر بھی گزاری جا سکتی ہے بشرطیکہ آدمی کا کوئی نصب العین ہو!

شاہدہ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے مجھے صحیح طور پر نہیں سمجھا۔

آصف۔ مجھے آپ سے یہی شکایت ہے۔

شاہدہ۔ (کچھ وقفے کے بعد اداس لہجے میں) آج کی صبح کتنی اچھی تھی۔

آصف۔ صبح اب بھی اچھی ہے۔ ہوا میں وہی خوشگوار ٹھنڈک ہے۔ غالباً پھولوں میں بھی وہی تازگی ہے۔ اور پرندے بھی اسی طرح چہچہا رہے ہیں......

شاہدہ۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ آج آپ سے ملاقات ہی نہ ہوتی۔

آصف۔ میرا خیال ہے کہ ملاقات ہم دونوں کیلئے ضروری تھی تاکہ ایک دوسرے کی غلط فہمی دور ہو جاتی۔

شاہدہ۔ (پژمردہ لہجے میں) میں آپ سے پھر کہوں گی کہ آپ کو کم از کم میرے متعلق غلط فہمی ہے۔

آصف۔ اگر یہی بات آپ آج سے ایک سال پہلے کہتیں تو نجانے میرے دل کی کیا کیفیت ہوتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ یک لخت مجھے آسمانوں اور زمینوں کی سب سے بڑی دولت مل گئی ہے۔ شاہدہ اُس زمانے میں میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تمہیں پا لینا تھا۔

شاہدہ۔ زندگی کی سب سے بڑی خواہش!

آصف۔ ہاں اُس وقت آپ اگر یہی الفاظ مجھ سے کہتیں تو میں فوراً ہی آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتا "شاہدہ! دیکھو آج کی صبح کس قدر خوشگوار ہے باغ کا ایک ایک پتا ہم دونوں کو ایک نئی زندگی کا پیغام دے رہا ہے۔ ہر شے میں بہار کی شیریں سانس چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، آؤ ہم دونوں بہار کی اس سنہری صبح سے اس طرح لطف اٹھائیں کہ ہماری زندگیوں میں یہ صبح ایک یادگار بن کر رہ جائے!۔۔۔ اور پھر اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ دیئے میں تمہیں باغ میں لے جاتا۔۔۔"

شاہدہ۔ (پژمردہ لہجے میں) آصف بھائی آپ کس قدر بدل گئے ہیں!

آصف۔ اور شاہدہ جانے سے پہلے میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں!

شاہدہ۔ (غمگین لہجے میں) کہیئے۔
آصف۔ آج سے چار سال پہلے جو دَور مجھ پر آیا تھا اُسی دَور سے اب بیچارہ نسیم گزر رہا ہے، اگرچہ نسیم کے خیالات اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے اِس سے ہمدردی ہے ——
شاہدہ۔ ہمدردی ؟
آصف۔ ہاں مجھے اُس سے ہمدردی ہے۔ اور شاہدہ! کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ زندگی میں کم از کم ایک آدمی پر احسان کر سکیں۔
شاہدہ۔ احسان ؟ کیسا احسان ؟
آصف۔ مجھے معلوم ہے نسیم نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی۔ وہ سمجھتا ہے کہ آپ کو اُس سے محبت ہے۔ اگر اُسے بعد میں معلوم ہوا کہ اُسے بھی غلط فہمی رہی ہے تو یقیناً اسے شدید صدمہ ہوگا۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ اُس کی یہ غلط فہمی ہمیشہ قائم رکھیں ؟
شاہدہ۔ میں ؟
آصف۔ ہاں آپ ؟ اور یہی اُس پہ آپ کا سب سے بڑا احسان ہوگا اور اب مجھے اجازت دیجئے۔ اگر میں نے کوئی تلخ بات کی ہو تو اُس کے لئے معافی چاہتا ہوں ——
(تسنیم داخل ہوتی ہے)
تسنیم۔ بھائی جان! آپ کہاں چلے ؟ کہاں جا رہے ہیں آپ ؟ دیکھیے میں تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر آئی ہوں کہ ذرا باغ میں گھومیں گے۔ آؤ نا باجی آج تو آصف بھائی بھی ہیں ——
شاہدہ۔ (پژمردہ لہجے میں) لیکن تسنیم اب تو باغ میں دھوپ آچکی ہے۔
(پردہ)

حشر کی مکالمہ نویسی کا انداز

(دو رومن سردار عذرا یہودی کو خلاف ورزیٔ حکمِ شہنشاہی کرتے پاتے ہیں، اور ایک سردار اُسے حکم دیتا ہے کہ وہ دوسرے سردار کو سجدہ کرکے اپنے مذہب سے پھر جائے)

سردار۔ سجدہ!
عذرا۔ کسے ؟
سردار۔ اس عالی شان کو!
عذرا۔ اس فانی انسان کو ؟ ہم سجدہ کرتے ہیں اپنے سُبحان کو!
ٹکڑے مرے اُڑ جائیں یہ ڈر کر نہ جھکے گا آگے کسی انسان کے یہ سر نہ جھکے گا
سردار۔ ماجحوسنیں تم نے باتیں خصومت کی ؟
عذرا۔ اگر رحم نہ ہو تو حکومت کس کام کی ؟ بے انصاف کی بہادری ہے نام کی۔
سردار۔ یہ ہمارے دیوتاؤں کا سخت دشمن ہے۔
عذرا۔ ہم نہ کسی کے دشمن ہیں نہ بدخواہ تم اپنی راہ ہم اپنی راہ۔
ہر ایک اپنے مذہب کا دُوربین خود ہے عیسٰی بدینِ خود ہے موسٰی بدینِ خود ہے
(تصویرِ وفا)

تھی مشرق کی سمت صاف دکھائی دینے لگی۔ جہاز آسانی سے کھاڑی میں داخل ہو گیا اور لنگر ڈال دیا گیا۔ کپتان ناشتہ کر کے جہاز کے عرشے پر گیا۔ صاف آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ وہ سر سبز ساحل کو دیکھ کر فطرت کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یکایک وہ مسکرایا اور مسکرا کر اُس نے سگار کا جلا ہوا ٹکڑا سمندر میں پھینک دیا۔ دوسرا سگار سلگاتے ہوئے اُس نے ایک ملاح سے کہا "چھوٹی کشتی باہر نکالو میں ساحل پر جاؤں گا۔" کشتی جہاز کے برابر لگائی گئی، وہ سیڑھی سے کشتی پر اُترا اور کشتی ایک کنج کی طرف روانہ ہو گئی۔ ناریل کے درخت سمندر کے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے۔ درختوں کے سایہ میں چھاؤں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کشتی ساحل سے آ لگی، کپتان کشتی پر سے اُترا اور درختوں کے سائے میں ایک پگڈنڈی پر ہوتا ہوا کھاڑی کی طرف چل دیا۔ کھاڑی پر ناریل کے درختوں کے تنوں کا بنا ہوا ایک پُل تھا۔ ناریل کے تنے ایک دوسرے سے یوں ملا کر رکھے گئے تھے کہ جہاں دو تنے ملتے تھے وہاں جوڑ پر ایک ٹکانی لگی تھی اور وہ کھاڑی میں گاڑ دی گئی تھی۔ یہ نرالا پُل چکنا، گول اور تنگ تھا، اس کے باوجود چلتے وقت ہاتھ کو سہارا دینے کے لئے کوئی جنگلا نہ تھا۔ اِس قسم کا پُل پار کرنے کے لئے بڑی جرأت اور مہارت کی ضرورت ہے۔ کپتان پُل پر چلتے چلتے کچھ ہچکچایا۔ لیکن جب اُس نے کھاڑی کے اُس پار، درختوں کے ایک جھنڈ میں، ایک مکان دیکھا تو اُس مکان کی طرف جانے کا ارادہ کر کے اُس نے اپنی رفتار کچھ تیز کر دی۔ اُس نے بہت سنبھل سنبھل کر قدم ڈالے۔ لیکن جہاں ایک تنا دوسرے تنے سے ملتا اور سطح ناہموار ہوتی تو اُس کے پَیر ذرا ڈگمگا جاتے۔ جب وہ پُل کے اُس پار پہنچا تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ پُل پار کرنے میں اتنا محو تھا کہ اُس کو خیال بھی نہ ہوا کہ کوئی اُس کو دیکھ رہا تھا۔ جب اُس نے آواز سُنی تو وہ بہت متعجب ہوا، وہ شخص کہہ رہا تھا: "جو شخص ایسے پُلوں پر چلنے کا عادی نہ ہو اُس کا اِس تیزی سے یہ پُل پار کر لینا بڑی ہمت کی بات ہے۔"

کپتان نے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا، وہ اُسی مکان سے باہر آیا تھا جس کو کپتان نے پُل کے اُس پار سے دیکھا تھا۔ اُس نے کہا "مَیں آپ کو دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ اب گرے کہ اب گرے۔"

کپتان نے جواب دیا "نہیں تو۔ بالکل نہیں!"

وہ آدمی بولا "عرصہ ہوا مَیں ایک دفعہ اِس پُل پر سے گر چکا ہوں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دن شام کو مَیں شکار سے واپس آیا اور پُل کو پار کرتے کرتے بندوق سمیت کھاڑی میں جا گرا۔ اب جب بھی مجھے پُل پار کرنا ہوتا ہے تو بندوق دوسرے آدمی کو دے دیتا ہوں۔"

اجنبی جوان نہ تھا، اُس کی چھوٹی سی ڈاڑھی کھچڑی ہو چلی تھی اور چہرہ دُبلا پتلا تھا۔ وہ سفید پتلون اور بغیر آستینوں کی قمیص پہنے، نہ جُوتا نہ موزے، مکان کے باہر کھڑا تھا۔ اُس کی زبان گو انگریزی تھی لیکن لب و لہجہ انگریزی نہ تھا۔

کپتان نے پُوچھا "آپ کا نام نیلسن ہے؟"

اجنبی نے جواب دیا "جی، ہاں۔"

کپتان نے کہا "مَیں نے اکثر آپ کا نام سُنا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ یہیں کہیں رہتے ہوں گے۔"

نیلسن نے کچھ جواب نہ دیا اور اپنے بنگلے کی طرف چل دیا۔ کپتان بھی نیلسن کے پیچھے پیچھے چلا، وہ دونوں بنگلے میں گئے،

اندر پہنچ کر نیلسن کے اشارے پر کپتان ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیلسن شراب اور گلاس لینے اندر گیا تو کپتان نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ دیکھ کر اُس کو بہت تعجب ہوا۔ اُس نے کبھی اتنی جگہ میں اتنی زیادہ کتابیں نہ دیکھی تھیں۔ چاروں طرف اُونچی اُونچی الماریاں تھیں جو سب کی سب کتابوں سے بھری پڑی تھیں، ایک کونے میں ایک پیانو رکھا تھا اور ایک بڑی میز پر اخبارات اور رسالے بکھرے پڑے تھے۔

کمرہ دیکھ کر وہ کچھ سراسیمہ سا ہو گیا۔ اُس کو یاد آیا کہ نیلسن ایک عجیب و غریب آدمی ہے۔ کسی شخص کو بھی اُس کے متعلق پُورا پُورا علم نہ تھا باوجودیکہ اُس کو جزیرہ میں رہتے عرصہ گزر چکا تھا لیکن جو بھی اُس کو جانتا تھا اُس کا یہی خیال تھا کہ نیلسن عجیب قماش کا آدمی ہے۔

جب نیلسن واپس آیا تو کپتان نے کہا "آپ نے کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔"

نیلسن نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا مضائقہ ہے۔"

کپتان نے پوچھا "کیا آپ نے سب کی سب پڑھ لی ہیں؟"

نیلسن نے جواب دیا "قریب قریب سب۔"

کپتان نے کہا "کسی زمانے میں مجھے بھی کتابیں، اخبارات اور رسالے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔"

اس کے بعد نیلسن نے اپنے مہمان کو شراب کا ایک گلاس اور ایک سگار دیا۔ کپتان نے شراب پیتے ہوئے کہا "رات مَیں یہاں پہنچا لیکن مجھے کھاڑی نظر نہ آئی اس لئے مجھے باہر ہی لنگر ڈالنا پڑا۔ مجھے تو یہاں آنے کا قطعاً خیال نہ تھا۔ لیکن میرے ساتھی کچھ سامان یہاں لانا چاہتے تھے اور اُنھوں نے مجھ کو یہاں آنے پر مجبور کیا تو آنا ہی پڑا۔ کیا آپ گرے کو جانتے ہیں؟"

نیلسن نے جواب میں کہا "ہاں، اُس کی قریب ہی دکان ہے۔"

کپتان بولا "اچھا، اُس کو ناریل کے عوض کچھ دوسری چیزیں لینا تھیں۔ میرے ساتھی اپنے ساتھ کپڑا، شراب، چینی کے برتن اور دوسری اشیا لائے ہیں جو وہ ناریل کے عوض گرے کو دے دیں گے۔" کپتان نے شراب کا ایک گھونٹ پیا اور سگار سُلگا لیا۔ نہ معلوم کیوں وہ نیلسن کی موجودگی میں گھبرایا ہوا سا تھا اور گھبراہٹ میں باتیں کئے جاتا تھا۔ نیلسن اُس کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

کپتان نے کہا "ان درختوں سے آپ کو بہت فائدہ ہو گا کیونکہ یہ اچھی قسم کے معلوم ہوتے ہیں اور ناریل اس وقت بہت گراں ہے۔ میرا بھی ناریل کا ایک باغ تھا لیکن مجبوراً مجھے وہ فروخت کر دینا پڑا۔" کپتان نے پھر کمرے کو دیکھا، کتابوں کو دیکھ کر اُس پر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ اُس نے پوچھا "یہاں تنہائی میں آپ کا دل تو گھبراتا ہو گا؟"

نیلسن نے جواب دیا "نہیں، مَیں اس کا عادی ہو گیا ہوں۔ مجھ کو یہاں رہتے ۲۵ سال ہو چکے ہیں۔"

اب کپتان کو کوئی اور موضوع یاد نہیں آتا تھا جس پر گفتگو کرے اِس لئے وہ خاموشی سے سگار پیتا رہا۔ نیلسن ظاہراً اِس خاموشی کو توڑنا نہیں چاہتا تھا، وہ اپنے مہمان کو غور سے دیکھتا رہا۔ مہمان ایک لمبا تڑنگا چھ فٹ اُونچا آدمی تھا۔ اُس کا چہرہ سرخ تھا اور گالوں پر چھوٹی چھوٹی رگوں کا جال، اُس کا ناک نقشہ مٹاپے نے چھپا دیا تھا۔ اُس کی آنکھیں لال تھیں۔ مٹاپے سے اُس کی گردن تک چھپ گئی تھی۔ اُس کی گدّی پر

سفید بالوں کی ایک لٹ تھی اور باقی سر چندلا تھا۔ اُس کی چوڑی پیشانی عقلمندی کی دلیل کے بجائے حماقت کی نشانی معلوم ہوتی تھی۔ وہ نیلی فلالین کی قمیص پہنے تھا جو گلے پر سے کھلی تھی اور اُس میں سے اس کا سرخ بالوں سے ڈھکا ہوا سینہ نظر آتا تھا۔

کپتان اپنی کرسی پر بیٹھا تھا، اُس کی توند نکلی ہوئی تھی اور موٹے موٹے پیر کھُلے تھے۔ اس کے اعضا کا سب لوچ ختم ہو چکا تھا۔ نیلسن کپتان کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ جوانی میں کیسا حسین ہوگا۔ یہ خیال کرنا غیر ممکن تھا کہ وہ موٹا تازہ آدمی کسی وقت دُبلا پتلا لڑکا ہوگا اور اِدھر اُدھر دوڑتا پھرتا ہوگا۔

کپتان نے اپنی شراب ختم کی تو نیلسن نے بوتل اُس کی طرف کر دی اور کہا "تکلف برطرف۔"

کپتان آگے جھکا اور بوتل اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا "آپ کا اس جگہ آنا کیسے ہوا؟"

نیلسن نے جواب دیا "مَیں اِس جزیرہ میں تبدیلِ آب و ہوا اور صحت یابی کے لئے آیا تھا۔ میرے پھیپھڑے خراب ہو گئے تھے اور ڈاکٹروں نے ایک مہینے کے بعد میری موت تشخیص کی تھی لیکن جیسا آپ دیکھتے ہیں اُن کی تشخیص غلط ثابت ہوئی۔"

کپتان نے پوچھا "میرا مطلب یہ ہے کہ آپ یہاں آباد کیسے ہوئے؟"

نیلسن نے کہا "مَیں جذباتی آدمی ہوں۔"

کپتان بولا "خوب۔"

نیلسن کو علم تھا کہ کپتان اُس کا مطلب نہیں سمجھا اور اُس نے اپنی سیاہ آنکھوں سے اُسے گھورنا شروع کیا۔ کپتان کا بھدا پن دیکھ کر اُس نے زیادہ بات نہ کی اور کہا "پُل پار کرتے وقت آپ اپنا توازن قائم کرنے میں اتنے محو تھے کہ اِس جگہ کی خوبصورتی کا اندازہ نہ لگا سکے، لیکن یہ مقام عام طور پر خوبصورت خیال کیا جاتا ہے۔"

کپتان نے کہا "آپ کا یہ مکان چھوٹا تو ہے لیکن صاف ستھرا اور آرام دہ ہے۔"

نیلسن نے جواب دیا "لیکن مَیں پہلے پہل یہاں آباد نہیں ہوا۔ مَیں پہلے ایک معمولی جھونپڑی میں ٹھہرا جس پر ایک بڑے سرخ پھولوں کے درخت کا سایہ تھا۔ چاروں طرف زرد، سُرخ اور سنہرے پتوں کی کروٹن کی جھاڑیاں تھیں۔ جھونپڑی کے کنارے کنارے ناریل کے درخت تھے جو تمام دن کھڑے کھڑے پانی میں اپنا عکس دیکھا کرتے۔ مَیں اُس وقت نوجوان تھا۔ اس کو چوتھائی صدی کا عرصہ ہوا۔ مَیں اپنی موت سے پہلے دُنیا کی تمام آسائشوں سے بہرہ اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں یہ حسین ترین مقام تھا۔ مَیں نے جب پہلی مرتبہ اِس کو دیکھا تو محسوس کیا کہ اُس نے میرے دل پر قابو پا لیا ہے۔ اُس وقت میری عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی اور مَیں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ عرصے بعد مَیں نے محسوس کیا کہ اِس مقام کی خوشگواری اور تازگی مجھ کو جینے پر مجبور کر رہی ہے۔ جب مَیں پہلی مرتبہ یہاں آیا تو مَیں نے محسوس کیا کہ میری گزشتہ زندگی رائگاں گئی۔ وہ مجھے کسی دوسرے کی زندگی معلوم ہوتی تھی۔ بعض وقت مَیں چیخ اُٹھتا "ایک سال، صرف ایک سال، اگر مَیں یہاں زندہ رہ سکوں تو اس کے بعد خوشی سے مرنے کو تیار رہوں۔" آپ کچھ پی نہیں رہے۔" اُس نے یہ کہتے ہوئے شراب کی طرف اپنا ہاتھ

بڑھایا اور مسکراتے ہوئے کہا "میں شراب نہیں پیتا، میں اپنے خیالات ہی میں سرشار رہتا ہوں لیکن شراب کے ایک قطرے سے مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے گلاس میں کچھ شراب اُونڈیلی اور اس میں سوڈا ملا کر ایک گھونٹ لیا۔ گھونٹ لے کر وہ بولا "میں نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ یہ جگہ میرے لئے جاذبِ نظر کیوں تھی۔ یہاں کچھ عرصے تک عشق و محبت نے اپنا ڈیرا ڈالا تھا، اُس طائر کی طرح جو موسمِ گرما گزارنے سرد مقامات سے گرم مقامات میں چلی آتی ہے یا اُس اُڑتی ہوئی چڑیا کی طرح جو بیچوں بیچ سمندر میں اُڑتے اُڑتے جہاز پر آرام کرنے بیٹھ جاتی ہے اور ذرا سی دیر کو پر سمیٹ کر سستا لیتی ہے۔ جذبۂ محبت کی خوشبو یہاں کی فضا پر اس طرح طاری و ساری تھی، جس طرح موسمِ گرما میں شہد کی خوشبو سبزہ زار پر چھائی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جگہ جہاں دو دل ملے ہوں یا کوئی دل ٹوٹا ہو اپنے آس پاس ایک خاص قسم کی کشش رکھتی ہے اور وہ کشش لازوال ہوتی ہے۔ وہ مقام ایک روحانی خصوصیت حاصل کر لیتا ہے جس کا اثر قریب سے گزرنے والوں تک پر پڑتا ہے۔ کاش میں اپنا مفہوم صاف طور سے بیان کر سکتا۔" وہ مسکرایا اور بولا "مگر میرا خیال ہے کہ اگر میں صاف صاف بیان بھی کر دیتا تو بھی آپ کی سمجھ میں نہ آتا۔" اس کے بعد وہ ذرا ٹھہرا اور ٹھہر کر بولا "میرا خیال ہے کہ یہ جگہ حسین ہے کیونکہ یہاں میں بھی حسن سے دوچار ہوا۔ میں نے اظہارِ نیاز کیا اور حسن نے ناز!"

کپتان نیلسن کی گفتگو نہ سمجھ سکا لیکن وہ قابلِ معافی تھا، کیونکہ نیلسن کے الفاظ پہیلیوں اور معموں سے کم نہ تھے نیلسن نے اپنی بات ختم کر کے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اُس نے کپتان کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ اُس نے کہا "مجھے یقین ہے کہ میں نے آپ کو کہیں نہ کہیں ضرور دیکھا ہے۔"

کپتان نے جواب دیا "مجھے بالکل یاد نہیں۔"

نیلسن بولا "میرا دل کہتا ہے کہ میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ کے چہرہ سے میں شناسا ہوں لیکن مقام اور وقت کا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ میں نے آپ کو کہاں اور کب دیکھا ہے؟ یہ خیال مجھ کو پریشان کئے ہوئے ہے۔"

کپتان نے کہا "میں یہاں تیس سال پہلے کچھ عرصے کو آیا تھا۔ اُن دنوں شاید آپ نے مجھے دیکھا ہو، لیکن اتنے عرصے بعد کسی شخص کو یاد رکھنا ذرا مشکل ہے۔"

نیلسن نے کہا "کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی نادیدہ مقام سے مانوس ہو جاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ اُس سے بخوبی واقف ہے۔ بس ایسے ہی آپ مجھ کو معلوم ہوتے ہیں۔ شاید دوسروں کے زمانے میں آپ کسی جہاز کے کپتان ہوں اور میں نے غلام کی حیثیت سے آپ کی ماتحتی میں کام کیا ہو۔ کیا آپ تیس سال پیشتر یہاں آئے تھے؟"

کپتان نے کہا "جی ہاں۔"

نیلسن نے پوچھا "آپ کی ریڈ سے ملاقات ہوئی تھی؟"

کپتان نے کہا "ریڈ، کون ریڈ؟"

نیلسن بولا "میں اُس کو اسی نام سے جانتا ہوں، میں اُس سے ذاتی طور پر واقف نہیں۔ میں نے اس کو کبھی دیکھا بھی نہیں۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اُس سے اپنے اُن بھائیوں سے زیادہ واقف ہوں جن کے ساتھ میں نے زمانۂ طفلی گزارا۔ وہ میرے دماغ پر فرہاد اور قیس کی طرح چھایا ہوا ہے۔"

نیلسن سگار پیتے پیتے اپنی کرسی پر دراز ہو گیا اور دھوئیں کے

اُن بادلوں کو جو ہوا میں بھٹک رہے تھے دیکھنے لگا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں سنجیدگی، وہ کپتان کی طرف دیکھا گیا۔ اُس کے خیالی انسان اَور حقیقی انسان میں جو اُس کے سامنے بیٹھا تھا زمین آسمان کا فرق تھا۔ آخر وہ بولا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریڈ حسین ترین انسان تھا۔ میری ایسے بہت سے لوگوں سے بات چیت ہو چکی ہے جو اُس کو بخوبی جانتے ہیں۔ اَور وہ سب کے سب اِس بات پر ہم خیال ہیں کہ ریڈ کے حسن کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اُوپر کی سانس اوپر اَور نیچے کی نیچے رہ جاتی تھی۔ لوگوں نے سرخ بالوں کی وجہ سے اس کا نام ریڈ رکھا تھا۔ اس کے بال لمبے اَور گھونگروالے تھے۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ اُس کو اپنے بالوں پر ناز تھا وہ اِن باتوں سے قطعی مبرا تھا، لیکن اگر اُس کو ناز ہوتا بھی تو وہ موردِ الزام نہ تھا، وہ لمبا تھا، ۶ فٹ ایک انچ یا دو انچ، اِس جگہ مکان کی چھت کے ستون پر اُس کی اُونچائی کے برابر چاقو سے ایک نشان بنا ہوا تھا۔ اُس کی جلد ساٹن کی طرح سفید اَور چمکدار تھی۔ اُس میں نسوانیت پائی جاتی تھی۔"

کپتان نے کہا "مَیں جب بچہ تھا تو میری جلد بھی سفید تھی۔"

لیکن نیلسن نے اُس کی طرف خیال تک نہ کیا، وہ اب اپنی داستان سُنا رہا تھا، اَور دخل درمعقولات سے اس کا پیمانۂ صبر چھلک اُٹھا۔ اس نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کا چہرہ اس کے جسم کی طرح خوبصورت تھا۔ اُس کی آنکھیں بڑی اَور اتنی گہری نیلی تھیں کہ بعض کے نزدیک سیاہ تھیں۔ اکثر سرخ بال والوں کے خلاف اُس کے ابرو سیاہ تھے اَور مژگاں لانبے اَور سیاہ۔ اُس کے خدوخال نہایت موزوں تھے اَور اُس کا دہن زخم کی طرح سرخ تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر بیس سال کی تھی۔"

یہ کہتے کہتے نیلسن یکایک خاموش ہو گیا اَور شراب کا ایک گھونٹ لے کر بولا "وہ عجیب الخلقت انسان تھا۔ اُس سے زیادہ حسین انسان دیکھنے میں نہیں آیا۔ اُس کا یہاں ہونا ایسا ہی عجیب تھا جیسا ایک جنگلی پودے پر ایک حسین، خوشنما اَور خوشبودار پھول کا مہکنا، ایک دن وہ جہاز سے اُسی کھاڑی میں اُترا جس میں آج صبح تم اُترے ہو۔ وہ ایک امریکی ملاح تھا اَور ایک جنگی جہاز سے بھاگ نکلا تھا۔ اُس نے کسی تُرش مزاج ملاح کو بہلا پھسلا کر اُس کی کشتی پر اِس جزیرہ تک سفر کیا۔ مَیں یہ نہیں جانتا کہ وہ جنگی جہاز سے کیوں بھاگ نکلا۔ شاید جنگی جہاز کے اوامر و نواہی سے تنگ آ گیا ہو، ممکن ہے وہ مشکلات میں پھنس گیا ہو، شاید اِس جزیرہ کی اُس نے تعریف سُنی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کے لطیف دل کو یہاں کی سرسبز پہاڑیوں اَور نیلے سمندر نے موہ لیا ہو۔ بہرحال وہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اَور اُس نے خیال کیا کہ وہ اِس کنجِ عافیت میں محفوظ رہے گا اَور جہاز کے کپتان اَور دوسرے عملہ کی نگاہ دُور رس سے دُور۔ کھاڑی کے قریب ایک جھونپڑی تھی وہ اس کے پاس کھڑے ہو کر مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی اُس جھونپڑی سے باہر آئی۔ لڑکی نے اُس کو دیکھا اَور اُس نے لڑکی کو، دونوں ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف تھے۔ لڑکی اُس کو دیکھتی رہی اَور وہ لڑکی کو۔ اُس نے لڑکی کی مسکراہٹ اَور ناز و ادا کا مطلب سمجھ لیا اَور کچھ دیر بعد جب لڑکی نے اُس کو جھونپڑی میں آ جانے کا اشارہ کیا تو وہ اُس کے پیچھے پیچھے جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ جھونپڑی میں وہ ایک چٹائی پر بیٹھ گیا اَور لڑکی نے آنکھیں نکال نکال کر اُس کو اناناس کے ٹکڑے دیئے۔

"مَیں ریڈ کے متعلق تو صرف سُنی سُنائی سے واقف ہوں لیکن

اِس واقعہ کے تین سال بعد مَیں نے اُس لڑکی کو دیکھا، اُس وقت اُس کی عمر بمشکل ۱۹ سال ہوگی۔ تم اُس کے حُسن کا اندازہ نہیں لگا سکتے اُس کا قد لانبا اَور جسم چھریرا تھا۔ اپنی نسل کی تمام خصوصیات اُس میں پائی جاتی تھیں۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں کھجور کے درختوں کے نیچے خاموش پانی کی جھیلیں معلوم ہوتی تھیں۔ اُس کی سیاہ اَور گھونگر والی زلفیں اُس کی پیٹھ پر پڑی رہتی تھیں۔ وہ خوشبودار پھولوں کا ایک ہار گلے میں ڈالے رہتی۔ اُس کی انگلیاں نزاکت کا بہترین شاہکار تھیں جو انسان کے تارِ دل کے لئے مِضراب کا کام دیتیں۔ اُس زمانے میں وہ بہت ہنس مُکھ تھی، اُس کی مسکراہٹ لوگوں کے خرمنِ صبر و قرار پر بجلیاں گراتی، اُس کی جِلد موسمِ گرما کے پکے ہوئے کھیت کی مانند تھی۔ مَیں اُس کا کیا بیان کروں۔ وہ اتنی حسین تھی کہ وہم و خیال معلوم ہوتی تھی نہ کہ حقیقت۔

"اَور یہ دونوں نوجوان، وہ ۱۶ سال کی تھی اَور وہ ۲۰ سال کا، نگہِ اوّلیں میں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے۔ یہی عشقِ حقیقی ہے نہ کہ وہ عشق جو ہمدردی، مشترکہ مفاد یا اغراض پر مبنی ہو۔ یہی وہ محبت ہے جو حضرتِ آدم نے بی بی حوّا کے لئے محسوس کی جبکہ اُن کی سوتے سوتے آنکھ کھلی اَور اُنہوں نے بی بی حوّا کو پُرنم آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ یہی وہ محبت ہے جو چوپایوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے! اَور دیوتاؤں کو بھی!! یہی وہ محبت ہے جو دُنیا کو جنّت بنا دیتی ہے۔ کیا تم نے اُس فلسفی عاشق کا مقولہ نہیں سُنا جو کہتا تھا کہ "دو معشوقوں میں ایک مُحب ہوتا ہے اَور دوسرا محبوب۔ لیکن کبھی کبھی دو ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دونوں کی دونوں مُحب اَور دونوں کی دونوں محبوب ہوتی ہیں"۔ اب بھی، اتنے سال گزرنے کے بعد، جب کبھی مجھے اُن دونوں کا خیال آتا ہے تو میرے دل میں ہُوک سی اُٹھتی ہے اَور میرا دل ویسا ہی پاش پاش ہو جاتا ہے جیسا کہ رات کو صاف شفاف آسمان پر چاند دیکھنے سے۔ حُسنِ کامل کے تخیل سے ہمیشہ مَیں ایک خاص قسم کا درد محسوس کرتا ہوں"۔

"وہ دونوں بچوں کی طرح تھے۔ وہ سادہ مزاج، حسین اَور نیک خصلت تھی۔ اُس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا، صرف اتنا پتا چل سکا کہ وہ صاف دل اَور نیک طینت تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس کی روح بھی اُس کے جسم کی طرح حسین ہوگی۔ لیکن مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی رُوح جنگل کے اُن باسیوں کی طرح تھی جو نرکل کے پیپے بجاتے ہوں اَور پہاڑوں کے چشموں میں نہاتے ہوں۔ احساس ایک دولت ہے لیکن پریشان کُن! انسان نے اِس کو ترقی دی تو باغِ عدن کھو بیٹھا۔ ریڈ کے اِس جزیرہ پر آنے سے پہلے یہاں سخت وبا پھیلی اَور ایک تہائی آبادی لقمۂ اجل ہو گئی۔ لڑکی کے سب کے سب رشتہ دار ختم ہو چکے تھے اَور اُس وقت وہ اپنے ایک دُور کے رشتہ دار کے یہاں رہتی تھی۔ خاندان میں دو ضعیف العمر عورتیں، دو جوان عورتیں، ایک مرد اَور ایک لڑکا باقی بچے تھے"۔

"چند دن تک ریڈ نے جھونپڑی میں قیام کیا لیکن شاید اُس نے ساحلِ بحر کے اتنا قریب رہنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اُس کو ڈر تھا کہ مبادا آتے جاتے کوئی ملّاح اُس کو دیکھ لے اَور گرفتار کرا دے یا شاید وہ برداشت نہ کر سکے ہوں کہ دوسروں کی موجودگی اُن کی تنہائی میں ایک لمحہ کے لئے بھی مخل ہو۔ ایک دن علی الصباح وہ دونوں نکل کھڑے ہوئے۔ لڑکی نے اپنی تمام جائداد منقولہ اپنے ساتھ لے لی اَور وہ دونوں ایک سرسبز پگڈنڈی پر ہو لئے۔ ناریل کے درختوں کے سائے میں چلتے چلتے وہ اِس کھاڑی کے پاس آ گئے جو تم نے ابھی دیکھی ہے۔ جو پُل تم نے پار کیا اُن دونوں

بھاگ آتے۔ وہ سفید ریت پر بیٹھی رہتی، آنسو اُس کے رخساروں پر سے بہہ کر ریت پر گرتے اور خشک ہو جاتے۔ دن مُنہ سے تھکی ماندی گھسٹ گھسٹا کر وہ اس جھونپڑی پر واپس آتی جہاں اُس نے ہنسی خوشی اپنے دن گزارے تھے۔ اُن لوگوں نے جن کے ساتھ وہ ریڈ کے آنے سے پہلے رہتی تھی بہت کوشش کی کہ وہ پھر اُن کے ساتھ رہنے لگے لیکن وہ نہ مانی، اُس کو یقین تھا کہ ریڈ واپس آئیگا اور وہ چاہتی تھی کہ وہ اُس کو وہیں پائے جہاں اُس نے اس کو چھوڑا تھا۔ اُس کی زندگی سے خوشی کا عنصر معدوم ہو چکا تھا۔ اگرچہ اُس کا حزن و ملال زمانہ گزرنے کے بعد قابلِ برداشت ہو گیا تھا لیکن اُس کی جگہ مستقل سوز و گداز نے لے لی تھی۔ وہ نہ اس کے اس یقین میں کہ ایک نہ ایک دن ریڈ ضرور واپس آئیگا ذرا بھی تزلزل نہ آنے پایا۔ وہ اُس کی راہ دیکھا کرتی، جو کوئی ناریل کے تنوں کے پُل کو پار کرتا وہ سر اُٹھا کر اُس کو دیکھتی۔ شاید وہ ہو! اُس کو نہ پا کر ایک آہ سرد بھرتی اور پھر سر جھکا لیتی۔"

نیلسن بات کرتے کرتے رُک گیا اور اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

کپتان نے پوچھا "آخر اُس کا ہوا کیا؟"

نیلسن ذرا تلخی سے مسکرایا اور بولا "تین سال بعد وہ دوسرے کی ہو گئی۔"

کپتان نے کہا "عام طور سے عورتیں ایسا ہی کیا کرتی ہیں۔"

نیلسن نے یہ سُن کر اس پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اِس موٹے اور بھدے آدمی نے اس کے دل میں نفرت کے جذبات کیوں پیدا کر دیئے۔ اُس کے خیالات منتشر ہو گئے اور اُس کے دماغ میں بھولی ہوئی باتیں آنے لگیں۔ وہ [illegible] خیال کرنے لگا۔ یہ جب کی بات تھی کہ وہ جزیرہ میں آیا تھا، اپنے وطن سے بیزار ہو کر۔ ان دنوں وہ بے حد شراب پیتا تھا، جوا کھیلتا تھا اور دوسری خرافات میں مبتلا تھا۔ ایک مریض جاں بلب جس نے اپنے تمام ولولوں کو زیرِ خاک دفن کر کے، اپنی کامیابی اور شہرت کو پسِ پشت ڈال کر اور زندگی کے چند مہینوں کو غنیمت جان کر انہیں اچھی طرح گزارنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ ایک سوداگر کے یہاں کھانا کھاتا تھا جس کی دکان وہاں سے دو میل کے فاصلے پر تھی۔ ایک دن وہ ناریل کے باغ میں سے ہو کر گزر رہا تھا کہ وہ سیلی کی جھونپڑی کے پاس سے گزرا۔ گرد و نواح کی خوبصورتی کو دیکھ کر وہ مبہوت رہ گیا۔ سیلی کے وہاں نظر آ جانے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اِس سے پہلے ایسی حسین لڑکی اُس کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اُس کی کالی کالی آنکھوں سے غم و اضمحلال ٹپک رہا تھا، اُن غمزدہ آنکھوں میں بجلی سی بھری تھی۔ اُس نے سوداگر سے اِس لڑکی کے متعلق پوچھا۔ سوداگر نے اُس کو سیلی کا واقعہ سُنا کر اُس کی دُنیائے دل میں تلاطم برپا کر دیا۔ نیلسن نے سوداگر سے پوچھا کہ "وہ کبھی واپس آئیگا بھی یا نہیں؟"

سوداگر نے جواب دیا تھا "سال دو سال بعد وہ اِس واقعے کو بھول گیا ہوگا۔ میں شرط لگا کر کہتا ہوں کہ جب اُس کا نشہ اُترا ہوگا اور اُسے معلوم ہوا ہوگا کہ ملاحوں نے اُس کو دھوکا دیا تو وہ غم سے دیوانہ ہو گیا ہوگا۔ اور وہ ہر ایک سے لڑنے لگا ہوگا۔ لیکن آخر کار اُس نے سیلی کی مفارقت برداشت کر لی ہوگی اور دو ایک مہینے کے بعد اُس نے سوچا ہوگا کہ جزیرے سے نجات پانا اچھا ہی ہوا۔" نیلسن یہ واقعہ سُن کر بہت متاثر ہوا۔ وہ خود ایک بدرُو انسان تھا لیکن دوسروں کے حُسن و جمال کی بہت قدر کرتا تھا۔ اُس نے کسی سے والہانہ محبت نہ کی تھی اور یقیناً اِس سے پہلے کبھی محبت نہ کی تھی۔ سیلی میں محبت کے جذبات دیکھ کر اسکو عجیب لطف

آتا تھا۔ کھاڑی کے پاس کی چھوٹی جھونپڑی میں وہ دوبارہ گیا۔ اُس کا ذہن بہت رسا تھا اور وہ زبانوں کا ماہر تھا: اُس نے جلد ہی جزیرہ کی زبان سیکھ لی۔ اُس بڑھی نے جو سیلی کے ساتھ جھونپڑی میں رہتی تھی نیلسن کو مدعو کیا اور اُس کو قہوہ اور سگریٹ پیش کئے۔ اُس کو کوئی بات چیت کرنے کو مل گیا۔ وہ اُس پر خوش تھی، بڑھی اس سے باتیں کیا کرتی اور وہ سیلی کو دیکھا کرتا۔

دو تین مرتبہ دیکھنے کے بعد نیلسن نے اُس کو بات کرنیکی رغبت دلائی۔ اُس نے پوچھا "کیا تم نے ریڈ کو دیکھا ہے؟" ریڈ کو غائب ہوئے دو سال گزر چکے تھے لیکن پھر بھی وہ اُس کو ہمیشہ یاد کرتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد نیلسن کو محسوس ہوا کہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ اب وہ مشکل ہی سے اپنے آپ کو ہر روز کھاڑی جانے سے باز رکھ سکتا تھا۔ وہ سیلی سے جب جدا بھی ہوتا تھا تو اُس کے خیالات ہمیشہ اُسی کے ساتھ رہتے تھے۔

شروع شروع میں وہ اپنے آپ کو مریض جاں بلب خیال کرتا تھا۔ وہ صرف اُس کو دیکھنے کا متمنّی تھا اور کبھی کبھی اُس سے بات کرنے کا اُمیدوار۔ محبت کے احساس سے اُسکو تعجب انگیز مسرت ہوئی تھی۔ وہ محبت کے صدق و صفا کا خیال کرکے پھولا نہیں سماتا تھا۔ وہ سیلی سے کچھ نہیں چاہتا تھا، صرف اُسکی خوبصورت ہستی پر خوش خیالیوں کا جال تننا چاہتا تھا۔ لیکن کھلی فضا، معتدل آب و ہوا، آرام اور ورزش نے اُس کی تندرستی پر غیر متوقع اثر ڈالنا شروع کیا۔ اب رات میں اُس کا بخار تشویش ناک حد تک نہیں پہنچتا تھا، کھانسی کم ہوگئی تھی اور وزن بھی بڑھنے لگا تھا۔ پچھلے چھ ماہ میں اُس کو ایک مرتبہ بھی خون نہیں آیا تھا۔ یکایک اُس کو اپنی جانبری کے امکانات نظر آنے لگے۔ اُس نے اپنے مرض کا بغور مطالعہ کیا اور اُس کو اُمید ہوگئی کہ احتیاط اور پرہیز سے وہ اچھا ہو جائے گا۔ مستقبل کے خیال سے اب اُس کو تقویت ہونے لگی۔ اور اُس نے آیندہ کے لئے منصوبے باندھنا شروع کر دیئے۔

یہ ظاہر ہے کہ عملی زندگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن وہ جزیرہ پر رہ سکتا تھا اور اُس کی محدود آمدنی جو دوسری جگہ قطعی ناکافی ہوتی یہاں اُس کے لئے کافی ہو سکتی تھی۔ وہ ناریل کا باغ لگا کر، اپنی کتابیں اور پیانو منگوا کر اپنا وقت گزار لیتا لیکن اُس کے دُور رس دماغ نے محسوس کر لیا کہ یہ تمام باتیں اُس کی مستور خواہشات کو محض چھپانے کی کوشش تھیں۔ اُس کو سیلی کی خواہش تھی۔ اُس کو سیلی کے نہ صرف حُسن سے محبت تھی بلکہ اُس پریشان رُوح سے جو اُس کی غمزدہ آنکھوں کے پردے میں پنہاں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ سیلی کو اپنے جذبات سے مست و بیخود بنا دیگا اور اُس کے تمام غم و الم بھلا دیگا۔

نیلسن نے سیلی سے اپنے ساتھ رہنے کو کہا لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ اس کو اس کی امید بھی نہ تھی اِس لئے انکار نے اُس کو مضمحل نہیں کیا۔ اُس کو یقین تھا کہ سیلی آخر اپنی موجودہ زندگی سے گھبرا جائے گی۔ اُس نے بڑھی سے اپنے منصوبے کا تذکرہ کیا۔ اور اُس کو یہ معلوم کرکے سخت تعجب ہوا کہ اُس کو اور پڑوسیوں کو اس امر کا پہلے ہی سے علم تھا اور وہ سیلی کو مجبور کرتے تھے کہ وہ نیلسن کی محبت کو قبول کر لے، کیونکہ گاؤں کا ہر باشندہ اپنے گاؤں میں ایک مالدار آدمی کے بس جانے کے حق میں تھا۔ وہ بڑھیا اگر بھی جس کے پاس نیلسن کھانا کھاتا تھا سیلی کے پاس گیا اور اُس کو سمجھایا اور کہا "لڑکی بیوقوف نہ بن، ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ یہ اُمید نہ کر کہ اتنے عرصے کے بعد ریڈ واپس آئے گا۔" سیلی نے پھر بھی انکار کیا لیکن اُس کے انکار نے نیلسن کے ارادے کو اور بھی پختہ کر دیا۔ سیلی کے بار بار انکار نے نیلسن کی محبت کو شدید

بدل دیا۔ اُس نے قطعی ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے اور سیلی کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہنے دیگا۔ اُس نے سیلی کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ آخر کار سیلی نیلسن کی ضد سے تنگ آ کر اور اپنے پڑوسیوں اور سہیلیوں کے اصرار سے مجبور ہو کر نیلسن کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گئی۔ لیکن دوسرے دن جبکہ وہ خوش خوش سیلی سے ملنے گیا تو اُس نے دیکھا کہ رات میں سیلی نے اُس جھونپڑی کو آگ لگا دی جس میں وہ اور ریڈ رہا کرتے تھے۔ نیلسن کو دیکھ کر بڈھی سیلی کو سخت شکست کھاتی ہوئی دوڑی آئی لیکن نیلسن نے اُس کو ہاتھ سے دھکیل کر ایک طرف کر دیا۔

وہ جھونپڑی کی جگہ ایک بنگلہ بنوا سکتا تھا۔ جھونپڑی کا جل جانا ہی اچھا ہوا۔ اُس کی کتابوں اور پیانو کے لئے بنگلہ موزوں تھا نہ کہ جھونپڑی۔ کچھ عرصے کے بعد جھونپڑی کی جگہ لکڑی کا چھوٹا سا گھر بن گیا۔ سیلی سے نیلسن کی شادی ہو گئی اور دونوں ایک زمانے تک وہاں رہتے رہے۔ لیکن نیلسن کو بہت کم خوشی میسر ہوئی۔ سیلی نے واقعات سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو نیلسن کے حوالے کر دیا، لیکن اُس کی رُوح نیلسن سے بچ کر نکل گئی اور اُس کے ہاتھ نہ آئی۔ نیلسن کو علم تھا کہ سیلی اُسکی مطلق پروا نہ کرتی تھی، وہ اب بھی ریڈ ہی سے محبت کرتی تھی اور ہر وقت اُس کی واپسی کی منتظر رہتی تھی۔ نیلسن کو یقین تھا کہ باوجود اس کی محبت، ہمدردی اور شفقت کے سیلی ریڈ کا ایک معمولی سا اشارہ پاتے ہی بغیر کسی پس و پیش کے اس کو چھوڑ دے گی، وہ نیلسن کی بے چارگی اور خستگی کی مطلق پروا نہ کرے گی۔ یہ دیکھ کر اُس کی محبت تلخی سے بدل گئی۔ نیلسن نے مہربانی سے سیلی کے دل کو پگھلانے کی کوشش کی لیکن وہ پہلے ہی کی طرح سخت رہا۔ اُس نے لاپروائی ظاہر کی لیکن اُس نے اس کی بھی کچھ پروا نہ کی۔ کبھی کبھی وہ غصے میں اس کو لعن و تشنیع کرتا۔ وہ چپکے چپکے رہتی لیکن زبان سے کچھ نہ کہتی۔ بعض اوقات وہ خیال کرتا کہ سیلی صرف ایک سراب تھی اور اُس کا تخیل اُس کی اپنی اختراع تھا۔ وہ اس کے حرم دل میں داخل نہ ہو سکا کیونکہ وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس کی محبت اس کے لئے محبس بن گئی جس سے وہ آزادی حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس میں در زندان کھولنے کی ہمت اور طاقت نہ تھی تو وہ باہر کیسے آتا اور آزاد کس طرح ہوتا؟ یہ محبت جان کا عذاب ثابت ہوئی اور وہ نا اُمید اور بے حس ہو کر رہ گیا۔ آخر کار آگ آپ ہی آپ جل جلا کر بجھ گئی۔ جب نیلسن سیلی کو چپ پر نظر غلط انداز ڈالتے دیکھتا تو اُس کے دل میں بے صبری سے غم و غصہ کے جذبات بھڑک اُٹھتے۔ اُن دونوں کو ساتھ رہتے برسوں گذر گئے مگر ان کی یکجائی محض بربنائے عادت و سہولت تھی۔

نیلسن نے مسکرا کر اپنے عشق کہنہ کا تذکرہ کیا۔ سیلی اب بوڑھی ہو چکی تھی کیونکہ اس جزیرہ کی عورتیں بہت جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ نیلسن نے سیلی کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ خود اپنی کتابوں اور اپنے پیانو پر قانع تھا۔

اُس کے خیالات نے اُس کو کچھ اور کہنے پر مجبور کیا اور وہ بولا "جب میں گزشتہ واقعات کا جائزہ لیتا ہوں اور سیلی اور ریڈ کی مختصر زیست کا خیال کرتا ہوں تو کہنا پڑتا ہے کہ اُن دونوں کو بڑے حکم قسمت کا متشکر ہونا چاہئے کہ اُس نے اُن کو اُس وقت جُدا کیا جس وقت اُن کی محبت معراج پر تھی۔ اُنہوں نے ستم سہے، صدمے اُٹھائے اور تکالیف برداشت کیں لیکن اِس میں بھی کچھ لطف تھا۔ اُن کو محبت کی حقیقی ترشی سے دوچار نہ ہونا پڑا۔"

کپتان نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آیا!"

محبت کا حسرت ناک انجام موت یا جدائی نہیں۔ آخر کب تک اُن میں سے ایک یا دوسرا ایک دوسرے سے محبت کرنا کم نہ کر دیتا؟ اُس عورت کو جسے تم دل و جان سے پیار کر چکے ہو اور تم اس کو اپنی نظروں سے دُور کرنا تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہو اُسی کے متعلق یہ سوچنا کہ کاش وہ پھر تمہارے سامنے نہ آئے کس قدر تلخ حقیقت ہے۔ محبت کی روح فرسا حقیقت بے اعتنائی ہے نہ کہ جدائی یا موت۔"

جب نیلسن یہ باتیں کر رہا تھا ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مانا کہ کپتان اُس کا مخاطب تھا لیکن وہ اُس سے بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے ہی واسطے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں اپنے سامنے والے شخص پر جمی ہوئی تھیں، لیکن اُس کے خیالات کہیں اور تھے۔ اور...... اب اچانک ایک دھندلا خیال اُس کی نظر کے سامنے آ گیا! اُس شخص کا نہیں جس کو وہ دیکھ رہا تھا بلکہ کسی دوسرے کا۔ جس طرح کسی کچے آئینے میں کسی کا عکس لمبا یا چپٹا نظر آتا ہے۔ اُسی طرح ایک بھونڈی سی تصویر اُس کے پردۂ دماغ پر بن گئی۔ اُس کے بعد اُس نے اُس بدصورت اور عمر رسیدہ انسان میں جو اُس کے سامنے بیٹھا تھا ایک جوان لڑکے کا خوبصورت اور ہشاش بشاش چہرہ دیکھا۔ وہ اُس کو غور سے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ وہ یہاں کیسے آ نکلا؟

یکایک اُس کا دل لرز گیا اور سانس رُک رُک کر چلنے لگی۔ ایک بے معنی شبہ نے اُس کو مغلوب کر لیا۔ نیلسن نے گھبرا کر پوچھا "آپ کا نام؟"

کپتان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ہویدا ہو گئے، اور وہ مکاری سے مسکرایا، اُس وقت وہ کمینہ پرور اور حد درجہ کا بدتمیز معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا "اِس کو سُنے اتنا زمانہ گزر چکا ہے کہ میں خود بھی بھول چکا ہوں۔ لیکن مجھے اب بھی یہاں ریڈ ہی کہا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اِس زور سے ہنسا کہ اُس کے بھاری بھر کم جسم میں زلزلہ آ گیا نیلسن کانپ اُٹھا۔ ریڈ بڑا محظوظ ہوا اور اُس کے لال لال دیدوں سے بڑے بڑے آنسو نکل کر اُس کے رخساروں پر ٹپکنے لگے۔

نیلسن نے ایک گہری سانس لی۔ اُس وقت ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ عورت گاؤں کی تھی۔ ہٹی کٹی، تنومند، سانولے رنگ کی (جزیرہ میں عمر کی رفتار کے ساتھ رنگ سانولا ہوتا جاتا ہے) سر کے بال کھچڑی۔ وہ ایک سیاہ لبادہ پہنے تھی، لبادے کا کپڑا اتنا ہلکا تھا کہ اُس میں سے اُس کا بدن جھلک رہا تھا۔

اُس کی زندگی کا نازک ترین لمحہ آ پہنچا تھا!

عورت نے اُمورِ خانہ داری کے متعلق کچھ نیلسن سے پوچھا جس کا اُس نے جواب دیا اور وہ سوچنے لگا کیا میری آواز اِس عورت کو بھی اِس وقت اتنی ہی غیر فطری معلوم ہوتی ہوگی جتنی کہ خود مجھ کو؟ عورت نے اُس مرد پر جو کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھا تھا بے اعتنائی سے ایک نظر ڈالی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

اُس کی زندگی کا نازک ترین لمحہ آیا اور نکل گیا!

نیلسن کچھ دیر تک بالکل نہ بول سکا۔ اُس کے حواس جاتے رہے تھے۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آخر کار بولا۔ "اگر شام کا کھانا میرے ساتھ کھائیے تو بڑی نوازش ہو۔"

ریڈ نے جواب دیا "شاید میں کھانا نہ کھا سکوں گا۔ مجھے گرمے سے ملنا ہے۔ اُس کا سامان دے کر مجھے واپس گھر جانا ہے۔ کل مجھے گھر پہنچنا ہے۔"

نیلسن نے کہا "میں راستہ بتانے کے لئے آپ کے ساتھ ایک چھوکرا کر دوں گا۔"

ریڈ بولا "شکریہ۔ نوازش"۔ پھر اُس نے ٹھنڈی سانس لی اور کرسی سے اُٹھا۔ نیلسن نے باغ سے ایک مزدور کے لڑکے کو بُلایا اور اُس کو بتایا کہ کپتان صاحب کو کہاں جانا ہے۔ لڑکا پُل پر پہنچا اور ریڈ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

نیلسن نے پکار کر کہا "دیکھئے ذرا احتیاط سے۔"

ریڈ نے جواب دیا "نہیں، آپ بیفکر رہیئے۔"

نیلسن اُس کو پُل پار کرتے دیکھتا رہا، اور جب وہ ناریل کے پیڑوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا تو بھی اُسی طرف دیکھا کیا۔ اس کے بعد وہ دھم سے اپنی کرسی پر گر گیا۔ کیا یہ وہی آدمی تھا جو میری خوشی میں حائل رہا۔ کیا یہ وہی آدمی تھا جس سے سیلی اتنی مدت تک محبت کرتی رہی اور جس کا اتنی بیتابی سے انتظار کرتی رہی؟ یکایک اس پر غیظ و غضب کا جذبہ طاری ہو گیا، اُس کا دل چاہتا تھا کہ اپنے گرد و پیش کی تمام چیزوں کو توڑ پھوڑ کر ختم کر دے۔ اُس نے سوچا میں دغا اور فریب کا شکار ہو گیا۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن پہچان تک نہ سکے۔ وہ ہنسنے لگا ہنستے ہنستے اس پر دورہ پڑا۔ قسمت نے اس کے ساتھ عجب ستم ظریفی کی تھی۔

سیلی اُس سے کہنے آئی کہ کھانا تیار ہے۔ وہ اُس کے ساتھ بیٹھ گیا اور کھانا کھانے کی کوشش کی۔ وہ سوچتا رہا کہ اگر اب وہ اُسے بتا دے کہ وہ موٹا اور بوڑھا آدمی، جو کرسی پر بیٹھا تھا، اُس کا وہی عاشق تھا جس کو وہ اب بھی جوانی کی وارفتگی سے یاد کرتی تھی، تو وہ کیا کرے گی؟ کئی سال گزر رہے کہ وہ سیلی سے نفرت کرتا تھا کیونکہ اُس نے اُس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔

اب یہ واقعہ سُنا کر اُس کو بڑی خوشی ہو گی، وہ سیلی کو ذہنی تکلیف دینا چاہتا تھا جو وہ اُس کو دیا کرتی تھی۔

سیلی نے پوچھا "وہ آدمی کیا چاہتا تھا؟"

نیلسن نے کچھ جواب نہ دیا۔ سیلی اب موٹی اور بوڑھی ہو چکی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ اُس نے اُس سے ایسی والہانہ محبت کیوں کی۔ اُس نے اپنی روح کے تمام خزانے سیلی کے قدموں پر نچھاور کر دیئے لیکن اُس نے اُن کی مطلق پرواہ نہ کی۔

اب جب کبھی نیلسن سیلی کو دیکھتا اُس کی نفرت بڑھ جاتی۔ آخر اُس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور ایک دن اُس نے کہا "وہ آدمی ایک کشتی کا کپتان تھا اور میرا ہم وطن۔"

سیلی نے صرف "ہاں" کر کے بات ختم کی۔

نیلسن بولا "وہ میرے گھر سے خبر لایا تھا کہ میرا بڑا بھائی سخت بیمار ہے اب مجھے وطن واپس جانا چاہیئے۔"

سیلی نے پوچھا "کیا تم زیادہ عرصے کے لئے جاؤ گے؟"

نیلسن معنی خیز طور پر خاموش ہو گیا۔

دو غزلیں

(صفیہ شمیم ملیح آبادی)

نقابِ شب میں عروسِ سحر تلاش کریں
چلو تبسمِ گلہائے تر تلاش کریں

حریمِ ذہن کے سب جھلملا رہے ہیں چراغ
چلو تجلیٔ شمس و قمر تلاش کریں

نیاز و ناز کے تازہ کریں پھر افسانے
بہ ذوقِ عجز کوئی سنگِ در تلاش کریں

نظر کی کھوئی ہوئی لذتوں کو پھر ڈھونڈیں
چلو تلاطمِ برق و شرر تلاش کریں

فضا کے دوش پہ لہرائیں پرچمِ عظمت
شکستِ غم میں نشاطِ ظفر تلاش کریں

چمن اُداس ہے، گُل سرنگوں، فضا خاموش
پھر آج روحِ نسیمِ سحر تلاش کریں

توہمات کی پُرہول بدلیوں میں شمیمؔ
چلو حقائقِ نورِ سحر تلاش کریں

(طفیل ہوشیارپوری)

یہ دَورِ سست گام بدلنے کی فکر ہے
رفتارِ صبح و شام بدلنے کی فکر ہے

دستورِ میکشی کی ہے تجدید کا خیال
آئینِ دورِ جام بدلنے کی فکر ہے

جس زندگی کو اپنی خودی کا یقیں نہ ہو
اُس زندگی کا نام بدلنے کی فکر ہے

اِس دَورِ انقلاب میں دل سے حیات کا
احساسِ ناتمام بدلنے کی فکر ہے

پنہاں ہوں جس مقام پہ ہستی کی رفعتیں
ہستی کا وہ مقام بدلنے کی فکر ہے

دولت ہو جس نظام میں انسانیت کا نام
دُنیا کا وہ نظام بدلنے کی فکر ہے

میرے تخیلات کو شام و سحر طفیلؔ
اطوارِ خاص و عام بدلنے کی فکر ہے

ڈاکٹر گیان چند ایم۔ اے۔ ڈی۔ فل

بوستانِ خیال کی تاریخ

ڈاکٹر گیان چند صاحب ہماری درخواست پر پہلی بار بزمِ مخزن میں تشریف لائے ہیں۔ لیکن ادبی تحقیق و تدقیق کے کام میں اُن کا بلند مرتبہ مسلّم ہے (مخزن)

فارسی میں اس کے مصنف میر محمد تقی خیال ہیں۔ یہ محمد فضل ثابت الہٰ آبادی ہم عصرِ عالمگیر کے شاگرد تھے۔ محمد شاہ کے عہد میں خیال اپنے وطن احمد آباد گجرات سے دہلی میں وارد ہوئے۔ بوستانِ خیال کی شانِ نزول مشہور ہے۔ دہلی میں خیال کی قیام گاہ کے نزدیک ایک نشست گاہ میں داستانِ امیر حمزہ پڑھی جاتی تھی۔ ایک روز اہلِ محفل نے خیال کو سنانے کو کہا کہ انسان حسبِ قدر علم و فضل میں دستگاہ پیدا کر سکتا ہے مگر فنِ قصہ گوئی ایسا دقیق و مشکل ہے کہ بغیر مناسبِ طبیعت کے ہرگز نہیں حاصل ہوتا۔ اس طنز کے جواب میں خیال نے ایک داستان تصنیف کرنے کا ارادہ کیا اس کے علاوہ ایک زنِ مطربہ ان کے ہمراہ حیدر آباد سے آئی تھی اور وہ ہر روز نئی نئی کہانیوں کی فرمائش کرتی تھی۔ کچھ اس کے تقاضوں سے اور کچھ اہلِ محفل کو سنانے کے لئے خیال نے دس بیس جزو بوستانِ خیال کے تصنیف کر کے اسی نشست گاہ میں پڑھے۔ سب نے تحسین و آفرین کی۔ اُن کا شہرہ سن کر مؤتمن الدولہ نواب اسحاق خاں سالار جنگ نے بلوایا۔ خیال نے قصے کے اجزا نذر کیے۔ نواب نے خلعت دے کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ محمد شاہ نے تکمیل کی فرمائش کی اور انہیں کتب خانے کی خدمت دی گئی۔ ۱۵ کاتب مقرر ہوئے۔ اُنہوں نے مہدی نامہ اور اسمٰعیل نامہ لکھا تھا کہ محمد شاہ انتقال کر گیا۔ خیال بنگال میں نواب سراج الدولہ کے پاس چلے گئے۔ وہاں اُنہوں نے جعفر خاں ناظم بنگال کے لڑکوں کی فرمائش پر بوستانِ خیال کی تکمیل کی جعفر خاں کے تین لڑکوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں سے نواب رشید الدین خاں سالار جنگ عرف مرزا محمد علی رفیع اللہ خیال کے سرپرست تھے۔ اسی وجہ سے بوستانِ خیال کو بعض اوقات فرمائشِ رشیدی بھی کہتے ہیں۔ بوستانِ خیال کی پہلی جلد مہدی نامہ ۱۷۴۲ء میں دہلی میں شروع ہوئی تھی اور آخری جلد ۱۷۵۵ء میں مرشد آباد میں ختم ہوئی۔ خیال چار سال بعد ۱۱۷۳ھ میں دوسری دُنیا کو سدھار گئے۔ خواجہ امان نے حدائق الانظار کے دیباچے میں بہ غلط لکھ دیا ہے کہ بوستانِ خیال ۲۵ برس میں لکھی گئی

بوستانِ خیال کی فارسی جلدوں کی عجب تقسیم ہے۔ وہ وہ الجھنیں ہیں کہ عقل چکرا جاتی ہے۔ مکمل نسخے تو نادر ہیں۔ نامکمل نسخوں سے آخری اندازہ نہیں ہو پاتا۔ بوہر لائبریری (BUHOR) کلکتہ میں کچھ اور ترتیب ہے اور انڈیا آفس اور بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں کچھ اور۔ تینوں جگہ بیچ کی چند جلدیں غائب معلوم ہوتی ہیں۔ آخری دو جلدوں کی ترتیب یکساں ہے۔ اس لئے میں ان سے نقل کرتا ہوں ہندسے میں سلسلہ کا واقعی نمبر دیا ہے اور لفظ جلد کے ساتھ امان کی ترتیب دی ہے۔

بوستانِ خیال

مہدی نامہ ۱، ۲ مقدمہ کتاب یا بہارِ اوّل

- معز نامہ
  - ۳ مقدمہ
  - ۴، ۵ گلشنِ اوّل
  - ۶، ۷ گلشنِ دوم
  - (بہارِ دوم یا گلستانِ اوّل)
- خورشید نامہ
  - جلد اوّل ۸
  - جلد دوم ۹
  - ضمیمۂ جلد دوم — شاہنامۂ بزرگ
    - ۱۰ اشطرِ اوّل
    - ۱۱ اشطرِ دوم
  - جلد سوم ۱۲
  - جلد چہارم ۱۳
  - جلد پنجم ۱۴
  - جلد ششم ۱۵
  - جلد ہفتم
    - ۱۶ فصلِ اوّل
    - ۱۷ فصلِ دوم و خاتمہ
  - (بہارِ سوم یا گلستانِ دوم)

تمام کتاب تین بہاروں میں تقسیم ہے۔ پہلی بہار میں مہدی نامہ اور اسمٰعیل نامہ ہے۔ یہ تمام کتاب کا مقدمہ ہیں۔ دوسری بہار معز نامہ دو گلشنوں میں تقسیم ہے اور یہ گلشن دو دو گلزاروں میں بانٹ دیئے گئے ہیں۔ اِن گلشنوں کے پیشتر ایک مقدمہ ہے۔ تیسری بہار خورشید نامہ ہے۔ اِس کی دوسری جلد کے بعد ایک ضمیمہ موسوم بہ شاہنامۂ بزرگ ہے۔ اِس ضمیمہ کے دو حصوں کا نام شطر ہے۔ ساتویں جلد کے بھی دو حصے ہیں۔ اِس طرح کُل ۱۷ جلدیں ہیں۔ اُردو مہدی نامہ میں فارسی کی ابتدائی تین جلدیں شامل ہیں۔ فارسی کی باقی ۱۴ جلدیں اُردو کی ۶ جلدوں میں سماتی ہیں۔

خیال سے ماخوذ کرکے اسے فارسی اور اُردو میں کئی شخصوں نے لکھا۔ بوہر لائبریری کلکتہ میں منتخب بوستانِ خیال قلمی ہے۔ اس کا مرتب معلوم نہیں۔ رامپور لائبریری میں خلاصۂ بوستانِ خیال قلمی نہایت ضخیم ہے۔ یہ ۱۲۷۰ھ میں نواب کلب علی خاں کے حکم سے تحریر ہوا۔ ایک اَور درباری داستان گو عبداللہ خاں نے ۱۸۵۱ء میں زرّیں نامہ عرف خورشید نامہ لکھا۔ رامپور کے شاہی کتب خانے میں ذیل کے اُردو نسخے بھی موجود ہیں جو نواب کلب علی خاں اَور نواب حامد علی خاں کے لئے لکھے گئے۔ ان میں بوستانِ خیال سے خاص خاص واقعات لے کر اپنے تخیل کی گلکاریاں دکھائی گئی ہیں۔

طلسمِ سعید یا طلسمِ جامِ جم از مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی ۱۸۶۲ء سید محمد سعید خاں کے لئے

طلسمِ حیرت کدۂ آصفی از مہدی علی خاں ذکی ۱۸۶۲ء

طلسمِ حکیم قسطاس از مہدی علی خاں ذکی مکتوبہ ۱۸۶۵ء بوستانِ خیال کی دوسری جلد کا ترجمہ۔

طلسمِ سبع سیارہ موسوم بہ معز نامہ از مہدی علی خاں ذکی مکتوبہ ۱۸۵۶ء

طلسمِ صفا از شیخ علی بخش بیمار بریلوی مکتوبہ ۱۸۶۵ء

خورشید نامہ از مرزا کاظم حسین عرف مرزا محشر رامپوری المتوفی ۱۸۶۵ء

زرّیں نامہ عرف خورشید نامہ از حیدر مرزا تصوّر مکتوبہ ۱۸۷۶ء

یہ سب غیر معروف قلمی نسخے ہیں۔ اب اُردو کے مطبوعہ ایڈیشن درج کرتا ہوں۔ عالم علی نے تمام بوستانِ خیال کو بڑے سائز کے ۱۴۰ صفحوں کی ایک جلد میں بند کرکے زبدۃ الخیال کے نام سے بعا گلپور سے شائع کیا۔ یہ ۱۸۴۲ء میں مرتب ہوا اور ۱۸۶۳ء میں پہلی بار چھپا۔ سب سے مشہور ترجمے خواجہ امان اَور نولکشور پریس کے ہیں۔ بدر الدین خاں عرف خواجہ امان غالب کے بھتیجے تھے۔ ان کے ترجمے کی پہلی جلد پر غالب نے دیباچہ لکھا ہے۔ امان الور کے راجہ شیودان سنگھ کے ملازم تھے۔ شاہی کتب خانے میں بوستانِ خیال

مکمل موجود تھی۔ راجہ نے امان سے ترجمہ کرنے کو کہا۔ امان نے پہلی جلد مہدی نامہ اور اسمٰعیل نامہ شو باں کر چھوڑ دیں اور اٹھ معز نامہ کی صرف دو جلدوں کا ترجمہ حدائق الانظار کے نام سے کیا تو انہ الور میں ایک فتنہ عظیم برپا ہوا جس میں اوروں کے ساتھ خواجہ امان بھی نکالے گئے۔ دلی میں آکر انہوں نے اپنے اردو کی چھٹی جلد تک ترجمہ کیا تھا کہ موت نے آ لیا۔ ساتویں جلد اخبار عالم کے ایڈیٹر حکیم محمد مقرب حسین خان نجفی نے ترجمہ کی۔ یہ دن کو مطب کرتے تھے رات کو ترجمہ کرتے۔ آٹھ دس مہینے میں ختم کی اور راجہ بلونت راؤ سندھیا سے منسوب کی۔ اس کے بعد انہوں نے آٹھویں جلد بھی ترجمہ کی۔ یہ جلد امان سے الٹ کے قمرالدین احمد رالمتوفی سنہ ۱۹۰۵ء) نے بھی ترجمہ کی۔ امان کے ترجمے کے نسخے کی تفصیل یوں ہے :-

جلد نمبر	نام	مترجم	تاریخ ترجمہ	تاریخ طبع
۱	حدائق الانظار	امان	سنہ ۱۲۰۵ھ	سنہ ۱۲۰۲ھ
۲	ریاض الابصار	امان	سنہ ۱۲۸۳ھ	سنہ ۱۲۸۴ھ
۳	شمس الانوار	امان	سنہ ۱۲۸۵ھ	[illegible]
۴	بدر الآثار	امان	سنہ ۱۲۹۱ھ	سنہ ۱۲۹۱ھ
۵	نجم الاسرار	امان	سنہ ۱۲۹۲ھ	سنہ ۱۲۹۶ھ
۶	مصباح النہار	امان	سنہ ۱۲۹۵ھ	سنہ ۱۲۹۶ھ
۷	کاشف الاسرار	مقرب حسین نجفی	سنہ ۱۳۰۰ھ	سنہ ۱۳۰۲ھ
	خاتمۃ الاسما	مقرب حسین نجفی		سنہ ۱۸۸۷ء
۸	میرات الاعتبار قمرالدین راقم ابن خواجہ امان		سنہ ۱۳۰۱ھ	سنہ ۱۳۰۱ھ

لکھنؤی ترتیب کے لحاظ سے حدائق الانظار دوسری جلد ہے اور میرات الاعتبار نویں جلد۔ پہلی جلد کا ترجمہ نہ تھا۔ مہدی نامہ اسمٰعیل نامہ کا ترجمہ لکھنؤ کے مرزا محمد عسکری عرف چھوٹے آغا نے کیا۔ انہوں نے فارسی مہدی نامہ کا ترجمہ سنہ ۱۸۸۰ء میں کیا اور اسمٰعیل نامہ کا ترجمہ سنہ ۱۸۸۲ء میں کیا۔ اردو میں دونوں کو ملا کر مہدی نامہ کے نام سے نولکشور پریس سے سنہ ۱۸۸۳ء میں شائع کیا۔ باقی آٹھ جلدوں کے ترجمے کی تجویز تھی کہ مرزا محسن علی خاں عرف آغا مجو ہندی مرحوم کے بھتیجے نواب جعفر علی خاں نے مرحوم کی ترجمہ کی ہوئی جلدوں کا نا تمام مسودہ پیش کیا۔ آغا مجو نے بھی پہلی جلد چھوڑ کر ترجمہ کیا تھا۔ باقی جلدوں کی ترتیب وغیرہ آغا مجو کے شاگرد منشی پیارے مرزا اور نواب مرزا علی خاں نے کی۔ تفصیل یہ ہے :-

جلد ۱۔ مہدی نامہ از چھوٹے آغا محمد عسکری مطبوعہ سنہ ۱۸۸۳ء

" ۲۔ دُرَر الابصار از آغا مجو مطبوعہ سنہ ۱۸۸۹ء

" ۳۔ ضیاء الابصار از آغا مجو بہ تصحیح پیارے مرزا

" ۴۔ شمس النہار از آغا مجو بہ تصحیح پیارے مرزا

" ۵۔ مطلع الانوار از آغا مجو بہ عرق ریزی پیارے مرزا

" ۶۔ نزہت الاسرار از آغا مجو بہ اصلاح چھوٹے آغا بہ تصحیح پیارے مرزا

" ۷۔ نور الانوار از آغا مجو بہ ترتیب پیارے مرزا

" ۸۔ تفریح الاسرار، آغا مجو نے یہ جلد نامکمل چھوڑ دی۔ پیارے مرزا نے اجزائے گم شدہ سے ترتیب اور ترجمہ کیا۔ چھوٹے آغا نے نظر ثانی کی۔ سنہ ۱۸۹۱ء

" ۹۔ تفریح الاحرار، آغا مجو نے نامکمل چھوڑ دی۔ پیارے مرزا اور مرزا علی خاں نے مکمل کی۔

بوستانِ خیال کا ایک اور مکمل ترجمہ ہے۔ یہ دس نہایت جلی جلدوں میں فرزند احمد صفیر بلگرامی نے کیا۔ یہ جلدیں شائع بھی ہوئیں حالانکہ آج ان سے کوئی واقف بھی نہیں۔ ان کی طباعت کے وقت واجد علی شاہ کلکتہ میں مقیم تھے یعنی سنہ ۱۸۵۶ء کے بعد چھپیں اور مرزا دبیر بقید حیات تھے۔ پہلی جلد کا نام پردۂ اعظم ہے۔ اس میں مہدی نامہ

اور اسمٰعیل نامہ کا خلاصہ ہے۔ دوسری جلد کا نام پردۂ اول، تیسری کا پردۂ دوم اور اسی طرح دسویں کا پردۂ نہم۔ تیسری جلد انڈیا آفس میں موجود ہے۔ تین جلدیں پروفیسر مسعود حسین رضوی کے پاس موجود تھیں جن سے ذیل کی پانچ جلدوں کا نام معلوم ہوتا ہے۔

جلد۱۔ پردۂ اعظم موسوم بہ آفت الخیال ۱۲۸۱ھ
" ۲۔ پردۂ اول " صبح خنداں
" ۳۔ پردۂ دوم " چمنستان ۱۸۸۳ء
" ۴۔ پردۂ سوم " صبح بہار
" ۱۰۔ پردۂ نہم " شام وصال

بوستانِ خیال کے لکھنوی ترجمے کا خلاصہ سید ناصر علی بلگرامی لاہور والے نے شروع کیا تھا۔ ۵ حصے خلاصہ کئے تھے کہ زندگی نے وفا نہ کی۔ یہ خلاصہ لاہور سے ۱۸۹۱-۹۳ء میں شائع ہوا۔ یہ انڈیا آفس میں موجود ہے۔

بوستانِ خیال جب پہلی مرتبہ دلّی میں خیال نے سنائی تھی۔ تو اس کی داد میں کہا گیا تھا کہ واقعی اس میں تاریخ گزشتہ کا لطف ہے خیال نے اپنے قصے کے بعض واقعات کی تائید میں تاریخ طبری، مرأت الجنان، حبیب السیر اور عاصم کوفی وغیرہ کا حوالہ دیا ہے۔ قصے کے ہیرو شہزادہ معز الدین ابوتمیم کا تعارف یوں ہے کہ انکا نسب دس پشتوں کے بعد امام جعفر صاحب سے ملتا ہے۔ ان کے والد المنصور بقوت اللہ اسمٰعیل تھے۔ اسمٰعیل کے والد قائم بامر اللہ تھے اور قائم کے والد محمد مہدی تھے۔ تاریخ سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بیان بالکل درست ہے۔ مصر میں خلیفہ معز الدین ہوئے ہیں اور اُن کا یہی نسب ہے یہ فاطمی خلیفہ تھے۔ اسٹینلی لین پول کی انگریزی تاریخ مصر میں ص۹۹ پر ان کی حکومت کی تاریخیں یوں دی ہیں۔ المہدی ۹۰۹-۹۳۴ء۔ القائم ۹۳۴-۹۴۶ء المنصور ۹۴۶-۹۵۳ء۔ المعز اپریل ۹۵۳ء سے ۹۷۵ء تک۔ المعز کا پورا نام امام ابوتمیم معاد المعز الدین اللہ لکھا ہے۔ تقریباً یہی نام خیال نے لکھا ہے۔ چند تاریخوں کا بھی مقابلہ کر لیا جائے۔ مہدی نامہ میں لکھا ہے کہ مہدی کا انتقال ۳۲۲ھ میں ہوا۔ واقعی ۹۳۴ء اسی کے مطابق ہے معز الدین جب طلسم اجرام و اجسام سے برآمد ہوتے ہیں اس وقت کو راوی نے ۳۲۵ھ بتایا ہے۔ یہ سال غلط ہے۔ یہ طلسم کی سیر اس وقت کرتے ہیں جب یہ شہزادے ہیں اور انکے والد صاحب تخت ہی حال تکہ تاریخ کے لحاظ سے ۳۵۱ھ میں معز کے جلوس اور منصور کی وفات کو دس سال ہو چکے ہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ جوہر عیار بھی تاریخی شخصیت ہے۔ تاریخ کے لحاظ سے یہ شرقی رومی حکومت کا باشندہ تھا۔ یہ غلام تھا لیکن المعز کے وزیر کے عہدے تک پہنچا۔ معز الدین کیلئے سپہ سالاری کر کے اُس نے مصر فتح کیا اور شہر قاہرہ کی بنیاد رکھی۔ المعز تمام فاطمی خلفا میں سب سے زیادہ طاقتور اور مدبر تھا۔ بوستانِ خیال کی ابتدا کے کچھ اور واقعات تاریخ میں پائے جاتے ہیں داستان کے آخر میں معز الدین کی اولاد کی بادشاہت کی تفصیل لکھی ہے۔ یہ تمام شجرہ بھی تاریخ کے مطابق ہے۔ مصر کی یا خلافت کی کسی بھی تاریخ میں ان کا ذکر مل سکتا ہے۔

بوستانِ خیال ایک ضخیم داستان ہے ممکن نہ تھا کہ اس میں دوسری کتابوں کے مضامین نہ آجائیں۔ جا بجا مذہبی کتابوں کے بیانات کی طرف اشارے ہیں۔ رائج الوقت قصوں سے کام لیا گیا ہے۔ یہ داستان امیر حمزہ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اسمیں جا بجا امیر حمزہ کے محیر العقول کارناموں پر اعتراض کیا ہے لیکن پھر بھی اس عظیم داستان سے مفر نہیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر قصۂ حمزہ کا رنگ جھلک آیا ہے۔ وہی صاحبقران، اسی طرز کے عیار۔ اسی طرح کے کراماتی اعجازی تحفے، سحر جو کچھ ہے وہ داستان حمزہ سے متأثر بعض طلسم بھی اسی انداز کے ہیں۔ خاص کردار حمزہ کے کرداروں کی نحیف صدائے بازگشت ہیں۔ خصوصاً مہتر توفیق خواجہ عمرو کا چربہ ہے بوستانِ خیال کا پلاٹ بھی داستانِ حمزہ کو ذہن میں پیلہ ملیتا ہے۔ جزئیات

ھ طوالت کے خوف سے حذف کرتا ہوں +

ظفر اقبال حشر

غزل

کسی کے غم سے وہ جانِ حسن و شباب کچھ بے قرار سی ہے
نظر نظر غم پسند سی ہے ادا ادا سوگوار سی ہے

کوئی یہ ذوقِ نگاہ دیکھے، کوئی یہ شوقِ جمال سمجھے
وہ سامنے جلوہ گر ہیں پھر بھی کشاکشِ انتظار سی ہے

مری محبت نے دو جہاں کو مذاقِ حسن و شباب بخشا
وگرنہ دنیائے آب و گل تو تمام مشتِ غبار سی ہے

نہ اُن کے جلووں کی آرزو ہے نہ برقِ ایمن کی جستجو ہے
بس اتنا محسوس ہو رہا ہے نگاہ کچھ بے قرار سی ہے

سزائیں مجھ کو ملی ہیں اتنی کہ آرزو ہی نہیں کرم کی
خطائیں کچھ تو ہوئی ہیں ایسی کہ زندگی شرمسار سی ہے

نہ ذہن و حکمت پہ تازگی نہ سوز باقی نہ ساز باقی
تمام آزادیاں ہیں لیکن حیات بے اختیار سی ہے

بنا گئے ہیں وہ اک نظر سے تمام دنیا کو مست و رنگیں
خزاں کا موسم ہے حشر لیکن فضا میں رونق بہار سی ہے

مخزن المخازن

"ساقی"

فسادات کے افسانوں کا پروپیگنڈائی پہلو

(انتظار حسین)

فسادات کے افسانوں کے بارے میں سب سے پہلا اور بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ فسادات کے افسانے ہیں یا نہیں۔ دقت یہ آ پڑتی ہے کہ ان میں فسادات کو محض قتل و غارت گری، آتشزدگی اور عصمت دری کے واقعات سے عبارت کیا گیا ہے۔ فسادات کا یہ ایک بہت محدود سا مفہوم ہے۔ آگ اور خون کا یہ ہنگامہ جو گرم ہوا تھا وہ خلا میں نہیں اگا تھا۔ اس کا ایک آگا پیچھا تھا۔ اور اس آگا پیچھا کے سلسلے میں صرف یہ کہہ کر پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا کہ یہ سب انگریزی سامراج کی کارستانی تھی۔ جس چیز کو ہم فسادات کہتے ہیں وہ ایک پیچیدہ قومی واقعہ ہے جس کے مختلف خارجی پہلو ہیں۔ آگ اور خون کا یہ ہنگامہ اس کے خارجی پہلو کا ایک جزو تھا۔ ہمارے افسانہ نگار نے اِس ایک پہلو کے ایک جزو کو پوری حقیقت سمجھا۔ دوسری بات یہ ہے اُردو افسانے کا جو عام معیار ہے اس کے مقابلے میں مجموعی طور پر ان فسادات کے افسانوں کا معیار پست ہے۔ بات یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر آدمی خواہ مخواہ رقیق القلب ہو جاتا ہے اور رقیق القلبی، ضبطِ نفس اور سوچ بچار کو بڑی حد تک فنا کر دیتی ہے۔ اِس چکر میں بعض اخبار نویس بھی "میں کون ہوں؟ میں انسان ہوں" قسم کی جذباتی چیخیں مار کے افسانہ نگار بن گئے، تو گویا ادبی اعتبار سے اِن افسانوں کی ایک بڑی تعداد بہت زیادہ اہم نہیں ہے لیکن اِن افسانوں کا ایک پروپیگنڈائی پہلو بھی ہے جس کی بنا پر وہ سیاسی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔

فسادات کے بارے میں مسلمان اپنے آپ کو سب سے زیادہ مظلوم سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں کی مسلمانوں کے بارے میں پہلے ہی سے کچھ اچھی رائے نہ تھی، اِس لئے اگر وہ بربریت کا الزام مسلمانوں کے سر چپکتے ہیں تو ایسی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ پھر مسلمانوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہندو فرقہ پرست عناصر مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جس تندہی سے پرچار کر رہے تھے اُس کا لازمی نتیجہ اس خون خرابہ کی شکل میں نمودار ہونا تھا۔ ہندو نفرت کا مبلغ مسلم لیگ کو گردانتے ہیں۔ ایک تیسری بظاہر غیر جانبدار جماعت ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی ہے۔ جس کا کہنا یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان رجعت پرست رہنماؤں نے برطانوی سامراج سے سمجھوتہ کر کے معصوم عوام کو جنہیں فرقہ پرستی کی ہوا بھی نہ لگی تھی آپس میں لڑا دیا۔ میں اس بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا کہ اِس قیامت کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جنہوں نے ہندو مسلم مسئلہ کے وجود سے ہی انکار کیا یا اُن لوگوں پر ہے جنہوں نے اِس مسئلہ کی اہمیت پر اصرار کیا۔ میں نے سیدھے سادے الفاظ میں تین نظریوں کو پیش کر دیا۔ تین شاید میں نے غلط کہا۔ یہ دو نظریے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی اور ہندو جماعتوں کے نقطۂ نظر میں بس ایک اِتنا فرق ہے کہ اوّل الذکر نے ذرا غیر جانبداری کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اِس لئے برطانوی حکومت کی شر انگیزی پر ضرورت سے زیادہ اصرار کیا ہے۔

برِ اعظم میں آزادی کے لئے جو جد و جہد ہو رہی تھی اِس میں

ایک طرف مسلمان حق خود اختیاری مانگ رہے تھے اور دوسری طرف کانگریس متحدہ قومیت کے نعرے کے بل پر مسلمانوں کی الگ حیثیت ہی کو نظرانداز کر دینے پر تُلی ہوئی تھی۔ ہمارے ترقی پسند ادیب چونکہ غیر جانبداری کی فکر میں گھُلے جا رہے تھے اور کانگریس نے پروپیگنڈا اس نفاست کے ساتھ کیا تھا کہ مُسلم حقِ خود اختیاری کا مطالبہ فرقہ پرستی نظر آتا تھا اور متحدہ قومیت کا نظریہ ایک بے لاگ اور غیر جانبدارانہ نظریہ معلوم ہوتا تھا اس لئے وہ متحدہ قومیت کے نظریہ سے ہی وابستہ ہو گئے۔

اگرچہ کانگریس کی پالیسی کے خلاف بد دلی عام تھی، لیکن کمیونسٹ پارٹی جو ہندو مسلم مسئلہ کے وجود سے ہی منکر تھی کانگریس کی مخالفت کے ساتھ ساتھ اس تصور کو سینے سے لگاتی رہی۔ اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک چونکہ اسی کے زیر اثر پل رہی تھی اس لئے اُس نے مسلمان ادیبوں کو اس تصور سے بچھڑنے نہیں دیا۔ جس میں وقت کے سیاسی مسائل سے متأثر ہونا مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ اُدھر لیگ کے رہنما اس بات سے پُورے طور پر مطمئن تھے کہ لیگ کے ہر جلسے میں کوئی طالب علم یا شہر کا کوئی شاعر ضرور قومی نظم پڑھ دیتا ہے۔ پروپیگنڈائی ادب کے اس سے بلند تصور کا سوال ان کے سلسلے میں یُوں بھی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اُنھوں نے کبھی اس مسئلہ پر سوچ بچار کرنا مناسب سمجھا ہی نہیں۔

ایسی صورت میں تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں ہونے والے فسادات کے متعلق ادیبوں کا جو رویّہ رہا ہے وہ ایسا غیر متوقع نہیں ہے۔ اُنہوں نے فسادات کی ساری ذمہ داری تقسیمِ ہند کے سر تھوپ دی اور تقسیم کو اُنہوں نے برطانوی سامراج کا تحفہ تصور کیا۔ پس اُردو افسانہ میں متحدہ قومیت کے نظریہ کی موت پر آنسو بہائے گئے، برطانوی سامراج کو گالی کوسنے دیئے گئے، اور اس برعظیم کے پھر ایک ملک ہو جانے کے خواب دیکھے گئے۔ کرشن چندر اس نظریہ کا سب سے بڑا مبلغ ہے۔ بات سیدھی سادی تبلیغ پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ "ہم وحشی ہیں" کی اشاعت سے اُردو ادب میں فرقہ پرستی کی باقاعدہ ابتدا ہوتی ہے۔ میں تو کرشن چندر کے ہر نئے افسانہ کو راشٹریہ سیوک سنگھ کا ادبی بلیٹن سمجھ کر پڑھتا ہوں۔ اس کے افسانہ "پشاور ایکسپریس" ہی کو لے لیجئے جس کی تعریف میں ترقی پسندوں سے لے کر ممتاز شیریں تک سب کے منہ سُوکھے جاتے ہیں۔ اس افسانے میں کرشن چندر نے دو قوموں کے کردار کا موازنہ کیا ہے۔ مگر وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ ہندو قوم کے مقابلہ میں مسلمانوں کا کردار بہت پست ہے۔ "پشاور ایکسپریس" کے مسلمان کرداروں کو اپنی جان اس قدر پیاری ہے کہ وہ اس پر سے قومی غیرت اور خودداری تک کو نچھاور کر دیتے ہیں عذر نہیں سمجھتے۔ ہندو کرداروں میں قومی غیرت ہے، ضبط اور حوصلہ ہے۔ ہندو لٹ پٹ کر گاڑی میں سوار ہوئے ہیں لیکن غم نہیں وطن کے چھٹنے کا غم ہے، اپنی عزت و آبرو کا پاس ہے، اپنی عورتوں کی آبرو کا خیال ہے۔" موت کا وہ خاموشی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ عورتوں کی عصمت کا سوال آ جاتا ہے تو وہ جان کی بازی لگا دیتے ہیں لیکن مسلمانوں کے سامنے صرف ایک سوال ہے اور وہ جان کا سوال ہے۔ اس کے بچانے کے لئے وہ برہمنوں کا بھیس بدلتے ہیں، چوٹی رکھاتے ہیں۔ یہ فرق مردوں میں ہی نہیں عورتوں میں بھی موجود ہے بلکہ وہاں اور زیادہ شدت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ ہندو عورت ننگی ہو کر دروپدی بن جاتی ہے۔ مسلمان عورت جان بچانے کی خاطر ایمان اور عزت کا سودا کرتی ہے۔ ہندو عورتوں کے ننگے جلوس کو دیکھ کر کرشن چندر کی خطیبانہ حِس بیدار ہو جاتی ہے۔

اُردو فصاحت و بلاغت کے دریا یُوں بہاتا ہے :-

"اُن کی نگاہوں کا جلال دروپدی کو بھی شرماتا تھا۔
اُور ہونٹ دانتوں کے اندر یُوں بھینچے ہوئے تھے
گویا کسی مہیب لاوے کا منہ بند کئے ہوئے ہیں۔ شاید
ابھی یہ لاوا پھٹ پڑے گا اُور اپنی آتش فشانی سے
دُنیا کو جہنم زار بنا دے گا۔"

لیکن جب مسلمان لڑکی پر جو اشتراکیت اُور فلسفہ پڑھتی ہے حملہ کیا جاتا ہے تو وہ کرشن چندر کو یہ کہتی نظر آتی ہے :-

"مجھے مارتے کیوں ہو؟ مجھے ہندو کر لو، مَیں تمہارے
مذہب میں داخل ہوئی جاتی ہوں، تم میں سے کوئی
ایک مجھ سے بیاہ کر لے، میری جان لینے سے فائدہ؟"

کرشن چندر مسلمان عورت کے کردار پر اس سے بڑا حملہ کیا کرتا۔ "جانور" میں کرشن چندر نے حکومت کے مقاصد کا تھوڑی سی اُور خوش سلیقگی کے ساتھ پروپیگنڈا کیا ہے۔ یہاں وہ قبائلیوں کے نام نہاد مظالم کی بڑی درد انگیز تصویر کھینچتا ہے۔ لیکن جب اسے توازن قائم کرنے کی فکر ستاتی ہے تو وہ مہاراجا ہری سنگھ کے مقبوضہ کشمیر سے کترا کر مشرقی پنجاب اُور بہار کا رُخ کرتا ہے۔ لیکن بہار کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ یہ بتانا نہیں بھُولتا کہ یہ سب کچھ نوآکھلی کے بدلے کے طور پر ہوُا تھا۔ البتہ اُسے اِس بات کا افسوس ضرور ہے کہ بہار کے فسادات میں "اچھے اُور بُرے کی تمیز" اُٹھ گئی۔ گویا کرشن چندر بنیادی طور پر بہار کے فسادات کا مخالف نہیں ہے۔ اس کا اصرار صرف اِتنا ہے کہ کانگریسی اُور لیگی مسلمانوں میں امتیاز کیا جانا چاہئے تھا۔ میرے خیال میں پروپیگنڈائی نقطۂ نظر سے کرشن چندر کا "نیا مدرسہ" سب سے زیادہ کامیاب افسانہ ہے۔ یہ افسانہ سب سے زیادہ زہریلا پروپیگنڈا ہے۔ "نیا مدرسہ" کے طلبہ ہیں تو بچے ہی لیکن ہیں اِتنے اُستاد کہ بڑے بڑوں کے کان کترتے ہیں۔ وہ بار بار یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ آزادی کے بعد ہندوستان کا نقشہ چھوٹا کیوں رہ گیا۔ اُنہیں یہ غم بھی کھائے جاتا ہے کہ آدھا پنجاب پاکستان میں کیسے رہ گیا؟ وہ ذہنی طور پر اِس بات پر بھی آمادہ نہیں ہیں کہ کشمیر ہندوستان کی سرحد سے باہر ہو۔ بات یہاں آ کر ختم نہیں ہو جاتی۔ کرشن چندر یہ جتانے کا بھی اہتمام کرتا ہے کہ پہلے سیلون بھی ہندوستان ہی میں شامل تھا۔ گویا کرشن چندر کے پروگرام میں پنڈت نہرو کے ایشیائی اقتدار کے خواب کا پروپیگنڈا بھی شامل ہے۔

کرشن چندر نے شاید سب سے زیادہ سینہ کوبی پنجاب کی تقسیم پر کی ہے۔ پنجاب پر پہلی قیامت تو یہ ٹوٹی کہ اُس کا بٹوارہ ہو گیا، دوسری قیامت یہ ٹوٹی کہ کرشن چندر نے اسے سیاسی سٹنٹ کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے یہاں سوہنی مہینوال اُور اجنتا اُور ایلورا کے الفاظ ایک ہی قسم کا شور برپا کرتے ہیں۔ ہندو کلچر کی طرح پنجاب کا بھی کوئی رچا ہوُا احساس اس کے یہاں نظر نہیں آتا۔ پُورا افسانہ تو درکنار کوئی ٹکڑا کوئی فقرہ اس کے اِن افسانوں میں ایسا نہیں ملتا جس میں پنجاب نظر آتا ہو۔ پنجاب البتہ بلونت سنگھ کے یہاں نظر آتا ہے۔ کرشن چندر نے تو محض لفظوں کا طلسم کھڑا کیا ہے۔ لیکن ایک فضا کا ایک کلچر کا رچا ہوُا احساس اگر فسادات کی نثری نگارشات میں کہیں نظر آتا ہے تو وہ آغا محمد اشرف کا مختصر رپورتاژ جنہیں ہم وہاں چھوڑ آئے ہیں، میں ہے۔ آغا محمد اشرف نے کرشن چندر کی طرح سینہ زنی نہیں کی ہے۔ اس نے صرف چند گمشدہ چیزوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ جو بظاہر بہت معمولی چیزیں ہیں لیکن جو درحقیقت دلّی کی زندگی کی نمائندگی ہیں۔ اِن اُڑتے اُڑتے اشاروں ہی سے اُس نے ایک فضا پیدا کر دی ہے۔

اور اس پوری بربادی کی داستان بیان کر دی ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی ماری ہوئی دلّی کا یہ بڑا دردناک نوحہ ہے۔ کرشن چندر چند سیاسی اغراض کی خاطر پنجاب کا نوحہ پڑھتا ہے اور اسی لئے وہ بربریت کو بھول کر دوسری باتیں کہنی شروع کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں دو خاتمے دیکھئے۔ کرشن چندر کا افسانہ "امرتسر" یوں ختم ہوتا ہے:۔

"ہم انسان ہیں، ساری کائنات میں ہم تخلیق کے علمبردار ہیں اور کوئی تخلیق کو مار نہیں سکتا، کوئی اس کی عصمت دری نہیں کر سکتا، کوئی اسے لوٹ نہیں سکتا کیونکہ ہم تخلیق ہیں اور تم تخریب ہو، تم وحشی ہو، تم درندے ہو، تم مر جاؤ گے لیکن ہم نہیں مریں گے، کیونکہ انسان کبھی نہیں مرتا۔ وہ درندہ نہیں ہے۔ وہ نیکی کی روح ہے، خدائی کا حاصل ہے، کائنات کا غرور ہے۔"

اب شاہد احمد کے رپورتاژ "دلّی کی بپتا" کا خاتمہ دیکھئے:۔

"بیٹا اپنی ماں کی گود میں دل شکستہ ہو کر آیا تھا اور دل مردہ لے کر واپس آیا۔ ماں کا رنڈ سالہ دیکھا، بیوگی کے آنسو دیکھے۔ شاہجہانی مسجد کو نکھری چاندنی میں دیکھا تو بھالہ ماں کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں اور مریم کی طرح اس کے دل میں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ بہ ظاہر کچھ ایسا بندھا ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا اور بار بار دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، "ماں کیا تیرا سہاگ ہمیشہ کے لئے اُجڑ گیا؟"

اوّل الذکر خاتمہ میں مصنف امرتسر سے نکل کر کمیونسٹ پارٹی کے جلسے میں پہنچ جاتا ہے اور سٹیج پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دیتا ہے۔ ثانی الذکر خاتمہ میں مصنف دلّی سے نکل کر دلّی ہی میں رہتا ہے۔

شاہجہانی مسجد کا غمناک تصور اس کے ذہن کو کسی اور طرف بھٹکنے ہی نہیں دیتا۔ یہ تصور ہی اس کی تحریر میں زور اور اثر پیدا کرتا ہے۔ لیکن کرشن چندر کے ذہن میں امرتسر کا، امرتسر کے کسی محلہ کا، امرتسر کی زندگی کے کسی پہلو کا کوئی تصور بسا ہوا ہے ہی نہیں۔ اس لئے اس کے لئے تقریر میں مصروف ہو جانا بہت آسان ہے۔ کرشن چندر کے یہاں تخلیق، نیکی کی روح، خدائی کا حاصل، کائنات کا غرور جیسے پرشکوہ جملے تقدس کا وہ تاثر پیدا نہیں کر سکے ہیں جو شاہد احمد کے یہاں صرف مریم کی تلمیح نے پیدا کر دیا ہے۔

کرشن چندر کے فسادی افسانے شروع میں تو بہت ہی مقبول ہوئے۔ فسادات پر افسانہ لکھنے کی آدھا تیتر آدھا بٹیر قسم کی تکنیک سی جو اس نے بنا ڈالی تھی وہ اردو میں عام ہو گئی۔ اس نے ایک روایت کی شکل اختیار کر لی۔ کرشن چندر نے افسانہ نگاروں کو ایک سانچہ دیا تھا اور افسانہ نگار اس سانچہ کا استعمال اندھا دھند کرنے لگے مگر کم از کم پاکستان کے افسانہ نگاروں کو تو اس سانچہ کے استعمال سے پہلے بہت سوچنا سمجھنا اور اس کے عواقب و نتائج پر نظر ڈالنا چاہیئے تھا۔ کرشن چندر کی تحریر میں چند ایسے اوصاف ہیں جو نوخیز لکھنے والوں کو بہت اپیل کرتے ہیں۔ اس کی خطابت، سطحی جذباتیت، مرثیہ کا چٹخارہ، رنگین فارسی الفاظ کا ہجوم وغیرہ — یہ چیزیں ایسی ہیں جو عام قارئین اور نئے لکھنے والوں کو شدت سے اپیل کریں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہونی چاہیئے۔ پھر یہ سانچہ اس نقطۂ خیال کے عین مطابق تھا جو ترقی پسند مصنفوں کو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی سے ورثہ میں ملا تھا۔ اس کے علاوہ یہ سانچہ (منافقانہ) منصف مزاجی اور غیر جانبداری کی ایک فضا پیدا کر دیتا ہے۔ اور ایسے زمانوں میں جب منصف مزاجی اور غیر جانبداری ختم ہو جاتی ہے کچھ "فراریت پسند" طبیعتیں اس قسم

کی فضا کو پسند کر کے اپنے آپ کو ماحول سے کچھ اُوپر اُٹھا ہوا محسوس کرتی ہیں اور اِس طرح اپنی ذہنی آسودگی کا سامان کرتی ہیں۔

'ہم وحشی ہیں'، اور 'میں انسان ہوں'، دونوں نعرے ایک ہی ذہنیت کی پیداوار ہیں، اور دونوں نعرے غلط ہیں۔ یہ کہنا کہ 'ہم وحشی ہیں'، اس بات کی دلیل ہے کہ ہم وحشی نہیں ہیں، یہ نعرہ لگانا کہ 'میں انسان ہوں'، یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم انسان نہیں ہیں۔ "انسان پرست" ادیبوں نے درحقیقت انسان کے مسئلے پر غور کیا ہی نہیں ہے۔ وہ تو ننگی عورتوں کے جلوس کی داستانیں سُن کر بوکھلا گئے ہیں، اور متذکرۂ بالا دونوں نعرے اِسی بوکھلاہٹ کے مظاہرے ہیں۔ مذہب اور انسانیت دو متضاد چیزیں نہیں ہیں۔ آدمی، آدمی بننے کیلئے ہی سکھ اور مسلمان اور ہندو بنتا ہے۔ پھر یہ بھی صحیح ہے کہ اِس برِ عظیم کے رہنے والے ہندو اور مسلمان اور سکھ ہیں، انسانیت پر اصرار کرنے والے افسانہ نگاروں میں کم از کم احمد ندیم قاسمی نے اِس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کا افسانہ 'میں انسان ہوں' یوں شروع ہوتا ہے: "میں انسان ہوں، کلائی پر کھُدے ہوئے 'اوم'، ٹوپی پر ٹنکے ہوئے چاند تارے اور پہلو میں لٹکتی ہوئی کرپان کے باوجود میں انسان ہوں۔" لیکن ندیم قاسمی نے شاید اسے عیب کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ میں اگر اس فقرے کا مصنّف ہوتا تو یہ فقرہ یوں ہوتا: "میں انسان ہوں کلائی پر کھُدے ہوئے 'اوم'، ٹوپی پر ٹنکے ہوئے چاند تارے اور پہلو میں لٹکتی ہوئی کرپان کی بنا پر میں انسان ہوں۔" ندیم قاسمی نے اِس بات کا انتظام کیا ہے کہ قارئین کو افسانے کے ہیرو کے مذہب کا پتا نہ چلنے پائے۔ میں یہاں 'میں کون ہوں' کے ہیرو کی فرقہ پرست ذہنیت کا تجزیہ کرنے کا تکلّف نہیں کروں گا۔ خواجہ احمد عباس کی حیثیت ایک صحافی کی ہے۔ اُردو افسانہ کی تاریخ میں وہ دن بڑا منحوس تھا جب احمد عباس نے افسانے لکھ کر اُردو کے قارئین کا مذاق خراب کرنا شروع کیا تھا۔

ہمارے افسانہ نگاروں نے دوسری قوم کے دکھ درد کو سمجھا اور محسوس کیا ہی نہیں ہے۔ وہ محض رواداری کے طور پر اس کی مظلومیت کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر کرشن چندر مسلمانوں کے دکھ درد کو محسوس کرتا اور پیش کرتا تو مجھے یا کسی اور فرقہ پرست کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کرشن چندر نے دیانتداری اور دردمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ اس نے مسلمان قوم کے عزائم اور آدرشوں کی بے حُرمتی کی۔ اس نے اس کی تاریخ پر اس کے کردار پر حملے کئے ہیں۔ کرشن چندر مسلمانوں کے زخموں پر مرہم نہیں لگاتا، ان پر نمک چھڑکتا ہے۔ ادب کے نام پر سب کچھ برداشت کیا جا سکتا ہے ریاکاری برداشت نہیں کی جا سکتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ رامانند ساگر اور نند و گھوش کا رویّہ زیادہ صحت مندانہ اور زیادہ ترقی پسندانہ ہے۔ "فیروس لین" کے دیباچہ میں بھی نند و گھوش بڑی ایمانداری سے یہ اعلان کر دیتا ہے کہ اس نے صرف ہندوؤں پر مظالم ہوتے دیکھے ہیں۔ اس افسانے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگرچہ اس میں ہندوؤں کی مظلومی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور فسادات کو براہِ راست مسلم لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن کا نتیجہ بتایا گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جو مسلمان کردار آئے ہیں وہ زندہ اور جاندار کردار ہیں مصنّف کو اپنے ان کرداروں سے محبت اور اُنس ہے۔ کرشن چندر کی طرح وہ انہیں ذلیل کرنے پر آمادہ نہیں ہے بلکہ انہیں سر آنکھوں پر جگہ دیتا ہے۔ نند و گھوش پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کرتا ہے، اپنی قوم کی مظلومی پر آنسو بہاتا ہے لیکن وہ اپنے مسلمان کرداروں سے اچھا برتاؤ کرنا جانتا ہے۔ رامانند ساگر کا پورا ناول میرے پیش نظر نہیں ہے: "بھاگ اِن بردہ فروشوں سے"، میں ایک ہندو لڑکی کی داستان پیش کی گئی ہے جو مسلمان مفسدوں کو اپنی عزت و عصمت سپرد کر کے جب گھر واپس پہنچتی ہے تو وہاں بھی ٹھکرائی جاتی ہے۔ شاید پورے

ناول میں مصنف کا رویہ وہی ہے جو اس ٹکڑے میں نظر آتا ہے' جب ہی تو عصمت چغتائی نے ترقی پسندی کے جوش میں اس پر فرقہ پرستی کا فتویٰ عاید کر دیا ہے۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ اس زمانے میں ایک افسانہ نگار کا غیر فرقہ پرستانہ رویہ ہو سکتا ہے تو اس کی شکل وہی ہو گی جیسا مانند ساگر اور نندو گھوش کے یہاں ہے۔ رامانند ساگر نے اگر اپنی قوم کے دکھ درد کو شدت سے محسوس کیا ہے اور اس شدتِ احساس نے اسے دوسری قوم کے خلاف محسوس کرنے پر بھی آمادہ کر دیا ہے تو اس میں فرقہ پرستی کی کونسی بات ہوئی۔ اپنی قوم سے محبت کرنے والے ایک دیانتدار ادیب کا اس کے علاوہ رویہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ فرقہ پرستانہ رویہ تو کرشن چندر کا ہے۔ جو چیز فرقہ پرستی کو جنم دیتی ہے' وہ ریاکاری اور شر انگیزی ہے نہ کہ دیانتداری اور خلوص۔ (خلاصہ)

"ایشیا"

نئی ترقی پسند غزل اور نظم

غزل

(احمد ریاض)

سال گیا مستقبل آیا، کچھ بھی اپنے ساتھ نہ لایا
یہ بھی کھوکھلا یہ بھی ننگا یہ بھی بے بس یہ بھی حیراں

راہبر واسے راہنماؤ تم جیتے اور دنیا ہاری
گھر گھر میں جب آگ لگی تو تم نے منایا جشنِ چراغاں

جس کے ہوتے چند ہوس کاروں نے ہتیا لی ہے دنیا
اُس کو سمجھوں خالقِ آدم اُس کو مانوں میں یزداں؟

دل نے جیسے جنت کا جھلاوا دیکر اک دن بہکایا تھا
دوزخ کے شعلوں میں تنہا کر پھر جاگا وہ غافل انساں

دُوسرا رُخ

اور انتظارِ سحر میں آنکھیں بھی تھک چکی تھیں
سحر جو آئی لہو کی بوندوں سے چھم چھماتی
شکستہ جسموں، تڑپتی لاشوں، بلکتے غنچوں، سُلگتی راہوں پہ دندناتی
فسردہ آہوں کے گیت گاتی
کہ جیسے کوئی حیاتِ انساں کی قبر پر اک دیا جلانے کو آ رہا ہو!
میں کیسے کہہ دوں،
سحر کی آمد، طویل شب سے ہے یُوں بھی بہتر،
کہ اک اُجالا ہے، اِک اندھیرا
مگر اُجالے کو کیا کروں گا۔
یہ زندگانی کا خون پی کر چمک اُٹھا ہے
اور اس پہ بھی ہم سحر کے نغموں میں کھو گئے ہیں
بغیر سوچے، بغیر سمجھے الاپتے ہیں
کہ زخم خوردہ سحر حسیں ہے!!

بلراج کومل

(اس نظم میں آزادیٔ ہند کا "خیر مقدم" اُسی انداز سے کیا گیا ہے جس انداز سے کرنل فیض احمد فیضؔ کی نظم کے اس مشہور و معروف مطلع میں آزادیٔ پاکستان کا "خیر مقدم" کیا گیا تھا ؎
وہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
یہ انتظار تھا جس کا وہ یہ سحر تو نہیں)

"ماہِ نو"

مشرقی پاکستان اور اُردو

(محمد مختار زمن)

اتوار کی ایک خوشگوار صبح کو میں ہنوز اپنے بستر پڑا رہا تھا کہ

مجھے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ کان لگا کر سُنا تو معلوم ہوا کہ دو نوکروں میں لڑائی ہو رہی ہے۔ غلام مرتضیٰ ساکن نواکھالی کہہ رہا تھا "ہم جب تُوم کو بولا، تم چا کا پتی کیوں نئیں لایا ہے" چاٹ گام والے اسمٰعیل نے جواب دیا "تُوم کھُود کیوں نئیں لایا۔ جب کال (کل) باجار گیا تھا (گیا تھا) ہم تُمرا چاکور (نوکر) ہے یا تُماب کا جو تُوم ایسا ایسا بات بولتا"

مصطفےٰ نسبتہً بیفیئر سے تڑپ گیا "تُوم کام کھا راب (خراب) کرے گا تو ہم بولے گا نئیں حارام (حرام) کا پیسا دیتا تُوم کو جو تُوم رای رکوم (اس قسم کا) بات بولتا ہم شاب کو شوب (سب) بات بولے گا۔"

اسمٰعیل نے سفید جھنڈا دکھلایا "بھائی، تم مجاج کاہے دکھلاتا، ہم لے آئے گا چا کا پتی" وغیرہ وغیرہ۔

مَیں سوچ رہا تھا کہ سات آٹھ ماہ پیشتر جب غلام مرتضیٰ نواکھالی سے آیا تھا تو اُردو تو کجا، ہم جیسے اناڑیوں کی بنگلہ بھی مشکل سے سمجھتا ــــــ اور اب اپنے بنگالی ہم وطن سے بھی اُردو میں لڑتا ہے۔ مَیں نے اسے نہ اُردو سیکھنے پر مجبور کیا، نہ باقاعدہ سکھانے کی کوشش کی۔ ڈھاکے کے ماحول میں رہ کر وہ خود ہی سیکھ گیا اور چار پانچ ماہ بعد جب دوسرا نوکر اسمٰعیل وارد ہوا تو اکثر اس کے ساتھ "رزم و بزم" کی محفلیں اُردو میں گرم ہونے لگیں۔ اسمٰعیل اتفاق سے "صاحب ذوق" بھی واقع ہوا ہے اور اُردو کے فلمی گانے جنہیں وہ مرتضیٰ کو سُنایا کرتا ہے، اس "بزم" کی جان ہیں۔

مَیں قیامِ پاکستان سے چار دن پہلے گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کو ڈھاکے میں وارد ہوا۔ اُس وقت چوک کے دکاندار اور ڈھاکے کے لوکل باشندے اُردو بولتے تھے لیکن بقیہ اضلاع کے لوگ جو ڈھاکے میں مقیم تھے اور ہندوؤں کی کثیر تعداد، دفترِ کا عملہ اور یونیورسٹی کے طلبہ سب بنگلہ بولتے تھے۔ اور اب اِس شہر میں نا واقفوں کا فقدان نہیں تو قلیت ضرور ہے۔ ناواقفوں میں یا تو وہ طبقہ ہے جو تلاشِ معاش میں دوسرے اضلاع سے آتا رہتا ہے اور جسے اُردو سیکھنے میں چند ماہ لگتے ہیں یا شاید وہ عورتیں ہونگی جو پردے کی قیود کے باعث بیرونی فضا سے متأثر نہیں ہوسکیں۔

عام قاعدے کے مطابق ہونا یہ چاہیئے تھا کہ اپنی ضروریات کے باعث مشرقی بنگال آکر، نووارد بنگلہ سیکھتے۔ برخلاف اس کے یہاں کے مقامی باشندے خود ہی بڑی تیزی کے ساتھ اُردو سیکھ رہے ہیں۔ باہر سے آنے والے سرکاری ملازمتوں کی ضرورت سے مجبور ہو کر یا اپنے شوق کی بنا پر خال خال ہی بنگلہ بولتے نظر آتے ہیں لیکن کام چلانے کے قابل اور روزمرّہ گفتگو کے لئے اکثر خواندہ اور ناخواندہ بنگالی اُردو بولنے کی استعداد بہم کر چکے ہیں۔ یہ سب کچھ اُس فضا کے باوجود ہو رہا ہے جو چند خود غرض لوگوں نے قیامِ پاکستان کے بعد اُردو کے خلاف تیار کر دی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ مشرقی پاکستان سے اِس زبان کا جو آفتاب طلوع ہو رہا ہے وہ نصف النہار پر پہنچ کر اپنی ضیاباریوں سے پُورے صوبے کو منوّر کرے گا بلکہ اُس کی کرنیں مغرب تک پہنچیں گی۔ تعصب کے بادل جو اب تک اسے چھپائے ہوئے تھے اب چھٹتے جا رہے ہیں۔

اب تو ڈھاکے میں اُردو فلموں کو دیکھنے کے لئے بنگلہ فلموں سے زیادہ بھیڑ ہوتی ہے، ریڈیو کی اُردو خبروں کے وقت دکانوں اور چائے خانوں کے سامنے جہاں لاؤڈ اسپیکر لگے ہیں، لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع رہتے ہیں۔ گلیوں میں بچے "ایکلا چولو رے"

ڈینگو بنگیت ہے کے بجائے

"یہاں بدلہ بھیا کا بے بھائی کے سوا کیا ہے"

گنگناتے ہوئے ملتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں پاکستان کی قومی زبان اُردو کا "ڈھاکہ اسکول" جنم لے رہا ہے۔ سابق متحدہ ہندوستان میں اُردو ادب کے "دلی اور لکھنؤ اسکول" موجود تھے۔ اور حیدر آباد بھی اُردو کا بڑا مرکز تھا۔ اِن شہروں کی زبانوں میں عام طور پر محاورے اور طرزِ بیان سے امتیاز کیا جاتا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ڈھاکے نے، مشرقی بنگال کے صدر مقام اور ایک اہم حصۂ ملک کے مرکز کی حیثیت سے بہت اہمیت حاصل کر لی ہے اور یہ شہر اب مرجعِ خاص و عام ہے۔ ڈھاکے میں بیرونی، معاشی اور معاشرتی اثرات کے باعث اُردو کی عمومیت بڑھ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُردو کے کچھ ادیب یہاں آکر بسیں گے بلکہ متعدد نثر و نظم لکھنے والے یہاں پہنچ چکے ہیں اور یہ صوبہ شاید تھوڑی ہی مدت میں اُردو کے بنگالی ادیب بھی پیدا کریگا۔

آیندہ کے ادیبوں کے موضوعات پر تفصیل سے کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔ چھالیہ اور ناریل کے درختوں، دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں، چاندنی میں نہائی ہوئی فضا میں ماہی گیروں کے "بھٹیالی" گیتوں، سانولی سلونی، آہو چشم، دراز زلف کنواریوں کے علاوہ بھی انہیں لکھنے کے لئے بہت سے سیاسی اور سماجی موضوع ملیں گے۔ مگر قیاس کہتا ہے کہ اُردو کے اِس نئے اسکول پر بنگلہ کے علاوہ "ڈھاکے کی اُردو" کا اثر خاص طور پر پڑے گا۔

شاید بہت سے لوگ اس سے واقف نہ ہونگے کہ "ڈھاکے کی اُردو" بجائے خود، ایک اہم مقامی بولی کی حیثیت رکھتی ہے، ایک حد تک یہ بولی، اس اُردو سے مختلف ہے جو دوسرے اضلاع کے بنگالی بولتے ہیں۔ ڈھاکہ کی اُردو یہاں کے بہت سے لوکل باشندوں کی مادری زبان ہے، گو یہ لوگ بنگلہ سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن اپنے گھروں میں ڈھاکے کی اُردو بولتے ہیں، عام طور پر رکشا والے، گاڑی والے، مزدور پیشہ لوگ (جو کٹی کہلاتے ہیں) اِس زبان کو بولتے ہوئے ملیں گے۔ شہر کے بعض پرانے مسلمان خاندان بھی "ش" "ق" کی درستی کے ساتھ یہی اُردو استعمال کرتے ہیں۔ اس کے محاورے، طرزِ ادا اور لہجہ یو۔پی، بہار، پنجاب سب سے علیحدہ ہے۔

اگر آپ کسی بنگالی سے پوچھیں "تم یہ کام کر سکو گے؟" تو وہ جواب دیگا "ہم تو کرنے نہیں سکتا"۔ لیکن "ڈھکیا" کہے گا "ہم تو سکیں گے نہیں"۔ ــــ کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:-

بنگالی اُردو	ڈھکیا اُردو
ہم دوسری طرف چلا جانا مانگتا یا جائیگا	ہم دوسری طرف چلے جائیں گے بیلا
تم آج اسلام پورہ جانا مانگتا	آج تمہارا اسلام پورہ جانیکا ہے
او یار، تم ابھی ابھی سوتا ہے؟	او میاں، تم ابھی تک سوتے ہے؟
ہم جائے گا	ہیں جائیں گے

محاوروں کی بھی متعدد مثالیں ہیں۔ مثلاً تصویر اٹھانا یعنی تصویر کھینچنا، گاڑی میں اٹھنا یعنی سوار ہونا، کاگج میں کھبر اٹھانا یعنی اخبار میں خبر چھپوانا۔ "ہی" کا استعمال اکثر مواقع پر عام ہے، مثلاً یہاں پر، یاں پری اور چاقو سے کم ڈرتے ہیں، چکڑے سے کبھی ڈرتے۔

اُردو کے مشہور ادیب ڈاکٹر عندلیب شادانی، کوئی بیس اکیس برس سے ڈھاکے میں مقیم ہیں، اُنھوں نے تو شعر و نثر میں اِس زبان کو استعمال کر کے بھی دکھلایا ہے۔ نمونے

مدیر

ملاحظہ ہوں :-

یہ سوچتے ہیں کہ اُن سے بگڑ لیں، مگر یہ ڈر ہے سکیں گے کیونکہ

تمام ہی عمر ٹوں تو بندہ وفا کئے ہیں، وفا کرینگے

جو عرضِ احوال پر وہ بگڑا تو مَیں بھی فوراً کہے کہ صاحب

یہی ہے اپنا بھی فیصلہ اب خطا کئے ہیں خطا کریں گے

حضور کا ہو اگر اجازت ٹیک کے آئیں، مَیں آپکے گھر

کہ بارہا ایسے کام بندہ کیا کئے ہیں کیا کریں گے

نثر کا ایک ٹکڑا ہے جس کا عنوان ہے "مَیں ڈھاکا سے بول رہے ہیں۔"

"حضور کہنے سکتے، آپ کوئی علمائے دین ہے یا کوئی اُونی بھارسٹی کا فرد فلیسر ہیں یا مشرقی بنگال کا ہیلتھ منسٹر یا ریڈیو کا آرٹسٹ ہیں جو ڈھاکہ سے بولنے مانگتے۔ آخر کیوں بولتے مانگتے ؟ آپ کو کیا دورکار ؟ (درکار)"

مَیں عرض کریں گے۔ بندہ کو کچھ بھی نہیں۔ مَیں پبلک کا ایک خادم ہیں۔ یہی واسطے دو ٹھو بات حضور کو بولیں گے......

بنگال میں مذہبی رہنماؤں اور مولویوں کا بڑا اثر ہے۔ عموماً یہ لوگ شمالی ہند کی مذہبی درسگاہوں کے تعلیم یافتہ اور عربی و اُردو سے واقف ہیں۔ عوام کی زبان پر اُن کی عالمانہ اُردو بھی ضرور اپنا اثر چھوڑے گی۔ یہ تو اب بھی ایک امرِ واقع ہے کہ مشرقی بنگال میں میلاد خوانی اُردو میں ہوتی ہے اور چاٹگام و نواکھالی کی بنگلہ میں عربی و فارسی کی بہت سی اصطلاحیں شامل ہو گئی ہیں۔ اُردو کے فعل، متعلقاتِ فعل اور ضمیریں سیکھ لینے کے بعد جب عربی میں رچی ہوئی اور متعلق تراکیب سے بھری ہوئی اُردو بولنے والے نواکھالی کے ادیب اُردو میں لکھنے کی کوشش کریں گے تو ضرور اُن کا بھی کچھ نہ کچھ اثر اس زبان پر پڑے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بنگلہ پر عربی و اُردو کا پڑا ہے اور ان رنگوں کے امتزاج سے جو رنگ پیدا ہوگا، وہی اس نئے اسکول کی اُردو کا رنگ ہوگا۔

اگر ہارڈی سسکس سے متأثر تھا، اگر ڈکنز کے گاڑی والے لندن کے نچلے طبقے کی زبان بولتے ہیں۔ اگر رابرٹ برنز کی شاعری بھی انگریزی ادب میں داخل ہے، تو پنجاب، بنگال، سندھ، سرحد، بلوچستان سبھی جگہوں کے عوام کے تأثرات، اُنکی روزمرہ کی زبانیں، ان کے لوک گیت، ان کے عقیدے اور روایتیں اُنکی زندگی کی کشمکش اور عشق و محبت کی داستانیں، پاکستان کی قومی زبان کے لئے مواد فراہم کرنے اور اُسے سنوارنے اور نکھارنے میں مِل جُل کر مدد کریں گی۔ اسی ادب میں، جو مشترکہ کوششوں کی پیداوار ہوگا، پاکستانی قوم کے دل کی دھڑکنیں سُنی جا سکیں گی۔

"رُوحِ ادب"

چناروں کی چھاؤں میں

(اختر شیرانی)

کشمیر کی حسین بہاروں کی چھاؤں میں
شمشاد و سرو و گُل کی قطاروں کی چھاؤں میں
شاخ و شجر کے زمزمہ زاروں کی چھاؤں میں
بدلی سے جھانکتے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں
آ، مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

اُمیدِ وصل، ایک فریبِ خیال ہے
یہ دل نشیں خلش، خلشِ بے مآل ہے
اِس زندگی میں ساتھ رہیں ہم محال ہے
سفاک، کینہ ساز ستاروں کی چھاؤں میں
آ، مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

چھایا ہوا ہے ابر، ہوا خوشگوار ہے
موسم ہے، بیخودی ہے، چمن ہے، بہار ہے
اِک آخری خوشی کا فقط انتظار ہے
سرو و گل و سمن کے نظاروں کی چھاؤں میں

آ، مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

کہتے ہیں پُر سکوں ہے بہت محفلِ عدم
آزادیٔ کشاکشِ غم حاصلِ عدم
آ چل پڑیں جہاں سے سوئے منزلِ عدم
اِس کہکشاں کے راہگزاروں کی چھاؤں میں

آ، مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

آ جا کہ بعدِ مرگ تو آرام مل سکے
تسکین دردِ خاطرِ ناکام مل سکے
درمانِ جورِ گردشِ ایام مل سکے
اِس دس بھرے اُفق کے کناروں کی چھاؤں میں

آ، مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

اِس خاکداں سے دُور ہے اِک خاکداں نیا
دُنیا نئی، زمین نئی، آسماں نیا
چھوڑ اِس جہاں کو چل کے بسائیں جہاں نیا
پرویں و مشتری کے دیاروں کی چھاؤں میں

آ، مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

زہرابۂ فراق کا پینا نہیں قبول
تیرے بغیر بادہ و مینا نہیں قبول
دُوری کے صدمے جھیل کے جینا نہیں قبول
مرنا قبول ہم کو بہاروں کی چھاؤں میں

آ، مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

بحوالہ "چٹان"

ہمایوں

قائدِ اعظم سے ایک مُلاقات

(عزیز احمد)

"مرحوم ہر چند ہیرے کی طرح سخت تھے مگر اُن میں ہیرے جیسی چمک بھی تھی۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو مشہور انگریزی اخبار "سٹیٹسمین" نے حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح کی وفات پر لکھے۔ قائدِ اعظم کے بارے میں یہ رائے اگر تمام کی نہیں، تو کم از کم اُن انگریزوں کی ضرور تھی جو ہندوستان میں حکومت کی باگیں سنبھالے ہوئے تھے۔ اِس رائے میں قائدِ اعظم کی تعریف ہے مگر یہ عیب نمائی بھی بالکل واضح ہے کہ وہ مزاج کے سخت تھے۔ انگریز بڑے سیانے اور کائیاں ہوتے ہیں مگر قائدِ اعظم کے بارے میں، اُنہوں نے یہ رائے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر قائم کر لی تھی۔ قائدِ اعظم کے مزاج کی دُرشتی کے بارے میں اِس قدر پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ غیر تو غیر اپنے بھی اُنہیں سخت مزاج سمجھنے لگے۔

ایک زمانہ تھا جب بقول مہاتما گاندھی ملک میں بچے بچے کی زبان پر قائدِ اعظم کا نام رہتا تھا۔ اُن دنوں ہر مذہب و ملت کے نوجوان اُس کی تقلید کو ترقی اور کامیابی کے زینے کی پہلی سیڑھی خیال کیا کرتے تھے۔ نوجوانوں میں قائدِ اعظم کی مقبولیت کا اندازہ اِس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُن دنوں کھدر پوشی کا دور دورہ تھا اور اخبارات کے صفحات میں، اور جلسوں کی تقاریر میں سودیشی کی وکالت میں مسلسل آوازیں بلند ہو رہی تھیں لیکن جو نوجوان میدانِ سیاست میں اُترتا تھا وہ مسٹر جناح ہی کے لباس اور اندازِ تقریر کی پیروی کرتا نظر آتا تھا۔ وہ اپنے زیبانہ لباس، دراز قد، باوقار چہرے اور خوشنما

ماتحتوں کی وجہ سے سب کے مرکزِ توجہ بنے ہوئے تھے۔ سُنا ہے ایک عرصہ تک بمبئی کی عدالتوں میں یہ حالت رہی کہ جو نیا وکیل پریکٹس شروع کرتا تھا وہ مسٹر جناح کی اِتنی زیادہ تقلید کرتا تھا کہ اُنکا نقال معلوم ہونے لگتا تھا۔ مگر پھر ایک دَور ایسا آیا کہ اُنھوں نے مسلمانوں کی آزادی کے لئے قافلۂ ملت کی سالاری کا بار اپنے شانوں پر لے لیا اور قوم نے اُنہیں اپنا قائدِ اعظم تسلیم کر لیا تو بڑے زور شور سے اُن کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا کہ فرقہ وارانہ مفاہمت نہ ہو سکنے کے کا اصلی سبب مسٹر جناح کے مزاج کی سختی اور اُن کا غرور ہے۔ یہ پروپیگنڈا اِس قدر مسلسل اور متواتر ہوا کہ تھوڑا بہت سبھی اِس سے متاثر ہوئے۔ خود میرا ایک عرصے تک یہی خیال رہا کہ ہمارے لیڈر کی طبیعت میں غرور کا مادہ ہے۔ مگر یہ بات غلط تھی۔ اِس کے ثبوت میں مَیں ذیل کا واقعہ بیان کرتا ہوں جو میرے ساتھ گزرا۔

ستمبر ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے، مَیں اپنے ایک عزیز کے ساتھ بمبئی گیا ایک روز صبح کے وقت ہم مالابار ہِل کے مُعلق باغ (HANGING-GARDEN) کی سیر کر کے لَوٹ رہے تھے۔ راستے میں قائدِ اعظم کی کوٹھی نظر پڑی۔ دروازے پر باوردی دربان کھڑا تھا۔ ہم نے اُس سے دریافت کیا کہ کوئی شخص قائدِ اعظم سے ملنا چاہے تو اُس کا کیا طریقہ ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ اندر جا کر سکرٹری صاحب سے دریافت کر لیجیے۔ ہم اندر داخل ہوئے، کوٹھی کی فضا پر ایک گہرا سکوت چھایا معلوم ہوتا تھا، جیسے ہر شے ایک عظیم شخصیت کے حضور میں اعترافِ عجز سے دم بخود ہے۔ سامنے کے کمرے میں سکرٹری صاحب ایک خوشنما میز کے آگے کرسی پر بیٹھے کسی کام میں مصروف تھے۔ ہمارے سلام کرنے پر اُٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کا جواب دے کر پوچھنے لگے "کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" مَیں نے جواب دیا "ہم پنجاب سے آئے ہیں۔ بمبئی کی سیر کرنے کی غرض سے۔ اور قائدِ اعظم سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔"

وہ پوچھنے لگے "ملاقات کی غرض کیا ہے؟" میں نے کہا "کوئی خاص کام نہیں ہے۔ بس دیدار اور مصافحہ۔" فرمانے لگے "اِس وقت تو غالباً قائدِ اعظم آرام فرما رہے ہیں۔ آپ اپنا پتا چھوڑ جائیے، ملاقات کا وقت مقرر کر کے آپ کو اطلاع بھیج دی جائے گی۔" میں نے ہنس کر کہا "صاحب! ہم ٹھہرے سیلانی آدمی۔ بہتے دریا اور رمتے جوگی کو کران و مکان سے کیا واسطہ، اگر اِس وقت ملاقات کا موقع مل جائے تو فبہا، ورنہ آپ تکلیف نہ کیجیے۔" سکرٹری صاحب بولے "بہت بہتر، میں ابھی اُن سے ملاقات کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا "اگر موصوف آرام کر رہے ہوں تو ہم اُن کے آرام میں خلل انداز ہونا پسند نہیں کریں گے۔" مگر سکرٹری صاحب نے ہم کو اصرار سے روکا اور خود متصل کمرے میں تشریف لے گئے، تھوڑی دیر بعد واپس آ کے اور بتایا کہ قائدِ اعظم اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

ہم پنجابی وضع کا معمولی لباس پہنے ہوئے تھے اور ہمارے جوتوں پر راستے کی گرد بھی جمی ہوئی تھی، اِس لئے ظاہر ہے کہ ہماری ہیئت کذائی کچھ زیادہ متاثر کُن نہیں تھی۔ لیکن جونہی ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے، دَورِ حاضر کا سب سے بڑا مدبّر اور سیاستدان، جس نے اپنے عزم و استقلال، تدبّر و ذہانت، تحریر و تقریر، علم و فضل اور جدوجہد سے ایک عظیم النظیر انقلاب برپا کر دیا، جس نے سوئی ہوئی قوم کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا اور زندہ رہنے کی اُمنگ بخشی، وہ بطلِ حریت جس نے سیاست کی بساط پر دشمنوں کو بار بار مات دے کر ایک ایسی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھ دی، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھی شان رکھتی ہے، وہ ہم دو غیر معروف مسلمانوں کی تعظیم کے لئے سروقد کھڑا ہو گیا اور سلام مسنون کا جواب دیتے ہوئے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔

اُن دنوں پنجاب میں سکندری راج تھا۔ قائدِ اعظم سر سکندر کی روش سے مطمئن نہ تھے۔ پنجاب کی سیاسیات پر گفتگو چھڑ گئی تو اُنہوں نے سر سکندر کی روش کی مذمت کی اَور اپنے دعوے کی تائید میں اخبارات کے تراشوں کا فائل نکال کر اُس میں سے حوالے دینے شروع کر دیئے۔ وہ اپنی آنکھ پر مانوکل لگا کر اخبار کے تراشے میں سے کہیں کچھ عبارت پڑھ کر سُناتے اَور پھر ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم کو اِس طرح سمجھانے کی کوشش کرتے گویا ایک وکیل جج کو اپنا مقدمہ سمجھا رہا ہے۔ دورانِ گفتگو میں اُنہوں نے اِس بات پر زور دیا کہ قوم کی زندگی اَور ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک بلحاظ مرتبہ و حیثیت خود کو قوم کے مفاد کا نگہبان و محافظ سمجھے اَور اگر کسی کو کسی ایسی حرکت کا مرتکب پائے جس سے قوم یا ملک کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اپنے آرام اَور سہولت کو نظر انداز کر کے مرتکب کی گردن پکڑ لے۔

اِس ضمن میں اُنہوں نے اپنا ایک واقعہ بھی بیان کیا۔ فرمایا، مدتوں پہلے کی بات ہے، مَیں ایک دفعہ سفر کر رہا تھا۔ اُن دنوں بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے۔ مَیں نے درجہ اوّل کا ٹکٹ خریدا مگر وہ سہواً ملازم کے پاس رہ گیا۔ جب میں منزلِ مقصود پر گاڑی سے اُترا اَور مجھے ٹکٹ نوکر کے پاس چھوڑ آنے کا احساس ہوا تو میں ٹکٹ کلکٹر کے پاس پہنچا اَور اُس سے کہا کہ مَیں اِس اِس طرح ٹکٹ بھول گیا ہوں۔ تم مجھ سے کرایہ وصول کر لو۔ میں خریدے ہوئے ٹکٹ کے داموں کی واپسی کا مطالبہ کر لوں گا۔ ٹکٹ کلکٹر نے کہا۔ "تم مجھے دو روپے دے دو تو جا سکتے ہو۔" اُس کا یہ کہنا تھا کہ میں وہیں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اَور مَیں نے کہا: "تم نے میری ہتک کی ہے، اپنا نام اَور پتا بتلاؤ۔" لوگ جمع ہو گئے، اُن میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کئی ایک آدمیوں نے مجھ پر فقرے بھی چُست کئے۔ مگر مَیں وہاں سے نہ ٹلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسافروں کو لُوٹنے والا بابُو برخاست ہو گیا۔

قائدِ اعظمؒ ہم سے نہایت بے تکلّفی سے باتیں کرتے رہے، حالانکہ انہیں خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم نہ تو لیڈر ہیں، نہ کچھ نمایاں آدمی ہیں اَور نہ ہماری ملک میں کوئی آواز ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے سامنے نہایت متانت، سنجیدگی اَور انہماک سے اپنا نقطۂ نظر واضح کر رہے تھے۔ پہلے یہ خیال تھا کہ قائدِ اعظم چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد خود ہی ہم کو چلتا کر دینگے۔ لیکن جب کافی وقت ہو گیا اَور اُنہوں نے اِس قسم کی کوئی بات اشارۃً بھی نہ کی تو میں نے اپنی طرف سے پہل کی اَور یہ کہہ کر کہ ہم آپ کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں، ہم دونوں رخصت ہوئے مگر حیران تھے کہ کیا سُنا تھا اَور کیا نکلا۔

اِس کے بعد جب کبھی میں نے قائدِ اعظم کے بارے میں کسی کی ایسی رائے پڑھی یا سُنی کہ وہ مغرور یا بدمزاج انسان ہیں تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ یہ ممکن ہے کہ مغرور اَور سرکش قسم کے لوگوں سے اُن کا برتاؤ ایسا ہی ہوتا ہو لیکن غریبوں اَور عام لوگوں سے وہ جھک کر ہی ملتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے سانحۂ ارتحال کی خبر سُن کر کروڑوں آنکھوں سے آنسو برسے، اِس احساس کے زیرِ اثر کہ غریبوں کا ایک حقیقی ہمدرد دُنیا سے اُٹھ گیا۔

غزل

(حامد علی خاں)

نہ پروا کر جو تجھ سے مصرعِ موزوں نہ پیدا ہو
مگر اے زندہ فکر! اک مرگ کا مضموں نہ پیدا ہو

اگر ہے عشقِ صادق شرطِ اوّل کامیابی کی
تو پھر مغز و صد دانا سے اِک مجنوں نہ پیدا ہو

نہیں سوزِ نہ وہ بنتا شعلہ جو اثر مستی
اگر سوزِ محبت اُس سے پیدا موں تو پیدا ہو
محال اُس وقت تک ہی آبیاری کشتِ ملت کی
جگر کے خوں سے جب تک آنکھ سے جیحوں نہ پیدا ہو
کسی کی اب مسیحائی مسلم ہی نہیں جب تک
یہ دُنیا مٹ کے اِک دُنیائے دیگر گوں نہ پیدا ہو
جہاں مفلس ہو اب ایسے گوہر گم گشتہ پھر جب تک
جہاں میں کوئی تجھ سا گوہرِ مکنوں نہ پیدا ہو

"معارف"

ہندوستان اور مسلمان

(شاہ معین الدین احمد ندوی)

جمعیتہ العلماء کے دستور العمل میں ایک بنیادی تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ آئندہ اس کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور اس کا دائرۂ عمل مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی اور تمدنی کاموں تک محدود رہے گا۔ لیکن اس کے لئے پوری تنظیم کے ساتھ عملی جد وجہد کی ضرورت ہے۔ اسلام میں مذہب کا اور ہندوستان میں سیاست کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بہت سے مذہبی اور تمدنی کاموں کی سرحد بھی سیاست سے مل جاتی ہے اور کانگریس کا ایک طبقہ جماعتی کلچر کے تصور کو بھی فرقہ وارانہ اور متحدہ قومیت کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس لئے جمعیتہ نے جن مصالح کی بنا پر سیاست سے علیحدگی اختیار کی ہے، وہی خطرات تمدنی کاموں میں بھی درپیش ہیں۔ اس کا تازہ ثبوت ہمارے صوبہ کے وزیر اعظم کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے جمعیتہ کے اسی اجلاس میں فرمائی ہے۔ اس کا وہ حصہ جو مختلف فرقوں کے حقوق میں مساوات، اُن کے تحفظ اور ہندو مسلم اتحاد کے متعلق ہے بہت مناسب ہے۔ لیکن زبان اور کلچر کے متعلق اُن کے خیالات نہایت متضاد اور کانگریس کے اُصولوں کے سراسر خلاف ہیں۔ یہ تقریر خاصی طویل ہے۔ اس کے جستہ جستہ فقرے یہ ہیں:۔

"مختلف صوبوں کے ہندو مسلمانوں کا کلچر ایک ہے، اس ملک کے باشندوں کو ایک ہی کلچر اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے، اور ان کا طرزِ زندگی ایک ہے، مسلمان ہندوستان کی تہذیب کو اپنی تہذیب سمجھیں کیونکہ اس کی بنیاد قدیم آریائی تہذیب پر نہیں ہے بلکہ اس میں مغلوں اور دوسرے مسلمانوں کے بھی گہرے اثرات ہیں۔ اس لئے مسلمان مختلف کلچر کا خیال نہ کریں۔ اس سے قومی وحدت کی تعمیر میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ مختلف صوبوں کی زبانوں اور کلچر میں اختلافات ہیں لیکن ان کی بنیاد مذہب پر نہیں ہے، اگر مسلمان اپنی امتیازی باتوں پر زور دیں گے تو اس سے اُلجھنیں پیدا ہوں گی، ہم کو گاندھی جی کے اُصولوں کو یاد رکھنا چاہئے اور آپس میں محبت بڑھانی چاہئے۔ کسی زبان کو کسی مذہبی گروہ سے وابستہ کرنا غلط ہے۔ ہندی اور اردو کی تعمیر و ترقی میں ہندو مسلمان دونوں نے حصہ لیا ہے، اور ہندی میں اُردو بھی داخل ہے اور فارسی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ اور ہندوستان کی سب چھوٹی چھوٹی زبانیں اس میں داخل ہیں لیکن نئے الفاظ سنسکرت سے لئے جائیں گے عربی سے نہیں۔ رسم الخط دیوناگری ہوگا کیونکہ وہ بہت آسان سائنٹفک اور صوبہ میں رائج ہے۔ (الجمعیتہ ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ء)

درحقیقت سارے ہندوستان کا کلچر کبھی ایک نہیں رہا اور اب ہے، جیسا کہ خود تقریر میں بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ مختلف صوبوں کی زبانوں اور کلچر میں اختلافات ہیں، اگر وہ مقرر کے نزدیک

مذہبی بنیاد پر نہ سہی۔ جنوبی ہند کی زبانیں اور وہاں کے ہندوؤں کا کلچر شمالی ہند کے ہندوؤں سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا یہاں کے مسلمانوں سے، حتیٰ کہ ایک دوسرے کی زبان تک نہیں سمجھ سکتے خود ایک صوبہ کے ہندوؤں کے مختلف طبقوں کے کلچر میں بڑا فرق ہے، اس لئے پورے ہندوستان کو ایک کلچر اور ایک تہذیب کا وارث کہنا صحیح نہیں ہے۔

خالص مذہب سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی کلچر کا وہ حصہ جو مخصوص مذہبی تصورات، ملی روایات، نیم مذہبی، معاشرتی رسم و رواج سے متعلق ہے، نہ صرف مسلمانوں کا ہندوؤں سے بلکہ خود ہندوؤں کے مختلف فرقوں اور طبقوں کا بڑی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے، اور بودھ، سناتن دھرم، آریہ سماج، جینی، برہمن، چھتری، ویش اور شودر وغیرہ کے کلچر میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہے، کلچر کا یہی وہ حصہ ہے جس کے تحفظ کا کانگریس نے وعدہ کیا ہے ورنہ اگر ہندوستان کے تمام فرقوں کا کلچر بالکل ایک ہوتا تو پھر اس کے تحفظ کے کوئی معنی نہیں اور کلچر کے اس حصہ کو نہ صرف مسلمان بلکہ ہندوستان کا کوئی فرقہ بھی نہیں چھوڑ سکتا۔

لیکن اس امتیازی پہلو کے باوجود عام معاشرت میں ہر صوبہ کے ہندو مسلمانوں کا کلچر تقریباً ایک ہے اور آج بھی شہر کے تعلیم یافتہ طبقہ کی تہذیب و معاشرت میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اسی طریقہ سے دیہات کے باشندوں کے رہن سہن میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، یہی وہ کلچر ہے جس کی بنیاد خالص آرین تہذیب پر نہیں ہے بلکہ اس میں مسلمانوں کے بھی گہرے اثرات ہیں، مسلمان اسی مشترکہ کلچر کو چاہتے ہیں، اس کے علاوہ اور کسی امتیازی بات پر زور نہیں دیتے، اسی کلچر نے صدیوں تک ہندو مسلمانوں کو شیر و شکر رکھا، اس لئے متحدہ قومیت کے دشمن درحقیقت وہ لوگ ہیں جو اس مشترک کلچر کو مٹا کر ایک نئے کلچر کو جنم دینا چاہتے ہیں، مسلمانوں کا تو قریب قریب سارا کلچر ہندوانہ رنگ میں رنگا ہوا ہے، حتیٰ کہ ان کے مذہبی رسوم بھی اس سے خالی نہیں ہیں، ان کے کس شعبۂ زندگی میں خالص عربی کلچر رہ گیا ہے جس سے دوئی کی بو آتی ہے، بہتر ہوتا کہ اس خیالی کلچر کی تفصیل بتا دی جاتی، کہ مسلمانوں کو اس کا علم تو ہو جاتا، ساتھ ہی ہندوؤں کو بھی اس کی دعوت دی جاتی کہ ان میں بھی اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

یہ دعوےٰ بالکل نیا ہے کہ ہندی میں ہندوستان کی تمام چھوٹی چھوٹی زبانیں شامل ہیں، اور اردو اور فارسی الفاظ بھی اس میں داخل ہیں۔ اردو کا سوال تو بعد میں آتا ہے، پہلے ڈراویڈین اور پنجابی اور بنگالی زبانوں کو تو ہندی میں شامل کر لیا جائے، جو اس سے حریفانہ ٹکر لے رہی ہیں، لیکن اگر اس دعویٰ کو اس حیثیت سے صحیح بھی مان لیا جائے کہ اردو بھی ہندوستان ہی کی پیدا شدہ اور یہیں کی زبانوں سے نکلی ہے اور مقرر کو یہ خود تسلیم ہے کہ ہندی اور اردو کی تعمیر و ترقی میں ہندو مسلمان دونوں کا حصہ ہے تو پھر اردو کے ساتھ اجنبی زبان کا برتاؤ کیوں ہے، اس کو بھی کم سے کم ان صوبوں میں جہاں وہ صدیوں سے رائج ہے ہندی کے برابر درجہ دیا جائے، اور اس کے ان الفاظ کو جو زبان کا جزو ہو گئے ہیں۔ اور جنہیں ہر شخص سمجھتا ہے نکال کر اس کی جگہ سنسکرت کے مشکل اور نامانوس الفاظ نہ ٹھونسے جائیں، اور اردو کو کم سے کم ہندوستانی رہنے دیا جائے۔ سنسکرت نہ بنایا جائے، یہ تو بقول گووند سہائے پارلیمنٹری سکریٹری وہی پرانی برہمنی ذہنیت ہے کہ زبان بھی ایک خاص طبقہ کی ملک بن جائے، اور اس کا سمجھنا عوام کی دسترس سے باہر ہو۔

دیوناگری رسم الخط کو سائنٹیفک اور صوبہ میں رائج کہنا صحیح

نہیں ہے، دیوناگری کی ایک سہولت کے مقابلہ میں اُردو رسم الخط کو یہ ترجیحیں حاصل ہیں کہ وہ دیوناگری کے مقابلہ میں صوتی اور تحریری لحاظ سے زیادہ مکمل ہے، بہت زُود نویس ہے اور بہت کم جگہ لیتا ہے، رائج ہونے نہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ بہت کم تعلیم یافتہ ہندو مسلمان ایسے نکلیں گے جو اُردو میں نہ لکھ سکتے ہوں، اگر کچھ لوگ اُردو نہ لکھ سکتے ہوں صرف ہندی لکھ سکتے ہوں تو بہتیرے اُردو لکھ سکتے ہیں اور ہندی نہیں لکھ سکتے، پھر حکومت کی پالیسی میں کسی معمولی سہولت یا دشواری کا کیا سوال۔ کیا وہ کسی معمولی دشواری سے بچنے کے لئے کسی انتظامی معاملہ کو چھوڑ دیتی ہے، آخر آجتک ہندو مسلمان دونوں کس طرح اس رسم الخط کو سیکھتے آئے، اور اب یہ دشواری ناقابلِ حل کیوں ہوگئی۔ کسی زبان کو رسم الخط سے محروم کرنا جسم کو جان سے الگ کرنا ہے، متحدہ قومیت کی تعمیر کا یہ طریقہ نہیں ہے، اس کی تعمیر انہی وسائل سے ہوسکتی ہے جنھوں نے صدیوں تک ہندو مسلمانوں کو متحد رکھا اور وہ اسی پُرانے مشترک کلچر یا عام فہم ہندوستانی زبان کا رشتہ ہے، گاندھی جی کے اصولوں کی تلقین کرنے والوں کو ہر چیز میں اُن کے اصول پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، اِسی میں ہندوستان کی فلاح ہے۔

"فردوس"

نشاطِ گرداب

(ساغر نظامی)

کشتی کو بھنور میں گھرنے دے موجوں کے تھپیڑے سہنے دے
زندوں میں اگر جینا ہے تجھے طوفان کی ہلچل رہنے دے
دھارے کے موافق بہنا کیا توہینِ دست و بازو ہے
پروردۂ طوفاں کشتی کو دھارے کے مخالف بہنے دے
اے جوشِ تمنا ڈال بھی دے امروز کی گردن میں باہیں
جو محوِ غمِ فردا ہیں انہیں، محوِ غمِ فردا رہنے دے
مچھلی کی طرح تڑپائے گا احساس تجھے پایابی کا
جینا ہے تو اپنے دریا میں امکانِ تلاطم رہنے دے
کچھ اور حسیں ہو جاتے ہیں اس رُوپ میں شعلے ذوقِ نظر
اُس پیازی پیازی مکھڑے پر اشکوں کے تارے بہنے دے
وہ دیکھ اُفق کے ساقی نے خورشید کا ساغر چھلکایا
یہ رات کے ساغر ٹکڑے کر یہ بادۂ دوشیں بہنے دے

"تبرکاتِ مخزن"

(منقول از مخزن جولائی ۱۹۰۷ء)

تصویرِ یار

تری تصویر کو ہم دیکھ لیا کرتے ہیں
یونہی تسکینِ دلِ زار کیا کرتے ہیں
کام یہ صبح کو اُٹھتے ہی کیا کرتے ہیں
ہم دُعائیں تجھے لاکھوں ہی دیا کرتے ہیں
آہ آغوشِ حقیقی تو کہاں اپنا نصیب
ہاں تصوّر میں تجھے کھینچ لیا کرتے ہیں
دیکھتے دیکھتے پیار آتا ہی، تو آنکھوں سے
ہم بلائیں ترے مُکھڑے کی لیا کرتے ہیں
کبھی کُڑھنا، کبھی رونا، کبھی آہیں بھرنا
کوئی جینا ہے یہ؟ کیا خاک جیا کرتے ہیں

(گمنام)

تبصرہ

نقوشِ شرافت:- شریف رانا صاحب لاہور کے ایک مشّاق اور چابک دست نوجوان مصوّر ہیں جو مدّت سے بڑی خاموشی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ حال میں اُنہوں نے ایک مفید ملّی خدمت انجام دی ہے یعنی "نقوشِ شرافت" کے نام سے ۹ "نقوش" کا ایک ایسا دلآویز سیٹ تیار کیا ہے جو بچوں اور نوجوانوں میں احیائے ملّت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے بہت سود مند ثابت ہوگا۔ ہر نقش قرآن مجید کی کسی آیت، تاریخ اسلام کے کسی واقعے یا علامہ اقبال (وغیرہ) کے کسی شعر کو مصوّر کرتا ہے۔ یہ تصاویر شریف صاحب کے نفیس مصوّرانہ کارناموں کے کیبنٹ سائز "خوبصورت" فوٹو پرنٹ ہیں۔ ہر نقش "فل سائز ماؤنٹ" سے مزیّن ہے جس پر بلاک کے دلکش حروف میں تصویر کی تشریح بھی درج ہے۔ تصویروں کے عنوان حسب ذیل ہیں:-

(۱) **آنے والے کی آمد:-** ہادیٔ برحق کی تشریف آوری

(۲) **جاء الحق:-** نزولِ قرآن مجید

(۳) **میراثِ مومن:-** مومناں را تیغ با قرآں بس است (اقبال)

(۴) **تعمیرِ ملّت:-** قومیں کس طرح بنتی ہیں؟

(۵) **شیطانی کارنامے:-** ہوسِ سرمایہ داری کا نتیجہ

(۶) **تقدیرِ اُمم:-** زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں (اقبال)

(۷) **تخریبِ ملّت:-**

ذرّہ بندی کی ہوا تیرے گلستاں میں چلی
ہائے ان مالیوں نے باغ اُجاڑا اپنا

(۸) **اِزماست کہ بر ماست:-**

"اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اگر تُو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم یقیناً خسارے میں رہیں گے"۔

(۹) **اسرارِ شہادت:-**

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیل

علامہ اقبالؒ کا مشہور شعر ہے ؎

ہند کے شاعر و صُورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

شریف صاحب نے اِس شعر سے بہت سبق حاصل کیا ہے، چنانچہ اُن کا یہ مرقع نہ صرف تشبیہِ انسانی سے بالکل پاک ہے۔ بلکہ ایک بلند مقصد کا حامل بھی ہے۔ ہماری رائے میں ان تصاویر پر مولوی صاحبان کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا مگر اس کے باوجود یہ بے حد دلکش ہیں اور اِس لحاظ سے گھروں اور بالخصوص مدرسوں، کالجوں اور کتب خانوں کی آرائش کے لئے لاجواب ہیں۔

مکمل سیٹ کی قیمت (علاوہ محصول) دس روپے مقرر ہے۔ **پاک آرٹ پبلشرز ۲۶ ریلوے روڈ لاہور سے طلب فرمایئے۔**

مدیر
(... اکرم ... رسالہ "مخزن" مال روڈ لاہور سے شائع کیا)

جلد ۲ نمبر ۳

مخزن

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور ستمبر ۱۹۴۹ء

سلسلۂ مطبوعاتِ نوائے وقت

سالانہ :-	سات روپے
ششماہی :-	چار روپے
فی پرچہ :-	دس آنے

The Makhzan Lahore

حضرت شیخ عبدالقادر مدظلہٗ مدیر اعزازی صفحہ اوّل
مرزا محبوب بیگ، لفظِ فلسفہ کی سرگزشت، ۳
جگن ناتھ آزاد، منزل ہے کہاں تیری (نظم)، ۱۴
جلال الدین اکبر، یادِ (غزل)، ۱۵
محمد حسن عسکری، آندرے ژید کا تازہ ترین ناول، ۱۶
سید نذیر حسین ناشاد، جشنِ برشگال (غزل)، ۲۳
جعفر طاہر، جھولا (نظم)، ۲۴
صفیہ شمیم ملیح آبادی، برسات کی چاندنی رات (نظم)، ۲۷
ونگ کمانڈر سید فیاض محمود، صاحب بہادر (ڈراما)، ۲۸
نشتر جالندھری، جیمنی سرشار، مس نکہت رضا، سید جابر علی، ضمیر اظہر، اختر انصاری اکبر آبادی، شاکر عروجی، مدیر پرچم، نذیر خادم، باقر رضوی، شوکت الزاہدی، — بزمِ تغزّل، ۳۲
مدیر، جگن ناتھ آزاد کا مجموعۂ کلام، ۳۵
نظر حیدر آبادی، نقشِ آخر (نظم)، ۳۹
امین الرحمٰن، صبحِ کاذب — صبحِ صادق (ڈراما)، ۴۱
نذیر مومن، قطعات، ۴۸
سعید اختر درانی، پہلے درجے کا مسافر (افسانہ)، ۴۹
مدیر، مخزن المخازن، ۵۴
(قائدِ اعظم کی یاد میں)
ماہِ نو، حیاتِ قائد کا آخری سال (فرخ امین)
قائدِ اعظم (نظم) مجتبیٰ حسین
اردو ادب، قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ
نوائے وقت، قائدِ اعظم اور اردو (ڈاکٹر مولوی عبدالحق)
آفاق، جناحؒ اور اقبالؒ کی خط و کتابت (محمد شفیع)
استقلال، قائدِ اعظم کے پیغاماتِ عید (افتخار الملک)
عہدِ استوار (نظم) انجم رحمانی
امروز، قائدِ اعظم زندہ باد!
ہوا پہ پیلنگ، چینی شاعروں کے نوحے،
نقوش، قائدِ اعظم،
ہمایوں، حضرت قائدِ اعظم کی یاد (نظم) اثر صہبائی

صفحۂ اوّل

شیخ عبدالقادر مدظلہٗ، مدیر اعزازی

دو ملنگ

بیسویں صدی عیسوی میں برِ اعظم ہند کی سیاست نے جو رنگ اختیار کیا، اس میں دو شخصیتیں بہت نمایاں طور پر ابھریں۔ ان میں ایک ہندو بزرگ تھے جو مہاتما گاندھی کے لقب سے ملقب ہوتے اور جن کو ان کے ہمارے سرپھروں نے ملنگ کے نام سے مشہور کیا۔ انہوں نے ہندو فقیروں کا روپ دھارا اور وضع قطع میں بھی ملنگ بن گئے۔ دوسرے بزرگ ہمارے قائد اعظم علیہ الرحمۃ محمد علی جناح صاحب تھے۔ یہ بھی اپنی دُھن کے انہیں کی طرح پکے اور مضبوط ارادے کے مالک تھے۔ ان کے مزاج میں بھی درویشانہ بانکپن اور ملنگ تھا مگر اس کو انہوں نے اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا اور ہمیشہ خوش پوش ملنگ رہے۔ جب کبھی انگریزی لباس پہنتے تھے تو وہ اس فیشن کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا تھا اور جب اچکن اور تنگ پاجامہ یا اس کے بعد اچکن اور شلوار کو زیب تن کیا تو اس وقت بھی اُن کی جامہ زیبی مسلم تھی۔ ان کی سیاسی جدوجہد ہمیشہ آئینی رہی اور اسی کی بدولت آخر حکومتِ انگریزی ہندوستان کی تقسیم پر مجبور ہوئی۔

پہلے ملنگ نے جو آواز اٹھائی۔ وہ تھی ہندوستان چھوڑ دو! انگریزوں میں سے کچھ سوچتے تھے کہ شاید چھوڑنا پڑ جائے اور بہت سے اس آواز کو ہنسی میں ٹالنا چاہتے تھے کہ مٹتے ہیں۔ خوش پوش ملنگ نے یہ غلغلہ بلند کیا کہ تقسیم کر دو اور چھوڑ جاؤ۔ اس آواز کے بلند ہوتے ہی چھوڑ جاؤ کا آوازہ مضبوط تر ہوگیا۔ اور سب کو نظر آنے لگا کہ اب اس سے مفر نہیں۔ البتہ تقسیم سے انگریز بھی ہچکچاتے تھے اور کانگریس بھی۔ مگر جب گاندھی اور جناح کی گفتگوئیں بار بار ناکام رہیں اور کئی انگریزی نائب السلطنت بھی کوئی بنیادِ مفاہمت قائم کرنے سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے تقسیم کو ناگزیر سمجھ لیا۔ اُدھر سے ان کو ہندو سیاست والوں اور اُن کے سکھ حلیفوں کی کوتہ اندیشی نے مدد دی۔ انہوں نے بجائے اُس تقسیم کو پسند کرنے کے جو قائدِ اعظم چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے سالم طور پر پاکستان کا جزو بن جائیں اور آبادی ملی جلی رہے۔ خود یہ تجویز پیش کر دی کہ صوبۂ پنجاب اور صوبۂ بنگال کے دو علیحدہ علیحدہ ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو اس وقت نائب السلطنت تھے۔ اس تجویز کو غنیمت سمجھ کر اس کو پسند کر لیا اور برطانیہ کی وزارت سے بھی اس کی منظوری حاصل کر لی۔ قائدِ اعظم اس تجویز کو پورا پسند نہیں کرتے تھے مگر معاملے کی صورت ایسی تھی۔ کہ کوئی اور راستہ اس وقت نکلنا ممکن نظر نہ آیا اور وہ بھی اس تکلیف دہ تقسیم کو منظور کرنے پر مجبور ہو گئے۔

تقسیم کے بعد جو فسادات اور کشت و خون اور وحشیانہ پن ہوا۔ وہ ہماری ملکی تاریخ کا ایک نہایت شرمناک باب ہے۔

اکثر لوگ یہ باور کرتے ہیں کہ انگریزی حکومت کو یہ انجام نظر آ رہا تھا۔ مگر بدنیتی سے انہوں نے روکنے کی کوشش نہ کی۔ ممکن ہے کہ یہ نظریہ درست ہو۔ لیکن میں کم از کم یہ کہوں گا کہ انہوں نے تقسیم کر تو دی مگر نہایت بدحواسی میں کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک فریق کو ہر چیز میں اپنے جائز حق سے زیادہ نفع ملا اور دوسرے کو گھاٹا پڑا۔ مگر قائدِ اعظم نے ہمت نہ ہاری اور اسی پاکستان کو جو بقول اُن کے لنگڑی اور لُنجی حالت میں اُن کو ملا تھا۔ سنبھالنے کی کوشش شروع کر دی اور ایک سال کے قلیل عرصے میں وہ پاکستان کی بنیادیں ایسی مضبوط کھڑی کر گئے کہ اُن پر اُن کے ہمراہی اور جانشین کارکن تعمیری کام کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں کوئی اتنا بڑا انقلابِ عظیم محض آئینی تدبیر سے رونما نہیں ہوا اور آئندہ مورخ یقیناً ہمارے خوش پوش ملنگ کی اس بے نظیر کامیابی کی داد دیں گے اور اب بھی زمانے بھر کے مدبر اور بڑی بڑی دول کے سفیر اُن کی ستائش کر رہے ہیں۔

دونوں قوموں کے ان دو رہنماؤں کے طریقِ کار میں بہت فرق تھا، گو منزل واحد تھی۔ ہمارے ملنگ نے نہ لباس بدلا۔ نہ لمبے لمبے روزے رکھے۔ نہ روزہ رکھتے رکھتے اپنا خاتمہ کر دینے کی کسی کو دھمکی دی۔ مسکراتے ہوئے حکام سے اور دوسری قوموں کے رہنماؤں سے باتیں کرتے رہے۔ اُن کو کھری کھری سناتے رہے۔ اُن سے کڑی اور کڑوی باتیں سنتے رہے۔ مگر جو کچھ کیا۔ سیدھی چال سے کیا اور اُس میں کسی بل اور پیچ کو دخل نہیں دیا۔ اسی کا انعام ہے کہ اُن کی رحلت کے بعد جو حصولِ آزادی کے صرف ایک سال پیچھے واقع ہوئی۔ ہر دشمن و دوست اُن کی تعزیت میں دل سے شریک ہوا۔ اور آج تک سب اُن کے مزار پر پھولوں کی چادریں چڑھاتے اور پھول برساتے ہیں۔

مسلمانوں کے ہاں دنیا سے کسی کے گزرنے پر سب سے بڑی روحانی خدمت جو ہو سکتی ہے، وہ کلام مجید کو پڑھ کر اس کا ثواب مرحوم کو پہنچانے ہوتی ہے۔ اس ثواب کا جس قدر حصہ قائد اعظم علیہ الرحمۃ کو ملا، میرے خیال میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں کہ لاکھوں آدمی زن و مرد، بچے، بوڑھے، مہینوں کلام مجید پڑھتے اور اُن کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہے۔ پاکستان ریڈیو میں چالیس دن مسلسل قرآن خوانی ہوتی رہی گویا در و دیوار اِس ماتم میں اور اِس ایصالِ ثواب میں شریک تھے۔

مخزن

لفظِ "فلسفہ" کی سرگذشت

میرزا محبوب بیگ صاحب (حیدر آباد ۔ دکن)

فلسفہ کی اصطلاح ہماری زبان میں عربی سے آئی ہے۔ لیکن یہ کوئی خالص عربی چیز نہیں۔ یہ ایک معرب یعنی عربی بنایا ہوا لفظ ہے اصل لفظ یونانی زبان کا ہے۔ اور وہ ہے فیلاسوفیا۔ فیلاسوفیا ایک مرکب کلمہ ہے۔ اس کے ترکیبی اجزا دو ہیں۔ ایک فیلاس دوسرا سوفیا۔ فیلاس کے معنی ہیں عشق یا محبت۔ اور سوفیا کے معنی ہیں دانش یا حکمت۔ یوں فیلاسوفیا کے معنی ہوئے دانش کا عشق، حکمت کی محبت۔ یونانی بڑے حسن شناس تھے۔ وہ نوجوان تنومند اور برہنہ انسانی جسم کی تکمیل و رعنائی کے دلدادہ تھے۔ اشیاء کی باترتیبی و موزونی کے گرویدہ تھے۔ اور ساتھ ہی حسبِ ذیل مباحث کے سردوسادہ حسن کے بھی پرستار تھے۔ ریاضیات، طبعیات، فلکیات، کونیات، دنیا کی بنیادی ساخت، حوادث کے سلسلۂ نظم پر حاوی اصول؛ زندگی کے معنی و مقصد، کردار کے اخلاقی مبادیات، انسانی معاشرہ کی موثر تنظیم، حکومت کی بہترین شکل، حق اور جمال اور عدل کا مفہوم اور تعلیم۔ اس طرح یونانیوں کے فنونِ لطیفہ اور ان کی آزاد عقلی فکر و نظر باہم لازم و ملزوم تھے۔ جیسے کہ وہ تخلیق و تحسین کے ایک مسلسل عمل کے متوالی مرحلے ہوں۔ اسی لئے ان میں انہیں لطف و نشاط کا یکساں احساس ہوتا تھا۔

حکمت کی محبت سے ذہن حکمت کے شیدائی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ فیلاسوفاس کا لفظ اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ ہماری زبان کا لفظ فیلسوف اسی یونانی لفظ سے بنا ہے۔ فیلسوف کے اضافی معنی اب ہمارے ہاں بُرے ہوگئے ہیں۔ ہم مکار کو کہتے ہیں فیلسوف۔ اور فیلسوفی ہمارے نزدیک عین فریب کاری

ہے۔ اسی طرح ہم منطقی کہتے ہیں اس کو جو خوامخواہ حجت کرتا ہے۔ لیکن معاملہ فلسفی اور منطقی کی ان تحقیر آمیز تعبیروں پر ختم نہیں ہوتا۔ ہم انہیں اپنی شرارت اور عناد کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ خفقانی، سٹرنظیف نہ لطیفے اس بات کی شہادت دیں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقل و استدلال، نقد و نظر کی مطلوبہ قابلیتوں سے ہم عاری ہوتے ہیں۔ فیلاسوفیا اور فیلاسوفاس کے الفاظ یونانی ادب میں پہلی مرتبہ پانچویں صدی ق م میں ملتے ہیں۔ مشہور مؤرخ ہیروڈوٹس نے انہیں اپنی تحریروں میں استعمال کیا ہے۔ اس سے پہلے کے مصنفوں کے ہاں ان کا پتا نہیں چلتا۔ ہومر کی نظموں کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں ہیں۔ کئی شاعروں نے ان کی تکمیل میں حصہ لیا ہے۔ ۷۵۰ ق م سے لے کر ۵۵۰ ق م تک کا زمانہ ان کی تصنیف کا زمانہ ہے۔ لیکن یہ الفاظ ایلیڈیا اوڈیسی کسی میں نہیں ملتے۔ وہ ہیسیوڈ کی نظموں میں بھی کہیں نہیں ملتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایجاد پانچویں صدی ق م میں کسی وقت عمل میں آئی۔ اس کے قبل فلسفہ محض سوفیا تھا۔ اور فلسفی صرف سوفاس۔ ابتدا میں سوفاس اس آدمی کو کہا جاتا تھا جس میں کسی فن کی فطری قابلیت ہوتی تھی۔ بعد میں اس کا اطلاق ایسے شخص پر بھی ہونے لگا جس کو ذہنی فوقیت حاصل ہو۔ اس کے معنی ہیں حکیم، عاقل، فرزانہ۔ یونان کے سات حکما مشہور ہیں۔ ان میں سے صرف ایک کو فلسفے کی تاریخ میں جگہ ملی ہے۔ اس کی وجہ پلوٹارک یہ بتاتا ہے کہ اکیلے تالیس ہی نے اپنی تحقیقات کو عملی ضروریات سے آگے بڑھایا۔ فہرست کے دوسرے ناموں سے ظاہر ہے کہ لفظ حکیم کا مفہوم کیا تھا۔ ابتدائی مفکرین حکمتِ عملی کے ساتھ ساتھ علمِ فطرت کے حصول کی جانب ہمہ تن متوجہ تھے۔ اس لئے فلسفی کے لئے ایک اور لفظ تھا یہ ہے فزیکاس یا فزیالوگاس۔ اس کے معنی ہیں طبیعی۔ لیکن پانچویں صدی ق م میں فلسفیوں کی ایک جماعت نے وجود یاتی مسائل پر غور و فکر کو رد کر دیا۔ یہ لوگ مبلغے کے فن کی تعلیم دیتے تھے۔ اس فن میں کام آنے والا علم سکھاتے تھے۔ اور بحث کے ہتھکنڈوں کو تسلیم کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے علمیات کی بنا ڈالی۔ انہیں سوفسطائی کہا جاتا ہے۔ فیلسوف کا ایک اور نام ہے۔ اس کے معنی ہیں دانش مند، عالم، معلمِ حکمت۔ افلاطون کے اثر سے اب اس کے معنی ہو گئے ہیں غلط دلیل سے دھوکا دینے والا، حکمت فروش۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفکر کے لئے جب اتنے نام موجود تھے تو پھر ایک نیا لفظ کیوں گھڑا گیا؟

الفاظ کیوں وضع ہوتے؟

دیوجانس لیرتوس نے فلسفیوں کے حالات اور تعلیمات پر دس جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام ہے تذکرۃ الحکماء۔ اس کے دیباچے میں فیثاغورس سے یہ قول منسوب اور منقول ہے "حکیم صرف ذاتِ الٰہی ہے۔ انسان کے لئے ضروری اور کافی یہ ہے حکمت سے محبت رکھے، اور اس کی تلاش کرے"۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ انسان صحیح معنی میں کبھی حکیم نہیں ہو سکتا۔ وقت اور وجود کا ناظر بننا اس کے لئے قطعاً ناممکن ہے۔ حکمت کا احاطہ بس کی بات نہیں ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بڑا عالم بڑا دانش مند ہو۔ لیکن دانش کا بڑا حصہ پھر بھی اس کی دسترس سے باہر ہوگا۔ چنانچہ سقراط نے کبھی علم و حکمت کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ ایک سچے طالب علم کی طرح بارہا اپنی نادانی اپنی جہالت کا اعتراف کیا ہے۔ ایک دفعہ اس کے کسی شاگرد نے ڈیلفی کے دار الاستخارہ میں پوچھا۔ کیا سقراط سے بھی زیادہ دانش مند کوئی شخص ہے؟ جواب ملا۔ نہیں سقراط ہی اپنے زمانے کا سب سے دانش مند انسان ہے۔ یہ بات شاگرد نے استاد سے کہی تو استاد بوکھلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ تو کچھ نہیں جانتا۔ لیکن دیوتا بھی جھوٹ نہیں بولتے۔ اس مخمصے سے نکلے کیسے؟ وہ یہ سوچتا رہا۔ آخر کار ایک ترکیب اُسے سوجھی۔ اس نے سوچا کہ دیوتا کی غلطی ثابت کرے۔ لہٰذا وہ ایسے لوگوں سے ملا جو عام طور سے دانش مند مشہور تھے۔ پہلے وہ ایک مدبر کے پاس گیا۔ اس کو سب دانش مند خیال کرتے تھے۔ اور وہ بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھے ہوئے تھا۔ لیکن سقراط پر اس کا بھرم کھل گیا۔ اس نے اپنے مخاطب سے یہ بات

کہہ دی۔ کسی مدعی کو یہ بتلانا کہ وہ دانش مند نہیں، بڑی بات ہے! اور شاید شائستگی کے خلاف بھی۔ لوگ تو اپنے تعصبات اور اوہام کی دنیا میں رہتے ہیں۔ رنگین چشموں سے ارد گرد کو دیکھتے ہیں۔ وہ بھلا غلط فہمی کے ازالے کو کیسے پسند کرتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا۔ اب وہ شاعروں سے ملا۔ ان سے انہیں کے بعض اشعار کا مطلب پوچھا۔ جواب تشفی بخش نہیں تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ شعر گوئی کو حکمت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو صرف ایک فطری مناسبت یا آمد کا حاصل ہے۔" اس کے بعد اس نے اہلِ حرفہ سے ملاقات کی۔ اور انہیں بھی مایوس کن پایا۔ صاف گوئی ناگوار گزرتی ہے۔ بعض میں بہت سے دشمن بن گئے۔ آخر میں اس نے یہ رائے قائم کی۔ میں اوروں سے بڑھ کر تو کچھ نہیں جانتا۔ لہذا سب سے دانش مند ہونا سب سے عالم ہونا نہیں۔ پھر میں کس اعتبار سے سب سے دانش مند ہوں؟ ممکن ہے اس اعتبار سے۔ لوگ اپنی لاعلمی کا علم نہیں رکھتے۔ وہ جانتے تو کچھ نہیں مگر سمجھتے ہیں کہ جانتے ہیں۔ میں نہ جاننے میں ان سے مختلف یا بہتر نہیں۔ البتہ یہ جانتا ہوں کہ کچھ نہیں جانتا۔ اصل الفاظ یہ ہیں۔ "خدا ہی علیم و حکیم ہے۔ اس کے جواب سے ظاہر ہے کہ انسانی دانش بالکل ہیچ ہے۔ وہ میرا ذکر نہیں کر رہا۔ میرا نام تو اس نے مثالاً لیا ہے۔ جیسے کہ کہتا ہو۔ لوگو جانتے ہو سب سے دانش مند کون ہے؟ وہ جو سقراط کی طرح یہ جانتا ہو کہ اس کی دانش حقیقت میں بے حقیقت ہے۔" یہ بڑا مفکر زندگی بھر علم و حکمت کے مدعیوں سے الجھتا رہا۔ اور باتوں باتوں میں ثابت کر گیا کہ یہ مدعی خود اس سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ اسی لئے وہ عمر بھر فقر و فاقہ میں مبتلا رہا باایں ہمہ وہ ایک سپاہی کی طرح اپنا فرض بجالایا، اور ایک سپاہی کی طرح میدان میں جان دی۔ کوئی اپنے آپ کو دانش مند نہیں کہہ سکتا۔ یہ غرور کی علامت ہوگی اور ایسے شخص کے لئے حکمت کا مزید حصول دشوار ہوجائیگا۔ عجز و انکسار ہمیشہ سے پسندیدہ رہے ہیں۔ ان کی بدولت آدمی اپنی خامیوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ خامیوں کا علم اصلاح و تکمیل کا باعث بنتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی حکمت پہ قناعت نہ کریں۔ اسے کافی نہ جانیں۔ بلکہ عجز و فروتنی کے ساتھ اس کی مزید جستجو کریں۔ اور اسے جان و دل سے عزیز رکھیں۔ انکسار کے ساتھ لاعلمی کے اعتراف، جاننے کے شوق، اور تلاشِ حق کی زبردست خواہش سے ایک ذہنی حالت بنتی ہے۔ یہی ذہنی حالت فلسفہ اور فلسفی کے الفاظ کی ذمہ دار ہے۔ مگر یہ ہیں کس کی جدتِ طبع کا نتیجہ؟

آپ موقع سے یہ پوچھ سکتے ہیں۔ سوال بالکل قدرتی ہے۔ اور خیال انگیز بھی۔ لیکن ایک بات سن لیجیئے۔ مسئلہ نزاعی ہے۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پوری بحث قیاس و قرینہ کی ہے۔ احتیاط و جرح کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ اغلب رائے ہاتھ آسکتی ہے۔ امکانات میں غلطی کی گنجائش بہر حال ہے۔ اس سے پست ہمت ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ خالص حق کبھی آسانی سے میسر نہیں آتا۔ اصل چیز واقعات سے مطابقت ہے۔ اور اس لحاظ سے صحت و خطا کا درجہ کم و بیش ہوتا ہے۔ اب اصل موضوع سے رجوع کیجیئے۔

کس نے وضع کیئے؟

عام طور سے کہا یہ جاتا ہے۔ فیلاسوفیا اور فیلاسوفاس کے الفاظ فیثاغورس نے وضع کیئے۔ نہ صرف وضع کیئے بلکہ ان کے معنی بھی متعین کیئے۔ سِسرو کہتا ہے کہ یہ نامور یونانی ایک سیاحت کے دوران میں فلیس پہنچا۔ یہاں لیونامی ایک شخص حکمراں تھا۔ اسے حکیم کے فضل و کمال پر بڑا تعجب ہوتا۔ اس نے پوچھا جناب یہ تو بتائیے آپ کرتے کیا ہیں؟ فیثاغورس نے جواب دیا۔ یونان کے مشہور اولمپیائی کھیلوں میں تین قسم کے آدمی آتے ہیں بعض تو خرید و فروخت کرتے ہیں بعض مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اور بعض محض دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ زندگی میں بھی تین طرح کے آدمی ملتے ہیں

کوئی منفعت چاہتا ہے۔ کوئی شہرت پسند کرتا ہے۔ اور کوئی صرف مطالعۂ فطرت میں مصروف رہتا ہے۔ یہ بے غرضانہ جذبۂ تحقیق سب سے بڑا تزکیۂ نفس ہے۔ اس میں مصروف رہنے والے کو میں مطالعہ کرنے والا دانا یا فلسفی کہتا ہوں۔" پیدائش کے چکر سے نجات مؤثر طریق پر اسی کو ملتی ہے جس کا شمار اسی جماعت میں ہے (جان برنٹ۔ یونان کا ابتدائی فلسفہ ص ۱۰۸) افلاطون بھی کہتا ہے کہ دنیا میں انسان تین وضع کے ہیں۔ اہلِ حرفت، اہلِ ہمت اور اہلِ حکمت۔ صنعت و حرفت والے غمِ روزگار میں لگے رہتے ہیں۔ کسبِ معاش ان کا مقصود ہوتا ہے۔ انہیں بازار سے دلچسپی ہوتی ہے۔ طاقت و مہارت والے قبضہ کی ہمت اور استعداد کے قابل ہوتے ہیں۔ وہ فتح اور صرف فتح چاہتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کس لئے لڑ رہے ہیں۔ انہیں کارزار کا شوق ہوتا ہے۔ عقل و ہمت والے مال و متاع نہیں چاہتے۔ انہیں فتح و کامرانی کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ وہ فکر و فہم کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ علم و صداقت کی دل سے آرزو کرتے ہیں! ور الگ تھلگ کھڑے رہتے ہیں۔ چند امور یہاں ہماری توجہ کے طلبگار ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے۔ الگ کھڑا تماشا دیکھنے والا سب میں بہتر ہے۔ یہ بات ہمیں کچھ عجیب سی معلوم ہوگی۔ ہم ساحل سے رزمِ خیر و شر کے دیکھنے کو پسند نہیں کرتے۔ بلکہ مانتے یہ ہیں کہ

بہ دریا غلط و با موجش در آویز

وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرتی حالات مختلف ہیں۔ ہماری اقدار الگ ہیں۔ یونان میں شرفا کا طبقہ غلاموں کی محنت پر بسر کرتا تھا۔ انعام کی خاطر مسابقت کرنے والے اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ شریف آدمی کو زندگی کے طمانچوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس کی یہ سبکساریٔ ساحل بڑی خود اثر ثابت ہوئی۔ یونانی ذہن علم و حکمت کو کھڑے دیکھتے رہنے کے مماثل جانتا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر تلاشِ علم شریفوں کا کام تھا۔ شریفانہ کام تھا۔ دوسری چیز یہ ہے۔ ہمارا علم سائنسی ہے۔ یعنی احتیاط کے ساتھ تصدیق شدہ مشاہدات کا عقلی استعمال ہمارے نزدیک علم کا واحد ذریعہ ہے لیکن علم کا یونانی تصور جمالی تحسین سے تعلق رکھتا ہے۔ اشیاء کی خصوصیات کے حساس نظارے میں گہرے ذوقِ تجسس کا اظہار ہوا۔ اسی لئے یونانیوں کی حکمت زیادہ تر ظن و تخمین، قیاس و نظر، تأمل و استغراق پر مبنی تھی۔ اسے قطعی علم یا بنیادی واقعات سے کچھ ایسا زیادہ سروکار نہ تھا۔ تیسری اور آخری چیز یہ ہے۔ فطرت کا مطالعہ اور علم کی تلاش فلسفہ ہے۔ فلسفی وہ ہے جو بے غرضی سے علم کی جستجو اور فطرت کا مطالعہ کرے۔ ایک اور جگہ فیثاغورس نے فلسفہ کا لفظ حکمت کی محبت اور تلاش کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس کا یہ قول دیوجانس لیرتیوس کے حوالے سے اوپر نقل ہوا ہے۔ اسی مادہ کا ایک اور گواہ پونٹس کا ہرقلیدس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک علم کے معنوں میں فلسفہ کے لفظ کو سب سے پہلے ساموسی حکیم نے رائج کیا۔

غور سے اس رائے کو دیکھئے۔ آپ اسے مشکل سے قبول کر سکیں گے۔ پہلی دشواری یہ ہے۔ فیثاغورس ایک مذہبی تحریک کا بانی ہے۔ وہ صوفیانہ رجحان رکھتا تھا۔ اس نے آرفی مذہب کی اصلاح کرنی چاہی۔ اس مقصد سے ایک برادری بنائی۔ اس کا ضابطۂ حیات معین کیا۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں شریک ہو سکتے تھے۔ یہ لوگ راہبوں کی طرح رہتے تھے۔ بہت سی باتوں کی ممانعت تھی۔ ملکیت مشترکہ تھی۔ طریقِ زندگی بھی یکساں تھا۔ یہ ایک عام مذہبی تحریک تھی۔ اس کی تعلیمات صوفیانہ اور علامتی تھی۔ بقائے روح اور تناسخ کے عقیدے بنیادی تھے۔ رسوماتی پابندیاں بے حد تھیں۔ ایک مرحلہ بھی تھی۔ اس سے مقصود دو باتیں تھیں۔ مریدوں کی روحوں کا تزکیہ۔ اور آئندہ زندگی میں ان کی مسرت کا تحفظ۔ تلاشِ علم بھی تزکیۂ نفس کا ایک ذریعہ تھی۔ فیثاغورس کو موسیقی اور ریاضیات سے گہرا صوفیانہ شغف تھا۔ ان چیزوں کو یونانی فلسفہ کی رفتار سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی لئے فیثاغورس اصلاً اور اولاً فلسفی نہ تھا۔ اس نے بعد کے فکر و نظر کو سمت عطا کی۔ اس میں کلام نہیں۔ لیکن یہ اس کی دوسری سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا ضمنی اور اتفاقی ثمرہ تھا۔

ایسوکریٹس کہتا ہے کہ وہ مصر سے فلسفہ لایا۔ لیکن اس سے وہ علمی نظریات مراد نہیں لیتا۔ وہ اس سے ایک اصلاحی اور تعلیمی دستور العمل مراد لیتا ہے (ایڈورڈ زلیر فلسفۂ یونان کی مختصر تاریخ ص ۳۵) "جو تعلیمات اس سے منسوب کی جاتی ہیں ان کی نسبت فیثاغورس سے معین نہیں ہو سکتی۔ خود ارسطو کے زمانے میں بھی یہی کیفیت تھی۔ ارسطو جا بجا فیثاغورسیوں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن فیثاغورس سے منسوب کر کے کوئی بات نہیں لکھتا" (خلیفہ عبدالحکیم داستان دانش ص ۴۳) فیثاغورس کا ایک شاگرد فلولاس تھا۔ یہ سقراط کا ہم عصر تھا۔ اس نے فیثاغورسی دبستان کا فلسفہ پہلی مرتبہ مرتب کیا۔ دوسری دشواری یہ ہے۔ فیثاغورس (۵۸۲ — ۵۰۰ ق م) کی گرفت یونانی ذہن پر بہت وسیع اور مضبوط تھی۔ زیر بحث اصطلاحیں اگر واقعی اسی نے وضع کی ہیں تو یونانی ادبیات میں ان کا استعمال ضروری تھا۔ نئے الفاظ یوں بھی بہت جلد پھیل جاتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے کیا ہیں؟ یہ ہمیں ہومر کی نظموں میں نہیں ملتے۔ ہیروڈوٹس (پ ۴۸۴ ق م) سے پہلے کے اہلِ قلم کے ہاں ان کا پتا نہیں۔ ہیراقلیتوس (۵۳۵ — ۴۷۵ ق م) کہتا ہے کہ فیثاغورس اپنے وقت کا سب سے بڑا عالم تھا۔ وہ اسے فلسفی نہیں کہتا۔ حالانکہ مؤخر الذکر کا دعویٰ یہی تھا۔ تیسری دشواری یہ ہے تحقیق روایت کے خلاف ہے۔ پال ژانے اور گابریل سیاستے یہ لکھتے ہیں سقراط (۴۶۹ — ۳۹۹ ق م) کے عہد تک فلسفیوں کو یا تو سوفوئے کہا جاتا تھا۔ یا فزیکوئے یا فزیالوگوے یا سوفسطائی (تاریخ مسائل فلسفہ جلد اوّل ص ۲) زلیر کا خیال ہے کہ دیوجانس لیرتیوس نے کتاب بے احتیاطی سے اور غیر ناقدانہ انداز میں لکھی ہے (کتاب مذکورہ بالا ص ۹) کلپے کا خیال ہے کہ ہیرقلیدس کا بیان قابلِ اعتبار نہیں (مقدمہ فلسفہ ص ۹) سسرو کے بیان میں "یعنی فلسفی" کے الفاظ قوسین میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خود اس نے اضافہ کئے ہوں۔ تو پھر موجد کون ہے؟

فیثاغورس نہیں تو پھر کون؟

اے ایس۔ راپوپورٹ نے ایک قیاس ظاہر کیا ہے۔ یہ ممکن حل کا ایک اشارہ بن سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیوجانس لیرتیوس نے فیثاغورس کی سند سے جو قول پیش کیا ہے اس کا سقراط سے منسوب ہونا زیادہ مناسب ہے (فلسفہ کا قاعدہ ص ۴) کیوں؟ اُوپر سقراط کا ایک قول نقل ہوا ہے۔ یہ فیثاغورس کے قول سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مؤخر الذکر کے سوانح اور تعلیمات میں موضوعات کثرت سے شامل ہو گئے ہیں۔ یہ بڑے آدمیوں کی عام قسمت ہے۔ حُسنِ عقیدت کو حق و باطل کی پروا نہیں ہوتی۔ دیوجانس لیرتیوس نے اپنی کتاب ۲۳۰ء میں لکھی۔ اور اس میں ہر قسم کا رطب و یابس بھر دیا۔ برعکس اس کے سقراط کے قول کا راوی فلاطون ہے۔ وہ سقراط کا ایک ممتاز ترین شاگرد ہے۔ اس کا بیان تاریخی نوعیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ استاد کا کردار اس نے پوری دیانت سے بیان کیا ہے۔ پھر لہجہ کا انکسار خود چغلی کھاتا ہے۔ فیثاغورس تو اپنے آپ کو نیم الٰہی وجود سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا ہے "دنیا میں انسان ہیں دیوتا ہیں اور فیثاغورس جیسی ہستیاں ہیں۔" آپ کہہ سکتے ہیں یہ سب کچھ تسلیم۔ مگر اس سے حل کی سمت کا تعین ہوتا کیسے ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے دو چیزوں میں تمیز ضروری ہے (۱) زیر بحث الفاظ کی تصنیف اور (۲) ان کے صحیح مفہوم کی حد بندی۔ اب پیشِ نظر قول سقراط کا ہو تو وہ کم سے کم صحیح مفہوم کا معین کرنے والا تو ضرور قرار پا سکتا ہے۔ تعریف اس کے طرزِ فکر کے عین مطابق ہے۔ گویا وہ اس کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ ان تعلیمات کی مختصر تفصیل یہ ہے۔ لاعلمی کا شعور تعلیم کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس کے بغیر جاننے کی خواہش موجود نہیں ہو سکتی۔ لوگ سقراط کے پاس آتے۔ وہ ان سے معمولی امور پر بات چیت شروع کرتا۔ مخاطب اپنی رائیں ظاہر کرتے۔ ان سے وہ مزید باتیں پوچھتا۔ یہ لوگ ایسے جواب دیتے جو پہلے جوابوں سے میل نہیں کھاتے۔ گفتگو کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا۔ آخر میں انجان آدمی بوکھلا جاتے۔ مان لیتے کہ انہیں زیر غور موضوع کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ لاعلمی کے اعتراف سے علم کی خاص رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ مگر یہ

منفی نتیجہ علم کے سچے طالب کے لئے وجہ تحریک بن جاتا تھا۔ اب نئی تعریفیں پیش ہوتیں۔ ہر ایک کو جانچا جاتا۔ ان پر جدید مثالوں کی روشنی میں تنقید کی جاتی متناقضات اور تضادات دور کئے جاتے۔ کمیوں کو پورا کیا جاتا۔ مزید مثالیں تجویز کی جاتیں۔ یہاں تک کہ ایک تشفی بخش تعریف یا تصور کلی حاصل ہوتا۔ سقراط نے لوگوں کو سوچنا سکھایا۔ یہ بھی بتایا کہ سوچنا کیسے چاہیئے۔ اس نے جاننے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ ہر وقت یہی کہا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اسی لئے وہ علم و حکمت کی تلاش کرتا تھا۔ اس کے برخلاف لوگ عام طور سے جانتے تو کچھ نہیں۔ پر سمجھتے ہیں کہ بہت جانتے ہیں۔ لہذا علم کی تلاش نہیں کرتے۔ سقراط کو علم کی ضرورت اور امکان کا پکا یقین تھا۔ اس وجہ سے وہ لاعلمی کے احساس اور اعتراف پر نہیں رکا۔ اس نے علم کی طلب میں پوری کوشش کی۔ وہ نوجوانوں سے کہتا آؤ علم کی تلاش کریں۔ اپنے خیالات کا جائزہ لیں۔ دیکھیں کہ وہ صاف اور غیر متناقض ہیں یا نہیں معلوم کریں کہ جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں ان سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔ علم کی تلاش اگر اچھی طرح سے ہو تو عمل کا بہتر راستہ خود بخود نظر آتا ہے۔ تلاش علم کی ضروری صفات یہ ہیں۔ کامل خلوص، وحدت مقصد، غلطیوں کو ماننے کے لئے تیار رہنے والی سچی فروتنی، خودی سے بزرگتر چیز کی محبت میں خود فراموشی، اور صبر و استقلال۔ حق و صداقت کا وجود فرد سے علحدہ اور مستقل ہے۔ اس کی تلاش جو بھی راستبازی سے کرے وہ اسے پا سکتا ہے۔ اچھائی زندگی کے مقصد کی تکمیل ہے علم میں مسلسل ترقی ممکن ہے۔ ہر نئے مرحلے میں لاعلمی کا شعور ہوتا ہے۔ اس سے ذہن کھلا رہتا ہے۔ خیالات آسانی سے قبول کئے جاتے ہیں۔ پوچھنے اور ڈھونڈنے کا نتیجہ مردہ نہیں ہوتا۔ یہ شعور نہ ہو تو علم کی ترقی متاثر ہو جائے۔ علم جیسے جیسے بڑھتا ہے۔ بصیرت بھی ویسے ہی بڑھتی ہے۔ اس طرح صحیح مفہوم کی تعیین کا مسئلہ قریب قریب طے ہے۔ یہاں ہمارے لئے ایک اشارہ ہے۔ اور اس سے ہم اپنی بحث کو آگے جاری رکھ سکتے ہیں۔ زیر غور الفاظ کے معنی اگر سقراط کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ تو ہو سکتا ہے کہ انہیں وضع بھی اسی نے کیا ہو۔

تصنیف راہمنتت نیکوکنند بیاں

کس قسم کی ذہنی حالت ان الفاظ کا ماخذ ہے۔ یہ اوپر گذر چکا ہے۔ سقراط کا انداز خیال بھی ظاہر ہے۔ اس لئے اگر ہم اسے موجد ٹھہرائیں تو بیجا نہ ہوگا۔ اس قیاس کی تصدیق اور طرح بھی ہوتی ہے۔ سقراط طبیعی نہ تھا۔ وہ خود کہتا ہے "مجھے طبیعی قیاس آرائیوں سے کوئی سروکار نہیں"۔ وہ سوفسطائی بھی نہ تھا۔ صاحب حکمت یا علم حکمت ہونے کا اس نے کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ تشکیک اس کا مقصود نہیں۔ اس نے ہمیشہ سوفسطائیوں کے طور طریقوں اور افکار کا مذاق اڑایا۔ اُسے دراصل دلچسپی اخلاقیات سے تھی۔ اس کا مسئلہ یہ تھا۔ اپنے آپ کو کچھ کیا ہو؟ حکیم کا لقب اسے پسند نہیں تھا۔ اس میں عُجب و غرور کی بُو آتی تھی۔ لہذا ایک نیا لفظ اس نے وضع کیا۔ فلسفی یعنی حکمت کا شیدائی۔ اور حکمت کی محبت کا نام فلسفہ ہوا۔ یہ چیز سقراط کے میلانِ نظر کے بالکل مُوافق تھی۔ ثابت اور سیاسے بھی کہنا یہی چاہتے ہیں کہ لفظ فلسفہ سقراط کے زمانے میں رائج ہوا۔

ایک اور طرح بھی اس بحث کی تائید ہوتی ہے۔ یہ ہے لفظ فلسفہ کا ابتدائی استعمال۔ آپ جانتے ہیں یہ لفظ پہلی مرتبہ ہمیں ہیروڈوٹس کی تحریروں میں ملتا ہے۔ وہ سقراط کا ہم عصر تھا۔ اگرچہ عمر میں کچھ بڑا تھا۔ اغلب ہے یہ لفظ اس نے مؤخر الذکر سے لیا ہو۔ اس طرح اس لفظ کی حد تک سقراط کے عصری ادبیات کا مطالعہ سودمند ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے پہلے ایک چیز کو سمجھ لیجئے۔ یہ خود سقراط کا تصور علم و حکمت ہے۔ اسے انسان سے غیر معمولی دلچسپی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ کائنات کے متعلق قیاس آرائیاں محض فضول ہیں۔ پرانے مسئلوں کی چھان بین اور جانچ پڑتال ختم ہونی ضروری ہے۔ توجہ کے لائق امور دراصل یہ ہیں ہمیں کیا ہونا چاہیئے؟ زندگی کے معنی کیا ہیں؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ ورزش کے لئے بہترین نیکی کیا ہے؟ غرض کہ سچا علم وہ ہے جو ہمیں انسان کی حیثیت سے اچھا بنائے۔ سب کے لئے اخلاقی مسئلہ اور بنیاد ایک ہے۔ سقراطی اخلاقیات کا اساسی تصور یہ ہے۔ علم نیکی ہے۔ علم کے بغیر راست روی محال ہے۔ بلکہ نیکی کا صحیح علم ہونے پر نیکی نہ کرنا بھی ناممکن ہے۔

خیرِ عامل کے لئے مفید ترین ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی بھلائی چاہتا ہے کسی عمل کو کوئی اچھا سمجھ لے اور عامل نہ ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ علم کا یہ موضوع بالکل نیا تھا۔ اور اس سے متعلق تلاشِ علم کا ایک انوکھا طریقہ تھا۔ یہ سقراطی طریقہ کہلاتا ہے۔ اسے طریقۂ جدل، طریقۂ مناظرہ، استقرا، یہ سلسلۂ براہین وغیرہ بھی کہتے ہیں۔ علم ذہن میں حقیقت کی شبیہ کا نام نہیں۔ وہ ذہن کی سرگرمی ہے۔ اور منصر اس پر ہے کہ ذہن خارجی اشیاء کے ساتھ پیش کیسے آتا ہے؟ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے مستقیم طور سے سوچیئے۔ بعکور کے سچے اور واضح تصور قائم کیجئے۔ اس طریقے سے حق مستنبط ہوتا ہے۔ مگر صرف ان صورتوں میں جب کہ زیرِ بحث اشیاء منطقی نوعیت کی ہوں۔ اس سے منطقی استقامت کو ترقی ہوتی ہے۔ الفاظ کا صحیح استعمال معلوم ہوتا ہے۔ صحیح معنوں کی تحقیق سے تصورات خلط ملط نہیں ہوتے۔ اس طور سے سقراط لوگوں کے دل و دماغ روشن کرتا تھا۔ انہیں صحیح طور پر سوچنا اور حق دریافت کرنا سکھاتا تھا۔ یہ بتاتا تھا کہ عمل کے مقاصد علم سے متعین ہونے چاہئیں۔ تربیتِ روح اور کمالِ نفس مفید باتیں ہیں۔ حکمت کی محبت اور تلاش یہی ہے۔

معنی کیا ہیں؟

اب لفظِ فلسفہ کے ابتدائی مفہوم کو لیجئے۔ اس کا استعمال تحقیق کے جذبہ، ذہنی تربیت اور حصولِ علم کی جد و جہد کے لئے ہوتا تھا۔ کروسس سولن سے کہتا ہے: "ہم نے سنا ہے تم بہت دانش مند ہو۔ دانش مندی سے محبت کرتے ہو۔ دنیا کے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہو۔ اور اس بنا پر بہت سی سرزمینوں کی سیاحت کر چکے ہو"۔ (ہیروڈوٹس ۱-۳۰) سولن یونان کے مشہور سات حکماء میں سے ہے۔ وہ عملی کی مشق یعنی زندگی کے امور و معاملات میں ماہرانہ فراست رکھتا تھا۔ اس کی حکمت عملی تھی۔ اس کی سیر و سیاحت کے متعلق یہاں فلسفیانہ نگاہ اور نظری انداز کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اور اوپر بتاتے ہوئے مطلب کا اظہار ان سے مقصود ہے۔ پیریکلیز کی تعزیتی تقریر قدیم خوش بیانی کا نہایت شاندار نمونہ ہے۔ اس کا ایک فقرہ یہ ہے۔ ایتھنز دوسرے شہروں سے زیادہ حکمت اور حسن کا خیال رکھتا ہے: "ہم حسن کی پرستش کرتے ہیں مگر ہمارے مذاق سادہ ہیں۔ اور ہم مردانگی کو نقصان پہنچائے بغیر ذہن کی تربیت کرتے ہیں"۔ (تھیوسی ڈائڈیز ۲-۴۰) یہاں فیلاسوفائن سے مراد یہ ہے۔ ہر شکل میں حق کی محبت، صحیح طور پر سوچنے اور بولنے کا فن اور انسان کو حقیقی معنی میں انسان بنانا۔ آپ اسے تہذیبِ نفس کہہ سکتے ہیں۔ روشن خیالی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یو تھیڈیمس ایک مشہور سوفسطائی ہوا ہے۔ وہ افلاطون کے ایک مکالمے کا ہیرو بھی ہے۔ اس نے مشہور شاعروں اور سوفسطائیوں کی بہت سی کتابیں جمع کی تھیں۔ اور اتنی سی بات پر وہ اپنے آپ کو فلسفے میں بہت ترقی یافتہ سمجھتا تھا۔ (زینوفن ۴-۲-۲۳) السوکریٹس اپنے رسالہ حفاظت کو کبھی فلسفیانہ مقالات کہتا ہے۔ کبھی فیلاسوفیا۔ اور کبھی فلاسوفائن۔ یہی مصنف فیثا غورس کے اصلاحی و تعلیمی دستور العمل کو اس نئے فلسفے سے تعبیر کرتا ہے۔

سقراط کی ہستی بڑی با اثر تھی۔ جو بھی اُس سے ایک بار مل لیتا عمر بھر نہ بھولتا۔ ہر وقت کے ملنے والوں کی تو کچھ پوچھئے نہیں ایتھنز کے باشندوں کا عام خیال یہ تھا حسین روح حسین جسم میں ہو تو اس سے بات چیت کی لذت ہزار گونہ بڑھ جاتی ہے۔ پھر بھی وہ اس بھدّے بے ڈھنگے آدمی سے بہت متأثر ہوئے تھے۔ اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ اور حسینوں کی صحبت پر اس کی صحبت کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کے دوستوں میں السی بیاڈیز نامی ایک امیر تھا۔ اس نے ایک مرتبہ کہا۔ سقراط کا ظاہر کردہ سا ہے لیکن باطن حسین دیوتاؤں سے بھرا ہوا ہے۔ اس شخصی اثر کو سقراط کی دلیرانہ شہادت نے بے انتہا بڑھا دیا۔ حکمت اور الوہیت دونوں مل گئے۔ یہ معراج بہت کم کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ جذبات کے نرغے سے نکالنے کا ماہر تھا۔ آزادیٔ فکر کا بڑا

موسکی تھا مگر فکر اس کی تباہی اور بناتی ہوئی راہوں کا زیادہ دن پابند نہ رہ سکا۔ زندگی مقررہ حدود و قیود کو توڑ نکلتی ہے تجسس اس کے اثر سے کچھ دیر کے لئے دبا رہا مگر دوبارہ اچھلا اور بڑے زور سے اچھلا۔ وہ ایک جبلت ہے۔ بڑی موثر اور بڑی طاقتور۔ وہ دائرۂ تحقیق کی کسی مستقل حد بندی کو قبول نہ کر سکی انسانی زندگی اور کردار کے مسئلے روح کی ضروریات ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں مگر فکر و وجود کے مسئلے بھی اتنے ہی اہم ہیں۔ وہ پس منظر میں زیادہ دیر تک نہ رہ سکے۔ اور عقلی کھوج ہونے کے اعتبار سے اخلاق و کردار کی تحقیقات سے مل گئے۔ چنانچہ لفظ فلسفہ کے ابتدائی معنی برقرار نہیں رہے۔ وہ بمرورِ زمانہ بدلے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ کسی اصطلاح کی بنیادی تعبیر کو تبدیل نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن الفاظ کی بھی نشوونما ہوتی ہے۔ وہ استحالہ کرتے ہیں۔ اور نمو میں ابتدائی خدوخال بدل جاتے ہیں۔ اصلی معنی قائم نہیں رہتے۔ نہ صرف مفہوم کے نازک فرق پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات محدود اور مختلف معنی بھی۔ ایرس ٹپ پس نے فلسفے کو مآل اندیشی کے مترادف قرار دیا یعنی اس کے معنی یہ ٹھہرے۔ زندگی میں عمدہ چیزوں کا استعمال۔ توہمات، تعصبات اور جذبات سے آزادی۔ لذتوں میں ضبط اور فطرت کے ادنیٰ میلانوں پر عقلی قابو۔

فلاطون نے یہ لفظ علم کے ہر خصوصی شعبے کے واسطے برتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے "ہندسہ یا کوئی اور فلسفہ" (تھی ایٹی ٹس) انسان نے حیرت کی وجہ سے دنیا کا مطالعہ کیا تحقیق، تخمین اور بحث و تمحیص سے مختلف مرکزوں میں مختلف نظریات و افکار مرتب ہوئے۔ یہ پھیلے اور آپس میں ملے ان کا تنقیدی اور تاریخی نظر سے مطالعہ ہوا۔ نتیجۃً نئے نئے دبستاں پھلے پھولے۔ علمی ذخیرہ بڑھا۔ وہ داخلی وحدت اور منطقی ربط کی بنا پر کئی شاخوں میں بٹا۔ اس علمی مجموعے کا نام فلسفہ ہوا۔ اس کی باقاعدہ تعلیم و تدریس ہوتی تھی۔ اس بنا پر فلاطون کہتا ہے۔ فلسفہ اکتسابِ علم ہے (یوتھیڈیموس) فلاطون کے ہاں مختلف علوم یا فلسفے ہیں (جمہوریہ ۴۸۰ ب۔ تھی ایٹی ٹس ۱۴۳ ب) وہ حق کے مختلف اجزا ہیں۔ مگر وہ الگ الگ نہیں ملتے۔ فنی تنظیم اور تدوین یہاں یکسر مفقود ہے۔ اکادیمی میں عام اور ہمہ گیر بحثیں ہوتی تھیں۔ یہ لفظی طور پر حکمت یا حق کی محبت ہی ہے۔ علم سے فکر اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ نیکی اس سے علیحدہ نہیں فلسفہ پورے حق کی محبت ہے۔ لہذا وسعت و جامعیت فلسفی کے فکر و نظر کا خاصہ ہے۔ وہ ہمیشہ کُل کو دیکھتا ہے۔ آزادی اور فرصت اس کی تربیت کی دو لازمی شرطیں ہیں (تھی ایٹی ٹس) یہاں ایک بات بتا دینی ضروری ہے۔ حقیقت کے بنیادی مسئلوں کا غائر مطالعہ فلاطون کے ہاں جدلیات کہلاتا ہے۔ وہ عین فلسفہ نہیں۔ فلسفے کی ایک شاخ ہے۔

بعد کی تبدیلیاں

ارسطو نے فلسفہ کی اصطلاح کو اتنے ہی وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ البتہ اس کے ہاں ترتیب ہے۔ تدوین ہے، تبویب ہے۔ فلسفہ عام علم کا نام ہے۔ وہ علم اور سائنسی تحقیق کی پوری وسعتوں پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) نظری (۲) عملی اور (۳) تخلیقی۔ نظری فلسفہ میں تین علوم داخل ہیں (۱) فلسفۂ اولیٰ (۲) فلسفۂ اوسط اور (۳) فلسفۂ ادنیٰ۔ فلسفۂ اولیٰ کو ارسطو کے دیکھتوں اور شاگردوں نے مابعد الطبیعیات کہا ہے کیونکہ انہوں نے فلسفۂ فطرت کی کتابوں کو پہلے رکھا۔ اور ماہیتِ اشیاء کے مسائل اور مباحث کو بعد میں جگہ دی۔ اسے انہوں نے کہا و ٹا فیٹا فیوزیکا۔ یعنی وہ جو طبیعیات کے بعد ہے آج کل اسی کو فلسفہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے علمی فلسفہ بھی کہا گیا ہے۔ بطور جملۂ معترضہ کے یہ کہنا ضروری ہے ما بعد الطبیعی مسائل ارسطو کی اختراع نہیں۔ ان پر آیونیا کے فلسفیوں نے بھی غور کیا ہے! اور فلاطون نے بھی فلسفۂ اولیٰ دو شقوں پر مشتمل ہے۔ (۱) علم امور عام اور

(۲) الٰہیات۔ ریاضیات فلسفۂ اوسط ہے۔ اور طبیعیات یا نیچرل سائنس فلسفۂ ادنیٰ۔ اس میں یہ فلسفے داخل ہیں۔ (۱) فلسفۂ طبیعیات (۲) فلسفۂ کون و فساد (۳) فلسفۂ کائنات الجو (۴) حیاتیات (۵) جمادات وغیرہ۔ ارسطو بعض اوقات علم کی مختلف شاخوں کے لئے جمع کا صیغہ کام میں لاتا ہے۔ مثلاً طبیعیات، ریاضیات اور الٰہیات کو اس نے تین نظری فلسفے (فیلاسوفیائے تھیوریٹیکائے) کہا ہے (مابعد الطبیعیات ۱-۶-۹۸۸ الف ۲۹) یہ سائنس کے تین مختلف نظام ہیں۔ (۱) فلسفۂ اخلاقیات (۲) فلسفۂ تدبیر منزل اور (۳) فلسفۂ سیاسیات تخلیقی فلسفہ محیط ہے (۱) خطابت اور (۲) شاعری کو۔ نظری فلسفہ کا مقصود حق ہے عملی فلسفہ کا مقصد خیر ہے۔ اور تخلیقی فلسفہ کا مقصود حُسن ہے۔ جو سیبا الیسین جو آیان لکھتا ہے: "نظری فلسفہ میں بحث اشیاء کے وجوبی پہلو سے ہوتی ہے۔ یعنی ایسی چیزوں سے جو کم سے کم اپنے مبادیات و اصول کے اعتبار سے وجوبی ہوتی ہیں۔ شعری اور عملی فلسفوں میں بحث اشیاء بذور خاصہ نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کے ایسے پہلوؤں سے ہوتی ہے جو کم و بیش ارادے کے تابع ہیں۔ مگر حسن کاری اور عمل میں فرق ضروری ہے۔ حسن کاری کا مقصود ایسی چیز ہے جو عامل سے باہر ہے یہ عامل کے ارادہ کا متحق ہوتا ہے۔ عمل کا منتہا خود ارادہ ہے۔ یعنی عامل کا ذہنی فعل۔" (مقالہ بر مابعد الطبیعیات ارسطو جلد اول صفحہ ۲۵) اس طرح فلسفہ کا جامع تصور معین اور واضح ہوا۔ ہر علم جزئی فلسفہ ہے۔ وہ ایک ایسے عام نظریہ کے معلوم کرنے کی کوشش ہے۔ جو زیر بحث امور پر حاوی ہو۔ علم کے ہر شعبہ کے اصول علیحدہ ہیں۔ ان میں کوئی شعبہ دوسرے کا شریک نہیں ہوتا۔ علم کے مختلف شعبوں کے دائرے مختلف ہیں۔ جملہ جزئی فلسفے باہم مربوط ہیں علم و نظر کی یہ ترکیب سب سے پہلے ارسطو کے ہاں ملتی ہے۔ وہی انسانی علم میں نظام اور فصل بندی کا بانی ہے۔ اس نے ہر علم میں مفروضے قائم کئے۔ اور فلسفہ کو "وحدت کی محبت اور تلاش" بنا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی تعمیمیں جلد بازانہ ہوں۔ اس نے علم کے غیر متحقق میدانوں میں اپنے ظن و قیاس کو مسلمات کا درجہ دے دیا ہو۔ لیکن ایسے فیضان سائنس سے ملا تھا۔ کہتا ہے "دانش مند انسان جملہ چیزوں سے سائنسی طور پر واقف ہوتا ہے" (مابعد الطبیعیات ۴-۱) اسی سرچشمے سے اس نے یہ چیزیں پائیں۔ اپنے مقدمات، اپنے مسائل کا اصولی طریقے سے پیش کرنا اور اپنے طریقہ کا تصور۔ فکر کی دنیا میں ارسطو کی فتوحات سیاسیات کی دنیا میں سکندر کی فتوحات سے کم حیرت انگیز یا شاندار نہ تھیں۔ دو بڑے مقدونیوں نے دو بڑی دنیاؤں کو بدنظمی اور افراتفری سے بچایا۔

مگر سکندر مقدونی کا سیاسی نظم بہت مہنگا پڑا۔ ایتھنز کی فکری و سیاسی آزادیاں ختم ہو گئیں۔ یونانی ذہن میں وہ کیفیت پیدا ہو گئی جسے نفسیات میں رجعت بنفس (INTROVERSION) کہتے ہیں۔ ارسطو تک کے یونانی فلسفی عقلی اعتبار سے بڑے طاقت ور تھے۔ انہیں دنیا کی ہر چیز سے دلچسپی تھی۔ وہ فطرت پر غور کرتے تھے علم کے متعلق سوچتے تھے۔ سیاسیات میں عملی حصہ لیتے تھے۔ فیثاغورس اور افلاطون جیسے صوفی مفکر بھی حکمرانوں کو حکیم بنانے کے آرزومند تھے۔ اتنی تجویزیں انھوں نے آزمائیں بھی۔ لیکن ارسطو کے بعد کے فلسفی ہر اعتبار سے بے بس تھے۔ اسی لئے خارجی دنیا سے انہیں کوئی دلچسپی کوئی غرض نہ تھی۔ سیاسیات سے وہ دستکش تھے ہستی اور فکر کے مسئلوں پر غور کرنا ان کے نزدیک محض بیکار تھا۔ ان کی ساری ہمت اور توجہ باطن کی طرف مبذول تھی۔ یعنی ان کے پیش نظر کائنات یا علم یا اچھی مملکت کے سوال نہ تھے۔ وہ پوچھتے یہ تھے۔ بدی اور ناانصافی اور شر اور درد سے بھری ہوئی اس دُنیا میں انسان نیک یا خوش کیسے ہو سکتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کا نقطۂ نظر داخلی اور انفرادی تھا۔ وہ ہارے اور تھکے ہوئے اشخاص تھے۔ مایوسی۔ نے ان کے فطری ذوق و شوق کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ان کا فلسفہ فرار اور پسپائی کا فلسفہ ہے۔ اُس

دور میں سوچنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ صرف دو دبستان مشہور ہیں۔ ایک معاقیت کا دوسرا ابی قوریت کا۔ رواقی کہتے ہیں کہ فلسفہ مفید فن کی مشق ہے۔ اسے نیکی کی جد و جہد بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور معقول اخلاقیات کے اصولوں کی تلاش بھی۔ اس طرح وہ نام ہے نیک زندگی بسر کرنے کا۔ دانش مند اور نیک مترادف الفاظ ہیں علم وہی اچھا ہے جو اخلاقی زندگی میں مدد و معاون ہو (مثلاً دیکھئے سینیکا خطوط ۸۹) اب فلسفہ حکمت کی محبت نہ تھا۔ وہ علم کی محبت بھی نہ تھا۔ اس کے معنی تھے نیکی کی محبت یا زندگی کا فن جو سائنسی اصولوں پر مبنی ہو۔ ابی قوری یہ کہتے تھے۔ تصورات اور مباحث کے ذریعے سے پرمسرت زندگی بسر کرنا فلسفہ ہے منطق اور طبیعیات تابع ہیں اخلاقیات کے۔ بہرحال فلسفہ انسانی زندگی اور افعال پر جامع نظر کرنا تھا (سیکس ٹس ایمپیریکس ADV. MATH-9-169) یہ چیز افلاطون اور ارسطو کے تصور سے کس قدر مختلف ہے!

خاتمہ کلام اور خلاصہ بحث

اس طرح یونانی ذہن نے لفظ فلسفہ کے معنی معین کئے۔ ایک یہ کہ وہ فکر کا باترتیب و بااصول کام ہے۔ اس کے ذریعے سے ہمیں کائنات اور موجوداتِ کائنات کا علم ہوتا ہے جس سے ہستی کے راز فاش ہوتے ہیں۔ یوں فلسفہ سائنس کا ہم معنی تھا۔ یوں یونانیوں نے اپنی سائنس کو فلسفہ کہا۔ ہر علم مخصوص ایک فلسفہ تھا۔ ایک جزئی اور منفرد فلسفہ۔ اس میں فطرت کے کسی نہ کسی پہلو کی تحقیق یا اس سے بحث کی جاتی تھی۔ بدیں اعتبار فلسفہ کے معنی باقاعدہ فطری علم کے تھے۔ جملہ علوم فلسفیانہ بنیاد پر قائم ہو سکتے تھے۔ دراصل فلسفیانہ تھے۔ یہ لفظ فلسفہ کا نظری مفہوم تھا جسے فلاطون اور ارسطو نے معین کیا۔ لیکن اس کی بنیاد ایک بڑی روایت پر ہے۔ آیونیائی مفکرین کے افکار و قیاسات سائنسی مفروضے تھے۔ ان میں تشبیہی خواہشوں اور اخلاقی تصورات کو کوئی دخل نہ تھا۔ جنوبی اطالیہ اور صقلیہ کے یونانی شہروں کا فلسفہ آیونیا کے فلسفے کے مقابلے میں کم سائنسی تھا۔ بایں ہمہ اسے کائنات سے دلچسپی تھی۔ اس کی توجہ فطرت پر مرکوز تھی۔ انسان پر حد سے زیادہ زور اس میں پایا نہیں جاتا۔ سقراط نے طبیعی قیاس آرائیوں کو سختی سے رد کیا۔ لیکن رکی ہوئی دبائی ہوئی چیزیں ختم نہیں ہوتیں۔ وہ پھر ظاہر ہوتی ہیں۔ اور شدت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ فلاطون اور ارسطو کے نظاموں میں فطرت کی توجیہوں کے پائے جانے کا سبب یہی ہے۔ لیکن اس برتر نظری مفہوم کے ساتھ ہمیں ایک عملی مفہوم بھی ملتا ہے۔ اخلاقیات اور سیاسیات فلاطون اور ارسطو کے فکر کا ضروری جزو ہیں۔ وہ باہم لازم و ملزوم ہیں۔ عقلمند مقنن کا کام یہ تھا کہ جماعت کے ارکان کے لئے تمام قاعدے مرتب کرے۔ ان کے ذہنوں کو تربیت دے۔ ان کے کرداروں کو بنائے۔ تاکہ وہ اچھی زندگی گذاریں۔ اچھی زندگی کے خواہش مند ہوں۔ چنانچہ فلاطون اور ارسطو دونوں نے کوشش کی حکمرانوں کو حکیم بنانے کی۔ اپنے اصولوں کو انسانوں اور شہریوں کی زندگی میں پیوست کرنے کی۔

لفظِ فلسفہ کے دوسرے معنی ہیں، انسانی علم کے عام ترین نتیجوں پر غور و فکر۔ اور ان سے طرزِ حیات کے لئے ایک یقین حاصل کرنے کی کوشش۔ اس تصور کی ابتدا سقراط سے ہوئی۔ فلسفے کے شہیدوں کا یہ مرشدِ اعظم ایتھنز کا بہت بڑا مفکر تھا۔ اسی نے فلسفے کی اصطلاح ایجاد کی۔ حکمت کی محبت ایک مبہم ترکیب تھی۔ اسی نے اس لفظ کا صحیح مفہوم معین کیا۔ اس نے اسے اچھے شہری کے لوازم کے لئے استعمال کیا۔ یہ کیا تھے آپ بخوبی جانتے ہیں مگر سب پڑھنے والے یکساں چوکس نہیں ہوتے۔ لہذا مختصر سی تکرار میں حرج کچھ نہیں۔ انسان کے لئے ضروری باتیں یہ ہیں۔ حصولِ علم کے واسطے جد و جہد کرے۔ حق سے محبت رکھے۔ تحقیق کے جذبے سے معمور ہو۔ صحیح طور پر سوچے اور بولے۔ زندگی کے معنی و مقصد کو جانے۔ حقیقت میں آدمی بنے۔ یعنی وہ علم حاصل کرے جو

نیک بنائے۔ نیکی اور علم کا امتزاج لفظِ فلسفہ کا عملی مفہوم تھا۔ اس کو قبول و فروغ پیلو پونیشی جنگ کے دوران میں حاصل ہوا۔ مقدونی استیلاء کے بعد تو وہ بے حد اہمیت اختیار کر گیا۔ اب نظری دلچسپی خصوصی فلسفوں کی طرف منتقل ہو گئی۔ یہ اپنے مخصوص موضوعاتِ تحقیق کے نام سے موسوم اور مشہور تھے۔

ڈرانے کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ یونانیوں نے لفظِ فلسفہ کی صحت کے ساتھ تعریف کبھی نہیں کی معمولی مفہوم یہ تھا۔ انسانوں کو اشیاء کی ماہیت اور حقیقت سے آگاہ کرنا۔ اور بصیرت کے اس موقف و مقام سے فرد اور سماج کی اچھی زندگی کا راستہ بتلانا۔ حکمت کا یونانی تصور ابتداء سے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں پر حاوی رہا ہے۔ البتہ سیاسی عروج و زوال کے متناسب ان پر زور دیا گیا۔ قومی اقبال کے زمانہ میں یونانی مفکروں کا دماغ روشن تھا۔ ان کی طبیعت میں جولانی تھی۔ عقل تیز تھی۔ ان کا تخیل قوی تھا۔ ان کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ ان میں رجائیت تھی۔ کھوج کا ذوق تھا۔ کائناتی مسائل کو بے غرضانہ طریقہ پر سمجھنے اور سلجھانے کا انہیں سلیقہ تھا۔ اور ان کی اخلاقیات سیاسیات سے مربوط تھی۔ لیکن اسپارٹا اور مقدونیہ سے شکست کھانے کے بعد ایتھنز والوں کے فکری اور عملی قوائے مضمحل ہو گئے۔ سیاسی حریت اور اہمیت، معاشی ذرائع اور تفوق سے محروم ہو کر یونانی قوم بے جان ہو گئی۔ ہمتوں کے پست ہونے سے طبیعتیں مایوس اور سرد ہو گئیں۔ ذوق و شوق رخصت ہوا۔ آزادانہ علمی افکار اور مسائل علم و عالم سے دلچسپی نہیں رہی۔ اخلاقیات کا سیاسیات سے اب کوئی رشتہ نہ تھا۔ شخصی نجات مقصدِ حیات بن گئی۔ لوگ سوچتے ضرور تھے۔ مگر صرف اس لئے کہ سوچنے پر مجبور تھے۔ ان کے فکری میلانات کا تقاضا تھا کہ نئے طرزِ زندگی کی تائید علمی نظریئے سے ہو۔ یعنی شکست و فرار کے لئے بھی فلسفہ درکار تھا!

فلسفے کے کام اور ما فیہ کا یہ تصور اب تک برابر موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں یہ کچھ بدلا۔ فلوطینوس کے نظام میں فلسفے نے مذہب کی جگہ لی ہے۔ مذہب کا وظیفہ انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کا ردِ عمل ہوا۔ یہ بہت زور کا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں مذہب نے فلسفے کے فرائض خود انجام دئے۔ اس نے کہا۔ شخصی زندگی یوں بسر کی جائے۔ حقیقت کے بارے میں صحیح نظری رائے یہ ہے۔ یہ نظری رائے ایک حد تک فلسفیانہ تھی۔ لہٰذا فلسفہ مذہب کا "فرماں بردار خادم" بن گیا۔ اس کے سپرد یہ کام تھا۔ کہ عقیدے کو عقلی طور پر پیش اور ثابت کرے۔ لیکن اس سے اسے فائدہ بھی پہنچا۔ اس کا اسلوب الٰہیات سے مختلف اور ممتاز ہو گیا۔ الٰہیات کا علم ربانی علم تھا۔ وہ الہام کو پیش کرتا تھا۔ فلسفہ دنیوی علم تھا۔ وہ الہام کو علم اور عقل اور تجربے سے ثابت کرتا تھا۔ مگر وہ رفتہ رفتہ مذہب پر تنقید کرنے لگا۔ ماتحتی نے آزادی کی شکل اختیار کر لی۔ آزادی کے ساتھ وظیفہ کی بحالی بھی عمل میں آئی۔ بلاشبہ فلسفہ آج محض فنی مسئلوں سے بحث کرتا ہے۔ ایک خصوصی مطالعہ بن رہا ہے۔ اسے زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر یہ تصور بالکل جدید ہے۔ اور ابھی عام نہیں ہوا۔ بڑی حد تک فلسفہ کا کام اب بھی وہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ فلسفے کے جدید رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے "منطقی تحلیل فلسفیوں کا کام ضرور ہے۔ لیکن یہ ان کا واحد کام ہرگز نہیں۔ اگر صرف یہی ان کا کام ہے تو یہ صریحاً اعتماد شکنی ہے اگر ہمارے زمانے کے حکیم و دانائے راز نہیں۔ اگر ان کے پاس موجودہ پریشاں حال دنیا کے لئے کوئی اپنا پیغام اپنی حکمت نہیں۔ تو وہ کم سے کم اتنا تو ضرور کر سکتے ہیں کہ ماضی کے دانش وروں کی دانش کا جائزہ لیں۔ اسے جدید بیان و زبان میں پیش کریں۔ وہ ان کا گراں قدر ورثہ ہے۔ اور اس کی ترجمانی کے لئے ان سے زیادہ موزوں دوسرا کوئی نہیں" (فلسفہ ص ۲۲۷)

★

جگن ناتھ آزاد
مدیر "بساط عالم" دہلی

منزل ہے کہاں تیری

ہر ایک چیز زمانے میں آنی جانی ہے
ہر ایک رسم حقیقت نُما کہانی ہے
بس اتنی بات ہی دنیا میں جاودانی ہے
کہ اضطراب ازلی اور غیر فانی ہے
ازل سے گرمِ تگ و دو ہے ولولہ دل کا
کہیں رُکا نہ زمانے میں قافلہ دل کا

یہ دل "زمانۂ شاہی" میں مطمئن نہ رہا
"زمیں" کا دور جب آیا اسے سکوں نہ ملا
"زمیں کے دور" کے بعد آیا "دورِ سرمایہ"
یہاں بھی ذوقِ نظر مائلِ قرار نہ تھا
گیا یہ دور تو "دین و وطن" کے دور آئے
فرات و دجلہ کے گنگ و جمن کے دور آئے

ہر ایک وقت کا دل نے کیا قبول اثر
ثبات مل نہ سکا ایک دور کو بھی مگر
اب "اشتراک" پہ ٹھہرا تو ہے مذاقِ نظر
مگر یہ کون کہے یہ بھی شاخ ہے کہ ثمر
کسے خبر یہ کوئی موج ہے کہ ساحل ہے
چراغِ راہگزر ہے کہ منزلِ دل ہے

جلال الدین اکبر

یاد

یہ بھول بھی کیا بھول ہے یہ یاد بھی کیا یاد
تو یاد ہے اور کوئی نہیں تیرے سوا یاد

وابستہ تری یاد سے تسکینِ دل ہے
مجھ کو تو ہے لے دے کے یہی ایک دوا یاد

اتنی تو ہو اے کاش تری یاد کی مستی
آئے نہ کبھی کوئی مجھے تیرے سوا یاد

اس حسنِ تعلق کا ادا شکر ہو کیوں کر
میں نے جو کیا یاد تو اُس نے بھی کیا یاد

درس ایسا دیا پیرِ طریقت نے رضا کا
مطلب ہے کوئی یاد نہ مطلب کی دُعا یاد

وابستہ تری یاد سے ہے یادِ خدا بھی
آتا ہے جو تو یاد تو آتا ہے خدا یاد

کیا خوب ہے یہ بے خودیٔ شوق کا عالم
اب کوئی عطا یاد ہے تیری نہ بلا یاد

اللہ تری رحمتِ کامل کا کرشمہ
خود مجھ کو نہیں آج کوئی اپنی خطا یاد

اب عشق ہے اور یادِ رُخِ دوست کی مستی
دوزخ کی سزا یاد نہ جنّت کی جزا یاد

اُس مردِ خدا مست کی کیا بات ہے اکبرؔ
جس کو نہ رہا کچھ بھی بجز یادِ خدا یاد

محمد حسن عسکری

آندرے ژید کا تازہ ترین ناول

یہ بات آج کل بعض حلقوں کی طرف سے بار بار دہرائی جاتی ہے کہ جو اپنے جذبات و احساسات کے تجزیے سے، اپنی انفرادی شخصیت سے دلچسپی رکھتا ہو وہ لازمی طور سے اپنی شخصیت کا شکار ہو کے رہ جاتا ہے، اس کا اُفق محدود ہو جاتا ہے، خارجی حقیقت سے اُس کا تعلق باقی نہیں رہتا، اُسے انسانوں سے نفرت ہو جاتی ہے، انسانیت کے مستقبل سے ہمدردی ہی نہیں رہتی، اس کے اندر انحطاط پذیری آجاتی ہے، وہ اپنی نفسانیت میں پھنس کے رہ جاتا ہے، گدھا، کُتّا، بندر، بھیڑیا بن جاتا ہے (ان جانوروں کے نام واقعی گنائے جاتے ہیں) یہ اصول بیان کرنے کے بعد جب مثالیں پیش کرنے کا نمبر آتا ہے تو اُن میں آندرے ژید کا نام پیش پیش ہوتا ہے۔ یہ کچھ ہمارے ہی ملک پر موقوف نہیں ہے، ہر ملک کے کمیونسٹ نقادوں کا یہی خیال ہے۔ ژید نے اپنے روزنامچے میں دو چار جگہ یہ لکھا ہے کہ میرے احساسات پہلے کی طرح تیز نہیں رہے، مجھے زندگی کچھ خالی خالی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ستّر پچھتّر سال کے بوڑھے آدمی کے تاثرات اور کیا ہوں گے۔ یہ بالکل فطری سی بات ہے، خصوصاً ژید کے لئے تو اعصاب کا کُند ہو جانا اور بھی افسوس ناک ہونا چاہئے، کیونکہ انہوں نے ہمیشہ زندگی کے حسیاتی پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے، اور اسے حقیقت کی دریافت کا ذریعہ بنایا ہے۔ مگر ژید جو وقتاً فوقتاً اپنی جسمانی، ذہنی اور حسیاتی قوّتوں کے گھٹنے پر افسوس کا اظہار کرتے رہتے ہیں، اسے بعض لوگ اُن کی اخلاقی انحطاط پذیری کا ثبوت سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ انفرادیت پرستوں کا یہی انجام ہوتا ہے، جن لوگوں کو انسانوں سے ہمدردی نہ ہو وہ یوں ہی کُڑھ کُڑھ کے مرتے ہیں، اگر ژید نے دوسرے انسانوں کی زندگی کو توجّہ کے قابل سمجھا ہوتا تو وہ بڑھاپے میں یوں تنہائی محسوس نہ کرتے، غرض ژید کی انسانیت سے بے نیازی اور خود پرستی کا افسانہ آج کل بڑا مشہور ہے، اور جن لوگوں نے ان کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی اُنھوں نے اپنے تخیل کی مدد سے اور رنگ آمیزی کی ہے۔

اصل میں یہ افسانہ طرازی ایک خاص وجہ سے ہو رہی ہے۔ انسانوں کے دُکھ درد سے بے نیاز ہونا تو دُور کی بات ہے ۳۲ء سے ۳۶ء کا زمانہ ژید کے لئے ایسا گزرا ہے کہ سماجی انصاف کا مسئلہ اُن کے لئے ہر دوسرے مسئلے سے زیادہ اہم بن گیا تھا۔ اُس زمانے میں وہ سولہ سال کے نوجوان نہیں تھے بلکہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے فرانسیسی ادیب سمجھے جاتے تھے، ادیبوں کی دو ایک نسلیں اُن سے اثر بھی قبول کر چکی تھیں، انفرادیت پسندی کے مسئلے پر اُنہیں جو سوچنا تھا یا کہنا تھا اُس سے وہ فارغ ہو چکے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اُنھوں نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ اب تو مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جب تک دنیا میں بھوک اور غربت موجود ہے ادب کی تخلیق سے کیا فائدہ ہے، سماجی مسائل پر غور کرتے ہوئے اُن کے اندر اس حد تک جذباتیت آگئی تھی۔ یوں تو اُن کو طبعاً ہر قسم کی جماعت بندیوں سے نفرت ہے، اور کسی جماعت میں شامل ہونے کا مطلب اُن کے لئے ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے اپنے آپ کو مقید کر لینا ہے، اس کے باوجود اُنھوں نے کمیونزم کی حمایت کا اعلان کر دیا چنانچہ کمیونسٹ

حلقوں نے اُن کا بڑا پُرزور خیر مقدم کیا (آج کل پکاسو پر بھی یہی کچھ گزر رہی ہے) اُن کے جن ناولوں کو آج کل انفرادیت پرستانہ اور اور انسانیت کے لئے زہرِ قاتل بتایا جاتا ہے۔ اُنہیں کے رُوسی زبان میں ترجمے ہوتے، لاکھوں جلدیں بکیں، اور اُن کی فروخت سے ژید کو ہزاروں روپے ملے۔ آخر ۱۹۳۶ء میں رُوس کی حکومت نے اُنہیں رُوس آنے کی دعوت دی۔ وہاں اُن کی بڑی زبردست خاطر مدارات اور شاہانہ دعوتیں ہوئیں مگر ژید صاحب بھی بڑی اُلٹی کھوپڑی کے واقع ہوئے تھے۔ دعوتوں سے خوش ہونے کے بجائے اُنہوں نے اُلٹا یہ سوچا کہ میری دعوت پر اتنا روپیہ فضول کیوں خرچ ہو رہا ہے، اور کسی اشتراکی ریاست کو ان نمائشی باتوں سے کیا مطلب۔ خیر، رُوس کی سیر کرنے کے بعد اُنہیں بڑی مایوسی ہوئی، اور جس اشتراکیت کی اُنہیں توقع تھی وہ کہیں نہ دکھائی دی، چنانچہ اُنہوں نے فرانس واپس آکر روس کے بارے میں دو چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھ دیں۔ بس جناب پھر تو اللہ دے اور بندہ لے، گالیوں کی برسات ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ یورپ میں ژید کی بڑی زبردست حیثیت تھی۔ اگر اُن پر سرمایہ داروں سے رشوت لینے کا الزام لگایا جاتا۔ تو کسی کو یقین نہ آتا۔ یوں تو خیر یہ الزام بھی لگا مگر زیادہ زور اس پر دیا گیا کہ ژید تو تخیل پرست اور جذباتی آدمی ہے، اس کی باتوں کا کیا اعتبار، یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ جنگ آگئی اور فرانس پر جرمنوں کا قبضہ ہو گیا۔ فرانسیسی ادیبوں نے مدافعت کے لئے جو کمیٹیاں بنائی تھیں۔ اُن میں افریقہ والی کمیٹی کے صدر آندرے ژید تھے۔ اِس دوران میں اُنہوں نے اپنے روزنامچے میں اپنے ملک کے سیاسی لوگوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُسے پڑھنے کے بعد کسی طرح یہ شبہہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اپنے ملک کے بدخواہ ہو سکتے ہیں۔ مگر ژید اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو ایک وقت میں صرف ایک ہی حقیقت محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے روزنامچے میں یہ بھی لکھا ہے کہ جرمن سپاہی بڑے مہذب اور با اخلاق ہیں، ان کی وردیاں بڑی اچھی ہیں، اور اُن پر بڑی سجتی ہیں۔ اِس میں ایسی کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے۔ خاص طور سے یُوں کہ ہٹلر نے سولہ سولہ سال کے لڑکوں کو بڑی کثرت سے فوج میں بھرتی کر لیا تھا۔ جن میں فوجیوں کی سی درشتی نہیں تھی۔ اتنی سی بات لکھنے پر بعض لوگوں نے ژید کو غدار ٹھہرا دیا، اور کمیونسٹ شاعر اراگون نے تو حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ چند اور لوگوں نے کہا کہ یہ شخص غدار نہ سہی، کم سے کم نوجوانوں کے اخلاق ضرور خراب کر رہا ہے۔ اِس لئے اِسے سزا ضرور ملنی چاہیئے۔

یہ تو تھیں لوگوں کی رائیں ژید کے متعلق، اب ژید کی تحریروں کی طرف آئیے۔ جنگ کے زمانے سے لے کر اب تک ژید کی تین کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ایک تو "خیالی ملاقاتیں" دوسرے اُن کا "روزنامچہ" جس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ان دونوں کتابوں میں اُنہوں نے زندگی اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے تیسری کتاب ہے "تے زے"۔ یہ کوئی سَوا سَو صفحے کا قصّہ ہے۔ پتہ نہیں اِسے ناول کہنا چاہیئے یا کچھ اَور، یہ کتاب ژید نے ۱۹۴۴ء میں ختم کی اور غالباً ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی یعنی ٹھیٹ جنگ کے دوران میں بھی اُنہوں نے اپنا تخلیقی کام بند نہیں کیا تھا، اور زندگی کے متعلق غور و فکر برابر جاری رکھا تھا۔ بلکہ زندگی کے متعلق ایسی قطعیت سے شاید اُنہوں نے کبھی رائے ظاہر کی ہی نہیں تھی، نہ انسانی کوشش اور سماجی خدمت کے متعلق ایسا اُمید افزا رویہ اختیار کیا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ژید نے ستر بہتر سال تک زندگی کے متعلق جو کچھ سوچا ہے اُس کا ماحصل اِس کتاب میں پیش کر دیا ہے، اس بات نے اکثر لوگوں کو متحیر کیا ہے کہ جس شخص کو کٹر انفرادیت پرست سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے انسانی زندگی کے متعلق قطعی فیصلہ کرتے ہوئے اجتماعی فلاح کا نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔

یہ کتاب "تے زے" قدیم یونان کے اُس مشہور ہیرو کے بارے میں ہے جسے انگریزی میں تھی سی اَس کہتے ہیں۔ یُوں تو اس کا قصّہ آپ نے اسکول

کے زمانے میں پڑھا ہی ہوگا۔ بہر حال مختصراً دہرائے دیتا ہوں۔ تِھی سِیس ایتھنز کے بادشاہ ایجِیَس کا بیٹا تھا، مگر اس کے بارے میں مشہور تھا کہ دراصل وہ سمندر کے دیوتا کی اولاد ہے۔ جب وہ جوان ہوا تو حسبِ دستور اُس سے شجاعت اور ہمت کے بڑے بڑے کارنامے ظہور پذیر ہوتے۔ ساتھ ساتھ کچھ تفریحِ طبع کا بھی سامان ہوتا رہا۔ اسی سلسلے میں اُس کا بیٹا ہِپولِٹس پیدا ہوا۔ مگر اُس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ابھی باقی تھا۔ اُس زمانے میں یونانی لوگ تو یوں ہی نیم وحشی قسم کے تھے، اور ان کی قومی زندگی میں بڑا انتشار تھا، اس کے برخلاف یونان کے جنوب میں جزیرۂ کریٹ کی تہذیب اُس وقت اپنے عروج پر تھی۔ اور وہاں کا بادشاہ مِینوس بڑا طاقت ور تھا۔ اس نے یونانیوں کو دبا رکھا تھا، اور اُن سے خراج وصول کیا کرتا تھا۔ مگر خراج ایک عجیب شکل میں لیتا تھا۔ اس کی ملکہ پاسی فاءے کی ایک دفعہ کسی بیل پر نظرِ عنایت ہوگئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ایک بیٹا پیدا ہوا جو آدھا انسان تھا اور آدھا بیل۔ اسی لئے اُس کا نام مِینو تور رکھا گیا۔ یہ حضرت آدم خور تھے۔ چونکہ اس عجیب الخلقت جانور کو مقدس سمجھا جاتا تھا، اس لئے بادشاہ اسے قتل تو نہیں کرا سکتا تھا، مگر اپنی رعایا کی بربادی بھی نہیں دیکھی جاتی تھی۔ اس کے دربار میں وہ مشہور انجنیئر تھا جسے انگریزی میں ڈیڈلس کہتے ہیں اور جو موم کے پر لگا کے اُڑتا تھا۔ بادشاہ نے اُس سے ایک ایسی بھول بھلیاں بنوائی جس سے کوئی نکل ہی نہ سکے، اور مِینو تور کو اس میں ڈال دیا۔ مگر مقدس مِینو تور کی تھوڑی سی خاطر داری بھی ضروری تھی، اور کچھ یونانیوں کو ذلیل کرنا بھی مقصود تھا۔ اس لئے ایتھنز والوں کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر سال چودہ نوجوان کریٹ بھیجے جائیں۔ ان لوگوں کو بھول بھلیاں میں اُتار دیا جاتا تھا۔ وہاں مِینو تور انہیں کھا لیتا تھا۔ یہ رسم اسی طرح بہت دنوں سے چلی آ رہی تھی۔ تِھی سِیس کو اپنی قوم کی یہ تذلیل بڑی ناگوار گزری، اور اُس نے جی میں ٹھان لی کہ میں جا کے مِینو تور کو مار دوں گا، اور اپنی قوم کو اس مصیبت سے نجات دلاؤں گا۔ چنانچہ اس نے بڑی بحث و تکرار کے بعد اپنے باپ سے اجازت حاصل کر لی، اور دوسرے نوجوانوں کے ساتھ کریٹ جا پہنچا۔ یہ تو اسے یقین تھا کہ میں مِینو تور کو قتل کر دوں گا، مگر سوال یہ تھا کہ بھول بھلیاں میں سے نکلا کیسے جائے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بادشاہ مِینوس کی بڑی بیٹی آریان اُس پر عاشق ہوگئی، اور اس کی یوں مدد کی کہ تِھی سِیس کو تاگے کا ایک گولا دیا، خود تو تاگے کا ایک سرا پکڑ کے بھول بھلیاں کے دروازے پر کھڑی ہوگئی، اور اُس سے کہا کہ تم گولے کو کھولتے ہوئے چلے جاؤ۔ جب تِھی سِیس مِینو تور کو قتل کر چکا تو گولے کو لپیٹتا ہوا بڑی آسانی سے دروازے پر آ پہنچا۔ اب آریان تو چاہتی تھی کہ تِھی سِیس مجھے گھر لے چلے، مگر تِھی سِیس کا دل اُس کی چھوٹی بہن فیدرؔ پر آ گیا تھا۔ اُس نے دھوکے سے دونوں بہنوں کو اپنے جہاز پر سوار کر لیا، اور راتوں رات نکل بھاگا۔ آریان کو تو اس نے زبردستی ایک جزیرے میں اُتار دیا، اور فیدر کو گھر لے آیا۔ ایتھنز سے چلتے ہوئے یہ بات طے پا گئی تھی کہ اگر جہاز تِھی سِیس کے بغیر واپس آئے تو سیاہ بادبان لگائے جائیں، اگر وہ زندہ ہو تو سفید۔ اتفاق کی بات کہ بھاگنے کی جلدی میں تِھی سِیس بادبان بدلنا بھول گیا۔ اُس کے باپ نے جو دُور سے کالے بادبان دیکھے تو وہ سمجھا کہ میرے بیٹے کی جان گئی۔ اس غم میں اُس نے فوراً سمندر میں چھلانگ لگا دی، اور ڈوب کے مر گیا۔ خیر، اب تِھی سِیس بادشاہ ہوا، اور فیدر ملکہ۔ بادشاہ ہونے کے بعد اُس نے نمائشی قسم کے کارناموں کی فکر چھوڑ دی اور اپنی حکومت کے استحکام میں لگ گیا۔ بڑھاپے میں اُسے ایک زبردست صدمہ پہنچا۔ اُس کی اور فیدر کی عمر میں بڑا فرق تھا۔ وہ تو بڈھا ہو چلا تھا، مگر ملکہ ابھی جوان تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے سوتیلے بیٹے ہِپولِٹ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دئے۔ جب وہ قابو میں نہ آیا تو اُلٹا اسی پر الزام لگا دیا۔ تِھی سِیس کو بھی اپنی بیوی کی بات کا یقین آ گیا، اور اُس نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا۔ بعد میں فیدر کو اپنے اس فعل پر بڑی ندامت ہوئی، اور اُس نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا (اس واقعے کو فرانس کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار راسین نے اپنے عظیم ترین ڈرامے "فیدر" کا موضوع بنایا ہے۔

یہ ہے وہ مشہور یونانی داستان جس پر ژید نے اپنے ناول کی بنیاد رکھی ہے۔ یوں تو یونانی داستانیں ہمیشہ ہی فرانسیسی ادب میں استعمال ہوتی رہی ہیں مگر عموماً یہ ہوتا ہے کہ ہر ہیرو کا جو روایتی تصور ہے اُس کو برقرار رکھتے ہوئے مصنف کردار کو ذرا تفصیل اور گہرے تجزیے کے ساتھ پیش کر دیتا تھا۔ مگر جب سے نئے نفسیاتی علوم خصوصاً اجتماعی نفسیات کا مطالعہ شروع ہوا ہے، لوگ پرانی داستانوں کو مختلف پہلوؤں کے سمجھنے اور اُن کی نئی نئی تفسیریں پیش کرنے لگے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو انفرادی کرداروں کا اس طرح تجزیہ کیا ہے کہ روایتی تصور سے اُنہیں کوئی علاقہ ہی باقی نہیں رہا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ یونانیوں کے ذہن میں ان داستانوں کی جو معنویت تھی وہ برقرار رہے۔ پچھلے تیس سال میں جن فرانسیسی مصنفوں نے یونان کی روایتی داستانوں کو نئے ڈراموں اور ناولوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ اُن میں ژاں کوکتو، ژید اور ژاں پول سارتر خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس صدی کے سب سے بڑے جرمن شاعر ریلکے نے کوکتو کے متعلق کہا ہے کہ پرانی داستانوں کے دروازے تو بس ایک اُن کے لئے کھلتے ہیں اور واقعی کوکتو کے ڈراموں میں جو شدت، معنویت اور ہمہ گیری ہے وہ شیکسپیئر کے زمانے کے بعد انگریزی ڈراموں میں بالکل نظر نہیں آتی۔ البتہ ریلکے کا قول سارتر اور ژید پر بھی صادق آتا ہے۔

جیسا کہ آپ نے کہانی پڑھتے ہوئے غور کیا ہوگا، تے زے کی زندگی میں کئی واقعات ایسے ہیں جو بذاتِ خود دلچسپ ہیں مگر ژید نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ جن باتوں پر اس کہانی میں ہمیشہ زور دیا گیا ہے۔ اُن پر ژید نے زور نہیں دیا۔ مینوتور کے قتل سے پہلے تے زے نے جتنے کارنامے کئے ہیں۔ اُن کا ذکر بس یوں ہی چلتے چلتے ہوا۔ بلکہ مینوتور کے قتل کو بھی خاص اہمیت نہیں دی گئی، نہ عشق و عاشقی کا ذکر تفصیل سے ہے۔ روایتی تصور تے زے کو ایک بڑے بہادر آدمی کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، مگر ژید نے اُس کی بہادری کو ثانوی درجہ دیا ہے۔ اُن کا نظریہ تو یہ رہا ہے کہ بہادر تو یونان میں اور بھی بہت سے ہوتے ہیں، معلوم یہ کرنا چاہیئے کہ تے زے اوروں سے کس بات میں مختلف ہے۔

ژید نے یہ ناول واحد متکلم کے صیغے میں، یعنی تے زے کی طرف سے لکھا ہے۔ اس ناول میں اور ژید کے اکثر دوسرے ناولوں میں فرق یہ ہے۔ کہ اور جگہ تو ژید کا ہیرو زندگی بسر کرنے کا کوئی نیا اصول یا زندگی کا کوئی نیا اور اہم عنصر دریافت کرتا ہے، اس کے بعد ہیرو کے سامنے مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اس اصول یا عنصر کو اپنی زندگی کے ساتھ کیسے تطبیق دے، ہیرو کی روحانی کہانی ناول کے ساتھ ختم نہیں ہوتی بلکہ اس میں نئے امکانات نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے برخلاف تے زے کو بس اب صرف اپنی موت کا انتظار ہے، اُس زندگی کے نئے امکانات کا شمہ بھی باقی نہیں، اب وہ یہ ڈھونڈ رہا ہے کہ میری زندگی میں کیا معنی پیدا ہوتے ہیں، اور اس سے پوری انسانی زندگی کے لئے کیا فلسفہ مرتب ہوتا ہے۔ تے زے بات ہی یہاں سے شروع کرتا ہے۔ دراصل وہ اپنی کہانی اپنے بیٹے ای پولیت کو سنانا چاہتا ہے کہ وہ اس سے سبق حاصل کرے۔ یہ تدریس کا عنصر بھی ژید کے یہاں نیا ہے۔ اگر پہلے کبھی یہ عنصر نمودار بھی ہوتا تھا تو اس طرح جیسے ژید تجربے کرتے چلے جا رہے ہوں، اور پیچھے آنے والوں کو ان سے آگاہ کرتے ہوں مگر یہاں ژید اپنے سارے تجربات کا نچوڑ پیش کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں کوئی مسئلہ نہیں پیش کیا گیا جس کا حل کرنا ابھی باقی ہو، بلکہ زندگی کے پورے پورے مسئلے کا ایک حل پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک میں نے اس وجہ سے کہا کہ یہ ناول کسی کمیونسٹ کا نہیں بلکہ ژید کا لکھا ہوا ہے جو بیک وقت مختلف اور متضاد حقیقتوں کا وجود تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ تے زے کو بھی احساس ہے کہ جس چیز کو وہ زندگی کے مسئلے کا حل سمجھتا ہے، ممکن ہے کسی دوسرے مزاج کے آدمی کے لئے وہ حل مناسب نہ رہے، مگر چونکہ ژید خود کئی مزاجوں کا مجموعہ ہیں، اس لئے یہ حل کئی طبیعتوں کے لئے قابلِ قبول

ہوسکتا ہے۔ اس اقتباس سے بعض لوگوں کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب انسانیت کے لئے تیذ کا وصیت نامہ ہے۔

اب اصل کتاب کی طرف آیئے۔ تیے زیے کے اندر جو خامیاں ہیں وہ اُس نے بڑی ایمانداری سے قبول لی ہیں۔ اُس کو اپنی بہادری پہ کوئی خاص فخر نہیں۔ اس کے مزاج میں ضبطِ نفس کا عنصر بہت کم ہے۔ دل میں جو بھی خواہش پیدا ہوئی وہ پوری ضرور کی خواہ کتنی ہی مشکلیں کیوں نہ پیش آئیں۔ پھر وہ ایک جگہ ٹکنا تو جانتا ہی نہ تھا، اس کا کام صرف آگے چلنا تھا۔ چنانچہ بادشاہ بننے سے پہلے اُس نے جس عورت کی طرف بھی توجہ کی محض وقتی، بڑی جلدی جی بھر گیا، اور چھوڑ کے چل دیا، چاہے تھوڑی بہت بے رحمی ہی سے کام لینا پڑے۔ حالانکہ آریان نے اُس کی خاطر اپنے ماں باپ کو دھوکا دیا، گھر بار چھوڑا، مگر اس نے بیچاری کو بیچ ہی میں جہاز سے اُتار دیا، پھر اگر کہیں چالاکی سے کام لینا پڑے تو وہ اس سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ فیدر کو اڑانے کے لیے اُس نے آخر میبوس کو چکمہ دیا ہی، جب وہ بادشاہ ہو گیا تو لوگ اُس کے کارناموں سے ایسے مرعوب تھے کہ اُنھوں نے اُس کے بارے میں طرح طرح کی حکایتیں مشہور کر دیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے دوزخ کی بھی سیر کی ہے، اور وہاں کی ملکہ سے لطف اندوز ہوا ہے۔ لوگوں کے دل پر اپنا سکہ جمانے کے لئے اُس نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی اور اپنی طرف سے دو چار باتیں اور جوڑ دیں۔ بادشاہ بننے سے پہلے یہ تھی اُس کی زندگی۔ فدا اُس کی جوانی کا حال خود اُسی کی زبانی سنیئے "میں ہوا تھا، سمندر کی لہر تھا، ننھا سا پودا تھا، پرندہ تھا، میں اپنے آپ تک بند نہیں تھا، خارجی دنیا سے ٹکرا کر مجھے اپنی حدوں کا احساس نہیں ہوتا تھا، بلکہ میرے اندر لذت جاگ اُٹھتی تھی۔ عورتوں کو پیار کرنے سے پہلے میں نے پھلوں کو، ننھے درختوں کو، سمندر کے کنارے چکنے چکنے پتھروں کو، بالوں دار کتوں کو، گھوڑوں کو پیار کیا ہے۔

اس انداز سے اُس کی زندگی گزر رہی تھی کہ ایک دن اُس کے باپ نے اُسے نصیحت کی کہ تم بادشاہ کے بیٹے ہو، تمہارے کچھ فرائض ہیں، تمہیں اپنی قوتِ ارادی کو قبضے میں لانا چاہیے۔ اُس دن سے تیے زیے کی زندگی بدلنی شروع ہو گئی۔ جسمانی ورزش کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنی ذات میں بھی ایک معنویت پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اُس زمانے میں بادشاہوں کے بیٹوں کے لئے اس کا ایک ہی طریقہ مقرر تھا وہ یہ کہ شجاعت کے کارنامے دکھلائے جائیں۔ چنانچہ وہ اپنی بساط کے مطابق یہ فرض بھی ادا کرتا رہا، یہاں تک کہ اُس کے دل میں قومی غیرت کا جذبہ پیدا ہوا، اور وہ یونان کی پیشانی سے ذلت کا داغ مٹانے کے لئے مینوتور سے لڑنے کریٹ روانہ ہو گیا۔

اب کتاب کا مرکزی حصہ آتا ہے۔ روایت سے گریز کرتے ہوئے ژید نے تیے زیے کی فتح میں آریان کا حصہ بہت کم کر دیا ہے، اور وہ ایک عام جذباتی اور ضدی لڑکی کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس ناول میں کریٹ کی ملکہ بھی تیے زیے پر ریجھتی ہے، اور اس سے مستفید ہونے کے بعد اُسے انجینیر دو تے وال (انگریزی میں ڈیڈلس) کے پاس بھیج دیتی ہے کہ جاؤ وہ تمہیں بھول بھلیاں سے نکلنے کی ترکیب بتائے گا۔ دو تے وال اسے چند نصیحتیں کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں پہلی مرتبہ تبدیلی باپ کی نصیحتوں سے آئی تھی۔ اب سب سے بڑی تبدیلی آئندہ چل کر دو تے وال کی نصیحتوں سے واقع ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ژید نے محض انفرادی کوشش ہی کی نہیں بلکہ رُشد و ہدایت کی اہمیت بھی تسلیم کی ہے۔ دو تے وال بتاتا ہے کہ میں نے بھول بھلیاں اس اصول کے ماتحت بنائی ہے کہ جو وہاں جائے اُس کا پھر باہر آنے کو جی ہی نہ چاہے۔ وہ تیے زیے کو مشورہ دیتا ہے کہ تم اندر جا کے وہاں کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا، اور اپنی قوتِ ارادی کو قبضے سے باہر نہ نکلنے دینا۔ اس کے علاوہ وہ تاگے کے گولے والی ترکیب بتاتا ہے۔ یہ گفتگو اس کتاب کا بہترین اور بلند ترین حصہ ہے۔ اس کا تمثیلی اور مابعد الطبیعیاتی پہلو یہ ہے کہ جو آدمی اپنی ذات کی

بھول بھلیاں میں پھنس جاتا ہے، اُس کا آزاد ہونا مشکل ہے، مگر اس بھول بھلیاں میں جائے بغیر آدمی کی زندگی بے معنی رہتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اپنی ذات کی پیچیدگیوں میں اُلجھ کر بھی وہ اپنی قوتِ ارادی کو بیدار رکھے، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے علاوہ کسی اور ذات یا حقیقت سے بھی سلسلہ استوار رکھے، جس طرح تے زیسے آریان سے بندھا ہوا تھا۔ اس طرح ژید نے انفرادیت پرستی کا ایک نیا فلسفہ پیش کر دیا ہے جو کمیونسٹوں کی اجتماعیت پرستی سے کہیں زیادہ متوازن اور صالح ہے، اور ہمارے صوفیوں کے نقطۂ نظر سے قریب تر ہے۔

جب تے زیسے بادشاہ بن جاتا ہے تو اُس کی زندگی میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔ اب وہ خواہش پرستی بالکل چھوڑ کے اس دُھن میں لگ جاتا ہے کہ قومی انتشار کو ختم کر کے ایک مضبوط اور مستحکم ریاست قائم کروں جہاں امن وامان اور خوش حالی کا دَور دَورہ ہو، اور شہر ایتھنز علم وفن کا مرکز بن جائے۔ اسی بنیادی مقصد کے پیشِ نظر وہ ایک طرح عوام کو دھوکا بھی دیتا ہے، یعنی عوام اُسے فوق الانسان سمجھتے ہیں، اور وہ جان بوجھ کے اس بات کی تردید نہیں کرتا۔ ریاست کے استحکام کے لئے وہ سب سے پہلا کام یہ کرتا ہے کہ جو قبیلوں کے سردار آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اُن کی جائیداد یں چھین کے عام لوگوں میں برابر برابر تقسیم کر دیتا ہے۔ اُس کا ایک دوست اُسے سمجھاتا ہے کہ کامل مساوات تو غیر فطری چیز ہے، تھوڑے دن میں پھر چھوٹے بڑے کا فرق پیدا ہو جائیگا۔ وہ جواب دیتا ہے کہ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں، مگر ملک کے استحکام کا یہی طریقہ ہے، دوسرے میری کوشش یہ ہے کہ اب کی جو اشرافیہ وجود میں آئے اس کی بنیاد دولت نہ ہو بلکہ علم وہنر اور ذاتی صفات، ایک طرح دیکھئے تو ژید نے اس ناول میں روسی اشتراکیت کی وکالت کی ہے، بلکہ اسٹالن تک کی، کیونکہ اسٹالن خاص طور سے ذاتی عقیدت کو ملک کے استحکام کے لئے استعمال کرنے کا حامی ہے، نظریوں کو عوام کہاں سمجھتے ہیں۔

تے زیسے کی کوششوں سے ایتھنز واقعی ایک مضبوط ریاست بن جاتا ہے، اور آئندہ عظمت کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ حالانکہ اُس کے بیٹے کی جان ایسے حسرت ناک طریقے سے گئی اور بیوی بھی ہاتھ سے جاتی رہی، مگر وہ پھر بھی خوش ہے، اور ایک شہر کی تعمیر اُسے اپنا سب سے بڑا کارنامہ نظر آتا ہے۔ مصیبتیں تو ایک دوسرے ہیرو ای ڈی پس پر بھی پڑی تھیں، مگر اُس کے اُوپر دوسرا ہی اثر ہوا تھا۔ ای ڈی پس نے غلطی سے اپنی ماں سے شادی کر لی تھی، مگر پتا بڑھاپے میں چلا جب اُس کے بچے بھی ہو چکے تھے۔ اِس رنج میں اُس نے اپنی آنکھیں نکال ڈالیں، اور سلطنت چھوڑ کر جنگلوں میں مارا مارا پھرنے لگا، آخر تے زیسے نے اُسے اپنے یہاں پناہ دی (ای ڈی پس کے قصے پر کوکتو نے اپنا عظیم ڈراما INFERNAL MACHINE لکھا ہے جو لاہور کی پبلک لائبریری میں ملتا ہے۔ ہو سکے تو ضرور پڑھئے۔ ژید نے بھی اس داستان کو اپنے طریقے پر لکھا ہے) جب ان دونوں میں باتیں ہوتی ہیں تو ای ڈی پس کہتا ہے کہ در اصل میں ہی کیا، ساری انسانی نسل کسی ازلی گناہ سے داغ دار ہے، اور خدا کی رحمت کے سوا اُس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے، میں تو دُنیا سے بالکل کنارہ کش ہو گیا ہوں، اندھا ہونے کے بعد مجھے بصیرت حاصل ہوگئی ہے، اور خدا کا جلوہ نظر آنے لگا ہے۔ تے زیسے اُس کے نقطۂ نظر کا بڑا احترام کرتا ہے، مگر جواب دیتا ہے کہ اس معاملے میں مَیں تمہارا ہم خیال نہیں بن سکتا، میں تو اسی زمین کا فرزند ہوں، اور میرا تو خیال ہے کہ انسان چاہے ازلی گناہ گار ہو چاہے کچھ اور، بہر صورت اُسے وہی پتے کھیلنے ہیں جو اُس کے ہاتھ میں ہیں۔

اِس کے بعد تے زیسے اپنی کہانی یُوں ختم کرتا ہے "جب میں اپنی زندگی کا مقابلہ ای ڈی پ (انگریزی میں ای ڈی پس) کی زندگی سے کرتا

ہوں تو مجھے بڑا اطمینان ہوتا ہے۔ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ میں اپنے پیچھے شہر ایتھنز چھوڑے جا رہا ہوں۔ اپنے بیٹے اور اپنی بیوی سے بھی زیادہ مجھے اس شہر سے محبت رہی ہے۔ آخر میرا شہر بن گیا ہے، میرے بعد میری یاد ابد الآباد تک یہاں رہے گی۔ میں بڑے سکون کے ساتھ تنہائی میں اپنی موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو چکا ہوں۔ مجھے یہ سوچ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میرے بعد میرے وسیلے سے لوگ زیادہ آزادی سے، زیادہ خوشی سے اور زیادہ اچھے طریقے سے زندگی بسر کریں گے۔ آنے والی انسانیت کی بھلائی کے لئے میں نے اپنا کام پورا کیا ہے۔ میں واقعی جیا ہوں۔"

یہ ہیں الفاظ اس شخص کے جسے انفرادیت پرست، انسان دشمن اور ملعون کہا جاتا ہے، اور دن رات گالیاں دی جاتی ہیں۔ انسانی کوشش اور اجتماعی فلاح کے متعلق اس سے زیادہ صحت مند نقطۂ نظر اور کیا ہو سکتا ہے؟ تھیسے کو اسی قومی خدمت پر تو ناز ہے کہ یہ کام کسی دوسرے یونانی ہیرو سے نہیں ہوا۔ دوسرے اس بات پر کہ میں نے اپنا کام پورا کر دیا۔ اسی کتاب میں ژید نے دوزخ کی یہ تعریف کی ہے کہ وہاں ہر آدمی کو وہ کام بار بار کرنے پر مجبور کیا جائے گا جو اس نے دنیا میں ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ یعنی دوزخ کے معنی ہیں غیر مکمل شخصیت، اور جیسا کہ دانتے والی تعریف سے ظاہر ہے شخصیت کی تکمیل کے معنی شخصیت میں مقید ہو کے رہ جانے کے نہیں ہیں۔

چنانچہ اس کتاب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جن اقدار کو دوسرے فن کاروں کے ساتھ ساتھ ژید نے بھی متوسط طبقے کی اقدار سمجھ کر رد کر دیا تھا۔ اب انہیں پھر قبول کر لیا ہے، اور انہوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں کو اپنے دائرۂ نظر میں لے لیا ہے۔ چنانچہ ان کے خیال میں بہترین زندگی وہ ہے کہ فرد اپنی انفرادی شخصیت کی تکمیل کرے، مگر اس طرح کہ معاشرے کو بھی فائدہ پہنچے، اور آئندہ نسلیں بھی اس کی جد و جہد کے اثرات محسوس کریں۔ یہ ہے مکمل زندگی۔

اس معیار پر خود ژید کی زندگی پوری اترتی ہے۔ انہوں نے کئی نسلوں کی رہنمائی کی ہے، اور آئندہ بھی ان کا فیض بدستور جاری رہنے کی قوی امید ہے۔ ژید کا بھی شہر بن چکا ہے!

جہاں تک اس کتاب کے طرزِ تحریر کا تعلق ہے میں کچھ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کیونکہ جب تک فرانسیسی نثر کی کئی صدیوں کا رچا ہوا احساس نہ ہو، طرزِ تحریر کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مجھ تک کو اس کتاب میں ایک نئے ضبط اور وقار کا احساس ہوتا ہے جو اپنی زندگی کے مقصد کو مکمل ترین صورت میں پورا کر لینے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

ممکن ہے یہ کتاب کوئی بہت بڑا شاہکار نہ ہو، مگر ژید کے خیالات کی تاریخ اور ان کے نشو و نما کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنے سے پہلے اگر نقاد اس کتاب کو نہیں پڑھتا تو اس کی رائے بے مصرف ہوگی۔

سیّد نذیر حسین ناشاد

جشنِ برشگال

برسات میں پھر عیش منانے کے دن آئے — صد شکر کہ پھر پینے پلانے کے دن آئے
پھر ٹھنڈی ہواؤں نے طبیعت کو اُبھارا — پھر بولنے اور ہنسنے ہنسانے کے دن آئے
پھر ابر اُٹھا آنے لگیں ٹھنڈی ہوائیں — پھر شام و سحر لطف اُٹھانے کے دن آئے
پھر پڑنے لگیں مینہ کی پھواروں پہ پھواریں — آرام سے پھر سونے سُلانے کے دن آئے
پھر سبزہ و گل سے ہوئی آرائشِ گیتی — پھر حُسنِ فسونگر کے لبھانے کے دن آئے
پھر نکھرے حسینانِ چمن بادِ خنک سے — پھر عشوہ و انداز دکھانے کے دن آئے
آرائشیں ہونے لگیں پھر زُلفِ دوتا کی — پھر عطر میں کپڑوں کے بسانے کے دن آئے
پھر گُندھنے لگے پھولوں کے ہر باغ میں گجرے — معشوقوں کے پھر مہندی لگانے کے دن آئے
پھر آنکھوں میں پھرنے لگی تصویر کسی کی — عُشّاق کے پھر اشک بہانے کے دن آئے

پھر وحشتِ دل لے کے چلی شہر کے باہر
پھر عقل کے اور ہوش کے جانے کے دن آئے

جعفر طاہر

جھولا

برسات کی حسینہ، رقصاں ہے، گا رہی ہے
موسیقیِ حسیں کے دریا بہا رہی ہے
نوخیز ولولوں پر مستی سی چھا رہی ہے
بہکی ہوئی جوانی تانیں اڑا رہی ہے

سلمائے رنگ و نکہت دھومیں مچا رہی ہے
بستی کی شاہزادی جھولا جھلا رہی ہے

سرسبز کھیتیوں کے دامن لہک رہے ہیں
غنچے چٹک رہے ہیں پودے پھبک رہے ہیں
کونین کی جبیں کے سہرے مہک رہے ہیں
پگڈنڈیوں کے دھندلے چہرے چمک رہے ہیں

اک موجِ نور بن کر گردوں پہ چھا رہی ہے
بستی کی شاہزادی جھولا جھلا رہی ہے

ہے ساحتِ فلک پر طفلِ سحاب رقصاں
وادی کی وُسعتوں میں جوئے شراب رقصاں
زرتار گھونگھٹوں میں سو آفتاب رقصاں
سایوں میں پریوں کے حسن و شباب رقصاں

جنگل میں رُوپ رانی منگل منا رہی ہے
بستی کی شاہزادی جھولا جھلا رہی ہے

یہ نہر کا کنارہ، اشجار کی قطاریں
نشوں میں جھومتی ہیں شیریں ادا بہاریں
دل کے افق پہ ابھریں ماضی کی یادگاریں
سینے کو چیر نکلیں احساس کی کٹاریں

قلب و نظر کی دنیا پھر تھرتھرا رہی ہے
بستی کی شاہزادی جھولا جھلا رہی ہے

رہ رہ کے جھولتی ہے جھولے کے بازوؤں میں
بُندے اُلجھ رہے ہیں شب خیز گیسوؤں میں
ہے کس بلا کی طاقت ظالم کے زانوؤں میں
تلوار چل رہی ہے گردوں کے پہلوؤں میں

اک مست مورنی ہے جو اُڑتی جا رہی ہے
بستی کی شاہزادی جھولا جھلا رہی ہے

اللہ ری کسی کی چڑھتی ہوئی جوانی
بھادوں میں جس طرح ہو دریاؤں کی روانی
لہرا رہا ہے یوں ہی اُس کا لباس دھانی
ہے حورِ عدن کوئی یا مالوے کی رانی

سلطانۂ دکن یا پرچم اُڑا رہی ہے
بستی کی شاہزادی جھولا جھُلا رہی ہے

کیوں بکریاں چرانے چرواہے دُور جاتے
سائے میں شیشموں کے بیٹھے ہیں گیت گاتے
اُٹھ اُٹھ کے ناچتے ہیں پھولے نہیں سماتے
پاسِ ادب سے پھر بھی آنکھیں نہیں ملاتے

دُنیائے دل میں لیکن وہ حشر ڈھا رہی ہے
بستی کی شاہزادی جھولا جھُلا رہی ہے

کس نور کا الٰہی پرتو زمیں پہ ڈالا
یخ بستہ ظلمتوں پر لہرا گیا اُجالا
دشت و دمن میں ہر سو روشن چراغِ لالا
ابیرا سلام تجھ پر اے خلد کی غزالا

اندوہگیں جوانی تسکین پا رہی ہے
بستی کی شاہزادی جھولا جھُلا رہی ہے

صفیہ شمیم ملیح آبادی

برسات کی چاندنی رات

یہ برشکال کی برسی ہوئی سنہری رات — یہ بوئے حسن سے مہکی ہوئی سنہری رات
یہ چاندنی یہ فضائیں یہ وادیوں کی بہار — گماں یہ ہوتا ہے رہ رہ کے پڑ رہی ہے پھوار
یہ زرنگار مناظر، یہ جوشِ نکہت و نور — زمیں ہے وجد میں، طاری ہے آسماں پہ سرور
یہ شاخساروں کے نغمے یہ پتیوں کے ستار — بھڑک رہا ہے ہر اِک شے میں زندگی کا شرار
یہ گلشنوں میں چٹکتے ہوئے سبک غنچے — گل و سمن سے یہ مہکے ہوئے خنک جھونکے

یہ جوشِ حسن فروغِ بہار کیا کہنا
یہ چاندنی، یہ لبِ جوئبار کیا کہنا

یہ آسماں پہ ستاروں کی محفلِ تاباں — یہ رُوح بخش مناظر، یہ دل نواز سماں
جبینِ ناز ہے روشن عروسِ فطرت کی — ہوائیں آتی ہیں گلشن میں باغِ جنّت کی
نکھر رہا ہے ہر اِک رنگ زندگانی کا — سرِ حیات پہ ہے تاج شادمانی کا
یہ مُسکراتی ہوئی رات ہے نگارِ طرب — یہ گُل، یہ بوٹے، یہ گلشن ہیں بے قرارِ طرب

یہ کیف و سوز و سرورِ بہار کیا کہنا
یہ گیت گاتے ہوئے آبشار کیا کہنا

ترے بغیر مگر یہ بہار کچھ بھی نہیں
دلِ حزیں میں بجز انتشار کچھ بھی نہیں

سید فیاض محمود

صاحب بہادر

(ڈراما)

"پھول کانٹے" کے نام سے ونگ کمانڈر سید فیاض محمود کے افسانوں اور ڈراموں کا ایک نیا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے جو عنقریب چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ یہ تمام افسانے اس وقت تک غیر مطبوعہ تھے۔ لیکن ہم نے سید صاحب سے بہ اصرار مخزن میں ایک ڈرامے اور ایک افسانے کی اشاعت کی اجازت لے لی ہے۔ تمام افسانے اور ڈرامے تو ہماری نظر سے نہیں گزرے لیکن مجموعے کے نام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ہمارا خیال ہے کہ ہمارا منتخب کردہ افسانہ جو آئندہ مہینے چھپے گا پھول ہے اور یہ ڈراما کانٹا، لیکن اس کانٹے کی خلش صرف "صاحب بہادر" تک محدود ہے۔ ہمارے لئے اور لاکھوں دوسرے غیر صاحب بہادروں کے لئے یہ بھی پھول ہی ہے۔ اگر اسے پڑھ کر صاحب بہادروں کی وسیع نسل کے دو چار افراد بھی اپنی اصلاح پر مائل ہو گئے۔ تو سید صاحب کی محنت اور ہمارے انتخاب کا حق ادا ہو جائے گا ——— (مدیر)

صاحب نے اپنے کشادہ سینے کو اور بھی پھیلایا۔ کرسی کے بازوؤں کو اپنے ہاتھوں سے دبایا۔ اپنے تنگ ماتھے کو شکنوں سے سجا کر اپنے کلرک سے بولے "میاں تم سے کہا جو ہے کہ کر دیں گے"۔

"حضور آپ نے درست فرمایا! میں فقط اتنا عرض کرنا چاہتا تھا کہ آپ بڑے افسر ہیں۔ ہم سب لوگ آپ کی تعریف و توصیف میں ہر روز یہی بات دہراتے ہیں کہ آپ جو بھی وعدہ فرماتے ہیں۔ ضرور ہی پورا کر دیتے ہیں ....!"

"پھر!"

"حضور گزارش یہ ہے کہ شاید آپ کو موقع نہیں ملا کہ آپ پوری طرح میری بات سن لیں"۔

"نہیں نہیں ہمیں تمہارا سارا کیس معلوم ہے!"

"جی ہاں!"

"یہی بات ہے نا کہ تم چھٹی مانگتے ہو!"

"نہیں حضور چھٹی نہیں میں تو تبدیلی کے لئے حاضر ہوا تھا!"

"تبدیلی!"

"جی حضور!"

"تبدیلی!"

"جی غریب پرور!"

"تبدیلی!"

"جی بندہ نواز!"

"مگر ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"حضور میں نے دو ہفتے ہوئے درخواست دی تھی"۔

"تو ہمیں کیوں نہیں بتایا"۔

"حضور میں نے سررشتہ دار صاحب سے پوچھا ہے۔ وہ کہتے ہیں آپ کے سامنے پیش کر دی تھی!"

"جھوٹ بکتا ہے! بلاؤ کہاں ہے!"

"حضور وہ بھی افسر ہیں۔ میں تو گستاخی نہیں کر سکتا! آپ ہی گھنٹی بجا دیجئے!"

"ہاں ہاں!" (صاحب گھنٹی بجاتے ہیں اور چپراسی حاضر ہوتا ہے)

"دیکھو افضل صاحب کو بلاؤ"۔

"بہت خوب حضور!"

(صاحب بہادر نے اپنی چپٹی ناک کو اور بھی پھیلایا۔ اپنے موٹے موٹے ہونٹوں کو پہلے سکیڑا۔ پھر ڈھیلا چھوڑ کر اپنے دستِ مبارک سے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو انگشتِ شہادت اور اپنے خوش ساخت انگوٹھے سے ہلکے ہلکے دو جھٹکے دیئے۔ گھور گھور کر اپنے کلرک کے اوسان خطا کرتے رہے۔ اتنے میں بشیر تھرڈ کلرک صاحب نمودار ہوتے)

"افضل!"

"جی!"

"بھئی یہ کیا حرکت ہے؟"

"کیا بات ہے حضور؟"

"اس شخص کی عرضی تم نے کہیں غائب کر دی ہے؟"

"جناب عالی وُہ تو میں نے آپ کے کاغذات میں دس دن ہوئے پیش کردی تھی۔"

"پھر وُہ کہاں گئی؟"

"جناب والا وُہ میرے پاس تو واپس آئی نہیں!"

"تو کہاں جا سکتی ہے؟"

"دیکھتا ہوں آپ کی ٹرے میں!"

(بہت سی فائلوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ دس بندھے کھلے کاغذوں میں وہ درخواست بھی نکل آتی ہے)

"یہ رہی حضور!"

"یہ کہاں غائب ہو گئی تھی!"

"یہیں تھی حضور!"

"دیکھو افضل تم ہماری میز کے کاغذات خلط ملط کر دیتے ہو اچھا جاؤ۔"

(افضل چلا جاتا ہے اور صاحب نہایت توجہ کے ساتھ اس درخواست کو پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ پانچ سطریں پڑھ کر کلرک سے مخاطب ہوتے ہیں)

"کیا کہتے ہو؟"

"حضور سب کچھ اس درخواست میں عرض کر دیا ہے۔"

"ہاں ہاں مگر اپنی زبان سے بتاؤ۔ تم تبدیلی چاہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ بہت سے لوگ تبدیلی چاہتے ہیں۔ اگر ہر کسی کو تبدیل کر دیا جائے تو کام کیسے چلے؟"

"حضور میری بیوی بیمار ہے۔"

"ہاں ہاں وُہ تو ٹھیک ہے مگر کوئی معقول وجہ بتاؤ؟"

"بندہ پرور اس جگہ کی آب و ہوا اسے موافق نہیں آئی۔"

(اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو انگشت مبارک سے سہلاتے ہوئے)

"کیا کہا آب و ہوا کی تبدیلی چاہتے ہو؟"

"نہیں حضور یہاں وہ بیمار رہتی ہے۔"

"تو اس کا علاج کرواؤ!"

"غریب پرور بہت علاج کیا ہے۔"

"تو اور کراؤ۔ کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ کسی سپیشلسٹ کے پاس لے جاؤ (نہایت مشفقانہ لہجے میں) دیکھو میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں۔ اسے کسی سپیشلسٹ کو دکھاؤ۔ معمولی ڈاکٹروں کے علاج سے فائدہ نہیں ہوگا۔"

"بہت اچھا حضور!"

"تو تبدیلی کی اب ضرورت نہیں۔"

"حضور ہے؟"

"کیا؟ دیکھو (گھور کر) ہمارا وقت ضائع نہ کرو!"

"نہیں حضور ایک عرض ہے۔"

"کیا ہے جلدی کہو" (ایک دو کاغذوں کو دائیں طرف سے اٹھا کر بائیں طرف رکھتے ہوئے) "مجھے فرصت نہیں۔"

"حضور سیالکوٹ اگر میری تبدیلی ہو جائے تو وہاں میری سسرال ہے۔ وہاں میری بیوی کا علاج بہتر ہو سکے گا۔"

"دیکھو یہ کیا بکواس ہے! مجھے تمہارے گھر کے جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں!"

"نہیں حضور جھگڑا کوئی نہیں۔ عرض یہ ہے کہ وہاں میری سسرال ہے۔۔۔"

"کیا نامعقول وجہ ہے! جاؤ میرا دماغ مت چاٹو۔"

(عرضی اسے واپس دیتا ہے)

"حضور میرے پاس روپے نہیں کہ اس کا علاج کروا سکوں۔۔"

"تو اس کو اس کے گھر بھیج دو۔ تمہارا خرچ گھٹ جائے گا!"

"حضور چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔۔۔"

"دیکھو یہ کوئی وجہ نہیں! میں تم پہ کوئی ظلم نہیں کر رہا۔ سیدھی سی بات ہے یا تم مجھے قائل کر لو۔ یا میری بات مان لو۔ میرا تو یہی اصول ہے۔ ماتحتوں پہ سختی نہیں کرتا۔ میں نے تمہیں تمہاری مشکلات کا حل بتا دیا ہے۔ اب تم جانو تمہارا کام!"

"بندہ پرور یہاں میرا گزارا نہیں ہو سکتا۔ وہاں مجھے کچھ مدد مل سکے گی۔"

"مگر میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ واللہ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ قسم ہے کلام پاک کی میں اپنے ماتحتوں کا خاص خیال رکھتا ہوں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے ماتحتوں کی مدد نہیں کرتا۔ مگر مجھے کوئی معقول وجہ بتاؤ۔"

"حضور میں نے کبھی کوئی درخواست نہیں دی۔"

"ہاں ہاں وہ ٹھیک ہے مگر اس طرح تبدیلی نہیں ہو سکتی۔"

"حضور میں تین سال سے یہاں ہوں۔ صبح سے شام تک کام کرتا ہوں۔"

"تو اپنا کام وقت پر کیوں نہیں ختم کرتے؟"

"حضور آپ ہی کا ٹائپسٹ ہوں۔ آپ کے ذاتی خطوط ہی اتنے ہوتے ہیں۔۔۔"

(کاغذات اٹھا کر پڑھتے ہوئے) "ہاں ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تمہارے کام پہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر دیکھو پھر شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"مگر حضور میں تو کچھ اور عرض کر رہا تھا۔"

"(پڑھتے ہوئے) ہوں ہوں!"

"حضور میں نے عرض کیا کہ میرا چھوٹا بچہ بھی بہت بیمار رہتا ہے اس کی ماں اس کا خیال نہیں رکھ سکتی!"

"کیا کہا؟"

"حضور چھوٹا بچہ بھی اب بیمار رہتا ہے۔"

"تو اس کو ہسپتال لے جاؤ۔"

"حضور فرصت نہیں ملتی۔ شام کو یہاں سے جاتا ہوں۔ اگر تبدیلی ہو جائے تو سیالکوٹ میں۔۔۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے میں غور کروں گا۔"

"تو حضور میں یہ عرضی یہیں چھوڑ جاؤں۔ آپ سفارش کر دیں تو کام ہو جائے گا۔"

"ہاں ہاں اب جاؤ۔ میں کر دوں گا۔ میں کر دوں گا!" (کاغذات الٹنے پلٹنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ایک دو فائلوں کو اٹھا کر صاحب بہادر دیکھتے ہیں۔ کسی کا ایک صفحہ پڑھتے ہیں اور کسی کا نصف، کسی کی چار سطریں! اتنا کام کرنے پر تھک جاتے ہیں۔ گھنٹی بجتی ہے۔ چپراسی آتا ہے)

"چاء لاؤ"

"بہت اچھا حضور!"

(صاحب بہادر کرسی پر سے اُٹھ کر اپنے دفتر کے قالین پر ادھر سے اُدھر پھرتے ہیں۔ سینہ کسا ہوا ہے۔ ورزشی جسم ہے۔ پیٹ قد سے بڑھا ہوا ہے۔ سینہ تان تان کے چلتے ہیں۔ اتنے میں افضل ان کا سررشتہ دار کچھ کاغذات لئے داخل ہوتا ہے۔ وہ باہر جانے والے خانے میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ وہاں کچھ نہیں ہوتا۔ داخلہ کے خانہ میں فائلوں کا پلندہ پڑا ہے۔ صاحب بہادر فرماتے ہیں:-)

"افضل بھئی۔ آج کام بہت کیا ہے دماغ تھک گیا ہے"۔

"جی! آپ کا کام بہت بڑھ گیا ہے"۔

"ہوں م۔ ہوں م!"

"جناب وہ عرضی اس کلرک کی آپ نے دیکھی؟"

"(چونک کر) کونسی!"

"جناب عالی وہ کلرک جسے آپ نے صبح بلایا تھا!"

"کیا کہتا تھا؟"

"حضور وہ تبدیلی کے لئے کہتا تھا"

"کیوں؟"

"شاید اس کی بیوی بیمار ہے"۔

"تو اس کا علاج کروائے۔ تبدیلی بھی کوئی نسخہ ہے!"

"مگر حضور وہ پریشان ہے"۔

"دیکھو افضل مت میرا دماغ چاٹو۔ مجھے بہت کام ہے۔ کہاں ہے وہ چپراسی کم بخت چائے نہیں لایا۔ دماغ تھک گیا!"

"تو حضور کیا کہوں اس سے"۔

"کس سے؟"

"اسی کلرک سے؟"

"کیا مانگتا ہے؟ ان کلرکوں نے دماغ خراب کر دیا۔ کہہ دو اس وقت چھٹی نہیں مل سکتی۔ کام زیادہ ہے۔ پاکستان کو چھٹی دے دے کر مضبوط نہیں بنایا جا سکتا۔ جی توڑ کر کام کرنے سے ہمارا ملک سنور سکتا ہے۔ کام سے! کہہ دو اُس سے کام ٹھیک کریگا تو چھٹی دے دیں گے"۔

"مگر۔۔۔"

"افضل!"

"جی"

"مت چاٹو میرا دماغ۔ جاؤ جلدی چائے بھیجو۔۔۔"

بزمِ تغزّل

نشور جالندھری

یہ خواب ہے مرے اللہ! یا حقیقت ہے
مجھے تو اُن سے۔ اُنہیں غیر سے محبت ہے

مزاج پوچھنے والے سے عرض کر دینا
حضور خوش رہیں، اچھا ہوں میں عنایت ہے

کسی کو پاس بُلائے۔ کسی سے پردہ کرے
خدا ہی جانے۔ یہ کیا دوست کی طبیعت ہے

وُہ آئے، بیٹھے بھی، باتیں بھی کیں چلے بھی گئے
میں بے خودی سے نہ چونکا، مقامِ حیرت ہے

لبِ نگاہ سے کہدے کوئی: "ہم آئیں گے"
میں انتظار کروں عمر بھر۔ یہ حسرت ہے

پیامِ وصل تمنا کو ہے پیامِ اجل
جو زندگی کی ہے روحِ رواں۔ وُہ فرقت ہے

جو سر جھکا درِ محبوب پر تو پھر نہ اُٹھا
بلاکشانِ محبت کی یہ عبادت ہے

یہ خاک واں ہو۔ کہ اِس خاک داں سے دُور کہیں
جہاں بھی تجھ سے ملاقات ہو۔ وُہ جنت ہے

اگر تو خوش ہو۔ تو دونوں جہاں مجھے محبوب
اگر تو خوش نہیں۔ دونوں جہاں سے نفرت ہے

نظر ہے جانبِ در۔ لب پہ نام ہے تیرا
کسی سے کہہ دو۔ یہ بیمارِ غم کی حالت ہے

یہ بے مقام سفر یُوں نہ ہو گا طے نشترؔا
طنابِ منزل اِدھر کھینچ لے جو ہمت ہے

جیمنی سرشار

ہوش میں ہیں؟ ہو گئے یا ہوش سے بیگانہ ہم؟
یُوں بھری محفل میں کہتے ہیں ترا افسانہ ہم!

ہر کس و ناکس سے کہہ کر عشق کا افسانہ ہم
ہو گئے رسوا زمانے میں دلِ دیوانہ ہم

خاک ہوتے آشنائے کوچۂ جانانہ ہم
تھے اسیرِ امتیازِ کعبہ و بُت خانہ ہم

آرزو مندِ شراب و شیشہ و پیمانہ ہم؟
مستِ خونابِ جگر ہیں ساقیِ میخانہ ہم

تا درِ جانانہ آتے آتے ہمت ہار دی
لطف تو جب تھا پہنچتے تا دلِ جانانہ ہم

اللہ اللہ! انتقامِ انقلابِ روزگار
رزق بخشِ دہر ہیں، محتاجِ دانہ دانہ ہم

تیرے میخانے میں آ کر شکوۂ تشنہ لبی
کرنے والے ہم ہی تھے اے ساقیِ میخانہ ہم

جانِ جاں! تُو نے ہماری ہوشیاری دیکھ لی؟
ایک عالم کو بنا لاتے ترا دیوانہ ہم

ہم کو ہوتی گر نہ اُمیدِ حیاتِ جاوداں
یُوں نکل آتے نہ مرنے کو بیتابانہ ہم

آؤ اب آپس میں مل جُل کر گذاریں زندگی
یوں بہم نفرت بڑھا کر آپ ہوں رُسوا نہ ہم

پھر کریں سرشارؔ تازہ قصّۂ دار و رسن
پھر اناالحق کا لگائیں نعرۂ مستانہ ہم

مِس نکہت رعنا

رند کیا اُٹھ کے گئے لُٹ گئے میخانے بھی
خُم گئے جام گئے اور گئے پیمانے بھی
وہ مری لاش پہ آئیں دلِ ناداں کیونکر
شمعِ مردہ پہ نہ آئے کبھی پروانے بھی
لے کے جائیں گے کہاں عالمِ وحشت سے مجھے
بھاگتے آئیں گے پیچھے میرے ویرانے بھی
ہوش والے تو بھلا ایسے کہاں کے ہشیار
اب کے سمجھے نہ مری بات کو دیوانے بھی
اللہ اللہ وُہ جنوں خیز نگاہیں نکہت
آ گئے نعرۂ مستانہ پہ فرزانے بھی

سیّد جابر علی

چراغِ حسن مرے غمکدہ میں جلتا ہے
سرشکِ غم جو مژہ پر کبھی مچلتا ہے
ہر اک ادا کو مرے ذوقِ دید کی ہے تلاش
مری نگاہ کے سانچے میں حُسن ڈھلتا ہے
کراہتی ہیں ہوائیں، فضائیں روتی ہیں
یہ کون ہے جو زمانے کا دل مسلتا ہے
کبھی نشاط و مسرّت گراں گذرتے ہیں
کبھی فسونِ اذیت سے دل بہلتا ہے
کوئی بھی صورتِ تسکینِ اضطراب نہیں
سنبھالنے سے یہ دل اور بھی مچلتا ہے
مری نظر سے ہم آہنگ ہے یہ دردِ جہاں
مرے بدلنے سے سارا جہاں بدلتا ہے

ضمیر اظہر

دیدہ و دل جو غمِ عشق پہ غالب رہتے
ہم نہ تم سے کبھی رُودادِ محبت کہتے
بارہا تیرے مہِ حُسن سے کھیلا ہُوں میں دوست
بحرِ احساس کی امواج میں بہتے بہتے
تُو لطافت کا وُہ افسانۂ شیریں ہے جسے
لُطف لیتی ہے زباں شوق سے کہتے کہتے
دیرپا کچھ تو بھلا حسنِ بہاراں ہوتا
سلسلے دید کے کچھ دیر تو قائم رہتے
اتنی فرصت ہی نہ دی گردشِ دوراں نے مجھے
ورنہ کچھ تم سے بھی ہم حالِ پریشاں کہتے
ہو گئی ہے غمِ دُنیا سے بھی اُلفت اظہرؔ
اب یہ حالت ہوئی غمِ عشق کا سہتے سہتے

اختر انصاری اکبرآبادی

میری نگاہِ شوق ہے جلوۂ حسرتِ خموش
دل کو بھی غم بنا دیا ہائے رے دل کے غم کا جوش
ان کا نقاب اُٹھ گیا جلوۂ تابناک سے
حُسن ہے مائلِ کرم عشق کو جب نہیں ہے ہوش
شمع خموش، وُہ خموش، مرگِ دل و پتنگ سے
آج ہے اُن کی بزم میں محشرِ ماتمِ خموش
شام کی دلفریبیاں جام و سبو میں غرق تھیں
آہ یہ صبحِ انجمن، وہم ہے دورِ نائے و نوش
فیضِ ہوائے ناز سے عشق ہے کائنات میں
دشت بہ دشت جلوہ گر موجۂ خاکِ دل بدوش
آپ کا نقشِ پا ہے اب ہوشِ جبین و سر نہیں
یاد ہے وُہ بھی دور جب سر تھا مرا وبالِ دوش

اختر پاکباز بھی مست ہے کیف و رنگ میں
بزم میں وُہ نگاہ ہے کیف طرازِ مے فروش

شاکر عروجی

آنکھوں میں سرشکوں کا سیلاب اُتر آیا،
یہ کس نے توجہ کی، دل درد سے بھر آیا
تھا ذکرِ جمیل اُن کا — یا نامِ خدا کوئی
ہونٹوں پہ دُعا بن کر جو شام و سحر آیا
اپنے رُخِ زیبا سے خود اُس نے نقاب اُلٹا
اے شوقِ نظر مژدہ! مطلب ترا بر آیا
دیکھا جو اُنہیں آتے تو رُک گئے آنسو بھی
رُوپوش ہوئے تارے جب چاند نظر آیا
مچلا ہوا دل لے کر اس کوچے سے نکلا تھا
سہمی ہوئی جاں لے کر پھر بارِ دگر آیا
شایانِ درِ جاناں نذرانہ تو لے جاؤں
اے موت ذرا مہلت کچھ دیر ٹھہر! "آیا"
رستے کی نزاکت بھی، منزل کا تقاضا تھا
موقع نہ دیا میں نے گو ملنے خضر آیا
دُنیا سے ہم اے شاکرؔ ہنستے ہوئے جائیں گے
پیغامِ قضا بن کر جب وقتِ سفر آیا

نذیر خاور

کمی ہونے نہ دی ساقی پرستی میں کبھی میں نے
نصیحت ناصحِ ناداں کی دونوں وقت پی میں نے
بسر کرنے کو کی، کوچے میں اُن کے زندگی میں نے
خدا شاہد بہت محسوس کی دل کی کمی میں نے
مری پُر اشک آنکھیں پھر مری پُر اشک آنکھیں ہیں
ہنسی آتی ہوئی لب پر کسی کے چھین لی میں نے
دلِ پُر آرزو اور سوزِ پنہاں کی یہ پہنائی
بھرے گھر کو آپ اپنے ہاتھ سے خود آگ دی میں نے
چمک کر برق نکلی ابر سے جس وقت، یاد آیا
کہیں دیکھی تھی اک ہنستی ہوئی صورت کبھی میں نے
کوئی محرم نہیں خاورؔ ستم ہائے محبت کا
کہی دل نے سُنی میں نے سُنی دل نے کہی میں نے

باقر رضوی

جس کسی کے دل میں دائم تشنگی ہوتی نہیں
زندگی اُس کی مکمل زندگی ہوتی نہیں
ایسی وحشت ناک تاریکی کا آخر کیا علاج
دل میں شمعِ حُسن سے بھی روشنی ہوتی نہیں
واقفیت جستجو کی اور بھڑکاتی ہے پیاس
باعثِ تسکینِ خاطر آگہی ہوتی نہیں
زردیٔ رشئے دو عالم کا کھنچا آتا ہے عکس
وقتِ یادِ روئے روشن چاندنی ہوتی نہیں
عشق کرتا ہے حدیثِ دوست میں بھی قیل و قال
حُسن کی پہلی سی وہ پیغمبری ہوتی نہیں

شوکت اللہ اہدی

میری صورت میں نمایاں ان کی صورت دیکھنا
دیکھنا اہلِ نظر! جذبِ محبت دیکھنا
اپنی صورت میں انہیں پھر دیکھنے کا قصد ہے
دیکھنے والو! مرا معیارِ حسرت دیکھنا
وُہ ہنسے اظہارِ غم پر میں یہ سمجھا خوش ہوئے
اِن جفاؤں پر مرا حُسنِ عقیدت دیکھنا
غیر سے کہتے ہیں شوکتؔ اُس کی حالت پُوچھنا
یہ ستم آمیز! اظہارِ محبت دیکھنا

جگن ناتھ آزاد کا مجموعۂ کلام

پنجاب کے نامور شاعر جگن ناتھ آزاد کا تازہ مجموعۂ کلام دہلی میں زیرِ طبع ہے۔ اشاعت سے قبل انہوں نے اس مجموعے کے اجزاء مطالعے کے لئے ہمیں مرحمت فرمائے ہیں مگر ہمیں مناسب معلوم ہوا کہ اس مطالعے میں ہم قارئینِ مخزن کو بھی شریک کریں۔ ان سطور کا مقصد نہ تنقید ہے نہ تعارف۔ کیونکہ اردو کے کہنہ مشق شاعر اور مخزن کے قدیم کرمفرما حضرتِ محروم مدظلہ کے فرزندِ ارجمند جگن ناتھ آزاد اردو ادب کے شناساؤں کے لئے کچھ اجنبی نہیں اور خود قارئینِ مخزن ان صفحات میں اس سے قبل بھی اُن کے بعض بلند پایہ منظومات ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس لئے یہ صفحات آپ کو کسی نئے شاعر سے نہیں بلکہ محض ایک نئے مجموعۂ کلام سے روشناس کریں گے۔

اس مجموعے کی افتتاحی غزل تو وہی ہے۔ جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے عنوان سے مخزن میں بھی چھپ چکی ہے:۔

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری ذرا دیکھو تو اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

لیکن اس کے علاوہ بھی جو نظمیں اور غزلیں اس مجموعے میں ہیں۔ اُن میں جابجا ہنگامۂ ۴۷ء کے تاثرات ملتے ہیں۔

آزاد کا مولد و منشا پاکستان ہے۔ مگر آزادی کے بعد جو طوفانِ بے تمیزی برپا کیا گیا۔ وہ ان کو بھی لاکھوں دوسرے ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرح اپنے وطنِ مالوف سے اُٹھا کر ایک دوسری سرزمین میں لے گیا۔ آزاد کے ذکی الحس دل نے وطن کی جدائی کو قدرتاً بہت محسوس کیا ہے اور اُن کے کلام میں اب بیشتر اُسی آزادی کا ماتم نظر آتا ہے جس کے انتظار میں انہوں نے اپنی نوجوانی کے سیکڑوں مضطرب روز و شب گزارے تھے۔ صبحِ آزادی طلوع ہو چکی ہے۔ لیکن غریب الوطن شاعر نوحہ خوانی پر مجبور ہے:۔

خیال تھا کہ صبحِ نو اُفق پہ جگمگائے گی
ہر اک بلند و پست پر نشاط بن کے چھائے گی
قریب و دُور تک ردائے نور پھیل جائے گی
فلک بھی مسکرائے گا، زمیں بھی مسکرائے گی
کچھ اپنا رنگ اس طرح یہ صبحِ نو جمائے گی

خیال تھا کہ ظلمتوں سے ہم رہائی پائیں گے
خیال تھا کہ اپنے گھر کا اپنا گھر بنائیں گے
خیال تھا کہ مل کے جشنِ دورِ نو منائیں گے
خیال تھا کہ زندگی نجاتِ غم سے پائے گی
خوشی کے ایک بحرِ بیکراں میں ڈوب جائے گی

خبر نہ تھی بہار جس کی آرزو چمن کو ہے
بہار جس کی جستجو چمن کے بانکپن کو ہے
بہار جس کا انتظار سنبل و سمن کو ہے
جب آئے گی تو موجِ زہرناک ساتھ لائے گی
خزاں کی طرح آئے گی چمن میں پھیل جائے گی

آزادؔ کے لئے غریب الوطنی کا درد اس وجہ سے اور بھی شدید ہوگیا ہے کہ سرزمینِ پاکستان سے محض ان کا مادی تعلق ہی نہیں، روحانی تعلق بھی ہے۔ وہ اُسی تہذیب و تمدن سے وابستہ ہیں جسے ہند سے جلاوطن کر کے اب پاکستان تک محدود کر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آزادؔ کی زبان، اُن کی ادبی روایات، اُن کی طرزِ فکر، اُن کے پسندیدہ ادبا و شعرا سب کے سب اب صرف پاکستان کو سونپے جا رہے ہیں۔ انہوں نے ایک دفعہ اپنی محبوب زبان اُردو کے متعلق یہ پُرامید شعر کہا تھا ؎

نکتہیں یہ کہتی ہیں، لالہ زارِ اُردو میں پھر بہار پیدا ہے
حیف باغبانوں پر اس چمن میں اے آزادؔ اب اگر خزاں پہنچے

آزادؔ کی اس اُمید کا یہ حشر ہُوا کہ اگرچہ وُہ خود یوں تو اردو کے گھر (دہلی) جا پہنچے۔ لیکن اُردو وہاں سے مہاجر بنا کر نکال دی گئی اور ان کا نیا وطن اُن کے لئے بالکل اجنبی بن کر رہ گیا۔ اس حالت میں نئے وطن سے کوئی سمجھوتا کرنا اُن کے لئے اور زیادہ مشکل تھا۔ چنانچہ ایک ناکام کوشش کے بعد بے اختیار اُن کی زبان سے یہ شعر نکل گیا ؎

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا
نئی محفل کو ہم اپنا بنائیں بھی تو کیا ہوگا

نئے وطن میں اُنہیں کوئی پُرانا محرم نہیں ملتا ؎

چمن بدلا چمن کا رنگ بدلا باغباں بدلے
یہاں اب ہم پُرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہوگا

نئے وطن میں اُن کے خونِ جگر کے لعل و گہر کے قدرداں مفقود ہو چکے ہیں ؎

جہاں ہر سنگ پارے کو گہر کی شان حاصل ہو — نوادر ہم وہاں جا کر لٹائیں بھی تو کیا ہوگا
خرد دُشمن جہالت آفریں ماحول میں اے دل — ترانے ہم تمدن کے جو گائیں بھی تو کیا ہوگا
جنہیں ذوقِ نظر بخشا گیا تھا ہو چکے رخصت — ہم اب تارے فلک کے توڑ لائیں بھی تو کیا ہوگا
تجلّی کا اب اس ماحول میں طالب نہیں کوئی — اندھیری رات میں ہم جگمگائیں بھی تو کیا ہوگا

اس مایوسی میں اُنہیں پُرانے وطن کی یاد ستاتی ہے اور وُہ دردآمیز حیرت سے سوچتے ہیں کہ فراقِ وطن میں جب میرا یہ حال ہے تو میرے

بغیر میرے وطن کی بہار کا کیا حال ہوا ہوگا ؎

کس طرح کر سکو گے بہاروں کو مطمئن
اہلِ چمن جو میں بھی چمن میں نہ آ سکوں

پھر اپنی بیکسی اور مجبوری پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور اہلِ وطن کو یاد کر کے رہ جاتے ہیں ؎

اس بزم میں جہاں نہ علم ہے نہ ہے قلیل
میرا قصور کیا جو ترانے نہ گا سکوں

ہم نے ابھی کہا تھا کہ آزاد کا روحانی تعلق اُسی تہذیب وتمدن اور انہیں ادبی روایات سے ہے جو اب صرف پاکستان کا حصّہ سمجھی جاتی ہیں آزاد کے متعلق ہمارے اس قول کی صحت کا سب سے بڑا ثبوت علامہ اقبال رح سے آزاد کی بے پناہ عقیدت سے ملتا ہے سفرماتے ہیں؛

وُہ حق شناس فلسفی وہ مردِ نکتہ داں   وُہ باکمال شاعر و درویشِ پاکباز
نغمے تھے جس سخنورِ عالی دماغ کے   مشرق میں دلپذیر تو مغرب میں جاں نواز

اقبال اے جہانِ معانی کے تاجدار   اے رومی و سنائی و غالب کی یادگار

تُو نے سخن کو زندۂ جاوید کر دیا   تیرے نفس نے دی چمنِ شعر کو بہار

گو زیرِ خاک کالبدِ خاک آ گیا   تو رُوح بن کے عالمِ جاں میں سما گیا

اس دور میں تو آگہِ رازِ قدیم تھا   جو ہو حریفِ جلوۂ حق وُہ کلیم تھا

"آزاد و اقبال" کے عنوان سے اُن کے چند شعر اور اس مجموعے میں دیکھئے۔ وُہ علامہ اقبال کو اپنا روحانی رہنما بھی تسلیم کرتے ہیں۔ شعر یہ ہیں:-

آزاد و اقبال

آزاد: ذلیل و خوار ہیں اہلِ ہنر کیوں
جہاں نا قدرداں ہے اس قدر کیوں
جو کوسوں دُور ہیں علم و ہنر سے
وہی ہیں صاحبِ لعل و گہر کیوں

اقبال: قماش و نقدہ و لعل و گہر چیست
غلام خوش گِل و زرّیں کمر چیست
چو یزداں از دو گیتی بے نیاز ند
دگر سرمایۂ اہلِ ہُنر چیست

آزادی کے بعد آزاد نے جس درد و غم کا اظہار کیا ہے۔ اُس کے اسباب ظاہر ہیں۔ پھر اُن کے درد و غم میں ایک پاکیزگی اور خلوص بھی ہے۔ لیکن ہمیں آگاہ رہنا چاہئے کہ آزادی کے بعد بعض نفاق انگیز لوگوں نے بلا وجہ بھی بیقراری اور زارنالی کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ اگر گمراہ لوگوں سے شرمناک جرائم سرزد ہوئے ہیں تو اس میں آزادی پر یا آزادی کے لئے جہاد کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں آتا۔ نہ محض نالۂ ماتم کی صدائیں بلند کرکے ہمارے ادباء اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ ادباء کا فرض تو یہ ہے کہ وُہ عام انسانوں کے لئے مشعلِ ہدایت بن کر انہیں اعلےٰ انسانیت اور بہتر مستقبل کی طرف لے جائیں۔ خود آزاد کو ایسے گمراہ کن شعر و ادب کے کھوکھلے پن کا احساس ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

افکار سے انساں کی بقا بھی ہے فنا بھی
فانی ہیں جو افکار ترے تو بھی ہے فانی
جس نظم میں موجود نہ فردا کی تڑپ ہو
وُہ نظم ہے آزاد فقط مرثیہ خوانی

فی الحقیقت اب ہمیں مرثیہ خوانی کے ہنگامے کو اب طول نہ دینا چاہئے۔ شعراء اور ادباء کو لازم ہے کہ وُہ عوام کے مضطرب جذبات کو تسکین دے کر انہیں بہتر زندگی کی تعمیر کی طرف مائل کریں۔ جن لوگوں کے دل میں انگریز نے متحدہ ہند کا شہنشاہانہ تصور پیدا کرکے اُنہیں ناحق نعل در آتش کر دیا تھا۔ انہیں بھی عدل و انصاف کے تقاضوں سے آگاہ کرکے اُن کے جذبات کو آسودہ کرنا ضروری ہے۔ اردو کے شاعروں کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وُہ ایسے لوگوں کو سمجھائیں کہ اگر اردو زبان اردو تہذیب اور اردو تمدن والوں کو اردو ادب اور اردو تہذیب و تمدن کو زندہ اور محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے تو اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تمہیں اُردو والوں سے درحقیقت محبت ہے تو تم اب اس بے غرض محبت کا پہلے سے بہتر ثبوت مہیا کر سکتے ہو۔ انسانوں کو بانٹنے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے اردو والوں کی خود اختیاری کو ناحق اپنی حق تلفی قرار دے کر ہنگامہ و فساد کھڑا کر دیا اور پھر انتقام اور انتقام در انتقام کی آگ کو بھڑکایا۔ پاکستان و ہند کے شعراء و ادباء کو چاہئے کہ وُہ عوام کو عدل و انصاف کے احترام پر مائل کریں۔ جغرافی تسلط ایک ہونے کا ذریعہ نہیں بلکہ نفاق اور دوئی کا سب سے بڑا محرک ہے۔ ایک ہونے کے لئے محض دلوں کا متحد ہونا ضروری ہے۔ اگر اہلِ ہند اہلِ پاکستان سے محبت کرنا سیکھ لیں تو ناممکن ہے کہ پاکستان ہندوستان سے محبت نہ کرے۔ محبت کا جادو دو سلطنتوں کو الگ الگ بنتے ہوئے بھی باہم اتنا متحد رکھ سکتا ہے کہ کشور کشائی کا کوئی بڑے سے بڑا گُر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ادباء و شعرائے ہند و پاک کو چاہئے کہ وُہ اپنے اپنے عوام کے دل میں دوسرے ملک کے عوام کے لئے محبت پیدا کریں تاکہ وُہ جگن ناتھ آزاد کے ہم زبان ہو کر صحیح معنوں میں گمراہوں اور مفسد پردازوں پر اپنی فتح کا یوں اعلان کر سکیں ؎

انسانوں کو بانٹنے والو چال تم اپنی ہار گئے
دل کے ارادے یہ کہتے ہیں بٹ کر بھی ہم ایک ہوئے

مدیر

نظر حیدرآبادی

نقشِ آخر

ایک عرصۂ دراز کے بعد آپ کا اسمِ گرامی "مخزن" میں بحیثیتِ مدیر نظر آیا اور نظروں کے سامنے سے "ہمایوں" کے بہت سے پچھلے پرچے گزر گئے اور دل بے اختیار چاہنے لگا کہ ایک دیرینہ کرم فرما سے "تجدیدِ ملاقات" کی جائے۔ خط و کتابت بھی تو نصف ملاقات ہی ہوتی ہے۔ "ہمایوں" سے آپ علیحدہ ہوئے اور مجھ سے بھی وہ "محفل" چھوٹی! معلوم نہیں۔ پھر اس تمام عرصے میں آپ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ اتنا تو میں نے بھی سُنا تھا۔ کہ آپ دلی ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے تھے اور اس کے بعد ممکن ہے کہ اگست کے خونیں انقلاب نے آپ سے بھی دلی چھڑا دی ہو۔ اور یہ اچھا ہی ہوا۔ اس لئے کہ آپ اپنے وطن لوٹ آئے۔ لیکن میری طرح لاکھوں بدنصیب ایسے بھی ہیں۔ جنہیں اپنا محبوب وطن چھوڑنا پڑا۔ حالی کا ایک شعر ہے ؎

جان جب تک نہ ہو بدن سے جُدا　　کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جُدا

لیکن شاید حالی کی یہ دعا قبول نہ ہو سکی اور اسی لئے دشمن کا تو کیا ذکر۔ یہاں اپنوں نے گھر سے بے گھر کر دیا۔ مجھے حب الوطنی کی سزا میں اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دکن کی شاداب سرزمین شاید میں زندگی بھر نہ دیکھ سکوں گا۔ یہ دکھڑا میں آپ کو اس لئے سنا رہا ہوں کہ آپ غریب الوطنی کے دُکھ سے آشنا ہیں۔ کیا قہرِ خداوندی ہے کہ میں کراچی کی شدید گرمی سے دم گھٹا دینے والی فضاؤں میں سانس لے رہا ہوں اور میرے وطن میں اس وقت برسات دُھومیں مچا رہی ہوگی۔ اب قسمت کا شکوہ کیا کروں۔ زندگی کے دن بہرحال پورے کرنے ہی ہیں۔ دعا کیجئے کہ ہمت ٹوٹنے نہ پائے۔ پچھلے چھ سات مہینے میں کیا کچھ گزر گئی اس کا ایک ہلکا سا خاکا آپ کو "نقشِ آخر" میں نظر آئے گا۔ یہ نئی نظم "مخزن" کے لئے پیش ہے۔

نظر

عالمِ احساس پر طاری ہے اک پُرہول رات　　رات جس نے پھونک ڈالا گلستانِ شش جہات
ایک گورستان بنتی جا رہی ہے کائنات　　بادلوں کی گھن گرج ہے بجلیوں کے حادثات

ڈوبا جاتا ہوں، کنارے بھی نظر آتے نہیں
کیا اندھیرا ہے ستارے بھی نظر آتے نہیں

گھِر گیا ہُوں اس طرح آلام کی منجدھار میں مُردنی سی مُردنی ہے ہمتِ پیکار میں
ایک نالہ سا سِسکتا ہے لبِ گفتار میں ایک آنسو رہ گیا ہے چشمِ دریا بار میں!

لاؤ اب اس کو بھی نذرِ موجِ طوفاں کر ہی دوں
چشمِ یزداں، نظمِ دوراں کو پشیماں کر ہی دوں!

ایک ٹوٹی ناؤ میں ہر موجِ غم سے بے خبر وقت کے ہمراہ اک اُلجھی ہُوئی سی آس پر
کب تک اک بے نام منزل کی طرف گرمِ سفر میرا دل، میری تمنّائیں، مرا ذوقِ نظر!

ٹھہر اے دل، اے مرے ہمراز، رونے دے مجھے
جسم و جاں میں آخری نشتر چبھونے دے مجھے!

میرا رونا کیا ہے، وہ نغمے، بھلانا ہے جنہیں آج اس بحرِ الم میں ڈوب جانا ہے جنہیں
حلقۂ موج و تلاطم میں بسانا ہے جنہیں آج گا لوں پھر نہ خود مجھ کو بھی گانا ہے جنہیں

جانے کن ہونٹوں پہ لہرائیں گے میرے زمزمے
موت کے قدموں کی آہٹ سُن رہا ہوں دیر سے!

امین الرحمٰن

صبحِ کاذب —— صبحِ صادق

(ڈراما)

کردار

(جس ترتیب سے ظاہر ہوتے ہیں)

نوشابہ :- بیس برس کی ایک لڑکی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے کبیدہ خاطر ہو جانے والی۔

فرحت :- نوشابہ کی ایک سہیلی۔ اُس کی ہم عمر۔ نیچر سے دلچسپی لینا اس کی طبیعت کا خاصا ہے اور مزاج میں سنجیدگی۔

طاہرہ :- نوشابہ کی خالہ زاد بہن۔ پندرہ سولہ برس کے قریب عمر۔ شوخ اور الھڑ۔

نوشابہ کی ماں :- ادھیڑ عمر کی عورت۔

رقیہ :- نوشابہ کی بھابی۔ تیس برس کے قریب عمر ہے۔

صفیہ :- نوشابہ کی بڑی بہن۔ جذباتی قسم کی لڑکی۔

منظر :- نوشابہ کے کمرے میں۔ رات کا آخری پہر۔

[چھوٹا سا کمرہ جس کے دائیں بائیں دو دروازے ہیں۔ جن پر پردے پڑے ہیں۔ اور جو گھر کے اندر کی طرف کھلتے ہیں۔ کمرے کی سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی ہے جس کے پٹ بند ہیں۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے رات کی تاریکی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نوشابہ گاؤ تکیے کا سہارا لیے چپ چاپ قالین پر بیٹھی ہے۔ چہرے پر اداسی چھائی ہے۔ پاس ہی اُس کی سہیلی فرحت بھی خاموش بیٹھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دونوں کسی گہرے سوچ میں ہیں۔ گھر کے اندر سے کبھی کبھی ڈھولک بجانے اور اس کے ساتھ ہی چار پانچ لڑکیوں کے گانے کی آواز بھی آ جاتی ہے۔ پردہ اُٹھتے ہی فرحت قالین پر سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور کھڑکی کے قریب جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ کھڑکی کے شیشوں میں سے باہر کی طرف دیکھتی ہے اور پھر نوشابہ سے مخاطب ہو کر کہتی ہے]

فرحت :- نوشابہ! ذرا یہ کھڑکی کھول دوں؟ اور نہیں تو ٹھنڈی ہوا ہی آئے گی؟

نوشابہ :- (دھیمی آواز سے) جیسی تمہاری مرضی۔

[فرحت کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیتی ہے۔ کھڑکی میں سے رات کی سیاہی نظر آتی ہے]

فرحت :- دیکھا نوشابہ! کیسی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔ پر دیکھو ابھی شفق نمودار نہیں ہوئی۔ باہر ویسے کا ویسا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اور ہاں نوشابہ (ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) وہ بڑا سا ستارہ

ابھی تک چمک رہا ہے (ہنس کر اور مڑ کر نوشابہ کو دیکھتے ہوئے) تمہاری قسمت کا ستارہ!

نوشابہ (پھیکی سی ہنسی کے ساتھ) میری قسمت کا ستارہ!

فرحت:۔ تو اور کیا نہیں؟ دیکھو تو کیا جگمگا رہا ہے۔ ذرا آجاؤ نا تم بھی کھڑکی کے قریب۔ دیکھو تو کیا سہانا سماں ہے شفق نمودار ہوگی تو اور بھی سہانا ہو جائے گا۔

نوشابہ:۔ (دھیمی آواز سے) تمہیں شفق کی پڑی ہے۔ میں کہتی ہوں اچپ ہو جاتی ہے) ...... نجانے میرے جی کو کیا ہو گیا ہے بھئی فرحت میرے پاس آ کر بیٹھو۔ یہ رات پھر کب آئے گی۔

[گھر کے اندر سے لڑکیوں کے ڈھولک بجانے اور گانے کی آوازیں آتی ہیں]

فرحت:۔ دیکھو تو یہ لڑکیاں کتنی اچھی ڈھولک بجاتی ہیں۔

نوشابہ:۔ تمہیں ڈھولک کی پڑی ہے اور ......

فرحت:۔ نوشابہ چھوڑو بھی یہ وہم ہے سراسر تمہارا۔ زاہدہ اور طلعت سے کہتی ہوں ذرا ہمیں لے آئیں نا ڈھولک ـــــ

نوشابہ: خدا کے لئے کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا فرحت۔ ڈھولک بجاتے رات کا آخری پہر ہونے کو تو آیا۔ میں کہتی ہوں ان لڑکیوں کو نجانے نیند بھی کیوں نہیں آتی؟

فرحت:۔ شادی بیاہ میں نیند؟

نوشابہ:۔ پر فرحت سچ مجھے تو ذرا بھی نہیں بھاتی ڈھولک کی آواز؟

فرحت:۔ بھئی گا بجا تو خوب رہی ہیں یہ لڑکیاں۔ یہ تو نہ کہو۔

نوشابہ:۔ نجانے مجھے یہ باتیں کیوں اچھی نہیں لگ رہیں۔ مہندی پر رات ان لڑکیوں نے جو ہلڑ مچایا تھا تم نے دیکھ ہی لیا۔ طاہرہ اور خالہ جان نے زبردستی لگا دی ورنہ ......

فرحت:۔ ورنہ کیا نہ لگواتی؟ دلہن اور مہندی نہ لگے؟

نوشابہ:۔ (پھیکی سی ہنسی کے ساتھ) دلہن!

فرحت:۔ تم تو ناحق غم لگا بیٹھی ہو نوشابہ!

نوشابہ:۔ نہیں غم کیا ہوگا ......

فرحت:۔ غم نہیں تو اور کیا۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے بھلا۔ رات سے تو اس طرح گم سم بیٹھی ہو۔ میں کہتی ہوں نوشابہ تم ذرا کی ذرا سو کیوں نہیں جاتیں۔ نوشابہ آنکھیں تو تمہاری بھی نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔ ابھی تو سویرا ہونے میں دیر ہے۔

نوشابہ:۔ نیند آئے تو سو نہ جاؤں۔

فرحت:۔ پر نوشابہ میں کہتی ہوں تائی جی کو معلوم ہو گیا کہ ابھی تک نوشابہ بیگم کے دل سے یہ وہم دور نہیں ہوا تو ان کا جی کتنا برا ہوگا (وقفہ) اور پھر مجھے تو ڈر ہے بات ذرا بھی باہر نکل گئی تو لوگ نجانے کیا کیا باتیں مشہور کر دیں گے؟

نوشابہ:۔ فرحت کچھ بھی نہیں ہے بات۔ میں کہتی جو ہوں۔ تم میرے کہنے کا یقین کیوں نہیں کر لیتیں؟

فرحت:۔ نہیں نوشابہ تم لاکھ کہو۔ آخر میں جانتی نہیں تمہارے دل کی بات۔

نوشابہ:۔ خدا کے لئے فرحت چھوڑو بھی اس نامراد قصے کو۔

فرحت:۔ بھئی نوشابہ تمہیں اس طرح دیکھ کر میرا دل بھر آتا ہے۔ مجھے خود وہم سا ہو گیا ہے ......

نوشابہ:۔ فرحت تم تو خواہ مخواہ میرے لئے کڑھ رہی ہو۔

فرحت:۔ نہیں کڑھنے کی بات نہیں۔ نجانے یہ رواج کب تک رہیں گے (وقفہ) پر خیر ماں باپ کی مرضی بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔ آخر ہمارے تمہارے گھرانوں میں یہی ہوتا چلا آیا ہے۔

نوشابہ:۔ ہاں فرحت تم کہتی تو ٹھیک ہو۔

فرحت:۔ کچھ عجیب سی بات نہیں کیا؟ ادھر لڑکی کی برات آ رہی ہے

ادھر لڑکی کے دل سے یہ وہم دور نہیں ہوا کہ دولہا میاں۔۔۔

نوشابہ :۔ فرحت اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔۔۔

فرحت :۔ نوشابہ ایک بات پوچھوں بُرا تو نہ مانو گی ؟

نوشابہ : نہیں تو ؟

فرحت :۔ نعیم صاحب میں اتنی برائی بھی کیا ہے ؟ آخر کوئی لڑکا کتنا بُرا ہو سکتا ہے۔

نوشابہ :۔ میں نے کب کسی کو بُرا کہا ہے۔

فرحت :۔ تو پھر تمہیں وہم اور ہے کس بات کا ؟

نوشابہ :۔ کسی بات کا بھی نہیں۔ چھوڑو یہ قصّہ

[باہر سے قدموں کی تیز تیز چاپ سُنائی دیتی ہے]

فرحت :۔ لو طاہرہ آ رہی ہے۔ کیا تیز تیز قدم اٹھاتی ہے، پر میری سینڈل کی خیر نہیں۔ کل سے تو پہنے پھر رہی ہے۔

[دائیں دروازے کا پردہ ہٹا کر طاہرہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ دوپٹہ سر سے ڈھلک کر شانوں پر آ گیا ہے]

طاہرہ :۔ نوشابہ باجی! نوشابہ باجی! ہائے ذرا جلدی سے بتانا میں کون سا جوڑا پہنوں ؟ سُرخ ساٹن کا یا گلابی کریپ کا ؟ اوئی اللہ یہ بھی کیا کوئی اس طرح چپ چاپ تھوڑی بیٹھتا ہے۔ اچھی باجی ہائے ذرا بتا دو نا ؟ دیکھو تو میں تمہارے لئے ایک بالکل نئی خبر لائی ہوں

نوشابہ :۔ کیا ؟

طاہرہ :۔ سُنا نہیں صفیہ آپا آ رہی ہیں تم سے ملنے!

نوشابہ :۔ (حیرت سے) صفیہ ؟ وُہ کیسے آسکتی ہے ؟ کیا کہہ رہی ہو طاہرہ ؟

طاہرہ :۔ ہاں ہاں میں خود اپنے کانوں سن کر آ رہی ہوں۔ اچھی باجی ذرا ہاتھ تو دکھانا۔ ہائے گورے گورے ہاتھوں میں کیا رنگ چڑھا ہے۔ دیکھا جی میں نے لگائی تھی نا مہندی ؟

نوشابہ :۔ طاہرہ بند کرو یہ واہی تباہی اور سچ سچ بتاؤ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ صفیہ آ رہی ہے ؟

طاہرہ :۔ بھلا مجھے معلوم کیوں نہیں ہوتا جی ؟ وُہ جو ماما کریمن ہے نا۔ وہی بتاتی پھرتی ہے۔ ہائے باجی ذرا کریمن کا نخرہ دیکھا ؟ تائی جان کی پرانی چکنی کی نیلی شلوار اور آپا کلثوم کا تربوزی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے ایسے پھر رہی ہے کہ۔۔۔ (بات بدل کر) دیکھو نا باجی بھلا کوئی نیلے رنگ کے ساتھ بھی تربوزی رنگ پہنتا ہے ؟

نوشابہ :۔ (حیرت سے) طاہرہ کبھی کسی کی سُن بھی لیا کرو۔ توبہ۔ میں پوچھتی ہوں ماما کریمن کو کیسے معلوم ہوا ؟

طاہرہ :۔ ہائے ماما کریمن کو معلوم نہ ہو ؟ بلی کی طرح گھر گھر جھانکتی جو پھرتی ہے ؟ ممانی جان کے یہاں سے ہو کر تو آ رہی تھی شاید ؟

فرحت :۔ نوشابہ صفیہ کون ؟ تمہارے ماموں جان کی لڑکی ؟

طاہرہ :۔ ہائے فرحت باجی تم صفیہ آپا کو نہیں جانتیں ؟ نوشابہ باجی کی تو کبھی بہت پیاری سہیلی تھیں۔ بچپن ہی سے اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا ایک ساتھ رہا ہے دونوں کا۔۔۔"

فرحت :۔ پر نوشابہ تم حیران کیوں ہو گئی ہو ؟

طاہرہ :۔ واہ حیران ہونے کی بھلا بات ہی نہیں ؟

فرحت :۔ تو کیا بات ہے وہ ؟

طاہرہ :۔ بات کیا ہوتی۔ بتا دوں نوشابہ باجی ؟ پر ہم نہیں بتلاتے یہ ہے کون سی بڑی بات۔ آخر کو شادی ہی کا جھگڑا ہے نا۔ ہائے باجی تمہارے رشتے پر کوئی جھگڑے سے جھگڑے ہوئے ہیں۔

فرحت :۔ (حیران ہو کر) جھگڑے کیسے ؟

نوشابہ :۔ (طاہرہ کو گھورتے ہوئے اور جیسے بات کو ٹالنا چاہتی ہے) بے فائدہ باتیں مت کرو۔ طاہرہ خدا کے لئے۔۔۔۔

طاہرہ (قہقہہ لگا کر) واہ جی سب فائدہ؟

نوشابہ:- پر بھائی جی نے اجازت کیسے دے دی صفیہ کو؟

طاہرہ:- ہائے باجی بھلا صفیہ آپا کو بھی اجازت لینے کی ضرورت ہے؟

فرحت:- بھئی یہ کیا باتیں ہیں۔ کیسا جھگڑا؟ کیسی اجازت؟

طاہرہ:- جھگڑا تو ہونا ہی تھا۔ نوشابہ باجی کا رشتہ جو مانگتے تھے۔

فرحت:- نوشابہ کا رشتہ مانگتے تھے کون؟

طاہرہ:- ماموں جان ہی نہیں صفیہ آپا تو باجی کے رشتے کے پیچھے دیوانی ہوئی پھرتی تھیں۔ ہائے بیچاری کو اپنے بھائی سے کتنا پیار تھا۔

فرحت:- تو پھر انکار کیوں ہوا؟

طاہرہ:- ہائے اُن بے چاروں کے تو نصیب پھوٹ گئے۔ اِدھر خالہ جان نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ اُدھر جمیل بھائی کا انتقال ہو گیا۔

فرحت:- اوہو!

طاہرہ:- فرحت باجی بڑا ظلم ہوا ہے بے چاروں پہ۔ ارے ایک بات تو میں بھول ہی گئی (آہستہ سے) دیکھو نا باجی خالہ جان اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھیں.....

نوشابہ:- رو رہی تھیں؟

طاہرہ:- ہاں تو میں نے خود انہیں دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے دیکھا ہے۔

فرحت:- پر تائی جی تو یہیں آ رہی ہیں.....

[بائیں دروازے کا پردہ ہٹتا ہے اور نوشابہ کی ماں کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ نوشابہ کو آتے ہی گلے لگا لیتی ہے۔ دونوں ماں بیٹیاں کچھ دیر آنسو بہاتی ہیں۔ پھر ماں بھرائی ہوئی آواز میں کہتی ہے]

ماں:- نوشابہ! میری بچی خواہ مخواہ کا غم کر رہی ہو۔ دیکھو تو اتنا سا مُنہ نکل آیا ہے اور کوئی پوچھے بات کیا ہے؟ بیٹی یہ تیرا وہم ہے۔ بالکل وہم ہے۔

طاہرہ:- آپ جانیئے خالہ اماں کچھ بھی تو نہیں بات۔ ابھی دیکھئے باجی کو کیسی پیاری دلہن بناتی ہوں۔ ایسی دُلہن بنے گی میری باجی.... ہائے خالہ اماں ذرا باجی کے ہاتھ تو دیکھئے.... دیکھا کیا رنگ چڑھا ہے گورے گورے ہاتھوں میں....

ماں:- نوشابہ بیٹی اس طرح سر جھکا کر نہ بیٹھو۔ تمہاری گردن نہیں تھکتی اس طرح بیٹھنے سے؟ میں کہتی ہوں لڑکیو! کچھ دیر کے لئے تم اس کمرے کا پیچھا چھوڑ دو تو کیا حرج ہو گا۔ کوٹھے پر کچھ دیر کے لئے کیوں نہیں ہو آتیں؟

طاہرہ:- ہاں ہاں باجی آؤ کوٹھے پر ذرا چلیں (نوشابہ کی ماں سے مخاطب ہو کر) خالہ اماں رقیہ بھابی آپ کو کب سے ڈھونڈ رہی ہیں....

ماں:- (فرحت سے مخاطب ہو کر) فرحت بیٹی بھلا ماں باپ بھی کہیں اولاد کے دشمن ہوتے ہیں؟ کوئی اپنی بچی کو اندھے کنوئیں میں تھوڑا ہی دھکیل دیتا ہے۔ کوئی پوچھے آخر نعیم میں کیا بُرائی ہے؟ کیا کمی ہے اُس لڑکے میں؟

طاہرہ:- ہائے نعیم بھائی کتنے اچھے ہیں۔

ماں:- (روتے ہوئے) نوشابہ دیکھو اس رشتے کے لئے میں نے اپنے سگے بھائی کو ناراض کیا۔ بول چال تک بند ہے (بھرائی ہوئی آواز میں) بھائی کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ جوان لڑکا یوں گزر گیا......

[نوشابہ کی ماں رونے لگتی ہے اور دوپٹہ سے اپنے آنسو پونچھتی ہے]

طاہرہ:- ہائے اللہ تائی جان آپ تو رونے لگ گئیں۔ بھلا یہ بھی کوئی موقع ہے۔ ہائے دیکھئے دوپٹے سے آنسو نہ پونچھئے۔ یہ لیجئے رومال۔

[طاہرہ جلدی سے نوشابہ کی ماں کو رومال نکال کر دیتی ہے

رقیہ کمرے میں داخل ہوتی ہے]

رقیہ :- (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) نہ جانے یہ لوگ کہاں کھسک گئے ہیں؟ طلعت، زاہدہ اور سکینہ تو خیر ڈھولک کی ہو رہی ہیں پر طاہرہ اور فرحت تم بھی کیا مزے سے یہاں بیٹھی ہو۔ طاہرہ شرم تو نہیں آتی تمہیں۔ کیا ٹھسّے سے یہاں بیٹھی ہو۔ میں کہتی ہوں ابھی کوئی کام بھی ہوا ہے؟ حمام صاف ہوا ہے؟ تولئے کہاں پڑے ہیں؟ اور تو اور صابن دانیوں کا کچھ پتا نہیں چلتا (نوشابہ کی ماں پر نظر پڑتے ہی) ہیں تائی جان آپ رو رہی ہیں۔ کیا بات ہوئی؟

ماں :- (آنسو پونچھتے ہوئے) کچھ نہیں دلہن

رقیہ :- دیکھئے میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں نہ تولیوں کا کچھ پتہ چلتا ہے نہ ابھی حمام صاف ہوا ہے۔ عجیب دھماچوکڑی مچ رہی ہے گھر بھر میں۔ برات کے آنے میں معلوم ہے لڑکیو! کتنا وقت رہ گیا ہے؟ پانچ بجنے ہی والے ہیں۔ طاہرہ نوشابہ کے غسل کا انتظام تمہیں کو کرنا ہے —

طاہرہ :- ہاں بھابی جان آپ نے رات جو کہہ دیا تھا۔ ہائے بھابی جان ذرا باجی نوشابہ کے ہاتھ تو دیکھئے کیا رنگ چڑھا ہے گورے گورے ۔ ۔ ۔ ۔

رقیہ :- (سنجیدگی سے) کریمن مہندی اچھی لائی تھی۔ پر تم آؤ نا میرے ساتھ (جانے کے لئے مڑتی ہے) اور تائی جان آپ سے بھی تو کئی مشورے کرنے ہیں ابھی۔ طاہرہ تم ذرا تایا جان کے کمرے میں طلعت اور تسنیم وغیرہ کے ساتھ مل کر قالین تو بچھا دو۔ اور بھئی فرحت تمہارے ذمے تو کوئی ہلکا پھلکا سا کام ہونا چاہئے مہمانوں کی خاطر تواضع سپرد کر دوں؟

فرحت :- شوق سے بھابی جان

رقیہ :- ارے نوشابہ۔ یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ میں نے تمہیں تو دیکھا ہی نہ تھا۔ بس وہی بات۔ دیکھو بیوقوف نہ بنو۔ دیکھو تو تمہاری سہیلیاں کیا کہیں گی جی میں۔ اور ہاں تم نے سنا صفیہ نے آنے کے لئے کہلا بھیجا ہے۔

ماں :- ہاں نوشابہ صفیہ آ رہی ہے۔ آخر پرانی سہیلی ہے۔ سوچا ہوگا۔ سہیلی کو وداع کر آؤں۔

نوشابہ :- پر ممانی جان نے اجازت کیسے دے دی؟

ماں :- آخر اتنی بات بھی کیا ہے!

رقیہ :- اچھا طاہرہ تم تو آؤ نا میرے ساتھ۔ اور تائی جان آپ بھی آیئے ۔ ۔ ۔ ۔

[رقیہ، طاہرہ اور نوشابہ کی ماں کمرے سے باہر چلی جاتی ہیں]

فرحت :- اچھا نوشابہ اب سچ سچ کہو کیا بات ہے اصل میں؟

نوشابہ :- فرحت خواہ مخواہ کا اصرار کر رہی ہو

فرحت :- اصرار

نوشابہ :- تو اور کیا

فرحت :- اچھا یہ بتاؤ کیا نعیم صاحب تمہیں پسند نہیں کرتے؟

نوشابہ :- میں کیا کہہ سکتی ہوں۔

فرحت :- کیا تم سے نفرت کرتے ہیں؟

نوشابہ :- (دھیمی آواز سے) نفرت تو نہیں — پر (خاموش ہو جاتی ہے)

فرحت :- پر کیا؟ — تم سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں؟

نوشابہ :- بھئی فرحت چھوڑو بھی یہ باتیں۔

فرحت :- پر آخر کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟

نوشابہ :- وجہ تو مجھے کوئی معلوم نہیں!

فرحت :- نہیں معلوم؟

نوشابہ :- اب میں تمہیں کیا بتاؤں؟

فرحت :۔ مجھ سے چھپانا ہے تو خیر نہ بتاؤ۔

نوشابہ :۔ نہیں اب تم سے کیا چھپاؤں گی ۔

فرحت :۔ تو پھر؟

نوشابہ :۔ تم خود ہی سوچو جو شخص تمہاری ہر بات کا مذاق اڑائے، ہر بات پر نکتہ چینی کرے۔ سب کے سامنے شرمندہ کرنے کی کوشش کرے تم سمجھو گی، وہ تمہیں پسند کرتا ہے؟

فرحت :۔ تو کیا نعیم صاحب ــــ

نوشابہ :۔ رفیعہ، عطیہ بھی تو آخر ان کی چچیری بہنیں ہوتی ہیں۔ ان کی چال ڈھال، وضع قطع کا مذاق کیوں نہیں اڑاتے تھے؟ میری چال ڈھال میں اُنہیں کیا خرابی نظر آتی تھی؟ میرے لباس میں کیا نقص ہوتے تھے۔ جو یوں سب کے سامنے نکتہ چینی کیا کرتے تھے؟ اور پھر میری شکل صورت میں ....

فرحت :۔ پر ہو سکتا ہے نوشابہ، نعیم صاحب محض مذاق کرتے ہوں...

نوشابہ :۔ (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) مذاق کرتے تھے ....

فرحت :۔ یہی تو ہوتا ہے نوشابہ آدمی جسے پسند کرتا ہے۔ دوسروں کو یہ جتانے کے لئے کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بہ ظاہر اُس کا مذاق اڑاتا رہتا ہے ....

نوشابہ :۔ نہیں فرحت انہیں شروع ہی سے مجھ سے نفرت تھی۔ مذاق اڑانا تو خیر، پیٹھ پیچھے بھی تو لوگوں سے میری برائیاں کیا کرتے تھے .....

فرحت :۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

نوشابہ :۔ تم سمجھتی ہو ایسی باتیں چھپی رہتی ہیں؟

فرحت :۔ چھپی تو نہیں رہتیں پر آخر ....

نوشابہ :۔ اوّل تو صفیہ ہی مجھے اُن کی ایک ایک بات بتا دیا کرتی تھی اور پھر ....

فرحت :۔ صفیہ؟

نوشابہ :۔ تمہیں شاید معلوم نہیں۔ اُن دنوں صفیہ میری سب سے عزیز سہیلی ہوا کرتی تھی ...

فرحت :۔ تو مطلب یہ ہوا کہ نعیم صاحب کو تم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پر تعجب ہے کہ پھر بھی برات لے کر آ رہے ہیں ....

نوشابہ :۔ تم جانتی نہیں ہو نا چچا جان کی طبیعت کو۔ کوئی ان کی بات رد کر کے تو دیکھے۔

فرحت :۔ نوشابہ ایسے والدین سے ڈر کر رشتہ کرنے والے لڑکے کم ہی ہوتے ہیں دُنیا میں .... اور پھر اس زمانے میں!

نوشابہ :۔ یہ زبردستی کی شادی ہے ۔

نوشابہ :۔ آخر صفیہ غلط تو نہیں کہا کرتی تھی .... کوئی آ رہا ہے شاید...

[طاہرہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ دروازے کے قریب آ کر رُک جاتی ہے]

طاہرہ :۔ (پردہ اٹھا کر) نوشابہ باجی صفیہ آپا آگئی ہیں ... آ جاؤ نا صفیہ آپا؟ دروازے کے باہر کیوں کھڑی ہو گئی ہو؟ اندر کوئی غیر تھوڑا ہی ہے۔ ہائے آ بھی جاؤ نا .... فرحت باجی ہیں ...... بس ....

[صفیہ جھجکتے جھجکتے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ سیاہ برقع ہاتھ میں اٹھا رکھا ہے]

نوشابہ :۔ (حیرت سے) صفیہ؟

صفیہ :۔ نوشابہ تم حیران ہو گئی ہو؟

نوشابہ :۔ ممانی جان نے اجازت کیسے دے دی؟

صفیہ :۔ رات سے ارادہ کر رہی تھی، نوشابہ مجھے تو یہ بات کئی دن سے معلوم ہو چکی تھی .... (فرحت کی طرف دیکھ کر) .... تم نے نوشابہ ہمارا تعارف تو کرایا ہی نہیں؟

نوشابہ:۔ بھئی فرحت معاف کرنا۔ میری خالہ زاد بہن صفیہ ہیں نا۔ اُنہی کا تو ابھی ذکر ہو رہا تھا۔

صفیہ:۔ میرا ذکر؟

نوشابہ:۔ ادھر آجاؤ نا کاؤچ کے پاس....

طاہرہ:۔ فرحت باجی آپ کو بھابی جان بلا رہی ہیں.... کہہ رہی ہیں فرحت نے ابھی تک بیاہ کے کاموں میں کچھ نہیں کیا....

فرحت:۔ مجھے خود ہی اُنہوں نے کوئی کام ابھی تک نہیں بتایا....

طاہرہ:۔ سمدھنوں کی خاطر تواضع کا کام آپ کے سپرد کر رہی ہیں۔ آؤ نا ذرا میرے ساتھ.... برابر ہی کے کمرے میں تو ہیں....

فرحت:۔ نوشابہ میں کچھ دیر کے لئے ہو آؤں....

نوشابہ:۔ ارے یہ لوگ کسی کو بھی چین نہیں لینے دیتے... ہو آؤ....

[طاہرہ اور فرحت کمرے سے باہر چلی جاتی ہیں]

صفیہ:۔ نوشابہ مجھے معاف کرنا۔ میں تم سے دوستی کے پردے میں دشمنی کرتی رہی ہوں!

نوشابہ:۔ (چونک کر) کیا مطلب؟

صفیہ:۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نوشابہ!

نوشابہ:۔ (گھبرا کر) صفیہ خدا کے لئے مجھے کسی اور مصیبت میں نہ ڈال دینا....

صفیہ:۔ دو زندگیوں کے مستقبل کا سوال تھا....

نوشابہ:۔ صفیہ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو....

صفیہ:۔ نوشابہ اور نعیم کے مستقبل کا سوال تھا...

نوشابہ:۔ صفیہ تم کیا کہہ رہی ہو....

صفیہ:۔ نوشابہ تمہیں نعیم کے بارے میں غلط فہمی ہو رہی ہے....

نوشابہ:۔ غلط فہمی؟

صفیہ:۔ ہاں غلط فہمی۔

نوشابہ:۔ صفیہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیسی غلط فہمی....

صفیہ:۔ تم نے نعیم بھائی جان کے متعلق جو تصور قائم کر رکھا ہے وہ درست نہیں....

نوشابہ:۔ ہیں!

صفیہ:۔ میں درست کہہ رہی ہوں!

نوشابہ:۔ تصور؟

صفیہ:۔ اصل میں تو نعیم بھائی جان کو تم سے شروع ہی سے دلچسپی تھی!

نوشابہ:۔ صفیہ؟

صفیہ:۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں نوشابہ!

نوشابہ:۔ صفیہ تمہیں آج کچھ ہو گیا ہے۔ پانی منگواؤں؟

صفیہ:۔ نہیں نوشابہ میں بالکل ٹھیک ہوں....

نوشابہ:۔ پر تم معقول باتیں نہیں کر رہی ہو؟

صفیہ:۔ میری اچھی نوشابہ میری بات کا یقین کر لو....

نوشابہ:۔ اُف توبہ میرا سر چکرا رہا ہے....

صفیہ:۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم دونوں میں عمر بھر غلط فہمی رہے....

نوشابہ:۔ تمہاری وجہ سے؟

صفیہ:۔ ہاں نوشابہ۔ پر میرا راز میرے سینے ہی میں رہنے دو...

نوشابہ:۔ راز؟ کیسا راز؟

صفیہ:۔ (روتے ہوئے) ہائے میری کتنی تمنا تھی کہ میں تمہیں اپنی بھابی بنا کر اپنے گھر لاتی۔ جمیل بھائی جان سے جتنا مجھے پیار تھا اس سے بھی کہیں زیادہ تم سے محبت تھی.... پر بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ بات ہمارے نصیبوں میں نہیں۔ تمہارا رشتہ ہی نہ مل سکا اور بھائی جان کا بھی انتقال ہو گیا....

نوشابہ:۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) صفیہ خدا کے لئے میرا دل نہ دکھاؤ....

صفیہ:۔ (روتے ہوئے) نوشابہ! یہ سب میری شرارت تھی نوشابہ! میں شیطان ہوں۔ میں ہی شیطان کی طرح نعیم کو تمہارے خلاف ورغلایا کرتی تھی۔ میں ہی یہ کوشش کیا کرتی تھی کہ کسی طرح نعیم بھائی تم سے نفرت کرنے لگ جائیں اور تم سے شادی کرنے پر راضی نہ ہوں .... نوشابہ! میں مجرم ہوں.... میں قصوروار ہوں.....

نوشابہ:۔ اُف توبہ! صفیہ صفیہ خدا کے لئے کچھ مت کہو....

صفیہ:۔ (روتے ہوئے) پر نوشابہ! میں کیا جانتی تھی کہ قسمت میں کچھ اور ہی لکھا ہے۔ جمیل بھائی کے انتقال سے میری تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا....

نوشابہ:۔ صفیہ! صفیہ! خدا کے لئے....

[نوشابہ صفیہ کے گلے لگ کر رونے لگتی ہے۔ دُور سے برات کے باجوں کی آواز آتی ہے۔ طاہرہ اور فرحت کمرے میں داخل ہوتی ہیں]

فرحت:۔ ارے یہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟

طاہرہ:۔ نوشابہ باجی! نوشابہ باجی! لو برات بھی آگئی۔ ہائے اللہ اب میں کیا کروں۔ کوئی بتاتا بھی نہیں کہ میں کون سا جوڑا پہنوں۔ کیوں نوشابہ باجی سُرخ یا گلابی؟ ہائے نوشابہ باجی.... نوشابہ باجی.... ہائے اللہ کچھ بتاؤ بھی نا....

فرحت:۔ (کھڑکی کے قریب آکر) نوشابہ دیکھو صبح کتنی پیاری ہے۔ اُفق پر شفق نمودار ہو رہی ہے۔ نوشابہ! اُٹھو! ذرا آؤ نا۔ دیکھو تو کھڑکی میں سے شفق کا نظارہ کتنا سہانا دکھائی دے رہا ہے....

[برات کے باجوں کی آواز اور قریب آجاتی ہے]

(پردہ)

قطعات

نذیر مومن

چمن کا پتّہ پتّہ نکتہ چیں ہے
کہ فطرت خود نگر ہے خُردہ بیں ہے
اُٹھے گی اک قیامت پھر چمن سے
ضمیرِ لالہ و گُل آتشیں ہے

کچھ روز ہم نے یوں غمِ دوراں پہ جی لیا:
کچھ روز ہم نے وعدۂ جاناں پہ جی لیا
سوچا خزاں کے بعد بھی ہے آمدِ بہار
کچھ روز انتظارِ بہاراں پہ جی لیا

سوچا کہ چھین لوں گُلِ لالہ سے داغِ دل
یا شمع جلا کے رات کے تاروں سے چھین لوں
کہتے ہیں زندگی ہے فقط سوزِ زندگی
رازِ حیات وردکے ماڑں سے چھین لوں

ہیں زخمِ دل کو سینا نہ چاہوں تو کیا کروں؟
خونِ جگر بھی پینا نہ چاہوں تو کیا کروں؟
مانا کہ اُن کا وعدۂ فردا دُرست ہے
کل تک بھی گر میں جینا نہ چاہوں تو کیا کروں؟

انتین چیخوف
ترجمہ سعید اختر دُرّانی

پہلے درجہ کا مُسافر

(افسانہ)

پہلے درجے کا ایک مسافر جو ابھی اسٹیشن پر کھانا کھا کر آیا تھا اور کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا تھا مخملیں نشست پر لیٹ گیا اور آرام سے دراز ہو کر اونگھنے لگا۔ کوئی پانچ ایک منٹ کی غنودگی کے بعد اُس نے اپنی چکنی چکنی آنکھیں اپنے مدِ مقابل کی طرف اُٹھائیں۔ باچھیں پھیلائیں اور کہا: "والد مرحوم کی عادت تھی کہ کھانے کے بعد گاؤں کی عورتوں سے تلوے سہلوایا کرتے تھے۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کھانے کے بعد میں ہمیشہ اپنی زبان اور دماغ کو ذرا تحریک دینا پسند کرتا ہوں۔ پیٹ بھر چکنے پر مجھ گنہگار کو پیٹ بھر کر باتیں کرنا بہت بھاتا ہے۔ کیا آپ مجھے تھوڑی سی بات چیت کی اجازت دیں گے؟"

اس کے مدِ مقابل نے جواب دیا: "مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

"عمدہ کھانے کے بعد حقیر ترین موضوع بھی میرے ذہن میں شیطان کی آنت کا سا لمبا سلسلۂ خیالات پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً ہم نے طعام خانے کے پاس جن دو نوجوانوں کو دیکھا تھا۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ اُن میں سے ایک نوجوان دوسرے کو اُس کی شہرت پر مبارکباد دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں کہ تم ابھی سے کافی نامور ہو کر جادۂ شہرت پر گامزن ہو چکے ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ دونوں ادنیٰ درجے کے ایکٹر ہوں گے یا اخبار نویس مگر کچھ بھی ہو۔ ان کی ذات اس وقت معرضِ بحث نہیں میرے ذہن میں جو سوال اس وقت جاگزین ہے۔ وہ حقیقتہً یہ ہے کہ صاحب آخر اس لفظ 'شہرت' یا نامُوری سے مراد کیا ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ پشکن کے خیال میں شہرت ٹاٹ میں مخمل کا پیوند ہے۔ ہم سب بھی اس معاملے میں پشکن کے ہمنوا ہیں — یعنی کم و بیش داخلی طور پر — لیکن کسی شخص نے بھی تا حال اس لفظ کی کوئی صریح، منطقی تعریف نہیں کی... میرے لئے ایسی تعریف بہت قابلِ قدر ہوگی۔"

"آپ کے لئے یہ سوال اتنا اہم کیوں ہے؟"

پہلے درجے کے مسافر نے ایک لمحہ سوچ کر جواب دیا: "دیکھئے نا۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ شہرت ہے کیا۔ تو شاید اس کے حصول کے وسائل بھی ہمیں معلوم ہو جائیں۔ صاحب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جب میں نوجوان تھا تو شہرت کی آرزو میری نس نس میں بسی ہوئی تھی۔ یوں کہئے کہ شہرت کی تمنا میرے لئے ایک جنون بن چکی تھی۔ اُسی کی خاطر میں پڑھتا، کام کرتا، راتوں کو جاگتا اور کھانے پینے سے غفلت کرتا تھا۔ اب جہاں تک میں غیر جانبداری سے غور کر سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے لئے مجھے تمام خداداد قابلیتیں حاصل تھیں۔ پہلے تو دیکھئے کہ پیشے میں میں انجینئر ہوں اور اپنی زندگی کے دوران میں کوئی دو درجن بھر شاندار پل رُوس میں تعمیر کر چکا ہوں۔ تین شہروں میں کاریز لگا چکا ہوں اور رُوس، انگلستان اور بلجیم میں کام رہا ہوں۔ علاوہ ازیں میں اپنے پیشے کے متعلق متعدد موضوعات پر خاص مقالے لکھ چکا ہوں اور بندہ نواز اس پر مستزاد یہ کہ بچپن ہی سے مجھے کیمیا کا خبط رہا ہے۔ فرصت کے اوقات میں اس مضمون کا مطالعہ کر کے میں نے استعداد یہاں تک بڑھا لی کہ بعض نامیاتی تیزاب بنانے کے طریقے دریافت کر لئے حتےٰ کہ بیرونی ممالک کے سب کیمیاوی رسالوں میں آپ میرا نام دیکھ سکتے ہیں۔ میں مستقل طور سے ملازمت میں ہوں، سول کونسلر کے عہدے پر فائز ہوں اور میری ملازمت کا ریکارڈ بالکل بے داغ ہے۔ میں اپنے کارناموں اور خوبیوں کے بیان سے آپ کا دماغ زیادہ نہیں چاٹوں گا۔ بلکہ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میں نے بعض نامور

ہستیوں سے کہیں زیادہ کام کیا ہے اور باوجود اس کے دیکھ لیجئے بڑھاپے میں یہاں گویا قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں اور اُسی قدر نامور ہوں جتنا وہ سامنے پلیٹ فارم پہ دوڑتا ہوا کالا کتا۔"

"لیکن کیا خبر ہو سکتا ہے آپ واقعی مشہور ہوں۔"

"ہوں ـــ چلئے ابھی آزما کے دیکھے لیتے ہیں ـــ کیا کبھی آپ نے 'ریکوناف' نام سنا ہے؟"

اُس کے مدمقابل نے نظریں چھت کی طرف اُٹھائیں۔ ایک منٹ سوچا اور پھر مسکرا کر بولا "نہیں تو، کبھی سننے میں تو نہیں آیا۔ ..."

"یہ میرا خاندانی نام ہے۔ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ خاصے مسِن ہیں اور باوجود اس کے میرے نام سے ناواقف ہیں ـــ یہ بیّن ثبوت ہے کہ شہرت حاصل کرنے کی کوشش میں کچھ ٹھیک سے نہیں کر پایا یعنی یہ کام کرنے کا درست سلیقہ مجھے آیا ہی نہیں اور شہرت کو غلط طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش میں اُس سے پرے بھٹک گیا ہوں۔"

"تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟"

"ہُوں ـ جانے میری بلا! آپ کا خیال ہے ـ صلاحیت، غیر معمولی قابلیت، جدّت، ہرگز نہیں صاحب! میرے دیکھتے دیکھتے وہ وہ لوگ بامِ ترقی پر چڑھ گئے جو پرلے درجے کے نالائق اور ناکارہ تھے اور میرے مقابلے میں تو بالکل حقیر تھے جو میرے کام کا دسواں حصّہ بھی نہیں کرتے تھے ... . اور جنہوں نے ناموری حاصل کرنے کے لئے ذرّہ بھر بھی محنت نہیں کی اور زمانے کا رنگ دیکھئے کہ اُن کے نام شب و روز اخباروں میں اور زبانوں پر آتے رہتے ہیں۔ اگر آپ میری باتوں سے اُکتا نہ گئے ہوں تو میں ایک مثال سے اُس کی وضاحت کرتا ہوں۔ چند برس ہوئے۔ میں نے 'شہرک' میں ایک پُل تعمیر کیا۔ میں آپ کو اتنا بتا دوں کہ یہ ذلیل چھوٹا سا قصبہ اتنا بے رونق تھا کہ الاماں! اگر وہاں تاش اور عورتیں نہ ہوتیں تو میں ضرور پاگل ہو جاتا۔ خیر، یہ ایک پرانا قصّہ ہے میں اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ مجھے ایک گائن کے ساتھ میل جول بڑھانا پڑا۔ ہر شخص اس عورت میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ خدا جانے کیوں۔ میرے خیال میں تو وہ ـــ اب میں کیا کہوں ـــ ایک بالکل معمولی عورت تھی۔ جیسی سینکڑوں اور عورتیں ہوں گی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بددماغ، حریص اور طرّہ یہ کہ بالکل بیوقوف سی لونڈیا تھی۔ کھاتی بے تحاشا تھی اور پی بھی بے اندازہ جاتی تھی۔ شام کے پانچ بجے تک سویا کرتی تھی ـــ اور میرے خیال میں تو اور کچھ نہیں کرتی تھی۔ لوگ اُسے ایک زنِ بازاری سمجھتے تھے اور ایسا ہی درحقیقت اُس کا پیشہ بھی تھا۔ لیکن جب وہ اُسے ذرا سلجھا ہوا نام دینا چاہتے تو ایکٹرس اور مغنّیہ کے لقب سے پکارتے تھے۔ مجھے تھیئٹر سے بہت لگاؤ تھا۔ اس لئے اُس کا یوں خواہ مخواہ ایکٹرس کہلانا مجھے بہت ناگوار گزرتا۔ اُس کو ایکٹرس یا مغنّیہ کہلانے کا ذرّہ بھر بھی حق نہ تھا بلکہ اُس اللہ کی بندی کو تو کسی قسم کی صلاحیت یا احساس سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ میں کہوں گا وہ ایک قابلِ رحم ہستی تھی۔ جہاں تک میں جانچ سکتا ہوں، اُس کا گانا طبیعت کو منغّض کر دینے والا ہوتا تھا۔ اُس کے آرٹ کا تمام کمال یہی تھا کہ وہ ہر موزوں موقع پر ٹانگیں چلا سکتی تھی اور جب لوگ اُس کے کپڑے بدلنے کے کمرے میں گھس آتے تو وہ بالکل ہراساں نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے لئے عموماً ایسی مزاحیہ تمثیلیں چُنتی تھی جن میں گانے اور چُست مردانہ لباس پہننے کے بہت مواقع ملا کرتے تھے۔ فی الواقع یہ تمام ـــ اُف توبہ! تو خیر، اب ذرا توجہ سے سنئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس نو تعمیر شدہ پُل کے افتتاح کے لئے ایک رسمِ عام منائی گئی تھی۔ مذہبی رسوم کے علاوہ تقریریں ہوئیں، تار آئے اور بہت کچھ ہوا۔ اب جناب میں تھا کہ اپنی اس محبوب تخلیق کے اردگرد منڈلا رہا تھا اور

دل تھا کہ جوشِ خلاقی سے پھٹا پڑتا ہے۔ یہ ایک پُرانا قصہ ہے اور خواہ مخواہ کے انکسار کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا میں آپ کو بتا دوں کہ میرا پُل ایک نہایت شاندار شے تھا۔ پُل کیا تھا ایک تصویر تھی تصویر۔ مکمل حُسن و مسرت! اور جب شہر کا شہر افتتاح پر آیا ہو تو بھلا کون ہے جو اپنی خوشی ضبط کر سکتا؟ میں نے سوچا! اب سب لوگوں کی آنکھیں مجھ پر لگی ہوں گی! میں چھپوں گا کہاں؟ مگر صاحب جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مجھے اس تشویش کی ذرّہ بھر بھی تو ضرورت نہ تھی —— آہ، افسوس! سوائے سرکاری حکّام کے کسی نے میری رتی بھر پروا نہ کی۔ لوگ دریا کے کنارے پرے باندھے کھڑے تھے اور دم بخود پُل کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس کی انہیں قطعاً پروا نہ تھی کہ یہ معلوم کریں کہ پُل تعمیر کس نے کیا ہے —— اور ہاں، بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ بس وہ دن اور آج کا دن، میں اپنے ان قابلِ احترام عوام سے نفرت کر رہا ہوں —— خدا انہیں غارت کرے۔ ہاں تو اس کے بعد یوں ہوا کہ اچانک مجمع میں ایک ہیجان سا پھیل گیا اور ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ چہروں پر مسکراہٹیں آگئیں اور شانے ہلنے لگے۔ میں نے سوچا، ہو نہ ہو انہوں نے مجھے دیکھ پایا ہے۔ مگر کیا کہنے ہیں میرے اس خیال کے بھی! اب جو میں نے نظر دوڑائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی مغنّیہ مجمع کو چیرتی ہوئی بڑھتی چلی آرہی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے لونڈوں کی ایک قطار کی قطار لگی ہے۔ ہجوم کی نگاہیں تیزی سے اس جلوس کا تعاقب کر رہی تھیں جتنے مُنہ تھے اتنی ہی باتیں۔ "یہ فلاں عورت ہے . . . کافرہ! ساحرہ!" اور جب آخر انہوں نے میری طرف توجہ مبذول کی تو دو چھوکروں نے جو غالباً مقامی نوآموز انجینئر تھے۔ میری طرف دیکھا، باہم آنکھیں ملائیں، اور زیرِ لب بولے: "وہ رہا اس کا عاشق"۔ "کہتے کیسی رہی؟" اور پھر ایک کم رُو شخص جس نے ایک لمبی ٹوپی پہن رکھی تھی جس کی ٹھوڑی کو حجامت کی شدید حاجت تھی اور جو مرغے کی طرح باری باری ٹانگیں بدلتے ہوئے میرے پاس منڈلا رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا: "آپ جانتے ہیں وہ دوسرے کنارے پر کون صاحبہ چل رہی ہیں؟ یہ فلاں ہیں . . . ان کی آواز تو خیر ناگفتہ بہ ہے۔ مگر انہیں اس کے مکمل ترین قابو حاصل ہے! . . . "

میں نے اُس کم رُو شخص سے دریافت کیا: "کیا آپ بتا سکتے ہیں یہ پُل کس نے تعمیر کیا ہے؟"

اُس نے جواب دیا: "مجھے حقیقتاً کچھ علم نہیں۔" "غالباً کوئی انجینئر ہوگا۔"

"اور آپ کے شہر کا گرجا کس نے بنایا تھا؟"

"میں حقیقتاً کچھ بھی تو آپ کو نہیں بتا سکتا۔"

"پھر میں نے اس سے دریافت کیا کہ شہر ک" میں بہترین معلّم کون سمجھا جاتا ہے اور بہترین ماہرِ تعمیر کون؟ مگر میرے سب سوالات کے جواب میں اُس کم رُو شخص نے جواب دیا کہ مجھے کچھ علم نہیں"۔ انجام کار میں نے اُس سے پوچھا: "اور براہِ کرم مجھے یہ تو بتائیے کہ وہ مغنّیہ رہتی کس شخص کے ہاں ہے؟"

"کریکوناف نامی ایک انجینئر کے یہاں۔"

اب فرمائیے جناب کیا ملتا ہے آپ کو؟ بہرحال چونکہ آج کل شہرت کا تمام انحصار کم و بیش اخبارات پر ہے۔ میں نے اگلے روز نہایتی شوق سے مقامی اخبار "پیغام" کیڑا اور اپنا تذکرہ اس میں ڈھونڈنے لگا۔ میں کافی دیر چاروں صفحوں پر نظریں دوڑاتا رہا اور واللہ آخر کار میں نے اُسے ڈھونڈ ہی نکالا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا: "کل۔ خوشگوار موسم میں۔ عوام کے ایک جمِ غفیر کے سامنے۔ صوبے کے گورنر مسمّی فلاں اور دیگر حاضرین کی موجودگی میں۔ نو تعمیر

پُل کی رسمِ افتتاح سرانجام پائی' وغیرہ . . . . . اور آخر میں لکھا تھا: 'ہماری باکمال مغنیّہ "ک" کے شہریوں کی ہر دلعزیز ہستی مسماۃ فلاں۔ رسم میں موجود تھیں اور بہت حسین نظر آ رہی تھیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُن کی آمد سے مجمع میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُن کا لباس . . . اور علیٰ ہٰذا القیاس۔

وہ چاہتے تو کم از کم ایک فقرہ ہی میرے متعلق لکھ دیتے۔ آدھا ہی! اگر نہیں، چاہیے یہ کتنا ہی اوچھا پن معلوم ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ تکلیف سے میرے آنسو نکل آئے۔ آخر میں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ چھوٹے شہروں میں تو احمق بستے ہیں اور ان سے کوئی توقع رکھنا حماقت ہے۔ ناموری کے لئے تو ہمیں علمی مراکز کی طرف رجوع کرنا چاہئے ۔۔ پیٹرز برگ اور ماسکو کی طرف۔

اور کرنا خدا کا یوں ہوا کہ اسی اثنا میں میں نے پیٹرز برگ میں اپنی ایک چیز مقابلے میں بھیج رکھی تھی اور نتیجے کے اعلان کی تاریخ بالکل قریب تھی۔ میں نے "ک" سے چھٹی لے لی اور پیٹرز برگ کو چل کھڑا ہوا۔ "ک" سے پیٹرز برگ تک ایک طویل مسافت ہے اور اس خیال سے کہ رستہ بدمزگی میں نہ کٹے میں نے ایک ڈبہ مخصوص کروا لیا۔ اور ۔۔ اور . . . . اپنے ساتھ میں اُس مغنیّہ کو بھی بٹھا لیا۔ ہم چل پڑے' اور رستہ بھر کھاتے پیتے شمپین پیتے رہے اور رنگ رلیاں مناتے رہے اور آخر ہم اس علمی مرکز پر پہنچ ہی گئے! میں اُسی روز پہنچا جب نتیجے کا اعلان ہوا اور بندہ نواز مجھے اپنی کامیابی پر خوشی منانے کا پورا موقع مل سکا۔ میں نے پہلا انعام حاصل کیا تھا! مرحبا! اگلے روز میں نے نیفسکی جا کر مختلف اخبارات خریدنے میں کوئی ستر کوپک صرف کر ڈالے۔ میں جلدی سے ہوٹل کے کمرے کو لوٹا اور صوفے پر لیٹ گیا اور جوش و مسرت کی کپکپاہٹ کو دباتے ہوئے میں نے تیزی سے پڑھنا شروع کیا۔ پہلے اخبار میں اوّل سے آخر تک نظر دوڑائی ۔۔ خاک بھی نہ تھا۔ دوسرا اخبار الف سے یٰ تک دیکھ ڈالا ۔۔ اس میں بھی کچھ نہ تھا۔ آہ خدایا! آخر کار کہیں چوتھے اخبار میں جا کر اس پیرے پر میری نظر پڑی: 'مشہور و معروف قصباتی ایکٹرس مسماۃ فلاں' کل بذریعہ ایکسپریس' پیٹرز برگ پہنچی۔ ہم مسرت سے کہتے ہیں کہ جنوب کی آب و ہوا ہماری عزیز حسینہ کو بہت راس آئی ہے۔ جس وقت وہ سٹیج پر نمودار ہوتی ہے تو . . . . ' اور پتہ نہیں کیا کیا الم غلم بھرا پڑا تھا۔ اس پیرے سے بہت نیچے۔ باریک ترین ٹائپ میں چھپی ہوئی یہ سطر میں نے دریافت کی۔ 'مقابلے میں پہلا انعام فلاں نام کے انجینئر کو دیا گیا' اور بس! اور مستزاد یہ کہ انہوں نے میرے نام کے ہجے تک تو غلط لکھ رہے تھے۔ کریکوناف کی بجائے کیرکوناف۔ تو یہ حال ہے آپ کے علمی مراکز کا! لیکن اسی پہ بس نہیں . . . جب تک کہ میں مہینہ بھر کے قیام کے بعد پیٹرز برگ سے لوٹوں' سب کے سب اخبار ہماری لاثانی' مافوق الفطرت' غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ایکٹرس کے متعلق بحث میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے میں مشغول ہو چکے تھے اور ان محترمہ کا ذکر اُن کے خاندانی نام سے نہیں بلکہ عیسائی اور موروثی ہر دو ناموں کے حوالے سے ہوتا

اس کے چند سال بعد میرا جانا ماسکو ہوا۔ میئر نے ایک خط بقلم خود لکھ کر مجھے بلاوا بھیجا تھا کہ میں ایک ایسا کام ہاتھ میں لوں جس کے بارے میں ماسکو کے اخبارات کوئی سو سال سے شور مچا رہے تھے۔ کام سے فرصت کے وقفوں میں رفاہِ عام کے پیشِ نظر میں نے ایک مقامی عجائب گھر میں پانچ پبلک لیکچر دیئے۔ آپ کا خیال ہوگا کہ ایسا کرنے سے کم از کم تین دن کے لئے شہر بھر میں معروف ہو جانا یقینی ہے۔ ہے نا؟ لیکن افسوس! ماسکو بھر کے کسی ایک اخبار نے بھی میرے متعلق ایک لفظ تک نہ کہا۔ مکانوں کو آگ لگ جانے کے متعلق خبر تھی۔ تھیٹر کے ڈرامے کے متعلق خبر تھی۔ غافل اربابِ بلدیہ اور نشے میں دُھت دکانداروں کے متعلق خبر تھی۔ لیکن اگر ایک خبر نہیں تھی تو میرے کام' میری تجاویز' اور میرے لیکچروں کے متعلق۔ ماسکو والے بھی کیا ہی خوب ہیں! میں ایک ٹرام پر چڑھا . . . کھچا کھچ بھری تھی' خواتین تھیں' فوجی سپاہی تھے اور پھر دونوں صنفوں کے طلبہ تھے۔ ہر قسم کے لوگ جوڑوں جوڑوں میں۔ مجھے بتایا

گیا ہے کہ ٹاؤن کونسل نے فلاں فلاں کام کے لئے ایک انجینئر بلایا ہے" میں نے اپنے ساتھ والے مسافر سے اتنی بلند آواز میں کہ ساری ٹرام سن سکے پوچھا کیا آپ اس انجینئر کا نام جانتے ہیں ؟ میرے پڑوسی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ باقی لوگوں نے مجھ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی جس میں لاعلمی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ فلاں عجائب گھر میں کوئی صاحب لیکچر دے رہے ہیں اور موضوع کے متعلق ایک سلسلۂ گفتگو جاری کرنے کے لئے میں نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ سنا ہے لیکچر کافی دلچسپ ہیں"

کسی نے سر تک نہ ہلایا۔ ظاہر ہے کہ کسی نے بھی لیکچروں کے بارے میں کچھ سن نہیں رکھا تھا اور خواتین تو عجائب گھر کے وجود سے بھی آگاہ نہ تھیں۔ خیر معمولی بات تھی مگر صاحب اب تم تو دیکھئے کہ ایک دم سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑکیوں پر ٹوٹ پڑے۔ بات کیا تھی ؟ آخر یہ ہوا کیا ؟ "دیکھو" "دیکھئے" میرے پڑوسی نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "وہ سیاہ فام سا شخص آپ کو نظر آ رہا ہے نا جو تانگے میں چڑھ رہا ہے۔ وہ مشہور ہھگیت ہے۔ کنگ" ! اور اس دوڑنے والے کے متعلق باتیں کرنے جو ماسکو بھر کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ٹرام کی ٹرام کا دم پھول گیا۔

"میں آپ کو کتنی ہی ایسی مثالیں دے سکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے یہی کافی ہیں۔ اب اگر ہم یہ فرض کر بھی لیں کہ میں اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں اور کہ میں ایک ذلیل شیخی خورا، اور نالائق شخص ہوں جب بھی میں اپنے علاوہ اپنے ہمعصروں میں سے کئی ایک کے نام لے سکتا ہوں۔ جو اپنی صلاحیتوں اور محنتوں کے لئے بے نظیر تھے اور باوجود اس کے گمنامی میں مر کھپ چکے ہیں۔ کیا روسی جہاز ران، کیمیا دان، طبیعی دستکار اور زراعت کار ریپبلک میں ہر دلعزیز ہیں ؟ کیا ہمارا اچھا ہوا طبقہ روسی آرٹسٹوں صنم تراشوں اور ادیبوں کے متعلق کچھ جانتا ہے ؟ بچارا بوڑھا محنتی اور لائق انشا پرداز "ج" تنتیس برس تک ناشروں کی چوکھٹوں کی جبین سائی کرنے کاغذ کے رموں کے رم سیاہ کرنے اور بیسیوں مرتبہ اہانت کے جرم میں سزا پانے کے باوجود وہی ٹٹ پونجیا کا ٹٹ پونجیا ہی ہے۔ کیا آپ مجھے ایک بھی ایسے ادیب کا نام بتا سکتے ہیں جو اس قسم کی عالمگیر افواہوں کی عدم موجودگی میں بھی مشہور ہو جاتا جیسی مثلاً یہ کہ وہ ڈوئل میں ہلاک ہو گیا یا اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ جلا وطن کر دیا گیا اور یا تاش میں جل دے گیا"۔

پہلے درجے کا مسافر اس قدر جوش میں آ گیا کہ اس کے منہ سے سگرٹ گر پڑا اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تندی سے بولا "جی ہاں۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ میں ایسے سینکڑوں گویوں، بازیگروں اور نقالوں کے نام بھی گنوا سکتا ہوں۔ جن سے بچہ بچہ واقف ہے۔ جی ہاں"!

دروازہ چرچرایا۔ ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا اور ایک کریہہ المنظر شخص ان ورنیس کا کوٹ پہنے، لمبی ٹوپی جمائے اور نیلا چشمہ لگائے ڈبے میں داخل ہوا۔ اس نے سیٹوں پر نظر دوڑائی اور آگے بڑھ آیا

درجے کے پرلے سرے سے ایک دبی دبی سی سرگوشی کی آواز آئی۔ آپ اسے جانتے ہیں۔ یہ کون ہے۔ یہ ن۔ ن ہے۔ طولا کا رہنے والا تاش کا مشہور جادوگر جو تی جنیک کے سلسلے میں دھر لیا گیا تھا:

"سن لیا آپ نے"؟ پہلے درجے کا مسافر ہنسا۔ "وہ طولا کے پتے باز کو تو جانتا ہے مگر ذرا اس سے پوچھئے آیا وہ سمیرا دسکی، دچے کا دسکی یا فلسفہ دان سولووی اوف کے بارے میں کچھ جانتا ہے ــــ وہ سر ہلا کر رہ جائے گا۔ . . . کمبختی سی کمبختی ہے"!

تین منٹ تک سکوت چھایا رہا۔

مدمقابل نے سکنت سے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی ایک سوال پوچھنے دیجئے۔ کیا آپ نے پشکوف کا نام سنا ہے"؟

"پشکوف ؟ ایں . . . . پشکوف . . . . نہیں تو۔ کبھی سنا تو نہیں"۔

مدمقابل نے سراسیمگی سے مغلوب ہو کر کہا "یہ میرا نام ہے۔ تو گویا آپ نہیں جانتے۔ اور اس کے باوجود میں روس کی ایک یونیورسٹی میں پینتیس سال تک پروفیسر رہا ہوں، سائنس اکادمی کا ممبر ہوں۔ ایک سے زیادہ تصنیفوں کا مصنف ہوں . . . "

پہلے درجے کے مسافر اور اس کے مدمقابل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بے تحاشا ہنسنے لگے۔

مخزن المخازن

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی یاد میں

عُمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات — تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ستمبر کے "مخزن" کے یہ کالم اُس مردِ خدا کی یاد کے لئے وقف کئے جاتے ہیں جس نے ہندوستان کے بے اماں مسلمانوں کو غلامی، بے یقینی اور انتشار کی خاکِ مذلّت سے اٹھا کر تختِ حکومت پر بٹھا دیا اور جو بفضلِ ایزدی دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت قائم کر کے اور ہمیں ایک دارالامان بخش کر، گذشتہ سال، اسی مہینے میں، اپنے خالق سے جا ملا۔

ماہِ نو

حیاتِ قائد کا آخری سال

(فرّخ امین)

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی اس سوگوار گھڑی سے جب ہمارے قائدِ اعظم نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ہر طرح کے لوگ چھوٹے بڑے، امیر غریب مجھ سے اپنے مرحوم محبوب قائدِ اعظم کے متعلق سوال پر سوال کر رہے ہیں:۔

"ہمیں تو اُن کی بیماری تک کا علم نہیں تھا۔ یہ آخر ہوا کیسے؟"

"موت سے پہلے اُن کی حالت کیا تھی؟"

"اُن کی آخری گھڑیاں کس طرح کٹیں؟"

لوگوں کو اُن کی موت کا یقین نہیں آتا۔ خود وہ جنہوں نے اُنہیں موت کے خلاف جنگ کرتے دیکھا۔ ان کا دل بھی کسی طرح یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں اور یہ بات اس لئے ہے کہ ہم نے بارہا انہیں محض قوّتِ ارادی کے زور سے مہلک بیماریوں پر فتح پاتے دیکھا تھا اور اس لئے ان کے جانے کے بعد ہمیں یہ دنیا مردوں کی دنیا نظر آتی ہے۔ اُس دن کا ایک ایک منظر جو گورنر جنرل ہاؤس میں پیش آیا میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ پہلے وزیرِ اعظم آئے۔ پھر دوسرے وزیر پھر گورنر سندھ اور ان کے بعد مس جناح کے پاس آنے والے بے شمار گریہ کناں انسان۔ پھر جنازہ کی تیاریاں ہوئیں اور سب کچھ اس طرح ہوا جیسے رات کی ہولناک اور سنسان سیاہی میں بے جان حرکت کر رہے ہوں جن نے بے خبر سنی، دم بخود رہ گیا۔ جیسے کسی نے ضربِ کاری لگا دی ہو۔ ہماری زندگی میں کسی پُر عظمت اور پُر شان چیز کی کمی آگئی تھی۔ یہ غم بھی ہر غم کی طرح وقت کے ساتھ کم ہوتا جائے گا۔ لیکن نقصان کا شدید احساس دلوں میں ہمیشہ نشتر کی طرح چبھے گا۔

میری خوش نصیبی مجھے قائدِ اعظم کے قریب لائی۔ پاکستان کی عارضی حکومت کے قیام کے چار دن بعد ۲۲ر جولائی ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی میں مجھے حکم ملا کہ میں ٹھیک دس بجے محمد علی صاحب سکرٹری جنرل سے ملوں میں وقتِ مقررہ پر پہنچا اور انہوں نے مجھے اسسٹنٹ پرائیویٹ سکرٹری منتخب کر کے قائدِ اعظم کی خدمت میں پہنچنے کا حکم دیا۔ میں زندگی کے اس غیر معمولی تغیر پر مسرور بھی تھا اور کسی قدر پریشان بھی۔ مسرور تو اس لئے کہ کسی مسلمان کے لئے اس سے بڑی عزت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ اسے قوم کے معمار اور مملکت کے بانی قائدِ اعظم کی خدمت کا موقع

ملے ۔لیکن اس مسرت کے ساتھ مجھے تھوڑی سی پریشانی بھی تھی۔ اب تک میں نے قائدِ اعظم کو دُور سے، جلسوں کے منبروں اور اسمبلی کے ایوان میں دیکھا تھا اور ان کا گرویدہ تھا لیکن اتنی بڑی ہستی سے اس قدر قریب ہونا ذرا مختلف بات تھی اور اسی لئے جب میں مئی ۱۹۴۸ اورنگ زیب روڈ کی طرف جا رہا تھا۔ تو میری رفتار میں ایک عجیب قسم کی ہچکچاہٹ تھی۔ وہاں پہنچ کر اپنا کارڈ بھجوایا شاید میرے پہنچنے کی اطلاع قائدِ اعظم کو پہلے ہی دے دی گئی تھی۔ مجھے فوراً اندر طلب فرمایا اور میں ذرا سی دیر میں قائدِ اعظم کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ لمحہ میری زندگی کا اہم ترین لمحہ ہے۔ قائدِ اعظم صوفے پر تشریف فرما تھے اور سگار پی رہے تھے۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ گھبراہٹ اب بھی مجھ پر غالب تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے قائدِ اعظم مجھ سے کیا خدمت لیں گے لیکن قائدِ اعظم کے مخصوص مشفقانہ انداز نے بہت جلد میری گھبراہٹ ختم کر دی پہلے انھوں نے مجھ سے میری ذات، میری ملازمت اور میرے کراچی جانے کے متعلق کچھ سوالات پوچھے اور پھر خطوں اور تاروں کے اس ڈھیر کی طرف جو گورنر جنرل کے تقرر پر دُنیا کے مختلف حصوں سے قائدِ اعظم کے پاس آئے تھے۔ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا" کیا تم مہربانی کر کے ان پر ایک نظر ڈال لو گے"؟ یہ بات قائدِ اعظم نے ایسے لہجہ اور انداز میں فرمائی کہ جو تھوڑی بہت گھبراہٹ اب تک مجھ پر طاری تھی۔ وُہ یک لخت رخصت ہو گئی۔

اس کے دو ہفتہ بعد ہم کراچی پہنچ گئے اور آتے ہی سرکاری مصروفیتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۴ اگست کو جب دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا تو قائدِ اعظم نے فرمایا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ اسمبلی کا یہ اجلاس کراچی میں ان کی پہلی سرکاری مصروفیت تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ فضا قائدِ اعظم زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی اور میری آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے۔ اس دل افروز منظر سے قائدِ اعظم بھی متاثر تھے۔ انہوں نے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا" ہمارے پاس انسانی قوت کا کتنا شاندار سرمایہ ہے اگر ہم ان کے جوش کو صحیح راہوں پر لگا سکیں تو پاکستان یقیناً دنیا کی نمایاں مملکتوں میں سے ایک ہو"۔ اب ہم اسٹریچن روڈ پر وائی-ایم-سی-اے کی عمارت کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ اس عمارت کو دیکھ کر قائدِ اعظم نے فرمایا"۔ وائی-ایم-سی-اے تنظیم کی ایک بڑی اچھی مثال ہے تھوڑے سے آدمیوں نے دُنیا کے کونے کونے میں اس کی شاخیں قائم کر لی ہیں"۔ اس کے بعد باتوں باتوں میں قائدِ اعظم پارسیوں کے متعلق فرمانے لگے کہ یہ تھوڑے سے لوگ محض اپنی جانفشانی اور تنظیم کی بدولت عزت اور دولت دونوں کے مالک ہیں۔ اگر ہم بھی اپنے لوگوں کو صحیح تربیت دے کر منظم کر سکیں تو ہم حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں"۔

حالانکہ گورنر جنرل ہونے کے بعد قائدِ اعظم نے ایک لمحہ بھی آرام نہیں کیا اور آخر ان کی یہ کثیر الاشغالی ان کی موت کا باعث بنی۔ لیکن پاکستان کے قیام کے بعد کے ابتدائی دو مہینے ان کے لئے انتہائی مصروفیت اور پریشانی کے مہینے تھے۔ یہ وُہ زمانہ تھا جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو بے دردی سے تہ تیغ کیا جا رہا تھا اور مغربی پنجاب کی حکومت (جو ۱۶ اگست کو مسلم لیگی وزارت کے ہاتھ میں آئی تھی) کو یکایک مہاجرین کے سخت اور زبردست مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ یہ سخت آزمائش کا وقت تھا حکومت کے قدم متزلزل تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ پاکستان اپنے قیام کی پہلی ہی منزل میں ختم ہو جائے۔ قائدِ اعظم نے اس زمانہ میں جانفشانی سے کام کیا اور تزلزل کے اس اندیشناک دور میں ان کی آواز کی یہ گرج کہ" پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے"۔ لوگوں کے لئے سہارا بنی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان مستحکم ہو گیا اور مستحکم رہے گا۔ لیکن آزمائش کے اس دَور کی قائدِ اعظم کو بہت بڑی قیمت دینی پڑی۔ ان کی صحت خراب ہو گئی۔ بعض لوگ قائدِ اعظم کے متعلق کہتے تھے کہ دوسروں کا دکھ درد محسوس نہیں کرتے۔ یہ بے شک صحیح ہے کہ وُہ فکر اور اندیشہ کے ایسے موقعوں پر بھی جب دوسروں کے کمزور اعصاب پر جذبات کا غلبہ ہو جاتا، وُہ سکون اور توازن کو قائم رکھتے۔ اپنی پریشانی ظاہر کر کے دوسروں کو پریشان

نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کا باطن ان حالات سے درد و کرب میں مبتلا تھا۔ اس زمانہ میں میں نے انہیں دو ایک بار رات کی خاموشیوں میں سونے کے کمرے میں مضطربانہ ٹہلتے دیکھا ہے اور اسی لئے میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ان دنوں قائدِ اعظم کو یہ کرب نہ سہنا پڑتا تو وہ آج بھی ہم میں ہوتے۔ اللہ ان کی روح کو ابدی سکون دے

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب وہ دوسری بار لاہور تشریف لے گئے تو انہیں نزلہ ہو گیا اور اس زمانہ میں میں نے دیکھا کہ وہ اپنی صحت کے معاملہ میں کس قدر بے نیاز تھے۔ میں نے دو مرتبہ ان سے مؤدبانہ گزارش کی کہ اپنے لئے اچھے سے اچھا ڈاکٹر بلوانے کی اجازت دیجئے۔ لیکن دونوں مرتبہ انہوں نے مجھے یہ کہکر خاموش کر دیا "مسٹر امین مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں میرا گلا تو بارہا خراب رہ چکا ہے اور میں جانتا ہوں کہ ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیئے" (قائدِ اعظم مجھے ہمیشہ امین کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔ لیکن جب کبھی کوئی بات ان کے خلافِ مزاج ہو جاتی تو وہ نام کے پہلے مسٹر لگا دیتے اور یہ علامت تھی اس بات کی کہ جو کچھ میں نے کہا یا کیا ہے۔ وہ ان کی مرضی کے خلاف ہے۔ چنانچہ مجھے خاموش ہو جانا پڑا) قائدِ اعظم مزاحاً فرماتے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ ڈاکٹر مجھے "اپنے تجربہ" کا آلۂ مشق بنائیں۔ قائدِ اعظم کو اس بات سے بھی سخت نفرت تھی کہ کوئی نرس ان کی دیکھ بھال کرے۔ اس لئے کہ اپنے ذاتی کاموں میں انہیں کسی کی مدد اچھی نہ لگتی تھی شروع شروع میں میں ان کے کاغذات یا اُن کا قلم اُٹھا کر اُن کے سامنے رکھ دیتا لیکن انہوں نے کبھی اس بات کو پسند نہیں فرمایا۔

قائدِ اعظم اپنے خیالات اور عقائد کے معاملہ میں بڑے راسخ تھے۔ وہ صرف ایک مملکت کے گورنر جنرل ہی نہیں بلکہ قوم کے قائدِ اعظم بھی تھے اور جانتے تھے کہ قوم کے لئے کیا چیز سب سے اچھی ہے اور گو میں ان کا ادنیٰ خادم تھا۔ وہ ہمیشہ میرے نقطۂ نظر کو سنتے اور اپنا خاصا وقت صرف کر کے مجھے میرے خیال کی کوتاہیوں سے آگاہ کرتے۔ وہ عموماً معاملات کا فیصلہ خاصے سوچ بچار کے بعد کرتے۔ لیکن ہمارے خلوص کی قدر دانی کی خاطر کبھی کبھی ہماری بات مان کر اپنے فیصلے میں تبدیلی بھی فرما لیتے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ مئی ۱۹۴۸ء وہ پاکستان ملٹری اکیڈیمی کے افتتاح کے لئے کاکول تشریف لے جانے والے تھے کہ ان کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ لیکن وہ جانے پر مُصر تھے نہ صرف اس لئے کہ وہ وہاں جانے کا فیصلہ فرما چکے تھے بلکہ اس لئے بھی کہ انہیں اپنے کسی سرکاری پروگرام میں تبدیلی کرنا بے حد ناگوار ہوتا تھا۔ لیکن ہم سب کا خیال تھا کہ انہیں وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے ہماری بات مان لی اور آخری وقت کاکول جانے کا خیال ترک فرما دیا۔

قائدِ اعظم سے میرے تعلقات محض ایسے نہیں تھے جو گورنر جنرل اور اس کے اسٹاف کے درمیان ہونے چاہئیں۔ بے تکلفی کے لمحوں میں قائدِ اعظم شفقت اور کرم کا مجسمہ ہوتے تھے۔ خصوصاً ایسے لمحوں میں مجھ پر ان کے الطاف بے پایاں ہوتے تھے۔ اکثر مجھے یہ سعادت نصیب ہوتی کہ وہ مجھ سے اپنے خیالات اور رجحانات کے متعلق گفتگو فرمانے لگتے ہم لوگ لاہور میں تھے۔ ہندوستانی فوجیں کشمیر میں داخل ہو گئی تھیں۔ اسی زمانہ میں ایک دن قائدِ اعظم فرمانے لگے کہ مسلمان قوم کی ایک بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے دشمنوں کو خود ہم ہی میں سے ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو آسانی سے اُن کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ ایک اور موقع پر زیارت میں ایسے مسلمان گفتگو کا موضوع بن گئے جنہوں نے جنگ کے زمانے میں جنگی ملازمتیں کر لیں اور اپنے انگریز افسروں کو خوش کرنے کی اُمید میں شراب خوری کے عادی ہو گئے اس سلسلہ میں قائدِ اعظم نے فرمایا کہ یہ انسانی کردار کی انتہائی پستی ہے کہ وہ ایسی رکیک حرکتیں کر کے دوسروں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ جو کام ان کے سپرد کیا جائے۔ خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اسے قابلیت کے ساتھ اور اچھی طرح انجام دیں۔ دیر یا سویر ان کی محنت کا انعام ضرور ملتا ہے۔ کوئی آقا یا حکومت کسی مستحق ملازم کو ترقی کرنے سے ہرگز نہیں روک سکتی۔ اگر سرکاری ملازم اسی اصول کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور اُونچے

عہدے یا ترقی حاصل کرنے کے لئے سفارشوں اور سازشوں سے کام لینا چھوڑ دیں تو اقربا پروری اور دوست نوازی کا خاتمہ ہو جائے اور ہماری سیاسی زندگی کہیں زیادہ صحت ور عناصر سے معمور ہو جائے۔"

ایک دن کا ذکر ہے۔ قائداعظم بے حد مسرور معلوم ہو رہے تھے۔ فرمانے لگے: "زیارت مجھے بہت پسند ہے۔ اسے ایک خوبصورت شہر بنایا جا سکتا ہے۔ جہاں ہر جگہ بڑے بڑے آرام دہ ہوٹل، خوبصورت بنگلے، پارک، پھولوں سے بھرے ہوئے باغ بغیچے ہوں"۔ اس کے بعد مسکرا کر فرمایا: "تمہیں معلوم ہے کہ میں اسی طرح کے خواب دیکھتا ہوں اور کبھی کبھی میرے یہ خواب پورے بھی ہو جاتے ہیں۔ پاکستان بھی کبھی اسی طرح کا خواب تھا۔ اسی طرح کا یہ خواب زیارت کے متعلق ہے اور ممکن ہے کہ ایک دن یہ خواب بھی پورا ہو کر رہے۔"

قائداعظم کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ مجھے جتنے عرصے تک اُن کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہ زمانہ میرے ذہن پر نقش ہے۔ میں اپنے آپ کو بھول سکتا ہوں لیکن ان بیش بہا لمحوں کی یاد کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

قائداعظم کی شخصیت کی جس خصوصیت سے لوگ عموماً ناواقف ہیں۔ وہ ان کی لطافتِ مزاج ہے۔ کبھی کبھی وہ ہمیں کھانے کی میز پر مزے مزے کے لطیفے اور قصے سناتے۔ قائداعظم کا سنایا ہوا ایک لطیفہ مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے۔

انگلستان کے کسی چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر گاڑی معمول سے زیادہ ٹھیر گئی۔ ایک ہندوستانی جج نیچے اُتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے۔ اتنے میں ایک انگریز بھی گاڑی سے اُترا اور سیدھا جج صاحب کی طرف آ کر اُن سے پوچھنے لگا "گاڑی کب چھوٹے گی؟" جج نے جواب دیا "مجھے کیا معلوم؟" اس پر انگریز نے کہا۔ "لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔ کیا تم اسٹیشن ماسٹر نہیں ہو؟" اس پر جج نے کسی قدر جھنجھلا کر جواب دیا "نہیں میں اسٹیشن ماسٹر نہیں ہوں"۔ انگریز بولا: "اگر نہیں ہو تو ویسے معلوم کیوں ہوتے ہو؟"

قائداعظم کی آخری بیماری کے حالات لوگوں کو عام طور پر معلوم نہیں۔ ہوا یوں کہ کراچی میں قائداعظم نے کسی طرح بھی سرکاری کام کرنا کم نہ کیا۔ یہاں تک کہ جب ڈاکٹروں کے مشورے سے وہ تبدیلی کے خیال سے دو ایک دن کے لئے جا کر ملیر رہتے تو وہاں بھی کام کرنا یا لوگوں سے ملنا بند نہ کرتے۔ انہیں آرام کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے وہ ۲۵ مئی کو کوئٹہ کے لئے روانہ ہوئے۔ لیکن اسی آرام کے زمانہ میں پاکستان کے اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرنے کی غرض سے جون کے آخر میں کراچی تشریف لائے اور یہاں کے مختصر قیام میں اتنا کام کیا کہ جب وہ بلوچستان واپس پہنچے تو وہ سارے اچھے اثرات جو ایک مہینے کے آرام سے پیدا ہوئے تھے۔ زائل ہو چکے تھے۔ کام کی زیادتی نے انہیں پھر تھکا دیا تھا۔ وہ بیمار ہو گئے اور محترمہ فاطمہ جناح نے اس بات پر زور دیا کہ باہر سے کسی ماہر معالج کو بلا لیا جائے لیکن قائداعظم راضی نہ ہوتے اور مس جناح نے اس زمانہ میں قائداعظم کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی خاطر خدا جانے کتنے دن رات اپنے اور قائداعظم کے کمرے کے درمیان آتے جاتے گذارے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے قائداعظم سے کہا: "قائداعظم جو پاکستان آپ نے اتنی طویل جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے۔ اسے مضبوط بنانے کے لئے ابھی دس برس تک آپ کی ضرورت ہے۔" میں نے سنا ہے کہ ابھی ڈاکٹر صاحب اپنا جملہ پورا بھی نہیں کر سکے تھے کہ قائداعظم نے فرمایا: "میں اپنا کام کر چکا۔ اب مجھے مرنے کا رنج نہیں ہوگا۔ لیکن میں زیارت میں نہیں مرنا چاہتا۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنے وہی الفاظ دہرائے جو بعد میں یوم استقلال کے پیغام میں دہرائے گئے ہیں: "آپ کے پاس اب سب کچھ ہے۔ آپ آزاد اور ایک خود مختار مملکت، جس میں آپ زندگی کی تشکیل اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔ قدرت نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ کے وسائل لامحدود ہیں۔ سوائے کوئلے اور لوہے کے، لیکن یہ چیزیں بھی آپ اپنی فاضل پیداوار کے بدلے میں دوسرے ملکوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اب یہ کام نئی نسل کا ہے کہ وہ اپنے ملک کی تعمیر کرے اور

اسے مضبوط بنائیے۔"

اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ قائدِ اعظم ایک دن کوئی سرکاری کاغذ ملاحظہ فرما رہے تھے۔ اُن کی عینک پھسل کر نیچے گر پڑی۔ اُنہوں نے اسے اُٹھا کر پھر لگایا۔ لیکن وُہ پھر پھسل کر نیچے گر پڑی۔ ایک مرتبہ قائدِ اعظم نے میری طرف نظر اُٹھائی۔ جیسے وُہ متوقع ہیں کہ میں کچھ کہوں۔ میں نے عرض کیا۔ "قائدِ اعظم آپ کی عینک ڈھیلی ہو گئی ہے۔" اُنہوں نے فرمایا۔ "ہاں میرا خیال تھا کہ یہاں آکر میں ذرا توانا ہو جاؤں گا۔ لیکن اس کے برخلاف میں دبلا ہوتا جا رہا ہوں۔"

بیماری کے پُورے زمانہ میں قائدِ اعظم نے اس وقت تک سرکاری کاموں کا سلسلہ جاری رکھا جب تک ان میں ذرا بھی سکت باقی رہی۔ ہم انہیں کاموں کی اطلاع نہ دیتے۔ لیکن اگر انہیں پتہ چل جاتا تو وُہ کام کرنے پر مُصر ہوتے۔ مجھے وُہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب انہوں نے یو۔ این۔ او میں پاکستان کی نمائندگی کے لئے سر محمد ظفر اللہ خاں کو پورے اختیارات دینے کے لئے آخری سرکاری کاغذ پر دستخط کئے۔

قائدِ اعظم اپنی مسہری پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے کاغذ ان کے سامنے پیش کیا۔ اس پر نظر ڈال کر قائدِ اعظم نے میری طرف دیکھا اور فرمایا: "امین کچھ نظر نہیں آ رہا۔" میں نے یہ سمجھ کر کہ روشنی کی کمی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ بجلی روشن کر دی۔ قائدِ اعظم نے پھر کاغذ پر نظر ڈالی اور اسے پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا سی دیر میں وہاں سے نظر ہٹالی اور میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا۔ کاغذ کے پڑھنے میں انہیں اب بھی دقت ہو رہی ہے۔ کمرے کے بائیں طرف ایک کھڑکی تھی۔ اس پر ایک موٹا سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ کھڑکی کے پاس جا کر میں نے پردہ سرکا دیا کہ باہر سے روشنی آ سکے۔ اس مرتبہ بھی قائدِ اعظم کاغذ کی عبارت کو اچھی طرح نہ پڑھ سکے۔ دل کہہ رہا تھا کہ یا اللہ یہ کیا ہوا۔ اتنے میں مجھے دیکھا اور فرمایا کہ مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ان کی پسلیوں کے نیچے ہاتھ رکھ کر آہستہ سے سہارا دیا اور پیچھے کی طرف دو تکیے رکھ کر انہیں بٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن قائدِ اعظم کے لئے یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ وُہ اس طرح بیٹھ کر کاغذ پر دستخط کر سکیں۔ اس صورتِ حال سے اُنہیں بڑی اُلجھن ہوئی۔ وُہ مجھ سے فرمانے لگے کہ مجھے سہارا دو تاکہ میں پُوری طرح بیٹھ سکوں۔ میں نے ہاتھوں کے سہارے سے ان کے جسم کو سیدھا کیا۔ میں ان کے سامنے کی طرف کھڑا تھا اور میرے دونوں ہاتھ ان کی دونوں پسلیوں کے نیچے تھے۔ اس طرح اگر وُہ کاغذ پر دستخط بھی کرنا چاہتے تو میرے دونوں ہاتھ ان کے لئے رکاوٹ پیدا کرتے۔ اس لئے میں نے ان کے جسم کو ایک ہاتھ سے روکا اور پیچھے کی طرف جا کر اسے اپنے دونوں ہاتھوں پہ سنبھال لیا۔ اس وقت میرے دل کی یہ کیفیت تھی کہ جیسے میں نے شیشے کی کوئی بہت ہی نازک سی چیز پکڑ رکھی ہے اور میری ذرا سی کوتاہی سے بھی اس نازک شیشہ میں بال پڑ جائے گا۔ قائدِ اعظم نے اس وقت فرمایا: "مضبوطی سے پکڑو۔" یہ لفظ تحکمانہ انداز میں فرمائے گئے تھے۔ لیکن آواز میں کسی قدر ضعف تھا۔ اس طرح قائدِ اعظم نے بڑی مشکل سے اس کاغذ پر دستخط کئے۔ اس دستخط کا نقش اب بھی میرے سامنے ہے۔ اس میں قائدِ اعظم کے پچھلے دستخطوں کی سی استواری نہ تھی۔ اس وقت میرا دل رو رہا تھا۔ یہ نحیف جسم اور ہڈیوں کا یہ ڈھانچا جسے میں نے اپنے ہاتھوں میں سنبھال رکھا تھا۔ اسی شخص کا تھا۔ جس نے برسوں ہندوستانی اور انگریزی سیاست دانوں کا مقابلہ کیا اور جس نے منتشر مسلمانوں کو ایک منظم اور طاقتور قوم بنایا۔ اس کی آج یہ حالت ہے! جب کاغذ پر دستخط کر چکے تو قطعی تھک چکے تھے۔ اُنہوں نے بڑے درد ناک انداز میں فرمایا: "امین میں بھی ہانپ رہا ہوں اور تم بھی ہانپ رہے ہو۔" میرا سانس بیشک تیز تھا۔ لیکن اس لئے نہیں کہ قائدِ اعظم کو سہارا دینے سے تھک گیا تھا۔ میں تو اس لئے ہانپ رہا تھا کہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش نے مجھے تھکا دیا تھا۔ میرے ہاتھوں میں اور میرے جسم سے ملحق پاکستان کی سب سے محبوب شخصیت تھی جس کے ایک اشارہ پر لاکھوں آدمی اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں اور اس وقت اس کی یہ حالت تھی کہ بیماری کے ہاتھوں میں بے بس تھا۔ اس صورتِ حال نے میرے ذہن میں جو اضطراب پیدا کیا تھا۔ وُہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لئے

قائدِ اعظم کو بستر پر لٹاتے ہی میں تیزی سے کمرے کے باہر نکل گیا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

اس کے بعد سے میری کوشش یہ ہوتی کہ جہاں تک ممکن ہو میں قائدِ اعظم کی خدمت میں نہ جاؤں۔ اس لئے کہ وُہ جونہی مجھے دیکھتے تو انہیں کوئی نہ کوئی سرکاری کام یاد آجاتا اور اس کے متعلق گفتگو شروع کر دیتے۔ ۱۰ ستمبر کو کوئٹہ میں اُنہوں نے مجھے طلب فرمایا اور پوچھا: "کیا سب کچھ تیار ہے۔ فرض کرو کہ میں آج ہی کراچی جانا چاہتا ہوں" کراچی پہنچ کر قائدِ اعظم کو ملیر کے جس مکان میں ٹھہرنا تھا۔ وہاں کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ لیکن ہم لوگوں کا خیال تھا کہ ہم ۱۵ ستمبر سے پہلے وہاں نہیں جائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ "جی ہاں"۔ اس پر تھوڑے وقفے کے بعد فرمایا: "کیا مجھے کوئی ضروری کاغذ دکھانا چاہتے ہو؟" میں نے عرض کیا: "جی نہیں قائدِ اعظم کچھ نہیں" لیکن اس بات نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کی حالت اس قدر نازک ہے۔ پھر بھی ان کے دل سے مملکت کے کاموں کا خیال نہیں جاتا۔ اگلے دن ہم کوئٹہ سے چل دیئے کراچی پہنچنے کے کچھ دیر بعد ان کی حالت خراب ہو گئی۔ میں آخری وقت تک اُن کے پاس ہی تھا۔ رات کو دس بج کر دس منٹ پر ڈاکٹر نے ان سے کہا: "قائدِ اعظم آپ زندہ رہیں گے" قائدِ اعظم بولے: "نہیں اب نہیں" اور اس کے پندرہ منٹ بعد وُہ نہیں رہے ملت کا بانی دُنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ ہم سے رخصت ہو کر وُہ فنا نہ ہونے والوں میں جا ملا۔ قائدِ اعظم کے آخری لمحات بے حد پُرسکون تھے۔ موت کی آغوش میں بھی وُہ ہمیشہ کی طرح خاموش اور پُرعظمت نظر آ رہے تھے۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ ط

قائدِ اعظم رح

مجتبیٰ حسین

لذّتِ ہوش و بے خودی نہ رہی   ناز تھا جس پہ زندگی نہ رہی
زخم کچھ بھر چلا تھا غربت کا   اُٹھ گیا دستِ دلدہی نہ رہی
جس کی بیگانگی پہ شیدا تھے   آہ وُہ رسمِ دوستی نہ رہی
وُہ مجاہد وُہ سرفروش کہاں   سطوتِ عزمِ آہنی نہ رہی
ایک رُوحِ عظیم و جسمِ نحیف   عظمتِ ذکرِ آدمی نہ رہی
وُہ حقیقت شناسیاں نہ رہیں   راہِ منزل کی آگہی نہ رہی
وُہ جوانی کے ولولے نہ رہے   وُہ بڑھاپے کی پختگی نہ رہی
وُہ بصیرت وُہ فکرِ تابندہ   عقل کی نرم چاندنی نہ رہی
تجھ کو شمعِ مزار کیا معلوم   بزمِ عالم کی روشنی نہ رہی

"ایک روشن دماغ تھا نہ رہا"
"ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا"

کیسے منزل کا اب نشاں پائیں   تیرگی میں اُلجھ گئیں راہیں
کون جانے گا دردِ مہجوری   حالتِ زار کس کو سمجھائیں
"لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں   اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں"
مرنے والے ہمیں تو چھوڑ چلا   ہم کہاں جائیں کس طرف جائیں
تو ہمارے دلوں کی ہمت تھا   اب کہاں سے وُہ کرمیاں لائیں
تیرا اک حرفِ گرم جانِ عمل   جس کے تیشے سے کوہ تھرائیں
سب کی تقریر سن چکے ہیں ہم   "ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں"
تو وُہ معجز بیان مقرر تھا   نغمگی میں بدل گئیں آہیں
تیرا ہر لفظ ذوالفقارِ علیؓ   کوئی تجھ سا اگر ہو دکھلائیں
لوگ کیوں کر نہ تجھ کو پیار کریں   تو ہی کہدے نہ کس طرح چاہیں

حسرتِ دید ناتمام رہی
ساقیا! بزم تشنہ کام رہی   (منتخب اشعار)

اُردو ادب
قائدِ اعظم محمد علی جناح

قائدِ اعظم ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے ہیں تو ہمیں اُن کے احسانات

ایک ایک کر کے یاد آ رہے ہیں۔ جب ہم اپنے آپ کو بالکل بے یار و مددگار سمجھ رہے تھے، انہوں نے آ کر ہمیں تیکارا، دلاسا دیا اور ہماری منتشر قوتوں کو جمع کیا۔ ہمارے سامنے ایک معین نظریہ رکھا۔ ہمارے اندر اس کی محبت اور اس کے لئے جد و جہد کرنے کا حوصلہ پیدا کیا اور آخر ہمارے خوابوں کو حقیقت کر دکھایا۔ لیکن ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے احساس خودی کو جو بالکل مرنے کے قریب تھا از سر نو زندہ کیا اور ہماری قومی شخصیت کو ایک نئی توانائی دی۔ دراصل جس دن ہم نے سمجھ لیا کہ ہم مسلمان ہیں، مسلمان ہونا کوئی شرم کی بات نہیں ہے اور مسلمان کی حیثیت سے ہمارے کچھ سیاسی، معاشی اور تہذیبی حقوق بھی ہیں۔ جن کے لئے ہم جائز طور پر لڑ سکتے ہیں۔ اسی دن ہماری منزل آ گئی تھی۔ اسی دن پاکستان بن گیا تھا۔ جس دن ہم اپنے اوپر ایمان لے آئے اسی دن ہمارے خواب حقیقت سے زیادہ حقیقی ہو گئے۔

اور یہ سب اقبال اور جناح کے طفیل ہے۔ اقبال سے کہیں زیادہ جناح کے طفیل۔ کیونکہ اقبال کا اثر ایک محدود طبقے تک تھا جس میں بذاتِ خود اپنے نصب العین کے لئے جد و جہد کرنے اور قربانیاں دینے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس کے برخلاف جناح کا تخاطب براہِ راست عوام سے تھا اور عوام تک ان کی پہنچ بھی تھی۔ متوسط طبقے کے بہت سے لوگ شاید جناح کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کچھ دن ہچکچائے بھی ہوں مگر مسلمان کسانوں اور مزدوروں نے شروع ہی سے انہیں اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ کم سے کم اقلیتی صوبوں میں تو شروع ہی کے ضمنی انتخابات میں یہ منظر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ گاؤں سے رلتے دھنتے آئے ہیں، پھٹے کپڑے، چہرے پر گرد، ہڈیاں نکلی ہوئی۔ دوسروں کی طرف سے آوازوں پہ آوازیں پڑ رہی ہیں کہ جناح تو بس سبز باغ دکھا کے بیٹھے گا۔ ادھر آؤ۔ یہاں تمہیں روٹی ملے گی۔ مگر یہ ہیں کہ ان کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ ان لوگوں نے زبردستی کی اور ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا تو صاف صاف کہہ دیا کہ ہمیں اس طرح روٹی چاہئے ہی نہیں۔ قوم کی عزت بیچ کے روٹی نہیں لیں گے اور یہ محض ڈینگ نہیں تھی۔ ایک دو دن

نہیں، پورے دس سال تک یہ لوگ جناح کے نامزد کئے ہوئے نمائندوں کی اسی حوصلے کے ساتھ حمایت کرتے رہے۔ دوسروں میں اتنی ہمت اور اتنا یقین پیدا کرنے کے لئے آدمی کے اندر خود بے پناہ یقین اور ایمان چاہئے اور یہ ایمان جناح کے اندر اس وقت پیدا ہوا جب مسلمانوں کی ظاہری حالت دیکھتے ہوئے اس کی گنجائش بہت کم تھی۔ ہزیمت خوردگی، مایوسی اور بیچارگی بھی بہت بڑی قومی مصیبتیں ہیں مگر ذرا اس قوم کی حالت پر غور کیجئے جس کے پاس کوئی نصب العین سرے سے ہی نہ ہو۔ تعمیر کی حسرت ہو، شاید تعمیر کا حوصلہ اور تعمیر کی صلاحیت بھی ہو مگر یہ پتہ نہیں کہ ہمیں عمارت کیا بنانی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ اس سے بھی بڑا حادثہ یہ ہوا تھا کہ عوام میں اپنی شخصیت اور انفرادیت کا احساس، اسے برقرار رکھنے کی تمنا، ایک خاص قسم کی اجتماعی زندگی کا تصور، ماضی کی یاد اور مستقبل کا دھندلا سا خواب تو موجود تھا۔ مگر مسلمانوں کے اہلِ فکر طبقے کے بہت سے لوگ ان چیزوں سے بھی عاری ہو چکے تھے یا ہوتے جا رہے تھے۔

ایسے زمانے میں جناح نے اٹھ کر مسلمانوں کو یاد دلایا کہ تمہاری پشت پر تیرہ سو سال کی تاریخ ہے، روایت ہے، ایسا ماضی ہے جس سے نہ تمہارا حال دامن بچا سکتا ہے نہ مستقبل، تمہارے ماضی نے تمہیں ایک منفرد شخصیت، ایک مستقل تصورِ حیات دیا ہے جسے زندہ رہنے کا حق ہے جسے زندہ رہنا چاہئے اور جو زندہ رہ سکتا ہے۔

یہ سب سے ضروری اور عظیم بات تھی جو جناح نے ہمیں سمجھائی — یہی کہ ہماری قومی شخصیت زندہ رہ سکتی ہے۔ اجتماعی شخصیت کا احساس تو اور سیاسی رہنماؤں کو بھی تھا، اُسے برقرار رکھنے کی آرزو بھی تھی مگر کوئی دوسرا آدمی اس کی اہلیتوں پر ایسا ایمان نہیں رکھتا تھا۔ جو کام جناح نے کیا ہے۔ اس کے لئے خالی ذہانت، سیاست دانی، تدبر یا ہمت سے کام نہیں چلتا۔ کسی چیز کو بچانے کے لئے یہ سب باتیں لازمی تو ہیں مگر سب سے پہلے یقین کی ضرورت ہے — اندھے یقین کی ضرورت ہے — کہ ہاں یہ چیز بچائے

مدیر

جاننے کے قابل ہے اور اپنے اندر پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

جناح نے اس یقین کا مظاہرہ بار بار کیا اور ایسے ایسے موقعوں پر کہ جب خود ان کے ساتھیوں کا دل ڈوب چکا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جب قتلِ عام شروع ہوا اور پناہ گزین لاکھوں کی تعداد میں آنے لگے' اُدھر یہ حال کہ اپنے پاس نہ روپیہ نہ سامان' اُوپر سے ہر وقت حملے کا دھڑکا' اچھے اچھوں کے اوسان خطا ہو گئے اور ذمے دار سے ذمے دار آدمی کہنے لگے کہ بس اب پاکستان ختم ہوا مگر ایک جناح تھا جو برابر یہی کہے جا رہا تھا کہ نہیں جس چیز کی بنیاد عوام کی محبت اور عقیدت پر ہو وہ کیسے ختم ہو سکتی ہے اس عالمگیر مایوسی اور بددلی کے وقت بھی انہیں خود ہماری بے یقینی پر شک تھا اور وہ ہم سے پوچھ رہے تھے "کیا ہم دل شکستہ ہیں؟ ہرگز نہیں... سات کروڑ کی ایک متحد قوم کو جس کی پشت پر ایک عظیم تہذیب اور تاریخ ہو۔ کسی چیز کا کیا ڈر ہو سکتا ہے"۔

قوم کے مستقبل پر ایسا یقین یا تو جناح کو تھا یا پھر عام مسلمان کو۔ یوں دیکھنے میں تو وہ عام آدمیوں سے بہت مختلف تھے مگر ان کا ہاتھ عام آدمی کی نبض پر تھا۔ وہ اس کے دل کی دھڑکن اچھی طرح پہچانتے تھے۔ جب مسلمانوں کے اکثر سیاسی اور ذہنی رہنما پوری مسلمان قوم کو اتحاد و اتفاق سے بیگانہ، فکر و عمل کی صلاحیتوں سے عاری اور فی الجملہ ازکار رفتہ سمجھ چکے تھے انہوں نے خودی اور قومی شعور کی دبی ہوئی چنگاری کو دیکھ ہی نہیں لیا بلکہ راکھ کے ڈھیروں کو ہٹا کر اُسے دہکایا اور آخر شعلۂ جوالہ بنا کر چھوڑا۔ یہ درست ہے کہ وہ ہماری قومی شخصیت کی تفصیلات سے واقف نہیں تھے مگر انہیں اس کے علیحدہ اور مستقل وجود کا بڑا گہرا احساس تھا۔ غالباً وہ مسلمانوں کے ادب و شعر کے بارے میں مضمون نہیں لکھ سکتے تھے مگر انہیں یہ معلوم تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی روح نے ایک خاص ادب کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ غرض کہ انہیں مسلمان قوم کی پرکھ خوب تھی۔ اگر ہمیں اس موقع پر ایسا جوہری نہ مل جاتا تو ہمارے اجتماعی وجود کا زندہ بچنا محال تھا بلکہ یہ ہماری قوم کی زندگی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ ہم نے اپنے تاریک ترین دور میں اقبال اور جناح جیسے یقین کے مجسمے پیدا کئے۔ دراصل اقبال اور جناح دونوں ایک دوسرے کا ضمیمہ ہیں جو اقبال نے سوچا وہ جناح نے کر دکھایا۔ اقبال کے تصورات کی تجسیم جناح کی شکل میں ہوئی۔ انہیں دونوں نے مل کر قوم کی خودی کو از سرِ نو تخلیق کیا

چونکہ جناح کا دل قوم کے دل کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ اس لئے قوم نے ان کو اس طرح اپنا سمجھا کہ دنیا کی تاریخ میں بہت کم رہنماؤں کو ان کی قوم نے اس طرح اپنا سمجھا ہوگا۔ نہ تو وہ عوام کے سے کپڑے پہنتے تھے' نہ ان کے طور طریقے عوام کے سے تھے۔ وہ تو ٹھیک طرح اُردو بھی نہیں بول سکتے تھے مگر عام آدمیوں کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ انہیں اپنا سب سے بڑا ہمدرد اور غمخوار سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں یہ محسوس ہوتا تھا جیسے قائدِ اعظم براہِ راست ان کے ذاتی معاملات سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ میں نے ایک پھیری والے کو دیکھا جسے پولیس والوں نے تنگ کیا تھا۔ وہ اپنی درخواست میں ان کی شکایتیں لکھوا رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا کہ خیر یہاں تک تو درخواست دیئے دے رہا ہوں مگر کسی طرح جناح صاحب کو پتہ چل جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے"۔ اور یہ حال اس وقت تھا کہ جب جناح نے لفظِ عوام کو جا و بیجا استعمال نہیں کیا تھا مگر سوزِ دروں نے' دل کے درد نے فتح پائی اور جناح کی روح نے ظواہر کی دیواریں توڑ کر براہِ راست عوام پر اثر کیا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ہماری قوم نے بڑی مردم شناسی کا ثبوت دیا۔ قوم نے ہمیشہ جناح کے دل کو دیکھا۔ کپڑوں کو دیکھا ہی نہیں۔

قوم پر یقین اور ایمان کے علاوہ جناح میں ایک اور بات ایسی تھی جو اقبال کے سوا ہمارے زمانے کے کسی اور شاعر یا ادیب کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ یعنی ایک عظیم خیال پر پورا اعتقاد۔ "ہندوستان ٹائمز" نے تو ان کی وفات کے بعد شاید طنزاً لکھا ہے کہ ان میں ایسی قوتِ ارادی تھی جو حقیقتوں کو توڑ پھوڑ کر خوابوں کو حقیقت بنا سکتی تھی مگر اس سے زیادہ

جناح کی تعریف اور کیا ہو سکتی ہے۔ جب انہیں ایک مرتبہ یقین آگیا کہ یہ ایک عظیم خیال ہے تو پھر وہ مادی رکاوٹوں کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ جناح کا شمار یقیناً انسانی تاریخ کے عظیم تصور پرستوں میں ہوگا۔ محض ایک تصور کی بنا پر اپنے آپ کو تخلیق کے لئے آمادہ کرنا، ایک پوری قوم کے اندر تخلیقی جذبہ ابھارنا، نفی کو اثبات میں تبدیل کرنے کا خیال دل میں لانا ——— ان چیزوں کے لئے ایک بڑے شاعر کی شخصیت اور تخیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام قسم کا آدمی تو ایسے تصور کے بوجھ ہی سے پس کے رہ جائے۔ جناح کی شخصیت اور اس کے کارنامے کو شاعر کے تخیل سے بھرا ہوا محض شاعری نہیں ہے جناح واقعی اہلِ جذب اور اہلِ جنوں میں سے تھا۔ بس اتنا ہی تو ہے کہ وہ از خود رفتہ نہیں تھا۔ اس نے درویش صفت بانش و کلاہِ تتری دار کی سب شرائط پوری کر دیں۔ ویسے بھی دیکھئے تو بہت سے لوگ جناح کے کارنامے پاکستان کو آج تک شاعری سمجھتے رہے

عمر بھر لوگ جناح کو "وکیل" اور "سیاستدان" کہہ کر بدنام کرتے رہے ان کے دل کی لگن کسی نے نہ دیکھی مگر اپنی تخلیق کی اصلیت کو سمجھا بھی خود انہیں نے، اور اس کی طرف اشارہ بھی کیا۔ پاکستان وجود میں آنے سے پہلے بھی اُن کے لئے ایک عظیم تصور تھا اور وجود میں آنے کے بعد بھی ایک عظیم اور مقدس تصور رہا۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اس کی تعریف یوں پیش کی کہ پاکستان جغرافیائی حدود سے عبارت نہیں ہے۔ یہ تو چند انسانی تصورات کا نام ہے۔ کم سے کم اُن کی نظر میں پاکستان کی بنیاد تنگ دلی، تعصب اور خود پرستی پر نہیں تھی۔ اُنہوں نے اعلان کیا کہ پاکستان بننے سے انسانی روح ذات پات کی زنجیروں سے آزاد ہو گئی ہے اور اس آزادی کا مقصد یہ ہے کہ اُس روح کی صلاحیتیں ترقی کی منزلیں طے کرنے میں صرف ہوں۔ یہ تھا اُن کے ذہن میں پاکستان کا تصور۔ اور وہ اسی کو عملی شکل دینے کے لئے آخری سانس تک کام کرتے رہے۔ پہلے اُنہوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اُسے اپنی مسلسل جد و جہد سے زندہ حقیقت کر دکھایا۔ اب اُنہوں نے دوسرا خواب دیکھا تھا۔ جس کی تعبیر اُن کی نظروں کے سامنے نہ آسکی مگر وہ ہمیں بتا گئے کہ زندہ قوم کے عزائم کیا ہوتے ہیں اور اُن کے لئے کس طرح کام کیا جاتا ہے

کیا دولے نے موت پائی ہے!

اُن میں دُنیا سے، دُنیا والوں کی رائے سے، دنیاوی علائق سے فن کاروں کی سی بے نیازی تھی اور تخلیق کے لئے جس صبر و استقلال اور مسلسل کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ وُہ بھی موجود تھی۔ ایک بڑے فن کار کی طرح انہیں معلوم تھا کہ تخلیق اور شخصیت میں کتنا فصل ہونا چاہیئے۔ ذاتی زندگی میں انہوں نے اپنے اُوپر جو تنہائی مسلط کر لی تھی۔ اس کی مثال ادب اور فلسفے کی دُنیا سے باہر مل ہی نہیں سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُنہیں جینے کے لئے بس ایک عظیم تصور ہی کا سہارا کافی تھا۔ جب میں جناح کی ذاتی زندگی کا نقشہ ذہن میں جمانا چاہتا ہوں تو ایسا نظر آتا ہے جیسے کوئی عظیم سنگ تراش ان گھڑ اور بے ڈول مادّے کو کانٹ چھانٹ کر ایک نئی اور بے مثال ہیئت تخلیق کرنے کی دُھن میں کھو بیٹھا ہو۔ اُنہوں نے اپنی ذات کو اپنی تخلیقی جد و جہد سے اتنا علیحدہ رکھا تھا۔ بلکہ اُسے اپنے تخلیقی جذبے میں اس طرح حل ہو جانے دیا تھا کہ ان کا کارنامہ ہی ان کی سوانح عمری بن گیا ہے۔ اُن کی زندگی میں ایسا ضبط و نظم، ایسا ٹھہراؤ، ایسا تسلسل، ایسی ہم آہنگی، ایسی نشو و نما، ایسا تدریجی عروج ہے کہ وُہ بذاتِ خود ایک کلاسیکی نظم معلوم ہوتی ہے۔

جناح کا کارنامہ جناح سے الگ نہیں ہے۔ پاکستان زندہ ہے تو جناح زندہ ہے مگر بشریت کا تقاضا ہے کہ ہمیں جسمانی حیثیت سے جناح کے نہ ہونے پر پھر بھی رنج ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اور بھی کہ جس روح کو جناح نے عوام کے ساتھ مل کر آزاد کرایا تھا۔ اب اُس کی تخلیقی جد و جہد پہلے سے ہزار گنا مشکل ہو جائے گی۔ جن انسانی تصورات کا نام پاکستان تھا۔ ان کا بہترین پاسبان جناح تھا۔ اُن اقدار کی حفاظت تو خیر اب ہم سب کو مل جل کر کرنی ہی پڑے گی اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے جناح کا کام آپس میں بانٹنا پڑے گا۔ مگر جناح کے سے آہنی عزم اور ایمان کے بغیر ہم

مدیر

[redacted]

کتنی کمزوری محسوس کریں گے۔ بہرحال جناح کو ہم پر یقین تھا اور جناح کا یہ یقین ہی ہمیں ہمیشہ تقویت پہنچاتا رہے گا۔

ہماری تقویت کے لئے اس سے بھی ایک بڑی چیز موجود ہے۔ جسے جناح نے ہمیں بار بار یاد دلایا ہے ـــــ ہماری تاریخ اور ہماری روایت جب قائدِ اعظم کے سوگ میں ریڈیو پاکستان سے قرآن کی تلاوت ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جناح کی موت تیرہ سو سال کی تاریخ سے ملا دی گئی ہے۔ اس واقعے کو سمجھانے کے لئے ایک پورا پس منظر پیش کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اس ایک موت کو حیات و ممات کے کائنات گیر مسئلوں سے متعلق کر دیا گیا ہے۔ اسی ایک بات سے مسلمان قوم کی انفرادیت اور شخصیت ظاہر ہے۔ مسلمان کا سوگ بھی دوسروں کے سوگ سے مختلف ہے۔ ریڈیو پاکستان سوگ منا رہا تھا ـــ حافظِ قرآن کی آواز ہمیں بتا رہی تھی کہ موت کیا ہے، زندگی کیا ہے، زندگی کے مسائل کیا ہیں۔ زندگی کس طرح بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ اچھی زندگی کیا ہوتی ہے اور بُری زندگی کیا ہوتی ہے! انسان کو زندگی کس لئے عطا ہوئی ہے اور اُسے کس طرح استعمال کرنا چاہئے۔ جناح کے انتقال کے پس منظر میں یہ آواز ہمیں اپنی تاریخ کے غم اور خوشیاں، حادثے اور کامرانیاں یاد دلا رہی تھی۔ مسلمان قوم اتنا کچھ دیکھ چکی ہے۔ اتنا کچھ اس پر گذر چکا ہے۔ مگر ابھی تک زندہ ہے ـــــ نہ صرف زندہ ہے بلکہ عزت اور شان کے ساتھ رہنے کا جذبہ اس کے سینے میں بیدار ہو چکا ہے۔ یہ جذبہ جناح نے بیدار کیا ہے مگر اب قوم کو اس جذبے کی قدر و قیمت کا شدید احساس ہے۔ اب یہ جذبہ آسانی سے مر نہیں سکتا۔ جناح نے ہمیں یہ آرزو دی اسے پورا کرنے کا سامان بھی دیا۔ کیونکہ وہ ہمیں اس کا اہل سمجھتا تھا ہم اُس کی مہربانیوں سے زیادہ اُس کے اعتماد کے احسان مند ہیں کیونکہ جناح کے اعتماد نے ہمیں اپنے اُوپر اعتماد کرنا سکھایا۔ اب ہم اپنی تیرہ سو سالہ تاریخ کی رہنمائی میں جناح کی رُوح کی رہنمائی میں خود آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اب جناح کا باقی کام قوم خود کرے گی۔ قوم کی متحدہ کوشش سے وہ انسانی تصورات زندہ رہیں گے۔ جن کی بقا کے لئے ہم نے بڑی سے بڑی قربانیوں سے بھی دریغ نہیں کیا۔ پاکستان زندہ رہے گا اور اس کے ساتھ جناح بھی زندہ رہے گا۔

نوائے وقت

قائدِ اعظم اور اُردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ میں ایک مختصر جماعت نے جس میں زیادہ تر یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اُردو کے خلاف بڑی شورش مچائی۔ اس میں بیرونی سیاست کا بھی دخل تھا۔ جن لوگوں کو (خاص کر مغربیوں کو) مشرقی بنگال سے علیحدگی شاق تھی وہ چپکے چپکے نئے نئے انداز سے گمراہ کن خیالات پھیلا رہے تھے اور خفیہ طور پر مسلمان نوجوانوں کو آلۂ کار بنا کر اُردو کی مخالفت کا پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ ان عزیز طالب علموں نے وائس چانسلر ارکان کونسل اور اپنے پروفیسروں اور معزز وزراء سے جس بدتہذیبی اور بدتمیزی کا برتاؤ کیا۔ وہ نہایت قابلِ افسوس تھی۔ انہیں دنوں میں قائدِ اعظم مشرقی پاکستان کے دورے پر جانے والے تھے۔ وہاں کے ارکانِ حکومت اور حکامِ انتظامی پریشان تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سرپھرے نوجوان کوئی ایسی ناشائستہ حرکت کر بیٹھیں۔ جو ہمیشہ کے لئے ہماری ذلت اور بدنامی کا موجب ہو۔ لیکن قائدِ اعظم ایک زبردست شخصیت کے انسان تھے۔ ایسی شورشوں کو وہ کب خیال میں لاتے تھے۔ وہ ڈھاکہ پہنچے اور ۲۲ مارچ کو اپنی تقریر کے دوران میں نہایت واضح اور صریح اور پُرزور الفاظ میں ارشاد فرمایا۔

"میں یہ واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہی ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں۔ ہر وہ شخص جو اس بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے یقیناً پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو مربوط رہ سکتی ہے اور نہ اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو آپ کو خود ہی یہ معلوم ہو جائے گا۔ جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی۔"

یہ سنتے ہی وہ ہنگامہ جو برق و رعد سے بھی زیادہ شدید اور قوی معلوم ہوتا تھا ہوا ہو کے رہ گیا۔ دو روز بعد ۲۴ مارچ کو اپنی ایک دوسری تقریر میں اُردو کے متعلق یہ الفاظ فرمائے:

"ایک ملک میں صرف ایک ہی مشترک زبان ممکن ہے۔ دراصل زبان ہی وہ شے ہے جو حکومت کے مختلف صوبوں کے درمیان اظہار خیال کا واحد ذریعہ ہے اور وہ زبان اُردو ہی ہونا چاہئے۔ کوئی دوسری زبان اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔"

اس کے بعد اس تمام سازش اور شورش پر اوس پڑ گئی۔ طلبہ کے اس ہنگامی فساد سے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان اُردو کے مخالف ہیں۔ حالانکہ یہ شورش صرف ایک مختصر جماعت کی تھی۔ ورنہ مشرقی پاکستان میں ۹۰ فیصدی سے زیادہ اُردو کی حمایت میں ہیں۔ چنانچہ اس زمانے میں سلہٹ اور دوسرے مقامات کے مسلمانوں نے اس شورش پسند جماعت کا بڑا سخت مقابلہ کیا۔ اب وہاں والے اُردو کی خوبیوں اور صلاحیتوں کو سمجھنے لگے ہیں اور روز بروز اُردو کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ (اقتباس)

آفاق

جناحؒ اور اقبالؒ کی خط و کتابت

(محمد شفیع)

دنیائے اسلام کی دو عظیم الشان شخصیتوں قائد اعظم محمد علی جناحؒ اور حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کے درمیان باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ ۱۹۳۶ء میں شروع ہوا اور حضرت علامہ کے وصال تک جاری رہا۔ ان خطوط کا موضوع عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ برِّ اعظم ہند میں ملتِ اسلامیہ کے استقلال کے لئے کون سا طرزِ عمل اختیار کیا جائے..... بدقسمتی سے اقبالؒ کے نام جناحؒ کے خطوط نہ مل سکے۔ وہ سب کے سب علامہ اقبالؒ کی زندگی ہی میں تلف ہو گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب روزمرہ کی ڈاک ملنے کے بعد اس میں جو ضروری خطوط ملتے، ان کا جواب لکھوا دیا کرتے لیکن ان خطوط کو محفوظ رکھنے کے متعلق ان کی کوئی ہدایت نہ تھی۔ چنانچہ مجھے آج انتہائی ندامت کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ قائد اعظم کے بہت سے خطوط اس زمانے میں میرے ہاتھوں ہی ردی کی ٹوکری کی نذر ہوتے رہے..... اگرچہ قائد اعظم کے خطوط ضائع ہو چکے ہیں۔ لیکن مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ کہ وہ اپنے ابتدائی خطوط میں بار بار اس بات کا اظہار کیا کرتے کہ میں تو بہت تیز چلنا چاہتا ہوں۔ لیکن قوم کی تنظیمی حالت ایسی نہیں کہ وہ ساتھ قدم بڑھا کر چل سکے"۔ اپنے ایک اور خط میں قائد اعظم نے لکھا تھا:

"اس بات میں کوئی فائدہ نہیں کہ لیڈرشپ تیز چلتے چلتے قوم کے کارواں سے علیحدہ ہو جائے۔ ہمیں ماضی کے واقعات سے سبق لینا چاہئے"۔ (اقتباس)

استقلال

قائدِ اعظم کے پیغاماتِ عید

(افتخار ملک)

۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ تاریخِ قیامِ پاکستان میں بہت اہم ہے۔ اس دوران کے پیغاماتِ عید جو ہمارے محبوب قائدِ اعظم نے ہندوستان کے برِّ اعظم میں بسنے والے مسلمانوں کو دیئے نہایت سادہ اور اچھے پیرائے میں پاکستان کے حصول کی جدوجہد کے مختلف مراحل کو پیش کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۹ء

سنہ ۱۹۳۹ء میں عید کے موقع پر سیاسیاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا:

"مسلمانانِ ہند مستقبل کے ہندوستان میں حقوق اور دعوے رکھتے ہیں لیکن وہ اپنے نصب العین کے لئے ضد سے کام نہیں لیں گے کیونکہ یہ اس جذبۂ محبت اور رواداری کے خلاف ہے جس کا سبق ہمارے محبوب پیغمبرؐ نے دیا اور جو ہمیں عید کے موقع پر یاد رکھنا چاہئے:-

"آدمی کو قرآن شریف میں خدا کا خلیفہ کہا گیا ہے اور اس خطاب کے مستحق ہونے کے لئے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم بندگانِ خدا کے ساتھ اس طرح سلوک کریں جس طرح خدا بنی آدم کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔"

"اس عید کے موقع پر اس جذبہ کا اظہار جو ہم میں نماز اور روزے

نے پیدا کیا ہے۔ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے گھر میں۔ اپنی قوم میں اور اپنے ملک میں مکمل ہم آہنگی، مطابقت اور اتحادِ عمل پیدا کریں۔

میری آپ سب سے پُرزور درخواست کرتا ہوں کہ یہ کبھی نہ بھولئے کہ اسلام ہر ایک مُسلمان سے توقع رکھتا ہے کہ وُہ اپنی ملّت کے متعلق اپنے فرض کو ادا کرے۔"

۱۹۴۰ء

پاکستان کی قرارداد جو "لاہور ریزولیوشن" کے نام سے مشہور ہے منظور ہو چکی تھی اور مسلمانوں کی سیاست خیالی پیچیدگیوں سے نکل کر ٹھوس اصُولوں کی طرف آ چکی تھی۔ نومبر ۱۹۴۰ء کے پیامِ عید میں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کو اتفاق اور یکجہتی کی تاکید کی۔ آپ نے فرمایا:۔

"اتحاد سے ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیں کہ ہم اقلیت نہیں ہیں۔ ہم اس ملک کے لئے مجوزہ پارلیمنٹری نظامِ حکومت کے قائل نہیں ہیں۔ ہم ایک قوم ہیں اس لئے ہمارے پاس اپنا ملک اور اپنی حکومت ہونی چاہیئے۔

۱۹۴۱ء

اکتوبر ۱۹۴۱ء میں مسلمانوں کو عید کا پیامِ تہنیت دیتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا:۔

"رمضان روزہ داری، عبادت اور خُدا کے ساتھ لَو لگانے کا مہینہ ہے۔ یہ وُہ مُبارک مہینہ ہے جس میں قرآن حکیم نازل ہوا۔ رمضان زیادہ تر ایک روحانی تربیت ہے۔ لیکن اس تربیت کی تکمیل میں اس کی اخلاقی معاشرتی اور فطری تربیت بھی کم کُچھ نہیں۔ یہ آپ کو بتاتی ہے کہ بھوکا رہنا کیا ہے۔ یہ فرض کی ادائیگی میں تکلیف اُٹھانے اور ہر طرح کی مصیبت کا مقابلہ کرنے کا سبق سکھاتی ہے۔ اس کے جسمانی پہلو بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ یہ معدے کے اعضاء کو آرام پہنچا کر جسم کو اس زمین کی طرح صحت اور طاقت بخشتا ہے جسے ہل چلا کر ایک سال تک بغیر جوتے چھوڑ دیا جائے۔"

"اس کے معاشرتی پہلو بھی بہت اہم ہیں۔ اسلام معاشرتی اور اجتماعی زندگی پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ ہر روز ایک علاقے کے امیر غریب بڑے اور چھوٹے سب مسلمان پانچ دفعہ انسان کے صحیح برابری کے اصول کے مطابق جمع ہوتے ہیں اور اس طرح ایک خوشگوار معاشرتی زندگی کی بنیاد عبادت کے ذریعے پڑتی ہے۔ رمضان کے آخر میں ہلالِ عید نویدِ مسرت لاتا ہے اور خوشی کے شادیانوں کے ساتھ ہی یہ مسلمانوں کے ایک زبردست اجتماع کی خبر بھی لاتا ہے۔ عید کی خوشی ایک ایسی خوشی ہے جو انسان کو ایک فرض کے احسن طریق پر ادا ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

"آیئے ہم ایک اور نہایت اہم فرض کے لئے تیار ہو جائیں اور اس بڑے دن مصمم ارادہ کریں کہ ہم اپنے قومی فرض کو پُورا کریں گے اور اپنی قوم کے ساتھ جو اس ملک میں آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہے وفاداری کریں گے۔ آیئے ہم سب مل کر خدا کے آگے دُعا کریں کہ وُہ ہمیں اس عہد کو پُورا کرنے کے قابل بنائے اور ہمیں اس کے لئے طاقت بخشے۔"

"ہمارا اصول ایمان، اتحاد اور تنظیم ہو۔"

یہ وُہ زمانہ تھا جب کہ دوسری جنگ عظیم اپنے خوفناک دَور سے گزر رہی تھی اور میدانِ کارزار دُنیا کے مختلف حصوں میں پوری شدت کے ساتھ گرم تھا۔ حکمرانوں کی جنگی مشکلات دیکھتے ہُوئے کانگرس سودا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن قائدِ اعظم کو "ہندوستان چھوڑ دو" کے شور میں ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی وجود کی موت نظر آئی اور اُنہیں خدشہ ہوا کہ کہیں برطانوی سامراج کانگرس کے دباؤ میں آ کر مسلمانوں کے لئے ابدی ہندو غلامی کا ذریعہ نہ بن جائے۔ قائدِ اعظم کی اَن تھک کوشش، ہمت اور سرگرمی نے اسلامی ناؤ کو ہر طرف کے طوفانی تھپیڑوں سے بچائے رکھا اور مسلمانوں کو آخرکار مکمل آزادی کی آخری کش مکش کے لئے تیار کر دیا۔

۱۹۴۲ء

اگست ۱۹۴۲ء کے پیامِ عید میں قائدِ اعظم نے فرمایا:

"اب ہمارے سامنے آزادی کی جنگ کے اصلی واقعات اور تجربے آرہے ہیں اور اس وقت میں تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ منظم ہو جائیں اور ایک تربیت یافتہ قوم کی طرح اپنی تمام قوت اور طاقت کو ایک مرکز پر جمع کریں اور ہر امکان کے لئے تیار رہیں۔"

"آزادی کی راہ آسان نہیں۔ آزادی، قربانی، دُکھ سہنے اور رستے سے تمام رکاوٹیں دُور کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک مسلمان آدمی، عورت اور بچہ اس مبارک دن میں یہ مصمم ارادہ کرے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ تعلیمی ہو یا معاشرتی۔ اقتصادی ہو یا سیاسی تربیت یافتہ انسانوں کی طرح کام کرے اور اس طرح اپنی قوم کے لئے جو دس کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ ایسی جگہ حاصل کرے جو ہمارے روشن ماضی اور تاریخی روایتوں کی یاد کو تازہ کرے۔"

"آج ہمارے لئے افق پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ برطانوی حکومت اور وہ اکثریت جس کی کارگزاریاں راز میں گھری ہوئی ہیں ہمیں ہر طرف سے بدنام کیا جاتا ہے اور ہمارے متعلق ہر طرح کی غلط بیانی کی جاتی ہے اور ہمیں دھمکیاں تک دی جاتی ہیں مسلم لیگ کے خلاف بہت زبردست پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور سارا الزام اس کے سر تھوپنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کے لئے ذرہ بھر بھی معقول وجہ نہیں ہے۔"

"مجھے یقین کامل ہے کہ اگر دس کروڑ مسلمان متحد رہے تو دشمنوں کی تمام چالیں اور چالاکیاں بُری طرح سے ناکام ہوں گے اور ہم اس کشمکش میں کامیاب ہوں گے اور ہم پاکستان ضرور حاصل کریں گے۔ اسی میں ہماری نجات ہے اور اس کے بغیر ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

"ہم نے دلیلیں دینے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ہم نے التجا اور منت و سماجت بھی کی اور ہم نے بہت سی رعایتیں بھی دیں۔ لیکن سب لاحاصل۔ ہمارے سامنے ایک مہیب اور ہیبت ناک کشمکش ہے ہمیں اس کا مردانہ وار ہمت سے تربیت یافتہ قوم کی حیثیت سے منظم ہو کر مقابلہ کرنا ہوگا

ہمیں ناکامی، نارسائی اور رکاوٹوں سے نا اُمید نہیں ہونا چاہئے اور نہ کامیابی سے ہمیں مغرور اور شاداں ہی ہونا چاہئے۔ ہمارا مطالبہ سچائی اور حقیقت پر مبنی ہے اور ہم کبھی ناکام نہیں ہوں گے۔

"اس نازک مرحلے پر ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے۔ آئیے ہم ایک متحدہ قوم کی حیثیت سے ایک قومی جھنڈے کے نیچے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور یقین محکم۔ کتنے ہی بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی تیار رہیں۔ ہمارا دستورالعمل اتحاد، یقین اور اطاعت ہونا چاہئے۔ خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہماری کامیابی یقینی ہے۔"

آزادی کے بعد

یہ بیانات ایک بڑے قائد سے ایک بڑی قوم کی طرف تھے اور انہوں نے اپنا مطلب اُمید سے پہلے حل کر دیا۔ پاکستان کی آزاد حکومت ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو بن گئی اور اسی دن قائد اعظم نے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اعلان کیا:-

"ہمارا مقصد ہے کہ مُلک کے اندر اور باہر امن ہونا چاہئے۔ ہم اپنے ہمسایہ ممالک اور دوسری دُنیا کے ساتھ امن سے رہنا چاہتے ہیں اور اچھے دوستانہ تعلقات کے خواہشمند ہیں۔ ہم کسی اور کے خلاف کوئی جارحانہ قدم نہیں اٹھانا چاہتے۔ ہم مجلس اقوام متحدہ کے منشور کو مانتے ہیں اور ہم خوشی سے دُنیا کے امن اور خوشحالی کو قائم رکھنے اور بڑھانے کے لئے اپنا فرض ادا کریں گے۔

انہوں نے مزید فرمایا: "پاکستان بہت بڑے قومی ذرائع کا حامل ہے لیکن اسے مُسلم قوم کے شایانِ شان مُلک بنانے کے لئے ہمیں اپنی تمام قوت اور ہمت جو ہمارے پاس ہے۔ خرچ کرنی ہو گی اور مجھے یقین ہے کہ ہر شخص اس کام میں پُوری طرح حصہ لے گا۔

تاہم پاکستان کی امن پسندی کو اس کے دشمنوں نے کمزوری سمجھا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل نے پنجاب۔ دہلی اور ہندوستانی ریاستوں کے

مسلمانوں کو بربریت، قتل و غارت، آتش زنی اور لوٹ مار کا نشانہ بنایا۔ برطانوی سامراج اور کانگرسی حکومت یہ جانتے ہوئے بھی کہ مسلمانوں کے قتلِ عام کے منصوبے پوری قوت اور تنظیم کے ساتھ تیار کیے گئے تھے۔ ان کو بچانے کے لیے کوئی مؤثر اور مناسب قدم نہ اٹھا سکی۔ پچاس لاکھ سے زائد مسلمان مہاجرین نے خانماں برباد ہو کر پاکستان میں پناہ حاصل کی۔ اس دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان کی حکومت مظلوم انسانیت کے اتنے بڑے سیلاب کی دیکھ بھال اور انہیں پھر سے بسانے کے کام کی مشکل کی وجہ سے ہی ایسی دب جائے گی کہ پھر اُٹھ نہ سکے گی لیکن خداوند کریم کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایسے مصیبت کے وقت میں جب کہ آسمان اندھیرے بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ہلالِ عید نویدِ مسرت لایا۔

سنہ ۱۹۴۷ء

قائدِ اعظم کا ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء والا پیامِ عید لاکھوں مصیبت زدہ انسانوں کے لئے اُمید، ہمت اور اعتماد کا پیام تھا۔

اُنہوں نے فرمایا:

"اللہ اکثر اُن لوگوں کا امتحان لیتا ہے جن کے ساتھ اُسے محبت ہوتی ہے۔ آج خدا پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کا امتحان لے رہا ہے۔ اس نے ہم سے زبردست قربانیاں مانگی ہیں۔ ہماری نئی حکومت ان زخموں سے خون آلود ہے جو ہمارے دشمنوں نے ہمیں پہنچائے ہیں۔ ہندوستان میں رہنے والے ہمارے مسلمان بھائی صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ظلم و ستم کا شکار بنے ہوئے ہیں اور انہیں پاکستان کے ساتھ ہمدردی رکھنے کی وجہ سے قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ سیاہ بادل ہمیں چاروں طرف سے اس وقت گھیرے ہوئے ہیں۔ لیکن ہم ہمت نہیں ہاریں گے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے اس خطرناک دور پر دشمنوں کے منصوبوں کے باوجود اُسی طرح غالب آ جائیں گے جس طرح ہم نے اپنی پچھلی تاریخ میں ایسے دوروں پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ ہم اس مصیبت کی تاریک رات سے کامیاب و فتح مند اور مضبوط ہو کر نکلیں گے اور دُنیا کو دکھا دیں گے کہ ہماری حکومت نہ صرف زندگی کے لئے بلکہ اچھی زندگی کے لئے جیتی ہے"

"دُنیا کی کوئی طاقت پاکستان کو برباد نہیں کر سکتی۔ جتنی زیادہ ہمیں قربانیاں دینی پڑیں گی۔ اتنے ہی ہم صاف اور پاکیزہ ہو جائیں گے جیسے سونا آگ میں سے نکل کر خالص ہو جاتا ہے۔"

میرا پیغام آپ کے لئے اُمید، ہمت اور کامل اعتماد کا پیغام ہے آیئے ہم اپنے تمام ذرائع کو منظم طور پر جمع کریں اور ان اہم اور مشکل اُمور کو جو ہمیں درپیش ہیں۔ ایسی سنجیدگی اور ارادے کی پختگی سے سلجھائیں جو ایک بڑی قوم کے شایانِ شان ہو۔ پاکستان زندہ باد!"

عہدِ استوار

(مجتبیٰ احسانی)

السلام اے قائدِ قوم اے امیرِ کارواں
السلام اے بانیٔ راحت گہِ اسلامیاں

اے کہ تیری ذاتِ عالی وجہِ ناز و افتخار
آج تک ہے قومِ مسلم تیرے غم میں سوگوار

چشمِ فطرت سے ٹپکتا ہے ابھی تک اشکِ خوں
بام و در پہ ہے ابھی تیری جلالت کا فسوں

اپنی ملت کو سکھایا تُو نے اے عالی نظر
مُسکرانا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

تیری ہر آوازِ حق اُٹھ کر بساطِ خاک سے
جا کے ٹکرائی ہے پیہم گنبدِ افلاک سے

بالیقیں صدیوں تک اس دُنیا کا کوئی انقلاب
پیش کر سکتا نہیں تیرے تدبر کا جواب

صدقِ دل سے عہد کرتے ہیں یہ ہم تیرے حضور
ارضِ پاکستان کو جنت بنائیں گے ضرور

ہمتیں اپنی جواں اور دل جری رکھتے ہیں ہم
بازوؤں میں اپنے زورِ حیدری رکھتے ہیں ہم''

آنہیں سکتا ہمارے عزمِ راسخ میں خلل
تیرا افسانہ ہمیں ہے مشعلِ راہِ عمل

جو چمن تو نے سجایا ہے باِیں عزمِ صمیم
ہو نہیں سکتا وہ اب آلودۂ پائے غنیم

وقت کی رفتارِ نازک کو بدلنا ہے ہمیں
تیری دکھلائی ہوئی راہوں پہ چلنا ہے ہمیں

اہم ورق

قائدِ اعظمؒ زندہ باد

قائدِ اعظم محمد علی جناح اپنے پیچھے سوا ست پالیے ملتِ اسلامیہ سے غمگسار نے رحمتِ حق کے آغوش میں جگہ پائی۔ جادۂ حیات کا رہنما اپنے سفر کی آخری منزل پر جا پہنچا۔ جہاں رضوانِ الہٰی اس کا منتظر تھا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلیہ رَاجِعون۔

اس کے نحیف جسم میں ایک طوفان روح چھپی ہوئی تھی۔ اس کا عزم کہسار سے زیادہ پایندہ و محکم تھا اور اس کی ہمت عقاب ہے جو سنگ خارا کی چٹانوں میں نشیمن بناتا ہے۔ زیادہ بلند پرواز اور شباب سیر۔ وہ ایک جری اور بے باک سپاہی تھا جو چٹانوں سے ٹکرانے اور پُر خروش موجوں سے لڑنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس نے کئی بار رکاوٹوں کے پہاڑوں کو ٹکڑے کر دیا میں اڑایا۔ کئی مرتبہ پستیوں کو اُچھالا اور بلندیوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ لوگوں نے کہکشاں کو اس کی تلاش میں افلاک کی رفعتوں سے اُترتے بھی دیکھا ہے اور اس کے سمندِ ہمت کی گرد نے کبھی کبھی کہکشاں کی ہمسری کا دعوےٰ بھی کیا ہے۔ وہ سکندر یا نپولین کی طرح کوئی فاتح یا کشور کشا نہیں تھا۔ اس نے شہر فتح نہیں کئے۔ میدان نہیں مارے۔ پھر بھی اس کی فتح مندیاں ایسی ہیں۔ جن پر اس کی قوم ہمیشہ فخر کرتی رہے گی اور دنیا کا استعجاب کبھی کم نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگرچہ وہ ہندوستان کے بے بس اور مجبور مسلمانوں کا لیڈر تھا۔ جن میں ڈیڑھ سو برس کی مسلسل غلامی نے اُولوالعزمی اور بلند ہمتی کی رُوح باقی نہیں چھوڑی تھی اور وہ اپنی غلامی پر قناعت کر کے بیٹھ رہے تھے۔ تاہم اس کی فتح مندیوں کو دُنیا نے ہمیشہ حیرت و تعجب کی نظر سے دیکھا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کوئی بڑے سے بڑا شخص ایسا نہیں گزرا جسے مسلمانوں میں ایسی محبوبیت نصیب ہوئی ہو۔ ہم اپنے جھگڑوں میں پڑے ہوئے تھے۔ لیکن جب اس نے ہمیں پکارا تو اس پکار میں کچھ ایسی کشش تھی کہ ہم اپنے سارے جھگڑے بھول کے اس کے پیچھے ہو لئے۔ ہمارے کان اس کی آواز پر لگے رہتے تھے۔ ہماری نظریں اٹھتی تھیں تو اسی کی طرف اٹھتی تھیں ہمیں کچھ عادت سی ہو گئی تھی کہ اپنے سارے معاملات اس پر چھوڑ کے مطمئن ہو جائیں ہم اس سے محبت بھی کرتے تھے اور اس سے ڈرتے بھی تھے۔ کیونکہ وہ صرف ہمارا رہنما ہی نہیں تھا۔ بلکہ شفیق باپ اور غمگسار دوست بھی تھا۔ ہم اس سے اسی طرح محبت کرتے تھے جس طرح بچے باپ سے محبت کرتے اور ڈرتے ہیں۔ آج وہ ہم میں نہیں۔ لیکن ہمیں یقین نہیں آتا کہ وہ ہمیشہ کے لئے دُنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ نہ جانے کب اس کی آواز جس میں صاعقۂ جلالِ حق کی کڑک تھی۔ پھر گونج اُٹھے اور کب وہ طوفانوں کو چیرتا۔ موجوں کے رُخ پھیرتا ہمیں نئی راہوں اور نئی منزلوں کی طرف لے چلے۔ ہمارے کان اس کی آواز سننے کے لئے بے تاب ہیں اور ہمارے قدم اس کی قیادت میں نئی مسافتوں کو قطع کرنے کے مناسب وقت اور موقع کا انتظار کر رہے ہیں۔

قائدِ اعظم کے فیضِ تربیت سے ہمیں خود آگہی کی جو دولت نصیب

ہوئی ہے۔ وہ ہم میں موجود ہے۔ اُس نے ہم میں اولوالعزمی کی جو غیر مغلوب اور ناقابلِ تسخیر رُوح پیدا کر دی ہے۔ اس سے کوئی ہمیں محروم نہیں کر سکتا وہ ہمیشہ صبح کے ستارے کی طرح ہمارے ساتھ رہے گی اور اس کی روشنی میں ہمارے قدم برابر بڑھتے چلے جائیں گے۔ ابھی آسمان کئی بار جھکے گا۔ کہکشاں کئی مرتبہ افلاک کی بلندیوں سے زمین پر اُترے گی۔ پھر ہم یہ کیوں سمجھیں کہ قائدِ اعظم ہم میں موجود نہیں جب تک ہماری رُوح غیر مغلوب اور ہمارا عزم پائندہ ہے۔ پاکستان زندہ ہے اور جب تک پاکستان زندہ ہے ہمارا محبوب رہنما بھی زندہ ہے ـــ قائدِ اعظم زندہ باد۔

قائدِ دہر

(احمد ندیم قاسمی)

تُو نے اسلام کا بول بالا کیا\
ہر قیامت کو ہنس ہنس کے ٹالا کیا\
تُو نے ان ظلمتوں میں اُجالا کیا\
جن کو صدیوں سے افرنگ ڈھالا کیا\
تُو نے اِن راستوں کو اُجاگر کیا جن پہ صدیق رضؓ و فاروق رضؓ چلتے رہے\
تُو نے اُن قافلوں کو خراماں کیا جو پڑاؤ پہ پہلو بدلتے رہے\
بحرِ ہستی میں اسلام کی لہر تھا قائدِ ہند کیا، قائدِ دہر تھا\
آندھیوں سے نکلنا سکھایا ہمیں\
آن میں آسماں پر چڑھایا ہمیں\
راستہ زندگی کا دکھایا ہمیں\
ساری دُنیا کا دُولہا بنایا ہمیں\
تُو نے تلوار کو طاق پر رکھ دیا اور قرآن کو رہنما کر دیا\
یعنی صدیوں کے اُلجھے ہوئے راز کو چند باتوں کی حکمت سے وا کر دیا\
بحرِ ہستی میں اسلام کی لہر تھا قائدِ ہند کیا، قائدِ دہر تھا

ایک بے داغ آئینہ سیرت تری\
سلطنت کا سہارا تھا قوت تری\
ساری ملت کی حشمت تھی شوکت تری\
پاک فطرت تری نیک نیت تری\
آفتابِ جہاں تاب تیری شعاعیں ابد تک فضاؤں میں لرزاں رہیں\
تیرا چہرہ ابد تک فروزاں رہے تیری آنکھیں ابد تک درخشاں رہیں\
بحرِ ہستی میں اسلام کی لہر تھا\
قائدِ ہند کیا، قائدِ دہر تھا

یوایہوا (پیپنگ)

(دو چینی شاعروں کے لکھے ہوئے نوحے)

پیپنگ (چین) کے اخبار "یوایہوا" (YUEHJUA) میں حضرت قائدِ اعظمؒ کے متعلق دوسرے مضامین کے علاوہ دو چینی شاعروں ماٹنگ اور لُو ینگ کے لکھے ہوئے نوحے بھی شائع ہوئے تھے۔ ان نظموں کا انگریزی ترجمہ احمد علی اور لیو پیہہ لنگ نے انگریزی سہاہی پرچے "پاکستان" کی اشاعت اپریل ۱۹۴۹ء میں شائع کرایا تھا۔ ان نظموں کا اُردو ترجمہ استقلال لاہور نے بھی شائع کیا تھا۔ ذیل کے تراجم متذکرۂ صدر انگریزی اور اردو تراجم ہی سے ماخوذ ہیں۔

آگ سوزندہ رہے

(ماٹنگ)

"غم کو غصے میں بدلو\
"اور غصے کو آگ میں\
"اور آگ کو سوزندہ رکھو!"\
گزشتہ رات یہ الفاظ جناح سے کہے\
یا کم از کم میں نے سُنے!\
(پھر جناح نے کہا)

"خون کی آبیاری کے بغیر نخلِ تمنا کا ہرا ہونا،
"یا اُس میں نئے برگ و بار کی نمود،
"ناممکن ہے،
"مقاومت کے دستِ توانا کے بغیر
"تم امن اور مسرت حاصل نہیں کر سکتے،
"جاؤ میری طرف سے محمدؐ کے برگزیدہ فرزندوں کو،
"میرے مسلمان بھائیوں کو، یہ پیغام پہنچا دو!"

۲

میری آنکھ کھل گئی
(لوگ کہہ رہے تھے)
"جناح، رحلت فرما گئے"

یوں معلوم ہوا،
دُنیا کسی بھونچال کی گرفت میں ہے،
"زندگی کی بنیادیں لرز گئیں!

یوں معلوم ہوا،
جیسے رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں،
ہمارا روشن دیا،
یک بیک بجھ گیا ہو،
یا راستہ بتانے والا،
ہمیں تنہا چھوڑ کر کہیں نکل گیا ہو!
یوں معلوم ہوا،
جیسے ہمارا باپ،
اور ہماری ماں بھی،
ہم سے چھن گئی ہو،
یا جیسے مصیبت کی گھڑی میں،
صبر و قرار نے ہمیں جواب دے دیا ہو!
ہم مصیبت زدہ ہیں،
غمگین ہیں،
اور صدائے ماتم بلند کر رہے ہیں!

۳

لیکن میں پھر سُن رہا ہوں
جناح کی یہ آواز،
"غم کو غصے میں بدلو،
"اور غصے کو آگ میں،
"اور آگ کو سوزندہ رکھو!"

نوحہ

لوہ ییبنگ

یَاأَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝
فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ —

جناح! اے مقاومت، جہاد اور انقلاب کے نشان!
تجھے صحراؤں کے خانہ بدوش بھی پہچانتے تھے،
اور گنگا کے کناروں پہ بسنے والے بھی!
میرا کمزور دل آج غم کے مقابلے میں عاجز ہے،
میں رونے پر مجبور ہوں،
اگرچہ آنسو میرے غم کی شدت کے اظہار سے قاصر ہیں! —
او جناح! — رُوحِ انسانی تجھے کبھی بھولنے نہ پائے!
حکمرانوں کی نخوت اور دشمنوں کی لذتِ خون آشامی برقرار رہے گی،
لیکن تو صبر و اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لے،
کیونکہ جنگلوں میں،
اور ساحلوں پر،
تیرے بیٹے (ہی نہیں)
تیری بیٹیاں (بھی)
تلواریں ہاتھوں میں لئے،
حق کی حمایت کرتی رہیں گی!
وُہ تیرے طویل جہاد کو،
از سرِ نو شروع کریں گے،
اور یہ نسل (ہی)
تیرا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا دے گی!
یہ صرف ایک نوحہ نہیں،
حلف ہے!

نقوش

قائدِ اعظم

ادارہ

مغلوں کے زوال اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمان ابدی نامرادی کے غار میں گر چکے تھے۔ اُن کی ذہنیت میں افسردگی رچ بس گئی تھی۔ ان کے ارادوں کو تصوّف اور رہبانیت نے کچل ڈالا تھا۔ ان کے ادب میں انسان کی اولوالعزمی کے بجائے دُنیا کی بے ثباتی کا موضوع سما چکا تھا۔ ان کی معاشرت بادشاہوں کے جائز و ناجائز وارثوں یعنی جاگیرداروں اور صاحب ثروت لوگوں کا اجارہ بن چکی تھی۔ اُن کی سیاست میں فرنگی بادشاہوں اور ان کے نمائندوں کی قصیدہ خوانی اور خوشامد کے سوا کچھ نہ تھا۔ انہوں نے اپنے مذہب پر بھی ان گنت فرقوں، نقلی پیروں اور جادوگروں کو مسلط کر رکھا تھا۔ استبداد و استعمار کے خلاف بغاوت کرنے کو وہ سر پھروں کا مشغلہ سمجھتے تھے اور ان نشیبوں میں اُتر چکے تھے، جہاں زندگی محض ایک صدائے بازگشت اور موت ایک بے بہا حقیقت بن جاتی ہے اور جہاں انسان جان بوجھ کر بے احتیاطی سے شیشے کا برتن اُٹھاتے ہوئے اُسے توڑ بیٹھتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی تھی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون"—— ان حالات میں اجنبی حکمران سے اپنی لٹی ہوئی آزادی چھین لینے کا ولولہ اور اپنی قوم کے کلچر اور عقیدے کی حفاظت کا نعرہ بیشتر صورتوں میں حلق میں دب کر مر جاتا ہے۔ لیکن قائدِ اعظم کو انسانی شرف کی عظمت اور تمام انسانوں کی ناقابلِ شکست مساوات پر یقین تھا۔ وُہ جانتے تھے کہ قومیں لٹ سکتی ہیں مٹ نہیں سکتیں اور سورج غروب ہو سکتا ہے، بجھ نہیں سکتا۔

یہی وُہ یقین تھا جس نے قائدِ اعظم کے طویل اور دشوار سفر میں ان کا ساتھ دیا۔ اور آخر وُہ دن آ پہنچا جب قوم کو پروانۂ آزادی اور حق خود اختیاری ملا اور پاکستان نقشۂ عالم پر ایک تڑلے سے اُبھرا۔ پاکستان کی تخلیق اگرچہ لاکھوں انسانوں کے لہو سے آلودہ ہو گئی اور کروڑوں انسان معاشرتی حیثیت سے جھنجھوڑ کر رکھ دیئے گئے۔ مگر پاکستان کے دشمن بھی مانتے ہیں کہ اس میں نہ تو قائدِ اعظم کا قصور تھا نہ مہاتما گاندھی کا۔ ثقافتی حیثیت سے دو مختلف قوموں کی جبری یکجائی (جس میں مغل شہنشاہوں اور انگریز حکمرانوں کی دُور رس مصلحتیں پوشیدہ تھیں) صدیوں سے ایک ایسے ہی خوفناک اور غیر انسانی قتل و غارت کی غمازی کر رہی تھی اور پھر انگریز جو دسترخوان کے علاوہ سیاست میں بھی کانٹا چھُری استعمال کرنے کا عادی ہے جلتے جاتے اس آگ کو ہوا دے گیا۔ یہ دو قومیں یکجا بھی رہ سکتی تھیں اور قائدِ اعظم نے اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا میں ان کی یکجائی ہی کا نعرہ بلند کیا تھا مگر دونوں قوموں کے اقتصادی معیار میں تفاوت اور ثقافت اور عقیدے کے لحاظ جائز و ناجائز امتیازات نے اس یکجائی کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رکھی تھی۔

قائدِ اعظم کا مشن پُورا ہوا۔ پاکستان قائم ہو گیا—— لیکن ابھی اس نوزائیدہ ملک کو قائدِ اعظم ایسے بے غرض مخلص اور صاحب بصیرت مدبّر کی برسوں تک ضرورت تھی۔ اتفاق یا مصلحت نے ان کے گرد ایسے رہنماؤں کو جمع کر دیا تھا جن کی اکثریت جاگیرداروں پر مشتمل تھی اور پھر اس اکثریت کی ذہنیت بھی جاگیردارانہ تھی۔ ابھی قائدِ اعظم کو ان لوگوں کے ذہنوں میں سچی جمہوریت، بے لوث خدمتِ خلق، اور صدیوں کے جابر و قاہر حاکموں سے مکمل گلو خلاصی کے دو ٹوک فیصلے کی قوت بھرنا تھی کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو—— پاکستان کے قیام کے ایک برس بعد—— متحدہ برّ عظیم کا یہ نیک نام فرزند اور پاکستان کا یہ نامور خالق اس دُنیا سے اُٹھ گیا اور اپنے ملک کو ایسے عالم میں چھوڑ گیا کہ پاکستان کو قیامت تک برقرار رکھنے کا جذبہ تو ہر دل میں تھا، مگر پیٹ خالی تھے اور جسم نیم عریاں تھے اور پناہ گزینوں کے قدم ابھی اُکھڑے اُکھڑے سے تھے اور پاکستانیوں کے ذہن میں کھلبلی تھی اور پھر ابھی پاکستان کا کوئی دستور مرتب نہیں ہوا تھا!

قائدِ اعظم اگر چند برس اور زندہ رہتے تو ان تمام مسائل و مشکلات

کے حل ہونے کی اُمید تھی۔ لیکن وقت حسبِ معمول بے حد سفاک ثابت ہوا۔ قائدِ اعظم ہم سے چھن گئے اور اگرچہ ان کے ارشادات ہمیشہ ہمیشہ مشعلِ راہ رہیں گے۔ لیکن ان کے وجودِ گرامی سے ہم محروم ہو گئے اور اگرچہ چاند بادل کی اوٹ میں ہو کر بھی چاندنی برسا سکتا ہے۔ مگر جب وُہ بادل کی اوٹ میں نہیں ہوتا تو اس کی چاندنی میں زیادہ چمک زیادہ ٹھنڈک اور زیادہ لطافت محسوس ہوتی ہے

ادارۂ نقوش قائدِ اعظم کے انتقال کے چھ مہینے بعد اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہے۔ اس لئے کہ وُہ مجبور تھا، اس لئے کہ قائدِ اعظم ہی کے پاکستان میں اس کی زبان چھ مہینے کے لئے بند کر دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں ہم قائدِ اعظم کی پاکیزہ روح کے سامنے شرمندہ اور حکومتِ پنجاب کے اس غیر جمہوری اقدام کے شاکی ہیں۔

ہمایوں
حضرت قائدِ اعظم کی یاد میں
اثر صہبائی

(۱)

زندگی حُسنِ عمل کی دل کش تصویر تھی
تیری ہر جُنبش خلوصِ عشق کی تفسیر تھی
پاک دل، بے باک دل، بیدار دل، کرار دل
ناتواں سے جسم میں تھا کس قدر جرار دل
تیرے عزمِ آہنی سے سرنگوں کہسار تھے
تیری چشمِ دُور بیں پر بے نقاب اسرار تھے
لرزہ بر اندام تھے دُشمن تری تقریر سے
زرد پڑ جاتے تھے تیری شوخیٔ تحریر سے
اے علمبردارِ حق! اے پیکرِ عزم و ثبات
تُو نے مسلم کو غلامی سے دلائی ہے نجات
خوابِ غفلت میں پڑی تھی قوم اور تُو بیدار تھا
کارواں بکھرا پڑا تھا جس کا تُو سالار تھا
تُو نے خوابیدہ دلوں میں نورِ ایماں بھر دیا
اے ترے قرباں! مسلماں کو مسلماں کر دیا
تیری فطرت کو خدا نے کس قدر جوہر دیئے!
ایک کوزے میں سمندر ہی سمندر بھر دیئے

قائدِ اعظم! ترا غم بھی غمِ اعظم رہا
ایک عالم میں بپا ہنگامۂ ماتم رہا

(۲)

تیری تُربت ہے زیارت گاہِ اربابِ ہمم
اک چراغِ راہ ہے تیرا ہر اک نقشِ قدم
زندگی تیری ہے یا اِک نُور کا مینار ہے
دستِ قُدرت کا یہ کتنا خوش نما شہکار ہے
بے دلوں کو اک پیامِ جراٗت و ہمت ہے یہ
بے نواؤں کو نویدِ عظمت و شوکت ہے یہ
تُو نہیں لیکن ترا پیغام ہر محفل میں ہے
تُو ہماری رُوح میں ہے تُو ہمارے دل میں ہے
تجھ پہ لاکھوں رحمتیں نازل ہوں اے مردِ خُدا
اے شہیدِ قوم! تُو جب تک جیا غازی رہا
خاک بھی اکسیر ہے تجھ سے اگر منسوب ہے
ذرہ ذرہ تیری تُربت کا ہمیں محبوب ہے
چشمِ حق تیرے شبستاں کی نگہبانی کرے
دستِ رحمت صُبح و شام اس پر گُل افشانی کرے

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا

مدیر

۱

جلد ۲ نمبر ۴

مخزن

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور۔ اکتوبر سنہ ۱۹۴۹ء

سلسلۂ مطبوعاتِ نوائے وقت

سالانہ:۔	سات روپے
ششماہی:۔	چار روپے
فی پرچہ:۔	دس آنے

The "Makhzan" Lahore

مدیر،	صفحۂ اول،	
پروفیسر حمید احمد خاں،	پھول کانٹے پر ایک نظر،	۳
مدیر،	عشق پہ زور نہیں۔۔!	۹
ونگ کمانڈر سید فیاض محمود،	بس میں ہو تو۔۔! (افسانہ)،	۱۳
جلال الدین اکبر،	غمِ عشق (غزل)،	۱۶
عبد الغنی،	مرزا عبد القادر بیدل پر اپنے عہد کے اثرات،	۱۷
یوسف ظفر،	شکستِ خواب (نظم)،	۲۷
شیخ محمد اسماعیل پانی پتی،	مامون الرشید کا فیصلہ،	۲۹
محمد ہادی حسین (کمشنر راولپنڈی)،	جیتے رہیئے یا مر جایئے (نظم)،	۴۱
غلام رسول تنویر،	درونِ خانہ،	۴۳
کیف بنارسی،	غمزدہ مہاجر سے، (نظم)	۴۶
مسعود اشعر،	گیت،	۴۷
منشی تلوک چند محروم،	آج وارث شاہ سے۔۔! (نظم)	۴۸
ریاض الرحمٰن،	باد (ترجمۂ افسانہ جیمز جوئس)،	۴۹
عظیمہ قریشی،	اثبات (نظم)،	۵۶
مدیر،	مخزن المخازن،	۵۷

"اُردو" کراچی، اُردو میں دخیل الفاظ، ڈاکٹر مولوی عبد الحق مدظلہ

"اُردو ادب" لاہور، اُردو ادب کا آخری دَور، کنہیا لال کپور

"ہادی" لاہور داغ دہلوی کا ایک خط،

"معارف" اعظم گڑھ ہندستان کے مسلمان، شاہ معین الدین احمد

"ماہِ نو" کراچی، قائدِ اعظم اور مسئلہ ہند و مسلم، ایم۔ اے حسین

"سویرا" لاہور پاگلو (نظم) ظہیر کاشمیری،

تبرکاتِ مخزن۔۔۔ (نظم)۔۔ منقول از مخزن بابت مارچ سنہ ۱۹۰۳ء

معاونین،	ایڈیٹر کے نام،	۶۶
مدیر،	مطبوعات،	۶۸

صفحۂ اوّل

گزشتہ مہینے یوم قائد اعظمؒ کے احترام میں حضرت مدیر اعزازی کا ایک مختصر مقالہ "دوستنگ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جسے احباب نے بے حد اشتیاق سے پڑھا اور تقاضا کیا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ حضرت شیخ صاحب نے صحت یاب ہونے کے بعد یہ پہلا مضمون "مخزن" کو عنایت فرمایا ہے ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ڈاکٹر محمد باقر نے "میرے استاد" کے عنوان سے جو مضامین لکھنے شروع کئے تھے ان کے متعلق بعض قارئین نے دریافت کیا ہے کہ ان کی اشاعت کیوں روک دی گئی۔ اشاعت روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا "مخزن" کے اوراق باقر صاحب کے مضامین کے ہر وقت منتظر ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ ہماری ہوائی فوج کے ایک نہایت مصروف افسر ہیں اور ان کے لئے جلد جلد لکھنا ممکن نہیں۔ بہرحال اس وقت ہم مشتاق قارئین کو یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ اس سلسلے کی ایک اور قسط ہمیں موصول ہو چکی ہے اور ہم اسے اپنی کسی قریبی اشاعت میں شامل کرتے ہیں۔

ہمیں مسرت ہے کہ ملک کے فاضل ادیب اور "مخزن" کے مستقل مقالہ نگار جناب محمد حسن صاحب عسکری کی ادارت میں لاہور سے ایک نیا دو ماہی رسالہ "اردو ادب" کے نام سے نکلنا شروع ہوا ہے اس کے پہلے نمبر سے دو مضامین (قائد اعظم محمد علی جناح اور "اردو ادب کا آخری دور") کا اقتباس "مخزن المخازن" میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ دونوں مضامین سے "اردو ادب" کے بلند معیار کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ ان سطور میں "اردو ادب" پر کسی مفصل تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ مختصراً یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ رسالہ ظاہری اور معنوی محاسن کا مجموعہ ہے ہماری رائے میں "اردو ادب" کا اجراء گھٹیا اشتہاری ادب پر ایک ضربِ کاری کا حکم رکھتا ہے۔ سعادت حسن صاحب منٹو اس پرچے کی ترتیب و ادارت کے کام میں عسکری صاحب کے دستِ راست ہیں۔

چند مہینے قبل ہم نے ان سطور میں یہ شکایت کی تھی کہ ہمارے نوجوان اردو کی ترقی کے لئے تراجم کی اہمیت سے غافل ہو گئے ہیں "مخزن المخازن" میں ہم نے "ہمایوں" سے حضرت سالک کے ایک مضمون کا خلاصہ بھی شائع کیا تھا جس میں صاحب مذکور نے لکھا تھا!

"جہاں تک علومِ حاضرہ اور ادبیاتِ جدیدہ کا تعلق ہے ہم ابھی بہت پسماندہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ترقی یافتہ زبانوں کی ہزارہا کتابوں کا ترجمہ کر ڈالیں۔ اس میں شک نہیں کہ ترجمہ کرنا بعید مشکل کام ہے آجکل ہر نوجوان مصنف اور انشاپرداز بننا ترجم بننے سے زیادہ آسان سمجھتا ہے۔ بلکہ بعض لکھنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ طبع زاد لکھنے والا ادیب اور انشاپرداز خواہ کتنا ہی لچر نگار کیوں نہ ہو، مترجم سے بہتر ہوتا ہے۔ حالانکہ ایک اچھا مترجم جو دنیا کے چند بہترین شاہکاروں کو اپنی زبان کا جامہ پہنا دیتا ہے درجۂ دوم اور درجۂ سوم کے ہزارہا مصنفین سے بہتر خدمت انجام دیتا ہے۔"

ہمیں مسرت ہے کہ بہت سے نوجوان اس تحریک سے متاثر ہوئے ہیں۔ گو طبعزاد مضامین کی اہمیت مسلّم ہے لیکن اُن کے معیار کو بلند رکھنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ دنیا کے اعلےٰ ادب کے اردو ترجمے لکھنے والوں کے پیشِ نظر رہیں۔ جن حضرات نے "مخزن" کے لئے اچھے افسانوں کے تراجم بھیجے ہیں ہم ان کے بھی اُسی طرح ممنون ہیں جیسے اُن حضرات کے جنہوں نے ہمیں بلند پایہ افسانے اور ڈرامے خود لکھ کر عنایت فرمائے ہیں لیکن بہتر یہ ہوگا کہ مترجم حضرات محض افسانوں اور ڈراموں تک اپنا دائرۂ عمل محدود نہ رکھیں، انہیں دوسری زبانوں کے علمی ذخائر پر بھی ہاتھ مارنا چاہیئے۔

مدیر

مخزن

"پھول کانٹے" پر ایک نظر

پروفیسر حمید احمد خاں

ستمبر کی اشاعت میں ہم نے سید فیاض محمود کی زیرِ ترتیب کتاب "پھول کانٹے" کا ایک ڈرامہ شائع کر کے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ مہینے اس کتاب کا ایک افسانہ بھی "مخزن" میں شامل ہوگا "بس یہیں ہو تو" .. وہی افسانہ ہے۔ مناسب معلوم ہوا کہ اس افسانے کے ساتھ "پھول کانٹے" کا دیباچہ بھی شائع کر دیا جائے جس کے بعض نکتے یقیناً عام دلچسپی کا مبحث بن سکتے ہیں۔ مثلاً "ماں" اور "بیسوا" کے متعلق آٹو وائننگر کا وضع کردہ اساسی تصور۔ وائننگر کے نظریہ کی مزید توضیح کے لئے ہم پیلے پرچے کے بعد کنوٹ ہیمسن کے ایک افسانے کا ترجمہ بھی شائع کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اس پرچے کے آخر میں جیمز جوئس کے ایک افسانے کا ترجمہ بھی اس سلسلے میں قابلِ توجہ ہے۔ جوئس کی ہیروئن اخلاقی نقطۂ نظر سے اپنی "ناجائز" محبت کے باوجود وائننگر کی "بیسوا" نہیں ہے۔ - مدیر

سید فیاض محمود کے افسانوں کو کسی رسمی تعارف کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے تعارف کا سوال اٹھارہ بیس سال پہلے پیدا ہو سکتا تھا جب ان افسانوں نے ادبی ماہناموں اور ان کے قارئین کے دلوں میں جگہ بنانی شروع کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے نوجوان مصنف کی بے تاب مگر مسرت نگاہ زندگی کے ہر ولولہ انگیز پرشوق سے اٹھتی، زندگی کی ہر جنبش کا سرور آمیز تعاقب کرتی تھی۔ نوجوانی کے غم اور خوشیاں (مگر غموں سے زیادہ خوشیاں)، نوعمری کی محبت کا نشہ اور خمار مگر خمار سے زیادہ نشہ، زندگی کی ٹریجڈی اور کامیڈی (مگر ٹریجڈی سے کہیں زیادہ کامیڈی)، یہ تھے اُس کے موضوعات۔ یہ افسانے کچھ اس طرح زندگی کی چمک اور اوائلِ شباب کے جوش سے تھرتھرا رہے تھے کہ اردو رسائل کے پڑھنے والے بہت جلد ان کے شخصی خدوخال سے مانوس ہو گئے۔ ان کا مجموعہ

"رنگ و بو" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء کی جنگِ عظیم کے بعد دنیا کے ادبی شعور میں جو ہل چل مچی، اردو ادب میں اس کا پہلا جھٹکا ۱۹۲۵ء کے قریب ہمارے نوجوان شاعروں نے محسوس کیا۔ چند ہی سال بعد اسی کیفیت نے ہمارے افسانہ نگاروں کو جھنجھوڑا۔ یہی وقت تھا جب فیاض محمود کے افسانے پہلے پہل نمودار ہوتے۔ لیکن کس شانِ بے نیازی سے! جیسے دنیا میں کوئی زلزلہ آیا ہی نہیں۔ جیسے اقتصادی قوتوں کی کشاکش نے انسانی طبقوں کو تہ و بالا کیا ہی نہیں۔ یہ افسانے ایک کھلا سوال بن کر آتے: کیا عمرانی جدوجہد کے علاوہ زندگی کا اور کوئی مفہوم نہیں ہے؟ کیا سیاسی مقاصد سے منہ پھیر کر ادب زندہ رہ ہی نہیں سکتا؟ "رنگ و بو" کا جواب یہ تھا: فن کار کے لئے انسان کے دل کی دھڑکن، اس کے سینے کی گرمی ہی یقیناً کافی ہے۔ "رنگ و بو" کی دنیا عظیم الشان مقاصد یا فلسفیانہ غایتوں کی دنیا نہیں ہے۔ ان افسانوں کی بنیاد مصنف کی لذتِ حیات پر ہے اور ان کا مقصد لذتِ اظہار! اہلِ ذوق کے لئے ان کی تازگی، تیزی اور ہنرمندانہ نمائش بجائے خود مکمل طور پر تشفی بخش تھیں۔

اور اب دس سال کے بعد پھر ہم ہیں اور "پھول کانٹے"۔ اس خاصے طویل عرصے کے عالمگیر خلفشار سے ہمیں فی الحال سروکار نہیں ہے لیکن یہاں قابلِ ذکر یہ بات ہے کہ اس دوران میں چھ سات برس تک سید فیاض محمود اور افسانہ نگاری ایک دوسرے سے بے تعلق رہے۔ اس غیر متوقع انقلاب کی ظاہری علامت یہ تھی کہ اپریل ۱۹۴۳ء میں فیاض محمود درس و تدریس کی گوشہ نشینی سے نکلے اور عسکری زندگی کے ہنگامہ زار میں داخل ہوتے (اب وہ "پروفیسر" کے بجائے "ونگ کمانڈر" کہلاتے ہیں)۔ ایئر فورس میں جو نئے تجربات انہیں حاصل ہوئے، ان میں عسکری تنظیم اور نفسیات (بالخصوص تجزیۂ نفس) سے پیشہ ورانہ واقفیت زیادہ نمایاں ہیں۔ اس عرصے میں افسانہ نگاری کا دروازہ بند رہا لیکن ۱۹۴۹ء کے آغاز میں کسی باطنی یا ظاہری واقعے (یا سلسلۂ واقعات) نے یکایک افسانہ نگار کے دماغ میں کروٹ لی۔ ڈیڑھ دو مہینے تک ایک اُبال کی سی کیفیت رہی اور اس کیفیت کا نتیجہ تھا "پھول کانٹے"۔

"رنگ و بو" کی فضا اپنی جھلملاتی روشنیاں، اپنا سرور و زیبائش کا رس اور نوجوانی کا لوچ لئے ہوئے "پھول کانٹے" کی دنیا سے بچھڑ نہیں گئی۔ دونوں مجموعوں کی مماثلت ظاہر ہے لیکن کچھ چھوٹے کچھ بڑے فرق موجود ہیں اور نظر آتے ہیں۔ پرانے شرفا کی خانہ داری کے بجائے اب جدید معاشرت کے لوازم بیشتر افسانوں میں جھلک رہے ہیں۔ اب مزاح کم ہے اور طنز زیادہ، اور خود طنز میں بھی کچھ زیادہ تلخی آگئی ہے۔ اس کے علاوہ "رنگ و بو" کے بہشت میں اب احساسِ مقصد کا سانپ داخل ہو چکا ہے۔ اب مصنف کا دماغ خیر و شر کے تصور سے الجھتا ہے ("تحفہ")۔ وہ انسان کی خود غرضی کے خلاف احتجاج کرتا ہے ("زبردست") یا موجودہ سماجی اور اقتصادی نظام کی ناہمواریوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے ("خواجہ کی چھتریاں")۔

"پھول کانٹے" کی دنیا کچھ زیادہ وسیع اور متنوع معلوم ہوتی ہے۔ بعض افسانوں اور ڈراموں کا سیاسی پس منظر بالکل واضح ہے اور بعض میں طبقۂ متوسط کی خود فریب بے حسی اور لاحاصل مشاغل، یا حکام کے طبقے کے مہمل تجمل پر تلخ تنقید ہے۔

ان چھوٹی بڑی تبدیلیوں سے کچھ زیادہ اہم محبت کا نیا تصور ہے جس کے ماتحت اس مجموعے کے تقریباً سبھی عشقیہ افسانے لکھے گئے ہیں۔ "پھول کانٹے" کی عورتیں اور مرد دونوں "رنگ و بو" کے بھولے پن کو بہت پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ یہ تبدیلی ہمیں عورتوں کے معاملے میں زیادہ شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ان کا عشق معصومانہ نہیں، واقف کارانہ ہے۔ اس سے قطعِ نظر عشق کے بدنی پہلو خاص طور پر اُجاگر کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک افسانے میں جس کے

راوی پر جنون کی کیفیت طاری ہے، دیکھنے، سننے، سونگھنے اور چھونے کی سبھی لذتیں آکر شامل ہوتی ہیں۔ اگر دخل نہیں ہے تو ان کیفیتوں کو جن کا مرازغ انسان کے ضمیر یا وجدان یا عقل تک پہنچتا ہے۔ اس نکتے کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ پھول کاٹنے میں عشق کا تصور خالصتہً جمالیاتی ہے، اخلاقی نہیں۔ اخلاقی اور روحانی اقدار سے ان افسانوں کا دامن بالکل پاک ہے۔

یہ غیر اخلاقی بدنی افسانہ اردو ادب کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ بدن کی کشش عصمت چغتائی کے افسانے میں بھی موجود ہے۔ اس سے بھی پہلے یہ کیفیت مغربی افسانہ نگاری میں نمودار ہو چکی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد بعض انگریزی افسانہ نگاروں نے اس طرف توجہ کی اور انہیں بڑی شہرت اور رسوائی نصیب ہوئی۔ لیکن پہلی جنگ عظیم سے بہت پہلے فرانسیسی افسانے کے بعض شاہکاروں کی بنیاد اسی کیفیت پر رکھی جا چکی تھی۔ ان تفصیلات کے بیان کرنے سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ "پھول کاٹنے" کے عشقیہ افسانوں کو ان تینوں ادبی روایتوں یا ان میں سے کسی ایک سے منسلک کرنے کی کوشش کروں۔ اصل مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ "پھول کاٹنے" میں کشش بدن کا احساس اردو یا فرانسیسی افسانے کی اسی قسم کی روایت سے الگ ہے۔ میری رائے میں عشق کا یہ بظاہر فوق الجدید تخیل اپنی کیفیت کے لحاظ سے اردو اور فارسی کی پرانی غزل سے ہم آہنگ ہے۔

غزل کا عشق عالم اخلاق سے باہر ہے (اس عشق کے لئے پرانی اصطلاح "عشق مجازی" تھی)۔ اس کی بنیاد لذتِ حواس پر ہے کسی روحانی ہم آہنگی پر نہیں۔ غزل میں عورت ایک طوائف ہے حسین شوخ اور بے باک، دل ربا مگر خود پسند، خود غرض اور خود فروش۔ وہ نغمہ و نور کی فضا میں رہتی ہے اور اس کے گرد رشک و رقابت کا ہالہ کھنچا ہوا ہے۔ اس کے برعکس فرانسیسی افسانے کی محبوبہ معاشرتی اخلاق کے بعض پہلوؤں سے مبرا سہی کبھی کبھی بیسوا بھی سہی، مگر لازماً بیسوا نہیں ہوتی۔

یہ بیسوا پن کا معاملہ قابل غور ہے۔ آٹو وائیننگر نے اپنی کتاب "جنس اور سیرت" میں عورت کے متعلق کہا ہے کہ اس کی ہستی مطلقاً اور کلیتہً جنسی ہے۔ وہ اپنی جنسیت کے دو انتہائی اور متضاد نقطوں پر یا ماں ہے یا بیسوا۔ ماں کی حیثیت سے اس کی زندگی (یعنی جنسیت) کا مبتدا و منتہا اولاد ہے۔ اس طرح وہ نسل انسانی کے تسلسل اور معاشرتی تنظیم کا محور بنتی ہے۔ دوسری طرف بیسوا کو انسان کے اس اجتماعی تصور سے کسی منزل پر بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی (یعنی جنسیت) کا مدار ایک بدنی لذتیت ہے۔ اس کا وظیفۂ حیات اپنے نفس شہوانی کی تشفی ہے۔ وائیننگر کے نظریئے نے ایک زمانے میں اپنے گرد تائید و اختلاف کا ایک بڑا طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ خود فرائڈ نے اس پر نکتہ چینی کی لیکن وائیننگر سے کامل اتفاق کئے بغیر بھی اس کے وضع کردہ اساسی تصور "ماں" اور "بیسوا" مفید معلوم ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ اس قسم کے لفظوں کو تشریح و توضیح کے بغیر قبول کر لینا درست نہ ہوگا۔ یہ دو لفظ ہماری مادی زندگی میں اس قدر وضاحت سے عورتوں کے دو مخصوص گروہوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں کہ انہیں "مثل افلاطونی" کے عالم سے وابستہ کرنا کاوش اور مزید تفصیل کا محتاج ہے۔ اس بحث میں ماں اور بیسوا کے ذکر سے نفس نسوانی کی دو واضح اور مختلف کیفیتیں مراد ہیں۔ ماں کو محض "صاحب اولاد منکوحہ عورت" یا بیسوا کو صرف "پیشہ ور فاحشہ" قرار دینے سے ہمارا مطلب خبط ہو جائے گا۔ ہمارے سامنے اس وقت دو نفسیاتی تصور ہیں جنہیں معاشرتی حالات میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی "صاحب اولاد منکوحہ عورت" اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے بیسوا ہو اور کوئی "پیشہ ور فاحشہ" جبلتہً اس نفسیاتی صنف میں شامل ہو جسے ہم نے ماں کا نام دیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ان دو مختلف صنفوں کا عشق (اور صرف عشق) زیر بحث ہے۔ وہ صنف جسے ہم نے

اصطلاحاً ماں سے موسوم کیا ہے۔ عشق میں اپنے اخلاقی رجحانات شامل کر دیتی ہے۔ بیسوا کے عشق میں خالص جمالیاتی پہلو زیادہ واضح ہوتے ہیں۔ ماں کے لئے حُسن سے عاری ہونا لازم نہیں، لیکن وہ اس حُسن سے بدرجۂ اتم کام نہیں لیتی، نہ بالقصد اسے اپنا سرمایۂ زیست قرار دیتی ہے۔ دوسری طرف بیسوا حُسن کے ساتھ "ادا" بھی رکھتی ہے۔ وہ ایک فن کار ہے جس کا ذریعۂ اظہار بدن ہے، وہ اپنی اداسے حُسن کے علاوہ رقص اور موسیقی سے، غرض کہ بدن کے تمام ممکنات سے کام لیتی ہے۔ ماں کی قوت ایک پجاری کی طرح، اُس کا پجاپا اور نذر نیاز ہے۔ بیسوا کو ایک بیوپاری کی طرح اپنے مال کی آرائش اور نمائش پر بھروسا ہے۔ بیسوا کو عشق کے "احساسی[1]" پہلوؤں سے، لیکن ماں کو "جذباتی[2]" پہلوؤں سے سروکار ہے۔ ایک کی نظر لذائذ پر اٹھتی ہے، دوسری کی فرائض پر۔ ایک خودنگر اور تحسین طلب ہے، دوسری خود فراموش۔ ایک کے لئے مرد محض ایک جنسی وجود ہے، دوسری کے لئے مرد ایک عمرانی ہستی ہے، معاشرہ کا ایک فرد۔ ایک کو مرد کی پرستش کی طلب ہے، دوسری کو اُس کی رفاقت کی۔ ایک مرد کے جذبات کو مشتعل کر کے لطف اندوز ہوتی ہے۔ دوسری ان جذبات کو آسودگی بخش کر خود اپنے لئے طمانیت حاصل کرتی ہے۔

دونوں عقل و دماغ سے کام لیتی ہیں لیکن ایک کا کمال بے نیازی اور بذلہ سنجی ہے اور دوسری کا ذہانت، ہمدردی اور دل سوزی۔ دونوں کے اسی نفسیاتی فرق نے عشق کی ان کیفیتوں کو جو مرد اُن کے حضور میں پیش کرتے ہیں نمایاں طور پر الگ کر دیا ہے۔ ایک عشق کی بنیاد احترام، حفظِ مراتب اور ضبطِ نفس پر ہے۔ دوسرا عشق والہانہ ہے، حُسن کی خوشبوؤں سے مہکا ہوا، بے قابو۔ یہ وہ فرق ہے جسے حافظ نے "عاشق" اور "مجنوں" کے فرق سے تعبیر کیا ہے۔ یہی وہ جنوں ہے جسے شاعروں نے "شیشۂ مردافگن" کا خطاب دیا۔ بیسوا کا عاشق دنیائے شعر کا مثالی عاشق ہے۔ اس کے ہوش و حواس، عقل و خرد، اخلاق و عمل پر صرف ایک تصویر، ایک آواز، ایک مہک، ایک لمس مستولی ہے۔ زندگی کا اور کوئی احساس اُس کے لئے حقیقی وجود نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے کہ فنونِ لطیفہ کا موضوع بننے کی جو صلاحیت اس عشق میں ہے دوسرے کو میسر نہیں۔

مطلق ماں اور مطلق بیسوا سے دنیائے افسانہ نے کام لیا تو ہے مگر شاذ و نادر۔ عشقیہ افسانے اور شاعری میں ان دونوں کو مختلف تناسبات میں باہم ترکیب دی جاتی ہے۔ اردو غزل کی محبوبہ مطلق بیسوا ہے۔ انگریزی افسانے کی محبوبہ کبھی کبھی، اور فرانسیسی افسانے کی محبوبہ بارہا بیسوا پن کی طرف جھکتی ہے۔ لیکن باایں ہمہ فرانسیسی افسانہ اس بارہ خاص میں فارسی غزل کے معمول کا پابند کبھی نہیں ہوا۔ اگر سید فیاض محمود نے اپنے عشقیہ افسانوں میں عورت کی مامتا اور بیسوا پن، دونوں تصور استعمال کئے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ جو بات اس سلسلے میں قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ مامتا کی منزل لطافتِ رنگ و بو پر ختم ہو جاتی ہے۔ "پھول کانٹے" سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ وہ معصومانہ عشق جس میں عورت ایثار و خود فراموشی کی تصویر بنتی، اور اپنے آپ کو طمانیت کرنے کے لئے مضطرب ہوتی ہے، "رنگ و بو" کے حسین و جمیل مرقعوں پر ختم ہو چکا۔ مصنف کا ذہن اب جولیٹ کے بجائے کلیوپیٹرا کی نقش کاری پر مرکوز ہے۔ "پھول کانٹے" کا عشق ایک بیسوا کا عشق ہے اور اس بیسوا پن کے خطوط بڑی کاوش سے روشن اور گہرے اور پائدار بنائے گئے ہیں۔ "وقت گزاری" کے نام کا افسانہ اگر انیسویں صدی کے کسی افسان مثلاً خود مرزا غالب کے سامنے رکھا جاتا تو وہ اپنی ذہانت کے باوجود دھوکا کھا جاتے، اور بعض نئے الفاظ اور ترکیبیں نہ سمجھتے ہوئے بھی اسے کسی ہم عصر طوائف کی اشکل نمالے انداز میں لکھی ہوئی داستان قرار دیتے۔ "پھول کانٹے" کی محبوبہ حسین اور بے باک، چنچل اور بے وفا، خودنگر اور خود پرست ہے، وہ

---

[1] احساس۔ Sensation　　[2] جذبہ Emotion

بدنی لذتوں کے ہر نازک فرق سے لطف اندوز ہوتی ہے لیکن بے شمار دوسرے لطیف احساسات کے لئے اُس کی روح بیدار نہیں ہوتی۔ وہ حلقۂ زلف سے لے کر پاشنۂ پا تک اپنے بدن کو عاشق کے حوالے کر سکتی ہے لیکن صرف اپنے تفنن کی غرض سے۔ اس کی نفسی کیفیتوں کا وہی باریک اور تفصیلی تجزیہ یہاں بھی ملتا ہے جو فرانسیسی افسانہ نگاروں اور بالخصوص تنغزلین کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہاں پہنچ کر فرانسیسی افسانہ "پھول کانٹے" کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے لیکن غزل کی رفاقت بدستور قائم رہتی ہے۔ "پھول کانٹے" اور غزل دونوں کی محبوبہ نغمہ و شعر اور رنگ و نور میں لپٹی ہوئی ہمارے سامنے آتی ہے۔ فرانسیسی افسانے کی بنیاد اس کی واقعیت پر ہے۔ "پھول کانٹے" کے عشقیہ افسانے میں غزل کی غنائیت لرز رہی ہے۔ غزل کی طرح یہاں بھی عشق شعر و سُرود میں ڈوب کر نکلتا ہے۔ "پہاڑی ندی" ایک تشبیہ کی تلاش ہے۔ "تم نے دیکھا ہے؛ دیکھا ہے" ایک مسلسل غزل ہے جس کا سرمست اور پُرکیف موضوع معشوق کا سراپا ہے۔ اسی طرح "بس میں ہو تو....." ایک اور افسانہ ہے جس کا بے تاب تغزل یقیناً ہر مرد کی رُوح کے تار چھیڑتا ہے۔ "پھول کانٹے" کے عشقیہ افسانے کی فضا اس مستانہ تغزل کے علاوہ غزل کے کچھ اور لوازم بھی ساتھ لاتی ہے۔ مثلاً رشکِ رقیب کی ٹیس بار بار اٹھتی ہے اور کم از کم ایک جگہ تو

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

کی کیفیت رونما ہوتی ہے۔ اس مجموعے کے عشقیہ افسانوں میں صرف ایک افسانہ ہے جو غزل کی تیز رسیلی خوشبو سے بوجھل نہیں ہے۔ "دوست یک نظر" میں مصنف نے صرف ایک بار "رنگ و بُو" کا ننھا سا دریچہ دوبارہ کھولا ہے اور پھر طلوعِ صبح کی وہی پرانی، مانوس بھینی بھینی نسائیت مشامِ روح پر چھانے لگتی ہے۔ مہ جبیں کی خود نگر اور بے نمائش محبت دلآویز سہی مگر اس مجموعے میں باعثِ تعجب ضرور ہے اور ہم اس خوش گوار استعجاب کو نہ چھپا سکتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں: "بیٹی! تم یہاں کیسے؟"

مضمون سے قطع نظر، افسانہ نگار کے فن میں بھی بعض تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ اب جگہ جگہ نیت اور عمل کا تجزیہ ارادی طور پر مفصل اور مدلل ہے۔ اس نئی معقولیت کا اچھا یا بُرا ہونا اس کے استعمال کے موقع و محل پر موقوف ہے لیکن ایک اور خصوصیت ایسی ہے جو بلاشبہ افسانہ نگار کے فنی ارتقا کا ثبوت ہے۔ یہ خصوصیت اس مجموعے کے افسانوں میں بار بار ملتی ہے اور عجیب بات ہے کہ سب سے بڑھ کر عشقیہ افسانوں میں۔ "رنگ و بو" میں بھی اس کی جھلک موجود تھی لیکن "پھول کانٹے" کی منزل تک پہنچتے پہنچتے یہ کچھ زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ اب افسانہ نگار اپنے آپ کو اپنی فنی تخلیقات سے علیحدہ رکھتا ہے۔ وہ خود ان تخلیقات میں مدغم نہیں ہوتا، بلکہ ان سے باہر اور ان کے اوپر رہتا ہے۔ جن افسانوں میں دو ذہنوں کی کشمکش رشک و عشق یا کسی اور رنگ میں بیان ہوتی ہے، وہاں افسانہ نگار کی یہ فنی برتری خاص طور پر نمایاں ہے۔ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک تیسرے نقطۂ نظر کی بھی گنجائش ہے لیکن یہ نقطۂ نظر بڑی سختی سے افسانے کی فضا کے باہر رکھا گیا ہے۔ ("گلاب کا پھول"، "مجھے اُن سے کتنا پیار ہے"، "وقت گزاری" وغیرہ)۔ مصنف ان افسانوں کے افراد پر کوئی حکم نہیں لگاتا، اُس کی ملامت یا ستائش کی کوئی جھلک یہاں نظر نہیں آتی۔ اس کیفیت سے انحراف کی سب سے قابلِ ذکر مثال "صاحب بہادر" والے تیز و تند خاکے ہیں جن میں "صاحب بہادر" پر مصنف کا اپنا عتاب بالکل واضح ہے۔

جدید افسانے نے جدید زندگی کے گریزپا اور برق وش لمحات کا ساتھ اس طرح دیا ہے کہ ناول اور داستان گوئی کی دور رس مطول شکلوں کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ دیکھنے میں مختصر افسانے کا سانچہ بہت کڑا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ غزل کے شعر کی طرح تیکھا پن اور معنوی بلاغت مختصر افسانے کی

نہایت ملفوف اشارات اور مختصر واقعات مختصر افسانے کے بظاہر ننھے سے پیمانے کو زندگی سے لبریز کر دیتے ہیں۔ اس مخصوص فنی کمال کے ہوتے ہوئے بھی مختصر افسانے کے مضامین، برخلاف غزل کے، نوعیت کے لحاظ سے نامحدود ہیں۔ جدید افسانے کی ہیئت میں اتنی لچک پیدا ہو گئی ہے یہاں ہر رنگ کی ہلکی پھلکی یا بڑی سے بڑی بات سما سکتی ہے۔ اس لچک اور آزادی کے رنگا رنگ استعمال کے لئے کم از کم اردو میں فیاض محمود کا افسانہ ہی مثال آپ ہے۔ بیتے ہوئے زمانے کی حکایات، نوجواں کا کسی گزرتے ہوئے لمحے کی جھلک، واقعات کا سلسلہ، طنز کا تیکھا زہر، آرزوؤں کا دوش، شاعرانہ تخیل کا جوش و ہر ڈھنگ کے پھول اور کانٹے یہاں ملتے ہیں۔ اکثر افسانوں کا آغاز اور خاتمہ فنی لحاظ سے ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ اس سے شاید یہ خیال پیدا ہو کہ افسانے کے آغاز و انجام کو اس طرح ڈھالنے میں بڑی کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ درحقیقت اس قسم کی کوئی کاوش اس موزونیت فن کے پیچھے نہیں ہے۔ ان افسانوں کی موزوں ہیئت افسانہ نگار کی فنی حس سے خود بخود اُبھرتی ہے یہی فنی حس ہیئت کے معاملے میں اسے کسی سکہ بند نمونے سے وابستہ نہیں ہونے دیتی۔ "آپا کے ساتھ" راہ چلتے آدمیوں کا مکالمہ ہے۔ "فرصت یک نظر" برسوں کی محرومی کی داستان ہے جو چھوٹے چھوٹے اشاروں اور بظاہر ضمنی باتوں کے ذکر میں اس خوبی سے بیان ہوئی ہے کہ افسانے کی ہیروئن کو ایک بار بھی لب کشائی کی زحمت نہیں دی گئی۔ "دوست" ایک اور پرلطف افسانہ ہے جس کی پوری تفصیل اُس ایک لمحے میں گزر جاتی ہے جب جہاں نے اپنی چیک بک کھولی اور پھر بند کر دی۔

زندگی کے اسی قسم کے تڑپتے ہوئے پر معنی لمحے جدید افسانے کا موضوع ہیں۔ ان کی بنیاد پر افسانے کی تعمیر کے لئے احساس کی شدت اور ادراک کی تیزی درکار ہے۔ اس طرح دیکھئے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جدید افسانہ اور فیاض محمود کی شخصیت ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہیں۔ فیاض محمود کی اپنی بے کلی اور تیزی رفتار جدید افسانے کی دین ہے۔ ڈیڑھ دو مہینے کا جو بے پناہ بہاؤ افسانوں کے اس مجموعے کو اپنے ساتھ لایا اُس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ فیاض محمود کی ذاتی زندگی کیا باطن اور کیا ظاہر بجلی کی طرح سریع و شدید ہے اور ان افسانوں میں ہر جگہ اسی سرعت اور شدت کا نشان موجود ہے۔ ان کے مسودات کو پڑھتے ہوئے ایک موقع پر میرا عام متذبذب، انسانیت کچھ اطمینان سا محسوس کئے بغیر نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ وہ بجلی جس کا نام فیاض محمود ہے، ایک مقام پر گرتے گرتے رک گئی۔ مجھے ایک جملہ ایسا نظر آیا جو علانیہ طور پر کاٹا اور دوبارہ لکھا گیا تھا:

"رنگ و بو" کی اشاعت کے بعد فیاض محمود کے افسانے کی زبان کبھی کبھی زیر بحث آتی رہی۔ خود فیاض محمود کو اپنی اردو سے زیادہ اپنی انگریزی پر اعتماد ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے خاص انداز بیان کے جوش میں قواعد صرف و نحو کو نظر انداز بھی کر جاتے ہیں اور اپنے کلام میں کہیں کہیں پنجابی روزمرہ کے استعمال سے ایک نئی لہر دوڑا دینے کے شائق ہیں۔ پریم چند کی زبان پر بھی اہل زبان کی طرف سے اسی طرح اعتراض ہوتے تھے لیکن اس قسم کے ہر اعتراض کا جواب یہ ہے کہ مختصر افسانے کا فنی لطف صرف اصول انشا کی پابندی پر منحصر نہیں ہوتا۔ ذرا غور کیجئے کہ اس قسم کے جملے میں جیسا یہ ہے "ندیاں، بوڑھے آسمان کو اپنے جوان پہلو دکھاتی چلی جاتی ہیں" کس قسم کی ترمیم ممکن ہے؟ اور پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جب موقع کی مناسبت سے افسانہ نگار کامل چاہتا ہے تو وہ کلاسیکی انداز کی ثقہ اردو بھی بے تکلف لکھتا ہے مثلاً "تحفہ" نام کا افسانہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

فضائے عشق میں کچھ حرکت ہوتی ہے۔ ایک غبار لطیف مگر روشن، زمین کی

طرف اترتا دکھائی دیتا ہے۔ نہ اتنا ثقیل کہ اسے ستارہ کہا جاسکے اور نہ اتنا
کثیف کہ اس پر بادل کا دھوکا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور آخر میں یہ سوال ہم سے جواب کا طالب ہے کہ ہمارے افسانے کے ارتقا میں "پھول کانٹے" کے مصنف کا مقام کیا ہے؟ گزشتہ ربع صدی میں جن ادیبوں نے اردو افسانے کو ایک نئے قالب میں ڈھالا انہی میں سید فیاض محمود کا نام بھی آتا ہے۔ ان ادیبوں نے پریم چند کے افسانے کے پھیلاؤ کو سمیٹا اور اسے صرف ایک روشن نقطے پر مرتکز کر دیا۔ انہوں نے افسانے کی بنیادی ترتیب پر سے واقعات کے تہ بر تہ ڈھیر ہٹا دیئے۔ اس طرح افسانے کے خلوص میں تو نہیں مگر اس کی حدت اور حرارت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ان ادیبوں نے ہمیں بتایا کہ زندگی کی قاشیں زاویۂ قائمہ کے علاوہ اور زاویوں سے بھی کاٹی جاسکتی ہیں۔ ان تغیرات میں سید فیاض محمود کا شخصی حصہ یقیناً قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے یہ واضح کیا کہ افسانے میں مضمون کے علاوہ اس کی ساخت بھی برابر کی شریک ہے۔ انہوں نے افسانے کے مضمون میں وسعت پیدا کی۔ اور اس کے اندازِ بیان کے حدود معین کئے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ سیاسی اور اخلاقی اقدار کے علاوہ فن کی اپنی اقدار بھی ہیں جو ادب اور زندگی کی رونق میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے افسانے نے ہمیں یہ ناقابلِ فراموش سبق دیا کہ زندگی کی تعبیروں سے قطع نظر زندگی کے بو قلموں جلوس کا نظارہ بجائے خود دلچسپ ہے۔

حمید احمد خاں

مدیر

عشق پہ زور نہیں ۔ ۔ ۔

(کنوٹ ہیمسن)

قلعے کے برج میں ایک لڑکی قید تھی۔ اسے ایک نوجوان لارڈ
سے محبت تھی۔

کیوں؟

یہ سوال کرو ہواؤں سے، یا ستاروں سے، یا زندگی کے آفریدگار
خدا سے، کیونکہ کسی انسان کو اس کا جواب معلوم نہیں۔

لارڈ اُس کا دوست تھا، اور عاشق۔ لیکن وقت نے پلٹا کھایا اور ایک ایسا دن آیا کہ لارڈ کی آنکھ کسی اور سے لڑگئی اور اُس کی محبت نے اپنا مرکز بدل لیا۔

لارڈ نے نوجوان لڑکے کی طرح اُس لڑکی کو چاہا تھا۔ وہ اُسے اپنی "پیاری مینا" کہتا اور اپنی "تقدیر کی مالک" —— اُس وقت اُس کی ہم آغوشیوں میں محبت کی گرمجوشیاں تھیں، اور مضطرب دل کی دھڑکنیں۔

نوجوان لارڈ نے اُس کا دل مانگا اور لڑکی نے اُسے دل دے دیا۔

اُس نے پُوچھا: "پیاری! میں تم سے کچھ اور بھی مانگ سکتا ہوں؟"

اور لڑکی نے مجنونانہ مسرت سے کہا "کیوں نہیں" اور اپنا سب کچھ اُس کی نذر کر دیا۔

لیکن اس کے باوجود لارڈ اُس کا شکرگزار تک نہ ہوا۔

نئی محبوبہ کا وہ درم ناخریدہ غلام بن گیا۔ اب اُس کی محبت میں دیوانوں کی سی وارفتگی تھی اور بھکاریوں کی سی عاجزی۔

"کیوں؟"

یہ سوال گردِ غبارِ راہ سے، یا خزاں زدہ درختوں کے گرتے ہوئے زرد پتوں سے، یا پُراسرار زندگی کے ان دیکھے خدا سے، کیونکہ کسی انسان کو اس کا جواب معلوم نہیں۔

اُس نے لارڈ کو کچھ دیا بھی نہیں، بالکل کچھ نہیں دیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُس کا شکرگزار تھا۔

محبوبہ نے اُس کا اطمینانِ قلب مانگا، اور اُس کی عقل و دانش

بھی، لیکن یہ سبھی کچھ دے چکنے کے بعد اُسے افسوس ہی رہا کہ محبوب نے
اُس کی زندگی کا مطالبہ کیوں نہیں کیا۔

اور اُس کو چاہنے والی لڑکی قلعے کے زنداں میں بند تھی . . .

"اے حسین دوشیزہ! تو یہاں بیٹھی کیوں مسکرا رہی
ہے؟"
"میں دس سال پہلے کی ایک بات یاد کر رہی ہوں۔ دس
سال گزرے، جب میں پہلے پہل اُس سے ملی تھی؟"
"تجھے وُہ اب تک یاد ہے؟"
"مجھے وُہ اب تک یاد ہے!"

زمانہ گزرتا چلا گیا!

"اے حسین خاتون! تُو یہاں بیٹھی کیوں مسکرا رہی
ہے؟"
"میں اِس کپڑے میں اس کا نام کاڑھ رہی ہوں!"
"کس کا نام؟ اُس کا، جس نے تجھے زنداں میں ڈال
رکھا ہے؟"
"ہاں اُسی کا، جس سے بیس سال پہلے میں ملی تھی!"
"تجھے وُہ اب تک یاد ہے؟"
"مجھے وُہ پہلے ہی کی طرح اب تک یاد ہے!"

زمانہ گزرتا چلا گیا!

"تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے، قیدن ؟"

"میں بوڑھی ہو چکی ہوں، میری نظر اب سینے پرونے کے قابل نہیں رہی،

میں دیواروں کی استر کاری کا ریختہ کھرچ کر ایک گل دان بنا رہی ہوں

اُس کی نذر کے لئے، ایک حقیر ہدیہ !"

"تو کس کا ذکر کر رہی ہے ؟"

"اپنے محبوب کا، جس نے مجھے قلعے کے اس بُرج میں قید کیا تھا"

"کیا تو اس لئے مسکرا رہی ہے کہ اُس نے تجھے برُج میں قید

کر رکھا ہے ؟"

"میں یہ سوچ رہی ہوں، وہ اب کیا کہے گا، وہ کہے گا، دیکھو! دیکھو!

میری محبوبہ نے مجھے یہ ننھا سا گلدان بھیجا ہے۔ تیس سال گزر چکے ہیں لیکن

وہ مجھے اب بھی نہیں بھولی ۔"

زمانہ گزرتا چلا گیا !

"تو بیکار بیٹھی کیوں مسکرا رہی ہے، قیدن ؟"

"میں روز بروز زیادہ بوڑھی ہوتی چلی جا رہی ہوں۔ اب میری

آنکھیں اندھی ہیں، لیکن میں سوچ رہی ہوں"۔۔

"اُس کے بارے میں، جس سے تو چالیس سال پہلے ملی

تھی ؟"

"ہاں اُسی کے بارے میں، جس سے میں نوجوانی میں ملی تھی لیکن

جسے چالیس سال گزر چکے ہوں"۔

"مگر کیا تجھے معلوم نہیں، اب وہ مر چکا ہے ؟"

۔۔۔"اے زرد رُو بڑھیا، اب تو جواب کیوں نہیں دیتی ؟ تیرے

ہونٹ سفید پڑ گئے ہیں، تیرا سانس بند ہے ۔۔۔

(ترجمہ)

ونگ کمانڈر سید فیاض محمود

بس میں ہو تو ......

(افسانہ)

اُس کا نام بہار تھا۔ یہ اس کا اصلی نام نہ تھا مگر یونہی لوگ اسے بہار کہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ واقعی بہار تھی۔ اس میں بہار کی سی صفات تھیں شباب میں سرمست۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر کیوں بہل جاتے ہیں اور اس سے ملنے والے اس کے ساتھ تھوڑا سا زیادہ تپاک کیوں برتتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں اس سے باتیں کرتے وقت تھوڑی سی زیادہ چمک کیوں آ جاتی ہے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ لوگ اس سے اُلجھتے بھی کیوں زیادہ ہیں۔ وہ یہ نہ جانتی تھی کہ اس مصرع کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ ع

من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

کیا واقعی وہ جان بوجھ کر اس کی بات نہیں سمجھتے تھے۔ اسے لوگوں کو بات سمجھانے میں کیوں دیر لگ جاتی تھی۔ بالخصوص اس سے وہ ہر بات بار بار کیوں دہراتے تھے۔ اسے یہ بات پریشان کرتی !

اس کا قد کتنا تھا، یہ اُن سے پوچھو جنہوں نے کبھی اسے نظر بھر کے دیکھا ہو۔ اسے کوئی نظر بھر کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ نظر پھسل جاتی اور کسی ایک نقش یا ایک بات پر نہ رکتی۔ اس کی آنکھوں میں اگر آپ آنکھیں ڈال کر دیکھتے تو آپ یہ بھول جاتے کہ اس کی ناک کتنی خوش قطع ہے۔ اس کے ہونٹوں کی نرم جنبشوں کو محسوس کرتے تو آپ اس کے بالوں کی گھٹاؤں کو بھول جاتے۔ اس کی ہنسی کو اگر آپ توجہ سے سنتے تو آپ دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو جاتے۔ اس کا سراپا کون بیان کر سکتا تھا۔ یہ نہ پوچھو۔ یہ پوچھو کہ اُسے بہار کیوں کہتے تھے ؟ اس لئے کہ اس کی موجودگی محفل میں زندگی کی دلیل ہوا کرتی تھی۔ وہ بولتی بھی نہیں مگر لوگ یہ محسوس کرتے کہ کوئی ہلکے ہلکے ہر دل میں جادو جگا رہا ہے۔ وہ پلکوں کی گھنی چھاؤں سے نکل کر آپ کو دیکھتی اور آپ کو محسوس ہوتا کہ چاند اور ستاروں کا ناچ ہو رہا ہے اور کہکشاں نیچے اُتر آئی ہے۔ اسی لئے میں اسے بہار کہتا تھا۔ لوگ اسے بہار نہیں کہتے تھے۔ لوگوں کو کیا علم تھا کہ اس کے گالوں کے خموں میں میری ساری زندگی کا نشیب و فراز پوشیدہ ہے۔ میں ہی اسے بہار کہتا تھا۔ مگر اسے یہ علم نہ تھا کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔

وہ بہت بے باک تھی۔ مجھ سے کہتی تم جانتے ہو میں جنتوں بھوتوں کو نہیں مانتی۔ میں پرانے رسم و رواج کو بہت بُرا سمجھتی ہوں۔ میں آزاد خیال ہوں آزاد خیال! سمجھے تم ؟ تم اپنے آپ کو بہت لائق سمجھتے ہو، میں نہیں تسلیم کرتی۔ جو چاہو سو کرو۔ یہ کیا کہ دو چار کتابیں پڑھ لیں اور ڈینگ مارنے لگے۔ میں کہتا میری جان میں کب تمہارے سامنے ڈینگ مارتا ہوں۔ تو جواب دیتی۔ میں سمجھتی ہوں، تمہاری خاموشی ہی ایک طعنہ ہے کہ میں کچھ نہیں جانتی۔ کیا میں کالج میں نہیں پڑھتی۔ میں ادب کو نہیں سمجھتی، میں شعر سن کر نہیں جھوم سکتی؟ میں اپنے ماں باپ سے آزادانہ بات نہیں کر سکتی ؟ تو پھر تم کو مجھ پر کیا فضیلت ہے ؟ تم بہت شیخی خورے ہو"

میں بہت سمجھاتا کہ میں کبھی یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ تمہارے علم کے آگے سر اونچا کر دں۔ ہیں تو جانتا ہوں کہ تم بہت لائق فائق ہو۔ تو مسکرا کر اور بالوں کی گھٹاؤں کو میرے دل پہ مسلط کر کے جواب دیتی۔ واہ پھر مذاق شروع کر دیا۔ دیکھو ہم سے مذاق مت کیا کرو ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ مگر یہ بتاؤ، یہ قمیص مجھے اچھی لگتی ہے۔ کیوں میں موٹی نہیں ہوتی جا رہی۔ دیکھو میری کمر اب ۲۲ انچ کی ہے اور میرے کولھے ہیں ۳۲ انچ کے۔ واہ بس شرما گئے۔ کولہوں کا نام سنا اور شرما گئے۔ ارے بھئی اس میں شرمانے کی بات کیا ہے تمہارا دماغ سائنٹیفک نہیں ہے۔ کل گھٹنوں اور ٹخنوں کا نام سن کر رو دوگے۔ خیر تو میں سمجھتی ہوں کہ میں بہت موٹی ہوتی جا رہی ہوں۔ ٹھیک ہے نا۔ کل سے ورزش شروع کر دوں گی اصل میں مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔ ہائے کیا کروں کسی وقت تو یہ جی چاہتا ہے کہ تمہیں کھا جاؤں۔ اور پھر اس کا دلنواز قہقہہ فضا میں گونج کر کائنات پر چھا جاتا اور مجھے معلوم ہوتا کہ میں ستاروں کے جھولوں میں جھول رہا ہوں۔ وہ سمجھتی کہ میں حسب معمول کسی سوچ میں پڑ گیا ہوں۔ کہتی تم تو یہاں آ کر گونگے ہو جاتے ہو۔ بات کیوں نہیں کرتے؟ دیکھو میں کل باغ گئی تھی۔ وہاں مجھے چہرے کے پھول دکھائی دیئے۔ ہزاروں ننھے ننھے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ ہائے میرا جی چاہا انہیں گود میں اٹھا لوں۔ مگر تمہیں معلوم ہے مجھے خزاں کا موسم بہت پسند ہے۔ کیوں؟ ہائے تمہیں کیا سمجھاؤں۔ تم تو بالکل کورے ہو کیا تمہیں خوبصورتی کا ذرا پاس نہیں۔ کیا تم کسی حسین چیز کو پسند نہیں کر سکتے؟ خدا تم سے ٹھوس علمی آدمیوں سے بچائے۔ ارے کیا تم نے چیڑ کے درختوں میں سے ہوا کو گزرتے نہیں سنا۔ ہائے تمہیں کیا بتاؤں، پتوں کی سرسراہٹ تم نہیں سنا کرتے؟ میں تو باغ میں پھولوں کی ڈالیاں ہلتی سن لیتی ہوں۔ تمہیں بتاؤں مجھے معلوم ہے کہ پھول آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں۔ تم ہنستے ہو؟ واقعی بہت بیوقوف ہو۔ معلوم نہیں میں تم سے کیوں باتیں کر لیتی ہوں۔ بس یہی کہ بچپن کے ساتھی ہو۔ ورنہ ایمان سے تم جیسا کورا شخص میں نے نہیں دیکھا۔

نیلے رنگ کا سوٹ اور اس پر گلابی پٹی۔ بالوں میں ایک پھول اور منہ پر معصومیت، کھوئی ہوئی سی آنکھیں! مجھے ایک پارٹی میں اس سے ملنے کا اتفاق ہو گیا۔ میں دیر تک مبہوت ہو کر دیکھا کیا۔ آخر نہ رہا گیا۔ میں کھنچتا کھنچتا اس کے پاس پہنچ گیا۔ اشارے سے مجھے پاس بیٹھنے کو کہا۔ پوچھا تمہیں کیا ہوا ہے۔ آج تو معمول سے زیادہ بھکڑ دکھائی دے رہے ہو۔ پھر جواب سنے بغیر کہا: ہائے میں کہاں پھنس گئی ہوں مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں نے کہا: کہاں لے چلوں؟ کہنے لگی: یہ کہیں دور! اور پھر اپنی آنکھیں جن کی ہمدردی گہرائیوں میں میں ہزار بار کھو کھو کر سنبھلا ہوں۔ دور کسی خیالی منظر پر گاڑ کر مجھ سے کہنے لگی۔ دیکھو تم نے خزاں کے موسم میں کبھی زرد اور سرخ پتوں کو گھاس پر انباروں میں پڑے دیکھا ہے۔ ہائے مجھے خزاں کا موسم کتنا پسند ہے۔ درخت سونے سے لدے ہوئے ہوتے ہیں اور پھر اس خشک آتشی بھورے رنگ کے طوفان میں سے گزرنا کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ تم کبھی ایسے پتوں پر سے چلے ہو۔ ہائے تمہیں کیا بتاؤں، تمہارے آگے تو ان باتوں کا ذکر کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے برابر ہے!

ایک دن جون کی تمتماتی شام کو میں اُن کے ہاں گیا۔ باہر گھاس پہ بیٹھی اپنی بہنوں سے کچھ باتیں کر رہی تھی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ چھوٹتے ہی کہا میں نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ایکٹرس بنوں گی۔ میں نے مسکراہٹ کو ضبط کر کے دریافت کیا۔ کیوں؟ غصے سے منہ بنا کر، [?] ماتھے پر سے بال پیچھے جھٹک کر میری طرف ایک جلتی ہوئی نظر ڈالی اور حقارت سے منہ موڑ لیا۔ اور اپنی بہن ستارہ کو مخاطب کر کے کہنے لگی: پوچھتے ہیں کیوں؟ سنا تم نے؟ کیوں؟ انہیں کیا معلوم ایکٹنگ کس چڑیا کا نام ہے! کسی بھینگی کو کولھے مٹکاتے دیکھ لیا اور سمجھ لیا

کہ ناچ ہو رہا ہے۔" اور پھر آنکھوں کی بجلیاں مجھ پہ برسا کر کہا "تمہارے سامنے کوئی ایکٹنگ خاک کرے۔ تم تو سمجھتے ہو کہ آنکھوں کو دس دفعہ جھپکا لیا تو شرم کا اظہار ہوگیا اور منہ کو پلّو سے چھپا کر مسکرا لیا تو محبت کا اظہار ہوگیا، میں لہنگا پہن کر ودمنٹ کے لئے سٹیج پہ آجاؤں تو تمہیں ہوش آجائے" میں نے کہا "ہوش جاتا رہے یا آجائے"۔ ستارہ کی طرف منہ پھیر کر کہا "میں نہ کہتی تھی ان سے باتیں کرنا فضول ہے۔ ہائے رے میں ایسے لوگوں میں کیوں پھنس گئی ہوں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ پہاڑ کی چوٹی پہ بیٹھی افق کا نظارہ کرتی رہوں۔" میں نے پوچھا: "وہاں کیسے ایکٹ کر سکو گی؟" میں کہہ تو گیا مگر ڈر رہا تھا کہ اب کے برسی تو مار ڈالے گی۔ مگر وہ یک لخت ہنس پڑی اور اس طرح بے ساختہ ہوکر کہ دوپٹہ ڈھل گیا اور کرناگن کی طرح بل کھانے لگی۔ بال شفق پہ چھا گئے۔ چمن میں جلیبدار ہنسی کے لوچ کو سن کر چپ ہوگئے۔ کائنات میں ایک ساز بجنے لگا اور وہ ہنسے گئی

میری تبدیلی دہلی ہوگئی میں کچھ عرصے کے لئے لاہور کی فضاؤں سے دور چلا گیا۔ چھ مہینے گذر گئے۔ ایک دن دہلی ہی میں کسی کے ہاں دعوت تھی۔ ان کے ایک عزیز آئی سی ایس میں حال ہی میں کامیاب ہوئے تھے اور ان کی شادی بھی کچھ دن گذرے ہوئی تھی۔ کھانے میں دیر ہوگئی۔ ان کے عزیز نہیں آئے تھے۔ ساڑھے نو بجے کے قریب وہ آئے۔ موٹر آکے رکی۔ وہ صاحب اندر آئے۔ ان کے ساتھ ایک نازک بدن خاتون تھیں۔ بہت قیمتی ساڑھی پہنے ہوئے تھیں۔ وہ صاحب اندر آئے۔ معذرت کی۔ ان کا سب سے تعارف ہوا۔ میں بھی تعظیم میں جھکا۔ نظریں اٹھیں تو ان کی بیگم صاحب سے آنکھیں چار ہوگئیں۔ رسمی مسکراہٹ کے ساتھ میرے آداب کا جواب دیا اور پھر مخملی لہجے میں کہنے لگیں۔ "انہیں تو میں جانتی ہوں۔ یہ ہمارے ہاں لاہور پاپا سے ملنے آیا کرتے تھے۔" اس کے بعد وہ مجھ سے نہ بولیں۔

میں کھانا کھانے میں مشغول ہوگیا۔ میرے کان کسی نغمہ کی گونج کے منتظر تھے۔ میری آنکھیں صبح کی نکھری ہوئی کرنوں کی تلاش میں تھیں۔ میں بہار کے پھول ڈھونڈھ رہا تھا، مگر کمرے میں حسین جامد کے علاوہ اور کوئی چیز جلوہ گر نہ تھی۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ پر بیٹھنے والے مہمان سے باتیں شروع کیں۔ مگر میری اپنی باتوں کے شور میں مجھے ایک آواز یہ کہتی سنائی دیتی رہی "تم نے زرد گلاب کے پھول دیکھے ہیں۔ تم نے ان کی خوشبو سونگھی ہے۔ ہائے خوشبو ہے کہ مستی کا پیالہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ جام بھر بھر کے پیوں۔ جانے شراب پینا لوگ کیوں برا سمجھتے ہیں۔ میں تو ہر وقت مدہوش رہتی ہوں۔ دیکھا تم نے وہ چھوٹا سا سبز رنگ کا پرندہ کیسے سامنے سے کوند کر گذر رہا ہے۔ ہائے اسے کون پکڑے، مجھے لادے۔ میں دنیا کے حسن کو کیوں اپنے قابو میں نہیں کر سکتی۔ توبہ جی! حمید بدبخت کا نام محبوب ہے، تم میری مدد کیوں نہیں کرتے۔ ہائے تم کو میرا کوئی خیال نہیں۔ . . .

میرے کانوں میں اس نیم بھرائی ہوئی آواز کے یہ الفاظ پھر سے گونجنے لگے "ہائے تمہیں میرا کوئی خیال نہیں . . . تمہیں میرا کوئی خیال نہیں . . . تمہیں میرا کوئی خیال نہیں۔" میرے منہ سے نکلا بہار! میرا ساتھی کہنے لگا "کیا کہا آپ نے؟" میں نے جواب دیا "کچھ نہیں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔" وہ ہنس کے کہنے لگا "جاگتے میں خواب؟" میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "جی ہاں انہیں خوابوں کے لئے جاگتا ہوں۔" اب اکثر سوچتا ہوں کہ کیا واقعی بہار کو میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے؟

★

جلال الدین اکبر

غمِ عشق

اے ودود، اے کریم اے وہّاب
دے غمِ عشق اور لغیرِ حساب

پھر کوئی دل فروز یاد آیا
کھل گئے دل پہ خُلد کے ابواب

تیرے رُوئے نکو سے کیا نسبت
ہم نے دیکھا ہے جلوۂ مہتاب

جلوۂ حسنِ یار کیا کہتے،
دل ہے پہلو میں پارۂ سیماب

دل ہے اور جلوہ ہائے حسنِ ازل
خس و خاشاک و تُندیِ سیلاب

یہی معراجِ عشق ہے شاید
وُہ بھی میرے لئے ہُوئے بیتاب

آہ وُہ گفتگوئے ناز و نیاز
کاش حاصل ہو پھر مسرتِ خواب

وُہ بھی عالم عجیب ہوتا ہے
جس میں بے لفظ ہوں سوال و جواب

بیخودِ عشقِ یار ہیں اکبر
ہم کو یکساں ہے لُطف ہو کہ عتاب

عبدالغنی

مرزا عبدالقادر بیدؔل پر اپنے عہد کے اثرات

ہر شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اُس کی انفرادیت کی تشکیل اپنے ماحول سے ہوتی ہے اور پھر اُس کی تخلیقی صلاحیتیں اُس کی انفرادیت کا رنگ لے کر اُس کے ماحول کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اگر اُس کے زمانے کے حالات اُس کی قوتِ تخلیق میں ایک زبردست تہیّج پیدا کر دیں تو پھر وُہ اپنے عہد کی بندشوں سے آزاد ہو کر ایک ایسے بلند مقام سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتا ہے۔ جہاں سے ماضی اور مستقبل کے کنارے علیحدہ علیحدہ دکھائی نہیں دیتے۔ اس مقام سے وُہ اس انسان کو مخاطب کرتا ہے جو زمان اور مکان کی حدبندیوں سے بالاتر رہ کر اپنے جبلی شرف کو قائم رکھنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔ ایسے شاعر کی نگاہ فطرتِ انسانی کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ اُس کا کلام سحرِ حلال بن جاتا ہے، اور دُنیا کا کوئی انقلاب اُس کے کلام کی تازگی میں فرق نہیں آنے دیتا۔ ایسے زندۂ جاوید شعراء انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں اور میرزا عبدالقادر بیدؔل عظیم آبادی میرے نزدیک اُن کے سرتاج ہیں۔ اس تمہید کے بعد ہم بیدؔل اور اُن کے ماحول پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔

سلطنتِ مُغلیہ اپنے پُورے عروج پر تھی۔ شاہجہاں لال قلعہ میں تختِ طاؤس پر جلوہ افروز ہو کر دادِ جہانبانی دے رہا تھا۔ اورنگ زیب اپنے بھائی داراشکوہ کی عیاریوں سے تنگ آ کر دکن کی پہلی صوبہ داری سے مستعفی ہو چکا تھا۔ جبکہ ۱۶۴۴ء میں میرزا عبدالقادر پٹنہ[ل] کے ایک تصوّف پسند گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت تمام ہندوستان میں شاہجہان کی فوجی طاقت کا لوہا مانا جا چکا تھا۔ ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ زراعت اور تجارت فروغ پر تھی اور لوگ خوشحال اور فارغ البال تھے۔ علوم اور فنون میں شاہجہان اور عمائدِ ملک کی سرپرستی کی وجہ سے غیر معمولی ترقی ہو رہی تھی پٹنہ اُس علاقہ میں واقع تھا۔ جہاں ہندوؤں کے عرُوج کے ایام میں نالندہ یونیورسٹی قائم تھی اور جو اب پھر مسلمانوں کے عروج کے دنوں میں علوم و فنون کا گہوارہ بن چکا تھا چُنانچہ وہاں کے علمی چرچوں کو دیکھ کر شاہجہان نے کہا تھا "پورب شیرازِ ماست"۔

ہندوستان کو شروع ہی سے انسان کی باطنی قوتوں سے بڑا شغف رہا تھا۔ رُوح کی عظمت اُس کے لئے بیحد جاذبِ نظر تھی۔ اس لئے جب مسلمان یہاں وارد ہوئے تو اُنہوں نے اپنے قدم جمانے کے بعد یہاں کی آبادی کے اس فطری لگاؤ کے زیرِ نظر زیادہ تر اسلام کے روحانی فیوض کے عام کرنے کی کوشش کی اور اسی لئے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت سیّد علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدینؒ چشتی اجمیری، خواجہ نظام الدینؒ اولیاء دہلوی اور اُن کے معتقد صوفیوں کی بدولت ہُوئی۔ بہار میں بھی صُوفیائے کرام ہی مشعلِ اسلام لے کر پہنچے تھے اور اُن کے روحانی تصرفات قلوب کو مسخر کر رہے تھے۔ خود میرزا عبدالقادر کا تمام کا تمام خاندان ایک باکمال بزرگ شیخ کمال کا معتقد تھا اور جب بیدؔل پیدا ہوئے تو اُن کے والد میرزا عبدالخالق کے جس دوست نے حسابِ جمل سے لفظِ "انتخاب" سے اُن کی تاریخِ پیدائش نکالی وُہ بھی ایک صاحبِ کرامات درویش قاسم نامی تھا اور جس سے بعد میں

[ل] ۱۷۰۴ء میں شاہزادہ عظیم الشان نے اس کا نام بدل کر عظیم آباد رکھا۔ گویا بیدؔل کی زندگی میں یہ شہر عظیم آباد کہلانے لگ گیا۔

مدت تک بیدل کے گہرے مراسم رہے۔ علاوہ بریں جب اُن کے والد ماجد نے وفات پائی تو چچا نے اپنے دامنِ تربیت میں لیا اور وُہ بھی صُوفی مشرب تھے ان تمام باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ بیدل کا عہدِ طفولیت دولت و ثروت کی ہماہمی، علم و فن کی چہل پہل اور تصوّف کی باطن نوازیوں سے گھرا ہوا تھا۔ دولت کے وفور نے اُسے سیر چشم بنایا۔ ضیائے علم نے صغر سنی ہی میں اُس کے ذہن کو روشن کر ڈالا اور تصوّف نے اُس کے دل میں خدائے لم یزل کی محبت پیدا کی۔ اس محبت کا ذکر بیدل انوکھے اندازِ بیان سے کرتا ہے ؎

آتش پرستِ شعلۂ اندیشہ اتِ جگر   آئینہ دارِ داغِ ہوائے تو سینہ ہا

اور کہتا ہے وُہ بیان ہی افسردہ ہے جس میں حمدِ الٰہی موجود نہ ہو ؎

بے زمزمۂ حمد تو تا نونِ سُخن را   افسردہ چو خونِ رگِ تار است بیانہا

خدا سے محبت ہندو یوگیوں کو بھی تھی۔ لیکن ویدانت نے رُوحِ کُل کی ہمہ گیری کچھ اس انداز سے بیان کی تھی کہ ہر چیز کو خُدا کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اس لئے بعض مسلمان صوفیوں نے بھی جوشِ محبت میں آ کر وحدتِ وجود کا دعوےٰ کیا تھا۔ مغربی مستشرقین اسے اسکندریہ کے نو فلاطونی علماء کا اثر بیان کرتے ہیں اور اس رشتہ سے اس کا تعلق پھر ویدانت سے جا قائم کرتے ہیں۔ لیکن در اصل مسلمان صوفیوں کے یہ تمام دعوے جذبات و خیالات پر عشقِ الٰہی کے استیلا کا نتیجہ تھے۔ ان کا تعلق کسی مربوط فلسفۂ فکر سے نہ تھا۔ بہرحال ویدانت کے عقیدۂ وحدۃ الوجود، بعض مسلمان صوفیوں کے نعرۂ انا الحق کو جائز سمجھنے، اور اکبر کی ملحدانہ تعلیمات کی وجہ سے ہندوستان میں ایک ایسے مُصلح کی ضرورت تھی جو ذاتِ الٰہی کی ماورائیت کو الم نشرح کرے اور گم کردہ راہ مُغل شہنشاہ کے اثرات کا قلع قمع کر دے۔ اس کام کو مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے بوجہ احسن سرانجام دیا اور یہ بات پوری طرح الم نشرح کر دی کہ ذاتِ باری وراء الورا ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ چنانچہ جب عبد القادر بیدل پیدا ہوئے تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عقیدۂ وحدتِ شہود کا عام چرچا تھا۔ بیدل نے بھی اسی عقیدہ کو اپنایا اور اسی لئے اُن کے کلام میں جا بجا ذاتِ الٰہی کی ماورائیت کا بیان ہے کہتے ہیں ؎

آں کیست شود محرمِ اظہارِ خفایت   آئینۂ خویشند عیانہا و نہانہا

ما را چہ خیال است بآں جلوہ رسیدن   او ہستی و ما نیستی او جملہ و ما ہیچ

در قلزمِ خیالِ تو نتواں کنار جست   خلقے در آبِ آئینہ دارد سفینہ ہا

میرزا صاحب اپنی تصنیف چہار عنصر میں لکھتے ہیں کہ اُنہیں حسن ابدال (نزد راولپنڈی) میں ایک ایسے ہندو یوگی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جو مسئلۂ وحدتِ وجود کا قائل تھا۔ اُس سے خُوب بحث چھڑی۔ آخرکار اُنہوں نے اُسے اس مسئلہ سے تائب کرایا اور وُہ مسلمان ہو گیا۔ مجدد الفِ ثانیؒ نے وحدتِ شہود کا جو غلغلہ بلند کیا تھا۔ اُس کی صدائے بازگشت جس زور سے بیدل کے ہاں سُنائی دیتی ہے۔ وُہ شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں ملے۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ اُن دنوں پُورب اپنے علمی چرچوں کی بناء پر شیراز کا ہمسر بنا ہوا تھا۔ وہاں شیراز کی طرح فلسفہ کا بازار بھی خُوب گرم تھا چنانچہ مُلا صدرا اور میر باقر داماد کا فلسفہ وہاں عام طور سے پڑھایا جاتا تھا۔ اُنہی کے خیالات سے متاثر ہو کر شاہجہان کے عہد میں مُلا محمد جونپوری نے

فلسفہ پر اپنی ہنگامہ خیز کتاب "شمس بازغہ" لکھی، جو آج تک درسی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ اس گرم بازاری کے ہوتے ہوئے بیدل ایسا مشکل پسند طالب علم فلسفہ کی موشگافیوں کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ اُس کی مثنوی عرفان، اُس کے "نکات" اور اُس کی متعدد غزلیات اور اُس کی دیگر تصنیفات کے جستہ جستہ مقامات اس بات کے شاہد ہیں کہ اُس نے منطق کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اگرچہ وہ عقل سے مایوس ہو کر اقبال کی طرح کہتا ہے ؎

افسردہ ایم بزندانِ عقل چارہ محالست — جنوں مگر کہ قیامت گری برآورد از ما

ہر عقلی کمال کے ساتھ عشق کی آشفتہ سری کو ضروری سمجھتا ہے ؎

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است — ہر چند عقلِ کل شدہٖ بے جنوں مباش

اور کہتا ہے داغِ عشق حاصل کرنے کے لئے اپنے سینہ کو سوز و گداز کے ہزاروں شعلوں کا نشیمن بناؤ ؎

تا رسد داغے بکف صد شعلہ می باید گداخت — یافت اسکندر بچندیں جستجو آئینہ را

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اگر مابعد الطبیعات کے متعلق اُس کے خیالات کو منظم صورت میں پیش کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔

چونکہ پورب میں تصوف اور تعلیم و تعلّم کا گھر گھر چرچا تھا۔ اس لئے ہم نے ماحول کے سلسلے میں پہلے زیادہ تر انہی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن جو چیز بیدل کی دائمی شہرت کا سبب بنی۔ وہ اُس کی شاعری ہے۔ تورانی نژاد ہونے کی بنا پر ویسے بھی اُسے فارسی زبان سے دلچسپی تھی۔ لیکن ہمایوں کے عہد سے ایران کے ساتھ تعلق نے ہند کے مسلمانوں کا فارسی کے ساتھ رشتہ اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ فارسی زبان کے اساتذہ کا کلام مکاتب میں عام طور سے پڑھایا جاتا تھا۔ اسی لئے وہ دس سال کی عمر ہی میں اچھے شعر کہنے لگا۔ بیدل نے جب آنکھ کھولی تو ہندوستان میں لوگ صائب اور کلیم کے "مثالیہ" کے بڑے مداح تھے۔ مثالیہ کو کمالِ فن شمار کیا جاتا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بیدل کے دل میں اوّل اوّل اس کا شوق کیسے پیدا ہوا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شروع ہی سے ہر معاملہ میں اپنے ہمعصروں اور ہم خیالوں سے گوئے سبقت لے جانا چاہتے تھے اور جب اُنہیں معلوم ہو گیا کہ صنعتِ تمثیل ہی سے ایک شاعر طغرائے امتیاز حاصل کرتا ہے تو اُنہوں نے اس پر بیش از بیش توجہ صرف کی۔ چنانچہ اُن کے بے شمار اشعار اسی صنعت کے حامل ہیں اور کئی غزلیں تو تمام کی تمام اسی صنعت میں پائی جاتی ہیں۔ اس صنعت میں اُنہوں نے جو کمال حاصل کیا۔ وہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ لیکن ہم نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کرتے ہیں ؎

دلِ آسودۂ ما شورِ امکاں درقفس دارد — گہر وزدیدہ است اینجا عنانِ موجِ دریا را

سوخت پیش از ما دریں محفل چراغِ انتظار — دیدۂ یعقوب تا بابست در کنعانِ ما

عاشقاں در سایۂ برقِ بلا آسودہ اند — ابرو از تیغ است چشمِ خونفشانِ زخم را

منزلِ عیش بوحشت کدۂ امکاں نیست — چمن از سایۂ گل پشتِ پلنگ است اینجا

نکشاد عقدۂ دل بے گداز خود بہ مُشکل   کہ نکشاید بجز سودن گرہ از کارِ گوہرہا

دورِ مغلیہ اور خاص طور پر عہدِ شاہجہانی کے شعرا تازہ گوئی کے لئے شہرۂ آفاق ہیں۔ سرخوش کے تذکرے کلماتُ الشعراء کو اُٹھا کر دیکھئے۔ بیدؔل کے ہمعصروں کا بیان ہے۔ سرخوش ہر شاعر کے سلسلہ میں رنگین خیالی اور طبعِ معنی یاب کا ذکر کرتا ہے۔ عرفیؔ اور ظہیریؔ نے جدید تراکیب کے دریا بہا دیئے تھے۔ خاص کر بیدؔل کے زمانے میں جدید اسالیبِ بیان، تلاشِ معانی اور رنگین خیالی کی طرف شعراء کی پوری توجہات منعطف ہو چکی تھیں۔ بیدؔل نے بھی اپنے زمانے کی روش کا اتباع کیا اور ایسا نظر آتا ہے کہ ان خوبیوں کے مخترع اور ان کو درجۂ کمال تک پہنچانے والے وہی ہیں۔ اپنے متعلق یہی احساس رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

بفکرِ تازہ گویاں گر غبارِ الم پرتو اندازد   پرِ طاؤس گردد جدولِ اوراقِ دیوانہا

اس خیال کی رنگینی کا مشاہدہ کیجئے اور ساتھ ہی مندرجۂ ذیل اشعار سے بھی لطف اُٹھائیے:-

زخارِ ہر مژہ صد رنگ موجِ گل جوشد   بدیدہ گر گزر اُفتد خیالِ روئے ترا

یک سرِ مو خالی از پروازِ شوخی نیست حسن   صد نگہ خوابیدہ در تحریکِ مژگانِ شما

خوشا صبحے کہ شاہِ ملکِ عشرت جلوہ ریز آید   بزریں تختِ جام از قصرِ زنگار ربنۂ مینا

معنی آفرینی میں بیدؔل اپنی مثال آپ ہیں۔ نئے نئے معانی تلاش کرتے ہوئے ان کا خیال عام مشاہدات کو ایسے بدیع انداز سے پیش کرتا ہے اور ایسے ایسے باریک اور لطیف پردے ابرو کی ہلکی سی جنبش سے اُٹھا دیتا ہے کہ آج کل کی عجلت پسند نگاہیں ان کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں رکھتیں، حالانکہ وہ تخیل کی جان ہیں۔ اسی لئے بیدؔل کو اپنی معنی آفرینی پر بجا ناز ہے ؎

بیدؔل از فطرتِ ما قصرِ معانیست بلند   پایہ دارد سخن از کرسیِ اندیشۂ ما

ان کی معنی آفرینی کے دو ایک شاہکار ملاحظہ فرمائیے۔

این قدر تعظیمِ نیرنگِ خمِ ابروئے کیست   حیرت است از قبلہ رو گرداندنِ محرابہا

زبانِ تاک نادم می زند بنگالہ بند   کہ بر تو بائے نمی گنجد مگر در غرمنِ مینا

بچشمِ آئینہ تا جلوہ گر شد چشمِ مخمورت   ز مستی چوں مژہ برکید گر اُفتاد جوہرہا

سرگرانی لازمِ ہستی بود بیدؔل کہ صبح   تا نفس باقیست صندل بر جبیں مالیدہ است

بیدؔل کے ہاں تراکیب کی جدت اور تازگی کا اندازہ لگانا ہو تو مکتوبات اکبر الہ آبادی میں سے میرزا سلطان احمد کے نام وُہ مکتوب پڑھئے جس میں اقباؔل کی جدتِ ادا کا ذکر کرتے ہوئے اکبرؔ مرحوم کو یکلخت بیدؔل یاد آجاتا ہے۔ اقباؔل کی تعریف کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں "کیا طرزِ ادا ہے، کیا بلاغت ہے، مغربی لٹریچر کی تکمیل۔ اس پہ یہ رنگِ طبیعت کہ بیدؔل کا دل بھی صدقے ہو"۔ خود علّامہ اقباؔل نے ایک بار گوجرانوالہ کے ایک غیر معروف شاعر غلام حسین شاکرؔ کو لکھا تھا کہ اگر حسنِ تراکیب حاصل کرنا چاہتے ہو تو بیدؔل کا مطالعہ کرو۔ بیدؔل کے ہاں جدید اور تازہ ترکیب کا اس قدر وفور ہے کہ کہیں کہیں کیا ملے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ حدِ نگاہ تک رنگا رنگ دلآویز پھول کھلے ہوئے ہیں اور نگاہ ابھی ایک کی رعنائی سے پوری طرح لُطف اندوز نہیں ہوئی ہوتی۔ کہ ایک اور دعوتِ نظّارہ دیتا ہے۔ ذرا مندرجہ ذیل چند تراکیب کو دیکھئے:۔

بہشتِ عافیت، نوبہارِ عشرت، صدگُل خندہ، چمن پیکرِ حسن میگوں، شوخیٔ طاؤس، شعلۂ ادراک، معنی شکار، وحشیٔ اندیشہ، شبستانِ خیالِ میلِ گفتگو، یک جہان نیرنگ، وعالمِ عبرت، تہدیدِ دوراں، غبارِ یاس۔

جیسا کہ مضمون کے عنوان سے ظاہر ہے۔ میرا مقصد بیدؔل پر ماحول پر کے اثرات کو نمایاں کرنا ہے۔ اُس کی شاعرانہ خوبیوں کا جائزہ مقصود نہیں۔ اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود میں یہ کوشش انشاء اللہ کسی اور موقع پر کروں گا۔ تاہم اب ضمناً چند ایسے اشعار پیش کر دیتا ہوں جن سے بیدؔل کے متعلق (خاص طور پر غالبؔ کے ابتدائی پیچیدہ کلام سے متاثر ہو کر) مُشکل پسندی کے بہتان کے برعکس اُس کے بیان کی صفائی اور بے ساختگی نمایاں ہوتی ہے ؎

مُردہ ہم لشکرِ قیامت دارد　　آرمیدن چہ قدر دشوار است

چشمِ اُمید نداریم زکشتِ دگراں　　دلِ ما دانۂ ما، نالۂ ما ریشۂ ما

در ہائے فردوس وا بُود امروز　　از بے دماغی گفتیم فردا

گر نالم کجا روم بیدؔل　　شش جہت بیکسی و من تنہا

آرزو خُوں گشتۂ نیرنگِ وضعِ نازکیست　　غمزہ دارد دُور باش و جلوہ می گوید بیا

گاہ آہم می رُباید، گاہ اشکم می بُرد　　نقدِ من یک مشتِ خاک و اینہمہ سیلابہا

نہ بدامنے زحیا رسد، نہ بدستگاہِ دُعا رسد　　چو رسد بہ نسبتِ پا رسد کفِ دستِ آبلہ دارِ ما

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو سمن درآ   تو زِ غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ

تو کریم مطلق و من گدا چہ کنی جز این کہ نخوانیم   درِ دیگرے بنما کہ من بکجا روم چو برانیم

ان اشعار میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی آمد اور اُن کی دروبست اور جذبات کی فراوانی کو دیکھئے۔ کیا ان کو دیکھنے کے بعد آزاد بلگرامی کا یہ قول صادق نہیں اُترتا کہ اگر کلیاتِ بیدل را انتخاب زنند مجموعۂ لطیف و مقبول حاصل می شود و خط نسخ بر نسخۂ سحرِ سامری می کشد۔

۷۱۲ء میں محمد بن قاسمؒ کی ہندوستان میں آمد کے وقت ہی سے عربی اور فارسی نے ہندوستانی پراکرتوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ مختلف تہذیب، مختلف زبان، اور مختلف ادبیات رکھنے والی دو قوموں کے مل کر ایک جگہ رہنے سے ایک جدید زبان کا ایجاد ہونا لازم تھا۔ بیدل ۱۶۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ اس نو سو سال کے عرصہ میں وہ زبان پیدا ہو کر کئی مراحلِ حیات طے کر چکی تھی جو اب اُردو کے نام سے دُنیا کی سر برآوردہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ بیدل کا زمانہ اُردو کا عہدِ طفلی ہے۔ اگرچہ اُنہوں نے اظہارِ خیالات کے لئے فارسی نظم و نثر کو استعمال کیا۔ لیکن اپنے گردوپیش اس طفلکِ خوبرو کو دیکھ کر اُس کی دل پسند اداؤں سے وہ بھی مسحور ہو گئے۔ چنانچہ اُن کے یہ شعر انہی اداؤں کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

شہرۂ حسن سے از بسکہ وہ محجوب ہوا   اپنے چہرہ سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں   اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا   پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

ان اشعار کو دیکھئے۔ زبان کس قدر صاف[1] ہے! افسوس ہے کہ اِن اشعار کے باوجود بیدل کا تذکرہ اُردو کے پہلے دَور کے شعراء میں سنہری حروف میں نہیں لکھا جاتا۔

۱۶۵۷ء کے سرما کا ذکر ہے۔ بیدل کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ والد عمر کے چھٹے سال میں انتقال فرما گئے تھے۔ یتیم تھی۔ پھر بھی چچا کے سایۂ عاطفت میں بے فکری سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ عربی اور فارسی میں کافی مہارت پیدا ہو چکی تھی۔ لکھنے پڑھنے سے فارغ ہوتے تو شعر گوئی سے دل بہلاتے یا صوفیائے کرام اور صاحبِ جذب فقیروں کی صحبتوں میں شریک ہوتے۔ نگاہ بتدریج حقیقۃ الحقائق کی طرف اُٹھ رہی تھی۔ آنکھیں حسنِ ازل سے دوچار ہو رہی تھیں اور دل میں بھی ایک جلن سی پیدا ہو رہی تھی۔ اس بات کا تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ تاریخ اب ایک تہلکہ انگیز کروٹ لے رہی تھی۔ اور اس کی وجہ سے بیدل کے مذکورۃ بالا جذبے میں ہلچل مچنے والی تھی۔ اس کا از سرِ نو بیان ضروری تھا۔ بیدل اس طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ جب اُس کے اردگرد بڑی دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ بہار کا صوبہ دار شاہزادہ شجاع پٹنہ میں رہ کر دہلی کا تخت حاصل کرنے کے لئے فوج بھرتی کر رہا تھا۔ شاہجہاں

۱؎ کیا غالب نے بیدل کے کسی اسی قسم کے مجموعۂ اشعار کو دیکھ کر کہا تھا ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا   اسداللہ خاں قیامت ہے

کی موت کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ بیدؔل بھی سب کچھ دیکھ اور سُن رہا تھا۔ اُس نے سلیمان شکوہ کے ہاتھوں ۱۶۵۸ء کے آغاز میں شجاع کی شکست دیکھی۔ اسی سال کی گرمیوں میں اُس نے شاہ جہان کے بیٹوں کے درمیان سامُوگڑھ کے میدان میں گھمسان کا رَن پڑنے کا حال سُنا اور وہ دم بخود رہ گیا جب اُسے معلوم ہوا۔ کہ تختِ طاؤس کا مالک جلیل القدر شہنشاہ شاہ جہان، جس نے ایک طرف تو تاج محل اور موتی مسجد اور دہلی کی جامع مسجد تعمیر کرائی تھی اور دوسری طرف خواجہ معین الدین چشتیؒ، محبوب الٰہی اور خواجہ نظام الدینؒ اولیا۔ دہلوی کے مقبرے تعمیر کرائے تھے۔ قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ اُس نے چشمِ تصور سے دہلی کی گلیوں کا وہ زہرہ گداز منظر بھی دیکھا۔ جب ۱۶۵۹ء میں لوگ اشکبار تھے اور داراشکوہ اور اُس کا بیٹا سپہر شکوہ پابجولاں پھر رہے تھے۔ اور پھر اس کے سات سال بعد اس ٹریجڈی کا آخری سین بھی اُس کی نظروں کے سامنے سے گزرا۔ جبکہ قلعہ کی دیوار کو گرا کر رفیع المنزلت شہنشاہ شاہ جہان کی میت کو بیکسی کی حالت میں چند خواجہ سرا اُٹھائے ہوئے دفن کرنے کے لئے لے جا رہے تھے۔ اس وقت اُس کی عمر ۲۲ سال تھی اُس نے ایک آہِ سرد بھر کر کہا ؎

یا د آں موسم کہ بے وہم بہار و فصل دَے — داشت مینائے فلک جامِ طرب لبریزِ مے
انجمن نازاں، چمن خنداں، طراوت گلفشاں — شاخِ گُل رقاص و بلبل بستہ در منقار نَے
دورِ سعدے بُود و عہدِ امن و ایّامِ شریف — خلق در حمدِ خُدا از عدلِ شاہ نیک پَے

امن و آرام کے دورِ سعید کا یہ حسرتناک انجام دیکھ کر اس کے حساس دل کو بیحد صدمہ ہوا اور دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اُس کی نگاہوں میں اس قسم کے ہزاروں اور زہرہ گداز حادثات بسنے لگ گئے جو اپنی پُوری ہلاکت انگیزیوں کے ساتھ ماضی میں رُونما ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھوں کے پردے سب دُور ہو گئے۔ مستقبل بھی اُسے اِسی قسم کی تباہیوں کا حامل نظر آیا۔ حشمت و دولت اور عزت وجاہ کا اُسے بہرحال یہی انجام دکھائی دیا۔ اُسے پوری طرح یقین ہو گیا۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ؕ اربابِ طریقت کی صحبتوں کی برکت سے وہ پہلے ہی خدا سے لَو لگا چکا تھا۔ تخلیقِ کائنات کے سلسلہ میں اُسے منطق نے بتایا تھا کہ حقیقتِ ثابتہ وُہی نورِ ازل ہے۔ جس کے جلوے اُس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ اب اُسے دولت، عزت، زندگی، دُنیا، کائنات ہر چیز ہیچ نظر آنے لگ گئی۔ وہ پکار اُٹھا ؎

جاں ہیچ و جسد ہیچ نفس ہیچ بقا ہیچ — اے ہستیٔ تو ننگِ عدم تا بکجا ہیچ
دیدی عدم ہستی و چیدی الم دہر — با اینہمہ عبرت، نہ مید از تو حیا ہیچ

اُس نے ایک اَیسا انقلاب دیکھا کہ مظاہر کی حقیقت اُس کی نظروں میں کچھ بھی نہ رہی۔ لوگ اُس پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ دُنیا کو بے حقیقت سمجھتا تھا۔ بالکل ٹھیک ہے جو خونیں مناظر اُس نے دیکھے تھے۔ اُنہیں جو شخص بھی دیکھتا۔ اُس کا ذہنی توازن بالکل بگڑ جاتا۔ لیکن نہیں وہ باہمت اور صاحب بصیرت انسان تھا۔ اُس نے ان خونیں مناظر کے درمیان اُن اقدار کو دیکھ لیا جو انسان کو انسان بناتی ہیں اور زندگی کو امن اور ابدی مسرت سے معمور کر دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے اُس کی عظمت ہمارے دلوں پر ثبت ہو جاتی ہے۔ وہ پہلے صرف صُوفی تھا۔ اب عارف بن گیا۔ پہلے وہ بڑا شاعر تھا۔ اب حکیم ہو گیا۔ اُس کی تراکیب میں جدت اور شان و شوکت اب بھی موجود تھی۔ اُس کا کلام رعنائی خیال کا اب بھی بہترین نمونہ تھا۔ مُنہ سے گلہائے معانی اب بھی بے ساختہ جھڑ رہے تھے۔ مثالیہ اب بھی از خود اشعار میں وارد ہو کر شعریت کو دوبالا کر دیتا تھا اور تخیل میں قوت، بداعت اور رفعت اب بھی

(...)تی جاتی تھی۔ اور زبان کا ترنم اب بھی دلوں کو موہ لیتا تھا۔ لیکن اب اُس کی شاعری زمزمۂ حمد بن چکی تھی اور جو سوز و گداز اور درد اور خلوص اس کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ عدیم المثال ہے۔ اس کے کلام میں اب وہ وصف پیدا ہو چکا تھا جو فارسی گویانِ ہند میں مفقود ہے اور جو صرف سنائیؒ اور رومیؒ کے ہاں ملتا ہے۔ وہ شوقِ دیدار اور آرزوئے وصل سے بیتاب ہو کر ایک موسیٰؑ کی طرح کہتا ہے ؎

اے بہارستانِ اقبال اے چمن سیما بیا — فصلِ سیرِ دل گزشت اکنون بچشمِ ما بیا
عرضِ تخصیص از فضولیہائے آدابِ وفاست — چون نگہ در دیدہ یا چون روح در اعضا بیا
بیش ازین نتوان حریفِ داغِ حرمان زیستن — یا مرا از خود ببر آنجا کہ ہستی یا بیا

اور کائنات کے تمام خس و خاشاک کے درمیان اس وقت اُسے اپنے مقام سے آشنا انسان کی جو عظمت نظر آتی۔ وہ بیان سے باہر ہے خود بیدل کی زبان سے سنیئے :-

ما حریفانِ بزمِ اسراریم — مستِ جامِ شہود و دیداریم
جوشِ بحرِ محیطِ لاہوتیم — فیضِ صبحِ جہانِ انواریم
اثرِ ذُلِّ حق ز ما پیداست — بے گمان عرضِ سترِ اظہاریم
جلوہ فرماست حق بکسوتِ ما — لاجرم طرفہ رنگہا داریم
برقِ عشقیم شعلہ می خندیم — ابرِ شوقیم نالہ می باریم

دل اور دماغ اور روح میں اس زبردست انقلاب کے بعد عام دنیاوی اقدار اُس کے لئے بالکل ہیچ بن کر رہ گئیں۔ بادشاہ اور گدا کا فرق دُور ہو گیا۔ شاہزادہ اعظم شاہ نے قصیدہ لکھنے کو کہا تو اُس کی ملازمت ترک کر دی۔ نظام الملک نے دکن آنے کے لئے لکھا تو یہ شعر لکھ بھیجا ؎

دُنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش — من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

اور جب بے پناہ طاقت رکھنے والے بادشاہ گر سید بھائیوں نے شہنشاہ فرخ سیر کو قتل کرا دیا تو ان میں سے چھوٹے بھائی سید حسین علی خاں کے ساتھ دیرینہ مراسم کے باوجود بے دھڑک یہ تاریخ وفات کہی ؎

سادات بسے نمک حرامی کردند (۱۱۳۱ ہجری مطابق ۱۷۱۸ عیسوی)

مندرجہ بالا حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ جب بیدل کی قوتِ بیان پختہ ہو گئی تو اُس کے محرکاتِ تخلیقی حقیقتِ حقہ کے مقابلہ میں کائنات کی ہیچمیرزی اور انسان کا حملِ امانت تھے۔ یہی برقی قوت اُس کے ضخیم دیوان، اُس کی مثنویات، اُس کی نثری تصنیفات، اُس کے قصائد و قطعات اور اُس کی رباعیات میں ایک بے پناہ تڑپ پیدا کر رہی ہے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے یہ سب کچھ اُس کے ماحول کا نتیجہ تھا۔

عظیم آباد پٹنہ چھوڑنے کے بعد بیدل دہلی اور اُس کے قرب و جوار میں پچاس سال سے زائد عرصہ رہے۔ یہ بڑا طویل عرصہ ہے لیکن اُن کی انفرادیت نے جو رنگ اختیار کر لیا تھا۔ وہ آخر دم تک قائم رہا۔ ہاں اس کی روشنی میں وہ حالاتِ عالم کا جائزہ لیتے رہے اور حکیمانہ انداز میں شعر

کہتے رہے۔ اُن کی بلند سیرت، اُن کی عرفان پروری، اُن کی وسعتِ علم، اور اُن کے کریمانہ اخلاق سے متاثر ہو کر فقرا، شعرا، اور اُمرا اُن کے پاس کھنچے کھنچے چلے آتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے عزلت دائرہ اکو نہ چھوڑا۔ اُن کی شہرت اورنگ زیبؒ کے کانوں تک بھی پہنچی اور اُس دیں پروَر شہنشاہ نے اُن کے دیوان کی ایک نقل منگوائی اور مطالعہ کیا۔ چنانچہ رقعاتِ عالمگیری میں بیدؔل کا مندرجۂ ذیل شعر موجود ہے ؎

حرص قانع نیست بیدؔل ورنہ اسبابِ معاش   آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

بیدؔل نے پچاس سال سے زائد عرصے کی یہ تمام طویل مدّت ایک خاموش مُصلح کی حیثیت سے گزاری۔ عہدِ مُغلیہ نے تین مجدّد پیدا کئے ہیں۔ صُوفی مجدّد، حضرتِ احمد سرہندیؒ، شہنشاہ مجدّد، محی الدین اورنگ زیبؒ اور شاعر مجدّد، میرزا عبدالقادر بیدلؒ۔ ان کے کلام میں کچھ چیز ورائے شاعری ہے اور اگر اس کی حقیقت سے آگاہ ہونا مطلوب ہو تو ان کے دیوان اور اُن کی دیگر تصنیفات کی ورق گردانی کرنا چاہئے۔ شاہانِ مُغلیہ کے دارالسلطنت میں جب بیدؔل پہنچے تو مُغل اور ایرانی اُمرا کی بے راہ روی نے اُنہیں جس قدر تکلیف دی، اُس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سعدؔی کے بعد امرا اور سلاطین کے اخلاق کی جس قدر شدید مذمت بیدؔل نے کی ہے، اتنی اور کسی شاعر نے نہیں کی۔ غالباً انہی کی اصلاح کے لئے اُنہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اُنہوں نے اس طبقہ کی درشت مزاجی، بے مروّتی، غفلت شعاری، کم ظرفی، بے مغزی اور دینِ حق سے لاپروائی۔ الغرض ایک ایک بات کو لیا ہے اور عجیب پیرایے میں سرزنش کی ہے اور کہا ہے۔ تم اپنے آپ کو عام انسانوں سے کیسے بالاتر سمجھتے ہو ؎

در حباب و موجِ ایں دریا تفاوت بیش نیست   اندکے باد است در سر صاحبِ اورنگ را

اور پھر اس منفی تنقید کے ساتھ ساتھ مثبت اخلاق کی تلقین کی ہے۔ یہ بیان بجائے خود ایک تصنیف چاہتا ہے۔ اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے فطرتِ انسانی کی حیرت انگیز نقاب کشائی کی ہے اور نہایت باریک نکتے پیدا کئے ہیں اور پھر اخلاقِ افلاطون کی طرح مسلک گوسفندی کا نہیں بلکہ جواں ہمتی اور مردانگی کا درس دیتے ہیں اور اس طرح معلوم ہوتا ہے گویا رُوحِ اقبال کام کر رہی ہے۔ سُنئے ؎

حوادث عینِ آسائش بود آزادہ مشرب را   کہ موجِ بحر دارد از شکستِ خویش جوہرہا

اے فغاں بگزر ز چرخ و لامکاں تسخیر باش   چند در زیرِ سپر کردن نہاں شمشیر را

جمع با زینت نگردد جوہرِ مردانگی   از برش عاری بود گر سازی از زر تیغ را

داغِ عشقم نیست اُلفت با تن آسانی مرا   پیچ و تابِ شُعلہ باشد نقشِ پیشانی مرا

گرمیٔ ہنگامۂ آفاق موقوفِ تب است   روز اگر خورشید باشد شمعِ شبہا آتش است

الغرض مذموم اخلاق سے نفرت دلاتے ہیں۔ مردانہ اوصافِ حمیدہ کی ترغیب دیتے ہیں۔ عقائد کی اصلاح ہو رہی ہے۔ اسرارِ عالم کھولے جا رہے ہیں۔ عشقِ الٰہی کا سبق دیا جا رہا ہے۔ حضرت ختمی مرتبت کو بحرِ کائنات کا گوہرِ آبدار بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

دو عالم چوں صدف در ہم شکستم　　　که آمد گوہر نامش بدستم

اس طرح معلوم ہوتا ہے گویا بیدل مغلیہ سلطنت کے قلب یعنی دہلی کو ہر قسم کے تعفن سے پاک کر کے اس کے اندر ایک صالح روح پھونکنا چاہتے ہیں لیکن افسوس ہے صدیوں کے عیش و عشرت کی وجہ سے طبائع اس قدر مضمحل اور بیکار ہو چکی تھیں کہ بیدل اور عالمگیر کی بے لوث مجاہدانہ کوششیں اُن کی اصلاح کر کے اُن کے اندر ایک تڑپتی ہوئی جانِ پاک ڈال نہ سکیں۔

مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفلس اور نادار طبقہ سے بیدل کے وسیع جذبۂ ہمدردی کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک متمول فوجی سردار کا فرزند ہونے کے باوجود اور پھر شاہزادہ اعظم شاہ کی فوج میں ترقی مناصب کی تمام یقینی توقعات کو چھوڑ کر اُس نے درویشی اختیار کی اور غریب اور نادار طبقہ کے ایک فرد کی حیثیت سے بڑے اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کی اور ساتھ ہی احساس کی پوری شدت کے ساتھ ان کے مصائب کو اپنے اشعار میں بیان کیا۔ اُن کی خاموش افسردہ صورتوں کو دیکھا تو کہا ؎

مفلساں را بیدل از مشقِ خموشی چارہ نیست　　　تنگدستی باز می دارد ز قلقل شیشہ را

اور پھر جب اپنی پریشانیوں کی بنا پر اُنہیں فریاد کرتے سُنا تو کہا بہ حق بجانب ہیں ؎

ہجومِ شکوہ ہر کس زدردِ مفلسی باشد　　　نخیزد نالہ از نے تا بود مغز استخوانش را

اور ساتھ ہی اس ستم رسیدہ طبقہ سے کہا۔ افلاس اور احتیاج کی بنا پر تونگر لوگوں کے سامنے جا کر ہاتھ مت پھیلاؤ۔ نہ مایوسی ہی اختیار کرو۔ بلکہ بن پڑے تو اپنی قوت بازو سے کام لے کر انقلاب پیدا کرو اور زندگی اور زندگی کی رُسوا کُن رسوم و عادات کا خاتمہ کر دو ؎

زندگی در بند و قیدِ رسم و عادت مردن است　　　دست و دستِ تست بشکن ایں طلسمِ ننگ را

اس وسعتِ نگاہ اور جذبۂ دل کی ان پہنائیوں اور گہرائیوں کے ساتھ اپنی معاشرہ کی آخری دم تک اصلاح کرتا ہوا ہندوستان میں فارسی زبان کا یہ عظیم الشان شاعر عمر کے ۷۶؎ سال گزار کر ۱۷۲۱ء میں بمقام دہلی محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں راہیٔ ملکِ بقا ہوا اور پرانے قلعہ کے سامنے حضرت یار پرّاں کے مزار کے قریب دفن ہوا۔ شاگرد ایک مدت تک سال بسال اُس کا عُرس مناتے رہے۔

میں نے سطورِ بالا میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ماحول نے بیدل کی تربیت اور پختگی میں کیا حصّہ لیا اور پھر بیدل نے کس طرح اسے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ چند باتیں رہ بھی گئی ہیں مگر وہ ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً اپنے عہد کے شعراء کو قصیدہ گوئی سے باز رکھنے کی کوشش، دکن میں عالمگیری فتوحات پر اظہارِ مسرت، اپنے عہد کے مختلف اہم واقعات پر تاریخی قطعات وغیرہ۔ میرا خیال ہے کہ ان کا تفصیلی ذکر بے جا طوالت پر منتج ہوگا۔ لیکن جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اُس کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مضمون میں بیدل کے قلب کی ہر بنیادی لرزش کا ذکر آ گیا ہے اور اُمید ہے کہ ان کے مطالعہ سے قارئین کو روحِ بیدل آشناسی معلوم ہونے لگے گی۔

؎ قمری حساب سے ۹۰ سال۔ پیدائش سنہ ۱۰۵۴ھ اور وفات سنہ ۱۱۳۳ھ

یُوسف ظفر

شکستِ خواب

حیات کی سرد و گرم لہروں سے مُجھ کو اُلفت سی ہو چلی ہے
بدلتے لمحے، سرکتے سائے، ہمکتے بجرے، لپکتی موجیں
مجھے حوادث کی اک مسلسل ہماہمی میں لپیٹتی ہیں،
یہ نرم آنسو بھی اک ہنسی ہے، وُہ گرم نالہ بھی قہقہہ ہے
مری نگاہوں کو چیرتی چیخ کا بُلاوا بھی قہقہہ ہے
نہ درد آہوں کی بے بسی کا، نہ تلخی آرزو کہیں ہے
وُہ بے حِسی کا سکوں میسر ہے جس میں کوئی الم نہیں ہے

زمانہ گزرا کہ ایک نادان آرزو میری زندگی تھی
اُسی کی ناکامیوں کا طوفان جا، ساماں وُہ آسماں تھا
کہ جس پہ میرے چراغِ دامن جیسی ستاروں کی روشنی تھی
بدل تھی اُس ماہ کا کہ جس کو مری تمنّا نہ پا سکی تھی ——
انہیں چراغوں سے میں نے فانوس خانۂ غم بنا لیا تھا
وُہ ایک عالم بنا لیا تھا کہ جس میں میں نے شکستہ نغموں،
شکستہ آہوں، شکستہ خوابوں کے ریزے ریزے کو چُن لیا تھا
وُہ ایک عالم کہ جس میں تنہائیوں سے، آلامِ زندگی سے،

نجات پانے کو تَن لیا تھا
وُہ جال — وُہ خود کفیل جلووں کی اُلجھی سُلجھی حکایتیں سی
جنہوں نے اس مختصر سی دُنیا کو وسعتِ لامکاں عطا کی
مسرّت دو جہاں عطا کی۔

مرے مسرّت کدے میں، اس خواب زار میں تیری مُسکراہٹ
فسوں بنی اور میری دُنیا پگھل کے بکھری، بکھر کے پھیلی۔
تری مسرّت کے ریشمیں دائروں نے میری نظر کو چھیڑا
تری لطافت، تری صباحت، تری محبّت کے پیچ و خم میں
نہ مجھ کو پاسِ الم رہا تھا نہ دل کو احساسِ غم رہا تھا،
تری گُلابی حیا کی لہریں بہا کے لے ہی گئیں غموں کو
قدیم یادوں کے ہمدموں کو —

یہ سحر ٹوٹا، وُہ زندگی خواب ہو چکی، خواب سے گلہ کیا
مرا قصور وفا نہیں ہے، تری شکستِ حیا نہیں ہے
مگر کوئی بات بھی ہو پہلا سا وُہ زمانہ رہا نہیں ہے
یہی بہت ہے کہ اب حوادث سے مجھ کو اُلفت سی ہو چلی ہے
نہ غم ہے آہوں کی بے بسی ہے، نہ تلخیِ آرزو کہیں ہے
وُہ بے حسی کا سکوں میسّر ہے جس میں کوئی الم نہیں ہے۔

یوسف ظفر

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

مامون الرشید کا فیصلہ

(دورِ عباسیہ کی ایک عبرت انگیز داستان)

فضل بن ربیع اُن بدبخت مشاہیر میں سے ایک ہے۔ جن کے ناپاک تذکروں سے تاریخ کے صفحات گندہ ہیں فضل کی شہرت تاریخِ اسلام میں میسور کے محمد صادق۔ بنگال کے میر جعفر اور بغداد کے ابن علقمی سے کسی طرح کم نہیں۔ اپنی خباثت۔ کینہ پروری۔ حسد۔ غمازی اور فتنہ پردازی میں یہ اپنے باپ ربیع کا جائز وارث تھا۔ بلکہ شاید اُس سے بھی دو قدم آگے۔ اگر باپ نے مہدی عباسی سے جھوٹی سچی چغلیاں کھا کر اُس کے وزیر ابو عبداللہ معاویہ بن یسار کے بیٹے محمدؐ کو قتل کرایا اور خود وزیر کو معزول کرایا تو برخوردار نے ہارون الرشید سے اُس کے وزیر جعفر برمکی کی شکائتیں کرکے اُسے قتل اور اُس کے باپ اور بھائیوں کو قید کرایا۔ مگر فضل کا ایک کارنامہ اپنے باپ سے بڑھ کر یہ رہا کہ ہارون کے بعد اُس کے بیٹے ابین الرشید کے قتل کا باعث بھی یہی شخص تھا۔ اپنے انہی افعال کی وجہ سے دنیا ہمیشہ اس پر لعنت کرے گی مگر ہمیں اس وقت فضل کے چال چلن سے غرض نہیں۔ ہم تو آج کے فسانہ میں مامون کی سیرت کا ایک پہلو دکھانا چاہتے ہیں جس کا تعلق اسی فضل بن ربیع سے ہے

فضل بن ربیع حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ کے غلام کیسان کی اولاد سے تھا۔ اسلام میں جس قدر لطف و کرم کی بارش غلاموں پر ہوتی رہی ہے اُس سے کیسان کو بھی وافر حصّہ ملا تھا اور اُس کی اولاد پر تو اس بارش کی انتہا نہ رہی۔ لیکن اولاد کچھ ایسی کمینہ فطرت اُٹھی کہ ان عنایاتِ الٰہی کی اس نے کچھ بھی قدر نہ کی اور اپنی ساری کوششیں لوگوں کی تخریب، ذلت اور تباہی میں صرف کیں۔

فضل کا باپ ربیع بن یُونس عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کا حاجب تھا۔ دورِ عباسیہ میں حاجب ایک نہایت جلیل القدر منصب تھا۔ حاجب کی اجازت کے بغیر کوئی شخص خلیفۂ وقت سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ تمام مہماتِ سلطنت میں حاجب ضرور شریکِ مشورہ کیا جاتا تھا۔ ربیع تین عباسی خلیفوں کا حاجب رہا۔ یعنی منصور۔ مہدی اور ہادی کا۔ جو بدترین سلوک اس نے اپنے گہرے دوست اور مہدی کے وزیر ابو عبداللہ سے کیا۔ وہ حد درجہ شرمناک ہے۔ آخر سنہ ۱۷۰ھ میں اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لئے دار الجزا کو روانہ ہو گیا مگر اپنے پیچھے فضل جیسے جانشین کو چھوڑ گیا جو پانچوں عیبِ شرعی کا حامل اور حد درجہ بدباطن انسان تھا۔ اس کے جرائم کی فہرست خاصی طویل ہے اور ساری کی ساری مکروہ بدکرداریوں سے بھری ہوئی۔

فضل بن ربیع ہارون الرشید کا بہت مُنہ چڑھا مصاحب تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ اپنے باپ کی طرح وزارت یا کسی اور معتمد عہدے پر فائز ہو جائے

مگر برامکہ کے اقتدار کے آگے اُس کا چراغ نہ جلتا تھا۔ اس لئے اس بدبخت نے اپنی پستِ فطرتی اور دناوتِ طبع کی بدولت اس امر کا عزم کر لیا کہ جس طرح بھی ہو برامکہ کا نشان راستہ میں سے ہٹانا چاہیئے جبھی میرے عروج کا رہوار میدانِ ترقی میں دوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے وزیر السلطنت جعفر اور اس کے بھائی فضل اور دونوں کے باپ یحییٰ برمکی کے خلاف ہارون الرشید کے کان بھرنے شروع کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جعفر قتل ہوا۔ باپ بھائی گرفتار ہوئے اور برامکہ پر ایسی تباہی آئی کہ کسی مقتدر خاندان پر نہ آئی ہو گی۔ یہ سانحہ ۱۸۷ھ میں پیش آیا۔

برامکہ کے استیصال کے بعد فضل کی دیرینہ آرزو بر آئی۔ ہارون الرشید نے اس کو اپنا وزیر بنا لیا اور تمام انتظامِ سلطنت اُسے سونپ دیا حالانکہ وہ نہایت نالائق تھا اور قطعاً اس بارِ عظیم کو اُٹھانے کے قابل نہ تھا جسے برامکہ نے اپنی عقل و دانش اور فہم و فراست سے اُٹھا رکھا تھا۔

وزیر ہونے کے بعد اس کم نصیب اور لاابعقل شخص نے اس امر کی کوشش شروع کی کہ ہارون کے بیٹے مامون الرشید کو ولیعہدی سے معزول کر کے اُس کے بھائی امین الرشید کو ولیعہد بنایا جائے۔ مامون کی تعلیم و تربیت جعفر برمکی کے زیرِ اہتمام ہوئی تھی اور جعفر ہی نے ہارون سے پر زور سفارش کر کے مامون کو ولی عہد بنوایا تھا۔ قدرۃً جعفر کے قتل سے مامون کو نہایت صدمہ پہنچا تھا۔ وہ اُس کا اتالیق بھی تھا اور محسن بھی۔ اس لئے بدبخت فضل بن ربیع نے سوچا کہ اگر ہارون کے بعد مامون بادشاہ ہو گیا تو پھر میری خیر نہیں۔ یہ جعفر کا قصاص مجھ سے ضرور لے گا۔ اس لئے اُس نے سوچا کہ جعفر کی طرح اس کانٹے کو بھی راہ سے ہٹاؤ۔ نسخہ آزمودہ تھا۔ اُس نے وہی استعمال کرنا شروع کر دیا یعنی مامون کی نالائقی اور امین کی لیاقت کی فرضی کہانیاں گھڑ گھڑ کر ہارون الرشید کو سُنانی شروع کیں۔

اس قسم کی فتنہ انگیزی کا جو نتیجہ ہوا کرتا ہے وہی ہوا۔ یعنی ہارون نے ولیعہدی میں مامون کو مؤخر اور امین کو مقدم کر دیا اور دونوں بیٹوں سے قول و قرار اور قسمیں لے کر ایک عہد نامہ لکھوایا کہ ہارون کے بعد امین خلیفہ ہو گا اور امین کے بعد مامون۔ یہ عہد نامہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔ اور فرشتوں اور خدا کو اس پر گواہ بنایا گیا۔

اگر فضل کا بس چلتا تو مامون کے ساتھ بھی وہی سلوک کرواتا جو اُس نے جعفر کے ساتھ کروایا تھا۔ مگر یہ بات اُس کے اختیار کی نہ تھی لہٰذا یہ سوچ کر چپکا ہو رہا کہ جب ہارون کے بعد امین خلیفہ ہو گا۔ تو میں اس سے کہہ کر اس عہد نامہ کو پھاڑ ڈالوں گا اور مامون کو معزول کرا دوں گا۔ پھر میرے اور میری اولاد کے لئے میدان صاف ہے۔

بدقسمتی سے اس کا موقع جلد ہی آ گیا ۱۹۳ھ میں ہارون کا انتقال طوس میں ہو گیا۔ اُس کے مرتے ہی فضل بن ربیع کے دل میں امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ اپنے مستقبل کے متعلق جو فکر اُسے تھا۔ ہارون کے مرتے ہی اطمینان سے بدل گیا۔ کیونکہ امین الرشید اُس کے ہاتھ میں موم کی ناک تھا اور ساری فوج اور تمام خزانہ اُس کے اپنے قبضہ میں تھا۔ ان پختہ ذریعوں اور قوتوں کی موجودگی میں مامون الرشید کو تباہ اور ہلاک کر دینا وہ اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتا تھا۔

ہارون نے مرتے وقت تمام فوج جو اُس کے ساتھ تھی اور تمام اسلحہ اور کُل فوجی سامان اس اقرار اور قسم کے ساتھ فضل بن ربیع کے سپرد کیا تھا کہ میرے مرنے کے بعد یہ سب کچھ مامون کے پاس مرو میں پہنچا دیا جائے۔ کیونکہ یہ اُسی کا مال ہے۔ تمام سردارانِ لشکر سے بھی اسی بات پر قسمیں لی گئی تھیں۔ مگر ہارون کی آنکھیں بند ہوتے ہی فضل نے ساری قسمیں اور قول و قرار بھلا دیئے۔ فوج اور سردارانِ لشکر کو بہکا سکھا کر قسمیں توڑنے پر راضی کر لیا۔ کسی کو ڈرا دھمکا کر کسی کو لالچ دیا اور اس طرح کل فوج کو اپنے ساتھ شامل کر کے سب کو امین کے پاس بغداد لے گیا اور مامون بڑی حسرت کے ساتھ اس ڈرامے کو دیکھتا رہ گیا۔

سیاسی لحاظ سے یہ نہایت سخت دھکا مامون کو لگا تھا۔ مگر اس نے اس کی پروا نہ کی اور بڑی محبت کے ساتھ امین سے خط و کتابت جاری رکھی فضل کو دونوں بھائیوں کا اتنا سا تعلق بھی پسند نہ آیا۔ کیونکہ اس میں اُس کو صاف اپنی تباہی نظر آ رہی تھی۔ اس لئے اس نے چاہا کہ دونوں بھائیوں میں سخت دشمنی اور عداوت پیدا ہو جائے اور سلسلۂ رسل و رسائل قطعاً بند ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے مامون کے خلاف امین کے کان بھرنے شروع کئے اور کہا کہ آپ کے والد نے آپ کے بعد جو مامون کو خلافت دینے کا اقرار آپ سے لیا تھا۔ وہ بالکل غلط اور خلافِ اُصول تھا۔ اب آپ کو چاہیئے کہ اپنے بیٹے موسیٰ کو اپنا ولی عہد قرار دیں۔ کیونکہ وہی آپ کے بعد مستحقِ خلافت ہے اور مامون کو معزول کر دیں۔ باپ کے مرنے کے بعد کوئی حق خلافت میں اس کا باقی نہیں رہتا۔

امین نے اوّل اوّل تو نقضِ عہد سے انکار کیا۔ مگر فضل کے بار بار کہنے اور اکسانے اور بہکانے سے آخر مان گیا۔ خدا اور رسول کو ضامن قرار دے کر اور سخت قسمیں کھا کر جو عہد نامہ لکھا تھا اور خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا تھا۔ وہاں سے منگوا کر پھاڑ ڈالا اور مامون کو لکھ دیا کہ میں تمہیں ولیعہدی سے معزول کرتا ہوں۔

فضل کی دشمنی مامون سے یہیں تک محدود نہ رہی بلکہ اُس نے اُسے گرفتار کر کے مروا ڈالنا چاہا۔ تاکہ یہ پتھر اُس کے راستے سے ہمیشہ کے لئے ہٹ جائے۔ چنانچہ امین کو بھڑکا کر فضل نے چالیس ہزار سپاہ کی ایک فوج تیار کی اور علی بن عیسٰی بن ہامان کو اس کا سپہ سالار بنا کر ۱۹۵ھ میں مامون کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ چلتے وقت علی کو فضل نے چاندی کی ایک زنجیر اس غرض سے دی کہ جب تم مامون پر فتح پاؤ تو اس زنجیر میں جکڑ کر مامون کو میرے سامنے پیش کرنا۔

اگرچہ مامون کے پاس فضل بن ربیع کی مہربانی سے کچھ نہ رہا تھا۔ نہ فوج، نہ اسلحہ، اور نہ خزانہ۔ مگر پھر بھی اُس نے ہمت نہ ہاری اور جس طرح بھی ہو سکا اِدھر اُدھر سے کچھ فوج جمع کر کے علی کے مقابلہ کے لئے اپنے غلام طاہر بن حسین کی سرکردگی میں روانہ کی۔
بمقام رے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور نتیجہ فضل بن ربیع کی توقع کے بالکل برخلاف نکلا۔ علی میدان میں مارا گیا اور طاہر کو فتح ہوئی۔

جس وقت یہ ہولناک خبر بغداد میں پہنچی تو فضل بن ربیع کے ہوش اُڑ گئے۔ بلا توقف اُس نے بیس ہزار سپاہی مزید تیار کئے اور ان کو عبدالرحمٰن ابن جبلہ

کی قیادت میں طاہر کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ ہمدان کے میدان میں دونوں کی مٹ بھیڑ ہوئی اور عبدالرحمٰن شکست کھا کر قلعہ بند ہوگیا۔ طاہر نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ دنوں سستا کر عبدالرحمٰن قلعہ سے نکلا اور حملہ کیا۔ مگر پھر شکست کھائی اور جان کی امان کے وعدہ پر قلعہ طاہر کے حوالے کر دیا۔

جب اس مرتبہ بھی کامیابی نہ ہوئی تو فضل نے تیسری مرتبہ بیس ہزار سپاہ احمد بن یزید کو دے کر اُسے مامون کی طرف روانہ کیا۔ مگر اس فوج کو بھی ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

آخری بار فضل نے مزید بیس ہزار فوج عبداللہ بن حمید کے ماتحت روانہ کی۔ ان دونوں فوجوں کو طاہر کے ہوشیار جاسوسوں نے اپنی چالاکیوں سے آپس ہی میں لڑوا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فوجیں بغیر دشمن کا مقابلہ کئے بخیر و عافیت بغداد واپس چلی آئیں۔

اب طاہر نے بغداد پر حملہ کر دیا۔ ظالم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔ جب فضل نے یہ حالت دیکھی تو اُسے اپنا انجام اینٹ میں نظر آنے لگا۔ بجائے اس کے کہ فوج کو لڑاتا اور جوانمردی سے دشمن کا مقابلہ کرتا۔ اس نے عافیت اسی میں دیکھی کہ جلدی سے کہیں روپوش ہو جائے۔ اسے خوف تھا کہ مامون کے سپاہی اُس کی بوٹی بوٹی الگ کر ڈالیں گے۔ چنانچہ وہ روپوش ہوگیا۔

یہاں وُہ مثل ہوئی کہ چھوٹے میاں سو چھوٹے میاں۔ بڑے میاں سُبحان اللہ۔ فضل نے تو چھُپ کر اپنی جان بچائی۔ امین کو اور کچھ نہ سُوجھی تو اس نے سارے شہر کے بدمعاشوں، اوباشوں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کو اپنی امداد و نصرت کے لئے جمع کیا۔ قید خانے میں جتنے قیدی تھے۔ سب کو چھوڑ دیا اور کہا کہ اس وقت میری مدد کرو۔ اس صلہ میں تم آزاد ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے لوگ فوج کا کیا مقابلہ کرتے۔ اُلٹا انہوں نے شہر والوں کو لوٹنا شروع کیا۔ اور وُہ بلسئے توبہ مچی کہ خُدا کی پناہ۔

اس چیخ پکار میں طاہر نے بغداد پر قبضہ کر لیا اور ۲۵ محرم ۱۹۸ھ کو امین گرفتار ہو کر قتل کر ڈالا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس سارے المناک ڈرامے کا ہیرو فضل اور محض فضل تھا۔ مامون کی تباہی کے لئے اُس نے شروع سے آخر تک کسی قسم کی کسر باقی نہیں چھوڑی اور وُہ سب کچھ کیا جو وُہ کر سکتا تھا

سقوطِ بغداد کے بعد جب امن و امان ہوگیا تو سب سے پہلے اس قیامت خیز ہنگامہ کے بڑے مجرم فضل بن ربیع کی تلاش شروع ہوئی۔ مامون کے سپاہیوں نے بغداد کا کونا کونا چھان مارا مگر فضل کا پتا نہ لگا

اب مامون نے فضل کی گرفتاری کے لئے یہ تدبیر کی۔ کہ اپنے ایک نہایت معتمد، بہادر اور عقلمند مصاحب معیل شاہک کو بلایا اور اس سے یہ بات کہی کہ میں تمام سلطنت میں سے خاص طور پر تمہیں اس کام کے لئے مخصوص کرتا ہوں کہ جہاں سے بنے اور جس طرح ممکن ہو فضل بن ربیع کو گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کرو۔ اور میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ وُہ اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ میں نے تمہیں اس اُمید اور اس توقع کے ساتھ منتخب کیا ہے کہ تم پوری کوشش سے فضل کا کھوج نکال کر اسے گرفتار کر لاؤ گے۔ تم مختار ہو کہ اُس کی گرفتاری کے لئے جس قدر انعام چاہو مشتہر کر دو۔ وُہ سب خزانہ شاہی سے ادا کیا جائے گا۔

شاہک نے عرض کی کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہے تو جو حقیر خدمت امیر المؤمنین نے میرے سپرد کی ہے۔ میں اُسے بجا لانے میں کوشش اور جستجو کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھوں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے مجھے اس مہم میں کامیابی بخشے۔ میں حضور سے رخصت ہوتا ہوں اور آج ہی سے اُس کی تلاش میں لگ جاتا ہوں

معیل شاہک نے گھر پہنچتے ہی شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو شخص فضل بن ربیع سابق وزیر ہارون الرشید کو گرفتار کر لائے گا۔ اُسے ایک ہزار دینار سُرخ شاہی خزانہ سے انعام دیئے جائیں گے اور حضرت امیر المؤمنین اُس سے نہایت خوش ہوں گے۔

انعام بیش قرار تھا سینکڑوں آدمی اُس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ مگر اُس کا سُراغ کہیں نہ ملا۔ یہاں تک کہ ایک سال ہو گیا۔

مامون نے معیل شاہک کو پھر بلایا اور کہا "کیوں شاہک تم بھی ہار کر بیٹھ رہے اور ہمارا مجرم پکڑا نہ جا سکا"

شاہک نے نہایت شرمندہ ہو کر کہا "حضور کیا عرض کروں۔ میں نے تو کوشش میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ کامیابی نہیں ہوئی مگر میں ابھی تک مایوس نہیں ہوں۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا۔ کہ فضل کا سر آپ کے قدموں میں ہوگا۔ مامون نے کہا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اس وقت میری سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ کسی طرح مجھے فضل پر قابو حاصل ہو جائے۔ وہ دُنیا میں میرا سب سے بڑا دشمن ہے۔ تم یہ کام کرو کہ انعام کی رقم دگنی کر دو"

چنانچہ انعام کی رقم بجائے ایک ہزار کے دو ہزار دینار سُرخ کر دی گئی۔ مگر مجرم کا سُراغ نہ ملا۔ ایک برس اور گذر گیا۔

ایک روز مامون نے پھر شاہک کو بلایا اور اُس سے کہا "کیوں شاہک! کوئی پتا لگا؟"

شاہک نے گردن جھکا کر کہا "حضور! میری ہر کوشش اس معاملے میں ناکام ہو چکی ہے مگر میں ابھی تک نہیں ہارا اور خدا گواہ ہے کہ برابر کوشش کر رہا ہوں"

مامون نے کہا "اچھا انعام کی رقم پھر دوگنی کر دو۔ شاید انعام کے لالچ ہی میں لوگ اس طرف توجہ کریں۔ چار ہزار دینار میں اگر فضل بن ربیع کا ناپاک جسم میرے قبضہ میں آتا ہے تو یہ کچھ مہنگا سودا نہیں ہوگا"

اب اعلان ہو گیا کہ چار ہزار دینار اُس شخص کو انعام دیئے جائیں گے جو کہیں سے فضل کو پیدا کر دے۔ لوگوں نے بہت کچھ بھاگ دوڑ کی۔ سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ رہا اور فضل بن ربیع گرفتار نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

تیسرا برس ختم ہو کر چوتھا سال لگ گیا۔ مگر فضل بن ربیع کا وجود عنقا رہا۔ شاہک نے خلیفہ کے حکم سے سال کے شروع میں انعام کی رقم بجائے چار ہزار کے آٹھ ہزار دینار سُرخ کر دی تھی لیکن نتیجہ صفر رہا۔ شاہک کے آدمی تلاش کرتے کرتے تھک گئے۔ خود شاہک نے دُنیا جہان کے سارے کام چھوڑ دیئے اور ہر وقت اسی فکر میں سرگرداں رہنے لگا۔ ہزاروں آدمی انعام کے لالچ میں جگہ جگہ فضل کو ڈھونڈتے پھرے سینکڑوں سراغ رسان اور کھوجی بھی برابر شہروں اور دیہات کا چکر لگاتے رہے۔ مگر ساری تگ و دو بیسود ثابت ہوئی۔ سلطنت کا ہر چھوٹا بڑا اور صغیر و کبیر فضل کے خون کا پیاسا تھا۔ مگر پیاس ایک کی بھی نہ بجھی۔ چار سال ہونے کو آئے مگر گوہر مقصود کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ اگرچہ غواصوں نے بے حد غوطے مارے۔ ہر قسم کی

کوشش کے بعد جب ہر شخص اس تلاش میں ناکام رہا تو اب یہ خیال عام ہو چلا کہ فضل اس دُنیا میں موجود نہیں۔ اگر ہوتا تو کبھی تو کسی کو ملتا۔ یا اُس کا کوئی سراغ لگتا۔ خود مامون رشید نے یہ سمجھ لیا کہ فضل زندہ موجود نہیں اور کہیں مر کھپ گیا۔

گرمی کی دوپہر تھی اور دُھوپ بڑی تیز پڑ رہی تھی۔ مامون الرشید اپنے محل میں آرام کر رہا تھا۔ یکایک کنیز نے آہستہ اور ادب کے ساتھ اُسے جگایا اور عرض کی کہ باہر ایک غلام کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ایک بہت ہی ضروری اطلاع حضرت امیر المومنین کو دینی ہے

مامون الرشید نے نیند سے بیدار ہو کر کہا "بلاؤ۔ کیا کہتا ہے؟"

ایک منٹ کے بعد غلام آقا کے سامنے کھڑا تھا۔

"کیوں خالد! کیا بات ہے؟"

"اعلیٰ حضرت! ابھی ابھی نعمان بن الیاس شہر کا سب سے بڑا مقتدر رئیس دردولت پر حاضر ہوا اور کہنے لگا "میں امیر المومنین کے لئے اتنی بڑی خوش خبری لایا ہوں کہ اُس سے زیادہ خوشی کی خبر آج تک امیر المومنین نے نہ سُنی ہوگی۔" میں نے اُس سے کہا کہ وُہ مجھ سے کہدو تاکہ میں حضور کی خدمت میں عرض کردوں۔ مگر اس نے انکار کیا اور کہا کہ وُہ میں خود ہی اعلیٰ حضرت کو سناؤں گا۔"

مامون الرشید نے کچھ چڑ کر کہا "ایسی کیا خوش خبری ہوسکتی ہے جسے خود سنانے کے لئے نعمان کو اس قدر اصرار ہے؟ اچھا خیر اُسے حاضر کرو۔"

غلام گیا اور نعمان بن الیاس کو بُلا لایا۔ وُہ بڑے ادب سے سلام کرکے خاموش کھڑا ہو گیا۔

مامون الرشید نے کہا "آؤ نعمان بیٹھ جاؤ۔ بتاؤ۔ تم میرے لئے کیا خوش خبری لائے ہو؟"

"حضور! آپ کا وُہ قاتل۔ خُونی اور جانی دشمن جس کا نام فضل بن ربیع ہے۔ اور جس کی تلاش میں چار سال سے سلطنتِ اسلامیہ کا ہر فرد سرگرداں تھا۔ الحمدللہ کہ میری قید میں اور میرے پاس موجود ہے۔ چار غلام میرے ساتھ کئے جائیں جو اُسے ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنا کر حضورِ عالی کی خدمت میں حاضر کریں حضرت امیر المومنین! میں نے یہ کام انعام کے لالچ سے قطعاً نہیں کیا۔ حضور کے اقبال سے لاکھوں روپے تجارت کے ذریعے کماتا ہوں اور زندگی عیش کے ساتھ گزرتی ہے۔ میں نے یہ کام محض حضور کی خوشنودی کے لئے کیا ہے۔ باقی اور کوئی غرض نہ تھی۔"

چار سال کی مایوسی کے بعد یکایک بالکل خلافِ توقع اس خبر کے سُننے سے مامون الرشید بے حد خوش ہوا۔ فوراً شاہک طلب کیا گیا جو اس کام کے لئے خاص طور سے مقرر کیا گیا تھا۔ وُہ حاضر ہوا تو مامون نے ہنستے ہوئے اس سے کہا "دیکھو شاہک! تم لگاتار کوشش کے باوجود جس کام کو چار سال میں نہیں کر سکے۔ اُس کو نعمان نے پُورا کر دکھایا۔ ہمارا دیرینہ مجرم شیطانِ مجسّم فضل بن ربیع ان کے پاس موجود ہے۔ فوراً ان کے ساتھ جاؤ اور چار سپاہیوں کو ہمراہ لے جاؤ اور اس خبیث ابن خبیث کو گھسیٹتے ہوئے مجھ تک لے آؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کرکے جہنم واصل کروں"

آج کا دن مامون کے لئے عمر بھر میں سب سے زیادہ خوشی کا دن تھا۔ وُہ مارے خوشی کے جُھوم رہا تھا۔ بار بار تلوار کو اُٹھاتا تھا اور اُس کی تیز دھار کو دیکھ کر کہتا تھا "اتنے بڑے ملعون کا خون آج تک تُو نے نہ پیا ہوگا۔" اس خیال سے اُسے بڑی مسرّت ہو رہی تھی کہ عنقریب اُس کا بدترین دشمن نہایت

ذلت کی حالت میں اُس کے سامنے کھڑا ہوگا اور وُہ تلوار کے ایک وار سے اُس کا سر بُھٹے کی طرح اُڑا دے گا۔ وُہ نہایت خوش خوش اپنی جگہ سے اُٹھا اور باہر دربار میں آکر بیٹھ گیا۔

اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ یکایک فضل بن ربیع چار سپاہیوں کی حراست میں ہتھکڑیاں بیڑیاں کھڑکاتا۔ سر اور پیروں سے ننگا بحالِ تباہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ شاہی حکم کی تعمیل میں اور نعمان انعام اور خوشنودی کی توقع میں اُس کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

بالکل خلافِ توقع اپنے شدید ترین دشمن کو یُوں آسانی سے اپنے سامنے دیکھ کر مامون بے اختیار سجدے میں گر پڑا۔ اور دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ سجدے سے سر اُٹھایا تو فضل بن ربیع پابجولاں سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے سے اُس وقت عجیب وحشت برس رہی تھی۔

مامون نے اُسے دیکھا تو کہا "نمک حرام اور احسان فراموش فضل قریب آؤ۔ اور بتاؤ کہ میرے باپ نے جو سلوک اور احسانات تم سے کئے تھے۔ کیا اُن کا یہی بدلہ تھا جو تم نے مجھے دیا؟ خبیث انسان! بتلا کر تجھے اور تیرے باپ ربیع کو جو غلام زادہ تھا میرے آباؤ اجداد نے فرش سے اُٹھا کر عرش پر نہیں بٹھایا، مگر کیا تُو نے مجھ کو جو شہزادہ تھا۔ عرش سے فرش پر کھینچنے اور فرش سے قبر میں سُلانے کی پُوری اور انتہائی کوشش نہیں کی؟ کونسا احسان اور کونسی مہربانی ایسی تھی جو میرے والد مرحوم نے تجھ پر نہیں کی؟ اور کونسی دشمنی اور غداری ایسی ہے جو تُو نے میرے خلاف روا نہیں رکھی؟"

فضل نے نہایت شرمندگی کے ساتھ کہا "امیر المؤمنین! مجھے اپنے جرائم کا اقبال ہے۔ واقعی کشتنی اور گردن زدنی ہوں مگر آپ کی عفو و ترحم کی عادت کو اپنا شفیع بناتا ہوا عرض پرداز ہوں کہ میری سیاہ کاریاں معاف فرمائی جائیں اور میری جاں بخشی کی جائے۔ میں پُختہ اقرار اس امر کا کرتا ہوں کہ آئندہ جب تک زندہ رہوں گا حضور کا خیر خواہ اور خیر اندیش رہوں گا۔"

مامون نے غضبناک ہو کر کہا "تُو جھوٹ بولتا ہے اور صریحاً دھوکا دے رہا ہے۔ اس وقت محض اپنی جان بچانے کے لئے تو اس قسم کی چاپلوسی کے کلمات کہہ رہا ہے۔ ورنہ تیرے دل میں ہرگز خلوص نہیں ہے۔ تُو نہ میرا خیر خواہ کبھی تھا اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتا ہے۔ جیسا دشمن اس وقت تک تو میرا رہا ہے۔ اگر تجھے چھوڑ دیا گیا تو آئندہ بھی میرا ایسا ہی مخالف رہے گا۔ بلکہ شاید کچھ زیادہ۔ خیر اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔ پہلے یہ بتا کہ اس چار سال کے طویل عرصے میں تُو کہاں کہاں چھپتا پھرا؟ کہاں کہاں کی خاک چھانی؟ اور آخر کس طرح گرفتار ہوا؟ تجھ جیسے گرگِ باراں دیدہ کا یوں آسانی سے گرفتار ہو جانا تعجب انگیز ہے۔ مجھے اشتیاق ہے کہ تیری قسمت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے تیری داستانِ مصیبت خود تیری زبان سے سنوں تو بیان کر۔"

فضل نے کہا "امیر المؤمنین! کیا عرض کروں۔ اس چار سال کے عرصے میں جس قدر مصائب مجھے پیش آئے اور جس قدر شدائد سے مجھے واسطہ پڑا۔ خدا دشمن کو بھی وُہ نہ دکھائے۔ یہ سارا زمانہ نہایت سخت تکلیف۔ تنگی اور مصیبت میں بسر ہوا۔ نہ ایک دم کو چین ملا۔ نہ ایک دن کو سکون میسر ہوا۔ اطمینان عنقا تھا اور سکونِ قلب فنا۔ ہر وقت خوف اور دہشت سے واسطہ رہتا تھا۔ آج اس گھر میں چھپا ہوا ہوں تو کل اُس مکان میں۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں۔ کوئی گرفتار نہ کرلے۔ کوئی پہچان نہ لے۔ نہ کھانے کو دل چاہتا تھا نہ پینے کو۔ دم بھر ایک جگہ قرار نہ تھا اور ایک لحظہ بھی اس عرصے میں اطمینان کا نہیں گزرا۔ اپنی داستانِ مصیبت کب تک اور کہاں تک سُناؤں۔ ایک نہ ختم ہونے والی کہانی ہے اور وُہ بھی درد و الم سے بھری ہُوئی۔ اگر میں اتنا عرصہ قید رہتا۔ تو نسبتہً زیادہ اطمینان کے ساتھ زندگی گزرتی۔ لیکن اس روپوشی میں زندگی اجیرن ہو گئی۔ بار بار جی چاہتا تھا کہ خودکشی کرکے اس روز روز کی کوفت سے چھٹکارا حاصل کروں۔ لیکن امیر المؤمنین! جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ اسی خیال سے رُک جاتا تھا کہ شاید کبھی اچھے دن

آئیں اور مجھے آزادی اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ اس عرصہ میں بیسیوں بھیس بدلے اور سینکڑوں روپ دھارے تاکہ پہچانا نہ جاؤں لیکن جہاں جاتا تھا۔ شامتِ اعمال میرے آگے آگے چلتی تھی اور امن کہیں نصیب نہ ہوتا تھا۔ امیر المومنین! اس تمام زمانے میں چار دن کہیں ایک جگہ اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ہر وقت یہ خدشہ میری روح کو تحلیل کرتا رہتا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے اور کوئی آکر گرفتار نہ کرے۔ جب اپنے متعلق انعام کا اعلان سنتا تھا تو اکثر دل بیٹھ جاتا تھا کہ کیونکر بچ سکوں گا۔ شاہک کے جاسوس ہر گلی کوچے میں چیلوں کی طرح منڈلا رہے تھے اور مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اب گرفتار ہوا۔ اب گرفتار ہوا۔

مامون نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تو سوچے تو تیرے لئے تیرے اعمال کی یہی سزا کافی تھی۔ جس میں تو چار سال تک مبتلا رہا اور جس نے تیرے آرام اور اطمینان کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔

فضل نے جواب دیا۔ "حضور نے بجا ارشاد فرمایا۔ یہ ایام مجھ پر نہایت سخت تھے۔ زمین میں مجھے کہیں ٹھکانا نہ ملتا تھا اور میں حیران تھا کہ کہاں جاؤں جو شاہک کے جاسوسوں سے امن میں رہوں۔ بار بار یہی خیال آتا تھا کہ اس جہنمی زندگی سے تو ہزار درجہ یہ بات بہتر ہے کہ میں خود ہی اپنے آپ کو شاہک کے حوالے کر دوں اور وہ میرا سر کاٹ کر حضور کی خدمت میں پیش کر دے۔ یہ صرف ایک دفعہ کی موت ہوتی۔ مگر میں ہر آن موت کے منہ میں پھنسا رہتا تھا جس سے نجات کی مجھے کوئی شکل نظر نہ آتی تھی۔"

مامون نے کہا۔ "اچھا۔ تو تجھے اپنی بداعمالی اور بدکرداری کا بدلہ ملا۔ اب یہ بتا کہ نعمان نے تجھے کس طرح گرفتار کیا اور تیرا پتہ اسے کس طرح لگا۔"۔ فضل نے عرض کی:۔

"امیر المومنین! یہ داستان بھی بڑی الم انگیز اور عبرت خیز ہے۔ چند روز کی بات ہے کہ جس جگہ میں چھپا ہوا تھا۔ وہاں سے مجھے مجبوراً نکل کر دوسری جگہ کی تلاش میں جانا پڑا۔ میں نے ایک اونٹ والے کا بھیس بھرا۔ اور اونٹ کی کاٹھی کندھے پر رکھ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ابھی چند قدم چلا تھا کہ سامنے سے دو آدمی گھوڑوں پر سوار آتے دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے پہچان لیا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ فضل بن ربیع ہے جس کی گرفتاری کے لئے دربارِ خلافت سے آٹھ ہزار دینار سُرخ کا اشتہار شائع ہو رہا ہے۔ یہ سونے کی چڑیا ہے اور قسمت سے ہاتھ آئی ہے۔ آؤ اسے پکڑیں اور مالا مال ہو جائیں۔ یہ کہہ کر دونوں سوار آگے بڑھے اور میرے قریب پہنچ کر چاہتے تھے کہ گھوڑوں سے کود پڑیں اور مجھے گرفتار کر لیں کہ میں فوراً کاٹھی پھینک بھاگ کھڑا ہوا۔ میرے کاٹھی پھینکنے سے دونوں گھوڑے بدکے اور اپنے سواروں کو لے کر ہوا ہو گئے۔ ہر چند ان سواروں نے اپنے گھوڑوں کو روکنے کی کوشش کی مگر بھلا گھوڑے کب رکنے والے تھے۔ میں سوار کی گفتگو سن چکا تھا۔ میں گھوڑوں کے بدکنے کو تائیدِ غیبی سمجھا اور جلدی سے بھاگ کر ایک گھر میں داخل ہو گیا۔ اس مکان میں اس وقت صرف ایک بڑھیا بیٹھی تھی اور کوئی نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اماں! خدا کے لئے مجھے کہیں چھپاؤ۔ لوگ میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ ابھی مجھے قتل کر ڈالیں گے۔ بڑھیا نے کہا۔ "اوپر بالاخانے میں چلے جاؤ۔ وہاں تم تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔"

یہ کہہ کر بڑھیا اپنے کام میں مشغول ہو گئی اور میں جھٹ پٹ اوپر چڑھ گیا۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ وہی سوار جو راستے میں مجھے ملا تھا۔ گھر میں داخل ہوا اور بڑھیا سے کہنے لگا۔ "آج تو میرے ساتھ بہت ہی بری ہوئی۔ اتنی بری جس کا افسوس ساری عمر رہے گا۔

مجھے محض اتفاق سے آج فضل بن ربیع ہاتھ آگیا تھا۔ میں اُسے پکڑنے کو آگے بڑھا۔ مگر میرا گھوڑا بدکا اور مجھے لے کر تیزی کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا۔ بڑی مشکل سے بہت دُور جا کر رُکا۔ اتنے میں فضل خبر نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ اگر میں اُسے پکڑ لیتا تو آٹھ ہزار دینار مفت میں ملتے اور میں ساری عمر عیش سے بسر کرتا۔ افسوس صد ہزار افسوس"۔ یہ شخص غالباً بڑھیا کا پوتا یا نواسا ہو گا۔ اس کی تقریر سُن کر میرے ہوش غائب ہو گئے۔ کہ اب کیا ہو گا۔ بدقسمتی سے اُسی وقت مجھے ایک زور کی چھینک آئی۔ میں نے ہرچند اُسے روکنے کی کوشش کی مگر رُک نہ سکی۔ سوار نے چھینک کی آواز سُنی تو چونک کر پوچھا "اماں! اوپر بالاخانے میں کون ہے؟" بڑھیا نے کہا "میرا بھتیجا خالد ہے۔ برسوں کے بعد دمشق سے واپس آیا ہے۔ راستے میں ڈاکوؤں نے جو کچھ پاس تھا رکھوا لیا۔ کپڑے تک اتروا لئے۔ اب بچارا شرم کے مارے ننگا اُوپر بیٹھا ہے۔ کم بخت ڈاکو ایسے بے رحم تھے۔ کہ بدن پر ایک کپڑا تک نہ چھوڑا۔ عجب زمانہ آگیا ہے۔ خدا ایسے بے رحموں کو تباہ کرے"۔

سوار نے یہ گھڑی ہوئی کہانی سُن کر بڑا افسوس کیا۔ اور کہا "تم نے میرے کپڑے نکال کر اُسے کیوں نہ پہنا دیئے؟ اب جاؤ اور اُسے میرے کپڑے پہنا کر نیچے لاؤ۔ بڑا غضب ہوا جو اُس کے ساتھ ایسا سلوک ہوا۔ خدا کا یہ فضل ہوا کہ جان بچ گئی۔ ورنہ ڈاکو اگر جان سے بھی مار ڈالتے تو کون پوچھنے والا تھا۔ جاؤ کپڑے لے کر جلدی جاؤ"۔ بڑھیا نے کہا "اچھا جاتی ہوں۔ مگر تم پہلے بازار سے جا کر اس کے لئے کچھ کھانا لاؤ۔ غریب تین دن سے بھوکا ہے"۔ سوار تو باہر گیا اور بڑھیا میرے پاس دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ تم کون ہو۔ اور یہاں کیوں آکر چھپے تھے۔ تم چونکہ میری پناہ میں آچکے تھے اور میں تم سے حفاظت کا وعدہ کر چکی تھی۔ اس لئے بڑی کمینگی ہوتی۔ اگر میں تمہیں اس کے حوالے کر دیتی۔ اب تم فوراً یہاں سے نکل کر کہیں چلے جاؤ۔ ورنہ وہ ابھی آتا ہی ہو گا۔ پھر اُس کے ہاتھ سے بچنا ناممکن ہو گا۔ آٹھ ہزار دینار کون چھوڑتا ہے اور ہاں تم بہت مصیبت زدہ معلوم ہوتے ہو۔ یہ میری سونے کی انگوٹھی لیتے جاؤ۔ اسے بیچ کر اپنے کام میں لانا۔ چند ماہ کا کھانے پینے کا سہارا تو ہو ہی جائے گا۔ میرے پاس اس وقت نقد روپیہ نہیں ہے۔ ورنہ تمہیں خالی ہاتھ یہاں سے نہ جانے دیتی۔

مامون نے کہا "بڑی عالی ہمت اور عالی ظرف عورت تھی۔ تم نے عجیب حکایت سُنائی"۔

"حضور آگے کی کہانی اس سے بھی عجیب ہے"۔

"ہاں وہ بھی کہو"۔

"جب میں بڑھیا کے ہاں سے نکلا تو جان کے خوف سے سرپٹ دوڑا چلا گیا۔ مگر بدقسمتی کہاں پیچھا چھوڑتی تھی۔ ابھی تھوڑی دُور گیا تھا کہ پیچھے سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُنائی دی۔ میں نے سوچا کہ پہلی مرتبہ تو اتفاق سے بچ گیا تھا۔ لیکن اس دفعہ بچنا محال ہے۔ یہ سوار ابھی یہاں پہنچ جاتے ہیں اور فوراً مجھے گرفتار کر لیں گے۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ میری ہی تلاش میں چکر لگا رہے ہوں۔ یہ خیال آتے ہی دماغ چکرانے لگا اور میں بیہوش ہو کر گرنے کو ہو گیا کہ یکایک میں نے اپنے سامنے سڑک کے کنارے ایک محل دیکھا۔ میں لپک کر اُس کی ڈیوڑھی میں ہو رہا۔ کہ جس وقت سوار نکل جائیں گے تو یہاں سے نکل کر کہیں ٹھکانا ڈھونڈوں گا۔ مگر وہ سوار اُس محل کے آگے آکر رُکے۔ میرا یہ معلوم کر کے خون خشک ہو گیا کہ یہ محل شابک کا تھا اور وُہی اپنے سواروں کو لے کر میری تلاش میں گیا تھا۔ جس وقت شابک ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو اُس نے مجھے اور میں نے اُسے دیکھا۔ وُہ حیران اور میں دم بخود۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شابک نے انتہائی حیرت کے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ "تم یہاں

کہاں آن مرے ؟" میرے تو ہوش بجا نہیں تھے۔ کیا جواب دیتا۔ بہت رُک رُک کر میں نے کہا: "شاہک! قسمت سے نہیں لڑا جا سکتا۔ میں نے ہرچند چھپنے اور روپوش رہنے کی کوشش کی۔ لیکن تقدیر نے خود مجھے پکڑ کر زبردستی تمہارے دروازے پہ لا ڈالا۔ اب تمہارا حق ہے کہ مجھے گرفتار کرو اور امیرالمؤمنین کے حضور میں پیش کر کے اپنا انعام حاصل کرو۔" شاہک نے کہا: "وہ تو خیر میں کروں گا ہی۔ مگر تم بتاؤ کہ واقعہ کیا ہوا؟ اور کس طرح تم یہاں تک پہنچ گئے؟" امیرالمؤمنین! اس پر بڑھیا کا سارا واقعہ اور وہاں سے بھاگنے اور اس ڈیوڑھی میں پناہ لینے کا سارا قصہ اُسے سُنا دیا جسے سُن کر شاہک کہنے لگا: "اچھا اب گھر میں چلو۔" مجھے موت صاف نظر آ رہی تھی۔ مگر کیا کرتا۔ مجبوراً اس کے ساتھ ہو لیا۔ شاہک نے اندر پہنچ کر ایک نہایت آرام دہ کمرے میں مجھے بٹھایا اور غلاموں کو حکم دیا کہ کھانا لاؤ۔ کھانا فوراً آ گیا۔ کہنے لگا: "کھاؤ"۔ بھلا جس کے سر پہ تلوار لٹک رہی ہو اُسے کھانے میں کیا مزہ آ سکتا ہے۔ مگر طوعاً و کرہاً میں نے کچھ کھایا

شاہک نے مجھے تین دن تک اپنے پاس مہمان رکھا۔ اس کے بعد کہنے لگا "فضل! تم جانتے ہو کہ تم سلطنت کے سخت دشمن اور خلافت کے اشتہاری مجرم ہو۔ میں تم کو امیرالمؤمنین کے خلاف کس طرح اپنے ہاں پناہ دے سکتا ہوں؟ اگر تم کہیں راہ میں ملتے یا میں تمہیں کسی مکان سے گرفتار کرتا تو یقیناً فوراً لے جا کر امیرالمؤمنین کے حضور میں پیش کر دیتا۔ لیکن چونکہ تم نے میری ڈیوڑھی میں آ کر پناہ لی تھی۔ اس لئے یہ بات مروت اور اخلاق کے بالکل خلاف تھی کہ میں تمہیں گرفتار کر لیتا۔ تمہارے مصارت کے لئے یہ ایک ہزار درہم کی تھیلی میں تمہیں دیتا ہوں اور تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم یہاں سے کہیں چلے جاؤ۔ میں اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہیں کروں گا اور پہلے کی طرح تمہیں برابر ڈھونڈتا رہوں گا۔ لیکن یہ ضرور سُن رکھو کہ اگر تم مجھے کہیں مل گئے تو میں تمہیں بغیر گرفتار کئے ہرگز نہیں رہوں گا۔ کیونکہ امیرالمؤمنین کے لئے اس سے زیادہ خوشی کا کوئی دن نہیں ہوگا۔ جب وہ تمہیں بندھا ہوا اپنے سامنے کھڑا دیکھیں گے۔ ظاہر ہے کہ تمہیں گرفتار کر کے امیرالمؤمنین کے حضور میں پیش کرنا اس وقت میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے اور میں اپنے فرض سے کسی صورت میں غفلت نہیں کر سکتا۔ پس تمہیں تلاش کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دوں گا۔ مگر اب تم جاؤ اور تھیلی ساتھ لیتے جاؤ۔"

یہ کہانی سُن کر مامون نے شاہک کی طرف دیکھا جو راز کے کھُل جانے کی وجہ سے مارے خوف کے کھڑا کانپ رہا تھا۔ مامون نے کہا۔ "کیوں شاہک! یہ کیا حرکت تھی؟ شاہی مجرم کو اپنے ہاں پناہ دی۔ تین دن تک خوب اس کی دعوتیں کیں اور پھر بجائے گرفتار کرنے کے ایک ہزار درہم کی تھیلی دے کر اُسے چپکے سے نکال دیا۔ بتاؤ اس جرم کی تمہیں کیا سزا دی جائے؟" شاہک کا لہو بدن میں خشک ہو چکا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے کہا "امیرالمؤمنین! واقعی غلام قصوروار اور گنہگار ہے۔ میں نے شاہی مجرم اور فضل جیسے شدید دشمنِ خلافت کو قبضے میں آنے کے بعد چھوڑ دیا۔ اس جرم کی جو بھی سزا حضور تجویز فرمائیں۔ اُس کے بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے خیال کیا تھا کہ میرا یہ جرم مخفی رہے گا اور کسی کو اس کی خبر نہ ہوگی۔ مگر تقدیر کے نوشتے پورے ہونے تھے۔ امیرالمؤمنین پر سب کچھ واضح ہو گیا۔ اپنے اس جرم کا تو میں ضرور معترف ہوں۔ لیکن ادب کے ساتھ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ بے بسی اور لاچاری کے ساتھ قبضے میں آئے ہوئے دشمن کو گرفتار کر لینا میں نے حمیت اور غیرت کے خلاف سمجھا۔ خصوصاً اس وقت جبکہ دشمن نے میرے مکان کی ڈیوڑھی میں پناہ لی ہو۔ حضور! میں نے جرم بیشک کیا ہے مگر میری نیت بُری نہ تھی۔ آگے حضور مالک ہیں۔"

مامون نے کہا:" اچھا تمہارا فیصلہ بھی بعد میں ہو گا۔ فضل تم آگے چلو۔ اس کے بعد کیا ہوا؟"

فضل نے کہا: امیرالمومنین! شاہک کے ہاں سے نکل کر میں کچھ دن تک اِدھر اُدھر چھپتا پھرا۔ اس تلاش میں کہ کہیں چند روز کے لئے پاؤں ٹکانے کو سہارا مل جائے۔ آخر سوچتے سوچتے آج خیال آیا کہ اپنی وزارت کے ایام میں میں نے نعمان بن ایاس پر بڑے بڑے احسان کئے تھے۔ وہ غریب اور مفلس انسان تھا۔ میں نے اُسے امیر اور دولتمند بنا دیا۔ شہر میں اُسے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ میں نے اُسے نہایت معزز اور مشہور کر دیا۔ اگر میں اُس کے پاس چل کر پناہ لوں تو یقین ہے کہ وہ بڑی خوشی کے ساتھ مجھے اپنے ہاں چھپا لے گا اور کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو گی۔" یہ سوچ کر میں اُس کے دروازے پر گیا اور میں نے اُس کے غلاموں سے کہا کہ میں تمہارے آقا سے ملنا چاہتا ہوں۔ نعمان نے مجھے اندر بُلا لیا اور جب میں اُس کے سامنے پہنچا تو وہ مجھ سے بڑے تپاک سے پیش آیا۔ بغلگیر ہوا اور اپنے پاس مسند پر مجھے جگہ دی۔ میں نے کہا" نعمان! تم جانتے ہو کہ دربارِ خلافت سے میری گرفتاری کا اشتہار جاری ہو چکا ہے اور معیل شاہک مجھے گرفتار کرنے کے لئے خاص طور پر مقرر ہے۔ میں اس وقت تک چھپا رہا اور کسی کے ہاتھ نہ آیا مگر اب حالات بہت ہی مجبور کن ہو گئے ہیں۔ سب طرف سے مایوس ہو کر مجھے تمہارا خیال آیا۔ اگر پہلے تعلقات کا لحاظ کرتے ہوئے تم مجھے چند روز کے لئے اپنے ہاں پناہ دو۔ تو میں ساری عمر اس احسان کو نہیں بھولوں گا۔ بڑی اُمید لے کر میں تمہارے پاس آیا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں لوٹاؤ گے۔" نعمان نے کہا" اہلاً وسہلاً! میں۔ میرا سارا گھر اور میرے سارے خدام آپ کی خدمت کے لئے وقف ہیں۔ جو احسانات آپ نے مجھ پر کئے ہیں۔ میں اُن کو بھول نہیں سکتا۔ اور سخت ناشکری ہو گی۔ اگر میں اس موقع پر اپنے ولی نعمت اور محسن کی ادنےٰ سی خدمت بھی بجا نہ لاؤں۔ میرے آقا جب تک آپ چاہیں۔ نہایت خوشی اور اطمینان کے ساتھ یہاں ٹھہریئے۔" مجھے اس کے قول کا پورا یقین آ گیا اور میں خوش ہو گیا کہ میں نے مامن ڈھونڈنے میں نہایت مناسب انتخاب کیا۔ نعمان نے کھانا منگایا جو نہایت پُرتکلف تھا اور میں نے چار سال کے بعد پہلی مرتبہ نہایت اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد نعمان مجھے اپنے مکان کے ایک نہایت آراستہ کمرے میں لے گیا اور کہنے لگا" آپ تھکے ہوئے ہوں گے اور نہ معلوم کتنی راتوں کے جاگے ہوئے۔ یہاں جب تک چاہیں آرام فرمائیے۔" واقعی میں تھکا ہوا تھا۔ پڑ کر بے خبر سو گیا۔ مگر جس وقت آنکھ کھلی تو سر پر شاہک کھڑا سپاہیوں کو حکم دے رہا تھا کہ" اس شاہی مجرم کو گرفتار کر لو اور امیرالمومنین کی خدمت میں لے چلو۔" نعمان بھی سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں سارے معاملے کو سمجھ گیا۔ میں نے نعمان کو مخاطب کر کے صرف اتنا کہا کہ" نعمان! کیا میرے ہزارہا احسانات کا بدلہ یہی تھا جو تُو نے دیا؟" اور پھر اپنے آپ کو سپاہیوں کے حوالے کر دیا جو مجھے حضور کی خدمت میں لے آئے۔ یہ ہے مختصر طور پر میری داستانِ مصیبت!

مامون نے یہ داستان سُن کر کہا:" فضل تُو نے اپنی کہانی تو خوب بیان کی۔ مگر تجھ سے ایک بات پوچھنی چاہتا ہوں۔ جو الزام احسان فراموشی اور نمک حرامی کا تُو نے نعمان کو دیا۔ کیا تو خود اُس کا مصداق نہیں؟ میرے والد نے تجھ سے کیسا بہترین سلوک کیا اور تجھ پر بیسیوں احسانات کئے۔ باوجود سخت نالائق اور نہایت احمق اور بے تدبیر ہونے کے تجھ پر ہمیشہ بے حد مہربانیاں کیں اور تجھے اپنا وزیر بنایا۔ مگر تو نے ان تمام احسانات کا یہ بدلہ اُن کو دیا کہ برامکہ کو برباد کرا کے سلطنت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔ پھر اپنے محسن اور اپنے آقا کے ایک بیٹے کے ساتھ تو نے جو کچھ

کیا وہ دُنیا پر روشن ہے۔ دوسرے بیٹے کو تیری خبیث فطرت نے قتل کرا کے ہی چھوڑا۔ بتلا تجھ میں اور نعمان میں احسان فراموشی کے لحاظ سے زمین آسمان کا فرق ہے یا نہیں۔ بلکہ تو اس فن میں اس کا اُستاد ہے۔ جیسا شاگرد اُستاد کو کرتا دیکھیں گے۔ ویسا ہی خو کریں گے۔ پھر تُو نے اُسے الزام کیوں دیا؟ اور اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر کیوں نہیں دیکھا۔ لیکن خیر پہلے میں ان تینوں کے بارے میں فیصلہ کر دوں جو تیرے بیان کردہ قصّے کے ادا کار ہیں۔ اس کے بعد تیرا فیصلہ ہوگا۔"

اس کے بعد مامون نے حکم دیا کہ اُس بڑھیا کو حاضر کیا جائے جس نے فضل کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ جب بڑھیا آگئی تو مامون نے اُس سے کہا۔ "بڑی بی! میں تمہارے اس فعل سے ناراض نہیں ہوا جو تم سے فضل بن ربیع کے معاملے میں سرزد ہوا۔ بلکہ میں خوش ہوں کہ میرے مُلک میں ایسی عالی حوصلہ اور بلند اخلاق خواتین موجود ہیں۔ میں تم کو تمہاری نیک طینتی پہ مبارک باد دیتا ہوں اور وہ انعام جو میں نے فضل کی گرفتاری پر مشتہر کر رکھا تھا۔ میں تمہیں مرحمت کرتا ہوں خزانچی سے اپنی رقم لے لو۔ یہ فضل کی گرفتاری کا انعام نہیں بلکہ تمہاری نیک نیتی اور شرافت کا انعام ہے"

پھر سپاہی کی طرف متوجّہ ہوا اور کہنے لگا۔ "سپاہی اس واقعہ سے تمہاری قدر و منزلت میرے دل میں ہزار گُنا بڑھ گئی۔ واقعی شرافت اسی کا نام ہے جو تم سے اس موقع پر ظہور میں آئی۔ اگر تم اس کے برخلاف کرتے تو میری نظروں سے ہمیشہ کے لئے گر جاتے۔ میں تمہیں تمہارے اعلیٰ اخلاق پر بارہ ہزار دینار انعام دیتا ہوں اور تمہیں اپنا مقرّبِ خاص بناتا ہوں۔"

زاں بعد خلیفہ نعمان بن الیاس کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔ "نعمان بن الیاس! تم میرے نزدیک ناپاک فطرت، دنی الطبع، محسن کش اور احسان فراموش شخص ہو جس شخص نے تم پر بے شمار احسانات کئے اور جس نے تم کو غریب سے امیر بنا دیا تم نے اُس کے ساتھ وقت پڑنے پر یہ سلوک کیا کہ اُسے دھوکا دے کر گرفتار کرا دیا تم محض بندۂ زر ہو اور تم نے میرے تقرّب کے لالچ میں یہ ناجائز فعل کیا ہے۔ یاد رکھو۔ بد اعمالی اور بدکرداری سے بادشاہوں کا قرب حاصل نہیں ہوا کرتا بلکہ ابنائے جنس کی ہمدردی اور نوعِ انسانی کی بھلائی انسان کو مفتخر اور معظّم کیا کرتی ہے اور پھر محسن کے ساتھ تو آدمی کو بدرجۂ اولیٰ حسنِ سلوک اور مروّت و اخلاق سے پیش آنا چاہئے مگر تم نے کسی بات کا خیال نہ کیا اور اپنے محسن کو دھوکے سے پکڑوا کر ایسا کام کیا جس کے نتیجے میں ہمیشہ تم پر لعنت پڑتی رہے گی۔ میں حکم دیتا ہوں کہ تم جیسے محسن کش فریبی کو یہاں سے ہمیشہ کے لئے جلا وطن کر دیا جائے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے جس میں ترمیم نہیں ہوگی۔"

"تینوں آدمیوں کا فیصلہ کرنے کے بعد اب خلیفہ نے اصل مجرم یعنی فضل بن ربیع کی طرف مُنہ پھیرا اور کہا۔ "فضل! تم میرے اور میرے باپ کے شدید دشمن تھے۔ تم نے کوئی دقیقہ میرے باپ کے استیصال میں اور مجھے تباہ کرنے میں باقی نہیں چھوڑا۔ تم نے سب سے بڑی نیکی مجھ سے یہ کی تھی۔ کہ علی بن عیسیٰ کو میرے لئے بجائے لوہے کے چاندی کی زنجیر دے کر بھیجا تھا کہ اس میں مامون کو گرفتار کر کے لانا۔ اگر میں تمہارے ہاتھ آجاتا تو نہ معلوم تم میرا کیا حشر کرتے اور کس عذاب سے مجھے ہلاک کرتے۔ بولو میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔"

فضل بن ربیع کی آنکھیں نیچی تھیں اور زبان خاموش۔ مامون الرشید نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "فضل! جس وقت میں نے تم کو چار سپاہیوں کی حراست میں چار سال کی تگ و دو کے بعد آتے دیکھا تو میں اللہ تعالیٰ کے شکر کے جذبے کے ماتحت بے اختیار سجدہ میں گر گیا۔ اور درگاہِ ربّ العزت میں عرض کی کہ یا الٰہی! تیرا لاکھ لاکھ شکر۔ تیرا احسان ہے کہ تُو نے آج فضل پر مجھے قبضہ دیا۔ بارِ الٰہا! جہاں تک میں غور کرتا ہوں۔ تمام روئے زمین پر تیرے سارے بندوں میں اپنے سے زیادہ گنہگار اور خطاکار کسی کو نہیں پاتا۔ اور یا الٰہی! یہ بھی حقیقت ہے کہ میری تمام رعایا میں فضل بن ربیع سے زیادہ میرا دشمن اور مخالف کوئی نہیں! مگر یا الٰہی! میں اسے معاف کرتا ہوں۔ اے مالک الملک! اے شہنشاہوں کے شہنشاہ تُو اپنے حبیب پاک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں مجھے معاف فرما دے۔ فضل! میں نے خدائے قدوس کے حضور میں نہایت عاجزی کے ساتھ یہ دُعا مانگی اور پھر سر اُٹھا کر تیرا مقدمہ سُنا۔ جا اب تُو آزاد ہے۔ جو کچھ تیرا دل چاہے کر۔"

[redacted]

محمد ہادی حسین
بی۔ اے۔ ایس (کمشنر راولپنڈی)

جیتے رہیئے یا مر جائیے؟

شیکسپیئر کے ہملٹ کی (SOLILOQUY) کا ترجمہ

یہ ترجمہ تقریباً لفظی ہے۔ اس کے باوجود فاضل مترجم نے ربطِ مضمون اور تسلسلِ کلام کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور نہ غالباً اُردو کے محاوروں پر کوئی جبر روا رکھا ہے۔ SOLILOQUY کے لفظ کا ایک ترجمہ "تنہا کلامی" ہو سکتا ہے۔ "مخزن"

جینے رہیئے یا مر جائیے؟ — ہے درپیش اب تو یہ سوال:-
کیا یہ افضل ہے کہ ستمگر قسمت کی بیداد کے تیر
سینے میں پیوست رہیں، پر لب پہ نہ آنے پائے فغاں،
یا یہ بہتر ہے کہ مصائب کے ساگر سے ٹھان کے جنگ
اُس پر غلبہ حاصل کیجیئے؟ — جی سے گزریئے، مُوند لیجئے آنکھ —
اور بس کر لیجے یہ تصوّر ختم ہوا سب دردِ دل
اور وہ صدمے گوشت و پوست کی جو میراثِ فطری ہیں —
یہ کیسا اچھا انجام ہے! — جی سے گُزریئے — مُوند لیجئے آنکھ —
مُوند لیجئے آنکھ اور سپنے دیکھئے: — اُف! جھگڑا تو اسی کا ہے۔
کیا جانے اُس موت کی نیند میں کیا کیا سپنے دکھائی دیں،
جس کی گود میں ہم ہنگامۂ ہستی سے لیتے ہیں اماں —
کتنی ہی چیزیں ہیں جن سے بنتی ہے دُوبھر عمرِ دراز:—
ایسا کون ہے جو ہنس کر ہستی کے کوڑے سہتا ہو:—

ظالم کا ظلم اور متکبر کا توہین آمیز سلوک،
ٹھکرائی ہوئی چاہ کے صدمے اور قانون کی لیت و لعل،
سرکاری حکام کی نخوت اور وہ ٹھوکریں در در کی
جو اہلوں کو نا اہلوں کی خاطر کھانی پڑتی ہیں،
جب وہ چاہے تو خود اپنے ہاتھوں نوکِ خنجر سے
رکھ دے فیصلہ کر کے دم بھر میں اس سارے قضیے کا؟
کس کو گوارا ہے کہ کراہے اس ہستی کے بوجھ تلے؟ ——
یہ سب کچھ اس ڈر سے ہے کہ نہ جانے موت کے بعد ہو کیا؟
وہ انجانی اور اَن دیکھی دُنیا جس کی سرحد سے
کوئی راہی بھی نہیں لوٹ کے آتا، اُس دُنیا کا ہول
کر دیتا ہے اپنے عزم کو مختل اور ہم اُس کے طفیل،
تکلیفاتِ نامعلوم کو ٹالتے رہنے کی خاطر،
چُپ چاپ اس ہستی کی تکلیفوں کو سہتے رہتے ہیں۔
یُوں کر دیتی ہے ہم سب کو عاقبت اندیشی ڈرپوک،
اور یُوں رُوئے عزمِ انسانی کی فطری رونق پر
فکر و تذبذب کی زردی اور مُردنی سی چھا جاتی ہے،
اور یُوں اُونچے ارادے دل کے دل ہی میں رہ جاتے ہیں۔
خوفِ مآل کے مارے پلٹا کھا جاتی ہے من کی موج
اور عمل کے نام سے رہ جاتے ہیں ارادے سب محروم۔

محمد ہادی حسین

[redacted]

غلام رسول تنویر

درونِ خانہ

حیاتِ انسانی لاتعداد ارتقائی منازل طے کر چکی ہے۔ چاند ستاروں سے اپنی قسمتیں وابستہ کرنے والے اذہان اب چاند ستاروں کی قسمت کو خود سے وابستہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ حیاتِ انسانی ہر لمحہ بدلتی ہوئی اپنے ارتقا کی طرف مائل ہے۔ مگر فطرتِ انسانی کے متعلق بڑے بڑے ماہرِ نفسیات بھی خاموش ہیں اور اگر ان میں سے چند خاموش نہیں تو ان کی گفتگو اس موضوع کو اور بھی پُر اسرار بنا رہی ہے۔ انسان کی فطرت صدیوں وقت کے سانچوں میں ڈھالی گئی مگر ہر سانچے سے باہر نکلنے پر وہ پھر اپنی اسی خاص شکل میں بدل گئی۔ پیغمبروں نے اس کے لئے معابد بنائے۔ ادب نے اس کی زُلفوں کو سنوارا اور وقت نے اُسے مختلف تہذیبوں کے رنگ برنگ کپڑے پہنائے مگر جونہی اسے موقع ملا اس نے وہ معابد توڑ دیئے، زُلفیں بکھیر لیں اور رنگ برنگ لباس کو نوچ کر پھینک دیا اور اپنا وہی برہنہ ناچ ناچنے لگی۔ جو اس نے پہلے پہل شاید جنت میں ناچا تھا۔ یہ رقاصہ کبھی تو قابیل کی صورت میں نمودار ہوئی اور کبھی چنگیز و ہلاکو کی شکل میں دکھائی دی۔ کبھی اس نے ہٹلر و ٹوجو کا بھیس بدلا اور کبھی سکھ، ہندو، مسلمان کا — مذہب، تہذیب، ادب اور وقت نے اسے لاکھ سانچوں میں ڈھالا مگر یہ جونہی باہر نکلی، پھر اپنی پہلی شکل اختیار کر کے اپنا وہی مخصوص ناچ ناچنے لگی۔

فطرتِ انسانی اپنا مخصوص ناچ اب ایک دفعہ پھر ناچ چکی ہے۔ مذہب، تہذیب، ادب، اور وقت پھر اپنے اپنے سانچے لے کر اس کے گرد ہو گئے ہیں اور اسے کوئی نئی شکل دینے پر تُل گئے ہیں۔ آج یہ سانچے کبھی تو "نصب العین" کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں اور کبھی "انسانیت" یا "وطن پرستی" کی شکل میں۔ مگر ان سانچوں سے اب بھی فقط حیاتِ انسانی ہی اثر پذیر ہو گی۔ فطرتِ انسانی ان میں ڈھلنے کی نہیں۔

فن برائے فن اور فن برائے زندگی کا مسئلہ انہی حالات کی پیداوار ہے۔ فن سے حیاتِ انسانی کا تقاضا کچھ اور ہے اور فطرتِ انسانی کا تقاضا کچھ اور۔ ذہنِ انسانی گومگو کی حالت میں کبھی تو حیات کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی فطرت کی طرف۔ حیات اپنے ارتقاء کے لئے امن، آشتی، الفت اور مساوات کی تلاش میں ہے اور فطرت کہہ رہی ہے کہ امن و آشتی، محبت اور مساوات میرا بھی خاصہ ہیں مگر میرا کُل نہیں۔ میرے کُل میں جنگ و جدل، ظلم و حرص اور خود پرستی و خود نمائی بھی شامل ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر اپنے کُل کو کیسے قائم رکھ سکتی ہوں، ذہنِ انسانی کبھی تو حیات کی طرف جُھک جاتا ہے اور فطرت سے خطاب کرتا ہے۔

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب — ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

اور کبھی یہ ذہن حیاتِ انسانی کی نظر بچا کر فطرت کے پاس چلا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس سے کہتا ہے:

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں

ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آکر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو نشاں پا لے مرا
اور جُرمِ عیش کرتے دیکھ لے

زندگی اور فطرت کے اس سنگھم پر جہاں ذہنِ انسانی ایک خلفشار میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ فن کے مشہور شہپاروں کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ شیکسپیئر کو گذرے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں اور حیاتِ انسانی اس اثنا میں لاتعداد منازل طے کر چکی ہے مگر پھر بھی شیکسپیئر پہلے سے چوگنی شہرت کے ساتھ زندہ ہے۔ کیونکہ حیات اور فطرت کا یہ سنگھم ازلی اور ابدی ہے اور ہر وہ فن پارہ جس کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے۔ ابدیت کا جامہ اوڑھ لیتا ہے شیکسپیئر کی بقا اس کی ڈراماتی کہانیوں سے وابستہ نہیں بلکہ اس کے کرداروں سے متعلق ہے اور وہ کردار عموماً اسی سنگھم پر کھڑے ہیں۔ جہاں حیات اور فطرت کی حدیں ملتی ہیں اور جہاں ذہنِ انسانی ہمیشہ گومگو کی حالت میں پایا جاتا ہے۔ ہیملٹ، میکبتھ اور اوتھیلو اسی ذہنی خلفشار میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہمارے دل بھی دھڑکتے ہیں اور ان کی چیخ میں ہمیں اپنی چیخ سُنائی دیتی ہے۔ کیونکہ اس وقت میکبتھ، ہیملٹ، اوتھیلو، شیکسپیئر اور ہم سبھی اس عالمگیر فطرت میں ڈھل کے رہ جاتے ہیں جسے کوئی سانچہ بدل نہیں سکا۔ اسی لئے تو ہم میکبتھ سے باوجود اس کے ایک سفاک قاتل ہونے کے نفرت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ ہماری ہی فطرت کی آواز ہے۔ اسی طرح ہم ہیملٹ کی جنونی حرکات سے نہیں چڑتے کیونکہ وہ ہمارا ہی ایک حصّہ ہے۔ یہ ہم ہی ہیں جن میں یہ کردار پیدا ہوتے ہیں اور یہ ہم ہی ہیں جن میں یہ کردار مر جاتے ہیں۔

حیاتِ انسانی کو بہتر بنانے کی کوششیں آج کی طرح ہر عہد میں جاری ہیں۔ یہ سنگھم آج ہی کی پیداوار نہیں بلکہ صدیوں پہلے بھی یہ اسی عالم میں پایا جاتا تھا۔ ہم نہ تو حیات سے بھاگ سکتے ہیں اور نہ فطرت کے تقاضوں ہی سے فرار کر سکتے ہیں۔ ورڈز ورتھ نے بھی عوامی زبان میں شعر لکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ حیات کا پلڑا بھاری ہوا اور اس کی شاعری بھی بیرونِ خانہ سے متعلق ہونے کی مدعی ہو گئی مگر اس کے ذہن کی اس کھڑکی نے جو خارجی اور داخلی دُنیا کے درمیان واقع تھی۔ بیرونی دُنیا کو اتنی روشنی نہیں دی جتنی بیرونی دُنیا سے اندر کھینچ لی۔ مناظرِ قدرت کو عوام تک پہنچاتے پہنچاتے وہ اتنا محو ہوا کہ ہاتھوں کی حرکت اندر سے باہر ہونے کی بجائے باہر سے اندر کی طرف ہو گئی اور اس نے قدرت کو سمیٹ کر اپنے سینے میں رکھ لیا اور اسے ایک دیوی سمجھ کر اس کی پُوجا کرنے لگا۔ اور یہی وہ دیوی تھی جس کے قدموں میں پڑا ہوا ایک حقیر پھول بھی اس کے لئے اتنے گہرے مطالب کا حامل ہو گیا کہ اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے . . . . اس نے جتنی بھی سادہ نظمیں عوام کے لئے "عوامی" زبان میں کہیں وہ عموماً عوام کی توجّہ کا مرکز نہ بن سکیں۔ عوام کی توجّہ کا مرکز ان منظومات کے وہ حصّے ہوئے (جن میں عوام کی نہیں) اس کے اندر کی آواز صدائے بیرونِ خانہ سے زیادہ شدید ہے اور اس شدتِ احساس کے اظہار کے لئے بھی عوامی نہیں خواصی زبان اختیار کی گئی ہے۔

فیض احمد فیضؔ نے بھی خود سے سرگوشیاں کرتے ہوئے اپنی خواب آلود آنکھوں کو ذرا نیم باز کیا تو اسے حیاتِ انسانی عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں اجنبی ہاتھوں کے بے نام گراں بارستم کے نیچے سسکتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے محبوب کے چہرہ پر اپنی وحشت انگیز نظریں گاڑتے ہوئے بولا کہ وہ اس سے پہلی سی محبت کا مطالبہ نہ کرے۔ کیونکہ اب اس کی محبت میں کلیوں کی بھینی بھینی خوشبو نہیں بلکہ ناسورِ دل سے

بہتی ہوئی پیپ کی بساند ہے۔ اس کے گیتوں نے جب "دلے بفروختم جانے خریدم" سے ہم آہنگی پیدا کی تو عوام کی نظریں تشکر و تحسین سے لبریز ہو گئیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے دل پر "تنہائی" (صفحہ ۹، نقش فریادی) مسلط رہی۔ جہاں فطرت بن سنور کر بیٹھی ہے۔ اس کے ایوانوں کے دروازے کھلے ہیں اور وہ انتظار کر رہی ہے۔ کسی اجنبی کا کہ شاید وہ آجائے.... شاید وہ آجائے۔

احمد ندیم قاسمی، ساحر، فیض اور کرشن چندر وغیرہ کی کتابوں میں سے زیادہ تر وہی پڑھی اور پسند کی جاتی ہیں جو بقول ان کے زیادہ ترقی پسندی کی حامل نہیں، یا جن میں ان کے نزدیک ان کا فن افادیت کے لحاظ سے پورے عروج پر نہیں۔ قاسمی نے جلال کو جمال میں لپیٹ کر پیش کیا تو اسے خندہ پیشانی سے قبول کیا گیا مگر اس کی "افادیت" اب جمال کے اس پردے کو بھی برداشت نہیں کرتی۔ وہ اسے چاک کر کے صرف جلال دینا چاہتا ہے مگر عوام جلال کے ساتھ ساتھ وہ جمال بھی چاہتے ہیں جسے وہ دینے کے لئے آمادہ نہیں۔ دونوں کے درمیان کشاکش جاری ہے

ساحر نے فن سے دستکشی اختیار کر کے کھلم کھلا کہہ دیا کہ آئندہ اس کی تمام نظمیں مزدوروں اور کسانوں سے منسوب ہوں گی۔ فن کے پجاری ساحر کو فن کار نہ مانیں۔ اسے ان کی پروا نہیں مگر اس کے باوجود "تلخیاں" صرف ان نظموں کی وجہ سے خریدی جا رہی ہے جن میں ساحر نے فن کار ہونے کا دعوےٰ بھی کیا ہے (ظاہری طور پر نہیں) اگر وہ ان نظموں کو اپنی کتاب سے خارج کر دے جن کی افادیت کا وہ قائل نہیں تو اس کتاب کو شاید وہ مزدور اور کسان بھی نہ خریدیں جن سے وہ نظمیں منسوب ہیں۔ (مالفرض وہ اب انہیں خریدتے ہیں)

یہی حال فیض کا ہے۔ وہ تو لگی لپٹی رکھے بغیر اس کا اعتراف بھی کر چکا ہے۔" اس مجموعہ کی اشاعت ایک طرح کا اعتراف شکست ہے لیکن دو چار نظموں کو طبع کر دانا ممکن نہیں.... پہلے حصے میں طالب علمی کے زمانے کی نظمیں ہیں۔ انہیں حذف نہ کرنے کی تجارتی وجہ شروع میں عرض کر چکا ہوں"

کرشن چندر طلسم خیال سے باہر نکل کر گرجا اور خندق میں عوام کو ڈھونڈتا ہوا ان کے قریب آنکلا مگر عوام اسے اب بھی طلسم خیال ہی میں ڈھونڈ رہے ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔" ڈاچی والیا موڑ مہار دے" (جہلم میں ناؤ پر ۔۔ طلسمِ خیال)

آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ ادیب تو عوام کے قریب ہونے کے لئے اپنے فن سے بھی ہاتھ اٹھا لیتے ہیں مگر عوام ان کی اس قربانی کو نظر انداز کر کے انہیں پھر اسی حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں جہاں وہ فنکار زیادہ اور صحافی کم دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہی فطرت اور حیات کا سنگھم ہے ۔۔ حیات کے تقاضے ہمیں ہر لمحہ اپنی طرف بلاتے رہتے ہیں۔ ہم ان کی آواز بھی سنتے ہیں۔ ہم اس کا جواب بھی دیتے ہیں مگر روٹی سے متعلقہ ہمارے ان مسائل کی شہرت کے باوجود فطرت اپنا ساز بند نہیں کر دیتی۔ وہ ساز پھر بھی بجتا رہتا ہے۔ اور ہمیں ہر آن اپنی طرف بلاتا رہتا ہے ہم بھی کبھی روٹی کے ان مسائل سے تنگ آکر حیات کی نظریں بچا کر درونِ خانہ بھی گھُس جاتے ہیں اور فطرت کی گود میں سر رکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:-

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آکر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو نشاں پا لے مرا
اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے

(اقبال اکیڈیمی لائل پور میں پڑھا گیا)

کیف بنارسی
(از ڈیرہ اسمٰعیل خاں)

غمزدہ مہاجر سے

خوشی کا وقت ہے اے دوست غم کا وقت نہیں
کہ آج پائی ہے اسلامیوں نے آزادی!!
ذرا سکون تو لینے دے گردشِ ایام
ہم اپنے واسطے دُنیا نئی بسائیں گے
بُھلا کے ہند کی رنگینیاں دماغوں سے
یہاں کی خاک کو اپنا وطن بنائیں گے
وُہ رنگِ صبحِ بنارس، وُہ لُطفِ شامِ اودھ
ہم اپنے جذبِ تصوّر سے کھینچ لائیں گے
تُم ایک تاج محل کے لئے فسردہ ہو
ہزار تاج محل ہم یہاں بنائیں گے
ہم اپنے مُلک کی زینت کے واسطے اے دوست
فلک سے چاند ستارے بھی توڑ لائیں گے
گئے وُہ دن کہ جہاں ہم پہ مُسکراتا تھا
ہم آج خود ہی زمانے پہ مُسکرائیں گے
خُوشی کا وقت ہے اے دوست غم کا وقت نہیں
کہ آج پائی ہے اسلامیوں نے آزادی!!

۱۴ راگست بروز جشنِ آزادی

مسعُود اشعر
از رام پور (ہند)

گیت

مُدیرِ مخزن کے خط کا جواب

یہ رواجی گیت نہیں۔ اس کا مرکزی موضوع وُہ "لیڈر" (نیتا) ہیں جنھوں نے کسی زمانے میں جب انہیں خود ضرورت تھی اعوام کو بڑے بڑے سبز باغ دکھلائے تھے اور جب ان کے قبضے میں خدائی اختیار آگئے تو جن کی وجہ سے انہیں یہ مرتبہ ملا تھا۔ وُہ ان کے لئے سوائے جھُوٹی تسلیوں کے اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ وُہ قطعی بھُول گئے کہ وُہ عوام جو ان کے لئے اتنا بڑا انقلاب پیدا کر سکتے تھے آج خود منظّم ہو کر اس سے بھی بڑا انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اُنہوں نے عوام کے سینوں میں جو جوت جگائی تھی "وُہ ابھی بجھی نہیں ہے اور نہ کبھی بجھ سکتی ہے۔ گیت کے آخری بند میں خاص طور پر یہی کہا گیا ہے۔ بلکہ ان لیڈروں (آقاؤں) کو بتایا گیا ہے کہ عوام کی وہ طاقت جو آپ کے مفاد کے لئے انقلاب لا سکی آج اپنے فائدے کے لئے بھی بہت کچھ کر سکتی ہے! ساجن تو شاید "جوت کی گھاتیں" بھول گئے۔ کیونکہ وُہ "لوبھی" ہیں۔ لیکن گوری انہیں کبھی نہیں بھُول سکتی ـــــ اگر آپ چاہیں تو اس خط کے ساتھ گیت کو شائع کر دیجئے! آپ پر کوئی بات نہیں رہے گی۔ میرا پتا بھی شائع کر دیجئے! میں تو ہندوستانی ہوں اپنی حکومت کے متعلق کہہ رہا ہوں۔ کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق ـــ؟ مسعود اشعر

کیا ساجن مُجھ کو بھُول گئے؟ ـــــــــ ہاں لوبھی ساجن بھُول گئے!
اک وُہ دن تھا جب اِس گھر میں تم آشا بن کر آئے تھے
کچھ نئی اُمنگیں، نئی ترنگیں، نئے ترانے لائے تھے
کچھ ایسے وعدے بھی جن پر ارمان مرے اترائے تھے
وُہ سمے وُہ باتیں بھُول گئے؟ ـــــــــ ہاں لوبھی ساجن بھُول گئے!
تم کہتے تھے، ان آنکھوں میں، اب آنسو کبھی نہ آئیں گے
تم کہتے تھے، ان ہونٹوں پر، اب شکوے آہی نہ پائیں گے
تم کہتے تھے، اندھیارے بھی، سُندر سپنے برسائیں گے
وُہ بیتی راتیں بھُول گئے؟ ـــــــــ ہاں لوبھی ساجن بھُول گئے!
میں جان گئی تم نے ساجن جس کارن آنکھ چرائی ہے
ہاں اور کوئی ہے! اور کسی سے تم نے پینگ بڑھائی ہے
لیکن ساجن کب بجھنی ہے، جو تم نے جوت جگائی ہے
اس جوت کی گھاتیں بھُول گئے؟ ـــــــــ ہاں ساجن شاید بھُول گئے!؟

تلوک چند محروم
(از دہلی)

آج وارث شاہ سے کہتی ہوں میں

یہ مشرقی پنجاب کی مشہور شاعرہ امرت کور کی پنجابی نظم کا ترجمہ ہے جس میں حضرتِ محروم نے کہیں کہیں معمولی تصرف کیا ہے۔ اگرچہ شاعرہ ایک سکھ خاتون ہیں اور مترجم ایک ہندو بزرگ۔ لیکن ہماری رائے میں انہوں نے تینوں قوموں کے مظلومین کی ترجمانی کا حق یکساں ادا کیا ہے۔ وارث شاہ کی وجہ سے چناب کا ذکر تو ضروری تھا لیکن اس کے بعد دوسرے ہی شعر میں پنجاب کے اور دریاؤں کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ "مخزن"

آج وارث شاہ سے کہتی ہوں میں — تربت سے بول — اور کتابِ دردِ الفت کا نیا اک باب کھول
روئی تھی جب فرطِ غم سے دخترِ پنجاب ایک — آنسوؤں کا تو نے جاری کر دیا سیلاب ایک
آج لاکھوں بیٹیاں پنجاب کی ہیں اشکبار — یاد کرتی ہیں تجھے دلدوز ہے ان کی پکار
اے انیسِ دردمنداں اک نظر پنجاب پر — جنگلوں میں بے کفن لاشوں کا بھی نظارہ کر
بے گناہوں کے لہو سے آج رنگیں ہے چناب — ظالموں کے واسطے سامانِ تسکیں ہے چناب
کس نے زہرِ ناب گھولا آہ ان دریاؤں میں — لہر دھرتی پر چڑھی ہر شہر میں ہر گاؤں میں
بس بھری ایسی ہوا آ کر نیستاں میں چلی — ناگ میں تبدیل جنگل کی ہر اک نَے ہو گئی
پھر انہی ناگوں کے افسوں کا ہوا ایسا اثر — بے بسی میں ناگ سے کاٹا گیا ہر اک بشر
زہر سے پنجاب کا ہر انگ نیلا ہو گیا — تھا جو پہلے چمپئی وہ رنگ نیلا ہو گیا
تکلیوں سے تار ٹوٹے اور لبوں سے گیت سب — ہو گئی سپنا وہ مل کر کاتنے کی ریت سب
پیپلوں سے آہ شاخیں کٹ گریں جھولوں سمیت — زیبِ دریا سیج کی کشتی گئی پھولوں سمیت[1]
آج کیدو[2] بن گئے سب طالبانِ حسن و عشق — آئے گا وارث کہاں سے قدردانِ حسن و عشق

آج وارث شاہ سے کہتی ہوں میں — تربت سے بول
اور کتابِ دردِ الفت کا نیا اک باب کھول

[1] یعنی ہیر کے لڈن ملاح کی غداری کی طرف اشارہ ہے۔ [2] "کیدو" ہیر کے چچا کا نام جو ہمیشہ ہیر کی مخالفت پر آمادہ رہا۔

[redacted]

ریاض الرحمٰن
(ماخوذ از جیمز جوئس)

یاد

(افسانہ)

زاہد شہر سے دُور ایک مختصر سے مکان میں رہتا تھا۔ کیونکہ اُسے شہری تصنّع، جھوٹ اور ریاکاری سے نفرت تھی۔ چھوٹے سے مکان کی کھڑکیوں سے دریا اور اُس کے دونوں طرف پھیلے ہوئے ہموار کھیت بڑے سہانے دکھائی دیتے۔ کمروں کی اُونچی دیواریں تصویروں اور دُوسری آرائشی چیزوں سے مبرا تھیں۔ گھر میں صرف ایسا ضروری فرنیچر تھا جس کے بغیر وُہ رہ نہیں سکتا تھا مگر وُہ بھی اِدھر اُدھر بکھرا رہتا۔ لوہے کا سیاہ پلنگ، بید کی چار کُرسیاں، کپڑوں اور کتابوں کی الماری، ایک میز، کوئلہ رکھنے کی ٹوکری، آگ کے لئے چمٹا۔ یہ تھیں اس کی ضرورت کی چیزیں۔ بستر پر سفید چادر اور سُرخ کمبل بچھا رہتا۔ چلمچی کے پاس اُوپر کی طرف دیوار میں ایک شیشہ بھی لٹکایا گیا تھا اور دن کے وقت آتش دان پر رکھا ہوا لیمپ آرائش کا کام دیتا تھا۔ الماری میں چند موٹی موٹی کتابیں بھی رکھی رہتی تھیں اور میز ایک چمڑے کی جلد والی کاپی، قلم دوات اور لکھنے پڑھنے کی دیگر اشیا سے مزین رہتی۔ کاپی میں وُہ کبھی کبھی زندگی کے متعلق طنزیہ فقرے لکھتا اور کہیں کہیں اخباروں کے اشتہارات بھی بہ نگاہِ حقارت نقل کر لیا کرتا۔

زاہد نہایت سختی سے اپنے دماغی و جسمانی توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا اور اُن سب چیزوں سے دُور رہتا جو اس توازن کو متزلزل کر سکتی تھیں۔ اسی لئے سب ناواقف لوگ اُسے ایک قسم کا دماغی مریض سمجھتے تھے۔ اور اُس کا لمبوترا اُداس چہرہ اُس کی خشک اور کٹھن زندگی کا آئینہ تھا جس پر گزرے ہوئے سال کچھ نقوش چھوڑ گئے تھے۔ لیکن وُہ بالکل پُرسکون رہتا۔ صرف ہلکی سی مونچھ اور اُبھری ہوئی ہڈیاں کچھ سختی کا اظہار کرتیں لیکن چھوٹا سا دلکش دہانہ جس پر مونچھیں پھیلی ہوئی تھیں مسکراتا ہوا معلوم ہوتا۔ اس مسکراہٹ سے درشتی کا اثر کچھ ہلکا ہو جاتا۔

اُس کی آنکھیں ہمیشہ دُور دیکھتی ہوئی معلوم ہوتیں جیسے دُنیا کی سخت اور کھُردری سطح کے پرے کوئی سُہانا سماں دیکھ رہی ہوں۔ لیکن جب کبھی اُسے دُنیا یا انسانوں کی کوئی چیز پسند آتی تو اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک آجاتی جیسے کوئی گمشدہ چیز واپس مل گئی ہو۔ لیکن ایسے لمحے بہت کم ہی آتے اور اکثر وُہی حزن و یاس اُس کی آنکھوں سے ٹپکتا۔ وُہ اپنے جسم سے بہت دُور رہتا اور اپنی تمام حرکات کا نقادانہ جائزہ لیتا رہتا۔ اپنا جسم اُس کے لئے بیکار تھا اور صرف خیالات کی دُنیا اُسے مصروف و مشغول رکھتی۔ اُس نے فقیروں کو بھیک کبھی نہیں دی۔ وُہ اس قسم کے احساسات سے بالاتر تھا۔ ایک موٹی بادامی رنگ کی چھڑی اُس کے ہاتھ میں رہتی اور وُہ آہستہ آہستہ بڑی استقامت کے ساتھ چلتا۔

وُہ بہت عرصے سے ایک پرائیویٹ بنک کا خزانچی تھا اور روز صبح کو موٹر بس سے اپنے کام پر حاضر ہوتا۔ دوپہر کو ایک نامعروف سے ہوٹل میں کھانا کھاتا۔ اور چار بجے کے قریب اُسے بنک سے چھٹی مل جاتی۔ شام کا کھانا وُہ مقررہ وقت پر ایک ایسے ہوٹل میں کھاتا جس کی فضا شہر کے بانکے سجیلے نوجوانوں سے بالکل پاک تھی اور جہاں قیمت میں بھی کچھ ایمانداری برتی جاتی تھی۔ اُس کی باقی ماندہ شام برابر کے مکان میں رہنے والی بوڑھی عورت کے پیانو پر گزرتی۔ اُسے پیانو کی موسیقی بہت پسند تھی اور یہی وجہ تھی کہ وُہ شہر کے تھیٹروں اور کنسرٹ ہالوں میں ضرور جاتا۔ جہاں موسیقی اُس کی پیاسی رُوح کی تشنگی کو

دُور کردیتی۔ صرف یہی وُہ دنیاوی عیاشی تھی جس میں وُہ کبھی کبھی ضرور حصّہ لیتا۔

اُس کی رُوحانی زندگی میں دوستوں یا رشتہ داروں کا کوئی دخل نہ تھا۔ صرف موت یا کسی تہوار کے موقع پر وُہ اپنے رشتہ داروں سے ملتا۔ مذہب سماج یا سوسائٹی کے قانون اُس کے لئے بالکل بے معنی تھے۔ اس طرح اُس کی زندگی کی ندی۔ رنج و غم احساسات و حادثات کے بغیر خاموش بہتی چلی جارہی تھی

ایک شام تھیئٹر میں اُس نے اپنے برابر کی نشستوں پر دو عورتوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ تھیئٹر میں بہت ہی تھوڑے آدمی تھے اور اس شام کے پروگرام کی ناکامی پہلے ہی سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے پاس بیٹھی ہُوئی عورت نے ہال میں چاروں طرف بیٹھے ہُوئے مختصر سے مجمع کو دیکھا اور بولی۔ "بیچارے ایکٹروں کو کتنی ذہنی کوفت ہوگی۔ جبکہ اُن کے پارٹ کی داد دینے کے لئے ہال میں صرف گنتی کے آدمی موجود ہیں۔ کم از کم میں تو اتنے کم اجتماع کے سامنے ہرگز پارٹ کے لئے نہ آؤں"۔

زاہد نے اس اشارے کو گفتگو کے لئے دعوت سمجھا اور وُہ واقعی حیران تھا کہ عورت بالکل بے دھڑک بول رہی ہے اور اُسے زاہد کے اجنبی ہونے کا قطعاً احساس نہیں۔ باتوں کے دوران میں زاہد نے اُس عورت کی شبیہہ اور اُس کی باتوں کو اپنے دماغ میں رچانے کی کوشش کی تاکہ وُہ بعد میں اُس کے متعلق اچھی طرح سے سوچ سکے۔ یہ دونوں عورتیں ماں بیٹیاں تھیں۔ لڑکی باتوں کے دوران میں بالکل خاموش رہی۔

وُہ متوسط عمر کی عورت تھی اور زاہد سے شاید چند ہی برس چھوٹی ہوگی۔ اس کا جسم ابھی تک چُست اور سڈول تھا۔ لیکن جوانی کی شام ہوچکی تھی اور اُس کی اُبھری ہُوئی چھاتی رخصت ہونے والی جوانی کے حزن و یاس کو چھپانے میں ناکام معلوم ہورہی تھی۔ اُس کا آفتابی چہرہ جو کبھی بہت خوبصورت ہوگا اب بھی خوش آئند اور ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے خدوخال نستعلیق قسم کے تھے۔ جن پر عمر کا تحلیل کُن اثر اپنے مستقل نشان نہیں ڈال سکا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں مضطرب اور پریشان معلوم ہوتی تھیں اور اُس کی نگاہ جو بڑی بے باک تھی۔ دیکھنے والے کے دل میں بڑے پُر رحم جذبات بیدار کرتی تھی۔ زاہد کو اُس کی شخصیت کچھ عجیب، جاذب اور دُوسری عورتوں سے مختلف معلوم ہُوئی۔ وُہ اسے ایک مرتبہ پھر تھیئٹر میں ملی اور اس دفعہ اُن میں خوب باتیں ہُوئیں۔ اُس نے باتوں باتوں میں اپنے خاوند کا بھی ذکر کیا۔ اس لئے نہیں کہ زاہد اُس کی موجودگی کا کوئی خاص خیال رکھے بلکہ یونہی۔ کیونکہ اس مرتبہ اُس نے اپنے متعلق سب باتیں بتائیں۔ اُس کا نام فریدہ تھا اور اُس کا خاوند ایک امیر تاجر تھا جسے تجارت کے معاملوں کے لئے عموماً باہر رہنا پڑتا تھا۔

جب وُہ تیسری مرتبہ اسی طرح ملے تو زاہد نے ہمت کرکے اُسے باقاعدہ ملنے کی دعوت دی جسے اُس نے منظور کرلیا۔ یہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وُہ ہمیشہ شام کے وقت ملتے اور ایسی جگہوں کو سیر کے لئے جاتے۔ جہاں عام آدمی بہت کم جاتے ہیں۔ لیکن زاہد کو چھپی چھپی ملاقاتیں پسند نہ تھیں۔ اس لئے اُس نے فریدہ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

فریدہ کا خاوند ان ملاقاتوں سے اس لئے خوش تھا کہ اس کے خیال میں شاید اُن کی لڑکی کی شادی کا معاملہ طے ہو رہا تھا۔ اپنی بیوی کو تو وُہ پتھر سمجھتا تھا۔ اور اسی لئے اُس نے اُسے اپنی رنگین زندگی کے دائرے سے دُودھ کی مکھی کی طرح باہر نکال پھینکا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کوئی مرد اُس کی بیوی کی طرف مائل نہیں ہوسکتا۔ غالباً وُہ فریدہ کو نہایت خشک مزاج اور بے حس سمجھتا تھا۔

فریدہ کا خاوند اکثر باہر رہتا تھا اور اُن کی لڑکی روزانہ شام کو موسیقی سیکھنے جاتی تھی۔ اُن کی عدم موجودگی میں اُنہیں خوب باتیں کرنے کا موقع ملتا۔ دونوں کو ایسا موقع پہلے کبھی نہیں ملا تھا اور پھر وُہ ہم خیال بھی تھے۔ رفتہ رفتہ دونوں کے خیالات میں ایک ہم آہنگی شروع ہوگئی۔ ابتدا سے اُن

[redacted]

کتابیں پڑھنے کے لئے دیتا۔ ان کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرتا۔ اُسے ساتھ چھیڑے جاتا۔ حتیٰ کہ وہ اس کی روحانی زندگی کے دائرے میں آگئی اور فریدہ نے بھی زندگی کے لطیف لمس کو پہلی مرتبہ محسوس کیا۔

بعض اوقات وہ اس کے نظریوں کے بدلے میں اپنے خیالات اور زندگی کے تجربات پیش کرتی اور بالکل مادرانہ تجسّس کے ساتھ اُس کے اپنے خیالات نظریوں اور احساسات کو قلمبند کرنے پر مجبور کرتی۔ حتیٰ کہ زاہد نے اپنے پوشیدہ خزانوں کی وسعت کو اُس کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ اور وہ اُس خلا میں داخل ہو گئی جو زاہد کی زندگی کے گرد ایک وحشت انگیز صحرا کی مانند پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے فریدہ کو بتایا کہ ایک دفعہ اسے ایک مقامی پارٹی کے لئے کام کرنے کا موقع بھی ملا تھا اور وہ ان لوگوں کے طریق کار اور خیالات کا بڑے غور سے مطالعہ کرتا رہا۔ لیکن اُن میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی۔ جس کے لئے ایک ایماندار اور راست گو آدمی اُن کا ساتھ دے سکتا۔ وہ سب کے سب ڈرپوک، جاہل اور مطلب پرست تھے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو بہت بے غرض اور خیر خواہ خلائق ظاہر کرتے بڑے ملک اور عوام کے لئے عجیب عجیب اصلاحات پیش کیا کرتے جو اُن کی اپنی نفسانیت اور جہالت کا بالکل صحیح آئینہ ہوتیں۔ اس لئے کچھ عرصے کے بعد اُس نے اِس پارٹی سے قطع تعلق کر لیا۔

ایک دن فریدہ نے اُس سے پوچھا "اگر تم یہ سب کچھ واقعی محسوس کرتے ہو تو پھر خاموش رہنے سے کیا فائدہ ـــــ تم ان باتوں کو عام لوگوں پر واضح کیوں نہیں کرتے۔ تمہیں ضرور لکھنا شروع کرنا چاہیئے"

زاہد نے بڑی پُرضبط نفرت سے کہا "آخر کس لئے ؟ کیا اُن مداریوں سے مقابلہ کرنے کے لئے جو متواتر ساٹھ سیکنڈ بھی نہیں سوچ سکتے اور اگرچہ گھٹیا لفاظی پر قادر ہیں مگر عقل و خرد سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ کیا میں اپنے آپ کو اُن لوگوں کی جاہلانہ تنقید کے لئے پیش کر دوں جن کی تہذیب اور اخلاق کی حفاظت صرف پولیس کے سپاہی کر سکتے ہیں۔ جن کا آرٹ اخلاق سوز فلموں کی صورت میں گرے ہوئے انسانوں کے گروہوں کو ہر روز سینماؤں میں دکھایا جاتا ہے اور جن کے ادب کے مالک وہ بھوکے انسان ہیں جو تہذیب اور ادب تو درکنار ـــ اپنی زبان اور معمولی تعلیم سے بھی بے بہرہ ہیں اور جو ادب کو گھٹیا کتابوں کی صورت میں بیچ کر اپنی کبھی نہ بجھنے والی دوزخ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں برابر مصروف رہتے ہیں۔"

فریدہ اکثر زاہد کو اپنے چھوٹے سے مکان میں لے جاتی جو شہر سے خاصا دور تھا اور وہاں دونوں تنہائی میں اپنی شام گزارتے۔ آہستہ آہستہ وہ باہمدگر زیادہ ہم خیال ہوتے گئے اور اپنے آپ کو ایک دوسرے سے بہت نزدیک محسوس کرنے لگے۔ اب ان کے درمیان ذاتی معاملات اور خیالات کے متعلق بھی گفتگو ہونے لگی۔

زاہد کو یہ رفاقت یوں معلوم ہوئی جیسے گرمیوں میں تپش سے جھلسی ہوئی زمین پر کوئی آوارہ بادل پانی برسا دے۔ بعض اوقات شام کو اندھیرا ہو جانے پر فریدہ کمرے میں روشنی نہ کرتی۔ وہ اندھیرا کمرہ، اُن کی تنہائی، اور موسیقی کی لہریں جو ابھی تک اُن کے کانوں میں گونج رہی ہوتی تھیں۔ اُن کو دماغی طور پر ایک عجیب طریقے سے ملا دیتیں۔ زاہد اپنے آپ کو فضاؤں میں اُڑتے ہوئے محسوس کرتا۔ اِس عجیب ملاپ نے اُس کی فطرت کے سخت گوشوں کو ہموار کر دیا۔ اُس کی زندگی میدانوں میں بہتی ہوئی ندی کی طرح رواں ہو گئی۔ اُس کے لئے یہ ایک نیا ہی احساس تھا۔ اُس نے اپنی پژمردہ روح پر سے پُرانا بے رنگ نقاب اُٹھتا ہوا محسوس کیا اور اُس کی زندگی کے ساکن سمندر میں ایک طوفان پیدا ہو گیا۔

بعض اوقات زاہد کو ایک مبہم سی آواز سنائی دیتی۔ جوں جوں فریدہ کی ہستی اُس کے قریب ہوتی گئی۔ وہ آواز بھی ساتھ ساتھ بلند ہوتی گئی۔

وہ کہا کرتی : "میرا اور تمہارا دائمی رشتہ ہے۔ دراصل ہم دونوں ایک ہیں۔ ہم یہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے کہ ایک تیسری ہستی ہمارے درمیان حائل ہو جائے۔ ہم ہمیشہ تنہا رہتے ہیں۔ شاید یہ تنہائی ہی ہماری حقیقی زندگی ہے۔ اور اگر یہ تیسری ہستی ہمارے درمیان حائل ہو گئی تو میں جو کہ تمہاری روح ہوں تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گی۔ میں کہیں دُور ۔ بہت دُور ابدی تنہائیوں میں رُوپوش ہو جاؤں گی۔"

زاہد اور فریدہ کے اس اختلاط کا آخر یہ نتیجہ نکلا کہ فریدہ اپنے جذباتی طوفان کو برداشت نہ کر سکی اور ایک روز شام کے وقت جبکہ وہ دونوں اکیلے باتیں کر رہے تھے۔ اُس نے زاہد کا ہاتھ بڑے پیار سے پکڑا اور اپنے رُخساروں سے لگا لیا۔ زاہد پر یکایک ایک بجلی سی گری۔ وہ پریشان ہو گیا۔ بس گویا یہی، ان کی پاکیزہ رفاقت کا آخری مقصد تھا۔ اُس کی آنکھوں سے جذبات کا رنگین پردہ اُٹھ گیا۔ فریدہ کی اس "رُومانی" حرکت نے اُسے بیزار کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد زاہد فریدہ سے ایک ہفتہ تک دُور رہا۔ پھر اُس نے فریدہ کو بذریعۂ خط ملنے کی دعوت دی۔ کیونکہ وہ اس آخری مُلاقات کو اُس روز کے واقعے کے اثر سے خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ فریدہ کو ایک چھوٹے سے ریستوراں میں لے گیا۔ خزاں آ چکی تھی اور موسم کافی سرد تھا۔ لیکن پھر بھی وہ شام کے دُھندلکے میں تین گھنٹے تک ویران سڑکوں پر پھرتے رہے۔ انہوں نے آخرکار یہ طے کیا کہ اس جذباتی رفاقت کا خاتمہ کر دیں۔ زاہد نے فریدہ کو سمجھایا کہ انسان کا ہر رابطہ اُسے غم اور ناکامی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لئے غم کے طوفان زدہ سمندر میں ڈوبنے سے تو یہ بہتر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی رُوح کو ایک مکمل تنہائی کے لبادے میں ہمیشہ کے لئے چُھپا لے۔

جب الوداع کہنے کے لئے زاہد فریدہ کو بس کے اڈے کے قریب لے آیا تو وہ بیچاری اپنی رُوح کے تاریک غم کو برداشت نہ کر سکی۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور اُس نے فرطِ جذبات سے مجبور ہو کر کانپنا شروع کر دیا۔ زاہد نے جب اُس کی یہ حالت دیکھی تو وہاں سے جلد رخصت ہونے کی کوشش کی۔ اس لئے کہ مبادا بعد میں حالات اور زیادہ خراب ہو جائیں۔ کچھ دنوں بعد بذریعہ ڈاک اُسے فریدہ کی طرف سے ایک پارسل ملا جس میں اُس کی تمام کتابیں اور خطوط تھے۔

چار سال بیت گئے اور زاہد کی زندگی حسبِ معمول اپنے مدار میں گردش کرتی رہی۔ وہ اس سانحہ کو بھول گیا۔ اُس کی زندگی کی جھیل کی سطح پھر سے ساکن اور ہموار ہو گئی۔ اُس کی چھوٹی سی لائبریری میں نطشے کی دو اور کتابوں کا اضافہ ہو گیا اور اب اُس نے اپنی نوٹ بک میں بھی لکھنا کم کر دیا۔ صرف فریدہ کی آخری مُلاقات پر اُس نے دو فقرے لکھے تھے۔ وہ یہ تھے کہ مرد اور مرد کے درمیان "محبت" ناممکن ہے۔ کیونکہ اُن میں جنسی تعلقات نہیں ہو سکتے، اور مرد اور عورت میں دوستی اس لئے ناممکن ہے۔ کیونکہ اُن میں کسی نہ کسی طرح جنسی تعلقات ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ زاہد نے تھیٹر جانا بھی بند کر دیا کہ کہیں فریدہ سے ملاقات نہ ہو جائے۔ اس عرصے میں اُس کے باپ کا انتقال ہوا اور بنک کا بڑا حصہ دار بھی ریٹائر ہو گیا۔ لیکن وہ باقاعدہ روزانہ صبح اپنے کام کو بس سے شہر جاتا اور شام کو ریستوراں سے کھانا کھا کر پیدل گھر واپس آ جاتا۔

ایک شام کو ریستوراں میں اُس نے کھانا شروع کیا ہی تھا کہ اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے اخبار پر پڑی۔ اس کے ہاتھ یکایک رُک گئے۔ اس نے کھانا فوراً پرے ہٹا دیا اور اخبار کو نزدیک سرکا کر غور سے پڑھنے لگا۔ اُس نے وہی صفحہ بار بار پڑھا۔ میز پر رکھا ہوا کھانا بالکل سرد ہو گیا لیکن اُس نے اُدھر بالکل توجہ نہ کی۔ آخر تھوڑی دیر میں وہ گھبرا کر اُٹھا۔ پانی کا گلاس جلدی سے ختم کیا اور بل ادا کر کے وہاں سے گھر کی طرف چل دیا۔

شام کی مٹتی ہوئی روشنی میں وہ جلد جلد چل رہا تھا۔ اُس کی موٹی چھڑی متواتر سڑک پر پڑنے سے آواز پیدا کر رہی تھی اور اخبار کا ایک

گوشہ اُس کے بھاری کوٹ کی جیب میں سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اُس کا سانس تیز تھا جیسا عموماً بہت پریشانی کی حالت میں ہوتا ہے۔ اُس نے کمرے میں پہنچتے ہی جلدی سے کھڑکی کے پاس جا کر شام کی مدھم روشنی میں دوبارہ اخبار کا وہی صفحہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اُس صفحے پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی :۔

"شہر کے غربی ریلوے پھاٹک کے قریب ایک خاتون کی موت"

"ایک نہایت افسوسناک واقعہ"

"آج سنٹرل ہسپتال میں ایک خاتون مسماۃ نسرین کی لاش لائی گئی جن کی عمر تقریباً چالیس سال ہوگی۔ وُہ ایک مقامی تاجر کی بیوی تھیں۔ موت دوپہر کی ایکسپریس کے نیچے آجانے سے واقع ہُوئی۔ گواہوں کا بیان ہے کہ ریلوے پھاٹک بند تھا اور تمام ٹریفک رُکا ہوا تھا۔ لیکن مرحومہ ریلوے لائن عبور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور باوجود پھاٹک کے ملازم کی چیخ پکار کے وُہ نہیں رُکیں۔ ایکسپریس کے آنے کا وقت بالکل قریب تھا۔ ابھی مرحومہ لائن کے پاس پہنچی ہی تھیں کہ گاڑی موڑ پر سے نمودار ہُوئی اور مرحومہ اس کی لپیٹ میں آگئیں ان کے سر اور داہنی طرف کی پسلیوں پر ضربات آئیں۔ جن کی وجہ سے اُنہوں نے وہیں دم توڑ دیا۔

ڈرائیور کا بیان ہے کہ اُس نے مرحومہ کو ریلوے لائن کے نزدیک چلتے دیکھ کر سیٹی بجائی اور گاڑی کو ٹھہرانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن موڑ ہونے کی وجہ سے اُسے بہت کم وقت ملا۔ چنانچہ ٹکر ہونے کے وقت انجن کی رفتار بہت کم ہو چکی تھی۔ چونکہ موڑ پر پوری بریک لگنے سے گاڑی کے اُلٹ جانے کا خطرہ تھا اور ڈرائیور مجبور تھا۔ اس لئے وُہ گاڑی کو یکدم نہ روک سکا۔ لہٰذا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں اور پھر اُس کی بیس سالہ سروس میں یہ پہلا حادثہ تھا جو صرف حالات کی مجبوری کی بنا پر ہوا۔ عدالت نے اُسے بے قصور قرار دیا ہے۔

سنٹرل ہسپتال کے وارڈ ہاؤس سرجن کا بیان ہے کہ مرحومہ کی انجن سے ٹکر نہیں ہُوئی ہے۔ کیونکہ ضربات محض یکدم زمین پر گر جانے کی وجہ سے آئی ہیں اور عام حالات میں صرف اِن ضربات سے موت کا واقع ہونا ضروری نہیں۔ غالباً مرحومہ انجن کے فوراً پاس سے گزر جانے کی وجہ سے زمین پر گر پڑیں اور انتقال فوری صدمے اور حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہُوا ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا بیانات کی بنا پر حکومت ریلوے اور اُس کے عملے کو بری الذمّہ قرار دیتی ہے۔

مرحومہ کے خاوند کا بیان ہے کہ فریدہ کے حادثہ کے وقت وُہ کچھ روز کے لئے باہر گئے ہُوئے تھے۔ اُن کی شادی کو بائیس سال کا عرصہ ہو گیا تھا اور اس دوران میں اُن کی زندگی میں کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہُوئی۔ صرف دو سال سے اُن کی بیوی کی عادات و حرکات بغیر کسی وجہ کے ذرا کچھ مختلف ہو گئی تھیں۔

مرحومہ کی بیٹی کا بیان ہے کہ اُن کی والدہ کچھ عرصے سے روزانہ رات کو شراب خریدنے کے لئے باہر جایا کرتی تھیں۔ اُنہوں نے کئی مرتبہ اپنی ماں کو سمجھایا بھی اور کسی کلب کی ممبر بن جانے کا مشورہ بھی دیا۔ لیکن دو تین سال سے اُن کی فطرت میں کچھ عجیب تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں جس کا سبب دونوں باپ بیٹی نہ سمجھ سکتے تھے۔

عدالت کا فیصلہ ہے کہ یہ حادثہ محض مرحومہ کی بے احتیاطی سے ہوا ہے۔ اس کے لئے کسی کو قصور وار نہیں ٹھہرایا جا سکتا لیکن ریلوے کو تنبیہہ کی جاتی ہے کہ وُہ آئندہ ایسے حادثوں کے انسداد کے لئے مزید انتظامات کرے۔ حکومت کو مرحومہ کے متعلقین سے دلی

ہمدردی ہے۔ کیونکہ واقعی یہ حادثہ بڑا دردناک ہے۔

زاہد نے اخبار سے نگاہ اٹھائی اور کھڑکی میں سے اُداس اور بے رنگ زمین کی طرف دیکھا۔ دریا تقریباً خشک تھا اور اس کی خالی خالی گزرگاہ شام کے بے رنگ دُھندلکے میں بڑی بھیانک دکھائی دے رہی تھی۔ یکدم اُس کے دل میں ہُوک سی اُٹھی —— کتنا دردناک انجام!! فریدہ کی موت کی خبر پڑھ کر اُس کا روآں روآں کانپ اُٹھا جس ہستی نے ایک دفعہ اُس کی بے نور زندگی میں رنگ بھر دیا تھا۔ اُسے کتنی ہولناک موت نصیب ہُوئی اور پھر اس حادثے کی ذمہ دار وُہ خود تھی۔ نہ صرف اُس نے اپنے آپ کو رسوا کیا بلکہ مجھے بھی ذلیل کیا۔ ایک دم فریدہ کا افسردہ چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اور اُس کی دھیمی اور مغموم آواز بھی کانوں میں گونجنے لگی۔ وُہ اُس کی رُوح کی رفیق تھی اور پھر اُسے اُن گندگی سے بھرپور جگہوں کا خیال آیا۔ جہاں وُہ ہر روز شراب پینے جایا کرتی تھی —— یا خدا!! کیا واقعی وُہ یہ سب کچھ برداشت کرسکی ہوگی۔

درحقیقت وُہ اور زندہ رہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ بھلا بغیر کسی مقصد کے آدمی کیسے زندہ رہ سکتا ہے اور پھر ایسا شخص جسے تمام زندگی میں صرف ایک دفعہ اپنا اُفق نظر آئے اور پھر وُہ بھی اس سے چھین لیا جائے۔ قُدرتاً وُہ بُری عادتوں کا شکار ہوجائے گا۔ ایسا شکار جیسے ہزاروں اور ہماری موجُودہ تہذیب اور سماج کے تاریک غاروں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ لیکن ظاہراً وُہ دُنیا کو چمکتے ہُوئے دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن وُہ اتنی پست گہرائیوں میں کیسے اُتر گئی۔ کیا واقعی میں نے فریدہ کے متعلق دھوکا کھایا۔ پھر اُسے اپنی آخری مُلاقات بھی یاد آئی۔ میں نے فریدہ سے کتنا سخت سلوک کیا تھا۔ کیا اُس وقت میرا رویّہ ٹھیک تھا —— ہاں جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔

جُوں جُوں روشنی مدھم پڑتی گئی۔ زاہد کی آنکھوں کے سامنے پُرانے واقعات پھرنے لگے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے فریدہ نے اُسے چھُوا ہے۔ جس صدمے نے پہلے محض اُس کے دماغ کو مُضمحل کردیا تھا۔ اب اُس کے دل پر بھی اثر کرنے لگا۔ اُس نے اپنا بڑا کوٹ اُٹھایا اور باہر چل دیا۔ باہر نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا نے اُس کا استقبال کیا اور اُس کے دماغ کو تروتازگی بخشی۔ وُہ چلتا گیا اور کافی ہاؤس کے قریب آکر رُک گیا۔ اُس نے اندر نظر دوڑائی صرف چار پانچ آدمی چُپ چاپ بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور فضا بہت اُداس تھی۔ وُہ اندر چلا گیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے سامنے کافی رکھ دی گئی۔ دوسری طرف بیٹھے ہوئے آدمی اب زور زور سے بول رہے تھے۔ غالباً وُہ مقامی سیاست کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ کافی ہاؤس کا مالک اپنی میز پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اور کبھی کبھی اُن شور مچاتے ہُوئے آدمیوں کی طرف حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ لیتا تھا۔ نہ معلوم یہ لوگ کافی ہاؤس کو کیا سمجھتے ہیں۔ دُنیا بھر کے بیکار اور آوارہ آدمی صبح سے آدھی رات تک میرا دماغ چاٹتے رہتے ہیں۔ غالباً کافی ہاؤس میں وقت گزارنا ان لوگوں کا پیشہ بن چُکا ہے۔ وُہ ان میں سے ہر ایک کو خوب پہچانتا تھا۔ یہ لوگ یہاں بیٹھ کر شاید مجھ پر احسان کرتے ہیں۔

زاہد تنہا بیٹھا ہوا اُن دنوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو اُس نے فریدہ کے ساتھ گزارے تھے اور اب —— اب اُس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ وُہ کس فریدہ کو اپنے دماغ میں بسا لے۔ اُس فریدہ کو جس نے کچھ عرصے کے لئے اُس کی دُھندلی فضاؤں میں رنگ بھر دیئے یا اس فریدہ کو جس نے اس پست اور ذلیل قسم کی موت کو قبول کیا۔ اچانک اُسے دھچکا سا لگا کہ وُہ مر چکی ہے۔ اب وُہ مجھے کبھی دکھائی نہیں دے گی۔ شاید وہ اب ایک مستقل یاد بن گئی ہے جو ہمیشہ ایک اُداس اور غمگین خواب کی مانند مجھے پریشان رکھے گی۔ اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا

یہ عجیب سا احساس ہے جس سے مجھے آج سابقہ پڑا ہے۔ میں نے پہلے کبھی یوں محسوس نہیں کیا۔ لیکن کیا فریدہ کی موت کا ذمہ دار میں ہوں ــــ نہیں میں اس قسم کے رشتہ کو کبھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ میں یہ کھیل ہرگز نہیں کھیل سکتا تھا اور پھر اس سے میں کھلم کھلا کیسے عشق کر سکتا تھا جبکہ وہ ایک منکوحہ اور گھربار کی ذمہ دار عورت تھی۔ آخر یہ ذلیل اور بھیانک سماج ہمیں کب تک چین سے رہنے دیتی اور پھر میں خود بھی یہ کبھی برداشت نہ کر سکتا کہ فریدہ اپنے خاوند اور گھربار کو چھوڑ کر میرے ساتھ آبسے اور اسی لئے میں نے فریدہ سے اس رات اتنا سخت سلوک کیا تھا۔ آخر اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔

لیکن اب ــ اب تو وہ جا چکی ہے ہمیشہ کے لئے۔ اور اب واقعی میں محسوس کرتا ہوں کہ فریدہ کی زندگی کتنی اُداس اور ویران رہی ہوگی۔ اس نے اتنی طویل تنہائی کیسے برداشت کی ہوگی۔ اس نے وہ لمبی کٹھن راتیں کیسے گذاری ہوں گی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے فریدہ کی ہولناک تنہا زندگی کا نقشہ پھیل گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ فریدہ کی اس رات والی حرکت محض نفسانیت یا رومان کے بنا پر نہ تھی۔ بلکہ اس روح کو کچل دینے والی تنہائی کا اظہار تھا جس کے یا تلے وہ اتنے سال دبی رہی تھی اور اس نے اس وقت زاہد کو اپنا غمگسار اور رفیق سمجھ کر اپنی بے بسی کا یوں اظہار کیا تھا ــ لیکن میں نے فریدہ کو کتنا سخت سبق دیا۔ اتنا سخت کہ وہ اپنی زندگی سے بھی بیزار ہو گئی اور آخر اس نے اپنے آپ کو اس ہولناک اور تاریک تنہائی میں ڈبو دیا ہمیشہ کے لئے . . . . .

زاہد نے محسوس کیا کہ اس کا کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ اچانک اُسے ایک بھیانک خیال آیا کہ اب میں بھی تو تنہا ہی رہوں گا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ میری زندگی بیکار گذری ہے، میری زندگی ایک صحرا کی مانند رہی ہے جس میں سوائے ویرانی کے کچھ بھی نہیں۔ جہاں سراب آوارہ پھرتے ہیں۔ جہاں ابدی موت ہے اور پھر فریدہ اپنے پیچھے یاد تو چھوڑ گئی ہے۔ لیکن مر جانے کے بعد مجھے کون یاد کرے گا۔ واقعی مجھے کوئی یاد کرنے والا نہیں ہوگا۔ میں غالباً اُن بدنصیب لوگوں میں سے ہوں۔ جن کی زندگی سوائے ایک بھیانک خواب کے کچھ بھی نہیں۔ وہ بیٹھا سوچتا رہا اور شدید غم کا ایک سیاہ بادل اس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ جب نو بج گئے تو وہ کافی ہاؤس سے اُٹھا۔ رات تاریک اور اُداس تھی اور خنک ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ بغیر کسی سوچ کے خود بخود اُن سڑکوں کی طرف چل نکلا جن پر وہ اور فریدہ پھرا کرتے تھے۔ چار سال گزر چکے تھے۔ لیکن اُن لمحات کی یاد اب تک اس کے دل میں ویسی کی ویسی قائم تھی۔ وہ ان سڑکوں پر تنہا پھرتا رہا۔ رات کی اس غمناک تاریکی میں اُسے فریدہ اور بھی قریب محسوس ہوئی۔ اُسے فریدہ کی دھیمی آواز اپنے پاس ہی سنائی دیتی اور کئی دفعہ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس کے ہمراہ چل رہی ہے اور اس کا ہاتھ اُسے چھو رہا ہے۔ وہ چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ اسے اچانک خیال آیا کہ میں نے ہی فریدہ کو زندگی سے محروم کیا ہے۔ میں نے ہی اُسے موت سے ہمکنار کیا ہے۔ میں مجرم ہوں اور وہ مضبوط اور آہنی خول جس میں اس نے برسوں کی محنت و مشقت سے اپنی زندگی کو بند کیا تھا۔ چکنا چور ہو گیا۔

وہ چلتا پھرتا بستی پارک کے قریب پہنچ گیا۔ دور شہر کی روشنیاں ستاروں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں۔ پارک کے درختوں کے پتے جھڑ چکے تھے اور وہ اُداس معلوم ہو رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف بنچ رکھے تھے اور کہیں کہیں ان بنچوں پر نوجوان جوڑے بیٹھے ہوتے تھے۔ جب وہ ان کے قریب سے گزرتا تو وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے اور اس کے وہاں سے گزر جانے کا انتظار کرتے رہتے۔ اس نے محسوس کیا کہ میں کسی عجیب دُنیا میں آگیا ہوں۔ جہاں مجھے کوئی نہیں چاہتا۔ جہاں میں کسی کو نہیں جانتا۔ شاید میں اب تک خوابوں کی دُنیا میں رہا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ زندگی اور اس کی روشنی سے محروم رکھا ہے۔ میں ایک اجنبی ہوں جسے اِن لوگوں میں رہنے کا کوئی حق نہیں اور پھر صرف ایک انسان نے میری بے فیض ہستی سے محبت کی۔ لیکن میں نے اسی کو خوشی اور زندگی سے محروم رکھا۔ بلکہ خود غرضی اور ناقابلِ فہم ضد کے باعث اُسے مجروح کر کے ایک ہولناک موت سے ہمکنار کر دیا

اُسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہُوئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ زندگی سے بھرپُور نوجوان جوڑے بنچوں پر بیٹھے ہوئے اُسے حقارت کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک بھکاری ہے جسے محبت، رحم اور زندگی کی بھیک درکار ہے۔ لیکن لوگ اُسے حقیر سمجھ کر دھتکار رہے ہیں۔ دُنیا میں اُسے کوئی بھی اپنا دکھائی نہ دیا۔ اُس کے دل میں جلن سی پیدا ہُوئی اور اُس نے اپنے دماغ کو شل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ وہاں سے چل دیا۔

دریا کے قریب پہنچ کر اُس نے اردگرد ایک نظر ڈالی۔ ریل کے پُل سے پرے دُور ایک مال گاڑی بے انتہا وزن کھینچے چلی آرہی تھی۔ دُور سے انجن کی روشنی ایک اژدہے کی چمکتی ہُوئی آنکھ معلوم ہو رہی تھی جو تاریکی میں اپنے بھاری وزن کے ساتھ ہانپتا ہوا چلا آرہا تھا۔ ناہد کو انجن کی متواتر آواز فریدہ کا نام چیختے ہوئے سُنائی دی۔ وہ واپس مُڑا۔ پیچھے سے انجن کی مدھم ہوتی ہُوئی آواز ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اُس کا دماغ شل ہوچکا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ جو واقعات اب تک ہوچکے ہیں۔ کیا وہ واقعی دُرست ہیں۔ لیکن انجن کی مدھم پڑتی ہوئی آواز سوچنے سے روک رہی تھی۔ وہ ایک سُوکھے ہوئے درخت کے نیچے رُک گیا تاکہ کچھ عرصے میں دُور جاتی ہُوئی گاڑی کی آواز ختم ہو جائے۔

آج شام کو جب اندھیرے میں اُس نے فریدہ کی قربت محسوس کی تھی تو اُس نے اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔ اس لئے اب پھر اُس نے فریدہ کو قریب محسوس کرنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ دیر کھڑا اُس کی افسردہ آواز سُننے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اُسے مایوس کُن ناکامی ہُوئی۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ اس انتظار میں کہ شاید وہ لمحے اُسے پھر واپس مل جائیں۔ لیکن نہ اُس نے کوئی آواز سُنی اور نہ اُسے کسی نے چھُوا ہی۔ رات اور بھی تاریک ہوگئی۔ اُس نے دوبارہ سُننے کی کوشش کی۔ لیکن سوائے اپنے دل کی دھڑکن کے اُسے کچھ بھی سُنائی نہ دیا۔ یکایک ایک رُوح فرسا خیال ساون کی تیز رفتار گھٹا کی طرح اُس کے دل و دماغ پر چھا گیا کہ وہ فانی انسان نہیں بلکہ اپنے مسکن سے بھٹکی ہُوئی رُوح ہے، جو ازل سے تنہا رہی ہے اور ابد تک تنہا رہے گی۔ وہ تنہائی کے تاریک سمندر میں ایک تنکے کی مانند گُم ہو گیا۔ تاریکی اور بھی گہری ہو گئی۔

ریاض الرحمٰن

عظیم قریشی

اثبات

اور ہونٹوں سے کچھ کہا نہ گیا
لڑکھڑاتا ہُوا حسیں سا پیام
جیسے پھُولوں پہ تیرتا ہو جام
چاندنی سے بھی کچھ سُنا نہ گیا
تھرتھراہٹ فضا سے ٹکرائی
جیسے نغموں نے لی ہو انگڑائی

مخزن المخازن

"اُردو"

اُردو میں دخیل الفاظ

(ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب)

دخیل الفاظ کو مستعار الفاظ بھی کہتے ہیں۔ جو انگریزی لفظ ــ LOAN - WORDS کا ترجمہ ہے لیکن مستعار کا لفظ زیادہ موزوں نہیں۔۔۔ دخیل کا لفظ زیادہ موزوں ہے اور قدیم سے اسی مفہوم میں استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ دُنیا کی کوئی زبان اچھوتی نہیں ہر زبان نے کسی نہ کسی زمانے میں دوسری زبانوں سے کچھ نہ کچھ لفظ لئے ہیں۔۔۔ دخیل الفاظ تاریخی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔۔۔ بلکہ قوموں کی اندرونی کیفیت کو بھی بتاتے ہیں ۔۔۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ ایک زبان کے لفظ دوسری زبان میں بھی پائے جاتے ہیں تو اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوگا کہ ایک قوم کو دوسری قوم سے سابقہ رہا ہے بلکہ اگر صحیح طور پر اُن کا کھوج لگایا جائے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اُن کے باہمی تعلقات کس قسم کے تھے اور زندگی کے کن شعبوں میں ایک کو دوسرے پر فوقیت تھی۔۔۔ مسلمان ہند میں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے ان کی زبان فارسی تھی۔۔۔ مسلمانوں نے ہندی اور ہندوؤں نے فارسی لفظ اپنی بول چال میں استعمال کرنے شروع کئے ۔۔۔ یہ سلسلہ رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ دونوں زبانوں نے ایک مدت کے بعد نئی صورت اختیار کر لی جسے ہم اُردو کہتے ہیں۔ جب مغلوں کا دور دورہ ہوا تو اس ربط ضبط کو اور فروغ ہوا۔ ہم جنہیں مغل کہتے ہیں۔ درحقیقت ترک تھے مغل بادشاہ اور امرا فارسی کے علاوہ ترکی بھی جانتے اور بولتے تھے ۔۔۔ یوں بھی فارسی میں ترکی لفظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ اُردو میں تُرکی لفظ زیادہ تر فارسی کے ذریعہ سے آئے ہیں

یہ ترکی لفظ ایسی اشیا کے نام تھے جو ہماری زبان میں نہیں تھیں۔۔۔ مثلاً آلاتِ حرب میں توپ، بندوق، تفنگ وغیرہ۔ کھانے کے اقسام میں قورمہ، دُلما، اولما وغیرہ۔ کھانے کے ظروف میں تاب، مشقاب، طشت، طاس، معاشرتی تعلقات میں بیگ، بیگم، آکا، آتون، خاتون، انگہ، اتگہ، باجی ۔۔۔ ان کے علاوہ بہت سے متفرق ترکی الفاظ ہیں۔۔۔ مثلاً اُردو، آل تمغا، الغار، ایلغار، ایلچی (ایلچی)، آتالیق (اتالق)، بلاق، بقچہ، چاق (چاق چوبند میں)، چاوش، چقماق (چاقمق یا چقمق)، تُوزک، تناب، تغار، تاش، قالین، قالیچہ، قزاق، قرق، قدغن، قیطون (قیطان) چاقو، قینچی، قلی، ساچق، قلماقنی، الاچہ، اُتو، تکمہ، قلتبان "چی" کا لاحقہ ترکی ہے جو اکثر پیشوں کے ناموں کے ساتھ آتا ہے جیسے توپچی، ایلچی، بادرچی، مشعلچی اُردو والوں نے اس کے استعمال میں کشادہ دلی سے کام لیا ہے جیسے طبلچی، دفالچی، خزانچی، حتیٰ کہ افیم سے افیمچی بنا لیا ہے ۔۔۔ بعض ایسی اشیا ایران سے اس دیس میں آئیں جن کے نام بھی بلا تکلف ان کے ساتھ آگئے۔ پھل پھول اور میوے جیسے گلاب، نرگس۔ لالہ، بنفشہ، زعفران امرود، ناشپاتی، آلو بخارا، آلوچہ، خوبانی، سیب، بہی (بِہ) انگور، سردا، خربوزہ، بادام، انار، کشمش، منقا، پستہ وغیرہ لباس میں۔ پاجامہ شلوار، پشواز، قمیص، فرغل، جبہ، چوغا، لحاف، توشک، رزائی، پوستین، شال، دوشالہ، برقع، تکیہ، رومال، کرتہ، گریبان، موزہ، جراب وغیرہ کپڑوں میں۔ کمخواب، زربفت، دریا، مخمل، اطلس، جامدانی، سوسی، جامدانی، شبنم، آب رواں۔ مخمل گھوڑے اونٹ ہاتھی کی سواری کے متعلق۔ زین، لگام، رکاب، مہمیز، تنگ، چارجامہ خوگیر، زیربند، فتراک، پاکھر، قدم، شلگام، نعل، سم، ردیف، پائدان

کجاوہ، ساربان، فیلبان، شتربان، محمل، مہار، عماری، سائیس، چابک چابک سوار، ابلق، شترغا، سمند، سبزہ وغیرہ۔ **دریائی سفر میں:** ملاح سکان، بادبان، لنگر، مستول، کشتی۔ **عمارت میں:** محل، قلعہ، بارہ دری برج، مینار، گنبد، محراب، روکار، شہ نشین، طاق، طاقچہ، دیوار، فیل پایہ وغیرہ **کھانے کے ظروف:** دیگ، دیگچی، دیگچہ، کفگیر طشت، کشتی، رکابی، قرابہ، بادیہ وغیرہ **سامان نوشت و خواند:** قلم، دوات، قط، قلمدان، قلمتراش، کاغذ، مسطر، ابری وغیرہ **کھانے کے اقسام:** قیمہ، قورما، قلیا، خشکہ، نان خطائی، شوربہ، شکم پر، پلاؤ، یخنی، کباب، زردہ، مزعفر، قلما، پنیر، سموسہ، گجک (گزک) طاہری، قبولی، حلوہ، جلیبی، مربا، اچار وغیرہ۔ نان کی متعدد قسمیں مثلاً خمیری، فتیری، آبی، گاؤ دیدہ، گاؤ زبان، تافتہ، تنکی، شیرمال، باقرخانی (ترکی: باقرخانی) **فوجی الفاظ:** سپاہی، سپاہ، سپہ سالار جمعدار، منصب دار، ہراول۔ **آرائش و آسائش کی اشیا:** جیسے تخت، کرسی، مسند، سوزنی، تکیہ، گاؤ تکیہ، قالین، عطر، عطردان مشک، عنبر، عود، عوددان، فانوس، فتیل سوز، آفتابہ۔ **پیشہ وروں** میں زیادہ تر ہندی الفاظ ہیں مگر کچھ فارسی میں بھی ہیں جیسے تارکش زردوز، قصاب، درزی، حلوائی، آب دار، صیقل گر، آتش باز، **شطرنج کے متعلق:** کشت، مات، شہ، شہ مات، فرزین، پیادہ رُخ، گنجفہ اور **تاش میں:** آفتاب، خلال، حکم وغیرہ **سکّہ و حساب وغیرہ:** دام، اشرفی، مہر، ریزگاری، خوردہ، مبلغ، مرافعی گولک (غولک، غلک) باقی، تحویل، سلک، میزان، برآمد، جمع، دستوری دکان، ضمیمہ (ضمیب) صراف، سرافہ۔ **شادی بیاہ کے الفاظ اور اس کی رسمیں** (سوائے چند کے سب ہندی ہیں) جہیز، آرسی مصحف، جلوہ، مہر، نسبت، عقد، شادی، وداع **تجہیز و تکفین:** قبر، تعویذ، جنازہ، سردابہ، گور، مزار، کفن، چہلم، قل، لفافہ۔ **حقّہ اور اس کے**

لوازم: نے، نیچہ، قلفی، چہرہ، چنبل، سلفہ، ضامن۔ **زیوروں کے** نام زیادہ تر ہندی ہیں۔ چند فارسی بھی ہیں۔ جیسے جوشن، جہانگیری، گلوبند، پازیب، بازوبند، نورتن (ہندی) آویزہ **جواہرات میں** عقیق، الماس، فیروزہ، نیلم، مروارید، یاقوت، زبرجد، یشب، بلور، **گانے بجانے کا سامان:** دف، طبل، طنبورہ، شادیانہ، طاؤس سرود، رباب، قرنا، قانون (کانون) قانونچہ، بعض گانے مثلاً خیال قوالی۔ **رشتہ داروں کے سب نام** ہندی ہیں سوائے خالہ کے خسر اور خسر، داماد اور جنوائی دونوں مستعمل ہیں **اعضائے انسانی** میں سب لفظ ہندی ہیں بجز دل، گردہ، سینہ، معدہ، مغز، جگر۔ **گنتی** کے سب لفظ ہندی ہیں۔ البتہ ہزار کا لفظ فارسی ہے اور فی صد اور فی صدی میں صد کا لفظ **ہتھیار** رذال میں۔ تیر، نیزہ، خنجر، پیش قبض، توپ، بندوق، طپنچہ **ناپ تول** کے الفاظ میں: سیر، من، تولہ، ماشہ گز، جریب، بالشت۔ **ملازم:** نوکر، چاکر، پیش دست، اصیل، خواص سب فارسی یا عربی ہیں . . . بعض غیر زبان کے اصل لفظ تو استعمال میں نہیں لیکن ان کے مرکب یا ان سے جو مرکب بنا لئے گئے ہیں وہ مستعمل ہیں . . . مثلاً فارسی کا لفظ **انگشت** جس کے معنی انگلی کے ہیں اُردو میں مستعمل نہیں۔ لیکن "انگشتانہ" جس کے لئے کوئی ہندی لفظ نہیں ہماری زبان میں آگیا ہے۔ انگشتری بھی کبھی بولنے یا لکھنے میں آتی ہے **دست** (ہاتھ) فارسی لفظ ہے۔ اُردو میں تنہا استعمال نہیں ہوتا لیکن اس کے بعض مرکبات مثلاً آبدست، دستانہ، دست رس، دست بدست دستخط، دستک، دست درازی، تنگ دست، بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ اسی سے اُردو والوں نے "دستی" بنا لیا ہے۔ اُردو کا "دسپناہ" دست پناہ کا مخفف ہے۔ اُردو میں فارسی اُردو یا عربی اُردو کے میل سے بے شمار مرکبات بنا لئے گئے ہیں۔ خاص کر **فارسی لاحقے** اس غرض کے لئے بہت کار آمد ثابت ہوئے ہیں۔ جیسے دل لگی، نیک چلن،

[redacted]

جگت اُستاد، جیب گھڑی، امام باڑہ، عجائب گھر، کفن چور، سمجھدار، اُگالدان، مچھردانی، مُنہ زور وغیرہ۔ اس کے برخلاف فارسی عربی الفاظ میں ہندی لاحقے لگاکر مرکب لفظ بنا لئے گئے ہیں۔ جیسے دیوانہ پن، جوشیلا، رنگیلا عقیل . . .

اہلِ یورپ بھی ہندوستان میں آئے . . . پہلے اہلِ پرتگال آئے پھر ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز۔ ان میں پرتگالی ایسے تھے جنہیں تجارت و حکومت کے ساتھ مذہب کی اشاعت کی بھی دُھن تھی . . . مذہب کی اشاعت میں اُنہیں عام لوگوں سے بھی سابقہ پڑا۔ اُنہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے بہت ظلم اور جبر کیا، سازشیں کیں اور لڑائیاں لڑے۔ اس لئے بہ نسبت ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کے اُن کی زبان کا اثر ہماری زبانوں پر زیادہ ہوا۔ اُن کی اب دو ہی یادگاریں رہ گئی ہیں ایک تو کچھ دو غلے اور دیسی عیسائی اور دوسری کچھ لفظ جو ہماری زبان میں ایسے گھُل مل گئے ہیں کہ جب تک خاص طور پر تحقیق نہ کی جائے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کہیں باہر سے آئے ہیں۔ مثلاً :-

اُردو پرتگالی	اُردو پرتگالی
گرجا ، اگریجا	کابجی ، کنجا
کمرہ ، کمرا	ساگو، ساگو
چابی، چاوی	گوبھی، گودی
پریگ، پیے گو	پادری، پادری
تولیا، ٹوالھا	مارتول، مارتیلو
پپیا، پپیا	اَلپین، پن، ال فنیت (ال فینی)
برنی، بورسنی	بمبا، بومبا
بالٹی، بالدی	کارتوس، کارٹوچا
(نان) پاؤ، پاؤ	پستول، پستولا
جہاں، میل	الپکا ، الپکا (انگریزی)
ڈوریا، ڈوریا (انگریزی)	کاکاتوا، کاکاتوا
بوتل، بوتلو	پیرو، پیرو
فیتہ ، فیتا	نیلام، لی لاؤں
سایا، سے آ	کاجو، کاجو
بوتام، بوتاؤ (بوتاؤں)	انناس ، انناس

آخر میں انگریز ان سب پر غالب آگیا اور . . . اُس کی زبان کا اثر سب سے زیادہ ہوا . . . اُس نے نہ صرف ہماری زبان اور ہمارے ادب پر اثر ڈالا بلکہ ہمارے خیالات، ہمارے طرزِ فکر اور ہماری تہذیب و معاشرت کو بھی بہت کچھ بدل دیا۔ ان وجوہ سے ہماری زبان میں انگریزی زبان کے بے شمار الفاظ داخل ہوگئے۔ اس کی تفصیل یا مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اس سے بچّہ بچّہ واقف ہے . . . اس میں شک نہیں کہ انگریزی زبان سے اُردو کو ایک گونہ فائدہ پہنچا . . . لیکن اس کے مقابلے میں جو نقصان پہنچا۔ اُس کی تلافی کے لئے ایک مدت درکار ہوگی کم سے کم موجودہ نسل میں تو اس کا کوئی امکان نہیں . . . جدّت اور جودت مفقود ہوگئی اور نقالی غالب آگئی اور طلبہ اپنے اخلاق و آداب اور اپنی روایات و تاریخ سے بیگانہ ہوگئے۔ اگر اُردو ذریعۂ تعلیم ہوتی اور نصابِ تعلیم اپنی تہذیب و معاشرت اور حالات کے مطابق ہوتا تو آج اس کا درجہ کس قدر بلند ہوتا . . . . . . (خلاصہ و انتخاب)

"اُردو ادب"

"اُردو ادب کا آخری دور"

کنہیا لال کپور

خدا خدا کرکے اُردو کا پانچواں دَور ختم ہوا۔ اللہ اللہ کیسی کیسی صورتیں تھیں کہ خاک میں پنہاں ہوگئیں ؏ وقتِ شعر و شاعری بگذشت و رفت اب چند عجیب و غریب کہ جنہیں دیکھ کر عقل انگشت بدنداں اور دماغ

نوحہ کناں ہے۔ بزم ادب میں تشریف لاتے ہیں۔ کندھوں پر اردو شاعری کا جنازہ اٹھائے ہائے ردیف ہائے قافیہ کے بین کرتے جونہی انہوں نے شبستانِ شاعری میں قدم رکھا یکلخت تمام شمعیں گل ہو گئیں۔ تغزل نے آخری ہچکی لی اور ترنم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اس گھپ اندھیرے میں حفظِ مراتب کو بالائے طاق رکھ کر ہر ایک شاعر مسند کی جانب بڑھا۔ ان تمام میں یوسف ظفر پیش پیش تھے۔

یوسف ظفر

نام یوسف لیکن تخلص ظفر تھا یا نہیں اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ نہایت مرنجاں مرنج بلکہ مریل قسم کے انسان تھے۔ اوائلِ عمر میں عجیب و غریب مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آخری عمر میں بھی کوئی خاص آسانیاں نصیب نہ ہوئیں۔ مشاعروں میں اپنا کلام اس طرح پڑھتے تھے جیسے کسی دوسرے کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ غزل اچھی کہہ لیتے تھے۔ لیکن با ایں ہمہ اس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ نظمیں کہنے کا جنون تھا۔ اکثر نظم کہنے کے بعد کافی ہاؤس میں تشریف لایا کرتے تھے۔ میخانے میں جانے کی آخری دم تک توفیق نہ ہوئی۔ چند سال حضرت ظہیر کے زنداں میں گزارے۔ وہاں سے سیدھے ہمایوں کے مقبرے میں پہنچے اور وہیں دفن ہوئے۔ قیوم نظر دربراتِ نے ایک دقت تاریخ وفات کہی

حیف صد حیف ظفر ۔ مُرد

اس مصرع سے وفات کا سنہ ۱۹۵۰ء نکلتا ہے جو قریب قریب صحیح ہے۔ کیونکہ آپ نے ۲۰۴۹ء میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام :۔ کلام آپ کا بے نظیر ہے۔ کہیں سے اٹھا کر پڑھ لیجئے۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔

قیوم نظر

نام مولوی عبدالقیوم بٹ تھا۔ لیکن بخوفِ طوالت اپنے آپ کو قیوم نظر کہتے تھے۔ غزل سے نظم اور نظم سے گیت کی طرف رجوع کرنے کے بعد مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ میرا جی سے عقیدت اور ان کے سوا ہر شاعر سے وحشت۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں خاص کمال حاصل تھا بشرطیکہ نشانۂ مشق کوئی شاعر ہو۔ اپنے نظر بٹو آپ تھے۔

لطیفہ :۔ ایک محفل میں آپ نے یوسف ظفر کے ایک شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ کاش آپ اتنے بیوقوف ہوتے کہ میرے تمام گیت لے لیتے اور مجھے یہ شعر دے دیتے۔ یوسف ظفر نے برگشتہ خاطر ہو کر جواب دیا "معاف کیجئے۔ مجھے یہ خسارے کا سودا منظور نہیں۔"

حفیظ ہوشیارپوری

نام حفیظ لیکن ہوشیارپوری کے لقب سے مشہور ہوئے۔ وضع قطع میں حفیظ جالندھری سے خطرناک مشابہت رکھتے تھے۔ ہزاروں غزلیں کہیں

روایت :۔ ان کے پاس غزل کا ایک سانچہ تھا جس میں الفاظ و تراکیب ڈھال کر غزل نکال لیا کرتے تھے۔ دواوین کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ بیشتر کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔ تقریباً ہر غزل میں وہی بات کہتے تھے جو اس سے پہلی غزل میں کہہ چکے تھے تاکہ ذہن نشین ہو جائے۔

لطیفہ :۔ ایک ریڈیو مشاعرے میں ایک گستاخ چھوکرے نے آپ کی غزل پر اعتراض کیا کہ اشعار بے جان ہیں۔ آپ نے فرمایا "میں شاعر ہوں۔ ابن مریم نہیں کہ مُردہ اشعار میں روح پھونک سکوں" معترض دم بخود ہو گیا۔

عبدالمجید بھٹی

نہایت بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں مغز کے علاوہ سبھی کچھ ہوتا تھا۔ پہلے بچوں کے لئے گیت لکھتے رہے۔ بعد میں نوجوانوں کے لئے معمے لکھنے لگے جو انعامی نہیں ہوتے تھے۔ زبان میں متروک الفاظ کو ترجیح دیتے تھے۔ بقول سالک صاحب اردو زبان کو ترقی سے دو سو برس پیچھے لے جانا آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے

کلامِ بلاغت نظام پر حضرت حفیظ جالندھری نے "پیش لفظ" لکھا جو آپ کے کلام کی ضخامت سے کم از کم تگنا ہے۔

نمونۂ کلام:- آپ کا کلام پڑھنے کے بجائے الجبرا کی کوئی بھی کتاب پڑھ لیجئے۔ (انتخاب)

"ہادی"
داغ دہلوی کا ایک خط

داغ دہلوی نے ایک خط میں لکھا:۔

میری پیدائش خاص شہر دہلی چاندنی چوک کی ہے جو دتی کا بھی دل ہے۔ تاریخ ولادت دوازدہم ماہ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء ہے۔ نام نواب مرزا خان خطاب عطائے شاہِ دہلی ہے۔ والد کا نام نواب شمس الدین احمد خاں انار اللہ برہانہ ہے۔ میرے خاندانِ آبائی کا سلسلہ حضرت خواجہ احمد گیسو دراز علیہ الرحمۃ تک پہنچتا ہے۔ جب میری تسمیہ خوانی ہوئی تو مولوی آخوند یار محمد ولایتی سے قرآن شریف پڑھا اور چھ برس کی عمر میں کلام مجید ختم کیا۔ جب استاد کا انتقال ہو گیا تو مولوی میر احمد حسین شکیب اور مولوی فخر الدین اور مولوی غیاث الدین صاحبِ غیاث اللغات اور مولوی سعید الدین سے فارسی کی تکمیل کی اور خطِ نستعلیق مشق مرزا عباد اللہ بیگ خوشنویس شاگرد رشید محمد امیر پنجہ کش سے حاصل کی۔ بلکہ گاہ گاہ خود میر صاحب مغفور سے بھی اصلاح لیتا رہا۔ بعدہٗ فن سپہ گری کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ بندوق لگانا، تلوار کا لگانا، مرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ ولی عہد بہادر گورگانی مرحوم سے حاصل کیا۔ گھوڑے کی سواری سبحان خان بندو خان چابک سوارانِ شاہی سے حاصل کی۔ فن بکینتی بھی مرزا عباد اللہ بیگ سے حاصل کیا اور فنِ پھینکیتی علی مرزا اسنگی بیگ سے حاصل کیا۔ بارہ برس کے سن تک یہ سب ہنر حاصل ہو گئے تھے۔ بعدہٗ شعر و سخن کی طرف طبیعت راغب ہوئی۔ خاقانیِ ہند سلطان الشعراء شیخ ابراہیم ذوق نور اللہ مرقدہ کا شاگرد ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں استاد ذوق کا انتقال ہوا۔ ان کے سامنے ایک دیوان مکمل ہو گیا تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی میں تلف ہوا۔ کچھ کچھ شعر اس تصنیف کے جو یاد تھے۔ وہ جستہ جستہ گلزارِ داغ میں لکھے گئے۔ ورنہ گلزارِ داغ، آفتابِ داغ، فریادِ داغ یہ سب کتابیں بمقام رامپور تصنیف کی گئیں۔ بعد غدر کے نواب فردوس مکان محمد یوسف علی خان بہادر والئی رامپور نے مجھے بتوقیر بلایا اور نہایت مہمان نوازی فرمائی۔ من بعد خلد آشیاں نواب کلب علی خان بہادر نے اپنے پاس ملازم اس طرح رکھا کہ حسود ہو گیا۔ چونکہ نواب خلد آشیاں کا مولد دلی تھا۔ بچپن سے ان سے ملاقات تھی۔ اکثر بھائی کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے اور کام کارخانوں کا اور عہدہ مصاحبت کا میرے متعلق تھا۔ جب نواب کلب علی خان بہادر نے رحلت کی تو میں رامپور نہ تھا حکیم محمود خان کے لینے کو دلی آیا تھا۔ ان کے بعد رئیس و ریاست کا رنگ نواب محمد مشتاق علی خان بہادر کے زمانے میں پلٹا۔ چونکہ میرے پاس کارخانوں کا کام تھا اور علاوہ حساب و کتاب کے لاکھوں روپیہ کی تحویل تھی۔ لہٰذا سب حساب و تحویل چار مہینے میں سمجھا کر بحالت بیماری رخصت لے کر دلی آیا اور پھر بسببِ مخالفت طریقۂ ریاست و ناموافقت آب و ہوا مستعفی ہو گیا۔ پھر دکن کا ارادہ کیا۔ چونکہ اقبال یاور تھا حیدرآباد پہنچ کر موردِ الطافِ سلطانِ دکن دام اقبالہٗ و خلد اللہ ملکہ ایسا ہوا کہ یومِ ورودِ حیدرآباد سے چار برس کی تنخواہ چڑھی ہوئی ملی اور شرفِ استادیٔ سلطانِ دکن حاصل کیا۔ دکن میں پہنچ کر تیسرا دیوان موسوم بہ مہتاب داغ مرتب ہوا اور چھپ کر تیار ہوا۔ فقط

راقم

داغ دہلوی۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۶ء

"معارف"

ہندوستان کے مسلمان

شاہ معین الدین احمد

ہندوستان کے مسلمان جس نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ وہ ان کے لئے تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کو بڑے بڑے مخالف حالات کا سامنا ہو چکا ہے۔ لیکن ان میں اور موجودہ حالات میں یہ فرق ہے کہ وہ عارضی تھے اور مسلمانوں کو بھی برابر کی قوت آزمائی کا موقع تھا لیکن موجودہ صورت میں کوئی جنگ و تصادم بھی نہیں ہے بلکہ زبانوں پر اتحاد و اتفاق کا نعرہ ہے۔ کہنے کو غیر مذہبی حکومت ہے لیکن واقعہ کے لحاظ سے دونوں میں طاقت اور حقوق کی مساوات کا کوئی سوال نہیں۔ قانون سازی اور طاقت اکثریت کے ہاتھ میں ہے جس پر کوئی پابندی نہیں اور اصل چیز قانون نہیں بلکہ اس پر عمل ہے اور اس کا جو حال ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ ہندوستان سے اسلامی عہد کے تمدن کو مٹانے اور پرانی ہندو تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش جاری ہے۔ مسلمانوں سے ایک زبان اور ایک کلچر کے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، اردو کو قانونی حیثیت سے ختم کر دیا گیا ہے، یہ اور بات ہے کہ اپنی سخت جانی سے زندہ رہ جائے، ہر شعبہ میں ایسی شکلیں اختیار کی جا رہی ہیں کہ مسلمان خود بخود جگہ خالی کرنے پر مجبور اور ان پر آئندہ ترقی کی راہیں بند ہو جائیں۔ یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ ہو مگر واقعہ ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

ان حالات میں ایک کانگریس سے انصاف کی توقع ہو سکتی تھی لیکن اب وہ بھی عملاً فرقہ وارانہ ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔ کچھ اشخاص ضرور ایسے ہیں جو کانگریس کے اصولوں پر قائم ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ انصاف چاہتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم اور ان کی آواز بالکل بے اثر ہے بلکہ اب تو مسلمانوں کی حمایت بھی جرم ہو گئی ہے۔ مسلمانوں کے بہادر لیڈروں نے پاکستان کی راہ لی۔ قوم پرور مسلمانوں کی کوئی شنوائی اور حیثیت باقی نہیں ہے۔ ان میں سے جو لوگ وزارت کی کرسیوں، حکومت کے عہدوں اور اسمبلیوں کے ایوانوں میں ہیں۔ ان کو اب صرف اپنے عہدوں کے تحفظ کی فکر ہے اور اس کی لذت و حلاوت کے لئے وہ ہر تلخ سے تلخ گھونٹ پی جاتے ہیں اور ان کی پیشانی پر شکن تک نہیں آتی، کچھ لوگ آئندہ کی امیدوں میں لو لگائے بیٹھے ہیں اور جن کو ان کی وفاداری کا صلہ ملتا جاتا ہے۔ وہ میدان چھوڑتے جاتے ہیں۔ جو مرد قلندر ان پھندوں سے آزاد ہیں۔ انہی سے آئندہ توقعات وابستہ ہیں۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب ان کا شمار معتوبین کے زمرہ میں ہو جائے گا۔

انسانوں کو انسانی حقوق سے محروم کرنے میں ہندوستان کو ہمیشہ سے کمال حاصل رہا ہے جس کی مثال اچھوت ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت بھی ان سے کم نہیں ہے۔ بلکہ اچھوتوں کی اصلاح و ترقی کی کوشش ہو رہی ہے۔ ان کو حقوق مل رہے ہیں اور مسلمانوں سے ان کے پرانے حقوق بھی چھینے جا رہے ہیں، جس کا ثبوت کونسلوں اور اسمبلیوں میں ان کی نشستوں کے تحفظ کا خاتمہ ہے۔ اس لئے اس کا خطرہ ہے کہ اچھوتوں کی اصلاح و ترقی سے ہندوستان کے پرانے نظام میں جو خلا پیدا ہوگا۔ وہ مسلمانوں سے پر کیا جائے۔ تاہم ان حالات سے ان کو مایوس اور خوفزدہ نہ ہونا چاہئے، ناامیدی اور غیر اللہ کا خوف مومن کی شان کے خلاف ہے، البتہ اس نکبت و ادبار کے اسباب کی تلاش اور ان کے ازالہ کی ضرور تدبیر ضروری ہے۔ ورنہ اگر یہ احساس بھی جاتا رہا تو پھر ان کی تباہی میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہ جائے گا۔

اگر مسلمانوں میں زندہ رہنے کی قوت باقی ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کو ختم نہیں کر سکتی۔ قوموں کی موت و زیست اور ترقی و تنزل کا مدار ان کی کمیت یعنی عددی قلت و کثرت پر نہیں بلکہ ان کی اندرونی

[redacted]

کیفیت یہ ہے۔ جو ہر فولاد کو پتھر کی چٹانیں بھی نہیں توڑ سکتیں اور خاک کے ڈھیر کو ہوا کا جھونکا بھی اڑا سکتا ہے۔ (اقتباس)

"ماہِ نو"
قائد اعظم اور ہندو مسلم مسئلہ

ایم۔ اے حسین

کیمبرج میں انڈین مجلس کے علاوہ ایک دوسری جماعت کیمبرج مسلم ایسوسی ایشن بھی۔ لیکن یہ ایسوسی ایشن کچھ عرصہ سے خاموش سی تھی جس زمانہ کا حال میں لکھ رہا ہوں یعنی ۱۹۳۱ء میں اسے دوبارہ زندہ کیا گیا۔ یہ چیز ہمارے ہندو اور نیشنلسٹ خیال رکھنے والے مسلمان دوستوں کو بہت ناگوار ہوئی۔ اپنے احیا کے بعد ایسوسی ایشن نے سب سے پہلے جلسہ میں مسٹر ایم اے جناح کو دعوت دی اور انہوں نے ہندوستان کے مسئلہ پر تقریر کی۔ دعوت نامے سارے ہندوستانی طالب علموں اور اتنے انگریز دوستوں کے نام بھیجے گئے تھے جتنے آسانی سے ہال میں آسکتے تھے۔ مسٹر جے اے جیم (جو اس وقت قاہرہ میں پاکستانی سفارت کے مشیر ہیں) ایسوسی ایشن کے صدر اور میرے دوست ایم سے کے قزلباش (اب نواب سر مظفر علی خاں قزلباش) سیکرٹری تھے۔

جب مسٹر جناح سے جلسہ میں تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے فوراً قبول کر لی اور جلسہ ہفتہ کے دن ۴ رجون ۱۹۳۱ء کو ہوا۔ جلسہ میں مسٹر جناح اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ فرانس کی بنی ہوئی مشہور قیمتی گاڑی ہسپانو سوئزا میں بیٹھ کر تشریف لائے۔ جن لوگوں نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا وہ ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی خوش پوشی نے انہیں فوراً ہی نوجوان خوش باش طالب علموں کا محبوب بنا دیا۔ طالب علموں کے علاوہ جو علم دوست حضرات جلسہ میں شریک ہوئے ان کی حیرت کا وقت بعد میں آنے والا تھا۔ مسٹر جناح کی تقریر کوئی گھنٹہ بھر جاری رہی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے زبردست حامی تھے اور حالانکہ ان کے "۱۴ مطالبات" نے فرقہ پرست ہندوؤں کے دل میں ان کی طرف سے ایک کد پیدا کر دی تھی۔ لیکن ان میں اکثر سچے دل سے یہی سمجھتے تھے۔ کہ ہندو مسلم اتحاد اگر کوئی حاصل کر سکتا ہے تو صرف مسٹر جناح۔ جو چیز ہم سب کے لئے بے حد بصیرت افروز تھی۔ وہ ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق ان کا گہرا تجزیہ تھا اور اب جبکہ میں اس دن کا تصور کرتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اب سے اتنے برس پہلے کی تقریر میں بھی بعد میں آنے والے واقعات کی ایک جھلک موجود تھی اور اس طویل مدت کے گزر جانے کے باوجود اب تک میرے ذہن میں اس تقریر کے نکات تازہ ہیں۔ مثلاً اس بارے میں کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک واضح کلچر اور طرزِ زندگی ہے جو انہیں کے لئے مخصوص اور انہیں بیحد محبوب ہے اور اس لئے ان کی خواہش ہے کہ ہر آئین میں ان کے اس تمدن اور معاشرت کا پورا تحفظ ہو۔ ان کے قوی دلائل اب بھی روز روشن کی طرح میرے سامنے ہیں۔ حالانکہ اس وقت ان کے ذہن میں یہ بات نہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے کلچر کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس بات پر پورا زور دیا تھا کہ اکثریت رکھنے والی سب جماعتیں شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے کلچر کو اقلیتوں کے کلچر پر غالب دیکھنا چاہتی ہیں۔ یہ خطرہ ایسا ہے جو ساری دنیا کے ملکوں کو یکساں طور پر لاحق ہے اور اسی لئے ہر آئین میں سیاسی سماجی اور مذہبی معاملات میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ایک لازمی چیز ہے۔ اس موقع پر انہوں نے کناڈا کی مثال دی، جہاں دو مختلف قوموں کے لوگ ساتھ ساتھ آباد ہیں۔ ایک قوم برطانوی نسل سے ہے اور دوسری فرانسیسی ان دونوں کے کلچر آئینی تحفظ کی بنا پر بغیر باہمی تنازع کے وہاں پھل پھول رہے ہیں۔ انہوں نے اس موقع پر یہ خواہش ظاہر کی کہ کاش ہندوستان کے ہندو بھی کناڈا سے سبق حاصل کریں اور یہ بات تسلیم کر لیں کہ اقلیتوں کو آئینی تحفظات کی ضرورت ہوتی ہے اور ان مسلمانوں کو جو اس طرح کے تحفظات کے طالب ہیں۔ فرقہ پرست اور قومیت کے دشمن کہنا چھوڑ دیں

دوسری اہم بات جو جناح صاحب نے اس موقع پر کہی یہ تھی کہ مسلمانوں کے جائز مطالبات بھی اکثریت رکھنے والی قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے بے اعتباری پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ رویہ مناسب نہیں۔ اس موقع پر انہوں نے مصر کے زاغلول پاشا کے ایک واقعہ کا ذکر کیا جس میں زاغلول پاشا نے اپنے ایک صحیح عمل سے قبطی اور مصری مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ واقعہ یوں تھا کہ زاغلول پاشا قبطی لیڈروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اپنے مطالبات ایک کاغذ پر لکھ دو۔ قبطیوں نے اپنے مطالبات لکھ دیئے۔ زاغلول نے ان مطالبات کو پڑھے بغیر انہیں لوگوں کے سامنے اس کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ اس بات نے قبطیوں پر بڑا اثر کیا اور اعتبار اور بھروسے کے اس معمولی سے عمل نے مصر کی اس موجودہ قوم کو ایک متحد قوم بنا دیا۔ اس کے برخلاف ہندو ہمیشہ مسلمانوں سے کوئی سودا کرنے اور سودے پر جھگڑنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ مسئلہ کو حل کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر بھروسا کریں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد گاندھی جی نے ایک اعلان میں یہ کہا تھا کہ "میں مسلمانوں کو ایک سودیشی قلم اور سودیشی کاغذ دوں گا کہ وہ اس کاغذ پر اپنے مطالبات لکھ دیں اور کانگریس کی طرف سے میں ان مطالبات کو جوں کا توں قبول کروں گا" یہ وعدہ محض لفظی وعدہ رہا اور دوسری گول میز کانفرنس کے بعد کانگریس نے مسلمانوں کے ان مطالبات کے قبول کرنے کی طرف کوئی قدم نہ اٹھایا۔

حالانکہ اس جلسہ میں جناح صاحب نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور مسلمانوں کے وفد کے طرزِ عمل کی ترجمانی بڑی قابلیت اور کامیابی سے کی تھی۔ لیکن ان کی پوری تقریر قومیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ انہوں نے مشترک انتخاب کی حمایت کی اور اس بات پر زور دیا کہ ہم سب کو انگریزوں کے خلاف متحد ہونا چاہیے۔ لیکن انہوں نے اس موقع پر اس چیز کی وضاحت بھی کر دی کہ چونکہ عام طور پر مسلمان مشترک انتخاب کے حامی نہیں ہیں۔ اس لئے آئین میں جداگانہ انتخابات کا ہونا لازمی ہے جناح صاحب نے پورے مسئلہ کو اس قدر وضاحت اور منطقی انداز سے پیش کیا کہ کیمبرج کے وہ نوجوان بھی جنہیں عموماً اپنی قابلیت کا پندار ہوتا ہے۔ ان سے کوئی اُلٹا سیدھا سوال نہ کر سکے۔ اس طرح جناح صاحب کی ذات کی بدولت کیمبرج مسلم ایسوسی ایشن کا پہلا جلسہ بے حد کامیاب رہا۔ اس بات سے ہمارے بعض ہندو دوست کچھ خوش نہ ہوئے اور ہم لوگوں کے تعلقات (بظاہر بغیر کسی معقول وجہ کے) کچھ دن تک کشیدہ رہے۔ اگلے دن (یعنی ۷ر جون ۱۹۳۱ء) کو کچھ مسلمان طالب علموں کی ملاقات سینٹ جان کالج میں چائے پر ہوئی اور یہاں ذرا زیادہ بے تکلفی سے باتیں ہوئیں۔ اس ملاقات میں جناح صاحب نے ہندوؤں کے ارادوں کے متعلق زیادہ یقین کے ساتھ شبہے ظاہر کئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس دن جناح صاحب نے گاندھی جی کا ذکر برابر "مہاتما جی" کہہ کر کیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ "آخر تو ہندو ہیں اور اس لئے ان کے لئے ہندوؤں کا مفاد باقی ہر مفاد سے بڑھ کر ہے"۔ اس دن کی گفتگو سے یہ بات صاف طور پر ظاہر تھی کہ جناح صاحب کے دل میں گاندھی جی کی بڑی عزت تھی۔ اپنے متعلق جناح صاحب نے فرمایا کہ جب سے میں نے مسلمانوں کے لئے چودہ مطالبات پیش کئے ہیں ہندوؤں کو مجھ پر بھروسا نہیں رہا۔ اس پر ہم میں سے کسی نے کہا "لیکن مسلمان رہنماؤں میں صرف آپ ہی ایسے ہیں جن کی طرف سے ہندوؤں کے دل میں سب سے کم بے اعتباری ہے اور اس لئے شاید آپ ہی کی ذات ہے جو ہندوؤں سے مسلمانوں کے مطالبات منوا سکتی ہے۔ (انتخاب)

"سویرا"

پاگلو!

ہی ہی ہا ہا!

ہو ہو ہو ہو

[redacted]

لپاڈگی
کھینچاتانی
دھینگامشتی
یہ سب کیا ہے؟

پاگل خانہ
سب کا گھر ہے
سب کا دامن
اپنا سمجھو
شور نہ ڈالو
میز نہ توڑو
دیواروں کا
میل اُتارو

اس میں رہ کر
جینا سیکھو
اس سے بچ کر
بھاگ سکو گے؟
بھاگ بھی جاؤ
کہاں رہو گے؟
اس کے علاوہ
پاگل خانہ
کوئی نہیں ہے

ظہیر کاشمیری

تبرکاتِ مخزن

بگل کی صدا

(ترجمۂ اشعار لارڈ ٹنی سن)

منقول از مخزن بابت ماہ مارچ ۱۹۰۳ء

اک نور ہے برستا قصروں کے بام و در پر
تقسیم کر رہا ہے خلعت مہِ منور
ہے فرش چاندنی کا تالاب میں سراسر
ہیں آبشار رقصاں سازِ طرب بجا کر
ہاں اے بگل بجے جا کام اپنا تو کئے جا
گو یہ صدا ہے فانی لیکن صدا دئے جا

یارو سنو تو ہے یہ آواز کیسی آتی
پہلے قریب تھی اب ہے دور ہوتی جاتی
شہنا یہ دیکھو دیکھو کیا گیت ہے سناتی
شیریں صدائیں جس کی از بس ہیں دل لبھاتی
ہاں اے بگل بجے جا کام اپنا تو کئے جا
گو یہ صدا ہے فانی لیکن صدا دئے جا

یہ عشق کے ترانے ہو جائیں گے فنا سب
ان نغموں کے ہیں دشمن یہ ارض اور سما سب
نالوں کو پر ہمارے سمجھے ہیں جانفزا سب
بلتے جو ہیں دلوں میں بستے ہیں دلربا سب
ہاں اے بگل بجے جا کام اپنا تو کئے جا
گو یہ صدا ہے فانی لیکن صدا دئے جا

ضامن (کنتوری)

ایڈیٹر کے نام

بیدل

آپ مضمون سے معلوم ہوتے ہیں کہ میں نے بیدل کے متعلق اپنا مضمون آپ کو بھیجا اور میں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے ہمایوں کے بعد پھر مخزن کے ذریعہ سے ملی ادب کی خدمت شروع کر دی ہے، اور گمنام اور گوشہ نشین لوگوں کو بھی سے

برآور ہر چہ اندر سینہ داری مرغوبے نالۂ آہے فغانے

سے روشناس کرانے کی بات کہنے کا موقع دیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میری ادبی دلچسپیاں آپ کی مرہون منت ہیں۔ آپ نے ہمایوں کے ذریعے میری ہمت افزائی کی اور میں ان مجلسوں میں یہاں بیٹھے بیٹھے پہنچنے کے خواب دیکھنے لگ گیا۔ اس کے لئے اپنے اچھے لوگوں کے لئے کیں پریشان کن ثابت ہوتا ہے۔ آپ ہی کی وجہ سے شعر و ادب کا شوق شاید میرے دل میں بھی کچھ چیزیں اتفاق سے موجود ہیں۔ آپ چلے گئے تو دو چار برس ہو گئے۔ ہمایوں مخزن لے اور حسب دیکھ نے پھر طبیعت میں ولولے پیدا کئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ احساسات، جذبات اور خیالات کے جس دور سے میں اب اپنی عمر اور اپنے مطالعے کی وجہ سے گزر رہا ہوں ممکن ہے یہ آپ کی ہمت افزائی کی بدولت نتیجہ خیز ثابت ہو۔

بیدل کے سلسلے میں میری خط و کتابت مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا غلام رسول مہر، سید محمد عبداللہ صاحب اور آقا ۔۔۔ سے کوئی نہ کوئی سے رہی ہے۔ بیدل کی تقریباً تمام تصنیفات میرے پاس موجود ہیں۔ اور ان پر میں نے بے حد خرچ کیا ہے۔ میں باقاعدہ ریسرچ سکالر کی حیثیت سے کام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میری بے زری مجھے اجازت نہیں دیتی کہ لاہور میں قیام کر سکوں۔ اگر یہ ہو جاتا تو مجھے امید تھی کہ علامہ اقبال مرحوم کا بیدل کے متعلق خواب اس بے بضاعت انسان کی بدولت شرمندۂ تعبیر ہو جاتا اور آپ سب بزرگ بھی بیدل کے سلسلے میں اپنی آرزوؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچتے دیکھ لیتے۔ خیر یہ بات میرے بس کی نہیں لیکن جہاں تک میری کوششوں کا تعلق ہے انشاء اللہ زندگی بھر بیدل کو دنیا سے روشناس کرانے کے لئے صرف کرتا رہوں گا۔ وبیدہ التوفیق۔ میں نے جو مضمون آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ وہ ضروری نہیں کہ اپنے تمام متعلقات پر حاوی ہو۔ یہ اس کی آخری مکمل اور مفصل صورت بھی نہیں۔ میں آپ کی خدمت میں اسی لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ میری رہنمائی بھی فرمائیں گے اور ہمت افزائی بھی۔

۲۰ مئی ۱۹۴۹ء عبدالغنی

دیارِ دوست

قبلہ شیخ عبدالقادر صاحب کی کوئی چیز بہت دنوں سے دیکھنے میں نہیں آئی۔ آج کل ان کی صحت کیسی ہے۔ ذرا تفصیل سے لکھئے۔

آخری صفحات میں انتخاب آپ بڑی محنت سے کرتے ہیں۔ اس انتخاب غزل یہاں اکثر دوستوں کی زبانی سنا ہے۔ مجھے تو یہ حصہ بہت ہی پسند آیا ہے۔

پچھلے دنوں یہاں یوم غالب کے سلسلے میں ایک مشاعرہ نشر ہوا معمولی تھا سا مشاعرہ۔ غالباً ریڈیو والوں کے سامنے کوئی معیار نہ تھا۔ دو مصرع دیئے ریڈیو والوں نے۔

سحر ہونے تک اور نظر نہیں آتی

میں نے عرض ہونے تک میں غزل کہی معمولی تھی ورنہ آپ کو ضرور

[redacted]

بھیجنا خاصی مشکل زمین ثابت ہوئی (میرے لئے کم از کم) ایک شعر جسے لطیفہ کہئے شاید زیادہ موزوں ہو، عام طور پر پسند کیا گیا ہے

طرحِ غالب میں تمنّا ہے غزل کہنے کی
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اردو کی محفلوں کا معیار اب یہاں بہت پست ہو گیا ہے اچھا شعر بہت مدت کے بعد سننے میں آتا ہے۔ یہ اکثر خوش نصیب جن میں سے ایک میں بھی ہوں رسائل کے مطالعہ سے یہ کمی پوری کر لیتے ہیں اور رسائل تقریباً یہاں سب آتے ہیں دونوں ملکوں کے۔

میرا مجموعۂ کلام اس وقت پریس میں ہے "بیکراں" نام ہے مجموعے کا اس کی ایک پروف کاپی آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ والسلام۔

دہلی ۱۱ جولائی ۱۹۴۹ء جگن ناتھ آزاد

(۲)

مخزن کا تازہ شمارہ موصول ہوا اور اس میں اپنے متعلق مضمون دیکھا یہ سراسر آپ کی محبت ہے کہ مجھے ان پیار بھرے لفظوں میں یاد فرمایا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کے مشوروں کو آج سے دس سال پہلے میں جس طرح اپنے لئے ضروری سمجھتا تھا اب بھی اسی طرح سمجھتا ہوں یہ مضمون والد صاحب (حضرت محروم مدظلہ) نے بھی بڑے شوق سے پڑھا ہے اور اسے پسند کیا ہے "بیکراں" اکتوبر کے شروع میں چھپ جائے گی۔ اب اسے مکمل صورت میں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ آج کل مجھے لکھنے اور پڑھنے کا کافی وقت مل رہا ہے۔ نومبر میں دوسرا مجموعۂ کلام "پانچ تال" مرتب کر لوں گا۔

ان دنوں "آج کل" کی ادارت میرے سپرد ہے کوئی دو ماہ کے لئے

دہلی، ۱۱ ستمبر ۱۹۴۹ء جگن ناتھ آزاد

میرے عزیز دوست

بڑی خوشی اس کی ہوئی کہ آپ اچھے ہیں۔ سرزمین پنجاب کو پاکستان کی پیدائش کے درد نسبتہً زیادہ سہنے پڑے۔ اتنی ہی خوشی یہ جان کر ہوئی کہ مخزن آپ کی ادارت میں پھر سے نکل رہا ہے۔ آپ کی سلامتی ذوق سے قوی توقع ہے کہ رسالہ زبان کی خدمت اپنے سابقہ ادوار سے بھی زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے گا۔ اور مقابلتہً بہت کامیاب رہے گا۔ اس توقع کو آپ میری دلی تمنا بھی باور فرما سکتے ہیں۔

آپ کے جاتے ہی جناب ایڈیٹر صاحب نے ہمایوں میں میرے مضمون کی اشاعت ختم کر دی۔ اس سلسلے میں میں نے ان سے کچھ مراسلت بھی کی۔ ان کا خیال تھا کہ مضمون مذہبی نقطۂ نظر سے دلآزار قسم کا ہے۔ میں نے اس الزام کے ماننے سے انکار کیا۔ ہمایوں کے ایک بڑے ادیب فلک پیما صاحب نے میری تائید کی۔ مگر افسوس کہ ایڈیٹر صاحب مطمئن نہیں ہوئے اس کے بعد میرے لئے ہمایوں میں کچھ لکھنا دشوار تھا۔ پھر بھی ہم بالکل دوستوں کی طرح جدا ہوئے۔

اصلاً میرے تمام مضامین آپ کی تحریک کا نتیجہ تھے۔ اور جب وہ قوتِ محرکہ باقی نہ رہی تو میں نے کچھ زیادہ پروا نہیں کی۔ اب ساری توجہ غمِ روزگار نے اپنی طرف مبذول کر لی۔ بلاشبہ بعض مضامین اس کے بعد بھی بعض رسائل میں چھپے مگر یہ سلسلہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ آپ نے پھر دنیائے علم و ادب کی طرف بلایا ہے فضا آج کل سنجیدہ غور و فکر کے لئے موزوں نہیں پاتا ہم آپ کی خواہش میرے لئے بمنزلۂ حکم کے ہے ایک مضمون علیحدہ بھیج رہا ہوں "لفظِ فلسفہ کی تاریخ"

حیدرآباد دکن ۱۰ جون ۱۹۴۹ء مرزا محبوب بیگ

"مخزن"

مخزن کا پہلا دور تو وہ تھا جس کا تذکرہ "پڑھا کرتا تھا"۔ دوسرا دور وہ تھا جس کا تذکرہ "بزرگوں سے سنا کرتا تھا" اور خوش قسمتی سے یہ تیسرا دور ایسا ہے جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں مجھ طفلِ مکتب میں اتنی جرأت کہاں کہ آپ کے مخزن کا کوئی تنقید کر سکوں ہاں جب رسالہ پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا "نگاہ نظارہ طلب" اسی چیز کی تلاش میں تھی۔

کیفی بنارسی ۲۵ اگست ۱۹۴۹ء

مطبوعات

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنی ضروری ہیں)

نادراتِ غالب:- دوستوں کو خط لکھنا غالب کا دل پسند مشغلہ تھا اور وہ اپنے خطوں میں عموماً نجی زندگی کے حالات بھی خاصی تفصیل سے لکھتے رہتے تھے۔ خطوں میں مرزا کی زندگی اس وضاحت سے بے نقاب ہوتی ہے۔ کہ ایک بزرگ نے چند سال قبل ان کی مدد سے غالب کی پوری خود نوشتہ سوانح عمری بھی مرتب کر لی تھی۔ مرزا کے کچھ خطوط تو پہلے سے مرتب ہو چکے تھے لیکن تقریباً تیس سال گزرے "نسخۂ حمیدیہ" میں ڈاکٹر بجنوری کے دیباچے کی اشاعت کے بعد جب نئے نقادوں نے غالب سے غیر معمولی دلچسپی لینی شروع کی تو ان کے اور خطوں کی تلاش بھی ہوئی۔ چنانچہ غالب کے پرستاروں نے جگہ جگہ سے ان کے نئے خط ڈھونڈ نکالے اور اب تک خطوطِ غالب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "نادراتِ غالب" بھی اسی سلسلے کی تازہ ترین کڑی ہے جس میں غالب کے چوہتر نئے خط چھپے ہیں۔ یہ خطوط ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۹ء تک کے زمانے میں غالب نے اپنے دوست اور شاگرد منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھے اور انہیں شائع کرنے کا شرف آفاق حسین صاحب آفاق کو حاصل ہوا ہے۔ جنہیں یہ نوادر اپنے نانا اور غالب کے خاص ارادت کیش میرن صاحب سے ورثے میں ہاتھ لگے ہیں۔ ان خطوطِ غالب کی زندگی کے مذکورہ بالا دہ سالہ دور کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے اور پرستارانِ غالب کے لئے یہ مجموعۂ مکتوبات ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ منشی نبی بخش حقیر کون بزرگ تھے اور غالب نے ان کے نام اس قدر مخلصانہ خط کیوں لکھے۔ اس سوال کا جواب غالب سے بہتر کون دے سکتا ہے۔ اپنے دوست اور شاگرد مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:-

"خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایک شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی، دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی نبی بخش حقیر کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں، مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا، یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے۔ آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوعِ انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہمِ سخن اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کو اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا ایسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت پر دنیا سے قانع ہوں۔"

غالب کے جن نقادوں کی نظر سے یہ خط گزرا ہے، انہوں نے حقیر کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی بہت کوشش کی لیکن "نادراتِ غالب" کی اشاعت سے پہلے ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکا۔ ان خطوط کے مطالعے سے غالب کے علاوہ حقیر کے حالات پر بھی بہت کچھ مزید روشنی پڑی ہے۔

نادراتِ غالب کی اشاعت سے ایک اور فائدہ یہ ہوا ہے کہ غالب کی بعض غزلوں کی تاریخیں زیادہ یقینی طور سے معین ہو گئی ہیں۔ غالب اپنی

[redacted]

لکھی ہوئی تازہ غزلیں بھی حقیر کے نام بھیجتے رہتے تھے۔ ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں جس کی تاریخ تحریر اپریل تا جولائی معیّن ہوتی ہے، مرزا لکھتے ہیں:۔

"آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا تم کو بھی لکھتا ہوں۔ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچ جائے تو اس کی صورت یہی ہوگی یا کچھ اور شکل؟"

اس کے بعد یہ پوری غزل لکھی ہے:۔

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے　　اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

اسی خط میں یہ غزل بھی لکھی ہے:۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے　　کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

مئی یا جون ۱۸۵۲ء کے خط میں اپنی ایک اور تازہ غزل غالب نے حقیر کو بھیجی اور لکھا:۔

"بھائی خدا کے واسطے داد دینا۔ اگر یہ ریختہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔ غالب یہاں اس غزل کا ذکر کر رہے ہیں:۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　صورتیں کیا خاک میں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ان خطوں سے جہاں غالب کی بعض غزلوں کے باب میں خود غالب کی رائے معلوم ہو جاتی ہے، وہاں ایک اور دلچسپ انکشاف بعض شعروں کی ابتدائی اور بعد کی اصلاح یا نئی صورت کے متعلق بھی ہوتا ہے۔ غالب کے بہت سے شعروں کی ابتدائی صورت "نسخۂ حمیدیہ" میں بھی مل جاتی ہے۔ لیکن بعض اشعار کی ابتدائی صورت وہاں بھی نہیں ملتی۔ مثلاً اسی غزل کا مشہور شعر ہے:۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں　　تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

لیکن محوّلہ بالا خط میں غالب نے پہلا مصرع یوں لکھا ہے:۔

نیند اس کی ہے نصیب اس کے ہیں، راتیں اس کی ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ "دماغ اس کا ہے" بعد کی اصلاح ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ اس ٹکڑے کے بغیر یہ شعر مقبولیت کے موجودہ مرتبے سے بہت دور رہتا۔ غالب کی ایک اور مشہور غزل کے دو شعر ہیں:۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو، نگار تو ہے　　روانیٔ روشِ و مستیٔ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے　　طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

مگر ان کے دونوں پہلے مصرعوں کو اپریل ۱۸۵۳ء کے خط میں غالب نے یوں لکھا ہے:۔

نہ ہو نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے　(اور)　نہ ہو بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے

اسی طرح نادراتِ غالب سے متعدد اور اشعار کی ابتدائی صورت اور بعد کی مناسب تبدیلی کے بارے میں بھی بہت دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ یہاں قدرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان اصلاحوں میں منشی نبی بخش کے مشورے کا بھی کچھ دخل ہے۔ راقم کی رائے میں نہیں۔ ہرچند غالب نے ان

کی سخن فہمی و سخن سنجی کی بے حد تعریف کی ہے۔ بلکہ ایک خط میں انہیں اپنی رباعیاں بھیج کر لکھا ہے کہ "انہیں بنظرِ اصلاح دیکھنا" لیکن اس کے باوجود ان خطوں سے ان کے کلام کے جو نمونے ملتے ہیں وہ کچھ بہت غیر معمولی نہیں۔ حقیر کے ایک شعر کی غالب نے یوں داد دی ہے۔

"بھائی صاحب یہ کس کا شعر ہے ؎

بڑھ گئی تو قیر میری اتفاعِ وصل سے — اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مجھ کو اس کے دربان دیکھ کر

ہاں اور کس کا ہوگا — یا میرا یا میرے بھائی کا۔ واللہ کیا شعر ہے۔ ایک خاص روش ہے۔ ہر کوئی اس کو نہیں جانتا"

تکلف اور تعقید کے باوجود خاصا شعر ہے لیکن غالب کی مبالغہ آمیز تعریف کچھ بے محل ہی معلوم ہوتی ہے۔

حقیر کی سخن فہمی کی بھی کوئی شہادت ان خطوط سے نہیں ملتی بلکہ ایک خط میں حقیر نے غالب سے ان کے ایک معمولی شعر کی تشریح بھی چاہی ہے۔ جس پر غالب لکھتے ہیں۔

"بڑا تعجب ہے کہ تم اس شعر کے معنی پوچھتے ہو ؎

اوّل ماہ است از شرمِ تو ماہ — آخرِ شب از شبستاں می رود

اس کے بعد غالب نے اس شعر کی توضیح کی ہے۔ اس شعر کو ایک معمولی سخن فہم بھی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اب ایسا سخن فہم اسے نہ سمجھ سکا جس کی سخن فہمی کا خود غالب سا جلیل القدر شاعر مداح تھا۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ منشی نبی بخش حقیر کی صلاحیتوں کی غیر معمولی مدح و ستائش میں غالب نے ان کی قابلیت سے زیادہ ان کے اخلاص و عقیدت کو پیش نظر رکھا ہے۔ آفاق صاحب نے بڑی تبحوت سے حقیر کے اشعار جہاں اور جدھر ڈھونڈ نکالے ہیں وہ خوب ہیں لیکن غیمہ واقعا ہیں اس لئے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کی اصلاحوں میں ان کا بھی کچھ دخل ہوگا۔ خود غالب کے کسی خط سے اس خیال کے حق میں شہادت نہیں ملتی۔

آفاق صاحب نے "نادرات غالب" کے چوبیس خطوط شائع کر کے غالب کے سوانح نگاروں اور عقیدتمندوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ غالب کے متعلق جو معلومات اب تک حاصل تھیں۔ ان میں اس کتاب نے مسلمہ طور پر اضافہ کیا ہے۔ اور اس سے غالب شناسوں کو بہت مدد ملے گی۔

"نادرات غالب" کا سرنامہ جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ اور تمہید خود مؤلف نے لکھی ہے جس سے کتاب کی ترتیب و تدوین سے متعلقہ حالات کے بارے میں دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔

مؤلف نے غالب کے خطوط کے مکمل متن کے اندراج کے بعد ستر صفحے کے حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ حواشی میں بعض فارسی خطوط اور فارسی اشعار کے ترجمے کے علاوہ بہت سی توضیح طلب باتوں کی بعد تحقیق وضاحت بھی کر دی ہے۔ علاوہ ازیں بیالیس صفحے کا ایک الگ باب شامل کیا ہے جو غالب کے تلامذہ شاگردوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

راقم کے خیال میں غالب کے شاگردوں اور دوستوں اور عزیزوں کے حالات کے متعلق ایک الگ مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اس کام کو شروع کرنے کا سہرا آفاق صاحب کے سر ہے۔ کیا عجب ہے کہ مزید تحقیق و تدقیق کے بعد ڈیڑھ دو سو صفحے کی ایک کتاب لکھ کر اس کام کی تکمیل بھی وہی کر دیں۔

آفاق صاحب نے غالب کے ان خطوں میں جو پیرا گراف خود قائم کئے ہیں۔ راقم کی رائے میں یہ ترمیم نہ ہونی چاہئے تھی۔ اسی طرح غالب کا طرز املا بھی قرار

[redacted]

رکھنا چاہیئے، یعنی جس طرح انہوں نے کوئی لفظ لکھا ہے، اسی طرح درج کیا جائے۔

اگر دوسرے ایڈیشن میں مؤلف ان خطوں کو لائن بلاک میں شائع کریں تو کتاب اور بھی زیادہ مقبول ہو۔ ان میں سے ایک خط کا بلاک پچھلے دنوں "ماہِ نو" میں چھپا تھا، اس میں غالب کی کتابت اس قدر صاف تھی کہ بچے بھی بہ آسانی پڑھ سکتے ہیں۔ بلاکوں کی صورت میں کتاب کی قیمت کا اضافہ پرستارانِ غالب بخوشی برداشت کرلیں گے۔ "نادراتِ غالب" کی کتابت و طباعت اور کاغذ، حالاتِ موجودہ غنیمت ہے لیکن جلدِ دوم کے موقع پر ظاہری محاسن کی ترقی کے لئے ابھی کافی گنجائش ہے۔

قیمت مجلد ۔/۲، ادارۂ نادرات، ۳/۴۶ نشتر پارک، کراچی سے طلب فرمائیے۔

مرآۃ الشعراء — مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا کی تازہ ترین کتاب مرآۃ الشعراء کی پہلی جلد بڑی تقطیع کے پونے چھ سو صفحات پر ختم ہوتی ہے۔ یہ اردو شعراء کا ایک نیا تذکرہ ہے جس کی تالیف تنہا صاحب نے ۱۹۲۶ء میں شروع کی تھی اور اگرچہ کتاب زمانۂ جنگ میں تکمیل کو پہنچ گئی لیکن طباعت کی مشکلات سے اس کی اشاعت میں مزید دس سال کی تاخیر ہوگئی۔

مرآۃ الشعراء کی اشاعت سے قبل اردو شعراء کے بیسیوں تذکرے نکل چکے ہیں اور ان میں سے دو دو جن سے اور مشہور تذکرے مرآۃ الشعراء کے زمانۂ تالیف میں فاضل مولف کے زیرِ نظر بھی رہے ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں ایک نئے تذکرے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ بہ الفاظِ مولف:

"کوئی تذکرہ ایسا نہیں ہے جس میں شاعروں کے کلام پر سیر حاصل تبصرے کئے گئے ہوں۔ ہم تمام شعراء کو ایک ہی درجے میں رکھنے کے عادی ہیں ... نہ کسی شاعر کی کماحقہ خوبیاں ہم پر ظاہر ہوتی ہیں، نہ کسی شاعر کے نقائص ہم پر منکشف ہوتے ہیں۔ جو تذکرے فارسی میں لکھے گئے ہیں، وہ از اول تا آخر ان کے نہایت مختصر احوال اور نمونے کے چند اشعار پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایسے تذکروں کے پڑھنے سے کیا حاصل۔ بجز اس کے کہ شاعروں کا نام یاد ہو جاتا ہے اور ان کے دو چار شعر ذہن میں رہ جاتے ہیں"

مؤلفِ مرآۃ الشعراء نے ہر شاعر کو ایک درجے میں نہیں رکھا۔ اور اگرچہ دوسرے تذکرہ نگاروں کے متعلق بھی یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے سب کو ایک درجے میں رکھا ہے مگر تنہا صاحب نے شعراء کے واضح طور سے چند درجے معین کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ اپنی کتاب میں انہوں نے باقی چار درجوں کو چھوڑ کر صرف پہلے اور دوسرے درجے کے شعراء کا ذکر کیا ہے اور ان کے متعلق اپنی بے لاگ رائے لکھی ہے لیکن بقولِ مولف "ذاتی محبت و نفرت کو اس میں قطعاً دخل نہیں"۔ گویا انہوں نے شیفتہ کی پیروی کی ہے؎

نہ ہمارا کوئی دشمن نہ ہمارا کوئی دوست — وہ نظر اور ہے جو اہلِ نظر رکھتے ہیں

مرآۃ الشعراء کی یہ جلد ولی سے لے کر شیفتہ تک پانچ ادوار پر تقسیم کی گئی ہے اور ہر دور میں پہلے اور دوسرے درجے کے شعراء کی فہرست الگ الگ دی گئی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تنہا صاحب کی تقسیمِ مدارج سے ہر جگہ ہر شخص متفق ہوگا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے اپنی رائے کا اظہار عموماً بہت جرأت اور بیباکی سے کیا ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں متخلص شیفتہ و حسرتی کے مختصر اردو دیوان کو تذکرہ نگار عموماً منتخب اشعار کا درجہ دیتے ہیں۔ غالب کے دل میں بھی شیفتہ کی یہ قدر و منزلت تھی کہ وہ ان کی پسند کو اپنے لئے سند سمجھتے تھے؎

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او — ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

ان کے شعر کا مرتبہ بھی غالب کے نزدیک مسلم تھا؎

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل — چوں او تلاشِ معنی و مضموں نکرد کس

ایسے بلند مرتبہ شاعر کے متعلق حضرت تنہا نے بڑی بیباکی سے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے!

"آپ دوسرے درجے کے شعراء میں ممتاز ہیں"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تنہا شیفتہ کی قدر نہیں کرتے یا ان کی عظمت کو نہیں پہچانتے۔ مراۃ الشعراء میں ہر شاعر کے حالات اور تنقید کلام درج کرنے کے بعد انہوں نے اس کے بہتر منتخب اشعار بھی شامل کئے ہیں۔ شیفتہ کے بہتر شعروں میں ان کے اکثر بہترین شعر آگئے ہیں اور شاید شیفتہ کے متعلق تنہا کی مذکورہ بالا رائے صحیح بھی ہے لیکن یہ بڑا ظلم معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شیفتہ کے مقابلے میں بعض ایسے شعراء کو بھی طبقۂ اول میں رکھا ہے جو جہاں استاد ہوں تو ہوں۔ مگر شاعر کے طور پر اور کلام شعریت کے لحاظ سے درجۂ اول کے اہل نہیں ہیں۔ مثلاً حضرت امام بخش ناسخ جن کے دونوں دیوانوں میں غزلوں کی بے عیب زبان "شعریت" کی آمیزش سے علی العموم پاک ہے۔

حضرت تنہا مرزا غالب کے بہت بڑے قدر شناس ہیں۔ غالب کے ذکر میں انہوں نے میر پر بڑی مزے کی پھبتی کہی ہے۔ کہتے ہیں:-

"الف سے ی تک غالب کے تمام دیوان میں سے اگر بہتر شعر نکال دیئے جائیں تو باقی تمام اشعار لاجواب نظر آئیں گے (نسخۂ حمیدیہ کا ذکر نہیں) اور میر کے سات دیوانوں میں کل عمر کی کمائی صرف بہتر شعر ہیں۔ جن کا جواب نہیں (یہ تعداد زیادہ سے زیادہ دگنی کی جاسکتی ہے) میر کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ میر کے باقی اشعار اس قابل ہیں کہ ان سے وہی برتاؤ کیا جائے جو انہوں نے خود ہلالی شاعر کیلئے تجویز کیا تھا۔"

تنہا صاحب کی رائے سے کسی کو پورا اتفاق ہو نہ ہو ان کی صاف گوئی ضرور قابل قدر ہے۔ یقیناً میر کے دیوان میں کثرت سے ایسے شعر موجود ہیں۔ جو اس قابل نہیں کہ کلام میر میں شامل رہیں۔ لیکن تنہا صاحب سے پہلے "اس شعراء کے امام" کے لئے اس بے خوفی سے سزا تجویز کرنے کی جرات کسی کو نہ ہوئی تھی۔

مراۃ الشعراء میں حتی الامکان ہر شاعر کے بہتر شعر درج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے لیکن میر کے بہتر اشعار پر حضرت تنہا نے میر کے بہتر نشتر کا عنوان لکھا ہے۔ اس انتخاب میں بعض شعر دیکھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر اچھے شعر کو نشتر کہہ سکتے ہیں؟ راقم کی رائے میں نشتر صرف ان شعروں کو کہنا چاہیئے جن کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہو۔ جو دل سے نکلیں اور براہ راست دل میں اتر جائیں۔ تنہا صاحب کے انتخاب کا پہلا ہی شعر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نشتر نہیں ؎

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا

یا یہ شعر ؎ چمن میں گل نے جو کل دعویٔ جمال کیا جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

ان منتخب نشتروں میں سے بعض کو تو غالباً ہم اچھا شعر بھی نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ؎

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

راقم کی رائے میں ذیل کے اشعار کو مولف نے بجا طور سے نشتروں میں شامل کیا ہے!

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

پھر موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

مراۃ الشعراء کے ابتدائی باب اردو زبان کی تاریخ اور اردو شاعری کے مختصرے پر مشتمل ہیں۔ ایک جگہ مولف نے ان لوگوں سے اظہار اختلاف کیا ہے جن کا خیال ہے کہ شاعری صرف قوموں کے زمانۂ جہالت میں فروغ پاتی ہے۔ اس کے برعکس وہ لکھتے ہیں:- "اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ قدما کے یہاں جو خیال باندھا گیا۔ اسی خیال کو متاخرین نے خوبی اور اضافے کے ساتھ باندھ کر دکھایا۔"

اس دعوے کی دلیل کے طور پر انہوں نے میر درد اور ڈاکٹر اقبال کا ایک ایک ہم موضوع شعر لکھا ہے۔ درد کہتے ہیں ؎

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

مولف کی رائے میں اقبال نے اسی خیال کو زیادہ یقینی اور ولولہ انگیز صورت یوں دی ہے ؎ جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا۔ تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

ہمیں امید ہے کہ اہل ذوق اس کتاب کی قدر کریں گے اور حضرت تنہا اس کی دوسری جلد بھی مستقبل قریب میں شائع کر سکیں گے۔

جلد اور سرورق بہت اچھا ہے۔ کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی قیمت عہ۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے طلب فرمائیے۔

اکتوبر ۱۹۴۹ء

مدیر

۲۸۹ [illegible] لاہور سے شائع کیا۔

[redacted]

جلد ۲ نمبر ۵

مخزن لاہور

علمی و ادبی ماہوار رسالہ

لاہور۔ نومبر ۱۹۴۹ء

۱۔ مدیر ، صفحۂ اوّل
۲۔ ڈاکٹر محمد باقر ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی، حافظ محمود شیرانی، ۳
۳۔ پروفیسر محمد اکبر منیر ایم اے پی۔ ای ایس، جہان نو (نظم)، ۱۷
۴۔ خواجہ عبد السمیع پال آثر صہبائی، ایم اے، ایل ایل بی، تجلیات (غزل)، ۱۸
۵۔ مولانا عبد المجید حیرت، آئینۂ حیرت ،، ۱۸
۶۔ جناب ارشد مسعود صاحب، منفی عمل (افسانہ) ۱۹
۷۔ حضرت مقبول احمد پوری، گیت، ۲۵
۸۔ محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی، رباعیات، ۲۵
۹۔ حضرت شیخ عبد القادر مدظلہ، مدیر اعزازی، جناح کے بغیر، ۲۶
۱۰۔ جناب ظفر اقبال صاحب، انسان کی آواز (نظم)، ۲۵
۱۱۔ جناب محمد خلیل الرحمن صاحب، حلقۂ ارباب ذوق اور موجودہ دہلی نظریئے، ۳۰
۱۲۔ جناب تصور کرتپوری } دو غزلیں، ۳۵
۱۳۔ جناب آتش لدھیانوی }
۱۴۔ جناب سعید اختر صاحب درانی، قدیم یونانی حکایات ۳۶
۱۵۔ جناب صادقین صاحب صدق، نقش و حرف (رباعیات) ۴۰
۱۶۔ جناب مسعود اشعر صاحب، تنہائی میں (نظم)، ۴۱
۱۷۔ حامد علی خاں، تلفظ کی غلطیاں، ۴۲
۱۸۔ حضرت ابو ظفر نازش رضوی، سرمایۂ نازش (غزل) ۴۴
۱۹۔ جناب طفیل ہوشیارپوری، غزل، ۴۴
۲۰۔ جناب محمد حبیب اللہ صاحب اوج حیدرآبادی، اس کے ماں باپ (افسانہ) ۴۵

بزم سخن

۲۱۔ جناب عبد المجید صاحب بھٹی، گیت، ۵۱
۲۲۔ جناب ڈاکٹر گیان چند صاحب ایم اے ڈی فل، رباعیات، ۵۱
۲۳۔ جناب جمنی سرشار، غزل، ۵۲
۲۴۔ جناب ظفر اقبال صاحب حشر، قطعات، ۵۲
۲۵۔ مخزن المخازن ۵۳

(رسائل و جرائد سے اقتباسات)

۲۶۔ ہمایوں لاہور، اقبال اور جاوید اقبال (جاوید اقبال)
۲۷۔ ایشیا بمبئی، غزل (حضرت جگر مراد آبادی)
۲۸۔ نگار لکھنؤ، بدقسمت ہندوستان (مدیر نگار)
۲۹۔ آجکل دہلی، درس محبت (نظم) (حضرت جوش ملیح آبادی)
۳۰۔ ماہِ نو کراچی، ارشاداتِ قائد اعظمؒ
۳۱۔ معارف اعظم گڑھ، اصلاحاتِ اقبال (محمد بشیر الحق صاحب)
۳۲۔ نظام المشائخ کراچی، میکسیکو کے کوچہ و بازار (پروفیسر بخاری)
۳۳۔ نقوش لاہور، گجیا بیواڑین (جناب محمود جالندھری)
۳۴۔ ساقی کراچی، کچھ صوبۂ سرحد کے بارے میں (جناب محمد حسن عسکری)
۳۵۔ اردو کراچی، میر، غالب اور فانی کے غم کا فرق (ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ)
۳۶۔ ادبی دنیا لاہور، ہماری جنسی شاعری (جناب محمد حزب اللہ صاحب)
۳۷۔ اردو ادب لاہور، مختار صدیقی اختر شیرانی کے حضور میں (مختار صدیقی)
۳۹۔ نفسیات لاہور، تعارفِ نفسی، (احمد نواز خاں)
۴۰۔ تبرکاتِ مخزن، کھیکوں، (منقول از مخزنِ قدیم)
۴۰۔ قارئین، ایڈیٹر کے نام،
۴۱۔ مدیر، ذکر حالی اور دوسری کتابیں،

★

سلسلہ مطبوعات نوائے وقت۔ چندہ سالانہ سات روپے، ششماہی چار روپے قیمت فی پرچہ دس آنے "Makhzan" Lahore

صفحۂ اوّل

پیشِ نظر اشاعت میں حضرت مدیرِ اعزازی کا ایک مضمون "جناحؒ کے بغیر" شامل ہے۔ اس مضمون کو حضرتِ ممدوح کے اُس مختصر مقالے کا تتمہ سمجھنا چاہیئے جو اس سے قبل "دو ملنگ" کے عنوان سے جناح اور گاندھی کے متعلق شائع ہوا تھا۔

اِس دفعہ ڈاکٹر محمد باقر کے مضمون کے ساتھ اُن کی اور اُن کے محترم استاد پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کی تصویر بھی شائع کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر باقر لکھتے ہیں۔

"شیرانی صاحب کی یہ واحد تصویر ہے جو صفحۂ ارض پر باقی رہ گئی ہے۔ اور غالباً آپ کی تمام تعلیمی و تدریسی زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ آپ تصویر بنوانے پر رضامند ہوتے۔ اس لئے اس کی اشاعت یوں بھی ایک مفید ادبی خدمت ہوگی"

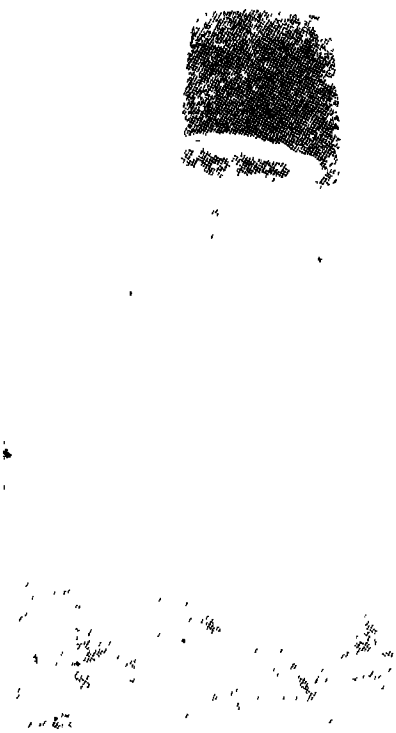
"جہانِ نو" کے عنوان سے پروفیسر محمد اکبر منیر صاحب کی جو نظم اس پرچے میں شامل ہے وہ دراصل ان کے ایک غیر مطبوعہ ترکیب بند کا ایک حصّہ ہے۔ اکبر منیر صاحب آجکل علمی تحقیق و تدقیق کے کام میں مصروف ہیں اس لئے ایک مدت سے انہوں نے شعر و شاعری کا شغل ترک کر رکھا ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ اس عدیم الفرصتی میں بھی انہوں نے ہماری درخواست پر "مخزن" کے لئے یہ دلکش نظم بھیج کر ہمارا ممنون فرمایا۔ برعظیم پاکستان و ہند میں اس وقت اکبر منیر فارسی زبان کے بہترین شاعر ہیں۔ اہلِ ذوق اُن کے دلاویز اور مترنّم فارسی شعر سے مستفید ہونے کے منتظر ہیں۔ خدا کرے کہ وہ اس طرف متوجہ ہونے کا وقت نکال سکیں۔

مسعود اشعر صاحب کا دلکش افسانہ "منفی عمل" نوجوانوں کی اُن مشکلات کا ایک مرقع ہے جو اُن کے معاملات میں بزرگوں کی بے وجہ مداخلت سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اس طبع زاد افسانے کے علاوہ دو تراجم بھی اس اشاعت میں شامل ہیں: "دیوالا کے دو ورق" دو قدیم یونانی حکایات ہیں۔ جن کا ترجمہ سعید اختر صاحب درّانی نے بُل فنچ کی مشہور کتاب سے "مخزن" کے لئے کیا ہے۔ ایک اور افسانے کا ترجمہ ہمارے نوجوان دوست محمد حبیب اللہ صاحب اَوج حیدر آبادی نے عنایت فرمایا ہے جو اسی پرچے میں شائع ہو رہا ہے۔

گزشتہ اشاعت میں ہم نے نوجوان اہلِ قلم کو دیگر زبانوں کے علمی نوادر کے تراجم کی طرف متوجہ کیا تھا۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہماری یہ درخواست رائگاں نہیں گئی اور اس سلسلے میں ہمیں بہت قابلِ قدر مضامین موصول ہو رہے ہیں۔

افسانوں کے مترجمین کو ایک ایکٹ کے مختصر ڈراموں کے تراجم کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہیئے۔ اچھے ڈراموں کی بہت کمی ہے۔

مدیر



استاد



شاگرد

مخزن

حافظ محمود شیرانی

(میرے اُستاد)

ڈاکٹر محمد باقر ایم اے پی ایچ ڈی

اس سلسلے میں ڈاکٹر باقر کے دو مضامین "مخزن" میں پہلے چھپ چکے ہیں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر ٹامس گراہم بیلی کے متعلق تھا اور دوسرا سرڈینیسن راس کے متعلق۔ اپنے مغربی اساتذہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے مشرقی معلمین کی طرف توجہ کی ہے مضامینِ ماسبق کے مقابلے میں پیشِ نظر مضمون قدرتاً استاد اور شاگرد کے تعلقات کا وہ تصور پیش کرتا ہے جو ہمیں صرف مشرقی روایات میں مل سکتا ہے۔

"کون ہ؟"

"باقر!"

جہاں ریلوے روڈ فلیمنگ روڈ ملتی ہیں لاہور والے اس کو برف خانے کا چوک کہتے ہیں۔ اس چوک سے فلیمنگ روڈ پر چلتے ہوئے آپ مشرق کی سمت تیس چالیس گز جائیں تو بائیں ہاتھ کو کڑی کا ایک بڑا دروازہ نظر آئے گا جو شکل کے لحاظ سے لاہور کے قلعے کے پرانے دروازوں سے ملتا ہے لیکن ان سے بہت چھوٹا ہے۔ لاہور میں یہ دروازے عام طور پر کٹڑوں کو بند کرنے کے لئے لگائے جاتے تھے لیکن اب کٹڑے نہیں رہے تو یہ دروازے بھی تعداد میں کم ہو رہے ہیں۔ اس دروازے سے اندر داخل ہوں تو سامنے ایک وسیع میدان نظر آتا ہے جس کے گرد اگرد سہ منزلہ مکان بنے ہوئے ہیں دروازے میں داخل ہوتے ہی، دائیں طرف گھوم جائیں تو ایک تین چار گز لمبی گلی ملتی ہے جس کے کونے والے مکان کے سامنے کو ہو گئیں ہر چند لحظوں کے بعد

دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا دیتا تھا اور کنڈی کھٹکھٹا کر پھر دو کر دہلیز سے الگ ہو جاتا تھا کیونکہ برابر کے مکان کے عقبی پرنالے سے پانی گرتا تھا جس سے بچنے کے لئے دروازے سے ہٹنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اس پانی کی بو بھی ناقابل برداشت تھی۔ گرمیوں کے موسم میں یہ بو تعفن کی شکل اختیار کر لیا کرتی تھی ایک دفعہ جو میں نے کنڈی زور سے کھٹکھٹائی تو کسی نے تیسری منزل سے جھانک کر کہا "کون ؟"

میں نے منہ آسمان کی طرف کر کے اپنا نام بتایا لیکن پیشتر اس کے کہ میں دیکھ پاتا پکارنے والا پیچھے ہٹ گیا۔ اور پھر "کالے خاں" کی پکار سنائی دی۔ میں منتظر تھا کہ کوئی سیاہ فام ملازم ابھی آ کر مجھے کچھ جواب دے گا۔ پھر طویل سیڑھیوں پر سے اترنے کی آواز آتی رہی اور ایک خوش رو گورے چٹے نوجوان نے آ کر کہا :-

"بابا آپ کو اوپر بلاتے ہیں" اور ساتھ ہی اس نے سیڑھیوں پر چڑھنے کی دعوت ہاتھ کے اشارے سے دی۔ تنگ اور تاریک سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا ایک تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ گورا چٹا کالے خاں ہی ہے تو اس کو کالے خاں کیوں کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ اگر بابا نے مجھے اسی منزل پر بلایا ہے جہاں سے انہوں نے جھانکا تھا تو وہاں پہنچتے پہنچتے آدمی ہلکان ہو جائے گا۔ پہلی بات کا جواب تو مجھے آج تک نہیں مل سکا لیکن دوسری تشویش جلد ہی رفع ہو گئی۔ جب کالے خاں نے دوسری منزل پر پہنچتے ہی مجھے ایک کمرے میں داخل ہونے کے لئے کہا۔ اس کمرے میں پختہ اینٹوں کا فرش تھا۔ اور بازار کی جانب پانچ چھ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ان کھڑکیوں کے ساتھ ایک پلنگ لگا ہوا تھا جس کے سرہانے گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا۔ اس تکیہ سے ٹیک لگا کر بابا آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے میں نے سلام عرض کیا۔ پلنگ کے سامنے دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بابا نے کہا "تشریف رکھئے" اور میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چھوٹے قد کا ایک گہرے گندمی رنگ کا سفید بالوں والا آدمی بنیان پہنے اور تہ بند باندھے پلنگ پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ بابا کچھ دیر تک اس پنکھے کو لاابالیانہ انداز میں ہلاتے رہے جو ان کے پاس پڑا ہوا تھا۔ پھر میری طرف بڑھا کر بولے۔

"لیجئے"

میں نے شکریہ ادا کر کے پنکھا لے لیا۔

منڈی ہوئی داڑھی، سفید تیتری کے مانند چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر چند لمحوں میں پسینہ کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ میں نے پنکھا پھر آگے بڑھاتے ہوئے کہا "آپ لیجئے آپ بھی تو گرمی محسوس کر رہے ہیں"

بابا نے پنکھے کی طرف توجہ کئے بغیر ایک "ہونہہ" کے بعد پوچھا "آپ کیسے آئے ہیں ؟"

"شیرانی صاحب میں آپ کا شاگرد ہوں۔ آج ہی ایم۔ اے میں داخل ہوا ہوں"۔

"ہونہہ!" اور پھر ایک طویل وقفے کے بعد بولے "کچھ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے ؟"

میں نے عرض کیا "کوشش تو کرتا ہوں"

"اچھا تو کل کالج میں ملیں گے" مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے انہیں میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ میں کچھ دیر اور بیٹھا رہا اور پھر سلام کر کے اینٹوں کے فرش اور تاریک سیڑھیوں سے گذرتا ہوا واپس چلا آیا۔

فلیمنگ روڈ سے یونیورسٹی اورنٹیل کالج کے وولنر ہوسٹل تک پہنچتے ہوئے ایک عجیب قسم کی الجھن دامنگیر رہی۔ "پنجاب میں اردو" اس وقت تک

[redacted]

شائع ہو چکی تھی۔ یہ ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے جب میں اورنٹیل کالج میں ایم۔ اے میں آکر داخل ہوا تھا۔ شیرانی صاحب کی تصنیف "پنجاب میں اردو" سے دنیائے اردو میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اور میں طالب علمی کے زمانہ میں اکتسابی نقطۂ نگاہ سے، اسے دیکھ چکا تھا۔ خیال یہ تھا کہ ایسے خشک موضوع پر اس قدر خوشگوار تصنیف کی تخلیق کرنے والا آدمی اگر بہت زیادہ ملنسار نہیں تو کم از کم زاہدِ خشک نہیں ہوگا۔ بالخصوص جب کہ میں عقیدت بھرے دل کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو یہ توقع ضرور رکھتی کہ اس ملاقات میں رسمی تعارف کے بعد کچھ غیر رسمی باتیں بھی ہوں گی لیکن شیرانی صاحب نے کچھ اس قسم کی بے تعلقی اور بے نیازی کا اظہار کیا کہ مجھے اپنی جرأت پر پشیمانی ہونے لگی۔ یہ شیرانی صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ میرا اندازہ کس قدر غلط تھا۔

یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جس قدر غیر دلچسپ اور غیر مفید ہے اتنا شاید دنیا کے کسی علمی ادارے میں نہیں۔ غیر دلچسپ تو اس لحاظ سے کہ السنۂ شرقیہ کی تعلیم کچھ اس بے جان اسلوب پر کی جا رہی ہے کہ اس عظیم الشان درسگاہ میں بیشتر طالب علم زبان سے کوئی دلی لگاؤ ہونے کے بغیر صرف سند لینے کے لئے آ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ نصاب کے ترجموں کو حفظ کرنے ہی پر تمام وقت صرف کر دیتے ہیں اور اس کالج میں ایسے معاشرتی مجمع شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں جہاں لوگ جمع ہو کر زبانوں کے افادی اور لطیف پہلوؤں پر بھی غور کر سکیں۔ حالانکہ اس کالج سے متعلق یونیورسٹی کا السنۂ شرقیہ کا کتاب خانہ ہی ایسا گراں بہا اور نادر علمی اور ادبی ذخیرہ ہے جس کے گرد ہزاروں ہنگامے برپا کئے جا سکتے ہیں۔ غیر مفید میں نے اس لئے کہا ہے کہ تمام دنیا میں کسی زبان کو سیکھنے کا جو اولیں مقصد متمدن دنیا نے قائم کیا ہے وہ یہاں قطعاً پورا نہیں ہوتا۔ زبان کے افادی پہلو کو چھوڑیئے۔ اس درسگاہ سے عربی اور فارسی کی اعلیٰ اسناد حاصل کرنے والے طالب علم ان زبانوں میں نہ تو گفتگو کر سکتے ہیں اور نہ آسانی سے ان زبانوں کو لکھ پڑھ ہی سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ڈگری لینے کے بعد ان لوگوں کا زبان سے قلبی تعلق بہت جلد ختم ہو جاتا ہے اور وہ سارا قومی وقت، روپیہ اور سعی جو اس کام پر صرف ہو رہی ہے۔ بالکل ضائع ہو جاتی ہے۔ میں نے چند دنوں میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس درسگاہ کے غیر دلچسپ اور غیر مفید ہونے کے باوجود اس میں کوئی خوبی ضرور ہے جو لاکھوں روپے یونیورسٹی اس پر خرچ کر رہی ہے ایک جواب تو مجھے بہت جلد مل گیا اور وہ یہ تھا۔ کہ اس درسگاہ کے شعبۂ فارسی عربی میں تین ایسے ٹھوس کام کرنے والے اور کلاسیکی قسم کے استاد موجود تھے جن کے نام علم و فضل اور عمقِ نظر کے اعتبار سے دُنیا کی کسی یونیورسٹی کے اساتذہ کے مقابلے میں فخر کے ساتھ پیش کئے جا سکتے تھے۔ ان میں سے پہلا نام عربی کے اُستاد پروفیسر محمد شفیع کا ہے۔ دوسرے دو بزرگ میرے اُستاد ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اور حافظ محمود شیرانی تھے۔ میں جب اُن دنوں کے اورنٹیل کالج کا تصور اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پنجاب یونیورسٹی کی دُنیائے تعلیم و تعلم میں یہ صاحبِ فضیلت بزرگ تین ٹھوس ستونوں کی طرح تھے۔ جن پر ہماری مشرقی زبانوں کی عمارت کھڑی ہو گئی تھی۔ اس احساس کے وجوہ کی تفصیل بیان کروں تو آپ شاید اُکتا جائیں۔ بہر صورت میں نے جلد ہی یہ بھانپ لیا کہ اس کالج سے ایم۔ اے پاس کرنا تو ایک ضمنی شغل ہونا چاہئے۔ اصل مقصد ان علم و فضیلت کے پہاڑوں سے فیض یاب ہونا ہوگا۔ بشرطیکہ حالات مساعدت کریں۔ پروفیسر محمد شفیع اُن دنوں عربی کے اُستاد تھے اور وائس پرنسپل بھی تھے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال شعبۂ فارسی کے صدر تھے اور شیرانی صاحب ایم۔ اے کے طلبہ کو نظم کا پرچہ پڑھایا کرتے تھے۔

دوسرے دن شیرانی صاحب سے کالج میں ملاقات ہوئی۔ نظم کی تدریس کا آغاز نظیری کی غزلوں سے ہوا۔ شیرانی صاحب نے ایک سکھ طالب علم سے غزل پڑھنے کے لئے کہا۔ اُس نے ایک شعر کچھ اس انداز سے پڑھا کہ ہم سب ہنس پڑے۔ شیرانی صاحب "اہا" "ہونہہ" کہہ کر زیرِ لب مسکرائے اور پھر سرور نیازی کی طرف دیکھ کر بولے "نیازی صاحب آپ پڑھئے"۔ سرور (آج کل ریڈیو پاکستان میں سٹیشن ڈائریکٹر ہیں) ہاتھ میں رجسٹر لئے ہوئے اس کو

اُنگلی پر چڑھانے اور اُتارنے میں مصروف تھے۔ آپ نے کتاب کھولے بغیر کہا: "شیرانی صاحب اس میں پڑھنے کی کون سی بات ہے۔ اگر کچھ تھی تو وہ سردار صاحب پڑھ چکے ہیں"۔ اس پر جماعت نے پھر قہقہہ لگایا۔ سرور کے تعلقات شیرانی صاحب سے بہت پُرانے تھے۔ اس لئے وہ اکثر جماعت میں بھی بے تکلفی سے کام لیا کرتے تھے۔ لیکن اس دن شیرانی صاحب اس جواب سے بہت جزبز ہوئے اور ہم کسی نتیجے پر پہنچے اور نظیری کی غزل پڑھنے کے بغیر جماعت سے رخصت ہوئے۔

اگلی ملاقات پر ان واقعات کا اعادہ تو نہ ہوا۔ لیکن ایک بات واضح اور مستقل اثر کی طرح ذہن نشین ہوگئی کہ شیرانی صاحب سے پڑھنے کے لئے یا تو نظیری کے کلام کے محاسن و معائب اور معانی و مطالب سے کُلی طور پر واقف ہونا ضروری ہے اور یا نظیری کو شیرانی صاحب سے سمجھنے کے لئے غیر معمولی زود فہمی کی ضرورت ہے۔ حالات یہ تھے کہ ہم میں سے بیشتر لوگ ان اوصاف سے متصف نہ تھے۔ شیرانی صاحب نظیری کا شعر سننے کے بعد کچھ اس انداز سے تبصرہ فرماتے اور علمی اور ادبی نکات کی طرف اشارے کرتے کہ ہمارے پلّے کچھ نہ پڑتا اور ہم صرف حاضر باشی اور وقت گزارنے کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس قسم کی درس و تدریس کے قائل ہی نہیں تھے جس کو انگریزی میں "سپون فیڈنگ" یعنی مُنہ میں نوالہ ڈالنا کہتے ہیں۔ وہ ایک جیّد عالم کی طرح نظیری، اُس کے زمانے، اُس کے ہم عصروں اور اُس کے تاریخی ماحول کی طرف اشارے کرتے ہوئے یہ سمجھ کر آگے بڑھتے چلے جاتے کہ ہم سب کا ذہنی پس منظر اُن کے اُفقِ ذہن کے مطابق ہے۔ حالانکہ ہم اُن سے کوسوں پیچھے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بحیثیت معلّم کے شیرانی صاحب نے اپنے طالب علموں پر کبھی کوئی خوشگوار اثر نہ چھوڑا اور میری ذاتی رائے اس وقت اور اب بھی یہی ہے کہ وہ درس و تدریس کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ چونکہ محض RESEARCHER (محقق) کی حیثیت سے پروفیسر شفیع صاحب اُن کو یونیورسٹی میں لانے کی کوئی سبیل پیدا نہ کر سکے۔ اس لئے وہ اُنہیں اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے یہاں لے آئے۔ حالانکہ یونیورسٹی میں شیرانی صاحب نے اُردو کی تدریس کا کبھی کام نہیں کیا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ شفیع صاحب نے یونیورسٹی کی رسمی پابندیوں سے چھٹکارا پانے کا نہایت خوبصورت حل تلاش کیا اور پنجاب یونیورسٹی اور اردو زبان پر ایک ایسا احسان کیا جس کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ اگر شفیع صاحب شیرانی صاحب کو اردو کا لیکچرر بنا کر یونیورسٹی میں نہ لاتے اور فارسی کی تدریس کے بہانے اُن کے وجود کا جواز ثابت نہ کرتے تو ممکن ہے کہ تحقیق و تفحص کا وہ عظیم الشان کام کبھی سرانجام نہ پاتا جو شیرانی صاحب اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔

دو چار ملاقاتوں کے بعد شیرانی صاحب نے ہم سے کچھ لکھنے کا تقاضا کیا۔ ایم۔ اے کے بیشتر طالب علم اس کام سے جی چراتے تھے۔ کیونکہ ہم میں سے اکثر محض زبان سیکھنے کے شوق سے تو کالج میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ تفصیل طویل ہوگی۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ ایک صاحب کسی دفتر میں کلرک تھے۔ اُن سے اُن کے کسی افسر نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ایم۔ اے کر لیں تو اُنہیں سپرنٹنڈنٹ بنا دیا جائے گا۔ ایک صاحب میونسپلٹی میں اوورسیر تھے اور وہاں سے کچھ وقت کے لئے آ جاتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایم۔ اے کر لیں تو شاید ترقی کی کوئی صورت نکل آئے اور نہیں تو کم از کم یونیورسٹی کے ممتحن مقرر ہو جائیں گے۔ ایک صاحب (نام نہیں بتاؤں گا) کے ہونے والے خسر کا تقاضا تھا کہ وہ ایم۔ اے کر لیں تو ۔۔۔ نہیں ای۔ اے۔ سی کرا کے اپنی لڑکی کی شادی اُن سے کر دیں گے۔ یہ کبھی کبھار آتے تھے اور اُن کے خسر صاحب بھی اس لئے ہمارے

ساتھ داخل تھے کہ ہونے والے داماد کی نگرانی کر سکیں۔ ایک صاحب اس لئے اس جماعت میں داخل ہو گئے تھے کہ اُنہیں لاہور میں قیام گاہ کی ضرورت تھی اور ایک روپے ماہوار کرایہ میں اتنا صاف ستھرا کمرہ یونیورسٹی ہوسٹل کے سوا اور کہیں نہیں ملتا تھا۔ وعلٰے ہذا القیاس۔ یہ سب لوگ کسی دن کچھ وقت کے لئے جماعت میں آجاتے تھے۔ ورنہ مسلسل حاضری اور ادبی ہنگاموں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شیرانی صاحب نے جب تنقیدی مضامین لکھنے کے لئے کہا تو میں نے ایک مضمون خاقانی پر اور ایک نظامی گنجوی پر لکھا۔ اپنی بساط کے مطابق میں نے محنت کی اور ڈرتے ڈرتے دونوں مضمون شیرانی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ خیال یہ تھا کہ اور لوگ بھی مضمون لکھ کر لائے ہوں گے اور میں نے چونکہ فارسی زبان سکول یا کالج میں کہیں نہیں پڑھی تھی۔ بلکہ نجی طور پر منشی فاضل کر کے ایم۔ اے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس لئے قیاس یہ کہتا تھا کہ میرے مضامین دیگر طلبہ کی بہ نسبت ہلکے ہوں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ اور کوئی صاحب مضمون لکھ کر ہی نہ لائے۔ میں نے دونوں مضمون جب شیرانی صاحب کے سامنے رکھے تو اُنہوں نے مضمون کے اوراق اُلٹتے ہوئے اور چشمہ کو ناک پر نیچے کی طرف پھیلاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا:۔

"کچھ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے ؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں نے تو آپ سے اُس دن بھی عرض کیا تھا۔"

"ہونھ !" ایک لطیف سی کھنکار کے بعد دریافت کیا۔ "کس دن ؟"

"جس دن میں آپ کے مکان پر حاضر ہوا تھا۔"

"اوہ ! تو وُہ آپ ہی تھے !"

گویا آپ کے ذہن سے یہ چیز بالکل خارج ہو چکی تھی کہ میں خاص طور پر آپ کے مکان پر آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا۔ مجھے اب کے کچھ کچھ بد مزہ سا ہوا اور میں چپکا ہو رہا۔ شیرانی صاحب مضامین دیکھتے رہے اور پندرہ بیس منٹ کے جائزے کے بعد بولے:۔

"محنت تو اچھی خاصی کی ہے۔"

میں نے دبی زبان سے کہا۔ "جی۔"

اس کے بعد آپ مزید آدھ گھنٹہ بالکل اسی طرح اشاروں میں باتیں کرتے رہے۔ جیسے نظیری پڑھاتے وقت کیا کرتے تھے۔ میں کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ اور "جی ہاں" کہہ کر یا خاموش رہ کر وقت ٹالتا رہا۔ چلتے ہوئے کہنے لگے "نظامی پر آپ کا مضمون تو اچھا رہا۔ لیکن خاقانی والا مضمون کچھ ہلکا ہے۔ اس پر مزید محنت کی گنجائش ہے۔ بہرصورت آپ دیکھ لیجئے۔ اگر مکمل ہو جائے تو اسے بھی کہیں چھپوا دیجئے۔"

میں رخصت لے کر چلا آیا۔ مضامین پر محنت کی گنجائش ضرور تھی لیکن محنت کرنے کا شعور رکھتے تھا۔ شیرانی صاحب کی ہدایات تو ایسے اشارے تھے۔ جن میں میں کوئی ربط پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دونوں مضمون اُٹھائے اور پنڈت دیا نرائن نگم کو زمانہ میں شائع کرنے کے لئے بھیج دیئے۔ شیرانی صاحب کی دقتِ نظر کا احساس پہلی مرتبہ مجھے اُس وقت ہوا۔ جب چند دنوں کے بعد پنڈت جی نے مجھے خاقانی والا مقالہ یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ شائع ہونے کے قابل نہیں اور نظامی گنجوی پر مقالہ آئندہ شمارے میں اُنہوں نے شائع کر دیا۔ مقالہ شائع ہوا تو میں اُن کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ کچھ دیر دیکھ کر بولے:۔

ے میں نے بی۔ اے ریاضی کے ساتھ پاس کیا تھا۔ ب

"کبھی کبھی آجایا کیجئے۔"

یہ ایک ایسی اجازت تھی جو شاذ و نادر ہی اپنے طالب علموں کو دیا کرتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُن کی تمام زندگی حقیقت شناسی اور راست کرداری میں گزری تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ جو لوگ محض امتحان پاس کرنے ایم۔ اے میں داخل ہوتے ہیں اور زبان اور ادب سے اُنہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ خواہ مخواہ اُن کے پاس آکر بادہ گوئی میں اُن کا اور اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔ رواج یہ تھا کہ ایم۔ اے کے تمام اُستاد ایم۔ اے کے ممتحن بھی ہوتے تھے۔ اور کبھی کبھی کچھ طالب علم کچھ اُستادوں کے نزدیک ہونے کی اس لئے بھی کوشش کرتے تھے کہ شاید اس سے امتحان میں کوئی فائدہ پہنچ سکے۔ لیکن شیرانی صاحب بیشتر طالب علموں سے کچھ اس بے اعتنائی سے پیش آتے کہ بلا وجہ کسی طالب علم کو اُن کے نزدیک جانے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔ حالانکہ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ وہ ایک نہایت شفیق اور رحم دل اُستاد تھے اور اپنے پسندیدہ شاگردوں کو بچوں سے زیادہ عزیز جان کر اُن کی زندگی کے ہر رُخ میں دلچسپی لیتے تھے اور اپنی بساط کے مطابق اُن کی مدد بھی کرتے تھے۔ میں صرف چند واقعات کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

قانون یہ تھا کہ جو طالب علم منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکا ہو۔ وہ کالج میں چھ مہینے رہ کر ایم۔ اے کا امتحان دے سکتا تھا۔ ان چھ مہینوں (اکتوبر سے مارچ) کے عرصے کو یونیورسٹی ایک سال کی حاضری کے برابر شمار کر لیتی تھی۔ فروری کے اواخر میں ہم جب امتحان کی تیاری کے لئے کالج سے رخصت ہونے لگے تو میں نے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید اس سال کافی تیاری نہ ہونے کی وجہ سے امتحان نہ دے سکوں۔ شیرانی صاحب میرا عذر خاموشی سے سُنتے رہے پھر بولے:

"آپ کلاس میں تو نہایت باقاعدگی سے آتے رہے ہیں۔ اس وقت آپ کو یہ خدشہ کیوں لاحق ہو گیا ہے۔"

میں نے عرض کیا "اس بہانے سے ایک سال اور آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع مل جائے گا اور اگلے سال ایم۔ اے کا ڈویژن بھی بہتر آجائے گا۔"

آپ نے حسبِ معمول چشمہ ناک پر سرکاتے ہوئے اور شیشوں سے اُوپر دیکھتے ہوئے کہا "پاگل نہ بنو۔ امتحان پاس کرنے کے بعد ساری عمر میرے گھٹنے سے لگے بیٹھے رہنا۔ اور ڈویژن کی فکر نہ کرو۔ تمہارا ڈویژن اچھا آ ہی جائے گا۔ ایک سال اور بیکار کیوں ضائع کرتے ہو۔"

میں کچھ ہوں ہاں کر کے ہوسٹل میں چلا آیا اور امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گیا اور اس بات کو معمولی سا واقعہ سمجھ کر بھول گیا۔ ایک ہفتہ بعد میں صبح مطالعہ کی تیاری میں مصروف تھا کہ کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ میں نے کہا:

"تشریف لائیے۔"

شیرانی صاحب دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ میں تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کرسی آگے بڑھائی اور آپ اس پر بیٹھ گئے۔ آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو میں سامنے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ آپ کو دمہ کا عارضہ لاحق ہے۔ اس لئے جب وہ کسی قسم کی جسمانی کوفت کے بعد بیٹھنے کے لئے رُکتے تو میں اُن کی آسایش کی خاطر چند لمحے خاموش بیٹھا رہتا۔ حتیٰ کہ اُن کی توانائی عود کر آتی۔ جس وقت وہ کرسی پر بیٹھے اُن کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ کیونکہ وہ کچھ فاصلہ طے کر کے آئے تھے اور کچھ سیڑھیاں بھی

چڑھے تھے۔ ایسی حالت میں وہ کسی قدر ہانپنے بھی لگتے تھے۔ میں چپکا بیٹھا رہا۔ حتےٰ کہ انہوں نے ترکی ٹوپی اُتاری۔ پھر رومال سے پیشانی کا پسینہ صاف کیا اور پھر کھنکارتے ہوئے بولے:

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کس چیز کے متعلق؟"

"آپ امتحان دینا چاہتے ہیں یا نہیں؟"

"جی ہاں! دینا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے نا؟"

"جی۔"

آپ نے پھر ترکی ٹوپی سر پر رکھ لی اور دروازہ کھول کر چلے گئے۔ میں تعظیم کی خاطر چند قدم پیچھے لپکا۔ لیکن آپ ہاتھ کے اشارے سے مجھے آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے کالج کی طرف بڑھ گئے۔

اسی امتحان کے سلسلے میں ایک اور واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ جب داخلے کے فارم جانے لگے تو کالج نے بی۔ اے کی ڈگری طلب کی جو میرے پاس نہ تھی۔ وائس پرنسپل شفیع صاحب نہایت سختی سے یونیورسٹی کی لگائی ہوئی اس شرط کے پابند تھے کہ جب تک طالب علم بی۔ اے کی ڈگری نہ دکھائے۔ اس کے ایم۔ اے کے داخلے کے فارم پر دستخط نہ کئے جائیں۔ ڈگری ملنے والی کانووکیشن پر میں کسی وجہ سے غیر حاضر تھا۔ اس لئے بی۔ اے کی ڈگری مجھے نہیں ملی تھی اور اس کے بعد کاغذ کے اس پُرزے کو حاصل کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے یونیورسٹی سے منگوائی بھی نہیں تھی۔ داخلہ بھیجنے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا تو میں شفیع صاحب سے جا کر ملا اور فارم پر دستخط کرنے کی درخواست کی۔ یونیورسٹی کیلنڈر اور یونیورسٹی کا بھیجا ہوا نتیجہ دکھایا۔ لیکن آپ کی آئین پسند طبیعت نے کوئی عذر قبول نہ کیا اور میں مایوس ہو کر چلا آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ ایک تو پندرہ بیس روپے جرمانہ ادا کر کے یونیورسٹی کو ڈگری کے لئے درخواست دی جائے اور دوسرے یہ کہ کسی طور یونیورسٹی سے ایک دن میں یہ ڈگری حاصل کی جائے۔ مالی زک اُٹھانے کے لئے تو میں تیار ہو گیا۔ لیکن یونیورسٹی کا عملِ کار دو بار گراں سیر تھا۔ اُس کا علاج میرے پاس نہ تھا۔ اس مایوسی کے عالم میں میں کالج کے دفتر میں چلا گیا۔ وہاں ہمارے ہیڈ کلرک ایک لالہ جی ہوتے تھے جنہیں بڑھاپے میں بدیشی عریاں تصویریں جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور اپنی کاوش اور حُسنِ انتخاب کی داد لینے کے لئے وہ اپنے البم مخصوص طلبہ کو بھی دکھایا کرتے تھے جس وقت میں دفتر میں داخل ہوا۔ لالہ جی اُس وقت اپنے نئے شہ پاروں پر تنقید کی دعوت احباب کو دے رہے تھے۔ حسبِ معمول مجھے بھی یہ دعوت دی گئی۔ لیکن میں اپنی ذہنی اُلجھن کی وجہ سے ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لالہ جی نے میرے چہرے پر مایوسی کے آثار دیکھے تو بولے:

"کیوں خیر تو ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں کیا، کوئی بات بتاؤ تو پتا چلے۔"

میں نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا: "بس ایم۔ اے کا امتحان نہیں دیں گے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"شفیع صاحب ڈگری دیکھنے کے بغیر داخلے کے فارم پر دستخط نہیں کرتے اور ڈگری میرے پاس ہے نہیں۔"

لالہ جی نے ہنس کر کہا: "بس اتنی سی بات ہے۔ دستخط ابھی ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا: "کیسے؟"

لالہ جی میرے قریب آ کر بولے: "آپ "صابھ" کے پاس چلے جائیے۔ اُسے کچھ نہ بتائیے۔ بس اتنا کہہ دیجئے۔ میں نے بھیجا ہے۔ "صابھ" دستخط کر دے گا۔"

یہ "صابھ" (صاحب) ڈاکٹر وولنر تھے۔ جو ہمارے کالج کے پرنسپل اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ چونکہ وہ بیشتر وقت یونیورسٹی کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ اس لئے وہ کالج کبھی کبھار آتے تھے اور کالج کا نظم و نسق کلی حیثیت سے شفیع صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے لالہ جی کی تجویز بہت پسند آئی۔ کچھ تو اس خیال سے کہ اس طرح پندرہ بیس روپے بچ جائیں گے اور کچھ اس وجہ سے کہ داخلے کا فارم وقت پر پہنچ جائے گا۔ میں لالہ جی کا شکریہ ادا کر کے دفتر سے باہر نکلا تو شیرانی صاحب سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ میں نے سلام عرض کیا۔ آپ حسبِ معمول ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ میں بھی اُن کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ اور ہم دونوں اُن کے کمرے میں پہنچ گئے۔ اورینٹل کالج میں جیبرجی ڈ کی طرف ایک کونے میں آپ کا آخری کمرہ تھا۔ بیٹھنے پر پوچھا:

"کیا کر رہے ہیں آپ؟"

چونکہ میری پوری توجہ اُس وقت داخلے کے فارم کی طرف تھی۔ میں نے جلدی جلدی تمام واقعات اُنہیں سنا دیئے۔ داخلے کا فارم میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اجازت چاہتے ہوئے اُٹھنا چاہا۔ معاً آپ نے فارم میرے ہاتھ سے لے کر کہا:

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"وولنر صاحب کے پاس۔"

"آپ یہیں رُک جائیے۔"

یہ کہہ کر آپ فارم لے کر کمرے سے باہر نکل گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر بولے: "میں اُن سے مل آیا ہوں۔ جائیے آپ یونیورسٹی میں درخواست دے کر ڈگری لے آئیے۔"

میں نے کہا: "آپ کس سے مل آئے ہیں؟ اور یونیورسٹی اگر اس طرح ڈگریاں بانٹنے لگے تو وہ روپے کس طرح ہم سے بٹورے!"

حسبِ معمول آپ اشاروں میں باتیں کرتے ہوئے بولے۔ "جاؤ جاؤ۔ خدمت کرو۔ ابھی ڈگری مل جائے گی۔"

"لیکن قبلہ یہ تو فرمایئے کہ میں بیس روپے یونیورسٹی کو دینے کے لئے اس وقت کہاں سے لاؤں اور پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ وولنر صاحب ابھی ڈگری دیکھے بغیر دستخط کر دیں گے۔"

"دیکھو اس میں اُن کی بیٹی ہے۔ تم لالہ کی چالوں کو نہیں سمجھتے۔ جاؤ۔ جاؤ۔"

اُن سے اُن کی مُراد شفیع صاحب سے تھی۔ میں اُس وقت مایوسی اور غصّے کی حالت میں تھا۔ لیکن شیرانی صاحب کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اس لئے چپکا ہو رہا اور دل میں تہیہ کر رہا تھا۔ کہ ان سے گلو خلاصی ہو تو وولنر صاحب سے فارم پر دستخط کرا لوں۔ اتنے میں شیرانی صاحب نے اپنی چیک بک نکالی اور ایک چیک پر دستخط کر کے بولے:

"اسے لے جایئے۔ ڈگری کی عرضی کے فارم کے ساتھ اسے ٹانک دیجئے اور خالی جگہ میں جتنے روپوں کی ضرورت ہو پُر کر لیجئے۔"

میں کسی بہانے وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ چیک واپس کرتے ہوئے میں نے پھر کہا۔ "حضرت چیک تو آپ نے دے دیا ہے۔ لیکن یہ فرمایئے ابھی ابھی ڈگری مجھے کون دے گا۔"

اُس وقت کسی قدر برہم ہو کر بولے۔ "میں جو کہتا ہوں جاؤ۔ ڈگری مل جائے گی۔ انہوں نے رجسٹرار کو ٹیلیفون پر کہہ دیا ہے۔"

میں نے چیک واپس کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے لئے شکریہ۔ اگر آپ کے ارشاد کی تعمیل ضروری ہے تو میں ابھی رجسٹرار سے جا کر ملتا ہوں۔"

"اچھا جاؤ" کہہ کر آپ نے مجھے کمرے سے باہر دھکیل دیا۔ میں رجسٹرار سے ملا۔ اُس نے ضروری فیس اور فارم لے کر مجھے اُسی وقت ڈگری دے دی جو میں نے شفیع صاحب کو جا کر دکھائی اور اپنے داخلے کے فارم پر دستخط کرا لئے اور یہ قضیہ یوں طے ہوا۔

بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ لیکن صرف اس ایک واقعہ سے شیرانی صاحب کی وضعداری، شفیع صاحب سے دلی عقیدت، اپنے شاگرد کے لئے شفقت اور اُس کی تکلیف کو رفع کرنے کا شدید احساس، یہ سب چیزیں ایک ہی مرتبہ میرے دل پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اثر چھوڑ گئیں۔ اگر آج شیرانی مرحوم زندہ ہوتے تو شاید انہیں یہ واقعہ یاد بھی نہ ہوتا۔ لیکن میری زندگی پر اس ایک واقعہ نے ایک اَمٹ اثر چھوڑا ہے۔

ایم۔ اے کا امتحان ختم ہو گیا تو میں ہوسٹل ہی میں ٹھہرا رہا۔ کیونکہ لاہور میں اوّل تو ایک تعلیمی ماہنامہ کی ادارت میرے سپرد تھی۔ دوسرے شیرانی صاحب کا قرب حاصل تھا۔ ایک دن صبح صبح آ نکلے۔

"گجرات چلو گے؟"

میں نے عرض کیا۔ "آپ کو بیٹھے بیٹھے گجرات جانے کی کیا سُوجھی؟"

شیرانی صاحب نے چشمہ ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہیں نا مارٹن صاحب۔ پادری ہے نا ایک گجرات میں۔۔۔۔ اُدھر۔۔۔؟"

میں سمجھ گیا۔ مارٹن صاحب کے صاحبزادے گورنمنٹ کالج، گجرات میں میرے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ میں اکثر اُن کے ہاں آیا جایا کرتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ مارٹن صاحب کو پرانے سکّوں کے کاروبار سے دلچسپی ہے۔ میں مُسکرا کر کھڑا ہو گیا تو شیرانی صاحب بولے:

"بس اب چلو گے بھی یا باتیں بناتے رہو گے؟"

میں نے پُوچھا۔ "ابھی چلیں گے یا کچھ دیر ٹھہر کر؟"

"ٹھہر وہر کر نہیں ابھی چلیں گے۔ چلتے ہو تو تیار ہو جاؤ۔ تانگہ باہر کھڑا ہے۔ میں نذیر احمد[1] کے پاس بیٹھتا ہوں۔" یہ کہہ کر شیرانی صاحب کمرے سے باہر نکل گئے۔

[1] مولوی نذیر احمد صاحب اُس وقت وولنر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مہتمم ہیں۔ ب

اس گفتگو سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ شیرانی صاحب کو نہ صرف تدریس کے وقت بلکہ مجلسی گفتگو کرتے ہوئے بھی اُس کا پس منظر کے حوالہ سے باتیں کرنے کی عادت تھی جو اُن کے اپنے ذہن میں ہوتا تھا۔ مثلاً اُنہیں میرے متعلق معلوم تھا کہ میں گجرات میں طالب علم رہ چکا ہوں اور میری والدہ اب تک وہیں تھیں اور اُنہوں نے یہ بھی فرض کر لیا تھا کہ مارٹن کا نام لینے نے میرے ذہن میں شیرانی صاحب کے گجرات تشریف لے جانے کی وجہ از خود اُ بھر آئے گی اور یہ کہ وہ اگر مجھے دفعتہً گجرات چلنے کے لئے کہیں گے تو اُن کے احترام کی وجہ سے میں کبھی انکار نہ کر سکوں گا۔

میں چند منٹ میں سفر کے لئے تیار ہو گیا اور مولوی نذیر احمد صاحب کے کمرے سے شیرانی صاحب کو ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا۔ گجرات کے ریلوے سٹیشن سے تانگہ لے کر ہم سیدھے مارٹن صاحب کے مکان پر پہنچے۔ راستہ میں میرا مکان پڑتا تھا۔ میں نے مکان سے گزرتے ہوئے اطلاع دے دی کہ دوپہر کو شیرانی صاحب مکان پر میرے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ مارٹن صاحب نے سکّے دکھائے تو شیرانی صاحب نے کوئی سکّہ پسند نہ کیا۔ وہاں سے تانگہ لے کر ہم صرّافوں کے بازار میں گئے اور شیرانی صاحب نے چند صرّافوں کے ہاں سکّے دیکھے۔ لیکن کوئی سکّہ پسند نہ آیا۔ اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانے سے فراغت پانے پر ہم پھر سٹیشن کو لوٹ آئے۔ سٹیشن پر آ کر میں نے اجازت چاہی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اتفاق سے گجرات پہنچ گیا ہوں۔ اس لئے دوست احباب سے مل کر دوسرے دن لاہور پہنچ جاؤں گا۔ شیرانی صاحب نے اجازت بخوشی دے دی۔ لیکن ٹکٹ لینے کے بعد مُصر ہوئے کہ میں لاہور تک واپسی کا کرایہ اُن سے لوں۔ میں نے بہت انکار کیا۔ لیکن کچھ پیش نہ چلی۔ بلکہ آپ جھنجلا گئے اور مجھے کرایہ لینا ہی پڑا۔ ابھی گاڑی چلنے میں کچھ دیر تھی۔ میں نے عرض کیا:۔

"اگر اجازت ہو تو ایک دو باتیں آپ سے پوچھ لوں۔"

فرمایا: "کہو۔"

میں نے کہا: "میں اس پر متعجب ہو رہا ہوں کہ آپ اتنی دُور سے آئے بھی اور آپ نے کوئی سکّہ بھی نہیں خریدا۔"

"میرے مطلب کی چیز نہیں تھی۔"

"اگر گستاخی نہ ہو تو میں پوچھ سکتا ہوں کیوں؟ مارٹن صاحب نے آپ کو شاہجہان، اکبر، جہانگیر سب کے سکّے دکھائے۔ لیکن آپ کو پسند نہیں آئے۔"

آپ نے حسبِ معمول پُر اسرار جواب دیا: "تم ابھی اس کو نہیں سمجھتے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا: "آپ سمجھاتے بھی تو نہیں۔"

"کھوٹے سکّے تھے اور اکبر کا سِکّہ تو وہ چیز نہیں تھی جو مجھے چاہیئے تھی۔"

یہ بات یہیں ختم ہو گئی۔ بعد میں کسی صحبت میں تفصیلی طور پر گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ شیرانی صاحب اس کوشش میں مصروف تھے کہ مغلوں کے سکّوں کو عہد بہ عہد جمع کر کے ایک ایسا جائزہ لیا جائے جس سے مختلف بادشاہوں کے اخلاقی، سماجی، فنّی، ادبی اور علمی رجحانات پر روشنی پڑ سکے۔ اُن کے نقطۂ خیال سے سکّوں کی ظاہری شکل و صورت، اُن کے بیل بوٹوں اور اُن پر کندہ کی ہوئی عبارات سے یہ نفسیاتی جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ مثلاً محمود کے متعلق ہندوؤں کے خلاف شدید روایتی تعصب کے سارے پروپیگنڈے کے باوجود اس کے سکّوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندو رعایا کو خوش کرنے کی سعی بھی کرتا رہا۔ کیونکہ لاہور کے عجائب خانہ میں محمود کے جو سکّے موجود ہیں اور جن کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ لاہور ہی میں بنائے گئے۔ اُن کے ایک جانب

تو عربی عبارت اور سنہ ہجری کندہ ہے اور دوسری طرف اس عربی عبارت کا ترجمہ سنسکرت میں اور بکرمی سنہ کندہ ہے۔ شیرانی صاحب کو معلوم ہوا تھا کہ مارٹن کے پاس اکبر کا ایسا سکہ ہے جو مارٹن کو گجرات کے قلعہ میں سے ملا تھا اور یہ قلعہ اکبر نے بنوایا تھا۔ شیرانی صاحب کی اطلاع یہ تھی کہ اکبر کے کمیاب سکوں میں سے یہ ایک سکہ تھا اور شیرانی صاحب کے پاس موجود نہ تھا۔ یہ اطلاع ملنے پر آپ گجرات دوڑے دوڑے گئے اور وہاں جاکر یہ معلوم ہوا کہ سکہ تو وہی ہے جس کی اطلاع آپ کو ملی تھی۔ لیکن وہ خالص چاندی کا ہونے کے باوجود اصل کی نقل تھی جو اصل سے آتاری گئی تھی۔ شیرانی صاحب کا خیال تھا اور تجربہ سے مجھے بھی معلوم ہوا۔ کہ بعض کمیاب سکوں کا لوگ عجائب خانوں سے گیلی مٹی پر سانچہ آتار لیتے ہیں اور پھر ان سانچوں میں چاندی پگھلا کر ڈال دیتے ہیں جس سے سکہ بظاہر تو اصل کی طرح بن جاتا ہے اور چاندی بھی خالص ہوتی ہے۔ لیکن اصلی سکے کی عبارت کی طرح ان سکوں کی عبارت کی نوک پلک نہیں نکلتی۔ جسے تجربہ کار نگاہیں فوراً بھانپ لیتی ہیں اور ہمارے عہد میں اس نوک پلک کو جانچنے اور بھانپنے کی مہارت رکھنے والے آدمی شیرانی صاحب کی طرح کم ہی پیدا ہوئے ہیں۔

میرے انگلستان جانے کے سبب پُرجوش محرک شیرانی صاحب ہی تھے اور انگلستان کے قیام کے دوران میں مجھے تحقیقی مواد کے سلسلے میں ہندوستان سے جس مدد کی ضرورت ہوئی۔ وہ آپ ہی کی وساطت سے مجھے پہنچی۔ میں انگلستان سے واپس آیا تو آپ نے میری ڈگری کی رعایت سے مجھے "ڈاکٹر صاحب" کہنا شروع کر دیا۔ شیرانی جیسے جیّد عالم اور اُستاد کے علم کے سامنے مجھے اپنی ولایتی ڈگری کا بھرم رکھنا معیوب سا معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے میں نے تکلفاً نہیں بلکہ دیانت داری سے عرض کیا "آپ میرے اُستاد ہیں اور جب آپ مجھے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں تو ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کیا آپ سابق لطف و کرم سے کام لے کر مجھے باقر ہی کہہ کر نہیں پکاریں گے؟"

بولے "ڈاکٹر صاحب اگر میں آپ کو عزّت سے مخاطب نہیں کروں گا تو دوسرے آپ کا احترام کیسے کریں گے۔ "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند"

میں نے پھر عرض کیا "لیکن یہ ضرب المثل کا استعمال تو آپ نے بیجا کیا۔ آپ بہرصورت میرے اُستاد ہیں۔"

پیار سے جھنجلا کر بولے "وہ تو میں کبھی آپ کا اُستاد تھا۔ اب آپ ایم۔ اے کے معلّم ہیں۔ اپنے کالج میں شعبے کے صدر ہیں اور میں دینی لکچرر کا لکچرر۔"

میں نے اس کے بعد بھی کئی دفعہ اصرار کیا۔ لیکن لوگوں کے سامنے آپ مجھے ڈاکٹر صاحب کہنے پر مُصر رہے۔

شیرانی صاحب خوش خور اور انتہا درجے کے متواضع انسان تھے۔ مکان پر بیٹھے ہوئے ایک دن کھانے کا وقت ہوگیا۔ آپ نے مجھے بھی دعوت دی کچھ عذر اور انکار کرنے کے بعد میں شامل ہوگیا۔ اتفاق سے بکرے کے پائے پکے ہوئے تھے اور غیر معمولی طور پر اچھے پکے ہوئے تھے اور میں نے کھانا کھانے کے بعد بہت تعریف کی معلوم نہیں اس تعریف کو شیرانی صاحب نے حسنِ طلب پر کیوں محمول کیا۔ ہر دس پندرہ روز کے بعد آپ کا تقاضا ہوتا

"ڈاکٹر صاحب آج دوپہر کو آپ میرے ساتھ چلیں گے۔"

"کیوں شیرانی صاحب۔"

"وہ آپ کھائیں گے نہیں کیا؟"

اور اس سے آپ کی یہ مراد ہوتی کہ میں نے تمہارے لئے پائے پکوائے ہیں۔ اس لئے تم میرے ہاں کھانا کھانے چلو۔ جہاں تک تحصیلِ لذت

کا سوال ہے یہیں کھانے کے متعلق لاپروا واقع ہوا ہوں۔ ایک دو دفعہ تو میں از رو امتثالِ امر اور اُستاد کی شفقت کی داد دینے کے لئے اُن کے ساتھ ہولیا۔ لیکن جب دیکھا کہ پلنے کھلانے کا محض بہانہ ہی ہے۔ اسی کھانے پر قسم قسم کی دیگر نعمتیں شیرانی صاحب جمع کر دیتے ہیں اور اُن کی وضعداری نے دعوتوں کا یہ سلسلہ پابندی سے قائم کر دیا ہے تو میں نے ایک دن شوخی سے کہہ دیا " بابا (ہم بے تکلفی سے اُنہیں اسی نام سے پکارتے تھے) آپ نے کوئی منت تو نہیں مان رکھی کہ ہر پندرہ روز کے بعد آپ مجھے کھلاتے ہیں۔ اگر آپ کو میرے زہد و اتقا پر کوئی حسنِ ظن ہے تو آپ غلطی پر ہیں "

اس سے آپ کچھ آزردہ سے ہو گئے۔ لیکن برہم نہیں ہوئے۔ پھر تھوڑی سی کوشش کرنے پر آپ مُسکرانے لگے اور بولے " اچھا لیٹگے اب نہیں کبھی کھانے پر نہیں بلائیں گے۔ حتیٰ کہ تم ماسٹر[1] کی طرح میری خوشامد نہ کرو"

کہنے کو تو اُنہوں نے یہ کہہ دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ جب تک لاہور میں رہے۔ دعوت دینے پر مُصر رہے۔

آپ کے اخلاق و عادات کی تصویر مکمل کرنے کے لئے ایک آخری واقعہ عرض کروں گا۔ میں نے انگلستان کے قیام کے دوران میں وہاں کے کتاب خانوں میں کچھ ایسے مخطوطات دیکھے جن سے معلوم ہوا کہ اُردو اور فارسی کے متعلق آج تک جو تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ اس میں ان مخطوطات کی نایابی کی وجہ سے کچھ کمی رہ گئی ہے اور چونکہ اتفاق سے میں نے چند مخطوطات فرانس اور انگلستان میں پہلی مرتبہ دیکھے تھے اور ان کے متعلق معارف اور دیگر جرائد میں میں لندن ہی سے متفرق مضامین شائع کرا چکا تھا۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس نئی تحقیق کو یکجا شائع کر دیا جائے۔ مواد میرے پاس موجود تھا۔ لیکن معاملہ ذرا نازک سا تھا۔ کیونکہ اس تحقیق کے دوران میں عمداً انگشت نمائی سے احتراز کرنے کے باوجود شیرانی صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین زور اور سید شمس اللہ قادری جیسے مستند محققین پر حرف گیری کا پہلو نکلتا تھا۔ میں نے ازراہِ احتیاط اس مضمون کے چند صفحے لکھے اور پرنسپل محمد شفیع صاحب (جو یونیورسٹی اورنٹیل کالج میگزین کے ایڈیٹر بھی تھے) کی خدمت میں بھیج دیئے کہ وہ ان کو دیکھ لیں اور اگر پسند فرمائیں تو یونیورسٹی کے جریدہ میں اشاعت کے لئے مضمون مکمل کیا جا سکتا ہے شفیع صاحب نے مضمون پسند فرما کر اسے مکمل کرنے کی تاکید کی۔ میں نے مضمون کے آغاز میں نہایت ادب اور احترام سے یہ واضح کر دیا کہ " بسا اوقات مصنفین کی رسائی تحقیق کے صحیح مواد تک نہیں ہو سکی اور اس وجہ سے ان سے کہیں کہیں لغزش سرزد ہو گئی ہے " لیکن جب مضمون فروری ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تو دوسرے دن میں نے شیرانی صاحب کو مکمل قطع تعلق کے مزاج میں پایا۔ پہلے تو کچھ پتا نہ چلا۔ لیکن جب آپ نے کہا " بارکش بابا ہم بازی" تو میں فوراً سمجھ گیا۔ کہ ہو نہ ہو اس مضمون نے یہ ستم ڈھایا ہے۔ چند دن تک تو میں اس کوشش میں رہا کہ شیرانی صاحب کسی طرح مان جائیں۔ لیکن اُن کی آزردگی رنجیدگی میں تبدیل ہو گئی۔ یہاں تک کہ عند الملاقات اُنہوں نے میرے سلام کا جواب دینا بند کر دیا۔ اس وقت وُہ کالج سے الگ ہو چکے تھے اور وطن جانے کی فکر میں تھے۔ مجھے ہر وقت یہ احساس دامن گیر رہتا کہ اگر وُہ اسی برافروختگی کی حالت میں مجھ سے رخصت ہو گئے تو نہ جانے پھر عمر بھر اُن سے تعلقات اُستوار کرنے کا موقع ملے یا نہ ملے اور پھر اس عمرِ مستعار کا اعتبار ؟ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ واقعات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ اُن کے لاہور سے جانے کے بعد میں کئی دفعہ کوشش کرنے کے باوجود پھر اُن کی قدمبوسی کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔ انہی ایام میں اتفاق سے میں ایک دن موچی دروازے کے اندر اپنی سسرال والوں

[1] ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی صاحب کو وُہ اسی طرح پکارا کرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب قبلہ انہیں بابا کہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی نئے پھل کا موسم شروع ہوتا تو شیرانی صاحب سے تقاضا کرتے کہ شیرانی صاحب اُنہیں وُہ پھل اس لئے کھلائیں کہ وُہ میوہ منڈی کے پاس رہتے ہیں۔ شیرانی صاحب پہلے تو مذاق میں ٹالتے رہتے۔ بالآخر دعوت میں پھلوں کے ٹوکرے کے ٹوکرے لا کر احباب کے سامنے رکھ دیتے

کے ہاں گیا ہوا تھا۔ مکان پر بیٹھے ہوئے میں نے سُنا کسی پھیری والے نے ہانک لگائی: "کھیس لے لو کھیس!" معاً مجھے ایک خیال آیا اور میں نے لپک کر اُسے پکارا۔ کھیس والا آ گیا۔ میں نے کھیس دیکھے اور دو اپنی پسند کے خرید لئے۔ پھر یہ کھیس لے کر شیرانی صاحب کے مکان پر پہنچا۔ حسبِ معمول کنڈی کھٹکھٹائی تو آپ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور کہا: "کون ہے؟"

مجھے دیکھ کر ٹھٹکے۔ لیکن پھر خود ہی سیڑھیوں سے اُتر کر مجھے ساتھ لے گئے۔ ایک کرسی پر مجھے بٹھا دیا اور بالکل خاموش چارپائی پر حسبِ عادت آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ میں نے خیریت پوچھی جس کا جواب ایک غرغراتی ہوئی "ہوں ہُوں" سے ملا۔ میں نے بیٹھتے ہی کھیس پلنگ کی پائنتی پر رکھ دیئے۔ اس وقت ہاتھ کے پنکھے کی جگہ بجلی کا پنکھا لے چکا تھا۔ آپ ایک دفعہ اُٹھے اور پنکھے کا رُخ میری طرف کرتے ہوئے بولے: "کیسے کیسے آنا ہوا؟"

میں نے عرض کیا: "آپ کے لئے یہ کھیس لایا ہوں۔"

کچھ سوچ کر برہم انداز میں بولے: "مجھے نہیں چاہئیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ شیرانی صاحب کو عمدہ قسم کے کھیس جمع کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ وہ کھیس کی بناوٹ کی خوبیوں کو جمالی نقطۂ نظر سے دیکھا کرتے تھے اور اس فن کو وہ مسلمانوں کے اُن ترقی یافتہ فنون میں سے سمجھتے تھے جن میں مسلمانوں نے اسلام کی حدود کے اندر رہ کر فنونِ لطیفہ کے ذوق کی تسکین کی تھی۔ رنگوں کے حسین و جمیل امتزاج، بیل بوٹوں کی نفاست اور تانے بانے کے سُوت کو پرکھنے کا انہیں خاص ملکہ تھا اور اُن کی صحبت میں رہ کر اکتسابی طور پر میں نے بھی اس کام میں شُد بُد پیدا کر لی تھی۔ میرے خریدے ہوئے کھیس معیاری لحاظ سے تو کچھ اتنے اچھے نہ تھے۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ اس قیمت پر شیرانی صاحب کو بہت پسند آئیں گے۔ کچھ دیر سوچ کر میں بولا:

"میرا خیال تھا آپ اس طرز کے کھیس پسند کرتے ہیں۔"

"لیکن آپ کو اس سے کیا؟"

"اگر مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں تو اور کسے ہو سکتا ہے۔" پھر میں نے ذرا جرأت آمیز انداز میں کہا: "بابا میں آپ سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اُس مضمون کی اشاعت سے آپ کی توہین مقصود نہ تھی۔ لیکن خدا جانے آپ اس پر کیوں یقین نہیں کرتے۔ اب اُس قصے کو چھوڑیئے۔ فرض کیجئے کہ میں نے قصور ہی کیا ہے۔ تو یہ قصور ایسا نہیں۔ جسے آپ معاف نہیں کر سکتے۔ لیجئے میں آپ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں آپ کے پاؤں چھونے کے لئے آگے بڑھا تو انہوں نے دونوں پاؤں اندر سکیڑ لئے اور دونوں ہاتھوں سے مجھے روک دیا میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد میں نے شیرانی صاحب کی ایک عجیب کیفیت دیکھی۔ میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اضطراب انگیز انداز میں کھیسوں پر پھیر رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں چارپائی پر گڑی ہوئی تھیں اور اُن کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ میں چند لمحے چپکا بیٹھا رہا اور پھر بولا: "اچھا چھوڑیئے اب اس قصے کو۔ کھیس دیکھئے آپ کو پسند ہیں یا نہیں۔"

آپ نے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا: "ہاں پسند ہیں۔ آپ کو کہاں سے ملے؟"

میں نے تفصیل بیان کی تو آپ نے کالے خاں کو بُلا کر اسی وقت قیمت ادا کر دی۔ میں دیر تک بیٹھا رہا نئی حاصل کی ہوئی کتابیں دکھاتے

رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا:

"اچھا تو کب آئیں گے وہ کھانے؟"

میں نے عرض کیا: "اب میں نہیں آؤں گا۔ اب آپ کو آنا ہو گا۔"

آپ نے ہنس کر جواب دیا: "اچھی بات ہے"۔ اور میں سلام عرض کر کے چلا آیا

حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کا آبائی وطن شیرانیوں کی ڈھانی، ریاست جودھ پور، مارواڑ راج تھا۔ اُن کے والد محمد اسمٰعیل خاں سید احمد شہید کے قافلہ سے تعلق رکھتے تھے اور تجارت اور کاروبار کی وجہ سے ٹونک کے صاحبِ ثروت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ شیرانی صاحب کی ابتدائی تعلیم یہیں ٹونک میں ہوئی اور یہیں اُنہوں نے قرآن شریف حفظ کیا۔ فارسی اور عربی کی تحصیل منشی فاضل کا امتحان پاس کرتے ہوئے کی۔ باپ نے شیرانی صاحب کو لندن بیرسٹری کی تعلیم کے لئے بھیجا۔ مگر غالباً باپ کی وفات کی وجہ سے اُن کو وطن سے روپیہ جانا بند ہو گیا۔ اور شیرانی صاحب مجبور ہو گئے کہ بیرسٹری کی تعلیم چھوڑ چھاڑ فکرِ معاش میں لگ جائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے لُوزک کی مشہور فرم سے تعلق پیدا کیا اور دس برس انگلستان میں رہ کر بیرسٹری کی سند لئے بغیر ہندوستان واپس آگئے۔ البتہ حسِ مطالعہ کا شوق یہاں سے ساتھ لے کر گئے تھے۔ اُس پر لندن کے کتب خانوں میں وقت گزار کر خوب جِلا کی۔

۱۹۲۱ء میں آپ لاہور تشریف لائے اور ۱۹۲۲ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں فارسی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ "پنجاب میں اُردو" اس زمانے کی معرکتہ آلارا تصنیف ہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۸ء میں آپ پنجاب یونیورسٹی کے اورئنٹل کالج میں اُردو کے لکچرر مقرر ہوئے جہاں سے وُہ ۱۵ر نومبر ۱۹۴۰ء میں فارغ ہوئے۔ یونیورسٹی سے سلسلہ ملازمت ختم ہونے پر آپ نے انجمن ترقی اُردو دہلی سے تعلق پیدا کیا لیکن علالت کی وجہ سے آپ مستقل طور پر اپنے وطن ٹونک میں جا کر مقیم ہو گئے۔

جب وُہ وطن جانے لگے تو دمہ کی وجہ سے اُن کی صحت مخدوش ہو چکی تھی۔ پرنسپل محمد شفیع صاحب کے اصرار پر وُہ آمادہ ہو گئے کہ اپنا قیمتی کتابخانہ اور سکّوں اور مُہروں کا ذخیرہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے حوالے کر دیں۔ یونیورسٹی نے کتاب خانہ تو سترہ ہزار روپے میں خرید لیا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ اُن عجائبات کی نصف قیمت بھی نہیں۔ لیکن سکّے شیرانی صاحب اپنے ساتھ لے گئے جنہیں حکومت یو۔ پی نے تئیس ہزار روپے کے عوض خرید لیا۔

شیرانی صاحب کی اولاد میں ایک ہی صاحبزادے تھے یعنی شاعرِ مشہور داؤد خاں صاحب اختر شیرانی۔ اُن کے علاوہ ایک صاحبزادی بھی اُنہوں نے چھوڑی۔ اختر شیرانی کا بھی اب انتقال ہو چکا ہے۔

شیرانی صاحب نے جمعہ کے دن ۱۵ر فروری ۱۹۴۶ء کو ۷۴ سال ۴ ماہ کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ وُہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق حافظ علیہ الرحمۃ نے کہا تھا:

نظیرِ خویش نہ بگذاشتند و بگذشتند

شیرانی صاحب کے علمی، تحقیقی اور ادبی مشغلوں اور کارناموں کے ذکر کے لئے ایک الگ صحبت درکار ہے۔ اس لئے اس کام کو کسی اور فرصت پر اُٹھا رکھتا ہوں۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ وُہ ایک نہایت بلند پایہ محقق، نقّاد اور صاحبِ ذوق انسان تھے۔ شاعری کا چسکا کچھ ذیرِ جوانی میں رہا۔ لیکن بعد میں شعر نہیں لکھے۔

★

پروفیسر محمد اکبر منیرؔ

جہانِ نو

نوید آئی ہے گلزاروں میں فصلِ نوبہاری کی
زمیں تصویر ہے کشتِ فلک کی لالہ کاری کی

حضورِ شاہدِ گل میں وفا کی آزمائش ہے
صلائے عام ہے پھر بلبلوں کو جاں نثاری کی

ختن کے سبزہ زاروں سے صبا پیغام لائی ہے
کہ پھیلی ہے مہک مشکِ غزالانِ تتاری کی

ملے گا عشق کا چاکِ گریباں چاکِ دامن سے
ادائیں اور ہیں اب کے جنوں کی بخیہ کاری کی

سرِ پیرِ مغاں پر پے بہ پے پیمانے ٹوٹیں گے
جنوں پرور ہوئی جاتی ہے محفل میگساری کی

ضعیفوں کو سرِ پرخاش ہے پھر زورمندوں سے
کبوتر کی نگہ میں شان ہے بازِ شکاری کی

چمک کر تیغ کی مانند خونِ گرم دہقاں کا
اُڑائے گا فضا میں دھجیاں سرمایہ داری کی

کشاورزی کشاکش میں ہے پھر کشور کشائی سے
اُکھڑنے کو ہیں بنیادیں نظامِ شہریاری کی

لہک اُٹھیں گے پھر گلزارِ ابراہیم کے لالے
کہ نوبت ہو چکی نمرودیوں کی شعلہ باری کی

جھکیں گی گردنیں آخر اُسی کے آستانے پر
شہادت دیتی ہے ہر چیز جس کی تاجداری کی

اُسی کی تاجداری کا علَم لہرائے عالم پر!
اُسی کی رحمتیں نازل ہوں فرزندانِ آدم پر!

اثر صہبائی

تجلیات

جلوہ آرا ترا جمال رہے
مست و رنگیں مرا خیال رہے

زندگی کے ہر اک دوراہے پر
تیری رحمت شریکِ حال رہے

یاس و غم کے سیاہ لمحوں میں
نور افشاں ترا خیال رہے

تیری چشمِ کرم ہو جس دل پر
اُس میں کیوں رنجش و ملال رہے

جس میں ہو حسنِ لازوال ترا
روح وہ کیوں نہ لازوال رہے

جس کا مقصود تو ہو کیوں اس کو
فکرِ فردا غمِ مآل رہے

اے اثر رہروانِ جادۂ عشق
ہر زمانے میں خال خال رہے

★

عبدالمجید حیرت

آئینۂ حیرت

یہ زندگی فضول نہ ہو صرف، دیکھنا
عزت پہ آنہ جائے کوئی حرف دیکھنا

بنتا ہے مدتوں میں کہیں ایک قطرۂ خوں
بیجا نہ ہو متاعِ جگر صرف دیکھنا

یہ دل کہ ایک پارۂ آتش سے کم نہیں
غفلت سے ہو نہ جائے کہیں برف، دیکھنا!

پرخاش کچھ نہیں ہے مگر دے کے جامِ غم
منظور ہے کسی کا اُنہیں ظرف دیکھنا

لکھی ہے خونِ دل سے غمِ دل کی داستاں
حیرت بگڑ نہ جائے کوئی حرف دیکھنا

★

ارشد مسعود

منفی عمل

(افسانہ)

میں جب بھی اس سڑک پر سے گزرتا ہوں، جو آج بیس سال کے بعد بھی اسی طرح میونسپلٹی کی غفلت پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے تو اس بڑے سے پھاٹک والے مکان کے قریب پہنچ کر میرے قدم ضرور رک جاتے ہیں اور میری نگاہ پھاٹک سے اُوپر بالاخانے کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔

یہ مکان اندر سے بہت بڑا ہے اور پُرانی وضع کا بنا ہوا ہے۔ میں اس مکان کو بیس سال سے جانتا ہوں اور اسے دیکھ کر مجھے بہت سی پُرانی باتیں اس طرح یاد آجاتی ہیں۔ جیسے کل کے واقعات ہوں۔

آج سے بیس پچیس سال پہلے یہاں اکرم کے والد اپنے تمام کنبے سمیت رہا کرتے تھے۔ اکرم میرا ہم جماعت اور بچپن کا ہمجولی تھا۔ اس کے والد جب فیروزپور میں ملازم تھے، تو ان کا مکان ہمارے مکان کے بالکل سامنے واقع تھا۔ اکرم کے والد بہت عرصے تک فیروزپور میں رہے۔ اس لئے دونوں گھروں میں بہت گہری راہ و رسم پیدا ہوگئی۔ میں اکرم کی اماں کو خالہ کہہ کر پکارتا تھا۔ پھر اس کے والد تبدیل ہوکر لاہور چلے گئے۔ جب میں کالج میں داخل ہونے کے لئے لاہور گیا تو اُنہوں نے بے حد اصرار کیا کہ میں ان کے یہاں رہوں۔ لیکن میں نے مناسب نہ سمجھا اور ہوسٹل میں داخل ہوگیا۔ تاہم میں اکرم کے ساتھ اکثر آجایا کرتا اور ہم بہت دیر دیر تک اس بالاخانے میں بیٹھے رہتے۔

اکرم لمبے قد کا شرمیلا اور حساس لڑکا تھا۔ جس کی آنکھوں سے ذہانت بھی جھلکتی تھی اور حزن بھی۔ حزن اور جھجک اس کی شخصیت کے دو نمایاں پہلو تھے۔ وُہ گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس لئے بچپن میں سب اُس سے لاڈ اور پیار کرتے تھے بلکہ اس پر اور اُس کے کھلونوں پر مناسب داری ہوتے رہتے۔ اسے کھلونے بنا بنا کر دیتے، چلا چلا کر دکھاتے۔ اس کی بات بات کا خیال رکھتے۔ نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔

کوئی کہتا: "اکرم اسے ہاتھ مت لگانا، اُنگلی کٹ جائے گی"۔

کوئی کہتا: "اکرم ایسے نہیں گر پڑو گے"۔

"ارے یوں نہیں چوٹ آجائے گی"۔

"ارے ہٹو، پاؤں جل جائے گا"۔

اب اتنا بڑا ہو جانے پر بھی گھر میں سب لوگ اسے بچہ ہی سمجھتے اور کالج کے دنوں میں بھی جب وُہ میرے ساتھ سیر کو نکلتا تو اُس کی ماں کہتی۔ "خدا حافظ، دیکھنا سڑک پر تانگے موٹریں بہت ہوتی ہیں۔ ان سے بچ کے چلنا"۔ اور میں کہتا: "آپ فکر نہ کیجئے، میں اس کے ساتھ ہوں"۔ تو وُہ کہتیں: "ہاں بیٹا اسے اپنے ساتھ رکھنا اور اپنے سے ذرا بھی جُدا نہ ہونے دینا"۔

پھر نہ جانے چوٹ آجانے یا گر پڑنے کا خوف اُس کی روح کی کسی گہرائی میں جا کر چھپ گیا اور اس وقت جبکہ ہم بچپن کو بہت دُور چھوڑ آئے

تھے۔ اس کی بعض باتوں پر میں حیران رہ جاتا اور یہ حیرت میرے دل میں کسی ایسے جذبے کو اُکساتی جس کے زیرِ اثر اس سے ایک عجیب قسم کی مزید وابستگی پیدا ہو جاتی۔

اور جب میری نظر بالاخانے کی جانب اُٹھتی ہے تو مجھے وہ دن یاد آجاتے ہیں جب ہم گرمیوں میں دوپہر کو یہاں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ اور اس سڑک کی جانب دیکھتے رہتے جو آج سے بیس سال پہلے بھی اسی طرح میونسپلٹی کی غفلت پر آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتی۔ اس وقت سڑک پر دُور دُور تک کوئی متنفس نظر نہ آتا۔ سامنے ایک شیشم کا درخت سر جھکائے خاموش کھڑا رہتا۔ اس کے خشک پتے سڑک پر بکھرے رہتے۔ اس وقت اگر کوئی بھولی بھٹکی۔ لاری وہاں سے گزر جاتی تو یہ پتے اُٹھ اُٹھ کر تھوڑی دُور اس کے پیچھے بھاگتے۔ پھر تھک ہار کر وہیں ڈھیر ہو جاتے۔ اس وقت سڑک سنسان ہو جاتی اور چاروں طرف خاموشی اونگھنے لگتی۔ میں خاموشی کو توڑنے کے لئے باہر جھانک کر کہتا "گرمی کی جوانی اُداس ہے"۔ اور اکرم کسی گہرے سوچ سے چونک کر کہتا "فطرت کسی گہرے سوچ میں ہے"۔۔۔

پھر جو ہم باتیں کرنے لگتے تو ہماری گفتگو موضوع بدلتی رہتی۔ مثلاً ہم اس سڑک کی حالت زار پر تبصرہ کرتے۔ میونسپلٹی کے کارکنوں کی غفلت پر آنسو بہاتے، اور پھر کارکنوں سے کاروں، اور کاروں سے کتابوں اور کتابوں سے نظموں، اور نظموں سے لڑکیوں، اور لڑکیوں سے لڑکیوں کی آنکھوں پر قدم دھرتی ہوئی ہماری گفتگو نہ جانے کہاں کہاں تک ہو آتی۔ پھر جو لڑکیوں کی آنکھوں کی بات ہوتی تو تسنیم کی آنکھوں کا ذکر بھی چھڑ جاتا ——

لیکن ٹھہریے یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں تسنیم کون تھی -!

اکرم کے دادا نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے صرف ایک لڑکا ہوا۔ بڑا ہو کر یہ لڑکا تلاشِ معاش کی خاطر پنجاب سے باہر چلا گیا اور پھر تمام عمر وہیں رہا۔ اس کے بھی ایک ہی لڑکا ہوا "منشاد حسین" جو ریلوے میں ملازم ہو گیا۔ یہ بھی زیادہ عرصہ پنجاب سے باہر ہی رہا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں صفیہ اور تسنیم، اور ایک لڑکا، روفی، جو دونوں بہنوں سے چھوٹا تھا۔ جب یہ لڑکیاں جوان ہوئیں اور انہیں اپنے رشتہ داروں میں بیاہنے کے لئے وہ پنجاب واپس آ گیا اور لاہور میں شہر سے باہر ایک مکان بھی خرید لیا۔ جب وہ پہلی مرتبہ لاہور آئے تو کچھ دن اکرم کے والد کے یہاں ہی ٹھہرے شام کا جھٹپٹا تھا۔ اُن کا تانگہ اس پھاٹک کے سامنے آکر رُکا۔ اکرم نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ پہلی مرتبہ اپنے ان رشتہ داروں کو دیکھا اور پہلی دفعہ تسنیم کو دیکھ کر اسے یہ احساس ہوا کہ وہ عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔ روشنی اور تاریکی کے امتزاج میں نہ جانے اس حسین لڑکی نے اکرم کے دل پر کیا اثر کیا۔

اور مجھے ایک دفعہ اس نے بتایا کہ "اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرا ہی ایک حسین خواب ہے"۔

تسنیم کی ماں زرد رو اور تیکھی ناک والی عورت تھی جس کی صحت غیر علاقوں کی آب و ہوا راس نہ آنے کے باعث بگڑ رہی تھی۔ صفیہ موٹی موٹی آنکھوں والی ایک موٹی سی لڑکی تھی اور روفی ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔

وہ ان کے ہاں جاتا اور سب سے پہلے تسنیم کی ماں کو سلام کرتا اور اس کے بعد صفیہ کو، اور آج تک اسے تسنیم کو سلام کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اور اگر اسے تسنیم سے محبت نہ ہوتی تو یہ جھجک بھی نہ ہوتی۔ تسنیم کی ماں کہتی "جیتے رہو"۔ اور پھر گھر کا حال پوچھتی "بہنیں کیا کر رہی تھیں، اماں کیسی ہیں؟ اور تو سب خیریت ہے۔ اصغر تو اچھا ہے"۔ وغیرہ

صفیہ، جس کی شادی جلد ہی ہونے والی تھی، کچھ سی رہی ہوتی۔ تسنیم سر جھکائے مشین چلا رہی ہوتی۔ یا کچھ بُن رہی ہوتی یا اور سو کام تھے کرنے کو وُہ صفیہ کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا اور وُہ پوچھتی "آپا کیسی ہیں۔ ننھا کیا کر رہا ہے۔ تمہارا امتحان کب ہے۔ آپا تو کبھی آئیں نہیں ہمارے یہاں۔ مدت ہو گئی انہیں آئے ہوئے۔" اور وُہ کہتا "آپ کب آتی ہیں۔" صفیہ کہتی "اچھا اس دفعہ ضرور آئیں گے روفی کو ساتھ لے کر۔ ہمیں تو آنے کیلئے روفی کی منتیں کرنا پڑتی ہیں امّاں کی صحت اچھی نہیں رہتی اور آپا تو تمہارے ساتھ آسکتی ہیں۔" لیکن تسنیم سے بہت کم باتیں ہوتیں اور وُہ اس کی جھکی ہوئی نیم وا آنکھوں کی طرف دیکھنے لگتا اور انہیں دیکھ کر اسے ایسے نیم وا دریچوں کا خیال آجاتا جو اس نے آج تک نہیں دیکھے تھے۔ تسنیم کی آنکھوں میں گہرائی بھی تھی اور چمک بھی جیسے کسی گہرے تہ خانے میں دیئے جل رہے ہوں اور اسے اپنی طرف متوجہ پا کر تسنیم شرما جاتی اور اس کا رنگ سُرخ ہو جاتا، شفق کی طرح۔ جیسے شام کو اُفق پر سانولے سانولے بادل سُرخ ہو جاتے ہیں اور انہیں دیکھتے دیکھتے، دیکھنے والے کو احساس ہوتا ہے۔ جیسے اُس کی کوئی چیز وہاں کھو گئی ہے۔ بالکل ایسا ہی ایک احساس اکرم کے دل میں بھی جاگ اُٹھتا۔ اگرچہ اسے تسنیم سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ وُہ اس کے پاس جا کر اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہے "شفق۔ میری کوئی چیز یہاں کھو گئی ہے"۔ کتنا چاہتا تھا اس کا دل کہ وُہ اسے ایک بار "شفق" کہہ کر پکارے اور اس وقت اسے ایک غیر ملکی مصنّف کا وُہ مقولہ یاد آجاتا کہ "جب حُسن کو اس کا نام لے کر پکارا جائے تو وُہ ضرور لبیک کہے گا۔" لیکن یہ خواہش صرف آنکھوں تک پہنچ پاتی۔ لبوں پر آج تک نہیں آئی تھی —— اور وُہ اس وقت کوئی پرانا اخبار اُٹھا کر دیکھنے لگتا۔ یا کھڑکی سے باہر بہت دور کہیں کھو جاتا۔

لیکن گھر میں کسی کو پسند یا ناپسند کرنے کی اجارہ داری گویا آپا صغریٰ نے لے رکھی تھی۔ شاید کسی شادی کی تقریب پر جہاں سب رشتہ دار جمع تھے، شمشاد حسین کی لڑکیوں نے کوئی ایسی بات آپا سے کہہ دی جو انہیں ناگوار گزری یا جانے پھر کیا بات تھی کہ آپا کو یہ لڑکیاں قطعاً پسند نہ تھیں اور ان کے ذکر ہی سے ان کے ماتھے پر بل پڑ جاتا۔ آپا کو ان کی عادتیں پسند تھیں نہ صورت۔ اور تسنیم کی آنکھیں تو گویا آپا نے دیکھی ہی نہیں تھیں اگر انہوں نے کچھ دیکھا تھا تو تسنیم کا سانولا رنگ۔ اکرم تو ڈرپوک تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اس کے لئے بھی آپا کو اس بات کا قائل کرنا مشکل ہو جاتا کہ تسنیم خوبصورت ہے اور اگر کسی کے انگ انگ میں کوئی شعر ہلکورے لے رہا ہو تو اس کا اعتراف کرنا تو بہت دور کی بات تھی پھر اگر کسی کے ہونٹوں پر کوئی حسین تل ہو تو آپا کو اس سے مطلب؟

لیکن اکرم تو اتنا بھی نہ کہہ سکتا کہ آپا نے کبھی گورا رنگ دیکھا نہیں اور تعریف کے پُل باندھے نہیں! ——

میں نے صرف ایک مرتبہ تسنیم کو دیکھا تھا۔ اس کا رنگ اگرچہ گورا نہ تھا۔ لیکن صاف اور دلکش تھا۔ نازک اندام اور دو بڑی بڑی حسین آنکھیں مجھے یاد ہے کہ میں نے اسے دیکھ کر دل ہی دل میں بے حد پسند کیا۔ یہ ملاقات ایک دکان میں ہوئی۔

سردیوں کے دن تھے۔ دو ایک دنوں سے بارش ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ اولے بھی پڑ چکے تھے۔ برف کے مانند سرد ہوا چلنے لگی تھی جو آری کی طرح کاٹتی۔ ان دنوں صبح صبح سائیکل پر کالج جاتے ہوئے ہاتھ اس قدر ٹھٹھر جاتے کہ جماعت میں قلم تھامنا مشکل ہو جاتا۔ ہم ایک دکان میں داخل ہوئے اکرم کا ارادہ دستانے خریدنے کا تھا اور میرا مفلر خریدنے کا۔ وہاں سیاہ برقعوں میں دو لڑکیاں۔ ایک چھوٹے سے لڑکے کے ساتھ کھڑی کچھ

خرید رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اکرم کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ ایک لڑکی نے دوسری کے کان میں کچھ کہا اور دوسری نے اکرم کو اشارے سے اپنے پاس بُلایا اور کہا: "اگر تمہیں کسی مفلر کی ضرورت ہے تو اُون لے کر ہمیں دے دو۔ تسنیم بہت اچھا مفلر بُن لیتی ہے۔ اُون بھی ہم نے پسند کر لی ہے۔" لیکن اکرم ایک دم گھبرا گیا۔ کہنے لگا: "نہیں نہیں آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میرے پاس پہلے ہی بہت سے مفلر ہیں۔" لڑکی نے اصرار کیا کہ "اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ تم اس کا خیال بھی نہ کرو۔" اس پر اکرم نے جلدی سے کہا: "لیکن مجھے مفلر کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے اشارہ بھی کیا کہ بنوا لو، کیا حرج ہے۔ لیکن اکرم نے میرا اشارہ دیکھا ان دیکھا کر دیا

اگر اکرم کے مفلروں میں ایک مفلر کا اضافہ ہو جاتا تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اکرم کے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وُہ اُن محبوب ہاتھوں کی بنی ہوئی کوئی چیز پہنے۔ لیکن "ہاں" کرنا اس کے لئے بہت مشکل تھا۔ یہ اس کی فطری کمزوری تھی۔ کسی جذبے نے اس قوّت کو مفلوج کر دیا تھا جس کے زیر اثر وُہ "ہاں" کہہ سکتا۔ ایک موہوم سا خوف غالب آجاتا اور خواہش لبوں تک پہنچتے پہنچتے انکار بن جاتی اپنے متعلق دوسروں کے فیصلے استعمال کرتے کرتے وُہ خود کوئی فیصلہ کرنے سے ہمیشہ جھجکتا تھا۔ ایسے میں اگر کچھ بن پڑتا تو صرف انکار ہی۔ اور اس انکار میں فرار مضمر تھا۔

مجھ سے دو تین مرتبہ اپنے عشق کا اقرار کر چکنے کے بعد ایک دن اکرم نے کہا: "شاید مجھے تسنیم سے محبت نہیں اور یہ صرف میرا خیال ہے اور شاید تسنیم ایسی خوبصورت بھی نہیں جیسا میں اُسے سمجھتا ہوں اور اس کا رنگ بھی سانولا ہے۔ شاید یہ میرے تخیّل کی فریب کاری ہے یا کوئی اور جذبہ ہے جسے میں نے محبت کا نام دے دیا ہے۔ یا شاید کچھ بھی نہیں صرف خیال ہی خیال ہے . . . صرف خیال بلکہ ایک سطحی جذبہ . . . اور تسنیم کی آنکھیں بھی . . . شاید آنکھیں بھی . . . شاید آنکھوں کی تحریر بھی محض فسانہ ہے . . . لیکن اس کی آنکھیں . . لیکن محض آنکھوں کی بنا پر کوئی . . . ."

میں نے کہا: "تم بھی عجیب شکّی مزاج کے آدمی ہو . . . تمہیں اپنے متعلق بھی شک ہے . . . پھر یہ کونسا کُلیہ ہے کہ محبوب کا رنگ گورا ہونا چاہیئے۔ یا کون ہے جس نے آج تک محبوب کا ناک نقشہ اور خدوخال مقرّر کئے ہیں اور یہ کہاں لکھا ہے کہ محبت کرنے سے پہلے محبوب کی پیمائش کی جائے . . . برادرم دُنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو حساب کے سوالوں کی طرح حل نہیں کی جا سکتیں . . ."

اس کے باوجود اس کی روح کی گہرائیوں میں تسنیم کی محبت ایک شمع کی طرح جلتی رہی۔ دھیمے دھیمے اور خاموش۔ وہ ایک سطحی لہر تھی اور اس کی محبت تہ میں جلتا ہوا ایک دیا اور ایسے موقعوں پر سطح اور تہ میں بلا کا تضاد ہوتا۔ یہ دُرست ہے کہ اس کی محبت ایک بھڑکتا ہوا شعلہ نہ تھی کہ آن کی آن میں اُس کی ہستی کو جلا کر بھسم کر دیتی۔ لیکن وُہ بہت دیر تک دھیمی سی لو سے جلنے والی ایک موم بتی کی طرح اُس کی رُوح میں ٹمٹماتی رہی اور وُہ دیر تک اس کی موجودگی کا فیصلہ نہ کر سکا اور مجھے یاد ہے کہ دھیمی دھیمی لو سے جلنے والی یہ شمع صرف ایک مرتبہ شعلہ بنی۔

جب عشق ہو جائے تو محبوب کے سامنے اس کے اظہار کی خواہش ایک فطری بات ہے۔ اس قسم کی خواہش اکرم کے دل میں بھی پیدا ہوئی ہوگی - لیکن مجھے ایک واقعہ یاد ہے۔ سردیوں کی ایک ابر آلود شام تھی۔ گہرے رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم سانولا اور حسین تھا۔ اس کا دل بہت چاہا اور وُہ تسنیم کے گھر کی طرف چل پڑا۔ صفیہ اس وقت اپنا کام چھوڑ کر کھڑکی میں سے نیچے آتے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے اسے دُور ہی سے پہچان لیا اور بولی: "وُہ رہا اکرم۔" وُہ اندر داخل ہوا ہی تھا کہ بوندیں پڑنے لگیں۔

وُہ حسبِ معمول کرسی گھسیٹ کر صفیہ کے پاس جا بیٹھا۔ بُوندیں ہوا سے اڑ اڑ کر کھڑکی سے اندر آنے لگیں۔ صفیہ نے کھڑکی بند کر دی۔ بوندیں کھڑکی کے شیشوں پر گرتیں اور پھسل جاتیں۔ وُہ صفیہ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا اور پھر کھڑکی کے شیشوں پر بوندوں کا رقص دیکھنے میں مشغول ہو جاتا دفعتہً تسنیم سلیٹی رنگ کا ایک کوٹ سوئٹر پہنے کمرے میں داخل ہوئی اور صفیہ کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ وُہ حسبِ معمول اس کی لمبی گھنی پلکوں اور سیاہ آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ تسنیم نے جھکی ہوئی آنکھیں اُٹھائیں اور پھر جھکا لیں —— اندھیرے میں بجلی کوند گئی۔ اگرچہ آپ نے بارہا مشاہدہ کیا ہوگا کہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک دم بجلی کوند جاتی ہے اور آپ اسی مقام پر نظریں جمائے منتظر رہتے ہیں کہ پھر وہاں بجلی چمکتی ہے۔ لیکن آپ نے بیک وقت کوندے اور شفق کا نظارہ کبھی نہیں کیا ہوگا —— اندھیرے میں بجلی چمکتی اور شفق کی سُرخی پھیل جاتی۔

اکرم کو محسوس ہوا کہ وُہ بہت دیر سے اُس کی آنکھوں اور چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے اور دیکھتے رہنے کا احساس جب شدت اختیار کر گیا تو اُس نے نظریں ہٹا لیں اور کھڑکی کے باہر گاڑھے دھوئیں کے مانند اندھیرے میں دیکھنے لگا جہاں پانی برس رہا تھا اور جس میں گرتی ہوئی بوندیں کبھی کبھی ایک پل کے لئے جگنو کی طرح چمک اُٹھتیں جیسے کسی گہرے تہ خانے میں دیئے جل رہے ہوں۔

اور اکرم نے پوچھا "آج روفی کہاں ہے؟"

صفیہ نے جواب دیا "وُہ اپنے کسی دوست کے ہاں گیا تھا۔ ابھی تک نہیں لوٹا۔ بارش کی وجہ سے رُک گیا ہوگا۔"

اصرار کیا گیا کہ کھانا یہیں کھا لو لیکن وُہ انکار ہی کرتا رہا۔ تاہم اس کا انکار بالکل بے کار تھا۔ کھڑکی سے باہر چیختی ہوئی ہوا کی طرح جو اندھیرے کے گاڑھے دھوئیں کو اڑا دینے سے قاصر تھی۔

تسنیم نے اس کے لئے میز پر کھانا لگایا اور دو دفعہ نوالہ اس کے حلق میں جا کر پھنس گیا۔ سردیوں کی بارش تھی تھمنے کا نام نہ لیتی تھی اور تھمنے کا انتظار بھی کسے تھا ذرا کم ہی ہو جاتی تو وُہ نکل جاتا۔ آخر خُدا خُدا کر کے بارش کا زور ذرا کم ہوا تو وُہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ تسنیم نے کہا "ذرا ٹھہریئے۔ میں لالٹین جلا دوں۔ ڈیوڑھی میں بہت اندھیرا ہے۔" اور اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ تسنیم خود اُسے دروازے تک پہنچانے آئی ہے۔ اس نے کچھ رُکتے رُکتے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں اسے ایک عجیب قسم کی چمک دکھائی دی۔ اس کے کان اور رخسار تپنے لگے اور اس نے کہا "آپ تو آتیں ہی نہیں۔ کل آپ ضرور آئیے —— کل ضرور ——"

"جی اچھا"

لیکن ابھی وُہ ایک بات اور کہنا چاہتا تھا اور وُہ بات اس کے حلق میں اٹک گئی "آپ . . . آپ . . . آپ کل ضرور آئیے . . . آپا آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔"

آپا اور تسنیم کی یاد —— ! یہ تو صاف جھوٹ تھا۔ پھر یہ تو نہیں تھی وُہ بات جو وُہ کہنا چاہتا تھا۔ پھر اُس نے یہ جھوٹ کیوں بولا۔ کس نے اسے مجبور کیا ——؟

تاہم اس ملاقات کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اس کا جی چاہا کہ وُہ سڑک کے کنارے کنارے بجلی کی لمپوں کے ساتھ ساتھ جن کی روشنی منجمد دکھائی دیتی تھی دوڑتا ہوا گھر جاتے —— لیکن سڑک پر جا بجا کیچڑ ہو رہی تھی —— !

ایک دن اکرم کی ماں نے اکرم کی موجودگی ہی میں کہا "اللہ رکھے اب میں اکرم کی منگنی کر دوں گی۔ لڑکیاں تو بہت ہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ اکرم کو کوئی اچھی سی ملازمت مل جائے تو دیکھ کر اس کی منگنی کسی اچھے سے گھر میں کر دوں۔ ویسے تو تسنیم کی اماں بھی ایک دفعہ باتوں باتوں میں ظاہر کر چکی ہیں جیسے وُہ اس انتظار ہی میں ہیں کہ ہم ان سے اکرم کے لئے تسنیم کو مانگ لیں مگر میں نے بات زیادہ چلائی نہیں۔ اس لئے وُہ بھی خاموش ہیں۔ لیکن ان کی مرضی ضرور ہے۔ لڑکی تو اچھی ہے۔ لیکن میں اس گھرانے میں رشتہ کرتے ہوئے ذرا ڈرتی ہوں"۔

آپا صغریٰ نے کہا "لڑکی کیا خاک اچھی ہے۔ ایسی خوبصورت بھی نہیں۔ رنگ بھی سانولا ہے میں تو اکرم کی شادی ہرگز یہاں نہ ہونے دوں گی اور دیکھنا میں اس کے لئے کیا پری سی دلہن ڈھونڈ کے لاتی ہوں"۔ پھر اکرم کی طرف دیکھ کر اس نے قدرے مسکرا کر کہا "میں جانتی ہوں شمشاد کی لڑکیاں بڑی چالاک ہیں کسی کو رام کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ میں بتاؤں اکرم کی مرضی تو یہی ہوگی کہ اس کی شادی تسنیم سے ہو جائے لیکن میں تو یہ رشتہ ہرگز نہ ہونے دوں گی"۔

اکرم ایک دم گھبرا گیا جیسے اس کی چوری پکڑ لی گئی ہو۔ کہنے لگا "نہیں نہیں، میں کب کہتا ہوں . . . آپا تو یونہی . . ."۔

اور ماں کہنے لگی "صغریٰ تو خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے"۔

اکرم نے اپنی مرضی کو اس طرح سے چھپا لیا جیسے چوری کا مال ہو۔ اس وقت اس کی حالت اس چور کی سی تھی جو چوری کا مال کسی خفیہ تہ خانے میں چھپا آئے اور باہر آ کر کہے "نہیں نہیں، یہاں تو کچھ بھی نہیں"۔

مجھے اس واقعے کا علم اس وقت ہوا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ تسنیم کے والدین یا تو ادھر سے مایوس ہو گئے۔ یا شاید ان کے کانوں تک آپا کی یہ بات پہنچ گئی کہ ہمارا تو لڑکا ہی نہیں مانتا۔ چنانچہ انہوں نے تسنیم کے پیغامات میں سے ایک کا انتخاب کر کے جلدی سے تسنیم کا نکاح کر دیا۔ یہی وُہ وقت تھا جب اکرم کے دل میں تسنیم کی محبت شعلہ بنی۔

اس موقع پر اس کی حالت اس گاہک کی سی تھی جو شوکیس میں رکھی ہوئی چیز کو دیکھ کر تذبذب میں پڑ جائے اور خریدوں یا نہ خریدوں کی اُلجھن میں گرفتار ہے کہ اتنے میں کوئی اور آ کر اس چیز کو خرید لے جائے تو چیز کو ہاتھ سے جاتے دیکھ کر اسے صدمہ پہنچے اور ایک دم اس کے دل میں اس چیز کی قدر بڑھ جائے اور وُہ کہے "میں تو اسے خریدنے ہی والا تھا"۔

وُہ فیصلہ جو اسے بہت پہلے کر چکنا چاہئے تھا۔ اس نے اپنی محبوب لڑکی کو کھو کر کیا تھا۔ اس وقت اگر کوئی بھی اس سے پوچھتا "کیا تمہیں تسنیم سے عشق ہے"؟ تو وُہ یقیناً جواب دیتا "ہاں"۔ لیکن اب وقت ہاتھ سے جا چکا تھا۔

جس دن ہم نے یہ خبر سنی۔ اُس دن وُہ بہت مضطرب تھا۔ رنگ سفید پڑ گیا اور آواز میں کپکپی تھی۔ وُہ ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اگر کرسی پہ بیٹھا ہوتا تو ٹہلنے لگتا۔ اگر ٹہل رہا ہوتا تو کسی جگہ بیٹھ جاتا۔ مجھ سے کہنے لگا "میں اب یہاں زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ میرے لئے یہاں رہنا اب بہت مشکل ہے۔ یہاں رہوں گا تو شاید پاگل ہو جاؤں گا۔ میں زاہدان چلا جاؤں گا۔ ریلوے کو زاہدان میں چند آدمیوں کی ضرورت ہے۔ دو تین دنوں سے اخبار میں یہ اشتہار نکل رہا ہے۔ اُمیدواروں سے ذاتی طور پر حاضر ہونے کو کہا گیا ہے۔ میں سوچتا ہوں میں زاہدان چلا جاؤں"۔

اور وُہ واقعی زاہدان چلا گیا۔ جب میں اسٹیشن پر اسے پہنچانے گیا تو مصافحہ کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جب گاڑی چلنے لگی تو وُہ زور زور سے رومال ہلانے لگا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔

مقبول حسین احمد پوری

گیت

بنی ہوئی ہے دُنیا موسم بدل رہی ہے بارم بار
نرتیہ رہا برہمانڈ[1] کا کن کن[2] لئے ہوئے گت[3] اپرم پار
شانت مُوکتا[4] آشاؤں کی جگت جیون کا ہے آدھار[5]

چوم رہی آکاش کو ہِم منڈت[6] پربت کی یہ دیوار
لیکن یہ اک جوالا مکھی ہے، انگ[7] میں اپنے لئے انگار

دیکھ رہا مدھوماس[8] کے سپنے بھر مایا بھولا سنسار

بنی ہوئی ہے دُنیا موسم بدل رہی ہے بارم بار!

[1] برہمانڈ = عالمِ وجود۔ دُنیا
[2] کن کن = ذرّہ ذرّہ
[3] گت = رفتار
[4] مُوکتا = گونگاپن
[5] آدھار = بنیاد
[6] ہِم منڈت = برف سے ڈھکا ہوا
[7] انگ = آغوش
[8] مدھوباس = بسنت۔ بہار

صفیہ شمیم ملیح آبادی

رُباعیات

پھر دولتِ بادِ صُبحگاہی آئی
پھولوں کو نویدِ کجکلاہی آئی
یُوں باغ میں کوئی مُسکراتا آیا
موسم کو جماہی پہ جماہی آئی

ہستی کو مری وقفِ سعادت کر دے
ظلمت میں عیاں صُبحِ حقیقت کر دے
شرمائیں جسے دیکھ کے حُور و غلماں
وُہ دل کو عطا نُورِ محبت کر دے

ویران ہوئی جاتی ہے بزمِ عالم
اخلاق کا ہو رہا ہے ہر سُو ماتم
ہر سمت بھڑکتے ہیں فنا کے شعلے
اب چھین لے اللہ کمالِ آدم

وُہ تابشِ برگ و بار آتا ہوگا
وُہ رونقِ سبزہ زار آتا ہوگا
کمہلاؤ نہ گلشن کے شگوفو ٹھہرو
وہ پیکرِ نوبہار آتا ہوگا

حضرت شیخ عبدالقادر بالقابہ

جناح رح کے بغیر

موجودہ پرچے کی کتابت شروع ہو چکی تھی جب ہمیں حضرت مدیر اعزازی کی توجہ سے یہ مضمون اشاعت کے لئے بلا۔ ہم حضرت ممدوح کے علاوہ ریڈیو پاکستان لاہور کے بھی ممنون ہیں جن کی نوازش سے ہمیں اس کے مسودہ کی نقل حاصل ہوئی۔ "مخزن"

جب لارڈ ویول کے زمانے میں شملہ میں کانگرس اور لیگ کے درمیان کسی ممکن سیاسی سمجھوتے کے لئے بات چیت ہو رہی تھی، اس وقت میں بھی حسن اتفاق سے شملہ گیا ہوا تھا۔ ایک دن ایک غیر مسلم نیشنلسٹ جو میرا واقف تھا۔ راستے میں ملا اور اس نے نہایت تبختر سے مجھے یہ خبر سنائی کہ کانگرس کے بڑے بڑے اراکین اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ وہ اگر قائد اعظم کو راضی کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو وہ ان کی شرکت کا انتظار کئے بغیر جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، کر گزریں گے۔ ان دنوں نئے نئے فارمولے بہت بنتے تھے اور عموماً انگریزی الفاظ کی صورت اختیار کرتے تھے۔ میرے ملاقاتی نے بڑے جوش کے ساتھ جو لفظ انگریزی میں کہے۔ ان کا ترجمہ یہ تھا۔

"جناح کو ساتھ لے کر (اگر ممکن ہو) ورنہ جناح کے بغیر"

میں نے تعجب سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ مگر اس سے کسی بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ الفاظ محض دھمکی ہیں۔ ورنہ کانگرس کے زیادہ پرانے لیڈر خوب سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے ہم آہنگ ہونے بغیر برطانوی حکومت انہیں آزادی دینے کی طرف مائل نہیں ہوگی اور مسلمانوں کی باگ اس وقت قائد اعظم کے ہاتھ میں تھی۔ اسی زمانے میں انگلستان کے بعض ہمدردان کانگریس کی آواز تھی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کی بڑی اکثریت کی خواہشوں اور آرزوؤں کا راستہ روکنے کی اقلیت کو اجازت دی جائے۔ اس آواز نے اس دھمکی کے لفظوں میں اور بھی زور پیدا کر دیا تھا اور یہ نعرہ کانگریس کے حلقوں میں بہت عام ہو گیا۔ بظاہر اس نعرے کے حق میں کئی دلائل تھیں مگر جو غلطی اس جماعت کے سیاست دانوں اور وہاں کے بعض ہمدرد انگریزوں سے ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ انہوں نے قائد اعظم کو صرف ایک واحد فرد سمجھا اور اس بات کا احساس نہ کیا کہ اس کی آواز اس کی پوری قوم و ملت کی آواز تھی۔

کانگرس اور لیگ کے مقابلے اور متقابل صف آرائی کا یہ پہلا موقع نہ تھا۔ اس سے پہلے کئی معرکے ہو چکے تھے اور پھر انگلستان سے کمیشن کی آمد پہ بھی بہت سے مقابلے ہوئے مگر جو غیر مساوی سیاسی مقابلہ شملے کی اس کانفرنس کے موقع پہ ہوا اس جیسی نمائش پہلے نہ ہوئی تھی۔ اس نمائش کا یہ پہلو خاص طور پر قابل دید تھا کہ ایک طرف گاندھی جی اپنے جاماتائی لباس میں ملبوس اور اپنے بے شمار پیروؤں کے جھگمٹے کے ساتھ، شملے میں پہونچے اور مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت صدر کانگرس تشریف لائے۔ یو پی کے وزیر اعظم مسٹر پنت ان کے ترجمان کی حیثیت سے ہمراہ آئے۔ گاندھی جی راج کماری امرت کور کے دولت کدہ میں فروکش ہوئے۔ یہ مکان اپنے ممتاز مکین کی طرح خصوصیت رکھتا تھا یعنی وہ خاتون کھدر کے لباس میں ملبوس، کیمبرج اور آکسفورڈ کی بہترین انگریزی بولتی تھی اور اس کی لباس کی سادگی کے باوجود اس کے کمرے زینت اور آرائش مشرقی اور مغربی

دونوں سجاوٹوں کے نمونے دکھاتی تھی۔ کانگریس کی اور بڑی شخصیتیں بھی بڑی تعداد میں اس موقع کے لئے شملہ میں جمع تھیں اور وہ سب الگ۔ راجکماری صاحبہ کے یہاں آ کر صلاح و مشورے میں شریک ہوتے۔ اس انبوہ کے مقابلے میں، لیگ کی طرف سے قائدِ اعظم ہوٹل کے ایک کمرے میں متمکن تھے۔ ان کی اپنی خداداد چمک کے سوا کوئی چمک دمک کا سامان اُن کے ہمراہ نہیں تھا۔ گویا ایک دُبلا پتلا شخص الف کی طرح سیدھا یکہ و تنہا ایک گروہ کا سامنا کرنے پر مامور تھا۔ ایک اور چیز جو کانگرس کے حق میں پلڑا جھکانے کا باعث تھی، وُہ کانگریس کے پریس کی طاقت تھی۔ اس جماعت کے سب بڑے بڑے اخباروں نے اپنے نمائندے اس کانفرنس میں بھیجے تھے اور وُہ اپنا پورا توپ خانہ لیگ اور مسلمانوں کے خلاف اور کانگریس کے حق میں استعمال کر رہے تھے۔

بعض چھوٹی چھوٹی مصنوعی ترکیبیں تھیں جن کی کانگریس والوں کو خوب مشق تھی اور جن کا دوسری طرف وجود نہ تھا۔ مثلاً کانگریس کے کیمپ میں یہ معمول تھا کہ صدرِ کانگریس وائسرائے کے یہاں جاتے وقت مہاتماجی سے برکت اور دُعا لے کر جائیں اور آتے وقت مہاتماجی کو ساری کارگزاری کی رپورٹ سُنا کر جائیں۔ یہ سمجھنا ہم معمولی قسم کے انسانوں کے فہم سے بالاتر تھا کہ کانگریس کے صدر کے فرائض میں مہاتماجی کے یہاں، یہ حاضر باشی کیوں داخل تھی، جب کہ مہاتماجی اس اعلان سے کسی وقت نہ تھکتے تھے کہ وُہ تو صرف ایک ہمدرد مشیر کی حیثیت سے آئے ہوئے ہیں۔ ورنہ کانگریس میں ان کی حیثیت چار آنے ماہوار دینے والے ممبر کی بھی نہیں مگر صدر پر یہ پابندی عائد کرنے سے جو اثر گاندھی جی کے متعلق پبلک پر یا وائسرائے پر پڑتا تھا وُہ ظاہر ہے۔ قائدِ اعظم نے کسی ایسے بیرونی اثر سے اس کانفرنس میں کسی اور موقع پر کام نہیں لیا۔ وُہ صرف مسٹر محمد علی جناح کہلانے پر قانع رہے۔

صدرِ کانگریس کی روزانہ آمد و رفت مہاتما گاندھی کے یہاں تو پھر بھی ایک سیاسی اہمیت رکھتی ہے۔ کانگریس والوں نے تو ایک غیر سیاسی بات سے اس موقع پر فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی، حالانکہ انہیں اس بات سے قدرے اجتناب لازم تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن لارڈ ویول کے جی میں یہ خیال آیا کہ گاندھی جی کو اپنے یہاں بلائیں اور اُن سے باتیں کریں۔ اس کے لئے ان کی خدمت میں خط بھیج دیا گیا جس میں یہ لکھا تھا کہ وائسرائے صاحب اپنی سواری کا خاص رکشا مہاتماجی کو لانے کے لئے بھیجیں گے۔ جب یہ خبر نکلی تو بعض لوگوں کو یہ اندیشہ تھا کہ مہاتماجی چونکہ اصولاً رکشا کی سواری کو مذموم سمجھتے ہیں اور پسند نہیں کرتے کہ انسان، انسانوں کو گھوڑوں کی طرح استعمال کرے۔ اس لئے وُہ شاید رکشا پر سوار ہونے سے انکار کر دیں مگر معلوم نہیں کہ کس مصلحت سے اُنہوں نے اس موقع پر رکشا پر جانا قبول کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں عوام جن میں بہت سے مشہور مقامی کانگریسی بھی تھے۔ وائسرائے کے گھر کے باہر سڑک پر دو رویہ کھڑے ہو گئے کہ گاندھی جی کو رکشا میں بیٹھے دیکھیں۔

ایک طرف بناوٹ اور دوسری طرف سادگی۔ اس کی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ باتوں باتوں میں جو تھوڑا سا ذکر آ گیا۔ وہ کافی ہے۔ وہ کانفرنس چونکہ بے نتیجہ رہی۔ اس لئے اس کے تفصیلی حالات میں جانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ فقط ایک چیز کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیئے۔ وہ یہ ہے کہ اس کانفرنس کے اختتام پر بھی کانگریس والے کہتے تھے اور دوسرے موقعوں پر بھی کہا گیا کہ قائدِ اعظم کی طبیعت میں ضد تھی اور اُن کی ضد کے سبب برطانوی حکومت پاکستان کو علیحدہ مملکت تسلیم کرنے پر مجبور ہوئی۔ یہ بات درست نہیں۔ قائدِ اعظم ارادوں کے پکے اور مضبوط عزم والے ضرور تھے اور جو بات غور و خوض کے بعد وُہ صحیح مان لیتے تھے۔ اس سے انہیں دوسری طرف پھیرنا آسان نہ تھا۔ لیکن جس معنی میں "ضد" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ قائدِ اعظم اس سے بہت بلند تھے۔ قائدِ اعظم سیاسی گتھیوں کو سلجھانے میں کسی قسم کی ضد کو

دخل نہیں دیتے تھے۔ ان کا عمر بھر کا رویہ ان کی با اصول زندگی اور خلوص اس کی شہادت دیتا ہے۔ جب سے انہوں نے سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ اپنی عمر کے آخری دس پندرہ سال چھوڑ کر برابر نیشلسٹ رہے اور اُن کی اسمبلی کی اور دوسرے مواقع کی تقریریں جو اب شائع ہو چکی ہیں۔ اس بات کی شاہد ہیں کہ قائدِ اعظم جس راہ پر چلتے تھے۔ اس پر ثابت قدم رہے۔ یہاں تک کہ جب انہیں لیگ سے تعلق ہو گیا اور مسلمانوں کی خاص ضروریات کا احساس اُن کے اندر پیدا ہوا۔ تب بھی وُہ عرصے تک اس کوشش میں رہے کہ جس طرح ہو سکے لیگ اور کانگریس میں تعاون پیدا کریں اور دونوں مل کر متحدہ مقاصد کو مدد پہنچائیں، مگر جب انہیں بار بار کی مایوسیوں اور تلخ تجربوں سے یقین ہو گیا کہ ابنائے وطن چکنی چپڑی باتوں کے علاوہ کسی طرح بھی مسلمانوں کی تعلیمی، صنعتی، تجارتی یا سیاسی ترقی میں مدد دینے کو تیار نہیں اور ان کی حیثیت کو ملک کی اکثریت میں مدغم کر دینا چاہتے ہیں۔ تب اُنہوں نے آواز بلند کی کہ ملک میں دو قومیں ہیں اور دونوں کو اپنی اپنی روایات اور تمدن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق ہے۔ یہ عقیدہ ان کے دل میں رفتہ رفتہ راسخ ہوتا گیا اور اُس نے پاکستان کی صورت اختیار کی۔ اس پر بھی وُہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کی خواہش تھی۔ کہ یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے اچھے ہمسائے بنیں اور ان سب چیزوں میں جن میں مل کر کام کرنے میں دونوں کا فائدہ ہو، مل کر کام کر سکیں۔ افسوس ہے کہ دوسری جانب سے ان کے اس دوستانہ رویہ کے جواب میں ان کے ہم خیال بہت زیادہ نہ نکلے۔ تاہم قائدِ اعظم نے جو پیغامات مختلف موقعوں پر پاکستانیوں کو دیئے ہیں۔ اُن میں اُس کی تلقین موجود ہے۔

پاکستان اور ہندوستان دونوں کو جیسی اور جتنی آزادی ملی ہے۔ وُہ قائدِ اعظم اور گاندھی جی کے اشتراک کا نتیجہ ہے۔ جب ہند کو چھوڑ جاؤ کی آواز میں دونوں شریک ہوئے۔ تب سے منزل قریب آئی۔ آہ! افسوس کہ ان دونوں بزرگوں کی رہنمائی سے دونوں جماعتیں محروم ہو گئیں اور دونوں ایک دوسرے سے تھوڑے وقفے کے بعد اس دُنیا سے رحلت کر گئے۔ آج ہم پاکستانی پھر جناح کے بغیر ہیں اور گھر گھر اُس کے ہم سے رخصت ہو جانے کا سوگ ہو رہا ہے۔ مگر جناح کے بغیر کی جو آواز میں نے شملے میں سُنی تھی۔ اس میں اور اس وقت جناح کے بغیر ہونے کی آواز میں بہت فرق ہے۔ اس وقت پاکستان محض قائدِ اعظم کا خواب تھا۔ اب وُہ اپنے خواب کی تعبیر اپنی زندگی میں دیکھ کر اس جہاں سے رخصت ہوئے۔ اب جناحؒ کا جسم تہِ خاک چلا گیا ہے۔ مگر اس کی رُوح پاکستان کی ترقی کرتی ہوئی زندگی کو دیکھ رہی ہے اور جو ہدایات اُس نے ہمارے لئے چھوڑی ہیں۔ وُہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں اور اُن سے ہماری ہمت بندھ رہی ہے۔ پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں وُہ مدفون ہے۔ جہاں دُنیا کے ہر حصے سے ممتاز اشخاص اور اکابر آ کر اس کے مزار پر پھول چڑھاتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ کس طرح اُس نے ایسی بڑی مملکت مسلمانوں کے لئے کسی جنگ و جدل کے بغیر حاصل کر لی۔ آج لاکھوں بلکہ کروڑوں فرزندانِ توحید اس یگانۂ روزگار شخص کی روح کو ثواب پہنچا رہے ہیں اور جوشِ عقیدت سے پاکستان زندہ باد کے ساتھ، قائدِ اعظم زندہ باد کے نعرے بھی لگاتے ہیں۔ وُہ اپنی ملت کا سچا عاشق تھا اور اسی کی خدمت کرتے کرتے بستر مرگ پر لیٹ گیا۔ حافظ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ظفر اقبال

انسان کی آواز

جو اُفقِ فردا سے آ رہی ہے

میں ہوں افسانۂ تخلیق کا عنواں اے دوست!
میں اُٹھا سکتا ہوں اسرار کے رُخ کے پردے
ہوں بلندی پہ لئے مشعلِ عرفاں اے دوست!
کھول سکتا ہوں میں تقدیرِ اُمم کے عقدے
ہے مرے نور سے یہ بزم چراغاں اے دوست!
مجھ میں وُہ نورِ حقیقت ہے کہ میرے آگے
پکڑے رہتا ہوں سدا شوق کا داماں اے دوست!
پھیلتا ہے مہ و خورشید کا داماں اے دوست
میں ہوں افسانۂ تخلیق کا عنواں اے دوست!
میں ہوں افسانۂ تخلیق کا عنواں اے دوست!

ابھی دُنیا کے لئے دُور کی آواز ہوں میں
کوئی مشکل مجھے رستے سے ہٹا سکتی نہیں
سینۂ عالمِ تخلیق کا اک راز ہوں میں!
کوئی طاقت مجھے رفعت سے گرا سکتی نہیں
ہاں بلندی کی طرف مائلِ پرواز ہوں میں!!
کوئی پستی مرے افکار پہ چھا سکتی نہیں
محو، پرواز میں ہے شہپرِ عرفاں اے دوست!
ہیں ملائک مری پرواز سے حیراں اے دوست!
میں ہوں افسانۂ تخلیق کا عنواں اے دوست
میں ہوں افسانۂ تخلیق کا عنواں اے دوست

زندگانی کے نگیں غرق ہوئے ہیں جس میں
اک نئے دَور کا پیغام سُناتا ہوں میں
یہ مکاں اور مکیں غرق ہوئے ہیں جس میں
آئینہ، دل کا، زمانے کو دکھاتا ہوں میں
مہ و خورشید و زمیں غرق ہوئے ہیں جس میں
نغمۂ امن و اماں وجد میں گاتا ہوں میں
میرے دل میں ہے محبت کا وُہ طوفاں اے دوست
ختم ہے دورِ سیہ، ظلم ہے لرزاں اے دوست!
میں ہوں افسانۂ تخلیق کا عنواں اے دوست
میں ہوں افسانۂ تخلیق کا عنواں اے دوست!

محمد خلیل الرحمٰن

حلقۂ اربابِ ذوق اور موجودہ ادبی نظریے

(یہ مضمون حلقۂ اربابِ ذوق کی مرکزی مجلسِ انتظامیہ کی فرمائش اور منظوری سے حلقے کے گزشتہ سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا)

حلقۂ اربابِ ذوق کو ہر نظریۂ ادب سے ایک مخصوص نسبت ہے اور اسے کسی مخصوص نظریۂ ادب سے نسبت نہیں ہے۔ اس سے ہماری مرادیہ ہے کہ اس انجمن کا نصب العین ہر ادبی نظریے کی اس حد تک تائید کرنا ہے جس حد تک وہ ادب کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرتا ہو کسی ایسے ادبی نظریے کی تلقین و ترویج نہیں ہے جس کی رو سے ادب کو کسی غیر ادبی مقصد کے لئے استعمال کرنا یا ادب پر غیر ضروری پابندیاں عائد کرنا جائز ہو۔ حلقۂ اربابِ ذوق کا مقصد جیسا کہ اس انجمن کے نام ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے، تنقید ی ہے موضوعی نہیں۔ لہٰذا یہ انجمن ادب کے ان تمام مسلمات، روایات، رجحانات اور امکانات کی حامی ہے۔ جو متوازن اور منصفانہ تنقید کے لئے لازمی ہیں اور کسی ایسے مفروضے، تصور یا پابندی کو جائز نہیں سمجھتی جو ادب کی بحیثیت ادب وسعت وارتقا میں حائل ہو سکے۔

حلقۂ اربابِ ذوق اور مروجہ نظریات ادب کی مخصوص نسبت پر روشنی ڈالنے اور یہ بتلانے سے پہلے کہ اس انجمن کے مقامِ نظر سے مختلف نظریاتِ ادب کس حد تک قابلِ قبول ہیں۔ ادب کا ایک جامع مفہوم متعین کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے یعنی ادب کا ایک ایسا مرکزی تصور قائم کرنا ضروری ہے جس کی روشنی میں دورِ رواں کے نظریاتِ ادب کی خوبیاں، کوتاہیوں اور خرابیوں کا سراغ لگانا آسان ہو جائے۔

ادب کے بنیادی تقاضے کیا ہیں یا ادب کیا ہے؟ اس سوال کا کوئی قطعی یا آخری جواب ممکن نہیں۔ ادب کی اساس زندگی ہے۔ اس لئے زندگی کی طرح ادب میں بھی بے پایاں قوتِ نمو اور صلاحیت ارتقا ہے۔ اس حقیقت سے واضح ہو جاتا ہے کہ ادب جیسی بڑھتی، بھیلتی، پھولتی اور پھلتی چیز کو کسی ایک تعریف کی حد میں لانا ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہزارہا سال کی ادبی تخلیقات اور ان سے متعلق تنقید و نظر کا جو سرمایہ موجود ہے۔ اس کی مدد سے ادب کی ماہیت کے بارے میں ایک جامع تصور قائم کیا جا سکتا ہے یعنی ادب کی وہ خصوصیات بیان کی جا سکتی ہیں۔ جن سے ادب کا وسیع ترین مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر ہمارے نزدیک ادب کے زمرے میں صرف اس تصنیف کو شمار کیا جا سکتا ہے جو اپنے نفسِ مضمون اور اندازِ بیان کی خصوصیت کے اعتبار سے انسان کے لئے بحیثیتِ انسان دلکشی رکھتی ہو۔ یعنی جس میں انسان کے لئے بحیثیت سائنسدان فلسفی سیاستدان یا اسی نوعیت کے کسی اور مخصوص زاویہ نظر سے جاذبیت کا کوئی پہلو نکلے یا نہ نکلے۔ لیکن بحیثیتِ انسان دلکشی کا سامان ضرور موجود ہو۔ ایک ادبی تصنیف اور کسی دیگر علمی تصنیف میں سب سے اہم فرق یہ ہوتا ہے کہ علمی تصنیف کا واحد مقصد علم میں اضافہ کرنا ہوتا ہے لیکن ادبی تصنیف علم میں اضافہ کرے یا نہ کرے۔ زندگی کے عناصر کو ایک ایسی صورت میں ضرور پیش کرتی ہے کہ وہ اس صورت میں انسان کی جمالیاتی تسکین کا باعث ہوں۔ علم میں اضافہ کرنا ادب کا بھی ایک بلند مقصد ہے۔ کیونکہ انسانی علم کا مجموعی مقصد زندگی کو توہمات اور جہالت

کی آلودگی سے پاک کرکے صاف اور آبدار بنانا ہے۔ اس کی کثافتوں کو دُور کرکے اسے حسن کی دولت سے مالا مال کرنا ہے۔ اس لحاظ سے علم کا مجموعی مقصد اپنی نوعیت کے اعتبار سے جمالیاتی کہلا سکتا ہے اور اس مقامِ نظر سے اضافی طور پر ادب کا مقصد بھی علم میں اضافہ کرنا ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن معنوں میں نہیں ہو سکتا جن میں اقتصادیات کی کسی کتاب کا ہو سکتا ہے۔ ادب کے لئے انسانی زندگی مجموعی طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس کا تعلق زندگی کے کسی مخصوص پہلو سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو قانون اور انصاف کا تضاد، محبت اور رسمی قوانین کی کشمکش احساسِ حسن اور احساس فرض کی رقابت جیسے فلسفیانہ نوعیت کے موضوع ادب کی جان رہے ہیں اور دوسری طرف خوابوں خیالوں کی اور حور شمائل دوشیزاؤں کا طلسم ادب کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ لالۂ صحرا سے لے کر شہروں کی گھناؤنی گلیوں میں بسنے والی سسکتی مخلوق تک ہر چیز اور ہر مسئلہ ادب کا موضوع ہے۔ بشرطیکہ اس کا تعلق اس توازن سے ہو جو زندگی کے مجموعی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ پھر یہ توازن چونکہ زندگی کے متحرک عناصر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے آزادیٔ فکر اور اجتہادِ نظر بھی ادب کی ایک اہم خصوصیت رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

مختصر طور پر ادب کا یہ تصور قائم کرنے کے بعد ہم حلقۂ اربابِ ذوق اور مروجہ نظریاتِ ادب کی مخصوص نسبت پر روشنی ڈالتے ہیں نظری بحث و مباحثہ کے اعتبار سے اردو ادب کا موجودہ دَور نہایت اہم ہے۔ اس سے پہلے تنقید و تبصرہ پر اتنا زور کبھی نہیں دیا گیا۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں جن سے فی الحال ہمیں سروکار نہیں۔ البتہ یہ بتانا مقصود ہے کہ موجودہ دور میں بے شمار ادبی نظریے پیش کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ادیبوں کی چھوٹی سے چھوٹی جماعت اور محدود سے محدود طبقے نے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ سیاسی اور سماجی طور پر یہ دَور چونکہ ایک بحرانی دور ہے اور اس میں فکر و نظر کے ہر شعبے میں تشکیک کا دور دورہ ہے۔ اس لئے ہر ادبی رائے کو نظریے کا جامہ پہنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ صرف ان نظریاتِ ادب کا ذکر کیا جائے جن سے ادب میں واقعی کچھ رُخ قائم ہو گئے ہیں۔

دورِ حاضر کے اہلِ قلم کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی ایک طبقہ وُہ ہے جو قدامت پسند کہلاتا ہے اور دوسرا وُہ جو جدید ادب کا حامی ہے۔ یہ تقسیم پہلے ہی سے موجود ہے اور اس کا ذکر کرنے سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ان اسباب کی تائید کرتے ہیں جو اس تقسیم کے سلسلے میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس تقسیم سے ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ادیبوں کے دو بنیادی گروہ ہیں جو مختلف نظریاتِ ادب کے حامی ہیں۔ پھر ان کے کچھ ذیلی طبقے ہیں جن کا ہم ہر مناسب موقع پر ذکر کریں گے۔

قدامت پسندوں اور جدید ادب کے حامیوں میں سب سے اہم اختلاف یہ ہے کہ قدامت پسند شاعری میں عروض کی قدیم پابندیوں کو لازمی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ قدامت پسند نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد کو مسلمہ اصنافِ سخن میں شمار کرنے کے لئے تیار نہیں اور جدید ادب کے حامی ان دونوں اصناف کو شاعری کی جان سمجھتے ہیں۔ اسی اختلاف کی بنا پر ان دونوں اصناف کو غزل کا حریف سمجھا جانے لگا ہے اور قدامت پسند اپنے نظریے کی فوقیت ثابت کرنے کے لئے ان اصناف سے غزل کا موازنہ کرتے ہیں اور غزل کو ان سے ہر طرح بہتر بتاتے ہیں۔ جدید ادب کے حامی غزل ہی کے نقائص گنوا کر نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد کی برتری ثابت کرتے ہیں اور غزل کو بیکار گردانتے ہیں۔

اس کے علاوہ قدامت پسند ادب پر کچھ مخصوص اخلاقی پابندیاں عائد کرنا روا رکھتے ہیں جو جدید ادب کے حامی تسلیم نہیں کرتے۔

اب ہم یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان دونوں گروہوں کے نظریات سے حلقۂ اربابِ ذوق کو کیا نسبت ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں فریق اعتدال اور توازن سے دور ہیں ہم فنی اور لسانی پابندیوں کا پوری طرح احترام کرتے ہوئے نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد دونوں اصناف کو تسلیم کرتے ہیں ہم جدید ادیبوں کی اس دلیل کو نہیں مانتے کہ موجودہ دَور میں خیالات کچھ اتنے تیز اور زیادہ ہیں کہ فنی اور لسانی پابندیوں کو محض اُلجھنیں سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہئے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد ہمارے نزدیک ادب کے ارتقائی اسباب کی بنا پر ادب کی اتنی ہی اہم اصناف ہیں جتنی کوئی اور صنف ہو سکتی ہے۔

نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد سے غزل کی رقابت ہمارے نزدیک غلط استدلال اور بے بنیاد وجوہ پر مبنی ہے نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد انگریزی شاعری کے اثر سے ہماری شاعری میں رُونما ہُوئی ہیں اور ان اصناف میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور جو کچھ لکھا جا رہا ہے۔ وُہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اصناف ہمارے شعر و ادب میں نہایت گہری جڑ پکڑ چکی ہیں اور ہم اب انہیں محض تجربہ یا ناکام یا کامیاب تجربہ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اب یہ مُسلّمہ اصناف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بحث نہایت فرسودہ ہو چکی ہے کہ قافیہ و ردیف شعریت کے لازمی عناصر نہیں ہیں۔ اصل چیز ندرتِ فکر اور شدّتِ جذبات کا موزوں امتزاج ہے اس سلسلے میں زبان کے لحاظ سے صوتی ترنم اور RYTHM وہی لطیف اثر پیدا کر سکتے ہیں جسے قافیہ و ردیف کے محاسن کے طور پر پیش کیا جاتا ہے شعریت کے اعتبار سے کوئی صنف بجائے خود اہم نہیں ہوتی ہر صنف کے متعلق ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ایک امکانِ شعریت ہوتا ہے جو شاعر کی بلند نظری، شدّتِ جذبات، علم و مشاہدہ اور قوّتِ بیان سے جوہرِ شعریت کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

دوسری طرف ہم یہ بات ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے کہ غزل ایک پُرانے زمانے کی یادگار ہے اور نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد نے اس کی جگہ لے لی ہے اور اب غزل کا کوئی مستقبل نہیں۔ ہمارے نزدیک غزل اور زیرِ بحث اصناف میں کوئی رقابت نہیں۔ یہ اپنی اپنی جگہ نہایت اہم ہیں اور رہیں گی اور ہمارے ہاں غزل کا نہایت شاندار سرمایہ موجود ہے۔ ہم غزل کو رد کرنے میں ایک بے بہا سرمائے کو ٹھکراتے ہیں جو ایک غلطی ہے۔ پھر غزل خالصتہً حسن و عشق کے معاملات کا ذریعۂ اظہار ہے ہم سمجھتے ہیں جب تک انسان شباب اور اس کی رنگا رنگ آرزوؤں حسن اور اندازِ دلربائی غرضکہ عشق کے عالم طلسم سے گزرتا رہے گا۔ غزل کی شگفتگی اور اس کی اہمیت میں فرق نہیں آئے گا۔ یوں دیکھا جائے تو غزل کا دامن فلسفے، تصوّف اور مناظرِ قدرت سے بھی خالی نہیں ہے۔

نثر میں بھی ایسے دو ہی طبقے موجود ہیں جن میں ایک ایسی ہی انتہا پسندی موجود ہے۔ اگر ہم ان پر منصفانہ تنقیدی نظر ڈالیں تو ان دونوں میں اعتدال اور توازن کی وہی کمی نظر آئے گی۔ قدامت پسندوں کا یہ اصرار کہ ادب کو رسمی قوانین اور روایتی اخلاق و تہذیب کی حد کے اندر رہنا چاہیئے یا صرف ان اقدار و عقائد کے معیار پر پُورا اُترنا چاہیئے جو کسی سوسائٹی یا اس کے ایک طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ جائز معلوم نہیں ہوتا۔

انسانی فطرت اور خارجی حالات، واقعات، اشیا اور مناظر غرضکہ ماحول کے ہر عنصر اور پہلو میں نت نئی نسبتیں قائم ہوتی رہتی ہیں اور پُرانی نسبتیں رد ہوتی رہتی ہیں۔ تبدیلی زندگی کا ایک جاودانی اصول ہے یعنی انسانی فطرت اور اس کے دنیوی ماحول کی ہر شے میں ایک نسبت ہمیشہ برقرار نہیں رہ سکتی چنانچہ اس تبدیلی ہی کا تقاضا ہے کہ انسانی تہذیب و تمدّن کے آئین کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اجتماعی زندگی کے قاعدوں ضابطوں اور قوانین کو انسانی فطرت اور اس کے دنیوی ماحول کی نئی نسبتوں کے دوش بدوش چلایا جائے۔ قاعدوں ضابطوں اور قوانین کو محفوظ رکھنے کے لئے نئی نسبتوں کو فراموش کرنا یا نظر انداز کرنا درست

نہیں بلکہ ممکن ہی نہیں۔ اس لئے قدامت پسندوں میں سے جو طبقہ ہر نئی چیز کو صرف اس لئے ناپسند کرتا ہے کہ وُہ پُرانے معیاروں پر پوری نہیں اترتی۔ اس کا اندازِ نظر قابلِ قبول نہیں ہے۔

دوسری طرف جدید ادب کے حامیوں کا ایک طبقہ قدامت پسندوں سے بھی زیادہ مہلک انتہا پسندی کا حامل ہے۔ وُہ انسانی اخلاق و تہذیب کے مسلمہ اصولوں کو نظر انداز کرنا ہی اپنا طرۂ امتیاز سمجھتا ہے۔ یہ طبقہ انسانی زندگی کے اخلاقیاتی مقصد ہی سے منحرف ہے۔ اور اپنی پُوری صناعی ایسے واقعات اور خیالات پیش کرنے پر صرف کرتا ہے جنہیں انسان کی اجتماعی زندگی کے اصولوں کے پیشِ نظر تحریر میں لا کر دُنیا تک پہنچانا کسی طرح موزوں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس طبقے کی فنکارانہ جدّت صرف یہ ہے کہ یہ ایسے واقعات اور خیالات پیش کر دیتا ہے۔ جو کچھ کرداروں کی انفرادی لغزشوں۔ اخلاقی افتادگیوں اور جرائم پر مبنی ہونے کی وجہ سے پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ان واقعات اور خیالات کے ذکر سے نہ اخلاقِ عالیہ کا کوئی مقصد پورا کرنا منظور ہوتا ہے۔ نہ جمالیاتی تسکین بہم پہنچانا۔ صرف انسانی فطرت کے بعض حصّے سے متعلق کچھ ایسی باتیں کہنا سُننا مقصود ہوتا ہے جنہیں ہر ہوشمند انسان اجتماعی زندگی کے مجموعی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے دبانا اور فراموش کرنا بہتر سمجھتا ہے۔ اجتماعی طور پر فنونِ لطیفہ کی بنیاد عالمگیر اقدار پر ہونی چاہئیے۔ اس کے بغیر کوئی فن کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس میں خارجی حقیقت کی وُہ اہمیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ جسے انسانی فطرت سے ایک دیرپا اور گہری نسبت ہے۔ ادب کے جن شاہکاروں میں عالمگیریت ہے اور جو انسانی سوسائٹی میں دور بہ دور قوم بہ قوم اور طبقہ بہ طبقہ بدلتی ہُوئی اقدار میں انسان کے لئے یکساں طور پر اہم رہے ہیں ان میں یہی اوصاف ہیں اور انہی اوصاف کی بنا پر کامیاب ادب وجود میں آ سکتا ہے۔

جدید ادیبوں میں ایک طبقہ عوامی ادیبوں کا بھی ہے۔ یہ طبقہ ابھی تک واضح طور پر یہ نہیں بتا سکا کہ عوام سے اس کی کیا مراد ہے اور اُس کی نظر میں ادب کا کیا مفہوم ہے۔ عوامی ادیبوں سے ملنے جُلنے اور اُن کی محفلوں میں شریک ہونے سے پتا چلتا ہے کہ جب وہ علم و ادب کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے سوا باقی سب کو عوام کہتے ہیں جب سیاسی اعتبار سے صاحبِ اقتدار طبقے کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے آپکو عوام کہتے ہیں عام بات چیت میں تانگے والوں قلیوں اور اسی قسم کے اور لوگوں کو عوام کہتے ہیں اور جب کسان و مزدور کا نام لیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ عوام کا ذکر کر رہے ہیں! اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ ادب کیا ہے تو وُہ ایسی تحریروں کو ادب کہتے ہیں۔ جن کا مقصد عوام کو بیدار کرنا اور اُن میں اپنے حقوق کا شعور پیدا کرنا ہو۔ یوں اگر کسی نظم میں "اہرامِ مصر" کا ذکر آ جائے تو وُہ بگڑ جاتے ہیں کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے عوام نہیں جانتے اور ادب میں صرف "عوام فہم" باتیں ہونی چاہئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو وُہ ادب کا مقصد اصلاحی اور تعلیمی بتاتے ہیں اور دوسری طرف اُسے اُنہی باتوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ جو پہلے ہی سے عوام کے علم میں ہوں۔

بہرصورت اس طبقے کی ان منطقی بے احتیاطیوں سے درگزر کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ طبقہ ادب کا مقصد عوام کی خدمت سمجھتا ہے اور ادب کے دائرے میں ایک تعلیمی اور فلسفیانہ ذمہ داری لیتا ہے۔ لیکن جب ہم اس زاویہ نظر سے عوامی ادیبوں کی تخلیقات پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن میں کہیں مسائلِ زندگی کا وُہ گہرا ادراک روشن نگاہی اور شدّتِ جذبات دکھائی نہیں دیتی جو اس دعوے کے بعد لازماً دکھائی دینی چاہئے۔ عوامی ادیبوں کے عوام اور مسائل اکثر و بیشتر کتابی ہوتے ہیں اصلی نہیں۔ ہمیں اپنے گرد و پیش جو عوام نظر آتے ہیں۔

اُن کے معاشرتی، ذہنی اور روحانی مسائل سے ہمدردی کی بجائے اُن کی تحقیر اور تضحیک دکھائی دیتی ہے۔ اگر اس طبقے کے ادیب اپنے سیاسی جبر کو چھوڑ کر پمفلٹوں کی دُنیا کی بجائے اپنے گرد وپیش کی دُنیا کا مطالعہ کریں تو وُہ اس میدان میں مفید کام کر سکتے ہیں۔ فی الحال تو عوامی ادیبوں اور دوسرے لوگوں میں یہ کش مکش جاری ہے کہ عوام ان کی تخلیقات کے خلاف یہ کہتے ہُوئے احتجاج کرتے ہیں کہ آپ کو ہمارے خدا رسول ہمارے مذہبی اور سیاسی عقاید کے متعلق ایسی ناروا باتیں نہیں کہنی چاہئیں اور عوامی ادیب کہتے ہیں۔ ادب کے متعلق تُم کیا جانو — تم ہمیں یہ نہیں بتا سکتے کہ ہمیں کیا کہنا چاہئیے اور کیا نہیں کہنا چاہئیے!

"حلقۂ اربابِ ذوق" اس قسم کی تمام ہنگامہ آرائیوں میں جانب دارانہ سرگرمیوں سے بچ کر صرف تعمیری اور متوازن اصولوں کے ماتحت دس سال سے ادب کی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ اب جبکہ غیر ملکی حکومت ختم ہو چکی ہے اور مُلک آزادی کی دولت سے مالا مال ہو چکا ہے۔ یہ انجمن اور بھی ذمہ داری اور مستعدی سے روز بروز رفعت، رُوشنی کی جانب قدم بڑھاتی جائے گی۔ ہمیں اُمید ہے کہ اہلِ نظر اس کی خدمات کو تسلیم کرنے اور اُس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں پُوری پُوری فرض شناسی سے کام لیں گے۔

اردُو شاعری کے تین دَور

گزشتہ پچاس سال میں قومی شاعری نے تین قابلِ ذکر پلٹے کھائے ہیں۔ سب سے پہلے ماتم کا، اور پھر طنز کا اور اس کے بعد امید اور جوش کا۔ پہلے دَور میں جو انیسویں صدی کے ساتھ ختم ہوتا ہے زیادہ تر قوم کی عظمت و اقبال اور پرانی تہذیب کا ماتم کیا گیا۔ اس کے بعد یورپ کے لائے ہوئے معاشرتی اور سیاسی انقلاب پر طنز کا زمانہ آیا۔ یہ رنگ انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہُوا اور بیسویں صدی کے پہلے پندرہ بیس برس تک قائم رہا۔ تیسرے دَور میں وطن اور قوم کے تصوّر نے نہ صرف فروغ پایا۔ بلکہ اس تصوّر سے امید کی نگاہوں نے مستقبل کو روشن کرنا شروع کیا۔ یہ دَور ابھی ختم نہیں ہُوا اور نہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آزادیٔ کامل سے پہلے اس کے خاتمے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ "نصاب اردو" مطبوعہ جولائی ۱۹۴۹ء

★

دو غزلیں

تصوّر کرتپوری

ہم تھے سو غم سہارنے والے
اب کہاں دل کو مارنے والے

موت کی بات کا جواب تو دے
زندگی کو پکارنے والے

دل کی اُلجھن میں کھو چلا ہوں میں
زلفِ پُرخم سنوارنے والے

گرتے گرتے سنبھل گیا ہوں ذرا
پھر پکار او پکارنے والے

اپنے ذوقِ کرم کو وہ جانیں
ہم ہیں دامن پسارنے والے

جان اب ڈال دے تصوّر میں
اے حقیقت نکھارنے والے

آتش لدھیانوی

گم تھے ہم اس حیات سے پہلے
عشق کے تجربات سے پہلے

اُن کے آتے ہی اشک بہہ نکلے
چھڑ گئی بات، بات سے پہلے

مست زلفیں مچل گئیں رُخ پر
آ گئی رات، رات سے پہلے

ہم کو بھی اپنی زندگی تھی عزیز
عشق کی واردات سے پہلے

خامشی سے اگر نہ کام چلے
تول لو بات، بات سے پہلے

کتنی سُونی تھی دل کی بستی بھی
عشق کے حادثات سے پہلے

اے غمِ عشق تیری عمر دراز
مر گئے تھے حیات سے پہلے

میری حالت کو دیکھ کر آتش
مسکرائے وہ بات سے پہلے

سعید اختر درّانی

یونان کی دیو مالا کے دو ورق

سیفلس اور پرو کرس[١]

یونانی دیو مالا کی دو حکایات کا ترجمہ بھیج رہا ہوں۔ اردو دان طبقے کی یونان کے قصص الاصنام سے بے خبری آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہ ہو گی۔ حالانکہ انگریزی شعر و ادب اِن کے حوالوں سے پٹا پڑا ہے۔ آئندہ دور میں جو بڑی حد تک ترجمے کا دَور ہو گا۔ عوام کو بار بار اس بے خبری کی بنا پر ایک اُلجھن سی محسوس ہو گی۔ اسی امر کے پیشِ نظر میں نے یونانی انتھولوجی کو اُردو کا جامہ پہنانے کا بیڑا اُٹھایا ہے (درّانی)

سیفلس ایک خوبصورت نوجوان تھا جو سیر و شکار کا بہت دلدادہ تھا۔ وُہ مُنہ اندھیرے اُٹھتا اور شکار کو نکل جاتا۔ آرورا[٢] (صبح کی دیوی) نے جب پہلے پہل اُسے دیکھا تو دفعتہً اُس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئی اور اُسے ساتھ لے اُڑی۔ مگر سیفلس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور وُہ اپنی حسین بیوی پرو کرس پر دل و جان سے نثار رہتا۔ پرو کرس شکار کی دیوی ڈائنا[٣] کی منظورِ نظر تھی۔ جس نے اُسے ایک کُتّا اور ایک نیزہ دے رکھا تھا۔ وُہ کُتّا اپنے ہر حریف سے زیادہ تیز دوڑ سکتا تھا اور وُہ نیزہ کبھی نشانہ خطا نہ کرتا تھا۔ پرو کرس نے یہ تحفے اپنے شوہر کو دے دیئے تھے۔ سیفلس کو اپنی بیوی سے ایسی والہانہ اُلفت تھی کہ آرورا کی تمام ترغیبات اس پر کچھ اثر نہ کر سکیں۔ آخر آرورا نے اُسے غصے میں یہ کہہ کر نکال دیا کہ "جا او ناشکرے انسان! جا، اپنی بیوی کو سنبھال، لیکن یاد رکھ، ایک دن آئے گا، جب تو پچھتائے گا کہ تو نے اُسے دوبارہ کیوں دیکھا"

سیفلس لوٹ گیا اور پھر اپنی بیوی اور شکار و تفریح میں اُسی پہلی سی دلبستگی سے محو ہو گیا۔ اب ہوا یُوں کہ کسی دیوتا نے ناراض ہو کر لوگوں کو تنگ کرنے کے لئے ایک ضرر رساں لومڑی بھیج رکھی تھی اور شکاری بڑے بڑے جتھے لے کر اُسے مارنے کو نکلا کرتے تھے۔ مگر سب بے سُود۔ کوئی کُتّا اُسے پکڑ نہ پاتا۔ آخر وُہ لوگ سیفلس سے اُس کا مشہور کُتّا مانگنے آئے جس کا نام لیلپس[٤] تھا۔ جونہی کتا چھوڑا گیا۔ وُہ تیر کی طرح اس تیزی سے اُٹھا کہ نگاہ پیچھا نہ کر سکتی تھی اور اگر اُنہوں نے اُس کے پیروں کے نشان نہ دیکھے ہوتے تو وُہ یہی سمجھتے کہ وُہ اُڑ کر گیا ہے۔ سیفلس اور اُس کے ساتھی ایک پہاڑی پر کھڑے دوڑ کا نظارہ کر رہے تھے۔ لومڑی کو بھی سارے حیلے آزمانے پڑے۔ وُہ بھاگتے بھاگتے مُڑ جاتی اور چکر لگا کر پھر واپس دوڑنے لگتی۔ اور کُتّا جو جبڑے پھاڑے بالکل اُس کے سر پر چڑھا آتا تھا۔ بار بار جھپٹتا مگر لومڑی کی ایڑیوں تلے کی ہوا کو کاٹ کاٹ کر رہ جاتا۔ آخر کار سیفلس اپنا نیزہ استعمال کرنے ہی کو تھا کہ اس کے دیکھتے دیکھتے کُتّا اور اُس کا شکار دونوں یکا یک رُک گئے۔ آسمانی طاقتوں کو یہ منظور نہ تھا کہ ان میں سے

١ه CEPHALUS AND PROCRIS
٢ه AURORA
٣ه DIANA (وہ اپالو کی بہن اور چاند کی دیوی بھی تھی)
٤ه LELAPS

کوئی ایک بھی دوسرے پر غالب آجائے عین حالتِ حرکت و زندگی میں وہ پتھر بنا دیئے گئے۔ مگر وہ اس حالت میں اس قدر فطری اور زندہ و جہندہ نظر آتے تھے کہ دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ کتا ابھی بھونکا کہ بھونکا اور لومڑی ابھی اُچھلی کہ اُچھلی۔

سیفلس گو اپنا کتا کھو چکا تھا۔ تاہم شکار میں اُسی انہماک سے دلچسپی لیتا رہا۔ وہ صبح ہی صبح، تنِ تنہا جنگلوں اور پہاڑوں کو نکل کھڑا ہوتا اور کبھی کسی مددگار کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ کیونکہ اُس کا نیزہ سدا اُس کے آڑے آتا۔ جب سُورج بلند ہونے لگتا اور وہ شکار سے تھک جاتا، تو وہ کوئی ایسا سایہ دار گوشہ ڈھونڈ لیتا۔ جہاں کوئی ٹھنڈی ندی بہہ رہی ہوتی اور کپڑے اتار کر گھاس پر دراز ہو جاتا اور ٹھنڈی نسیمِ صبح سے لطف اندوز ہوتا۔ کبھی کبھی وہ بلند آواز سے پکار اُٹھتا۔ آ۔ پیاری نسیم! آ اور میری چھاتی کو پنکھا جھل! آ! اور اس آگ کو ٹھنڈا کر جو مجھے جلا رہی ہے۔" ایک دن قریب سے گزرتے ہوئے کسی شخص نے یہ گفتگو سُن پائی جو وہ ہوا سے کر رہا تھا اور بیوقوفی سے یہ سمجھ کر کہ سیفلس کسی دوشیزہ سے باتیں کر رہا ہے اُس کی بیوی پروکرس سے یہ بات جا کہی۔ محبت بڑی کو دیقین ہوتی ہے۔ اس ناگہانی صدمے سے پروکرس پر غشی طاری ہو گئی۔ مگر پھر جلد ہی سنبھل کر بولی۔ "نہیں یہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب تک میں خود اپنی آنکھوں سے یہ نہ دیکھ لوں۔ میں ہرگز اس پر یقین نہیں کروں گی۔" چنانچہ وہ بڑی بیقراری سے اگلی صبح کا انتظار کرنے لگی، اور جونہی سیفلس حسبِ معمول شکار کو نکلا، وہ اس کے پیچھے پیچھے چل کھڑی ہوئی، اور بتائی ہوئی جگہ پر جا کر چھپ گئی۔ سیفلس تھک کر حسبِ عادت، ندی کے سرسبز کنارے پر لیٹ گیا اور کہنے لگا۔ آ! پیاری نسیم! آ۔ اور مجھے پنکھا جھل! تو جانتی ہے۔ میں تجھے کتنا پیار کرتا ہوں۔ یہ درختوں کے جھنڈ، اور میری یہ تنہا صحرا نوردیاں تیری ہی بدولت اس قدر خوشگوار ہیں۔" وہ اپنی اسی دھن میں اپنی سی کہے جا رہا تھا کہ اُسے قریب کی جھاڑیوں سے سسکی کی سی آواز آئی یا اُسے گمان سا ہوا کہ اُس نے یہ آواز سُنی ہے۔ اُس نے اُسے کسی جنگلی جانور کی آواز سمجھا اور اپنا نیزہ اُس طرف کو کھینچ مارا۔ اپنی پیاری بیوی کی چیخ نے اُسے بتا دیا کہ اُس کا ہتھیار بڑی ہی صحت سے نشانے پر بیٹھا تھا۔ وہ دوڑ کر اُس جگہ پہنچا۔ جہاں اُس کی بیوی لہو میں لت پت پڑی، زخم میں سے اپنے ہی دیئے ہوئے نیزے کو کھینچ کر نکال رہی تھی۔ سیفلس نے اُس کو زمین پر سے اُٹھایا۔ لہو کو روکنے کی کوشش کی اور پروکرس سے پھر سے جی اُٹھنے کی منتیں کرنے لگا۔ وہ رہ رہ کر کہتا۔ پروکرس تو کہاں چلی جا رہی ہے؟ تو کیوں مجھے اپنی موت کی ندامت سہنے کو چھوڑے جاتی ہے؟" پروکرس نے اپنی نحیف آنکھیں کھولیں اور بڑی مشکل سے اتنا ہی کہہ پائی۔ "پیارے شوہر! اگر تم نے مجھ سے کبھی محبت کی ہے اور اگر میں کبھی تمہاری اُلفت کی حقدار رہی ہوں، تو میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ میرے بعد ہرگز اُس منحوس نسیم سے شادی نہ کرنا۔" ان الفاظ نے تمام راز آشکار کر دیا۔ مگر افسوس! اب یہ بھید کھلنے کا فائدہ؟ وہ مر گئی۔ مگر اُس کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت طاری تھی اور وہ رحم اور عفو کی نظروں سے اپنے شوہر کو تک رہی تھی، جسے اس نے آخری لمحوں میں ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔

لیجنڈری بے لیڈز، میں مور کا ایک گیت سیفلس اور پروکرس کے متعلق بھی ہے۔ جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

ایک شکاری، دھوپ کی شدت سے بچنے کو،
شاداب پیڑوں کے گھنے، سایوں میں لیٹا،

ٹھنڈی ہوا کو پیار سے یُوں مخاطب کرتا،
آجا، پیاری ہوا آجا، اپنی سانس سے میری جبین کو ٹھنڈک پہنچا،
ندی کی مدھم موسیقی بھی تھم جاتی،
اور دم سادھ کے چُپ ہو جاتے بید کے پتّے،
صرف اُس کا یہ نغمہ فضا میں تھراتا ــــ پیاری ہوا، آ
اور صدائے باز گشت کہتی، آ، پیاری آ۔

(۲)
اپالو اور ڈافنی[1]

ڈافنی، اپالو کی محبوبۂ اوّل تھی۔ یہ محبّت اتفاقی طور پر پیدا نہ ہوئی تھی۔ بلکہ یہ کیوپڈ کی شرارت تھی۔ اپالو نے ایک دن اس کم سن لڑکے کو اپنے تیر کمان سے کھیلتے ہوا دیکھا تو اپنی تازہ فتح کی ترنگ میں جو اس نے پائتھن پر پائی تھی، بول اٹھا "گستاخ لڑکے! تمہیں بھلا ان جنگی ہتھیاروں سے کیا سروکار؟ انہیں تم اُن ہاتھوں کے لئے رہنے دو جو اُن کے اہل ہیں۔ دیکھتے نہیں میں نے ان ہاتھوں کی بدولت اس اژدہا پر جس کا زہریلا جسم ایکڑوں زمین پر پھیلا پڑا تھا، کس قدر عظیم الشان فتح حاصل کی ہے؛ مُنّے تم اگر بس اپنی مشعل ہی پر قناعت کرو تو بہتر ہوگا۔ تم کھلے بندوں اس کے نام نہاد شعلے جہاں جی چاہے روشن کرتے پھرو، لیکن میرے اسلحہ پر ذرا مہربانی ہی کرنا۔" وینس[2] کے بیٹے نے یہ سُنا۔ اور جواب میں بولا "اپالو! تیرے تیر چاہے باقی ہر چیز کو ہدف بنا سکیں، لیکن میرے تیر کا نشانہ تو تُو خود بنے گا۔" یہ کہہ کر وہ پارناسس[3] کی ایک چٹان پر جا کھڑا ہُوا اور اپنے ترکش سے دو مختلف الصنعت تیر نکال لئے۔ ایک تو محبت پیدا کرنے کے لئے اور دوسرا محبت کی مزاحمت کرنے کے لئے۔ پہلا تو طلائی اور نوکیلا تھا مگر دوسرا سیسے کا بنا ہُوا جس کا پیکان کند تھا۔ سیسے والا تیر تو اس نے حسین دیوی ڈافنی کے مارا جو سمندروں کے دیوتا پینیئس[4] کی بیٹی تھی۔ اور طلائی تیر کا نشانہ اس نے اپالو کے دل کو بنایا۔ کیوپڈ کے اس عمل کے فوراً بعد اپالو تو ڈافنی کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا اور ڈافنی کو عشق کے خیال ہی سے نفرت ہو گئی۔ اور اس کے بجائے اسے جنگلوں میں سیر کرنے اور شکار کھیلنے میں مزہ آنے لگا۔ کئی چاہنے والوں نے اس کے عشق کا دم بھرا، مگر اس نے سب کو ٹھکرا دیا۔ اور محبت کرنیوالوں کے خیال سے بے پروا جنگلوں میں گھوما کی۔ اس کا باپ اس سے اکثر کہتا "بیٹی، تم مجھے داماد کب لا کر دو گی؛ مجھے نواسے اور نواسیاں کب دو گی؟" مگر اسے تو شادی سے یوں نفرت

---

[1] Apollo and Daphne [2] Venus حسن و عشق کی دیوی جو جیوپیٹر کی بیٹی تھی اور ڈائی اونے Dione کے بطن سے۔ [3] Parnassus جس کی ڈھلانوں پر اپالو کا متبرک شہر اور بشارت گاہ "ڈیلفی" واقع ہے۔ [4] Peneus

ہو گئی تھی گویا یہ بھی کوئی جرم ہو۔ یہ باتیں سُن کر حیا کی سُرخی اُس کے چہرے پر دوڑنے لگتی اور وُہ اپنے باپ کے گلے میں باہیں ڈال کر کہتی۔ "پیارے ابا! مجھ پر اتنی نوازش کیجئے کہ مجھے ڈائنا[1] کی طرح زندگی کنوارپنے ہی میں گزار لینے دیجئے!" وہ مان جاتا لیکن ساتھ ہی اتنا کہہ دیتا کہ "بیٹی! تمہارا اپنا چہرہ ہی یہ بات انہونی کر دے گا۔"

اپالو اس سے محبت کرتا تھا اور اس کو اپنانا چاہتا تھا لیکن وہ جو سارے دنیا کو پیشین گوئیاں دیتا تھا اس قابل نہ تھا کہ اپنی قسمت کا حال معلوم کر سکے۔ وُہ اس کی شانوں پر پریشان زلفیں دیکھتا اور کہتا "اگر یہ بکھرنے پر بھی اس قدر دلفریب ہیں، تو سنور کر کیا کیا قیامت نہ ڈھائیں گی؟" وہ اس کی آنکھیں دیکھتا جو ستاروں سے بڑھ کر درخشاں تھیں۔ وُہ اس کے ہونٹ دیکھتا۔ اور محض دیکھ ہی لینے پر مطمئن نہ رہ سکتا۔ وہ اس کے ہاتھوں اور باہوں کے گن گاتا۔ جو شانوں تک عریاں تھیں، . . . اور جو کچھ نظر سے پوشیدہ تھا۔ اُس کی چشم تصوّر کو اُن سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا۔ اُس نے اس کا پیچھا کیا، اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی ـــ تند ہوا سے تیز تر۔ اور پھر اس کی التجاؤں پر لمحہ بھر کو بھی نہ رُکی۔ وُہ پکارا: ٹھہرو، ٹھہرو، او پینیئس کی بیٹی! مجھے اپنا دشمن مت سمجھو۔ مجھ سے یوں گریزاں مت ہو۔ جیسے برّہ بھیڑیئے سے بھاگتا ہے۔ یا فاختہ شکرے سے۔ میں تو چاہت کے ہاتھوں تمہارے پیچھے مارا مارا پھرتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ تم ان پتھروں پر گر پڑو گی، اور وہ بھی میری وجہ سے میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ آہ! ذرا دھیرے دوڑو! میں بھی اپنا قدم آہستہ کئے دیتا ہوں۔ میں سخرہ نہیں، دہاتی نہیں، جیوپیٹر کا بیٹا ہوں۔ ڈلفاس[2] اور ٹینے ڈاس[3] کا مالک ہوں اور ماضی اور مستقبل کے سب حالات سے واقف ہوں۔ میں موسیقی اور ساز کا دیوتا ہوں۔ میرے تیر نشانہ خطا نہیں کرتے۔ مگر افسوس! میرے تیر سے بھی بڑھ کر مہلک ایک تیر میرے دل کے پار ہو چکا ہے۔ میں دوا دارُو کا دیوتا ہوں۔ اور تمام صحت بخش بوٹیوں سے واقف ہوں مگر افسوس! مجھے خود ایک ایسا مرض لاحق ہے۔ جسے کوئی دوا اچھا نہیں کر سکتی۔"

وہ حسینہ بھاگتی رہی۔ اور اپالو کی ناتمام درخواستیں مُنہ ہی مُنہ میں گھُٹ کر رہ گئیں ـــ اور وہ بھاگتے میں بھی اپالو کے دل کو تڑپاتی رہی۔ تیز ہوا اس کے ملبوس کو اڑا اڑا دیتی تھی اور اس کے کھلے گیسو اس کے پیچھے لہراتے تھے۔ اپنی درخواستوں کے یوں ٹھکرائے جانے سے دیوتا ایک تو خود بے صبر ہوتا جا رہا تھا۔ اُس پر کیوپڈ نے بھی اُسے یوں دوڑایا کہ آخر وہ بالکل اس کے سر پر آ پہنچا۔ یہ دوڑ ایسی تھی جیسے شکاری کتا خرگوش کا تعاقب کر رہا ہو۔ کتے نے جھپٹ کر پکڑ لینے کو مُنہ پھاڑ رکھا ہو۔ اور کمزور جانور اس سے بچتا بچاتا تیر کی طرح اڑا جا رہا ہو۔ دونوں اڑے جا رہے تھے۔ دیوتا اور دوشیزہ: وُہ محبت کے پروں سے۔ اور یہ خوف کے پروں سے۔ مگر تعاقب کرنے والا زیادہ تیز رفتار تھا۔ اور اب وہ اس کے قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ اُس کا تیز سانس اس کے بالوں کو چھُونے لگا۔ اس کی طاقت جواب دینے لگی۔ اور پیشتر اس کے کہ یہ گر پڑتی اپنے باپ، سمندروں کے دیوتا کی، دہائی دے کر پکار اٹھی "پینیئس ابا! مدد! اَے باپ زمین کا سینہ شق کر دے کہ میں اُس میں سما جاؤں۔ یا میری صورت کو بدل ڈال کہ اسی کی بدولت میں اس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ وہ اتنا کہہ بھی نہ پائی تھی کہ ایک جمود اس کے عضو عضو میں سرایت کر گیا۔ اس کا سینہ ایک دم چھال میں لپٹنے لگا۔ اُس کے بال پتے بن گئے۔ اس کی باہیں شاخوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اس کے پاؤں جڑوں کی طرح مضبوطی سے زمین میں گڑ گئے۔ اور اس کا چہرہ درخت کی پھننگ بن گیا، جس پر سوائے پہلی سی خوبصورتی کے پورا تغیر آ چکا تھا۔ اپالو ششدر

[1] DIANA شکار کی دیوی۔ [2] لیٹونا (LETONA) کے بطن سے۔ [3] DELPHOS [4] TENEDOS -

رہ گیا۔ اُس نے تنے کو چھوا۔ اور نئی چھال کے نیچے کپکپاتے ہوئے گوشت میں ایک تھرتھری سی دوڑ گئی۔ وہ شاخوں سے لپٹ گیا اور اُن پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ مگر ٹہنیاں اس کے ہونٹوں تلے سے کھسک کھسک گئیں۔ آخر اس نے کہا "تم میری بیوی تو نہیں بن سکیں۔ مگر میرا متبرک درخت تم بن کر رہو گی۔ میں اپنے تاج تمہارے پتوں سے بناؤں گا۔ میں اپنا ستار اور ترکش تم سے مزین کروں گا۔ اور جب عظیم رومن فاتح شان و شوکت کے ساتھ جیوپٹر کے مندر[1] میں اظہار عقیدت کے لئے داخل ہوں گے تو ان کی پیشانیوں کے لئے تمہارے ہی ہار گندھا کریں گے۔ اور جیسے سدا کی جوانی میرے قبضے میں ہے۔ ایسے ہی تم بھی سدا بہار رہو گی۔ اور تمہارے پتے خزاں سے نا آشنا رہیں گے" ۔ یہ سن کر اس حسین دیوی نے جو لارل[2] کے درخت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ممنونیت کے اظہار کے لئے اپنا سر جھکا لیا۔

یہ امر کہ اپالو موسیقی اور شاعری دونوں کا دیوتا ہے تعجب انگیز نہیں۔ مگر دوا اور علاج کو بھی اسی سے منسوب کرنا شاید عجیب معلوم ہو۔ آرم سٹرانگ[3] جو شاعر ہونے کے علاوہ طبیب بھی ہے، اس کی یہ وجہ پیش کرتا ہے ؎

موسیقی فرحت افزا، کلفت فرسا ہے۔
درد کا درماں، دکھ کا مداوا، اس میں چھپا ہے
عہد عتیق میں داناؤں نے اس لئے مانا
ایک ہی رب صحت کا، ساز کا، موسیقی کا

شاعروں نے اکثر اپالو اور ڈافنی کی طرف اشارات کئے ہیں۔ والر[4] نے اس قصے کا اطلاق ایسی حالت پر کیا ہے جب کسی شاعر کی عشقیہ شاعری محبوبہ کے دل کو پگھلانے میں تو ناکام رہے۔ مگر شاعر کے لئے وسیع شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے ؎

اس کا لافانی نغمہ گو کام نہ آیا
پھر بھی دلوں میں بھر ہی گیا تاثیر کی ٹیسیں
سب دل اُس نالے سے تڑپے، پر نہ پسیجی
اک وہ حسینہ، بس میں تھا جس کے، درد کا درماں
اُس نے اپالو ہی کی طرح جب ہاتھ بڑھایا
اُلفت کے بدلے "لارل" کے سہرے پائے

شیلی[5] کے ایڈونیز[6] کا یہ بند بائرن[7] کے اس جھگڑے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں بائرن کو شروع شروع میں تنقید نگاروں سے الجھنا پڑا ؎

جتھا باندھے ہوئے لگڑ جو بھگوڑوں ہی پر شیر ہوں

---

[1] Capitol [2] Laurel فتح یا شاعری میں امتیاز حاصل کرنے کی علامت یا اشارہ۔ [3] Armstrong [4] Waller
[5] Shelley [6] Adonais شیلے کی بہترین نظم کیٹس Keats کا مرثیہ [7] Byron

گھناؤنے کتے جو لاشوں پہ کائیں کائیں کرتے ہوں
جیتنے والے کے جھنڈے تلے اڑتے ہوتے گدھ
جن کی خوراک ہے شکاریوں کا جھوٹا کھانا
اور جن کے پنکھ ہیں وباؤں کا برستا بادل
دیکھو کیسے بھاگے ہیں، رذیلوں کی طرح جب
غصہ جاذب کے اپالو نے کمانِ زرتاب
خندۂ تلخ کے ساتھ اُن پہ چڑھائی اور ا
ایک ہی تیر چلایا ——— کہ وہ ایک ہی تیر کی مار تھے
اُن کا شیوہ ہے وہ مغرور قدم چاٹیں جو ٹھکراتے

(دُرّانی)

نقش و حرف

(صادقین صدق)

مے ایک ہی فطرت کی ہر اک ظرف میں ہے
انداز میں مختلف ہیں فطرت میں نہیں
ہر چند تفاوت شرر و برف میں ہے
پیکر میں الگ الگ ہیں عادت میں نہیں
جو نقش میں ہے بات مصور کے لئے
الفاظ ادیبوں کے مصوّر کے نقوش
وہ بات ادیبوں کیلئے حرف میں ہے
صورت میں جدا جدا ہیں سیرت میں نہیں

از رنگِ تخیّل ہو کہ کاغذ کی لکیر
یکساں ہیں بہرحال بہ فرقِ تحریر
ہر نقش میں ہے جوشؔ کی تازہ اک نظم
ہر حرف میں ہے مونالسا کی تصویر

مسعود اشعر

تنہائی میں

تنہائی میں ———
چاندنی راتوں کے سناٹے میں
اندھیارے کا روشن پہلو
سپنے بن کر آجاتا ہے
میٹھے اور رسیلے سپنے،
کوئی آہستہ آہستہ
میری سمت بڑھا آتا ہے
ہلکا ہلکا آنکھ میں کاجل
شرم کے مارے پلکیں بوجھل
چہرے پر سرخی کے بادل
رنگینی کی گود میں جل تھل
کچھ سنبھلا کچھ ڈھلکا آنچل
دھیرے دھیرے بجتی پایل
موسیقی آنکھوں سے اوجھل
اٹھتی کرتی چھن چھن پل پل
ہلکے اور لرزتے قدموں سے
میرے پاس چلا آتا ہے
آنکھیں چاند میں کھو جاتی ہیں،
دل پر دھڑکن چھا جاتی ہے

تنہائی میں ———
برکھا رت کے کوندے بن کر
کالے بادل کے کاندھے پر
سہمے سہمے خواب آتے ہیں
سہمے اور ادھورے سپنے،
دور کہیں رنگیں وادی میں
جانے کیوں مدہوش کھڑا ہوں
ایسے میں کوئی چپکے سے
بجلی بن کر آجاتا ہے
تھرکتا ہے، شرماتا ہے
اٹھلاتا ہے، لہراتا ہے
پریم پیالے چھلکاتا ہے
دل کے پہلو گرماتا ہے
جھرنے کی لے پر گاتا ہے
رقص و رنگ میں کھو جاتا ہے
میں اپنی پھیلی باہوں میں
اس کو آتا دیکھ رہا ہوں
لیکن آنکھیں کھل جاتی ہیں
دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے
تنہائی میں

——— تنہائی میں ———
پھیلی پھیلی تنہائی میں
میں اکثر سوچا کرتا ہوں
کیا ایسا ہو بھی سکتا ہے
کاش کبھی ایسا ہو جائے!
——— تنہائی میں!! ———

حامد علی خاں

تلفظ کی غلطیاں

(ایک مکالمہ)

ظہیر: احمد صاحب! یہ کیا قصہ تھا آج صبح؟ —— بڑی بے نیازی سے آپ سائیکل بھگاتے ایک زناٹے کے ساتھ یوں پاس سے گزر گئے جیسے کبھی کی صاحب سلامت بھی نہ تھی۔

احمد: بھائی ظہیر آنکھوں پر دیوار اُٹھانے کا فن بھی کوئی تم سے سیکھے شکایت تو مجھے کرنی چاہئے تھی کہ تم نے میری بات تک نہ پوچھی —— واللہ کیا کہوں، اس وقت کس صفائی سے تم آنکھیں چرا گئے ذرا ہم بھی تو سنیں، کون تھے آپ کے یہ عجیب الخلقت دوست، پیر بھچڑی کے مرید میاں جھنگن جنہیں آپ، یہ بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر معلوم نہیں کب کی رام کہانی سنا رہے تھے۔ آپ کا یہ جوش و خروش اور انہماک دیکھ کر ہم نے کہا بھئی ہم دخل در معقولات دینے والے کون؟ پیچھے سے آگے نکل گئے۔ لیکن منہ پر آئی بات رکتی نہیں، اب کہتا ہوں ایک "کھٹک" ضرور دل میں رہ گئی۔ وہ چچا غالب کا شعر ہے نا، بس وہی حال تھا ہمارا۔

ظہیر: احمد طولِ کلام کی عادت نہ گئی تمہاری۔ غالب کے دو مصرع سنانے کے لئے اس بے سر و پا تمہید کی کیا ضرورت تھی بھلا! سیدھے سیدھے وہ شعر سنا دو جس کی وجہ سے یہ سب بیقراری ہے:

احمد: بھینس کے آگے بین بجانا ہوگا تو بیکار، مگر قسم لے لو اُس وقت تمہیں اور میاں جھنگن کو دیکھ کر غالب کا یہ شعر یاد آ گیا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مَژہ ہائے دراز کا

ظہیر: اے سبحان اللہ! تانت باجی راگ پایا۔ نام خدا مرزا غالب کے شعر تو پڑھنے لگے مگر تلفظ وہی اوٹ پٹانگ؟

احمد: کیوں، کیا غلطی کی میں نے؟ کم از کم برمحل شعر کی داد تو دی ہوتی

ع وائے بر جانِ سخن گر بہ سخن داں نہ

ظہیر:۔ درست اور بجا، مگر "مَژہ" کیا بلا ہے، مِژہ کہو

احمد: نہیں میاں، "مُژہ" بالکل درست ہے بلکہ بعض لوگ مَژہ بھی کہتے، وہ بھی صحیح ہے۔ لیکن یہ مِژہ تو آج آپ ہی سے سنا۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔

ظہیر: یہ قیاس آرائی مبارک! لیکن اگر مِژہ غلط ہے اور مُژہ اور مَژہ درست ہے تو پھر مِژگاں کو بھی مُژگاں اور مَژگاں کہا کیجئے

احمد:۔ بسر و چشم! لیکن "مِژگاں" کو مُژہ سے کیا تعلق؟ دونوں بالکل مختلف لفظ ہیں . . . . ہاں . . . مگر غور کیا جائے تو معنی ایک ہی معلوم ہوتے ہیں

ظہیر آپ پوچھتے ہیں مژگاں کا مژہ سے کیا تعلق؟

احمد: ہاں بجز ہم معنی ہونے کے دونوں لفظوں میں کوئی تعلق نہیں

ظہیر: اس سوفسطائی منطق کے کیا کہنے! مگر بندہ پرور یہ دونوں لفظ پورے ہم معنی بھی تو نہیں، کیونکہ مژگاں جمع کے لئے اور مژہ، واحد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اب دونوں لفظوں کا تعلق آپ خود معلوم کر لیجئے۔

احمد: ظہیر! بات تو کچھ پتے کی کہتے ہو۔ میں فارسی علامتِ جمع کو بالکل نظر انداز کر رہا تھا جب جمع کا تلفظ "مژگاں" ہے تو واحد کا تلفظ بھی مژہ ہی ہونا چاہیئے۔

ظہیر: ع کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔ یار سے آپ مان تو گئے کہ "مُژرہ اور "مُژہ" کوئی لفظ نہیں اور مژہ مژگان کا مفرد ہے۔

احمد: بھائی بات معقول بات کو تسلیم کرنے میں تو بندہ کبھی دیر کرتا نہیں۔ اور یوں بھی مجھے اب یاد آیا مژہ ہی درست ہے مُژہ تو نامعقول معلوم ہوتا ہے۔ دراصل پہلے میں نے خیال ہی نہیں کیا تھا بس سوچے سمجھے بغیر عُجلت میں کہہ گیا۔

ظہیر: تم بھی عُجلت کہتے ہو؟

احمد۔ نہیں بس جلدی میں یوں کہہ گیا۔ ورنہ صحیح لفظ ہے عَجلت!

ظہیر:۔ یک نہ شد دو شد!

احمد:۔ ہاں ہاں! میں جانتا ہوں۔۔۔ "عجلت"۔۔ ۔ یہی تلفظ ہوگا۔ عجلت عجات تو لغو معلوم ہوتا ہے

ظہیر: جی! درست۔ ! تو عجلت ہی کہتے نا جب صحیح لفظ معلوم ہو تو غلط کیوں بولا جائے؟

احمد: یوں جانتا تو سبھی کچھ ہوں، مگر وہی "عجلت" میں غلطی کر جاتا ہوں، مگر مجھے "مَسَرت" ہے کہ مجھے خدا نے تم سا "محبّت" کرنے والا دوست دیا ہے۔ بھول چوک کے موقع پہ تم ازخود یاد تو دلا دیتے ہو۔ یوں میں سمجھتا تو سبھی کچھ ہوں مگر اس جلد بازی کا بُرا ہو۔۔۔ خیر تم بہت اچھا کرتے ہو، یاد دلا دیتے ہو!

ظہیر: میں کیا اور میری بساط کیا۔ زبان دانی ہنسی کھیل نہیں۔ جو تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ دوستوں کو بھی بتا دیتا ہوں۔ اب یہ "مَسَرت" اور "محُبت" بھی تو درست نہیں۔

احمد: تم خوب سمجھے! یہ دونوں لفظ میں نے غلط بولے ہیں یہی تو ہے میری جلد بازی، جو منہ میں آئے کہہ دیتا ہوں ورنہ صحیح تلفظ تو ہے۔۔۔ اوں۔۔۔ اوں۔۔۔ یعنی۔۔۔

ظہیر: "مُسَرت" کہو نا!

احمد: ہاں بالکل درست! مُسَرت ہی صحیح لفظ ہے "مَسَرت" کس طرح ہو سکتا ہے بھلا؟

ظہیر:۔ اور "محُبت" نہیں "مَحبت" صحیح تلفظ ہے۔

احمد زندہ باش! بالکل درست کہا تم نے۔ یہ مُحبت اور مَسَرت تو عوام کا تصرف ہے۔ لاحول ولا قوۃ! کس قدر لغو تصرفات ہیں۔

ظہیر:۔ احمد تم جان بوجھ کر غلط کیوں بولتے ہو۔ جلد بازی سے فائدہ؟ بات سوچ سمجھ کر کرنی چاہیئے۔

احمد: ظہیر بھائی اسی کو تو کہتے ہیں ناتجُربہ کاری (ناتجربہ کاری)

ظہیر: تجُربہ کار (تجربہ کار) تو خیر میں بھی کیا ہوں البتہ طالب علمی کی زندگی ضرور گزارتا ہوں۔

احمد: برا ہو اس جلد بازی کا، معلوم نہیں یہ آخر مجھے کہاں پہنچائے گی۔ اسی کی وجہ سے میں مژہ کو مُژہ، عجلت کو عُجلت، مُسَرت اور مَحبت کو مَسَرت، اور مُحبت کہہ گیا اور ابھی تم نے دیکھا ہوگا میں نے تجربہ کو بھی تجُربہ کہا یقین مانو تم نے اس لفظ کا تلفظ بالکل صحیح کیا بھلا "تجُربہ" بھی کوئی بات ہے توبہ کیا لغویت ہے

ظہیر: جو لوگ تجربہ کو تجُربہ اور تجرُبہ کہتے ہیں انہیں تذکرہ کو بھی تذکُرہ یا تذکرہ کہنا چاہیئے۔ ایسے ہی تفرقہ کو تفرُقہ یا تفُرقہ وقس علیٰ ہذا۔

احمد: واہ! مزہ آگیا، خوب خاکا اڑایا تم نے جہلا کا۔ الٰہی تیرا شکر! میں کچھ جلد باز تو ہوں مگر جاہل نہیں ہوں۔

حامد علی خاں

ابوظفر نازش رضوی

سرمایۂ نازش

آنکھ میں آنسو ہیں اور دِل درد سے لبریز ہے
بحرِ محسوسات کی ہر موج طوفاں خیز ہے

مَیں ہُوں اُس ساقی کا دیوانہ کہ جس کی نگاہ
مست، متوالی، سرور آموز، کیف آمیز ہے

عِشق کے فیض و کرم سے اب ہم اُس عالم میں ہیں
رنجِ محرومی بھی جس عالم میں راحت خیز ہے

شورشِ ساقی، ہوا مستانہ، موسم خوشگوار
شیخ جی کیا میکشی سے آج بھی پرہیز ہے

تیرے لطفِ خاص کے صدقے میں اے جانِ بہار
آرزوؤں کے چمن کی ہر کلی نوخیز ہے

نالہ اپنا بھی تو صورِ حشر سے کچھ کم نہیں،
کیا ہُوا رفتار اگر اُن کی قیامت خیز ہے

ایک بار اُس نے کہیں جھٹکی تھی زُلفِ عنبریں
آج تک ساری فضائے خلد عنبر بیز ہے

مدّتیں گذریں کہ پی تھی ہم نے اے نازش مگر
آج بھی سر میں خمارِ بادۂ تبریز ہے

طفیل ہوشیارپوری

غزل

دِل نے دِل تک کی پرواز
ہُوا محبت کا آغاز

کُھل گیا ہر سربستہ راز
تو غمّاز نہ میں غمّاز

اپنی نشیلی آنکھ سے پوچھ
کون چھپاتا دل کا راز

اُلجھے اُلجھے سے اے دوست
تیری محبت کے انداز

نورس غنچے تیری ادائیں
ہنستے ہوئے گُل تیرے ناز

محوِ ترنّم کیا جانے
ٹوٹا کس کے دل کا ساز

اشکوں میں آکر لہرائی
دل کے تڑپنے کی آواز

اپنی جفا پر تجھ کو غرور
اپنی وفا پر مجھکو ناز

درد کی دولت جس نے دی
اُس کے ستم کی عمر دراز

بھول نہ جاؤں راہِ حیات
دیتے رہنا تم آواز

بزمِ سخن میں آج طفیل
کون ہے تجھ سا سحر طراز

از: ملک راج آنند
ترجمہ: محمد حبیب اللہ اوج حیدرآبادی

اُس کے ماں باپ

ملک راج آنند سنہ ۱۹۰۷ء میں پشاور میں پیدا ہوئے سنہ ۱۹۲۵ء میں سرکاری وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گئے جہاں انہوں نے لندن اور کیمبرج سے فلسفہ میں ڈاکٹری کی طیلسان حاصل کی۔ ادب کے نقاد کی حیثیت سے ان کی متعدد تصانیف کے علاوہ ان کی دو مشہور کتابیں "اچھوت" اور "قلی" ہیں جن کا تعلق معاشرتی مسائل سے ہے جو مصنف کا خاص موضوع ہیں۔ ملک راج آنند نے چند ہی مختصر افسانے لکھے ہیں۔ ذیل کا افسانہ مترجم کی رائے میں اُن کا شاہکار ہے۔

گاؤں میں بسنت کا میلہ لگا تھا

سویا ہوا قصبہ جاگ اُٹھا آہستہ آہستہ نیلی لہر کی چادر ہلکی ہوتی گئی۔ مشرق میں افق پر ایک سنہرا سا خواب طاری ہونے لگا اور اس خواب سے ایک بڑا طبق اُبھر آیا جس کے کنارے ڈبڈباتی ہوئی آنکھ کی طرح چھلک کر اُسے سونے کا رنگ دیتے جاتے تھے۔

موسم بہار کا سورج آسمان کی نیلی گہرائیوں میں آب و تاب سے دمکنے لگا گھروں کے دروازے کھل گئے اور دھوپ روئی کے نرم نرم گالوں کی طرح قصبے پر بکھرتی گئی۔ تنگ و تاریک گلیوں اور کوچوں سے زرق برق لباس میں ملبوس انسانوں کا ایک سیلاب قصبے کے باہر اُس کھلے میدان کی طرف رواں دواں تھا جہاں چمکتی دھوپ اور پھولوں سے لدے درخت، اور سبزہ زار ہر شخص کا خیر مقدم کر رہے تھے ایک ننھا بچہ اپنے ماں باپ کے پاؤں سے لپٹا ہوا، ہنستا کھیلتا اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا

سڑک کی دونوں جانب کھلونوں کی دکانیں لگی تھیں اور جب بچہ اِن کھلونوں کو للچاتی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا ان میں محو ہو جاتا تو ماں باپ جو آگے بڑھ جاتے تھے، رُک کر اُسے آواز دیتے "آجا بیٹے آجا" اور بچہ ماں باپ کی آواز سُن کر دوڑا دوڑا ان کی طرف جاتا۔ گو اس کی نگاہیں بدستور پسندیدہ کھلونوں پر لگی رہتیں۔ اور جب وہ اُن کے پاس پہنچ جاتا تو پھر اس کی دبی ہوئی خواہش اُبھر آتی اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے انکار سننا پڑے گا۔ ضد کرنے لگتا۔

"مجھے یہ کھلونا لے دو"

اور اس کا باپ سُرخ انگاروں جیسی آنکھیں اُس پر نکالتا اور اس کی ماں جو خوشگوار موسم کے زیر اثر نرم دِل ہو گئی تھی، بچے کی انگلی پکڑ کر کہنے لگتی "دیکھ تو، تیرے سامنے کیا ہے"

اور بچہ جو اپنی خواہش کی تکمیل نہ ہونے پر خفگی کا اظہار بھرائی ہوئی آواز میں سسکیاں لیتے ہوئے م ۔ آ ۔ آ ۔ ں، سے بمشکل کر پاتا پھر سامنے کے نظاروں کی دلکشی میں محو ہو جاتا۔

گاؤں کی گرد آلود سڑک یہاں ختم ہو گئی تھی۔ اور اب یہ لوگ کھیت کی ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے

سامنے سرسوں کا ایک وسیع کھیت تھا جس کے زرد زرد

پھول تا حدِ نظر ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی نے سونا پگھلا کر بہا دیا ہو اور جب ہوا چلتی اور اس کے بوجھ سے سرسوں کے پودے کبھی ایک طرف جھکتے کبھی سیدھے ہو جاتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے سونے کے سمندر میں جوار بھاٹا آ رہا ہے جس مقام پر کھیت ختم ہو جاتے وہاں پست پست گھروں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا جہاں زرد لباس میں ملبوس مرد، عورتیں اور بچے ہنستے کھیلتے، شور مچاتے دکھائی دیتے ان کی منتشر آواز دُور سے ایسی سنائی دے رہی تھی جیسے خوشبو اجتماعی طور پر قہقہے لگا رہا ہو۔ بچہ ماں باپ کی طرف دیکھتا جو اس نظارہ سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے اور جب ان کے چہروں پر اطمینان و بشاشت کے آثار دکھائی دیتے تو وہ بے اختیار کھلے میدان میں دوڑتا۔ ہرن کی طرح اُچھلتا، کودتا اور چوکڑیاں بھرتا۔ اس کے پاؤں اس ہوا کو کاٹتے۔ جو سنسناتی ہوئی دُور کے کھیتوں سے آ رہی تھی۔

کچھ بھڑیں اپنے زرد پروں کو پھڑپھڑاتی ان تتلیوں اور بھونروں کے راستے کی رکاوٹ بنی ہوئی تھیں جو شہد اور پھول رس کی تلاش میں مہکتی خوشبو کے پیچھے مصروفِ پرواز تھیں۔

بچہ ان تتلیوں کے پیچھے بھاگنے لگتا اور جب یہ تتلیاں پر مل کو بند کر کے کسی پھول پر بیٹھ جاتیں تو یہ انہیں پکڑنے کی کوشش کرتا اور جب وہ نہایت خاموشی سے اپنی انگلیاں ان کی طرف بڑھا کر پکڑنے کے قریب ہوتا تو وہ دفعتہً اُڑ جاتیں اور اپنے بازوؤں کو کھولتی بند کرتی فضا میں کہیں گم ہو جاتیں۔ ایک سیاہ بھونرا، جو بچے کی گرفت میں نہ آ سکا تھا اس کے کان کے اطراف بھنبھناتا اس کے ہونٹوں پر بیٹھنے کے قریب ہی تھا کہ ماں نے آواز دی۔

" آجا، بیٹے، آجا ادھر ہمارے پاس آجا " اور بچہ خوشی خوشی اچھلتا کودتا اپنے ماں باپ سے آ ملا۔ اور تھوڑی دُور اُن کے ساتھ چل کر ان کیڑوں مکوڑوں کو دیکھنے ایک مقام پر کھڑا ہو گیا جو زمین میں اپنے پوشیدہ سوراخوں سے مسلسل باہر آ جا رہے تھے چلنے میں جب ماں باپ یہ محسوس کرتے کہ بچہ پیچھے رہ گیا ہے تو وہ پھر آواز دیتے۔ " آجا رے آجا، اور خود تھک کر گھنے درختوں کے جھنڈ میں کسی باؤلی کی منڈیر پر سستانے بیٹھ گئے۔

بڑ کا ایک گھنا درخت جس کی دراز اور وسیع شاخیں، شیشم، نیم، جامن، اور سرس وغیرہ کے درختوں پر چھا گئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی بوڑھی دادی موسم سرما میں اپنا لحاف اپنے تمام پوتوں کو اڑھا کر انہیں اپنے قریب سمیٹ لیتی ہے۔ اس کے اردگرد کسی حسینہ کی چشمِ نیم باز کی طرح ادھ کھلے غنچے نسیمِ سحر کو خراج ادا کر رہے تھے۔ اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ان پھولوں اور غنچوں کے زرِ گل کو لیتے ہر طرف خوشبو کی لپٹوں کے ساتھ انہیں بکھیر رہے تھے۔ بچہ جونہی درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوا۔ اس پر گرتے ہوئے پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ اور جب وہ بکھری ہوئی پنکھڑیوں کو جمع کرنے لگا۔ تو اس کی نظر کچھ ہرنوں پر پڑی اور وہ اپنے ماں باپ کی طرف " ہرن! ہرن!! " پکارتا بھاگا اور پنکھڑیاں ہر طرف منتشر ہو گئیں۔ ماں باپ ابھی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ دور کسی گوشے سے کوئل نے کو۔ کو کی صدا لگائی۔

" آجا بیٹے آجا " انہوں نے آواز دی اور بچہ بڑ کے درخت کے نیچے ان کے پاس پہنچ گیا اور وہ بچے کی انگلی پکڑے سرسوں کے کھیت سے میلے کی طرف روانہ ہوئے۔ اور جب وہ گاؤں کے قریب پہنچے تو بچے نے دیکھا کہ ہر طرف سے انسانی سروں کا سمندر میلے کی طرف امڈا آ رہا ہے اور وہ ان مناظر کی دلکشیوں میں کھو گیا۔

میلے کے دروازے پر ایک پھیری والا گلاب جامن، رس گلے برفی، جلیبی، کی صدائیں دے رہا تھا۔ اور اس کی رنگ برنگی ٹوکری

میں سنہرے، روپہلے ورق لگی مٹھائی سلیقہ سے سجی دھری تھی جس کے اطراف خریداروں کا ہجوم لگا تھا۔ اپنی پسندیدہ مٹھائی، برفی کو دیکھ کر بچے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے آہستہ سے کہا: "میں برفی لوں گا" لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی خواہش پوری نہیں کی جائے گی اور ماں باپ اسے لالچی کا لقب دیں گے۔ اس لئے وہ جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔

ایک گلفروش پکار رہا تھا "لے لو چنبیلی کے ہار"۔ اور چنبیلی کی مست کرنے والی خوشبو کے زیر اثر بچہ پھول بیچنے والے کی طرف بڑھا اور مطالبہ کرنے لگا "مجھے ایک ہار دے دو" لیکن وہ جانتا تھا کہ پھولوں کی گرانی کا عذر پیش کر کے ماں باپ اسے یہ گجرا نہیں دلائیں گے اس لئے وہ جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گیا

ایک طرف ایک شخص رنگ برنگ کے غبارے لئے کھڑا تھا جو ہوا میں اڑ کر عجیب رنگا رنگ منظر پیش کر رہے تھے۔ قوس قزح کا یہ نقشہ دیکھ کر بچے کا دل بے اختیار ان غباروں کے لئے تڑپ اٹھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ماں باپ یہ کہیں گے کہ اب تمہاری عمر غباروں سے کھیلنے کی نہیں ہے۔ اس لئے وہ آگے بڑھ گیا۔

ایک طرف ایک مداری بین بجاتا سانپ کا تماشا دکھا رہا تھا اور ناگ ایک ٹوکری میں کنڈلی مارے راج ہنس کی خمیدہ گردن کی طرح پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ بین کی موسیقی ناگ کے نظر نہ آنے والے کانوں میں یوں داخل ہو رہی تھی جیسے دور سے کسی جھرنے کے گرنے کی آواز سنائی دے۔ لیکن یہ جان کر کہ اس کے ماں باپ ایسی غیر دلکش موسیقی کو سننے سے ہمیشہ منع کرتے آتے ہیں، وہ آگے بڑھ گیا۔

ایک جانب جھولے پڑے تھے جن میں مرد، عورت اور بچے بیٹھے چکر لگا رہے تھے، جب کوئی جھولا اوپر جاتا تو سب کے سب خوشی سے چیخ اٹھتے۔ بچہ جھولوں کو گھومتا دیکھنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھی جھولوں کے ساتھ ساتھ گھومنے لگیں، اس کے چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور ہونٹ فرط حیرت سے نیم کشادہ تھے۔ وہ اس نظارے میں ایسا کھو گیا جیسے وہ خود ان کے ساتھ ساتھ جھول رہا ہو۔

جھولے کا چکر پہلے تو تیزی سے گھوما پھر آہستہ آہستہ سست رفتار ہوتا گیا اور بچہ انگشت بدنداں اسے ساکت ہوتے دیکھتا رہا۔ جھولا جھولنے کی خواہش ماں باپ کے دائمی انکار کی حقیقت پر غالب آ گئی اور وہ بے اختیار پکار اٹھا: "میں اس جھولے میں بیٹھوں گا۔ اچھی اماں۔ پیارے ابا" لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ وہ اپنے ماں باپ کی طرف مڑا لیکن ان کا پتہ نہ تھا۔ اس نے دونوں جانب نظر دوڑائی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بھی ماں باپ نظر نہ آئے۔

اور اس کے خشک حلق میں ایک چیخ آن کر رک گئی اور وہ جس مقام پر کھڑا تھا۔ وہاں سے ایک جھٹکے کے ساتھ روتا چیختا آگے کی طرف دوڑا "ماں میری ماں۔ ابا"! اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے، چہرے پر خوف اور اضطراب کے آثار ہویدا تھے اور عالم پریشانی میں وہ ایک جانب سے دوسری جانب بے تحاشا دوڑنے لگا۔ یہ جانے بغیر کہ کہاں جانا چاہئے۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں پکارنے لگا "اماں۔ ابا" دوڑنے سے اس کے کپڑے پسینے سے بھیگ گئے۔ اور اس کے پاؤں پریشانی میں من من بھر وزنی ہو گئے۔

اِدھر اُدھر بے تحاشا دوڑنے کے بعد ہار تھک کر وہ روتا، سسکیاں لیتا ایک جگہ رک گیا۔ اس سے کچھ دور سبزے پر اپنی اشک آلود آنکھوں سے اس نے ان مرد عورتوں کو دیکھا جن کے چہرے مدھم نظر آتے تھے اور جو خوش گپیوں میں معروف قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ ان میں سے ہر ایک کے چہرے کا جائزہ لینے لگا لیکن ان میں اس

کے ماں باپ نہ تھے۔ اس دفعہ وہ ایک مندر کی طرف بھاگا جہاں عوام کا ہجوم تھا۔ اتنا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ لوگوں کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا "اماں۔ ابا" پکارتا رہا۔ مندر کے دروازے پر بیحد ازدہام تھا۔ زائرین ایک دوسرے پر لوٹ پڑ رہے تھے۔ بھاری بھرکم جسم کے لوگ جن کی آنکھیں ڈراؤنی تھیں —— غریب بچہ ان کی ٹانگوں میں سے اندر داخل ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگا مگر وہ دھکے کھاتا رہا اور قریب تھا کچلا جاتا اگر وہ اپنی پوری طاقت سے رونی آواز میں نہ چیختا: "اب — با۔ اماں" مجمع میں سے ایک شخص نے اس کی آواز سن لی اور بمشکل تمام اسے کھینچ نکالا اور ایک طرف لے جاکر پوچھنے لگا "بابا یہاں تم کیسے آگئے۔ تم کس کے لڑکے ہو؟"

لڑکا اس دفعہ اور بھی شدت سے رونے لگا۔

"مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دو۔ آبا تم کہاں ہو؟"

اُس شخص نے بچے کا دل بہلانے کی کوشش کی اور جھولے کے پاس لے جاکر دریافت کرنے لگا۔

"گھوڑے پر بیٹھو گے؟"

بچے کے حلق سے وقت واحد میں سینکڑوں چیخیں نکل گئیں اور وہ کراہ اٹھا: "مجھے میری اماں کے پاس پہنچا دو۔ آبا کے پاس لے چلو۔"

اور وہ شخص بچہ کو اس مقام کی طرف لے گیا۔ جہاں سپیرا بین بجا کر سانپ کا تماشا دکھا رہا تھا۔

"سنو سنو۔ ادھر دیکھو تو۔ کیا اچھا تماشا ہے۔"

لیکن بچے نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور چیخنے لگا۔

"میری ماں کہاں ہے؟ مجھے میرے آبا کے پاس پہنچا دو۔"

اس دفعہ وہ شخص اسے رنگ برنگی غبارے بیچنے والے کے پاس اس خیال سے لے گیا کہ شاید بچے کا دل ان غباروں سے بہل جائے لیکن بچے نے اڑتے غباروں کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور پکارنے لگا

"مجھے میری ماں کے پاس لے چلو۔ آبا تم کہاں ہو؟"

اور اُس شخص نے بچے کو کسی نہ کسی طرح خاموش کرنے کی دھن میں اسے پھول کے گجرے فروخت کرنے والے کے پاس لے جاکر کھڑا کیا: "دیکھو خوشنما اور خوشبودار پھول ہیں گلے میں ایک ہار پہنو گے؟"

بچے نے اپنی ناک بند کرلی۔ اور سسکیاں لیتے ہوتے کہنے لگا۔

"مجھے اماں کے پاس لے چلو۔ مجھے آبا کے پاس پہنچا دو"

یہ خیال کرکے کہ شاید مٹھائی سے بچے کا دل بہل جائے۔ وہ بچے کو مٹھائی کی دکان پر لے گیا اور پوچھنے لگا۔

"تمہیں کون سی مٹھائی پسند ہے؟"

بچے نے مٹھائیوں کی طرف سے نظریں پھیر لیں اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے میری ماں کے پاس لے چلو۔ آبا۔ اماں تم کہاں ہو؟"

اوج حیدرآبادی

بزمِ سخن

گیت

(عبدالمجید بھٹی)

ہم سے رُوٹھ کے جانے والو
تڑپانے کلپانے والو
ہم تنہا گھبراتے ہیں
تم رُک جاؤ!
ہم آتے ہیں

رُت جھڑ اور بہار کے ناتے
باغوں کو ہیں باغ بناتے
بھونرے دُھوم مچاتے ہیں
تم رُک جاؤ!
ہم آتے ہیں

جیون جیون چلنا ہوگا!
تنہا تنہا چلنا ہوگا!
دیکھو ہم سمجھاتے ہیں!
تم رُک جاؤ!
ہم آتے ہیں

رُباعیّات

(ڈاکٹر گیان چند غافل)

کونین میں جیسے انقلاب آتا ہے
جزر و مد کی طرح شباب آتا ہے
ہو جاتی ہے احساس سے فطرت معمور
ہر آہ کا تاروں سے جواب آتا ہے

ایسی دنیا میں چل جو بہلاتی ہو
بلبل پھولوں کے درمیاں گاتی ہو
پھولا رہے جس جگہ شفق سارے دن
رُک رُک کے شمیم حسن برساتی ہو

تو ہے قدرت کی سرنوشتوں سے بلند
پرواز تری رہے بہشتوں سے بلند
اے مردِ گناہگار بافسق و فجور
تو اب بھی ہے مفلوج فرشتوں سے بلند

کیا کیا ترے ہجر میں پگھلتا ہے دل
جلتا ہے۔ دھڑکتا ہے مچلتا ہے دل
بیٹھے ہوئے لاکھ کیجئے تیری یاد

تدبیر سے بھی کوئی سنبھلتا ہے دل

جس وقت زمیں پہ چاندنی آتی ہے
فطرت کی سنہری زلف لہراتی ہے
گاتا ہے جبھی رفیق نغمے کوئی!
کونین پہ ایک نیند چھا جاتی ہے

غزل

(حبیبی سرشار)

رخشندگیِ انجم و شمس و قمر کو دیکھ
تابندگیِ لعل و صفائے گہر کو دیکھ
دیکھ! آدمی کی زندگیِ مختصر کو دیکھ
پھر جد و جہد و کشمکش و شور و شر کو دیکھ
کر غور کچھ تسلسلِ مرگ و حیات پر
ہر روز کے تواترِ شام و سحر کو دیکھ
حاصل حیاتِ تازہ ہوتی ہے بہار سے
ہر نخل و غنچہ و گل و برگ و ثمر کو دیکھ
کس درجہ روح پرور و راحت نواز ہے
حسنِ سوادِ شام و طلوعِ سحر کو دیکھ
صوتِ ہزار و نالۂ بلبل پہ غور کر
آوارگیِ نکہتِ گلہائے تر کو دیکھ
یہ کیا کہا؟ "محبت و مہر و وفا کہاں؟"
ہم کو، ہمارے دل کو، ہمارے جگر کو دیکھ
کچھ مشکلیں بھی راہ میں دشواریاں بھی ہیں
سرشار! بُعدِ منزل و زحمتِ سفر کو دیکھ!

حضور و غیاب

(ظفر اقبال حشر)

اُف! مری شدتِ احساس کی تلخی نہ گئی
نور کے سائے میں ابتک وہی ظلمات کی رات
آج تک تجھ سے یہ کہنا بھی گوارا نہ ہوا
اپنے ماضی سے بھی مل سکتی ہے کیا مجھ کو نجات

زندگانی کو جو حساس نظر سے دیکھو
یہی آشوبِ جہنم ہے یہی جنت ہے
ایک ماحولِ یقیں بھی ہے ورائے احساس
اور وہاں تو ہے ترا نور تری رحمت ہے

کیا تماشا ہے یہ ہنگامہ پسندی یا رب!
یہ مکافات، یہ مخلوق، یہ محشر، یہ حساب
یہ جہاں منتظرِ جوشِ کرم ہے یا رب!
بس یہیں تک تو نہیں تھا تری رحمت کا نصاب

دونوں عالم پہ کبھی اس کی نظر جاتی ہے
آ ہی جاتا ہے اسے تیری خدائی کا یقیں
تجھ کو سمجھے بھی تو کیا سمجھے ترا عبدِ ضعیف
دیکھتا ہے جو تجھے قلبِ تمنا میں مکیں!

★

مخزن المخازن

"ہمایوں"

اقبالؒ اور جاوید اقبال

(جاوید اقبال)

والد صاحب یورپین لباس کو ناپسند کرتے تھے اور مجھے شلوار اور شیروانی پہننے کی تاکید کیا کرتے تھے۔

جب کبھی میں کپڑوں کے لئے کوئی قیمتی چیز خریدتا تو وہ مجھے ملامت کرتے اور فرماتے۔ کیا تم اپنے آپ کو کسی لارڈ کا بیٹا سمجھتے ہو۔ تم اگر اپنے طور طریق کی اصلاح نہیں کرو گے تو میں تمہیں کھدر پہننے پر مجبور کر دونگا۔

میرے لئے بارہ آنہ گز سے زائد کا قمیص کا کپڑا خریدنا یا آٹھ روپے سے زیادہ قیمت کا جوتا لینا بہت بڑا گناہ تھا۔

اگر میں پلنگ کی بجائے زمین پر سو جاتا تو والد صاحب بہت خوش ہوتے تھے۔

والد صاحب نے اپنی حیات میں مجھے صرف ایک مرتبہ سینما دیکھنے کی اجازت دی جس فلم کو دیکھنے کی اجازت دی گئی وہ درحقیقت نپولین کی داستان عشق سے متعلق تھی لیکن کسی شخص نے ان کو بتا دیا تھا کہ وہ ایک تاریخی فلم ہے

میرے والد صاحب تاریخ کی بہادر شخصیتوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ اکثر حضرت خالد بن ولید اور حضرت فاروق اعظمؓ کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ نپولین کے آباء و اجداد عرب سے آئے تھے اور مشہور پرتگالی سیاح واسکوڈے گاما کو ہند کا راستہ عربوں ہی نے بتایا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اس سے پہلے سرزمین ہند کا پتہ چلا لیا تھا۔

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں والد صاحب کی قوت بصارت بہت کمزور ہوگئی تھی اور وہ اخبار مجھ سے پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔ اگر میں کسی لفظ کا غلط تلفظ کرتا تو بہت ناراض ہوتے۔

رات کے وقت جب میں اُن کو اُن کا کلام سنایا کرتا تو خفیف سی غلطی بھی ان کو مشتعل کر دیتی اور وُہ مجھے فوراً ڈانٹتے کہ تم جو کچھ پڑھ رہے ہو یہ نظم ہے یا نثر!!

والد صاحب اکثر مجھ سے قرآن مجید کی تلاوت کرایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ مجھ سے مولانا حالی کا مسدس سنا جائے میں نے مسدس کے اشعار سنانے شروع کئے جب میں مسدس کے اس حصّے کو پڑھنے لگا جس میں حضرت رسول مقبولؐ کا ذکر آتا ہے تو والد صاحب پر رقت طاری ہوگئی۔ حالانکہ جب والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا تھا جن سے انہیں بے انتہا محبت تھی اس وقت بھی وہ روتے نہیں تھے۔

یہ اُن کی خصوصیت تھی کہ جب کبھی قرآن پاک کی تلاوت کی جاتی یا حضرت رسول اللہ صلعم کا نام نامی لیا جاتا تو ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی۔

مُنیرہ ان کی چہیتی بیٹی تھی۔ وہ اپنی جرمن گورنس کے ساتھ گھنٹوں ان کے کمرے میں رہا کرتی تھی۔ والد صاحب گورنس سے جرمن زبان میں بے تکان باتیں کیا کرتے تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ مُنیرہ بھی یہ زبان

سیکھ لے۔ وہ منیرہ سے فرمایا کرتے تھے کہ جو من عورتیں بہت بہادر ہوتی ہیں۔

جب کبھی منیرہ اپنے بالوں کی دُہری پلیٹ نکالتی وہ خفا ہوتے۔ اور فرماتے اس طرح یہودنیں بال بنایا کرتی ہیں۔

مجھے مستقل ہدایت تھی کہ جب کبھی ان کے پاس کچھ لوگ آن کر بیٹھا کریں، میں ضرور موجود رہا کروں۔

بزرگوں کی باتوں کو سننا میرے لئے ایک مصیبت تھا میری جانب سے ان کی باتوں میں عدم دلچسپی کا اظہار والد صاحب کو رنجیدہ کر دیا کرتا تھا۔

میں اس بھیانک رات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب والد صاحب کا انتقال ہوا۔ وہ اپنی نشست گاہ میں پلنگ پر لیٹے ہوتے تھے اور ان کے عقیدت مند اور مداح ان کو گھیرے ہوتے تھے جب میں رات کو نو بجے کے قریب کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ میں جذباتِ غم سے مغلوب ہو کر بے تابی کے ساتھ چلایا میں جاوید ہوں"

اس پر انہوں نے ایک قہقہہ لگایا اور فرمایا، ثابت کرو تاکہ تم جاوید ہو — پھر اپنے ایک عزیز ترین دوست سے ارشاد کیا۔ مہربانی کر کے آپ اس کا ضرور خیال رکھئے کہ یہ لڑکا نماز کا عادی بنے۔

میرے "جاوید نامہ" کے آخر میں "خطاب بہ جاوید" ہے۔

ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ وہ رات پوری نہ کر سکیں گے مگر اُن کی رائے والد صاحب کو نہیں بتائی گئی تھی تاہم وہ سب کچھ سمجھے ہوئے تھے لیکن پھر بھی اس رات خوب ہنستے بولتے رہے۔

مجھے پریشانی سے بچانے کی غرض سے والد صاحب کی تشویشناک حالت سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ افسوس! میں طلوعِ آفتاب سے قبل تک اپنے کمرے میں پڑا سوتا رہا۔

پھر علی بخش میرے پلنگ کے پاس پہنچ کر چلایا "چلو! دیکھو!! تمہارے والد صاحب کو کیا ہو گیا"!!!

مُنیرہ اور مَیں دونوں رنج و غم کی شدت سے کپکپاتے ہوئے والد صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے سب کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور وہ ایک سفید چادر اوڑھے لیٹے تھے۔

اس وقت میرا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ لیکن پھر بھی کچھ ایسی بات تھی کہ مَیں رو نہ سکا۔ اچانک میرا ایسا تصور بندھا کہ والد صاحب پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئے ہیں اور اپنے دونوں ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھ کر فرما رہے ہیں۔

"تم مرد ہو! یاد رکھو مرد روتے نہیں"

"ایشیا"

غزل

جگر مرادآبادی

وہ اداے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتحِ زمانہ
یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ
کبھی حُسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہی نازِ بے نیازی، وہی شانِ خسروانہ
مجھے چاک جیب و دامن سے مناسبت نہیں کچھ
یہ جنوں ہی کو مبارک رہ و رسمِ عامیانہ
تری اک نمود سے ہے ترے اک حجاب تک ہے
مری فکر عرش پیما، مرا نازِ شاعرانہ

"نگار"

بدقسمت ہندوستان

انسانوں کی طرح بعض ملک بھی بدنصیب ہوتے ہیں۔ اور ہندوستان بھی غالباً ایسا ہی ملک ہے — اس کی بدبختی کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سب سے پہلے آریہ قوم وسط ایشیا کی طرف سے یہاں آئی اور یہاں کی اصلی آبادی کو اُبھرنے کا کوئی موقع نہ دیا گیا، حتیٰ کہ ہندوؤں کی اونچی قومیں جو اپنے آپ کو آرین نسل میں شمار کرتی ہیں اب بھی ان سے نفرت کرتی ہیں اور ان کو اچھوت کہتی ہیں۔

ہندوؤں کے بعد مسلمانوں کی حکومت ہوئی، اور اعلیٰ نسل کے ہندوؤں کا بھی اقتدار ختم ہو گیا۔ مسلمانوں کے بعد انگریز آئے جو ہندو مسلمان دونوں سے مذہبی، ثقافتی اور ملکی تعلق دور کا بھی نہ رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے زمانہ میں خیر یہ تو تھا کہ جب ان کی سلطنت مستقلاً قائم ہو گئی تو ملک کی دولت ملک ہی میں رہی۔ لیکن انگریزوں نے تو اس کو ویرانہ ہی بنا کر چھوڑا۔ ظاہر ہے کہ جب ظلم اپنی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے تو مظلومیت کا احساس بھی ردِ عمل پیدا کرتا ہے اور یہی وہ چیز تھی جس نے کانگرس کو پیدا کیا اور آخر کار جہاتما گاندھی کی قیادت میں اس نے اتنی قوت حاصل کی کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا اور صدیوں کی غلامی کے بعد ملک کو آزادی کی راحت نصیب ہوئی۔

لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ ہندوستان شاید قدرت ہی کی طرف سے بدنصیب واقع ہوا ہے، آزادی ملنے کے بعد بھی اس کو امن و سکون نصیب نہیں اور ملک کی وہی جماعت جس نے حصولِ آزادی کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی تھیں، اپنا اثر و اقتدار کھوتی جارہی ہے اور وہ دن غالباً دور نہیں کہ ملک کی آزادی نہایت مکروہ قسم کی خانہ جنگی اختیار کر لے۔

ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ ہے صرف اس بات کا کہ کانگرس کا اثر اٹھتا جارہا ہے اور اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ خود کانگرس کے اندر پھوٹ پڑ گئی ہے۔

پھر اس سے زیادہ بدنصیبی ہندوستان کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ کانگرس جس نے ملک کو آزاد کرایا، آج اس سے آزاد ہونے کی تحریک ملک میں عام ہوتی جارہی ہے۔ اور اگر دنیا میں کوئی بات بغیر کسی سبب کے نہیں ہو سکتی، تو اس کا سبب کانگرس حکومت کو خود اپنے ہی اندر تلاش کرنا چاہئے۔

اس باب میں ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ (صدر کانگرس) نے جو بیان دیا ہے اس کا ایک حصہ بہت زیادہ دلچسپ ہے انہوں نے کہا کہ "ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو بہت پُر امن طریقہ سے اختیارات مل گئے لیکن اس کا مخالف پہلو بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ اختیارات فوجی حکومت کے تشدد آمیز طریقوں سے حاصل ہوتے تو عوام میں یہ بددلی نہ ہوتی جو آج پائی جاتی ہے کیونکہ اس وقت بلیک مارکیٹ سے فائدہ اٹھانے والوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا، رشوت لینے والوں کو درختوں میں لٹکا کر پھانسی دے دی جاتی، اور اس طرح دوسرے قومی مجرموں کو عبرتناک سزائیں دے کر تمام برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا جاتا لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ حکومت مروجہ قوانین کی پابند ہے اور ملک شہری آزادی کو انسدادِ جرائم پر ترجیح دیتا ہے"

صدر کانگرس کے اس بیان سے حکومت کی جس مجبوری پر روشنی پڑتی ہے وہ یقیناً بڑی تلخ حقیقت ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکومت کی کمزوری اور ارکانِ حکومت کی فرض ناشناسی دور کرنے کی کوئی صورت سوا اس کے نہیں ہے کہ یہاں فوجی حکومت

قائم کردی جاتے ۔؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر کانگرس کے اندرونی اختلافات دور ہو جائیں (جس کا اعتراف انہوں نے بھی کیا ہے، اور کانگرس پھر اسی بے تعصبی اور آزاد خیالی کی راہ پر آجاتے جو مہاتما گاندھی نے بتائی تھی تو بغیر فوجی حکومت کے بھی اصلاح ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہیں ہے، تو پھر یہ حالات موجودہ حکومت کا زوال اور اسی کے ساتھ خانہ جنگی ایک کھلا ہوا منطقی نتیجہ ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"آجکل"

درس محبت

(جوش ملیح آبادی)

عزیزو! یہ جوش روان بخش ہند
یہ مے خوار زاہد، یہ درویش رند
یہ دنیا کا حق کیش باطل نواز
یہ خاور شکن شاعر ذرہ ساز
یہ طاعت پرست و بغاوت پناہ
یہ فطرت سفید و بہ نامہ سیاہ
بخلوت سرود و بجلوت خروش
یہ تعمیر آمادہ تخریب کوش
یہ صورت گر نور و معمار نار
یہ آئینۂ اولیائے کبار
یہ جوئندۂ ہر خفی و جلی
گنہگار معصوم، کافر ولی
گہے شادمان و گہے مضمحل
جہنم در آغوش و جنت بدل
بہ ہستی مکدر، بہ مستی نقی
یہ اس دور کا فاسق متقی
یہ تاریک دنیا کا روشن ضمیر
سیہ کار قدسی، قدح خوار پیر
یہ جھوٹی عدالت کا سچا گواہ
یہ سر تا قدم اک مقدس گناہ
خطاؤں کے ہوتے سزاؤں سے دور
یہ قانون داں مجرم بے قصور
یہ دانا و عادل ظلوم و جہول
یہ بے دین مومن، یہ منکر رسول
ندا دے رہا ہے تمہیں صبح و شام
عزیزو یہ رند علیہ السلام
ندا دے رہا ہے سوئے منزلت
یہ پیغمبر دین انسانیت،
محبت کا اس پیر سے درس لو
خس و خار سے بھی محبت کرو
محبت کے دنیا میں غنچے کھلاؤ
شرارے بجھا دو، ستارے اگاؤ
ہر اک حلقہ پا بند زنجیر ہو
ہنسو، مسکراؤ بغلگیر ہو
نہ رندی، نہ مستی نہ عشرت حرام
اگر ہے تو میل عداوت حرام
نہ ہندو، نہ گبر و مسلماں بنو
اگر آدمی ہو تو انساں بنو
نہیں تو ہلاکت میں ڈھل جاؤ گے   خود اپنے جہنم میں جل جاؤ گے

"ماہِ نو"

ارشاداتِ قائدِ اعظم

(۱) تم آزاد ہو تم سب کو پوری آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جاؤ۔ تمہارا تعلق خواہ کسی مذہب، فرقہ یا عقیدہ سے ہو، حکومت کو اس سے بالکل سروکار نہیں۔ ہم اپنے کام کی بنیاد اس اصول پر رکھ رہے ہیں۔ کہ ہم ایک مملکت کے شہری اور برابر کے شہری ہیں تم اس خیال کو اپنا نصب العین بناؤ، اور تم دیکھو گے کہ تھوڑے ہی دن میں نہ ہندو ہندو رہے گا، نہ مسلمان مسلمان۔ مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں اس لئے کہ ہر شخص کا مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے جس کے مطابق ہر شخص اِس مملکت کا شہری ہے۔

(کراچی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء)

(۲) آپ کو اپنے عمل اور اپنی مثال سے اپنے ماتحتوں میں ایک تازہ روح بیدار کرنی ہے۔ آپ کو انہیں محسوس کرانا ہے کہ وہ ایک نصب العین کے لئے کام کر رہے ہیں، اور یہ نصب العین اتنا بلند ہے کہ اس کے لئے ہر بڑی سے بڑی قربانی کی جاسکتی ہے۔

(کراچی ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

(۳) یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اُن زرین اصولوں پر عمل کرنے میں ہے جو ہمارے عظیم المرتبہ، واضع قانون رسول پاکؐ نے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ آئیے ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد سچّے اسلامی اصول اور نصب العین پر قائم کریں۔

(سبی دربار۔ ۱۱ فروری ۱۹۴۸ء)

(۴) آزادی کے معنی بے راہ روی ہرگز نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آزاد ہو کر آپ مملکت کے دوسرے شہریوں کے مفاد کے لحاظ کے بغیر جو چاہیں کرتے رہیں۔ آپ پر بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اب پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ ہم متحدہ طور پر اور پورے نظم وضبط کے ساتھ کام کریں۔

(ڈھاکہ، ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء)

(۵)۔ ہم مسلمانوں کا ایمان، ایک خدا، ایک کتاب اور ایک نبی پر ہے۔ اس لئے ہمیں قوم کی حیثیت سے ایک ہو کر رہنا چاہئے۔ بڑی پرانی کہاوت ہے کہ اتحاد میں قوت ہے۔ اتحاد میں فتح ہے اور اختلاف میں شکست۔

(پشاور۔ ۱۷ اپریل ۱۹۴۸ء)

(۶)۔ قدرت نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ کے وسائل لامحدود ہیں۔ آپ کی مملکت کی بنیادیں رکھی جاچکی ہیں۔ اس بنیاد پہ عمارت تعمیر کرنا، اور جتنی جلدی اور جتنی خوبی سے ہوسکے تعمیر کرنا آپ کا کام ہے۔ اس لئے بسم اللہ کیجئے، اللہ آپ کی مدد کرے۔ ("زیارت" ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء)

"معارف"

اصلاحاتِ اقبال

(از جناب محمد بشیر الحق صاحب سنوی عظیم آبادی)

کتب خانہ الاصلاح میں رسالہ مخزن سلسلۂ قدیم کی مکمل جلدوں کے علاوہ دوسرے مشہور رسائل کی بھی مکمل و نامکمل جلدیں محفوظ ہیں۔ میں نے سب سے پہلے رسالہ مخزن کی کل جلدوں کو دیکھا تو بانگ درا کی درج شدہ نظموں کا بہت بڑا حصہ مخزن ہی کے اوراق میں بکھرا ہوا ملا، ان کا مقابلہ بانگ درا میں شائع شدہ غزلوں اور نظموں سے کیا تو ان دونوں میں بڑا فرق نظر آیا، چنانچہ ان ترمیموں اور اصلاحوں کو نوٹ کرتا گیا، اس سے تلاش و جستجو کا حوصلہ بڑھا اور دوسرے رسائل و کتب کی

ورق گردانی سے اور بہت سی غزلیں اور نظمیں دستیاب ہوئیں جو "اصلاحاتِ اقبال" کے نام سے ہدیۂ ناظرین ہیں۔

"اصلاحاتِ اقبال" کی اشاعت سے یہ فائدہ ہوگا کہ اس سے کلامِ اقبال کا تدریجی ارتقاء سامنے آ جائے گا۔ اس کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ بانگ درا میں غزل یا نظم کا جو عنوان ہے پہلے اس کو جلی حرفوں میں دیا گیا ہے اور اس کے نیچے حوالے درج کر کے اصل اور اصلاحات کو بالمقابل کالموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اصل پرانا کلام پہلے کالم میں ہے اور اصلاح شدہ دوسرے میں۔ جس مصرع میں اصلاح ہے اس کے مقابل میں اصلاح دکھا دی گئی ہے اور بقیہ مصرعوں کے سامنے صرف نقطے دے دیتے گئے ہیں۔

ہمالہ

(۱)

رسالہ مخزن لاہور، ماہ اپریل ۱۹۰۱ء	بانگ درا صفحہ ۳
تجھ پہ کچھ ظاہر نہیں دیرینہ روزی کے نشاں	تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
نوجواں ہے دورۂ شام و سحر کے درمیاں	تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
تیری ہستی پر نہیں بادِ تغیر کا اثر	ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایام پر	تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے
تیری ہر چوٹی کا دامان فلک میں ہے وطن	چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن
چشمۂ دامن میں رہتی ہے مگر پرتو فگن	تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ہے یا آئینۂ سیال ہے	چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کیلئے رومال ہے	. . . . .
ہائے کیا جوشِ مسرت میں چلا جاتا ہے ابر	ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر	. . . . .
نہر چلتی ہے سرودِ خامشی گاتی ہوئی	آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی	کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی	آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
ناز کرتی ہے فرازِ راہ سے جاتی ہوئی	سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

گلِ رنگیں

رسالہ مخزن لاہور ماہ مئی ۱۹۰۱ء	بانگ درا صفحہ ۶
تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں	اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
واقفِ افسردگیہائے طپیدِ دل نہیں	. . .
زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں	. . .
کیوں یہ تسکینِ خموشی راز مجھے حاصل نہیں	یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
سوزِ بازوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے	اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
رازِ دہ کیا ہے ترے سینہ میں جو مستور ہے	اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
	. . .

عہدِ طفلی

خالی از مفہوم خود میری زباں میرے لئے	حرفِ بے مطلب تھی خود میری زباں میرے لئے
درد اس عالم میں جب کوئی رلاتا تھا مجھے	درد طفلی میں اگر کوئی رلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیرِ در میں لطف آتا تھا مجھے	

مرزا غالب

رسالہ مخزن لاہور ماہ ستمبر ۱۹۰۱ء	بانگ درا صفحہ ۹
فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا	فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تاکجا	ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تاکجا
روح تھا تو اور تھی بزمِ سخن پیکر ترا	تھا سراپا روح تو بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا	. . . . .
صورتِ روحِ رواں ہر شے میں جو مستور ہے	بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے
معجزِ کلکِ تصور ہے دیا دیوان ہے یہ	محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
یا کوئی تفسیرِ رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ	جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
بارشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ	تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
نورِ معنی سے دل افروزِ سخنداناں ہے یہ	تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار

نقش فریادی ہے تیری شوخیٔ تحریر کا — زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا — تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں — . . .
ہو تصور کا نہ جب تک فکرِ کامل ہمنشین — ہو تخیل کا نہ جبتک فکرِ کامل ہمنشیں
ہائے ! اب کیا ہو گئی ہندستان کی سرزمیں — . . .
آہ ! اے نظارہ آموزِ نگاہ نکتہ بیں ! — . . .
گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے — . . .
شمع یہ سودائیٔ دل سوزیٔ پروانہ ہے — شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے
اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر — . . .
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در — . . .
تیرے ہر ذرہ میں خوابیدہ ہیں شمس و قمر — ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر — . .
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے — . . . .
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے — . . . .

"نظام المشائخ"

میکسیکو کے کوچہ و بازار

(احمد شاہ بخاری)

پروفیسر احمد شاہ بخاری نے جو پہلی عالمگیر ریڈیو کانفرنس میکسیکو میں پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے تشریف لے گئے تھے۔ آنریبل خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر داخلہ کے نام حسب ذیل خط بھیجا تھا۔ اگرچہ یہ نجی خط ہے۔ لیکن اس کی دلچسپی کے پیش نظر خواجہ صاحب نے اسے اشاعت کے لئے عطا کیا ہے۔

مکرمی و مشفقی۔ سلام مسنون۔

ڈان کے ایک تازہ نمبر میں یہ خبر پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی کہ کراچی میں بازاروں اور سڑکوں کے نام مشاہیر قوم کے نام پر رکھے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں میکسیکو کے بعض طور طریقے انوکھے ہیں اور دلچسپ بھی ان کا مختصر حال لکھ بھیجتا ہوں ممکن ہے کوئی بات آپ کے کام کی نکل آئے۔

جہاں تک مجھے نظر آیا۔ یہاں کسی بازار یا سڑک کا نام کسی زندہ شخص سے منسوب نہیں۔ ہمارے لاہور کی طرح نہیں کہ جو شخص دو تین سال کے لئے میونسپل کمشنر ہوا وہ کسی نہ کسی سڑک کو اپنے نام سے مزین کر گیا۔ چنانچہ لاہور میں کئی سڑکوں اور محلوں کے نام اب ایسے ہیں کہ کسی کو یاد بھی نہیں کہ کن کن کے نام سے منسوب ہوتے تھے۔ اور اگر وہ اب تک زندہ ہیں تو کب کے گمنام یا بدنام ہو چکے ہیں۔ میکسیکو کی تاریخ یہ ہے کہ تین سو سال تک یہاں ہسپانوی حکمراں رہے۔ اور لوگوں کا خون چوسا۔ ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ اس ملک نے بزورِ شمشیر آزادی حاصل کی۔ اس کے تقریباً سوا سو سال تک خانہ جنگی رہی جس میں بڑے بڑے لیڈر اور بڑے بڑے اولوالعزم محب وطن دونوں قسم کے لوگ پیدا ہوتے ۱۹۱۰ء میں ایک انقلاب عظیم ڈکٹیٹری کے خلاف برپا ہوا جو کتنے سال تک رہا۔ اور جس میں میکسیکو کے بیشتر ذکور مارے گئے۔ اس سو دو سو سال کی تاریخ میں کئی محبانِ وطن اور مشاہیر قوم بروئے کار آئے اور اکثر قوم کی راہ میں شہید ہوتے یعنی قوم کے دشمنوں یا غداروں یا کوتاہ نظر لوگوں اور اہل ہوس کی گولی یا تلوار کا نشانہ بنے۔ ان سب کے نام آج بازاروں کی زینت ہیں محض ناموں ہی سے میکسیکو کے قومی عروج کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ تین نام تو بالخصوص جا بجا ملتے ہیں

(ایدالگو) HIDALGO (موریلاس) MORELOS (جواریز)۔ ان میں سے دو مشاہیر نے ۱۸۱۰ء میں ہسپانیہ کے خلاف علم آزادی بلند کیا تھا تیسرا انیسویں صدی کے وسط میں میکسیکو کا پریزیڈنٹ تھا۔ اُس نے نیا کانسٹی ٹیوشن ۱۸۵۷ء میں بنایا تھا۔ اور

کئی اصلاحات مرتب کی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر شہید پریذیڈنٹ کا نام کسی نہ کسی بازار پر ثبت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ادا ان کی مجھے بہت پسند آئی۔ وہ یہ کہ کئی بازاروں کے نام داستانِ قوم کی اہم تاریخوں سے منسوب ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا۔ پیرس میں بھی ایک مشہور بازار کا نام "۴ ستمبر" ہے۔ یہاں یہ رسم عام ہے۔ ہر بڑے شہر میں ایک نہ ایک بازار کا نام "۵ مئی" ضرور ہوگا۔ اس تاریخ کو میکسکو کی حکومت نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ HIDALGD نے آزادی کا اعلان ۱۶ ستمبر ۱۸۱۰ء کو کیا تھا چنانچہ ایک بازار کا نام "۱۶ ستمبر" ہے اسی طرح ایک اور بازار کا نام "۲۰ نومبر" ہے۔ علیٰ ہذا کوئی اجنبی یا سیاح جب میکسکو آتا ہے تو لامحالہ ایک نہ ایک دن ان تاریخوں کی اہمیت دریافت کرتا ہے۔ گویا خواہ مخواہ میکسکو کی تاریخ کے درخشاں پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ خود قوم پر بھی اس کا اثر بہت اچھا پڑتا ہے۔ بچے بچے کو اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے

صرف مشاہیر اور تاریخوں ہی پر کفایت نہیں۔ ایک بازار کا نام "ARTICLE-123" ہے۔ یہ میکسیکو کے کانسٹی ٹیوشن کی طرف اشارہ ہے۔ جو آخری مرتبہ ۱۹۱۷ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس کانسٹی ٹیوشن کی دفعہ ۱۲۳ میں مزدوروں کے حقوق بالوضاحت محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ اس بازار کا نام گویا اس بات کی یادگار ہے کہ میکسیکو کی کانسٹی ٹیوشن مزدوروں کی دوست اور خیر خواہ ہے۔

میکسیکو کا شہر اچھا خاصا وسیع ہے۔ آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے۔ چنانچہ سینکڑوں بڑے اور چھوٹے بازار ہیں۔ ناموں کی تلاش میں یہاں کے ارباب اقتدار نے بڑی بڑی جدتیں دکھائی ہیں۔ اپنے مشاہیر کے ناموں اور اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے پورا فائدہ اٹھا چکے۔ تو دنیا کی تاریخ اور دنیا کے جغرافیہ کی طرف رجوع کیا۔ یورپ کا کوئی مشہور دارالخلافہ یا شہر ایسا نہیں جس کے نام پر کسی نہ کسی بازار کا نام نہ ہو۔ ایک بازار کا نام "پیرس بازار" ہے۔ ایک کا نام "مارسیلز"، ایک کا نام "لندن" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسے بازار سب کے سب ایک دوسرے سے متصل اور ایک ہی علاقے میں واقع ہیں۔ چنانچہ آپ سے اگر کوئی بازار پیرس کا ذکر کرے تو آپ کو نام سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر کے کس حصے میں واقع ہے علیٰ ہذا ایک اور علاقہ ایسا ہے کہ اس میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور دریاؤں پر رکھے گئے ہیں مثلاً نیل، ڈنیوب، دجلہ، فرات، رائن وغیرہ۔

شہر کے ایک اور علاقے میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور اہلِ فن اور اہلِ علم کے ناموں پر رکھے گئے ہیں مثلاً شیکسپیئر، ڈارون، رینان، کوپرنکس وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور علاقہ میں سب بازاروں کے نام جنوبی امریکہ کے ملکوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً برازیل، ارجنٹائن، کیوبا، گواٹی مالا وغیرہ۔

لیکن جہاں کسی بازار کا نام پہلے ہی کوئی خاص تاریخی یا اسی قسم کی کوئی اور اہمیت رکھتا ہو اُسے بالکل نہیں بدلتے۔ خواہ یہ تاریخی اہمیت قومی ہو یا محض مقامی اور خواہ کوئی ادبی یا کوئی اور اہمیت ہو۔ اس کی مثال لاہور میں یہ ہے کہ انار کلی بازار، چوک زریخاں تیر اندازکی گلی، ایسے نام نہ بدلے جائیں۔ کیونکہ ان میں مقامی تاریخ کے کئی دلچسپ پہلو نکلتے ہیں۔ یہاں ہر شہر کی مقامی تاریخ میں خاص طور پر دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔ ہر شہر کا اپنا ایک عجائب خانہ ہے جس میں مقامی تاریخ تصاویر یا نقشے یا دیگر یادگاریں اور علاوہ بر آں مقامی صنعت وحرفت کے نمونے خاص طور پر رکھے جاتے ہیں۔ تاکہ سیاح فوراً اس شہر کی تمام خصوصیات سے آگاہ ہو جائے۔ اور اہلِ شہر خود بھی جان لیں کہ ان کے شہر کی تاریخ میکسیکو اور میکسیکو کی قومی زندگی میں باعتبار صنعت وحرفت اور فن اور کاریگری کے کیا اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخ اسلام بے شمار مشاہیر کے ناموں سے پُر ہے۔ اور

علمِ اسلام میں بہت سے شہر مثلاً مکہ، مدینہ، بغداد، قرطبہ، غرناطہ ایسے شہر ہیں جو قوم کے ذہن میں محکم ہو جائیں تو احساسِ قومی کو تقویت پہنچے گی۔ علیٰ ہذا تہذیبِ اسلامی اکثر مشہور حکما، اور ادیبوں کی ممنونِ احسان ہے مثلاً جلال الدین رومی، خواجہ معین الدین چشتیؒ، یا شعراء میں حافظ، عمر خیام اور ہمارے اپنے شعراء میں غالب، ذوق، محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ مزید غور کیا جاتے تو ہماری تاریخ اور تہذیب کے کئی اور پہلو ایسے نکلیں گے جن سے ہماری قوم کو آگاہ ہونا چاہئیے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس نقطۂ نظر سے تجویز اور مشورہ کے طور پر ناموں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور اس فہرست کو پاکستان کے تمام صوبوں اور صوبوں کی معرفت میونسپل کمیٹیوں کے پاس بھیجا جائے، اور ان کی توجہ بالوضاحت اس مقصد کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس کی تہ میں ہے۔ اور اس غرض کے لئے ہر جگہ ہوشیار لوگوں کی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ جو شہر کے تمام بازاروں کے ناموں پر غور کریں۔ میری ناقص رائے ہے کہ یہ نیک کام پاکستان کی وزارتِ داخلہ بوجہ احسن انجام دے سکتی ہے اس لئے یہ مشورہ آپ کے گوش گذار کرنے کی جرأت کی۔ علاوہ بریں انگریزی الفاظ مثلاً روڈ، اسٹریٹ وغیرہ کی لعنت سے بھی نجات حاصل کرنی چاہئیے۔ مغلوں کی دلی میں بھی ہر سڑک اور بازار کا نام موجود تھا لیکن روڈ اور اسٹریٹ استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی، بازار، چوک، چوراہا، تراہا، چھتہ، گلی، کوچہ وغیرہ وغیرہ کئی الفاظ اردو کے ایسے ہیں یا وضع کئے جا سکتے ہیں۔ جو روڈ، اسٹریٹ وغیرہ کا کام دیں۔

ہمیشہ آپکی خیریت اور بہبود کا طالب

بخاری

★

★

★

"نقوش"

گجیا - پنواڑن

(ایک ترقی پسندانہ نظم)

مخمور جالندھری

دکاں چلتی ہوتی تم کیوں بڑھاؤ — اٹھو گجیا اسے پھر سے سجاؤ
نہ جاؤ اور تھوڑے دن نہ جاؤ

تمہاری قدر پہچانی نہ جس نے — تم اس کے ہجر میں کیوں رنج اٹھاؤ
اٹھو اک پان پل کھا کر لگاؤ

گئی آندھی بلاتی ہے کسی نے؟ — سنوارو عاقبت، بیتی بھلاؤ
کڑے چھنکاؤ، کھل کر مسکراؤ

اگر دھن راج تھیا لے اڑا ہے — تو پھر بیکار تم کیوں سر کھپاؤ
ستارا ٹانک کر بندی لگاؤ

تمہارا کب ہوا دھن راج چھوڑو — تم اپنی شوخیاں واپس بلاؤ
گھلی مہندی کو تلووں میں رچاؤ

ادائیں سونت کر گدی پہ آؤ — جو بیٹھو، پنڈلیاں قصداً دکھاؤ
جو اٹھو، جان کر پائل بجاؤ

تمہاری زندگی پیہم عمل ہے — تو پھر کیوں ہاتھ محنت سے اٹھاؤ
دکاں کو چھوڑ کر گجیا نہ جاؤ

(۲)

نہ جاؤ اور تھوڑے دن نہ جاؤ — کہاں بیٹھیں گے دکھیارے بچارے
ابھی درکار ہیں غمزے تمہارے

ابھی سے کر رہی ہو بزم سونی — سجاؤ پھول ماتھے کے کنارے
کہ جیسے پو پھٹے اوبے ستارے

ابھی "اقدام" پراتے نہیں ہیں — ابھی پژمردہ ہیں فاقوں کے مارے

ابھی دبکا رہیں ان کو سہارے
ابھی وہ نیم جاں آتے نہیں ہیں — کہ جن کے واسطے روشن منارے
ابھی ہیں بجلیوں کے تیز دھارے
یہاں آتے ہیں ڈرتے اور بچتے — ابھی کچھ لوگ ٹوٹے اور ہارے
خیالوں کو سمجھتے ہیں شرارے
نہ جاؤ اور تھوڑے دن نہ جاؤ — کہ ٹوٹیں خوف کے یہ جال سارے
بڑھیں صدیوں کے غم چھاتی اٹھائے
چلی جاؤ گی تم گجبیا تو سوچو — کہاں بیٹھیں گے دکھیارے بچارے
ابھی درکار ہیں غمزے تمہارے

(۳)

ابھی درکار ہیں غمزے تمہارے — ذرا چھنکا تو چوڑی سوہن آتے
فضا میں عطر کا طوفاں اٹھاتے
لگاؤ قہقہہ بلرام نکلے — لبوں میں پان کی بیڑی دباتے
چھٹی نیکر کو پیچھے سے چھپاتے
وہ تانگے والا نکلا اس کو چھیڑو — کہ میٹھا پان کھانے لوٹ آتے
اشارے مست آنکھوں میں بٹھاتے
کلائی موڑ کر ملینڈ کھولو — کچھ اس نخرے سے چابی کا گس اڑاتے
فضا میں اک پٹاخا گونج جاتے
اُبلتی گیس کی آواز سن کر — کہیں سے اٹھ کے بانکا فضل آتے
ڈلی چونے کی کلے میں دباتے
دکاں پر گھما گھمی پا کے یونس — گلے میں باندھ کے رومال آتے
لبوں سے تھرتی ہنسی لگاتے
نہ جاؤ کیا تمہیں اب دکھ نہ ہوگا — کہ یہ رنگین محفل ٹوٹ جاتے
اجالے پھیل کر بن جائیں سائے

(انتخاب اشعار)

"ساقی"

کچھ صوبۂ سرحد کے بارے میں

پٹھان اور اُردو

عسکری

لب ولہجہ کا مسئلہ بھی پورے پاکستان کے لئے بڑا دلچسپ سوال ہے۔ چونکہ بعض لوگوں کا تو مقصد ہی یہی ہے کہ ایسے ایسے قضیے کھڑے کئے جائیں جن کا وجود ہی نہ ہو، اس لئے دو چار لوگوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ لب ولہجہ کوئی چیز نہیں ہے، ہمارا جیسا جی چاہے گا بولیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یو۔پی میں بھی ایک لب ولہجہ رائج نہیں تھا، ہر ضلع کا الگ تھا البتہ دہلی یا لکھنؤ کا لب ولہجہ معیاری ضرور مانا جاتا تھا۔ ہر زبان کے لئے معیاری قواعد کی طرح معیاری لہجہ لازمی ہے۔ مگر نہ تو اسے جبراً رائج کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ بلکہ لہجوں کے اختلاف سے زندگی میں رچاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً سرحد کے جو لوگ ہند کو زبان بولتے ہیں، ان کا لب ولہجہ ایسا شیریں اور معصومانہ ہے کہ میں تو نہیں چاہتا کہ یہ لب ولہجہ کبھی ضائع ہو۔ اردو زبان اختیار کرنے کے بعد بھی یہ لوگ اپنا لہجہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔ نہ تو معیاری لب ولہجہ ان لوگوں کی اس آزادی میں حائل ہوتا ہے، اور نہ ان کی آزادی سے معیاری لہجہ کا کوئی نقصان ہے۔ جب تک لوگ معیار کو معیاری چیز سمجھتے ہیں، انہیں انحراف کرنے کی اجازت ہے۔

اسی طرح ایک سوال یہ ہے کیا صوبۂ سرحد کی زندگی کا اظہار اُردو میں ہو سکتا ہے یا اس کے لئے ایک نئی اردو بنانی پڑے گی قصہ یہ ہے کہ جو لوگ یو۔پی سے واقف نہیں، انہوں نے یو۔پی کے تکلفات کے قصے سُن کر اپنے طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ یو۔پی والوں

میں نسائیت ہے، لہٰذا اردو زبان میں بھی ہے، اردو زبان اور ادب کی نسائیت کا افسانہ اگر میر اور آتش کی شاعری اور میر امن کی نثر کے باوجود قابل یقین ہے تو پھر یہ مرض لاعلاج ہے۔ خیر، اس وقت میں یو۔پی کے متعلق دو چار باتیں عرض کرتا ہوں۔ یو۔پی کے اور مسلمان باشندوں کو چھوڑیئے۔ وہاں ایسے پٹھانوں کی بیسیوں بستیاں ہیں۔ جو سرحد سے جا کے ادھر بس گئے تھے۔ قائم گنج، ملیح آباد، شاہجہان پور، رام پور بریلی۔ اس کے علاوہ ہر ضلع میں پٹھانوں کے کچھ نہ کچھ گاؤں ضرور ہوتے ہیں۔ یو۔پی کے جس پٹھان سے پوچھئے وہ اپنے آپ کو یوسف زئی سے تو کم بتاتے گا ہی نہیں پھر چونکہ یہ لوگ اپنے اندر ہی شادی بیاہ کرتے رہے، اس لئے ان کی نسل بھی خاصی محفوظ رہی ہے۔ یو۔پی کے پٹھانوں کا چہرہ مُہرہ، بیٹھنے اٹھنے کا انداز، آنکھیں، بہت سی عادتیں، مزاج بالکل وہی ہے جو سرحد کے پٹھانوں کا۔ سخت گیری میں بھی یہ لوگ سرحدیوں سے کچھ ایسے بہت کم نہیں ہیں، اور ساتھ ساتھ تہذیب بھی بلا کے ہیں۔ ملیح آباد میں یہ عام بات ہے کہ دن کو خاں صاحب ڈنڈا چلاتے ہونگے اور رات کو مشاعرے میں غزل پڑھتے ہونگے۔ اور ان کی حرکات و سکنات سے آپ پہچان نہیں سکیں گے کہ یہ وہی صاحب ہیں۔ سرحد کے لوگوں میں بھی مردانگی اور نسائیت کا یہی امتزاج ملتا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ کندھے پر رائفل ہوگی اور کان میں پھول۔ دراصل سرحد کے لوگ مجھے بڑے مانوس معلوم ہوتے جیسے میں برسوں ان کے ساتھ رہ چکا ہوں۔ بات یہی ہے کہ یو۔پی کے پٹھانوں کا اور ان لوگوں کا بڑا قریبی رشتہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان اور ادب کی تخلیق میں پٹھانوں کا بہت بڑا حصہ ہے، اور پٹھان اس زبان میں اپنے جوہر دکھا چکے ہیں۔ اس لئے یہ امید بے جا نہیں ہے کہ جب پٹھان اپنے گھر بیٹھ کے اپنے کوہستانوں کی زندگی کو اردو میں منتقل کریں گے تو ان کی تخلیقی کوششوں کا درجہ اُس پہلے والی تخلیق سے کم نہیں ہوگا۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ یو۔پی کے پٹھان علاقوں میں اُردو جس طرح بولی جاتی تھی اُس طرح اور علاقوں میں نہیں بولی جاتی تھی۔ پٹھانوں کی اُردو کے تیور ہی اور تھے اُن کی زبان اُن کے مزاج کا مظہر تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ادب میں اس اُردو کی کوئی تصویر موجود نہیں ہے۔ مگر پہلے ادب میں مرکزی روایت اور طرزِ احساس اس طرح حاوی تھا کہ ادب کی تخلیق کرتے ہوتے ہر علاقے کا آدمی اسی سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔ اب اس زمانہ میں ہر علاقہ کے لوگوں کو اپنی زندگی سے تخلیقی دلچسپی پیدا ہوئی تو عظیم بیگ اور عصمت چغتائی کے یہاں آگرے اور علی گڑھ کی اردو بولی، اختر اورینوی کے بعض افسانوں میں پٹنہ کی اُردو بولی، انتظار حسین کی افسانہ نما چیزوں میں میرٹھ اور بلند شہر کی اُردو بولی۔ ہوسکتا ہے کل روہیل کھنڈ سے بھی کوئی ایسا لکھنے والا پیدا ہو جاتے۔ غرض یہ ہے کہ اُردو کی ایک ایسی قسم بھی موجود ہے جو پٹھانوں کے مزاج کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان کا ہر علاقہ اردو میں نئے الفاظ اور نئے عناصر کا اضافہ کریگا۔ مگر ہر علاقہ کے لئے ایک نئی اُردو گھڑنے کا خیال بالکل مہمل ہے۔ جسے دنیا کی لسانی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں، اور دراصل تخریبی کوششوں کے سلسلہ میں ایجاد کیا گیا ہے۔ بڑی زبان میں بہت سے مزاجوں کے اظہار کی گنجائش ہوتی ہے۔ اور اردو ادب نہ سہی تو اردو زبان اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنے علاقہ کا صحیح اظہار چاہتا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ دل میں مرکزی روایت کا بھی احترام ہو اور اپنے علاقے کی زندگی کا بھی اور دونوں چیزوں سے تخلیقی دلچسپی ہو۔ آئرلینڈ کے لکھنے والوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انگریزی زبان کی مرکزی روایت کے اتنے پابند نہ تو ویلیز والے ہیں نہ اسکاٹ لینڈ والے مگر آئرلینڈ کا جیسا مکمل

اظہار انگریزی زبان میں سومرسٹ مام، برنرڈشا اور جوئس نے کیا ہے۔ ویسا یہ دوسرے لوگ اپنے اپنے علاقوں کا نہیں کر سکے۔

اگر میں یہ کہوں کہ سرحد کے متعلق بڑے اچھے افسانے لکھے جا سکتے ہیں تو یہ ایسی ہی فضول بات ہوگی جیسے یہ کہنا کہ پانی پیا جا سکتا ہے۔ مگر سرحد کے عام لوگوں کو اپنی زندگی سے اتنی دلچسپی پیدا ہو چکی ہے کہ اب اردو میں سرحدی ادب پیدا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ سرحد کے بنجر پہاڑوں سے بھی نئے نئے احساسات اور کیفیتیں پیدا ہونگی اور آزاد پاکستان میں سرحد سے جو ادب تخلیق ہو کر سامنے آئے گا اس میں ایک نیا احساس ملے گا۔ اور تو اور سرحد کے پہاڑ دیکھ کر افسانوں اور نظموں کی نئی نئی اوضاع اور ہیئتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ مثلاً۔۔۔ مگر میں اپنے "کاروباری راز" کیوں بتاؤں۔ کم سے کم میں تو سرحد کے لوگوں سے ایسا متاثر ہوا ہوں کہ اگر تین مہینے بھی سرحد میں رہ جاؤں تو سرحد کے متعلق افسانے لکھنے لگوں۔ (اقتباس)

ان کی محبوب منزل ہے۔ ع

موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

وہ ہستی کو ہیچ سمجھتے ہیں اور اس کو سرمایۂ استحقار سے ٹھکراتے ہیں۔ فانی کا مطالعہ یاس انگیز ہے۔ ان کی شاعری میں موت کی محبت ایک مذہب کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر میر کا مسلک اور مشرب اس قسم کی غم پسندی کو روا نہیں رکھتا۔ ان کا غم ایک ایسا غم ہے جس میں دنیا کے اکثر و بیشتر انسان مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا غم قدرتی غم ہے جس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ عقل انسانی ان کے غم کو "مریضانہ غم" نہیں کہہ سکتی وہ ہماری ہمدردی کے مستحق ہیں۔

میر کا تصور عشق بھی ان کے نظریۂ غم کے تابع ہے، ان کی سیرت اور طبیعت کی خصوصیات ان کے عشق میں بھی موجود ہیں، ان کے عشق میں درد، سوز و گداز، اور جوش موجود ہے، ان کے اشعار میں حرمان بھی ہے مگر اس محرومی میں بھی وہ ہنگامہ موجود ہے جس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے۔

"اردو"

میر، غالب اور فانی کے غم کا فرق

(ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب)

میر کے غم میں خلوص اور راستی ہے۔ ان کا غم ان کی زندگی کے مطابق ہے، ان کی داستاں رسمی معلوم نہیں ہوتی، اس میں صداقت ہے، اس کے علاوہ انہوں نے غم کو غم ہی خیال کیا اس کو عیش کا درجہ نہیں دیا۔ میر کے برعکس غالب کے غم میں حکیمانہ شان نظر آتی ہے۔ وہ غم کو زندگی کی بنیادی حقیقت مانتے ہیں۔ ان کا غم ایک قوی دل اور صحت مند آدمی کا غم ہے، وہ اپنی خوش طبعی اور زندہ دلی کو قائم رکھتے ہیں (میر خوش طبعی کو قائم نہیں رکھ سکے مگر ان کی ذہنی اور خیالی دنیا میں چہل پہل اور زندگی ہے۔ فانی غم کو عیش خیال کرتے ہیں، موت

"ادبی دنیا"

ہماری جنسی شاعری

(حزب اللہ۔ ایم۔ اے۔ پی۔ سی۔ ایس)

شاعری سب رس ہے —— شاعری مقدس دیوانگی ہے۔ —— شاعری سفلہ پن ہے —— شاعری یہ ہے۔ شاعری وہ ہے۔

یوں تو شاعری ایک نہایت وسیع موضوع ہے اور اس کا دائرۂ مضامین وسیع تر، مگر اس وقت ہمیں اس امر سے بحث کرنی مقصود ہے کہ شاعروں نے کس حد تک ہمارے جنسی نظریئے بدلے، کیسے ان کی نوک پلک سنواری، کس کس انداز سے ان میں رنگ بھرے۔ رفتارِ شاعری میں ان نظریات نے کیا پہلو بدلے۔ قدیم جنسی شاعری سے جدید

تک کی منزلیں کس انداز میں طے ہوئیں وقت، ماحول اور سماج نے انہیں کیسے توڑا، مروڑا۔ اور یہ کہ ہماری جنسی شاعری ہمارے اخلاقی اقدار کو ضرر پہنچاتے بغیر کیسے جنسیات سے وابستہ رہ سکتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر، آیا اخلاق و جنسیات کا آپس میں میل ممکن ہے[1]؟

شاعروں نے ہمارے اکثر تصورات کو یکسر بدل دیا ہے۔ انہوں نے ہمارے جذبات پر نیا رنگ، روغن پھیرا۔ اور زندگی کے مختلف نظریات کو ہم سے متعارف کرکے اپنی نیری جمائی۔ جب انہوں نے شعر کہے۔ تو ہزاروں کے کلیجے اچھلے۔ مدھر، میٹھے، گمبھیر الفاظ جسم اور روح کو ایک سُر میں رضامند کر گئے۔ جب رودکی نے یاد یار مہرباں دلائی تو بادشاہ سلامت نے ننگے پاؤں گھوڑے پر لپک کر کوچ کا حکم دے دیا۔ حالی کا مسدس، اقبال کا شکوہ، حفیظ کا شاہنامۂ اسلام گھر گھر پڑھے گئے اور ان سب نے اپنے رنگ جمائے۔ یہ سب کچھ متناسب، متوازن اور ایقاعی الفاظ کا کرشمہ تھا۔

اسی طرح شاعر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ہمارے جنسی نظریات کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ ہر تمدن اور ہر دور کی جنسی شاعری نئے تقاضوں کے زیر اثر ڈھلتی رہتی ہے۔ فرق محض صورت کا ہے۔ بنیادی شے ایک ہی رہتی ہے۔ میر اثر کا خواب و خیال، میر حسن کی سحر البیان، گلزار نسیم، مثنویاتِ مومن خاں کی اپنی انفرادی حیثیت ہے۔ شاعر نے بات میں بات نکالی، جنسیات کی اپنے نقطۂ نظر سے تراش خراش کی اور لوگوں کو متاثر کیا۔ ایسی شاعری نے مختلف چولے بدلے ہیں اور شاعروں نے اپنے خیالات اور ردِ عمل کے مطابق مختلف انداز سے اس کی مشاطہ گری کی۔ نئے رنگ تھے۔ نئے ڈھنگ ——— اور پھر

---

[1] یہاں فحش اور جنسی شاعری کا فرق دکھانا غیر مناسب نہ ہوگا۔ اگرچہ آج کی علمی چکاچوند میں فحاشی ایک مبہم اور بے معنی سا لفظ رہ گیا ہے اور اس ضمن میں مذہب ہو یا اخلاق، جب ان کے استعمال کردہ علامات و اشارات کی تحلیل کی جاتی تو اُن کا پول کھل جاتا ہے۔ اور ایسی باتیں پردوں کی اوٹ میں دکھائی دیتی ہیں جو کسی طور بھی ان کی قائم کردہ فحاشی اقدار سے الگ نہیں ہوتیں۔ تاہم جہاں تک فن کا تعلق ہے۔ سب سماجی اقدار کو سامنے رکھ کر فحش شاعری اور صحیح جنسی شاعری میں ایک فرق ضرور موجود ہے۔ فحاشیات محض اخراجی (EXCRETORY) اعضاء اور اُن کے مختلف افعال کے لئے وقف ہے، اس میں کوئی رفعت و بلندی نہیں ہوتی۔ یہ محض اخلاقی مراجعت کی ایک صورت ہے۔ جو کسی صورت ارتقاء میں مدد نہیں دے سکتی۔ واقعی سماج نے جنس پر کئی ایک غیر دانشمندانہ پابندیاں بھی لگائی ہیں۔ مگر اس صورت میں بغاوت کا نعرہ "اخلاقی اقدار کو سرے سے رہنے نہ دو" نہیں بلکہ "اقدار میں نئے تقاضوں کے مطابق نیا رنگ بھرو" ہونا چاہئے۔ اخراجی افعال و اعضاء کو بلا واسطہ شاعری میں نبھا کر کوئی تعمیری مقصد نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ چرکین کی شاعری بھی فنی لحاظ سے ہر اصول اور قاعدے پر پوری اترتی ہے۔ وہ جذباتی بھی ہے اور ہیجانی بھی، زبان کے لحاظ سے بھی وہ ستھری شاعری ہے مگر اس میں وہ صحیح جنسیت کم بلکہ قطعاً مفقود ہے جو ہمیں ودیاپتی، چنڈی داس، میگھ دوت کے شاعر کالیداس، میراثر، میرامن وغیرہ کی شاعری میں ملتی ہے۔ ہمیں چرکین کی نجاست دوستی (COPROLAGNIA) سے کوئی ایسا انبساط حاصل نہیں ہوتا جس کے ہم فن میں متمنی ہوتے ہیں اور یہی حال مثلاً میراجی کی لب جوئبار کا ہے۔ جو پیشاب دوستی (UROLAGNIA) کی کسی حد تک بہترین مثال ہے (اگرچہ موضوع مستعار لیا گیا ہے) اور جو علمی نقطۂ نظر سے ایک خاصی دلچسپ نظم ہے۔

ان کے نظریات زندگیوں پر چھاتے چلے گئے۔ یہ کس نے نئی پود کے کانوں میں قدیم بات پھونکی ——

بال ہیں بکھرے بند ہیں ٹوٹے کان میں ٹیڑھا بالا ہے
جرأت ہم پہچان گئے کچھ دال میں کالا کالا ہے

اور ——

تازگی جی کی اور ترے تن کی
واہ کیا بات گورے بدن کی
پھر جب الفاظ کی اوٹ میں سرسراہٹ ہوئی تو
بھرے جوبن پہ اتراتی جھمک انگیا کی دکھلاتی
کمر لہنگے پہ بل کھاتی لٹک گھونگھٹ کی بھاری ہے

. . . . . .

. . . . . .

اور ——

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا
کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

اور . . . . .

پسِ خواب پہلے تے عاشق سے اُٹھنا
ڈھلے سادہ جوڑے کی وہ ملگجاہٹ

کچھ تو یاد بھی رہا . . . .

اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
جس کے ہونٹوں سے لیا تھا رات بھر
میں نے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام

نئی اور پرانی شاعری کی ان چند مثالوں میں سے ہر ایک کا انداز نظر علیحدہ[1] ہے۔ اس لئے کہ ہر نسل اور کلچر کی اپنی جنسی روایات ہوتی ہیں جنہیں شاعر اپنی ذات کے شانہ بشانہ لاکر نبھاتا ہے۔ کوئی لبے پر جان دیتا ہے کوئی مرمریں گردن پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ وِدیاپتی، چنڈی داس اور دیگر قدیم ہندوستانی ادب کے شاعروں نے انگیا کے اُدھر گورے بدن کی جھلک، چنری کی لپٹ اور گلابی جلد کے اُدھر رنگ رس کی ندیوں کے گیت الاپے، جب فارسی زبان نے دکھنی کا جامہ پہنا تو اس وقت تصوف کا دَور دورہ تھا۔ اور تصوف کے رنگ میں جنسی خیالات نے راہ پائی۔ پھر امرد پرستی کا رنگ جما، عورت کہیں دبک کے جا بیٹھی۔ لکھنؤ اسکول نے پھر عورت میں روح پھونکی۔ یوں کہئے کہ جہاں تک عورت کا تعلق تھا۔ دکن نے اس کے "قتل" کی تعلیم دی۔ اکبر آباد میں اس کا گلا گھونٹا گیا۔ دلی میں اس کی میت دفنائی گئی۔ لکھنؤ میدان حشر بنا اور عورت پھر زندہ ہو گئی مگر یہ عورت رنڈی تھی۔ یہ خصوصیت محض ۱۹۳۵ء کے بعد کی عورت میں پائی جاتی ہے۔ کہ وہ ہر رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ رنڈی تیرلیف منہ پھٹ، عیار ——غرض ہر دَور کے شاعروں کے اپنے اپنے رجحانات تھے اپنی اپنی جنسی دلچسپیاں تھیں اور علیحدہ علیحدہ جنسی علامات[2] یہی جنسی رجحانات قائم کردہ اخلاقی اقدار میں جکڑے ہوتے تھے۔ اخلاقی اقدار سے خواہ انسان کس قدر بددل کیوں نہ ہو وہ اپنی ٹانگ اڑاتے ہی رکھتی ہیں۔

"اردو ادب"

مختار صدیقی اختر شیرانی کے حضور میں

اس زمانے کے نوجوانوں میں اختر کے ایک محبوب پرستار،

---

[1] یہ انتخاب محض سرسری ہے، ہو سکتا ہے کہ اس سے بہتر یا مختلف مثالیں موجود ہوں [2] یہ جنسی ارتقا پر ایک اجمالی نظر ہے تفصیلی بحث (باقی صفحہ ۶۶ پر) مدیر

(اور شاید شاگرد بھی) حضرت تابش صدیقی تھے۔ آج ان کی بے۔ یا دوستی میرے لئے سرمایۂ فخر ہے۔ ان دنوں وہ ہمارے لئے دوست اور بزرگ دہلی گڑھ کی اصطلاح میں "سینئر [illegible]ں" تھے۔ اور وہی مجھے اس شخصیت کے حضور میں لے گئے۔ جسے ملک کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے عقیدت مند خیالوں نے اپنا کعبۂ مقصود بنا رکھا تھا۔ اور جس کی محبتوں کے افسانے سرگوشیوں میں ڈھلتے تھے۔ میں ملاقاتوں سے آج تک بہت گھبراتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵) بعد میں کی جائیگی۔ ۳ے متعلقات پرستی نے جنسی تصور کی داغ بیل ڈالنے میں کافی ہاتھ بٹایا ہے۔ متعلقات پرستی (FETICHISM) اشاریت (SYMBOLISM) کی وہ صورت ہے جب کہ عاشق محبوب کے کسی عضو یا متعلقہ شے پر فریفتہ ہو کر اُسے موضوع بنا لیتا ہے۔ کرافٹ ایبنگ کا قول ہے: "متعلقات (FETICHES) کا مطلب وہ اشیاء، اشیاء کے حصّے یا ان کی وہ خصوصیات ہیں۔ جو کسی انسان یا اُس انسان کے تصور سے وابستہ ہو کر ہم میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اگرچہ ان اشیاء میں بجائے خود (یعنی اُس انسان سے الگ ہو کر) وہ کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی"۔ اسی طرح جنسی اشیاء پرستی اس کیفیت کا نام ہے جو کسی کے اعضاء یا اس سے وابستہ اشیاء سے ظہور میں آتی ہے اور ہم میں جنسی خواہش بیدار کرتی ہے۔

شاعری میں بھی ہر شاعر نے اپنا ایک فیٹش (FETICH) تلاش کیا ہے۔ یا مختلف اشیاء کو اس مفہوم میں کھپایا ہے۔ کسی نے لباس پر جان دی، کسی نے ترشے ہوتے ہونٹوں پر، کسی نے سینے کی بے پناہ اٹھان پر۔ اسی متعلقات پرستی نے محبوب کے بہت سے عیبوں کو آدرشی بنا لیا۔ تِل بذات خود خوبصورت شے نہیں مگر محبوب سے وابستہ ہو کر اس پر سے سمرقند و بخارا صدقے۔ ہمارے اپنے شاعروں میں متعلقات پرستی کی مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ میر تقی میر کی متعلقات پرستی سایہ پرستی تک محدود ہے اُس کا عشق عبارت ہے "نہ ملنے" سے۔ "کھونے" کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ ایسا عاشق ہے جو سامنے کے مکان میں دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہوتے محبوب کا سایہ دیکھ دیکھ کر اُسے پوجتا ہو۔ اور کبھی کوشش نہیں کرتا کہ اپنے محبوب کو بھی دیکھ کر اسے ہاتھ لگاتے۔

بہرکیف اس متعلقات پرستی کا شاعری میں کافی دخل ہے، ہر شاعر نے اس سے استفادہ کر کے روایاتِ شعری اور جنسیت کو وسیع تر کیا ہے۔ غالب کبھی بوسوں کیلئے ترستا ہے کیونکہ اسے ہونٹ غنچۂ ناشگفتہ دکھائی دیتے۔ کبھی محبوب کے پاؤں کا کبھی انہیں دھویا بھی اور دابا بھی۔ کبھی زلفوں میں جا اٹکا اور کبھی سبزۂ خط سے دب چلا۔ میر کبھی نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی دیکھ کر بے پئے مست ہو گیا اور کبھی ساقی کی چشم "دیکھ صحبتِ شراب سے بھی آگے سفر کر گیا۔ اسی طرح نظیر کبھی دوپٹہ پر مرتا ہے، کبھی گُھنے پر کبھی گورے تن پر، — اور پھر جدید شاعروں کی طرف آئیے، جن کے فیٹش نئے تقاضوں میں ڈھلے ہوتے ہیں۔ میراجی کا مصنوعی اور خلافِ معمول عشق، راشد کا انتقامی عشق، فیض کا پھیکا پشیمان سا عشق، ساحر کا مارکسی عشق — ہر کسی نے اپنی بساط کے مطابق مختلف متعلقات پرستی سے کام لیا ہے۔ ان کی اپنی انفرادی حیثیت موجود ہے اور ہم نے ہر منزل پر انہیں اپنی روایات میں شامل کر لیا ہے۔ فرہاد کا تیشہ اپنے وقت میں خوب مجنونانہ فیٹش تھا اور یہی حال لیلےٰ کے ناقے کا تھا۔ لیکن اب ان متعلقات کے ڈھنگ اور ہو گئے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ نئے نئے متعلقات تلاش کرنا از حد ضروری ہے وگرنہ لطف جاتا رہتا ہے۔ تارڈ TARDE لکھتا ہے — "محبت میں پائیداری نام ہے محبوب کے سارے جسم کا درجہ بدرجہ سفر... کوئی اپنے محبوب سے متواتر دو دن ایک ہی صورت میں محبت نہیں کر سکتا۔" اور شاعر اگر اپنی شاعری میں تازگی پیدا کرنا چاہتا ہے تو اُسے بھی

ہوں۔اُن دنوں کی حساس خامکاری نے اس ملاقات، بلکہ باریابی کا احساس ہی دوبھر کر دیا۔ اور جب پیش کیا گیا، تو سخت گرمیوں میں بھی ٹھنڈے پسینے آتے لیکن اختر حسب عادت بڑی مہربانی سے پیش آتے، تابش سے دو ایک باتیں خصوصیت سے کیں اور بس —— ایک نوجوان جو پہلے سے موجود تھا اس سے سلسلۂ کلام پھر شروع کر دیا اور کہا —— تم بہت شریر ہو، کھاؤ چپت —— اور جب یہ مرحلہ طے ہوا تو اس نوجوان نے (ان دنوں کی مشہور نظم) "گذری ہوئی راتیں" بڑی خوبصورت آواز میں کچھ گاتے ہوئے کچھ پڑھتے ہوئے سنانی شروع کر دی ؎

نہ بھولے گا ترا راتوں کو شرماتے ہوئے آنا
رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا
رُخِ روشن کے جلووں سے سحر کا نور بن بن کر
اندھیری رات کے پردوں کو سرکاتے ہوئے آنا
روپہلی چاندنی میں اپنی مستانہ خرامی سے
بہار و خواب کے سائے سے برساتے ہوئے آنا
ترے ابریشمی ملبوس کا مرمر کے جھونکوں سے
سحاب رنگ و بو کی طرح لہراتے ہوئے آنا

یہاں تک پہنچتے پہنچتے اختر پلنگ کے نیچے سے لال رنگ کی بوتل نکال چکے تھے اور تابش سے کہہ چکے تھے "تابش بیٹے! اُمید ہے تمہارے دوست بُرا نہ مانیں گے" یکایک انہوں نے ایک آہ کی، مصرع دہرایا "سحاب رنگ و بو کی طرح لہراتے ہوئے آنا" اور ان کی سُرخ آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔

پھر نہ جانے کتنی مدت بعد یہی رنگ مگر اس سے کہیں بدتر ماحول میں دیکھا۔ ان کی حالت پہلے سے بہت گر چکی تھی۔ ان کا آخری سہارا "رومان" بند ہو گیا تھا۔ گھر سے وہ بے تعلق ہو چکے تھے محبت کی ناکامی نے اُن کے گرد جو ہالہ بنا رکھا تھا وہ خُم بخُم لنڈھائی جانے والی شراب نے ملیا میٹ کر دیا تھا۔ وہ ایک بُجھتے ہوئے شاعر اور نشے کے غلام انسان نظر آنے لگے تھے اس وقت پی رہے تھے۔ اس لئے بہت خوش تھے۔ یکایک بوتل رکھ دی اور کہنے لگے کوئی مجھے سنا سکتا ہے "پھر وہی نکہتِ مستانہ کدھر سے آئی" اور ایک صاحب نے سنانا شروع کر دیا۔

پھر وہی نکہتِ مستانہ کدھر سے آئی
محرم گیسوئے جانانہ کدھر سے آئی
ایک دن جس سے مہکتا تھا حریم سلمیٰ
وہی خوشبو دلِ دیوانہ کدھر سے آئی

حاضرین جُھوم رہے تھے، اس نظم کے حسین سوز نے دلوں میں عجیب آنچیں پیدا کر دی تھیں۔ اور ان آنچوں کا خالق رو رہا تھا۔ ماتھا کوٹ کوٹ کر کہتا تھا "ہائے ہائے مرحوم اختر" اور یہ سچ بھی ہے وہ ان حالوں پہنچتے پہنچتے ذہنی اور فنی لحاظ سے پہلے تو نیم جاں رہے، پھر واقعی مرحوم ہو گئے۔

(اقتباس)

"نفسیات"

تعارف نفسی

(احمد نواز خاں)

(ا) ۱۔ اگر آپ باضمیر ہیں تو واقعی آپ وہی کچھ کریں گے۔ جس کی توقع آپ سے کی جاتی ہے۔ اور اپنے متعلق آپ ڈھنڈورا نہ پیٹیں گے۔ بلکہ خاموشی سے کام کئے جائیں گے۔

آپ کو اپنے اوپر پورا بھروسا ہوگا اور آپ ہر کام میں کامیاب رہیں گے۔

(ب) اگر آپ بے ضمیر ہیں تو آپ کو کسی غیر دشمن کا خطرہ نہیں کیونکہ آپ خود ہی آخرکار اپنے پاؤں پہ کلہاڑا ماریں گے۔ یاد رکھئے ہمیشہ دیانت دار اور راست باز آدمی ہی کامیاب ہوتا ہے۔

(۲) و۔ اگر آپ کو اپنی ذمہ داریوں کا طبعاً احساس ہے۔ تو آپ یقینی طور پر با ضمیر ہیں۔

ب۔ اگر آپ حد سے زیادہ سختی سے با اصول ہیں تو یہ امر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو اپنے اوپر بھروسا نہیں ہے اور آپ کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے کہ آپ کسی وقت بد دیانتی نہ کر بیٹھیں دیانتداری مبالغہ کی حد تک نہ بڑھائیے۔ کیونکہ یہ حالت اکثر بد دیانتی کو اپنے دامن میں چھپائے ہوتے ہوتی ہے۔

(۳) ۔ اگر آپ شکوک اور اصول کی وجہ سے اپنے کاموں میں یکایک رک جاتے ہیں۔ تو آپ کے دماغ کے اندر بددیانتی چھپی ہوئی ہے جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔ لہذا ٹھنڈے دل سے سوچئے اور اس خیال کا سراغ لگائیے جو آپ کو روک رہا ہے اور تکلیف پیدا کر رہا ہے۔ آپ اس طرح سے اس خیال پر قابو پالیں گے اور وہ آپ کے راستے میں پھر حائل نہ ہو سکے گا اور آپ اس چھپے ہوتے دشمن سے خلاصی پاکر زیادہ اہلیت حاصل کرلیں گے۔

(۴) اگر آپ کے دماغ میں نظام۔ آرڈر۔ ترتیب تخصیص صحت وغیرہ کا حد سے زیادہ خبط بھرا ہوا ہے تو آپ اپنی اُپج قابلیت اور تسلی وسکون کو ان مبالغہ آمیز خیالات پر قربان کر رہے ہیں اکثر نظام اور حد سے زیادہ ستھرے پن اور ترتیب کے شیدائی وہ ہوتے ہیں جن کے اندر بچپن میں میل کچیل۔ غلاظت اور بے قاعدگی کے برخلاف خوف ذہن نشین ہو چکا ہوتا ہے۔ اور یہ خوف اکثر و بیشتر غلط ہوا کرتا ہے۔ نظام اور ترتیب کے غلام شاذ ہی مکمل قابلیت اور تکمیل حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ عادتاً اصلی کام کی طرف اتنی توجہ نہیں کرتے جتنی کہ ظاہری ترتیب اور باقاعدگی کی طرف اور پھر ان میں نرمی اور ملائمت باقی نہیں رہتی جو کامیابی کے لئے ضروری صفت ہے

(۵) اگر آپ ہر وقت حد سے زیادہ اور شدت سے راستی اور انصاف کے طلبگار رہتے رہتے ہیں۔ تو آپ اپنے اندرونی جذبہ کی مخالفت میں لگے ہوئے ہیں جس کا تقاضا آپ کو بے انصافی اور جھوٹ کی طرف راغب کرنے کے درپے رہتا ہے۔ جب آپ اپنے کی اس شدید حالت سے اپنے آپ کو خلاصی دے لیں گے۔ تو آپ انصاف اور راستی کی طلب میں خبط اور جنون کی حالت چھوڑ دیں گے اور آپ زیادہ آزادی سے اور زیادہ اہلیت سے اپنے کاموں میں منہمک ہو سکیں گے۔ (اقتباس)

تبرکاتِ مخزن
کچکول

دل ڈھونڈتا ہے لطف وہی پہلے پیار کا مجھ کو اسی نگہ سے پھر اک بار دیکھنا
یاد کوثر میں ہوا شیخ غریقِ رحمت مے کے پینے کا تو کمبخت میں مقدور نہ تھا
بس شام ہوئی جائیے اے حضرتِ ناصح اب رات ہے اور ہم ہیں اور افسانہ ہے اسکا
مائل کو غرض کیا ہے کہ جنت کی کرے فکر کوثر سے کہیں بڑھکے تو میخانہ ہے اُس کا
مائل کو ملا کفر میں وہ رتبہ عالی کعبہ جسے کہتے ہیں صنم خانہ ہے اُس کا

(لالہ سریرام. ایم. اے) (مائل دہلوی)

جس غنچہ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا چمن ہوا
نازک بدن کو توڑ کے نکلے ہیں رنگ سنے منہ بند کیا ہوا میں سراپا دہن ہوا

(اقبال) (امیر مینائی مرحوم)

ایڈیٹر کے نام

"خشکی"

مخزن میں باقاعدگی سے پڑھتا ہوں جس "خشکی" کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ وہ مجھے اس میں نظر نہیں آتی۔ البتہ کاغذ اور طباعت کے متعلق شکایت مجھے ہمیشہ سے ہے، لیکن غالباً اس کا حل ابھی ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے آپ سے جن لوگوں نے خشکی کی شکایت کی ہے۔ وہ "ہوس کار رنگینی"، اور "ترقی پسند" نظموں کی کمی کے شاکی ہونگے۔ آپ سے اگر ممکن ہو تو ایسے ادب کو مخزن میں ضرور جگہ دیجئے جو آرٹ اور فحاشی کے درمیان باریک سی حدِ فاصل کا خیال رکھتا ہؤا آرٹ کی جانب رہے لیکن سراسر ہوس کاری کی اشاعت پر میں آپ کو آمادہ نہیں کرنا چاہتا۔ اور پھر آپ یہ کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ کیا میں آپ کو جانتا نہیں؟

تازہ مخزن میں حمید احمد خاں صاحب کا مضمون بہت پسند آیا۔ سبحان اللہ! کیا زبان ہے۔ تائید و اختلاف کی اتنی خوبصورت شکل آج تک کسی دیباچہ میں دیکھنے میں نہیں آتی۔ میں تو جھوم جھوم گیا۔ افسانوں کے دیباچوں میں یہ مضمون سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری طرف سے حمید احمد خاں صاحب کو مبارکباد پہنچا دیجئے۔

محمد باقر

"جوئے شیر"

ادبی انتشار و پریشانی کے اس افسوسناک دور میں جبکہ چاروں طرف گروہ بندی کا دور دورہ ہے، "تہذیب و ادب کی اُسی پرانی ڈگر پر چلنا، جو ہمارے لئے باعثِ افتخار تھی ایک مستقل مزاج انسان کا کام ہے۔

مقامِ تاسف ہے کہ آج ہر رسالے کا ایڈیٹر معیارِ کلام نہیں، بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ فلاں شاعر یا ادیب کے ماتھے پر کس پارٹی کا لیبل ہے۔ ایسی صورت میں ایسی روش نکالنا کہ اعتراض کی گنجائش نہ رہے "جوئے شیر" لانے سے کم نہ تھا۔

کیف بنارسی

"تراجم"

اب کے جو مختلف زبانوں سے تراجم مخزن نے پیش کئے ہیں۔ میں نے انہیں دل سے چاہا ہے۔ میرا اپنا بھی خیال ہے کہ اردو زبان کی ترقی کے لئے ایسے تراجم ناگزیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس مہم میں آپ کو کامیاب کرے۔ اور آپکے لکھنے والوں کو ٹھوس کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (نکہت رخشانی)

"۔۔۔ ز داماں گلہ دارد"

"مرزا عبدالقادر بیدل پر اپنے عہد کے اثرات" کا مضمون بے حد قابلِ قدر مضمون ہے امید ہے کہ عبدالغنی صاحب بیدل کی شاعرانہ خوبیوں پر بھی قلم اٹھائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ انہیں مجبور کریں کہ وہ ما بعد الطبیعیات کے متعلق بھی حضرت بیدل کے خیالات کو لفظی صورت دیں۔ یہ ان کا بہت اہم کارنامہ ہوگا۔ کاش آپ مخزن میں سے افسانے کے حصے کو نکال کر اسے خالص علمی رسالہ بنا سکیں۔ جو مرحوم "معارف" علی گڑھ اور "اردو" کا جانشین ہو۔ ("اردو" بفضلِ خدا جاری ہے اور اپنا جانشین خود ہے "مخزن") "مخزن المخازن" کا حصہ نہایت بیش قیمت اور بے اندازہ دلچسپ ہے۔ اسے ضرور جاری رکھا جائے۔ ڈاکٹر محمد باقر صاحب

نے "میرے استاد" کے عنوان سے جو سلسلہ جاری کیا تھا وہ بے حد مفید تھا۔ اس کو ضرور دوبارہ جاری کیا جاتے۔ ہامون الرشید کا فیصلہ نہایت اعلیٰ درجہ کا مضمون ہے۔ اس قسم کے تاریخی مضامین کا بھی اگر مستقل سلسلہ جاری ہو سکے تو کیا اچھا ہو

اگر کوئی صاحب مسئلہ "وحدت الوجود" جو ہندو ویدانت سے لیا گیا، اور وحدت شہود پر قلم اٹھائیں۔ اور بتائیں کہ وحدت الوجود سے کس حد تک ہمیں نقصان پہنچا تو یہ ایک شاندار خدمت ہو گی۔

حضرت قبلہ شیخ عبدالقادر صاحب" اگر براہ کرم "مخزن کا پہلا صفحہ اپنے ذمے لے لیں۔ تو یہ ہماری معلومات میں کتنے اضافے کا باعث ہو۔ خدا انہیں عمرِ دراز بخشے۔ وُہ عمر کے لحاظ سے گو بزرگ ہیں لیکن ان کی مصروفیتوں کے پیش نظر تو ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ صرف جواں ہمت بلکہ جواں سال بھی ہیں۔ خدا اُن کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔ انہوں نے مخزن کے وسیلے سے جو خدمت اردو علم و ادب کی کی ہے۔ وُہ انہیں کی ذات گرامی کا حصہ ہے ؎

دامانِ نگہ تنگ وگلِ حسن تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد (بشیر احمد ملک)

"دعا"

انور رومان کا مقالہ "پاکستانی ادب" اور عسکری کا مضمون "جیمز جوئس" قابلِ قدر ہیں۔ آج کل فن ادب سے عام طور پر بیگانگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لئے شدید ضرورت ہے اس قسم کے معیاری مضامین کی جو اہل شعور کے لئے رہبری کا کام کر سکیں۔ میں دست بدعا ہوں کہ رب العزت آپ کے ارادوں میں برکت عطا فرماتے

ظفر اقبال حشر

"داستان جرائم"

اگرچہ عمر انگریزی ہی لکھنے پڑھتے کٹ گئی پھر بھی مجھے اُردو سے ذوق و شوق باقی ہے اور اکثر اردو رسائل دیکھتا رہتا ہوں۔ مخزن کی دو ایک گذشتہ اشاعتوں میں ایک سلسلۂ مضامین" داستانِ جرائم" کے عنوان سے میری نظر سے گزرا تھا۔ معلوم نہیں کیوں آپ نے اُسے بند کر دیا۔ (ایم۔ ایم جعفری)

"مخزن" یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ زیدی صاحب مصروف تھے۔ انہوں نے پھر لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

"جلال الدین اکبر"

اکبر صاحب کا نیا رنگ ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ رومان کی بہ نسبت اب روحانی پاکیزگی کی جھلک زیادہ ہے۔ (اثر صہبائی)

"نشأۃ الثانیہ"

مخزن کا دورِ جدید صحیح معنوں میں اردو ادب کی نشأۃ الثانیہ ہے۔ میں شروع سے لے کر ہر شمارہ کا بالاستیعاب مطالعہ کر رہا ہوں۔ مخزن صوری و معنوی محاسن کے اعتبار سے "عروسِ جمیل و لباسِ حریر" کے مصداق ہے۔

شاکر عروجی مدیر "پرچم"

"مخزن کے بعد مخزن"

یہ کس کو توقع تھی کہ مخزن کے بعد کوئی دوسرا جریدہ یا خود مخزن اس خلاء کو پورا کر سکے گا۔

مخزن کا دورِ جدید قدیم روایات کا بھی علم بردار ہے سب سے زیادہ خوشی جو ہوئی وہ یہ دیکھ کر ہوئی۔ کہ اس میں گروہ بندی قطعی نہیں۔ ورنہ آج کل تو تقریباً ہر جریدہ گروہ بندی کے مرض میں مبتلا ہے۔ (تصور کرتپوری)

"کشش"

یقیناً جانبین کی یہ کشش کا نتیجہ ہے کہ مخزن جیسے مستند جریدے کو آپ جیسا بہترین مدیر میسر آ گیا ہے لہٰذا آپ اور مخزن یکجا ہوتے ہیں۔ کوشش کر رہا ہوں کہ ملک کے اس مایۂ ناز میگزین میں بھی شرکت کر سکوں (احسن مارہروی)

ذکرِ حالی اور دُوسری کتابیں

ذکرِ حالی نام کو یہ کتاب پورے سو صفحے کی بھی نہیں لیکن اس کے مؤلف جنابِ صادق قریشی نے اپنے موضوع پر خاصی جامعیت سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ابتدا حالی کی زندگی کے مختصر حالات کے بیان سے ہوتی ہے۔ جسے ہم یقیناً محض سرسری جائزہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں ایسی معلومات بھی موجود ہیں جو زیادہ عام نہیں۔ اس کے بعد اوّل سے آخر تک حالی کی تمام تصانیف کی ایک فہرست دی گئی ہے جس میں موضوع تصانیف کے متعلق بھی مختصر اشارات شامل ہیں۔ اس فہرست میں تین غیر مطبوعہ کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں یعنی اصول فارسی (سنہ ۱۸۶۸ء) شواہد الالہام (سنہ ۱۸۷۰ء) اور سوانح استاد عبد الرحمٰن۔

جناب صادق قریشی نے حالی کی شاعری کے چار دَور قائم کئے ہیں اور ہر دَور سے الگ الگ بحث کی ہے۔ چند مباحث کے عنوانات یہ ہیں: (ا) حالی اور غزل (ب) حالی اور تصوّف (ج) حالی اصلاحِ قوم اور حبِ وطن کی روشنی میں (د) حالی کی رباعیات۔ (ہ) حالی کا مزاح۔

کتاب کا آخری باب حالی کی نثر سے متعلق ہے۔ لیکن یہ بہت ہی مختصر ہے۔ حالانکہ حالی ہماری ادبی تاریخ میں دونوں حیثیتوں سے ممتاز ہیں، یعنی بطور شاعر کے بھی اور بطور نثر نگار کے بھی۔ اردو نظم و نثر دونوں میں اُن کی خدمات یکساں اہم ہیں امید ہے کہ کتاب کی طبع ثانی میں یہ کمی بھی رفع کر دی جائے گی۔

موجودہ دَور میں متین علمی تصانیف کی طرف لوگوں کی توجہ بہت کم ہے نہ لکھنے والوں کو ایسی کتابیں لکھنے کی ہمت ہے نہ پڑھنے والوں کو پڑھنے کی۔ ہماری مقبول ترین صنف ادب بازاری افسانے ہیں یا شوقیانہ نظمیں۔ بازار میں زیادہ تر چچوڑی ہوئی ہڈیوں اور پہلے سے ہضم کی ہوئی غذا کے گاہک ملتے ہیں۔ گویا علم پر ظلم نے غلبہ پا لیا ہے۔ ایسی حالت میں صادق قریشی کی ہمت اور اُن کے ناشر کی جرأت قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے تالیف و طباعت کے لئے ایک ایسا موضوع اختیار کیا۔ جس میں خدمت زیادہ اور معاوضہ کم ہے۔

ہماری رائے میں یونیورسٹی کو ایسی کتابوں کی قدر کرنی چاہئے یہ کتاب یونیورسٹی کے بی۔ اے اور ادیب عالم کے نصابِ تعلیم میں شامل ہونے کے قابل ہے۔ حجم ۹۶ صفحات۔ قیمت مجلد عہ۔ پتا اردو مرکز گنپت روڈ لاہور۔

ڈرپوک ابو سعید قریشی ان مشہور انشا پردازوں میں سے ہیں جن کے قلم کی جولاں گاہ بیشتر افسانے کی زمین رہی ہے۔ اُن کے متعدد مختصر افسانے اب تک بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ ڈرپوک ان کا پہلا ناول ہے جس میں ان کی قدرتِ تحریر کے جوہر پوری طرح کھلے ہیں۔

ڈرپوک ایک ایسے نوجوان کی زندگی کی داستان ہے۔ جس کی تربیت اُس مخصوص مشرقی انداز سے ہوئی ہے جس کی کڑی پابندیاں

ہمارے متوسط الحال گھرانوں کی زندگی میں نہایت ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ اس روایتی طریق تربیت میں بچے کے ذہن کو آزادانہ نشو ونما کا موقع نہیں ملتا اور غیر ضروری قیود اس کی آئندہ زندگی پر اس بری طرح اثر انداز ہوتی ہیں کہ ایک قسم کی بزدلی اور بے عملی اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اور وہ زندگی میں بالکل مردہ دل، ناکارہ اور نکما رہ جاتا ہے۔

اس دست و پا بستہ انداز تربیت سے انسان کا ذہن اور اس کی دنیوی زندگی جن خرابیوں کا مجموعہ بنتی ہے ڈرپوک کا ہیرو تقریباً ان سب سے مرکب ہے۔

فاضل مصنف نے ناول کے مختلف ابواب میں نہایت حقیقت نگارانہ انداز سے ہمارے ہاں کے متوسط الحال نوجوانوں اور ان کے گھرانوں کے مصائب کی ہو بہو اصلی تصویریں دکھائی ہیں۔ اور اس میں کہیں کہیں ان کا قلم قابل رشک حد تک کامیاب ہوا ہے ڈرپوک کا ہیرو آخر زندگی کے اس تمام دکھ درد سے گھبرا کر موت کے آغوش میں پناہ لینا چاہتا ہے لیکن یہاں بھی وہی فطری یا اکتسابی بزدلی آڑے آتی ہے اور وہ اس مزعومہ نجات سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔ ع

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

آخر میں ایک بات ہمیں کہنی ہے۔ اس ترقی پسند دور میں جب نوجوان مصنفین اور شعراء صحیح زبان لکھنے کو اپنے لئے باعث توہین سمجھتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ قریشی صاحب نے صحیح زبان لکھنا اور موزوں الفاظ کا برمحل استعمال کرنا ضروری سمجھا۔ اسی قابلیت نے ان کے مکالموں کو بہت جاندار بنا دیا ہے۔

یہ ناول بہت دلچسپ اور حقائق افروز ہے۔ ہمارے ہاں اچھے ناولوں کی کمی ہے۔ اگر قریشی صاحب یہ سلسلہ جاری رکھیں تو وہ ایک اہم ادبی خدمت انجام دیں گے۔ حجم ۲۱۹ صفحات۔ قیمت عہ۸؍ر۔ پتا: مکتبۂ اردو لاہور۔

مضامین ذوقی

مولانا سید محمد ذوقی شاہ صاحب کے مضامین اور خطوط کا یہ مجموعہ واحد بخش صاحب (بہاولپور) نے مرتب کیا ہے اور جے۔ جی لینرڈ اینڈ کمپنی کراچی کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ نام سے خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ اردو مضامین کا مجموعہ ہے لیکن فی الحقیقت مضامین انگریزی میں لکھے گئے ہیں۔ چند عنوانات سے موضوع کتاب کے متعلق اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) قرآن مجید کے مطالب کو سمجھنے کا طریقہ (۲) پاکستان کا مطمح نظر (۳) اسلامی اخوت۔ (۴) پانچواں کالم (۵) پاکستان کا پہلا فرض (۶) اتحاد اور تنظیم (۷) خدا کی حاکمیت کے متعلق محمد مارماڈیوک پکتھال سے مراسلت (۸) ڈاکٹر عبداللطیف کے نام ایک خط (۹) بعض خطوط سے اقتباسات۔ (۱۰) اصلاح معاشرۂ اسلامی کے متعلق شہزادہ سعید حلیم پاشا کی کوشش پر تبصرہ وغیرہ۔

مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا ذوقی بہت وسیع النظر مسلمان ہیں۔ ان کے خیالات کی جدت اور تازگی جاذب توجہ ہے اور ان کا نقطۂ نظر صحت مندانہ۔ بعض جماعتوں کے متعلق انہوں نے کہیں کہیں بظاہر بڑی تلخ تنقید کی ہے لیکن یہ تلخی حقیقت کی تلخی ہے جس پر فاضل نقاد قطعاً قابل ملامت نہیں۔ ان مضامین کا مطالعہ ہر پڑھے لکھے مسلمان کے لئے مفید ہوگا۔ بہتر یہ ہوتا کہ مولانا یہ مضامین اردو میں لکھتے، تاکہ ان کے خیالات سے عام مسلمان بھی مستفید ہو سکتے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں۔ ناشر کا نام اوپر لکھ دیا گیا ہے۔

عبدالحمید نظامی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے امرت الیکٹرک پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ مخزن مال روڈ لاہور سے شائع کیا۔

جلد ۲ نمبر ۶

"مخزن"

علمی ادبی ماہوار رسالہ

لاہور دسمبر ۱۹۴۹ء

۱- صفحۂ اول،
۲- سید علی عباس، ہماری شاعری میں تمثالی حسن کا تصور، ۳
۳- جلال الدین اکبر، وعدہ آنے کا وفا کیجیے (غزل) ۱۴
۴- ڈاکٹر سلیم واحد سلیم، — کوئی بیقرار آیا — (״) ۱۵
۵- محمد حسن عسکری، دل بو کی خود آگاہی، ۱۶
۶- صفیہ شمیم ملیح آبادی، دوسرا رخ (غزل) ۲۳
۷- جعفر طاہر، غزل، ۲۴
۸- ونگ کمانڈر سید فیاض محمود، میرے افسانے، ۲۵
۹- جلیل حسین جلیل، ایک رات، (نظم) ۳۰
۱۰- نظر حیدر آبادی ایک اور رات (״) ۳۱
۱۱- ابن حسن زیدی، دربان (افسانہ) ۳۲
۱۲- محمد اسمٰعیل پانی پتی، سر سید احمد خاں کے دو خطوط، ۴۱
۱۳- پروفیسر محمد شمس الدین صدیقی، جیسی روح ویسے فرشتے (ڈراما) ۴۲
۱۴- حامد علی خاں، تلفظ کی غلطیاں، ۴۷
۱۵ ״ ״ منشورات، ۴۹
مدیر، مخزن المخازن، ۵۳
(رسائل و جرائد کے اقتباسات)
۱۶- استقلال، ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء جمیل ملک
۱۷- ״ آزادیٔ پاکستان سے پہلے،
۱۸- ״ میر کارواں کی للکار،
۱۹- "نوائے وقت" قائد اعظم کے مددگار،
۲۰- "عارف" خلافت ارضی،
۲۱- "ماہِ نو" کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد،
۲۲- "ادبی دنیا" فسادات کے متعلق "ترقی پسند کہانیاں"
۲۳- "ہمایوں" "بورزدا" (ملخص افسانہ)
۲۴- "جادہ" بھوپال اُردو کے وطن کی زمین آسمان بن گئی
۲۵- "نظام المشائخ" نوجوان اقبال مرزا غالب پر، محمد واحدی
۲۶- "صدق" لکھنؤ 'ہند میں اردو کی فاتحہ خوانی'
۲۷- "قومی زبان" کراچی اُردو (نظم)
۲۸- "نگار" لکھنؤ - انیس کی شاعری اور زندگی کی عکاسی
۲۹- علی گڑھ میگزین، غالب کی بیوی، حمید احمد خاں
۳۰- قارئین، ایڈیٹر کے نام، ۶۷

سلسلۂ مطبوعاتِ نوائے وقت۔ چندہ سالانہ سات روپے - چندہ ششماہی چار روپے - قیمت فی پرچہ (۱۰) دس آنے
THE MAKHZAN LAHORE

صفحۂ اوّل

پیشِ نظر پرچے کے ساتھ "مخزن" کے سہ بارہ اجراء کو ایک سال گزرتا ہے۔ اس قلیل مدت میں مخزن کو اپنے مقاصد میں جس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے اس میں "مخزن" کے اُن بلند نظر معاونین کا بہت بڑا حصہ ہے جنہوں نے اپنے منظوم و منثور جواہر پاروں سے "مخزن" کو فی الحقیقت مخزن بنایا۔ ہم اُن مخلص احباب کے بھی احسان مند ہیں جنہوں نے ہماری کوششوں کو سراہا، ہماری ہمت بڑھائی یا اپنے مفید مشوروں سے ہماری رہنمائی کی۔ ان بزرگوں اور دوستوں کی مدد کے بغیر "مخزن" کی یہ روز افزوں مقبولیت اور کامیابی ممکن نہ تھی۔ اس لئے ہم ان سب کے ممنون و شکر گزار ہیں۔

"مخزن" کی جلدیں چھ چھ مہینے کے بعد مکمل ہوتی ہیں۔ آج "مخزن" کی دوسری جلد بھی تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ آپ کو موجودہ پرچے کے آخر میں جولائی سے دسمبر تک کے پرچوں کی ایک مکمل فہرست ملے گی جو جزو بندی کے وقت جلد کے شروع میں رکھی جا سکتی ہے۔ اس فہرست میں صفحات کے وہ مسلسل نمبر درج ہوئے ہیں جو "مخزن" میں ہر صفحے کے نیچے چھپتے ہیں۔

سید علی عبّاس جلالپوری کا ایک دلکش اور کامیاب افسانہ "مخزن" کے کسی گزشتہ پرچے میں شائع ہُوا تھا۔ اس دفعہ انہوں نے اپنے تازہ مضمون کے لئے بھی ایک دلکش موضوع انتخاب کیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ مضمون دیگر اہلِ ذوق کو بھی طبع آزمائی کی دعوت دیتا ہے۔

گزشتہ جنوری سے عسکری صاحب نے مغربی ادیبوں اور شاعروں کے متعلق مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا تھا "آراں بو کی خود آگاہی" اس کی تازہ ترین کڑی ہے۔ عسکری صاحب کی مستقل مزاجی، وسعتِ نظر اور جذبۂ خدمت کے بغیر "مخزن" بھی اس ادبی خدمت کے قابل نہ ہوتا۔

اس مرتبہ ونگ کمانڈر سید فیّاض محمود کا مضمون "میرے افسانے" اس لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ایک مشاق صنّاع نے اپنی صنعت گری پر خود ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اہلِ ذوق کو ایسی تنقیدوں سے مستفید ہونے کے بہت کم موقع میسّر آتے ہیں۔ "مخزن" کی کسی گزشتہ اشاعت میں پروفیسر حمید احمد خاں نے سید فیّاض محمود کے افسانوں کے نئے مجموعے "پھول کانٹے" پر تبصرہ کیا تھا۔ ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ اب سید صاحب کے افسانوں کا ایک دوسرا مجموعہ "پردۂ ساز" بھی مرتب ہو کر ناشر کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اگر موجودہ مضمون "پردۂ ساز" کا دیباچہ بن جائے تو بہت مناسب ہو۔

ادبی نوادر کی اشاعت کے سلسلے میں اس دفعہ سید احمد خاںؒ کے دو اور خط شائع کئے جاتے ہیں۔ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی کے سوا اور کسی صاحب نے اب تک اس باب میں "مخزن" کی مدد نہیں کی۔

اپنے رفیقوں میں ہم بلند پایہ شعراء کے علاوہ افسانہ نگار اور مترجم حضرات کا شکریہ بھی خاص طور سے ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کی مدد ہمارے شاملِ حال نہ ہوتی تو "مخزن" بے رنگ اور پھیکا سیٹھا رہ جاتا۔

دسمبر کے آخر میں بانیٔ دولتِ مسلمہ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کا یومِ ولادت ہے۔ اسی تقریب کے احترام میں مخزن المخازن کے کچھ صفحات حضرت قائدِ اعظم کے متعلق منتخب مضامینِ نظم و نثر کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ وسلامٌ علیہ یومَ وُلِدَ ویومَ یموتُ ویومَ یُبعثُ حیّاہ

مخزن

ہماری شاعری میں نسوانی حُسن کا مثالی نمونہ

(سیّد علی عبّاس جلالپوری)

سقراط سے لے کر کروچے تک اکثر فلاسفہ نے حُسن کی ماہیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کوئی بھی کسی واضح اور معیّن نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اس ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بیشتر اہلِ فکر نے اس موضوع کا مابعد الطبعی نقطہ نگاہ سے مطالعہ کیا ہے اور ایک ایسی بدیہی حقیقت کو جسے ہمارا ابتدائی شعور بلا واسطہ معلوم کر لیتا ہے۔ فکر و تخیّل کے سیکڑوں پردوں میں ملفوف کر دیا ہے۔ اس ابہام کی ذمہ داری کسی حد تک صوفیا پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے اس مسئلہ کو حُسنِ کل کی پیچیدہ گتھی میں اُلجھا کر حقیقت پرست مفکّرین کو بھی راہِ راست سے ہٹا دیا۔ اگر اس مسئلہ کا مابعد الطبعی تخیّل آرائی اور متصوفانہ ابہام پرستی سے الگ کر کے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حُسن تناسب، آہنگ اور توازن کا ایک دلکش امتزاج ہے۔ جو انسان کے احساسِ جمال کو تحریک دے کر اُس کی ذوقی اور روحانی لذّت کا باعث ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حُسن کو تین اصناف میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ فنی، قدرتی، اور نسوانی۔ فنی حسن کا تعلق اسلوب اور اصول کے ساتھ ہے۔ کوئی چابکدست مصوّر کسی بدصورت اور کریہہ المنظر شخص کی تصویر کھینچے تو وہ دیکھنے والے کو خوبصورت معلوم ہوگی۔ قدرتی مناظر کا حُسن اہلِ نظر کو مسحور کر لیتا ہے۔ شفق کی سُرخی میں ٹمٹماتے ہوئے تارے، نیلگوں پہاڑوں پر لہراتی ہوئی گھٹائیں، چاندنی میں چمکتے ہوئے پیپل کے پتّے، ہوا میں جھوم جھوم کر باہم لپٹتی ہوئی ہری بھری ٹہنیاں، دوب پر کلیلیں کرتے ہوئے بھیڑ کے بچّے دیکھ کر ہر صاحب ذوق انسان متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک حسین دوشیزہ کو دیکھ کر ہر کہ و مہ کے رگ و پے میں برقی جھنجھناہٹ کی رَو دوڑ جاتی ہے۔ خیال رہے کہ حُسن فنی ہو یا قدرتی ہو یا نسوانی ہو۔ اس میں تناسب اور آہنگ کا عنصر لازماً موجود ہوگا۔ نظرِ غور سے دیکھا جائے تو قدرتی مناظ

کی بظاہر پریشاں وسعتوں میں بھی تناسب کا یہ عنصر ملے گا۔ اسی طرح جس عورت کے اعضا اور نقوش اور خط وخال میں تناسب نہ ہوگا۔ وہ حسین کہلانے کی مستحق نہ ہوگی۔ جہاں تک فنی اور قدرتی حسن کا تعلق ہے۔ اس سے گو اَن پڑھ اور جاہل بھی کسی حد تک متاثر ہوتے ہیں مگر ان سے کماحقہٗ لطف اندوز ہونے کے لئے سلامتیٔ ذوق ازبس ضروری ہے، اس کے برعکس نسوانی حسن شہری و دیہاتی۔ مہذب و وحشی۔ عالم و جاہل ہر شخص کے لئے کم وبیش یکساں کشش کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی وجہ جنسی جذبہ کی ہمہ گیر کارفرمائی ہے۔ بعض علمائے نفسیات نے حسنِ مطلق کو بھی جنسی جذبہ کی تخلیق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے۔ یہ دعویٰ محلِ نظر ہو مگر یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ نسوانی حسن کی تمام رعنائی اور لطافت اسی جذبہ کی مرہونِ منّت ہے۔ بقول سٹراٹز دنیا بھر کی اقوام نسوانی حسن کے ایک ہی معیار کی قائل ہیں اور یہ معیار وُہ ہے جو گندمی اور سفید فام نسلوں کے ہاں مثالی نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک حبشی کے نزدیک اپنے قبیلہ کی کالی کلوٹی۔ موٹے ہونٹوں اور بھدّے کولوں والی عورت ہی حسن و جمال کا بہترین مرقع ہوگی مگر جب بھی وُہ کوئی سفید فام حسینہ دیکھے گا۔ اس پر ہم قوم کے محبوبہ کی بدصورتی واضح ہو جائے گی۔

سنگ تراش اور مصوّر کی طرح شاعر بھی قدرتی اور نسوانی حسن میں اپنا مثالی نمونہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا اندازِ نظر ان دونوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ سنگتراشی اور مصوّری کے شاہکاروں سے لطف اندوز ہونے میں چنداں دقّت کا سامنا نہیں ہوتا۔ کیونکہ مجسمے یا تصویر کے خط وخال اور جسم کے زاویئے ایک نگاہ میں واضح ہو جاتے ہیں۔ مگر شاعر کی جمالیاتی تصویریں سماعت کی وساطت سے ہمارے ذہنی پردہ پر تشکیل پذیر ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں شاعر مصوّر کی دقّتِ نگارش اور تفصیل آرائی سے اجتناب کرتا ہے اور بسا اوقات اشاروں اور کنایوں میں حسن کے پہلو نمایاں پہلو اُجاگر کرکے دکھاتا ہے۔ اس کوشش میں لامحالہ اُسے تشبیہات کا دامن تھامنا پڑتا ہے۔ قدرتی مناظر سورج، چاند، بادل، پھول، درخت سبزہ وغیرہ میں وُہ اُن انواع کو منتخب کر لیتا ہے جو ایک حسین عورت کی جسمانی لطافتوں کو واضح کرنے میں مدد دے سکیں۔ اس کی معنی یاب طبیعت قدرتی مناظر کے ظاہری حسن ہی پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اُن کے رمزی اور ایمائی پہلوؤں کو بھی نظم میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے اس طرح اس کی تشبیہات اور استعاروں میں طرفگی اور ندرت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے متواتر استعمال سے چند علامتی مظاہر کی تشکیل ہوتی ہے جو ہر ملک وقوم کی شاعری میں امتیازی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان تشبیہات اور علامتی مظاہر کی نوعیت کا انحصار جغرافیائی ماحول کے مخصوص اثرات پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خوبصورت عورت کی آنکھ کو عرب میں شبِ دیجور سے، ایران میں نرگس اور چشمِ آہو سے، ہندوستان میں کنول سے، بلقان میں نیلم سے۔ عراق میں چشمے سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ ان لطیف تشبیہات کے طفیل شاعر سنگ تراش اور مصوّر سے بازی لے جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مغربی زبانوں کی شاعری مشرقی زبانوں کی شاعری کے سامنے ہیچ ہے۔ مغربی شعرا نے اکثر اوقات سنگ تراشوں اور مصوّروں کے تتبّع میں حسین عورت کے سراپا کے بیان میں تفصیل نگاری سے کام لیا ہے۔ اس کے برعکس فارسی اور اُردو شعرا کا اندازِ نگارش رمزی ہے جس کے باعث اُنہیں مضمون آفرینی اور نکتہ طرازی کا موقع مل گیا ہے۔ اس موضوع پر اُنہوں نے ایسے لطیف اور دقیق مضامین پیدا کئے ہیں کہ ذوقِ سلیم وجد کرنے لگتا ہے۔ غزل کی ہیئت مسلسل مضامین کے بیان کے لئے ناموزوں تھی، اس لئے ہمارے شعرا اپنی مصوّروں کی طرح دو چار جنبشوں سے ایک حسین وجمیل خاکا پیش کر دیتے تھے۔ جس میں ایک صاحبِ ذوق قاری کا تخیل جس طرح چاہے رنگ آمیزی کر لیتا تھا۔ اُردو کی غنائی شاعری ہیئت وموضوع کے لحاظ سے فارسی شاعری کی مقلّد ہے اور فارسی شاعری کا ارتقا ایک ایسے ملک میں

ہوا جس کا شمار قدرتی اور نسوانی حُسن کے لحاظ سے دُنیا کے بہترین ممالک میں ہوتا ہے۔ بقولِ شبلیؔ "آب وہوا، سبزہ زار، آبِ رواں، لالہ وگُل، طبیعتوں کو ہمہ وقت نشاط انگیز اور ولولہ خیز رکھتے تھے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ حُسن وجمال کے لحاظ سے ملک کا ملک یوسفستان تھا۔" ظاہر ہے کہ اس پس منظر میں شاعر کے لئے نازک اور لطیف تشبیہات کی فراوانی تھی جو مضامین مغربی شعراء بہزار دقّت پیدا کرتے تھے وُہ یہاں کے شعرا کے لئے پیش پا افتادہ تھے۔ حافظؔ شیرازی کی تشبیہات نے جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر گیٹے کو اس قدر مسحور کیا کہ اس نے فارسی نظم کی تراکیب اور بندشیں اپنی زبان میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ گلبدن۔ گل اندام۔ غنچہ دہن۔ سرو قد۔ سروِ رواں۔ شمشاد قد۔ آہو چشم۔ چشمِ نرگس۔ نرگس فتّاں۔ نرگسِ بیمار۔ زلف سمن سا۔ لعلِ نوش لب۔ وغیرہ تراکیب سے فارسی شاعری کا دامن رشکِ جناں بنا ہوا ہے۔ اُردو شعرا نے کم وبیش انہی تشبیہات کو نسوانی حُسن کی ترجمانی کے لئے استعمال کیا۔ ہندوستان کا قدرتی ماحول ایران کے ماحول سے مختلف تھا۔ اس لئے پس منظر کی غرابت اُردو شاعری کے خلوصِ بیان پر اثر انداز ہوئی مگر امرد پرستی اور غیر ملکی تلمیحات سے قطعِ نظر جہاں تک نسوانی حُسن کا تعلق ہے۔ ایرانی اور اُردو شعرا کے مثالی نمونوں میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کشمیر، افغانستان اور مغربی پنجاب کی صبیح عورتوں کے خدوخال اور ایرانی عورتوں کے نقشے میں چنداں فرق نہیں پایا جاتا۔ دراز قامت، گھنیرے بال، سیاہ آنکھیں، صبیح چہرہ، متناسب اعضا، گداز جسم دونوں کی مشترکہ خصوصیات ہیں۔

اس سے پہلے کہ حُسنِ نسوانی کے متعلق اُردو اور فارسی شعرا کے مثالی نمونہ کا جائزہ لیا جائے۔ دوسری اقوام کے مثالی نمونوں کو پیش کرنا فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سے قارئین کے لئے موازنہ کی صورت بھی نکل آئے گی۔

مسٹ فورڈ نے جاپانی حسینہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے "چہرہ تربوز کے بیج کی مانند بیضوی، رنگ صاف، آنکھیں ترچھی اور روشن، دانت چھوٹے چھوٹے ہموار، ناک عقابی، ہونٹ نازک اور سُرخ، ابرو محرابی، بال سیاہ اور لمبے، آواز سُریلی، گالوں اور ٹھوڑی میں چاہِ حُسن"

ڈاکٹر ڈیوی سنگھالی حسینہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "مور کی دم کی طرح گھنیرے بال گھٹنوں تک پہنچتے ہوئے، آنکھیں نیلم کی طرح، ناک عقابی، ہونٹ مونگے کی طرح سُرخ، دانت یاسمین کی کلیوں کی طرح سپید، گردن بھری ہوئی گداز، اثمارِ شباب ناریل کی طرح، کمر پتلی ایسی کہ ہاتھ میں آجائے۔ سرین بھاری بھرکم، جسم کے زاوئیے گول"

پدمنی کو ہندو نسوانی حُسن کا مکمل نمونہ سمجھتے ہیں۔ اس کا چہرہ ماہِ چہاردہ کی طرح گول ہو، جسم گداز، رائی کے پھول کی طرح نرم۔ جلد دبیز کنول کے پھول کی طرح زردی مائل سپید، آنکھیں چمکیلی۔ اثمارِ شباب اُبھرے ہوئے مستحکم۔ ناک سیدھی۔ چال راج ہنس کی۔ آواز کوئل کی۔ نرم اور مترنم

غزل الغزلات میں جو محبوب کا سراپا بیان ہوا ہے۔ اُسے یہودی حُسن کا مثالی نمونہ سمجھنا چاہئیے۔ پاؤں خوبصورت، ران گول موتی کی طرح سپید، ناف شراب کے بھرے ہوئے پیالے کی طرح گول، شکم گیہوں کے پُولے کی طرح جس پر سمن کے پھول رکھے ہوں۔ اثمارِ شباب دو ہرنیوں کی طرح یا انگور کے خوشوں کی مانند۔ گردن ہاتھی دانت کا منارہ، آنکھیں حشبان کے چشموں کی طرح۔ ناک لبنان کے منارہ کی مانند قد کھجور کے درخت کی طرح سیدھا۔

عربی حسن کی تصویر لین پول کے الفاظ میں ملاحظہ ہو "قد وقامت نازک بیدِ مجنوں کی شاخ کی طرح، چہرہ ماہِ چہاردہ کی طرح گول، بال

مات کی طرح سیاہ، رخساروں پر گلاب کے پھول کھلے ہوئے، آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ، اُن کی چمک لمبی لمبی پلکوں کے سائے میں ماند پڑی ہوئی، آنکھوں میں خمار آلود کیفیت، ابرو پتلی اور محرابی، پیشانی فراخ اور ہاتھی دانت کی طرح سپید۔ سیدھی ناک، غنچہ دہن، ہونٹ سُرخ، اثمارِ شباب دو اناروں کی طرح، کمر پتلی، کولہے بوجھل، ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے۔

اُردو اور فارسی شعراء کے کلام کے مطالعہ سے کچھ اس قسم کی تصویر آنکھوں کے سامنے اُبھرتی ہے، کشیدہ قامت سرو کی مانند، گھنیری تاب دار سیاہ معنبر زلفیں، ابرو محرابی کمان کی مانند، لمبی لمبی سیاہ نکیلی پلکیں، چشمِ آہو نشیلی اور سحر ساز، غنچہ دہن، کمر پتلی جسم گداز، سرین سیمیں، ساق بلّوریں، آواز مترنم۔ اس تصویر میں ہاتھ پاؤں کی خوبصورتی کی طرف اعتنا نہیں کیا گیا۔ ہندو رقص اور مصوّری میں ہاتھ کی انگلیوں کو اظہارِ جذبات کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔ اطالوی مصوّری میں چھوٹے چھوٹے گداز ہاتھ پیش کئے گئے ہیں۔ چینی شاعر ننھے منّے نازک پاؤں کی تعریف میں نظمیں لکھتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں کے حُسن سے قطع نظر فارسی اور اُردو شعرا کا معیارِ حُسن دلفریب اور جاذبِ نظر ہے۔ ہمارے اساتذہ کے نزدیک بعض نقوش اور اعضا بالخصوص کشش کا سامان رکھتے ہیں۔ قد و قامت، زلف و گیسو، چشم و ابرو، لب و دہن، بدن کی نزاکت اور صباحت کے متعلق ہماری شاعری میں لطیف اور نازک مضامین کی فراوانی ہے۔ سب سے پہلے قد و قامت کو لیجئے، سوائے جاپانیوں اور حبشیوں کے سب اقوام میں کشیدہ قامت عورت کو سراہا جاتا ہے۔ ہمارے شعرا نے محبوبہ کے قد کو سرو سے تشبیہ دی ہے جس کی موزونیت سے کسی صاحبِ ذوق کو انکار نہیں ہوسکتا۔ صائبؔ تو اس پر بھی قناعت نہیں کرتا ؎

قمریاں پاسِ غلط کردۂ خود می دارند ورنہ یک سروِ دریں باغ بہ اندامِ تو نیست

قد کی درازی کو بعض اوقات اپنی حرماں نصیبی کا باعث قرار دیا جاتا ہے۔

حافظؔ ؎ ایں سرکشی کہ در سرِ سروِ بلند تست کے با تو دستِ کوتہِ ما در کمر شود

بعض شعرا نے قدِ محبوب کو فتنۂ محشر سے نسبت دے کر اچھوتے مضامین باندھے ہیں۔

غالبؔ ؎ جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

دیگر ؎ ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

نادر مضمون ہے لیکن ممنونؔ کا شعر زیادہ بلند پایہ ہے ؎

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا ممنونؔ وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

قد کی درازی کا ذکر عمر کی طوالت کا باعث بھی ہوسکتا ہے ؎

حکایت از قدِ آں یارِ دلنواز کنیم بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

غالبؔ کی معنی یاب طبیعت نے ایک نہایت سُبک تشبیہ ڈھونڈ نکالی ہے ؎

اسدؔ اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

شیلےؔ نے ایک جگہ کہا تھا کہ خزاں زدہ پتّے ہوا میں اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں جیسے جادوگر کے منتر سے بھوت بھاگ

رہے ہوں۔ ایک محسوس امر کو واضح کرنے کے لئے نامحسوس کا دامن تھاما گیا ہے۔ غالبؔ نے بھی یہی کیا۔ پہلے قد کو لباسِ نظم کہا۔ پھر محبوب کے اُٹھنے سے اُس کے جسم میں جو لطافت پرور جنبشیں پیدا ہوتی ہیں۔ اُن کو مضمونِ عالی کے نو سے تشبیہ دے کر ندرتِ بیان کی انتہا کر دی

دُنیا کی بیشتر اقوام میں گھنے، سیاہ، لمبے اور تابدار بالوں کو حسنِ نسوانی کا لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے اساتذہ نے زلفِ محبوب کے ذکر میں مضامین تازہ کے انبار لگا دیئے ہیں۔

فردوسیؔ ؎ بہ پیچید مو را بصد آب و تاب گرہ کرد شب را پسِ آفتاب

چو بکشاد آں طرۂ مشکناب شب آمد بپا بوسیٔ آفتاب

صبیح چہرے کو آفتاب کہہ کر زلفِ سیاہ کو رات قرار دینا اور اس کے باندھنے اور کھولنے سے شام و سحر کے مناظر دکھانا کیسا لطیف خیال ہے۔ طرازیزدی کی شام وہی ہے۔ صبح مختلف ہے ؎

ازاں زلفِ سیہ مشکل کہ شام را سحر باشد مگر زاں چاکِ پیراہن دمے از صبح بکشائی

بقاؔ نے فردوسیؔ کے مضمون کو نئے انداز سے باندھا ہے ؎

یہ رُخِ یار نہیں زلفِ پریشاں کے تلے ہے نہاں صبحِ وطن شامِ غریباں کے تلے

فرد یزدی نے زُلف کی سیاہی اور درازی کو ایک ترکیب میں جمع کر دیا ہے ؎

گفتم روم کہ چشمت مائل بخوابِ ناز است بکشود زلف و گفتا بنشیں کہ شب دراز است

عارفؔ کا شعر بھی قابلِ قدر ہے ؎

بارے دم از تعلقِ دیرینہ می زند باکاکلِ دراز تو بختِ سیاہِ من

زلفِ محبوب کی درازی میں بعض اوقات مبالغہ سے بھی کام لیا گیا۔

مومنؔ ؎ اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

دراصل یہ مضمون فغانیؔ سے لیا گیا ہے ؎

افتادہ بپا زُلفِ سمن سائے تو از چیست دیوانہ منم سلسلہ بر پائے تو از چیست

غالبؔ نے قد اور زلف کی درازی کا مقابلہ اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے ؎

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

زُلف کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وُہ عام طور پر پریشان رہتی ہے۔

نشفائیؔ ؎ غمِ عالم پریشانم نمی کرد سرِ زلفِ پریشاں آفریدند

غالبؔ ؎ چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

دیگر ؎ نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

سلمیٰ ؎ کاکلت را من بہ مستی رشتۂ جاں گفتہ ام مست بودم زیں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

آزردہ ؎ یہ بلائیں اگر آئیں تو مجھی پر آئیں اُن کی زُلفیں ہوں پریشاں تو مرے شانوں پر

ریاضؔ ؎ بن سنور کر مرے گھر شام سے آنے والا اپنے گیسو کی طرح صبح پریشاں نکلا

زلف کو محبوبہ کی گردن پر لوٹتے دیکھ کر شاعر کس حسرت سے کہتا ہے۔

اوحدی یکتا ؎ اے خوش آں وقتے کہ اندر مجلسِ مستاں چو زُلف دست اندر گردنِ ساقی حمائل داشتم

چہرے پر بکھری ہوئی زلفیں نقاب بھی بن جایا کرتی ہیں۔

غالبؔ ؏ از زلفِ پُرخم مشکیں نقابے

زُلف کے پیچ و خم اُس کی ہلاکت آفرینی میں اضافہ کر دیتے ہیں

اقبالؔ ؎ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

غالبؔ ؎ تو اور آرائشِ خمِ کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

زُلف ایک دام ہے جس میں عشاق کے دل اسیر ہونے کے خواہشمند رہتے ہیں ؎

اقبالؔ ؎ دام ز گیسواں بدوش زحمتِ گلستاں بری صید چرا نمی کنی طائرِ بامِ خویش را

محبوبہ کی زُلفیں خوشبو میں بسی ہوتی ہیں۔ اسی لئے اُنہیں زُلفِ معنبر اور طرّۂ مشکناب کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

حسرتؔ ؎ کھول کر بال جو سوتے ہیں وہ شب کو حسرتؔ گھیر لیتی ہے اُنہیں زُلفِ معنبر کیا خوب

زُلف بے حد حسّاس ہے۔ بعض اوقات بغیر چھوئے بھی پریشان ہو جاتی ہے۔

ریاضؔ ؎ رنگ وہ ہار کے پھولوں کا بدلنا شبِ وصل بے چھوئے چھیڑے وہ زلفوں کا پریشاں ہونا

اور بلائیں لینے سے بھی ؎

بگڑے گیسو تو بولے جھنجھلا کر نہ بلائیں لیا کرے کوئی

اس کی وجہ شاید یہ ہو۔

داغؔ ؎ ادا بے ساختہ اُن گیسوؤں کی کچھ نرالی ہے بنائے سے بگڑتے ہیں سنوارے سے بکھرتے ہیں

مشرق کے اصحابِ نظر نے حسین آنکھوں کو کنول، نرگس، بادام اور ہرن کی آنکھوں سے تشبیہ دی ہے۔ ان آنکھوں پر نکیلی سیاہ پلکوں کا سایہ ہوتا ہے اور ان میں شوخی، فتنہ، مستی، حیا، خوابیدگی کی ملی جلی کیفیات پرورش پاتی ہیں۔ سیاہی کی وجہ سے انہیں چشمِ سرمہ سا بھی کہا جاتا ہے۔

اقبالؔ ؎ نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سیاہ آنکھوں میں تقدیر کی گہرائیاں دکھائی دینا — میں جب بھی اس شعر کو پڑھتا ہوں، میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ذوقؔ ؎ ہر اک گردش میں سو انداز ناز فتنہ زا سمجھے فلک کو ہم کسی کافر کی چشمِ سرمہ سا سمجھے

طالب آملی نے چشمِ سیاہ کو سرمے سے بے نیاز سمجھا ؎

بے نیازانہ ز اربابِ کرم می گزرم   چوں سیہ چشمے کہ بر سرمہ فروشاں گزرد

مگر کبھی کبھی چشمِ سیہ کو سرمے کا نیازمند ہونا پڑتا ہے۔

غالبؔ ؎ مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس   سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

حسین آنکھ کے کیف آور تاثر کو شراب کی مستی سے بھی نسبت دی گئی۔

میرؔ ؎ میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے

شعراء نے اس مضمون کو بڑے بڑے اچھوتے پیرایوں میں بیان کیا ہے۔

ہدایتؔ ؎ دیکھ اس کی چشمِ مست کو دل تو بہک گیا   بس میری جان! وہ ہی پیالوں میں چھلک گیا

حافظؔ ؎ اگر برقع بر افگندی از اں روئے چو مہ روزے   مدام از نرگسِ مستش جہاں پُر شور و شر بودے

حسرتؔ موہانی ؎ اُن کی نگہِ مست کے جلوے ہیں نظر میں   تھوڑے سے بھی ذکر مے دینا نہیں آتا

شادؔ عظیم آبادی ؎ دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار   جب تک شراب آئی کئی دَور ہو گئے

وحیدؔ قزوینی ؎ ساقی چناں خوش است کہ گرگئے کمی کند   پُر می کند بگردشِ چشمش پیالہ را

نامعلوم ؎ تنگِ چشمِ تو کند محتسبِ شہر کزو   ہر کجا میکدۂ ہست خراب افتاد است

سوداؔ ؎ کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ   ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

چشمِ محبوب قیامت انگیز فتنوں کی آئینہ دار ہے۔

اقبالؔ ؎ از ما بگو سلامے آں تُرکِ تُند خُو را   کآتش زد از نگاہے یک شہر آرزو را

وزیرؔ لکھنوی ؎ ہے چشمِ نیم باز عجب خواب ناز ہے   فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

حسرتؔ ؎ ملا کر خاک میں مجھ کو جھکی ہے شرم سے لیکن   اُٹھے گی پھر وہ چشمِ فتنہ کار آہستہ آہستہ

غالبؔ ؎ نگاہِ یار نے جب عرضِ تکلیفِ شرارت کی   دیا ابرو کو چھیڑا اور اُس نے فتنے کو اشارت کی

حافظؔ ؎ خوابِ آں نرگسِ فتانِ تو بے چیزے نیست   تابِ آں زلفِ پریشانِ تو بے چیزے نیست

آنکھ کو پُرکار اور سخن ساز بھی کہا گیا ہے۔ جو لطفِ بیان اور ندرتِ تخئیل کی انتہا ہے۔ اس طرح چشمِ محبوب کی صورت میں ایک مستقل کردار کی تخلیق کی گئی ہے جو اپنی زبان سے اظہارِ مدعا کرتا ہے۔

صائبؔ ؎ کس زبانِ چشمِ خوباں را نمی داند چو من   روزگارے ایں غزالاں را شبانی کردہ ام

نامعلوم ؎ گرچہ لعلِ تو خموش است ولے چشمِ ترا   بادلِ خوں شدۂ ما سخنے نیست کہ نیست

جگرؔ ؎ اللہ رے چشمِ یار کی معجز نمائیاں   ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

کلیمؔ ـــ من مست بہ ہشیاریٔ چشمِ تو ندیدم — مدہوش ولے باہمہ در گفت و شنید است

اچٹتی ہوئی نگاہ کو نگاہِ دزدیدہ کہنا قدرتِ بیان کا روشن ثبوت ہے ـــ

دزدیدہ فگندی بمن از ناز نگاہے — قربانِ نگاہے تو شوم باز نگاہے

غالبؔ ـــ لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

حسین آنکھ میں شیریں نقاہت اور لطیف خستگی کی ایک کیفیت ہوتی ہے جس کی ترجمانی کے لئے ہمارے شعرا نے نرگسِ بیمار کی خیال افروز ترکیب وضع کی۔

حافظؔ ـــ گشت بیمار کہ چوں چشمِ تو گردد نرگس — شیوۂ آں نشدش حاصل و بیمار بماند

نگاہِ ناز کو تیر و نشتر سے بھی تشبیہ دیتے ہیں

مجازؔ ـــ تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے — تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

مگر یہ نشتر کبھی کبھی رگِ جاں بھی بن جایا کرتا ہے۔

اصغرؔ ـــ ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

ہمارے شعرا کی مثالی حسینہ کا چہرہ ماہِ تمام کی طرح گول اور صبیح ہے۔ رخساروں پر گلاب کے پھول کھلے ہوئے۔ ملیح اور گندمی عارض پر سرخی کی بھڑک ہو۔ تو اس کو چمپئی رنگ کا نام دیتے ہیں۔ رنگ کی صفائی کے باعث رُخِ روشن، ماہ سیما، قمر جبیں، خورشید لقا کی تراکیب تراشی گئیں۔

داغؔ ـــ رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

جگرؔ ـــ اُف رے تجلّیٔ رُخِ ساقی کہ بادہ کش — رہ رہ گئے ہیں ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

مہریؔ ـــ از شبِ وصل تو کوتہ تر بنی باشد شبے — تا تو برقع می کشائی می نماید آفتاب

رُخِ زیبا کا فروغ بعض اوقات پردۂ حسن بن جاتا ہے

[illegible] ـــ دیکھنے والے فروغِ رُخِ زیبا دیکھیں — پردۂ حسن پہ خود حسن کا پردا دیکھیں

اسی فروغِ حسن کو آتشِ گل اور گلستان سے بھی تشبیہ دی گئی ہے

حسرتؔ ـــ مدہوش جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

ریاضؔ ـــ تیرا یہ رنگ رُوپ یہ جوبن شباب کا — جیسے چمن بہار میں پھولا پھلا ہوا

اصغرؔ ـــ عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا کچھ آ گیا — ان گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

چہرے کے فروغ کے ساتھ فروغِ مئے شامل ہو جائے تو کیا کہنا۔

جمالؔ ـــ ز آں رُخ از مئے عشرت تمام گلرنگ است — مرا بہ فکرِ دہانت چو غنچہ دل تنگ است

غالبؔ ـــ اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

چہرے پر سیاہ خال خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

صائب ؎ بر صفحۂ عذارِ تو از نقطہ ہائے خال　　گردست کلکِ صنع نشان بوسہ گاہ را

اہلِ مغرب کشادہ دہن اور بھرے بھرے ہونٹ پسند کرتے ہیں۔ ہماری شاعری میں چھوٹا دہن اور پتلے ہونٹ خوش وضع سمجھے جاتے ہیں۔

رودکی ؎ کشادہ غنچۂ تو بابِ معجزِ عیسےٰ　　بپردہ نرگسِ تو آبِ جادوئے بابل

کلیمؔ کا شعر لاجواب ہے ؎

درگلستاں بہ یادِ دہانِ تو غنچہ را　　امسال باغباں ہمہ ناشگفتہ چیدہ بود

اور گرامیؔ کے شعر کا کیا جواب ہے ؎

آں غنچہ کہ گل گشت دگر غنچہ نگردد　　ویں طرفہ لبِ یار گہے غنچہ گہے گل

لب و دہن میں شہد و شکر کی آمیزش ہوتی ہے۔ صائبؔ نے کیا نسخہ تجویز کیا ہے ؎

قند آمیختہ با گل نہ علاجِ دلِ ماست　　بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند

اسی طبیب کا ایک اور نسخۂ اعادۂ شباب ؎

گفتم ز لعلِ نوش لباں پیر را چہ سود　　گفتا ببوسۂ شکرینش جواں کنند

لعلِ لب کی شیرینی کلام کی تلخی کو زائل کر دیتی ہے ؎

ہر چہ بخواہی بگو کایں ہمہ دشنامِ تلخ　　چوں بہ لبت می رسد شہد و شکر می شود

اور شراب کی تلخی کو بھی

طراز یزدی ؎ بادہ را عیب نگفتند بجز تلخیٔ طعم　　بے خبر کز کفِ شیریں دہناں شیریں نیست

جوشؔ نے نازک ہونٹ کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی اور پھر کیا مضمون پیدا کیا ؎

لب کو یوں جنبش سی ہو نا نطقِ شرم آمیز سے　　پنکھڑی جس طرح مڑ جائے ہوائے تیز سے

لبوں پر پان اور مسی کی بہار ملاحظہ ہو

مسی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہے　　تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

مسکراہٹ محبوبہ کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے اور پھر تبسم و خندہ کے کئی لطیف مدارج ہیں۔

شکر خندہ ؎ پرِیرُخے بشکر خندہ قتلِ مردم کرد　　چوں گفتمش کہ مراہم بکش تبسم کرد

خندۂ دنداں نما ؎ دعویٰ او را بود دلیل بدیہی　　خندۂ دنداں نما بحسنِ گرارد

خندۂ زیرِ لب ؎ نیست لذت ز نظر بازیٔ بزمے کہ درو　　خندۂ زیرِ لب و گریۂ پنہانے نیست

تبسم پنہاں ؎ رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی　　شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

تبسّم زیرِ لب ؎ زیرِ لب ہے، ابھی تبسّم دوست منتشر جلوۂ بہار نہیں

اور ایک تبسّم جو سادگی اور پرکاری کا لطیف امتزاج ہے۔ بظاہر سادگی سے مسکرا کر دیکھنے والو۔ کوئی کم بخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جائے
پُرشباب اور گدرائے ہوئے بدن کی صفائی اور لطافت کو اُجاگر کرنے کے لئے ہمارے شعرا نے بڑی لطیف تشبیہات اختراع کی ہیں۔

ناسخ ؎ جب نہانے کو ہوا عریاں وہ تیلا نُور کا حوض میں روشن بہ رنگِ شمع فوارہ ہوا
دیگر ؎ دکھتا ہے جو کُندن کا بدن ہر ایک حلقے سے تری جالی کی کُرتی میں ہے عالم کا مدانی کا
غالب ؎ چو غنچہ جوشِ صفائے تنش ز بالیدن دریدہ بر تنِ نازک قبائے تنگش را

اصحابِ ذوق کے لئے فضلی جرفادقانی کا شعر قابلِ غور ہے ؎

یا دِ آں گلشن کہ گُل ہر چند می چیدم ازو وقتِ بیروں آمدن حسرت بداماں داشتم

پسینہ کی حالت میں محبوب کے بدن کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

میر حسن ؎ پسینے پسینے ہوا سب بدن کہ جوں شبنم آلود ہو یاسمن

نسوانی حُسن کا مشہور اطالوی مبصر کسا نوا اپنے خود نوشت سوانحِ حیات میں لکھتا ہے کہ ہر صبیح حسینہ کے بدن سے ایک خاص قسم کی فرحت بخش خوشبو نکلتی ہے۔ گیلوپن کہتا ہے کہ اس خوشبو پر عنبر کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہندو اہلِ قلم کے نزدیک پدمنی کے بدن سے مشک کی خوشبو نکلتی ہے۔ ہمارے شعرا نے بھی اس کا ذکر کیا ہے ؎

جو ایک رات بھی سویا وہ گُل گلے مل کر تو بھینی بھینی بھبنوں رہی ہے بُو باقی
حسرت ؎ آج تک جس سے معطّر ہے محبّت کا مشام ہائے کیا چیز تھی وہ پیرہنِ یار کی بُو

عام حالات میں زیورات جسمانی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لئے پہنے جاتے ہیں مگر حضرت سعدی کو اتفاق نہیں ؎

بزیورہا بیارائند وقتے خوبرویاں را تو سیمیں تن چناں خوبی کہ زیورہا بیارائی
حسرت موہانی ؎ رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

سراپا کی تعریف میں نظیری کا مشہور شعر ہے ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

ستائی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہے ؎

سر تا قدم آئینۂ حُسنی و لطافت افسوس کہ در چشم دلبت صلح و صفائیست

ایک حسین عورت کے جسم کے خطوط اور زاویئے بے حد دلآویز ہوتے ہیں حکیم آغا جان عیش نے کیا خوب کہا ہے ؎

اک زلف کا بل ہو تو کہوں سیکڑوں بل ہیں پیشانی سے ابرو تلک ابرو سے کمر تک

مندرجہ بالا بیان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہماری شاعری میں حسین عورت کا سراپا مسلسل اشعار کی شکل میں مفقود ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک تصویر پیش کی جاتی ہے۔

میر حسن سے

وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے — وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
جو کچھ چاہئے ٹھیک نک سک سے ڈھنگ — نزاکت بھرا سبوتی کا سا رنگ(؟)
کچھ اک تمکنت اور کچھ اک بانکپن — غرض ہر طرح میں انوکھی پھبن
وہ ابرو کہ محرابِ ایوانِ حسن — جھکی شاخِ نخلِ گلستانِ حسن
نگہ آفت و چشم عینِ بلا — مژہ وہ صفوں کو الٹ برملا
وہ بینی کہ جس کا نہیں کچھ نظیر — ہے انگشتِ قدرت کی سیدھی لکیر
وہ رخسارِ نازک کہ ہو جائے لال — اگر اس پہ بوسے کا گزرے خیال
وہ ساقیں بلوریں وہ انداز پا — پھریں ہر سحر چشم دل میں سدا

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام
قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

سید علی عباس

ایک تصویر

(عظمت اللہ خاں مرحوم)

چال نشیلی، جھومتا بادل — یا کوئی ندی لہراتی — اک موج مچلتی چھلاتی — چڑھتی اترتی، لہراتی
جوبن جوانی میں اٹھلاتی — وہ گردن کا نفیس ڈھلاؤ
ڈرتی ڈرتی بچتی بچاتی — رکتی رکاتی شرماتی — سینہ مستی کا جوالا مکھ — کمر لچکتی، بل کھاتی
دل کو مسلتی تڑپاتی — ہوش رُبا اُتار چڑھاؤ

سندر صورت سندر ہی ہے — رنگت گوری یا کالی
فطرت نے جو جس رنگ میں ڈھالی
فطرت کے لئے حسن یہی ہے — سج دھج گرمانے والی
جان کی کھیتی جوتنے والی

جلال الدین اکبر

وعدہ آنے کا وفا کیجیے

اے — اے پیکرِ شائستۂ مہر و وفا

تیرا ہر انداز مجھ کو باعثِ صد ناز ہے
تیرے الطافِ فراواں کا یہ سارا فیض ہے
آج بھی حاصل جو مجھ کو لذّتِ آغاز ہے
تیرا ہر شیوہ ترے اکرامِ پیہم کی دلیل
میرا ہر انداز تیرے شوق کا غمّاز ہے
تیری اُلفت ہے سُرورِ زندگانی کی کفیل
میں جو زندہ ہوں اسی اُلفت کا یہ اعجاز ہے
آج بھی تیری تمنّائیں وُہی ہیں گرمیاں
آج بھی دل کی جگہ طوفانِ سوز و ساز ہے
اب نہیں جانِ حزیں کو تابِ رنجِ انتظار
وعدۂ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
بڑھ گئیں حد سے جنونِ شوق کی بے تابیاں
رُوح اب قیدِ بدن سے مائلِ پرواز ہے
اِک ہجومِ شوق ہے دل میں مگر خاموش ہوں
آ کہ تیرے واسطے میں سربسر آغوش ہوں

سلیم واحد سلیم

"کوئی بے قرار آیا"

فسونِ جذبِ محبّت بروئے کار آیا
مرے سکوں کے لئے کوئی بے قرار آیا

خزاں نصیب تھے، جب وقت سازگار آیا
اِدھر تُم آئے اُدھر موسمِ بہار آیا

اُف اضطراب کا عالم کہ تیرے کُوچے میں
ہزار بار گیا اور ہزار بار آیا

ہزار ادائیں ہر اک دلنشین و ہر اگیں
بتائیں کیا ہمیں کس کس ادا پہ پیار آیا

تری تلاش کی دُھن اور جنوں کا یہ عالم
خُدا ہی جانے کہاں تک تجھے پُکار آیا

پئے سکونِ غمِ دل کسی کی محفل میں
بحالِ زار گیا اور بحالِ زار آیا

یہ کس کا پاسِ ادب تھا کہ مجھ سا رندِ خراب
پئے ہُوئے بھی سرِ بزم ہوشیار آیا

اُٹھ اور جام پلا ساز اُٹھا ترانے گا
ترا سلیم ترا رندِ جاں نثار آیا

محمد حسن عسکری

راں بو کی خود آگاہی

یورپ کے جدید ادب کی روایت بودلیئر سے شروع ہوتی ہے۔ ٹکنیک ہو، یا خیالات یا جذبات و احساسات، غرض نئے ادب کے ہر پہلو کی ابتدائی شکل بودلیئر کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن ۱۸۹۱ء کے بعد شاعروں اور ادیبوں پر جس شخص کا سب سے زیادہ اثر پڑا، وہ راں بو ہے۔ اس کی رائے ہے کہ شاعر کو "عارف" بھی ہونا چاہیئے اور اس کی نظر میں اتنی طاقت ہونی چاہیئے کہ ظواہر کی سطح کو توڑ کر حقیقت تک پہنچ سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ شاعر عام آدمیوں کی نظر سے نہ دیکھے بلکہ خاص قسم کی "نظر" پیدا کرے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے محسوسات کو شعوری طور پر گڈمڈ کر دے، ہر چیز کو اپنے سارے حواس کی مدد سے گرفت میں لائے۔ جو دیکھنے کی چیز ہے اُسے چھوئے بھی، سونگھے بھی، سُنے بھی۔ یہ صلاحیت بعض دفعہ پاگلوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ راں بو کا خیال تھا کہ شاعر کو پاگلوں کی سی کیفیت بھی اپنا کے دیکھنی چاہیئے۔ کیونکہ بعض معنوں میں پاگل حقیقت کے بعض پہلوؤں کا ادراک عاقلوں سے اچھا کر سکتے ہیں۔ حقیقت کی تلاش اصلی چیز ہے۔ اس میں عقلیت اور غیر عقلیت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس طرح راں بو نے موضوع اور طریقۂ کار دونوں لحاظ سے ادب کا میدان بہت وسیع کر دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ راں بو ایک روحانی اور اخلاقی تجربہ بھی کر رہا تھا۔ نشاۃِ ثانیہ کے زمانے میں یورپ والوں کو پہلی مرتبہ مذہب پر شک پیدا ہوا اور انیسویں صدی تک یہ سلسلہ اتنا بڑھ گیا کہ مذہب تو الگ رہا۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی مگر لازمی باتوں پر سے بھی یقین اُٹھ گیا جب شک اتنی ترقی کر جائے تو آدمی کے لئے بس یہی رہ جاتا ہے کہ خودکشی کرے مگر زندگی کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ زندگی کی خواہش نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ یقین کی تلاش پھر سے کریں۔ لیکن جب تک شک پوری طرح شکست نہ کھا جائے۔ یقین کی بنیاد مضبوط نہیں ہوتی۔ مگر شک سے لڑنے کی طاقت عام آدمی کے اندر نہیں ہوتی۔ یہ کام راں بو جیسے فن کاروں نے کیا۔ راں بو نے ہر قسم کی اخلاقی پابندیاں دور کرکے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ اب ہماری زندگی کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ آخر میں اُسے پتا چلا کہ اگر جبلتوں کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے اور انسان مذہب یا خدا سے بالکل کنارہ کش ہو جائے تو اس کی زندگی دوزخ کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اس روحانی جدوجہد کا حال اُس نے یُوں تو اپنی بہت سی نظموں میں بیان کیا ہے مگر اس کا نچوڑ ایک طویل منثور نظم میں آجاتا ہے۔ جس کا نام ہے "دوزخ میں ایک موسم"۔ اس نظم میں راں بو نے شک اور یقین کی جنگ کی پوری داستان بیان کر دی ہے اور لُطف یہ ہے کہ اُس وقت راں بو کی عمر صرف اُنیس سال کی تھی۔ وُہ ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۹۱ء میں مرا۔ شاعری اُس نے صرف اُنیس سال کی عمر تک کی۔ اس کے بعد اپنے مسودے پھاڑ، بلجیم، ہالینڈ، جرمنی، اٹلی، حبش، عدن، نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرا۔ کبھی کلرکی کی، کبھی بوجھ ڈھویا، کبھی غلاموں کی تجارت کی۔ اُس کی جو نظمیں بچ گئیں تھیں، وُہ اُس کے دوست ورلین نے شائع کیں۔

ورلین ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۹۶ء میں مرا۔ وہ اتنا اہم تو نہیں ہے جتنا بودلیئر یا راں بو۔ مگر اس کے باوجود اس کی شاعری ایک خاص ندرت رکھتی ہے۔ اس نے شاعری میں تاثریت کا اضافہ کیا۔ اس کا کمال یہ ہے کہ کسی منظر یا کسی جذباتی کیفیت کو تفصیلات کے بغیر کم سے کم اشاروں میں بیان کر دیتا ہے اور احساسات بھی وہ ایسے لطیف لیتا ہے کہ جن کا تجزیہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ جو نظم کے ساتھ ہی ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں کہ انہیں پڑھنے کے بعد آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ نظم کا موضوع کیا تھا۔ اس کی نظموں کی کیفیت مصحفی کے اس شعر کی سی ہوتی ہے۔

ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا

خیر، اس وقت مجھے ورلین کی شاعری کے متعلق کچھ نہیں کہنا۔ بلکہ اس کی اور راں بو کی دوستی کا ذکر مقصود ہے۔

راں بو گاؤں کا رہنے والا تھا اور اس کی ماں بڑی سخت گیر تھی۔ ظاہر میں تو وہ دبا دبایا رہتا تھا مگر اس ماحول سے بہت تنگ تھا۔ چنانچہ سولہ سال کی عمر میں وہ گھر سے بھاگ کے پیرس جا پہنچا۔ مگر انقلابی سپاہیوں نے کچھ ایسی بدسلوکیاں کیں کہ دو تین دن بعد ہی اسے واپس آنا پڑا۔ اس دوران میں اس نے شاعری بھی شروع کر دی تھی، اور جو نئے شاعر اس زمانے میں مشہور ہو چکے تھے۔ انہیں اپنی دو چار نظمیں بھی بھیجی تھیں۔ ورلین کو اس کی نظمیں بہت پسند آئیں اور اس نے راں بو کو پیرس آنے کی دعوت دی۔

ورلین کچھ آشفتہ مزاج واقع ہوا تھا۔ بیوی سے اور گھر والوں سے اَن بن رہتی تھی۔ اب راں بو اس کے گھر رہنے لگا تو روز بیوی سے تُو تُو میں میں ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک دن ورلین تلوار لے کے بیوی کو مارنے چڑھ گیا اور گھر والوں نے آ کے اسے بچایا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ورلین اپنی ملازمت چھوڑ چھاڑ راں بو کو ساتھ لے۔ بلجیم چل دیا اور وہاں سے انگلستان۔ اب ان دونوں کی زندگی کا ایک بہت ہی عجیب غریب اور ہولناک دور شروع ہوا۔ جو اخلاقی اعتبار سے بُرا سہی، مگر ادب کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ فاقہ مستی، شراب نوشی، آوارہ گردی اور شعر گوئی ـــــ اس زمانے میں یہ تھی کہ ان دونوں کی زندگی۔ راں بو کا مزاج بھی بڑا ٹیڑھا واقع ہوا تھا۔ اکثر ان دونوں میں جھگڑا ہوتا رہتا تھا اور ہر دفعہ راں بو دھمکی دیتا کہ بس میں جاتا ہوں۔ ورلین انتہائی جذباتی آدمی تھا۔ اسے رنج ہوتا اور وہ رونے دھونے لگتا۔ راں بو کو جذباتیت سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ وہ اور بگڑتا۔ آخر یہ نتیجہ یہ ہوتا کہ ورلین نے ایک دن غصے میں آ کے پستول چلا دیا جس سے راں بو کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ ورلین پر مقدمہ چلا اور اسے دو سال کی سزا ہو گئی۔ راں بو فرانس واپس چلا آیا۔

اب دیکھئے کہ ان اندوہ ناک واقعات کا اثر ان دونوں شاعروں کی طبیعت پر کیا ہوا۔ ورلین جیل خانے ہی میں تھا کہ اس کی بیوی نے عدالت سے طلاق حاصل کر لی۔ اس پر اسے بڑا رنج ہوا اور اسے اپنے افعال پر ندامت ہونے لگی۔ اس صدمے سے ورلین مذہب کی طرف مائل ہوا اور حضرت مریم کی شان میں نعتیں اور توبہ و استغفار کے مضامین سے پُر نظمیں لکھنے لگا۔ اب اس پر نفس پرستی اور اخلاقیات دونوں کی حقیقت آشکار ہوئی۔

اُدھر راں بو نے اپنے تجربات کا سختی سے تجزیہ کیا اور ایک طویل نظم "دوزخ میں ایک موسم" لکھنے بیٹھ گیا۔ جو جبلت پرستی اور اخلاقیات سے آزاد زندگی کی شکست اور محرومی کا اعتراف ہے۔ یہ نظم جدید ادب میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ کو ہمارے زمانے کی

بنیادی کشمکش سے آگاہی حاصل کرنی ہے تو اس کی انتہائی معنی خیز تصویر آپ کو یہاں ملے گی۔ فی الحال میں اس مضمون میں اس طویل نظم کا صرف ایک جز پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ اس کا بھی پہلا حصہ۔ اس جز کا نام ہے "جنون"۔ پہلے حصے میں تو اس نے ان دنوں کا حال بیان کیا ہے جب وہ اور ورلین دونوں ساتھ ساتھ بلجیم اور انگلستان میں آوارہ گردی کر رہے تھے۔ دوسرے حصے میں شاعری سے متعلق اپنے نظریات اور اپنی شاعری پر بھی اندر سے تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

جو حصہ میں پیش کر رہا ہوں۔ اس میں جہنمی دولھا تو راں بو خود ہے اور پگلی دوشیزہ ورلین ہے۔ ورلین کو عورت اس وجہ سے بنایا ہے کہ اس میں عورتوں کی سی شدید جذباتیت تھی اور راں بو کو عورتوں سے چڑ تھی۔ بعض نقادوں کی رائے ہے کہ اصل میں یہ دونوں کردار خود راں بو کی شخصیت ہی کے دو پہلو ہیں۔ پگلی دوشیزہ اسی کی ذات کا عملی پہلو ہے اور "جہنمی دولھا" مثالی پہلو ہے، یا وہ بھوت ہے جو راں بو کے سر پر سوار تھا۔

اپنے اس ترجمے کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ یہ میں نے کام چلاؤ سا ترجمہ کیا ہے تاکہ اس نظم کا تعارف آپ سے کرا سکوں۔ ورنہ راں بو کی کسی نظم کا ترجمہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ کام تو تین چار ساتھیوں کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔ میں جو ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ اس میں آپ کو نظم کا مطلب تو مل جائے گا، مگر اس کی لطافتیں نہیں ملیں گی۔ شاید بعض جگہ غلطیاں بھی ہوں۔ کیونکہ میں فرانسیسی زبان کی نزاکتوں سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ بہرصورت یہ ترجمہ تو صرف تعارف کے طور پر ہے۔ جسے واقعی ترجمہ کہہ سکیں۔ وہ تو کوئی اور صاحب ہی کریں گے۔

جنون

اب جہنم کے ایک ساتھی کے اعترافات سنئے :-

" اے آسمانی دولھا، اے آقا، تیری اس بندی جیسا دکھی دنیا میں اور کون ہوگا۔ اس کے اعترافات رد نہ کر۔ میں برباد ہو گئی ہوں، میں زندگی سے تنگ آ چکی ہوں، میں ناپاک ہوں۔ یہ بھی کیسی زندگی ہے!

معاف کر، اے آسمانی آقا، مجھے معاف کر! میں معافی چاہتی ہوں! آنسوؤں کا دریا اُمڈا چلا آ رہا ہے! اور شاید یہ دریا یوں ہی جاری رہے گا!

ایک نہ ایک دن میں آسمانی دولھا کے قدموں میں پہنچ جاؤں گی! میں تو پیدا ہی اس کی خدمت کے لئے ہوئی ہوں ـــــ فی الحال دوسرا دولھا مجھے مار پیٹ سکتا ہے!

آج کل تو میں تحت الثریٰ میں پہنچ گئی ہوں، میرے دوستو! . . . . نہیں، میرا کوئی دوست نہیں . . . . نہ آج تک کسی کو ایسا جنون ہوا ہوگا. نہ کسی کو ایسی اذیتیں اٹھانی پڑی ہوں گی . . . کیا حماقت ہے!

آہ! میں بڑی مصیبت میں ہوں، میں چیخ رہی ہوں، واقعی میں بڑی مصیبت میں ہوں، مگر مجھ سے تو انتہائی نفرت انگیز دل بھی نفرت کرتے ہیں اس لئے مجھے ہر بات کی اجازت ہے۔

بہرحال اب میں اپنے دل کی بات تو کہہ دوں۔ اسے بیس دفعہ دُہرانے سے تو چھوٹ جاؤں گی ـــ ویسے بھی میری بات ہر دفعہ ایسی ہی بے رنگ اور فضول ہوگی!

مَیں جہنمی دولہا کی باندی ہوں، وہی جس نے بہت سی ننگی دوشیزاؤں کو برباد کر دیا ہے۔ یہ وہی عفریت ہے۔ وُہ کوئی بھُوت پریت یا جن نہیں ہے اصل میں میں ہی عقل سے بیگانہ ہو گئی ہوں، مجھی پر خدا کی مار ہے، میں نے ہی جیتے جی اپنے آپ کو دفن کر لیا ہے ـــ کسی نے مجھے قتل تھوڑی کیا ہے! اب میں اُس کی باتیں تمہیں کیا بتاؤں! اب تو مجھ سے بولا بھی نہیں جاتا۔ میں رنج والم میں گرفتار ہوں، میں زار و قطار رو رہی ہے، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اے میرے آقا، مجھ پر نظرِ عنایت ہو، تو مجھے ذرا سی تازگی عطا فرما!

میں بیوہ ہوں .... ـــ میں بیوہ تھی .... ـــ مگر ہاں، ایک زمانے میں میں بڑی سنجیدہ تھی، اور میں اس لئے پیدا نہیں ہوئی کہ ہڈیوں کا ڈھیر بن کے رہ جاؤں! .... ـــ وُہ بالکل بچہ ہی سا تھا .... اُس کی پُراسرار لطافتوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میں اپنے سارے انسانی فرائض بھول گئی، اور اُس کے پیچھے پیچھے پھرنے لگی۔ کیا زندگی ہے! اصلی زندگی تو غائب ہے۔ ہم دُنیا میں ہی نہیں ہیں۔ جہاں وُہ جاتا ہے۔ وہیں میں بھی جاتی ہوں، مجبور ہوں۔ کبھی کبھی وُہ مجھ پر، مجھ پر، مجھ بچاری پر، بگڑ اُٹھتا ہے۔ بھُوت ہے بالکل! ـــ واقعی بھُوت ہے۔ آدمی تھوڑی ہے

وُہ کہتا ہے: "مجھے عورتیں پسند نہیں، محبت کو پھر سے ایجاد کرنا چاہئے۔ عورتیں تو بس اتنا چاہتی ہیں کہ کوئی اچھا سا ٹھکانا ہو جائے ٹھکانا مل جائے تو پھر دل اور حُسن سب کو طاق پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سرد مہری اور حقارت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ یہی آج کل شادیوں کی غذا ہے! پھر مجھے ایسی عورتیں نظر آتی ہیں۔ جن میں سچی مسرت کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ جنہیں میں اپنا رفیق بنا سکتا ہوں۔ مگر معقولیت پسند وحشی شروع ہی سے قصائیوں کی طرح اُن کا گلا ریتنے لگتے ہیں ...."

کبھی تو وُہ بے شرمی کی باتوں پر فخر کرتا ہے، کبھی سنگدلی کو حسین بنا دیتا ہے اور میں سُنتی رہتی ہوں: "میں ایک ایسی نسل سے ہوں جو دُور کے ملکوں میں بستی تھی۔ میرے آباؤ اجداد اسکینڈی نیویا کے تھے۔ وُہ اپنے پہلو میں خنجر بھونک لیتے تھے اور اپنا خُون پیا کرتے تھے ـــ میں اپنے جسم کو جگہ جگہ سے پھاڑ لوں گا، اپنے بدن کو گُدواؤں گا۔ میں منگولوں کی طرح بدصورت بننا چاہتا ہوں۔ تو دیکھے گی کہ میں سڑکوں پہ دھاڑتا پھروں گا، میں غُصّے کے مارے پاگل ہو جانا چاہتا ہوں۔ مجھے جواہرات کبھی نہ دکھانا، میں فرش پر لوٹ جاؤں گا۔ اپنے بدن کو توڑنے مروڑنے لگوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر میرے مال و دولت پر جگہ جگہ خون کے دھبے ہوں .... میں کبھی کوئی کام نہیں کروں گا" .... اکثر رات کے وقت اُس کا بھُوت میرے سر پر بھی سوار ہو جاتا۔ ہم لوٹتے لوٹتے پھرتے، اور میں اُس سے لڑتی جھگڑتی! ـــ رات کو نشے کی حالت میں وُہ مجھے ڈرانے کے لئے کہیں مکان میں یا سڑک پر جم کے کھڑا ہو جاتا ہے ـــ "لوگ مجھے ذبح کر دیں گے۔ یہ بڑی گندی بات ہوگی۔" وُہ دن بھی کیا ہوتے ہیں۔ جب وُہ ایسے بن بن کے چلتا ہے جیسے کوئی بڑا جرم کرنے جا رہا ہو!

کبھی کبھی وُہ بڑی پیاری، بھاتی زبان میں باتیں کرتا ہے ـــ موت کے بارے میں جو آدمی کو توبہ و استغفار پر مجبور کر دیتی ہے، اُن بدنصیبوں کے بارے میں جو واقعی ہماری دُنیا میں رہتے ہیں۔ پُرمشقت کاموں کے بارے میں، دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی جدائیوں کے بارے میں۔ اُن بھٹیوں پر ہم شراب پینے جاتے تھے وہاں وُہ پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ دیکھ کے رونے لگتا جنہیں افلاس نے جانور بنا رکھا تھا

وہ اندھیری سڑکوں پر پڑے ہوئے شرابیوں کو اُٹھاتا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہوتا جیسے کسی بدمزاج ماں کو چھوٹے چھوٹے بچوں پر رحم آجائے — وہ ایسی شائستگی سے چلتا جیسے کوئی چھوٹی سی لڑکی گرجا جا رہی ہو — وہ ایسے بنتا جیسے تجارت، فن، طب، ہر چیز اُسے آتی ہو — میں اُس کے پیچھے پیچھے پھرتی، بس مجبوراً۔

وہ تخیل ہی تخیل میں اپنے گرد جو تھیٹر کی سی سین سینریاں بناتا رہتا تھا۔ میں اُن سے واقف تھی — لبادے، چادریں، سازوسامان ان سب چیزوں سے میں اُسے زرہ بکتر بلکہ ایک نیا چہرہ بھی مہیا کر دیتی۔ اُس کا تعلق جس چیز سے بھی تھا، اور وہ ہر چیز کو اپنے لئے جس طرح ازسرِنو تخلیق کرنا چاہتا تھا۔ میں ان سب باتوں سے واقف تھی۔ تب وہ مجھے بے دل سا معلوم ہوتا تو چاہے وہ کیسے ہی اچھے یا بُرے پیچیدہ اور عجیب و غریب کام کیوں نہ کر رہا ہو، میں دور تک اُس کا ساتھ دیتی۔ مجھے یقین تھا کہ میں اُس کی دنیا میں کبھی بار نہیں پا سکتی۔ راتوں کو میں اُس کے سوتے ہوئے پیارے جسم کے برابر لیٹی گھنٹوں جاگتی رہی ہوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں کہ آخر وہ حقیقت سے اتنا کیوں بچنا چاہتا ہے۔ ایسی خواہش تو آج تک کسی آدمی کے دل میں بھی پیدا نہ ہوئی ہوگی۔ اُس کی طرف سے تو مجھے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ مگر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ معاشرہ کے لئے زبردست خطرہ بن سکتا ہے — شاید وہ زندگی کو بدلنے کے سربستہ رموز سے واقف ہے؟ پھر میں خود ہی جواب دیتی، نہیں، وہ تو صرف ان رموز کی تلاش میں ہے۔ مگر اُس کی رحم دلی بڑی سحر کُن ہے اور میں اُس کی اسیر ہوں۔ کسی اور روح میں یہ طاقت — مایوسی کی طاقت — نہیں ہوسکتی کہ اسے برداشت کرے۔ اُس کی سرپرستی اور اُس کی محبت کا بارِ گراں اُٹھائے۔ اس کے علاوہ میں نے اس کا جو تصور اپنے ذہن میں قائم کیا تھا۔ وہ کسی اور کی روح کے شایان نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آدمی اپنے ہی ہمزاد کو دیکھتا ہے۔ کسی اور کے ہمزاد کو نہیں۔ اُس کی روح کے اندر پہنچ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی ایسے محل میں جسے لوگ اس وجہ سے خالی کر گئے ہوں کہ مجھ سے زیادہ کم ظرف آدمی وہاں نظر ہی نہ آتا ہو۔ یہ ہے سارا قصہ۔ افسوس کہ میری زندگی اُس پر بہت زیادہ منحصر ہوکے رہ گئی تھی۔ مگر میری حقیر اور بے رنگ سی ہستی سے اُسے کیا لگاؤ تھا؟ اگر میں اُس کے ہاتھوں مری نہیں جا رہی تھی۔ تو میری حالت کچھ بہتر بھی نہیں ہو رہی تھی! بعض دفعہ میں چڑ کر اُس سے کہتی کہ میں تمہاری بات سمجھتی ہوں تو وہ کندھے جھٹک دیتا۔

چنانچہ مجھے بار بار غصہ آجاتا اور میں اپنے آپ کو بڑا آشفتہ حال محسوس کرنے لگتی۔ اگر میں اس لعنت میں گرفتار نہ ہوتی کہ کوئی میری طرف توجہ کرے گا ہی نہیں، تو جو لوگ مجھے دیکھتے، انہیں بھی میں ایسی ہی لگتی۔ مگر اس کے باوجود مجھے اُس کی نوازشوں کی طلب زیادہ ہی ہوتی گئی۔ اُس کے بوسوں اور پیہم آغوشیوں سے مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے جنت میں، کسی پُرسکون جنت میں پہنچ گئی ہوں اور جی چاہتا کہ چاہے اندھا، بہرا، گونگا، مفلس بن کے رہنا پڑے، مگر یہاں سے نہ جاؤں" — مجھے ان باتوں کی عادت پڑ گئی۔ سب مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہم دونوں دو اچھے بچے ہیں جنہیں افسردگی کی جنت میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے۔ ہماری اچھی پرگت ملتی تھی۔ (یا ہماری خوب گھٹتی تھی) ہمارے دل میں بڑے بڑے ولولے اُٹھتے، اور ہم مل کر کام کرتے۔ لیکن بڑی محبت سے مجھے پیار کرنے کے بعد وہ کہتا: "جب میں تیرے پاس نہیں ہوں گا تو جو باتیں اب تک ہوئی ہیں۔ وہ سب تجھے کیسی مضحکہ خیز معلوم ہوں گی۔ یعنی جب نہ تو تیری گردن میں میری باہیں ہوں گی۔ نہ تیرے آرام کرنے کے لئے میرا سینہ ہوگا، نہ میرے ہونٹ تیری آنکھوں پر ہوں گے۔ کیونکہ ایک نہ ایک دن مجھے کہیں دور چلے جانا پڑے گا۔ مجھے دوسروں کی بھی تو مدد

کرنی چاہیئے۔ یہ میرا فریضہ ہے۔ میری جان، چاہے مجھے اس کام میں مزہ آئے یا نہ آئے۔۔۔" فوراً میری آنکھوں کے سامنے یہ نقشہ کھنچ گیا کہ وُہ مجھ سے جدا ہو گیا ہے، اسے گھنی چڑھی ہوئی ہے اور وُہ اُس ہولناک ترین اندھیرے یعنی موت کے مُنہ میں گرنے والا ہے۔ میں نے اُس سے وعدہ لے لیا کہ وُہ مجھے چھوڑ کے نہیں جائے گا۔ اُس نے یہ عاشقوں کا سا وعدہ بیسیوں دفعہ کیا ہے۔ مگر یہ وعدہ بھی ایسا ہی مضحکہ خیز نکلا جیسے میں اُس سے کہوں کہ میں تیری باتیں سمجھتی ہوں۔

میں نے کبھی اُس سے حسد نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ وُہ مجھے چھوڑ کے نہیں جائے گا۔ اب کیا ہونا ہے؟ اُسے کسی چیز کا علم نہیں، کام وُہ کبھی کر کے نہیں دے گا۔ وُہ تو اس طرح زندگی بسر کرنا چاہتا ہے جیسے کوئی سوتے میں چل رہا ہو۔ کیا صرف اپنی نیک مزاجی اور رحم دلی کے بل پر اُسے حقیقی دُنیا میں رہنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے؟ بعض دفعہ میں بالکل بھول جاتی ہوں کہ میری کیا گت بن گئی ہے۔ وُہ مجھے طاقت دے گا۔ ہم دونوں سفر کریں گے، ریگستانوں میں شکار کھیلیں گے۔ نامعلوم شہروں کی پٹریوں پر سوئیں گے، نہ کوئی فکر ہوگی نہ دُکھ۔ جب میں میری آنکھ کھلے گی تو اُس کی ساحرانہ طاقت کے طفیل قانون اور رسم و رواج بدل گئے ہوں گے، یا پھر دُنیا ویسی کی ویسی ہی ہوگی۔ مگر مجھ سے میری خواہشوں، میری مسرتوں اور میری بے فکریوں پر کوئی باز پُرس نہیں کریگی۔ میں نے اپنے دکھ اُٹھائے ہیں کہ اُن کے بدلے میں کیا تو مجھے وُہ عجیب و غریب زندگی بخش دے گا جو بچوں کی کتابوں میں بستی ہے؟ وُہ یہ نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کا نصب العین معلوم نہیں۔ اُس نے مجھے بتایا ہے کہ اُس کے دل میں کچھ پشیمانیاں ہیں، کچھ اُمیدیں ہیں، مگر اُن کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ کیا اُسے خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہے؟ شاید مجھے خدا ہی سے رجوع کرنا چاہیئے۔ مگر میں بالکل تحت الثریٰ میں جا پہنچی ہوں اور مجھ سے دُعا بھی نہیں مانگی جاتی۔

اگر وُہ مجھ سے اپنے رنج و غم بیان کرے تو کیا میں اُنہیں اُس کی ٹھٹول بازی سے کچھ زیادہ سمجھ لوں گی؟ وُہ مجھ پر حملہ کرتا ہے۔ دنیا میں جس کسی بات سے بھی میرا تعلق ہے، اُن سب پر مجھے گھنٹوں شرم دلاتا رہتا ہے۔ اگر میں روؤں تو بگڑ بیٹھتا ہے۔

ـــ "تُو نے دیکھا، اُس خوبصورت اور پُرسکون مکان میں ایک جامہ زیب اور خوش قرینہ نوجوان داخل ہوتا ہے؟ اُس کا نام دیووال دیوفوَر، آرمان، مورِس یا نہ جانے کیا ہے۔ ایک عورت اس ظالم اور احمق آدمی کے دامِ عشق میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اب وُہ مر چکی ہے اور جنت میں اُسے یقیناً ولیہ کا مرتبہ حاصل ہوا ہوگا۔ جیسے اس شخص نے اس عورت کو مارا ہے۔ اسی طرح تُو مجھے مار ڈالے گی۔ ہم گداز طبیعت لوگوں کی قسمت ہی میں یہ لکھا ہے۔۔۔" ہائے! بعض دن ایسے آتے کہ جو آدمی کسی نہ کسی قسم کا کام کرتے ہوں۔ وُہ اُسے کسی خوفناک دیوانگی کے شکار معلوم ہوتے اور وُہ بڑی دیر دیر تک ایسے زور زور سے ہنستا کہ ڈر لگنے لگتا ـــ اس کے بعد اُس کا انداز پھر نوجوان ماں یا بڑی بہن کا سا ہو جاتا اگر وُہ اتنا وحشی نہ ہوتا تو ہم بچ نکلتے! مگر اُس کی نرمی بھی تو اتنی ہی مہلک ہے۔ میں اُس کی باندی بن کے رہ گئی ہوں ـــ میں تو بالکل پگلی ہوں!

شاید ایک نہ ایک دن وُہ کسی عجیب و غریب طریقے سے غائب ہو جائے گا۔ لیکن اگر اُسے دوبارہ آسمان پر ہی واپس جانا ہے تو مجھے معلوم ضرور ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ میں کم سے کم یہ تو دیکھ لوں کہ میرے پیارے دوست کو خدا نے آسمان پر اُٹھا لیا!"

دُولہا دلہن کا یہ جوڑا بھی بڑا ہی عجیب ہے!

اس نظم میں ایک بہت بڑی صنعت نظر آتی ہے جو آپ نے بھی محسوس کر لی ہوگی یعنی معروضیت، دوسروں کے بارے میں آدمی معروضیت برت سکتا ہے، غیر جانبداری سے کام لے سکتا ہے۔ لیکن اپنے بارے میں، اپنے تجربات کے بارے میں ایسا معروضی رویّہ اختیار کرنا صرف ایک بڑے فن کار ہی سے ممکن ہے۔ راں بو نے اپنی تصویر کھینچتے ہوئے کسی قسم کی رعایت یا جذباتیت ملحوظ نہیں رکھی بلکہ اپنی شخصیت کے ہر پہلو کو پوری ایمانداری سے پیش کر دیا ہے۔ اچھا پہلو یہ ہے کہ اس کے عزائم بہت بلند رہے ہیں۔ وہ زندگی کو بدلنے اور اسے بہتر بنانے کا نسخہ ڈھونڈ رہا ہے۔ اس کوشش میں اسے بہت سی نازیبا حرکتیں کرنی پڑتی ہیں۔ اپنے دوستوں سے برا سلوک کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو وہ بالکل وحشی بن جاتا ہے۔ راں بو نے ان سب باتوں کو تسلیم کیا ہے۔ اس نے تو یہاں تک اعتراف کر لیا ہے کہ سماج میں رہنے کا حق محض نیک دلی یا نیک نیتی کے صلے میں نہیں مل سکتا۔ بلکہ خارجی افعال میں بھی چند قاعدوں کا پابند ہونا ضروری ہے۔ یعنی راں بو سرمست تو ہے مگر اس حد تک نہیں کہ اپنے آپ کو تنقیدی نظر سے نہ دیکھ سکے۔ یا اپنا محاسبہ نہ کر سکے۔ اگر شاعر سچا "عارف" ہے تو سب سے پہلے تو اسے اپنے آپ سے واقف ہونا چاہیئے۔ راں بو نے اس نظم میں یہ کوشش نہیں کی کہ آپ اسے اچھا ہی سمجھیں یا برا ہی سمجھیں۔ اس نے اپنے کردار کو ایسے پہلو دار طریقے سے پیش کیا ہے کہ آپ کو اس سے وحشت بھی ہوتی ہے۔ ڈر بھی لگتا ہے۔ اس پر ہنسی بھی آتی ہے۔ رحم بھی آتا ہے اور کچھ عقیدت بھی پیدا ہونے لگتی ہے۔

دوسرا اہم عنصر اس نظم میں تجربا تیت کا نظر آتا ہے یعنی شاعر حقیقت کی تلاش میں نکلا ہے تو وہ اپنے اوپر تجربے کرنے سے بھی نہیں جھجکتا۔ وہ اچھائی برائی دونوں کو آزماتا ہے اور اس کوشش میں جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی اذیت اٹھاتا ہے۔ تجربہ کر چکنے کے بعد وہ اپنے گزشتہ دکھ درد کا کوئی لحاظ نہیں کرتا۔ بڑی صفائی سے نتیجے کا اعلان کر دیتا ہے جو درحقیقت اعترافِ شکست ہے۔ راں بو اور ورلین دونوں اس تلاش میں نکلے تھے کہ سچی مسرت کا راز معلوم کریں۔ زمانے کے مروجہ تصورات نے انہیں بتایا کہ اخلاقیات، مذہب ہر چیز سے آزاد ہو کر مسرت مل سکتی۔ یہ نسخہ آزمایا تو انہیں پتا چلا کہ اس طرح تو زندگی مسلسل عذاب بن کے رہ گئی۔ چنانچہ راں بو کی اس نظم کا مقصد فتح مندی کا جشن منانا نہیں ہے۔ بلکہ شکست کا اعتراف کرنا، اور یہ سوچنا کہ ہم ہارے کیوں۔ اس جد و جہد کی ساری تفصیلات تو راں بو کی پوری نظم میں ملیں گی اس حصے میں تو صرف اس کشمکش کا ایک رُخ پیش ہوا ہے۔ نظم میں آگے چل کر اثباتی رنگ پیدا ہوتا ہے اور ہمیں پتا چلتا ہے کہ آزاد جبلتوں کے دوزخ سے نکلنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ مذہب کی قسم کے کسی ہمہ گیر تصور کو قبول کیا جائے جس سے ہماری اندرونی زندگی میں ترتیب اور نظم آ سکے۔

میں کوشش کروں گا کہ اس عظیم الشان نظم کے اور حصے بھی تشریح کے ساتھ پیش کر دوں لیکن سب سے بڑی مشکل ترجمے کی ہے۔ یہ حصہ تو نسبتہً سیدھا سادھا تھا۔ بعض حصے ایسے ہیں جن کا لفظی ترجمہ تو آسان ہے، مگر معنی خیز ترجمہ اردو میں ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔

صفیہ شمیم ملیح آبادی

دوسرا رُخ

ماضی کے داغ دل سے مٹاتے بھی دیکھئے
آ کر کسی کو اشک بہاتے بھی دیکھئے

جن حسرتوں کے ناز اُٹھاتی تھی زندگی
اُن حسرتوں کی لاش اُٹھاتے بھی دیکھئے

تھی رہبری نصیب جسے آپ کی کبھی
ظُلمت میں اُس کو ٹھوکریں کھاتے بھی دیکھئے

جشن و طرب میں جس کے گزرتے تھے روز و شب
خلوت میں اس کو اشک بہاتے بھی دیکھئے

پھولوں سے بے نیاز رہا جو بہار میں
کانٹوں کے اس کو ناز اُٹھاتے بھی دیکھئے

مایوس ہو کے کشمکشِ روزگار سے
دامن مسرّتوں سے چھڑاتے بھی دیکھئے

بخشی تھی جس کو دولتِ کونین آپ نے
اب آ کے اُس کو خاک اُڑاتے بھی دیکھئے

جس کا جنوں تھا حاصلِ ادراک اب اُسے
اہلِ خرد کے ناز اُٹھاتے بھی دیکھئے

جعفر طاہر

غزل

کون جُز اہلِ نظر ہے جو وہاں تک پہنچے
جان پر کھیل کے اُس دشمنِ جاں تک پہنچے

دیکھ یہ فیضِ جنوں دیکھ کہ ہم سُست خرام
گھر سے نکلے تو حدِ کون و مکاں تک پہنچے

پھر کبھی عقدۂ کونین کا حل سوچیں گے
دیکھ اُس زلف کے پیچاک کہاں تک پہنچے

ہر گُل و لالہ کی تقدیر میں یہ اوج کہاں
پُھول دو چار ہی دستارِ بتاں تک پہنچے

یُوں سجا گلشنِ ہستی کہ مہینوں پہلے
غلغلہ تیری بہاروں کا خزاں تک پہنچے

آنکھ پر فرض کہ موسم کا اشارا سمجھے
دل پہ واجب کہ درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

مٹ گیا نام و نشاں جن کا رہِ اُلفت میں
کچھ وُہی مرتبۂ نام و نشاں تک پہنچے

شاعرِ شہرِ وفا ہوں مرے رنگیں افکار
نغمہ و شعر بنے، حُسنِ جواں تک پہنچے

حکم یہ بھی دلِ گمراہ کا مانا طاہر
خدمتِ ہادئ صاحب نظراں تک پہنچے

ونگ کمانڈر سیّد فیاض محمود

میرے افسانے

میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "رنگ و بو" ۱۹۳۹ء میں طبع ہوا۔ جہاں تک مجھے علم ہے "رنگ و بو" کا دائرۂ مقبولیت محدود تھا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ اوّل یہ کہ ہماری پبلک کے سامنے "افسانہ" ابھی کسی معیّن شکل میں موجود نہ تھا۔ اکثر لوگ افسانے کو "ایک مختصر افسانہ" کہنا زیادہ مناسب خیال کرتے تھے۔ اختصار پر زور تھا۔ مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک طویل قصّے، چھوٹے ناول اور لمبے افسانے میں جو بیس یا تیس صفحوں پر مشتمل ہو، کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔ افسانے میں پلاٹ کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا اور چونکہ پلاٹ سے واقعات کا بتدریج اور مدلّل ارتقا مراد لیا جاتا، اس لئے افسانے کا ڈھانچ تیار کرنا، افسانہ نگار کے لئے ضروری سمجھ لیا جاتا۔ افسانے کا آغاز اور انجام لابدی چیزیں تھیں۔ کردار کی پیش کاری، موضوع کی ترتیب اور گفتگو کا رکھ رکھاؤ، زبان کی چستی، چاشنی، محاورہ، استعاروں اور دیگر صنائع بدائع کا استعمال افسانے کے دیگر لوازم تھے۔ افسانہ کیا تھا ایک چھوٹا سا ادبی جلوس تھا۔ ناول اور افسانے میں فرق اسی بات کا تھا کہ ناول ذرا لمبا ہوتا اور افسانہ چھوٹا۔ ورنہ افسانے کو ناول کی اولاد سمجھ کر اس میں کسی ذاتی خصوصیت کی موجودگی کو ضروری نہیں قرار دیا جاتا تھا۔

اس نقطۂ نظر کو تقویت اس امر سے بھی پہنچی کہ پریم چند جیسے جادو نگار ادیب مذکورۂ بالا قسم کے افسانے لکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پریم چند کا افسانہ اگرچہ واقعیت پر مبنی ہوتا اور کردار کی تخلیق میں سچائی، اور طرزِ گفتگو میں بے تکلفی ہوتی، مگر اس کے افسانوں کی بنیاد "ایک واقعہ" ہی پر ہوتی اور چونکہ "واقعہ پرست" افسانہ نگار کو دوسری طرز کے افسانہ نگاروں پر اس بات میں فوقیت ہوتی ہے۔ کہ واقعے میں ایک ٹھوس، مرئی، اور محسوس سی چیز ہوتی ہے، اس لئے پڑھنے والے کو ایک قسم کی "تسلی" ہوتی ہے کہ افسانہ میں جان ہے۔ یہ ایک خاص مقام سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی اٹھان ایک جانے پہچانے اصول پر ہوتی ہے اور اس کا انجام منطق اور عقل کے اصولوں پر ہوتا ہے۔ لہٰذا پبلک میں ایسے افسانے مقبول رہے اور دوسری طرز کے افسانوں کو مہمل اور بے ربط قرار دے دیا گیا۔ اس لئے بھی کہ دوسری قسم کے افسانوں میں پڑھنے والے کے تخیّل کو کچھ کام سا لگتا ہے اور جو "اشارہ" افسانے میں پنہاں ہوتا ہے۔ اس کی تجسیم اور تشکیل اور خانہ پری پڑھنے والے کو خود کرنی پڑتی ہے۔ اس ذہنی تکلیف کے باعث پڑھنے والے پر "بوجھ" پڑتا ہے۔ جس کا جواب بعض پڑھنے والے یہ کہہ کر دے دیتے ہیں کہ افسانہ نہیں "خاکا" ہے۔ حالانکہ آرٹ کی ہر اچھی مثال سمجھنے کے لئے اگر ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں تو "توجہ" کی ضرورت لازمی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری کو اکثر لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ اس میں بنے بنائے اور مانوس طریقہ ہائے اظہار سے اکثر گریز کیا جاتا ہے اور نئی یا اچھوتی بندش، ترکیب یا تشبیہ سے بیان میں مدد لی جاتی ہے۔

دراصل "افسانے" کی تاریخ میں یہ دَور ہر ملک میں گزرا ہے۔ اوّل اوّل ہر جگہ "ٹھوس" اور "واقعی" افسانے ہی لکھے گئے۔ بیشتر اس لئے کہ لکھنے والے ناول نگار تھے جو فرصت کے اوقات میں افسانے گھسیٹ دیتے تھے اس لئے عادۃً افسانے کو "مختصر ناول" کی شکل دینی پڑ جاتی۔ چنانچہ

امریکہ میں او ہنری، بریٹ ہارٹ اور ایمبروس بیرس، انگلستان میں سٹیونسن، ٹامس ہارڈی اور بعد میں گالزوردی کے افسانے، روس میں پشکن ٹالسٹائے، السیکو اور ترجینیف، فرانس میں پراسپر میریمی، ڈوڈے اور بطل زمن ماپساں بھی "واقعہ" ہی کو افسانے کی ساخت کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ ایک واقعہ، ایک سانحہ، کسی واقعے کا ایک پہلو، کسی کردار کا ایک ایسا منظر جو کسی واقعے سے تعلق رکھتا ہو، یہی وہ ادبی اصول تھا جو افسانے کی ساخت، ہیئت اور شکل کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ غالباً افسانے کی ارتقا کے لئے یہ ضروری تھا۔

افسانے کی صحیح تشکیل یعنی اس کی حیثیت بالذات چیخوف کے افسانوں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ پہلا افسانہ نگار ہے جس نے افسانے کی بساط کو توسیع دیتے ہوئے اپنے افسانوں کے ذریعے سے دُنیائے ادب پر یہ ثابت کیا کہ افسانے کے لئے کسی "ٹھوس" واقعے کی ضرورت نہیں۔ اس میں تدریجی پلاٹ کی جگہ نہیں۔ اس کے پھیلاؤ اور جامعیت کے لئے کسی اور رمز کی ضرورت ہے۔ اس کے نزدیک افسانہ کسی معنی خیز لمحہ حیات کا جذباتی ادراک ہے۔ اس لمحے میں اتنی گہرائی، اتنی دمک اور اتنے معنی ہونے چاہئیں کہ وہ اپنی مختصر سی مدت میں زندگی کی گوناگوں کیفیات کی عکاسی کرے اور وسیع سے وسیع اور عمیق سے عمیق معانی کا حامل ہو سکے۔ زندگی کے گریزپا اور سریع التبیر تاثرات، احساسات کے تنوع اور متبدل امکانات جو "سطحیت" یا رکاکت سے پاک ہوں، بعض دفعہ ایک ایسے جذباتی نقطے کے گرد مرکوز ہو جاتے ہیں جو بظاہر ایک تیز رو لمحے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا آغاز کس لفظ، شخص، جذبہ یا واقعیت سے ہوا۔ کیونکہ بیشتر ایسے لمحوں کا آغاز انسان کے تحت الشعور کی آماجگاہ میں ہوتا ہے۔ یہ نقطے سطح زندگی پر اُبھرتے ہیں اور اپنی تابانی سے زندگی کو درخشاں، پُرمعنی، حسین، گداز یا پُرکیف بنا کر پھر زیرِ شعور گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ زندگی کے ان پُرمعنی لمحات کے جذباتی ادراک اور ان کی حسین تشکیل کا نام ادب یا آرٹ ہے اور اُن کے لئے ظاہری یعنی جسمانی پھیلاؤ کی ضرورت نہیں۔ کسی تاثر کی جامعیت یا اس کے عمق کا انحصار، اس کی خارجی تفصیلات پر نہیں ہو سکتا۔ اچھے شعر، اچھی تصویر یا اچھے راگ کی پہچان یہ نہیں کہ وہ باقاعدہ یا بااصول آغاز سے ترتیب دیا جائے۔ کسی مصور سے یہ پوچھنا کہ تیری تصویر کے دائیں بائیں کیا چیزیں ہیں یا اس بات کی تحقیق کہ فلاں شعر کو لکھتے وقت شاعر کرسی پر بیٹھا تھا یا چارپائی پر آرام کر رہا تھا۔ ایسے سوال تو اُس زمانۂ فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب ہر تصویر کے پس پُشت کوئی کہانی، کوئی خیال یا کوئی سبق موجود ہوتا تھا

"افسانہ" کا آغاز حیاتِ انسانی ہے۔ اس کا انجام انسان کی بے بضاعت یا باوجاہت، حقیر یا وقیع، گرم یا سرد، مسرور یا مغموم زندگی ہے۔ افسانے کا موضوع زندگی کی مسلسل حرکت ہے۔ وہ حرکت جو اٹل ہے جو تھم نہیں سکتی، جس کی وجہ سے حُسن قائم نہیں رہ سکتا، مسرت کو بقا نہیں، حزن ایک قابلِ مضحکہ چیز ہے اور انسان ایک متحرک ذرہ جو اپنے اندر شدید طوفان کا جوہر رکھتا ہے۔ اس حرکت میں کسی واقعے کو تھام کر اسے زمانی اور مکانی جزئیات کی کیلوں سے معاشرتی بساط پر جڑ دینا، اعلیٰ ادب یا فن پیدا کر دینے کے مترادف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعر کی دُنیا میں جدید شاعری نے قدم بڑھایا۔ ناول نے جیمز جوائس، مارسل پروسٹ، ورجینا ولف جیسے لوگ پیدا کئے اور ڈرامے میں چیخوف، پراں ڈیلو، اور یوجین اونیل جیسے افراد نے مقبولیت حاصل کی۔ ان سب کے ادبی شاہپاروں میں حرکت، تسلسل، سرعت، بے فنا اور بقا کی باہمی آویزش جیسے نکات بیّن طور پر پائے جاتے ہیں۔ یوجین اونیل جو واقعے سے انحراف نہیں کرتا اور جو جذباتی نقطے کو مرکزی حیثیت نہیں

دیتا۔ وُہ بھی اپنی جذباتی وحدت کو واقعے کا روپ دے دیتا ہے۔ اس کے ڈراموں کو پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں مختصر افسانے کی سی چبھن اور شدّتِ احساس موجود ہے۔

دراصل افسانہ شروڈ اینڈرسن، کیتھرائن مینسفیلڈ، ایچ۔ای بیٹس، ہیمنگوے، او مونیپر، ہگامرگی اور دیگر بیسویں صدی کے اعلیٰ افسانہ نگاروں کے ہاتھوں شدّت، مرکزی اختصار اور جذباتی وحدت کی طرف بڑھتا گیا اور اس بات میں وُہ شعر کے بہت نزدیک ہوگیا ہے۔ اس میں غنائیت بڑھ گئی ہے۔ اس لئے صحیح قسم کے افسانوں کو پڑھ کر دل و دماغ میں ایک گونج سی پیدا ہو جاتی ہے جو اچھے شعر کی طرح، دیر تک ذہن کے پردوں کو مرتعش رکھتی ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے افسانے کس حد تک اس اصول کے پابند ہیں۔ وُہ افسانے یا ڈرامے جو میں اپنی ادبی زندگی کے اوائل میں لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے اکثر میں "واقعے" کا وجود کم ہے اور شدت اور جذباتی وحدت زیادہ۔ ان کی ساخت بھی کسی معیّنہ اصول کی پابند نہیں۔ وُہ بھی کسی مقررہ وقت اور مقررہ مقام سے شروع نہیں ہوتے اور ان میں زندگی کا کوئی بنا بنایا حل نہیں دکھایا گیا۔ اسی لئے بہت سے ادیبوں اور بیشتر پڑھنے والوں نے بجا طور پر یہ اعتراض کیا تھا کہ انہیں افسانے نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ آج سے کئی سال پہلے کالج میں میرے ایک شاگرد نے کچھ انکسار اور کچھ بیزاری کے ساتھ مجھ سے سوال کیا "پروفیسر صاحب آپ افسانے تو لکھتے ہیں مگر ہمیں اُن کی افسانویت بعض دفعہ دکھائی نہیں دیتی؟" میں ہنس دیا۔ میں نے کہا "برخوردار! تمہیں جس چیز کی تلاش ہے۔ وُہ ان افسانوں میں شاید نہیں"۔ دراصل میں نے زندگی کو کبھی بنی بنائی معجون کی شکل میں پیش نہیں کیا۔ زندگی کے تیز و تند، نرم اور سجل، ترش اور شیریں، تاثرات ہی نے مجھ سے یہ افسانے اور ڈرامے لکھوائے اور چونکہ میں "واقعہ" کی ٹھوس اور جسمانی ثقالت کا کبھی قائل نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اپنے افسانوں کو گریز پا رہنے دیا۔ غالباً بہار کو محسوس کرنے کے لئے ایک سجی سجائی پھولوں کی کیاری دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ سیر کرتے ہوئے اچانک خوشبو کا ایک جھونکا ہی بتا سکتا ہے کہ بہار اپنی رنگینیوں سمیت اُمنڈ آئی ہے۔

واقعے کی تلاش اچھے اچھے لوگوں کو پریشان کر دیتی ہے اور چونکہ میرے افسانوں اور ڈراموں میں "واقعے" کی جگہ "جذبے" کی ناگزیر حقیقت ملتی ہے۔ اسی لئے بہت سے لوگ بھول میں پڑ جاتے ہیں۔ مدت ہوئی۔ میاں بشیر احمد مدظلہٗ نے جو آج کل ٹرکی میں پاکستانی سفیر بن کر گئے ہیں۔ اپنے ہاں پنجاب کے ادیبوں کی مجلس رچائی۔ تقریب شاید انجمن ترقی اردو پنجاب کا انعقاد تھی۔ اس مجلس میں بہت سے نامور ادیب موجود تھے۔ دوسرے شرفا بھی کافی تعداد میں شریک ہوئے بہت سی چیزیں پڑھی گئیں۔ میں نے اپنا ڈراما "ایوب کی شادی" پڑھ کر سنایا۔ محفل برخاست ہوئی تو ایک صاحب جو کسی فنونِ لطیفہ کی ایسوسی ایشن کے سیکرٹری تھے۔ میری طرف بڑھے اور بڑے تپاک سے مصافحہ کر کے پوچھنے لگے۔ "آپ کب اس ڈرامے کو مکمل کریں گے"؟ میں حیران ہوا۔ میری حیرت کو اُنہوں نے شاید "موٹی سمجھ" پر محمول کیا۔ مربیانہ انداز میں فرمانے لگے "میرا مطلب یہ ہے کہ جب اس کے باقی "ایکٹ" آپ لکھ لیں تو ہمیں دیجئے۔ ہم اس کو "سٹیج" کروائیں گے"۔ اب میں سمجھا کہ یہ حضرت اس ایک ایکٹ کے ڈرامے کو کسی بڑے ڈرامے کا بابِ اوّل سمجھ رہے ہیں اور ان کے نزدیک یہ نامکمل ہے!

کئی اور نقاد میری زبان "یعنی میری" افسانوی زبان کی خامیوں کو نظر انداز نہیں کر سکے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرے افسانوں کی زُبان،

ٹکسالی زبان نہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں غالباً ٹکسالی زبان لکھ نہیں سکتا۔ دوسری یہ کہ زبان کی فصاحت یا محاورہ کی خوبی یا تراکیب کا حُسن یا عبارت کی دلکشی میرے نزدیک افسانے کی تعمیر میں نہ صرف غیر ضروری ہیں بلکہ قطعی طور پر نقصان دہ! یہ میں اپنی زبان کی خامیوں کے جواز کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ صرف ایک اصولی بات پیش کر رہا ہوں۔ زبان کی خوبی افسانے کے حُسن کو بڑھا دیتی ہے۔ مثلاً میرے دوست کرشن چندر کی افسانوی زبان میرے نزدیک قابلِ رشک ہے۔ مگر وہ افسانے کے "مجموعی اثر" کے لئے لازمی نہیں اور پریم چند کی سی زبان جو استعاروں اور تشبیہوں کو افسانوی فضا کی مدد نہیں بناتی۔ بلکہ ان کی الگ حیثیت قرار دے دیتی ہے قطعی طور پر فن کے منافی ہے۔ اگر افسانوی زبان بذاتہٖ ایسی دلکش ہے کہ اس کو پڑھ کر پڑھنے والے کی زبان چٹخارے لینے لگے تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ زبان قاری کی توجہ "افسانوی زندگی" سے ہٹا لیتی ہے۔ اگر زبان ایسی ہو کہ اس کی رنگینی بالقصد ہو یعنی اس کے استعارے یا تراکیب کسی کردار کے ذہن کی عکاسی کریں، یا کسی واقعہ کی ساخت یا "جان" کو اُجاگر کریں تو اُن کی حیثیت جائز ہے۔ ورنہ لسانی خوبی بجائے خود افسانے کے اثر میں حارج ہوتی ہے اور افسانے کی ترکیب ایسے نازک عناصر سے ہوتی ہے کہ اس میں حشو و زوائد کی مطلق گنجائش نہیں، خواہ وہ جذباتی نمائش ہو یا لفظی گلکاری! اگر کوئی لفظ افسانے کی تعمیر، اس کے ارتقا یا تاثر کی تکمیل میں مدد دیتا ہے تو خواہ وہ کتنا ہی بھڑکیلا ہو، جائز ہے بصورتِ دیگر معمولی سے معمولی، بے ضرر سے بے ضرر لفظ بھی غلط اور مکروہ بن سکتا ہے۔ اگر اس کے ضروری ہونے میں کوئی شک ہو۔ اسی لئے دنیائے ادب کے اعلیٰ افسانہ نگاروں کے ہاں یہ قاعدہ ہے کہ زبان بحیثیت زبان افسانے کی ساخت میں کوئی جگہ نہیں رکھتی۔ وہ اظہار کا ایک ذریعہ ہے اس کا حُسن اُسی حد تک جائز ہے۔ جس حد تک وہ نفسیاتی طور پر افسانے کی تخلیق یا کردار کے اظہارِ مطلب میں مدد دے۔ لیکن اس اصول کے بیان سے مجھے اپنی کوتاہیوں کی پردہ پوشی مقصود نہیں۔

دوسرے اعتراض کا جو اکثر لوگوں کی زبانی سُننے میں آیا ہے جواب میں کسی حد تک اوپر دے چکا ہوں۔ اس ضمن میں ایک بات کہی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض افسانوں میں احساس کی شدت غنائیت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ میری ایک کہانی سُن کر ایک عزیز اور محترم دوست جو گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب کے ایک اور مشہور اور قابل پروفیسر ہیں، کہنے لگے کہ یہ تو غزل ہے! میں نے عرض کی کہ اگر ایک تاثر کا اظہار کوئی شخص غزل یا نظم میں کر دیتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس قسم کا اظہار نثر میں نہیں کرنا چاہئے۔ لازماً دونوں اظہار الگ نوعیت رکھتے ہیں۔ مگر افسانہ بعض دفعہ اپنی شدتِ اظہار میں نظم سے مماثلت اس طرح رکھتا ہے کہ نظم بھی زندگی کے سرعت سے گزرنے والے تاثرات کا حسین اور شدید اظہار ہے۔ اگر کوئی تاثر اپنے اندر حُسن اور شدت رکھتا ہے۔ تو اُس کے لئے افسانے کی شکل اختیار کر لینا ممنوعات میں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں غزل اور افسانے یا نظم اور افسانے کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں رہ سکتی۔ میرا جواب یہ ہے کہ نہ رہے! اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر سند مطلوب ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادبی اصناف کی سند ان کا کامیاب اظہار اور فنی کمال ہے۔ ممکن ہے کہ افسانے کے ڈانڈے جلد ہی شعر سے مل جائیں۔ مگر ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ اس سے افسانوں کی تعمیر اور ساخت یا فنی حیثیت میں کمی نہیں آئے گی۔

ایک اور اعتراض کا جواب دینا باقی ہے۔ وہ شدتِ احساس سے تعلق رکھتا ہے۔ کوئی بیس سال کا عرصہ ہوا۔ میں نے ایک افسانہ لکھا جو بعد میں "دو خط" کے عنوان سے اوّل ہمایوں میں چھپا اور کئی برس بعد "رنگ و بو" میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ پڑھنے کے بعد سید عبدالقادر صاحب جو اسلامیہ کالج لاہور میں تاریخ کے پروفیسر اور میرے رفیقِ کار تھے، مجھ سے ازراہِ تمسخر پوچھنے لگے "آپ نے اب اپنے خط بھی چھاپنے شروع کر دیئے"۔ مجھے تعجب ہوا۔ یہی حیرت

اس واقعے کے بیس سال بعد ہوئی۔ جب میرا ایک افسانہ حال ہی میں حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک محفل میں پڑھا گیا۔ اس پر بھی غالباً کسی ظریف نے یہی پھبتی کسی۔ ان دو باتوں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب میں ذاتی جذبات یا تاثرات کا کہاں تک دخل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ "ذاتی" اور "نجی" تاثرات میں تمیز کروں۔ نجی حالات یا جذبات کی فن یا ادب میں کوئی جگہ نہیں۔ "وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے" کو نجی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ کئی خوش قسمت نوجوانوں کے لئے ایسے مواقع جنتِ نگاہ کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر اس کی "جزئی" تفصیل اور مو شگافی اس وقت تک فنّی اعتبار سے قبول نہیں کی جا سکتی۔ جب تک "وسعت اور پیمائی" میں ان "جزئیات" کا اطلاق عام مخلوق پر نہ ہو سکے۔ ادب یا فن کے محرکات جذباتِ انسانی ہیں اور "اظہار" براہِ راست شدتِ احساس پر مبنی ہے۔ یہ ابھی تک نفسیات کے ماہروں نے بھی قطعی طور پر دریافت نہیں کیا کہ فن یا ادب کے ماخذ کیا ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ بعض دفعہ شدید سے شدید واقعہ یا جذبہ اظہار پر آمادہ نہیں کر سکتا اور بعض دفعہ ایک چھپتا ہوا تاثر ایسا ذہنی ہیجان پیدا کر دیتا ہے کہ خود لکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ذاتی احساسات ہی ادب کا سرمایہ ہیں۔ مگر بجائے خود وُہ ادب کا ماخذ نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ البتہ وہ ہیجانات میں ضرور شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ورنہ خلا میں اظہار کے محل قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر یہ کہ ادیب یا فن کار ہر دفعہ اپنی بیتی ہی سُناتا ہے۔ ایک ایسی غلط فہمی اور ادب کے متعلق ایسا بھونڈا اور مبتدیانہ خیال ہے کہ اس کا جواب دینا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

میری اوّلیں دور کی کہانیوں کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ وُہ گھریلو زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ بعض مہربان تو یہ بھی کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے کہ کہانی وانی تو ہوتی نہیں اپنے ہی واقعات درج کر دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ "گھر" کا ماحول اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ جن اقدار سے میں ان دنوں متعلق تھا یا جن اقدار کا اظہار میں ان دنوں کرنا چاہتا تھا۔ ان کے بیان کے لئے وُہ ماحول زیادہ سازگار معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کے معمولات میں جو طنز اور ٹریجیڈی پنہاں ہوتی ہے۔ اس کا اظہار میرے پہلے افسانوں کا موضوع تھا۔ اگر ان میں واقعیت اِس حد تک جلوہ گر تھی کہ وُہ مجھی سے منسوب کئے جاتے تھے تو اسے میں اپنی تعریف سمجھ کر خوش ہو سکتا تھا اور اگرچہ ایک فن کار ہونے کی حیثیت سے خود پسندی میرے ضمیر میں بھی موجود ہے۔ لیکن میں ایسی تنقید سے کبھی خوش نہیں ہوا۔ ادب واقعی ادیب کے ذہن اور تجربے کی پیداوار ہے، مگر اس میں غیر شعوری عناصر کس شرح اور حد اور مقدار میں شامل ہیں۔ اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ اس کا ثبوت خود میرے پاس یہ ہے کہ افسانہ شروع کرتے وقت شاذ ہی مجھے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انجام کس طرح ہوگا اور کسی نے آج تک یہ نہیں کہا کہ میرے افسانوں کے انجام "بے معنی" ہوتے ہیں۔

سیّد فیاض محمود

افسانہ کیا ہے

(بُرڈس پیٹی سن)

چونکہ مختصر افسانہ نویسی کا فن ابھی نیا اور نامکمل ہے، اس لئے افسانے کی کوئی واضح اور قطعی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنا شاید درست ہو کہ افسانہ وہی کچھ بن جائے گا جو آپ اُسے بنانا چاہیں گے۔ افسانہ کیا ہے، فقط صنّاع کی شخصیت کا اظہار۔ صنّاع غیر ارادی طور پر زندگی کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھنا سیکھتا ہے اور لوگوں کے بارے میں اور زندگی کے تجربوں کے متعلق ایک خاص اندازِ نظر اختیار کرتا ہے۔ اسی کو وُہ اپنے افسانوں کے ذریعے سے آپ تک منتقل کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے مدِّ نظر ایک ایسی چیز کی تخلیق ہوتی ہے جو زندگی کا ایک جزو ہو — اُس زندگی کا جو خود اُس کی شخصیت میں سے چھن کر نکلتی ہے۔

جلیل حسین جلیل

ایک رات

ہے وجد میں گلستاں اور مست ہیں ہوائیں
چھایا ہوا سکوں ہے پُر کیف ہیں فضائیں
ہیں دلگداز و دلکش مہتاب کی ادائیں

یہ دلفریب موسم یہ رات کے نظارے
ہے پُرسکوت دریا شاداب ہیں کنارے
رنگینیوں کی لے ہیں ڈوبے ہوئے ہیں تارے

مدہوش ہو رہا ہے بل کھا رہا ہے پانی
پانی میں تیرتی ہے مہتاب کی جوانی
پھر یاد آ گئی ہے بھولی ہوئی کہانی

رہ رہ کے جی میں آ کر بے خود بنا رہے ہیں
جن کو بھلا دیا تھا وہ یاد آ رہے ہیں
دل میں بسے ہوئے ہیں آنکھوں پہ چھا رہے ہیں

جادو بھرا ہوا ہے موجوں کی نغمگی میں
خود کھو گئی ہے فطرت پھولوں کی دلکشی میں
سوئی ہوئی ہیں کلیاں تاروں کی روشنی میں

دامانِ گلستان میں گل مسکرا رہے ہیں
یوں منتظر ہے وادی جیسے وہ آ رہے ہیں
جیسے خوشی کا کوئی پیغام لا رہے ہیں

تارے لٹا رہے ہیں طشتِ فلک سے افشاں
مہتاب کی جبیں پر کچھ نقش ہیں نمایاں!
ہوتا ہے راز جیسے دل میں کسی کے پنہاں

آنکھوں کے سامنے ہیں اُن کے حسیں فسانے
بیتی ہوئی بہاریں گزرے ہوئے زمانے
وہ آئیں یا نہ آئیں کون اُن کی بات جانے

ہم بے خودی کی لے میں گیتوں کی لے ملا کر
بہلا رہے ہیں دل کو نظمیں سنا سنا کر
دامن پکڑ رہا ہے اُن کا خیال آ کر

تاریک ہو چلی ہیں تاروں کی جلوہ گاہیں
کچھ تھک گئی ہیں دیکھو مہتاب کی نگاہیں
سونے کو جا رہی ہیں وہ کہکشاں کی راہیں

خوابوں کی وادیوں سے دل کو پیام آئے
میرے حسیں وطن میں جس طرح شام آئے
گردش میں جیسے اُن کی آنکھوں کا جام آئے

تاروں پہ ارغوانی بدلی سی چھا رہی ہے
بادِ نسیم آ کر پنکھے ہلا رہی ہے
اے دل خموش ہو جا اب نیند آ رہی ہے

نظر حیدر آبادی

ایک اور رات

شکوۂ بختِ نارسا کب تک وا رہیں گے لبِ دُعا کب تک
دلِ محزوں! خُدا سے پُوچھ نہ لے سازِ بیگانۂ صدا کب تک
بے نوائی کی یہ سزا کب تک!

نور و نکہت کی انجمن سے دُور عشرتِ خلد کے وطن سے دُور
کیوں تڑپتا رہے کوئی طائر سرزمینِ گل و سمن سے دُور
دُور ہنگامۂ چمن سے دُور!

ظرفِ غم آزمائے جاتی ہے زخم پر زخم کھائے جاتی ہے
تھامنا اے شعاعِ صبحِ اُمید زندگی لڑکھڑائے جاتی ہے
رات کیا کیا ستائے جاتی ہے!

دل سے کب یہ غبار اُترے گا بارِ فکرِ قرار اُترے گا
بول اے آسماں کہ کب آخر نشۂ سوگوار اُترے گا
چاندنی کا خمار اُترے گا!

پھر فضاؤں میں گیت لہرائے ہائے اب کس طرح سے چین آئے
کتنے ظالم ہیں کشتگانِ فراق نُور آواز میں چُرا لائے
کاش یہ ماہتاب جل جاتے!!

ابن حسن زیدی

داستانِ جرائم

دربان

(ایک ہائی کورٹ کے چیف جج کے قلم سے)

سولن کی تاریخ میں شاید ہی کوئی واقعہ ایسا لرزہ خیز گزرا ہو اور ضلع کی پولیس کو اُس نے اتنا پریشان کیا ہو۔ جتنا مسماۃ جانکی کے نوکر بھگوتی کی گمشدگی نے!

جانکی سولن کے بڑے جاگیردار کلیان سنگھ کی بیوی تھی اور کئی گاؤں اُسے باپ کی طرف سے بھی ورثے میں پہنچے تھے۔ وُہ نوجوان اور خوبصورت تھی۔ اُس کے جسم میں وُہ تمام جادو بدرجۂ اتم موجود تھے۔ جن سے ایک ہندو عورت حسین و جاذبِ نظر کہلاتی ہے۔ اُس نے کچھ تعلیم بھی پائی تھی۔ ہندی تو اچھی خاصی جانتی تھی مگر انگریزی رسم الخط میں بھی کم از کم نام اور پتا وغیرہ لکھ پڑھ لیتی تھی۔ وُہ ایسے ماحول کی پروردہ تھی جس میں رئیس خاندانوں کی لڑکیاں خاندانی تموّل کی بنا پر علم کم حاصل کرنا چاہتی ہیں اور فیشن زیادہ۔ وُہ اپنے پردے کو بھی کبھی رسمی انداز میں برقرار رکھنا چاہتی اور کبھی حسبِ ضرورت، بے پردہ بننے میں بھی اُسے کوئی تامّل نہ ہوتا۔ المختصر وُہ دورِ حاضر کی اُس تہذیب کا نمونہ تھی۔ جس میں امیر کبیر عورتیں اپنے گھروں ہی میں بہت کچھ انگریزی معاشرت کے طریقے سیکھ لیتی ہیں یا سیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اِس میں اُنہیں اپنے گھر کے مردوں سے جو انگریزی تہذیب کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ بہت کچھ مدد ملتی ہے۔ لیکن ایسی فضا میں تربیت یافتہ عورتیں اِدھر تو اپنی اصلی تہذیب کو بھول جاتی ہیں۔ اُدھر انگریزی تہذیب کو بھی باقاعدہ اور کماحقہٗ نہ سیکھ سکنے کی وجہ سے "اینگلو انڈین" طرزِ معاشرت کا کچھ عجیب بے جوڑ نمونہ بن کر رہ جاتی ہیں! ایک طرف اُن کو اُن کی نسلی خصوصیات اور قدیم روایات اُن مروّجہ حدود کے اندر رکھنا چاہتی ہیں جن کی پابندی وُہ صدیوں سے کرتی چلی آ رہی ہیں تو دوسری طرف نئی روشنی کی بیباک ادائیں اُنہیں آزادی و جرأت آموزی کی تعلیم دیتی رہتی ہیں۔

وُہ اپنے طور طریق اور چال ڈھال سے اسی سادگی و پرکاری کی نمائش میں کبھی ایک آہو بچہ کی طرح الھڑ، نادان اور قطعی پروردۂ فطرت معلوم ہوتی ہیں، اور کبھی انتہا درجہ سنجیدہ و متین نظر آتی ہیں۔ پہاڑوں کی مانند پُر شوکت و پُر دبار۔ ساکت و جامد۔

جانکی کے گورے گداز بدن، مست آنکھوں، سیاہ چمکیلے بالوں اور اُس کی باوقار شخصیت میں ایک بیقرار روح پوشیدہ تھی جو کائنات کا محاصرہ کرنے کے لئے ہر وقت مضطرب نظر آتی تھی۔ ایک تلاشِ مستقل، ایک جستجو تھی مدام اُس پر طاری رہتی۔ وُہ جلد جلد چیزوں سے گزرتی معلوم ہوتی۔ یہ بھی سیکھ لوں وُہ بھی سیکھ لوں۔ اسے بھی حاصل کر لوں۔ اُسے بھی اپنے قبضۂ اقتدار میں لے آؤں۔ کائنات پر میری فتح ہو جائے۔ میرے گرد و پیش ہر شے میری فضیلت و برتری کو مان لے۔ کوئی چیز میری راہ میں نہ آئے۔ میرے مقصد میں خلل انداز نہ ہو۔

وُہ جہاں ایک بڑی جائداد کی مالکہ تھی۔ وہاں قدرت نے اس کو دولتِ حسن سے بھی مالا مال کیا تھا اور اس دولت کا نشہ اُس کی مالی دولت سے زیادہ تھا۔ اس دوہری فارغ البالی نے اُس کو بڑی حد تک متکبر بنا دیا تھا۔ اُس کی طبیعت میں تحمل نام کو نہ تھا اور وُہ ذرا سی مخالفت کو بھی گوارا نہ کر سکتی تھی۔ بایں ہمہ وُہ

بدمزاج نہ تھی۔ اُس کے حسین چہرے پر ہروقت مسکراہٹ رقصاں رہتی اور جو لوگ اُسے خوش رکھ سکتے اور اُس کی مزاج دانی کرتے اُن کے ساتھ مہربانی سے پیش آتی تھی۔ البتہ جب اُسے کسی بات پر غصہ آجاتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتی۔ وہ اپنے کیریکٹر میں کلوپیٹرا کی مثال تھی ـــــ ایک جابر، رحم اور آہنی قوتِ ارادی کی عورت کہ اگر ایک بار اُس کی آتشِ غیظ و غضب بھڑک اُٹھے تو وہ آناً فاناً وہ سب کچھ کر گزرے جو ایک بڑے سے بڑے عزمِ صمیم کا مرد بھی شاید ہی کر سکے۔

تعلیم و تربیت انسانی طبیعت میں لوچ اور رُوح میں پاکیزگی پیدا کرتی ہے۔ لیکن ادھوری تعلیم مزاجی خصوصیات کے ساتھ مل کر بعض اوقات اس کے بالکل برعکس اثرانداز ہوتی ہے اور "کڑوا اور نیم چڑھا" کی مثال بن جاتی ہے۔ یہی حال کچھ جانکی کا تھا۔ اُس کا شوہر کلیان سنگھ ایک صاحبِ مقدرت رئیس اور تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ گورنمنٹ کنٹریکٹر کی حیثیت سے اُس کی زندگی بہت مشغول تھی اور اکثر کئی کئی ہفتے اُسے گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ جانکی کچھ تو فطرۃً آزاد واقع ہوئی تھی۔ کچھ شوہر کے اکثر گھر سے غیر حاضر رہنے کے باعث اُس کے دماغ میں ازحد آزادی و خودمختاری آگئی تھی۔ موسمِ گرما میں وہ سال کا نصف سے زیادہ حصہ سولن میں اپنے ایک ذاتی مکان میں مقیم رہتی اور سرما کے ایام کاٹنے کے لئے نیچے ایک گاؤں کے مکان میں چلی جاتی۔ اُس کا سولن کا مکان ایک شاندار وسیع دو منزلہ بنگلہ تھا جو مغربی طرز پر سجا بنا رہتا تھا۔ جانکی کو جو جائداد باپ سے پہنچی تھی۔ اُس کے حصول میں اُسے اپنے بہت سے عزیزوں کے ساتھ طویل مقدمہ بازی سے گزرنا پڑا تھا جو شکست کھانے اور عدالتی نقصانات اُٹھانے کے بعد اور بھی اُس کے دُشمن ہو گئے تھے۔ اس نوعمری میں عزیزوں کی ریشہ دوانیوں اور شاطرانہ چالوں سے مظفر و منصور نکل آنے کے باعث بھی جانکی کا دل بہت بڑھ گیا تھا اور وہ اپنے تئیں بہت باحوصلہ اور دبنگ محسوس کرتی تھی۔ اُس نے قلیل مدت میں بہت کچھ دُنیا دیکھ لی تھی اور وہ سماج۔ اخلاق اور مذہب کسی چیز کو بندش نہ سمجھتی تھی۔ جانکی اور اُس کے شوہر کے ملازموں کے علاوہ اُن کے کئی ایک غریب رشتے دار بھی اُنہیں کے پاس آ رہے تھے جو سولن کے بنگلے سے متعلقہ باہر کے مکانوں میں رہتے۔ گھر میں کلیان سنگھ کی بیوہ چچازاد بہن سیتا دیوی بھی رہتی تھی۔ ایک ہندو بیوہ کی زندگی جس قدر تاریک و المناک ہوتی ہے۔ احاطۂ بیان سے باہر ہے۔ وہ کتنی ہی کم عمر یا نوجوان کیوں نہ ہو۔ بیوگی کے بعد زندگی کے روشن اور حیات آفریں پہلو پر اُس کا کوئی حق نہیں رہتا۔ شوہر کے مر جانے کی پاداش میں اُس پر پہلے ستی ہونا واجب ہو جاتا تھا اور اب گھٹ گھٹ کر مرنا۔ وہ بقیہ عمر کے لئے تاریکی اور نفرت کے گڑھے میں پھینک دی جاتی ہیں یہی حال اب سیتا دیوی کی زندگی کا تھا۔ ایک بدبخت بیوہ کی حیثیت سے وہ جوں توں اپنے دن گزارنے کے لئے کلیان سنگھ کے یہاں آکر رہنے لگی تھی۔ لیکن بھرے گھر میں اُس کی زندگی سب سے الگ تھلگ تھی۔ کوئی اُس کی ذات میں دلچسپی لینے والا یا اُس کا دل ٹٹولنے والا نہ تھا۔ وہ سب کے درمیان خود کو تنہا پاتی۔ اور اکثر کسی سے دل کی بات کہنے کی بھوکی رہتی تھی۔ یہاں یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ ایسے ہی حالات میں ناکامِ حیات عورتیں زندگی میں تنوع، حرکت اور لہر پیدا کرنے کے لئے کسی نہ کسی ہنگامے کی منتظر رہا کرتی ہیں۔ خواہ تجدیدِ اُلفت کی شکل میں یا کسی اور صورت میں۔ وہ ہر اُس صدا پر لبیک کہنے کو تیار ہوتی ہیں جو اُنہیں کسی عنوان پیغامِ عمل دے! سیتا دیوی مسمّی بھگوتی کی پُراسرار گمشدگی کی تفتیش میں پولیس کے لئے ایک مفید آلۂ کار ثابت ہوئی۔

واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ جب کلیان سنگھ کام سے کہیں باہر جانے لگا تو اُس نے اپنے معتمد نوکر بھگوتی سے کہا۔ "... میں ایک ہفتے کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ تم رات کو ڈیوڑھی میں سویا کرنا اور خبردار رات کو کوئی شخص باہر سے اُوپر نہ جانے پائے۔ ..." بھگوتی نے

اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کلیان سنگھ کا بہت پرانا نمک حلال خادم تھا اور غالباً اس وفاداری و فرماں برداری کے پیچھے اس کی جان گئی۔ کلیان سنگھ کی سولن سے روانگی کے بعد چوتھی شب بد قسمت بھگوتی کو اس ڈیوڑھی میں نہیں پایا گیا۔ جہاں اس کا آقا اسے سونے کی ہدایت کر گیا تھا۔ بلکہ اس کے بعد وہ کہیں بھی زندہ یا مردہ کسی حالت میں نہیں دیکھا گیا۔

اس کے اس طرح غائب ہو جانے کے متعلق ایک بات عجیب تھی۔ یہ کہ اگرچہ اس کے یکایک گم ہو جانے کا ہر ایک شخص کو علم ہوا ہوگا۔ مگر کسی نے بھی اس کا کوئی خیال نہیں کیا کہ بھگوتی کہاں ہے۔ ورنہ گھر میں کام کرنے والے نوکر کے ایک دم مفقود الخبر ہو جانے پر صبح سے شام تک کام کے دوران میں بھی کئی مرتبہ اس کی یاد آ سکتی تھی۔ مگر نہیں یوں سمجھئے سب اس کو جان کر فراموش کئے رہے بعض تو اس لئے کہ وہ غالباً سب کچھ جانتے تھے اور باقی اس لئے کہ وہ کچھ نہ جاننے کے باعث مکمل خاموشی اختیار کر کے حالات کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ اونچے گھروں کا دستور ہے کہ جب آپ گھر کا کوئی راز سمجھنے سے قاصر ہوں تو اس کی نسبت مستفسرانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے مکمل خاموشی اختیار کر لیجے۔ بات کسی نہ کسی طرح خود بخود آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔ یہی فضا سولن کی اس جاگیر دار عورت کے گھر میں اس کے خادم بھگوتی کی پراسرار گمشدگی سے متعلق طاری تھی۔ عجیب تر یہ بات یہ ہے کہ خود کلیان سنگھ نے بھی اپنی سولن میں واپسی پر کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ ورنہ اس کے لئے لازم تھا کہ گھر پہنچ کر معلوم کرتا کہ اس کا وفادار نوکر کہاں گیا اور اس پر کیا گزری ہے اور کوئی معقول وجہ اس کے گم ہونے کی نہ پاتے ہوئے معاملے میں متجسسانہ قدم اٹھاتا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ کلیان سنگھ کا اس طرف خیال ہی نہ گیا ہو۔ چونکہ اس کی واپسی پر اس کی بیوی گھر میں نہ تھی اور اس نے اپنے سولن سے گاؤں چلے جانے کی اطلاع ایک خط میں کلیان سنگھ کو دے دی تھی کہ اپنا مختصر سامان، زیور اور کپڑے وغیرہ لے کر ایک دو نوکروں کے ساتھ وہ ایام سرما گزارنے کے لئے گاؤں کو منتقل ہو رہی ہے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ موسم پہاڑ پر خاصہ سرد ہونے لگا تھا اور جانکی کو حسبِ معمول سولن سے گاؤں جانا ہی تھا۔ مگر اس میں ایک بے قاعدگی اور غیر مربوط بات یہ تھی کہ ایک ہی ہفتہ قبل جو کلیان سنگھ کاروباری ضروریات سے باہر جا رہا تھا تو جانکی نے اس کے سولن واپس آنے تک چلے جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہ کیا تھا۔ غرض گھر پہنچنے کے بعد اگلے ہی دن کلیان سنگھ بھی اپنا ضروری سامان باندھ کر ایک نوکر کو ہمراہ لے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ ان حالات میں بھگوتی کی گم شدگی کی کوئی اولیں رپورٹ پولس اسٹیشن پر نہیں درج کرائی گئی۔ نہ بروقت کوئی تحقیقات کی جا سکی جس پر تفتیشِ جرم کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ کلیان سنگھ اور اس کی بیوی گاؤں سے واپس نہ آئے۔ بھگوتی کے وجود و عدم کو گویا دل سے بھلا دیا گیا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ "لام" پر چلا گیا ہے۔ جہاں جنگی کامیابیاں اس کی منتظر تھیں اور تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ جانکی کے ذاتی ملازم شندر نے لوگوں سے خاص طور پر ایسا کہا تھا۔ لیکن شندر سے جب پولس نے باز پرس کی تو اس نے بیان کیا کہ میں نے تو یہ صرف اس مطلب سے کہا تھا کہ بھگوتی کا اس طرح غائب ہو جانا فوج میں بھرتی ہو کر چلے جانے ہی کے برابر ہے۔ ورنہ دراصل مجھے کچھ معلوم نہیں کہ بھگوتی لڑائی میں گیا ہے یا کہاں؟ الغرض بھگوتی کے جنگ میں جانے کی یہ صورت نہ ہو سکتی تھی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ بعض غریب گھروں کے لڑکے گھر کی عسرت سے تنگ آ کر کسی کو اطلاع دیئے بغیر نکل کھڑے ہوتے اور فوج میں بھرتی ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن بھگوتی کوئی لڑکا نہ تھا۔ وہ شادی شدہ آدمی تھا۔ بیوی کی محبت

اور گھر کی دلچسپیاں ہرگز اُس کو ویسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔ مزید یہ کہ اُس نے اس قسم کے ارادے کا کبھی کسی پر اظہار نہیں کیا تھا۔ خود اُس کے بھائی بہاری لال اور گھر پر اُس کی بیوی تک کو اس کا کچھ علم نہ تھا۔ بھگوتی کے جوتے تک بھی گاؤں ہی میں مل گئے اور پہچانے گئے۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر وہ کہیں گاؤں سے باہر کسی جگہ گیا ہوتا تو کم از کم اپنے جوتے پہن کر ضرور جاتا۔ دیہاتی ملازمین، خاص کر ہندو نوکر چاکر روزمرّہ کے کام کاج میں جوتے نہیں پہنتے۔ مگر جب کہیں گھر سے باہر جانا ہوتا ہے تو جوتے پہن کر جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں بھگوتی کا بھائی بہاری لال سخت پریشان تھا۔ سُندر نے اُسے ایک متوحش خبر یہ بھی سنائی تھی کہ بھگوتی کا کسی عورت سے تعلق تھا۔ وہ اُسے لے کر فرار ہو گیا ہے۔ مگر پھر یہ کہ گھر سے اپنا کپڑا لتّہ اور کوئی ضروری چیز ساتھ لئے بغیر یا اپنے بھائی سے کچھ کہے سُنے بغیر وہ کہاں چلا گیا ہوگا۔ بہاری کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ بار بار مُسماۃ جانکی کے یہاں مستفسرانہ جاتا اور ہر بار نوکروں سے اسی قسم کے جواب پاکر مایوس و ناکام واپس چلا آتا۔ اسی دوران میں اُس نے ایک دن مسماۃ جانکی کے ایک نوکر جوکھو کو اپنے بھائی کے جُوتے پہنے دیکھا۔ جوکھو ذات کا چمار تھا۔ بہاری نے خیال کیا یہ چمار میرے بھائی کے جُوتے کیونکر پہنے ہوئے ہے اور اُس سے اُس کے متعلق سوال کیا تو جوکھو نے جواب دیا۔ "مجھے یہ جوتے سُندر نے دیئے ہیں"۔ لیکن جب سُندر سے بہاری نے اس کی تصدیق چاہی تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ جوکھو ہی کے یہاں بہاری نے اپنے بھائی کی لاٹھی بھی پہچان لی جس پر پیتل کا دستہ لگا تھا اور جو اُس غریب کی ایک عزیز چیز تھی۔ بھگوتی کبھی اپنی لاٹھی لئے بغیر کہیں باہر نہیں جاتا تھا!

معمولی سمجھ کا آدمی بھی خیال کر سکتا ہے کہ اس قدر سُراغ مل جانے کے بعد تفتیش میں کوئی دقّت نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ مگر یہ بہاری کی جہالت اور غفلت سے ہوا۔ وہ کمبخت اگر فوراً تھانے میں رپورٹ کر کے ان ہر دو انکشافات پر پولیس کو مطلع کر دیتا۔ معاملہ میں بہت کچھ آسانی پیدا ہو جاتی۔ مگر وہ سُست مزاج آدمی تھا اور کسی قدر بیوقوف بھی۔ وہ جانکی کے بنگلے پر تو دوڑ دوڑ کر جاتا رہا مگر تھانے تک ایک بار بھی نہ گیا گاؤں کے تعطّل آفریں شام و سحر میں اُس نے دِن۔ ہفتے اور مہینے یُوں ہی گزار دیئے۔ اس کے نتیجہ میں وہ دقّتیں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے اس مقدمے کو خراب کر دیا۔ موسمِ سرما بغیر کسی تفتیش و تحقیق ہی کے گزر گیا اور بدقسمت بھگوتی کی گمشدگی پر کوئی روشنی نہ ڈالی جا سکی۔ تاآنکہ آغازِ موسمِ بہار کے ساتھ ساتھ سولن میں کئی طرح کی چہ میگوئیاں ہونی شروع ہوئیں۔ جن کی تہ میں مسماۃ جانکی کے دیرینہ دشمنوں کا ہاتھ تھا۔ پولس کو خبر کی گئی اور ایک سب انسپکٹر تفتیشِ جُرم کے سلسلے میں سولن میں علیٰحدہ آکر مقیم ہوا۔ اس قدر طویل مدت گزر جانے کے بعد اُس کے کام کی مشکلات ظاہر تھیں مگر وہ ہوشیار آدمی تھا۔ گاؤں میں بھگوتی کے غائب ہو جانے کے متعلق مختلف قسم کی افواہیں گشت لگا رہی تھیں۔ جانکی کے دشمنوں کی پارٹی کافی مضبوط اور اُس کی مخالفت میں مصروفِ کار تھی جس سے کوئی تفتیشی افسر بھی دھوکا کھا سکتا تھا۔ بھگوتی کا بھائی بہاری لال ایک سادہ لوح دہقان تھا جو کبھی کچھ کہتا تھا کبھی کچھ۔ تعلیم کی کمی کے باعث غریب دیہاتیوں کی طبیعت میں ایک قسم کی جھجک اور بے چارگی واقع ہوتی ہے جس سے اُنہیں اپنے مفیدِ مطلب بیان پر جمے رہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ ایسے افراد عدالت میں لائے جانے کے قابل نہیں ہوتے۔

گاؤں میں بھگوتی سے متعلق عام افواہ یہ تھی کہ مسماۃ جانکی نے اپنے دو نوکروں کی مدد سے اُس کو مروا ڈالا اور اُس کی لاش کو جوکھو چمار کے ذریعے سے کہیں پھنکوا دیا۔ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ جوکھو نے گاؤں میں اکثر جگہ اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ تجربہ کار سب انسپکٹر نے ایک سایہ دار درخت کے نیچے اپنی نشست مقرر کر کے روزانہ گاؤں کے لوگوں کو بُلا کر معاملے کی تفتیش شروع کی۔ کئی اشخاص نے اس پُراسرار قتل کی تہ

میں مسماۃ جانکی کا نزدیکی گاؤں کے ایک خوبرو نوجوان زمیندار سے معاشقہ بیان کیا۔ جو جانکی کے شوہر کی غیر حاضریوں میں اپنے گھوڑے پر سوار راتوں کو چھپ چھپ کر اُس سے ملنے آتا اور صبح پو پھٹے واپس ہو جاتا تھا۔ اُس کا نام بشن سنگھ تھا۔ رات کو جب وہ اپنا گھوڑا اُڑاتے آتا، مسماۃ جانکی کا ایک نوکر گاؤں سے باہر ایک درخت کے نیچے اس کا منتظر ہوتا جو اُس سے گھوڑا لے لیتا اور شب باشی کے بعد صبح صادق سے پیشتر جب پھر بشن سنگھ واپس جانے لگتا تو یہ آدمی اُس کا گھوڑا لئے اُسی جگہ تیار رہتا۔ لوگوں نے یہ بھی بیان کیا کہ کلیان سنگھ کے گھر سے کہیں باہر روانہ ہوتے ہی جانکی اپنے ملازم سندر کے ہاتھ اپنے عاشق کو پیغام بھیجتی کہ میدان خالی ہے اور وہ آ جاتا ــــ اُسی طرح اپنے گھوڑے پر سوار، اعلیٰ پوشاک پہنے، اُس کا ریوالور اور خنجر اُس کی کمر سے لٹکے ہوتے! یہ صورت کافی عرصے سے جاری تھی۔ بنگلے میں بھگوتی چونکہ جانکی سے زیادہ اُس کے شوہر کا خادم سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اُس سے ہر بات کو راز میں رکھنے کی کوشش کی جاتی اور جب قضا کا راس موقع پر بھگوتی کا اُس کے آقا کی غیر حاضری میں بشن سنگھ سے سامنا ہو گیا تو مسماۃ جانکی نے افشائے راز کے خوف سے اُسے مروا کر اُس کی زبان کو ہمیشہ کے لئے کچھ کہنے سے روک دیا اس کے بعد جانکی نے جوکھو چمار کو بُلا کر بھگوتی کی لاش کو گاؤں سے باہر اپنے مویشی خانے کے پاس کہیں دبوا دیا۔

یہ حالات معلوم کر کے سب انسپکٹر دو ایک اشخاص کی رہبری میں جانکی کے مویشی خانے کی طرف موقع کے معائنے کو گیا۔ جہاں پہنچ کر اس نے ایک غیر معمولی بدبو محسوس کی جیسے کسی نے اُس جگہ کی مٹی کو اُلٹ پلٹ کیا ہو۔ جہاں بھگوتی کی لاش مدفون بتائی گئی تھی۔ سب انسپکٹر نے جگہ کو کھدوایا جو نرم و کمزور پائی گئی۔ لیکن کافی کھدوانے کے بعد بھی کوئی لاش وہاں سے برآمد نہ ہوئی۔ معاً سب انسپکٹر کو خیال ہوا کہ تفتیش کے خوف سے کسی نے لاش کو یہاں سے ہٹوا دیا ہے۔ قرب و جوار میں لاش کی مزید تلاش ناکام ثابت ہونے پر سب انسپکٹر نے اُس گڑھے کی بدبودار مٹی سے ایک مٹھی خاک لے کر کیمیائی تجزیہ کے لئے "کیمیکل ایگزامینر" کو روانہ کر دی۔ جہاں سے بعد ازاں موافق رپورٹ موصول ہوئی۔

اب سب انسپکٹر کے لئے جوکھو چمار (جس کے پاس سے بھگوتی کے جوتے برآمد ہوئے تھے) پر ہاتھ ڈالنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ اُس نے فوراً جوکھو کو حراست میں لے لیا اور اپنی مخصوص تراکیب عمل میں لاتے ہوئے اُس سے سب کچھ اُگلوا لیا! جوکھو نے مسماۃ جانکی کی بالائی منزل پر دن دہاڑے ایک بے گناہ آدمی کے لرزہ خیز قتل کی واردات حسب ذیل الفاظ میں بیان کی:۔

چوہدری بشن سنگھ چھپ چھپ کر جانکی جی سے ملنے آیا کرتے تھے۔ جس دن بھگوتی کو مارا گیا ہے۔ اُس کی گزشتہ رات بھی وہ (بشن سنگھ) اسی طرح آئے تو ڈیوڑھی پر بھگوتی سے اُن کا سامنا ہو گیا۔ بھگوتی نے اُنہیں ٹوکا اور اندر جانے سے روکا۔ اس پر بشن سنگھ جی کی بھگوتی سے سخت کلامی ہو گئی۔ اتنے میں اُوپر سے راجہ رام آ گیا اور چوہدری بشن سنگھ کو اپنے ساتھ اُوپر لے گیا۔ بھگوتی ڈیوڑھی میں بڑبڑاتا رہ گیا۔ بشن سنگھ اگلے دن بھر دم واپس ہو گئے اور اپنا خنجر اُوپر ہی بھول گئے۔ صبح ہوئی۔ دوپہر سے ذرا پہلے میں اور بلدیو (مویشیوں پر کام کرنے والا دوسرا آدمی) بازار والے پیپل کے پاس ڈنگروں کو جنگل لے جا رہے تھے۔ بھگوتی پان والے کی دکان کے پاس کھڑا ہوا تھا کہ اتنے میں رانی جی (جانکی) کا نوکر راجہ رام دوڑا ہوا آیا اور بھگوتی سے کہنے لگا ــــ سانپ۔ سانپ۔ اوپر کے مکان میں بڑے کمرے سے پاس والی کوٹھڑی میں یہ بڑا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ بھگوتی ذرا آنا تو جھٹ سے ـــــ بھگوتی یہ سُن کر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ میں اور بلدیو اپنے کام پر آگے کو چلنے لگے۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد جب ہم گاؤں سے باہر مدرسے کے پاس ڈنگروں کو چرا رہے تھے۔ رانی جی (جانکی) نے مجھے بھی بلوا لیا۔ میں سمجھا۔ سانپ وانپ مارا ہو گا جیسے

پھنکواتی ہوں گی۔ لیکن میں جب اُوپر گیا تو کمرے کے برامدے کی کوٹھڑی میں پہنچ کر حیران رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ رانی جی کوٹھڑی کے سامنے کھڑی ہوئی راجہ رام اور سُندر سے ایک تیسرے شخص کی مدد سے جسے میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بھگوتی کی لاش کے ٹکڑے کروا رہی ہیں ——— "اب ہاتھ کاٹو، پیر کاٹو، سر جُدا کرو، دھڑ کے دو ٹکڑے کرو" وغیرہ۔ ہے پرماتما! میرا سر چکرا گیا۔ میں جھجکا۔ ٹھٹکا۔ مگر رانی نے دلیرانہ آواز میں کہا اِدھر آ جوکھو۔ گھبراؤ نہیں۔ تجھے کافی انعام دوں گی۔ خبردار جو ایک لفظ بھی کسی کے سامنے زبان سے نکالا۔ اس لاش کے ٹکڑوں کو بوری میں بھر کر اس شخص (اجنبی کی طرف اشارہ کرکے کہا) کے ساتھ سے جاکر مویشی خانے کی طرف کہیں جنگل میں گاڑ آ۔ یہ سُن کر میں بادلِ ناخواستہ اُس اجنبی کے ساتھ بھگوتی کی لاش کے ٹکڑے جو ابھی بھلا چنگا بازار میں ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ بوری میں بھروانے لگا اور رانی جی کو اپنے دل میں کوستا جاتا تھا۔ اس اجنبی شخص کو میں نہیں جانتا تھا۔ قیاس کرتا ہوں کہ شاید چوہدری بشن سنگھ کا کوئی آدمی ہوگا۔ چونکہ اُس کے ہاتھ میں بشن سنگھ کا وہی خنجر تھا۔ جسے میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔

ہم دونوں نے جلدی جلدی غریب بھگوتی کی لاش کے ٹکڑوں کو بوری میں باندھ جوڑ کر ایک طرف رکھا اور کمرے کے فرش کو جو خون سے لال ہو رہا تھا۔ دھو دُھلا کر صاف کیا تاکہ اس خونِ بے گُنہ کی کوئی نشانی باقی نہ رہ جائے۔ شام کے جھٹپٹے میں ہم اپنا بوجھا لے کر چلے اور جیسا کہ مالکہ سے حکم ملا تھا۔ مویشی خانے کے باہر گاڑ کر چلے آئے۔ اگلے دن رانی جی (مسماۃ جانکی) اپنے رتھ میں بیٹھ کر گاؤں چلی گئیں۔ پھر وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ اب آپ گاؤں میں اس واقعے کی تفتیش کرنے آئے تو خطرہ کے باعث مجھے اور راجہ رام کو پھر حکم ملا کہ راتوں رات لاش کو وہاں سے نکال کر کہیں جلا دیں اور اُس گڑھے کو مٹی سے ہموار کر دیں۔ چنانچہ ہم نے سڑتی ہوئی لاش کو وہاں سے اُکھاڑ کر قریب کے شیشم کے درخت کے نیچے جلایا اور بڑی ہڈیاں جو نہ جل سکیں تھیں۔ وہیں دبا دیں۔ یہ کُل قصہ ہے . . . . "

جوکھو کو ساتھ لے جاکر سب انسپکٹر نے شیشم کے پیڑ کے نیچے سے وُہ ہڈیاں برآمد کیں۔ ان کوائف پر اب سب انسپکٹر کو کام کرنا تھا۔ وُہ حیران تھا کہ مقدمے کو کیونکر چلائے۔ واقعے کو گزرا اتنا عرصہ ہو چکا تھا کہ اب جوکھو کے بیان کو جس میں وُہ خود بھی اعانتِ جرم کا مرتکب تھا۔ عدالت تک لے جانے اور محض اُس کی بنا پر اتنے بڑے معزز لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ تاوقتیکہ جوکھو کے بیان کی تائید دیگر ذرائع سے نہ ہو معاملے میں مجرم خصوصی مسماۃ جانکی کی ذات تھی۔ ہر چند جوکھو کا بیان لفظ بہ لفظ ٹھیک ہی ہو۔ پھر بھی اس طویل وقفے کے بعد قانونی انداز میں ایک عالی عزت خاتون کے خلاف ایسی قبیح فردِ جرم لگانے کے لئے ناکافی تھا۔ کون یقین کرتا کہ جانکی جیسی خوش جمال و خوش ادا رئیسہ ایسے فعلِ شنیعہ اور ایسے ظالمانہ قتل کی مرتکب ہوئی ہوگی کہ صنفِ نازک کی افراد جسے سُننے اور جس کا تصور کرنے کی بھی تاب نہ لاسکیں اور جس کی تہ میں کوئی ایسی بڑی وجہِ اشتعال بھی نہ ہو جسے ایسے ہولناک قتل کے لازمی اسباب میں شمار کیا جاسکے۔ بات صرف اتنی ہی تو تھی کہ بھگوتی نے اپنے آقا کے زیرِ ہدایت بشن سنگھ کو داخل ہونے سے روکنا چاہا تھا۔ اس پر دونوں میں شاید گرم گفتاری ہوئی ہو۔ اس صورت میں اگر وقتی جذبۂ اشتعال کے ماتحت بھگوتی کا قتل وقوع پذیر ہوتا تھا تو وُہ چوہدری بشن سنگھ کے ہاتھوں اسی جگہ ہو جاتا۔ یہ کیا کہ وُہ وقت بھی ٹل گیا اور پھر بشن سنگھ نے اپنی محبوبہ کے پاس جاکر اپنی تلوار پیش کی ہو کہ لو میں تو صبح واپس چلا جاؤں گا۔ تم کسی طرح اپنے دربان کو میرے خنجر سے ہلاک کروا دینا۔ اچنبھے کی بات یہ تھی کہ لوگ عشق و ہوس کی آندھی میں مرنے مارنے کے لئے خود تیار ہوا کرتے ہیں۔ نہ کہ وُہ اپنی معشوقاؤں سے کہیں کہ ہمارے بجائے تم یہ کام کرا دینا! علاوہ ازیں جب معاملہ بشن سنگھ سے گزر کر

جانکی تک آ گیا تھا تو زیادہ قرینِ قیاس و قرینِ مصلحت یہ شکل تھی، کہ جانکی نسائی انداز میں بھگوتی کو جو اُس کے ایک غریب ملازم کی حیثیت رکھتا تھا۔ زیادہ آسان طریقوں سے خاموش کر دیتی تھی۔ چند سکّے ہی اُس کی زبان بندی اور اُسے ہموار کرنے کو کافی ہوتے۔

قانونی نقطۂ نظر سے جو کارگزاری اب تک ہو چکی تھی۔ وہ بھی مقدمے کو کامیاب بنانے کے لئے ناکافی تھی۔ جو کھوا اور اُس کی شہادت کوئی بڑی چیز نہ تھی، جُلاہے، چمار یا گاؤں کے دیگر غریب لوگ ذرا سے ڈر، دھمکی یا لالچ میں کسی قسم کا بیان بھی دے سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو عدالت خوب جانتی پہچانتی ہے۔ یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب جُعل سمّاۃ جانکی کے دشمنوں ہی نے اُس کو پھنسانے کے لئے بنایا ہو۔ کیا ضرور کہ شیشم کے نیچے سے برآمد شدہ ہڈیاں گم شدہ بھگوتی ہی کی لاش کی ہوں۔ کس انسانی پنجر سے بھی ایسی ہڈیاں جُدا کر کے کسی درخت کے تلے چھپائی جا سکتی ہیں! یہ خیالات تھے۔ جو تجربہ کار سب انسپکٹر کو مایوس و پریشان کر رہے تھے۔ پھر بھی اُس نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے سمّاۃ جانکی کے یہاں خانہ تلاشی لینا طے کیا۔ کہ شاید اس طرح کوئی شے یا ثبوت میں مزید فراہم ہو سکے۔ چنانچہ اس تلاشی کے دوران میں ایک چیز اُس کے ہاتھ آئی جسے پا کر وہ ایک حد تک خوش اور مطمئن ہوا کہ یہ مفیدِ مطلب ثابت ہو گی۔ ایک خوبصورت بکس سے جو سمّاۃ جانکی کا ذاتی بتایا گیا۔ کچھ عشقیہ خطوط برآمد ہوئے جو ہندی میں کسی تعلیم یافتہ آدمی کے رقم کردہ معلوم ہوتے تھے۔ جابجا ہندی اشعار اور عشقیہ استعارے تحریر تھے۔ ان میں سے چند خاص خط جو انگریزی ترجمے کے ساتھ عدالت میں پیش کئے گئے۔ مختصراً درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ یہ خطوط دستی ملفوف روانہ کئے گئے تھے۔ جن پر فرستندہ کا نام یا مکتوب الیہ کا پتا تحریر نہ تھا۔

۱

. . . پیاری! اپنے چاہنے والے کا سلام لو۔ جب میں اپنے ساتھ تمہارا تصوّر کرتا ہوں تو خدائے عزّ و جلّ کا ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے تمہیں پیدا کر کے میری ہستی کو رائیگاں جانے سے بچایا! اُس کا یہ کس قدر احسان ہے! . . . میرا گھوڑا اب ٹھیک ہے اور جب تم چاہو گی۔ یہ اُسی برق رفتاری کے ساتھ مجھے تمہارے پاس پہنچا دے گا۔

تمہارا۔ وُہی

۲

. . . جانِ من! تمہاری یاد ہر وقت میری ہمدم ہے اور دم سے جُدائی کی گھڑیاں دل پر شاق گزرتی ہیں . . . میرے خوابوں کے دھندلکے میں تمہاری ضیا بار آنکھیں ستارے بن کر چمکتی ہیں . . . پرماتما تمہاری صحت و ثبات کا ضامن ہو اور تمہارے شعلۂ حسن کو یوں ہی منوّر رکھے جس کی تابانیوں نے میرے بختِ نارسا کو چمکایا اور مجھے محبت سے آشنا کیا! . . . دعاگو

تمہارا۔ مہجور

۳

عزیز از جانِ من۔ تمہارا محبّت نامہ پہنچا۔ جسے پا کر میں بہت خوش ہوا۔ تمہاری اُلفت کی آگ میرے دل میں بھڑک رہی ہے۔ تمہیں کیونکر یقین دلاؤں کہ میرے شب و روز تمہارے ہی تصوّر میں گزرتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو میں کل شب میں ضرور پہنچوں گا۔ بالکل اُسی طرح جیسے

بھونرا پھول پر جائے۔ ۔ ۔ ۔ یا پتنگا شمع پر۔ ۔ ۔ ۔ اور تمہارے ہونٹوں کا تبسم، آنکھوں کی چمک اور دہن کی شیرینی چرا کر واپس آ جاؤں گا۔ ۔ ۔

تمہارا۔ شیدا

سب انسپکٹر نے اِن خطوط کو اپنے قبضے میں لیا اور نوجوان زمیندار چوہدری بشن سنگھ کی کوئی تحریر حاصل کر کے اُس سے مقابلہ کیا تو وُہ فوراً مطمئن ہو گیا کہ ضرور اِن خطوط کا راقم بشن سنگھ ہی ہے۔ اس کے بعد اُس نے جانکی کے شوہر کلیان سنگھ سے ملنا تجویز کیا۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کلیان سنگھ اپنی بیوی اور بشن سنگھ کے معاشقے سے آگاہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اُس نے سب انسپکٹر کو کوئی سہارا نہ دیا۔ شوہر کو اُس کی بیوی کی بیوفائی کا یقین دلانا۔ جبکہ وُہ خود اسے تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو ایک بیکار بات تھی۔ سب انسپکٹر نے کسی تمہیدی گفتگو کے بغیر کلیان سنگھ کو بتایا کہ گم شدہ بھگوتی کے قتل کا ثبوت مل چکا ہے۔ جس میں تمہاری بیوی کا ہاتھ ہے۔ لیکن وُہ اس کی معصومیت ہی کا یقین دلاتا رہا۔ سب انسپکٹر اگر رشوت لینے والا ہوتا تو اُسے ہاتھ رنگنے کا بہت اچھا موقع تھا۔ مسماۃ جانکی اور اُس کا شوہر مالدار زمیندار تھے۔ جو کسی قیمت پر بھی اس مقدمے کو عدمِ ثبوت کے بہانے ٹھکانے دار سے رفع دفع کرانے کی مقدرت رکھتے تھے۔ مگر سب انسپکٹر نے ایسا نہیں کیا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جانکی کے دشمنوں کی اُس پر برابر نگاہ تھی جو اس مقدمے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن سب انسپکٹر خود بھی دیانتدار اور کام کرنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے مقدمے کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ باوجودیکہ مقدمے کی فنی تکمیل میں اُس سے ایک مروّجہ غلطی ہوئی۔ جسے اُس نے اپنے بیان میں ڈھانپنا چاہا۔ مگر بات بن نہ سکی۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

کلیان سنگھ پر سب انسپکٹر کی گفتگو کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس نے مضبوطی کے ساتھ جواب دیا کہ جو کچھ افواہیں اُس کی بیوی کے طرزِ عمل کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں۔ سراسر غلط اور دشمنوں کی مشہور کی ہوئی ہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ میں نے اس موقع پر گھر سے چلتے وقت بھگوتی کو کوئی خاص ہدایات کسی امر کے متعلق نہیں دی تھیں۔ بجز ڈیوڑھی میں سونے اور ہوشیار رہنے کے۔ چونکہ اُس زمانے میں چوروں کا زور تھا۔ میں خود حیران ہوں کہ میں کب اُس کو اپنی بیوی پر چوکیدار بنا کر چھوڑ گیا تھا۔ اُس کی پُراسرار گمشدگی خود میرے لئے ایک معمّا ہے۔ جس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ میرے نوکروں ہی میں آپس میں کوئی دشمنی ہو جس کے باعث وُہ ایک دوسرے کا گلا کاٹ ڈالیں۔ لیکن اس میں میرا یا میری بیوی کا کیا دخل ہو سکتا ہے۔ ہم پر اس کی کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ ہم کیا جانیں۔ بھگوتی کہاں گیا؟ کیوں گیا؟ زندہ ہے یا مر گیا؟ یا کس نے اُسے مار ڈالا؟ ہم کچھ نہیں بتا سکتے۔ یہ آپ کا کام ہے۔ آپ پتا چلائیں۔ ۔ ۔ ۔

ناچار سب انسپکٹر نے جوکھو کو اقبالی مجرم کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے جانکی اور اُس کے دو نوکروں راجہ رام اور سُندر پر بھگوتی کے قتل کا مقدمہ چلایا۔ اس موقع پر اُس نے وُہ غلطی کی جس کا حوالہ سطورِ بالا میں دیا گیا ہے۔ یعنی مقدمے کی اگلی پیشی تک کے لئے اُس نے بہ نظرِ احتیاط جیسا کہ اکثر سب انسپکٹر کرتے ہیں۔ جوکھو کو روپوش رکھا تا کہ مسمّاۃ جانکی وغیرہ اس پر کسی طرح اثر نہ ڈال سکیں۔ اُس نے درمیانی مدت کے لئے جوکھو کو ایک کانسٹیبل کی معیت میں اپنے عزیزوں میں کہیں دُور رہنے کے لئے بھیج دیا۔ یہ سب انسپکٹر کے کسی چچا کا گھر تھا۔ لیکن تاریخ مقررہ پر جب جوکھو بلایا گیا تو اس بات کی اہمیت اُسے نہ سمجھائی گئی۔ عدالت پر اگر خود سب انسپکٹر یا جوکھو صاف الفاظ میں یہ ظاہر کر دیتے کہ مخالف گروہ کے اثر سے محفوظ رہنے کے لئے یہ انتظام کیا گیا تھا تو کوئی بھی بات نہ تھی۔ مگر جوکھو کو جب عدالت کے روبرو وکیل کی جرح سے سامنا ہوا تو وُہ کچھ گھبرا

گیا۔ کبھی کہتا میں تھانے دار کے یہاں تھا۔ کبھی بتاتا اپنے گھر میں تھا۔ تیسری مرتبہ سوال کرنے پر کہا کہیں اور تھا۔ اس طرح اُس کا بیان قابلِ اعتماد نہ رہا۔ وکیل کے پھر سوال کرنے پر کہ وہ کس کے چچا کے گھر مقیم رہا ہے جوکھو کبھی اپنے چچا کے گھر بتا دیتا۔ کبھی تھانے دار کے چچا کے گھر! اُس کے متزلزل بیان سے مقدمے میں کمزوری آ گئی۔ سنگین واردات کے جب کسی ایک پہلو میں (خواہ وہ کتنا ہی معمولی اور غیر متعلق کیوں نہ ہو) کمزوری آ جاتی ہے تو اُس کے اہم پہلو بھی مشکوک ہو جاتے ہیں۔ جوکھو کے اس رویّہ نے جج کو غیر مطمئن کر دیا اور اُس نے محض جوکھو کی شہادت پر ملزم کو سزایاب کرنا پسند نہ کیا۔ شیشم کے درخت کے نیچے سے برآمدہ ہڈیوں کی نسبت بھی اُس نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ کیا ضرور ہے کہ وہ ہڈیاں گمشدہ بھگوتی ہی کے جسم کی ہوں؟

کلیان سنگھ اور بشن سنگھ صفائی کے لئے طلب کئے گئے۔ بشن سنگھ نے اُن عشقیہ خطوط کا اپنی تحریر ہونا تسلیم کیا۔ لیکن اُس نے کہا۔ کہ یہ خطوط میں مسمّاۃ جانکی کو نہیں کلیان سنگھ کی بیوہ چچا زاد بہن سیتا دیوی کو لکھتا رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ میں اُن سے شادی کروں۔ جانکی جی سے ان خطوں کا کوئی علاقہ نہیں۔ اُنہوں نے سیتا دیوی کے پاس سے چوری کر کے اپنے پاس رکھ لئے ہوں گے . . . !

آخر کار جج نے ایک طویل فیصلہ لکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ ہو سکتا ہے۔ جوکھو کا بیان اور گاؤں کی عام افواہیں صحیح ہوں۔ لیکن مقدمہ قرار واقعی طور پر ثبوت کو نہیں پہنچا اور میں شبہے کا فائدہ مجرموں کو دیتا ہوں۔

اس طرح ہولناک قتل کا یہ مقدمہ ختم ہوا اور وہ حسین قاتلہ سزا سے صاف بچ گئی جسے گاؤں کے بہت سے لوگ اور گھر کے اکثر افراد غریب بھگوتی کے خونِ ناحق کا ذمہ دار جانتے تھے۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

سر سیّد احمد خاںؒ کے دو خط

(بنام مولوی سیّد ممتاز علی مرحوم)

جب شمس العلماء مولوی سیّد ممتاز علی صاحب مرحوم نے ۱۸۹۸ء میں لاہور سے عورتوں کے لئے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنا چاہا تو سرسیّد کو لکھا کہ میرا ارادہ یہ ہے۔ آپ اخبار کا کوئی نام تجویز کر دیجئے۔ اس کے جواب میں سرسیّد نے یہ خط لکھا۔ اس خط کو لکھے ہوئے بمشکل دو ہفتے ہوئے ہوں گے کہ سرسیّد کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے انتقال کے تقریباً تین مہینے بعد مولوی صاحب مرحوم نے سرسیّد کے تجویز کردہ نام ہی سے اخبار جاری کر دیا۔ جو آج تک نہایت کامیابی سے جاری ہے (اسمٰعیل)

(۱)

مشفقی و محبی مولوی سیّد ممتاز علی

عنایت نامہ ملا۔ اگرچہ آپ نے مجھ سے اس باب میں مشورہ نہیں لیا کہ آیا اخبار جاری کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ بلکہ صرف اُس کے نام کی بابت دریافت کیا ہے لیکن چاہے آپ میرا مشورہ پسند نہ کریں مگر میں یہی کہوں گا کہ آپ عورتوں کے لئے اخبار جاری نہ کریں۔ آپ یقین کریں کہ آپ اسے جاری کر کے پچھتائیں گے اور تکلیف، نقصان اور سخت بدنامی کے بعد بند کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر آپ ان سب باتوں کو سمجھ لینے کے بعد جاری کریں تو جو نام آپ نے مجھے لکھ کر بھیجے ہیں اُن میں سے مجھے کوئی بھی پسند نہیں آیا۔ میری رائے میں اگر کوئی اخبار مستورات کے لئے جاری کیا جائے تو اس کا نام تہذیب النسواں ہونا چاہئے۔

(۲)

محبی و مشفقی مولوی ممتاز علی صاحب

آپ کا لمبا پرائیویٹ خط کئی دن سے میرے سامنے رکھا ہوا ہے۔ میں اس کے جواب لکھنے کی فرصت ڈھونڈ رہا تھا۔ اس وقت اس کا جواب لکھتا ہوں۔ میری نہایت دلی آرزو ہے کہ عورات کو بھی نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی جائے۔ مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا اُن پر سخت ظلم کرنا اور اُن کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے۔ کنواری لڑکیاں تمام عمر بے شادی کے بلحاظ حالاتِ مُلک کے رہ نہیں سکتیں اور نہ اُن کی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ پس ضرور اُن کی شادی کرنی ہو گی۔ ہماری قوم کے لڑکوں کی جو ابتر و خراب حالت ہے اور بد عادتیں اور بد افعال اُن کے ہیں اور بد اخلاق اور بد طریقہ اُن کا اپنی جوروؤں کے ساتھ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس وقت تمام اشراف خاندانوں میں ایک لڑکا بھی نیک چلن اور خوش اخلاق مہذب و تعلیم یافتہ نہیں نکلنے کا۔ جو اپنی جورو کو اپنا انیس و غمگسار سمجھے۔ کل خاندان کے لڑکوں کا یہ حال ہے۔ جوروؤں کو لونڈیوں سے بدتر سمجھتے ہیں اور کوئی بد اخلاقی ایسی نہیں جو جوروؤں کے ساتھ نہیں برتتے اب خیال کرو بے تربیت لڑکی پر یہ مصیبت صرف ایک حصّہ ہے۔ اس کے خود خیالات عمدہ تہذیب کے نہیں ہیں۔ اس لئے اُس کو اپنے خاوند کی بد اخلاقی صرف بقدر ایک حصّہ کے رنج و مصیبت میں رکھتی ہے اور جبکہ وہ اپنے تمام ہمسروں کا یہی حال دیکھتی ہے تو کسی قدر تسلّی باقی ہے اور اس کے ماں باپ جب اس کی حمایت کرتے ہیں تو اس کے دل کو زیادہ تشفّی ہوتی ہے مگر جب وُہ خود شائستہ و مہذّب و تربیت یافتہ اور عالی خیال ہو تو یہ تمام معلومات اس کی روح کو بہت زیادہ رنج دیتے ہیں اور اس کی زندگی بلائے جان ہو جائے گی۔ عورات کی تعلیم قبل مہذّب ہونے مردوں کے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لئے آفتِ بے درماں ہے۔ یہی باعث ہے کہ میں نے آج تک عورات کی تعلیم میں کچھ نہیں کیا۔ شائستہ و تربیت یافتہ مرد کو نا تربیت یافتہ جوان عورت ملنے سے اُس کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ وہ اپنی تہذیب کے سبب اپنی جورو سے محبت کرتا ہے اور اس کو مہذّب و شائستہ بنا لیتا ہے مگر عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ اس وقت دو ایک مثالیں خاندان میں ایسی موجود ہیں کہ اُنھوں نے اپنی بیویوں کو ایسا پڑھا لکھا لیا ہے اور تعلیم کر لیا ہے کہ بلاشبہ وُہ عورتیں انیس و غمگسار ہونے کے لائق ہو گئی ہیں پس بالفعل عورتوں کو ایسا رکھنا چاہیئے کہ اگر اُن کے شوہر مہذّب ہوں تو اُن کو مہذّب کر سکیں اور اگر نامہذّب ہوں تو اُن کی بیویاں بھی ویسی ہی ہوں۔ فقط خاکسار سید احمد

محمد شمس الدین صدیقی
ایم۔ اے (عثمانیہ)

جیسی روح ویسے فرشتے

(ڈراما)

افراد:

شاہد:۔ ایک متلون المزاج نوجوان جو کسی دفتر میں ملازم ہے۔
ناصر:۔ شاہد کا روشن خیال باپ
احسان:۔ شاہد کا ہونے والا خسر جو نئی روشنی کا دلدادہ ہے۔
رنگین:۔ ناصر کا بے تکلف شاعر دوست
قاضی صاحب نکاح پڑھانے والے

زمانہ:۔ یہی آج کل

مقام:۔ پاکستان یا ہندوستان کا کوئی شہر

(ناصر کے گنگنانے کی آواز۔ کپڑوں کی سرسراہٹ ناصر کپڑے بدل رہا ہے اور بٹن کھولنے میں مصروف ہے)

ناصر۔ (اپنے آپ) کیا بٹن کو بھی اسی وقت ستانا تھا! (جھنجھلا کر) ارے نکل بھی جلدی۔ اونہہ (دانت کٹکٹا کر) اس بٹن کی ایسی تیسی خواہ مخواہ دیر ہو رہی ہے! شاہد تیار بیٹھا ہوگا۔ ادھر احسان صاحب انتظار میں ہوں گے کہ برات ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ سات بجے نکاح مقرر تھا اور اب سات بجنے میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں اور یہ بٹن ہے کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اونہہ —ہا! یہ نکل آیا، جلدی جلدی کپڑے بدل کر اب نکلنا چاہیئے (کپڑوں کی سرسراہٹ) نہیں معلوم شاہد کس حال میں ہے، تیار ہے کہ نہیں خدا معلوم، چل کر دیکھنا چاہیئے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔

(پیروں کی چاپ۔ دروازہ بند ہونے کی آواز)

ناصر۔ (بلند آواز سے) شاہد! شاہد!! چلو جلدی کرو۔ سات بجا چاہتے ہیں۔ سنتے ہو کہ نہیں؟ جواب کیوں نہیں دیتے۔

(دروازہ زور سے کھولنے کی آواز)

ارے! شاہد کہاں غائب ہو گیا۔ عجیب بیوقوف ہے، چمن میں جا کر سوچنے لگا ہوگا کہ خیر اور شر میں کیا فرق ہے، اس فلسفہ نے اُس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ شاہد! (زور سے) شاہد!۔ بیوقوف بھول گیا ہوگا کہ آج اُس کی شادی شاہدہ سے ہونے والی ہے (سامنے سے شاہد کو آتا دیکھ کر) شاہد! یہ کیا ہے تم ابھی تیار نہیں ہوئے؟

شاہد۔ کاہے کے لئے؟

ناصر۔ کاہے کے لئے؟؟ سات بجنے میں اب صرف پانچ منٹ باقی ہیں اور تم ابھی نہائے تک نہیں۔ خیر جلدی سے کپڑے بدل لو

شاہد۔ میرے کپڑے اچھے خاصے تو ہیں۔ بدلنے کی کیا ضرورت ہے۔

ناصر۔ ارے! کیا شادی میں انہیں کپڑوں سے چلو گے؟ سات بج گئے کیا تُم شادی کا وقت بُھول گئے۔

شاہد۔ وقت تو مجھے یاد ہے لیکن . . . .

ناصر۔ لیکن کیا؟

شاہد۔ لیکن میں نے شادی کا ارادہ بدل دیا ہے

ناصر۔ (چکرا کر) کیا؟ ارادہ بدل گیا ہے؟

شاہد۔ (اطمینان کے ساتھ) جی ہاں، میرا خیال ہے کہ میری شادی آج نہیں ہو گی۔

ناصر۔ (بدحواس ہو کر) یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا واقعی تمہارا یہی خیال ہے۔

شاہد۔ جی، یہی میرا خیال ہے۔

ناصر۔ تم آج شادی نہیں کرو گے؟

شاہد۔ جی ہاں میں نے یہی کہا تھا؟

ناصر۔ کیوں؟

شاہد۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔

ناصر۔ کیوں، ارادہ کیوں بدل دیا؟

شاہد۔ اس لئے کہ میں آج شادی کرنے کے مُوڈ میں نہیں ہوں

ناصر۔ واہ یہ بھی کوئی عذر ہے! تم شادی کرنے کے مُوڈ میں نہیں ہو؟

شاہد۔ واقعی میں اس مُوڈ میں نہیں ہوں۔

ناصر۔ یہ کیا لغویت ہے۔ ہوش کے ناخن لو شاہد۔ کیا تم بھول گئے ہو کہ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور احسان صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تمام دعوتی بھی آ چکے ہوں گے۔ قاضی صاحب کو بھی بُلا لیا گیا ہو گا۔

شاہد۔ ہاں ٹھیک ہے، میرا بھی خیال ہے کہ سب آ گئے ہوں گے

ناصر۔ پھر بھی تم مُوڈ میں نہیں ہو؟ اور اُن سب کا کیا ہو گا؟

شاہد۔ واپس ہو جائیں گے۔ وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔

ناصر۔ کیا بکواس کر رہے ہو، شاہد بیوقوف نہ بنو۔ چلو سب منتظر ہوں گے۔

شاہد۔ لیکن میں اپنے مُوڈ کو کیا کروں۔

ناصر۔ مُوڈ جائے بھاڑ میں —— (ذرا تھم کر فہمائش کے انداز میں) دیکھو شاہد! ذرا سوچو لوگ کیا کہیں گے۔

شاہد۔ عوام کی میری نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں۔ وُہ جو چاہیں کہیں

ناصر۔ اور شاہدہ کو کتنا رنج ہو گا؟

شاہد۔ چند دنوں میں دور ہو جائے گا۔ رنج و غم ایک عارضی چیز ہے

ناصر۔ اوہ! تجھے کیا ہو گیا شاہد؟

شاہد۔ کچھ نہیں۔

ناصر۔ پھر یہ کیا حماقت ہے؟

شاہد۔ کچھ نہیں۔ میں نے صرف اپنا ارادہ بدل دیا ہے اور انسان کے کام زیادہ تر اُس کے ارادہ کے تابع ہوتے ہیں۔

ناصر۔ میں تمہیں کیونکر سمجھاؤں۔ ٹھہرو میں قاضی صاحب کو بلا لاتا ہوں

(ناصر تیز تیز جاتا ہے اور احسان صاحب آتے ہیں)

احسان۔ کیوں شاہد بڑی دیر ہو گئی۔ موسم آج کس قدر عمدہ ہے چلو وہاں سب انتظار میں بیٹھے ہیں (ادھر اُدھر نظر دوڑا کر اور شاہد کو معمولی لباس میں دیکھ کر) ایں کیا بات ہے۔ کیا ہوا؟

شاہد۔ میں آج شام شادی کرنا نہیں چاہتا۔

احسان۔ کیا؟ آج شام شادی کرنا نہیں چاہتے۔ کیوں؟ کیا ہوا؟

شاہد۔ ہوا کیا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔

احسان۔ ارے یہ کیا لغویت ہے، تمام انتظامات مکمل ہیں۔ میں نے ایک ہزار روپیہ خرچ کر دیا آج کی شادی کے لئے۔ اور تم آج

شادی نہیں کرو گے، کیوں؟

شاہد۔ اس لئے کہ میں آج شادی کے موڈ میں نہیں ہوں۔

احسان۔ موڈ میں نہیں؟ خوب کیا عمدہ جواب ہے، شریر کہیں کا (دانت کٹکٹاتا ہے)

(شاہد غیر متاثر اطمینان سے آرام کرسی پر بیٹھا ہے)

احسان۔ کیوں بھلا آج تم موڈ میں کیوں نہیں (غصہ لہجہ سے ظاہر ہے)

شاہد۔ اب اس کیوں کا کیا جواب؟ اس لئے کہ نہیں ہوں۔

احسان۔ خیر، دیکھ لوں گا، لیکن اس مغالطہ میں نہ رہنا کہ تم نے آج شادی نہیں کی تو میں شاہدہ کی شادی کسی اور سے نہیں کروں گا۔ تمہارے ایسے ہزاروں اس کے خواستگار موجود ہیں میں نے تمہیں اس لئے منتخب کیا تھا کہ تم تعلیمیافتہ اور عقلمند ہو۔ . . .

شاہد۔ اور اس لئے کہ برسرِ ملازمت بھی ہو۔

احسان (سُنی ان سُنی کرکے) لیکن تم تو کورے نکلے بیوقوف، پاجی کہیں کے۔ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا؟

شاہد۔ اس وقت میں نے ارادہ نہیں بدلا تھا

احسان۔ اور یہ ارادہ آج کیوں بدل گیا؟

شاہد۔ کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں شادی کے موڈ ہی میں نہیں، اس لئے ارادہ بدل گیا۔

(ناصر قاضی صاحب کو لئے داخل ہوتا ہے)

قاضی السلام علیکم

شاہد۔ وعلیکم السلام

قاضی۔ (شاہد سے) تمہارے والد نے مجھے ابھی ابھی تبلایا کہ تم نے ارادہ بدل دیا ہے۔ کیا واقعی؟

شاہد۔ جی ہاں۔

قاضی۔ یقیناً تم اس وقت سنجیدہ نہیں ہو۔

شاہد۔ کیوں؟

قاضی۔ تم ہرگز ہرگز اس وقت سنجیدہ نہیں ہو۔ کیونکہ تم تو اپنی عقلمندی اور سلامتی طبع کے لئے مشہور ہو۔ پھر یہ حماقت کیوں کر تم سے ہو سکتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ صرف ذرا سا جوش اور ضد ہے اور بس۔ اور یہ تم میں کوئی پہلی مرتبہ نہیں دیکھ رہا ہوں۔ ایسے بہت سے واقعات میں نے دیکھے ہیں۔ کیا تمہارے پاس حقیقت میں انکار کی کوئی وجہ نہیں؟

شاہد۔ وجہ یہی تو ہے کہ میں نے ارادہ بدل دیا ہے

قاضی۔ ٹھیک ہے ٹھیک، میں نے کہا نا، بعض وقت ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن تمہیں شرمانے کی کیا بات ہے، یہ کوئی قابلِ شرم بات نہیں۔ لو تم جلدی سے کپڑے تو بدل لو۔ دیکھو تم پھر اپنا ارادہ بدل دوگے۔ گزشتہ ہفتہ کے اخبار میں میں نے ایک ایسا ہی واقعہ پڑھا تھا۔ ایک پروفیسر صاحب نے۔ سنتے ہو؟ پروفیسر نے اسی طرح اپنا ارادہ یکایک بدل دیا۔ لیکن جب انہوں نے دولھا کے کپڑے پہن لئے تو خود بخود شادی کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لو چلو جلدی سے بدل لو۔ ہم باہر تمہارا انتظار کرتے ہیں۔ جلدی آؤ۔

(قاضی صاحب یہ کہہ کر دروازے کی طرف جانا چاہتے ہیں ناصر اور احسان بھی یہ سمجھ کر کہ قاضی صاحب کی باتوں نے اس پر اثر کیا، دروازہ کی طرف بڑھتے ہیں)

شاہد۔ لیکن میں موڈ ہی میں نہیں ہوں۔

قاضی۔ تم گھبرا کیوں رہے ہو۔ شادی میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے تمہیں گھبراہٹ یا پریشانی ہو۔

شاہد۔ لیکن میں اپنے موڈ کو کیا کروں؟

(ناصر اور احسان پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ قاضی صاحب

بھی گھبرا کر کھانسنے لگتے ہیں۔ اپنے حربے کے بیکار جانے سے
وُہ پریشان ہیں کہ کیا کریں)

قاضی۔ شاہد کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری اس ضد سے تمہارے والد کو، احسان صاحب کو اور خود تمہاری ہونے والی بیوی کو کتنا رنج اور کتنی کوفت ہوگی؟

شاہد۔ وُہ اس پر قابو پالیں گے۔

قاضی۔ لیکن دُنیا کیا کہے گی۔

شاہد۔ کہا کرے۔

ناصر۔ دیکھو شاہد . . .

(قاضی صاحب ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں)

قاضی۔ نہ، نہ، خفا نہ ہوجیئے ناصر صاحب میں سمجھ گیا کہ شاہد کو کیا ہوگیا ہے۔ یہ ایک عارضی کیفیت ہے۔ یہ جذبہ خوف کی ایک قسم ہے۔

شاہد۔ خوف؟ مجھے کس کا ڈر ہے؟ میں کسی سے ڈر کر نہیں انکار کر رہا ہوں۔

قاضی۔ تم اس سے لاکھ انکار کرو۔ لیکن تم یقیناً ڈر رہے ہو۔ کیا واقعی تمہارے انکار کی کوئی وجہ نہیں؟

ناصر۔ ہاں ہاں وجہ تو ہے اور بڑی معقول —— (غصّہ میں)

(قاضی ہاتھ کے اشارہ سے روکتا ہے)

احسان۔ پاجی پن اور کیا وجہ ——

(قاضی ہاتھ کے اشارہ سے روکتا ہے)

قاضی۔ شاہد دیکھ رہے ہو، تمہارے انکار سے تمہارے متعلق کیا رائے قائم کی جانے لگی ہے

شاہد۔ یہ چند روزہ ہے، عارضی ہے، اس کی مجھے کوئی پروا نہیں۔

احسان۔ سمجھتا ہے کہ شاہدہ اور کسی سے بیاہی نہیں جائے گی۔ آج شام شادی نہیں کرے گا۔ کبھی اور دن کرے گا۔ جب موڈ آئے بدمعاش ——

(قاضی گھور کر دیکھتا ہے اور منع کرتا ہے)

قاضی۔ احسان صاحب، ذرا اپنی زبان بند ہی رکھئے، مجھے گفتگو کرنے دیجئے (شاہد سے) شاہد! کل تم سارے شہر میں بدنام ہوجاؤ گے تمہارے والد بدنام ہوجائیں گے۔ احسان صاحب اور اُن کی لڑکی بدنام ہوجائے گی۔ تم جب باہر نکلو گے تو تم پر اُنگلیاں اُٹھیں گی اور لوگ کہیں گے یہ وہی ہے جس نے عین شادی کے وقت شادی کرنے سے بے وجہ انکار کردیا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوں گی۔ کیا تمہیں اس بدنامی کا خیال نہیں آتا ——

شاہد (سر کے اشارہ سے انکار کرتا ہے) یہ سب عارضی ہے۔

قاضی۔ اور کیا تمہیں شاہدہ جیسی بیوی کے چھوٹ جانے کا رنج نہیں؟ چلو بس بہت مذاق کرتے رہے۔ لو اب کپڑے بدل لو۔ ہم تمہارا باہر انتظار کرتے ہیں۔ آدھ گھنٹہ کی دیر سے کچھ نہیں ہوگا اور اگر تم چاہو تو اس دیر کی ذمہ داری مجھ پر رکھ سکتے ہو۔

شاہد۔ آخری بار —— نہیں!

(قاضی صاحب غصّے میں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

قاضی۔ ناصر صاحب میں معافی چاہتا ہوں، اس سے زیادہ میں اور کیا کرسکتا تھا۔

(سب شاہد کو گھورتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے۔ اور رنگین صاحب داخل ہوتے ہیں)

رنگین۔ ہلو، شاہد کیا کر رہے ہو۔ دیکھو کیسی عمدہ شام ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی موسم بہار کی ہوا اور شادی! اوہ کتنا اچھا میل ہے۔ شاہد مجھے تم پر رشک آ رہا ہے، کاش میں تمہاری جگہ ہوتا۔ ہائے کیا اچھا موسم ہے ہیں۔ لیکن تم نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے۔ کیوں ناصر صاحب کیا انگلو

کا وقت نہیں ہوا۔

ناصر۔ وقت ہوگیا۔ لیکن آج شادی نہیں ہوگی۔

رنگین۔ نہیں ہوگی؟ کیوں؟

ناصر۔ (طنز سے) شاہد موڈ میں نہیں ہے۔ اُس نے ارادہ بدل دیا ہے

رنگین۔ کیوں شاہد، واقعی آج شادی نہیں کروگے؟ حیرت انگیز! موسم بہار کی اس قدر عمدہ شام اور شاہد شادی نہیں کرے گا۔ شاہدہ جیسی دلہن اس موسم میں اور کیا چاہئے شاہد؟

شاہد۔ لیکن میں کیوں کروں؟

رنگین۔ کیا؟ کیوں کروں؟ تمہیں ہوا کیا۔ کیا تم میں تخیل اور تصوّر کی صلاحیت ہی نہیں۔

شاہد۔ کا ہے کی صلاحیت؟

رنگین۔ ارے میاں تخیل کی، تصوّر کی۔ ارے تم تو بےحس بُت کی طرح ہو۔ اس عمدہ شام کو شاہدہ جیسی حسین بیوی سے تم انکار کر رہے ہو۔ ہائے رے بدمذاقی۔ اگر تم میں کچھ تصوّر کرنے کچھ تخیل سے کام لینے کی صلاحیت ہوتی تو سر کے بل جاتے سر کے بل۔ ارے بیوقوف۔ ایسے عمدہ موقع کو چھوڑ رہا ہے۔

ناصر۔ سمجھاتے سمجھاتے ہم تو تھک گئے۔ اب تم ہی کچھ سمجھاؤ رنگین۔

رنگین۔ ارے اس میں سمجھنے سمجھانے کا معاملہ ہی کیا ہے۔ لو دیکھو شاہد ابھی چلتا ہے (شاہد کے قریب جاکر) شاہد یہ تو یقینی ہے کہ تم لکڑی کے بنے ہوئے نہیں ہو۔ گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان ہو۔ تم جذبات و احساسات کے مالک ہو۔ اور تم تو شاہدہ کے ثناخوان بھی ہو اس سے محبت بھی کرتے ہو لیکن جس چیز کی کمی ہے وہ یہ کہ تم نے اب تک کسی دوشیزہ کا بوسہ نہیں لیا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟

شاہد۔ نہیں (چہرہ پر سرخی کی لہر دوڑ جاتی ہے)

رنگین۔ میں نے کہا نا تم نہیں جانتے کہ ایک لڑکی کا پیار کیا چیز ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ڈرتے تھے۔ تم نے شاہدہ سے گفتگو بھی کی ہے۔ اس کے ساتھ باغوں میں ٹہلے بھی ہو لیکن . . . . . .

قاضی۔ (ٹوک کر) لیکن رنگین صاحب آپ کو اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

رنگین۔ اجی قاضی صاحب آپ ان باتوں کا لطف کیا جانیں۔ یہ تو تخیل اور تصوّر کی باتیں ہیں (شاہد سے) شاہد! تم نہیں جانتے یہ کتنی بڑی دولت ہے کتنی بڑی نعمت ہے۔ ذرا تصوّر تو کرو شاہدہ جیسی خوبصورت لڑکی تمہاری بیوی ہوگی۔ تم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُسے محبت سے دیکھ رہے ہوگے اور اُس کے پتلے پتلے گلاب کی سی پنکھڑیوں والے ہونٹ . . . . ارے ظالم کیا اس کا تصوّر ہی تجھے مسرت سے معمور نہیں کر دیتا؟ (شاہد متاثر معلوم ہوتا ہے) ذرا تصوّر تو کرو، جب تم دفتر سے تھکے تھکائے آؤ گے تو تمہاری شاہدہ مسکراتے ہوئے تمہارا خیر مقدم کرے گی اور تمہاری ساری تھکن ایک لمحے میں دور ہو جائے گی۔ ارے ظالم کیا اس مسرت سے تجھے انکار ہے؟ کیا یہ حقیقی مسرت نہیں؟

شاہد۔ (متاثر ہوکر) یقیناً یہی سچی مسرت ہے۔

رنگین۔ اور تم اس مسرت سے ابھی ابھی انکار کر رہے تھے۔ چلو جلدی سے کپڑے پہن لو۔ یہ موقع بھلا انکار کرنے کا ہے؟

(شاہد فوراً اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کپڑے بدلنے لگتا ہے۔ سب باہر چلے جاتے ہیں۔ سب کے چہروں پر بشاشت اور رونق ہے۔ رنگین صاحب کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ہے۔ احسان صاحب آگے چلے جاتے ہیں)

شاہد۔ (کچھ دیر بعد باہر آکر) چلئے میں تیار ہوں۔

ناصر۔ چلو۔ چلو۔ خدا کا شکر ہے کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔

(موٹر میں بیٹھ کر موٹر اسٹارٹ ہی کرتے ہیں کہ احسان صاحب بوکھلائے ہوئے آتے ہیں)

قاضی۔ کیا ہوا؟ احسان صاحب آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟

احسان۔ شاہدہ! شاہدہ! . . .   **شاہد۔** کیا ہوا شاہدہ کو؟ (گھبراکر) کیا ہوا؟

احسان۔ شاہدہ حمید کے ساتھ بھاگ گئی۔   **ناصر۔** حمید کون؟

احسان۔ اُس کا ایک ہم جماعت تھا۔

(سب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

پردہ گرتا ہے   (پلاٹ ماخوذ از جوکوری)

حامد علی خاں

تلفّظ کی غلطیاں

(ایک مکالمہ)

آصف: تو شہید صاحب! ماحصل اس تمام گفتگو کا یہ ہے کہ ہم لوگوں کو ہاتھ پیر ہلانے چاہئیں۔ جب تک ہم میں سے ایک ایک شخص کام نہیں کرے گا، ملک خوش حال نہیں ہو سکتا ہم پاکستان کو "ٹکر گداؤں" کا وطن نہیں بنانا چاہتے۔

شہید: قبلہ مجھے آپ کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے، البتہ اس "ٹکر گداؤں" کے معاملے میں کچھ اختلاف ضرور ہے۔

آصف: یعنی آپ گداگری کا فروغ چاہتے ہیں؟

شہید: میرا یہ مطلب تو قطعاً نہیں، مگر یہ "ٹکر گدا" تو آج آپ ہی سے سنا، آخر یہ "ٹکر" ہے کیا چیز؟

آصف: میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ روٹی کے ٹکڑے کو لوگ "ٹکر" کہتے ہیں شاید....

شہید: الٰہی تیرا شکر!

آصف: شکر تو خیر بہرحال واجب ہے، مگر کیا میں پوچھ سکتا ہوں، اس وقت شکر گزاری کا خاص موقع کیا ہے؟

شہید: یہی کہ آپ نے کم از کم ٹکڑے کو تو "ٹکڑے" نہیں کہا

آصف: بھئی میں تو یہ پہیلیاں بوجھ نہیں سکتا۔ صاف بات کہو

شہید: تو صاف بات یہ ہے کہ "ٹکڑ گدا" کہئے۔ "ٹکڑ" ٹکڑے ہی کا مخفّف ہے۔ اس لئے اس میں نہ ک مشدّد ہو سکتا ہے نہ ڑ کی جگہ ر کو مل سکتی ہے۔ "ٹکر" مقامی دیہاتی لفظ ہو تو ہو، مگر ہماری قومی زبان اردو کا تو کوئی مستعمل لفظ نہیں ہے

آصف: شکریہ! آپ نے یہ خوب توجہ دلائی --- میں ہمیشہ اس لفظ کا تلفّظ غلط ہی کرتا رہا ہوں۔

شہید۔ ہاں تو آپ کا یہ ارشاد لفظاً بہ لفظاً اور حرف بہ حرف صحیح ہے کہ ہمیں اس وقت عمل اور متحدہ عمل کی ضرورت ہے۔

آصف: جی ہاں، یہ گروہ بندیاں اور "جتّھا بندیاں" ہمیں کہیں کا نہ رکھیں گی۔ زندہ قوموں کے متحدہ عمل نے بارہا ڈوبتی کشتیوں کو بھی پار لگایا ہے۔ ع

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ "گردوں" یوں بھی دیکھے ہیں

شہید: آپ کے خیالات، آصف صاحب! نہایت پاکیزہ ہیں، لیکن معاف فرمائیے زبان کے متعلق گفتگو کرنے کا مجھے کچھ مرض سا ہے۔

آصف: شہید صاحب اگر یہ مرض ہے، تو بڑا مبارک مرض ہے۔ زبان کا صحیح اور باقاعدہ استعمال تو ہماری قومی تنظیم کا ایک جزو ہے۔ زبان قوم کی زندگی کی ترجمان ہے۔ میں نے اگر کوئی غلطی کی ہے تو ضرور مجھے بتائیے

شہید: مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ گروہ بندی پر آپ نے جتھا بندی کا ناحق اضافہ کیا۔ یہ ہم معنی الفاظ ہیں اور گروہ بندی زیادہ فصیح بھی ہے، خیر یہ تو دوسرا سوال ہے، مگر میں پوچھتا ہوں۔ آپ نے جتھا کو جتّھا کیوں کہا؟

آصف: بھئی صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا۔ یہ آپ ہی سے آج معلوم ہوا کہ لفظ جبتّا نہیں جُبَّا ہے۔ یہ میرا تشدید کا شوق تو زبان پر اچھا خاصا تشدد معلوم ہوتا ہے۔

شہید: (ہنس کر) دوسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے۔ ع
کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں، کوئی بات نہیں، اور تعجب تو یہ ہے کہ آپ بھی اس مشہور مصرع کو یوں پڑھتے ہیں۔

آصف: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!

شہید: مطلب یہ ہے کہ "چرخِ گردوں" مت کہئے "چرخِ گرداں" کہئے۔ "گردوں" تو خود چرخ ہی کا دوسرا نام ہے، البتہ چرخِ گرداں سے مراد ہے گردش کرنے والا آسمان! چرخِ گردوں کہنا تو ایسا ہی مہمل ہے جیسے کوئی کہے "آسمانِ فلک"۔

آصف: (ہنس کر) لاحول ولا قوۃ ــــ ایک حرف کے ادل بدل نے پورے مصرع کو مہمل بنا دیا۔ خدا کے لئے میری گفتگو کو ذرا غور سے سنا کیجئے تاکہ میں اس قسم کی ٹھوکروں سے بچوں۔

شہید: آپ کے اخلاص اور سلیم الطبعی کی وجہ سے میں یہ جرأت کرتا ہوں۔ ورنہ بعض لوگ تو بُرا مان جاتے ہیں۔

آصف: نہیں صاحب میں تو "آنِ عالم" حضرات میں سے نہیں ہوں، نہ مجھے زبان دانی کا "گھمنڈ" ہے۔

شہید: "گھمنڈ" کہیئے نا! "گھمنڈ" تو ہے بادلوں کا ہجوم۔ اُمڈنا گھمنڈنا آپ نے سُنا ہوگا ــــ کسی گیت کا بول ہے۔

اُمنڈ گھمنڈ کر بدرا آوے

آصف: شکریہ، تو میں کہہ رہا تھا زبان دانی کا گھمنڈ مجھے نہیں ہے۔ وُہ کوئی اور ہوں گے جو غلطی جتانے پر بگڑتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے! گدھا کیا جانے زعفران کی بہار۔ شہید صاحب اپنی قدر ہمارے دل سے پوچھئے۔ ذہنی ترقی کے لئے لازم ہے کہ ہم سب طالب علمی کی زندگی گزاریں۔ دیکھئے نا جو کچھ آپ نے بتایا، مجھے سب یاد ہو گیا۔ "مُلکہ گدا" نہیں "ملکڑ گدا" کہنا چاہیئے۔ "جبتّا" غلط ہے "جُبَّا" صحیح ہے "چرخِ گردوں" مہمل ہے اور "چرخِ گرداں" سے مراد ہے گردش کرنے والا آسمان۔ غرور کا ہم معنی لفظ گھمنڈ نہیں بلکہ گھمنڈ ہے۔ کیوں درست ہے نا!

شہید۔ جی ہاں "لفظ بہ لفظ" بالکل درست!

(شکریہ ریڈیو پاکستان)

مُستحسن تصرّف

(آرزو لکھنوی)

انیس فرماتے ہیں:۔

کودکی، پیری، جوانی، دیکھ لی   تین دن کی زندگانی دیکھ لی

محاورے میں "دو دن" یا "چار دن" کی زندگی ہے جس کا مفہوم قلتِ زمانہ ہے، تعدادِ معیّنہ نہیں۔ مگر قادر الکلام مصنف تین زمانے ظاہر کرنے کے بعد "تین دن کی زندگی" کہہ کر وُہ معنی آفرینی کر رہا ہے جو اُسی کے لئے ہے کہ محاورہ غلط ہونے کے بدلے نئے جامے میں آکر دوسرا محاورہ بن گیا۔ محاورے میں ایسا تصرّف جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے۔

مَنشُورات

قائدِ اعظم زندہ باد

وہ شمع بجھ گئی مگر اُس کے ... نور سے	بزمِ وطن ہے بزمِ چراغاں اُسی طرح
دیکھو تو اُس کے کوکبِ اقبال کا عروج	سہمی ہوئی ہے گردشِ دوراں اُسی طرح

بالیدہ ہے زمینِ وطن کے نمو میں وُہ
مضطر ہے مثلِ شعلہ ہمارے لہو میں وُہ

عابد

۲۵ دسمبر (۱۸۷۶ء) عہدِ حاضر کے سب سے بڑے مسلمان رہنما حضرت محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کا یومِ ولادت ہے۔

جس وقت ہندوستان کے مسلمان مختلف سیاسی اور غیر سیاسی فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور کسی واضح نصب العین کی غیر موجودگی میں من حیث القوم اُن پر جمود اور افسردگی اور بے یقینی اور یاس کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، اور اُن کا قومی وجود ہی ابدی موت سے ہمکنار ہو رہا تھا، اُس وقت قائدِ اعظمؒ نے اس افسردہ جسم میں رُوح پھونکنے، اس بھٹکے اور بکھرے ہوئے کارواں کو راہ پر لانے، اور اُسے منزلِ مقصود تک پہنچانے کا کام اپنے ذمے لیا۔

۱۹۳۴ء میں قائدِ اعظمؒ نے مسلم لیگ کی از سرِ نو تنظیم شروع کی۔ اس سے کچھ پہلے لنڈن کی گول میز کانفرنس کے جلسوں میں ہندو نمائندوں کا طرزِ عمل دیکھ کر قائدِ اعظمؒ کو یقین ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کا مقصد ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ حکومت قائم کرنے کے بجائے پُورے برِاعظم پر صرف ہندوؤں کا سیاسی اور معاشری غلبہ حاصل کرنا ہے۔ یہ اس برِاعظم میں مسلمانوں کے وجود کے لئے ایک شدید خطرے کا اوّلین احساس تھا۔ اس کے بعد ملک میں کانگریسی وزارتوں کے مستبدانہ اور متعصبانہ اعمال سے دوسرے مسلمان رہنماؤں کو بھی یقین ہو گیا کہ قائدِ اعظم کو جن خطرات کا احساس ہُوا تھا وہ فی الواقع اب درپیش ہیں۔

۱۹۳۷ء میں خود حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے حضرت قائدِ اعظم کو ایک خط میں لکھا:-

"اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی کی وہ ذات ہے جس پر مسلمان اپنی رہنمائی کے لئے اعتماد کر سکتے ہیں۔ بالخصوص ایسے زمانے میں جب کہ شمال مغربی ہندوستان پر ایک طوفان اُمڈا چلا آ رہا ہے اور شمال مغربی ہندوستان ہی پر کیا موقوف ہے،"

یہ طوفان تو شاید سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہم اس وقت خانہ جنگی کی فضا میں جی رہے ہیں اور اگر (انگریزی) فوج اور پولیس نہ ہوتی تو یہ خانہ جنگی آنکھ جھپکتے میں ملک گیر شکل اختیار کر لیتی" +

مسلمان اس شکنجے میں تھے، جب قائدِ اعظم نے ملّت کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی مسلمان اپنے مسیحا سے اپنے مرض کا علاج دریافت کر رہے تھے۔ یہ علاج تھا پاکستان جس کے حصول کی جدّ و جہد ۱۹۴۰ء میں بطور ایک واضح نصب العین کے خود" قائدِ اعظم" کی قیادت میں مسلمانوں نے شروع کر دی۔ پاکستان کا مطلب اس وقت یہ تھا کہ برِ اعظم ہند کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کر کے اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو الگ الگ خود مختار حکومتیں قائم کی جائیں +

ایک وقت آئے گا

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ آپ ہندو ہیں یا مسلمان یا پارسی یا عیسائی، مجھے آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ آج خواہ مجھ پر کتنی ہی سخت نکتہ چینی ہو رہی ہے، مجھ پر کتنے ہی شدید حملے کئے جا رہے ہیں ۔۔۔ اور بعض لوگ تو مجھ پر نفرت پھیلانے کا الزام بھی لگاتے ہیں ـــ لیکن یاد رکھئے اور مجھے اس بات کا صدقِ دل سے یقین ہے کہ ایک وقت ایسا آئیگا جب مسلمان ہی نہیں عظیم الشان ہندو قوم بھی ـــ میری زندگی میں نہیں تو میری موت کے بعد ـــ میرے نام اور میری یاد کو دعائیں دیگی۔

قائدِ اعظمؒ

قائدِ اعظم کو یقین کامل تھا کہ وہ بہ فضلِ ایزدی مسلمانوں کے لئے ایک الگ آزاد حکومت قائم کر کے رہیں گے۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں بمقام الٰہ آباد انہوں نے اخبار نویسوں کی ایک انجمن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :-

"مجھے اُمید ہے کہ میں اپنی زندگی ہی میں اُس نصب العین کی تکمیل دیکھ لوں گا جس کے لئے مَیں جدّ و جہد کر رہا ہوں اور جو سب کی بہتری کے لئے ہے لیکن اگر مَیں اسے نہ دیکھ سکا تو پھر ـــ میرا کوئی بیٹا تو نہیں ہے جو میرا وارث ہو مگر ـــ کوئی شخص جو میرے نصب العین کا وارث ہوگا وہ اسے ایک تکمیل یافتہ حقیقت کے طور پر دیکھ لے گا"

قائدِ اعظم نے اپنی زندگی ہی میں ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنی انتھک کوششوں کا ثمر، یعنی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا قیام حصول پاکستان کی صورت میں دیکھ لیا ـــ مگر اب قائدِ اعظم کی زندگی کا ایک اور بھی زیادہ اہم اور جان کاہ محنت کا کام شروع ہُوا کیونکہ دشمن پاکستان کو قائم ہوتے ہی تباہ و برباد کر دینے پر تلے بیٹھے تھے چنانچہ پاکستان کے گورنر جنرل ہونے کے بعد "قائدِ اعظم" تادمِ مرگ ملک کے سب سے زیادہ مصروف اور سب سے زیادہ محنت کش فرد رہے۔ ستّر سال کی عمر میں شب و روز کی یہ جاں فرسا محنت ایک نئے عزم سے شروع ہوئی اور پاکستان کو دشمنوں سے بچانے اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے آخری دم تک تگ و دو کرتے ہُوئے ملّتِ اسلامیہ کا یہ بوڑھا معمار باپ اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت میں جا پہنچا۔

ہمدردئ بنی نوعِ انسان

لاکھوں آدمی امن اور اطمینان میں بسر کر رہے ہیں اور انہیں زندگی کے تمام آرام حاصل ہیں لیکن ان کے ان گنت بھائی ـــ بنی نوعِ انسان ـــ مدتوں سے دکھ درد جھیل چکے ہیں اور سبھی ناقابل برداشت مصائب کا شکار رہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اہل اللہ رضا کارانہ طور پر اُن کے لئے اپنے عیش و آرام اور مادّی املاک کی بڑی سے بڑی قربانی پیش کریں +

قائدِ اعظم

وصلّی اللہ علیٰ نورٍ کزو شد نورہا پیدا

جس طرح حضرت قائدِاعظم کو حصولِ پاکستان کا یقینِ کامل تھا اُسی طرح انہیں یہ بھی یقین تھا کہ میرا ملک اور میری قوم ترقی و سربلندی کے انتہائی مدارج طے کرے گی ۔ ایک موقع پر قائدِاعظم نے فرمایا تھا :۔

" اگرچہ مَیں اُس وقت تم میں موجود نہیں ہوں گا لیکن مَیں تمہیں بتا سکتا ہوں اور تم دیکھ لوگے کہ چند ہی سال میں ملّتِ پاکستان کا شمار دُنیا کی سب سے بڑی قوموں میں ہوگا ۔ اور دُنیا کی ہر حکومت اور ہر قوم اس کی دوستی کی خواہاں ہوگی ۔ مہاجرین پاکستان پر کوئی بوجھ نہیں ہیں بلکہ وہ پاکستان کی دولت ہیں پاکستان کو اُن کی وجہ سے اور زیادہ طاقت حاصل ہوگئی ہے ۔ حکومتِ پاکستان اُن کی تکالیف کو رفع کرنے کے لئے انتہائی جدوجہد کرے گی ۔ مگر کوئی خوددار آدمی خیرات پر بسر نہیں کر سکتا ۔ مہاجرین کو بھی ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے ۔ انہیں بیکار نہیں بیٹھنا چاہیئے بلکہ جس کو جو کاروبار ملے اُسے محنت سے شروع کر دینا چاہیئے ۔ اس طرح وہ پاکستان کی اور اپنی حکومت کی مدد کریں گے ۔ مَیں اُن کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان اُن کے لئے امن اور سلامتی کی منزل ہے ۔ دُنیا کی کوئی طاقت اب پاکستان کو نہیں مٹا سکتی ۔ پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور بفضلِ خُدا قائم رہے گا ۔ پاکستان کی ترقی مہاجرین کی ترقی ہوگی اور پاکستان کی خوشحالی اُن سب کی خوشحالی "

پاکستان اور اہلِ پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے متعلق قائدِاعظم کی یہ توقعات اُسی صورت میں پوری ہو سکتی ہیں کہ ہر پاکستانی محنت کشی اور دیانت داری کی زندگی گزارے اور قوم کے مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دے ۔ قائدِاعظم کا ارشاد ہے کہ مسلمان متحد اور منظم رہیں اور اپنے بلند نصب العین کی صحت پر یقینِ محکم رکھیں ۔

خدا کا شکر ہے کہ پاکستان کے مسلمان بڑی حد تک متحد اور منظم ہو چکے ہیں اور وہ اسلام کے لئے اور پاکستان کے لئے جان و مال قربان کرنے کے لئے اب بھی اُسی طرح تیار ہیں جس طرح قائدِاعظمؒ کی زندگی میں تھے ۔ بلکہ اب دوسرے اسلامی ممالک بھی قائدِاعظمؒ کے نصب العین کی اہمیت کو سمجھ چکے ہیں اور ان کے بہت سے رہنما قائدِاعظمؒ کو تمام عالمِ اسلام کا قائدِاعظم تسلیم کر چکے ہیں ۔ ہمیں اب اپنی عظیم الشان ذمہ داریوں کا احساس ہو چکا ہے ۔ پاکستان کے مسلمان اور دوسرے پاکستانی انشاءاللہ بابائے ملّت کی وراثت کے اہل ثابت ہوں گے اور ہم قائدِاعظمؒ کی روح سے شرمسار نہیں ہونے پائیں گے ۔ پاکستان زندہ باد !

میراجی کا انتقال

ہمیں اس اطلاع سے بہت رنج ہوا کہ ۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو میراجی جو اُردو کے جدید مسلکِ شاعری کے ایک مشہور رکن تھے ، بمبئی کے ایک ہسپتال میں انتقال فرما گئے ۔ میراجی کا اصل نام ثناءاللہ تھا ۔ لیکن جس طرح ان کی عام زندگی کا اسلوب انوکھا تھا اُسی طرح اُنہوں نے اپنے ادبی وجود کو بھی انوکھے طور پر اِس نسوانی نام سے منسوب کر لیا ۔ میراجی اردو میں جدید مسلکِ شعر کے اولیں علم برداروں میں سے تھے ۔ جہاں اُن کی شاعری نے نئے شاعروں کے لئے نئی راہیں پیدا کیں وہیں انہوں نے اپنے ہم خیالوں کو جو اس وقت بہت خال خال تھے بیحد تقویت بھی

دی۔اردو نظم کی جدید تحریکات میں انہوں نے اتنا اہم حصہ لیا ہے کہ ان کا نام اپنی بے وقت موت کے باوجود ہماری ادبی تاریخ میں دیر تک زندہ رہے گا۔ میراجی اپنے دوستوں کے مخلص دوست اور بے حد شریف اور بااصول آدمی تھے۔ حق مغفرت کرے۔

کمیونسٹ ادیبوں اور اخبار نویسوں کا جلسہ

گزشتہ مہینے باغ جناح (لاہور) میں کمیونسٹ ادیبوں اور اخبار نویسوں کا ایک ہنگامہ خیز جلسہ ہوا۔ ادیبوں کے اس جلسے میں کچھ "بے ادبی" کے مظاہرے بھی ہوئے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ناچ گانے اور تقریروں کے عام پروگرام کے دوران میں کسی ہندوستانی شاعر کی ایک ایسی نظم بھی گائی گئی جس میں ہمارے وطن کے وجود پر ناروا حملے کئے گئے تھے۔ اسے سن کر پاکستانی نوجوانوں نے قدرۃً بہ طور احتجاج "قائد اعظم زندہ باد" اور "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگائے۔ اس پر ایک طوفانِ بے تمیزی برپا ہو گیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض گمراہوں یا غیر ملکی جاسوسوں نے چوری چھپے "پاکستان مردہ باد" کے دو تین نعرے لگا کر اپنے دل کے ارمان بھی نکال لئے۔ ع

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

ہمیں کمیونسٹ ادیبوں کے جلسے کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ نہ ہمیں ان کے اچھے اور برے خیالات سے کوئی سروکار ہے۔ لیکن ہمیں تعجب ضرور ہے کہ جب ان کمیونسٹوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم پاکستان اور اہلِ پاکستان کے سچے عاشق ہیں تو پھر انہوں نے ان بدنفسوں کے یہ گستاخانہ نعرے کیوں خاموشی سے برداشت کر لئے۔ یہ لوگ ناچتے گاتے اور ڈھول بجاتے تو رہے لیکن کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ پاکستان کے ان بدخواہوں اور بداندیش حاسدوں کی مذمت میں چھوٹے منہ سے ایک حرف بھی نکالتا جنہوں نے ان کے وطن کی موت کی بددعاؤں کے لئے منہ پھاڑے تھے۔ آخر یہ کیسی "کمیونزم" اور "ترقی" ہے جو ملک و ملت کی بربادی اور موت کے خواہشمندوں سے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہے؟

قلعہ میں "قبر پرستی"

قلعۂ لاہور کا قدیم مغربی دروازہ انگریزوں نے تقریباً ایک صدی قبل مستقلاً بند کر دیا تھا۔ اس دروازے کے متعلق لاہور کے مسلمانوں میں یہ روایت مشہور تھی کہ انگریز اس کو کھول ہی نہیں سکتے۔ اور اب یہ اسی وقت کھلے گا جب ملک پر دوبارہ مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔ ۱۰ نومبر ۱۹۴۹ء کو پنجاب کے مسلمان گورنر نے اورنگ زیب کے اس دروازے کے افتتاح سے زبانِ خلق کی تصدیق کر دی۔ ایک صاحب نے ایک انگریزی اخبار میں لکھا ہے کہ دروازہ کھلا تو لوگوں کو ڈیوڑھی پر رکھی ہوئی قائد اعظم کی ایک تصویر نظر آئی۔ گورنر صاحب اگر روایاتِ اسلامی کا احیا چاہتے ہیں تو کیا یہ تصویر پرستی جو قبر پرستی سے کم نہیں اسلامی روایت ہے؟

کیمرے کی تصویر کے جواز و عدمِ جواز کے متعلق علما میں بہت اختلاف ہے، دنیائے اسلام کے بڑے بڑے علما و مجاہدین کی تصاویر ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مخلص مسلمان نے تصویر کی مجرد موجودگی کو پرستش کس طرح قرار دیدیا۔ سورج چاند ستارے جو مظاہر پرستوں کے بت یا خداوند رہے ہیں، اور اب بھی ہیں، ان کے محض وجود سے ہم پر شرک کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ چاند جس کی تصویر بہت سے اسلامی جھنڈوں پر مدتوں سے چلی آتی ہے۔ دوسری قوموں کے علاوہ آریاؤں کا دیوتا بھی رہ چکا ہے مگر چاند کی تصویر کا وجود کبھی ماہتاب پرستی کا ہم معنی قرار نہیں دیا گیا۔ اس مخلص مسلمان کو مطمئن رہنا چاہئے کہ پرستش کی نیت کے بغیر کسی قسم کی پرستش ممکن نہیں۔ مجسمے کا وجود خلافِ شرع ہے یا نہیں، یہ ایک الگ سوال ہے لیکن ترکی میں جہاں کمال اتاترک کا ایک عظیم الشان مجسمہ بھی ہے آج تک اس کی پرستش نہیں کی گئی۔ اور ترک بفضلہٖ مسلمان ہیں۔ رہا قلعہ میں قائد اعظم کی تصویر کی موجودگی کا معاملہ تو جس حامئ ملت کے جہاد سے یہ سب سے بڑی اسلامی حکومت قائم ہوئی اور جس کی کوششوں کے صدقے میں مسلمانوں کی مراد کے مطابق ان پر بالآخر طاقِ اورنگ زیب وا ہوا اسے اس موقع پر اس طرح یاد رکھنا محض شریفانہ اظہارِ تشکر کا ایک طریقہ سمجھنا چاہئے تھا۔ اس میں پوجا کی کوئی نیت شامل نہ تھی۔ تصویر کو دیکھنا تصویر پرستی یا قبر پرستی کا ہم معنی نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی مسلمان کبھی قائد اعظم کی تصویر کے سامنے جبینِ عبودیت رکھ سکتا ہے۔

مدیر

مخزن المخازن

"استقلال"

۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء

یومِ ولادتِ حضرت محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ

(جمیل ملک)

یہی وُہ دن ہے جب اُتری تھی آسمانوں سے
وُہ روح ارضِ وطن جس کے انتظار میں تھی
وُہ جس نے قوم کو اِک تازہ زندگی بخشی

یہی وُہ دن ہے جو لایا ہے اپنے دامن میں
خوشی کے پھُول کسی یاد میں سموئے ہوئے
خلوص و مہر و وفا کی ضیا سے دھوئے ہوئے

چلو یہ پھُول بکھیریں وطن کی راہوں میں
کہ رُوحِ رفتہ کو تسکین ملے، قرار آئے
ہمارے دل سے بھی آج اٹھیں ہاں کے سائے

آزادیٔ پاکستان سے پہلے

حریفوں کا شور و شغب اور خوفناک دھمکیاں

"پاکستان ناقابلِ عمل ہے" مہاتما گاندھی جی

"ہندوستان کی تحریکِ آزادی فاشزم کے بڑھتے ہوئے طوفان کے سامنے کھڑی ہے (فاشزم سے پنڈت جی کی مراد ہے مطالبۂ پاکستان) ہندوستانیوں کو اس شیطان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔"

پنڈت نہرو۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۶ء

"مسلم لیگ ایک علیٰحدہ حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ ہم طاقت سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ اگر قوم پرستوں کی طاقت برطانوی راج کو ختم کر سکتی ہے تو پاکستان کے تصور کو ابتدا ہی میں ختم کر دینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ تمام لوگ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہندوستان میں کوئی بھی ایسی حکومت نہیں قائم ہو گی جس میں ہندوؤں اور سکھوں کو مکمل نیابت نہ حاصل ہو۔ ہم پاکستان کے مخالف ہیں۔ لیگ سے ہمارا اس وقت تک کوئی واسطہ نہ ہو گا۔ جب تک وُہ پاکستان کا مطالبہ ترک نہ کر دے۔"

ماسٹر تارا سنگھ۔ ۵ مارچ ۱۹۴۷ء

"قوم کی تاریخ میں ایسے موقع بھی آتے ہیں۔ جبکہ فرقہ واریت کا مقابلہ صرف فرقہ واریت سے ہو سکتا ہے اور قوم کو صاف کرنے کے لئے اسے فرقہ واریت کی آگ سے گزرنا پڑتا ہے۔ آج یہی موقع ہے۔ ہمیں اپنے قومی محاذ کو فوری طور پر منظم کرنا چاہئے اور مسلم لیگ کے خلاف ڈائرکٹ اقدام کرنا چاہئے۔ ہم تلوار کا جواب صرف تلوار سے دینا جانتے ہیں۔ پاکستان کے خواب کو تلخ حقیقت سے دوچار ہونا ہوگا"

مسٹر بھوپٹکر صدر ہندو مہاسبھا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۴۶ء

"ہر وُہ شخص جس کا فکر صحیح ہے اور عہدِ جدید میں رہتا ہے۔ وُہ مطالبۂ پاکستان کی مذمت کرے گا۔ پاکستان ایک احمقانہ خواب ہے جس کا

حقیقت سے ذرہ برابر بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔"
(ڈاکٹر سید حسین (سابق سفیر ہند مقیم قاہرہ)

"ریفرینڈم کا بائیکاٹ کرو۔ ریفرینڈم اگر ہو سکتا ہے تو صرف ایک سوال پر اور وہ یہ ہے کہ پٹھانستان بنے گا یا پاکستان"۔
خان عبدالغفار خاں

"پاکستان کی جتنی بنیادیں ڈھا دی جائیں گی"۔
شیر کشمیر شیخ عبداللہ

"مسلم لیگ نے ہمیشہ آزادی کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں۔ ملک کے آزاد ہوتے ہی مسٹر جناح اور دوسرے لیگ لیڈروں پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ لیگ جس نے کہ ہندوستان کے مفاد کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کبھی بھی پاکستان کی حقدار نہیں"۔
مولانا حبیب الرحمٰن صدر آل انڈیا مجلس احرار
۳ر اگست ۱۹۴۵ء

"پنجاب میں پاکستان کے قیام کو روکنے کے لئے سکھ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے"۔
گنگا سنگھ ام۔ ال۔ اے۔ ۴ر ستمبر ۱۹۴۵ء

"پاکستان کا مطالبہ ناقابلِ یقین اور احمقانہ ہے۔ ہندوستان ایک رہا ہے اور ناقابلِ تقسیم ہے"۔
صدر ہندو مہاسبھا

میر کارواں کی للکار

"تمہیں مرعوب کرنے، مایوس کر دینے اور تم میں احساس کمتری پیدا کرنے کی منظم مہم جاری ہے۔ اس پر کان مت دھرو۔ خود اعتمادی پیدا کرو۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔ منظم ہو جاؤ۔ کامل اتحاد و اتفاق پیدا کرو۔ تربیت یافتہ سپاہیوں کی سی صلاحیت پیدا کرو۔ کوئی قوم یا کوئی فرد بلا محنت و قربانی کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ ایسی طاقتیں بھی ہیں جو تمہیں ڈرائیں گی، دھمکائیں گی اور دہشت زدہ کر دینا چاہیں گی اور ممکن ہے کہ تمہیں مصائب جھیلنا پڑیں لیکن مصائب و آلام کے اس طوفان اور ظلم و تشدد کی اس آگ سے گزرنے کے بعد ایسی قوم ابھرے گی۔ جو نہ صرف اپنے شاندار ماضی کے شایانِ شان مقام حاصل کرے گی۔ بلکہ ایسا تاریخی مستقبل تعمیر کرے گی جو نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لئے قابلِ فخر ہوگا۔ کوئی طاقت ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو مرعوب نہیں کر سکتی۔ ان کا مستقبل ان کے اپنے ہاتھ میں ہے اور ان کا متحدہ محاذ تمام مخالفتوں اور تمام خطروں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ فیصلہ کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچ لو۔ لیکن جب فیصلہ کر لو تو اس پر ڈٹ جاؤ۔ صادق اور وفادار رہو اور مجھے یقین ہے کہ فتح تمہاری ہی ہوگی"۔
(قائد اعظم خطبہ صدارت اجلاس مسلم لیگ ۱۹۳۷ء)

"نوائے وقت"
قائد اعظمؒ کے "مددگار"

آٹھ سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا جسے بیان کرنے میں اب شاید کوئی حرج نہ ہو۔ سر سکندر کے انتقال کی وجہ سے اسمبلی کا ضمنی انتخاب درپیش تھا۔ گورنر گلانسی نے نوجوان کیپٹن شوکت حیات کو فوج سے بلا کر جلیل القدر باپ کی جگہ وزیر تر مقرر کر دیا تھا۔ مگر اسمبلی کی ممبری کے لئے انتخابی مرحلہ میں سے گزرنا ضروری تھا۔ اس ضمنی انتخاب میں لیگ کے ٹکٹ کے لئے تین امیدوار تھے۔ سردار شوکت حیات۔ ملک محمد اکرم خاں اور پیر سید احمد شاہ جو اب مشیر مقرر کئے گئے ہیں۔ ملک صاحب کو ان کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ صوبہ کی ورکنگ کمیٹی آپ کو ٹکٹ نہیں دے گی اس لئے آپ درخواست نہ دیجئے اور آزادانہ مقابلہ کیجئے۔ چنانچہ انہوں نے

درخواست نہ دی اور کمیٹی کے سامنے صرف دو درخواستیں آئیں۔ ایک مسٹر شوکت حیات کی دوسری میر احمد شاہ صدر ضلع مسلم لیگ کیمبل پور کی۔ قائدِ اعظمؒ نے صدر صوبہ مسلم لیگ خان افتخار حسین کو لکھا کہ آپ کسی کو میرے پاس دہلی بھیج دیجئے۔ تاکہ اس مسئلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو ہو جائے۔ راقم حروف کو قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق کرید کرید کر تمام جزئیات معلوم کیں اور بڑی سخت جرح کی تاکہ کوئی گوشہ ان کی نظر سے مخفی نہ رہ جائے۔ آخر میں اُنہوں نے انگریزی میں پوچھا۔

"What is wrong with Ahmad shah?"

احمد شاہ میں کیا خرابی ہے؟

عرض کیا کہ اس کے سوا کوئی خرابی نہیں کہ غریب آدمی ہیں۔ ورنہ لیگ کے بہت پرانے اور بے حد مخلص کارکن ہیں"۔ قائدِ اعظمؒ نے انگریزی ہی میں فرمایا۔

"Then he is the Proper man for you."

تو آپ کے موزوں آدمی وہی ہیں۔

عرض کیا "پھر میں آپ کا یہ حکم نواب ممدوٹ کو پہنچا دوں"۔ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا "نہیں یہ حکم نہیں ہے۔ میں اس معاملے میں حکم نہیں دے سکتا۔ یہ میری رائے ہے۔ فیصلہ کرنے کی مجاز تمہاری ورکنگ کمیٹی ہے"۔

عرض کیا ورکنگ کمیٹی میں زیادہ تر وزارت کے آدمی ہیں۔ آپ کے ارشاد سے آپ کے وفادار عنصر کو تقویت پہنچے گی۔ قائدِ اعظمؒ کا ایک ایک لفظ راقم حروف کو اب تک یاد ہے۔ "نہیں میرے بچے میں کوئی حکم نہیں دوں گا۔ یہ میری رائے ہے۔ حکم نہیں کہ اگر لیگ نے احمد شاہ کو ٹکٹ نہ دیا اور شوکت کو ٹکٹ دیا تو وہ گلا اُنسی کی لیگ ہوگی۔ نوجوان ممدوٹ سے کہو کہ اسے اپنے پاؤں پکڑے ہونا چاہئے"۔

قائدِ اعظمؒ کی یہ ذاتی رائے ورکنگ کمیٹی کے ہر ممبر تک پہنچا دی گئی۔

مگر جب ٹکٹ کا مسئلہ کمیٹی میں پیش ہوا تو ۲۱ ممبروں میں سے ۱۹ نے مسٹر شوکت حیات کے حق میں اور میر احمد شاہ کے خلاف ووٹ دیئے۔ ووٹ بیلٹ کے ذریعے ڈالے گئے تھے۔ صرف شیخ کرامت علی کے متعلق معلوم تھا کہ انہوں نے کمیٹی کے اجلاس میں سردار صاحب کی سب سے زیادہ اور کھلم کھلا مخالفت کی تھی۔ دوسرے مخالف ووٹ کے متعلق قیاس تھا کہ مرحوم ملک برکت علی نے دیا ہے۔ مگر یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں تھا۔ صدر کے ووٹ کی نوبت ہی نہیں آنے پائی تھی۔

کئی ماہ بعد راقم حروف کو قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا تو ورکنگ کمیٹی کے اس جلسہ کا ذکر آگیا۔ انہوں نے بڑی دلگیری کے ساتھ یہ فرمایا "صرف دو آدمیوں نے شوکت کے خلاف ووٹ دیا تم کہتے ہو ان میں سے ایک کرامت ہے اور دوسرا برکت علی۔ مگر مجھے کم از کم چھ مختلف ممبروں نے یہ کہا ہے کہ وہ دوسرا مخالف ووٹ میرا ہے"۔

"عارف"

خلافتِ ارضی

"یہ مشیت ایزدی ہے، یہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی فیض ہے کہ جس قوم کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے صفحۂ ہندوستان سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی۔ آج وُہ قوم آزاد ہے۔ اس کا اپنا ملک ہے، اپنا پرچم ہے، اپنی حکومت ہے، اور اپنا آئین و دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا اور کوئی انعام ہو سکتا ہے؟ یہی وُہ خلافت ہے جس کا وعدہ خدا نے رسولِ اکرم صلعم سے کیا تھا کہ اگر تیری اُمت نے صراطِ مستقیم کو اپنے لئے منتخب کیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ خدا کے اس انعامِ عظیم کی حفاظت اب مسلمانوں کا فرض ہے۔

اگر مسلمان نیک نیتی، دیانت داری، خلوص، ضبط و نظم اور صالح اعمال سے دن رات کام لیتے رہے اور ان میں بدی، نفاق، جاہ طلبی اور ذاتی مفاد کا جذبہ پیدا نہ ہوا تو انشاء اللہ وہ چند ہی سالوں میں دُنیا کی بڑی قوموں میں شمار ہونے لگیں گے۔ ان کا ملک امن و آشتی، تہذیب و تمدن، ثقافت و شرافت کا مرکز ہوگا اور اس کی حدود سے ترقی کی شعاعیں نکل کر سارے ایشیا کی رہنمائی اور رہبری کریں گی اور ایشیا کو امن و آشتی اور ترقی کا راستہ دکھائیں گی۔"

★

جب تک آپ اپنی سیاسی زندگی کو (صوبجاتی تعصب کے) زہر سے پاک نہ کرلیں، آپ اپنے آپ کو حقیقی مفہوم میں ایک بڑی قوم کی طرح منظم، مرتب اور متحد نہیں کر سکتے۔ اِس لئے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی وغیرہ سمجھنا چھوڑ دیں۔ ہم مسلمان ہیں اور اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم خواہ اور کچھ بھی ہوں، سب سے پہلے مسلمان ہیں۔ ہم ایک قوم ہیں۔ ہم نے اپنے لئے ایک سرزمین ..... وسیع سرزمین حاصل کی ہے۔ یہ سب ہماری ہے، یہ کسی پنجابی، سندھی، پٹھان یا بنگالی کی نہیں، بلکہ یہ مسلمانوں کی سرزمین ہے۔"

"قائدِ اعظم" (اقتباس از آخری لمحات)

"ماہِ نو"

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

کوچ کا ترانہ

(شان الحق حقی)

ہاں تیز کہ چلتا ہے مقدر کا قلم تیز
ہاں تیز کہ ہے دیر سے دنیا کا قدم تیز
ہاں تیز کہ سانسوں سے ہے لمحات کا رم تیز
ہاں تیز کہ ہے سینۂ آفاق کا دم تیز

اے مرکبِ نو یافتہ مہمیز قدم تیز
اے مایۂ صد حسرتِ نو خیز قدم تیز

ہاں تیز کہ ہے تجھ پہ زمانے کی نظر تیز
ہاں تیز کہ ہوتا ہے سدا رقصِ شرر تیز
ہاں تیز کہ ہے دل میں امیدوں کا گزر تیز
ہاں تیز کہ ہے عمرِ بہاریں کا سفر تیز

اے مرکبِ نو یافتہ مہمیز قدم تیز
اے مایۂ صد حسرتِ نو خیز قدم تیز

ہاں تیز کہ جاتا ہے ترقی کا نشاں تیز
ہاں تیز کہ ہوتی ہے حریفوں کی زباں تیز
ہاں تیز کہ کرتے ہیں عدو تیر و سناں تیز

اے مرکبِ نو یافتہ مہمیز قدم تیز
اے مایۂ صد حسرتِ نو خیز قدم تیز (انتخاب)

"اَدبی دُنیا"

فسادات کے متعلق "ترقی پسند" کہانیاں

(وجیہ الدین احمد)

ان کہانیوں کی قدر و قیمت کا واحد امتحان اس قاری کا ردِ عمل ہے جو خود فسادات کے ہاتھوں تباہ ہو چکا ہے۔ کیا وہ اسے کسی قسم کا جذباتی سکون بخشتے ہیں۔ کیا وہ اس کے ولے میں زندگی کی کوئی لہر پیدا کرتے ہیں یا اس میں خود اعتمادی، ہمت اور استقلال کی صفات پیدا کرتے ہیں۔ افسانوں کی تحلیل کی جائے تو بعض مندرجۂ ذیل منفی تاثرات پیدا کرتے ہیں۔

۱۔ بیشتر افسانے ایسے ہیں۔ جن میں ایک قوم پر دوسری قوم کے مظالم کا نقشہ نہایت جذباتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان افسانوں کا

مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں احساسِ جرم تازہ کیا جائے۔ نفسیات کا ایک کلیہ ہے کہ غیظ و غضب کا ردِ عمل پشیمانی اور احساسِ گناہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس احساس کا کوئی تعمیری پہلو نہیں، یہ تاثر صرف رقیق جذباتیت کی سطح تک ہی رہتا ہے۔

۲۔ بعض افسانے ایک خاص سیاسی نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے لکھے گئے جو بجائے خود انسان کے مطلق و جامد تصور پر مبنی ہے اور اس کے بانی وہ ادیب ہیں جو بعض مفروضوں کی بنا پر تقسیمِ ملک کو ایک رجعت پسند اقدام کہنے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کے بات کہنے کا انداز کچھ ایسا ہے: "دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ ملک کی تقسیم نہیں ہونی چاہئے۔ جو تباہی و بربادی تم پر نازل ہوئی۔ وہ سب تمہاری غلط سیاست اور تمہارے رہنماؤں کی خود غرضی کا نتیجہ ہے۔ یہ ہوتا ہے کہا نہ ماننے کا انجام۔ اگر تم ہمارے بتلائے ہوئے راستہ پر چلتے تو قتل و غارت اور جنسی سفاکی کے یہ سب نظارے نہ دیکھنے پڑتے" یہ اندازِ تخاطب ایسا نہیں جس میں عوام کے دُکھ درد کا احساس ٹپکتا ہو یا جس میں کسی بلند تعمیری مقصد سے ہمدردی اور یگانگی کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار، پڑھنے والوں میں خود آگاہی اور بلند حوصلگی پیدا کرنے کے بجائے انہیں لعنت ملامت اور طنز اور استہزا کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ اس قسم کے مصنف عام طور پر دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا کام "سماج کی جراحت" ہے اور وہ "زندگی کا اصلی روپ" پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت حقیقۃً اس اعصابی مریض کی سی ہوتی ہے۔ جو دوسروں کو جسمانی یا ذہنی تکلیف میں دیکھ کر لذت حاصل کرتا ہے۔ "گلی سڑی سماج" کی جراحی کا حد سے بڑھا ہوا شوق نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے محض ایذا رسانی کے لاشعوری رجحان کا ایک پہلو ہے اور اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں اپنے آپ سے نفرت پیدا کی جائے۔ انہیں زندگی کے بدترین داغ دکھا کر خوفزدہ کیا جائے تاکہ وہ اپنے سب گناہوں سے تائب ہو کر اپنے سینوں کو ایک "نئے ایمان" کی روشنی سے منور کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

۳۔ مذکورہ بالا نوع سے ملتے جلتے کچھ ایسے افسانے ہیں جن میں فسادات کے پس منظر پر انسان کے جبلی تقاضوں کو ایک نہایت بھیانہ رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ("کھول دو" اور اسی نوع کے دوسرے افسانے) ان افسانوں میں یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ انسان بنیادی طور پر ایک لذت طلب درندہ ہے۔ جو صرف اس وقت تک بے ضرر رہتا ہے۔ جب تک اسے قانون اور رسم و رواج کی پابندیاں جکڑے رکھتی ہیں۔ جونہی انتشار اور بدنظمی کے زمانے میں یہ گرفت ڈھیلی پڑتی ہے، اس کی فطرت کی بربریت عود کر آتی ہے اور وہ ایسی حرکتیں کرتا ہے جو ہماری تہذیبی اقدار کے منافی ہیں۔ اس قسم کی کہانیاں پڑھ کر نہ صرف مذہب و تمدن بلکہ انسان اور اس کے جبلی تقاضوں کی قدر و منزلت ہماری نگاہوں سے گر جاتی ہے۔ لارنس بھی جو کہ جنسی آزادی کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ انسان کے عظیم ترین مقصد کو ایک میکانکی اور بے روح جسمانی فعل کی صورت میں پیش کیا جائے جو تمام جذباتی اور روحانی عناصر سے تہی ہو۔ اس قسم کی کہانیاں نہ صرف ہم میں جنسی اعمال کے متعلق نفرت اور گھن کے تاثرات پیدا کرتی۔ بلکہ ہماری ذہنی صحت پر بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ بعض ادبا کا یہ کہنا کہ وہ صرف حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں اور زنا بالجبر کے واقعات حقیقت رکھتے ہیں۔ چنداں موثر نہیں اگر وہ صرف حقیقت ہی کو پیش کرنا چاہتے ہیں تو ان بے شمار مردوں کے بارے میں کیوں نہیں لکھتے۔ جنہوں نے نہ تو زنا بالجبر کا ارتکاب کیا ہے اور نہ لوٹ کھسوٹ میں حصہ لیا ہے

بلکہ چپ چاپ اپنی کھڑکیوں میں بیٹھے سب کچھ دیکھا کئے۔ ظاہر ہے یہ موضوع ہیجان انگیزی اور لذت گیری سے تہی ہے۔ اس لئے اس کی صحافی قدر و قیمت بھی کم ہے۔ یہ ادبا جو ہیجان انگیز اور مقبول عام موضوعات کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں ہمیشہ ہنگامہ خیز اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کو کہانیوں اور نظموں کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ان کی تحریر میں ایک عامیانہ قسم کی ڈرامائی کیفیت تو پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات کی فنی قدر و قیمت بہت گر جاتی ہے۔ ادیب کا کام دہشت پھیلانا یا جذباتی سیلاب پیدا کرنا نہیں۔ کامیاب مصنف یا شاعر وہی ہے جو حقائق کو ایک نئے زاویئے سے پیش کرے اور ہم میں اپنے ماحول سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت کو ابھارے۔ اس قسم کا ادیب جذبات خیز واقعات کا سہارا نہیں طلب کرتا۔ بلکہ روزمرہ کے افکار و حوادث کو ایک نئے معنی پہنا دیتا ہے اور بظاہر غیر اہم فرسودہ اور غیر دلچسپ حقائق میں ایک حیات افروز تازگی پھونک دیتا ہے (اقتباس)

ہمایوں

بورژوا

ستیہ پرکاش سنگھ

مالک مکان کمرے کے اندر آتا ہے۔ چھوٹا قد، گورا رنگ، کالی کالی گھنی مونچھیں، کدو جیسا سر اس پر چھوٹی سی ٹوپی گلے میں مہین ململ کا کرتا بہت نفیس کپڑے کی دھوتی، کلائی پر گھڑی، پاؤں میں نئی چپل۔

مرد۔ آیئے سیٹھ جی، پدھاریئے۔

مالک مکان۔ بابوجی، پدھارنے و دھارنے کی فرصت نہیں۔ تعدنا ما تن جلدی سے دلوایئے اور اپنے رام سواری بڑھائیں۔

مرد۔ (نوکر سے) ارے بیوقوف سیٹھ جی کے لئے چائے بنا کر لا۔ کھڑا کھڑا منہ کیا تکتا ہے بونقوں کی طرح۔

نوکر۔ صاب دودھ نہیں ہے۔

مرد۔ ارے تو بغیر دودھ ہی کی لے آ۔

نوکر۔ صاب ابھی چینی بھی تو لانی ہے، راشن ڈپو سے۔

مرد۔ چینی نہیں ہے تو نہ سہی نمک ہی ڈال کے لے آ۔

مالک مکان۔ نمک! نمک کی چائے!!

نوکر۔ صاب چائے کی پتی بھی تو۔۔۔

مالک مکان۔ بابوجی مجھے چائے واسطے کچھ نہیں چاہیئے (نوکر سے) رہنے دے بھئی رہنے دے۔ مجھے تو آپ جلدی ہے کرائے کے روپئے کھرے کرلیجئے۔ بس پھر۔۔۔

مرد۔ (بات کاٹ کر) کتنے نکلتے ہیں اس مہینے؟

مالک مکان۔ اجی نکلیں گے کتنے۔ وہی جتنے ہر مہینے نکلا کرتے ہیں۔ وہی پینتالیس روپے۔ کیا اب کے کوئی کھاس بات ہو گئی۔

مرد۔ ہم نے اپنے خرچ سے مرمت کرائی ہے نا اس مہینے اور سفیدی۔۔۔

مالک مکان۔ تو آپ نے اچھا کیا۔ اپنے آرام کے لئے آدمی سبھی کچھ کیا کرتا ہے۔

مرد۔ اس مرمت وغیرہ پر ہمارے پینتیس روپئے اٹھے ہیں۔

مالک مکان۔ تو پھر؟

مرد۔ یہ رقم آپ کرائے میں سے مجرا کریں۔

مالک مکان۔ واہ جی واہ۔ مجھے اس سے تعلک کیا ہے! دیکھئے بابو آپ کرپا کرکے مکان کھالی کر دیں۔ مجھے کھد کو اس مکان کی جرورت ہے۔

مرد۔ (زور سے ہنس کر) واہ سیٹھ جی! آپ تو ناراض ہو گئے۔ میں تو ہنسی کر رہا تھا۔

مالک مکان۔ اچھا تو لایئے پینتالیس روپے پانچ آنے سات پائی نکالئے۔

مرد۔ (بٹوا کھول کر رقم گنتا ہے) لیجئے۔

مالک مکان۔ رام رام (جاتا ہے)

مرد۔ (جیسے خود سے کہتا ہے) ہم جیسے اوسط طبقے کے آدمیوں میں اتنی مال سکت ہی کب ہے کہ مالک مکان کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ ٹوٹا پھوٹا مکان چھوڑنا چاہیں تو اوّل تو اور کوئی مکان ہی نہ جُڑے گا۔ اور اگر جڑ بھی جائے تو کون سامان کی ڈھویا ڈھائی کرتا پھرے یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ چلنے بھی دو — ہمیں گھاٹے میں سہی!

نوکر۔ (اندر آکر) صاب دودھ والا آیا ہے۔

مرد۔ تم نے دو اُسے بھی۔ اس نے کیا جرم کیا ہے جو نہ آئے (نوکر جاتا ہے اور ایک پہلوان کو ساتھ لے کر آتا ہے) آؤ بھئی پہلوان! بولو کتنے دام ہیں؟

دودھ والا۔ جی میرے حساب سے اتنی سیر دودھ ہوتا ہے۔

مرد۔ تو چالیس روپے ہوئے۔ یہ لو (نوٹ نکال کر دیتا ہے) مگر دیکھنا پہلوان ہمیں صرف دودھ دے دیا کرو۔ پانی ہم خود ملا لیا کریں گے

دودھ والا۔ (بگڑ کر) آپ کا مطلب ہے میں پانی ملاتا ہوں۔ دیکھئے بابو ہمارا بھی کچھ دھرم ہے۔ اگر آپ کو سودا لینا پسند نہیں تو نہ لیجئے۔ مگر میں ایسی بات سُننی پسند نہیں کرتا۔ آج سے آپ اپنا کوئی اور انتجام کر لیجئے۔

مرد۔ ارے پہلوان تم تو بڑے غصیل معلوم ہوتے ہیں! میں نے تو یونہی ہنسی میں کہا تھا (دودھ والا تیوریاں چڑھاتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے)

نوکر۔ صاب بزاز بھی آیا بیٹھا ہے (دروازے میں بزاز کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیتا ہے)

مرد۔ کتنے ہیں؟

بزاز۔ بیس روپے۔

مرد۔ بیس روپے کا کیا آگیا؟

بزاز۔ تین چادریں آئی تھیں حضور۔

مرد۔ تین چادریں بیس روپے کی! ایک زمانے میں اتنے روپوں میں تین بیاہ ہوتے تھے۔ اچھا لو بھائی یہ بیس روپے (دھوبی کا چہرہ دروازے میں نظر آتا ہے) اِدھر آؤ تمہیں کتنے روپے دینے ہیں؟

دھوبی۔ بارہ

مرد۔ بارہ روپے (مغلوں کے زمانے میں بارہ چپراسیوں کی تنخواہ اتنی ہوا کرتی تھی (روپے دھوبی کو دیتا ہے) اور کوئی ہے؟

بنیا۔ (اندر آکر) ہاں جی، میں ہوں۔

مرد۔ کیا آیا ہے تمہارے ہاں سے؟

بنیا۔ گھی۔ تیل۔ دال۔ کھانڈ۔ نمک۔ مصالحہ۔

مرد۔ کتنے دینے ہیں؟

بنیا۔ ساٹھ روپے نو آنے۔

مرد۔ تم سب سے بڑھ چڑھ کر ہے اور وُہ کون ہے؟

بنیا۔ یہ صابن والا ہے۔

مرد۔ (اشارہ سے اُسے اندر بلا کر) کتنے ہیں؟

صابن والا۔ تیرہ روپے۔

مرد۔ اور تم؟ (تیسرے آدمی کی طرف اشارہ کر کے جو دروازے میں کھڑا ہے)

تیسرا آدمی۔ میں انڈے دیتا ہوں۔

مرد۔ روز؟

آدمی۔ ہر تیسرے دن۔

مرد۔ کتنے دام ہیں تمہارے؟

آدمی۔ بس جی۔ سات روپے۔

مرد۔ (سب کو روپے دے کر انہیں رخصت کرنے کے بعد) پینتالیس روپے پانچ آنے سات پائی اور چالیس روپے اور بیس اور بارہ

اور ساٹھ اور تیرہ اور سات۔ یہ ہوتے ۱۹۸ روپے چھ آنے سات پائی ـــــ دو سو پچیس میں سے باقی رہے چھبیس[26] روپے نو آنے پانچ پائی۔ یہ حالت ہے اوسط طبقہ کی۔ اور یوں مونڈے جانے کے باوجود معمولی سے معمولی دکاندار کو بھی کوئی سخت کلمہ نہیں کہہ سکتے۔ قرض جو لیتے ہیں۔ اگر وہ قرض سودا دینے سے انکار کر دے تو گھر کے محاذ پر فاقہ کشی کا اچانک حملہ ہو جائے۔ پچھلے مہینے کی تنخواہ قرضہ چکانے میں چٹ پٹ ہو گئی۔ اب آگے بھگوان کا بھروسا ہے یا قرض دینے والے دکانداروں کا۔

دفعتہً باہر سے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ "سرمایہ دار مُردہ باد! سرمایہ داری برباد ہو۔ بورژوائی برباد۔ بورژوا کا ستیاناس ہو کارل مارکس زندہ باد!) (ملخص)

"جادہ" (بھوپال)

اُردو کے وطن کی زمین آسمان بن گئی

یو۔ پی کے نئے نصاب تعلیم میں اُردو کی حیثیت ایک نقطے کی رہ گئی ہے، جسے دوسرے الفاظ میں "صفر" بھی کہا جا سکتا ہے نصابِ تعلیم اس انداز سے مرتب کیا گیا ہے کہ اُردو آہستہ آہستہ عوام سے دُور ہوتی چلی جائے مگر اُردو پر ایوانِ حکومت کے، مدرسوں اور سکولوں اور کالجوں کے دروازے بند کئے جا سکتے ہیں مگر دلوں کی کھڑکیاں مقفل نہیں کی جا سکتیں۔ ان کا کھولنا اور بند کرنا تو عوام ہی کے اختیار میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اُردو ہندوستان کے عوام کی زبان ہے اور انھیں کی ضروریات نے ایلورا اور اجنتا کی پاک سرزمین پر اُسے جنم دیا ہے وہ اُسے چھوڑ نہیں سکتے۔

اُردو کوئی اجنبی یا غیر ملکی زبان نہیں ہے نہ اس کے سوتے کسی اَور سرزمین سے پھوٹ کر ہمارے یہاں آئے ہیں۔ اُسے ہمارے ملک کی مقدس مٹی نے تخلیق کیا ہے۔ اس کا بیج دکن میں بویا گیا اور دلی کی علم پرور فضا میں اس کی نشوونما ہوئی۔ گنگا اور جمنا کی لہروں نے اسے لوریاں دیں۔ پھر ہندوستان کے عوام نے جن میں ہندو، سکھ اور مسلمان سب ہی داخل ہیں۔ اُس کے لئے نہ صرف اپنے گھروں کے بلکہ اپنے دلوں کے دروازے کھول دئے۔ اور یہ کبھی رتن ناتھ سرشار اور ابوالکلام آزاد کی نثر میں اور کبھی حالی، چکبست، نسیم، اور جوش کی نظم، غزل اور رباعی میں ہمارے دلوں کی دھڑکنوں پر لرزتی، مچلتی اور تھرکتی رہی، ایسی زبان کو جس میں ملک کی تاریخ ہے اس کی ادبی روایات ہیں۔ اس کے قیمتی افکار اور خیالات ہیں ان چند نفوس کی امانت سمجھ کر دوسروں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا جو ہم سے دُور چلے گئے، ہم اپنے ملک کے تاریخی افتخار کو پیروں تلے نہیں روند سکتے ـــــ اپنی بھارت ماتا کے میٹھے دودھ کو جو اب تک ہم اس کی چھاتیوں سے چُوستے رہے ہیں۔ جغرافیہ کی پیدا کی ہوئی تلخی کے باعث اُگل نہیں سکتے۔ جو ملک سے چلے گئے ان میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ ہندوستان کے تاریخی آثار کو سمیٹ کر لے جا سکتے، وہ تاج کو نہیں لے جا سکے۔ دہلی کی جامع مسجد کو بھی چھوڑ گئے، نظام الدین اور خواجہ باقی باللہ کے مزارات کو بھی وہ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ گنگا، جمنا، نربدا اور چمبل کی روانی اور ان کی آزاد لہروں کو باندھ کر لے جانا بھی ان کے امکان میں نہ تھا۔ آج یہ سب چیزیں ہماری ہیں۔ ہم ہی جائز طور پر ان کے وارث ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ صرف ایک اُردو کو جانے والوں کی میراث سمجھ کر ملک سے نکال دیا جائے اور اس کے ساتھ اپنے تمدن، کلچر اور اپنے علمی و ادبی خزانوں کو سندھ کے ریگستان میں بکھیر دیا جائے، اگر انخلا کنندگان کی جائداد کا تحفظ کسٹوڈین آفیسر کر سکتا

ہے تو زبان کا تحفظ ہم کریں گے — ہم — ہندو، سکھ اور مسلمان +

انہیں صفحات پر بار بار اعادہ کیا جا چکا ہے کہ اردو کی موافقت ہندی کی مخالفت کے ہم معنی نہیں ہے۔ ہندی سرکاری زبان قرار دیدی گئی بہت اچھا ہوا لیکن اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ بازاروں سے، گھروں سے اور شعر و سخن کی صحبتوں سے بھی غالب اور ذوق کے زمزموں کو نکال دیا جائے، ان کے ترنم اور رسیلے نغموں کا بھی گلا گھونٹ دیا جائے ——— اور غالب تو وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے اسی اردو زبان میں انگریزی سامراج کے خلاف آواز بلند کی، اس کا مقبرہ دہلی میں ہے۔ ذوق بھی دلی ہی میں آسودہ ہیں۔ ولی بھی ہماری ہی مملکت میں خوابیدہ ہیں چکبست۔ رتن ناتھ سرشار اور نسیم کا مدفن بھی ہندوستان ہے پھر ان کی روحیں کہاں جائیں گی، ان کے نغمے کہاں بھٹکتے پھریں گے، ان کے افکار اور خیالات کہاں دفن کئے جائیں گے ان کی تصنیفات اور ان کی علمی و دماغی کاوشیں کیوں کر ہم سے چھینی جا سکتی ہیں ——— اور اگر چھین لی گئیں تو یہ تو اپنا ہی نقصان ہوگا پھر اپنے ہی جسم سے کیونکر اپنا کوئی عضو کاٹ کر پھینک دیں، اردو کا مسئلہ فرقہ دارانہ نہیں اردو کی حمایت قوم پرستی اور وطنیت کے راستہ میں حائل نہیں، پھر ہم کیوں نہ پوری قوت کے ساتھ اردو کے تحفظ کا انتظام کریں ——— ہیں، آپ، عرش، جوش، فراق، نیاز، راجیندر، بیدی اور اوپیندر ناتھ متحدہ، قوم پرستانہ اور وطن پرورانہ انداز سے کیوں ہم ماہر شاہد احمد صہر شاہین اور چند ایسے ہی دوسرے ادیبوں کو اپنے وطن کی علمی امانت کا تنہا حصہ دار بننے دیں۔ یو۔ پی اور دوسرے صوبے اپنا نصاب تعلیم بناتے رہیں اور ہم اپنے عوام کے لئے میٹھی میٹھی کہانیاں، نظمیں، غزلیں اور رباعیاں لکھتے رہیں۔ حکومتیں زبان کے "راشننگ کارڈ" جاری کرتی رہیں اور ہم اپنی تخلیقات سے عوام کے احساس کو جگاتے رہیں +

(ملخص)

نظام المشائخ

گزری ہوئی باتیں

نوجوان اقبال مزارِ غالب پر

(محمد واحدی)

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

جس کے نشے کے اترنے، جس کی جوانی کے ڈھلنے اور جس کے لطفِ حیات کے خاتمہ کا مرزا غالب اس شعر میں ذکر کر رہے ہیں وہ خواہ خود ہوں یا کوئی اور۔ غور تو کیجئے، وہ آج لذتِ خوابِ سحر ہی سے نہیں۔ لذتِ خوابِ زندگی سے محروم ہے۔ مرزا صاحب کو لذتِ خوابِ سحر کے جانے کا ملال تھا۔ وہاں لذتِ خوابِ زندگی بھی نہ رہی۔ غالب کی جوانی کیا، غالب کے بڑھاپے کا دیکھنے والا اب کوئی باقی نہیں +

سو سوا سو برس پہلے سب کچھ یہی ہوتا ہوگا جو آجکل ہوتا ہے اور ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے لیکن زمانے کی قینچی اس طرح چل رہی ہے کہ کترنیں بھی کہیں پڑی نہیں چھوڑتی۔ پرانی اور بہت پرانی باتوں کو جانے دیجئے۔ کل کی بات سنئے! میرے سامنے کی بات ہے، شیخ محمد اقبال بغرض تکمیل علوم و فنون انگلستان روانہ ہو رہے ہیں۔ میر غلام بھیک نیرنگ انبالہ سے اور شیخ محمد اکرام[2] صاحب لاہور سے اپنے پیارے دوست کو رخصت کرنے دلی تک آئے

[1] شیخ عبدالقادر کے مشہور رسالہ مخزن کے ممتاز مضمون نگار بی۔ اے ایل۔ ایل بی، سابق ممبر سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی۔ اس گزری ہوئی بات کے لکھتے وقت ایک ان کا مضمون بھی میرے سامنے ہے۔ [2] مخزن کے معاون ایڈیٹر مرحوم،

ہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب اور منشی نذر محمد صاحب[1] اسٹیشن پر استقبال کرتے ہیں۔ ریل سے اُتر کر اول منشی نذر محمد صاحب کے مکان پر جو اسٹیشن کے قریب ہے کچھ دیر آرام کیا جاتا ہے۔ پھر سب مل کر سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز کی درگاہ آسمان پائیگاہ کی طرف چل پڑتے ہیں۔ راستے میں شہنشاہ ہمایوں کے مقبرہ کی زیارت اور سیر ہوتی ہے مزار حضرت محبوب الٰہی پر پہنچ کر اقبال تنہائی میں مزار مبارک کے سرہانے بیٹھتے ہیں اور مندرجہ ذیل نظم پڑھتے ہیں۔ پارٹی اقبال کی خواہش کے مطابق باہر ٹھیرتی ہے۔ پارٹی کے اصرار پر باہر آ کر اقبال نظم کو دوبارہ پڑھتے ہیں۔ درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر اور مزار کی طرف منہ کر کے، اقبال کی آواز میں درد اور لہجے میں رقت ہے تمام احباب اور سامعین متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کی زبان سے بے اختیار کلمات تحسین و آفرین و آمین نکلنے لگتے ہیں۔ ایک عالم محویت طاری ہے جس کی تصویر اُن ہی کا تصور کھینچ سکتا ہے جو اس وقت وہاں حاضر تھے۔

اب آپ بھی پہلے نظم ملاحظہ فرما لیجے۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا

تری لحد کی زیارت ہے زندگی میری
مسیح و خضر[2] سے اونچا مقام ہے تیرا

ترے وجود سے روشن ہے راہ منزل شوق
دیار عشق کا مصحف کلام ہے تیرا

نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی
بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا

کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال
مُرید پیر نجف ہے غلام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم، داغ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم گل بہار توام

کیا ہے تیرا مقدر نے مدح خواں مجھ کو
کہے ہزار مبارک، مری زباں مجھ کو

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

مرے سفینے کو تو نے کنارہ بوس کیا
اماں نہ دیتا تھا جب بحر بیکراں مجھ کو

فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

رہوں میں خادم خلق خدا جیوں جب تک
نہیں ہے آرزوئے عمر جاوداں مجھ کو

قسم ہے اپنے دل دردمند کی آقا
تری ثنا کے لئے حق نے دی زباں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

درگاہ سے رخصت ہو کر حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے مکان پر قیام ہوا۔ گھر کا اور لنگر کا کھانا کھایا گیا۔ ولایت[3] خاں ایک نوعمر قوال خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ نو تعلیم تھا

[1] مخزن کے مضمون نگار تھے۔ دہلی میں مدارس کے انسپکٹر رہے،

[2] یہ شاعری ہے یا رموز خودی کے مصنف کی بے خودی، اس مقام پر رُکے نہیں۔ چلے چلیے۔

حاشیہ اگلے صفحہ پر

مگر خوش گلو اور طبیعت دار، وہ گاتا رہا اور وقت نہایت مزے اور کیفیت سے گزرتا رہا۔ اس کے بعد شہر کو واپس ہوئے۔ واپسی کے وقت خاتم الشعراء مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تربت پر پارٹی رُکی۔ میر نیرنگ مرزا صاحب کی تربت کے سرہانے لوحِ تربت پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ اُن کے دائیں طرف اقبال عالمِ محویت میں تشریف فرما تھے۔ تربت کے گرد ساری پارٹی حلقہ باندھے ہوئے تھی۔

دو بجے دن کا وقت اور دن بھی ستمبر کا۔ دھوپ تیز اور ہوا بند مگر کسی کو گرمی کا خیال تک نہ تھا۔

ولایت قوال کو عجیب دقت کی سوجھی۔ بولا "حضور مرزا غالب کی ایک غزل یاد آئی ہے اجازت ہو تو سناؤں"؟ سرود بستان یاد دل نیدن۔ یہاں کسے عذر تھا۔ چنانچہ اس نے یہ غزل سنائی:—

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

غزل کے ان دو شعروں نے حاضرین میں ہلچل پیدا کر دی۔

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

غزل کے ختم ہونے پر کئی منٹ میں ہوش بجا ہوئے تو پارٹی چلنے کے لئے اُٹھی۔ اقبال نے جوشِ محبت میں مرزا صاحب کی لوحِ مزار کو بوسہ دیا اور شہر کو روانہ ہو گئے۔

آہ! اقبال اور اقبال کی صحبتیں بھی آج افسانہ ہیں۔ اور ان افسانوں کو بیان کرنے والے خود عنقریب افسانہ ہوا چاہتے ہیں +

لہ بوڑھے ولایت خاں نے تقریباً تین سال قبل دہلی میں مجھے بھی نوجوان اقبال کو مزارِ غالب پر غالب کی غزل سُنانے کی یہ پُرانی داستان سنائی تھی۔ جس کی تصدیق واحدی صاحب کی اس تحریر سے ہوئی۔ (حامد علی خاں مدیر مخزن)

صدق لکھنؤ

ہند میں اُردو کی فاتحہ خوانی

(مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل صدر شعبۂ اردو فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی)

بہت سے خواہ تھوڑے سے لوگوں کی رائے کچھ ہو، لیکن میں تو یہ سمجھے بیٹھا ہوں کہ اردو کی بنیاد کچھ کمزور نہیں اور اس رائے کو کچھ اہمیت نصیب نہیں تاہم سیاسی فضا کی وجہ سے جو ہماری حالت ہے اس سے اُردو کو نقصان ضرور پہنچے گا۔ اس احساس کی وجہ سے تمام اردو دنیا میں ایک زبردست ہلچل پیدا ہو گئی ہے اور ایسا ہونا ایک فطری امر ہے۔

حیدر آباد دکن اُردو کے لئے عرصۂ دراز سے ایک اچھا ملجاؤ ماویٰ رہا ہے لیکن اب وہاں بھی اردو کے لئے حسرت و یاس کا عالم برپا ہو گیا ہے۔ اس قسم کے حالات میں اربابِ اردو، بہی خواہانِ اردو کے حلقوں میں جس قدر بے چینی پیدا ہو بلاشبہ کم ہے پھر بھی ہمیں لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کو فراموش نہ کرنا چاہئے اور شور و غل کے ساتھ نہیں بلکہ خاموشی، صبر و استقلال کے ساتھ اردو کے لئے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنا چاہئے۔ اسی میں کامیابی کا راز سربستہ ہے۔ شاید یہی جذبۂ عمل ہے کہ جس نے ہمدردانِ اردو کو بے چین کیا ہے اور وہ اردو کی ترقی و تحفظ کے لئے باہم مل بیٹھ کر سوچنے کے لئے بنارس میں ایک عظیم الشان کل ہند اردو کانفرنس اور اس کے ساتھ ایک علمی نمائش اور مشاعرہ کا

انعقاد کررہے ہیں۔ احساس صحیح کے ساتھ جذبۂ عمل، ولولہ کا ایکا یہ بہترین مظاہرہ ہے۔ میں متوقع ہوں کہ ارباب علم وادب کانفرنس اور اس کے ساتھ ایک علمی نمائش کو قیمتی نوادر، قلمی نسخہ جات اور مخطوطات مرحمت فرما کر زیادہ سے زیادہ کامیاب بنائیں گے تاکہ ہم اپنے علم و فن کی اہمیت واضح کرسکیں کسی زبان کے نوادر کی اہمیت کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کو علمی و ادبی ذوق ہے ٭

"قومی زبان"

اُردو

(حضرت اسد ملتانی)

اُردو ہی تو ہے ہند کی مقبول زباں بھی
اور شیخ و برہمن کی محبت کا نشاں بھی
وسعت کا یہ عالم ہے کہ پہنچی ہے وہاں بھی
جن دُور کے دیسوں کا نہ تھا وہم و گماں بھی
کیا ملک میں ایسی ہے کوئی اور زباں بھی؟
اتنی ہی جو دلکش بھی ہو شیریں بھی رواں بھی
بنیاد اُٹھی اس کی اگر سنسکرت سے
موجود ہے اس میں عربی لطفِ بیاں بھی
گفتار کی رو سے جو کریں جانچ تو اردو،
ہندو کی زباں بھی ہے مسلماں کی زباں بھی
قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے لیکن
اس واسطے ہے بعض دلوں پر یہ گراں بھی
اس خط کو بدلنے کے لئے اہلِ وطن میں
جاری ہیں بہت کوششیں پنہاں بھی عیاں بھی
ملت ہی پہ موقوف ہے اس خط کی حفاظت
اور خط کی حفاظت سے ہے وابستہ زباں بھی
اردو ہے زباں جس کی وہ اک جسم ہے ملت
کیا اس میں ہے کچھ جان بھی اور تاب و تواں بھی
ملت ہے اگر زندہ تو مٹتی نہیں اُردو
گر جسم سلامت ہے تو باقی ہے زباں بھی

"نگار"

انیس کی شاعری اور زندگی کی عکاسی

(ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)

بنیادی طور پر مرثیہ میں زندگی کی عکاسی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں مرثیہ نگاروں نے صرف چار باتوں پر زور دیا ہے ایک وطن عزیز یا عزیزوں سے جُدائی۔ دوسری کچھ افراد کی باہم گفتگو، تیسری معرکۂ جنگ کے حالات اور چوتھے کچھ لوگوں کا مصائب میں مبتلا ہو کر گریہ وزاری کرنا۔ ظاہر ہے کہ جو صنف ان چار حالتوں میں محدود ہو اس میں زندگی کے کتنے حالات آسکتے ہیں۔

قدرتی طور پر جو شخص مرثیوں کو پڑھے گا وہ یہ بھی چاہے گا کہ امام علیہ السلام کی زندگی کے کچھ حالات اس کو معلوم ہوں۔ مگر مرثیوں میں زندگی کے صرف وہ جزئیات ملتے ہیں جو لکھنوی رسم ورواج سے وابستہ ہیں اور عرب یا امام حسینؑ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

مولانا شبلیؒ نے اس بات کی یہ تاویل کی ہے کہ شاعر مورخ نہیں ہوتا ہے لہٰذا جو چاہے سو کہے مگر یہ مولانا شبلی کا مغالطہ ہے شاعر کو تاریخی حقیقت سے کوئی سروکار نہیں مگر اس کو شاعرانہ حقیقت سے تو سروکار ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے نہ سہی مگر تخییلی اعتبار سے

تو اسے صحیح تصور قائم کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی تصنیف کر رہا ہے جس کا ماحول پرانے یونان کی زندگی ہے تو وہ افراد کو ہوائی جہاز پر سفر کرتا ہوا یا سوڈا واٹر پیتا ہوا تو نہ دکھلائے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیس کو زندگی کے نقوش ظاہر کرنے سے سروکار ہی نہ تھا۔ ان کا یہ مقصد ہی نہ تھا کہ امام کی زندگی کے بابت کوئی صحیح تصور پیش کریں۔ ان کی غرض صرف یہ تھی کہ لوگوں کو رلائیں اور اس کے لئے لکھنؤ کی زندگی کو پیش کرنا بہت ضروری تھا تاکہ سننے والے خود اپنے ماحول کو سامنے رکھ کر متاثر ہوں لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مرثیوں میں ہم کو لکھنوی سوسائٹی کا بھی مکمل نقشہ نہیں ملتا۔ اور نہ یہاں کی سوسائٹی کے کسی پہلو پر ان سے روشنی پڑتی ہے۔ ہاں حفظِ مراتب کے لحاظ سے یہاں کی بات چیت اور نالہ و شیون کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے انیس کے مرثیوں میں ہم کو کوئی مکمل فرد بھی نہیں ملتا۔ انیس کی سراپا نگاری ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہم افراد کو جان سکتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ حال ہے کہ ایک ہی سراپا کو ہم تمام افراد پر منطبق کر سکتے ہیں۔ ان کی نفسیات نگاری کا یہ حال ہے کہ وہ یہ تو ضرور جانتے ہیں کہ غصہ میں آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور انکسار میں انسان سر جھکا کر بات کرتا ہے۔ عورتوں میں فطری شرم و حیا ہوتی ہے اور غم کے موقع پر ہر شخص بے اختیار رونے لگتا ہے۔ لیکن اس سے آگے وہ انفرادی نفسیات کو ہاتھ نہیں لگاتے اور اس کے لئے مکمل اور مربوط جیتے جاگتے افراد ہم کو ان کے یہاں نظر نہیں آتے۔ رہ گئی انسانی احساسات و جذبات کی عکاسی سو وہ بھی جذباتیت کے درجہ سے بلند نہیں ہے۔ صحیح جذبات نگاری کا مقصد جذبات کی اصلاح ہوتا ہے لیکن میر انیس کے یہاں اس کا مقصد صرف گریہ و زاری ہے اس لئے مراثی انیس کو ادب برائے زندگی کے دائرے میں لانا غلطی ہے۔

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میر انیس کے کلام کی کیا قدر و قیمت ہے۔ ہم کو ایک گروہ ایسا نظر آتا ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے میر انیس کے لئے عرش پر ایک لاکھ چونسٹھ ہزار کنگرے تیار کئے ہیں اور اس لئے ان کو ہر طرح کامل سمجھنا اور ان کی شاعری میں دنیا بھر کے محاسن تسلیم کرنا لازم ہے لیکن اگر مذہبی غلو سے ہٹ کر فنی حیثیت سے کلامِ انیس کا مطالعہ کیا جائے تو ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ بڑے زبردست ماہر زبان تھے اور ایک مخصوص قسم کی بیانیہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

"علی گڑھ میگزین"

غالب کی بیوی

(حمید احمد خاں)

شادی سے چند سال بعد جب میاں بیوی جوانی کی عمر کو پہنچے، ایک ایسا ایسا واقعہ پیش آیا جو اس سلسلے میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ امراؤ بیگم کو وہ بڑے سے بڑا صدمہ پہنچا جو شوہر کی طرف سے بیوی کو پہنچ سکتا ہے۔ غالب نے ایک دوسری عورت سے بے قرارانہ عشق کیا۔ بیگم غالب کو جب یہ حال معلوم ہوا تو ان کے دل کی کیا کیفیت ہوئی، اس کے متعلق یقین سے کچھ کہنا دشوار ہے۔ غالباً ان کا فطری غرور و تمکنت اس وقت آڑے آیا۔ طبیعت کا مذہبی رنگ جو باپ سے ورثہ میں ملا تھا شاید کچھ اور گہرا ہو گیا۔ شاید دونوں کی روح کے درمیان ایک اور پردہ حائل ہو گیا۔ ہمارے سامنے اس معاملے میں معلومات نہیں صرف قیاسات ہیں۔

غرض طرح طرح کے اختلافات کی بنیاد پر آئے دن آپس میں جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اگر شوہر کچھ کما ہوتا تو طبیعتوں کا یہ اختلاف کسی حد تک

دیے جاتا لیکن شوہر کی کمائی کا یہ حال تھا کہ شادی کے بارہ چودہ برس بعد گھر میں جو اثاثہ تھا وہ بھی فروخت ہونے لگا۔ عورت کا شوہر اس کی قسمت ہوتا ہے اور بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ شادی کے بعد امراؤ بیگم کی قسمت پھوٹ گئی۔ غالب کی شاعری کو امراؤ بیگم نے کبھی کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ غالب کو ہنسی سوجھتی اور چھیڑ چھاڑ کا جو لپکا تھا وہ امراؤ بیگم کے لئے عذاب جاں ہو گیا۔ بڑھاپے تک غالب کی یہ عادت نہ گئی۔ اور امراؤ بیگم کی چڑ بھی بڑھاپے تک قائم رہی۔ نواب معظم زمانی بیگم نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ مرزا غالب نے ان سے مذاق کیا تو امراؤ بیگم خفا ہو کر بولیں "اے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لئے کوئی چاہئے۔ اب بہو ہی مل گئی۔

بارہا انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں جھپٹ ہو جاتی تھی۔ خانگی زندگی کے یہ لطیفے اکثر تذکرہ نویسوں نے بیان کئے ہیں۔ مگر ان لطیفوں کے ناگوار نتائج کا ذکر قدرتی طور پر نہیں کیا۔ مولانا حالی کی روایت ہے کہ ایک دفعہ غالب نے مکان بدلنا چاہا۔ نئے مکان کا دیوان خانہ تو خود پسند کر آئے۔ اور محل سرا دیکھنے کے لئے امراؤ بیگم گئیں۔ واپس آئیں تو غالب نے پوچھا "کہو مکان پسند آیا؟" بیگم نے جواب دیا "اس گھر میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں" غالب نے فوراً کہا۔ "مگر کیا دنیا میں تم سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟" اس کے بعد جو کچھ گزری وہ لطیفے سے تو خارج ہے مگر غالب کی سوانح عمری سے خارج نہیں ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میاں بیوی کے یہ جھگڑے کبھی کسی دائمی فساد یا بدمزگی کی بھی نوبت لائے۔ مولانا حالی کی روایت ہے کہ "مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے۔" دوسرے ثقہ راویوں کی زبانی بھی یہی معلوم ہوا کہ غالب اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے۔ اس علیحدگی کے باوجود امراؤ بیگم نے شریف بیبیوں کی قدیم روایات کو جس طرح قائم رکھا وہ قابل داد ہے۔ انہوں نے شوہر کی خدمت کرنا ہمیشہ اپنا فرض سمجھا کھانا زنانے میں پکتا اور وقت پر غالب کو دیوانخانے میں پہنچ جاتا۔ جب بیمار ہوتے تو دوائیں جوشاندے وغیرہ پورے اہتمام سے تیار کر کے انہیں پہنچائے جاتے۔

غالب بھی دن میں ایک مرتبہ ضرور زنانہ مکان میں جاتے تھے۔ جب تک بدن میں طاقت رہی صبح کا کھانا وہیں کھاتے۔ بڑھاپے میں اس کی پابندی نہ رہ سکی پھر بھی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے عام طور پر صبح یا دوپہر کو اور کبھی کبھی عصر کے قریب ضرور گھر میں جاتے۔ بنیادی بیگم کے پوتے نواب خضر مرزا مرحوم (جنہوں نے لڑکپن میں غالب اور امراؤ بیگم کو دیکھا تھا) راقم الحروف سے اس زمانے کی ایک حکایت ان الفاظ میں بیان کرتے تھے۔

"میں ایک دن مرزا صاحب کے دیوانخانے میں کھڑا تھا کہ وہ اوپر سے اترے میرے کھوے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ آ تیری دادی کے گھر چلتا ہوں (دادی سے مراد امراؤ بیگم تھیں) اندر جا کر بسنی ماما سے دادی کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہیں معلوم ہوا کہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ کہنے لگے۔ ہیں یہ کیا! جب آؤ نماز! اے خضر تیری دادی نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا دیا!"

امراؤ بیگم کی زندگی کے درمیانی بیس پچیس سال جس تنہائی بلکہ ویرانی کے عالم میں بسر ہوئے اس کی طرف مولانا حالی نے یوں اشارہ کیا ہے "مرزا غالب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ اس لئے ایک مدت سے وہ اور ان کی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے" ۱۸۵۲ء میں زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہوا تو آئندہ دس بارہ برس ان کے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرنے میں بسر ہو گئے۔ اس کے بعد پھر وہی تنہائی کا عالم شروع ہوا نواب معظم زمانی بیگم کا بیان ہے کہ بڑھاپے کے دنوں میں جانماز پر بیٹھے ان کے منہ سے اکثر یہ الفاظ نکلتے تھے: "اے اللہ! تو کب بلائے گا؟"

اب موت کی دعائیں قبول ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ پہلے فروری ۱۸۶۹ء میں مرزا غالب رخصت ہوئے۔ نواب خضر مرزا مرحوم نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ "مرزا صاحب کا انتقال دیوان خانے میں ہوا۔ دادی اس وقت زنان خانے میں تھیں۔ اسی عرصہ میں داروغہ کلو کو انہوں نے باہر کی خبر پوچھنے کے لئے کئی دفعہ بلایا۔ میں ایک دو دفعہ گیا۔ گریہ ان پر طاری تھا سفید دوپٹہ اوڑھے تخت پر بیٹھی رو رہی تھیں۔"

ساٹھ برس کی رفاقت جو بچپن سے شروع ہوئی تھی اس کا انجام یوں ہوا۔ غالب کی وفات سے ایک سال بعد قمری مہینے کی ٹھیک اسی تاریخ کو امراؤ بیگم شوہر کے پیچھے روانہ ہوئیں۔

(اقتباس)

ایڈیٹر کے نام

جدید تحریکات اور قدیم روایات

آل احمد سرور

آپ کی ادارت میں مخزن سنجیدہ اور متوازن ادب کا بڑا اچھا معیار پیش کر رہا ہے۔ مغربی مصنفین و مفکرین کے خیالات کی وضاحت کا جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے وہ بہت اچھا ہے، اسے جاری رکھئے۔ اس کے ساتھ ہر پرچے میں ہمارے ادب کے کسی ایک مشہور رکن کا بھی جائزہ ہونا چاہئے۔ موجودہ دور میں بعض اوقات کلاسیکی ادب اور اس کی خصوصیات کو لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ادب کی زندگی کے لئے یہ بھی برا ہے۔ میں باوجود نئے زمانے کا انسان ہونے کے اور نئی تحریکات و تجربات سے ہمدردی رکھنے کے، روایات سے واقفیت ادبی اسالیب سے شناسائی اور ادب کے مزاج اور تاریخ سے آگہی کو ضروری سمجھتا ہوں۔ اس دنیا میں چراغ ہی سے چراغ جلتے ہیں۔ مخزن المخازن کا سلسلہ بھی بہت اچھا ہے۔ اس سے موجودہ دور میں اچھے مضامین کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں ادھر اپنی پچھلی کتابوں کے نئے ایڈیشن تیار کرنے میں مصروف رہا۔ اس وجہ سے آپ کے لئے کچھ نہ لکھ سکا۔ بہت جلد کوئی مضمون مخزن کے لئے بھیجوں گا۔

تجاویز

مسعود احمد ملک بی اے

جب سے "مخزن" کا دوبارہ اجرا ہوا ہے، میں اسے نہایت باقاعدگی اور شوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ "مخزن" کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے میں آپ کی کامیاب ادارت مستحق ستائش ہے۔ چند تجاویز حاضر ہیں:-

۱۔ از راہِ کرم "مخزن" کے کچھ صفحات مستقل طور پر قند پارس کے لئے مخصوص کر دیجئے۔ اور اچھے اچھے فارسی گو شعرا کے کلام کو ان صفحات کی زینت بنائیے۔ جس طرح آپ نے "مخزن المخازن" اور "تبرکاتِ مخزن" مستقل عنوانات قائم کر رکھے ہیں۔ اسی طرح فارسی غزلیات وغیرہ کے لئے بھی ایسا بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ یا تو دو ایک صفحات کا اضافہ کر دیا جائے۔ یا موجودہ صفحات میں سے اس کے لئے گنجائش نکالئے۔ بہر حال اردو زبان کو فارسی زبان سے جو قریبی تعلق ہے اس کے پیشِ نظر آپ کا یہ اقدام "مخزن" کی معنوی خوبیوں میں اضافے کا موجب ہو گا۔

نومبر کے مخزن میں آپ نے پروفیسر محمد اکبر صاحب منیر کی ایک اردو غزل شائع کی ہے۔ اور توقع ظاہر کی ہے کہ چونکہ پروفیسر صاحب موصوف فارسی زبان کے برِ عظیم ہند و پاکستان کے ایک بے نظیر شاعر ہیں۔ اس لئے اگر وہ اپنے فارسی کلام سے "مخزن" کو نوازیں تو بہت ہی خوش قسمتی ہے۔ میں نے پروفیسر صاحب موصوف کا ایک مجموعۂ کلام "ماہِ نو" پڑھا ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کی بیشتر غزلوں اور نظموں کے متعلق بغیر کسی شک و شبہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دورِ حاضر کے صفِ اول کے فارسی گو شعرا کے کلام کے مقابلہ میں رکھی جا سکتی ہیں۔ خدارا ایسے فارسی گو حضرات سے جس طرح بھی ہو سکے، ان کا فارسی کلام حاصل کر کے "مخزن" کے صفحات میں پیش کیجئے۔ اس سے یقیناً مخزن کی ادبی حیثیت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ پھر ساتھ ہی متقدمین میں سے بعض بڑے بڑے شعرا پر تنقیدی مضامین بھی شائع کرنے چاہئیں۔ بیدل پر غنی صاحب کا مضمون اسی سلسلے میں پیشِ نظر رکھا جا سکتا ہے۔ جو غالباً اکتوبر کے مخزن میں شائع ہوا تھا۔ کیونکہ فارسی شعرا کو آج تک جدید قسم کی تنقید کی کسوٹی پر کسی نے پرکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور پرانے تذکروں میں سوائے لمبے

تعریفی جملوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان کی شاعری کو تنقیدی نظر سے پرکھا جائے اور اس کے مختلف گوشوں کو نئے زاویئے سے بے نقاب کیا جائے۔

۲ - ہر نمبر میں اردو کے کسی بڑے شاعر، ادیب یا مصنف کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جس طرح ڈاکٹر باقر صاحب کا سلسلۂ مضامین "ذمیر سے استاد" شوق سے پڑھا جاتا ہے، اسی طرح یہ سلسلہ بھی مفید اور دل کش ثابت ہوگا۔ اختر شیرانی مرحوم پر جو کہ بلاشک و شبہ اردو کے بہت بڑے رومانی شاعر تھے، کوئی جامع مقالہ شائع نہیں ہوا۔ کوشش کر کے کہیں سے انکی شاعری پر مبسوط مقالہ حاصل کیجئے

۳ - غیر زبانوں کے بیش قیمت افسانوں کو اردو زبان کا جامہ پہنانے کی تحریک بھی آپ کی طرف سے فروغ اردو کے سلسلے میں بڑی کارآمد اور مفید تحریک ہے۔ اور یقین ہے کہ "مخزن" اردو ادب کے خزینے میں بیش بہا اضافہ کرے گا۔ آپ انگریزی زبان کے کسی بڑے افسانہ نگار کی طرف اشارہ کر دیجئے، تو میری خدمات اس سلسلے میں حاضر ہیں۔ اور منفلوطی کی حادیہ جو اس کا سب سے بڑا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ اگر ارشاد ہو تو اس کا ترجمہ کر کے روانہ کر دوں۔

چند اور تجاویز

ظفر الحق خاں، بی، سی، ایس

مخزن ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ چند تجاویز اس کو اور مفید بنانے کے لئے عرض ہیں:-

۱ - جو آپ کے نئے مضمون نگار ہوں ان کے مختصر سے حالات زندگی شروع میں درج کئے جائیں تو لوگ پسند کریں گے۔ اسماء الرجال کے طریقے کے مطابق۔

۲ - محمد حسن عسکری صاحب کے مضامین واقعی دلچسپ ہیں۔ پر جب وہ کسی فرانسیسی یا غیر ملکی مصنف کا ذکر فرمائیں تو اس کا نام انگریزی حروف میں بھی لکھ دیا کریں۔ مثلاً (ANDRE GIDE) کا۔ بہت کم پڑھنے والے آندرے ژید کے صحیح ہجوں سے آگاہ ہوں گے۔ نیز ایسے مصنفوں کے بھی مختصر حالات لکھے جائیں تو اچھا ہوگا۔

۳ - مخزن المخازن بہت پسند کیا جاتا ہے۔ کیا یہ حصہ بڑھایا نہیں جا سکتا؟ یہ ایک طرح کا (READERS DIGEST) بن جاتا ہے

۴ - ہماری اردو کی شاعری میں غزل پر اتنا زور کیوں ہے؟ کیا رزمیہ شاعری شاعری نہیں؟ یہی قوم کو زندہ کرے گی۔

۵ - غیر زبانوں کے تراجم نہایت پسند کئے جاتے ہیں۔ کیا عربی، ترکی اور فارسی کے موجودہ ادب میں کوئی بات قابل ترجمہ نہیں ملتی۔

آپ کہاں ہیں؟

بھگی سرشار ایڈیٹر تیا جیون فیروز پور چھاؤنی مشرقی پنجاب

پاکستان میں میرے کئی پرانے دوست تھے جن کی مدت سے کوئی اطلاع مجھے نہیں ملی جن سے خط و کتابت کی بندش سوہان روح ہو رہی ہے۔ ان کے موجودہ پتے مطلوب ہیں۔ کیا آپ براہ کرم مخزن کے زیر ترتیب نمبر میں ان حضرات کے نام درج فرمائیں گے:-

۱ - ڈاکٹر نیاز الدین صاحب سابق ہیلتھ آفیسر مظفر گڑھ، سیالکوٹ، حصار وغیرہ۔ سنا ہے ۱۹۴۲ء میں ولایت گئے ہوئے تھے۔

۲ - ڈاکٹر محمد جمال صاحب بھٹہ، سابق انچارج سول ہسپتال علی پور، جو میو ہسپتال میں سرجن اور بعد میں شاید انسپکٹر جنرل ہاسپٹلز یا اسکے قریب کسی عہدہ پر تعینات تھے۔

۳ - مرزا نواب صمصام الدین صاحب سابق انسپکٹر پولیس مظفر گڑھ۔ نواب صاحب لوہارو کے رشتہ دار۔ اڑھائی برس پہلے فیروز پور میں مقیم تھے۔

۴ - مسٹر محمد حنیف صاحب کورٹ سب انسپکٹر، سابق علی پور۔ بعد کے حالات کا علم نہیں۔

۵ - مسٹر منور ظہیر سابق سب جج علی پور۔ آج کل معلوم نہیں کس عہدہ پر ہوں گے۔

۶ - خان بہادر شیخ نور محمد صاحب۔ رحیم یار خاں ریاست بہاولپور میں ڈپٹی کمشنر تھے۔

اگر کسی مہربان کو ان اصحاب میں سے کسی صاحب کا موجودہ پتہ معلوم ہو یا یہ نوٹ خود ان کی نظر سے گذرے تو اپنے موجودہ پتے سے فوراً مطلع فرمائیں۔

حمید نظامی، اڈیٹر و پرنٹر سلطنت نے امرت الیکٹرک پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر [illegible] ۱۱ میو [illegible] روڈ لاہور سے شائع کیا۔

فہرستِ مضامین

مخزن

(دورِ سوم)

جلدِ دوم از ماہِ جولائی ۱۹۴۹ء تا ماہِ دسمبر ۱۹۴۹ء

ماہ	نمبر	صاحبِ مضمون	مضمون	صفحہ
جولائی	۱	مدیر،	صفحۂ اوّل،	
	۲	پروفیسر انور رومان،	پاکستانی ادب، ۳	
	۳	مسعود اشعر،	نظم، ۲۱	
	۴	جگن ناتھ آزاد،	غزل، ۲۲	
	۵	مقبول احمد پوری،	گیت، ۲۴	
	۶	امین الرحمٰن،	بہار کی ایک شام (ڈراما)، ۲۶	
	۷	محمد خلیل الرحمٰن،	جذب، ۳۶	
	۸	کیپٹن خیر الدین احمد صدیقی،	سیلی (افسانہ)، ۳۷	
	۹	محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی،	دو غزلیں، ۵۱	
	۱۰	طفیل ہوشیار پوری،		
	۱۱	ڈاکٹر گیان چند ایم اے۔ ڈی فل	بوستانِ خیال کی تاریخ، ۵۲	
	۱۲	ظفر اقبال حشر،	غزل، ۵۶	
	۱۳	مدیر،	مخزن المخازن، ۵۷ نمبر ۱۳۔ الف مطبوعات،	
اگست	۱۴	مدیر،	صفحۂ اوّل۔ (ترانۂ آزادی)،	
	۱۵	پروفیسر انور رومان،	پاکستانی ادب، ۶۵	
	۱۶	پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی،	غزل، ۹۲	
	۱۷	سید علی عباس جلالپوری،	رقصِ حباب (افسانہ)، ۹۳	

۱۸	سید علی جمال،	ترا جمال ہے.... (نظم)،	۹۶
۱۹	محمد حسن عسکری،	جیمز جوئس،	۹۷
۲۰	محمد ہادی حسین (کمشنر راولپنڈی)	تین نظمیں،	۱۰۸
۲۱	عبدالمجید بھٹی.		
۲۲	جمیل نقوی،		
۲۳	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی،	مولانا حالی کے غیر مطبوعہ خطوط،	۱۱۱
۲۴	اثر صہبائی،	چند غزلیں،	۱۲۱
۲۵	عبدالمجید حیرت،		
۲۶	عاصی کرنالی،		
۲۷	خادم ہوشیارپوری		
۲۸	مظفر علی سید	یہودیہ کا حاکم (ترجمۂ افسانۂ اناطول فرانس)،	۱۲۳
۲۹	مدیر،	مخزن الخازن،	۱۳۱
۳۰	قارئین،	ایڈیٹر کے نام،	۱۴۰
۳۱	مدیر،	مطبوعات،	۱۴۱
ستمبر			
۳۲	حضرت شیخ عبدالقادر مدظلہ مدیر اعزازی،	صفحۂ اوّل (دو ہنگ)،	۱۴۶
۳۳	مرزا محبوب بیگ،	لفظ فلسفہ کی سرگزشت،	۱۴۷
۳۴	جگن ناتھ آزاد.	منزل ہے کہاں تیری، (نظم)،	۱۵۸
۳۵	جلال الدین اکبر	یاد (غزل)،	۱۵۹
۳۶	محمد حسن عسکری،	آندرے ژید کا تازہ ترین ناول،	۱۶۰
۳۷	سید نذیر حسین ناشاد.	جشن برشگال (غزل)،	۱۶۷
۳۸	جعفر طاہر،	جھولا (نظم)،	۱۶۸
۳۹	صفیہ شمیم ملیح آبادی،	برسات کی چاندنی رات: (نظم)،	۱۷۱
۴۰	ونگ کمانڈر سید فیاض محمود،	صاحب بہادر (ڈراما)،	۱۷۲
۴۱	نشتر جالندھری، جیمنی سرشار،	بزم تغزل،	۱۷۶
۴۲	مس نکہت رعنا، سید جابر علی،		
۴۳	ضمیر اظہر، اختر النساء اکبر آبادی		
۴۴	شاکر عروجی مدیر پریم. نذیر خاور.		
۴۵	باقر رضوی، شوکت الہ آبادی		
۴۶	مدیر،	جگن ناتھ آزاد کا مجموعۂ کلام،	۱۷۹
۴۷	نظر حیدرآبادی،	نقش آخر (نظم)،	۱۸۳
۴۸	امین الحق،	سحر کاذب ـ صبح صادق (ڈراما)،	۱۸۵
۴۹	نذیر مومن.	قطعات،	۱۹۲

	۵۰	سعید اختر درانی،	پہلے درجے کا مسافر (افسانہ)،	۱۹۳
	۵۱	مدیر،	مخزن المخازن،	۱۹۸
اکتوبر	۵۲	مدیر،	صفحۂ اوّل،	
	۵۳	پروفیسر حمید احمد خاں،	پھول کانٹے پر ایک نظر	۲۱۹
	۵۴	مدیر،	عشق پر زور نہیں ...؛	۲۲۵
	۵۵	ونگ کمانڈر سید فیاض محمود،	بس یہی ہو تو...: (افسانہ)،	۲۲۹
	۵۶	جلال الدین اکبر،	غمِ عشق (غزل)،	۲۳۲
	۵۷	عبدالغنی،	مرزا عبدالقادر بیدلؔ پر اپنے عہد کے اثرات،	۲۳۳
	۵۸	یوسف ظفر،	شکستِ خواب (نظم)،	۲۴۳
	۵۹	شیخ محمد اسماعیل پانی پتی،	مامون الرشید کا فیصلہ،	۲۴۷
	۶۰	محمد ہادی حسین (کمشنر راولپنڈی)،	جیتے رہئے یا مرجائیے (نظم)،	۲۵۷
	۶۱	غلام رسول تنویر،	درون خانہ،	۲۵۹
	۶۲	کیف بنارسی،	غمزدہ جہاں سے (نظم)،	۲۶۲
	۶۳	مسعود اشعر،	گیت،	۲۶۳
	۶۴	منشی تلوک چند محروم،	آج وارث شاہ سے .... (نظم)،	۲۶۴
	۶۵	ریاض الرحمٰن،	یاد (ترجمہ افسانہ جیمز جوائس)،	۲۶۵
	۶۶	عظیم قریشی،	اثبات (نظم)،	۲۶۷
	۶۷	مدیر،	مخزن المخازن،	۲۷۳
	۶۸	معترضین،	ایڈیٹر کے نام،	۲۸۲
	۶۹	مدیر،	مطبوعات،	۲۸۴
نومبر	۷۰	مدیر،	صفحۂ اوّل،	
	۷۱	ڈاکٹر محمد باقر ایم اے پی ایچ ڈی،	حافظ محمود شیرانی،	۲۹۱
	۷۲	پروفیسر محمد اکبر منیر ایم اے بی ای ایس،	جہانِ نو (نظم)،	۳۰۵
	۷۳	خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی،	تجلیات (غزل)،	۳۰۶
	۷۴	مولانا عبدالمجید حیرت،	آئینۂ حیرت،	۳۰۶
	۷۵	جناب ارشد مسعود صاحب،	منفی عمل (افسانہ)،	۳۰۷
	۷۶	حضرت مقبول احمد پوری،	گیت،	۳۱۳
	۷۷	محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی،	رباعیات،	۳۱۳
	۷۸	حضرت شیخ عبدالقادر مدظلہ مدیر اعزازی،	جناح کے بغیر،	۳۱۴
	۷۹	جناب ظفر اقبال صاحب،	انسان کی آواز (نظم)،	۳۱۷
	۸۰	جناب محمد خلیل الرحمٰن صاحب،	حلقۂ ارباب ذوق اور موجودہ ادبی نظریے،	۳۱۸
	۸۱	جناب قصور گرتپوری،	غزل،	۳۲۳

۸۲	جناب آتش لدھیانوی،	غزل،	۳۲۳
۸۳	جناب سعید اختر صاحب درّانی	قدیم یونانی حکایات،	۳۲۴
۸۴	جناب صادقین صاحب صنق،	نقش و حرف (رباعیات)	۳۲۹
۸۵	جناب مسعود اشعر صاحب،	تنہائی میں (نظم)،	۳۳۰
۸۶	حامد علی خاں،	تلفظ کی غلطیاں،	۳۳۱
۸۷	حضرت ابوظفر نازش رضوی،	سرمایۂ نازش (غزل)،	۳۳۳
۸۸	جناب طفیل ہوشیارپوری	غزل،	۳۳۳
۸۹	جناب محمد حبیب اللہ صاحب اوج حیدرآبادی	اُس کے ماں باپ (افسانہ)،	۳۳۴
۹۰	جناب عبدالمجید صاحب بھٹی،	گیت،	۳۳۸
۹۱	جناب ڈاکٹر گیان چند صاحب ایم ایل ٹی فل،	رباعیات،	۳۳۸
۹۲	جناب جیمنی سرشار	غزل،	۳۳۹
۹۳	جناب ظفر اقبال صاحب حشر	قطعات،	۳۳۹
۹۴	مخزن المخازن	مدیر،	۳۴۰
۹۵	قارئین	ایڈیٹر کے نام،	۳۵۷
۹۶	مدیر	ذکرِ حالی اور دوسری کتابیں،	۳۵۹
۹۷	مدیر،	صفحۂ اول،	
۹۸	سید علی عباس،	ہماری شاعری میں مثالی حسن کا تصور،	۳۶۳
۹۹	جلال الدین اکبر،	وعدہ آنے کا وفا کیجئے — (غزل)	۳۷۴
۱۰۰	ڈاکٹر سلیم واحد سلیم،	—— کوئی بتغزار آیا (٭)	۳۷۵
۱۰۱	محمد حسن عسکری،	ژاں پو کی خود آگاہی،	۳۷۶
۱۰۲	صفیہ شمیم ملیح آبادی،	دوسرا رُخ (غزل)	۳۸۳
۱۰۳	جعفر طاہر،	(غزل)	۳۸۴
۱۰۴	ونگ کمانڈر سید فیاض محمود،	میرے افسانے،	۳۸۵
۱۰۵	جلیل حسین جلیل،	ایک رات (نظم)	۳۹۰
۱۰۶	نظر حیدرآبادی،	ایک اور رات (نظم)	۳۹۱
۱۰۷	ابن حسن زیدی،	دربان (افسانہ)	۳۹۲
۱۰۸	محمد اسمٰعیل پانی پتی،	سرسید احمد خاں کے دو خط،	۴۰۱
۱۰۹	پروفیسر محمد شمس الدین صدیقی،	جیسی رُوح ویسے فرشتے (ڈراما)	۴۰۲
۱۱۰	حامد علی خاں،	تلفظ کی غلطیاں، (مکالمہ)	۴۰۷
۱۱۱	" "	منشورات،	۴۰۹
۱۱۲	مدیر	مخزن المخازن،	۴۱۳
۱۱۳	قارئین	ایڈیٹر کے نام،	۴۲۷

دسمبر